اے احتشام شیوۂ گفتار السّلام

اے احتشام جذبۂ بیدار السّلام

اے احتشام قوتِ اظہار السّلام

اے احتشام اُردوئے بیار السّلام

●

تو علم کی فصیل ادب کا حصار تھا

ہاں تیرا اعتبار بھی کیا اعتبار تھا

(ڈاکٹر ابوالحسن)

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۰ — دفتر فون نمبر ۲۶۱۳۵

لائسنس نمبر ۲۰۶۳۱۶/۲۰،۸،۶۴ — فون نمبر رہائش گاہ ایڈیٹر ۲۶۶۵۶

ادارہ فروغ اُردو ہند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ

(شمارہ ۸ و ۹ و ۱۰) فروری ۱۹۷۴ء (جلد ۱۹)

احتشام حسین نمبر

چیف ایڈیٹر

ڈاکٹر سید رغیب حسین

صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی (ڈی لٹ)

ایڈیٹر

محمد حسین شمس علوی قلمی کاکوروی

زرِ سالانہ اعزازی دس روپے — عوام سے چھ روپے — قیمت احتشام نمبر -/۱۵

پبلشر سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اُردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا

نوائے غم

جادو فلک کا پھر مری دنیا پہ چل گیا
جھپکی ہی تھی بس آنکھ کہ منظر بدل گیا
شاید کہ احتشام کے پیکر میں اے عمر
ٹکڑا تھا ایک ابر کا برسا نکل گیا

عمر انصاری

ماہنامہ

فروغِ اردو

احتشام حسین نمبر

مرتّب

سیّد انصار حسین رضوی ماہلی

کسی کو ہجر میں آہیں تلاش کرتی ہیں
ادب نواز کو راہیں تلاش کرتی ہیں
ادیب و ناقد و شاعر وہ احتشام کہاں
خدا گواہ نگاہیں تلاش کرتی ہیں

تکمیل رضوی لکھنوی

انتساب

میں اس مخصوص نمبر کو نور چشم جعفر عباس سلمہٗ کے نام معنون کرتا ہوں جن سے نہ صرف ان کے پورے خاندان کو بلکہ پوری ادبی دنیا کو توقع ہے کہ وہ اپنے پدر مرحوم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ادب کی بدستور خدمت کرتے رہیں گے اور جس کام کو بھیا مرحوم مکمل کرنا چاہتے تھے وہ مکمل کرنے کی طرف توجہ کریں گے۔

فہرست مضامین

زبانِ بے زبانی

شخصیت، تاثرات، جائزے

فکر و فن

تصورات و تاثرات

احتشام حسین خطوط کے آئینے میں

۱۱۷ احتشام حسین کے نام

فیضان احتشام

عرض مرتب

ادارۂ فروغ اردو نے رسالہ فروغ اردو کے احتشام نمبر کا اعلان کیا اور مولانا شمس علوی صاحب نے اسکی ترتیب میرے سپرد کی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ احتشام نمبر اچھے سے اچھا نکل جائے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور کچھ عنوان مقرر کر کے ایک خط کے ساتھ جتنے اہم لکھنے والے تھے روانہ کئے پہلے مرحلے میں میرے پاس سیکڑوں خطوط آ گئے کہ میں اس عنوان پر لکھوں گا میرا دل بڑھا اور میں نے انھیں عنوانوں کے تحت ایک نقشہ مرتب کیا لیکن افسوس کہ ہزاروں خطوط میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا اور مضمون کا تقاضہ کرتا رہا۔ رائے گاں گئے اور بہت سے اہم ترقی پسند لکھنے والے جن سے امیدیں وابستہ تھیں انھوں نے قلم نہ اٹھایا اس سلسلے میں میں نے پاکستان سے بھی رابطہ قائم کیا اور چاہا کہ وہاں سے بھی مضمون حاصل کروں لیکن سوائے چند خاص لکھنے والوں نے تو مضامین روانہ کئے اور باقی باوجود تقاضوں کے اپنے وعدے کا ایفا نہ کیا فروغ اردو کے عام دو شماروں میں میں نے وہ نام مع عنوان کے شائع کیے جنھوں نے عنوان کے تحت مضامین بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

لیکن جب آپ اس نمبر کو دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان وعدہ کرنے والوں کے کتنے مضمون اس نمبر میں شامل ہیں اور کتنے نہیں۔ مضامین کی امید پر تاخیر پر تاخیر ہوتی رہی اور میں مضامین کے لیے سادی ڈاک اور رجسٹری سے خطوط لکھتا رہا۔

مضامین جو آتے رہے خوشنویس کے حوالہ کرتا رہا، یہ بھی چاہتا تھا کہ پورا نمبر ایک ہی خوشنویس ایک ہی قلم سے ایک ہی طرح کی مسرخی کے ساتھ لکھے تاکہ نمبر کا معیار باقی رہے اور مختلف قسم کے خط نہ ہوں۔ میں نے اس کو اسی طرح ترتیب دیا پہلے حصے کا عنوان "احتشام اور احتشامیات" رکھا جس میں ان کے خاندانی حالات پر مشتمل ایک معلوماتی مضمون شامل کیا اس کے بعد دوسرا عنوان "زبان بے زبان" رکھا اس میں ان کی تصویریں شروع سے آخر وقت

یک جو مل سکیں شامل کیا۔ تیسرا عنوان "شخصیت تاثرات اور جائزے" رکھا ان میں اُن مضامین کو شامل کیا جو ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے تھے۔ چوتھا عنوان "فکر و فن" رکھا اس میں وہ مضامین شامل کئے جس میں ان کی تنقید اور فن پر بحث تھی پانچواں عنوان "احتشام حسین خطوط کے آئینے میں" قائم کیا کچھ خطوط احتشام صاحب کے دوسروں کے نام اور کچھ خطوط دوسروں کے احتشام صاحب کے نام شامل کیے۔ چھٹا عنوان "فیضانِ احتشام" قائم کیا جس میں ان کے لکھے ہوئے تقریباً ہر صنف کے مضامین شامل کیے۔ یہ بھی سوچا تھا کہ اس میں کچھ انگریزی اور کچھ ہندی مضامین بھی شامل کر دوں لیکن بعض مخلصوں نے یہ مشورہ دیا کہ یہ میگزین طرز کی چیز ہو جائے گی میں نے اس ارادے کو ترک کیا اور انشاء اللہ ان کے ہندی اور انگریزی مضامین جو خاصی تعداد میں ہیں کسی وقت شائع کر دوں گا۔ اسی حصہ میں اُن کے مضامین کی فہرست سنہ وار جن رسائل میں چھپے تھے جو حاصل ہو سکے شامل کر دیئے۔

آخری یعنی ساتواں عنوان جس میں کچھ اخبارات کے ایڈیٹوریل کچھ تعزیتی تار، خط اور کچھ اہم تعزیتی جلسوں کی کارروائی شامل کی۔

اس طرح "فروغ اردو" کے احتشام نمبر کی ترتیب دی اور ایک گلدستے کی شکل میں پیش ہے اچھائی اور برائی کا فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر سب مضامین جیسا کہ میرے پہلے خط کے جواب میں لوگوں نے بھیجنے کے لیے لکھا تھا وہ آجاتے تو اس سے بہت اچھا نمبر پیش کیا جا سکتا تھا۔ غیروں سے نہیں لیکن اپنوں سے یہ شکوہ ضرور ہے کہ باوجود وعدوں کے ایک صفحہ بھی نہ بھیجا جس کا افسوس ہے فہرست دیکھنے سے اندازہ ہوگا کہ قریب کے وہ لوگ جن کے مضامین اس میں نہیں شامل ہیں ان کا شامل ہونا ضروری تھا۔

اس نمبر میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر مضمون سامنے کے صفحہ سے شروع ہو اس کے لئے میں نے دو انٹرویو کے صفحات پھیلا دیئے ہیں نیز کچھ احتشام صاحب کی کتابوں سے ٹکڑے لیکر اس کو پر کیا ہے۔

مولانا شمس صاحب علوی نے اس کی ترتیب میرے سر ڈال کر مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا تھا لیکن میں ان کا شکریہ ضرور ادا کروں گا کہ موصوف نے جس جس طرح میری فرمائش کی اس امر کا نہ خیال کرتے ہوئے کہ اخراجات کس حد تک جا سکے ہیں میری ہمت افزائی فرماتے رہے ساتھ ہی ساتھ تاخیر کے لیے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ آخر وقت تک مضامین کے انتظار نے مجھے روکے رکھا اور میں وقت پر اس کو نہ نکال سکا اس کی وجہ سے دو نقصانات ہوئے ایک تو قارئین کو انتظار کی گھڑیاں گذارنی پڑیں دوسرے یہ مشکل آن پڑی کہ کاغذ ایک دم بازار سے غائب ہو گیا اور جیسا کاغذ لگانا

چاہتا تھا وہ میسر نہ آسکا بلکہ اُس سے دُگنی قیمت ادا کر کے یہ معمولی کاغذ فراہم ہو سکا۔

میں نسیم قریشی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً اس کی ترتیب میں مجھے صحیح مشورے دیئے اور میری استدعا پر اس کا اداریہ لکھا اس کے علاوہ سید اولاد اصغر کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ جنھوں نے اس پورے نمبر کی کاپی اور پروف سے مجھے آزاد رکھا۔ برادر محترم سید وجاہت حسین و محمود سلمۂ اور جعفر عباس سلمۂ و جعفر عسکری کا بھی مشکور ہوں کہ ان لوگوں نے جن جن چیزوں کو میں نے فرمائش کی مہیا کیا۔ ناظرین ترتیب میں تقدم و موخر کے فرق کو کوئی اہمیت نہ دیں گے بلکہ یہ ایک ایسی بزم ہے یا ایک صف ماتم جس پر آنے والوں کو جہاں گنجائش دیکھی بیٹھنے کی زحمت دیدی گئی ہے۔

اس نمبر میں جتنے محاسن اور خوبیاں نظر آئیں اس کے لیے مولانا شمس صاحب قابل مبارکباد ہیں اور جو خامیاں اور نقائص دکھائی دیں ان کو میں اپنے سر لینے کو تیار ہوں۔

مُرتّب

دو خوشگوار تبدیلیاں

"فروغ اردو" نے اپنے جلسہ تعزیت جو احتشام صاحب کی موت پر گنگا پرشاد میموریل ہال میں کیا تھا اس میں ایک تجویز یہ رکھی تھی کہ کسی سڑک کا نام بدل کر احتشام حسین روڈ رکھا جائے۔

لیکن جب میئر داؤ جی گپتا کی تقریر کا وقت آیا تو موصوف نے کہا کہ اس تجویز میں میں ایک ترمیم چاہتا ہوں وہ یہ کہ اتنے بڑے ادیب کے لیے آپ ایک سڑک کے لیے کہہ رہے ہیں یہ ان کے شایان شان نہیں۔ میں یہ ترمیم چاہوں گا کہ ان کے نام سے گولہ گنج یا بارود خانہ جہاں وہ رہتے تھے اس کا نام بدل کر "احتشام نگر" کر دیا جائے۔

چنانچہ حسن جعفر برلاسی صاحب نے یہ ریزولیوشن نگر مہا پالیکا میں رکھا اور مسٹر داؤ جی گپتا نے اس کی تائید کی اور مورخہ ۱۰ر مارچ ۷۳ء سے بارود خانہ کا نام "احتشام نگر" ہو گیا۔ جس کی تختی کی تصویر اس نمبر میں شامل ہے۔

الہ آباد میں مشن روڈ کا نام تبدیل کر کے "احتشام مارگ" رکھا گیا۔ ہم لکھنؤ کے میئر داؤ جی گپتا اور حسن جعفر برلاسی صاحبان اور الہ آباد کے میئر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اداریہ

عرض ہے

فروغ اردو کا یہ خصوصی شمارہ خلد آشیاں پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے حضور سلام عقیدت کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ یہ علمی رسالہ مرحوم کی رہنمائی، سرپرستی اور ہمہ وقتی امداد و اعانت کی ایک زندہ یادگار ہے۔ ادارہ فروغ اردو جس کے مقاصد اور کارگذاریوں کی ترجمانی یہ علمی رسالہ کرتا ہے، اپنے قیام کے روز اول سے مرحوم کا رہین منت رہا ہے۔ ان کی اندوہ ناک موت جس طرح ادبی دنیا کے لیے ایک حادثہ عظیم تھی، اسی طرح اس نے ہمارے ادارے اور علمی کام کو زبردست نقصان پہنچایا۔

احتشام مرحوم دنیا سے کیا اٹھے اردو ادب کا ایک ستون گر گیا، علمی جدوجہد کا ایک میر کارواں نہ رہا، فضل و کمال کی ایک ایسی دلکش اور وقار تصویر پردۂ زندگی سے محو ہو گئی، جس کے لیے اہل ذوق برسوں ماتم کناں رہیں گے، وہ ٹھنڈے دل و دماغ کا مجاہد اردو نہ رہا جس کے ہوش و احتیاط میں جوش و والہانہ کیفیتوں کی کلیاں بھری ہوئی تھیں، جس کی ہر رائے اتنی سنجیدہ، ہر قدم اتنا جچا تلا، ہر مشورہ اتنا صائب اور جس کی رہنمائی اتنی قابل اعتماد تھی کہ تنہا اس نے اپنے کام سے اردو کے علم و وقار کو بلند رکھا اور اس کے فروغ و ترقی کی نئی سے نئی راہوں کی نشان دہی کی۔

پروفیسر مرحوم ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے یہاں اتنا شاندار ذہنی توازن اور اصول اور وضع داری کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے، جس کی مثالیں بے انتہا کمیاب ہیں۔ وہ جدید ترین تحریکوں اور نئے سے نئے رجحانات سے پوری طرح آشنا تھے اور ان کے قلب و ذہن کی گہرائی ہر صالح اور توانا اثر کو قبول کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار تھی، نہ صرف قبول کرنے کے لیے بلکہ اپنی شخصیت میں سمو کر اسے تاب و تواں اور آب و رنگ سے نکھارنے کے ملکے سے بھی بہرہ ور تھی، بلکہ اس سے بڑھ کر ان کا یہ کمال تھا کہ اثر پذیری کے اس عمل میں انہوں نے اپنے ذہنی استقلال میں کبھی فرق نہ آنے دیا۔ اور ان کی مشرقیت، ان کی طبیعت کا رکھ رکھاؤ، ان کی ذہنی رواداری اور ان کی فراخ حوصلگی ان اثرات کی بدولت اور سنورتی، اور حسن سے روشن تر ہوتی گئی۔ وہ زندگی بھر صحیح اور سچے مفہوم میں ایک طالب علم رہے، وہ زمانہ جب وہ مکتب، مدرسہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں کتابیں لے کر حصول علم کے لیے جاتے تھے، تو ان کے انداز میں وہ شوق وہ احترام وہ تعلق اور وہ لگن ہوتی تھی جو ایک سچا نمازی اپنے سفر زیارت میں محسوس کرتا ہے۔ قدرت نے ان کی فطری صلاحیت کے پیش نظر انہیں طالب علم سے معلم بنا دیا، اس شان کا معلم جو علمی نکات کے حل کرنے میں، دقائق کی تشریح میں، مسائل کی توضیح میں اور اد بی حسن و جمال کی ترجمانی میں کچھ ایسا انداز رکھتا تھا کہ پڑھنے والے یہ محسوس کرتے تھے کہ علم کی جو تشنگی لے کر وہ آئے تھے، وہ ایک نہ بجھنے والی پیاس بن گئی ہے۔ ایک ایسی تڑپ جو زندگی بھر انہیں حقائق کی جستجو میں، حسن و کمال کی یافت میں اور ان کے لیے لذت قلب و نظر کا سامان فراہم کرتی رہے گی۔ اتنا ہی نہیں،

کتا روح پرور تھا طالب علموں کا یہ احساس کہ وہ اپنے استاد کے ساتھ ایک منزلِ دیریاب کے سفر میں اس طرح ہم قدم ہیں، جیسے راہِ حق کے دو مسافر ایک ساتھ چل رہے ہوں۔ وہ اپنے اور اپنے طالب علموں کے درمیان کوئی مصنوعی حجاب باقی نہیں رہنے دیتے تھے۔ ایک انتہائی خوشگوار ماحول میں ان کا لیکچر اس بے تکلفی اور فطری انداز کے ساتھ سیرابیِ ذہن کرتا تھا، جیسے کوئی چشمہ جوشِ نمو میں سینۂ زمین سے پھوٹ پڑا ہو اور سطحِ زمین کو زندگی کی دولت سے مالا مال کر رہا ہو۔ ان کی کلاس رسمی معنی میں تعلیم کا گہوارہ نہیں تھی حقیقی مفہوم میں کشادِ قلب و ذہن کی ایک دنیا تھی۔ آواز بہت متین، لہجہ بہت پروقار، الفاظ نپے تلے، کلام کا تسلسل آئینہ کی طرح شفاف، بتدریج گرہ کشائی کا عالم، قلب و نظر کی جہتوں کا وسیع سے وسیع تر ہوتا اور نتیجہ میں نہ صرف معلومات کا حاصل ہونا بلکہ موضوع کی روح کا عرفان میسر آجانا یہ تھا ان کا امتیازی کمال ادبی محفلوں، علمی مجلسوں، تہذیبی جلسوں میں ان کے خطبے بڑے خلوص، فکر کی بڑی پاکیزگی، استدلال کی بڑی قوت اور پروقار اثر و تاثیر کے ساتھ معاملات و مسائل کی وضاحت کرتے تھے اور خواہ ان کے ہم خیال ہوں یا ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والے، ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ سامنے ایک بلند ذہن، عالم اور مفکر کی گفتگو سن رہے ہیں جس کے یہاں نہ نیش زنی ہے نہ طنز و ملامت، نہ کسی کی تحقیر ہے اور نہ کسی نقطۂ نظر کی غلط ترجمانی۔ ایک انتہائی سوچی سمجھی رائے خلوص اور دیانت کی بدولت آہنی قوت حاصل کیے ہوئے عالمانہ وزن اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہے۔ احباب اور نیاز مندوں کے درمیان ان کی گفتگو ہمیشہ لطف و شفقت، التفات و محبت کا آئینہ رہی، لیکن اس میں بھی علمی اور ادبی لطافتیں طبیعت کا نکھار اور ذہن کی جولانی برابر اپنے جلوے دکھاتی رہی۔ نہ ان کا چہرہ مرعوب کن تھا اور نہ ان کی آواز، اور نہ ان کے انداز میں وہ بلند رہنے اور دور رہنے کی بات تھی، جن کا اظہار اکثر مدعیانِ علم اپنی وجاہت اور مرتبہ شخصیت کی نمائش کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ ان سے برسرِ راہ ملیں، کہیں دوکان پر ملاقات ہو، گھر پر گفتگو ہو، یا سفر میں ساتھ ہو جائے، ہر جگہ وہ آپ کو یکساں بے تکلف، شفیق اور کرم فرما دکھائی دیتے تھے۔

احتشام مرحوم کی ادبی زندگی کا آغاز ایک ایسے زمانے سے ہوا جب ادب کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن مرحلہ آگیا تھا، تاثراتی تنقید اپنا اظہارِ کمال کر چکی تھی اور جوش و گرمیِ دل کے ساتھ لکھنے لکھانے کا کاروبار سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے سبب سونا پڑ چکا تھا۔ اقبال کی حقیقت پسندی اور مسائلِ زندگی سے برملا دوچار ہونے کا حوصلہ فکر و نظر کی نئی جہتیں کھول رہا تھا، عالمی اثرات کی بدولت نئی ادبی تحریکیں ہندوستان کو متاثر کر رہی تھیں اور ترقی پسند تحریک ابھر کر سامنے آرہی تھی۔ انھوں نے مثبت قدروں، زندگی کے ایجابی نقطۂ نظر اور ترقی پسندانہ رویے کو اپنایا اور اپنی کاوشِ ذہن اور کاوشِ قلم کی بدولت اردو کے ادبی ذخیرے کے ایک نئے مطالعے کا دروازہ کھولا اور مسائل کے نئے پہلو بڑے صاف اور دلنشین انداز میں نگاہوں کے سامنے ہویدا کیے۔ وہ تنقید کا زبردست عالمانہ ملکہ رکھتے تھے۔ ان کے تجزیے کی قوت کا یہ عالم تھا کہ وہ مسائل کی تفتیش میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیتے تھے۔ لیکن یہ پورا عمل خالص علمی انداز سے بہرہ مند ہوتا تھا۔ وہ از اوّل تا آخر ترقی پسند تھے لیکن بہت وسیع مفہوم میں۔ ادبِ قدیم کی ہر توانا قدر اور ہر حیات آفریں پہلو کا نہ صرف کھلے دل سے انھوں نے اعتراف کیا، بلکہ اس کے احیا کے لیے زبردست وکالت کی۔ اس دور میں بھی جب ترقی پسند "کافر گری" کے شغل میں بہت پیش پیش تھے انھوں نے یکساں حسن دیر و حرم کا اعتراف کیا اور کبھی اپنے آپ کو نعرے بازی، انتہا پسندانہ نقطۂ نظر، جذباتیت اور ذہنی تحجر کا شکار نہ ہونے دیا۔ ان کے بعد ادبی تحریکوں نے نئے نئے موڑ لیے، نئے نئے لباس پہنے، نئی نئی منزلوں کا حوصلۂ سفر پیدا کیا لیکن ان کا یہ کارنامہ ہمیں یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر وہ قدیموں میں جدید تھے، تو جدیدوں میں برابر قدیم رہے۔ یہ صرف ان کے علمی وزن و وقار کا ثبوت نہیں ہے بلکہ ان کی وضع داری اور سلامت روی کا بھی آئینہ ہے۔

مرحوم کا دائرہ قلم بہت وسیع تھا۔ ادبی تنقید، لسانی تجربے، علمی ترجمے، ڈرامے، شعر و سخن غرض ان کا ذہن بڑی مستعدی اور ہمہ گیری کے ساتھ ادب کی خدمت کے لیے وقف رہا۔ انھوں نے مغربی دنیا کا ایک علمی سفر کیا اور شاید کم لوگ اپنے سفر کا حاصل ایسے شاندار طریق

ان ذہن کی خاطر پیش کر سکے ہوں جیسا انھوں نے اپنے بے پناہ مشاہدے، نتیجہ خیز ملاقاتوں، ذوق و شوق اور علمی کمال کی بدولت لکھا یا۔ ان کا سفرنامہ "ساحل و سمندر" اردو سفرناموں کے ذخیرے میں کوہ نور کی طرح بڑا دمک رہا ہے۔ تنہا یہ سفرنامہ بتا رہا ہے کہ اس کا والا کس قدر زندہ اور روشن ذہن رکھتا ہے، اس کے دل میں علم کی کتنی پیاس ہے، اس کی نظر کتنی وسعتوں کے ساتھ زندگی کے مناظر میں اتی ہے اور علم دوستی اور انسان دوستی کس طرح اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے فتوحاتِ سیر کو تمام و کمال جنت نگاہ و عالم بنا دے۔

ایک ناقد بالغ النظر، ایک ادیب صاحب فکر، ادیب، ایک عالم بلند حوصلہ عالم، ایک محقق سچا اور بے لوث محقق، ادب کی اور صالح قدروں کا ایک مبلغ اور مجاہد مبلغ، اردو کا ایک خادم ایک مخدوم صفت خادم، ہزاروں طالب علموں کا مربی استاد، ان ت دوستوں کا شفیق دوست، لا تعداد شیدائیانِ علم و ادب کا مرکزِ احترام، وضع داری اور شرافت کا ایک حسین و جمیل پیکر، اس کی نگاہ ہولہ و حیک جو زندگی کے اندھیروں میں روشنی پھیلا دے، اس کے ہونٹوں پر وہ تبسم جو محفل میں قند و نبات بکھیر دے، اس کی گفتگو میں زم جو حوصلۂ زندگی کو بیدار کر دے ـــــ وہ ایک انسان تھا، بڑا انسان، جس پر فخر کر کے اپنے اوپر فخر محسوس ہونے لگتا ہے، ہمارے ان نہ رہا۔ لیکن ہمارے دلوں میں اس محبت کا چراغ روشن ہے۔

یہ خصوصی شمارہ مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر شائع ہو رہا ہے۔ ہماری تمنا تھی، اور ہم نے اپنی حد تک پوری کوشش کی کہ ہندوستان بیرونِ ہند ہر جگہ کے اہل علم و ادب اس شمارے کی ترتیب میں ہماری معاونت کریں۔ جو خطوط ہم نے لکھے ان کی تعداد ہزاروں سے بھی ہے، ہم نے ملاقاتیں بھی کیں اور جہاں تک ہم سے ممکن ہو سکا ہم نے قلمی اعانت حاصل کی۔ اس کا گہرا صدمہ ہے کہ مرحوم کے اکثر عزیز ترین ب اور ہمارے دیرینہ کرم فرماؤں نے نہ جانے کیوں ہماری پذیرائی نہ کی۔ ان کا تعاون حاصل ہو جاتا تو یہ شمارہ اور زیادہ قابل قدر اتا۔ پھر بھی ہمیں بڑا اطمینان ہے کہ دور اور قریب کے کرم فرماؤں نے ہماری اعانت کی اور یہ انھیں کا احسان ہے کہ ہم یہ شمارہ آپ کے منے پیش کرنے کے قابل ہو رہے ہیں۔ شمارے کی ترتیب اس طرح ہے کہ پروفیسر احتشام مرحوم کی شخصیت کے جائزے، ان کے فکر و فن بنی اور تنقیدی مطالعے، ان کی وفات پر شعرا کے منظوم تاثرات، وفات کی منظوم تاریخیں، ان کی شخصیت اور فن کے متعلق اربابِ فکر کے ط کے اقتباسات اور جرائد و رسائل کے اہم تعزیتی شذرے اور مضامین کا انتخاب۔ شمارے میں ہم نے پروفیسر مرحوم کی نگارشات کا انتخاب بھی دے دیا ہے۔ تاکہ تصویر جامع اور مکمل ہو کر سامنے آ جائے۔

ادارۂ فروغ اردو کا یہ علمی اقدام احسان مندی کا بہت حقیر اعتراف ہے۔ کاش اہل دل، اہل نظر ہمارے خلوص عقیدت پر نگاہ تے ہوئے اس حقیر سی خدمت کو توجہ اور پذیرائی کا مستحق سمجھ لیں۔

نسیم قریشی
رکن ادارہ

ایک نایاب نظم

مجی صہبا صاحب، سلام شوق.

کاغذات الٹ پلٹ رہا تھا کہ جوش صاحب کی ایک نظم مل گئی اور مجھے اکیس سال پہلے کے بعض واقعات یاد آ گئے۔ جوش
احب "کلیم" بند کر کے ملیح آباد میں رہنے لگے تھے۔ وہاں سے کبھی کبھی ایک آدھ دن کے لیے لکھنؤ آتے، کسی ہوٹل میں قیام
تے اور چاہتے تھے کہ ان کے دوست اور قدر دان شام کو وہیں اکٹھا ہو جایا کریں ــــ پینے والے پئیں اور شاعری سے
پی لینے والے ان کا تازہ کلام سنیں۔ میں شام کی صحبت میں بیٹھنے کے بجائے دوپہر میں ان سے ملنا زیادہ پسند کرتا تھا کیوں کہ تنہائی
ں کچھ علمی ادبی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ صہبا صاحب! جن لوگوں کو یہ موقع نہیں ملا ہے انہیں آسانی سے جوش کی ذہانت اور علم کا
ندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت شعر۔

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کسی علمی یا ادبی موضوع پر بحث کر سکتے ہیں۔ ایسی ہی ایک تنہائی کی صحبت میں ــــ حرف آخر کی
یاد پڑی تھی، جو بد قسمتی سے ابھی تک نامکمل ہے۔ یہ صورت تھی، میں شام کو بھی جایا کرتا تھا۔ کیوں کہ وہ اسی وقت
ے ملنے کو ملنا سمجھتے تھے۔

ایک دن وہ ملیح آباد سے آئے اور میرے یہاں اطلاع کرائی کہ شام کو "نشست" ہو گی۔ میں نے وعدہ کیا کہ ضرور
وں گا۔ شام کو یہ حادثہ پیش آیا کہ اچانک میری بیوی بیمار ہو کر آ گئیں، اور مجھے ڈاکٹروں کے یہاں دوڑنا پڑا۔ شادی کو
پینے سے بھی کم ہوئے تھے، اور جوش صاحب کو یہ خیال پہلے ہی دن سے پیدا ہو گیا تھا کہ میں اب ان سے کم ملتا ہوں۔ میں
صفائی دیتے دیتے عاجز ہو گیا تھا، وہ لوگوں سے یہ کہتے نہ تھکتے تھے۔ یہ چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی کہ اس میں یہ افتاد پڑی
ں شب کی نشست میں نہ پہونچ سکا، اور انہیں کسی نے بتا دیا کہ بیوی آ گئیں۔ اس لئے نہیں آئے۔

یں صبح کو سو کر اٹھا بھی نہیں تھا کہ محترمی رئیس احمد خاں صاحب (جوش کے چھوٹے بھائی) ایک رقعہ دے کر چلے
گئے۔ اس میں یہ چند اشعار تھے۔ میں معذرت کے لئے گیا تو حالات میں معمولی سی تبدیلی ہوئی۔ لیکن ان کی یہ رائے نہیں بدلی
میں بیوی کی وجہ سے انہیں کچھ کم "چاہنے" لگا ہوں...

نظم پنسل سے بہت ہی شکستہ خط میں لکھی ہوئی ہے۔ ممکن ہے میں نے ایک آدھ لفظ بالکل صحیح نقل نہ کیا ہو۔ جی
چاہے تو یہ نظم شائع کر کے مجھے اور انہیں دونوں کو رسوا کیجیے۔

آپ کا

احتشام حسین

کل نہ آئے جو احتشام حسین — دل میں غصّے کی بدلیاں گھِر آئیں
اُن کے اس اوّلیں تمرّد پر — ہوگئی رُوحِ شعر چیں بہ جبیں
میرے فرمان پر نہ حاضر ہو — رُوحِ عالم کی یہ مجال نہیں
لیکن انسان، نا سزا انسان — کتنی شدت سے ہے شریر و لعیں
یہ خیال آتے ہی مرے سر میں — زلزلے آئے، بجلیاں کڑکیں
بستر غیظ و فرشِ حسرت پر — دل نے رہ رہ کے کروٹیں بدلیں
سازِ شیریں میں آگئی تلخی — بادۂ تلخ بن گیا شیریں
اُڑ گیا رنگِ ساغر و مینا — بجھ گئی آتشِ مہ و پرویں

تھا یہ عالم کہ دفعتًا اے جوشؔ — آئی ہاتف کی یہ صدائے حزیں
کہ نہ ہو احتشام سے ناخوش — اس میں ان کا کوئی قصور نہیں

ہو نہ ہو لکھنؤ شریف میں آج
زوجۂ احتشام آ دھمکیں

جوشؔ

۱۰ر مارچ ۱۹۴۷ء ۹ بجے صبح

پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

رندِ نصیحت مشرب سے

مسمی بہ جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی جب کبھی لکھنؤ آتے، کسی ہوٹل میں مقیم ہوتے ان کی کوشش اور خواہش ہوتی کہ انکے احباب اور قدر دان شام کو وہیں جمع ہو جایا کریں۔ پینے والے پئیں، شاعری کے خواہشمند ان کا کلام سنیں پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم شام کی صحبت سے اجتناب کرتے اور دوپہر کو ان سے ملنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ کیونکہ تنہائی میں کچھ علمی و ادبی باتیں ہوتی تھیں۔ جوش کو اصرار تھا کہ ہم نوالہ ہوں نہ ہوں لیکن ہم پیالہ ضرور رہوں۔ لیکن احتشام حسین صاحب ان کی یہ ضد پوری نہ کر سکے جس کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل نظم کی تخلیق ہوئی۔

مت بار بار پوچھ میں کیوں سوگوار ہوں
ہوتا ہے مجھ کو شک تری صحبت پہ بار ہوں

اے دوست لطفِ بزم میں کھو جاؤں کس طرح
آتی نہیں ہے نیند تو سو جاؤں کس طرح

ہاں سچ ہے مجھ پہ فکر کے بادل سے چھائے ہیں
خود میں نے اپنے گرد یہ حلقے بنائے ہیں

اب تجھ سے کیا بتاؤں ہے کس موڑ پہ نظر
کہرے کی دھند میں مجھے درپیش ہے سفر

جب سے سمجھ میں آئے ہیں دنیا کے بیش و کم
لرزاں ہے شمعِ عیش سرِ رہگزارِ غم

آنکھیں کھلی ہیں بند انھیں کیسے میں کروں
غم کی اندھیری رات کو دن کس طرح کہوں

جب ہر قدم پہ ٹھوکریں کھاتی پھرے حیات
جام و سبو میں غرق کروں کیسے کائنات

کانٹے بچھے ہیں راہِ محبت میں دور تک
غم کے اثر سے زہر ہے، موجِ سرور تک

کیسی رُکی رُکی سی ہے اس زندگی کی رو
کتنی بجھی بجھی سی ہے شمعِ طرب کی لو

اللہ ری زندگی کا نظر آفریں جہاد
جام و سبو کو دیکھ کے آتا ہے خون یاد

کیسے میں یہ کہوں کہ نہیں جانتا ہے تو ارزاں تری شراب سے انساں کا ہے لہو
یتری نظر تو ناقدِ رازِ حیات ہے تیرے مشاہدے میں تو اک ایک بات ہے
انساں کے غم میں خون جلایا کیا ہے تو بہتر جو راہ ہے وہ دکھایا کیا ہے تو
رستہ بدل کے عیش کی منزل پہ جا نہ اب سنگیں حقیقتوں کو فسانے بنا نہ اب
ہے ابر تیرہ، سایہ فگن، کائنات پر لہرا رہا ہے موت کا پرچم حیات پر
میں دیکھتا ہوں خوں میں لتھڑی جوانیاں سنتا ہوں روز درد میں ڈوبی کہانیاں
کتنے دلوں میں حسرتِ فردا بنی ہے داغ اکثر اندھیری رات میں گل ہو گئے چراغ
سونے کے زرد، زرد خداؤں کا راج ہے محنت کشوں کے فرق پہ کانٹوں کا تاج ہے
آندھی کی زد پہ آج تمدن کا ہے چراغ کو دے رہا ہے سینۂ انسانیت کا داغ
جھلسی ہوئی ہے نکہت گل، گرم ہے ہوا دم گھٹ رہا ہے ذہن کا مسموم ہے فضا
ہے عقل و دل پہ سایۂ افکار کیا کہوں یاد آ رہے ہیں تیرے ہی اشعار کیا کہوں

بیگانۂ حقیقت انفاس ہوشیار ہر سانس ایک عالم صد انقلاب ہے
ہر جنبش نگاہ ہے اک انقطاع فصل ہر لمحہ ایک منزل روز حساب ہے
جی بھر کے بزم عیش میں ارماں نکالنا اوچھا سا اک خیال، پریشاں سا خواب ہے (جوش)

تو نے یہ کہہ کے آگ لگائی ہے بارہا تیری صدا دماغ پہ چھائی ہے بارہا
ذوقِ عمل کو یوں ہی ابھارا کیا ہے تو تصویر آرزو کو سنوارا کیا ہے تو
پردہ نگاہِ شوق پہ اب ڈالتا ہے کیا جب تو نے خود حیات سے پردہ اٹھا دیا
بزمِ طرب میں ساتھ ترے کیسے ہوں ہم جب زندگی کے بوجھ سے اٹھتے نہیں قدم
دل چاہتا ہے صاحب فکر و نظر ہوں میں بڑھ کر جہاد زیست میں سینہ سپر ہوں میں
مانا بدل سکو نگا نہ میں نظم کائنات ممکن ہے ساتھ ہی نہ مرا دے مری حیات
ممکن ہے ڈوب جائے ستارہ امید کا فتح و ظفر کی آئے نہ میری طرف ہوا

منزل پہ جا سکوں گا نہ میں اس کا غم نہیں

[illegible]

حیف آفتابِ علم غروب ہو گیا

۱۹۷۲ء

(خیالِ ہاملی)

احتشام حسین

ایک جائزہ

احتشام اور احتشامیات

علم و ادب کا رعب جماتا نہ تھا کبھی
دولت کی آب و تاب دکھاتا نہ تھا کبھی
فانوس و گل سے گھر کو سجاتا نہ تھا کبھی
احسان کر کے سب کو بتاتا نہ تھا کبھی
کتنا بلند ظرف تھا، عالی وقار تھا
سرمایہ دار فن تھا، مگر خاکسار تھا

شمیم کرہانی

سید اولاد اصغر رضوی ماہلی

احتشام ـــــ اور ـــــ احتشامیات

جو گھر کر ظلمتوں میں دیکھ لے تصویر مستقبل
بڑی مشکل سے ہوتا ہے یہ اندازِ نظر پیدا — اصغر ماہلی

سید احتشام حسین رضوی

۱:- رجحن
۲:- حیرانؔ ماہلی (جو غالباً ایک دو غزلوں کے بعد ترک کر دیا گیا)
۳:- بڑی چہاؤنی- ماہل ضلع اعظم گڑھ یو-پی

ننہال:- کھجوہہ شریف ضلع فیض آباد
اصل تاریخ و جائے پیدائش - ۱۲ اپریل ۱۹۱۲ء - اترڈیہہ ماہل سے تقریباً دس میل پچھم
برتھ سرٹیفکیٹ " " ۱۲ جولائی ۱۹۱۲ء ماہل

امتحانات

...ل ورناکیولر فائنل	مڈل اسکول ماہل	۱۹۲۶ء	بی- اے	الہ آباد یونیورسٹی	۱۹۳۴ء
...سکول	ویسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ	۱۹۳۰ء	ایم- اے	" "	۱۹۳۶ء
...یڈیٹ	گورنمنٹ کالج الہ آباد	۱۹۳۲ء			

اولاد و آبائے امجاد

...عفر عباس، سید جعفر عسکری، سید ارشد حسین، سید جعفر اقبال، سعیدہ بانو، ثریا جبیں

...تشام حسین مرحوم، سید وجاہت حسین صاحب، سید انصار حسین صاحب، سید اقتدار حسین صاحب، بنت خاتون

سید اولاد اصغر، سید ارشاد اصغر، سید امداد اصغر، ارتضائی بی بی عرف بٹن

سید ابو جعفر صاحب مرحوم

حکیم سید ابو محمد صاحب جیش مرحوم

سید اصغر حسین صاحب مرحوم
سید ارتضا حسین صاحب مرحوم
سید مہر علی صاحب مرحوم

نسب
سید مہر علی، سید جعفر شہید، سید بازید- سید شہاب سے سلسلۂ نسب امام علی رضا علیہ السلام سے ملتا ہے

میراثِ شاعری

پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے جدامجد سید اصغر حسین صاحب مرحوم فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اردو میں کم کہتے تھے لیکن ساری فنی خصوصیات کے ساتھ۔ دستِ بُردِ زمانہ سے آپ کا سارا کلام ضایع ہو گیا۔

پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے چچا حکیم سید ابو محمد صاحب کا جو پہلے حقیر تخلص کرتے تھے اور بعد میں احتشام بھائی مرحوم ہی کی فرمائش پر عیش تخلص کرنے لگے تھے۔ فارسی و اردو کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ آپ کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ قصیدہ گوئی آپ کا خاص میدان تھا کئی ایک مرثیے بھی لکھے۔ احتشام حسین مرحوم کی شاعرانہ صلاحیت میں آپ کی تربیت کا بڑا حصہ ہے۔

احتشام بھائی غزلیں یا نظمیں نہایت خوش لحانی سے پڑھتے تھے جو صرف آپ کا تنہا اپنا لہجہ و لحن تھا۔ عجیب پرکشش بے پناہ۔ دلکش۔

> محض پڑھنا اور حاصل کیے ہوئے علم کو ظاہر کرنے پر قدرت نہ ہونا۔
> ایک ادھورا عمل۔ ایک ناقص ذہنی ارتقا ہے۔
> پروفیسر احتشام حسین

خاندان و مذہب

سادات رضویہ کے ایک معزز و محترم زمیندار خاندان کی ایک فرد تھے۔ آپ اور آپ کا سارا خاندان مذہب جعفری امامیہ اثنا عشری کا پابند رہا۔

بھائی بہن

(۱) **سید وجاہت حسین صاحب:** ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہیں، اپنے بیٹوں سید جعفر مہدی سلمہٗ و سید جعفر رضا سلمہٗ کے ہمراہ لکھنؤ میں مقیم ہیں۔

(۲) **سید انصار حسین صاحب:** سرفراز قومی پریس لکھنؤ کے منیجر ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ آپ کی محنتوں سے پریس نے نئی زندگی پائی۔ اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی طاقت حاصل کی۔ اور اب اپنی اچھی چھپائی و وقت کی پابندی کے لیے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ حجاب پبلشرس آپ کی زیر نگرانی کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ انصار حسین صاحب دو ایک کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ اپنی کتاب گھڑی کی کہانی پر گورنمنٹ آف انڈیا سے انعام بھی پا چکے ہیں۔

(۳) **سید اقتدار حسین صاحب:** احتشام بھائی نے بالکل بیٹے کی طرح سے ان کو پالا، پروان چڑھایا اور اقتدار سلمہٗ کو بھی اپنے اس مرحوم بھائی سے جو محبت تھی نہیں بلکہ ہے۔ وہ ان کے سامنے صرف احتشام بھائی کا نام لیکر دیکھی جا سکتی ہے۔ آپ دلی میں کسٹمس انشورنس میں ایک معزز عہدے پر مامور ہیں۔

(۴) **بنت خاتون عرف بٹن:** بھائیوں کی محبت کی حامل اکیلی بہن سید اولاد اصغر عابدی کی شریک حیات ہیں۔

اولاد

(۱) **پروفیسر سید جعفر عباس سلمہٗ:** اردو میں ایم۔ اے۔ فرسٹ ڈویژن فرسٹ دلی۔ یونیورسٹی سے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے انتقال کے فوراً بعد الہ آباد یونیورسٹی نے شعبۂ اردو میں لکچرر کی جگہ دیدی ہے۔ اس کے قبل دلی ریڈیو اسٹیشن میں کچھ دنوں کام کر چکے ہیں۔ کئی ایک

انٹر یونیورسٹی تقریری مقابلوں میں شیلڈ حاصل کی ہے تحریری صلاحیت بہت اچھی ہے۔

(۲) سید جعفر عسکری سلمہٗ:۔ احتشام بھائی مرحوم اپنے اس بیٹے کا بیحد خیال رکھتے تھے۔ اکثر اس کی شاعری اور ذہنی صلاحیتوں کا تذکرہ تعریفی انداز میں ہم سب سے کرتے تھے۔ بہت اچھے شاعر ہیں۔ وہ ایک مضامین دیکھ کر حیرت ہوتی کہ اس میدان میں بھی قدم پیچھے نہیں رہا۔

(۳) سعیدہ بانو سلمہا:۔ نہایت سلیم الطبع خدمت گذار جامع صفات بچی ہے۔ ایم۔اے کا امتحان مرحوم کے انتقال کی وجہ سے نہ دے سکی۔ انشاء اللہ اسال یہ ہفت خوان بھی طے کرے گی۔

(۴) ثریا جبیں سلمہا:۔ بے حد ذہین، سلیقہ مند لڑکی۔ احتشام بھائی مرحوم اکثر اپنے مضامین ثریا سلمہا سے لکھواتے تھے۔ کئی ایک ڈبیٹ میں اول انعام لا چکی ہے۔ بی۔اے۔ پریویس میں تعلیم پا رہی ہے۔

(۵) سید ارشد حسین سلمہٗ:۔ بی۔اے۔ پریویس میں الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے۔ نہایت بردبار، اپنے کام سے کام۔ مشینری کے کام میں کافی دخل ہے۔

(۶) سید جعفر اقبال سلمہٗ:۔ سب سے چھوٹے ہونے کے ناتے باپ کے سب سے دلارے بھی تھے اور احتشام بھائی کی بارگاہ میں کافی شوخ بھی۔ کسی قسم کا کام ہو کوئی دشواری ہو اقبال صاحب مشکل کشائی کے لیے حاضر ہیں۔

تعلیم

ابتدائی تعلیم دینیات وغیرہ اپنے پھوپھا سید محمد قاسم صاحب مرحوم کے ساتھ ان کی ملازمت پر رہ کر حاصل کی پرائمری اسکول الہ آباد دوبارہ فائنل امتحان اپنے وطن اول سے پاس کیا۔ ہائی اسکول ویسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ (جو ایک امریکن مشن کا اسکول ہے) پاس کیا اور اسکول کے سب سے زیادہ ذہین، مہذب اور خوش کردار طالب علم کے طور پر آج بھی اسکول کے ایک بورڈ پر آپ کا نام کندہ ہے۔ اسکول کے اساتذہ کو آج بھی اپنے اس فخر روزگار طالب علم پر ناز ہے۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج الہ آباد میں داخلہ لیا وہاں بھی اپنی ذہانت و لیاقت کا سکہ بٹھا کر نکلے۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ بی۔اے کا امتحان شاندار طریقہ سے پاس کر کے الہ آباد یونیورسٹی سے ہی اردو میں ایم۔اے پاس کیا صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ ساری یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے اور دو گولڈ میڈل کے حقدار بنے۔

پہلا انعام

پرائمری اسکول کے درجہ چہارم میں تھے غالباً سید اعزاز حسین صاحب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول معائنہ کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ اسکول کی دیوار سے کچھ چونے کا پلاسٹر ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا ڈپٹی صاحب نے تمام لڑکوں سے پوچھا کہ پلاسٹر اکھڑنے سے کون سی شکل بن گئی ہے بتانے والا ہاتھ اٹھائے تنہا احتشام بھائی مرحوم نے ہاتھ اٹھایا اور بتایا کہ جارج پنجم کی شکل بن گئی ہے۔ ڈپٹی صاحب نے ذہانت کی تعریف کی اور ایک قلم انعام دیا۔

شادی

۱۹۳۹ء میں آپ کی شادی ضلع لکھنؤ کے قصبہ نگرام میں سید حسن عسکری صاحب رئیس کی چھوٹی صاحبزادی ہاشمی بیگم کے ساتھ ہوئی۔ آپ کی اہلیہ سید فدا حسین صاحب کی پوتی ہیں۔ جن کا شمار اپنے زمانے کے چند مشہور و نامور وکیلوں میں تھا

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

ملازمت

ابھی تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ آپ کے چچا سید ابو محمد صاحب مرحوم آپ کو لیکر گورنر اتر پردیش سے ملے۔ انگریز حکو
سندوں اور سرٹیفکیٹوں کے ساتھ۔ مقصد تھا کہ ڈپٹی کلکٹری میں منتخب کر لیا جائے۔ گورنر نے وعدہ کر لیا لیکن کہ (غالباً) اپریل میں درخوا
اور ایک بار پھر یاد دہانی کرادیں۔ گورنر کی یقین دہانی پر جوار میں تقریباً مشہور ہو گیا تھا کہ احتشام حسین ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ وقت گذر گ
وعدے ہو گئے، لیکن ان کا نام نہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ وہ تو بعد میں ج
ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے تشریف لائے اور سید ابو محمد صاحب
کہ احتشام صاحب نے نہ تو کوئی درخواست ہی دی اور نہ گورنر سے ملنے
وہ انگریز حکومت کی نوکری نہیں کرنا چاہتے تھے
والد صاحب خاموش ہو گئے اور کوئی باز پرس احتشام
نہیں کی۔ کیونکہ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے منع فرمایا تھا۔ لیکن ا
اور کہا کہ احتشام میاں میری خواہش یہی ہے تمہیں کسی اچھے ع
لہذا اب تم کو آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے مقابلہ کا امتحان دینا ہے۔ لیکن یہ بھی سن لو کہ اگر ناکامیاب ہوئے تو اچھا نہ
میں بیٹھے۔ آئی۔ سی۔ ایس میں دوسرا اور پی۔ سی۔ ایس میں چوتھا نمبر آیا۔ یہ اردو کی تمام بدقسمتیوں کے ساتھ ساتھ ایک عظیم خوش قسم
تھی کہ اس سال آئی۔ سی۔ ایس میں ایک اور پی۔ سی۔ ایس میں صرف دو کی ضرورت تھی۔

طالب علمانہ زندگی کا آخری انعام

ایم۔ اے پاس کرنے پر آپ کو دو گولڈ میڈل ملے۔
اقبال گولڈ میڈل دوسرا جینتا منی گولڈ میڈل پہلا اردو میں
فرسٹ آنے پر دوسرا ساری یونیورسٹی میں فرسٹ آنے پر۔

ایم اے کر لینے کے بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں آپ کا تقرر بحیثیت لکچرر شعبہ اردو میں ہوا۔ یہیں پر آپ نے اپنے شعبہ کے
سے بھی کام کیا۔ ۱۹۶۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں ہیڈ آف اردو ڈپارٹمنٹ (پروفیسر) کا چارج لیا اور تا دم آخر اپنے اس منصب

احباب

حلقہ احباب: وسیع تر تھا یعنی جو بھی ایک بار ملا وہ انھیں یاد رہا اور وہ اپنا بے تکلف دوست ہی انھیں سمجھتا رہا۔
حلقہ احباب: محدود ترین تھا یعنی جسے دوست بچپن کا ساتھی راز دار ایک جان دو قالب کہا جا سکتا ہے وہ تنہا آ
سید محمد فصیح صاحب۔ ڈیوڑھی۔ ماہل۔ ضلع اعظم گڈھ۔

تخلیقات

(مطبوعہ)

۱۹۴۴ء۔ ویرانے (افسانوں کا مجموعہ) شائع ہوا۔
۱۹۴۵ء۔ تنقیدی جائزے
۱۹۴۶ء۔ روایت اور بغاوت
۱۹۴۸ء۔ ادب اور سماج
۱۹۵۲ء۔ تنقید اور عملی تنقید
۱۹۵۵ء۔ ذوقِ ادب اور شعور

۱۹۵۵ء۔ ساحل اور سمندر (سفر نامہ یورپ و امر
۱۹۵۵ء۔ اردو ساہتیہ کا اتہاس (ہندی میں لکھی گئی جس کا تر
۱۹۶۲ء۔ عکس اور آئینے
۱۹۶۳ء۔ افکار و مسائل
۱۹۶۴ء۔ اعتبارِ نظر
۱۹۶۹ء۔ اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس (

تراجم

- کالی (ڈاکٹر رادھا کرشنن)
- گنگا کی کہانی ۔ لیڈی مساکی
- سوامی وویکانند (روماں رولاں)
- سلومی (ڈرامہ) آسکر وائلڈ
- ہندستانی لسانیات کا خاکہ (مقدمہ) جان بیمز
- بادبان کھلے (رچرڈ ہیوز) اول کے جرمن

ترتیب

- تنقیدی نظریات (حصہ اول و دوم)
- انتخاب جوش
- آب حیات (تلخیص)
- سنگ گہر (انتخاب منظومات)
- ادب پارے (حصہ نظم و نثر

بچوں کے ادب سے متعلق تصانیف

- اردو کی کہانی
- احباب قاعدہ

دیگر متفرق موضوعات سے متعلق تصانیف

- شعری مجموعے "روشنی کے دریچے" زیر ترتیب
- اندھیری راتیں ۔ (ڈراما)
- ادب جدید منظر اور پس منظر (تنقیدی مضامین کا مجموعہ، زیر اشاعت)
- مرزا غالب، زندہ اور روشن احساس خلق (زیر اشاعت)
- سفرنامہ روس، (زیر اشاعت)
- اردو ادب کی تاریخ (ہندی کتاب کا ترجمہ) زیر اشاعت

تخلیقات غیر مطبوعہ زیر ترتیب

(۱) اردو ادب کی نئی تاریخ ۔ (۲) انتخاب مثنویات مع مقدمہ (۳) ڈرامے ۔ (۴) روشنی کے دریچے (شعری مجموعہ) (۵) ساحل اور سمندر (ہندی ترجمہ) ۔ اور دوسری تقریباً ایک درجن کتابیں۔

پروفیسر احتشام حسین صاحب کے متعلق قابل ذکر مضامین

(۱) ترقی پسند ادب	عزیز احمد	(۶) ادب لطیف	اویس احمد
(۲) نگار ۔ انتقادیات نمبر	حسرت نعمانی	(۷) مختصر تاریخ ادب اردو نیا ایڈیشن	ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب
(۳) نیا دور بنگلور غالب نمبر	عبادت بریلوی	(۸) تنقیدی اصول و نظریات	ڈاکٹر شارب ردولوی
(۴) نیا ادب (طویل مضمون)	ممتاز حسین	(۹) اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر محمود الحسن
(۵) تنقیدی سرمایہ	عبدالشکور	(۱۰) بازیافت	ڈاکٹر محمود الٰہی

(۱۷) نقطہ نظر — عبدالمغنی (۱۳) اردو ادب کی جدید تاریخ — نسیم قریشی

آجکل، زمانہ اور شاعر میں بعض لوگوں نے مضامین لکھے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین صاحب کے چند قابل قدر مضامین (جو ادب اور سماج کے بعد شائع ہوئے)

۱۔ شعر فہمی	سالنامہ شاعر آگرہ جنوری ۱۹۴۹ء	۷۔ تخلیقی تنقید	نئی روشنی جمہوریت نمبر جنوری ۱۹۵۰ء
۲۔ پریم چند کی ترقی پسندی	آج کل دہلی مارچ ۱۹۴۹ء	۸۔ سودا سے انقلاب تک	شاہراہ دہلی مارچ ۱۹۵۰ء
۳۔ ادب میں طنز کی جگہ	آج کل دہلی اگست ۱۹۴۹ء	۹۔ غالب کا تفکر اور اس کا پس منظر	اردو ادب علی گڑھ جولائی ۱۹۵۰ء
۴۔ حالی کا سیاسی شعور	شاہراہ دہلی اکتوبر ۱۹۴۹ء	۱۰۔ اختر شیرانی کی رومانیت	نیا ادب بمبئی و بہترین ادب ۱۹۴۳ء
۵۔ افسانے میں نفسیات	ادب لطیف افسانہ نمبر اکتوبر ۱۹۴۹ء	۱۱۔ اردو میں بچوں کا ادب	کاروان سالنامہ الہ آباد
۶۔ میں کیوں لکھتا ہوں	محاذ بمبئی فروری ۱۹۵۰ء		

رسالے جن کے احتشام نمبر شائع ہو چکے

(۱) ترنم ۔ لکھنؤ۔ (۲) آج کل ۔ دلی۔ (۳) نیا دور ۔ لکھنؤ۔ (۴) سب رس ۔ حیدر آباد۔ (۵) نقش کوکن ۔ بمبئی۔ (۶) شاہکار ۔ بنارس۔ (۷) آہنگ ۔ گیا۔

پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے زیر نگرانی پی۔ ایچ ڈی کرنے والے

لکھنؤ یونیورسٹی: (۱) ڈاکٹر بی کے ہیکروال۔ (۲) ڈاکٹر عبادت یار خاں عبادت بریلوی۔ (۳) ڈاکٹر افضال احمد (۴) ڈاکٹر عالیہ عسکری۔ (۵) ڈاکٹر اعجاز نقوی۔ (۶) ڈاکٹر شمیم نکہت۔ (۷) ڈاکٹر مسیب عباس شارب ردولوی۔ (۸) ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی۔

الہ آباد یونیورسٹی: (۱) ڈاکٹر شمیم حنفی (۲) ڈاکٹر نسیم بانو (۳) ڈاکٹر قدسیہ بیگم (۴) سید مجاور حسین نے پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی زیر نگرانی کام ختم کیا تھا لیکن ابھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں مل سکی ہے۔

مصروفیات

(۱) لکچرر، ریڈر، ہیڈ آف اردو ڈپارٹمنٹ لکھنؤ یونیورسٹی۔ (۲) پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی۔ (۳) آنریری لائبریرین الہ آباد یونیورسٹی۔ (۴) نائب صدر ہندوستانی اکیڈمی۔ (۵) ممبر ساہتیہ اکیڈمی (۶) ممبر اردو مشاورتی بورڈ ساہتیہ اکیڈمی (۷) ممبر اردو بورڈ ۔ اترپردیش۔ (۸) ممبر ہندی سمیتی ۔ اترپردیش۔ (۹) ممبر قومی یک جہتی کونسل اترپردیش۔ (۱۰) ممبر نیشنل بک ٹرسٹ۔

غیر ممالک کا سفر

امریکہ و یورپ	۱۹۵۲-۵۳ء	فیلو راک فیلر فاؤنڈیشن
سوویت روس	۱۹۶۹ء	غالب صد سالہ تقریبات

۞ ۞ ۞ ۞ ۞

آخری سفر

جمعہ، یکم دسمبر ۱۹۷۲ء صبح ۸ بجکر ۹ منٹ پر ایسا سفر اختیار کیا جس سفر سے کوئی لوٹ کے نہیں آتا ہے۔ اسی منحوس تاریخ کو ریڈیو، اخبارات، رسالے، شاعر، ادیب، نقاد، دانشور، فنکار اور صحافی پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ ایک عالم متبحر، ایک بلند مرتبت ادیب، ایک جلیل القدر نقاد، ایک نامور خطیب، ایک بیکراں مفکر، ایک عظیم نقاد جس نے اردو تنقید کو فن بنا کر پیش کیا، ایک عہد ساز شخصیت، ایک بالغ نظر معلم، ایک ماہر لسانیات، ایک منفرد شاعر، ایک بہت بڑا انسان ایک انسان دوست، ایک بلند دانشور، ایک عوام کا محبوب ادیب و ناقد جس کے علم کی ضیا اور جس کے یقین کی گرمی سے کتنوں کے شعور نے شعوری اور لاشعوری روشنی حاصل کی۔ جو اپنی تحریروں میں اور اچھے انسانوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آج اٹھ گیا۔

آہ ان آوازوں میں کون سنے کہ ایک لائق بیٹا، ایک پرخلوص شریک حیات، ایک شفقت آب باپ، ایک بہت ہی پیارا، ایک نازش خاندان، بزرگوں کا فرماں بردار، چھوٹوں کے لیے ظل عاطفت۔ دوستوں کے لیے مثالی دوست، وطن کا عظیم بیٹا، فخر، ملک کا سچا خادم بھی آج ہر ایک کو روتا۔ تڑپتا۔ کراہتا چھوڑ کر چلا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

تدفین:۔ ۲ دسمبر ۱۹۷۲ء۔ کربلائے الہ آباد۔ بوقت ۱۱ بجے دن

ادبی:۔ لکھنؤ محلہ بارود خانہ کا نام احتشام کنج (۲) الہ آباد مسس روڈ کا نام احتشام مارگ رکھا گیا۔

احتشام حسین

بقولے:۔

جناب اکبر علی خاں صاحب گورنر اتر پردیش

پروفیسر سید احتشام حسین رضوی اردو کے ایک جلیل القدر ادیب ہی نہیں ایک بڑے مفکر، مقرر، معلم اور بڑے انسان تھے۔ انہوں نے ادب کو بہت کچھ دیا اور ان کا تذکرہ اردو ادب کے ایک عظیم معمار اور فن کار کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ وہ غریب عوام کے ایک سچے [illegible] تھے۔ ان کی وفات پر جو ہندوستان گیر غم منایا گیا وہ ایک طرف ان کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف ان کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ملتا ہے۔

جناب اندر کمار گجرال صاحب وزیر اطلاعات و نشریات

پروفیسر احتشام حسین مرحوم افسانہ نویس تھے۔ شاعر تھے۔ ماہر لسانیات تھے لیکن ان کا اصل میدان تنقید تھا۔ جدید اردو تنقید کو [illegible] اور اسے ایک اعلیٰ وارفع معیار عطا کرنے میں جو اہم رول ادا کیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جتنے بڑے ادیب اور نقاد تھے اتنے ہی بڑے انسان تھے۔ ان کی شخصی ایمانداری، راست بازی اور دیانتداری ان کی تحریروں [illegible] پہنچ کر ادب کا ایک مسلک بن گئی۔

عزت مآب ڈاکٹر سید نور الحسن مرکزی وزیر تعلیمات و ثقافت

"پروفیسر احتشام حسین صاحب اردو کے ان چند ادیبوں میں ہیں جن کے نام کو اُن کی زندگی ہی میں بقائے دوام کی سند مل گئی۔ انھوں نے تنقید کو سماجی اور تاریخی شعور دیا۔ ادب اور انسان کے مضبوط رشتوں کو اجاگر کیا۔ دوسری قوموں کے ادب پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اردو کے رشتے دوسری ہندوستانی زبانوں سے مضبوط کیے، وہ اردو کے شیدائی تھے۔ اور اردو والوں نے بھی ثابت کر دیا کہ وہ بھی اُن کے شیدائی ہیں"

علامہ عبد الماجد دریابادی

"اردو پر جو مخلص آج اپنا جی جان قربان کیے ہوئے ہیں اور اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں ان میں کوئی احتشام سے بڑھ کر تو خیر اور کیا ہوتا۔ کوئی ان کے برابر کا، ان کی ٹکر کا مل آئے یہی بڑی بات ہے۔
تنقید بحیثیت فن کے "دورِ احتشامی" سے قبل اردو میں کہاں آئی تھی۔۔ اردو کا مورخ ادب اس موضوع پر جب قلم اٹھائے گا اور اس فن کے بانیوں میں جن کا نام گنائے گا، اردو والوں میں نام اس عالی شان والا احتشام کا ضرور آئے گا"

سید سجاد ظہیر مرحوم

گذشتہ تیس سال تک انھوں نے ہمارے ادبی شعور اور فہم کی جو لاجواب تربیت کی اُسے اردو ادب کی تاریخ میں ایک مستقل اور پائدار جگہ ملے گی۔ احتشام حسین کے چھوڑے ہوئے اس ورثہ کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب الٰہ آباد

"احتشام حسین دسواں درجہ وسیلی ہائی اسکول سے پاس کر کے مزید تعلیم کے لیے الٰہ آباد آ گئے۔ ایم۔ اے تک کی تعلیم میں حاصل کی ہر امتحان خواہ اسکول کا ہو یا کالج و یونیورسٹی کا وہ اول درجہ میں پاس کرتے رہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں لکچرر ہو گئے۔ وہاں سے اپنی قابلیت کا سکہ تحریر و تقریر کے ذریعہ سے رواں کرتے رہے، سنہ ۱۹۵۲ء میں امریکہ کی ایک انجمن نے موصوف کو لکچر دینے کی دعوت دی جہاں تقریباً سال بھر رہ کر انھوں نے ایک دنیا کو متاثر کیا۔ امریکہ سے لوٹتے وقت انگلستان و فرانس کی بھی سیر کی۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر و صدر منتخب ہو گئے۔
اردو تنقید نگاروں میں احتشام حسین اُن چند مخصوص صاحب النظر اہلِ قلم میں ہیں جنھوں نے باوجود مغربی اندازِ فکر سے متاثر و مستفید ہونے پر بھی اس کا ہر قدم پر خیال رکھا کہ اردو ادب مشرقی مزاج کا پروردہ ہے۔ ایسے حالات کافی ہیں جہاں پر نقاد کو رک کر مغربی عینک اتار لینی پڑتی ہے۔ اور ادب و فکر کا جائزہ مشرق کی روشنی میں لینا پڑتا ہے"

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی

احتشام صاحب اپنی تحریروں و تقریروں سے علمی دنیا میں روز افزوں ناموری حاصل کرتے رہے۔ اور اُن کے حسنِ اخلاق سے ان کے دوستوں اور قدر شناسوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ عصرِ حاضر کے سب سے زیادہ مقبول سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ ہر دلعزیز دانشور ہو گئے۔

جناب فراقؔ گورکھپوری

اس دور میں عالمانہ تنقید کی تاریخ کبھی مکمل نہیں ہو گی بغیر اُن کے کارناموں کا جائزہ لیے ہوئے .... احتشام کی تنقیدیں مجھے لینن کی تنقیدوں کی یاد دلاتی ہیں۔

بابو رام سکسینہ (وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی)

ایسا ودوان اپنے مضمون کا پایا یوں کہیں کہ تمام بھارتیہ ساہتیہ کا بھارتیہ ادب کا ملنا مشکل ہے۔

امرت لال ناگر

ہندی اردو کے پرکانڈ ودوان، دونوں شیلیوں کے اوپر اُن کا ایسا سمان ادھیکار تھا کہ بہت کم ہی لوگ ملتے ہیں۔

امرت رائے

بحیثیت ایک نقاد کے ان کی اردو ادب میں وہ جگہ ہے جو کہ غالباً کسی اور ناقد کی نہیں ہے۔

ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی (نائب صدر یو پی جن سنگھ)

"میں نے ہمیشہ ان کو پرسکون متوازن اور سنجیدہ پایا۔ کوئی دوسرا آدمی ان حالات میں ان کی طرح نہیں رہ سکتا تھا۔ اساتذہ کی حالت کے سدھار کے بارے میں ان کی رائے ہمیشہ نپی تلی۔ اُن کی تجویزیں بہت ہی مفید اور قابلِ قبول ہوئیں۔"

ڈاکٹر رگھو ونش پروفیسر شعبۂ ہندی الہ آباد یونیورسٹی

"احتشام صاحب اُن لوگوں میں تھے جن سے مل کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سچے ہمدرد اور ہم سے محبت کرنے والے ہیں۔ اُن سے برابر نئی تحریک ملتی رہی۔ میں نے ان کی گفتگو سے اکثر یہ محسوس کیا کہ وہ ہندی ادب اور اردو ادب پر یکساں عبور رکھتے تھے۔"

حضرت شمیم کرہانی

الطریقۃ نقد و نظر کا امام ہے   جس کے لیے فنا نہیں وہ احتشام ہے

علی جواد زیدی

وہ سیاست اور ادب کے معاملے میں راسخ العقیدہ تھے لیکن متعصب نہیں تھے۔ ان کا شمار مذہبی لوگوں میں نہیں کیا جاسکتا لیکن مذہبی حلقوں میں وہ سب سے گوارا ترقی پسند تھے۔

دوستوں کے دوست بلکہ سیاسی مخالف اور دنیاوی رقیب بھی ان سے گھر والوں کی طرح ملنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ احتشام کو ملنے کا کوئی اور طریقہ معلوم ہی نہ تھا۔

ڈاکٹر چیلاشیف

جب شہر میں احتشام حسین جیسا آدمی موجود ہو تو —— آپ جانئے ادبی جرم ہے اُن کے در سخن نہ کرنا اس قدر متوازن رائے رکھتے ہیں وہ کہ اُن کی رائے سن کر معاملات کی تہ تک پہونچنا آسان ہو جاتا ہے۔

ظ۔ انصاری

آپ کو کیا خبر احتشام صاحب! ہندوستانی ادبیات کا مطالعہ کرنے والے روسیوں کے دل میں آپ کا کتنا احترام ہے۔ قدر جنوں صفا آپ کے چراغ سے چراغ جلا کر گئے۔

ڈاکٹر محمد حسن

احتشام صاحب کی ذات ہر قسم کے شور سے پاک تھی نمود اور نمائش سے دور، ایک خاموش دردمندی ان کی شخصیت میں اتنی تھی جس میں ش اپنے علاوہ سبھی کے لیے ہمدردی اور دلسوزی موجود تھی۔ ان کی ذاتی انجمنوں میں وہ خود شریک ہو جاتے مشورے دیتے۔ گفتگو کرتے، حقیقت یہ ہ کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اپنے شاگردوں ہی کی نذر کر دیا۔ جو کچھ سیکھا تھا اس کے عشر عشیر کا بھی اظہار نہ ہو پایا۔ مگر جو کچھ ہوا وہ ا تحریروں سے زیادہ ان کے کلاس روم لکچروں میں ہوا۔ وہاں وہ ایک شعر کا مطلب سمجھاتے سمجھاتے دور نکل جاتے۔ ایسا لگتا جیسے علم ایک وحد ہے اور ادب پوری آگہی کا ایک ٹکڑا۔ یہیں سے لوگ مطالعہ کا شوق لے کر جاتے، اظہار کی طلب پاتے اور یہیں سے علمی زندگی کا حوصلہ ملتا تھا۔

پروفیسر آل احمد سرور

احتشام اپنے مطالعے کی وسعت، علمی تقشف، اور سنجیدہ اور گہری نظر کے لیے ہم چشموں میں ممتاز تھے۔

پروفیسر کرامت علی کرامت

احتشام صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر سے ہر پُرانا اور ہر نیا ادیب مضمحل اور افسردہ ہے۔ ہر شخص کا ذہن تاثرات اور خیال ہو کہ وہ گ ایک دوسرے کو جو بھی خط لکھتا ہے، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے اس میں مرحوم کی خوبیوں کا والہانہ ذکر ہوتا ہے۔ کوئی احتشام صاحب کی عبادت اور ریاضت کا ذکر کرتا ہے تو کوئی اُن کی سادگی اور انکساری کا۔ کوئی ان کی انسانیت دوستی کا ذکر کرتا ہے تو کوئی ان کی اردو تحریک

...ا کشمیر اور پنجاب سے لیکر میسور اور مدراس تک اور بنگال اور اڑیسہ سے لیکر گجرات اور مہاراشٹر تک کہاں مرحوم کی یاد میں جلسے نہیں ہوئے؟
...نسو نہیں بہائے گئے۔ چاروں طرف صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔
"احتشام حسین دلوں میں گھر کر نا تو کیا دلوں پر حکومت کر رہے تھے۔ سیاست داں یا سائنس داں کی وفات پر ماتم کرنے والوں کا دور فوراً
...تا ہے لیکن احتشام حسین جیسے بلند پایہ ادیب اور بلند کردار شخصیت کی موت پر رونے والے انسان ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے۔

...ت الاکرام صاحب

دنیائے ادب ایک عہد ساز شخصیت سے محروم ہو گئی۔

...م قریشی صاحب علی گڑھ

...ان کا سفر نامہ ساحل اور سمندر اردو سفر ناموں کے ذخیرہ میں کوہ نور کی طرح جگمگا رہا ہے تنہا یہ سفر نامہ بتا رہا ہے کہ اس کا لکھنے
...ا قدر زندہ اور روشن ذہن رکھتا ہے۔

...ر وحید اختر

احتشام صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کام سے یونیورسٹیوں کے اس جھوٹے معیار علم اور مصنوعی بلندی کو جھٹلا دیا۔ یہی وجہ ہے
...ں، جن کی نظر میں عہدہ ہی سب کچھ ہے، ان کا احترام کرنے پر مجبور ہوئے۔ جب انھیں پروفیسر شپ ملی تو اس منصب سے ان کا اعزاز تو
...تا۔ البتہ یہ منصب، صاحبان نظر کی نگاہ میں معزز و محترم ہو گیا۔ اور اس منصب کی گرتی ہوئی ساکھ کو کچھ دن کے لیے سہارا مل گیا۔ ادب
...احتشام صاحب کی وسعت مطالعہ ذوق اور عارفانہ نظر اپنی مثال تھی ہی، یونیورسٹیوں کے تعلیمی نظام اور معیار کو بھی ان کی شخصیت نے
...یسے معیار سے آشنا کیا جس پر پورا اترنا منصب کوشوں کے لیے بھاری پتھر ہے۔ اور جن کے تقاضوں کی تکمیل اتنی دشوار ہے کہ ان سے
...ر ان کے بعد بہت کم اس معیار کو چھو سکتے ہیں۔

...ر مسیح الزماں

پڑھنا، پڑھنا، مدام پڑھنا۔ احتشام صاحب کا معمول معلوم ہوتا تھا۔ ادب پر ہو یا معاشیات پر، تاریخ، سیاسیات، نفسیات، تعلیم، انگریزی، اردو
...فارسی کوئی زبان ہو کوئی موضوع ہو کتاب ملتی اور وہ پڑھنے میں لگ جاتے۔ قوت حافظہ اتنی زبردست تھی کہ بیشتر باتیں یاد رکھتے۔ اور جب
...ت کے لوگوں سے گفتگو کرتے تو اسی کے ماہر نظر آتے۔ جمالیات، فلسفہ، نفسیات، سماجیات سب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ہندی کے ادیبوں
...ری والے معلوم ہوتے تھے۔ انگریزی کے ماہرین میں انگریزی ادب کے پروفیسر دکھائی دیتے تھے۔

...سل مظہری

احتشام آہ! وہ انسان کی سیرت جس کی — حرف شائستگی، لفظ وفا کا مفہوم
عارف نغمۂ سخن، مالک فن، سالکِ فن — خادمِ دانش و دیں، اہل ادب کا مخدوم

ڈاکٹر شارب ردولوی

احتشام حسین اردو تنقید کا ذہن تھے، جو فکر اور فلسفیانہ گہرائی انھوں نے تنقید کو دی اس سے اردو تنقید کا دامن یکسر خالی تھا۔ انھوں نے فلسفیانہ فکر و فن کی معراج پر پہنچایا۔ وہ اردو کے پہلے نقاد تھے جنھوں نے سماجی نقطۂ نظر کو انتہا پسندی اور افراط و تفریط کے الزام سے بچایا۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی

ایک دوسری حیثیت سے بھی میں آپ کو (احتشام حسین کو) جوان بخت سمجھتا ہوں۔ اور وہ حیثیت ہے آپ کی غیر معمولی ذہانت۔

ذہانت کی ایسی قسم بھی ہے جو بطن عبادت سے پیدا ہوتی ہے جس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ وہ ذہانت جو اصیل و نجیب الطرفین ہوتی ہے وہ ایک ایسی دولت بیدار ہے، کرۂ ارض پر جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ جس کو میں الٹی ترتیب، یعنی قسم سوم، قسم دوم، قسم اول سے بیان کروں گا۔ قسم سوم کی ذہانت کا آلۂ کار "مٹھی" ہوتی ہے جو صرف موٹے موٹے رموز و نکات کو اٹھا سکتی ہے۔

قسم دوم کی ذہانت کا آلۂ کار "چٹکی" ہوتی ہے، جو باریک نکات کو بھی اٹھا لیتی ہے اور قسم اول کی ذہانت کا آلۂ کار "ناخن" ہوتا ہے جو باریک سے باریک اور باریک سے باریک، بلکہ باریک ترین رموز و نکات تک کو بآسانی چن لیتا ہے۔ اور آپ اس لحاظ سے بھی شایان مبارکباد ہیں کہ "قوت و حیات" نے آپ کو اس درجۂ اول کی ذہانت کا شرف و حق بھی عطا فرمایا ہے۔

سید شبیہ الحسن نونہروی

"احتشام صاحب کے ایسے شریف، مہذب اور معتدل انسان میں نے زندگی میں شاذ و نادر ہی دیکھے ہیں۔ اس دعوے میں نہ تو مبالغہ ہے نہ انکسار، جو لوگ ان سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ بلا تکلف اس کی تصدیق کریں گے۔"

"انھیں معلومات کا دائرۃ المعارف کہنا حق بجانب ہے۔ تازہ ترین کتابوں، اہم مصنفین، مسائل اور تحریکات کے متعلق خواہ ان کا تعلق دنیا کے کسی گوشہ سے ہو ان کی واقفیت اکثر تحیر کا باعث ہوتی تھی۔"

ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی

اردو ادب میں تنقیدی شعور کو صحیح اور مکمل شکل میں پیش کرنے والوں میں احتشام حسین کا نام سب سے زیادہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی نمایاں صلاحیتوں میں، جہاں بہت سے عناصر کا ہاتھ رہا وہاں یہ چیز بھی اہمیت رکھتی ہے کہ تنقید کی راہ پر گامزن ہونے سے پہلے انھوں نے شعر کی دیوی کے سامنے عقیدت کے جو پھول چڑھائے تھے اس نے ان کی تنقید میں اعتدال پسندی کے ساتھ ساتھ تخلیق کی وہ کیفیت پیدا کر دی جو دنیا کے بہت کم نقادوں کو حاصل ہو سکتی۔

گل پیٹرک ـــــــ نمائندہ راک فیلر فاؤنڈیشن

جب گل پیٹرک صاحب ہندوستان آئے انھوں نے ڈی پی مکرجی صاحب سے کہا کہ مجھے ایشیا سے ایک ایسے دانشور کی تلاش ہے جسے راک فیلر فاؤنڈیشن کی طرف سے امریکہ بھیج سکوں۔ ڈی۔ پی مکرجی نے کہا کہ میری نظر میں ایک شخص احتشام حسین صاحب ہیں جو آپ کے گوں کے ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ ملئے۔ ڈی پی مکرجی صاحب نے ملاقات کی تاریخ مقرر کی۔ پہلے دن نہیں جا سکے اس کی تفصیل ساحل و سمندر میں پڑھی جا سکتی ہے۔ بہرحال ملاقات کے بعد جب گل پیٹرک کے اصرار پر بھی صاف صاف وعدہ نہیں کیا تو گل پیٹرک صاحب نے دوسرے دن ڈی پی مکرجی صاحب سے کہا "احتشام صاحب بھی عجیب انسان ہیں اس اسکالرشپ کو حاصل کرنے کے لیے دوسرے مجھ سے خوشامد کرتے ہیں اور میں لینے کے لئے ان سے خوشامد کر رہا ہوں۔ مکرجی صاحب! انھیں تیار کیجئے۔ میں نے ایک گھنٹہ کی گفتگو میں جو اُن سے سیکھا ہے میں ایک سال کتابیں پڑھ کر وہ حاصل کر سکتا تھا۔"

اقتباسات

"سائنٹفک نقطۂ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے یہ ایک ہمہ گیر نقطۂ نظر ہے اور ادبی مطالعہ کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔"

"وقت کے ساتھ ساتھ میرا خیال پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ اعلیٰ ادب و اعلیٰ تنقید کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن، اور توانائی کو سمجھنے اور اُسے ابھارنے میں مدد ملتی ہے، اس طرح عوام کا رشتہ، عوامی جد و جہد کرنے والی طاقتوں سے مضبوط ہوتا ہے۔ زندگی ادب کو سنبھالتی ہے اور ادب زندگی کو سہارا دے کر آگے بڑھاتا ہے۔ اچھے ادب کے مطالعے سے انسان کا سماجی شعور بڑھتا ہے، اور وہ سماج کو بہتر بنانے اور فطرت کو اپنے قابو میں لانے کا اہل بن جاتا ہے۔ اگر کوئی ادبی کارنامہ یہ کام پورا نہیں کرتا، اس میں مدد نہیں دیتا، تو صرف ان لوگوں کی نگاہ میں ادب ہوگا جو زندگی کو بہتر بنانے کے متمنی نہیں ہیں۔"

"ادب مقصد نہیں ذریعہ ہے، ساکن نہیں متحرک ہے، جامد نہیں تغیر پذیر ہے، اسے تنقید کے چند فرسودہ اصولوں اور نظریوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ ہی کام آ سکتا ہے جس کی بنیاد تاریخ کے مادی۔ ترجمانی اور ارتقار بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔"

"میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے ہیں۔ اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں۔"

"نقاد کسی طرح بھی آنکھیں بند کر کے کیفیات اور محسوسات کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ نقاد کی اپنی نظر، اس کی اپنی بصیرت اس کے نقد کو تخلیقی بنا سکتی ہے یہ اپنی نظر ہی نقاد کا وہ حربہ ہے جسے الگ رکھ کر وہ نقاد باقی نہیں رہ سکتا۔"

"جب حیات و کائنات کا تصور بدلتا ہے، جب زندہ رہنے اور مرنے کا مقصد بدلتا ہے تو نیا انسان وجود میں آتا ہے۔ نیا ذہن پیدا ہوتا ہے اور نئے تخلیقی کارنامے جنم لیتے ہیں۔"

"اگر تنقید کوئی علمی کام ہے، اور محض تصورات کا بیان نہیں ہے تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا جن سے زندگی اور ادب کو سمجھا جا سکتا ہے۔"

"سماجی کشمکش سے پیدا ہونے والے ادب کا جتنا ذخیرہ اردو میں فراہم ہو گیا ہے اتنا شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔"

"کسی عہد کے تمام ادیب شعور کی ایک ہی سطح پر نہیں ہو سکتے۔ ذہنوں پر خاندانی، طبقاتی اور سماجی ورثوں کا بوجھ ہوتا ہے جسے زندگی کی کشمکش کو سمجھے بغیر اتار پھینکنا تقریباً ناممکن ہے۔"

"یہ درست ہے کہ رونے سے یا اظہار غم کرنے سے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ لیکن احساس کی لطافت اور شدت، انسانی رشتوں کی نزاکت اور طاقت، سماجی روابط کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔"

"تنہائی پسندی اور اس کی تبلیغ درحقیقت دوسرے انسانوں سے نفرت کی ایک معکوس اور بگڑی ہوئی شکل ہے اس کا قابل پرستش قرار دیا جانا انسان کی تذلیل ہے۔ یہ ایک خاص گروہ کا سماجی اور شعوری احساس اور بعض حالات میں اپنے اوپر طاری کیا ہوا احساس ہے۔"

"اگر اس بات کو سقراط کی نقل پر محمول نہ کیا جائے۔ تو یقیناً میرے دل سے بھی بار بار یہی آواز آتی ہے کہ میں صرف یہ ایک بات جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ بس سقراط میں اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد یہ کہتا تھا اور میں کچھ نہ جانتے ہوئے یہ کہتا ہوں۔ اور دلی نہیں۔ پھر سقراط اپنی لاعلمی کا اظہار کر کے بڑے بڑے عالموں اور جیدوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ جاہل ہیں اور اپنی جہالت کا احساس نہیں رکھتے۔ مجھ میں یہ صلاحیت بھی نہیں ہے کہ دوسروں کو ان کی جہالت ہی کا احساس کرا دوں۔"

"احساسِ حسن کا مرکز عقل ہے یا تخیل کا جذبہ ہے یا علم؟ یہ طے ہو جائے تو فلسفۂ جمالیات کی سائنٹفک توجیہ کی جا سکتی ہے۔"

"مرنے والے کے ساتھ تم یہ کر سکتے ہو کہ اس کی صداقت کو پھیلاتے رہو جس سے اُن کے خیال روشن تھے۔ یقین کی وہ گرمی پیدا کرو ے اُن کے سینے منور تھے۔"

"رنج مجھے بے حد رنجیدہ کر دیتا ہے اور خوشیاں زیادہ خوش نہیں کرتیں۔"

"میں یا تو بے حس ہوں یا پھر اپنے جذبات پر کسی قدر قابو رکھتا ہوں کیونکہ نہ تو لوگوں کی تعریفیں مجھے زیادہ مدہوش بناتی ہیں اور یاں اور عیب جوئیاں مجھے بہت زیادہ تکلیف پہنچاتی ہیں۔"

"میں جس زبان میں لکھتا ہوں وہ اردو ہے، جسے بیسویں صدی کی ابتدا تک ملک کی عام زبان کی حیثیت حاصل تھی لیکن حالات اس قدر بدلے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاست نے وہ ابتری پھیلائی ہے کہ ہندوستان میں اس کی زندگی مشکل ہو رہی ہے تاہم یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں موجود ہے۔ اور اب بھی پیدا ہو رہا ہے اور میں اس کی حیثیت منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

"میری خاندانی زندگی بھی کچھ اس قسم کی رہی ہے کہ اپنے متعلقین سے اور وہ سب مجھ سے بہت زیادہ وابستہ ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہ اگر میں نہ رہوں تو شاید ان لوگوں کو تکلیف ہو۔"

"مرنا تو سبھی کو ہے لیکن افراد مرتے ہیں تاریخ نہیں مرتی۔"

تھا محبت میں وہ بھی دور کبھی　　　رات دن چاندنی برستی تھی
گرچہ ہر لمحہ وقفِ عشرت تھا　　　زندگی وقت کو ترستی تھی　　　تغیر ۱۹۳۷ء

چاند پر ہے ابر ہلکا سا　　　یا امیدوں پہ یاس کا سایہ　　　احساسِ تنہائی ۱۹۳۶ء

آج بیداری بھی میری نیند سے شرما گئی　　　تو جھجکتی مسکراتی غمکدے میں آ گئی
چھپ کے مجھ سے مل رہی ہو اس قرینے کے نثار　　　خواب میں آنے کے اور تسکین دینے کے نثار
لب تک آ کر سارے شکوے دل کے زائل ہو گئے　　　تیرے بازو میری گردن میں حائل ہو گئے
مل گئے چھوٹے ہوئے وہ تشنہ کامانِ وفا　　　"خواب میں آنیوالی سے"
عشق کی تاریک دنیا میں اجالا ہو گیا　　　۱۹۳۷ء

میں نے بھی محبت کی ہے مگر اس وقت نہ اس کا ذکر کرو　　　وہ تنہا میرا غم ہے اسے تنہا مجھکو ہی اٹھانے دو　　　"بیماری کی خبر" ۱۹۴۳ء

وہ موافق ہو گئی تقدیر بھی تدبیر بھی　　　خواب آزادی کی پوری ہو گئی تعبیر بھی
مٹ گئے یکسر غلامی کے سب آئینِ کہن　　　میرے ہی دستِ قوی سے نکلا ارمانِ وطن
دل میں ایسا جوش جیسے آگ سے شعلے اٹھے　　　وہ مسرت تھی کہ میرے دست و پا تھرّا اٹھے
ناگہاں زنجیر کی جھنکار نے چونکا دیا　　　قید سے باہر نہیں ہوں یہ مجھے بتلا دیا

"قیدی عالمِ تنہائی میں" ۱۹۳۶ء

ہائے جب تک عالمِ تخئیل یوں آباد تھا
اُتنے لمحوں کے لیے میرا وطن آزاد تھا

"آج اور کل" ۱۹۳۶ء

جس کا خیال وجہِ سکون و قرار تھا — اللہ اس کو دل سے بھلانا پڑا ہے آج
کل روشنی تھی آج اندھیرے کا دور ہے — لیکن جیوں گا میں کہ ابھی کل اک اور ہے

غزلیں:

کل تو غیر ان کی یاد آئی تھی — آج کیوں ہے فضا اداس اداس
تلخ ہے پر عزیز ہے کتنی — ہائے رے تلخ زندگی کی مٹھاس

وہ راہ جس پہ کئی بار بچھ چکیں لاشیں — اسی پہ روز نئے کارواں نکلتے ہیں
تری نگاہ جگاتی ہے شوق کا جادو — جو اک چراغ بجھے سو چراغ جلتے ہیں

یہ بھی کونین کو سنبھالے ہیں — میری دیوانگی شباب ترا
مسکرا کر آ گئے وہ سامنے — اپنی بیتابی پہ شرمانا پڑا
جو لرزتا ہو خوفِ طوفاں سے — کون ایسے کو ناخدا مانے

کچھ ایسی ہی گذری ہے کہ خوں ہو گیا دل بھی — آنکھوں کو لہو رونے کا ارماں تو نہیں ہے
روشن نہ سہی صبحِ وطن اے دلِ پُرشوق — بے رونقیٔ شامِ غریباں تو نہیں ہے
اے ضبط جو کر دیتا ہے زخمی دل و جاں کو — چہرے سے مرے غم وہ نمایاں تو نہیں ہے
کیا جانیے کب راہ پہ لے آئے انھیں بھی — میرے ہی لیے گردشِ دوراں تو نہیں ہے

پوچھا کسی نے غیر سے حالِ مریضِ غم — ہوتی تھی جتنی آہ میں تاثیر ہو چکی

ان کی جبیں پہ بھی عرقِ انفعال ہے — شاید یہی جنونِ وفا کا مآل ہے
تاریکیوں میں رات کی جیسے وہ آ گئے — کتنا سکوں نواز فریبِ خیال ہے
یہ حسن ہی نہیں ہے جو تنہا سنور گیا — عشقِ نظارہ جو بھی شریکِ جمال ہے

محفلِ دوست میں گو سینہ فگار آئے ہیں — صورتِ نغمہ بانداز بہار آئے ہیں
ایک پندارِ خودی جس کو بچا رکھا تھا — آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں
اپنے انجام سے خوش، اپنی وفا پر نازاں — مسکراتے ہوئے ہم جانبِ دار آئے ہیں

اے دوست میکدے میں یہ کیسی ہوا چلی — سب فتنہ ہائے دیر و حرم یاد آ گئے
اب کیا دکھا رہا ہے رہِ ماہ و کہکشاں — تا صبح کس کے نقشِ قدم یاد آ گئے

قصیدہ:

اندھیرا خوفناکا عجب پُرہول منظر ہے — شبِ تاریک ہے یا اُن کے عاشق کا مقدر ہے
ستارے کچھ چمکتے ہیں مگر تاریک ہے دنیا — عروسِ دہر کے چاروں طرف کالی سی چادر ہے
فریبِ وہم غم انگیز تصویریں بناتا ہے — درختوں کی قطاریں ہیں کہ اک دیوؤں کا لشکر ہے
انھیں تاریکیوں میں بسر ہوں سکے کام سنتے ہیں — یہ کالی رات وحشت زا بلاؤں کے لیے گھر ہے
انھیں تاریکیوں میں یکسر و بیکس جگمگاتی ہیں — سیاہی شب کی ان کو روزِ روشن کے برابر ہے

انھیں تاریکیوں میں مہوشوں کے دل دھڑکتے ہیں
ڈراتا ہے تو ہم بند گو چشمِ فسوں گر ہے

انھیں تاریکیوں میں ان کی زلفیں یاد آتی ہیں
شبِ تاریک یا مارِ سیہ کا اک سمندر ہے

انھیں تاریکیوں میں درد سا اٹھتا ہے سینے میں
وہ یاد آتے ہیں گو دل لاکھ ایسے غم کا خوگر ہے

انھیں تاریکیوں میں راستہ رہرو نہیں پاتے
گھنا جنگل ہے کوئی روشنی ہے اور نہ رہبر ہے

انھیں تاریکیوں میں عشق کی چوٹیں ابھرتی ہیں
ہر اک لمحہ حیاتِ تلخیں کا سنگ در بر ہے

مگر کیا دیر تک ایسی ہی حالت رہنے والی ہے
فضا تبدیلِ ہیئت کے لیے در پردہ مضطر ہے

سیہ بادل کے پیچھے بجلیوں کا بھی خزانہ ہے
شمیم طرّۂ محبوب بھی دوشِ صبا پر ہے

شبِ تاریک کتنی جا رہی ہے اپنا افسانہ
ستاروں کی طبیعت نیند سے لیکن مکدر ہے

بہت سے سو چکے ہے کچھ پہ افسوں خواب کا طاری
ابھی خود دیکھ لوگے انجمن کا حال ابتر ہے

کوئی بیدار ہونے پر تو کوئی خواب پر مائل
یہی تقدیرِ عالم ہے یہی ہستی کا چکر ہے

ابھی دم بھر میں ٹوٹے گا طلسمِ قطرۂ شبنم
جسے قطرہ سمجھتے ہو، نہ قطرہ ہے نہ گوہر ہے

اٹھا دی آنکھ مشرق نے وہ سرکا گوشۂ چادر
کسی رنگیں قبا کا منتظر، سارا یہ منظر ہے

جسے کہتے ہیں انجم اصل میں موہوم نقطہ ہے
یہ اک خالِ منور رات کی کالی جبیں پر ہے

بھرم کھلنے ہی والا ہے ضیائے ماہ و اختر کا
فرازِ چرخ پر اب آمدِ خورشیدِ خاور ہے

حدیثِ حُسن تھوڑی دیر میں، غنچہ سنائے گا
ابھی بلبل کی پوری داستانِ عشق ازبر ہے

ابل آیا سرِ مشرق یکایک نور کا چشمہ
نگاہ آتشیں رخسار اک بامِ فلک پر ہے

وہ اپنی ناؤ کو ظلمات میں کھیتا ہوا آیا
نمازِ صبح بیداریِ انساں کا جو مظہر ہے

ادھر آؤ مزاجِ رنگ و بو پہچاننے والو
درختوں کے لباسِ سبز پر پھولوں کا زیور ہے

وہ پہلی ہی کرن نے لے لیا کہسار کا بوسہ
یہیں دستِ وفا کو حسن کا دامن میسر ہے

ہوئے جاتے ہیں اب ہم رنگ حسن و عشق کے جلوے
دلِ بلبل کا دھوکا ہو وہ شکلِ غنچۂ تر ہے

گلوں کا مسکرانا اور وہ پودوں کی لچک رہی
چمن نغمہ مجسم ہے کہ دوشیزہ کا پیکر ہے

وہ بلبل کی ادا اس میں بھی پنہاں نغمۂ عشرت
حدودِ صبح سے ہر طرح کی تکلیف باہر ہے

حسین آنکھوں کی وقتِ صبح کچھ پوچھو کیفیت
یہ آنکھیں ہیں کہ جامِ بادۂ گل رنگ احمر ہے

کھلے غنچے کسی معصوم بچے کی ہنسی جیسے
نسیمِ صبح چلتی ہے کہ رقصاں موجِ کوثر ہے

طالب علمی کے زمانے کے "ایک قصیدہ کی تشبیب"

(بذلہ سنجی)

پروفیسر احتشام حسین صاحب نے فرمایا:۔ کرامت صاحب اُردو میں لکھتے رہتے ہیں اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ اردو ڈیپارٹمنٹ کے ہیں اس لیے انھیں لوگوں نے اردو ٹیچرس کانفرنس میں دعوت دی تھی۔

کرامت علی کرامت:۔ میں تو صرف آپ حضرات سے ملنے کی خواہش میں چلا آیا۔

گیان چند جین:۔ کیوں بھائی ہم لوگوں میں کیا خوبی ہے کہ آپ نے اتنی دور اڑیسہ سے کشمیر تک آکر ہمیں دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائی اتنے پیسے میں تو بمبئی جاکر کسی ایکٹریس سے مل سکتے تھے۔

پروفیسر احتشام حسین:۔ کرامت صاحب بیوی بچے والے آدمی ہیں ایکٹریس سے مل کر کیا کریں گے۔

حیدرآباد میں پروفیسر احتشام حسین اور سہیل عظیم آبادی ایک ہی کمرے میں مقیم تھے صبح صبح کوئی محترمہ آگئیں اور احتشام صاحب کو اپنی کوئی تخلیق سنانے لگیں گھنٹوں ہوگئے، لیکن نہ مضمون ختم ہوتا نہ محترمہ تھکتیں۔ اور سہیل صاحب وغیرہ بور ہورہے تھے۔ کوئی صاحب آگئے تو سہیل صاحب کو موقع ملا اُن کے ساتھ کسی سے ملنے چلے گئے۔ واپس آئے، تو ابھی پردے پر وہی سین تھا محترمہ سنا رہی تھیں احتشام صاحب سن رہے تھے۔ بڑی کوششوں کے بعد محترمہ صبح آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوئیں۔

سہیل صاحب یا اُن کے ساتھی نے کہا:۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

احتشام بھائی نے کہا:۔ لیکن یہ تو بتائیے۔ یہ محترمہ تھیں کون؟

دانش محل میں پروفیسر احتشام حسین اور دوسرے کئی ایک حضرات موجود تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میر انیس کے مقابلے میں مرزا دبیر صاحب کچھ نہیں تھے۔

احتشام صاحب نے کہا۔ ارے بھائی "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" کتنا شاندار مصرع مرزا صاحب نے کہا ہے۔ انھوں نے کہا۔ دو ایک مصرعوں سے کیا ہوتا ہے انھوں نے تو یہ مصرع بھی کہا ہے۔ "فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں" جو ایک بچہ بھی نہ لکھے گا۔ احتشام صاحب نے کہا ارے بھائی یہ اُن کا مصرع نہیں ہے اضافی ہے۔ وہ نہیں مانے مخالفت میں بولتے رہے۔

احتشام صاحب نے فرمایا۔ ارے جناب اردو والوں کو مرزا دبیر کا احسان ماننا چاہئے کہ انھوں نے اردو شاعری میں "بریکٹ" کا استعمال ایجاد کیا۔ یعنی "فرمایا میں حسین بریکٹ میں (علیہ السلام) ہوں۔ سب ہنس دیے اور وہ صاحب منھ کھولے ہوئے احتشام صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔

یاد احتشام

آپ کی فرمائش کی تعمیل کے لیے ذوقت کس کے گھر سے لاؤں، اور شدید ضعف بصر کی حالت میں مضمون کیسے قلمبند کروں، جب اپنے ہی کام کس مشکل سے بس لشتم پشتم ہی نپٹے جاتے ہیں۔ یوں بھی ان کے علمی خدمات اور فنی کمالات پر آپ کو لکھنے والے بہت مل جائیں گے۔ مجھے تو صرف ان کی شخصیت سے متعلق جو ذاتی تجربے ہیں، انھیں چند مختصر لفظوں میں لکھے دیتا ہوں۔

وہ مجھ سے بہت جونیئر تھے، اور پہلی بات یہ ہے کہ اپنے کو جونیر سمجھتے بھی تھے، یہ بات معمولی نہیں، غیر معمولی ہے، اور محض صفت ام الصفات ہے۔ چھوٹا آج اپنے کو کون سمجھتا ہے۔ ہر ایک اپنے کو بڑا ہی سمجھتا ہے۔ یہ ان کا اپنے کو چھوٹا سمجھنا ہی، دلیل اور بڑی دلیل ی بڑائی کی ہے، مجھ سے جب ملتے، چاہے جلوت ہو یا خلوت، یہ معلوم ہوتا کہ کوئی میرا خورد، بلکہ ادنا شاگرد مجھ سے مل رہا ہے، نکہ یہ ان کی شہرت کا زمانہ تھا۔

ایک دفعہ ریڈیو والوں نے مجھ سے انٹرویو لینے کی خدمت ان کے سپرد کر دی۔ میرا ایک آدھ جواب ایسا تھا، جس سے ان کی ت نہیں نکل سکتی تھی، ریڈیو والوں نے جھٹ اس پر اعتراض کیا۔ بات پکڑ لی۔ لیکن وہ خود اس کی تائید تو کیا کرتے، خاموش رفدار بھی نہ رہے، اُلٹے میری حمایت اور وکالت ہی کر دی۔

گفتگو میں علاوہ ادبیات کے سیاسیات پر اور نہ سیاسیات پر بھی چل نکلتی۔ ان کا رویہ ہر موقع پر یہی رہتا۔ اسی شریفانہ وضع داری اور مرنج مرنجاں طبیعت کا مظاہرہ

۲۔ دوسری بات اس سے ملتی جلتی ہوئی میں نے ان میں یہ پائی کہ ہر ایک کا کام کر دینے کو، کام نکالنے کو تیار رہتے۔ اور ں و سفارش کے لیے تو ہر وقت آمادہ و مستعد ہی بیٹھے رہتے۔

خدا جانے، خدمت اُردو کے سلسلہ میں کیسے کیسے حوصلے، کیسے کیسے ولولے، کیسے کیسے ارمان اپنے سینہ میں رکھتے تھے!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

عبدالماجد

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی

لکھنؤ یونیورسٹی میں
احتشام صاحب کی ملازمت

میں ۱۹۳۰ء سے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی و اُردو کا صدر تھا۔ اُس وقت فارسی میں تو ایم۔اے کا امتحان ہو
اردو صرف بی۔اے میں تھی۔ مسلسل کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۳۵ء میں ایم۔اے کے نصاب میں اُردو داخل ہوئی اور اُردو کے
کے تقرر کی ضرورت پیدا ہوئی۔ لکچرر کی جگہ مشتہر کی گئی۔ درخواستیں آنے لگیں، سلکشن کمیٹی بن گئی۔ احتشام صاحب نے بھی
دی۔ لکھنؤ آکر مجھ سے ملے۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھ کو ان کی موجودہ اہلیت اور آئندہ ترقی کے امکانات کا اندازہ ہو گیا۔
کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ صدر شعبہ کی حیثیت سے میں نے احتشام صاحب کا نام پیش کیا۔ کمیٹی کے بعض ممبروں نے تائید کی۔ مگر
وائس چانسلر صاحب کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے۔ بہت کچھ بحث و مباحثے کے بعد آخر کار میری تجویز کے مطابق ووٹ لیے،
کثرت رائے سے احتشام صاحب کا انتخاب ہو گیا۔ تھوڑے دن کے بعد اگزیکیٹو کاؤنسل نے ان کا تقرر بھی کر دیا۔

اُس وقت احتشام صاحب لکھنؤ میں نو وارد تھے۔ کچھ مدت تک انھوں نے میرے ساتھ قیام کیا۔ بعد کو یونیورسٹی میں
میرے رفیق کار رہے اور روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ جب وہ الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کے ریڈر اور شعبۂ اردو کے
ہو کر الہ آباد میں مقیم ہو گئے تو اُس یونیورسٹی کے اردو بورڈ کے جلسوں میں سال میں دو مرتبہ ملاقات ہوا کی۔ جب میں نے ا
معذوریوں کی بنا پر سفر کرنا موقوف کر دیا اور مختلف یونیورسٹیوں کی مختلف کمیٹیوں کی ممبری سے استعفا دے دیا تو ظاہری ملا
وہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا لیکن بقول میر درد

ملنے یہ نہیں نسبت عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

احتشام صاحب اپنی تحریروں اور تقریروں سے علمی دنیا میں روز افزوں ناموری حاصل کرتے رہے اور ان
اخلاق سے ان کے دوستوں اور قدر شناسوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ عصر حاضر کے سب
مقبول، سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ ہر دلعزیز دانشور ہو گئے۔ جس کا ثبوت وہ کثیر التعداد تعزیتی جلسے ہیں
اور لکھنؤ کے باہر شہر شہر میں ہو رہے ہیں اور وہ یادگاریں ہیں جو ان کے بقائے نام کے لیے قائم کی جا رہی ہیں۔ احتشام
اچانک انتقال اردو ادب کی دنیا کا انتہائی المناک حادثہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دالعلماء مولانا علی نقی صاحب۔

احتشام صاحب مرحوم سے متعلق

خود اپنے معلومات و تاثرات

عراق سے آنے کے بعد میرے خدمات کا ابتدائی دور تھا جب فیض آباد کے انجمن خدام المجالس کے شاندار اجتماعات میں جو اُس وقت جناب مدہدی صاحب تسکین مرحوم کی پرخلوص سرگرمیوں کا مرکز ہوتے تھے، دو نوجوان ایک ساتھ زیر منبر نظر آئے اور بڑے انہماک سے انھوں نے بیان سنا چہروں سے تاثرات بھی نمایاں ہوتے رہے۔

یہ ایک ہمارے رضی الدین حیدر صاحب تھے جنھیں اللہ زندہ رکھے اور ایک احتشام حسین صاحب تھے جنھیں اللہ اپنی رحمت و مغفرت شامل فرمائے۔

غالباً رضی صاحب ہی نے ختم موعظہ کے بعد (کیونکہ اس زمانہ میں میں مجلس نہیں پڑھتا تھا) اپنے ساتھی کا تعارف کرایا اور معلوم ہوا کہ سن و سال میں وہ مذہبی زندگی میں بڑے پیش پیش ہیں اس کے بعد وہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں بحیثیت طالب علم رہے اور میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بحیثیت معلم منسلک تھا لیکن اُن کی مذہبیت سے جو تاثر تھا، وہ قائم رہا۔ اس دوران میں جناب سید ابن حسین صاحب سکریٹری مشن بھی جو کام کے آدمیوں کی تلاش میں رہتے ہیں موصوف سے مرتبط ہو گئے اور اردو اور انگریزی کی تحریروں کی اُن سے فرمائشیں کرنے لگے۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کی طالب علمی کے انتہائی دور سے کچھ ایسی خبریں ملنے لگیں کہ احتشام صاحب کسی اور ماحول سے متاثر ہو گئے مگر جب اُن سے ملاقات ہوئی تو ہمیشہ محسوس ہوا کہ یہ وہی احتشام صاحب ہیں جن کے متعلق پہلا اثر ذہن پر وہی تھا جو پہلے درج ہو چکا۔

اب وہ وقت آیا، جب وہ بحیثیت لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی میں آ گئے تو ابن حسین صاحب بہت خوش ہوئے کہ اب وہ اُن سے زیادہ زیادہ کام لیں گے مگر لکھنؤ یونیورسٹی میں اُس حلقہ نے انھیں اور زیادہ شدت کے ساتھ گھیر لیا جو پہلے ہی الٰہ آباد یونیورسٹی میں خیال انھیں اپنا چکا تھا۔ پھر بھی ابن حسین صاحب نے جب گھیرا تو لکھنؤ آنے کے بعد انھوں نے میرے رسالہ "اسلامی عقائد" کا انگریزی ترجمہ کر دیا جو پھر کسی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا۔

اب یادگار حسینی کی تحریک آئی تو یہ غالباً بالکل مرحوم کے دل کی آواز تھی جو اتفاقاً میرے ذہن سے بلند ہوئی تھی لہٰذا انھوں نے تحریک میں پابندی طور پر حصہ لیا۔ وہ مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے اور کم کوئی جلسہ ہوا ہو گا جس میں وہ شریک نہ ہوئے ہوں۔ اب پھر میں یادگار حسینی کے جو بین الاقوامی جلسے ہو رہے تھے، اُن میں متعدد جگہ وہ بحیثیت مقرر شریک ہوئے اور اب ہم لوگ ہر دفعہ اُن کی تقریر کے جوہر کھلے جس کی خاص خصوصیت سکون، متانت، انداز بیان کی دلنشینی اور طرز استدلال کی علمی قوت کے ساتھ

سنجیدگی تھی۔

مجلس عاملہ کے جلسوں میں وہ بس رسمی شرکت نہ کرتے تھے بلکہ پورے طور سے حصہ لیتے تھے اور بیباکی سے اپنے نقطہ نظر کو پیش کرتے تھے چنانچہ یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ شہید انسانیت کا وہ خاکہ جس پر کتاب مرتب ہوئی، تقریباً پورا مرحوم کا تحریر کردہ تھا۔

صورت واقعہ یہ تھی کہ کتاب کے لیے شروع میں دو خاکے الگ الگ پیش ہوئے، ایک میرا تھا اور دوسرا سعید الملۃ مرحوم کا تھا ظاہر ہے کہ ہم دونوں آدمیوں کے خاکوں میں مذہبیت زیادہ تھی۔ اور ثانی الذکر خاکہ میں تو شاید معجزات کا بھی باب تھا۔ میں نے بحیثیت سکریٹری دونوں خاکے پیش کیے تو احتشام صاحب مرحوم نے اپنے بیباکانہ مگر نہایت سنجیدہ اور مہذب انداز میں یہ کہہ دیا کہ جس عنوان سے اس ادارہ میں تبلیغ حیثیت مقصود ہے، وہ ضرورت ان دونوں خاکوں کے مطابق لکھی ہوئی کتاب سے پوری نہیں ہو سکتی اور انھوں نے کچھ مجمل خاکہ جو اس کتاب کے لیے مناسب ہوگا اپنی تقریر میں پیش بھی کیا لہٰذا مرحوم کے سپرد یہ کام ہو گیا کہ وہ اپنا مجوزہ خاکہ مرتب کر کے آئندہ جلسہ میں پیش کریں جس کی موصوف نے تعمیل کی اور اپنا خاکہ میرے پاس بھیجدیا۔ وہ بلاشبہ ہمارے ادارہ کے مقاصد کے بالکل مطابق تھا۔ اب میں نے اپنے نقطہ نظر سے قبل والے خاکوں کے جو اجزا ضروری معلوم ہوئے انھیں اس خاکہ میں شامل کر کے پھر ایک مختتم خاکہ تیار کر کے مجلس عاملہ میں پیش کیا جس میں ہم بھی تھے اور احتشام صاحب بھی شریک تھے اور اب مجلس عاملہ نے بالاتفاق اس خاکہ کو منظور کیا جسے پھر کثیر تعداد میں چھپوا کر ملک میں پھیلا بھی دیا گیا اور اسی کو اہل قلم کے پاس بھیجا گیا کہ وہ اپنے اپنے لیے عناوین منتخب کریں۔

ظاہر ہے کہ جب مجلس عاملہ کی طرف سے وہ منظور ہوا اور شائع کیا گیا تو وہ کسی فرد واحد کا نہیں رہا بلکہ تمام ارکان مجلس عاملہ جس میں صف اول کے بعد والے مخالفین بھی شامل تھے، سب اس ذمہ داری میں شریک تھے۔ اسی لیے احتشام صاحب کے نام کو بھی کبھی اس سلسلہ میں لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ نہ انھیں کبھی اس کی شکایت ہوئی اس لیے کہ انھوں نے ایک کام حسینیت کے مفاد کے لیے انجام دیا تھا نام و نمود مقصود نہ تھی۔

جب میں لکھنؤ سے علی گڑھ آ رہا تھا اور جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب ادیب کی کوٹھی پر وداعی جلسہ ہوا تھا تو اس میں دوسرے مقررین کے ساتھ احتشام صاحب مرحوم نے ایک بڑی پراثر تقریر کی تھی اور جو سپاسنامہ پروفیسر مسعود حسن صاحب نے پڑھا تھا اور جو ان حضرات کی محبت کی یادگار میں ان حضرات کے عطا کردہ فریم کے اندر میرے یہاں علی گڑھ میں باہر کی نشستگاہ میں اب تک آویزاں ہے، یہ اصل میں احتشام صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ اس لیے کہ پروفیسر صاحب نے اپنی مصروفیت اور قلت وقت کی بنا پر یہ کام ان کے سپرد کر دیا تھا جسے انھوں نے رضاکارانہ طور پر انجام دیا۔

جب میں علی گڑھ آیا تو موصوف سے ملاقات کے مواقع کم ہو گئے پھر بھی میرے "خطابات" یعنی تقریروں کے مجموعہ پر موصوف نے مقدمہ لکھا جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس لیے کہ کتابی شکل میں اس مجموعہ کی اشاعت کی ابھی نوبت نہیں آئی۔

لکھنؤ سے ان کے الٰہ آباد جانے کے بعد ان سے ملاقات کے مواقع اور کم ہو گئے۔ بس دو ایک دفعہ عسکری صاحب (منیجر وائی کمپنی) کی کوٹھی پر میلاد یا شاید فخر قوم مولوی کلب عباس صاحب کی کوٹھی پر کی ۲۶ جنوری والی مجلس میں ان کی شرکت ہوئی لیکن الٰہ آباد میں وہ ایک اور ماحول میں گرفتار ہونے کے باوجود جو مجھ سے دوری کا باعث ہو سکتا تھا غالباً دل سے میرے ساتھ ویسے ہی رہے جیسے اس سے قبل تھے۔ اس لیے ان کے انتقال سے مجھ پر وہی اثر ہوا جو ایک انتہائی مخلص قدیم دوست کے انتقال کا ہو سکتا ہے جسے میں نے قطعہ تاریخ میں ظاہر کیا ہے۔

ب مولانا سید کلب عابد صاحب

ہے سے ماخوذ پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی ادبی و علمی خدمات

علم اور اسلام

بل کو امیسہ ہال پنچکوئیاں روڈ نئی دہلی میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم کی یاد میں بغرض ایصال ثواب ایک
منعقد ہوئی جس میں صفوۃ العلماء حضرت مولانا سید کلب عابد صاحب نے علم اور اسلام کے زیر عنوان بڑی جامع اور فاضلانہ تقریر
رت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اس قول کو دہرایا کہ علم اور عقل کی کیفیت وہی ہے جو آنکھ اور چراغ کی ہے۔
نا مولانا نے کہا کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے انسان کی بلندی اور ترقی کا زینہ علم کو قرار دیا ہے انھوں نے فرمایا کہ
ں ہیں جن میں ہر مسلمان کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ علم محصور نہیں ہے صرف علم دین میں بلکہ جہاں بھی علم ملے وہاں
ئے آپ نے کہا کہ علم کی حقیقت وہ نور ہے جو اللہ کی طرف سے آدمی کے دل میں آتا ہے۔ بہت سی کتابیں پڑھ لینا بہت
اتوں کو رٹ لینا علم نہیں ہے اللہ نے اہل علم سے وعدہ لیا ہے کہ وہ کبھی ظالم کے ساتھ کوئی سمجھوتہ یا مفاہمت نہیں کریں گے
نی ہیں ہمدردی مظلوم کے لیے اٹھ کھڑا ہونا۔ حضرت مولانا نے مولائے کائنات حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے
ں منظر میں کہا کہ علم کے سرمایہ دار اور پیسہ کے سرمایہ دار میں فرق ہے، پیسے کا سرمایہ دار جبکہ اپنے خزانے کا دروازہ کھلا
خرچ کرنے سے کم ہوتی ہے لیکن علم جتنا خرچ کیا جاتا ہے اتنا ہی اس کے خزانے میں اضافہ ہوتا ہے حضرت علی کا قول
والا حقیقت میں فقیر ہوتا ہے اور علم رکھنے والا امیر ہوتا ہے۔
نا مولانا سید کلب عابد صاحب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ مولائے کائنات حضرت علی بن ابی طالب اپنی ٹوٹی ہوئی جوتی کو ٹانک
نے میں ابن عباس آگئے آپ نے ان سے پوچھا کہ اس ٹوٹی ہوئی جوتی کی قیمت کیا ہے؟ ابن عباس نے کہا کہ یہ شکستہ جوتی
ں لیے کہ بازار میں اسے کوئی بھی خریدار نہیں خریدے گا۔ اس جواب پر حضرت علی نے فرمایا کہ اگر میں مظلوم کی مدد نہ کرسکوں
ے روک نہ سکوں تو پھر میری نظر میں حکومت و سلطنت کی قیمت اس ٹوٹی ہوئی جوتی سے زیادہ نہیں ہے۔ اقتدار و حکومت کے
کے اہل بیت کا انداز فکر ہمیشہ ہی یہ رہا، حضرت مولانا نے عترت رسول کے علم کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ کیمسٹری کے علم میں
کو ایک عظیم ستون تسلیم کیا جاتا ہے اور جابر ابن حیان وہ شخص ہے جس نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے زانوے
ور آپ سے کیمیا کا علم حاصل کیا ہے۔
ہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی بقا اور استحکام کے لیے جبکہ پیغمبر اسلام کو سرمایہ کی سب سے زیادہ
آپ نے اس وقت بھی جنگ بدر کے قیدیوں کا فدیہ روپیہ کی شکل میں نہیں بلکہ اس صورت میں لیا تھا کہ ان قیدیوں میں جو لکھنا
اور ان کی یہ خدمت ہی ان کے فدیہ کے برابر ہوگی ـــــ اس سلسلہ میں مولانا نے اس ماحول کو تفصیل سے بیان کیا جو بعثت رسول

سے قبل عرب میں پایا جاتا تھا اور جسے اہل تاریخ دورِ جہالت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس دور میں خدا نے اپنے آخری پیغمبر کو اس فریضہ کو انجام دہی کے لیے مامور کیا تھا کہ وہ علم اور حکمت پھیلائے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا پیغمبر وہی ہوسکتا ہے جو عقل میں کمال رکھتا ہو۔

علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا سید کلب عابد صاحب نے پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم کی علمی وادبی خدمات کا بہترین الفاظ میں تذکرہ کیا اور کہا کہ مرحوم احتشام حسین صاحب نے جو علمی مقام اور علمی منزل پیدا کی اس کا سکہ صرف اردو والوں ہی کے دلوں پر نہیں بلکہ دوسرے علمی حلقوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز لوگوں کے دلوں پر بھی بیٹھا ہوا ہے لیکن علم نے ان کے دل میں انسانیت کا جو نور پیدا کیا تھا اس نے ان کی شخصیت کو بڑا ہی دل کش اور بڑا ہی ممتاز بنا دیا تھا۔ حضرت مولانا نے کہا کہ توڑ جوڑ سے اقتدار حاصل کرلینا اور ہے۔ لیکن کردار کا سکہ بٹھانا اور ہے مرحوم احتشام حسین نے اپنے کردار کا سکہ بٹھایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی مجلس میں ہر فرقے اور ہر ملت کے لوگ شریک ہیں اور ان کی یاد میں اپنی عقیدتوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ خود پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم نے کیا خوب کہا ہے کہ مرنا تو سب ہی کو ہے۔ لیکن افراد مرتے ہیں تاریخ نہیں مرتی۔



تاریخی صُبحِ آکُم

۱۳۹۲ھ

(خیالی ماہلی)

زبانِ بے زبانی

احتشام صاحب

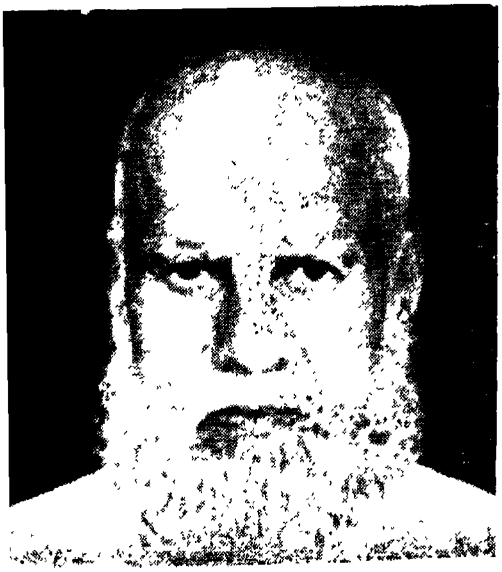
تصویروں کے

آئینے میں

●

ترے مرقد پہ جاتے ہیں بلاتے ہیں جگاتے ہیں
یہ نادانی سہی لیکن یہ نادانی نہیں جاتی
تو وہ شہکار فطرت تھا کہ جس کو چھین کر ہم سے
نہیں جاتی مشیت کی پشیمانی نہیں جاتی

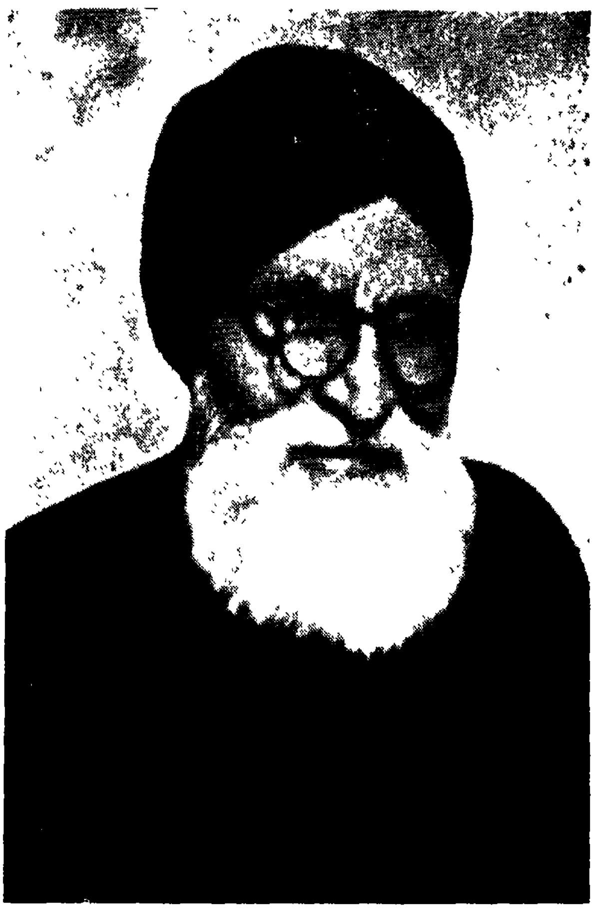




Syed Mohammad Qasim (His Uncle)



Ehtesham Husain Saheb



Syed Abu Mohammad (His Uncle)

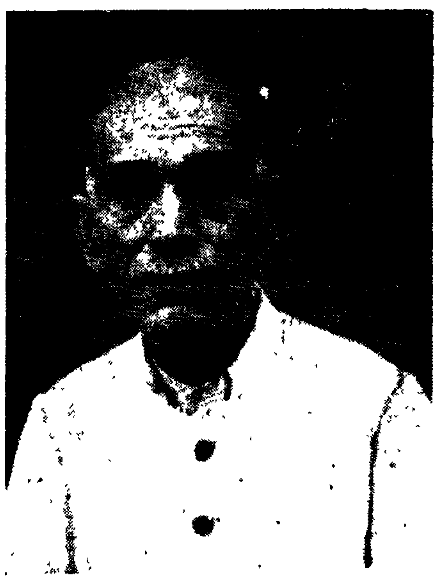


Ehtesham Husain Sahib in 1940



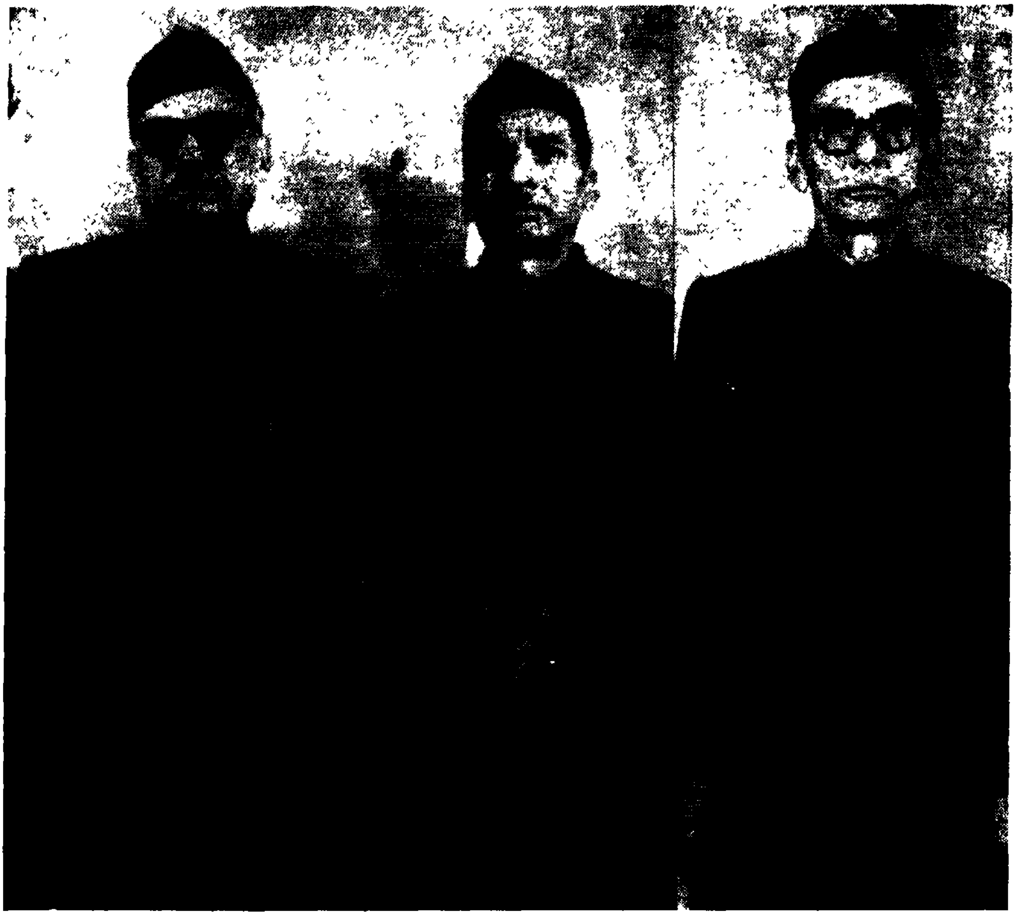


Syed Abu Jafar (His Father)



Syed Hasan Askari (His Father-in-La

Ehtesham Saheb and his brothers



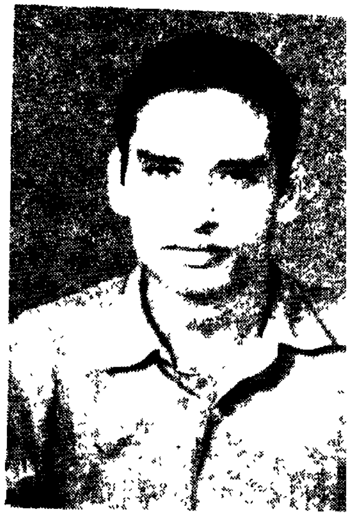
Ehtesham Saheb, S. Ansar Husain, S. Wajahat Husain



S. Iqtidar Husain



Syed Jafar Abbas



Syed Jafar Askari



Syed Arshad Husain



Syed Jafar Iqbal



With Ale Hasan at B.B C London



With Jafar Iqbal



With Zoya & Jafar Mustafa
(Iqtidar's Children)



With Syed Mohammad Fasih



With Shamim Kirhani



Aulad Asghar (Brother-In-Law)





Hashmi Manzil which he purchaseed to live at Lucknow.



Dr. Ragheeb Husain
Editor, Farogh-e-Urdu



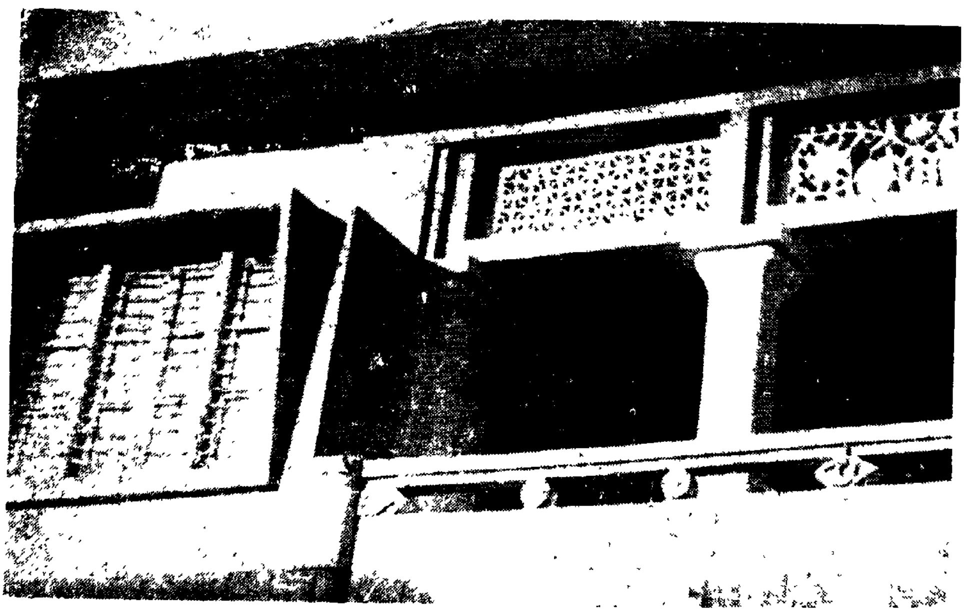
Maulana Mohd. Husain 'Shams' Alvi



The old Mohalla called Barud Khana, Lucknow is renamed Ehtisham Nagar by Lucknow Corporation.



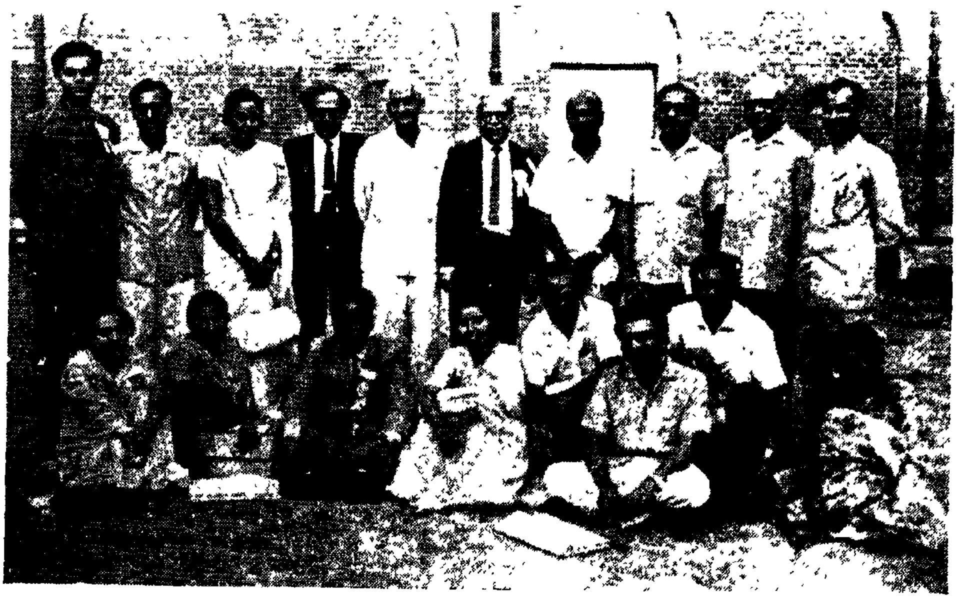
His former residence at Barud Khana Luck
(Ground Floor)



(1st Floor)



In the Year 1942



With few delegates at Urdu Teachers Conference Delhi



Addressing Lucknow Urdu Convention, 1955



In New York on January 1, 1953



At the funeral of 'Majaz Lu
6-12-1955

At London in June 1955

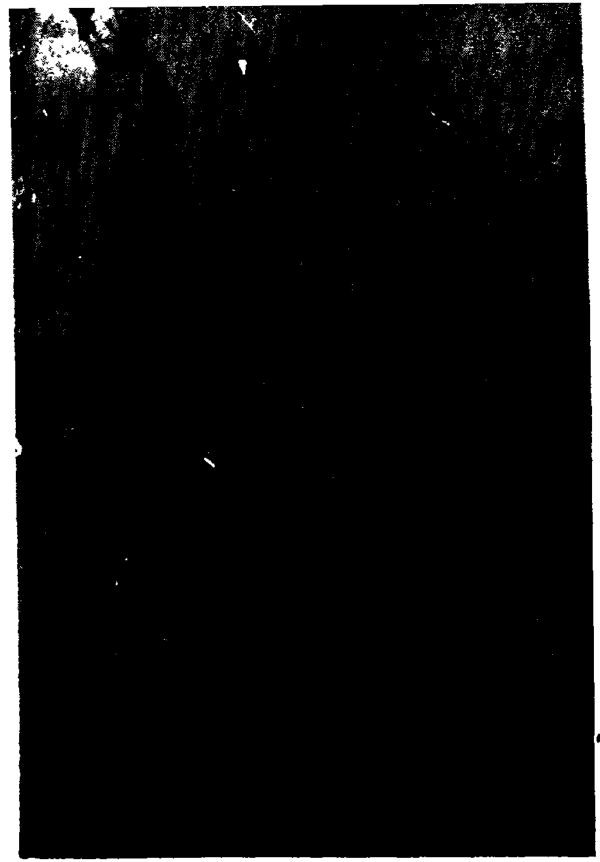








At Cairo in June 1953



At New York, 1952

With Kalam Haidery and others at Budh Mandir, Gaya.











At Gulmarg, Kashmir



With Dr. Sharib Rudaulvi, Dr. Hamidi Kashmiri and Prof. A. Q. Sarwari



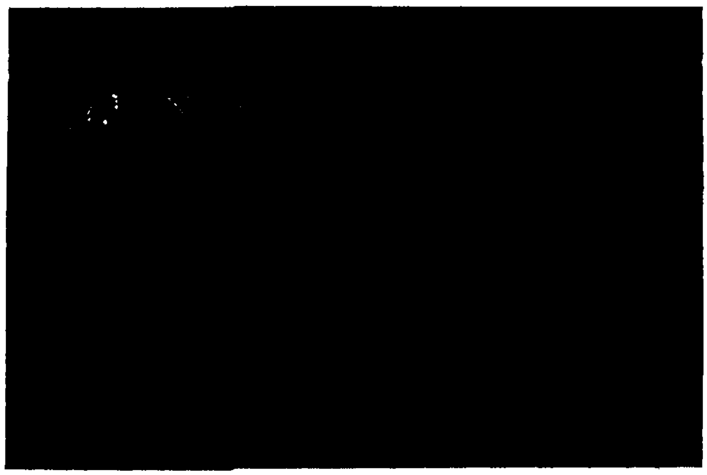


With Dr. Sharib & Prof Sarwari



← With Dr. Shamim
Nikhat,
Srinagar, Kashmir

From L to R
Dr. Mahmudul Hasan,
Prof. Ehtesham Husain
Prof. Yan Mark and
Dr. Sharib Rudaulvi at
Carlton Hotel, Lucknow →





← From L to R
Masihul Hasan,
Prof. Ehtesham Husain,
Baqar Mehdi, Ratan Singh
Ram Lal & A. J. Pasha



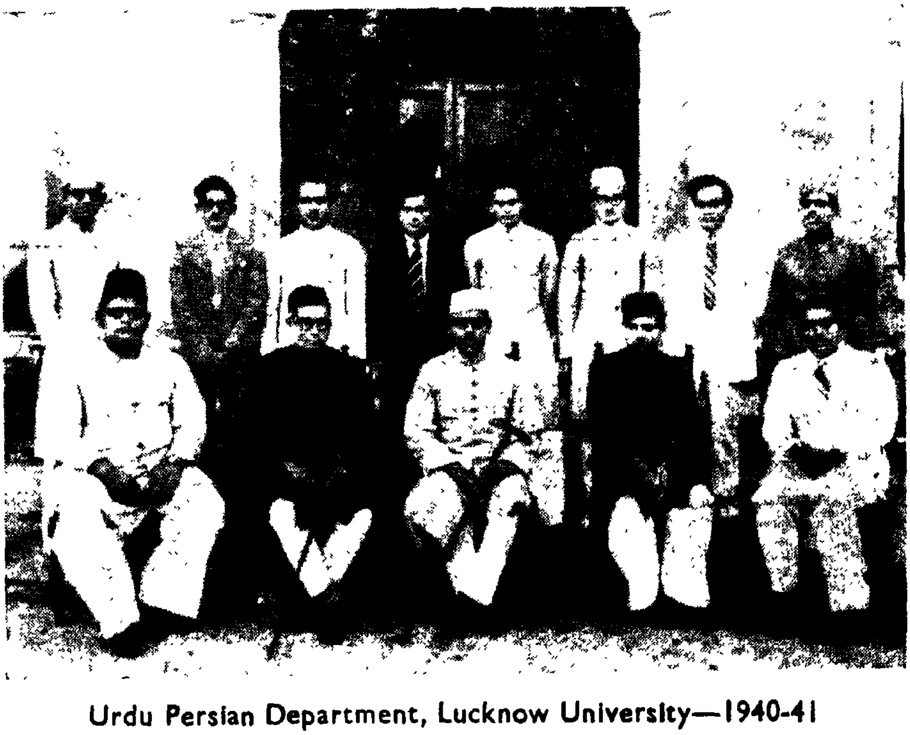
Delivering a talk from All India Radio, Lucknow



Delivering a talk from AIR Allahabad on 25-1-1969



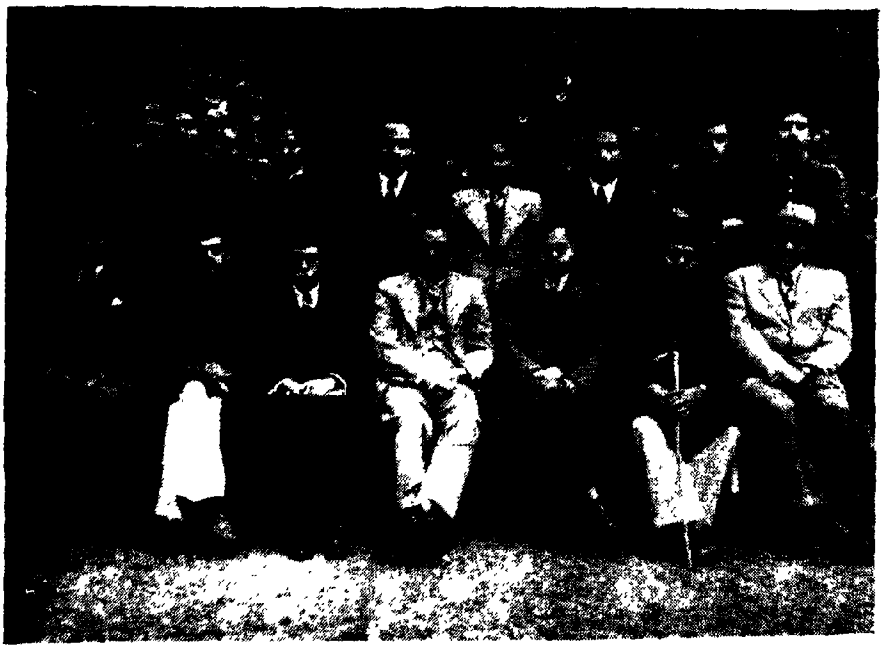
Department of Persian & Urdu Lucknow University—1938



Urdu Persian Department, Lucknow University—1940-41

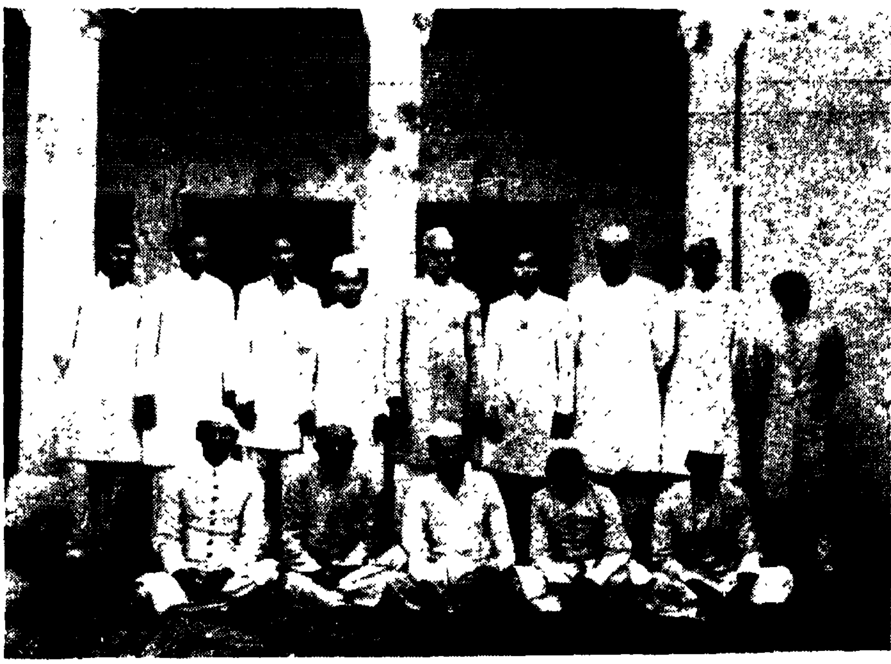


Thursday Club, Allahabad 1943-44



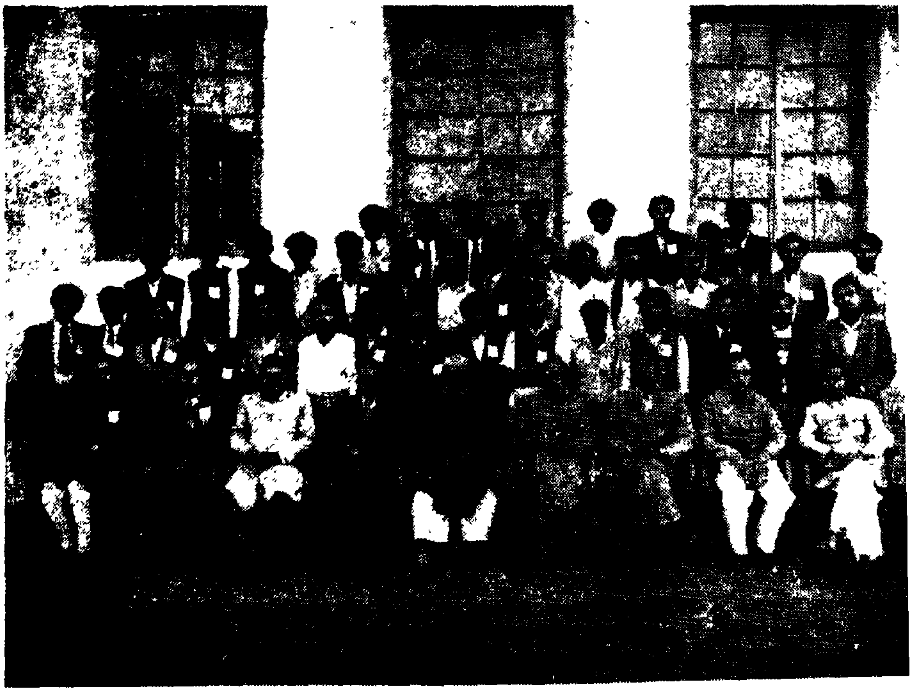
Department of Urdu, Lucknow University 1947-48


Bazme Adab, Ranchi College, 1950-51


With members of Anjuman Taraqqi Urdu, Amroha—29-2-1955



U.P. Student's Urdu Convention, Lucknow—4-12-1956



Annual Function Urdu Majlis, Gaya College, Gaya—1955-56



3rd March 1956 at Mau.



Urdu Persian Society, Lucknow University, 1957-58



Urdu-Persian Society, Lucknow University 1958-59



At Bombay—1958



At Madras on 21-12-1939 with A.H.S. Usha, Dr. A. K. Tamannai, & M. Y. Kokan



[illegible] November 13, 1960 Lucknow.



At Urdu Persian Department Lucknow University—1961



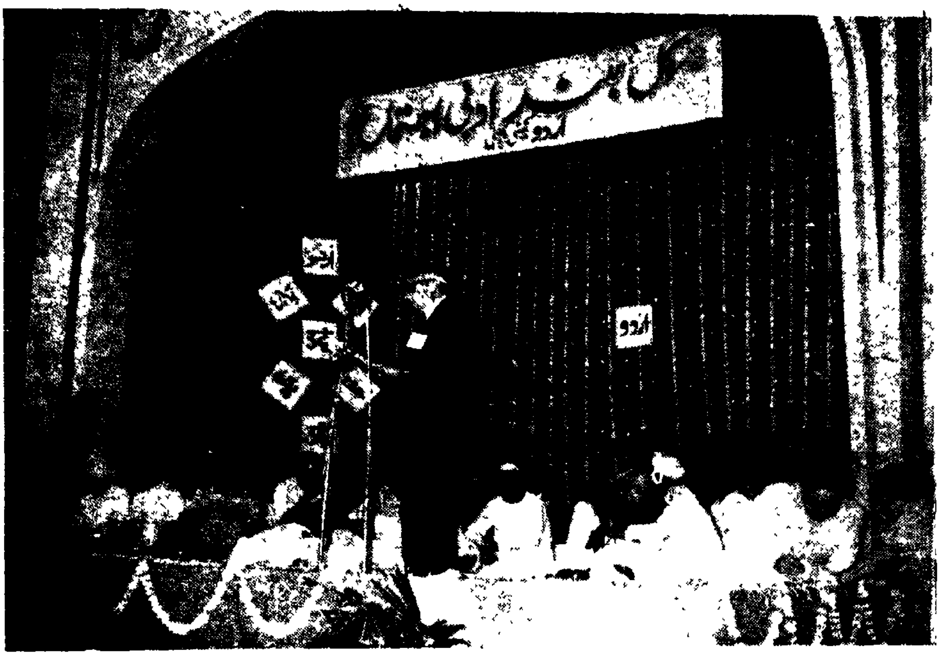
At the farewell accorded on his departure to Allahabad
by Urdu Persian Department Lucknow University—1961-62



Shri Zoe Ansari introducing Prof. Ehtisham Husain to Shri Dogra Finance Minister of J & K



With Sri Dogra, Finance Minister J & K & Sri Zoe Ansari



In 1963



Bazm Urdu Government Raza Degree College, Rampur 1965-66



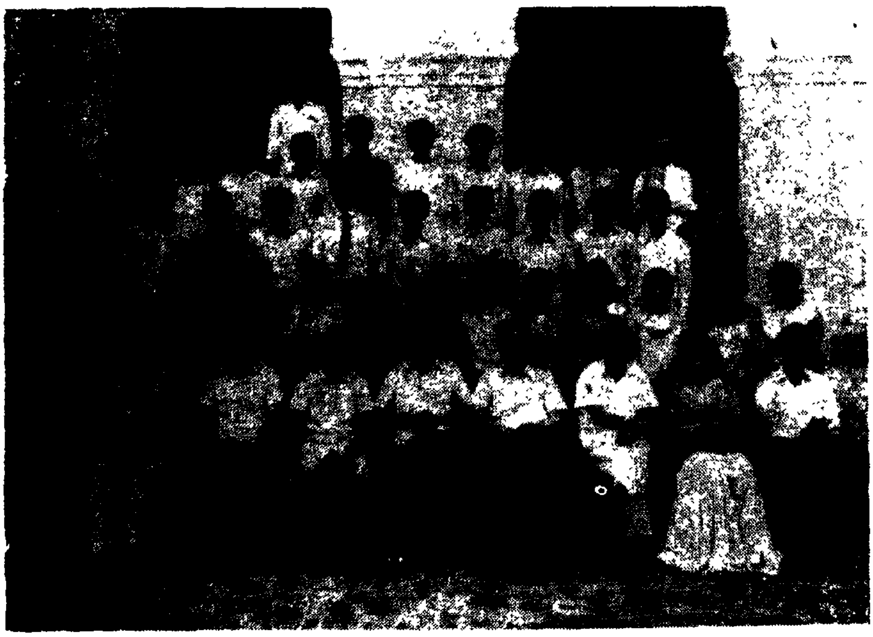
Presiding over a Shanti Sena Camp in ECC Allahabad on 24-5-1968



Inaugurating Lions Club Mushaira on 25-3-72 at Allahabad



With Dr. S. M. Aqeel at Allahabad on 22-4-70



At the farewell of M.A. Final Students of Allahabad University 1971-72



With Dr. Nagendra of Delhi University, after Extension Lecture



›f Najeeb Ashraf at Delhi



At Delhi University Extension Lecture with
Dr. K. A. Faruqi & Dr. Nagendra



Addressing Yaum-e-Iqbal at Patna



With Students & Teachers of Patna University



Delivering an Address at Ahmadabad



Vith Smt. Mahadevi Verma, Pt. Sumitra Nandan Pant & Firaq Gorakhpuri



In 1936



With Firaq Gorakhpuri



With Dr. Ejaz Husain & Dr M. Zaman



At Agra 1969



Dr. Mahmudul Hasan



With Dr. Ejaz Husain & Prof. Ale Ahmad Suroo



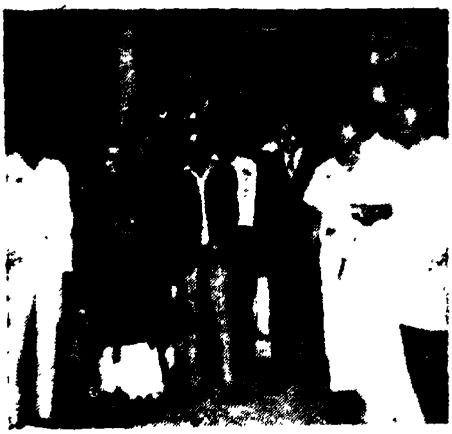
At the 70th Birthday Function of Prof. Firaq Gorakhpuri



Receiving a copy of Diwan of Late S S. Hasan, ICS from
Smt Rajan Nehru at Urdu Dept. Allahabad University—24-9-1966



Addressing Lion's Club Mushaira at Allahabad—25-3-1972



With Qurat-ul-Ain Hyder in
Urdu Department
University of Allahabad 1972

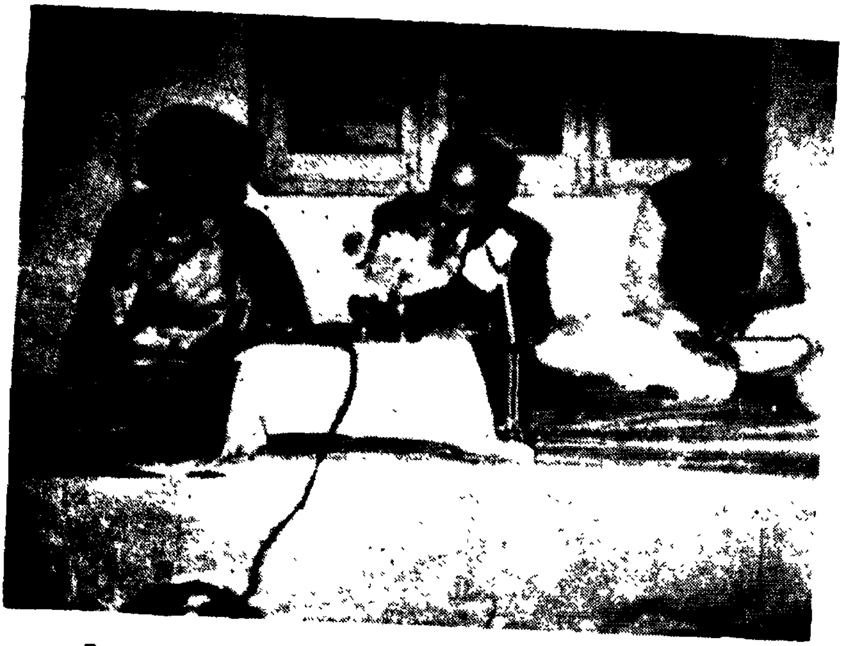




At the Language Terminology Meeting, Aligarh, November 1972



With Dr. Masood Husain Khan at Aligarh.



Presiding ovet Hindi Urdu Writers' Symposium.
Sitting on dias with Quratul Ain Haider and Sri C. V. Rao



With Quratul Ain Haider at Department of Urdu,
Allahabad University, 1972



Reading a Paper at a Seminar at Delhi University Dr. K.A. Faruqi &
Dr. Nagendra are also present



At Delhi University with Dr Nagendra, Dr. K. A. Faruqi, Dr. Mohd. Hasan
Dr. G. S. Narang & others





From Left-Alim Sholokhov (Russian Writer)Pt. Sumitra Nandan Pant Smt. Mahadevi Verma, Late Sajjad Zahir and others at Allahabad



Pt. Sumitra Nandan Pant and Smt. Mahadevi Verma etc. at Allahabad



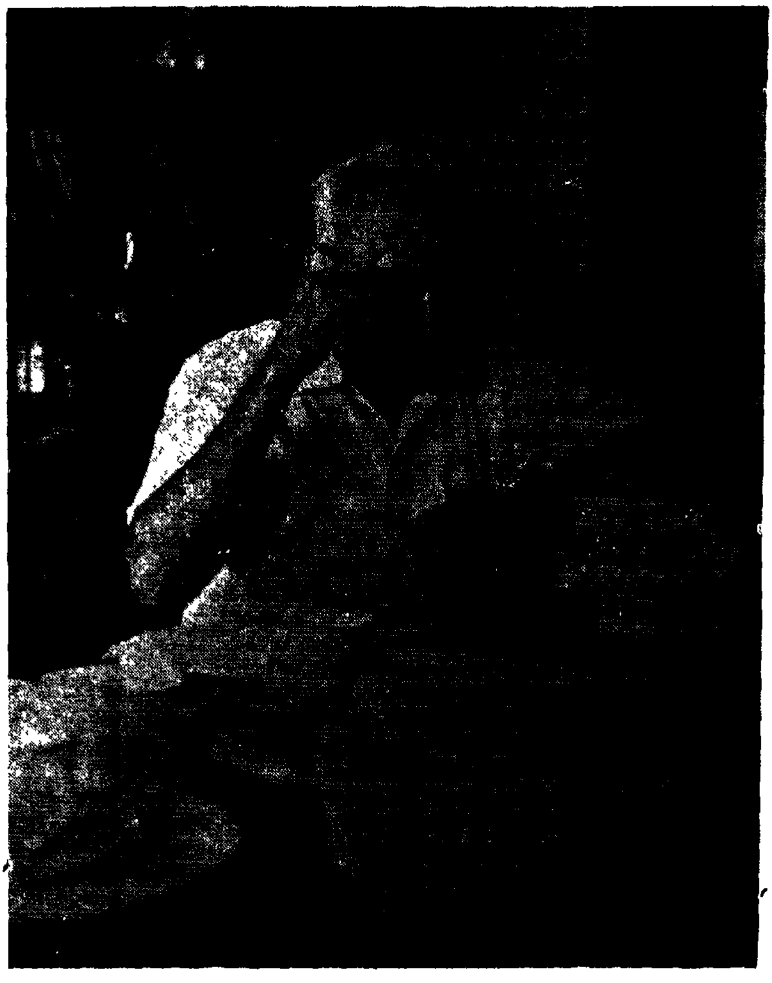
At Allahabad with Late Sajjad Zahir, Smt. Mahadevi Verma and Amrit Rai



With Mahadevi Verma & Sumittra Nandan Pant etc.



(From Left)
With Makhdoom Mohiuddin, Indever, Sajjad Zaheer, Ram Lal, Amrit Rai, Pt. Sumittra Nandan Pant, Sahir Ludhyanavi & others



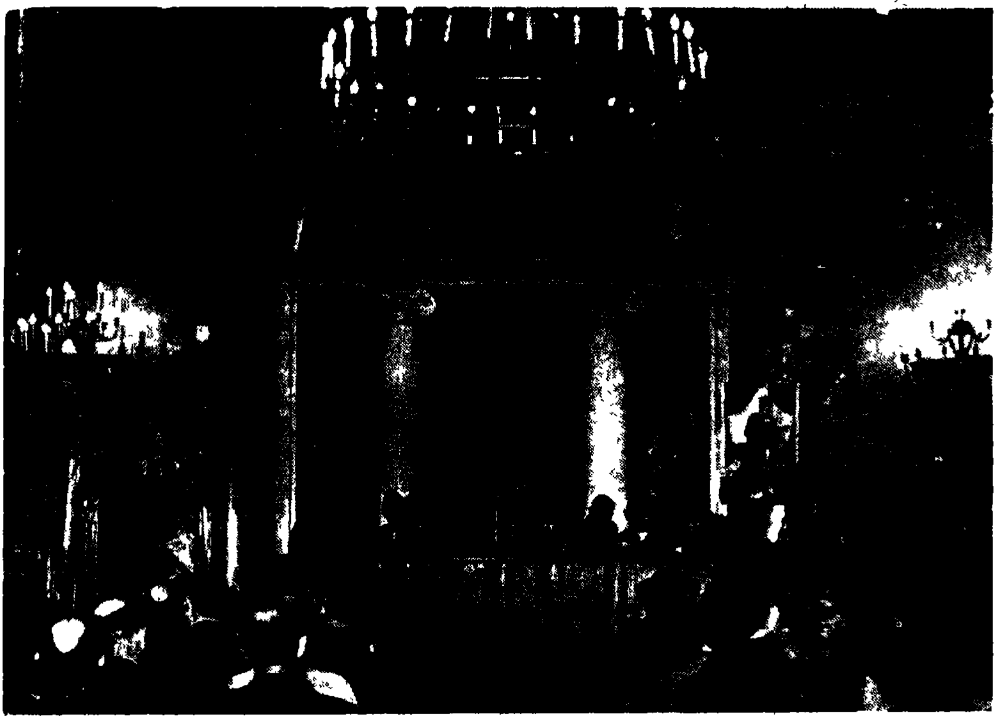
Language Committee, at Aligarh Nov. 1972



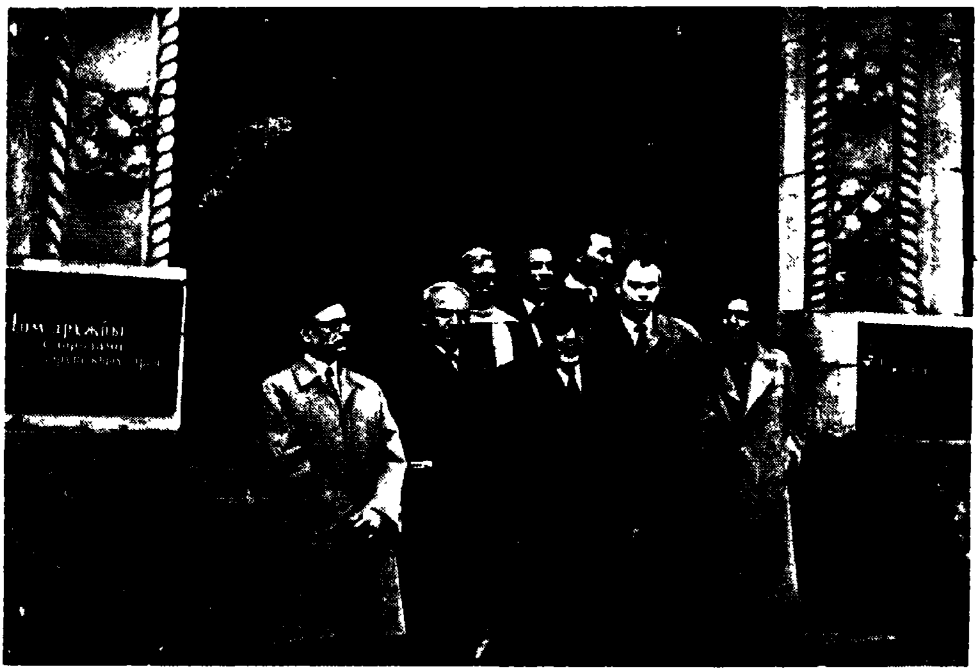
With Russian delegates at Allahabad



Delivering speech at Ghalib Centenary Celebration
at Tashkent, Russia 1969



Sitting in Ghalib Centenary Celebration at Tashkent, Russia—1969



With Malik Ram, Dr. A Aleem, Kaifi Azmi, Majrooh Sultanpuri & Russian Writers in Russia—1969

At Ghalib Centenary Celebrations, Russia 1969.





Addressing the Ghalib Centenary Celebration at Tashkent, Russia
(With his Interpretor)



Dead body is being taken out from his residence.



Funeral Procession



Namaz-e-Janaza of Shias lead by Maulana Zishan Haider



Namaz-e-Janaza of Sunnis lead by Prof. Ghulam Murtuza



Prof. B. R. Saxena Vice-Chancellor, Allahabad University
laying wreathes

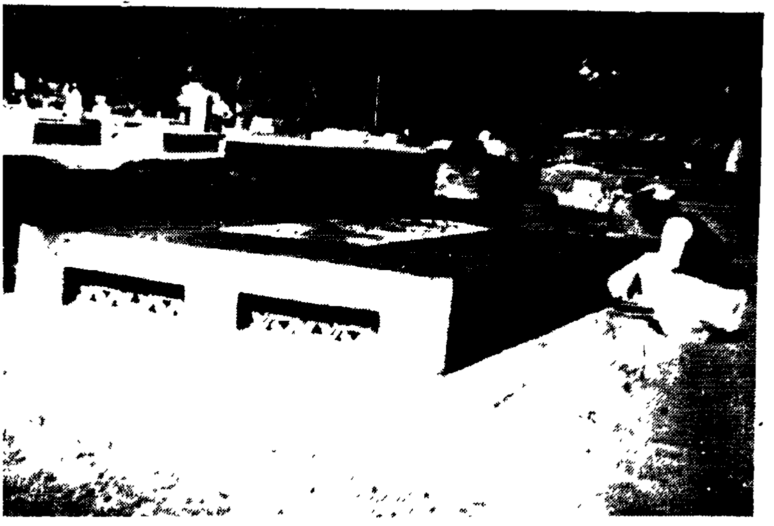


Members of Allahabad University Library Staff laying wreathes

Funeral Procession on way to Karbala Allahabad







LAST ABODE

شمعِ تنقیدِ ادب کی ہے خموش

۱۹۷۲ء

(خیالِ حالی)

- شخصیّت
- تاثرات
- جائزے
- نگہ بلند
- سُخن دلنواز
- جاں پُرسوز

تاثر

خود مرتا ہے کردار نہیں مرتا ہے
دنیا میں قلم کار نہیں مرتا ہے
آئے گا سدا نام ادب میں تیرا
سچ ہے کبھی فن کار نہیں مرتا ہے

(اعجاز خورشید کاشمیری)

...ر رحمانی جل گانوی
...ا۔ اے۔ بی۔ ایڈ

احتشام حسین — حیات اور شخصیت

سید احتشام حسین رضوی یوپی کے مردم خیز خطہ اعظم گڑھ کے ایک قصبہ ماہل کے ایک ممتاز سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے ایک ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جو روایت پرست، قدامت پسند اور خاندانی وجاہت پر فخر کرنے والا تھا۔ اپنی خاندانی وجاہت کے متعلق خود احتشام حسین نے لکھا ہے کہ یہ ایک ایسا خاندان تھا۔

"Who took pride in purity of blood, upkeep of traditi... and the distinctions achieved by the ancestors, more tha... in educational and material achievements." [۱]

گھر کا ماحول زمیندارانہ تھا۔ آپ کے والد ماجد سید ابو جعفر اردو فارسی کی مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کم عمری ہی سے زمیندارانہ ماحول کی نذر ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کا سارا وقت مقدمہ بازی اور زمینداری کے دھندوں میں گزرتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ ایسے روایت پرست خاندان میں ایک ایسا شخص بھی پیدا ہوگا جو روایت سے بغاوت کرنے والا ہوگا اور ترقی پسند روایات کا علمبردار ہوگا۔

احتشام حسین کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے سلسلے میں مختلف لوگوں کے بیانات میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ آپ کے استاد گرامی ڈاکٹر اعجاز حسین نے سالِ ولادت ۱۹۱۳ء لکھا ہے۔ خود احتشام صاحب کی کتاب "روایت اور بغاوت" میں سن ولادت ۱۹۱۲ء درج ہے۔ آپ کی دوسری کتاب "تنقیدی جائزے" میں جولائی ۱۹۱۲ء لکھا ہوا ہے۔ آپ کے ایک شاگرد شمیم حنفی نے اپنے ایک مضمون میں تاریخ پیدائش ۱۱ جولائی ۱۹۱۲ء بتائی ہے[۲]۔ حال ہی میں آپ کے انتقال کے بعد مجلس جہلم کا جو دعوتی رقعہ راقم الحروف کو ملا تھا اس میں تاریخ پیدائش ۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء درج ہے۔ لیکن خود احتشام صاحب کے بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی صحیح تاریخ پیدائش ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء ہے

"اسکول میں اور عام طور سے ہر جگہ تاریخ پیدائش ۱۱ جولائی ۱۹۱۲ء ہے لیکن صحیح تاریخ ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء ہے۔ اس کی تصدیق بعض خاندانی اندراجات سے ہوتی ہے"[۳]

اسی طرح یہ بات بھی درست نہیں کہ ان کی جائے پیدائش ماہل ہے۔ حالانکہ خود احتشام حسین نے اپنا وطن، قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ لکھا ہے اور ان کی ابتدائی تحریریں بھی "سید احتشام حسین رضوی ماہلی" کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ ان کا آبائی وطن ماہل ضرور تھا، وہ خود اور ان کے

۱۔ سوانحی خاکہ پرلٹہ رہک فیز نار منڈیشن اسکالرشپ در خیر، جولائی ۱۹۵۳ء ۔ ۵۲ ماہنامہ افکار کراچی جنوری ۱۹۶۰ء

۲۔ احتشام حسین کا خط بنام الیاس بیگ۔ [illegible]

دیگر اہلِ خاندان بھی ماہل ہی میں رہتے تھے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم قصبہ ماہل ہی میں حاصل کیں۔ مگر جائے پیدائش کے سلسلہ میں خود احتشام صاحب نے اس بات کی تردید کی ہے۔

"پیدائش بھی خاص 'ماہل' میں نہیں ہوئی۔ بلکہ وہاں سے کوئی بارہ میل کی دوری پر ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی۔ ماہل میں طاعون تھا۔ اور میرا خاندان دو تین مہینوں کے لیے وہیں منتقل ہو گیا تھا۔ کچھ زمینداری کا سلسلہ تھا۔ میں وہیں پیدا ہوا۔ گاؤں کا نام تھا 'اُتر ڈیہہ' (ضلع جونپور)"[1]

اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ احتشام حسین ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو قصبہ اُتر ڈیہہ ضلع جونپور میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ ڈھائی برس ہی کے تھے کہ ایک اور بچے کی ولادت ہوئی۔ آپ کی پھوپھی کو کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ وہ احتشام حسین کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ آپ کے پھوپھا محکمۂ پولیس میں ہیڈ کانسٹبل تھے۔ تعلیم سے بہرہ ور، اصول پسند اور انتہائی صاف گو آدمی تھے۔ غصہ ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اکثر اپنے افسروں سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کئی بار ترقی سے محروم رہ گئے۔ اُن کے غصہ کی وجہ سے تمام گھر والے اُن سے ڈرتے تھے۔ لیکن وہ ایک صاحبِ کردار انسان تھے۔ احتشام حسین چھ سات سال کی عمر تک اُن کے ساتھ بنارس اور گورکھپور میں رہے۔ ان مقامات کے مکتبوں میں قرآن ناظرہ ختم کیا۔ اردو، فارسی اور ریاضی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ۱۹۱۹ء میں پھوپھا کا تبادلہ کہیں دور ہو جانے کی وجہ سے اپنے وطن ماہل والدین کے پاس چلے آئے۔ انھیں ماہل کے ایک مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ ۶ سال تک اسی مدرسہ میں پڑھتے رہے۔ اسی دوران فارسی سیکھی اور انگریزی اور عربی سے بھی تھوڑی سی واقفیت ہوئی۔ مگر جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں۔ "ڈسٹرکٹ بورڈ کے غیر مناسب انتظام اور ناقص تعلیم کے باعث وہ بہت کم استفادہ کر سکے۔"[2]

اگرچہ احتشام صاحب کا خاندان کوئی ادبی خاندان نہیں تھا لیکن خاندان میں ایک ایسا ماحول ضرور تھا جس سے مطالعہ کا شوق اور ادب کا ذوق پیدا ہو۔ آپ کے والد صاحب کو مقدمہ بازی اور زمینداری کے دھندوں سے مطالعہ کا وقت بہت کم ملتا تھا۔ مگر جب کبھی سفر پر جاتے تو بھارتی یک ڈپو لکھنؤ سے ناول ضرور لاتے۔ یہ ناول اکثر جاسوسی ہوتے۔ کبھی کبھی رینالڈز کے تراجم بھی ہوتے۔ احتشام صاحب ان ناولوں کو چھپ کر پڑھتے۔ مطالعہ کا شوق انھیں ہر قسم کی کتابیں پڑھنے کے لیے اکساتا تھا۔ گھر پر جو مذہبی کتابیں اور فارسی ادب کی کتابیں تھیں انھیں آپ نے بصد شوق پڑھا۔ آپ کے بڑے چچا جو خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کے یہاں شعر و ادب کی محفلیں جمتی تھیں۔ وہ خود داستانیں سنتے، دو تین گھنٹہ طلسم ہوشربا یا اسی قسم کی کوئی اور کتاب پڑھتے رہتے۔ ماہل اگرچہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن وہاں اردو اخبارات اور رسائل آتے تھے۔ کانپور، نظام المشائخ دہلی، شیعہ گزٹ لکھنؤ، اصلاح کھجوہ (بہار)، اور ڈسٹرکٹ گزٹ اعظم گڑھ وغیرہ کا مطالعہ کرتے تھے۔ محرم کے دنوں میں خاص طور پر وہاں مجلسیں ہوتی تھیں جن میں انھیں مراثی اور تقاریر سننے کا موقع ملتا تھا۔ وہاں مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ ان شاعروں میں اعظم گڑھ، بنارس، جونپور اور فیض آباد کے شعراء خاص تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس چھوٹے سے دیہات میں بھی احتشام صاحب کو ایک ادبی ماحول میسر آ گیا تھا جس نے شعر و ادب سے دلچسپی پیدا کی اور مطالعہ کے شوق کو بڑھایا۔ لیکن مطالعہ بے ترتیب تھا۔ جو بھی کتاب ہاتھ لگتا اسے چاٹ ڈالتے ——— ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب ان کے بعض عزیزوں کے لڑکے قصبہ ماہل چھوڑ کر اعظم گڑھ کے ویسلی ہائی اسکول میں داخل ہو چکے تو احتشام حسین بھی گاؤں چھوڑ کر اعظم گڑھ چلے آئے۔ اور اسی ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ یہ آسٹریلوی مشن کا ایک مشہور تعلیمی ادارہ تھا۔ دیگر مشنری اسکولوں کی طرح یہاں بھی بائبل پڑھائی جاتی تھی۔ اساتذہ میں آسٹریلوی بھی

---

[1] احتشام صاحب۔ شمیم حنفی۔ افکار کراچی جنوری ۱۹۷۳ء [2] حاشیہ فکر برائے راک فیلر فاؤنڈیشن اسکالرشپ۔

بھی بھی۔ یہ لگ مشنری جذبے کے تحت پڑھاتے تھے اور ذہین اور اچھے طالب علموں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ احتشام حسین نے ہائی اسکول
میں داخل ہونے سے پہلے گھر پر ہی انگریزی کی معمولی استعداد بہم پہنچا لی تھی۔ اس لیے اپنی خداداد ذہانت اور شب و روز محنت کی بدولت بہت
اچھے طالب علموں میں شمار کیے جانے لگے تھے۔ اپنے قصبہ کے اسکول کی طرح یہاں بھی وہ اپنے درجے میں اوّل آنے لگے۔

اعظم گڑھ کی فضا اور ماحول دیہات کی روایتی فضا اور ماحول سے قدرے مختلف تھا۔ مشن ہائی اسکول کا ماحول تو دیہاتی ماحول سے
متضاد تھا۔ یہاں نہ قدیم سادات کی مخصوص مشرقی تہذیب اور روایتی وضع داری و مروت تھی، اور نہ مشرقی رسوم اور مجلس و ماتم،
سے برخاست اور خاطر تواضع کے روایتی انداز تھے۔ لیکن احتشام حسین اسی فضا اور ماحول ہی کے ہو کر نہ رہ گئے۔ دیہات کے ادبی
نے شعر و ادب اور مطالعہ کا جو چسکا لگایا تھا وہ انھیں کشاں کشاں 'شبلی منزل' اور شہر کی علمی و ادبی مجالس میں لیے پھرتا تھا۔ احتشام
کے پڑوس میں خواجہ صاحبان کا ایک ذی عزت اور کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ وہاں 'نگار' (لکھنؤ) اور 'پیمانہ' آگرہ جیسے معیاری
رسالے پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر نجم الدین جعفری وہاں ڈپٹی کلکٹر ہو کر آئے۔ ان کے دو بیٹے سید فرید جعفری اور رشید
جعفری ان کے ہم جماعت تھے۔ احتشام صاحب اکثر ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ وہاں بہت سے مشہور شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات
اور بہت سی کتابیں بھی پڑھنے کے لیے میسر آتی تھیں۔ احتشام صاحب کے ادبی مذاق کی تربیت کرنے اور جلا دینے میں ادبی مجلسوں اور مطالعہ
بینی کے علاوہ ان کے اردو فارسی کے استاد مولوی محمد یوسف صاحب کا بھی بہت بڑا حصہ ہے جو علامہ شبلی کے ہم وطن تھے۔

۱۹۲۹ء میں اُن کے والد ماجد کا انتقال ہوا۔ یہیں سے مصائب کا دور شروع ہوا۔ زمینداری برائے نام رہ گئی تھی۔ مالی حالت اچھی
۔ تمام بھائی بہنوں میں سب سے بڑے احتشام صاحب ہی تھے اس لیے گھر کی تمام ذمہ داریاں اُن پر آن پڑیں۔ ایک طرف گھر کی ذمہ
داری کا احساس اور دوسری طرف تعلیم جاری رکھنے کا شوق۔ کئی دنوں تک اسی ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہے۔ اسی دوران ان پر چیچک
کا حملہ ہوا۔ حملہ اس قدر شدید تھا کہ کئی ہفتے زندگی اور موت کے درمیان معلق رہے۔ اس دورِ ابتلا میں چچا نے دستگیری کی اور ڈھارس بندھائی۔
۱۹۲۹ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور اسکول میں اوّل آئے۔ والد کے انتقال کے بعد جن آلام و مصائب سے انھیں گزرنا پڑا
اس کے باوجود انھوں نے علم ریاضی جیسے خشک اور دقیق مضمون میں درجہ اوّل حاصل کیا تھا۔ اس کامیابی سے ان کی ذہانت اور محنت اور علم
سے لگن کا پتہ چلتا ہے۔ اپنی اس قابلِ فخر کامیابی کا احتشام صاحب نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔

"I passed my High School with distinction in Mathem...
I may mention here that when I left the school, my n...
was put on the much coveted board of the 'Dux of the
School'. I can now say that although I was much abo...
the average in all subjects, my cherished subject wa...
literature."[1]

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے احتشام صاحب کو الہ آباد جانا پڑا۔ جولائی ۱۹۳۰ء میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں اُن کے
چچا کوتوالی میں سب انسپکٹر تھے۔ اُنھی کے ساتھ احتشام صاحب رہتے تھے۔ انھیں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے بہت بڑا سہارا مل گیا تھا۔

۱۔ ڈاکٹر عاکف بیاسے لاک فیلر فاؤنڈیشن اسکالرشپ

بھی نظر آتی تھیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "ویرانے" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ یہ اُن کا پہلا مجموعہ تھا جو کتابی شکل میں شائع ہوا تھا لیکن اس سے پہلے ۱۹۳۶ء میں انھوں نے ایک دوست کے نام سے چھوٹی سی کتاب "ہماتما گاندھی" لکھی تھی جو الہ آباد سے رام دیال اگروال پبلشرز نے شائع کی تھی۔ اس دوست کا نام تھا شجاعت محمود[۱]۔ ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "تنقیدی جائزے" ۱۹۴۴ء میں حیدر آباد سے، دوسرا مجموعہ "روایت اور بغاوت" ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد ہی سے اور تیسرا مجموعہ "ادب اور سماج" بھی اسی سن میں بمبئی سے شائع ہو چکا تھا[۲]۔ ان تینوں مجموعوں میں ان کے تنقید کے متعلق خیالات و نظریات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔

۱۹۳۸ء سے اکتوبر ۱۹۶۱ء تک وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں رہے۔ اس دوران وہ اپنے تنقیدی مضامین کی بدولت ملک کے بلند پایہ نقادوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ بہت جلد وہ اردو تنقید کے ایک اہم ستون مانے جانے لگے۔ ان کے مضامین اردو ہی میں نہیں ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہوتے تھے۔ اگست ۱۹۵۲ء میں انھیں راک فیلر فاؤنڈیشن فیلوشپ پر امریکہ آنے کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے بڑے تامل و تردد کے بعد تمام رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں کے اصرار پر وہاں جانے کا فیصلہ کیا[۳]۔ جب امریکہ اور یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھیں شاندار طریقے سے الوداع کہی گئی۔ اس وقت کا منظر ڈاکٹر محمد حسن کی زبانی سنئے:-

"......جم غفیر پر نظر کیجئے اس میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی تھے جنھوں نے ہار پہنایا اور امام ضامن بازو پر باندھا۔ سارا ہاتھ امام ضامن سے بھرا ہوا تھا۔ علی عباس حسینی تھے جن کی آنکھیں تقریباً نمناک تھیں۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی تھے۔ طلبہ کی کثیر تعداد تھی۔ اردو اور انگریزی اخبارات کے صحافی تھے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ تھے۔ ایسی خوبصورت الوداع لکھنؤ اسٹیشن کو بہت کم دیکھنی نصیب ہوئی ہوگی۔"[۴]

اس سفر میں انھوں نے امریکہ اور یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں، وہاں کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے ملاقاتیں کیں۔ اُن سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا۔ مغربی تنقید کے مختلف دبستانوں کے علمبرداروں سے ملے۔ اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھا اور انھیں اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کی۔ اس سفر کے حالات انھوں نے اپنے سفرنامے "ساحل اور سمندر" میں نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز انداز میں تحریر کیے ہیں۔ اس سفرنامے پر قومی زبان کراچی نے جو تبصرہ کیا تھا اس سے سفرنامہ کی نمایاں خصوصیات کے علاوہ احتشام صاحب کی شخصیت بھی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے:-

"اس سفر کی سب سے نمایاں خصوصیت مصنف کا شعور ہے۔ وہ پرانی دنیا سے نئی دنیا گیا۔ اس نئی دنیا سے مطابقت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ امریکہ میں محض "عورت، شراب اور کوکا کولا" سے الجھ کر نہ رہ گیا بلکہ غیر جانبداری کے ساتھ سطح کے نیچے حقیقتوں کو تلاش کرتا رہا۔ دوسری خصوصیت اس سفرنامہ کی یہ ہے کہ لکھنے والا ایک "مقصد" کے تحت گیا تھا اور وہ اپنے مقصد سے کہیں بے خبر نہ ہوا...... احتشام صاحب کی نثر بہت سے لوگوں کو "خشک سامانی" نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں انھیں ایک دوسرا احتشام نظر آئے گا جو تنقید اور سفرنامے کے اسلوب کے فرق کو سمجھتا ہے۔ اس کتاب کے صفحات پر ایک وسیع نظر، وسیع مشرب اور انسان دوست شخصیت سے ملتے ہیں۔ رفاقت اور دوستی کا یہ احساس بہا بھی، ان کے تجربوں میں شریک بناتا ہے۔"

---

۱ ۲ خط بنام راقم مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۵ء ۳ ساحل اور سمندر ۴ نقوش۔ شخصیات نمبر

امریکہ اور یورپ کے اس سفر نے ان کے علم کو وسعت بخشی اور سب سے بڑی چیز جو انھوں نے سیکھی وہ تھا "احتشام کو سمجھنے کی کوشش"۔

نومبر ۱۹۶۱ء میں وہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں بہ حیثیت اردو کے پروفیسر ملازم ہوئے۔ جب صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اعجاز حسین ریٹائر ہوئے تو ان کی جگہ احتشام حسین کو ان کی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر صدر شعبہ مقرر کیا گیا۔ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء یعنی انتقال تک وہ اسی عہدہ پر بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ درس و تدریس کے علاوہ وہ کئی ادبی انجمنوں اور ثقافتی اداروں کے ممبر اور مشیر بھی تھے۔

احتشام صاحب ایک بڑے ادیب، اعلیٰ پایہ کے نقاد، ماہر لسانیات، شاعر، افسانہ نگار، اور اچھے مترجم ہونے کے علاوہ ایسے دوست، وسیع القلب، کسی کے آبگینۂ دل کو ذرا سی ٹھیس نہ پہنچانے والے اور ایک شفیق استاد بھی تھے۔ اپنے علم و فضل سے شاگردوں کے نوخیز ذہنوں کو جلا بخشی۔ ان کے بے شمار شاگرد اس چشمۂ علم و دانش سے فیضیاب ہو کر تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھا رہے ہیں۔ بعض کا شمار تو اردو کے [illegible] اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر محمد حسن، شجاعت علی سندیلوی، نسیم قریشی، ڈاکٹر شارب ردولوی، پروفیسر حنیف فوق، ڈاکٹر جندر ناتھ شیدا، ڈاکٹر شمیم نکہت، پروفیسر آغا سہیل، ڈاکٹر عبدالستار، ڈاکٹر اعجاز الحسن نقوی وغیرہ قابل ذکر شاگرد ہیں۔ جو ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ اور ہر ایک نے اپنی کسی نہ کسی تخلیق کو اپنے شفیق استاد احتشام حسین کے نام انتساب کیا ہے۔

احتشام حسین کی شخصیت کا نمایاں پہلو خلوص، دلداری اور مروت ہے۔ ان کی حتی الوسع کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی کی [illegible] نہ ہو۔ اس مروت نے انھیں نقصان بھی پہنچایا۔ اسی حد سے بڑھی ہوئی مروت کا نتیجہ ہے کہ بعض لوگ گھٹیا قسم کی اور غیر متعلق موضوعات کی کتابوں پر مقدمے اور دیباچے لکھوا کر لے گئے۔ جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو ان پر طعن و تشنیع کی جرأت ہوئی۔ لیکن کیا کیا جائے ان کا دل ہی اس قدر نرم تھا کہ وہ کسی کی دل آزاری کا باعث بننا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ:-

"...... مجھے آبگینوں کو ٹھیس لگانے میں لطف نہیں آتا۔ جہاں تک ہو سکتا ہے اس سے بچتا ہوں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا دل دکھے"

(ادب لطیف جوبلی نمبر ۱۹۶۳ء)

احتشام صاحب ایک با اخلاق اور شریف النفس انسان تھے۔ نہایت سنجیدہ اور متین تبسم زیر لب کے قائل تھے۔ بہت کم ایسا ہوا کہ قہقہے لگا کر ہنستے ہوں۔ علم و فضل، بلند منصب اور ادبی شہرت کے باوجود ان کے مزاج میں عاجزی و انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تکبر، خود نمائی اور بڑائی ان کو چھو تک نہیں گئی تھی۔ ورنہ اتنے بڑے منصب پر پہنچنے کے بعد اور اتنی شہرت حاصل کرنے کے بعد اکثر لوگوں میں جذبہ انا بڑھا ہوا اور "ہم چوں ما دیگرے نیست" میں ڈوبا ہوا پایا۔ احتشام صاحب کی تحریروں میں بھی یہی خوبی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کبھی اپنی رائے دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس وہ اپنے مضامین میں قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کا مزاج ابتدا ہی سے حکمانہ اور اقتدار پسند نہیں تھا بلکہ اس میں ایک قسم کا دھیما پن، اعتدال اور سلامت روی تھی۔

احتشام صاحب کو جو شہرت، بڑائی اور عظمت ملی وہ کسی اتفاق، کسی سہارے، کسی وسیلہ، کسی سازش اور کسی پروپیگنڈہ کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کی ذاتی محنت اور اعلیٰ لیاقت اور قابلیت کا ثمر تھی۔ حادثات زمانہ کے تھپیڑوں نے احتشام صاحب کو بہت زیادہ حساس، پھونک پھونک کر قدم رکھنے والا اور ہر وقت سوچ و بچار میں رہنے کا عادی بنا دیا تھا۔ "انھیں زندگی میں بڑے بڑے صدموں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ دل پر غم کے گہرے گھاؤ لگے۔ اس سے ان میں سوچ بچار اور تفکرات میں ڈوبے رہنے کی عادت راسخ ہو گئی تھی۔ کبھی تو وہ مجلس میں بیٹھے ہوئے بھی افکار و خیالات کی دنیا میں کھو جاتے تھے" [۵]

---

[۵] احتشام حسین - محمود ایوبی - ہفت روزہ نصرت لاہور - ۲۰ دسمبر ۱۹۷۲ء

ان کے ذہن میں ایک کشمکش سی برپا رہتی۔ کبھی اپنے آپ سے الجھتے اور کبھی چھوٹے چھوٹے معاملات پر گھبرا جاتے۔ غم کے عادی ہو چکے تھے۔ ۔ غم انھیں بے حد رنجیدہ کر دیتا تھا اور خوشیاں زیادہ خوش نہ کرتیں۔ خوشی کے موقع پر بھی غم ان کے ذہن پر تسلط جمائے رکھتا اپنی ی کیفیت کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:-

"...... میں نے آنکھیں بند کر کے بیتے لمحوں پر نگاہ کی تو عزیزوں کی بھیگی ہوئی آنکھیں اور اداس چہرے نظر آئے، خوشی اور غم کے آنسوؤں سے ڈھلے ہوئے، غم زیادہ اور خوشی کم۔ خود میں نے اپنے جذبات کو تولا تو غم ہی زیادہ تھا۔" [1]

ہی وجہ تھی کہ ان کی شخصیت پر افسردگی کی فضا چھائی رہتی تھی۔ اس بڑھی ہوئی افسردگی نے ان میں یاسیت اور نا امیدی پیدا کر دی تھی۔ حالانکہ ایک رجائی فلسفہ کے پیرو کار تھے اور ادب میں اس کی اشاعت اور ترجمانی کرتے تھے۔ لیکن عملی زندگی میں اسے برت نہ سکے۔ لیکن ان کی سیت میں بھی ایک قسم کی انفرادیت تھی۔ اس لیے وہ شیکسپیر کے جیکس کے کردار سے اپنے آپ کو تشبیہ دیتے تھے۔ اپنی ناتمام آرزوؤں چھپانے کے لیے انھوں نے اپنے اوپر متانت، سنجیدگی اور توازن کا خول چڑھا رکھا تھا۔ احتشام صاحب نے اپنی شخصیت کو کبھی اپنے سامنے بھی بے نقاب نہیں کیا۔ شخصیت کو چھپانے کا فن انھیں آتا تھا۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:-

"ان کی شخصیت میں بڑی تابناکی، بڑی سرمستی، بڑی رنگینی ہے۔ لیکن اس شخصیت پر سنجیدگی، متانت اور توازن کے وہ پہرے ہیں کہ وہ اپنے ضمیر سے سرگوشی میں بھی اپنے دل کے ارمان دہرا نہیں سکتے۔" [2]

وازن، اعتدال اور ٹھہراؤ ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔ ان کی شخصیت کا یہ وصف عمر کے اس دور میں بھی تھا جسے دورِ شباب کہتے ہیں جبکہ انسان کے دل میں جذبات کا آتش فشاں دہکتا رہتا ہے۔ عقل کی باگ دل کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ کرشن چندر اس دور کا کر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"...... احتشام صاحب کی طبیعت میں نوجوانی کے باوجود اتنا ٹھہراؤ ہے کہ وہ عریانی کو دیکھ کر بدکتے نہیں، برافروختہ نہیں ہو جاتے، صلواتیں سنانے پر آمادہ نہیں ہو جاتے۔" [3]

سی اعتدال اور توازن کا نتیجہ ہے کہ وہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں تدبر اور غور و فکر کے بعد قدم اٹھاتے تھے۔ اسی لیے وہ مخالفین کے حملوں و بھی برداشت کر لیتے تھے۔ اور مخالفین کی رائیں اور تحریریں بھی ہمدردی اور سکون سے پڑھتے تھے۔ انہی شخصی اوصاف کی بنا پر احتشام سین کو مارکسی اور ترقی پسند نقادوں میں ایک اعلیٰ اور امتیازی مقام حاصل تھا۔

---

[1] ساحل اور سمندر [2] نقوش۔ شخصیات نمبر [3] پودے

گیان چند

احتشام حسین، کچھ بھولی بسری یادیں

یکم دسمبر کی شام کو ایک طالب علم نے اطلاع دی کہ ریڈیو پر خبر آئی ہے کہ پروفیسر احتشام حسین کا انتقال ہوگیا۔ شعبے کے تمام اساتذہ دم بخود رہ گئے۔ احتشام صاحب کی بیماری کی کوئی خبر نہ تھی۔ ہم نے طالب علم سے پوچھا کہ تم نے نام صحیح سنا ہے۔ اس نے کہا کہ جہاں تک میرا خیال ہے احتشام حسین ہی بتایا تھا۔ ہماری بے یقینی نے خواہش کی کہ خود اپنے کانوں سے سن کر تصدیق کرلیں تو باور کریں۔ شام پونے آٹھ بجے جموں کشمیر کی مقامی خبریں آئیں تو سرخیوں میں احتشام صاحب کے انتقال کی پرملال خبر تھی سو دو ٹوک فیصلہ ہوگیا۔ دل پر ایک حزن و یاس طاری ہوگئی۔ رات کو ساڑھے نو بجے ریڈیو کی اردو سروس سے احتشام صاحب پر دلی کے کچھ ادیبوں کے خراج عقیدت سنے۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ ہر شخص کے مرنے پر کہا جاتا ہے کہ اب ان کی جگہ مشکل سے پر ہوگی۔ احتشام صاحب کے معاملے میں یہ بات رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہے کہ ان کی جگہ پر ہونے والی نہیں۔

کتنا صحیح تھا یہ تاثر۔ یہی بات میرے دل میں آئی تھی کہ احتشام صاحب کی وفات سے اردو ادب اور اردو تعلیم کی دنیا میں جو خلا ہوا وہ کوئی پر نہیں کرسکتا۔

میں احتشام صاحب کو کچھ اوپر چوتھائی صدی سے جانتا تھا۔ ابتدا میں یہ ایک دور کی دید تھی بعد میں مغائرت کم ہوتی گئی، فاصلہ گھٹتا گیا ویسے احتشام صاحب کا انکسار اس درجہ کا تھا کہ جب میں ریسرچ کا طالب علم تھا۔ تب بھی انھوں نے کسی عالمانہ یا استادانہ طمطراق سے ملاقات نہ کی بلکہ اپنے مقام کو میری سطح پر اتار لانے کی کوشش کی۔ جب میں معلم ہوگیا تو آہستہ آہستہ ان سے مراسلت اور ملاقات بڑھتی گئی تا آنکہ پچھلے پانچ سات سالوں میں ان سے سال میں چند بار ضرور ملنا ہو جاتا تھا۔ ادھر پچھلے ایک سال میں گجرال کمیٹی اور ترقی اردو بورڈ کی لسانیات کمیٹی کی بدولت تو بلا مبالغہ روز ساتھ ہی اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا ہوا۔

اور قرب کی اسی شدت کی وجہ سے مفارقت کے تلخابے میں اور تیزی آگئی ہے۔ ایک لمحے کی فکر ہی سے ان کی صورت چشم تصور کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کی باتیں کانوں میں گونجنے لگتی ہیں، ان کا پرخلوص لہجہ، بے تصنع انداز گفتار اور غم زدہ متانت چشم و گوش کے سامنے پھر جاتی ہے، اور پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب خواب و خیال ہے۔ اب تو بھولی بسری یادیں ہی ہمارے لیے احتشامی شخصیت ہیں۔ اور یہ یادیں یہ شبیہ، یہ تصورات آہستہ آہستہ دھندلاتے جائیں گے یہاں تک کہ فکر کے لیے احتشام صاحب کے چہرے کی واضح تشکیل بھی ممکن نہ رہے گی۔ کیسے کیسے اقربا جاتے رہے۔ حمیدیہ کالج بھوپال کے رفقائے کار میں عربی کے پروفیسر عبید عرب، اردو کے پروفیسر سلیم حامد رضوی اور فارسی کے پروفیسر حافظ محبوب الرحمن اللہ کو پیارے ہوگئے۔ میرے کرم فرما اور دوست عبدالقادر سروری چلتے بنے اور اب احتشام حسین کی ذات بھی احتشام ہمیشہ کے لیے غروب ہوگئی ہے۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ جو آج وہ کل ہماری باری ہے۔

ان کا مزاج مرنجاں مرنج تھا، وہ کبھی خفا نہیں ہوتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ کسی گستاخی کے سلسلے میں انھیں معذرت نامہ لکھا۔ انھوں نے اپنی خوش خلقی سے جواب میں منجملہ اور باتوں کے ایک مصرع لکھا ہے۔ میں کسی سے خفا نہیں ہوتا۔ میں نے انھیں صرف ایک بار خفگی کے عالم میں دو ایک جملے کہتے سنا ہے۔ ۶۶ء میں دلی یونیورسٹی میں اساتذۂ اردو کی پہلی کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کے موقع پر جو فہرست اساتذہ شائع کی گئی اس میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے استاذی ڈاکٹر رفیق حسین کو ریڈر شعبۂ اردو لکھ دیا گیا تھا۔ آں محترم اس وقت تک صرف لکچرر تھے۔ کسی ذات والا صفات نے ہوٹل میں احتشام صاحب پر اعتراض کیا کہ چونکہ رفیق صاحب آپ کے ہم فرقہ ہیں، آپ انھیں ریڈر مقرر کرنا چاہتے ہیں اس لیے آپ ہی نے انھیں ریڈر لکھ بھیجا ہوگا، اس پر احتشام صاحب برس پڑے اور یہ بات خفگی کی تھی بھی۔ خبرنامہ کے مرتبین نے کسی غلط فہمی کے سبب رفیق صاحب کو ریڈر لکھ دیا تھا۔ اس میں مرحوم کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ کیا وہ صدر شعبہ ہوتے ہوئے ایسی صریح غلط بیانی کرتے

پچھلے ایک دو سالوں میں بعض مجہول الاسم اخباری مراسلات میں مجھے ایک متعصب ہندو کے طور پر پیش کرنے کی سعی کی گئی۔ میں نے احتشام صاحب کو ایک چٹھی میں برسبیل تذکرہ لکھا کہ میں کئی سلکشن کمیٹیوں میں ہندو امیدواروں کے مقابلے میں مسلمان امیدواروں کا انتخاب کر چکا ہوں۔ یہ مثالیں احتشام صاحب کے علم میں تھیں۔ جواب میں احتشام صاحب نے لکھا کہ ”آپ خاموش ہو جائیے ان الزامات کی تردید نہ کیجیے۔ مجھے دیکھیے مجھ پر الزام لگایا جاتا ہے کہ میں کٹر شیعہ ہوں اور صرف شیعوں کا تقرر کرتا ہوں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میں اپنے لڑکے کو الٰہ آباد یونیورسٹی میں مقرر کرنا چاہتا ہوں حالانکہ میں نے اسے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخل بھی نہیں کیا۔ میں ان الزامات کو سنتا ہوں اور ہنس کر چپ ہو جاتا ہوں۔

یہ ان کے مزاج کی غیر معمولی حزم و احتیاط تھی ورنہ الٰہ آباد جیسی درسگاہ کو چھوڑ کر اردو کا ایم اے کرانے کے لیے اپنے فرزند دلبند کو کیوں دور دراز مقام پر بھیجا جائے۔ باہر پڑھانے میں صرفہ بھی ہوتا ہے اور پریشانی بھی۔ وہ دلی میں بھی فرسٹ کلاس فرسٹ ہوا۔ اگر وہ الٰہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم ہوتا اور وہاں اس کا ایسا ہی اعلیٰ نتیجہ آتا تو معترضین و مشککین کیا کیا طوفان نہ اٹھاتے۔ ان کی فرط احتیاط کے اس سلسلے کو میں اور آگے لے جانا چاہتا ہوں۔ اپنے صاحبزادے کے ایم اے کرنے کے بعد وہ ڈیڑھ دو سال زندہ رہے، اسے اصول پرستی کہیے کہ دنیا سازی کی کمی کہ ان کی زندگی میں ان کا فرسٹ کلاس فرسٹ بیٹا کوئی یونیورسٹی چھوڑ کسی کالج میں بھی مقرر نہ ہو سکا۔

ایک بار انھوں نے مجھے اس کے بارے میں لکھا کہ وہ اس کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہیں۔ آپ کی جو محبت اور شفقت مجھ پر ہے اس کی وجہ سے یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اس کے مستقبل کے بارے میں آپ کو بھی میری ہی طرح فکر ہوگی۔ اب جیسے جیسے سبکدوش ہونے کا وقت آتا جا رہا ہے خاندان کا بوجھ زیادہ محسوس ہو رہا ہے۔ میں بہت بے عمل انسان ہوں اور دنیوی معاملات میں حماقت کی حد تک کورا۔ اپنا بھی معاملہ ہو تو اور زیادہ گونگا ہو جاتا ہوں۔ صرف چند دوست اور ہمدرد ہیں جن سے کچھ کہہ سکتا ہوں، ان میں آپ بھی ہیں۔

میں نے جواب میں لکھا کہ ”میں بہت چھوٹا آدمی ہوں میرا حلقۂ اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر جموں میں کوئی جگہ ہوئی تو اس کا فیصلہ کرنے میں مجھ سے زیادہ آپ کو اختیار ہو سکتا ہے۔“ اس مراسلت کے تقریباً تین ماہ کے اندر جموں یونیورسٹی میں لکچرر کی ضرورت کا اشتہار ہو گیا۔ ان کی سلیم الطبعی دکھانا مقصود ہے کہ چونکہ یہاں ان کے سلکشن کمیٹی میں ہونے کا امکان تھا اس لیے انھوں نے اپنے صاحبزادے سے درخواست نہیں دلائی۔ اگر وہ دنیوی فراست سے کام فرماتے اور اپنا پورا زور لگا دیتے تو کیا اپنے بیٹے کو کسی نہ کسی یونیورسٹی یا کالج میں نہ لگوا دیتے۔

وہ بیٹے اور اپنے متوسلین کے لیے کسی جد و جہد کے اہل ہی نہ تھے۔ ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ لکھنؤ شعبۂ اردو میں لکچرر بنیں اور ریڈر کی جگہ ہونے پر اپنی اہلیت اور شہرت کے باوجود منتخب نہ ہو سکیں۔ لمبے عرصے کے بعد وہ ریڈر ہو کر شعبۂ اردو فارسی کے صدر ہو پائے لیکن

پروفیسری حاصل نہ کر سکیں۔ اس میں ان کی غیرتِ نفس کو بھی دخل تھا۔ دلّی یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں اردو کی پروفیسری کا اشتہار ہوا۔ میں نے ایک ملاقات میں محض برسبیلِ تذکرہ پوچھا کہ کیا آپ وہاں درخواست دیں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "بھائی اس عمر میں کہاں کہاں اور کس کس کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھروں!" ان کا فیصلہ اور نقطۂ نظر درست تھا۔ اپنے تمام علم وفضل کے باوجود وہ ۲۳ سال کے تدریسی تجربے کے بعد پروفیسر ہو سکے اور وہ بھی دوسری یونیورسٹی میں جاکر۔ دوسروں کو دیکھیے کہ ان سے کم اہلیت کے باوجود (یہ بری طرح) کتنی کم مدت میں اس بام پر جا پہنچے ہیں۔ کتنی بڑی کمی ہے وہ یونیورسٹی جو سرور اور احتشام جیسے استادوں کی صلاحیت کا اعتراف نہ کر سکی اور انھیں چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

حال میں مجھے الٰہ آباد کے شعبۂ اردو میں معلوم ہوا کہ کشمیر میں سروری صاحب کے انتقال کے بعد جموں و کشمیر کے اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ غلام محمد صادق کے کسی مقربِ خاص نے احتشام صاحب کو دعوت دی کہ وہ کشمیر یونیورسٹی میں سینیر گریڈ میں اردو کے پروفیسر ہوکر آجائیں بعد میں انھیں یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا جائے گا۔ ع۔ ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس، والا معاملہ تھا۔ احتشام صاحب جیسے سنجیدہ اہلِ علم کو وائس چانسلری کا انتظامی عہدہ کیونکر رجھا سکتا تھا۔ انھوں نے یہ پیش کش قبول نہ کی اور الٰہ آباد کی پروفیسری کو ترجیح دی۔ ۱۹۶۹ء میں انھیں الٰہ آباد ہی میں پروفیسر کا سینیر گریڈ مل گیا لیکن الٰہ آباد یونیورسٹی کی قلندری کی وجہ سے یہ گریڈ کاغذ تک محدود رہا، زرِ نقد کی شکل اختیار نہ کر سکا۔

یونیورسٹی پروفیسر کی صندلی پر متمکن ہونے کے بعد ہر شخص آسودہ نہ سہی، تنگی ناز کے بغیر بھی اہل وعیال کے لیے کچھ اندوختہ کر لیتا ہے لیکن احتشام صاحب کی سادہ مزاجی نے انھیں یہاں بھی مانع رکھا۔ سنا ہے کہ وہ لواحقین کے لیے کوئی رقم نہیں چھوڑ گئے۔ ان کا ترکہ رشحاتِ قلم ہی ہیں لیکن قلم کے تراشوں سے پس ماندگان کا پیٹ تو نہیں بھرتا۔

آٹھ دس سال پہلے وہ بھوپال میں میرے مکان میں ٹھہرے تھے۔ بات چیت کے دوران کہنے لگے کہ "میں آپ کے منہ سے بار بار اداسی کی باتیں سنتا ہوں۔ آپ کئی بار موت کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ کیا بات ہے"۔ میں نے جواب میں انھیں چھوٹی چھوٹی بیماریوں، گرہست کی پریشانیوں اور دوسری مکروہات کی تفصیل بتائی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ "آپ اسی کو بہت سمجھتے ہیں۔ اب میری کیفیت سنیے"۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی گھریلو اور مالی مشکلات، صحت وعدمِ صحت وغیرہ کی تفصیلات بتائیں اور پوچھا کہ "بتائیے ایسے میں کیونکر پڑھا لکھا جائے"۔ میں نے اعتراف کیا کہ ان کے مسائل میرے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ وہ کثیر العیال اور عسیر الحال تھے۔ میں نے تو شوخی کے ساتھ ان سے یہ بھی درخواست کر دی کہ اب تخلیق کا عمل بند کر دیا جائے۔

انگریزی کی جو کہاوت ہے "سادہ رہنا اور اونچا سوچنا" اور اس کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ان کے لباس اور سامانِ سفر میں سادگی ہی سادگی ہوتی تھی۔ ان کا کاغذات کا چرمی بیگ بے ڈھنگا اور بوسیدہ تھا، وہ کبھی بالوں میں تیل نہ لگاتے تھے کہتے تھے کہ "صحت کے اعتبار سے بالوں میں تیل ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سے بشرے کی وحشت کم ہو جاتی ہے"۔

احتشام صاحب کی رفعت، طبیعت اور فکر دونوں میں تھی۔ وہ دل اور دماغ دونوں کی خوبیوں سے برابر آراستہ تھے۔ پروفیسر تو بہت ہوتے ہیں لیکن ان جیسے روشن دماغ پروفیسر (بالخصوص اردو کے) کم ہی ہوتے ہیں۔ ہمیں تو ان کی معیت میں بڑی عافیت رہتی تھی۔ کسی کمیٹی میں ان کا ساتھ ہو اور کسی جلسے میں ممبران کو ماخوذ کر لیا جائے تو وہ سب کی جانب سے تقریر کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے۔ کسی مخصوص موضوع کے بغیر بولنا، بولے جانا ذہن پر بوجھ ڈالنے والی بات ہے۔ ان کے لیے یہ باتیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ جس سلیقے اور ترتیب سے سوچ سکتے تھے اسی کے ساتھ الفاظ کو سانچے میں ڈھال کر بدل سکتے تھے۔ اپریل ۱۹۷۲ء کے شروع

میں جب اپنی محبت میں ناکامیابی ہوتی تو وہ زندگی بھر اپنے محبوب کے غم میں مبتلا رہے۔ ایسی کیفیت میں خلوص کی پیمائش بڑی ہی مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنس پاکیزہ محبت کا بگاڑ تو نہیں بلکہ اس میں چار چاند لگاتا ہے۔ ہاں بوالہوسی کا معیار پست اور جنس کو محبت کہنا گناہ ہے۔ وہ ایک خاص شخصیت کے کردار ہوتے ہیں۔ جن کا تغزل کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا۔

خلوص تعلق یا محبت کے یہ اشعار کتنے حسین ہیں ؎

نظر آئی اک شکل مہتاب میں　　کمی آئی جس سے خور و خواب میں

نہیں ہے ربط کوئی پھر بھی دل یہ کہتا ہے　　وہ ہم کو دیکھ تو لیں چاہے گفتگو نہ کریں

نہ تم بولتے ہو نہ ہم بولتے ہیں　　مگر دل ہمارے بہم بولتے ہیں

کچے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں کب کے ساتھی چھوٹ چکے ہیں　　جانے کیوں دل تم کو اب تک اپنا سا مانا جاتا ہے

یہ کتنے اچھے اشعار ہیں۔ جو محبت سے وابستہ ہیں۔

دلی تعلقات پر نفسیاتی بحث کرنا ایک مشکل بات ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق دل سے ہے اور الفاظ میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا پر سید احتشام صاحب سے ایسا ہی تعلق تھا۔ اور انھوں نے دو ایک بار جب کسی سے میرا تعارف کرایا تو انھوں نے کہا "یہ بالکل میرے بچے جیسے ہیں یہ ویسے ہی محبت کرتے ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ نے فرمایا کہ "احتشام صاحب سکروال کو بہت پیار کرتے تھے اور جس سفر میں ہم ہریانہ ہماچل ہوتے ہوئے جاتے تھے۔ تو وہ وہاں ان کو بلا کر ان سے ضرور ملتے تھے۔" میرے وہ استاد تھے۔ انھوں نے ترقی پسندی کی طرف راغب کیا۔ اور نئی نئی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ ترقی پسند خیالات سے الجھنا اور کھیلنا میرے لیے انھیں کی دین ہے۔ خیالات کے آئیڈیلزم کا چسکہ انھیں نے لگایا۔ اور حسین ترین بات یہ ہے کہ ہم سب ان کے خیالات قریب قریب ہر موضوع پر ایک سے تھے۔ اسی بنیاد پر دلی محبت کی عمارت کھڑی تھی۔ جو کہ ایک شاندار یادگار استاد کا عطیہ ہے۔ جب میں ان کے گھر پہونچا۔ ان کی میت رکھی تھی۔ اور میرا نام ان کے گھر والوں و خاندان کے افراد کی زبان پر ایسا رواں تھا کہ جیسے میں ان میں سے ایک ہوں۔ اپنے استاد کے غم کے بارے میں لکھنا بے کار ہے۔

بحیثیت معلم میرا ان کا تعلق ۱۹۶۲ء میں ختم ہوا جب کہ میں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ پی ایچ ڈی کا موضوع "پریم چند" تھا۔ جو اب کتاب کی شکل میں شائع بھی ہو چکا ہے جس پر استاد معظم کا دیباچہ ہے۔ جو کہ انھوں نے انتقال سے چھ ماہ پیشتر ہی لکھا تھا۔ ان کو بڑی مسرت تھی کہ وہ شائع ہوئی۔ استاد اور شاگرد کا ناطہ ٹوٹ گیا تھا۔ مگر ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میری ابھی ادبی شخصیت ان کی طرف کھنچ چکی تھی۔ اور میں نے یہی سمجھا کہ یہ ناطہ جڑا ہوا ہے۔ جو ٹوٹنے کی چیز نہیں ہے وہ ایک دیانت دار انسان تھے۔ اور انھوں نے مجھے دیانت داری کا درس پڑھایا۔ جو کسی کتاب میں نہیں ملتا مگر ایک اچھے انسان سے ملاقات پر ہی سیکھا جا سکتا ہے۔ خلوص، انسانیت، شرافت اور دوسرے کی بات ہمدردی سے سننا ایسی خوبیاں تھیں۔ جو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ انھیں استاد کہتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ دو گھنٹہ یا دو چار سال کے معلم نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک ایسے معلم تھے۔ جو کہ زندگی کے معلم کہلائے جا سکتے ہیں۔

جب وہ ایم اے کے کلاس لیتے تھے تو فضا ہی ادبیت کی بن جاتی تھی۔ صرف کتابوں پر ہی اکتفا نہ ہوتی تھی۔ بلکہ خیالات کا اظہار کہاں تک مناسب ہو سکتا ہے۔ اور نئے نئے اسکولوں نے ان موضوع پر کیا کیا لکھا ہے تنقیدی بحث ہوتی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں خیالات آئیڈیلزم تھا۔ جب کلاسوں کا ایسا ماحول ہو تو کوئی بھی طالب علم جو ادب سے انسیت رکھتا، پروفیسر صاحب کی تقریر کی جادو

موضوع کی کشش ایسے طالب علم کو ضرور اپنی طرف کھینچتی تھی۔ جو تھرڈ کلاس طالب علم بھی فرسٹ کلاس طالب علم بننے کی تمنا کرتا تھا ہمارے کلاس میں لڑکیاں بھی تھیں۔ اور ہم لوگ موضوع کی اڑان میں ایسے کھو جاتے تھے کہ اپنی سدھ نہیں رہتی تھی۔ ادبی فضا بہت کہاں بند ہو جاتا تھا۔ اور دل یہ چاہتا تھا کہ یہ پیریڈ نہ ختم ہو۔ یا اگلا دن پھر جلدی سے واپس آئے۔ اور ہم لوگ ادبی رومانیت سے محظوظ ہو سکیں۔

وہ ریچ کوٹ کے معلم تھے جو کہ اپنے شاگردوں کو پیار کرتے تھے۔ اور خاص طور سے اردو ادب کے پجاری تھے۔ ان کو معلم کی شخصیت میں بڑی آسودگی ملتی تھی۔ کیونکہ اس حیثیت سے ریچ کوٹ کے ساتھ کا پرچار ممکن ہے۔ یہ بات میں نے تب محسوس کی جب میں نے ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی جوائن کی۔ وہ خوشامد سے چڑھتے تھے۔ ٹھوس کام پسند کرتے تھے۔ جس میں تصنع کا نام نہ ہو۔ اور کڑی محنت کا پھل ہو۔ چنانچہ اپنی کتاب کے ایک ایک باب کو تین تین چار چار مرتبہ دکھاتا تھا اور وہ اسے کاٹ دیتے تھے۔ کیونکہ وہ محنت سے پڑھتے تھے۔ اس پر غور کرتے تھے اور نئی سے نئی کتاب پڑھنے کو بتاتے تھے۔ اور لکھنے میں ہمیشہ نئی بات پیدا کرنے کے کوشاں رہتے تھے۔ ان کا یہ طور نہ تھا کہ طالب علم کے چیپٹر کی شروع کی دو لائین پڑھ کر کہہ دیں کہ اسے پھر سے لکھو۔ اس سے ریسرچ اسکالر کو دھکا پہنچتا ہے۔ اور ریسرچ کے معیار میں تنزلی آتی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب چیپٹر مجھ سے نہیں بنا تو انھوں نے خود تھوڑا لکھا کر میری حوصلہ افزائی کی۔ یہی ایک ریسرچ معلم کی ممتاز خصوصیت ہے۔ وہ معلم کے علاوہ زندگی بھر خود بھی طالب علم رہے۔ زندگی کو غور سے دیکھا۔ اپنے خیالات کی وجہ سے شروع شروع میں تکالیف اٹھانی پڑیں۔ لوگوں نے ان کی دھار دھارا پسند نہ کی۔ لیکن آج اردو ہندی انھیں کی دھار دھارا سے ڈھا ہوا ہے۔ اور ہندستانی ادب نے ایک نیا موڑ اختیار کر لیا ہے۔ اور اگر کوئی پریم چند جیسے ادیب کو رجعت پسند ادیب کہے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کی صف میں ان کا مرتبہ بہت ممتاز ہے۔ اگر ان کو بانیٔ جدید تنقید کہا جائے تو بجا ہوگا۔ سید احتشام صاحب امریکا اور انگلینڈ، یورپ اور روس گئے تھے۔ وہاں کے ادب و انسانی زندگی کو انھوں نے نزدیک سے دیکھا تھا۔ ان کا نظریہ ایک ضلع کی سرحد کا پابند نہ تھا۔ وہ کسی ذات یا قوم کے زمرے سے اوپر اٹھ چکے تھے۔ وہ ایک انسان تھے اور انسان پرست تھے۔ یہی خصوصیت ہے۔ جو ان کو دوسرے ادیبوں سے اونچا اٹھاتی ہے۔ وہ ادب کے سچے طالب علم تھے۔ بنی نوع انسان ان کے تخیل کا مرکز تھا۔ وہ زندگی میں حسن دیکھنا چاہتے تھے۔ چاہے وہ ہندستانی ہو یا امریکا۔ جہاں ان کو سلمس (جھونپڑی کی آبادی) دکھائی دیتی تھی۔ تکلیف دیتی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ معیار زندگی کو اونچا کرنے یا زندگی کو حسین بنانے کے لیے وہ فکرمند رہتے تھے۔ ان کی یہ جستجو تھی کہ اگر کسی دیس نے خواہ وہ روس ہو یا امریکا ترقی کی ہے تو کیسے؟ اور کہاں کے لوگ خوش حالی کی زندگی بتا رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ روس کے والدین دوسرے ممالک کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہیں۔ اور خوش حالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کیونکہ ان کو اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں فکر نہیں ہوتی ہے۔ سماج ان کی تعلیم و تربیت، شادی اور روزگار کا ذمہ دار ہے اس کے برعکس ہندستان میں ہندستانی والدین بہت زیادہ پریشان ہیں اور زندگی کے لطف سے کافی حد تک محروم بھی ہیں۔ وہ اشتراکیت کے حامی تھے اور سب کو خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی کشمکش میں ان کی زندگی بیتی۔ اور غم دوراں نے ان کے حساس دل پر ایک ایسا اثر ڈالا کہ وہ دل کے مریض ہوتے ہوئے بھی اپنے مرض کو کچھ نہ سمجھے۔ وہ ادب کے ذریعہ اس جنگ میں سب سے آگے تھے۔ انھوں نے دنیا کی مختلف دھار دھاراؤں کا مطالعہ کیا تھا۔ اور ہمیشہ سچ بات ماننے کے لیے تیار تھے۔ ان کے

خیالات میں پھیلی تھی۔ اور اردو ادب کے ذریعہ جو بڑا جانشین با جمہوریت کی خدمات ہو سکتی تھیں ان کا انھوں نے بہترین نمونہ پیش کیا۔ یہی راز فن کار کو کامیاب بناتا ہے اور انھوں نے اپنی شخصیت کی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ادب کی تاریخ میں بھلائے نہیں جا سکتے۔

ان کے شاگردوں کے لیے یہ ایک بہت بڑا غم ہے کہ وہ مرگ ناگہانی سے بے وقت دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کی ادبی خدمات و شخصیت کبھی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ان کی تصنیفات کا مطالعہ ہو۔ اور ان کے مختلف پہلوؤں پر ریسرچ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ ترقی پسند اردو ادب کا "جیتا جاگتا" ہونا زمانے کا تقاضا ہے۔ اور یہی ایک ایسے علم کے لیے حسین ترین خراج عقیدت بھی ہے۔

محمود ایوبی - ایم - اے

سیّد احتشام حسین

بس اتفاق تھا کہ کئی دنوں تک احتشام صاحب وہاں تشریف نہ لا سکے ورنہ یہ ان کا معمول تھا۔ جانے کیا وجہ تھی؟ ہم لوگوں کو کافی انتظار کرنا پڑا۔ جب آئے تو میں نے پہچان تو لیا لیکن گم سم بیٹھا رہا۔ گم سم وہ بھی بیٹھے تھے۔ تیکھے نقوش جس پر بہت پہلے چیچک نے بھی مشق ستم کیا تھا، لیکن اب تک اس کے نقوش باقی ہیں، بہت اونچی پیشانی اور تیزی سے جھڑتے ہوئے خشک سے کھچڑی بال، میں نے اس قدر قریب پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور کوٹ پتلون کی بجائے ترچھی ٹوپی اور شیروانی میں دیکھا تھا۔ جلسوں اور تقریبوں میں بھی وہ گم سم، دور نظر گاڑے جیسے اس محفل کی کارروائیوں سے بالکل بے خبر ہوں۔ بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ آج بھی وہی عالم تھا جس وقت تعارف کرایا گیا وہ اُٹھ کر الماری میں لگی ہوئی کتابوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے سمجھا کہ انھوں نے ٹھیک سے نام تک نہیں سنا ہے، بھلا وہ مشورہ یا معاونت کیا خاک کریں گے لیکن یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہوگئی، بعد میں وہ جب بھی علی گڑھ آئے اور مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی تو ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے میرے متعلق دریافت ضرور کیا۔ بہر کیف جب وہ اس عالم بیخودی سے بیدار ہوئے تو میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، نرم اور ٹھنڈے ہاتھ۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ احتشام صاحب ابھی عمر کی اس منزل میں نہیں پہنچے ہیں جہاں پہنچ کر زندگی کی گرمی زائل ہو جاتی ہے اور اعضا میں عجیب سی ٹھنڈک بھر جاتی ہے۔ ماجرا کیا ہے آخر؟ مجھے اس کی کرید کیوں تھی۔

میں سوچتا رہا کہ احتشام صاحب مارکسی اور عمرانی فلسفہ کے پرستار ہی نہیں مبلغ بھی ہیں۔ اقبال کے کلام کی روح تک ان کی رسائی ہے اور دونوں ہی عناصر حیات بخش اور رجائی ہیں۔ لیکن ان کے ہاں ایسی بے کیفی کیوں ہے؟ زندگی کی چمک اور تب و تاب کیوں نہیں ہے؟ ان کی طبیعت کچھ ناساز تو نہیں؟ اس وقت تو یہ معمہ تھا لیکن بعد کے شواہد اور روایات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عقلاً وہ رجائی فلسفہ کے پرستار ہیں لیکن عملی زندگی میں اسے تمام برت نہیں سکتے۔ ان کے یہاں ایک قسم کی انفعالیت ہے۔

اس بے کیفی اور انفعالیت کا سراغ آپ جب تک ان کے بہت قریب نہیں گئے، نہیں پائیں گے۔ ویسے بھی ان کی شخصیت اتنی آسان نہیں۔ بظاہری طور پر احتشام صاحب سے مل کر ان کے اخلاق اور ملنساریت کے قائل تو ہو جائیں گے بلکہ ممکن ہے گرویدہ بھی ہو جائیں۔ لیکن ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز کسی کے لیے فردوس گوش ثابت نہیں ہو سکتی۔ ان کی اندرونی شخصیت کا حسن پتھر کے اندر انگڑائی لے رہا ہے۔ مجسمہ ساز غیر ضروری اجزا کو ہٹا کر جسم کے حسن کو بے نقاب کر دیتا ہے لیکن احتشام صاحب کے یہاں بیکار اس کی ساری محنت اکارت جائے گی یہ پتھر اتنا سنگلاخ ہے کہ مجسمہ ساز کی چھینی ٹوٹ جائے گی لیکن پتھر پر نشان تک نہیں پڑے گا۔

مصنف کی تحریر اس کی شخصیت کو بے نقاب کر سکتی ہے لیکن احتشام صاحب کی تحریر بھی ان کے جلوے کو عام نہیں کرتی، اولاً تو ان کے یہاں سنجیدگی، علمیت اور فلسفے کی اتنی گرانباری ہے کہ عام پڑھنے والا موضوع کی تہہ تک بہزار دقت پہنچتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت اونچی سطح پر بیٹھ کر

علم و دانش کا شہنشاہ موتی لٹا رہا ہے لیکن عام نظریں موتی کی جدت اور انفرادیت سے ناواقف ہیں۔ چونکہ اس کے اندر ظاہری چمک نہیں اس لیے اسے اپنا گوہر مقصود نہیں سمجھتا۔ ظاہری طور پر نہ موتی کے اندر معنویت اور فکر کی دولت پوشیدہ ہے جسے اس کی تلاش ہے وہ احتشام صاحب کی تحریر سے دلچسپی لے سکتا ہے۔ مگر یہ نہ بھولیے کہ ان کی شخصیت کے جلوے سے وہ بھی محروم رہے گا یہاں کے اشعار بھی تو فکر و فلسفہ کے ٹکڑے ہیں۔ ان کے ساتھ تو ویرانے میں گشت کیجئے ممکن ہے کچھ ہاتھ آجائے۔

نفسیاتی تنقید کے علمبردار الفاظ میں بھی شخصیت کی قاشیں تلاش کرتے ہیں۔ ممکن ہے نفسیات کے خم و پیچ گمراہ کن ہوں۔ لیکن اس کی صحت سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کتابوں کے دیباچے تو خیر شریک مجموعہ مضامین کے پس منظر ہیں یا خیالات اور تصورات کے آئینہ دار۔ لیکن انتساب اپنے قلبی تعلقات اور رابطے کا مظہر۔ انتساب کے چند الفاظ ہیں: روایت اور بغاوت کو والد صاحب کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ والد سے انھیں کتنا لگاؤ تھا والد کی ان پر کتنی گہری شفقت تھی، کیا ان رموز سے آپ واقف نہیں ہو سکتے، ضرور ہوں گے اور یہ بھی جان لیں گے کہ پیار اور محبت کا سایہ یعنی باپ بہت جلد اس دنیا سے اٹھ گیا۔ احتشام صاحب کی کتنی خوں گشتہ آرزوؤں کی کہانی کا کوئی عنوان نہ بن سکا۔ سفر کلکتہ اور سائیکل کی خریداری ایسی ہی حسرتوں کی بنیاد ہیں جن پر ان کی زندگی کی محرومیوں کا ڈھانچا تیار ہو سکتا ہے۔

ایک نوجوان جس کی تعلیم ادھوری ہے، جس کی آرزوئیں تشنہ ہیں، اس دنیا میں بے یار و مددگار۔ متوسط طبقہ میں اس نے آنکھیں کھولی ہیں جس کے یہاں نمائش ہے لیکن حقیقت نہیں ہے ظاہری شان برتتا ہے لیکن کماؤ کے گزر جانے پر روٹی اور کپڑے کا مہیا ایک مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے کیا ہندوستان اس تلخ حقیقت کا شکار نہیں ہے کوئی وجہ نہیں کہ احتشام صاحب اس سے مستثنیٰ ثابت ہوں۔ ایسے خراب دنوں میں خویش و اقارب بھی بلا وجہ خصوصیت برتنے لگتے ہیں۔ ایسے میں جب امید کی کوئی جھلک نہ ہو تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسی حالت کا شکار نوجوان کس قدر پریشان ہوگا۔ چونکہ اس طبقہ کی وضع داری کی روایات اور تہذیب بھی اس کے خمیر کا جزو بن جاتی ہیں اس لیے کہ سامنے تاملات اور تکلفات کی چٹانیں بھی آکھڑی ہوتی ہیں احتشام صاحب نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین ان کے شفیق اور مہربان استاد ہیں لیکن ان کی اعانت قبول کرنے میں بھی احتشام صاحب کو جھجک ہوتی تھی۔ مگر خلوص کا جادو تو سر چڑھ کر بولتا ہے اور میرا تو خیال ہے کہ طوفان میں گھر جانے پر کوئی نہ کوئی سہارا ناگزیر ہو جاتا ہے، زندگی کے ہنگاموں کا مقابلہ کرنے کے لیے مفاہمت کرنی ہی پڑتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اپنے اندر کے باغی نوجوان کو دبا کر احتشام صاحب کی موجودہ شخصیت ابھری ہے۔ میں اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتا، ان کی ذہانت اور ذکی الحسی سے تو انکار محال ہے البتہ سرکشی کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ بچپن کا واقعہ سنئے۔ احتشام صاحب اور ان کے بچپن کے دوستوں نے یہ طے کیا کہ معینہ مدت تک کوئی بھی بال نہیں کٹوائے گا۔ بات طے ہوگئی اور بال بڑھنے لگے۔ لیکن اعجاز صاحب نے اعتراض کیا تو ایک آدھ دن ٹال مٹول ہوا۔ وجہ بھول جانا یا تساہل تھا اس وجہ کا ماخذ ان کا ضبط و احتیاط ہے جو ان کی معمولات زندگی، سفر کی تیاری اور کم نویسی کی اداؤں میں چھپ چھپ کر اب بھی نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ ورنہ اگر احتشام صاحب کے جذبہ میں باغیانہ ولولہ ہوتا تو وہ اگر دبدبہ نہیں تو دل میں تو ضرور یہ ٹھانتے کہ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ سوء اتفاق کہ ایک دوست بیمار پڑ گیا اور اس کے بڑھے ہوئے بال بیماری کی نذر ہو گئے۔ انکی اور انکے دوستوں کی مہم واپسی کا یہی حیلہ ثابت ہوا۔

بہر کیف تذکرہ واقعے سے جو شخص سامنے آتا ہے وہ انتہائی مصلحت اندیش، وضع دار اور محتاط ہے۔ احتشام صاحب خود زیادہ گفتگو نہیں کر سکتے لیکن اگر کوئی شخص انھیں اپنی طویل طویل گفتگو اس سے بور کرتا ہے تو وہ اپنی ناپسندیدگی کو ظاہر نہیں ہونے دیں گے بلکہ انتہائی جمعیت خاطر سے جب تک وہ شخص خود چپ نہ ہو جائے یا اپنی گفتگو سے تھک کر جانے کی اجازت نہ مانگے، احتشام صاحب بیٹھے رہیں گے اور سنتے رہیں گے۔ اس وضع داری میں ان کا ضروری کام یا یونیورسٹی یا ریڈیو کی تقریر کا وقت کیوں نہ ٹل جائے وہ اب ویر تک سنانے دیں گے۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ہے، وہ اپنے عزیز دوستوں یا شاگردوں کو دبی زبان میں ٹوک بھی سکتے ہیں۔ نسیم قریشی کی طرح معلوماتی، دلچسپ اور مسلسل گفتگو شاید ہی کوئی کر سکتا ہے۔ احتشام صاحب نے

اس کا الفہ کھینچے ہوئے ایک صحبت میں رہتا یا تھا کہ دس پندرہ گلوری پان کھاتے۔ دو تین گلاس پانی پیتے ہیں اور جب تک میں یہ دیکھوں کہ یونیورسٹی جانے کا وقت ہو گیا ہے وہ بات کرتے جاتے ہیں۔ ویسے ظاہری طور پر تو اپنی بزرگیت ظاہر نہیں ہونے دیتے اور وہ صاحب کمال عقیدت سے ان کا دماغ چاٹتے رہتے ہیں۔ کوئی تشاعر آ جائے تو اس کے الٹے سیدھے اشعار بھی گھنٹوں سنتے ہیں۔ ان کی یہ مروت بھر ادیبوں پر قلم اٹھانے میں متامل ثابت ہوتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ بےلاگ تبصرے سے اپنے ملنے والوں کو برہم کر دیں۔ دروغ برگردن ماوی اردو کے ایک بزعم خود ایک "ناولسٹ" نے احتشام صاحب سے اپنی کتابوں کے متعلق رائے دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں ایسی گھٹیا کتابیں نہیں پڑھتا۔ بعد میں احتشام صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ صاحب خود ہی مصنف تھے تو انھیں بڑا افسوس ہوا کہ ناحق کسی کی دل شکنی ہوئی۔ اسی مروت کا کرشمہ ہے کہ تیسرے درجے کے نہ جانے کتنے "ادیبوں" اور نقادوں نے اپنی کتابوں پر احتشام صاحب سے دیباچہ لکھوایا ہے۔ ایک لطیفہ تو یہ بھی ہے کہ انجینیرنگ کی کسی کتاب پر بھی احتشام صاحب کا دیباچہ موجود ہے۔ ان کی فطرت کے اس رخ سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد آپ چاہیں تو ٹٹ پونجیا سے ٹٹ پونجیا محفل اور تقریب کی صدارت ان سے کروا لیجیے۔ اگر مصروفیت حد سے زیادہ ہو گی تو کم از کم اپنی شرکت سے ضرور نوازیں گے۔

پابندیٔ رسوم و قیود کا ہی نتیجہ ہے کہ ڈرائنگ روم اور صوفوں کا انتظام کیا ہے۔ عمر بھر ترچھی ٹوپی اور شیروانی کو اپنائے رکھا لیکن امریکہ جانے لگے تو دو چار سوٹ اور انگریزی کپڑے بھی بنوا لیے اور جب ہی سے احتشام صاحب انگریزی پوشاک میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

حد سے بڑھتے ہوئے ضبط اور احتیاط نے بے نیازی کا رخ بھی اختیار کر لیا ہے۔ ڈرائنگ روم کے صوفے کی اسپرنگ بعض بعض جگہ سے غائب ہے غلطی سے اگر آپ نے اپنی جگہ وہیں بنائی تو آپ کو دوسری طرف جا کر بیٹھنا چاہیں گے۔ آخر اس قدر احتیاط کیوں؟ اپنے کپڑے اور جوتے چھوٹے بھائی سے خرید واتے ہیں۔ اگر اتفاقاً خود جانا پڑے تو نسیم صاحب (مالک دانش محل) کو ضرور ساتھ لے لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں زیادہ سوچنا اور کم لکھنا سفر سے گھبرانا، یہ سب احتیاط کی مختصر ترین زبانیں ہیں۔ ارے صاحب کنجوسی تو ایک حیلہ ہے۔

احتشام صاحب کے پاس شان براہیمی کی تلاش سعی لاحاصل ہوگی۔ آتش نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا حوصلہ ان کے یہاں مفقود ہے۔ ان کا دل غنی اور دماغ وسیع ہے ان کے یہاں قلندرانہ شان ضرور ہے وہ صوفی ہیں صوفیت ان کی افتاد مزاج میں رچ بس گئی ہے۔ توکل ان کا شیوہ ہے۔ متعلقے اور سقت سے گریز کرتے ہیں لیکن حریفوں کو ان سے خطرہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ ہاں جب یہ گھڑی گذر جاتی ہے اور احتشام صاحب کی بے نیازی جلوہ افگن ہوتی ہے تو وہ شخص ان کا حقیقی بہی خواہ ہو جاتا ہے۔ انھیں اپنا حریف نہیں دوست سمجھتا ہے اور اس کا ڈھنڈورا پیٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حریفوں کی تو بات چھوڑیے جس شخص کو بھی احتشام صاحب سے سابقہ پڑتا ہے وہ ان کا مداح اور بہی خواہ ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا امکان ہے کہ احتشام صاحب یار باش قسم کے انسان تو نہیں۔ ارے نہیں صاحب، انھیں ہنگاموں سے دور کا بھی واسطہ نہیں شاید کسی تفریحی مجلس میں دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت گنج یا کافی ہاؤس میں آپ احتشام صاحب کی پرچھائیں تک نہیں پائیں گے۔ دانش محل میں وہ البتہ پابندی سے آتے ہیں۔ یہاں مختلف شعبہ اور حیثیت کے لوگ بیٹھتے ہیں اور سب ہی احتشام صاحب کی دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ یہاں مختلف موضوعات پر بات ہوتی ہے حتیٰ کہ فلم اور اسپورٹس پر بھی اور احتشام صاحب بھی حسب توفیق شریک ہوتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ محفل انڈو ٹی اسٹال میں منتقل ہو جاتی ہے تو احتشام صاحب بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

گو امریکہ میں انھوں نے آرٹ گیلریاں، نمائش گاہوں اور فلموں کو دیکھا ہے لیکن لکھنؤ کے محرم یا ہندوستانی فلم اور آرٹ گیلری کے دیدار سے محروم رہتے ہیں۔ انھیں ہنگاموں اور تفریح کا شوق کہاں، دنیاوی علائق سے کٹ کر مطالعہ میں پناہ لی ہے۔ اردو فارسی ہندی اور انگریزی ادب کے شہ پارے ان کے بہترین رفیق اور تفریح کا باعث ہے۔ ہر موضوع پر ان کا مطالعہ وسیع ہے اور اسی کے طفیل ان کا ذہنی افق ناپید اکنار ہوا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنے جذباتی جبلّت پر بھی مطالعہ کی بدولت قابو پایا ہے۔ زندگی کے کسی رخ کو وہ جذباتی انداز میں قبول نہیں کرتے ہیں بلکہ انتہائی

دو ناغ سنجیدگی کے بعد۔ یہ وطیرہ انھیں جہاں ثروت منفی عطا کرتا ہے وہاں انھیں بعض اندیشوں میں بھی مبتلا کرتا ہے۔ چونکہ احتشام صاحب بجا طور پر اپنے کام کے لیے اپنے رسوخ کو استعمال نہیں کرتے اس لیے ان کی سنجیدگی اور ثروت منفی اکثر یاسیت کی حد کو بھی چھو لیتی ہے۔

"ادب اور سماج" کو انھوں نے رفیقہ حیات کے نام سے معنون کیا ہے بظاہر یہ دو لفظ عام اور سیدھے سادے ہیں لیکن ان پر تو احتشام صاحب کی سنجیدگی بت اور پہلو چھپے ہیں۔ اگر انھیں اُبھار کر دیکھا جائے تو انس و محبت کا ایک دریا ہے جو اس کوزہ میں سمٹ گیا ہے۔ چونکہ انھوں نے اپنے جذبات کو دعار یاد اور سنجیدگی کو پتھر رکھ دیا ہے اس لیے ان کی خانگی زندگی بھی بڑی پرسکون ہے۔ انھیں اپنے بچوں سے زیادہ پیار ہے۔ یہی بچے صوفوں کے اسپرنگ، ان کی تیلیوں اور ڈرائنگ روم کے قالین کو بگاڑنے والے ہیں لیکن احتشام صاحب انھیں ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے وہ اگر فلسفہ اور جمالیات کی بحث میں بھی مشغول ہوں گے تو ان کے بچے گود میں چڑھے جائیں گے۔ شہ پکڑ کر اپنی طرف کریں گے یا کیرم بورڈ لا کر دہیں جم جائیں گے۔ احتشام صاحب سے زیادہ انھیں جانے کو کہیں گے تو وہ نہیں نہیں کر کے گھومنے والی شیلف کے لاگو ہو جائیں گے۔

بچوں ہی کی طرح احتشام صاحب اپنے شاگردوں کا خیال رکھتے ہیں۔ میں ان سے لکھنؤ یونیورسٹی ملنے گیا تو انھوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ خیریت پوچھی اعلیٰ گڑھ میں اپنے دوستوں کا حال دریافت کیا اسی اثنا میں ان کے کچھ طالب علم ایک معمولی سا رسالہ لیے ہوئے آئے۔ نہایت معمولی اور طالب علمانہ سا رسالہ تھا لیکن پھر بھی احتشام صاحب نے اسے بڑی خوشی سے قبول کیا۔ رسالے میں احتشام صاحب کا پیغام بھی چھپا تھا۔ کچھ اسی طرح وہ طالب علموں کی حوصلہ افزائی اور غم گساری کرتے ہیں۔ مناسب اور مستحق طالب علموں کی فریاد ہمدردی سے سنتے ہیں۔ حاضری کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی مالی مشکلات کا حل ڈھونڈتے ہیں اور اپنے ذرائع اور رسوخ کو بھی حرکت میں لاتے ہیں۔ محمد حسن صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی بیروزگاری سے احتشام صاحب کس قدر پریشان ہوئے۔ احتشام صاحب کو دیکھ کر یا ان کے بارے میں سن کر مجھے عہد قدیم کے وہ گرو یاد آ جاتے جو باپ سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے جن کے سامنے بل نہیں بلکہ ہدیۂ دل تحفۂ جگر سمجھا جاتا تھا اور وہ بھی اپنے لختِ جگر کی طرح اپنے شاگردوں کی ذہنی ترقی اور تہذیب اپنا فرض سمجھتے تھے۔

آپ احتشام صاحب کے متعلق مزید واقفیت پیدا کرنے کے لیے ان کے مکاتیب اور ڈائری کا سہارا لینا چاہیں گے تو یہاں بھی امید بر نہیں آئے گی۔ ان کے مکاتیب بھی سیدھے اور سپاٹ ہوتے ہیں۔ حالات اور خیریت کو بیان کرنے والے اس میں بھی کیف و کم کی روداد نہیں ہوتی بلکہ انھیں دیکھنے سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ احتشام صاحب عالمانہ اور فاضلانہ مضمون کو خواہ جتنی وضاحت اور ارتکاز کے ساتھ بیان کریں لیکن اگر انھیں کیفیات و احساسات کی نقش گری کا کام سونپا جائے تو انھیں اگر ناکامی نہیں دشواری ضرور ہوگی۔

یہی حال ساحل اور سمندر کا ہے سفرنامہ امریکہ کہ لیجیے یا دور دیش میں جذبات و کیفیات کا مرقع۔ حالانکہ یہ ان چیزوں سے کچھ بھی نہیں ہے بلکہ ایک روئداد ہے جس میں سنجیدہ موضوعات کو چھیڑ کر اپنی تنہائی کے لمحات کو بھلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر کہیں جذبات بے قابو ہو کر اُبھر بھی پڑے ہیں تو ان پر سنجیدگی کا گرانبار پتھر ڈال دیا گیا ہے۔ احتشام صاحب نے خود ہی لکھا ہے کہ زندگی کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہونے کے لیے بعض اوقات بچہ بننا پڑتا ہے، بوالعجب حرکتوں کا مرتکب ہونا پڑتا ہے اور وہ اپنے اندر اس حوصلے کی کمی پاتے ہیں۔ یہ کمی ان کی پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ انھوں نے زندگی کی عشوہ طرازیوں کا لطف نہیں لیا ہے بلکہ سنجیدگی کے خول میں اسیر رہے ہیں۔ یہ خول دراصل آرزوؤں کے ماتم صد ہزار انجم کا بہلاوا رہا ہے۔ فقر و قناعت کا یہ سہارا انھوں نے کشتۂ ناتمام تمناؤں کے غم سے بچنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ اب تو وہ صوفی ہیں۔ اور انسان کے برتر اور بہتر اخلاق اور سیرت کے پرستار۔ یہ سعادت بزورِ بازو بھی ہے اور بخشندہ کا معجزہ بھی۔ تب ہی تو انھوں نے اپنی تشبیہ (AS YOU LIKE IT) کے کردار جیکس سے دی ہے جو قہقہوں پر یاس کو ترجیح دیتا ہے اور یاس کا یہ سرمایہ اپنا سب کچھ لٹا کر حاصل ہوتا ہے۔ جیکس کی یاس پرستی یاس کے بے شمار اسباب کے باوجود اس کی انفرادیت کی بھی غماز ہے۔

واثق جونپوری

ایک تاثراتی خط

برادر گرامی قدر۔ تسلیم مع التکریم۔ نوازش نامہ مورخہ ۴ ستمبر ۷۳ء موصول ہو کر کاشف حالات ہوا۔ اس سے پہلے والا خط شاید محکمۂ ڈاک کے ردی خانہ میں پڑا ہوگا اس لیے نہ مل سکا۔ حسب الارشاد فروغ اُردو کے احتشام نمبر کے لیے مندرجہ ذیل چند اوراق نذر کر رہا ہوں۔ مرحوم کو بہت قریب سے جاننے والوں میں بھائی ہونے کے ناتے آپ اور بحیثیت اُن داماد ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کے اسمائے گرامی زبان پر آتے ہیں اس لیے احتشام صاحب مرحوم کی شخصیت سے متعلق میرے مشاہدات اور تاثرات پر توثیق کا حق بھی سب سے زیادہ آپ ہی حضرات کو پہنچتا ہے۔

یوں تو ملک میں اُردو کا کون سا جریدہ ہے جس میں احتشام صاحب پر مسلسل نہ لکھا جا رہا ہو اور باشعور ارباب وطن کا وہ کون سا جلسہ مشاعرہ کانفرنس اور سمپوزیم ہو رہا ہے جس میں مرحوم کے مرنے پر سوگ نہ منایا جا رہا ہو۔ مگر اس ضمن میں نیا دور (یو۔پی) نے ابتک سب سے اچھا دستاویزاتی نمونہ پیش کیا ہے۔

نیا دور کا احتشام نمبر جعفر مہدی سلمہ کی معرفت مجھکو قدرے تاخیر سے ملا تھا۔ جس کو میں نے سب کا سب ایک سانس میں پڑھ ڈالا۔ نظموں میں شمیم کرہانی کا مسدس "جان برادر" بہت پسند آیا۔ مضامین میں چھوٹے سے بڑے تک (علاوہ دو ایک صاحبان کے) سب نے نہایت حقیقت آمیز اخلاص میں ڈوبی ہوئی احتشام صاحب کی امیج پیش کی ہے۔ ظ۔ انصاری کے تاثرات نے تو میرے دل و دماغ کو وہ کچوکے دیے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اتنی مختصر تحریر اور اس میں اتنی سچی اور حسین تصویر۔ بس یادوں کے فریم میں سج کر رہ گئی۔ میں روتا نہیں مگر ظ۔ انصاری کے اندازِ بیان نے (جو ہمیشہ اُن کا ہوتا ہے) میری آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکال ہی لئے۔ واہ ظ۔ صاحب۔ آہ احتشام صاحب۔

گذشتہ نو دس مہینوں میں احتشام صاحب پر جس قدر لکھا گیا ہے وہ شاید باید۔ اور اُن کے مرنے پر جتنا ماتم کیا گیا ہے اس کی گونج ابھی تک سنی جا رہی ہے اور نہ جانے کب تک سنی جائے گی۔

ٹوٹتا ہے سہارا مدت کا صبر آتے آتے آئے گا

کیا بات ہے۔ کیا یہ سب سوگواران احتشام حسین مردہ پرست ہیں۔ بے کم و کاست اس کی تردید اس حقیقت میں مضمر ہے کہ احتشام صاحب زندگی ہی میں اپنی عظمت کو منوا چکے تھے اور معراج محبوبیت پر فائز ہو چکے تھے۔ آج ان کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو اُن کی زندگی کی بازگشت ہے۔ ان کی اچانک اور قبل از وقت موت بالکل یوں لگ رہی ہے جیسے کوئی بہت ہی قیمتی اور دل پسند شے گم ہو گئی ہو اور اس کو دوبارہ ڈھونڈ نکالنے کی تگ و دو جاری ہو۔

جب کوئی بڑا آدمی مر جاتا ہے تو اہل قلم اور معترضین زیادہ تر اُس کی سماجی شخصیت اور انسانی کردار پر اظہار خیال کرتے ہیں مگر احتشام صاحب کے معاملہ میں چند لوگوں نے ان کی تنقیدوں پر تنقید اور تبصرہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان تبصروں سے اتفاق یا اختلاف یہاں مقصود نہیں۔ البتہ یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ اُن لوگوں کا یہ انداز بے محل ضرور ہے۔

اس کے لیے تو صدیاں پڑی ہوئی ہیں۔ مرحوم کی تنقید و تحریر پر تم کیا تبصرہ کرو گے۔ ان کو تو وہ آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے تمہارے پاس امانت کے طور پر چھوڑ گئے ہیں۔ اس سرمایہ کو بس اُن تک پہنچا دو۔ نامہ بر کو خط یا پیغام پر تبصرہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ عملی تنقید کو اور بھگلیشو ہونا چاہیئے۔ اور یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تعریف و منقبت دونوں میں ہم عصر ہونے کی وجہ سے تم غلطی ضرور کام لوگے اور اپنی ذات کو ضرور شامل کرو گے اس لیے یہ کام آنے والی نسلوں پر چھوڑ دو تو ادب پر بڑا احسان ہوگا۔ البتہ مرحوم کی تحریروں سے جس قدر بھی افادہ کر سکو کر لو کوئی معترض نہ ہوگا۔

فی الحال تو اُن پر ایک انسان محض کی حیثیت سے حاصل اظہار خیال ہونا چاہیئے تاکہ اُن کی شخصیت بھر پور ابھر کر سامنے آئے۔ انسان کی حیثیت سے مرحوم، پروفیسر احتشام حسین صاحب........ سے کہیں زیادہ عظیم شخص تھے۔ کیا آپ نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے جس کو کبھی غصہ نہ آیا ہو۔ ہاں۔ وہ احتشام صاحب تھے۔ کیا آپ نے ایسا بھی کسی کو دیکھا ہے جس نے اپنی تکلیف کی کبھی شکایت نہ کی ہو۔ جی ہاں۔ میں نے احتشام کو دیکھا ہے۔ کیا آپ نے کوئی ایسا بیمار (مطلب یہ کہ نزلہ زکام کھانسی بخار وغیرہ کی حالت میں) جس نے علاوہ معالج اپنی بیماری کا ذکر اور کسی سے نہ کیا ہو۔ نہیں مگر احتشام صاحب ضرور ایسے ہی تھے۔ اپنا حال دل تو وہ اپنے معالج تک سے نہیں کہتے تھے۔ سماج کی عطا کردہ ان امانتوں کو وہ اپنے کلیجہ سے لگا کر رکھتے تھے اس معاملہ میں اُن کا کوئی محرم نہ تھا۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ اُن پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بغیر کسی ڈاکٹر کو رجوع کئے ہوئے ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

ہاں احتشام صاحب! بغیر نوٹس دئے ہوئے آپ نے اتنا بڑا اتنا سنجیدہ اور اتنا جان جوکھم والا مذاق کر ڈالا۔ یہ تو اپنے چاہنے والوں پر آپ نے انتہائی ظلم کیا۔ آپ تو بڑے رحم دل اور دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنے والے تھے۔ سلام میں پیش قدمی کی رستہ کشی میں آپ نے ہم کو ہمیشہ شکست دی۔ مگر اُس دن جاتے ہوئے اس طرح نظریں پھیر لیں کہ ہم سلام کرتے ہی رہ گئے اور آپ نے تکبر آمیز انداز میں سر ہلا کر بھی جواب نہ دیا۔ درآنحالیکہ تکبر سے آپ کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ خیر اللہ آپ کا بھلا کرے۔ ہم پر تو جو گذر گئی وہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ آپ سے شکوہ و شکایت اور باتیں کرنے کو تو دل بہت چاہتا ہے مگر اس کے لیے پتھر کا کلیجہ کہاں سے لائیں۔ اب تو آپ سے باتیں کرنے میں دل کے ٹکڑے ہونے لگتے ہیں۔ ظ۔ انصاری سے ملاقات ہوگی تو پوچھیں گے کہ براہ راست آپ کو خطاب کرنے میں ان کے قلب کا کیا عالم ہوا تھا اور کتنے دنوں تک یونیورسٹی میں وہ روسی ادب کا کلاس نہ لے سکے تھے.......

احتشام صاحب کو کتابوں سے عشق تھا۔ ہمیشہ اور ہر وقت یعنی سوتے جاگتے سفر اور حضر میں ان کے پاس اُردو یا انگریزی یا کبھی کبھی ہندی کی خاص اور نو تصنیف کتابیں ضرور رہا کرتی تھیں۔ مرحوم کتابوں کو محض پڑھا اور جمع نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اُن کی ماہیت کا عطر نکال کر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ اور ان کے تبحر علمی کی یہی اساس تھی۔ احتشام صاحب کا حافظہ بھی غیر معمولی تھا۔ مصنفوں کتابوں اور ان کے صفحات کا حوالہ ان کی انگلیوں کی نوک پر رہتا تھا۔ مجھکو نہیں یاد کہ کبھی بھی اُن سے کسی کتاب کا ذکر آیا ہو اور انھوں نے اس سے لاعلمی ظاہر کی ہو۔ جوش صاحب کی یادوں کی برات کی ہندوستان میں پہلی کاپی اُن کے ہاتھ میں آئی تھی۔ ملحوظ رہے کہ مرحوم دیباچہ پڑھ کر کتابوں پر رائے نہیں دیا کرتے تھے۔ ان کی رائے کتاب کے متن کی نپی تلی عکاسی ہوا کرتی تھی۔

سلف میڈ لوگوں میں چونکہ بالعموم احساس کمتری ہوتا ہے اس لیے وہ اس کمزوری کو چھپانے کی کوشش میں انداز برتری سے کام لیتے ہیں مگر سلف میڈ ہونے کے باوجود احتشام صاحب نہ تو کبھی احساس کمتری کے شکار ہوئے اور نہ احساس برتری کے۔ جاہ طلب رکھنے والے انسان تھے۔ کسر نفسی اُن کے اعلیٰ کردار کا سب سے بڑا عنصر تھا۔ مرحوم کا اخلاق اور اعتماد متعدی قسم کا تھا۔ وہ اپنے مخاطب میں بھروسہ پیدا کر دینے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اونچے سے اونچی سطح پر بات کرنے والے تھوڑی ہی دیر میں اُن کی سطح پر بات کرنے والے تھوڑی ہی دیر میں اُن کی سطح پر آجاتے تھے۔ زیادہ سنجیدگی بھی آدمی کو اکثر بور بنا دیتی ہے مگر احتشام کی سنجیدگی بوریت سے بہت دور تھی بلکہ اس میں ایک جادو تھا۔ ان کے جملوں میں تیکھا پن اُن کے مزاج میں لطافت اور طنز میں حلاوت ہوتی تھی

مروت احتشام صاحب کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اور اسی کی بنا پر زندگی میں ان کو جس قدر نقصانات برداشت کرنا پڑے اُن کا ازالہ ممکن نہ ہو سکا۔ اس کمزوری کا شاخسانہ یہ بھی تھا کہ ترقی کے ہر موقع پر اپنا حق جتانے یا سفارشات کی مدد لینے سے انھوں نے ہمیشہ گریز کیا۔ کساد بازاری کے دور میں ان سب باتوں کا منطقی نتیجہ ظاہر تھا۔ مایوسیوں کو مرحوم نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے مگر دل پر کیا گذرتی تھی کبھی چہرہ سے ظاہر نہ ہوا۔ کیا نفس مطمئنہ پایا تھا۔

ان کے کردار میں ایک عجیب تضاد بھی پایا جاتا تھا یعنی وہ بڑے انصاف پسند مستقل مزاج اور سخت گیر بھی تھے۔ جس کو وہ غلط سمجھتے تھے اس کو کبھی نہ کرتے۔ ایک زمانہ میں اُن پر مضامین میں ادیبوں کے نام گنوانے اور کتابوں پر کثرت سے دیباچہ لکھنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ یہ اعتراض وہی چھوٹ بھیئے کیا کرتے تھے جو یا تو احتشام صاحب کو اچھی طرح جانتے نہ تھے یا جن کی پر مرحوم دیباچہ نہ لکھنے کا کوئی شرعی بہانہ نکال دیتے تھے۔ کچھ نے یہ زعم خود یہ سمجھتے تھے کہ اگر اعتراض کی سیڑھی لگا کر اُن سے دو دو باتیں کرلیں تو قد اُن کے برابر ہو جائے گا۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز رویہ یہ کہ وہی لوگ ایک دوسرے کے دواوین پر دیباچہ لکھتے ہیں اور اپنے مضامین میں کثرت سے اپنے احباب کے نام گنواتے رہتے ہیں۔

یہ بات غلط ہے کہ مرحوم کسی سے نفرت نہیں کرتے تھے اور یہ بھی غلط ہے کہ اُن سے کوئی نفرت نہیں کرتا تھا۔ وہ ابن الوقت سے سمجھوتا بازوں اور گروہ بندوں سے بے حد نفرت کرتے تھے البتہ بربنائے مروت و اخلاق اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن سے دوسرے حسد کریں اور حسد بے بسی کی صورت میں مبدل بہ نفرت ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ احتشام صاحب کی شخصیت قابل رشک تھی اور اس رشک میں ایک زمانہ مبتلا تھا اور یہ کوئی عیب کی بات بھی نہیں۔ البتہ مرحوم سے حسد و نفرت وہ لوگ کرتے تھے جن کا چراغ مرحوم کے آگے نہ چل سکا۔

انسان کو جب اس کی زندگی میں پیغمبر یا اوتار مان لیا جاتا ہے تو اس کے خلاف لوگوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں اور تعریف میں ہر بات مان لی جایا کرتی ہے۔ بلکہ تعریف کرنا ایک فیشن سا بن جاتا ہے مگر احتشام صاحب نہ تو پیغمبر تھے اور نہ اوتار بس ایک سیدھے سادے دانشور اور مفکر تھے اور بحیثیت انسان کے اُن کی عظمت اس خصوصیت میں مضمر تھی کہ انھوں نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا در آنحالیکہ اُن کا دل برابر دکھتا رہا۔

احتشام صاحب ترقی پسند اور مارکسی نظریہ پر اس لیے ایمان رکھتے تھے کہ اس میں ان کو بنی نوع انسان کی اقتصادی نجات نظر آتی تھی۔ احتشام صاحب ایک مذہبی آدمی اس لیے تھے کہ مذہب کی اخلاقی قدروں میں ان کو انسان کا سماجی اور تہذیبی ارتقا نظر آتا تھا۔

مختصر یہ کہ ان کی شخصیت میں قدیم اور جدید کا ایک نہایت حسین امتزاج تھا۔ اُن کی شخصیت ہشت پہل اور ہفت

ضرور تھی مگر اس میں حالات کے ساتھ قلابازی کھانے والی پرتیں نہ تھیں۔ مرحوم کا ضمیر آئینہ جیسا صاف تھا جس میں ہر شخص کو اپنی صورت صاف نظر آتی تھی۔

احتشام صاحب کا امیج نامکمل رہ جاتی ہے اگر یہ نہ کہا جائے کہ وہ بنیادی طور پر ایک گھریلو قسم کے آدمی تھے۔ ایک بڑے گھیرے کے کرتا دھرتا تھے۔ لباس میں زیادہ تر وہ شیروانی پہنتے تھے اور کبھی کبھی سوٹ جس پر وہ ہیٹ نہیں لگاتے تھے مگر شیروانی کے ساتھ کشتی نما ٹوپی ضرور پہنتے تھے۔ غالبًا وہ ہیٹ لگانا اس بنا پر ناپسند کرتے تھے جس بنا پر ہندوستان ایٹم بم بنانا نہیں چاہتا۔ یہ کوئی مزاقیہ جملہ نہیں ہے بلکہ اس میں ایک بڑی حقیقت پنہاں ہے۔ ذرا ملک کے رہبروں کے بیانات اور ملک کی اقتصادی حالت کو سامنے رکھئے مجھکو اعتراف ہے کہ میرے یہ سب تاثرات تشنۂ استدلال و حوالہ ہیں مگر اس کا جواز یوں پیدا ہو جاتا ہے کہ اول تو ایک مراسلہ میں اُن تفصیلات کی گنجائش نہیں ہوتی دوسرے یہ کہ مرحوم پر اب تک جتنے مضامین ضبط تحریر میں آ چکے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی واقعہ یا حوالہ میرے دعووں کی تائید ضرور کرتا ہے۔ تو تفصیل حاصل سے کیا فائدہ۔ ایک بات اور اور بس۔ وہ یہ ہے کہ علاوہ احتشام صاحب کے اعزا خاص کے کچھ اور لوگ بھی ہیں جو مرحوم کے احبائے خاص میں سے تھے اور جو ان کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ ان میں سرفہرست نام نسیم صاحب مالک مکتبہ دانش محل لکھنؤ کا آتا ہے۔ مرحوم کے دوستوں میں وہ تعزیت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ کم از کم ان کا انٹرویو لیکر ضرور شائع کیجئے۔ افسوس کہ دانش محل سے اس کی یہ شمع بجھا چھن گئی۔ میرا خیال ہے کہ ہر عظیم شخصیت کے مرنے پر اقبال کا یہ شعر ضرور پڑھا گیا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مگر کوئی دانشور جو دیدہ ور بھی رہا ہو تو اس کے لئے یہ شعر کتنا صادق آتا ہے جیسے احتشام صاحب تھے۔

والسلام

سوگوار

وامق جونپوری

سید اقتدار حسین - دہلی

بھیّا! ـــــ خدا حافظ و ناصر

معذرت:- میں اپنے بھائی کی گھریلو زندگی اور کچھ ادبی زندگی کے حالات لکھنے بیٹھا ہوں۔ اس سانحہ عظیم کے بعد دل و دماغ معذول بے کار ہو چکے ہیں۔ اس زندۂ جاوید کی صحبت میں ۱۹۲۶ء سے تقریباً لگاتار ۱۹۷۲ء تک ساتھ رہ کر نہ سیکھ سکا اور وہ پایا جسے اردو زبان کے "نقادِ اعظم" یعنی احتشام، اور "لسانیات کے شہنشاہ" یعنی احتشام نے دوسروں کو نہیں دیا۔ ہزاروں لوگ آپ پر لکھ رہے ہیں۔ لکھیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اردو زبان زندہ ہے۔ اور زبان اس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک انسانیت زندہ رہے گی۔ جن ادیبوں، شاعروں، شاگردوں، استادوں اور دوستوں کے دماغ میں "روحِ احتشام" بس چکی ہے ان کی تعداد ہزاروں تو کیا لاکھوں سے زیادہ ہے۔ اور وہ سرحد کے اندر، سرحد کے باہر ملکوں ملکوں دنیا سے خراجِ عقیدت لے رہے ہیں میں ان سب کا نام کیسے لکھ سکتا ہوں۔ صرف صرف نام ہی سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اس مضمون میں کسی اہم سے اہم دوست، ناقد، شاعر، ادیب کا نام رہ سکتا ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہ ہوگا کہ جان بوجھ کر اس کا نام نظر انداز کر دیا گیا۔ میں ان حضرات سے معذرت خواہ ہوں جن کی قربت بھیا سے تھی، پھر بھی ان کا نام رہ گیا۔ اس عظیم دانشور کی گھریلو زندگی کے پس منظر کو زیادہ سے زیادہ یہ سوگوار بھائی پیش کرے گا۔

سوگوار

سید اقتدار حسین

۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء، سورج کی سنہری کرنیں زمین کی آغوش میں سونے جا رہی تھیں، اس وقت سید حسن علی مرحوم کے خاندان میں ایک چاند پیدا ہوا۔ جس کا نام محمد میاں صاحب (بڑا گاؤں) نے احتشام حسین رکھا۔ میرے والد محترم کا نام سید ابو جعفر ولد سید اصغر حسین مرحوم تھا آپ والد کی پہلی اولاد تھے ـــــ سید و سادات خاندان کا یہ درخشاں ستارہ قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ (یو پی) کے ایک معزز اور زمیندار خاندان میں طلوع ہوا۔

۱۸۵۷ء کے قبل ہمارے بزرگوں کے پاس کافی جاگیر اور زمینداری تھی لیکن غدر کے بعد انگریزوں نے اپنا دشمن تصور کر کے بہت کچھ ضبط کر لیا بھیا کی پیدائش صرف گھر و خاندان والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ گاؤں والوں کی نظر میں بھی خدا کا دیا ہوا پہلا انمول تحفہ تھا۔ چچا سید ابو محمد صاحب نے کان میں اذان دی اور کہا، "بیٹا! خدا تیرے سر پر علم کا تاج رکھے اور تیرے نام و علم کا پرچم ملکوں ملکوں لہرائے۔" دیکھ بھال کے لیے ایک نوکر مقرر کر دیا گیا اور یہ معصوم ستارہ پروان چڑھنے لگا۔ خاندان کے رسم و رواج کے مطابق قرآن پاک سے تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ اپنی چچیتی پھوپھی و پھوپھا سید محمد قاسم صاحب کی زیر نگرانی آپ نے چھ سال کی عمر میں صرف پونے تین ماہ میں قرآن پاک ختم کر لیا۔ جو اب تک ہمارے خاندان میں اس عمر اور اتنے وقت میں قرآن ختم کرنے کی پہلی مثال ہے۔

بچپن کے بہترین دوستوں میں سید محمد فصیح (ڈپٹی) علی انصر صاحب (سیرالحلہ) وغیرہ تھے۔ بچپن ہی سے بھیا نہایت سنجیدہ، ملنسار اور غریب پرور تھے۔ ہر استاد آپ کی ذہانت اور قابلیت کی داد دیتا تھا۔

۱۹۲۰ء میں میری پیدائش ماہل میں ہوئی اور میں بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ بقول میری والدہ محترمہ میری پیدائش کی خوشی سب سے زیادہ بھیا کو ہوئی تھی۔ اس وقت آپ ماہل کے مڈل اسکول میں تھے۔ اور اسی زمانہ سے کنبہ برادری اور خاندان سے بے پناہ محبت کی داغ بیل آپ کے دل میں پڑ گئی، جسے پڑھنا شروع ہوگئی تھی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ بھیا کے دل نے محسوس کر لیا تھا کہ بہت جلد ———— یتیمی کا بادل ہم سب پر چھا جانے والا ہے۔ اس کے تاریک سایہ میں احتشام حسین، وجاہت حسین، انصار حسین، انتصار حسین اور بہنوں سب کو آنا ہے اور چچا کا قوتِ بازو بہت جلد جانے والا ہے۔

آپ اعظم گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے کہ والد خود اعظم گڑھ آپ سے ملنے گئے۔ اس وقت آپ نویں درجہ میں تھے۔ آپ نے خود اپنی کتاب "روایت اور بغاوت" میں جو بیان لکھا ہے اس کی عبارت یہ ہے،

"۱۰ دسمبر ۱۹۲۸ء کو آپ (والد) ماہل سے اعظم گڑھ آئے تھے۔ آپ نے مجھ سے کہا میں کلکتہ گھومنے جا رہا ہوں۔ تمہارا دل چاہے تو تم بھی چلو، میں انگریزی کے نویں درجہ میں پڑھتا تھا اور ششماہی امتحان ہو رہا تھا۔ میں نے منت سماجت کی کہ کل یہ امتحان ختم ہو گا ایک دن ٹھہر جائیے تو میں بھی چلوں۔ میری بات مان لی تھی، اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر امتحان میں اول آؤگے تو تمہیں سائیکل خرید دوں گا۔ میں نے شوخی سے کہا تھا "دیکھئے اپنا وعدہ بھول جائیے گا نہیں"

تیسرے دن میں ہم لوگ کلکتہ پہنچے تھے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۲۹ء کو کلکتہ ہی میں آپ کو بخار آیا، میں نے کبھی آپ کو بیمار نہیں دیکھا تھا۔ یک بیک آپ نے پریشانی کا اظہار کیا اور گھر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے پہلی مرتبہ آپ کے مطمئن قلب کو پریشانی کا شکار پایا۔ دوسرے دن میں آپ کو ساتھ لیکر ماہل واپس آیا۔ آپ نے اصرار کر کے مجھے اسکول واپس بھیج دیا۔ میں امتحان میں اول آیا تھا، مگر آپ سے ذکر کرنے کا موقع نہ تھا۔ ۱۵ جنوری کو میں آپ کو دیکھنے آیا۔ ۱۶ کی صبح کو واپس بھیج دیا گیا۔ اسی رات کو آپ نے آخری سانس لی۔ بہت دن ہو گئے لیکن جب کبھی کسی قسم کی کامیابی ہوتی ہے تو آپ کی یاد ضرور آتی ہے۔"

والد مرحوم کے انتقال نے گھر کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا۔ میرے چچا سید ابو محمد صاحب جو چھوٹے بھائی کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اس سانحہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ زمینداری کا کام والد مرحوم دیکھتے تھے اور اب مجبوراً یہ کام میرے منجھلے بھائی سید وجاہت حسین صاحب کو دیکھنا پڑا، کیوں کہ چچا کی اولاد میں ان کے تینوں بیٹے ابھی عمر میں آپ سے بھی چھوٹے تھے۔ وجاہت حسین بھائی نوعمری ہی سے سادہ اور سلجھے دماغ اور سادہ لوح انسان تھے۔ بہت جلد آپ نے کسانوں اور کاشتکاروں کے دل میں گھر کر لیا اور زمینداری کا کام بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگے۔ میرے سنجھلے بھائی سید انصار حسین صاحب کو جو اس وقت کسی قدر چڑچڑے مزاج کے تھے میرے ماموں سید ظہور الحسن صاحب اپنے ساتھ کچھوچھہ شریف (ضلع فیض آباد) لے گئے۔ ماموں کے کوئی اولاد نہ تھی، اس وجہ سے ماموں اور ممانی صاحبہ دونوں بھیا کو اولاد کی جگہ ماننے لگے۔ حد سے زیادہ محبت اور پیار پا کر آپ کا مزاج ریحمانہ ہو گیا اور آپ کے دل میں ماں، بھائی بہن کی وہ محبت نظر نہیں آتی تھی جو آج سربام ہے۔

وطن میں بھیا کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ وسیع ہو چکا تھا۔ بہترین ساتھیوں میں سید محمد فصیح، سبط حسن خیال، بشیر حیدر میاں ک

وزارت حسین۔ آل حسن۔ انصر صاحب وغیرہ اوما نباری (ضلع اعظم گڑھ) کے محمد شفیع اور سبط حسن بھائی تھے۔ آپ کی سب سے زیادہ اولوث محبت سید محمد فصیح سے تھی جس کا تذکرہ آپ نے اکثر کیا ہے۔ یہی نے خود آخر وقت تک ایک دوسرے کو ایک جان دو قالب پایا۔ یوں تو وطن کا بچہ بچہ آپ کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ جب آپ تعطیل میں گھر آنے کو ہوتے تھے تو غفور خاں اور اکبر خاں یکہ بان بھیا کو اسٹیشن سے گھر تک لانے میں فخر محسوس کرتے تھے، اس کی سب سے بڑی وجہ ان لوگوں کی محبت اور راستہ میں انھیں اپنے سوالوں کا جواب خوشی خوشی مل جاتا تھا، جس سے انھیں دلچسپی ہوتی تھی۔ منیر حیدر صاحب کے گھر بھیا اکثر صرف اس لیے جاتے تھے کہ منیر بھائی کو والد مرحوم سے حد درجہ محبت تھی۔ وہ بھیا کے لیے بہترین ناشتہ کا انتظام کرتے اور والد مرحوم کی زندگی کے حالات جس میں ان کو چچا سے دلچسپی، شکار کا شوق، مقدمہ بازی کا شوق اور رعایا سے محبت شامل ہوتی تھی۔

بھیا نے ۱۹۳۰ء میں ہائی اسکول ویسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ سے پاس کیا اور آج بھی آپ کا نام سنہرے لفظوں میں موجود ہے۔ پھر چچا نے آپ کو الہ آباد پھوپھی اور پھوپھا کے یہاں بھیج دیا۔ پھوپھی اور پھوپھا دونوں کی محبت لازوال تھی۔ پھوپھا صاحب پولیس کے محکمہ میں تھے اور ان کی اکلوتی بیٹی اور داماد سید ظہور حسن صاحب انجینیر کلکتہ رہتے تھے، بھیا کا داخلہ گورنمنٹ انٹر کالج الہ آباد میں ہو گیا۔ آپ نے اپنی محبت اور پھوپھی پھوپھا کی محبت کا تذکرہ جن الفاظ میں امریکہ جانے کے قبل کیا ہے وہ آپ کی شفقت اور عزیزوں سے محبت کی ایک ادنیٰ جھلک پیش کرتا ہے۔

> بچپن میں میں پھوپھی اور پھوپھا کے ساتھ رہا اور انھیں کو ماں باپ سمجھتا رہا۔ .... پھوپھا صاحب ضعیفی کے باوجود مجھ سے ملنے نایل آگئے تھے، میں انھیں کے ہمراہ رات کو اترولیہ (ضلع جونپور) پہونچا۔ پھوپھی اور بہن سے رخصت ہو کر دوسرے دن لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گیا، کھویا ہوا اور بے دلی کا شکار رہا۔[1]

بھیا کو یہ نہ معلوم تھا کہ جن کے ساتھ رہ کر وہ بہترین زندگی گذار رہے ہیں، تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کے گھر کا چراغ بہت جلد گل ہونے والا ہے اور اس گھر کی کشتی منجدھار میں آنے والی ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ظہور بھائی کا انتقال ہو گیا اور یہ اتنا بڑا سانحہ تھا جو صرف میرے پھوپھا کی اکلوتی بیٹی ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے خاندان کے لیے نہایت المناک اور تکلیف دہ تھا۔ پھوپھا کو مجبوراً قبل از وقت پنشن لینی پڑی اور وہ اپنی اہلیہ و بیوہ بیٹی کو لیکر وطن کوسگڑی (ضلع اعظم گڑھ) واپس آگئے۔ بھیا پر اس حادثہ کا بہت اثر پڑا۔ بہن کی بیوگی اور اپنی بے سروسامانی۔ تاریک دن اور تاریک راتیں آپ کو آگے پڑھنے سے روکنے لگیں۔ چچا خود الہ آباد آئے اور اپنے بھتیجے کے رہنے اور تعلیم کی ضرورتوں کے لیے کسی معقول انتظام کی فکر کرنے لگے۔ ذہین۔ ہونہار۔ ملنسار مخلص اور اعلیٰ کردار طالب علم کو رکھنے کے لیے کون تیار نہ ہوگا۔ چچا کی خواہش تھی کہ بھیا کسی ایسے آدمی کے ساتھ رہیں جو ان کی تعلیمی زندگی میں بہترین معاون ثابت ہو اور ان کی مدد کر سکے۔ پروفیسر سید اعجاز حسین صاحب جو اس وقت بھیا کے بہترین اور محبت کرنے والے استادوں میں سے تھے۔ انھوں نے خوشی سے اپنے یہاں رکھنا منظور کر لیا۔ اس وقت آپ بی۔ اے کے پہلے سال میں تھے۔ اسی زمانہ میں جناب حیدر مہدی صاحب وکیل اور پروفیسر ضامن صاحب اور بہت سے دوسرے حضرات بھی بھیا کو اپنے یہاں رکھنا چاہتے تھے۔ مگر بھیا نے آپ کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب اور بھیا کی محبت تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر پائیدار ہو گئی کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے اور آپ کی محبت و شفقت نے بھیا کو ان کی زندگی تک بہت کچھ رہنمائی کی۔

۱۹۳۳ء میں آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور سونے کا تمغہ و وظیفہ حاصل کیا۔ الہ آباد کی

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۳۱-۳۲

وہاں کے ماحول کے بارے میں آپ نے خود لکھا ہے:-

"۱۹۳۰ء میں الہ آباد پہونچا۔ الہ آباد اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک کا مرکز تھا بدیسی اور خاص کر برطانوی سامان کا بائیکاٹ، ستیہ گرہ، اور سیاسی جیل بھیل اپنے شباب پر تھی۔ میں بھی فطری طور پر آزادی کے جذبہ سے معمور ہو گیا"[1]

۱۹۳۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے آپ نے اردو میں ایم۔اے فرسٹ کلاس فرسٹ پاس کیا۔ سب کے دو طلائی تمغے حاصل کیے۔

بھیا جب ماہل کسی تعطیل میں آنے کو ہوتے تو مارے خوشی کے میری راتوں کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔ اپنی طالب علمی میں معاشی بحران کے باوجود جب بھی آتے میرے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتے تھے۔ مکرمی اعجاز صاحب کی نیک مزاجی اور ان کے برتاؤ کا تذکرہ ضرور کرتے ... ویسے ماہل میں آپ کی آمد کے قبل خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی، بعض مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ آپ کے انتظار میں مجالس، رسومات، سیرت پاک جلسہ وغیرہ اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیے جاتے تھے جب تک کہ آپ آ نہ جاتے تھے۔ ان کے آنے کے بعد قصبہ کا رنگ ہی بدل جاتا ... ساری تقریبات، مجالس وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جس میں میں نے بھیا کو سینکڑوں بار ذاکری کرتے، نوحہ خوانی کرتے، سیرت کے جلسہ میں تقریر کرتے دیکھا ہے۔ وطن کا بچہ بچہ ان کی آواز اور انداز بیان کو سن کر باغ باغ ہو جاتا تھا۔ گاؤں کا ہر کسان، مزدور ... برہمن، ہندو، مسلمان کوئی بھی ہو ملنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ آپ تانگہ کی باغ ہی سے یکہ سے اتر کر لوگوں سے بغل گیر ہوتے، ایک ایک کی خیریت دریافت کرتے۔ بزرگوں کو سلام اور چھوٹوں کو گلے لگاتے تھے۔ ہر ملنے والے کے گھر ایک نہ ایک دن چند منٹ کے لیے ... جاتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں آپ گرمیوں کی تعطیل میں گھر آئے تھے اپنے ہی مکان کے ایک کمرے میں اپنے چند احباب و عزیز مثلاً محمد فصیح صاحب ... احمد صاحب، چھوٹے بھائی وجاہت حسین صاحب، اولاد اصغر صاحب ارشاد اصغر صاحب اور پھوپھی زاد بھائی سید امتیاز حسین صاحب جو اب پاکستان جا چکے ... بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک آپ نے تجویز پیش کر دی کہ ایک عزائی جلوس ماہل میں اٹھایا جائے جس میں جوار کے حضرات بھی مدعو کیے جائیں۔ اور یہ بات ... یوں آئی کہ محمد فصیح صاحب کے والد جو ایک بڑے رئیس تھے اور ان کا آبائی وطن بڑا گاؤں تھا اپنے وطن کی نسبت سے ایک جلوس ۲ صفر کو بڑا گاؤں ... اٹھاتے تھے جس میں اچھا خاصہ پیسہ خرچ کرتے تھے۔ مقامی حضرات کے عدم تعاون سے کچھ بددل ہو گئے تھے اور خیال ظاہر کیا تھا کہ اب میں وہاں اس پیمانے پر جلوس نہ اٹھاؤں گا جس کا ہم سب کو کافی دکھ تھا۔ بھیا مرحوم نے کہا کہ اب ماہل میں اٹھایا جائے۔ بہرحال بزرگوں سے اجازت مل گئی۔ بھیا ہی نے رائے دی کہ ۲ صفر کو ... امام حسین کا داخلہ دمشق میں ہوا ہے یہی تاریخ مناسب رہے گی۔ یہ تابوت اٹھا اور آج انشاءاللہ چالیس سال سے اٹھتا آرہا ہے جس میں اچھا خاصہ اضافہ بھی ... ماری، ذوالجناح، تابوت۔ غیر مقامی چار چھ ماتمی دستے، چار چھ ذاکرین مقررین جس میں ہندو، سنی اور شیعہ بھی امام حسین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ... سکتا ہے کہ اس جلوس کے بانی احتشام حسین مرحوم تھے۔ بھیا نے ۱۹۲۶ء میں جب کہ آپ مڈل اسکول کے چھٹے درجہ میں زیر تعلیم تھے چند بہترین نوحے لکھے تھے۔

اپنی ابتدائی تحریروں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے محمد قاسم صاحب صدیقی، رائز گلو عربک اسکول دہلی (فی الحال آپ علی گڑھ ... یونیورسٹی میں ہیں) کو ۳ مارچ ۱۹۶۴ء کو ایک خط میں لکھا تھا ..... میں نے ۱۹۳۲ء سے لکھنا شروع کیا، میرا پہلا افسانہ "نگار" ... ۱۹۳۲ء میں، مزاحیہ مضمون "سرپنچ" لکھنؤ ۱۹۳۲ء میں۔ اور پہلا سیاسی مضمون "سرفراز" لکھنؤ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۲۸ء سے اشعار کہنے شروع کیے۔

ماہل میں اس زمانہ میں ہر سال طاعون پھیلتا تھا اور ہر سال کثرت سے لوگ مرتے تھے، لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ ... کبھی پھوپھا کے یہاں، کبھی چچا کے گھر پر، کبھی ننہال یا خالو کے یہاں چلے جاتے تھے۔ اس طرح تمام بھائیوں اور وطن کے دوسرے ... کی تعلیم کا بڑی طرح نقصان ہوتا رہتا تھا۔ بھیا بہت خاموشی سے دیکھ رہے تھے کہ میری تعلیم کو کس طرح گھن لگتا جا رہا ہے۔

---

[1] ساحل اور سمندر۔ صفحہ ۱۱

آپ کو گھر والوں سے عزیزوں سے حد درجہ محبت اور پیار تھا، اسی جذبہ اور خدمت کی غرض سے آپ جلد خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنوں کی خدمت کر سکیں۔ آپ نے ایم اے کے بعد ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا تھا لیکن جب لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر کی جگہ خالی ہوئی تو چند دوستوں اور گھر کے حالات سے مجبور ہو کر آپ نے بھی درخواست دیدی۔ اور مابعد گھر والوں کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیا۔ ۱۹۳۸ء میں آپ کا انتخاب لکھنؤ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ جن حضرات نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ دلچسپی لی تھی ان میں پنڈت آنند نرائن صاحب ملا۔ سید اخلاق حسین صاحب بیرسٹر اور مرزا جعفر حسین صاحب ایڈوکیٹ تھے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء یہ آٹھ سال کا زمانہ آپ کی تعلیمی اور سیاسی زندگی کا تھا۔ اس وقت الہ آباد سیاسی اکھاڑہ تھا۔ جیسا آپ نے خود لکھا ہے:-

"یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں نے لکھنا شروع کیا، افسانے، ڈرامے، نظمیں، غزلیں، تنقیدی مقالات، علمی مضامین، سب کچھ...... ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، نفسیات اور جنسیات سب ہی سے دلچسپی لیتا تھا۔ تاکہ میں زندگی کے مسائل کو پوری طرح سمجھ سکوں...... آخرکار میرا زیادہ وقت تنقید سے دلچسپی لینے، تنقیدی مضامین لکھنے میں صرف ہونے لگا۔"[1]

ملازمت ملنے کے چند ہی ماہ بعد آپ نے ۱۹۳۹ء میں مجھے اپنے پاس لکھنؤ بلا لیا، میری طرف سے آپ کو پہلے ہی سے ذہنی کوفت تھی کہ الہ آباد میں متواتر طاعون کی وجہ سے میری تعلیم برباد ہو رہی تھی، اور وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اس وقت ذرائع اور سہولتیں خود آپ کے لیے کسی حد تک مسدود تھیں جیسا کہ آپ نے خود اعتراف کیا ہے کہ ایک بار ایم۔ اے میں امتحان کی فیس جمع کرنی تھی اور میرے پاس پیسہ نہیں تھا اور وقت بھی کم رہ گیا تھا۔ اتفاق سے انھیں نے پروفیسر امرناتھ جھا صاحب نے ایک ڈرامہ کا پلاٹ وغیرہ واضح کر کے بہترین ڈرامہ لکھنے والے کو پچاس روپیہ کے انعام کا اعلان کیا۔ وقت کم تھا پھر بھی آپ نے "اندھیری راتیں" کے عنوان سے ڈرامہ لکھ کر داخل کر دیا۔ جو تمام دوسرے طلباء کے ڈراموں کے مقابلہ میں بہترین ڈرامہ ثابت ہوا اور آپ کو پچاس روپیہ انعام مل گیا جس سے آپ نے فیس ادا کی۔ کردار اور نفس کی بلندی اُسے کہتے ہیں کہ جو دنیا کو دکھا دے کہ علم کے راستہ میں جب معاشی طوفان امنڈ آئے تو بھی ہمت نہ ہارنا چاہیئے اور نہ ہی محنت سے حاصل کی ہوئی حقیر سے حقیر رقم پر پردہ ڈالنا چاہیئے۔

بھیا کے کسی دوست، استاد، کسی عزیز نے یہ نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی نے اشارتاً اس کا اظہار کیا ہو جس زمانہ میں الہ آباد یونیورسٹی میں "پرچم احتشام" لہرا رہا تھا اس وقت آپ نے زندگی کی کبھی بداخلاقی کے مرتکب ہوئے ہوں، سگریٹ، پان یا کسی بھی اس طرح کی عادت کو قبول کیا ہو، ہاں کتابوں سے آپ کو محبت تھی اور بستر کے داہنے، بائیں تاروں کی طرح بکھری رہتی تھیں۔

لکھنؤ کے ابتدائی دور قیام میں میں نے جن حضرات کو اکثر آتے جاتے، یا ملتے دیکھا ان میں خاص طور سے مرزا جعفر حسین صاحب ایڈوکیٹ، سید نجم الدین، اخلاق حسین صاحب بیرسٹر، نسیم انہونوی، سید ممتاز حسین صاحب (پاکستان چلے گئے) اختر علی صاحب تلہری سید کلب عباس صاحب ایڈوکیٹ۔ شوکت تھانوی۔ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب۔ حکیم صاحب عالم صاحب۔ سید علی عباس صاحب حسینی۔ سید اعجاز حسین صاحب۔ خواجہ باسد۔ کیفی اعظمی۔ سردار جعفری۔ مجاز ردولوی اور بہت سے دوسرے حضرات تھے۔

لکھنؤ میں آپ کی ادبی سرگرمیاں بہت تھیں۔ گھر کی خانہ داری، خرید و فروخت وغیرہ سے کسی طرح کا آپ کا لگاؤ نہ تھا۔ آپ کا روزانہ کا معمول تھا کہ آپ شام کو "دانش محل" ضرور جاتے۔ نسیم صاحب اور دانش محل یہ دونوں آپ کی زندگی کا جز بن چکے تھے۔ آپ کو وہاں

[1] ساحل اور سمندر، صفحہ ۱۹

یب۔ دوست۔ شاعر، شاگرد اور نئی نئی کتابیں سب مل جاتی تھیں جس سے آپ کو کافی سکون ملتا تھا۔ دانش محل آپ کے زمانہ میں زمانہ ایک ادبی نشست کا مرکز تھا۔

لکھنؤ کرسچین کالج کے سامنے بدری ناتھ روڈ پر آپ کا پہلا کرایہ کا مکان تھا۔ گرشید بی اے کے بعد اس سے زیادہ آرام دہ مکان رودخانہ میں کرایہ پر آپ نے لیا تھا۔ ماہل ہی کے ایک ضعیف غافا اں ضامن خاں چچا کے ساتھ آئے تھے اور تقریباً دو سال تک بے سگھر پر دودھ دینے والا منگرا اور احمد دھوبی ۱۹۳۵ء سے لیکر لکھنؤ کے پورے قیام میں اس گھر کی خدمت کرتے رہے۔

بھیا کی زندگی دوسرے موڑ پر قدم رکھ چکی تھی۔ شادیوں کے پیغامات تعلیمی زندگی کے ابتدائی دور ہی سے آنے شروع ہو چکے تھے مگر اب ان پیغاموں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ آپ نے کبھی اپنی کوئی خاص پسند اپنے کسی دوست سے بھی نہیں بیان کی۔ بچپن کے دوست سید محمد فصیح صاحب سے اکثر گھر والوں نے بھیا کی پسند کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے یہی کہا کہ ان کا خیال بس یہ ہے کہ لڑکی ایسی لڑکی ہو جو میری ماں کو اپنی ماں، میرے چچا کو باپ اور میرے بھائیوں سے محبت اور پیار کر سکے۔ اس معاملہ میں چچا اور پھوپھا سید محمد قاسم صاحب بالکل خود مختار رہیں۔

نگرام (ضلع لکھنؤ) کے میر فدا حسین صاحب وکیل، جو بہت بڑے رئیس تھے ان کے صاحبزادے سید باقر مہدی صاحب اُریلا تشریف لائے اور اپنی بھتیجی یعنی سید حسن عسکری صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سے رشتہ دیا۔ اس رشتہ کی تحریک سید علی عباس صاحب حسینی بارہ (ضلع غازی پور) نے کی تھی۔ چچا نے پھوپھا کو بلایا اور خاندانی حالات معلوم ہونے کے بعد رشتہ منظور کر لیا گیا۔ بھیا کو بالکل خبر نہ تھی کہ کہاں رشتہ منظور کیا جا رہا ہے۔ نگرام کا نام بیشک آپ نے سنا تھا۔ چند دنوں میں چچا کا خط آیا کہ ہم نے اور قاسم بھائی نے رشتہ طے کر دیا اور انشاءاللہ فلاں تاریخ کو بارات جائے گی۔ خط پڑھنے کے بعد آپ نے صرف یہ کہا "وقت بہت تنگ ہے"۔ خرید و فروخت کے بارے میں آپ بالکل کورے تھے۔ مجبوراً مجھے ساتھ لیا۔ اپنے لیے، میرے لیے کپڑے وغیرہ خرید کر درزی کے یہاں سلنے دیے۔ میرے ہی کہنے پر آپ نے نصیرالدین واچ کمپنی امین آباد سے خوبصورت سی ڈائمنڈ سیٹ ایک گھڑی میری ہونے والی بھابھی کے لیے خریدی۔ میں حیران تھا کہ میرے اور اپنے کپڑے وغیرہ کی خریداری میں بھیا کو کوئی عذر نہ تھا۔ مگر اس گھڑی کی خرید میں آپ کو ایک طرح کی شرم دامنگیر تھی۔ چند دنوں میں والدہ۔ چچا۔ چچی۔ بہنیں۔ پھوپھا اور بہت سے قریبی عزیز اور چند دوست لکھنؤ گئے۔ آپ کی بڑی سالی کاظمی بانو کا رشتہ حسینی صاحب کے بھانجے شمیم کربلائی صاحب سے طے ہو چکا تھا۔ دونوں باراتیں ساتھ ساتھ گئیں۔ بھیا کی بارات میں چند عزیز، دوست اور دو ایک شاگرد تھے، مگر شمیم بھائی کی بارات میں کافی لوگ شریک تھے، اس طرح ۱۹۳۷ء میں بھیا ازدواجی زندگی کی زنجیروں میں جکڑ دیے گئے۔

بیوی کے بارے میں بھیا کا جو نظریہ تھا وہ واقعی میں ویسی ہی ثابت ہوئیں۔ ساس کو ماں کا درجہ، چچا کو باپ تصور کیا اور بھائیوں کو اولاد کے برابر مانا۔ پہلے دن سے آج تک آپ مجھے اپنی ایک اولاد کے برابر تصور کرتی ہیں اور میں بھی ان کے ایک اشارہ پر بکلیں بچھانا فخر محسوس کرتا ہوں اور اس مقدس ہستی کی عزت کرتا ہوں۔ اس نیک اور پارسا بیوی نے سسرال کے بچہ بچہ کو اپنا بنا لیا۔ سگے اور چچا زاد کے فرق کو لغت سے نکال پھینکا اور محبت کا وہ دیپ جلایا جو سیکڑوں دلوں میں روشن ہو گیا اور روشن رہے گا۔ بھابھی نے میرے خاندان کے ایک ایک بچہ کو اتنا ہی پیار دیا جتنا بھیا نے، اور کسی حد تک اس سے بھی زیادہ۔ بھابھی کی بڑی بہن آپا جان بھی اسی کی گاے ہیں۔ میرا ہفتہ میں ایک دن ان سے ملنا ضروری ہے۔ وہ بھی ایک فرشتہ خصلت منظمہ ہیں پیار و محبت کا جواب اسی طرح دیتی ہیں جس طرح میری بھابھی۔

لکھنؤ تیرہ و انیس کے زمانے سے ہی اردو ادب کا گہوارہ ہے۔ بھیا کے زمانہ قیام میں ترقی پسند تحریک کا مرکز تھا، جگہ جگہ ترقی پسند حضرات کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ بھیا کے اس وقت کے چند ساتھیوں کے نام اب بھی یاد ہیں۔ مثلاً احمد علی صاحب۔ سجاد ظہیر صاحب ممتاز حسین صاحب (پاکستان چلے گئے) سبط حسن بھائی (پاکستان چلے گئے)، ڈاکٹر رشید جہاں مرحومہ، اسرار جعفری، مجاز مرحوم، حیات اللہ انصاری، صاحبہ رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ بعد میں ان حضرات کا حلقہ وسیع تر ہوتا گیا اور اس تحریک سے دلچسپی لینے والے اور نہ لینے والے دونوں طرح کے اصحاب آپ سے ملتے رہتے۔ ان میں خواجہ احمد عباس، بسر لا ہوتی، ڈاکٹر زیڈ اے احمد۔ آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم۔ ط۔ انصاری۔ وامق جونپوری، سید احمد حسن الہ آبادی۔ جعفر علی خاں اثر۔ جوش ملیح آبادی۔ بلاغت حسین۔ علی جواد زیدی، نجم الدین۔ یشپال۔ ڈاکٹر محمود الہٰی۔ امرت لال ناگر۔ پروفیسر نورالحسن، مالک رام، رضا انصاری۔ رام بابو سکسینہ۔ امرت رائے وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ صرف لکھنؤ کے قیام کی روداد اور بھیا کی وہاں کی روزمرہ کی زندگی کے حالات لکھنے بیٹھوں تو دو تین جلدوں میں کتاب مکمل ہوگی۔ لیکن میں چند ایسی باتوں کا تذکرہ ضروری خیال کرتا ہوں جن سے کم ہی لوگ واقف ہوں گے۔ اگرچہ ان کا گھریلو زندگی سے براہ راست واسطہ نہیں ہے۔

تیرہ سو سالہ یادگار حسین کے جلسہ میں جو کہ لکھنؤ کی شاندار بارہ دری میں ہو رہا تھا۔ میں اور بھیا وہاں گئے۔ مرزا جعفر حسین صاحب نے بھیا کو مجبور کردیا کہ وہ بھی تقریر کریں۔ بھیا اس وقت بالکل اس کے لیے تیار نہ تھے مگر مجبور ہو کر آپ کو تقریر کرنا پڑی۔ آپ نے ڈیڑھ گھنٹہ وہ معرکۃ الآرا تقریر کی کہ بارہ دری کے در و دیوار اب بھی گواہ ہیں۔

آپ ہندوستان کی تقسیم کے ہمیشہ سے مخالف تھے۔ دو قومی نظریہ کی آپ نے ہمیشہ مخالفت کی۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی سے پروفیسر شپ کے لیے بلایا گیا تھا اور آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ "میں ہمیشہ سے دو قومی نظریہ کے خلاف رہا ہوں اور وہاں بھی میرا نظریہ یہی رہے گا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ دن کو رات اور رات کو دن کہوں"۔ یہ بات غالباً میرے علاوہ ان کے چند خاص احباب ہی کو معلوم ہوگی۔

بھائی کی بے پناہ محبت اور ان کی سرپرستی کا سہارا لیکر میں خود تعلیم کی منزلیں طے کرتا جا رہا تھا۔ خاص خاص ادبی جلسوں میں میں بھی بھیا کے ساتھ جانے کو تیار رہتا تھا۔ مرزا محمد جواد صاحب مالک نظامی پریس لکھنؤ نے اردو کے علاوہ انگریزی پریس کے افتتاح کے لیے خواجہ غلام السیدین صاحب کو بلایا تھا۔ موصوف کو صدارت کے ساتھ ساتھ تقریر بھی کرنی تھی۔ کارڈ کے ذریعے خصوصی حضرات کو دعوت دی گئی تھی۔ مگر ہم ایسے تماشبین بھی کافی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ مرزا جواد صاحب نے بھیا سے تقریر کرنے کو کہا اور حد سے زیادہ اصرار کیا تاکہ سیدین صاحب کے قبل ہی ایک مقرر ہی اپنے خیالات کا اظہار کرلیں۔ بھیا نے مرزا صاحب سے کہا کہ سیدین صاحب ماہر تعلیم ہیں اور اس موضوع پر ان کا ہی حق ہے اور وہی موضوع ہیں گر مرزا صاحب نہ مانے۔ سچ تو یہ ہے کہ انکار بھیا کی زندگی کے کسی گوشہ میں اپنا مقام نہیں رکھتا تھا۔ بچپن سے لیکر ۲۰ رنومبر ۱۹۷۶ء کو گیارہ بجے رات تک کی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ بھیا نے کسی کی خواہش کو رد کیا ہو۔ چاہے وہ عزیز کی ہو، دوست کی ہو، شاگرد کی ہو۔ کتاب پر تبصرہ یا تعارف کی ہو، مجلس یا تقریر کی ہو، کسی چھوٹے سے چھوٹے مشاعرے یا ادبی جلسہ کی صدارت ہو، یا چند پیسوں کے لیے کسی فقیر کا سوال ہو۔ آپ نے مرزا صاحب کی بات مان لی اور تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کرنے کے بعد جب سیدین صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو موصوف نے پہلے یہ الفاظ کہے "میری تقریر میں معلومات، مواد اور حوالے احتشام صاحب کی تقریر سے بہت کم ہیں۔"

اسی طرح ایک بار لکھنؤ یونیورسٹی میں ہندی والوں کی طرف سے "یوم ٹیگور" منایا جا رہا تھا۔ اس وقت کے نہایت قابل وائس چانسلر

آچاریہ نریندر دیو جی تھے۔ آپ نے بھیا سے ٹیگور پر بولنے کو کہا آچاریہ جی احتشام صاحب کی اور احتشام صاحب آچاریہ جی کی حد سے زیادہ عزت کرتے تھے۔ بھیا نے کہا کہ ٹیگور پر میری معلومات بالکل ناقص ہیں اور یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں ان کے بارے میں کچھ کہوں لیکن آچاریہ جی نے اصرار کیا اور جب وہ بولنے کھڑے ہوئے تو تقریر کے دوران سب سے زیادہ تالیوں کی گونج آپ کی ہی تقریر میں تھی بھیا کی تقریر کے خاتمہ پر آچاریہ جی نے کہا، "احتشام تم کہتے ہو ٹیگور کے بارے میں لاعلمی ہے مگر تم نے تو معلومات کے دریا بہا دیے۔"

میں اپنے بھائی کی کن کن خوبیوں کو بیان کروں۔ ایک انسان کامل، جس کے دل میں غریبوں کے لیے درد، عزیزوں اور دوستوں کے لیے درد، اُردو زبان وادب کے لیے درد، اور اس پیکر انسانیت کا گھر ہمیشہ مہمانوں کے لیے مہمان خانہ۔ بیماروں کے لیے اسپتال ہوتا تھا اور کبھی علم کی پیاس بجھانے والوں کے لیے درس گاہ۔ صرف لکھنؤ کے دوران قیام میں عزیزوں اور وطن کے آٹھ ایسے مریض آپ کے یہاں آئے جس میں ایک کینسر کا۔ دو دق کے ایک سِل کا اور چار دوسرے امراض کے مریض تھے۔ ان میں سے چھ کی لاش کو بھیا نے لکھنؤ میں دفنا دیا اور مرنے والے بھیا سے خراج تحسین لیکر گئے۔ آپ مریضوں کی دیکھ بھال، ان کے آرام، دوا کا خود خیال کرتے تھے۔

اسی طرح انباری (ضلع اعظم گڑھ) کے سید علی اوسط صاحب نے انھیں کے ساتھ رہ کر بی۔اے پاس کیا۔ اور بعد میں اپنے والدین کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ آل حسن بھائی نے کئی سال رہ کر تعلیم حاصل کی۔ آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی پھر ترقی حاصل کر کے لندن چلے گئے۔ ہمارے عزیز خورشید حیدر صاحب نے رہ کر تعلیم حاصل کی پھر سنٹرل گورنمنٹ میں سکشن آفیسر ہو کر دہلی آ گئے۔ اس کے علاوہ میرے مجھلے بھائی سید وجاہت حسین صاحب کے دو بچوں نے آپ کے زیر سایہ اور آپ کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ ان میں جعفر مہدی شاہ گنج یونین بنک میں برانچ منیجر ہے اور دوسرا جعفر رضا لکھنؤ یونین بنک میں ہے۔

بہت ہی کمسنی سے عزیزی سید محمود الحسن جو ہمارے قریبی عزیز ہیں بھیا کی صحبت سے فیض حاصل کرتے رہے۔ محمود سلمہ کی نسبت ہماری ماں، بھائیوں، بھتیجوں کے ساتھ ہمیشہ نہایت خوشگوار رہی ہے۔ محمود نے لکھنؤ سے ایم۔اے۔ ایل ایل بی پھر وہیں سے ڈاکٹریٹ کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ترقی پسند تحریک سے بھی ان کی کسی حد تک دلچسپی رہی اور بھیا کے ساتھ سایہ کی طرح وابستہ ہو گئے۔ ان حضرات میں بھیا کے لیے کس قدر خلوص، پیار اور محبت ہے۔ جس کا تذکرہ بھیا نے اکثر کیا ہے۔ اور آگے کئی جگہ انھیں کے الفاظ میں ملے گا۔

لکھنؤ کے دوران قیام میں بھیا کا گھر ادب کا گہوارہ تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادہ خانہ میں (جواب احتشام کا گھر ہو چکا ہے) اردو کی گنگا بہہ رہی ہے اور لہریں یورپ اور امریکہ کے ساحلوں سے ٹکرا رہی ہیں۔

راک فیلر فاؤنڈیشن نے بھیا کو امریکہ و یورپ آنے کی دعوت دی اور یہ بالکل یک طرفہ کارروائی تھی۔ "امریکہ و احتشام" بالکل متضاد، مگر "ساحل اور سمندر" بھیا کا لکھا ہوا سفر نامہ اس پر پوری روشنی ڈالتا ہے۔ میں مضمون کو بہت طولانی کرنا نہیں چاہتا۔ کئی وجوہ تھے جس کی وجہ سے بھیا امریکہ وغیرہ جانا نہیں چاہتے تھے۔ عزیزوں سے محبت اور ان سے ایک سال کی جدائی۔ بیوی اور بچوں کی جدائی۔ میری علالت۔ امریکہ کی سماجی زندگی سے الجھن اور دوسرے وجوہ تھے۔ کسی کو اگر بغیر کسی جد وجہد کے وظیفہ ملے اور غیر ممالک کی سیر کسی بندش کے بغیر کرتا ہو تو اس کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن امریکہ کا وظیفہ بھیا کی ٹھوکروں کے نیچے تھا۔ آپ کو اس سے خوشی نہیں بلکہ الجھن اور رنج تھا۔

"رنج مجھے بے حد سنجیدہ کر دیتا ہے اور خوشیاں زیادہ خوش نہیں کرتیں۔ میری خاندانی زندگی بھی کچھ اس قسم کی رہی ہے کہ میں اپنے متعلقین سے اور وہ سب مجھ سے بہت زیادہ وابستہ ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں

نہ ہوں تو شاید ان لوگوں کو تکلیف ہوتی[1]

ابھی تو امریکہ نہ جانے کا فیصلہ اٹل ہے۔

"۵ جون کو ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب الٰہ آباد یونیورسٹی کا تار آیا کہ رات کو پہونچ رہا ہوں۔ اعجاز صاحب کا آنا ہمیشہ اس طرح خوش گوار ہوتا ہے جیسے سخت گرمی میں برسات شروع ہو یا خزاں میں بہار آجائے اور وہ فصل جب آئے تو بارش بھی ہوئی اور موسم بھی بدل گیا۔ ۶ کو شام کی ڈاک سے نیویارک سے خط آیا۔ "مبارک ہو فیلو شپ سال بھر کے لیے منظور ہو گئی، اور ساتھ میں مسٹر گل پیٹرک کا امید افزا خط۔ میں نے خط اعجاز صاحب کی طرف بڑھا دیا، اور کہا کہ آپ کی کیا رائے ہے، پڑھ کر کہنے لگے، رائے کیا، اس میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتی، تھوڑی ہی دیر میں مرزا جعفر حسین ایڈوکیٹ اور میرے دوست پروفیسر نجم الدین درام پوری آگئے اور سب نے یہی زور دیا کہ ضرور جانا چاہیے"[2]

لیکن اساتذہ اور دوستوں کے بعد بھی ابھی بہت سے اہم کام خود بھیا کو انجام دینے تھے۔

"خریداری کے متعلق میرا عجیب رویہ رہا ہے، بالعموم میں اس سے بچتا ہوں، یہاں تک کہ اگر مجھے جوتا بھی خریدنا ہے تو اختر لو سے کہہ دوں گا کہ میرے لیے ایک جوڑ جوتا لیتے آنا۔ اس دفعہ اس کے اصرار پر مارا مارا پھرا۔"[3]

لیکن بھیا کو ابھی امریکہ جانے کے قبل اس زمین سے اس وطن سے اجازت نہیں تھی جس نے ان کو جنم دیا تھا ان دوستوں سے ملنا تھا جن کے ساتھ بچپن کے دن گذرے تھے اور وطن والوں کا دل ٹٹولنا تھا جو احتشام کو "فخر مائل" کہتے تھے۔ آپ مائل گئے اور آگے کے حالات میں انھیں کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ لکھوں گا جو مقدس سرزمین پر محبت کے آنسو نثار کرنے گیا تھا۔

"میرا بچپن کا ساتھی اور عزیز دوست محمد نصیح پنچایت کا صدر ہے۔ مجھے خبر ملی ہے کہ میرے اعزاز میں گاؤں کی پنچایت کا جلسہ ہوگا ...... ایک بہت بڑے مجمع میں ہندو، مسلمان، برہمن، اچھوت، سید، چمار چھوٹے بڑے موجود تھے .... بڑے سے بڑے مجمع میں تقریریں کیں مگر آج گلا رندھ گیا، چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ ایک منٹ! دو منٹ! تین منٹ! اور میرے منہ سے آواز نہ نکلی نہ جانے کہاں کی یادیں ابلی پڑ رہی تھیں، سامنے بوڑھے پنڈت جی (پنڈت رما شنکر) مجھے دیکھ رہے تھے، جنھوں نے اسی اسکول میں کبھی مجھے پڑھایا تھا۔ بوڑھوں کے بے رونق اور فاقہ زدہ چہرے تھے، میلے کچیلے لباس میں کمزور اور لاغر بچے تھے، حیرت سے کھلی ہوئی سیکڑوں آنکھیں تھیں اور میرا ذہن ہزاروں تصویریں بنا بنا کر مٹا رہا تھا۔ میرے لیے یہ محبت کیوں ہے۔ میں نے اس گاؤں کے لیے، اپنے اس وطن کے لیے ان بھوکے اور ان پڑھ لوگوں کے لیے کیا کیا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں! یہ محبت مجھ پر قرض رہے گی۔ مجھے یونیورسٹی کی کرسی، راک فیلر فاؤنڈیشن سے ملا ہوا اعزاز، رسالوں میں چھپی ہوئی تعریفیں، سب اس بے پناہ اور پُر خلوص محبت کے سامنے ہیچ معلوم ہو رہی تھیں۔ اتنے میں کسی نے میرے قریب ہی (بھائی منیر حیدر بیباک) ٹھنڈی سانس بھر کر میرے والد مرحوم کا نام لیا اور کہا "کاش وہ زندہ ہوتے" میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی اور ہچکیاں گلے میں پھنسنے لگیں۔ سخت آزمائش تھی اور میں بالکل طوفان کی زد پر کھڑا تھا۔ شاید کوئی میری تنگ ظرفی پر ہنسے لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ یہ اعزاز، محبت کسی پیرو جسے مل جائے اسے کچھ اور نہیں چاہیئے! محبت کے آنسوؤں کے سوا کوئی چیز اس کی قیمت قرار نہیں پاسکتی۔"[4]

۱؎ ساحل اور سمندر صفحہ ۹ ۲؎ ساحل اور سمندر صفحہ ۱۷ ۳؎ ایضاً صفحہ ۲۹ ۴؎ ایضاً صفحہ ۳۳۔

ماں، چچا، پھوپھی، پھوپھا، بھائی، بہن اور عزیزوں، بیوی بچوں کی بے پناہ محبت بھیا میں جس قدر تھی جس کی مثال کم سے کم میری نظر میں نہیں۔ محبت کا طوفان جو اس وقت آپ کے دل میں امنڈ آیا تھا۔ اس کے چند اشارے میں آپ ہی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں

"جلسوں اور پارٹیوں میں شریک ہونے کی وجہ سے بچوں میں رہنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ اس کے شاکی تھے اور مجھے خود بھی احساس تھا کہ میں ابھی سے ان لوگوں سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔...... ویزا کے سلسلہ میں دہلی آیا اور جب پھر لکھنؤ واپس ہوا تو اقتدار کی طبیعت اچھی خاصی خراب تھی۔ بیوی کے یہاں بچہ پیدا ہوا تھا"۱؎

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، بھیا کے ایک کان میں سونے کا ڈر انھیں پہنے دیکھا تھا۔ ماں نے کسی منت کے لیے پہنا رکھا تھا، اور یہ بی۔ اے کرنے کے بعد گھر کے امام باڑہ میں بڑھایا گیا تھا۔ میں اس سے یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ مذہبی رواداری تعلیم کے راستہ میں کبھی حائل نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے حقیقی بھائیوں، چچا زاد یا خالہ زاد بھائیوں میں۔ ان لوگوں کی اولادوں میں بھیا کے یہاں کوئی امتیاز نہیں دیکھا۔ اور راستہ انھیں کا اختیار کیا ہوا تھا اسی لیے چھوٹوں نے بھی وہی اختیار کیا اور شاید اس خاندان کی کئی نسلیں اسی نقشِ قدم پر چلتی رہیں۔ ہم بھیا کو چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا۔ امیر ہو یا غریب اس کے گھر کی ہر تقریب میں، زندگی اور موت کے ہر موقع پر شرکت کرتے دیکھا اور آپ کے یہاں دوری یا نزدیکی سدِ باب نہیں بنتی تھی۔ امریکہ جانے سے قبل اس کے متعلق آپ نے خود اشارہ کیا ہے۔

"۲۹ اگست ۵۲ء کو جب امریکہ کے سفر کے لیے نکلا تو پہلے ماں، بہن، بیوی، چچا، بھائیوں، عزیزوں سے رخصت ہونا بہت صبر آزما تھا، بے حد، مگر میں نے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا.... میں سفر سے بے حد خوش ہوتا ہوں اور ضروری خیال کرتا ہوں، قرآنِ مجید میں خدا کی زمین پر چلنے پھرنے، اسلامی تاریخوں میں تجربہ اور حصولِ علم کے لیے سفر کرنے کے متعلق جو ہدایتیں ہیں، میں نے انھیں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا ہے"۲؎

بچوں، عزیزوں، دوستوں، استادوں اور شاگردوں سے رخصت ہو کر میرے گھر کا میرِ کارواں امریکہ اور یورپ کے سفر پر نکل پڑا آپ سب سے پہلے دہلی آئے، میں آپ ہی کے الفاظ میں دہلی اور اس کے آگے کے حالات قلمبند کر رہا ہوں۔

"خورشید حیدر۔ فرقت صاحب۔ اسد (مہدی عباس حسینی) شمیم بھائی (جناب شمیم کرہانی میرے عزیز جو دہلی کالج میں پڑھاتے ہیں) کے یہاں گیا۔ ۳۰ کی رات میں انڈیا جاپانا فرینڈشپ ایسوسی ایشن کے مشاعرہ میں شرکت کی۔ حضرت جوش۔ جگن ناتھ آزاد۔ علی سردار جعفری۔ جذبی۔ وامق۔ نریش کمار شاد۔ فکر تونسوی۔ مخمور جالندھری۔ تاباں شفیق نقوی اور جامعہ کے کئی دوست اکٹھے مل گئے۔ دوسرے دن احمد حسن الہ آبادی (جو پی۔ ٹی۔ آئی میں ہیں) کے یہاں دوپہر کا لذیذ کھانا کھایا۔ احمد کو میں بائیس سال سے جانتا ہوں جب وہ چھوٹے سے تھے، قد کے لحاظ سے تو وہ چھوٹے اب بھی ہیں، لیکن عقل بڑوں کو سکھاتے ہیں۔ دہلی میں میرا قیام اپنے عزیز خورشید حیدر ہی کے یہاں رہا"۳؎

آپ کو پیچش ہو جایا کرتی تھی۔ معدہ اکثر خراب ہو جایا کرتا تھا۔ اس سفر میں بھی آپ کو پیچش کی تکلیف ہوئی:

"پیچش سے تکلیف ہے، کچھ لوگ ملنے خورشید ہی کے یہاں آ گئے۔ خورشید اور حسن مہدی (میرے عزیز دہلی کالج میں تاریخ کے استاد) میری وجہ سے پریشان ہیں"۴؎

بھیا نے کبھی اپنی بیماری کو دوسروں پر ظاہر نہیں کیا۔ ان کو اپنے سے زیادہ دوسروں کی تکلیف کا احساس رہتا تھا اور یہ احساس رہتا!

۱؎ ساحل اور سمندر صفحہ ۳۴۳ ۲؎ ایضاً صفحہ ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰ ۳؎ ایضاً صفحہ ۴۱

اور یہ احساس یکم دسمبر ۱۹۵۲ء تک رہا۔ آپ نے ہندوستان سے رخصت ہونے کے قبل اپنی گھریلو زندگی کو جس طرح سے سفر نامہ "ساحل اور سمندر" میں پیش کیا ہے اس سے ان کے بلند خیالات کے بہتے ہوئے سمندر میں پیار و محبت کی گہرائی کی تھاہ لگانا غیر ممکن ہے۔ جب آپ دہلی سے وہ اس کو روانہ ہوئے تو دوران سفر ایک پیارے بچہ کو دیکھ کر اپنا بچہ ارشد یاد آگیا۔ گویا سفر میں امریکہ دیکھنے کی تمنا نہیں بلکہ بچوں کے چھوٹنے کا درد ہے۔[1]

امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد ہی سے آپ کو وطن کی یاد، عزیزوں کے خطوط اور خیالات کا جو خزانہ آپ ساتھ لیکر گئے تھے ان میں اضافہ ہوتا گیا اور وطن کی ہر چیز یاد آنے لگی۔

"۲۱ ستمبر۔ آج جب کچھ دیر پہلے عزیزوں کو خط لکھ رہا تھا تو خیال آیا کہ آج وہاں محرم کی پہلی تاریخ ہوگی، اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔"[2]

"خطوط کس پتہ پر منگاؤں نہ جانے کتنے دن کہاں رہوں، یہ خیال پریشان کن ہے۔ بھائی اور بیوی دونوں کو بیمار چھوڑ کر آیا ہوں، جی چاہتا ہے ان لوگوں کے خط برابر آتے رہیں۔"[3]

"آج کی سب سے بڑی خبر یہ ہے کہ لکھنؤ سے خط آیا، بیوی بچوں اور عزیزوں کا حال معلوم ہوا، کسی قدر الجھن کم ہوئی؛ ذمہ داری کا احساس یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا ...... جس دن گھر سے چلا ہوں ایک بچہ صرف آٹھ دن کا تھا۔ بیوی کو کمزور اور بیمار چھوڑ کر آیا ہوں۔ چھوٹا بھائی اقتدار بیمار تھا۔ ان خیالات کو کہاں لیجاؤں۔"[4]

تاریخ اسلام میں محبت کی جو مثالیں ملتی ہیں ان کی دنیا میں نظیر نہیں۔ تیرہ سو سال قبل نواسۂ رسول مقبول کی قربانی کی جو یاد ہندوستان میں منائی جاتی ہے اس کے پس منظر کو سوچ کر آپ کی آنکھیں کربلا سے ہٹ کر ہندوستان پر آئیں اور پھر اسی مظلومیت کی یاد آتے ہی محرم کی یاد آئی اور محرم کے چاند کا تصور آتے ہی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں، اور جب بچوں کی یاد آئی تو خواب تعبیر کی منزل تک آگیا۔

"۱۵ اکتوبر، بدھ۔ "ایں! تم یہاں کہاں؟" مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری بیوی سامنے کھڑی ہے۔ "کیا میں نہ آؤں آپ کے پاس؟" "نہیں، نہیں ضرور آؤ" اور قریب آؤ" میں نے یہ بھی کہا، مجھے کچھ حیرت سی ہے، اور بچے؟ اور بچے بھی ہنستے مسکراتے نمودار ہو گئے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اپنے چھوٹے بچے ارشد کو پکڑنا چاہا، ہاتھ میز سے ٹکرا گیا۔ تو یہ محض خواب تھا۔ خواب کی حقیقت ہی کیا لیکن خیالات کو پرواز عطا کرنے کے لیے یہی کافی ہے۔ جب حقیقتیں دور ہوں تو انسان خواب ہی دیکھتا ہے۔"[5]

اور وطن کے اس ہونہار اور ہر دل عزیز سپوت کے یہاں وطن کی یاد بڑھتی گئی جس پرند کو قدرت نے بغیر کسی مشقت کے پر پرواز عطا کی وہ مشرق سے اڑ کر مغرب میں آگیا۔ اور پھر اس قدر جلد فیصلہ۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شروع جولائی میں لکھنؤ پہونچ جاؤں گا۔ یہاں رہ کر ہندوستان اور عزیز ہوتا جا رہا ہے۔"[6]

راک فیلر فاؤنڈیشن کی فیلوشپ میں کسی طرح کی کوئی پابندی یا قید نہ تھی، آپ امریکہ کے قیام میں بہت سے نقادوں، ادیبوں سے ملے۔ نقادوں کی اہم کتابیں پڑھیں اور ان کے متعلق آپ نے لکھا ہے۔

---

۱ ساحل اور سمندر صفحہ ۱۱ ۲ صفحہ ۱۱۷ ۳ صفحہ ۱۲۳ ۴ صفحہ ۱۵۶ تا ۱۵۷ ۔ ۵ صفحہ ۱۵۶ تا ۱۵۷

"ادھر میں مسلسل امریکی نقادوں کی کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ اگرچہ یہاں کے کسی مشہور نقاد نے بھی میرے ذہن کے کسی گوشے کو متاثر نہیں کیا"[۱]

بھیا اور والد مرحوم کا ساتھ بیس سال سے بھی کم رہا اور اسی مدت میں آپ کا کافی وقت پھوپھا اور بچوپھی کے ساتھ اور اعظم گڑھ میں گذرا پھر بھی بھیا نے باپ کی محبت کو دل کے ایک گوشے میں چھپائے رکھا۔ مشرق ہو یا مغرب، ساحل ہو یا سمندر، خوشی ہو یا غم یہ یاد تو ہمیشہ سوئی کی نوک کی طرح دل میں چبھتی رہتی تھی۔ آپ نے لکھا ہے۔

"۱۶ر جنوری آج صبح سے کوئی یاد کوندے کی طرح ذہن میں بار بار لپک جاتی تھی، ڈھونڈھتا رہا اور آخر میں نے اسے ڈھونڈھ ہی نکالا۔ اس یاد کے ساتھ ایک طرح کے غم کا احساس بھی وابستہ تھا۔ اس لیے اسے ڈھونڈھ لینے کے بعد سکون نہیں ہوا۔ چوبیس سال پہلے ۱۶ر جنوری کو والد کا انتقال ہوا تھا۔ اتنی دور، اس تنہائی میں یہ یاد، جس کے نقش دھندلے ہوتے جاتے ہیں کیا تھا، میں نہیں کہہ سکتا۔ مصروفیت کے باوجود اس یاد نے رات ڈھونڈھ نکالا"[۲]

بھیا نے بچپن سے ہی ایک درویش کی زندگی بسر کرنے کی عادت ڈال رکھی تھی۔ آنکھ کھولی تو گاؤں کے غریب کسانوں کے جھونپڑے تھے، فاقہ زدہ لاغر بیمار انسان تھے۔ بڑے بڑے سرمایہ دار کمزور انسانوں کا خون چوس رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ —— عوام کے لیے اور عوام کی بھلائی چاہنے والے کے لیے ہمیشہ آپ کے دل میں درد تھا۔ آپ نے استالین کی بیماری کی خبر جب امریکی اخباروں میں پڑھی تو آپ کو سرمایہ دارانہ نظام کا بھیانک چہرہ سامنے آگیا۔ اور ضمیر کی آواز امریکہ میں گونج اٹھی

"۲۸ر مارچ استالین کی اچانک خطرناک بیماری کی خبر نے رنجیدہ کر دیا۔ یہاں کے اخبارات کی سرخیوں اور ان کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی شیطانی مسرت کو کبھی نہ بھولوں گا! مرنا تو سبھی کو ہے مگر افراد مرتے ہیں تاریخ نہیں مرتی"[۳]

امریکہ سرمایہ دارانہ نظام کے مکر و فریب کے پھیلائے ہوئے جال احتشام حسین پر کوئی جادو نہ کر سکے۔ آپ کو امریکہ سے نہیں بلکہ امریکہ کے حکمراں طبقہ سے نفرت تھی، اس سیاست سے جو دنیا کو ذاتی مفاد کے مقابلہ میں دوسروں کو کمزور کرنا چاہتی تھی۔ ۱۰ر مارچ کو آپ امریکہ سے لندن کے لیے روانہ ہوگئے۔ وطن کا فاصلہ قریب ہونے لگا اور آپ نے اپنی یاد پر سنہرا پردہ ڈال کر صرف بچوں کی یاد کو برقرار رکھا۔

"آج ایک حساب سے نوروز ہے، میرے گھر میں بھی خوشیاں منائی جا رہی ہوں گی۔ بچے رنگ کھیل رہے ہوں گے، نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن رہے ہوں گے، شاید مجھے بھی روز سے زیادہ یاد کر رہے ہوں"[۴]

امریکہ کے قیام کے دوران بھیا نے ہمیشہ ہر خط میں اس بات پر زور دیا کہ ہم سب ان کی غیر موجودگی میں زیادہ خوش رہیں۔ ہر تہوار کو زیادہ دھوم دھام سے منائیں۔ سب اپنی اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھیں۔ آپ جب امریکہ جا رہے تھے اس وقت آپ کا چھوٹا بچہ جعفر اقبال صرف آٹھ دن کا تھا۔ آپ نے امریکہ سے لکھا کہ میری خواہش ہے کہ اقبال سلمہ کا عقیقہ نہایت دھوم سے تم لوگ کرو۔ اور اس کے سارے اخراجات میں دوں۔ بھابھی کو ایک خط میں لکھا کہ اقتدار کی تندرستی کا خیال رکھنا۔ اور اس کے لیے ایک گرم سوٹ بنوا دو۔ ارشد کے لیے چھوٹی تین پہیہ کی سائیکل خرید دی جائے۔ یہ میرے بڑے بھائی کی خواہش تھی جو اپنی غیر موجودگی میں اپنے چاہنے والوں کے لیے بہت دور سے حکم دے رہا تھا۔ اور ہم سب نے نہایت گرم جوشی سے اس پر عمل کیا۔ نہایت شان سے جعفر اقبال کا عقیقہ ہوا۔ اقتدار کے لیے گرم سوٹ تیار ہوا۔ ارشد کے لیے تین پہیہ کی سائیکل آئی، ہاں ایک بات اور آپ یاد بار اپنے خطوط میں لکھتے تھے

---

۱ "ساحل اور سمندر" ۲ صفحہ ۲۲۰ - ۳ صفحہ ۲۵۱

میں امریکہ یا انگلستان کوئی قلعہ فتح کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں جب واپس گھر آؤں تو گھر کی زندگی میں میرے آنے سے کوئی آرائش یا بناوٹی چیز کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ دکسی طرح کی نمود بازی معلوم ہو، آپ کو ہمیشہ چھچھوری اور بناوٹی باتوں سے نفرت تھی۔ جس میں کسی چیز کو خواہ خواہ اچھالا جائے۔

آپ کا قیام جن دنوں امریکہ میں تھا میں نے بھابھی سے اجازت لی اور دہلی نوکری کے لیے چلا آیا کیونکہ سرکاری نوکری میں عمر کے ختم ہونے کا اندیشہ تھا۔ میں دہلی میں اپنی بہن اور بہنوئی سید خورشید حمید صاحب کے یہاں آکر ٹھہرا۔ اس وقت میری بہن بھی موجود تھی، اور اس نے کھانے پینے کا حد سے زیادہ خیال رکھا۔ میں بیماری کے بعد آیا تھا اس وجہ سے مجھے خود اپنی فکر تھی۔ یوپی کے ہر محکمہ میں ہندی لازمی ہو چکی تھی اور میں ہندی بالکل نہیں جانتا تھا۔ دہلی آنے کے چند دن بعد میں جوش صاحب سے ملا۔ جو اُن دنوں "آج کل" کے ایڈیٹر تھے۔ جوش صاحب سے میں بخوبی واقف تھا، موصوف کا دفتر شعراء، ادیب اور ملنے والوں سے بھرا رہتا تھا، اور میں اپنی غرض بیان نہ کر پاتا تھا۔ آخر ایک دن موقع نکال کر میں نے وجہ بیان کی۔ آپ نے شنکر پرشاد صاحب آئی۔سی۔ایس سے میرے لیے کہا، جو اس وقت انڈین ایر لائنس کے چیرمین تھے۔ موصوف نے گھر پر بلایا اور انڈین ایر لائنس میں گریڈ نمبر ۲ کی کلرکی کی پیش کش کی۔ میں ٹال مٹول کر کے وہاں سے یہ سوچ کر واپس آگیا کہ کلرکی پھر بھی کلرکی۔ یوپی میں نائب تحصیلداری مل رہی تھی مگر ٹھکرا دیا تھا۔ بھیا کے ایک شاگرد محترمی حسین کامل قدوائی اس وقت سمنٹ مارکٹنگ کمپنی میں اعلیٰ عہدہ پر تھے، میں ان سے ملا۔ آپ محترمی قدوائی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے جو اس وقت سول سپلائز کے منسٹر تھے۔ حسین بھائی نے دلچسپی لی اور چند دن کے اندر ان کی کوشش سے لکشمی انشورنس کمپنی میں سپروائزری کی معقول جگہ مل گئی، بعد میں ساری بیمہ کمپنیاں سرکاری تولیت میں آگئیں۔ حسین بھائی سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ میں نے بھیا کو اپنی نوکری کی اطلاع دی تو آپ کو خوشی تو ہوئی مگر سب سے زیادہ آپ نے میری صحت کے بارے میں لکھا کہ صحت کو بہتر بنانا۔ زیادہ محنت فی الحال نہ کرنا۔

لندن کی سرحد میں داخل ہوتے ہی آپ کو تھوڑا بہت سکون ملا۔ آل حسن بھائی جو کافی عرصہ تک لکھنؤ میں آپ کے ساتھ رہ کر آپ کے زیر سایہ تعلیم اور نوکری حاصل کر چکے تھے، آپ کی اہلیہ کرشنا اور بہن نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور بقول بھیا "مانوس چہروں نے مانوس فضا پیدا کر دی"۔ جاننے اور ملنے والوں میں بہت سے شاگرد، دوست اور خاص کر بچپن کے دوست فرید جعفری، محبت اور پیار کرنے والے استاد و صدر شعبہ انگریزی پروفیسر ایس سی۔ دیب الہ آباد یونیورسٹی۔ بہت سے ادیب اور شاعر دل کے ہجوم نے کسی حد تک آپ کی وطن کی دوری کو قربت میں بدل دیا۔ لندن میں آپ کو پڑھنے لکھنے کا لائبریری میں اہم کتابوں کے مطالعہ کا ملنے جلنے کا موقع ملا۔ جو گھٹن آپ امریکہ میں محسوس کرتے تھے وہ یہاں نہ تھی۔ آل بھائی نے کئی بار بی بی سی سے آپ کے تاثرات نشر کرائے اور آپ کی ہر وقت ہر طرح کی دلجوئی کرتے رہتے۔ آل بھائی کی بیوی اور بہن کے اصرار پر آپ نے ملکہ الزبتھ کی تاج پوشی کے بھی چند مناظر دیکھے۔

لندن کے قیام کے بعد آپ اپنے وطن عزیز کو روانہ ہو گئے اور بمبئی آگئے۔ بمبئی میں آپ کے دوستوں شاگردوں، عزیزوں اور وطن والوں نے کئی دن کے لیے روک لیا۔ آپ کے عزیز شاگرد علی رضا نے اپنی تیار کردہ فلم دکھائی، سبط حسن صاحب خیال مابلی نے اپنی آنکھیں بچھا دیں۔ میں آپ کی واپسی کی اطلاع پاتے ہی لکھنؤ آگیا اور صبح و شام انتظار کی گھڑیاں گنتے لگا کہ آخر تار آیا کہ [illegible] جولائی (۱۹۵۳) کو لکھنؤ پہونچ رہا ہوں۔

آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس خبر سے ان کے چاہنے والوں پر کیا گذری ہوگی۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ اضطراب اور بے چینی چاہنے والے سے جانے پر اور پھر اس کے آنے پر سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور انسانی تصور اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ کوئی ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے یا یکایک شمع محفل گل ہو جائے تو پروانوں پر کیا گذرتی ہے۔

تار کی خبر کے بعد میں بہت سے دوست، عزیز، میرے بہنوئی سید اولاد اصغر صاحب کانپور تک گئے تاکہ بھیا کا استقبال جلد سے جلد ہو سکے۔ کرنی مجھے یاد ہے کہ اولاد اصغر بھائی نے ایک خوبصورت سنہرا ہار سب کی آنکھیں بچا کر خرید لیا تھا۔ پلیٹ فارم پر لا محالہ ہم سب گاڑی کا انتظار کر رہے تھے کہ یکایک گاڑی کے آنے کی خبر ہوئی، ہم لوگ قطار میں کھڑے ہو گئے، ٹرین آ گئی اور فرسٹ کلاس کے ڈبے سے بھیا کا ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ دکھلائی پڑا۔ گاڑی سے آپ فوراً اتر کر ہم لوگوں کی طرف بڑھے۔ اولاد اصغر بھائی نے بڑھ کر ہار آپ کے گلے میں ڈالنا چاہا۔ بھیا نے وہ ہار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا کیا میں حج یا زیارت کر کے آ رہا ہوں۔ اس کے بدلہ میں اسی قیمت کی کتاب خرید کر ہاتھ میں دیتے" جس پر ہم سب مسکرا پڑے۔ پھر ہم لوگ سب اکھٹے ہی آ کر بیٹھ گئے۔ کانپور سے لکھنؤ کا راستہ بات ہی بات میں ختم ہو گیا۔ لکھنؤ کا پلیٹ فارم دکھلائی دینے لگا جس پر بے شمار احباب، اعزا، بچے بوڑھے، شاگرد، اساتذہ وغیرہ موجود تھے۔ بھیا نے سب کو دیکھا اس میں بزرگ چچا، پھوپھا، علی عباس صاحب حسینی، مرزا جعفر حسین صاحب وغیرہ اپنے ہاتھوں میں ہار لیے ٹرین کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ آپ نے فوراً وہ ہار جو کانپور میں آپ نے الگ رکھ دیا تھا اٹھا کر اولاد اصغر بھائی کو دیا اور کہا پہلا ہار تم میرے گلے میں ڈالو۔ اور کہا "تم جیت گئے میں ہار گیا"۔ اولاد اصغر بھائی خوش ہو گئے اور ہار بھیا کے گلے میں ڈال دیا۔ بچوں، عزیزوں، شاگردوں اور بزرگوں نے بھیا کو پھولوں کے ہار سے لاد دیا۔ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ بزرگوں کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کے سامنے آپ کا سر نہ جھکتا۔ پھولوں سے لدا ہوا میر کارواں آج کامرانی سے خود قدموں کو آگے بڑھاتا جا رہا ہے اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ یہی جسم خاکی پھولوں سے لدا ہوا تھا اور دوسروں کے قدم آگے بڑھ رہے تھے اور میر کارواں خاموش تھا۔

وطن اور عزیزوں، شاگردوں کی محبت کا شیدائی جس نے ۲۹ر اگست ۵۰ء کو اپنا سفر شروع کیا تھا، وہ ۱۹ر جولائی ۵۳ء کو اپنے چاہنے والوں کے پاس آ گیا۔

میری والدہ محترمہ کی خواہش کے مطابق، میری بہنوں، بھابھیوں، بچیوں اور شاگرد لڑکیوں نے میری بھابھی کو عروسی جوڑے سے اور تر و تازہ پھولوں سے آراستہ کیا۔ عزیزوں، دوستوں، شاگردوں کا کئی دن ہجوم رہا، دعوتیں لوگ قسم قسم کی کھا کھا کر دے رہے تھے۔ میں دہلی میں ملازم ہو چکا تھا اور نئی نئی ملازمت تھی اسی وجہ سے جلد ہی دہلی واپس آ گیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۳ء تک صبح و شام جس بھائی سے ایک پل جدا نہ ہوتا تھا اب نوکری کی وجہ سے وہ قربت جاتی رہی۔ بھیا نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ازدواجی زندگی کے خوشگوار رہنے اور اس کے بہتر نتائج کے لیے ضروری ہے کہ شادی سے قبل لڑکا برسر کار ہو۔ جیسا کہ خود آپ نے اپنے لیے یہی شرط قائم کر دی تھی۔ میری شادی کے بہت سے پیغامات آئے اور میرا بھی وہی نقش قدم تھا جو بھیا کا تھا۔ ماں اور بھائیوں نے ۱۸ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو میری شادی محترمی سید کلب مصطفیٰ صاحب ایڈوکیٹ کی بڑی صاحبزادی شمیم فاطمہ سے کر دی۔

بھیا نے جس خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے دعوت کا انتظام کیا تھا وہ لکھنؤ کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آپ نے میری بیوی کو ہمیشہ "بیٹی" کہا اور جس طرح وہ اپنی بچیوں، بھتیجیوں، بھانجیوں سے محبت کرتے تھے اسی طرح میری بیوی سے کرتے تھے۔

لکھنؤ کے قیام میں رمضان خاں باورچی جب بہت ضعیف ہو گئے تو ایک پہاڑی باورچی اسمٰعیل کو رکھ لیا گیا۔ اس کی عادتوں کا مجھے تھوڑے ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا۔ وہ زیادہ تر گھر کے باہر رہا کرتا تھا۔ پھر بھی بھیا نے ایک لفظ بھی اس سے نہیں کہا۔ ایک مرتبہ چند دن کے لیے آپ نگرام گئے تو اس سے تاکید کی کہ گھر پر رہنا اور میری غیر موجودگی میں یہیں سونا۔ مگر وہ کب عادت سے باز آتا۔ میں بیمار پڑ گیا اور وہ رات بھر غائب رہتا۔ ایک دن غصہ میں میں نے اسے الگ کر دیا اور دوسرا نوکر رکھ لیا۔ بھیا جب آئے تو میں نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ بھیا کے دل میں میری محبت اور میری لاج دوسری طرف اسمٰعیل کی بیکاری دل و دماغ پر چھا گئی۔ آخر آپ نے چند دن کے بعد اسمٰعیل کو جناب آل زماں صاحب

کے یہاں ذکر رکھوا دیا اور اس طرح جو خلش آپ کے دماغ میں تھی وہ دور ہوگئی۔

بھیا کے ساتھ وہ کر جس لاڈ اور پیار کی میں نے زندگی گذاری اس کی گواہی وہی لوگ دے سکتے ہیں جنھوں نے مجھے لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ اس محبت اور پیار کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ میرا دل چاہتا کہ میں اس بھائی کی ہمیشہ خدمت کروں جس نے مجھے اس قابل بنایا۔ ان کے بچوں کو وہی راستہ دکھاؤں جو بھیا نے مجھے دکھایا ہے۔ میں نے ضد کر کے آپ کے بڑے لڑکے جعفر عباس سلمہٗ کو اپنے پاس بلالیا میرا لڑکا جعفر مصطفیٰ اور لڑکی زویا اور جعفر عباس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی بطن کے یہ تینوں بچے ہیں اور تینوں ایک ہی پیار کی زنجیر میں جڑے ہیں۔ کیوں کہ درخت کی جڑ ایک ہے ہاں اس کی ڈالیاں ضرور ہیں۔ جعفر عباس نے دہلی کے قیام میں دہلی یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری بھی کر رہا ہے۔

لکھنؤ کے دوران قیام میں بھیا کو وہاں کی ادبی زندگی سے بڑا لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ اور لکھنؤ آپ کو بے حد پسند تھا۔ لکھنؤ میں کافی عزیز رہتے تھے اور ملنے جلنے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ مگر سیاست، مکر و فریب کا جال ہر جگہ بچھا رہتا ہے۔ لکھنؤ میں اردو ڈپارٹمنٹ میں پروفیسرشپ ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ جب الٰہ آباد یونیورسٹی سے آپ کے استاذ پروفیسر سید اعجاز حسین صاحب ریٹائر ہوئے تو بہت سے دوستوں نے اور محترمی اعجاز صاحب نے زور دیا کہ بھیا الٰہ آباد آجائیں۔ بھیا کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کی وجہ سے کسی کی حق تلفی ہو، لیکن دباؤ کا زور اس قدر بڑھا کہ ۱۹۶۱ء میں آپ کو لکھنؤ کو سلام کرنا پڑا اور آپ الٰہ آباد میں پروفیسر صدر شعبہ اردو ہوگئے۔ یہ وہی یونیورسٹی تھی جس نے احتشام کو احتشام بنایا تھا جس کی قابلیت کا لوہا یونیورسٹی مان چکی تھی۔ آپ کے زمانہ میں اردو ڈپارٹمنٹ کو چار چاند لگ گئے۔ اور آپ کے زمانہ میں اس یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ سے سب سے زیادہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علم ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیکر نکلے ہیں۔ طالب علم سے لیکر اساتذہ تک آپ کا احترام کرتے تھے۔

الٰہ آباد وہ الٰہ آباد نہ تھا جو آپ کی طالب علمی کے زمانہ میں تھا، نہ انقلابی چہل پہل، نہ وہ اساتذہ اور نہ پرانے ساتھی و شاگردوں کی صحبت اول میں مجھے چند نام یاد ہیں وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ بھیا کی خوشبو سونگھ کر ان سے ضرور ملنے آتے، ان میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر شارب ردولوی۔ ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر شمیم نکہت۔ ڈاکٹر عطیہ نشاط۔ ڈاکٹر نسیم قریشی۔ علی رضا۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر محمد علی۔ آل حسن۔ مہدی عباس حسینی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ڈاکٹر نقوی اور نہ جانے کتنے اور شاگرد ملکوں ملکوں پھیلے ہوئے ہیں۔

الٰہ آباد کے قیام میں جب آپ لکھنؤ جاتے تو منگو معدہ والا، احمد دھوبی یا پرانے ملازموں سے جو ملتا اس سے راستہ میں خود ہی سے روک کر ان کے بچوں کی خیریت معلوم کرتے۔ اگر ان میں سے کسی سے نہ مل پاتے تو کسی نہ کسی ذرائع سے اس کی خیریت دریافت کرلیا کرتے تھے۔ آپ سال میں دس بارہ مرتبہ دہلی ضرور آتے تھے۔ اکثر دوسری جگہوں کے معاملہ میں ہم لوگوں کی وجہ سے دہلی کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ جب آپ دہلی تشریف لاتے تو محبت کا دریچہ کھل جاتا اور گھر میں روشنی پھیل جاتی۔ ہم سب چاہتے کہ آپ جب بھی دہلی تشریف لائیں تو دل کے ٹکڑے ان کے سامنے رکھ دیں۔ وہ معدہ کی خرابی کی اکثر شکایت کرتے اور اکثر حکیم کوثر صاحب چاند پوری سے بھی اس کا تذکرہ کرتے۔ موصوف کی ایک خوراک آپ پر تیر حدف کا کام کرتی تھی۔ آپ زیادہ ٹھنڈی اور ثقیل چیزوں کو بہت کم پسند کرتے تھے۔ دہلی میں دوسرے عزیزوں شاگردوں اور دوستوں کو برابر یہ شکایت رہتی تھی کہ بھیا ان کے یہاں قیام نہیں کرتے۔ مگر آپ ہمیشہ ان لوگوں سے کہہ دیا کرتے تھے۔ "بھائی یہاں میرا چھوٹا بھائی اقتدار اس کی بیوی" دونوں بچے جعفر مصطفیٰ اور زویا ایک منٹ کے لیے نہیں پسند کرتے کہ میں کہیں اور ٹھہروں"۔ دہلی میں آپ کے آنے کی اگرچہ ہم خبر دیتا تھا مگر ان کے چند عزیز، دوست، شاگرد مثلاً احمد حسن صاحب، تبسم بھائی۔ خورشید حیدر، ڈاکٹر محمد حسن صاحب۔ ڈاکٹر شارب صاحب۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب، فرقت صاحب۔ اجمل اجملی صاحب وغیرہ کو نہ جانے کس طرح پتہ لگ جاتا تھا

اور وہ لوگ ضرور ملنے آتے۔ اور چائے یا کھانے پر آنے کے لیے حد سے زیادہ اصرار کرتے۔ بعض ان میں کامیاب ہو جاتے اور بعض سے "پھر کبھی" کا وعدہ کر کے چھٹکارا حاصل کر لیتے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ جب بھی بھیا آئیں میں ان کے اعزاز میں ان کے دوستوں، شاگردوں کو چائے یا کھانے پر بلاؤں۔ مگر ان کے دوست اور شاگرد بس اتنی مہلت دیتے تھے کہ رات کو آکر وہ یہاں سو رہیں۔

ایک مرتبہ آپ والدہ محترمہ کے ساتھ دہلی آرہے تھے۔ لکھنؤ کے اسی محلہ بارود خانہ کے جہاں آپ پہلے رہتے تھے چند بچے اسی گاڑی سے دہلی آرہے تھے۔ آپ غازی آباد اسٹیشن پر اتر کر اخبار خرید کر اخبار کی سرخی دیکھ رہے تھے کہ گاڑی چھوٹ گئی۔ آپ نے مڑ کر دیکھا تو ٹرین کافی دور نکل چکی تھی۔ آپ نے فوراً اسٹیشن ماسٹر کے پاس جا کر ان لڑکوں کے نام لکھائے اور ہدایت کی کہ دہلی ٹیلی فون پر ان لڑکوں کے نام کا اعلان کر کے یہ بتا دیں کہ زنانہ ڈبہ سے والدہ صاحبہ کو اتار لیں۔ آپ نے پریشان ہو کر معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا ٹیکسی یا کوئی دوسری سواری اس گاڑی کے کافی بعد دہلی پہونچے گی۔ تھوڑی ہی دیر میں کوئی اور گاڑی دہلی جانے والی تھی آپ اس سے دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ والدہ کو ان بچوں نے دہلی میں اتار لیا اور کہا کہ احتشام صاحب ابھی آرہے ہیں۔ والدہ محترمہ سے قلی بار بار دریافت کرتا کہ سامان کدھر لے چلوں تو والدہ صاحبہ جواب دیتیں کہ ابھی ٹھہرو۔ جب کافی دیر ہو گئی تو ماں کے دل کی پریشانی بڑھی اور طرح طرح کے خیالات ذہن میں آنے لگے۔ دوسری طرف بھیا کو الجھن کہ والدہ پر کیا گذر رہی ہوگی معلوم نہیں بارود خانہ کے بچوں نے والدہ کو اتارا یا نہیں۔ جب آپ پسینہ میں شرابور دہلی کے اسٹیشن پر والدہ سے ملے تو دونوں کی آنکھوں سے موتیوں کے قطرہ زمین پر گر پڑے۔

ماں بیٹے کی تھوڑی دیر کی جدائی اور پریشانی کا یہ عالم تھا اور جب کوئی ماں اپنے لعل کو ہمیشہ کے لیے کھو دے اور ایسے عالم میں کہ اپنے نور نظر کو آخری ابدی نیند سوتے نہ دیکھ سکے۔ اس کی خوشبو سے سیکڑوں میل دور ہو اس کا کیا عالم ہوگا۔

۱۴ مارچ ۱۹۶۵ء کو میرے لڑکے سید جعفر مصطفیٰ کے "غسل صحت" کے موقع پر آپ مع بھابھی و بچوں کے دہلی تشریف لائے۔ اسی موقع پر میرے خسر سید کلب مصطفیٰ صاحب ایڈووکیٹ بھی تشریف لائے تھے۔ دونوں حضرات کا ایک ساتھ رہنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ دو دانشور جن کے سیاسی خیالات تو بیشک الگ الگ تھے۔ مگر دل کے بندھن بہت مضبوط تھے۔ میں محبت اور پیار کے ان لمحات کو اپنی زندگی میں کبھی نہیں بھول سکتا جب بھیا نے میری بیوی کی آنکھوں سے خوشی سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے رومال سے خشک کیے تھے۔ چند دن کے اندر بھیا اور کلب مصطفیٰ صاحب نے ایک دوسرے کو کس قدر پہچان لیا تھا کہ جب اباجان (کلب مصطفیٰ صاحب) کا یکایک حرکت قلب کے بند ہو جانے سے ۲۸ نومبر ۱۹۶۵ء کو لکھنؤ میں انتقال ہو گیا تو بھیا کو حد سے زیادہ صدمہ ہوا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی یتیمی۔ اور بڑے بھائیوں کو جو صدمہ گذرا اس کا تذکرہ آپ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

"موت نہ تو سن وسال دیکھتی ہے اور نہ آرزوؤں اور خوابوں کا خیال کرتی ہے اس کے سامنے نہ تو زندگی کے گھپ اندھیرے میں چھوٹ جانے والے اہل وعیال ہوتے ہیں، نہ وہ مجلسی اور سماجی رشتے جن میں ایک شخص بہ خوشی بندھنا پسند کرتا ہے، زندگی میں یہ سارے بندھن کتنے مضبوط نظر آتے ہیں، لیکن موت کی ایک خاموش ضرب ساری زنجیروں کو اس طرح پارہ پارہ کر دیتی ہے، جیسے وہ تھے ہی نہیں .... یہ درست ہے کہ رونے یا اظہار غم کرنے سے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی، لیکن احساس کی لطافت اور شدت، انسانی رشتوں کی نزاکت اور رفاقت، سماجی روابط کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے"[1]

بھیا! یہ آپ کی چند سطریں لفظ بہ لفظ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو پوری قوم کے لیے قیامت کبریٰ کا پیغام دے رہی تھیں۔

---

[1] سرفراز کلب مصطفیٰ نمبر صفحہ ۹

۱۹۷۲ء میں بڑے بابا سید ابو محمد صاحب قبلہ کا انتقال ہوگیا۔ بھیا آپ کی حد سے زیادہ عزت کرتے تھے۔ جس وقت بابا کی
موت کا تار آپ کو ملا آپ بےہوش ہوکر روئے، ایک ساتھ باپ، بیٹا، بھیا۔ اور بڑے بابا کی یاد نے ایک طوفان مچا دیا۔ بچپن سے جن
بزرگوں کی یاد کے چراغ دل میں روشن تھے وہ ایک ایک کرکے گل ہوتے جا رہے تھے۔ اور بھیا کی قوت برداشت بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔
آپ کے خسر محترم سید حسن عسکری صاحب کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لیے وہ ایک عرصے سے اپنے داماد اور بیٹی کے ساتھ رہنے لگے تھے
اور ہم سب ایک مقدس بزرگ کی طرح آپ کی عزت کرتے تھے۔ آپ نہایت نیک اور فرشتہ خصلت انسان تھے۔ الہ آباد میں آپ کا انتقال ہوا تو
سوگواروں نے اس غم کو اپنا غم تصور کرکے بھیا اور بھابھی سے ان کی یاد بانٹ لی۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء (۷ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ) کو میرے دونوں بچوں سید جعفر مصطفیٰ سلمہ و زدیا سلمہا کی "تقریب روزہ کشائی" میں بھیا،
بیوی اور کئی بچوں کے ساتھ دہلی تشریف لائے۔ آپ کے پاس وقت نہ تھا، پھر بھی آپ نے محبت کا حق ادا کیا۔ اسی موقع پر میرے بہت سے
دوستوں، دفتر کے حضرات اور کرم فرماؤں سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ یہ تقریب بہت کامیاب رہی۔ تقریب روزہ کشائی کے خوبصورت کارڈ کا
تذکرہ چل رہا تھا کہ میں نے محترمی قمر الاسلام صاحب سے آپ کا تعارف کرایا۔ محترمی قمر صاحب آپ کی اہلیہ اور بیٹی فرزانہ کا شمار ہم لوگ "اپنوں"
میں کرتے ہیں۔ بھیا نے ان حسین کارڈوں کی تعریف کی۔ قمر صاحب کی اور آپ کی پہلی ملاقات تھی۔ کئی بار شام کو بھابھی، بچوں کو چائے پر کھانے
پر آپ نے مدعو کیا۔

میرا الہ آباد کا جانا بہت کم ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بھیا سے برابر اور بھابھی وغیرہ سے اکثر دہلی یا لکھنؤ میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔
میں جب بھی گیا عباس حسینی بھائی کو آپ سے قریب پایا۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ آپ کو بھیا سے قدرتی طور پر والہانہ محبت ہوگئی تھی۔ بھیا کو بھی
آپ سے ویسی ہی محبت اور کشش تھی جس کا اندازہ یکم دسمبر ۱۹۸۸ء کے بعد سے کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ حسینی بھائی میں خلوص، عزیزانہ شفقت
پائی۔ ان کے بلند کردار کی عظمتوں کو وہ مقام دیتا ہوں جہاں مثال قائم کرنے کے لیے سیکڑوں جبینیں جھک جاتی ہیں۔ بھیا صرف پیار کے بھوکے تھے۔
کسی کی دولت سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ اگر دولت کا سہارا لینا ہوتا تو امریکہ میں ایسے ذرائع تھے کہ دولت آپ کے قدموں میں ڈھیر ہوتی۔
مگر انسانیت کا نام زندہ رکھنے کے لیے اس غریب النفس بھائی نے اپنے کو اس سے دور رکھا، تاکہ جب وقت آئے تو آپ کی شرافت کی قسم
انسانیت کھا سکے۔

۲۰ نومبر کو ہم لوگ بھتیجے کی شادی کے سلسلہ میں "عصمت منزل" چوک میں تھے۔ بھیا نے مجھے اور ارشاد اصغر بھائی کو ساتھ لیا اور گلی کوچوں
سے گذرتے ہوئے یہ کہہ کر چلے کہ میں غالباً ۱۹۲۲ء میں اسی راستے سے میر انیس کے مکان اور ان کی قبر دیکھنے گیا تھا۔ دماغ میں گلیوں کا راستہ اور
وقت کب اسی راستے سے آئے تھے یاد تھا۔ میں نے اور ارشاد اصغر بھائی نے میر انیس کا مکان اور نو تعمیر مقبرہ پہلی بار دیکھا۔

۲۱ نومبر ۱۹۸۸ء (۱۰ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ) کو میرے منجھلے بھائی سید وجاہت حسین صاحب کے بڑے صاحبزادے سید جعفر مہدی سلمہ کی بارات
جھریا، محترمی سید وصی احمد صاحب زیدی، چیف ویلفیئر آفیسر کے یہاں روانہ ہوئی۔ بھیا بھی ساتھ تھے۔ یہ راستہ سیکڑوں بار آپ کے قدموں
تلے روندا گیا تھا۔ ہم انجان لوگوں کو برابر بتاتے جاتے کہ اگلے اسٹیشن پر چائے یا کوئی خاص چیز کس مزہ کی ملے گی۔ آپ نے جس جس اقسام کی
چائے کا تذکرہ کیا واقعی میں ویسی ہی چائے راستہ میں ملتی رہی۔ ہم بھائیوں کے بچوں میں یہ پہلی شادی تھی جو نہایت خوبصورتی سے انجام پائی۔
اور اس تقریب میں زیادہ سے زیادہ اعزہ شریک ہوئے۔ دعوت ولیمہ کے انتظام میں میں نے اپنے منجھلے بھائی سید افضال حسین صاحب کو
بہت با اصول پایا۔ میرا اندازہ ہے کہ جس کام میں آپ دل سے دلچسپی لیتے ہیں اس میں ہمیشہ چار چاند لگ جاتے ہیں اور اس میں کیوں نہ دلچسپی
لیتے یہ تو اپنے گھر کی بہار وابستہ تھی۔ ۲۳ نومبر کو دعوت ولیمہ کے دن میں نے دیکھا کہ مہمانوں کے ہجوم میں شاید ہی کوئی ایسا تھا

جیسے بھیا نہ جانتے رہے ہوں۔ میں نے حیرت سے اکثر آس پاس کے حضرات سے پوچھا۔ "اب یہ کون صاحب ہاتھ ملا رہے ہیں۔" "اب یہ کون صاحب بغل گیر ہو رہے ہیں۔" ۔۔۔ سہ پہر کی صبح کو یکایک ایک خوبصورت سی کار ہمارے گھر کے دروازہ "عصمت منزل" پر آ کر رکی۔ بھیا نے کار دیکھ کر ڈرائیور کو آواز دی کیوں! خیریت تو ہے نا! اور ڈرائیور نے ایک پرچہ نکال کر دیا تھا۔ محترمی مقبول احمد لاری نے لکھا تھا کہ آپ سے ایک ضروری مشورہ لینا ہے۔ چند منٹ کی زحمت ضرور کریں۔ بھیا کے ہمراہ میں عزیزی محمود الحسن اور میرا لڑکا جعفر مصطفیٰ بھی ساتھ ہو لئے بھیا نے لاری صاحب سے تعارف کرایا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی اقتدار ہے اور یہ اس کا لڑکا جعفر مصطفیٰ۔ میں نے صرف ایک بار لاری صاحب کو کسی جلسہ میں دیکھا تھا۔ "اقبال منزل" میں جس زمانہ میں چھوٹی رانی کی طرف سے عشرہ محرم میں جناب مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ ذکری کرتے تھے۔ اس وقت میں اکثر اقبال منزل آیا جایا کرتا تھا۔ جس کمرہ میں لاری صاحب نے ہمیں بٹھایا وہ بہت خوبصورت تھا۔ میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جہاں ۱۹۳۵ء کے مشاعرہ کے چندہ کے سلسلے میں ہمارا انجکار کے پاس آیا تھا۔ اس وقت میں لکھنؤ کرسچین کالج کی اردو یونین کا جنرل سکریٹری تھا۔ میں نے لاری صاحب سے کہا "یہ کمرہ تو وہی معلوم ہوتا ہے جس میں مہارا انجکار رہتے تھے۔" لاری صاحب نے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر اب یہ کمرہ ہمارے مہارا انجکار (احتشام صاحب کی طرف اشارہ کر کے) کے لیے وقف ہے۔ اس پر ہم سب ہنس پڑے۔ لاری صاحب بھیا سے کیوں اتنی محبت اور عقیدت رکھتے ہیں اور آج بھی ان کے دل میں محبت کا ایک شعلہ سا ہے جو ایک نہ ایک دن ضرور بھڑک اٹھے گا۔ لاری صاحب صاحب دولت و ثروت ہیں، ایک سرمایہ پرست فرد اپنی دولت سے آسودہ ہو سکتا ہے، کیونکہ اس کی کائنات صرف دولت ہے۔ اس کا خدا دولت، اس کی عزت دولت، اور اس کے نزدیک ہر چیز دولت ہوتی ہے، لیکن بہت سے شریف النفس انسان ایسے بھی ہیں جن کے لیے دولت بھی آسودگی کا سبب نہیں ہوتی بلکہ ان کے دل و دماغ میں کوئی اور بھی جذبہ ہوتا ہے جس سے انھیں آسودگی ملنے کی امید ہوتی ہے۔ لاری صاحب اپنی زندگی کے میزان پر اگر ایک طرف ادب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف ادب کے معماروں سے کچھ لینا بھی چاہتے ہیں۔ آپ کا ہر عمل ایک ٹھوس ارادہ کا پابند رہتا ہے۔ اور اسی لیے انھیں ایسے انسان کی تلاش تھی جو اس کشمکش میں ان کی مدد کر سکے۔ بھیا اپنا ہاتھ اسی لیے آپ کے ہاتھ میں دیا تھا کہ لاری صاحب کا ہاتھ ادب کی باغبانی چاہتا تھا، ان کا دماغ زبان کی لطافت و پاکیزگی کی خوشبو چاہتا تھا۔ جب بھیا امریکہ میں تھے تو مسٹر گل پیٹرک نے باتوں باتوں میں اس بات کا اشارہ کیا تھا کہ احتشام صاحب امریکہ سے واپس جا کر خود بھی امریکہ کا کلمہ پڑھیں گے اور دوسروں سے پڑھوائیں گے، امریکہ کی تعریف میں قصیدے لکھیں گے مگر اس کا اثر الٹا ہوا۔ جب تک امریکہ نہیں دیکھا تھا معلومات پر پردہ پڑا تھا، جب آنکھوں سے دیکھ لیا تو اس سرمایہ دارانہ نظام کے ملمع میں چھپے ہوئے عوام کے گھٹے ہوئے دم کا آپ نے خوب اچھی طرح جائزہ لیا اور اسے خودکشی کا مینہ سمجھ کر اپنے ملک والوں کو اس سے آگاہ کیا۔ اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں اپنی تحریر و تقریر کے جوہر دکھا کر عوام سے خراج تحسین حاصل کر لیا۔

بھیا ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو دہلی تشریف لائے۔ یہاں سے چند گھنٹوں کے لیے میرٹھ اور علی گڑھ بھی گئے تھے۔ والدہ صاحبہ کی آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں بھیا سے بات ہوئی اور آپ نے زور دیا کہ کسی اسپتال کے بجائے گھر پر دیکھ بھال زیادہ ہو سکے گی، اس لیے اگر آپریشن گھر پر ہو تو زیادہ بہتر رہے گا۔ ڈاکٹر خیرات آئی ہاسپٹل کے بہترین ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق آپریشن کا انتظام گھر ہی پر کیا گیا۔ مہر اکتوبر کو آپ کو واپس الہ آباد جانا تھا مگر نزلہ کی شدت کی وجہ سے ہم لوگوں نے روک لیا۔ اسی رات والدہ محترمہ نے بھیا سے ایک سوال کیا جس کا جواب آپ نے یہ دیا تھا کہ "جس کے ماشاءاللہ ایسے بھائی موجود ہوں اسے اس کی کیا فکر۔" اور آپ کا یہ جواب میری ڈائری میں درج ہے۔ اسی دن دہلی میں میرے مکان بنوانے کے سلسلہ میں بات چلی تو میں نے کہا کہ بھیا لمین کے پلاٹ کی قیمت ہم نے سوسائٹی کو ۱۹۶۵ء میں ادا کر چکے مگر ابھی تک ہم لوگوں کو اس پر قبضہ نہیں ملا۔ آپ نے بات ہی بات میں کہا کہ ہاں ایک کمرہ اس میں خاص میرے لیے بنوا دینا۔

اس میں اپنے لکھنے پڑھنے کا حساب کتاب رکھ سکوں۔ میں نے بے ساختہ برجستہ کہا "بھیا وہ گھر ایسا ہی ہوگا اور صرف آپ کے لیے ہوگا۔" محمد میاں نے (جعفر عباس) بھیجا ہوا تھا اس نے کہا "اور چچا جان میرے لیے" جس کا میں نے جواب دیا تھا کہ نہیں، صرف بھیا کے لیے۔ مجھے ابھی تک زمین کا قبضہ نہیں ملا لیکن قدرت کی طرف سے عطا کی ہوئی ۸ گز مربع زمین پر میں نے اپنے بھائی کے لیے پکے گھر کی تعمیر کا کام ملتا پور کی کربلا میں ۳ دسمبر ۱۹۸۲ء کو شروع کیا جو ۱۰ دسمبر ۱۹۸۲ء کو ختم ہو گیا۔ ایسا گھر جو صرف آپ کے لیے ہے اور ہمیشہ آپ ہی کا ہو کر رہے گا۔ مگر لاکھوں جبینیں جھک کر اس معصوم کی ابدی قیام گاہ کا بوسہ لیں گی۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء آخری بار میر کارواں نے دہلی کو ادب سے سلام کیا۔ دہلی نہیں بلکہ اردو زبان کے ان معماروں کو جو دہلی کی سرزمین پر سو رہے ہیں۔ اور آپ آسام میل سے روانہ ہو گئے۔ والدہ محترمہ کی آنکھ کا چند دنوں بعد گھر پر کامیاب آپریشن ہوا۔ اور اس موقع پر تسنیم بھائی، عماد سلمہ، سلمان سلمہ، جعفر عباس سلمہ اور میرا لڑکا جعفر مصطفیٰ موجود تھے۔ شام کو خورشید صاحب مع بیوی بچوں کے والدہ کو دیکھنے آگئے ۳ دسمبر کو آنکھ کی پٹی چالیس دن کے بعد کھلنا تھا۔

الہ آباد پہونچنے کے بعد آپ ہر خط میں والدہ محترمہ کی آنکھ کے بارے میں معلومات کرتے رہے اور آپ نے میرے منع کرنے کے باوجود روپیہ بھی ادا کیا۔ خطوط تقریباً روزانہ آتے رہتے تھے۔ نومبر کے آخری ہفتہ کے خطوط جو آپ نے ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۸ اور ۳۰ نومبر کو لکھے اس میں زیادہ تر والدہ محترمہ کی آنکھوں کا تذکرہ یا گھریلو زندگی اور محمد میاں کے بارے میں ہے۔ ۳۰ نومبر کو آپ نے سترہ آدمیوں کو خط لکھے تھے جس میں چند کے نام یہ ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ)، سید امداد اصغر (مالی)، سید وجاہت حسین (لکھنؤ)، سید انصار حسین (لکھنؤ)، سید خورشید حمید (دہلی)، سید افتخار حسین (دہلی)۔۔۔ ۳۰ نومبر کو بینک سے روپیہ نکلوایا۔ ۳۰ نومبر کو اپنی بہترین تصاویر جو آپ کبھی کبھی اپنے دوستوں یا شاگردوں کو دکھاتے تھے انھیں اپنی چھوٹی بچی ثریا حسین کو دے دیا۔ ۳۰ نومبر کو تقریباً گیارہ بجے رات تک سید بدرالحسن صاحب صدر شعبہ عربی بنارس یونیورسٹی سے آپ نے کسی اہم معاملہ پر بات چیت کی اور اس وقت تک بھیا بیٹھے باتیں کرتے رہے جب تک کہ خود بدرالحسن صاحب نے جانے کی اجازت نہیں چاہی۔

یکم دسمبر ۱۹۸۲ء (جمعہ) صبح بیدار ہو کر ایک مہمان کی آمد کی تیاری کر رہے تھے میری بیوی صبح آٹھ بجے جب کچھ دیر وہاں پہونچی تو آپ کے چہرہ پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب ہی بیویوں کی، بچوں کی، والدہ، انجم و چندو (تامر) کی خیریت دریافت کی۔ بھابھی کو آواز دے کر کہا "لو ایک ساتھی تمہاری بھلائی کے لیے آگیا۔" تقریباً سوا آٹھ بجے آپ نے میری بیوی کو مخاطب کر کے کہا "بیٹی اگر اقتدار کوئی ایسی بات غصہ میں یا جذبات میں آکر کہہ دے جو اسے دکھی چاہئے تو تم اسے بُرا نہ ماننا۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ صرف جذباتی ہے۔ اور ساڑھے آٹھ بجے پرسکون آواز سے کہا "میری زندگی کی ساتھی سے، آج میں ایک لمبے سفر پر جا رہا ہوں" بھیا! کس مہمان کی آمد کا انتظار تھا۔ لوگ آتے ہی رہتے تھے کیا یہ کوئی خاص مہمان ہے جس سے آپ کی پہلی اور آخری ملاقات ہوگی۔ بھیا! اس سولہ سال کی ہماری ازدواجی زندگی میں آپ نے پہلی اور آخری بار میری بیوی سے تعریف کے کلمات کیوں نکالے۔ اور بھیا یہ سفر پر جانے کے پہلے کیا آپ محبت کی گواہی کو توڑنے جا رہے ہیں۔ پھر کیا ہوا۔ میرا قلم آگے بڑھنے میں آنسوؤں کے آنسو رو رہا ہے کہ میرے پاس الفاظ نہیں، آپ ہی کے الفاظ لکھ رہا ہوں:

"۳۰ اپریل ۱۹۸۲ء کل سے طبیعت سست سی ہے۔ بیمار ہونے کا احساس ہے۔ نہ جانے کیوں خیال بار بار دل کو گھیر جاتا ہے۔ دل کی بیماری، شاعرانہ مفہوم میں نہیں، واقعی ہے"

لہ ترشحات ادب نمبر ۱۰ صفحہ ۳۰۰

صبح نکل رہا تھا۔ دوسری طرف باب ادب خاموش ہونے جا رہا تھا۔ میرے مایۂ ناز بھائی نے کہا ہوگا، میرے بچو، میرے مداحو اور میرے بھائیو، میرے چاہنے والو، میرے ہم وطنو اور عزیز شاگردو۔ اے اردو زبان۔ الوداع! اردو زبان نے تڑپ کر اپنی بے زبانی میں کہا ہوگا قافلہ سالار، الوداع اور قافلہ سالار کے دل کی وہ دھڑکن بند ہوگئی جس کی شرافت و نیکی کی لوگ قسم کھاتے تھے۔ اور پیار سے گلے لگاتے تھے۔ آج موت نے اسے گلے لگا لیا جس کا صبح سے انتظار تھا مگر جاتے جاتے دنیا کو یہ پیغام دیتا گیا۔

"ہر جوان .... مرنے والے کے ساتھ تم یہ کر سکتے ہو کہ اس کی صداقت کو پھیلاتے رہو جس سے ان کے خیال روشن تھے۔ یقین کی وہ گرمی پیدا کرو جس سے ان کے سینے منور تھے"[1]

شمع کے گل ہوتے ہی منٹوں میں سیاہ بادل کی طرح سوگوار ماحول چھا گیا۔ ریڈیو نے اپنی دھن میں "بحر بیکراں" کی موت کا بار بار اعلان کیا۔ دوستوں عزیزوں کو تار اور ٹیلیفون سے اطلاع کی گئی۔ سب آئے مگر کمزور جلی ماں جس کی آنکھوں پر قدرت نے اس حادثہ کے پہلے پٹی باندھ دی تھی نہ آسکی۔ اور وہ بہن جو بھائی کی زلفیں سنوارتی تھی دہلی میں ماں کی خدمت کر رہی تھی۔ منجھلا بھائی اس وقت پہونچا جب تلقین ہو رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے حسرت سے ماں اور چچی کو دیکھ رہے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ کریم نگر سے ۲ دسمبر کے نو بجے تک سوگواروں پر کیا گذری ہاں صبر کی تلقین دینے والے دوست ہزار موجود تھے۔

آہ! ۲ دسمبر کی صبح کو یہ "میر کارواں" ہزاروں دانشوروں، دوستوں، عزیزوں، شاگردوں اور شہر والوں کے کاندھوں پر کربلا کو روانہ ہوگیا۔ چند گھنٹوں میں مٹی کا جسم مٹی میں چھپ گیا۔

میرے پیدا کرنے والے یہ زمین، یہ آسمان، زندگی اور موت کا مالک تو ہے۔ جس طرح اس کا وجود ہے اسی طرح ایک نہ ایک دن اس کی انتہا ہوتی ہے۔ غم کیا ہی کیوں نہ ہو۔ قوم کے لیے ہو۔ گھر کے لیے ہو، ادب کے لیے ہو یا پورے نظام کے لیے ہو۔ مرحوم ہی کے الفاظ ہیں:

"غم کچھ لوگوں کے لیے ذاتی اور شخصی ہوتا ہے، وہ ایک وسیع تر دائرہ میں جماعتی اور سماجی، ملکی اور قومی بھی ہو سکتا ہے لیکن موت ان میں سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ وہ ماں، بیوی، بچوں اور عزیزوں کو رلاتا، بلکتا چھوڑتی ہے وہیں مرنے والے کی ذات سے قومی اور سماجی افادیت کا جو پہلو وابستہ ہوتا ہے اسے بھی نظر انداز کر جاتی ...."[2]

پوری قوم سوگ میں ڈوب گئی اور یہ سوگ تو ابدی ہے، ہمیشہ رہے گا۔ یہ وقار، یہ عزت، یہ محبت برسوں کی کاوشوں کا پھل ہے — وزیروں اور لیڈروں کے گھروں کا طواف نہیں۔ بقول آل احمد سرور:

"احتشام جمہوریت کے فدائی، ہندوستانی تہذیب کے عاشق ہی نہیں ملت اور سوشلزم کے پجاری تھے۔ انھوں نے ساری زندگی علمی و ادبی کاموں میں گذار دی، انھوں نے کسی بڑے عہدہ کے لیے جوڑ توڑ نہیں کیا۔ وزیروں اور لیڈروں کے گھر کا طواف نہیں کرتے تھے، ان کے دوستوں کو ان کی دلنواز شخصیت اور وضع داری یاد رہے گی، ان کے شاگرد ان کی شفقت و محبت کو کبھی بھلا نہ سکیں گے۔ اور اردو زبان و ادب کا ہر قدر دان ان کے بلند پایہ اور وسیع ادبی کارناموں کو ہمیشہ احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھے گا۔"

بھیا کے انتقال پر جن لوگوں نے بھرپور ساتھ دیا ان میں عباس حسینی بھائی کا نام سرفہرست ہے۔ شروع ہی سے میں نے انھیں ہر موقع پر پایا مگر ہر کام کو خوبصورتی اور محبت سے کرتے دیکھا۔ شاید یہ محبت آپ کی اور میرے مرحوم بھائی کی اس قدر پائدار تھی کہ ان کے لیے تھی جو ہم سب نے یکم دسمبر سے

---

[1] ساحل اور سمندر، صفحہ ۳۳۰۔ [2] سرفراز لکھنؤ، مصطفیٰ نمبر، صفحہ ۹

ماہنامہ جاسوسی دنیا کے اداریہ میں جس خلوص اور محبت کا تذکرہ کیا ہے وہ آپ کے علمی اقدام کو دیکھتے ہوئے کم ہے۔ آپ نے کہا ہے:

"انہوں نے علم و فن کی روشنی سے سارے عالم کو منور کیے ہوئے تھا۔ اخلاق و مروت کی ان اعلیٰ منزلوں پر گامزن تھا جہاں آج کا انسان مشکل ہی سے پہونچ پاتا ہے۔ انہوں نے مغرب و مشرق کی راہوں پر اپنے فضل و کمال کے چراغ روشن کر رکھے تھے .... مرحوم کی بے پناہ شفقتیں، ان کی محبت، ان کے پرخلوص مشورے، ان کی ہمدردیاں ہمیشہ ہمارے لیے باعث فخر رہی ہیں۔ اور میں ذاتی طور پر بس اتنا ہی کہوں گا کہ والد محترم کے انتقال کے بعد شفیق بھائی کا جو سہارا ملا تھا اسے بھی موت کے بے رحم ہاتھوں نے مجھ سے چھین لیا۔"

آپ کی واحد ذات تھی جس کے غم سے تمام عزیزوں، دوستوں اور بہت سی اہم باتیں ہم سب کو معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ مگر آہ وہ گھرانا جس سے ہزاروں گھر روشن تھے، جس سے علم و ادب روشن تھا، وہ معصوم گھرانا جو چند منٹ پہلے تابوت میں روشن تھا، اس نے پل بھر میں اندھیری قبر کو اپنے اعمال صالح سے منور کر دیا۔ جس طرح اخلاق و محبت، علم و ادب کے کمال سے دنیا کو روشن کیے ہوئے تھا یا مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی کے الفاظ میں:

"......... اردو میں ناقد تو پہلے بھی بڑے بڑے ہو چکے تھے۔ اور سخن فہم و سخن سنج، حالیؔ و شبلیؔ کب سے گذر چکے تھے، لیکن وہ سخن فہمی تمام تر ذوقی و وجدانی تھی، کسی ترکیب کی ندرت پر جھوم اُٹھے، کسی فقرے کی نزاکت پر، داد کے ساتھ دل دے بیٹھے، لیکن تنقید بہ حیثیت فن کے، "دورِ احتشامی" سے قبل اردو میں کہاں آئی تھی، اور تنقید کی اصولی بحثیں مغرب سے لاکر مشرق کے مدرسوں میں کس نے پھیلائیں۔ یہ نئے نئے رنگ، اور وضع کے گل بوٹے بستانِ مشرق میں کس نے کھلائے تھے، یہ نت نئے سبق اپنے ہم وطنوں کو کس نے پڑھائے تھے۔"

مرحوم کے جنازہ میں سوگواروں کا ہجوم۔ ملک کے کونے کونے میں اور ملک کے باہر تعزیتی جلسہ اندر اردو ادبی مجالس و سیرت پاک کے جلسہ ایصال ثواب کی غرض سے قرآن خوانی۔ فاتحہ۔ نذر۔ غربا کو کھانا کھلانا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ احتشام کسی ایک فرقہ کا ستون نہ تھا۔ بلکہ ادیب، شاعر، عزیز۔ دوست۔ شاگرد۔ امیر اور غریب شہری، سب کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ اور ایک دھڑکن کے رکتے ہی سب نے اس غم کو اپنا اپنا غم تصور کیا۔ مرحوم کے جنازہ سوئم، چالیسویں میں عقیدت مندوں کے بے پناہ ہجوم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھیا کی موت واقعی ایک قومی حادثہ ہے۔

میں ۲۰ دسمبر کو اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر دہلی آیا، میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنے بھیا کو اکیلا چھوڑ دوں، لیکن ہائے رے مجبوری! میرا بھائی جس نے میری یتیمی کو خوشگوار زندگی میں بدل دیا کاش اس کے قدموں کی خاک مل جائے تو کم سے کم اس کا بوسہ ہی لے لوں۔

دنیا میں ایک سے ایک اہم انسان مرتے ہیں، لیکن ہر موت کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ یہ المناک حادثہ وقت سے پہلے ہوا۔ ابھی بھیا کی ضرورت اس ماں کو تھی جو اپنی بیوگی کو بھول کر اپنے بچے کو اعلیٰ بلندیوں پر دیکھ رہی تھی۔ ابھی بھیا کی ضرورت اس بیوی کو تھی جو آپ کی غیر موجودگی میں رات کی رات جاگ کر کاٹتی تھی۔ ابھی بھیا کی ضرورت ان کے بچوں کو تھی جو ابھی درس و تدریس کی منزلوں پر تھے اور کمسن تھے۔ ابھی آپ کی ضرورت سیکڑوں، ہزاروں آنے والے ان شاگردوں کو تھی، جو پیراہنِ علم سے آراستہ ہو کر یونیورسٹی سے نکلتے اور ملک و قوم اور اردو زبان کی خدمت کرتے۔ ان کے شاگرد آپ کو دیکھ کر بالغ ہوتے اور وقت سے پہلے کوئی عزیز ترین شاگرد اپنے دکھ کو ان الفاظ میں لکھتا۔

"میں کن الفاظ میں اپنے دکھ کا اظہار کروں اور کس طرح آپ کا دکھ درد بٹاؤں۔ میرے لیے احتشام صاحب کی شخصیت ایک مشفق استاد، ایک مربی اور محسن کی شخصیت رہی ہے۔ انھوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ ان کی وجہ سے میری تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کی محبت اور شفقت نے قدم قدم پر میری رہبری کی۔ اس دکھ میں میں آپ کے ساتھ شریک ہوں۔ میرے لیے ان کی وفات ایک مشفق باپ کا سایہ اٹھ جانے کے برابر ہے۔ آج ایک بڑا آدمی ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔"

ایک عالم اور ادیب ہی نہیں تھا بلکہ ایک ایسا انسان تھا جس کی شرافت کی قسم انسانیت کھاتی آئی ہے"
دہلی میں سیکڑوں سوگوار یکم دسمبر ہی سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ چند سوگواروں کے جملے یہ تھے:۔
"فرشتہ نہیں تھے۔ کسی ایک انسان کو ہزاروں آدمی فرشتہ خصلت کہیں تو غالباً ان میں سے ایک ضرور کہے گا کہ اگر مرحوم میں یہ خوبی رہی ہوتی تو فرشتہ تھے۔ مگر احتشام صاحب کی ایک ایسی ذات تھی کہ ہزار میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو اس محسن اعظم کو ایک زبان ہو کر "پیکر انسانیت" اور شرافت کا مجسمہ نہ کہے۔"

علاوہ علی اوسط صاحب کے جو پاکستان میں ہیں۔ محمود الحسن۔ انتظار حسین۔ جعفر مہدی۔ جعفر رضا۔ خورشید حیدر جو مرحوم کے زیر سایہ رہ کر علم حاصل کر چکے تھے شروع سے آخر تک مرحوم کی ہر آخری رسومات میں شریک ہوئے۔

۲۶ فروری ۱۹۷۳ء بی بی سی آفس نئی دہلی سے دفتر میں آل بھائی کا ٹیلی فون آیا۔ آواز بھرائی بھرائی سی تھی۔ ٹیلی فون ہی پر ایک نے دوسرے کو پرسا دیا اور میں خود ان کی قیام گاہ پر چھ بجے شام کو ملا۔ مل کر ہم دونوں خوب روئے۔ آپ نے کہا "مجھے آج اس قابل کس نے کیا اسی کی جوتیوں کے تفصیل میں ہیں اس جگہ پہونچا ہوں" ۲ مارچ کو آپ الہ آباد والدہ و بھابی کے پاس گئے اور پھر بھائی کی قبر پر جا کر اپنے آنسوؤں سے گلاب پاشی کی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا ہے "ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس دوسری دیوان غالب۔ بے شک غالب نے ادب کو مالا مال کیا اور ہمارے لیے دیوان غالب وہ تحفہ چھوڑا جس سے ہماری زبان کو پاک مقام مل گیا۔ اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ احتشام حسین کی تنقید نے صرف موجودہ نسل ہی کو نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ در بے بہا چھوڑا ہے جو پاک سے زیادہ پاکیزہ تر ہیں۔
تحقیق و تنقید کا طالب علم جب آپ کی تنقیدی اور لسانی کتابوں کی گہرائیوں کا جائزہ لے گا تو اسے کہنا پڑے گا کہ ہندوستان میں الہامی کتابیں تین ہیں ایک وید مقدس، دوسری دیوان غالب، تیسری احتشام حسین کی تنقیدات۔
اے چمن اردو تو فخر سے اپنا سر اونچا کر "روح احتشام" قیامت تک تجھے معطر رکھے گی۔

روح احتشام اہل الہ آباد کو پیغام

جب طالب علم کی حیثیت سے آیا تو اپنے نام کا پرچم تمہاری یونیورسٹی میں لہرا دیا۔
جب معلم بن کر آیا تو شاگردوں کے سروں پر علم کا تاج رکھ دیا۔
جب خود یتیم ہو کر آیا تھا، اب اپنے بچوں کو یتیم چھوڑ کر جا رہا ہوں۔
جب ابدی نیند آگئی، تو تمہارے شہر کی کربلا کو ابدی خواب گاہ بنا لیا

ر یونس خالدی

آہ احتشام حسین

۱۹۳۹ء کی بات محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کل پرسوں کی بات ہے کہ جب آل انڈیا ریڈیو نے "ہندستانی کیا ہے؟" کے موضوع پر چھ تقریروں کا انتظام کیا تھا۔ تقریر کرنے والے ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر مولوی عبدالحق (بابائے اردو) بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور آصف علی بیرسٹر تھے۔ یہ سب کے سب ان لوگوں میں تھے جو ان سوالوں کا نہایت اطمینان اور آسانی کے ساتھ جواب دے سکتے تھے۔ یہ تقریریں بے انتہا دلچسپی کے ساتھ سنی گئیں، جگہ جگہ اس موضوع پر باتیں ہونے لگیں، اور اس لسانی جھگڑے کو مٹانے کے لیے زبان سے محبت رکھنے والوں نے سوچنا شروع کر دیا، کسی نے ڈاکٹر تاراچند کے وچاروں کی تائید کی، کوئی دتاتریہ کیفی کے تاثرات سے متاثر ہوا، کسی کی زبان نے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی صاف گوئی کی داد دی، اور کوئی بابو راجندر پرشاد کے خیالوں کا پرچارک بن گیا — اس بحث میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے اپنی بات ایک ایسے ڈھنگ سے شروع کی تھی کہ اس پر سب کی زبان سے واہ واہ نکل گیا، اور سب نے اس کو اپنے حوصلوں کا آئینہ دار قرار دیا، آخری تقریر آصف علی بیرسٹر کی تھی، جو اس پوری بحث کا نچوڑ قرار پائی۔

میرا ادب سے کوئی گہرا رابطہ نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ان مسائل سے گہری دلچسپی ایک فطری دلچسپی تھی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریات میرے سامنے تھے وہ ان تمام باتوں کو کاغذی اسکیم کہا کرتے تھے، یہ زمانہ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے عروج کا ابتدائی زمانہ تھا، اور لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کا تقرر اردو کے استاد کی حیثیت سے ہو چکا تھا، وہ بے انتہا ذہین اور لائق استاد شمار کیے جاتے تھے، ایک دن میرے بچپن کے رفیق ڈاکٹر عبادت یار خاں بریلوی نے یہ خبر سنائی کہ آج احتشام صاحب تشریف لا رہے ہیں — کون احتشام صاحب؟ انھوں نے تعارف کرایا تو مجھے بھی ان کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا، ان کی تشریف آوری سے قبل یونیورسٹی کے طلبا کا ایک اچھا خاصہ مجمع نظر آنے لگا، وقت مقررہ پر احتشام صاحب تشریف لائے، لیکن وہ مجھے بالکل نہیں جچے، میرے تصور نے احتشام صاحب کی جو تصویر بنائی تھی وہ بے انتہا وجیہہ اور حسین انسان کی تصویر تھی۔ گر یہاں استاد اور شاگردوں میں عمر کا کوئی خاص تفاوت نظر نہ آیا۔ پھر بھی احتشام صاحب، احتشام صاحب تھے، دیکھتے دیکھتے باتوں کا آغاز ہو گیا، ادب اور ادبیات پر گفتگو ہوتے ہوتے قدیم و جدید پر بحث شروع ہو گئی، ایک صاحب نے نہایت ادب کے ساتھ یہ سوال بھی کر لیا کہ "ہندستانی کیا ہے؟" میں اس پوری بحث کو ریڈیو کے ذریعے سن چکا تھا، احتشام صاحب نے شریلے انداز میں گر پورے اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ:

"ان مسائل پر غور کرنے کا یہ وقت نہیں، جب تک ہندستان کے بیشتر عوام لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، اس وقت تک، اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اردو کیا ہے، ہندی کسے کہتے ہیں اور ہندستانی زبان کس زبان کا نام ہے، یہ بحث دور غربت کی پیداوار ہے، اور اس کا تعلق ایک سیاسی نعرے سے ہے۔ جب تک ملک کے عوام

جاہل اور غریب رہیں گے، اور ان کا سیاسی شعور بیدار نہ ہوگا۔ اس وقت تک اس کا فیصلہ مشکل ہے
جہاں تک میرے نظریہ کا تعلق ہے تو میں اردو لٹریچر کی زبان کو چھوڑ کر جو زبان عوام شہروں اور قصباتوں
میں آپسی لین دین کے وقت بولتے ہیں، وہی زبان ہندی ہے، اردو ہے اور ہندستانی ہے، اس کے
علاوہ کسی زبان کو نہ اردو کہا جا سکتا ہے، نہ ہندی اور نہ ہندستانی ——

احتشام صاحب کی گفتگو کا یہ متوازن اور دلکش انداز، غور و فکر کی دعوت دینے والا انداز تھا اور خاص طور پر

یہ بحث دور غربت کی پیداوار ہے، اور اس کا تعلق ایک سیاسی نعرے سے ہے، جب تک ملک کے عوام جاہل
اور غریب رہیں گے، اور ان کا سیاسی شعور بیدار نہ ہوگا، اس وقت تک اس کا فیصلہ مشکل ہے۔

دل کو اپیل کرنے والے الفاظ۔ اس سے ان کے ابتدائی نظریات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور شاید یہی وہ محرکات تھے جو ان کو ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوئے اور آگے چل کر ان کا شمار اس تحریک کے بانیوں میں ہونے لگا۔

دنیا میں جتنی اہم اور ممتاز شخصیتیں گزری ہیں۔ ان کے دیکھنے اور جانچنے کے انداز جدا جدا ہیں۔ بعض شخصیتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ دور سے تو بہت اچھی لگتی ہیں، لیکن جب ان کو نزدیک سے دیکھا جاتا ہے تو عقیدت مجروح ہو جاتی ہے، اور بعض کے متعلق دور سے اندازہ لگانا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔ ان کے متعلق صحیح رائے ان سے قریب ہونے کے بعد ہی قائم کی جا سکتی ہے اور جتنا آدمی ان سے قریب ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی عقیدت اور محبت بڑھتی چلی جاتی ہے اور بعض ایسے بھی ہیں، جو دور و نزدیک دونوں سے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ میرے سامنے ان تینوں قسم کے انسانوں کی مثالیں موجود ہیں۔

میرا اس باب میں ذاتی نظریہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کو جتنا دور سے دیکھا گیا، اتنی ہی ان سے عقیدت بڑھتی چلی گئی لیکن قریب اور بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کے بعد وہ عقیدت باقی نہ رہی، جو ان سے ہونا چاہئے تھی، اور ارباب نظر کی نظروں میں جس کے وہ مستحق تھے، یہی حال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دوسروں کا بھی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف مشکل پسندی کی ایک دوسری مثال امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات گرامی تھی، ان کو دور سے دیکھنے والے ہمیشہ دھوکے کھاتے رہے، اور وہ مقام آزاد کو نہ سمجھ سکے، لیکن جن لوگوں کو نزدیک سے بلکہ بہت نزدیک سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا وہ ان کے کمالات کا صرف احاطہ ہی نہ کر سکے، بلکہ ان کو اس بات کا بھی اعتراف کرنا پڑا کہ اگر میں مولانا آزاد کو نزدیک سے نہ دیکھتا تو ان کی عظمت سے آشنا نہ ہوتا، اس کے بعد دور و نزدیک سے دیکھنے کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

تیسری قسم کی مثال میں سید احتشام حسین صاحب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ دور و نزدیک سے دیکھنے کا ایک واقعہ آپ کے سامنے آ چکا ہے لیکن مرحوم سے میری سب سے پہلی باضابطہ ملاقات ۱۹۴۳ء میں دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ میں ہوئی، بھائی نسیم احمد صاحب نے تعارف کے فرائض انجام دیے، اس پہلی ملاقات نے جو نقش چھوڑے، وہ لازوال تھے، اسی وقت میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کی دماغی قوت اور گفتگو کا متوازن انداز قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوتے چلے گئے، اور میں ان کے فضل و کمال سے استفادہ کرتا چلا گیا، علائق زندگی کی الجھنیں نہیں معلوم کہاں کہاں لیے لیے پھریں، مگر ان کی یاد برابر باقی رہی، وہ بھی ہندستان کے باہر امریکہ اور روس بھی گئے، مگر وہ اپنے مخلصوں کو نہ بھول سکے، لکھنؤ اور الہ آباد میں کوئی دوری نہ تھی، وہ جب تشریف لاتے، نسیم صاحب کے ذریعہ ان کی آمد کا علم ہو جاتا، ملاقات ہو جاتی، حالات سے متعلق جستہ جستہ گفتگو ہوتی، کبھی وہ میری مستقل علالت پر تشویش کا اظہار فرماتے، لیکن ایک دن مجھے ان کی موت کی خبر سننا پڑی، یہ خبر میرے لیے انتہائی دل شکن اور افسوسناک ثابت ہوئی، صرف اس لیے نہیں کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے، یا انھوں نے کافی

یا، موت تو ایک نہ ایک دن آنا تھی، وہ ساٹھ سال کی عمر میں نہ سہی، اسّی سال اور سَو سال کی عمر میں، نظامِ قدرت کا اٹل فیصلہ
ا ٹل نہ سکتا تھا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ اردو کے ایک ایسے ناقد، ادیب اور دانشور کا انتقال ہوگیا، جو بہتوں کا سہارا، اور اپنی خداداد صلاحیت
ی کی وجہ سے ہر دلعزیز تھا۔ جس کی انسان دوستی نے اس کو سب کا بنا دیا تھا، جو اپنی ابتدائی زندگی سے لے کر مرتے دم تک اردو زبان
کی خدمت کرتا رہا، جس کا نعم البدل ملنا مشکل ہے۔

احتشام صاحب کی شہرت کا اصل سبب ان کی ناقدانہ بصیرت تھی، پھر ان کی تنقید میں وہ شدت بھی نہیں پائی جاتی ہے جو ترقی پسند ناقدین
کا خاصہ ہے، وہ مفاہمت کے قائل تھے، اسی جذبہ مفاہمت نے ان کو قدیم و جدید کا سنگم بنا دیا تھا، اور اس میں ان کا کوئی شریک
نہیں آتا، مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب نے ان کی بصیرت نظری اور تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے، اپنے تعزیتی خطبہ صدارت
میں صحیح کہا ہے کہ:۔

"تنقید، تحقیق فنی کے دورِ احتشامی سے قبل اردو میں کہاں آئی تھی، اور تنقید کی اصولی تخشیں مغرب
سے لا کر مشرق کے مدرسوں میں کس نے پھیلائیں، یہ نئے نئے رنگ اور وضع کے گل بوٹے بستانِ مشرق
میں کس نے کھلائے، یہ نت نئے سبق اپنے ہم وطنوں کو کس نے پڑھائے؟"

کے یہ معنی نہیں کہ دورِ احتشامی سے قبل کا جو تنقیدی سرمایہ ہماری نظروں کے سامنے ہے، اس کا بحیثیت فن کے کوئی درجہ نہیں، بلکہ مقصود
ہے کہ اس تنقیدی سرمایہ میں تنقید برائے زندگی کو جانے دیجئے، تنقید برائے تنقید کے اصول کو بھی مدنظر رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی
ہے، اور نہ مغربی تنقید کے جامع اصولوں سے کوئی مدد لی گئی ہے، بلکہ قدیم تنقیدی سرمایہ میں تنقید کی حیثیت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔

اردو تنقید کی تاریخ میں پہلا تنقید نگار مولانا حالی کو قرار دیا جاتا ہے، اور ان کا "مقدمہ شعر و شاعری" تنقید کی پہلی کتاب۔ لیکن جب ہم
"شعر و شاعری" پر حالی کے دیوان کو نظر انداز کر کے ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو مختلف نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں، پروفیسر
صفدر حسین یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ

"تنقید میں وہ ترقی یافتہ نقاد ہیں"،

کلیم الدین کی نظر میں حالی کی تنقید کی کوئی اہمیت نہیں، پروفیسر آل احمد صاحب سرور کا نظریہ یہ ہے کہ:۔

"انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ سے اردو میں تنقید کی بنیاد ڈالی، شعر و شاعری کے متعلق ایک مکمل
اور حیات آفریں نظریہ مرتب کیا، پھر اس نظریہ کی روشنی میں اردو شاعری پر تبصرہ کیا، غزل، قصیدہ، مرثیہ
مثنوی پر علیحدہ علیحدہ ناقدانہ نظر ڈالی، ہماری تنقید کے جو سانچے ہیں وہ حالی کے بنائے ہوئے ہیں، ہم جن
چیزوں پر آج زور دیتے ہیں ان کی طرف سب سے پہلے حالی نے اپنے مقدمہ میں توجہ دلائی تھی۔[۱]"

ڈاکٹر عبادت بریلوی تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اردو تنقید کی روایت میں حالی کی شخصیت اتنی نمایاں ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ہی ناممکن ہے، حالی

---

[۱] فروغ اردو لکھنؤ کا حالی نمبر (۶) صفحہ ۳ ۴

کے ساتھ اردو تنقید کا اور اردو تنقید کے ساتھ حالیؔ کا خیال ضرور آتا ہے، بات یہ ہے کہ حالیؔ نے تنقید کی دنیا میں کچھ ایسے کارہائے نمایاں کیے ہیں، اور ان کی ذات سے اس میں کچھ ایسا اضافہ ہوا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ ان کا رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ یہی سبب ہے کہ حالیؔ کے بغیر اردو تنقید کی اور اردو تنقید کے بغیر حالیؔ کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔[1]

پھر ان کی بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ سلسلۂ کلام کو طول دیتے ہوئے آگے لکھتے ہیں، کہ

"حالی بنیادی طور پر ایک نقاد ہیں انھوں نے تنقید میں بہت بڑا اضافہ کیا ہے، اس موضوع پر ان کی مستقل تصانیف بھی موجود ہیں، اور دوسری تصانیف میں جو بنیادی طور پر تنقید نہیں ہیں، ان میں بھی تنقید کا پہلو خاصا نمایاں ہوتا ہے۔ "مقدمہ شعر و شاعری" اور یادگار غالب" ان کی مستقل تنقیدی تصانیف ہیں۔"[2]

وہ اس کا خاتمہ عبادت صاحب اس طرح کرتے ہیں کہ:۔

"حالیؔ نے تنقید کی طرف توجہ کر کے اردو ادب میں تنقیدی شعور کی ایک شمع روشن کی ــــ اس شمع کو ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھا ہے، اس کی روشنی میں ترقی کی ان گنت منزلیں طے کیں۔ حالیؔ کی تنقید اگر نہ ہوتی تو اردو ادب کا ان منزلوں سے ہم کنار ہونا تو در کنار، ان کا تصور بھی ناممکن تھا"[3] ۔

مولانا حالیؔ کے متعلق یہ نظریات بے انتہا واضح نظریات ہیں، اور اس میں شک کی مطلق گنجائش نظر نہیں آتی، لیکن جب احتشام صاحب "مقدمہ شعر و شاعری" پر مقدمہ دیوان کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں، تو بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ اور نقد و نظر کی کسوٹی پر کسنے کے بعد ان کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ:

"شعر و شاعری پر خواجہ الطاف حسین حالیؔ کا مقدمہ ان کے دیوان کے ساتھ پہلی دفعہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا، اس کے بعد کسی طرح اسے ایک آزاد اور خود مکتفی تصنیف کی حیثیت حاصل ہو گئی، اور وہ برابر دیوان سے الگ شائع ہوتا رہا، پڑھنے والوں نے بھی ہمیشہ دیوان سے الگ ہی کر کے پڑھا، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کے لیے وہ دیوان کا مقدمہ نہیں ایک باقاعدہ تنقید کی کتاب ہے، جس کی بنیاد پر حالیؔ کو اردو کا پہلا باقاعدہ نقاد تسلیم کیا جاتا ہے ـــــ اسے اس کے اصل مقصد یعنی مقدمہ دیوان کی حیثیت سے دیکھا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ناقدانہ پہلو ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے، اصلاً مقدمہ محض دیوان کا مقدمہ ہے، اور اس کا مطالعہ اسی روشنی میں کرنا چاہیے۔"[4]

پھر وہ اسی روشنی میں اس پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں، اور ناقدانہ نظر کی ابتدا میں یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ:۔

"اس طرح اگر مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ مقدمہ دیوان کی حیثیت سے کیا جائے تو اس کو اس اعتراض سے بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں باقاعدہ اصول شاعری اور نقد شعر سے بحث کر کے تنقیدی اصول اخذ نہیں کیے گئے ہیں، حالیؔ کا اصل مقصد تنقید کی کتاب لکھنا تھا ہی نہیں، وہ تو اپنی شاعری کے سمجھنے اور

---

۵ فروغ اردو لکھنؤ کا حالی نمبر (۱) صفحہ ۳۱۳ — ۵۲ فروغ اردو لکھنؤ کا حالی نمبر (۱) صفحہ ۳۱۴

۵ فروغ اردو لکھنؤ کا حالی نمبر (۱) صفحہ ۳۲۰ — ۵۴ فروغ اردو لکھنؤ کا حالی نمبر (۱) صفحہ ۲۵۴

اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے کچھ ضروری اشارے کردیے تھے، مقدمہ شعر و شاعری کی حیثیت بھی غور و فکر کی مستحق ہے۔[1]

احتشام صاحب صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ غور و فکر کی دعوت کے ساتھ ساتھ خود بھی اس مقدمہ کا اسی نقطہ نظر سے مطالعہ کرتے ، اور مطالعہ کے تمام نتائج قلمبند کرڈالتے ہیں، اس سے ان کا مقصد ان نظریات کی تردید نہیں کہ مقدمہ شعر و شاعری تنقید کی پہلی کتاب ہے آی اردو کے پہلے ناقد ہیں بلکہ مقصود اصلی اس بات کا اظہار ہے، کہ جو چیز جس مقصد کے تحت لکھی جائے، اس کا مطالعہ اسی روشنی میں کرنا ، ناقد کا اولین فریضہ ہے، اس کے بغیر اس کے ساتھ انصاف ناممکن ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج ہمارا تنقیدی شعور مقدمہ شعر و شاعری سے بہت آگے بڑھ چکا ہے، اس کی روشنی میں بھی اس مقدمہ کو صرف بد کی کتاب نہیں کہا جاسکتا، اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے، احتشام صاحب کو نتیجہ کے طور پر لکھنا پڑتا ہے کہ

"ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ رائے قائم کرنا غلط نہ ہوگا کہ مقدمہ کی اولین حیثیت مقدمہ دیوان کی ہے اس کی ساری بحثیں سب سے پہلے خود حالی کی شاعری کا جواز پیش کرنے کے لیے علمی انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ تنقید کی ایک اصولی تصنیف کی حیثیت سے بھی اس کی اہمیت ہے۔ لیکن یہ حیثیت ثانوی ہے۔"[2]

ہے ان کی ناقدانہ بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ "تنقید بحیثیت فن کے" احتشام صاحب سے قبل کہاں؟ وہ ایک ایسے تنقید نگار تھے جس میں کوئی ان کا شریک نہیں ——

---

۱ فروغ اردو لکھنؤ کا حالی نمبر (۲) صفحہ ۲۵۴

۲ فروغ اردو لکھنؤ کا حالی نمبر (۲) صفحہ ۲۶۰، ۲۶۸

ادب لطیف کے مدیر کے سوالات

اور

احتشام حسین کے جوابات

سوال:۔ تنقید نگاری سے آپ کا مقصد ادب کی تاریخ مرتب کرنا ہے یا ہمعصر ادب پر اثر انداز ہوتا ہے؟

جواب:۔ تنقید نگاری سے میرا مقصد ادب کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا، شاعر اور ادیب کو اس کی تخلیقی کاوش پر نقاد کے اس کے صحیح شعور اور ادراک پر داد دینا اور ادب کو زندگی کے تہذیبی رشتہ میں دیکھنا ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ ادب کے بعض پہلو بھی واضح ہو جاتے ہیں اور ہم عصر ادب کے بارے میں بعض خیالات کا اظہار بھی اس طرح ہو جاتا ہے کہ سنجیدہ مطالعہ کرنے والے ان سے متاثر بھی ہو سکیں۔ میری یہ خواہش ضرور ہے کہ اگر میرے تنقیدی خیالات مدلل اور مفید معلوم ہوں تو میرے عہد کے ادیب ان پر نگاہ رکھیں۔ میں اپنے خیالات کو صحیح سمجھتا ہوں اسی لیے پیش کرتا ہوں لیکن میرا یہ اصرار نہیں کہ آپ بھی اس طرح انھیں صحیح مان لیں جیسے میں مانتا ہوں۔

سوال:۔ کیا آپ کی دانست میں آپ کی تنقید سے ہم عصر ادب کو کوئی فائدہ پہونچا ہے اور کیا ہم عصر لکھنے والوں نے کسی طور پر آپ کی تنقیدی فکر سے اثر قبول کیا ہے؟

جواب:۔ یہ سوال کہ میری تنقید نگاری سے ہم عصر ادب کو کوئی فائدہ پہونچا ہے یا نہیں یا کسی ادیب نے میرا اثر قبول کیا ہے یا نہیں، مجھ سے پوچھنے کا نہیں ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایسا اثر کبھی بہت واضح نہیں ہوتا —— ہمارے ادیب اتنے فراخ دل بھی نہیں ہیں کہ وہ اس کا اعتراف کریں۔ میں اپنی باتیں اسی امید پر کہتا رہا ہوں کہ کچھ لوگوں کو اس سے ادب کے مسائل کو سمجھنے اور اچھے برے ادب کے پرکھنے میں مدد ملے گی۔ میں لوگوں کی کمزوریوں، حماقتوں یا تعصبات سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا بلکہ ان کے ذہن اور علم کو کریدتا ہوں۔

محمد اسلام

پروفیسر سیّد احتشام حسین مرحوم

موت سے تو کسی کو بھی رستگاری نہیں لیکن بعض موتیں دل پر اتنا گہرا اثر چھوڑتی ہیں کہ ان کو بھلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ احتشام صاحب کا رتحال اسی طرح کا ہے ان کا جو نقش دل پر مرتسم ہے وہ انمٹ ہے وہ ایک شفیق و ہمدرد استاد، مخلص و نیک صفت انسان، اردو کے م صف اول کے نقاد تحقیقی کام کی نگرانی کرنے والے، ماہر لسانیات اور شاعر و مجلس خواں تھے۔

دبی حلقہ ان کا نام بڑی عزت و احترام سے لیتا ہے۔ ان میں کچھ خصوصیات ہی ایسی تھیں جو ان کی عزت کرنے پر مجبور کرتی تھیں۔

۲ دسمبر ۷۲ء کو اخبار "جنگ" کے ذریعہ یہ خبر ملی کہ معظم و محترم پروفیسر سید احتشام حسین صاحب حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے یکم دسمبر ۷۲ء کو انتقال فرما گئے۔ مجھے مرحوم سے تقریباً دس سال تک شاگردی کا شرف حاصل رہا اس لیے بحیثیت شاگرد میں اپنا فرض ل کہ ان کی چند اعلیٰ انسانی صفات قلم بند کر کے ان کو خراج عقیدت پیش کروں۔

احتشام صاحب ایک شفیق و ہمدرد استاد تھے اپنے شاگردوں کا ان کو بے حد خیال رہتا تھا خواہ وہ کسی جگہ اور کسی بھی پیشہ میں ہوں ادبی لنے والے طالب علموں کو وہ اپنے سے بہت قریب کر لیتے اور ایسی ترغیب و تربیت کرتے کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا ذوق نکھر کر سامنے ، احتشام صاحب اس کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی فرماتے اور کبھی مایوس نہیں ہونے دیتے تھے۔

جو طالب علم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر چلے جاتے ان سے تعلق بھی وہ ان کے دوست طالب علموں سے دریافت کرتے رہتے کہ ان صاحب "کیا کر رہے" اگر کسی کو ملازمت مل جاتی تو بہت خوش ہوتے۔ بیروزگار طالب علموں سے ہمدردی کرتے اور اگر کہیں ان کی سفارش مت ملنے کی امید ہوتی تو اس کی سفارش کرتے، غریب طالب علموں کی فیس کی معافی کے لیے کوشش کرتے اگر ان کو ضرورت ہوتی تو کلاس میں دے کر ان کو اپنے گھر پر بلا معاوضہ کورس کی تمام چیزیں پڑھاتے یہ ایسا ایثار تھا جسے شاگرد بھلا نہیں سکتے تھے۔ اگر کوئی شاگرد ان کی مدد روبار شروع کرنا چاہتا تو وہ اس کے لیے بھی تیار رہتے۔

ایک دفعہ سہیل صاحب مدیر ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ نے نیا نیا رسالہ نکالا تو نہ صرف اس کے لیے مضامین لکھے بلکہ اپنی ایک کتاب بھی ان کو ی کرنے کے لیے دی تاکہ ان کا ادارہ ادبی حلقے سے متعارف ہو جائے معاوضہ کے لیے فرمانے لگے کہ "بھئی سہیل میرے شاگرد ہیں ان سے ں کوئی پبلشر ہوتا تو بات دوسری تھی یہ تو بالکل نیا کام شروع کر رہے ہیں"۔ کتاب شائع کرنے کی درخواست سہیل صاحب نے میرے کی تھی بعد میں انھوں نے احتشام صاحب کو کچھ روپیہ بطور اجر بڑے اصرار سے دیے اس کتاب سے رسالہ "کتاب" اور ادارہ ادبی حلقہ میں ت ہوا اور جب ۱۹۶۸ء میں میں پاکستان آیا تھا اس وقت وہ کتابیں شائع کر چکے تھے اور رسالہ بھی جاری تھا۔

احتشام صاحب کے شاگرد روس، جرمنی اور انگلینڈ وغیرہ تک میں تھے جو احتشام صاحب سے اپنی ضرورت و معلومات کے لیے برابر رابطہ

قائم رکھتے اور احتشام صاحب بھی لکھنؤ اور الہ آباد ہی سے بیٹھے بیٹھے سب کے خطوط کا جواب دیتے ان کو جدید ادبی معلومات فراہم کرتے اور اگر کسی طرح کے مواد کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی بھیجنے میں دریغ نہ کرتے۔

یہی نہیں کہ وہ صرف اپنے شاگردوں ہی کا خیال رکھتے تھے بلکہ کوئی بھی شخص جو اردو ادب سے دلچسپی رکھتا ہو اور کوئی کام کرنا چاہتا ہو تو اس کی بھی وہ اسی طرح مدد کرتے تھے جیسے ایک اردو دوست اور اردو کے پرستار کو کرنا چاہئیے یہی وجہ ہے کہ ان کی نگرانی اور رہنمائی میں بے شمار اسکالر ہوئے جنہوں نے پی ایچ ڈی لٹ تک کیا۔ ایک مرتبہ نجم الدین نقوی (لکچرر اردو گورنمنٹ کالج رامپور) نے "دانش محل" (امین الدولہ پارک لکھنؤ) میں کئی حضرات کے سامنے کسی کے تحقیقی کام کے صلے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دلانے پر اعتراض کیا کہ یہ تو تدوینی کام ہے اس کی بھی کیا اتنی اہمیت ہے کہ اس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی جائے تو احتشام صاحب نے کسی شاعر کا نام لے کر کہا کہ آپ ان کا دیوان مرتب کر دیجئے آپ کو بھی پی ایچ ڈی کی ڈگری دلوا دوں گا۔ اسی طرح وہ اردو کو عام کرنے کے خیال سے بعض ملازم پیشہ یا کاروبار کرنے والے ایم اے کے طالب علموں کو کلاس کی حاضری دے کر ان کو اپنے گھر پر شام میں ان کے فرصت کے وقت میں انھیں پڑھا دیا کرتے تھے یہ بڑا ایثار تھا۔

اسی طرح کوئی بھی شخص خواہ وہ کسی اعلیٰ درجے کے رسالے یا ادنیٰ درجے کے رسالے کا مدیر ہو۔ اگر کسی مضمون کی فرمائش کرتا تو وہ خلافِ عادت مروتاً انکار نہ کر پاتے اور کچھ نہ کچھ اس کے لیے لکھ ضرور دیتے۔ ہر نیا لکھنے والا کوشش کرتا کہ اس کی کتاب پر خواہ وہ شعری مجموعہ ہو یا ادبی و تنقیدی یا تحقیقی کتاب، کوشش کرتا کہ احتشام صاحب اس کی کتاب پر مقدمہ یا تعارف ضرور لکھ دیں تا کہ اس کی تصنیف کی اہمیت بڑھ جائے۔ تحقیقی معلومات ان کی اتنی تھیں کہ وہ کسی بھی عنوان پر تحقیقی مقالہ کا خاکہ فوراً دس پندرہ منٹ میں بنا دیتے اور یہ کہ ان کتابوں میں ورسالے حوالے کے لیے بتا دیتے کہ ان میں تحقیقی کام کرنے والے کا حوصلہ بڑھ جاتا وہ نہ صرف یہ کہ اتنا ہی کام کر کے فارغ ہو جاتے بلکہ جب ان کو معلوم ہوتا کہ اسکالر نے کام شروع کر دیا ہے تو اس کے لیے وہ خود اپنے ذاتی کتب خانے کی کتابیں و رسالے وغیرہ اس کے حوالے کر دیتے بعض اوقات دور دراز کے لوگ بذریعہ ڈاک ان سے یہ کام لیتے اور وہ اپنے حسن اخلاق اور مروت کی وجہ سے کبھی کسی سے انکار نہ کرتے

میں خود اپنا ایک ذاتی تجربہ لکھتا ہوں۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں جگر مرادآبادی کی حیات اور شاعری پر تحقیقی کام کرنا چاہا تو پہلے تو انہوں نے کہا کہ جگر صاحب کا انتقال ابھی حال میں ہوا ہے سارا مواد سامنے نہیں ہے پھر وہ مختلف مقامات پر رہے ہیں۔ ان مقامات تک پہونچنا آپ کے لیے مشکل ہے اس لیے یہ کام نہ کیجیے لیکن جب میں نے اصرار کیا اور کہا کہ میں تو اب یہی کام کروں گا تو انھوں نے مقالہ کا خاکہ تیار کرا دیا اسی عرصہ میں وہ الہ آباد یونیورسٹی چلے گئے میرے نگراں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب تھے لیکن صحت کی خرابی کی بنا پر میرا کام دیکھنے میں ان سے تاخیر ہو جاتی اور میں عجلت پسند واقع ہوا ہوں اس لیے میں نے احتیاطاً ہاشمی صاحب سے اجازت لیکر ابواب احتشام صاحب کو دکھانا شروع کیے۔ جب وہ الہ آباد سے چھٹیوں میں لکھنؤ آتے تو میں ان سے عرض مدعا کرتا وہ کہتے علی الصبح آجاؤ۔ چائے پینے کے دوران تمہارا کام کر دوں گا۔ میں اسی وقت حاضر ہو جاتا ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ابواب دیکھتے وقت مجھ سے فرماتے کہ بھئی اجازت ہے میں اس میں کچھ لکھ بھی سکتا ہوں میں نے عرض کیا آپ کو بھی پوچھنے کی ضرورت ہے ترمیم و اصلاح کے لیے تو میں دکھا ہی رہا ہوں وہ اسی وقت دو تین گھنٹے میں پورا باب پڑھ کر ضروری ترمیم و اضافہ کر تے وہ مجھے ہدایات دیتے کہ اس میں کیا کچھ چیزیں بڑھا دیجیے یا گھٹا دیجئے اس کے لیے وہ کتاب بھی دے دیتے کہ اس کو پڑھ لیجئے پھر لکھئے۔

یہ سب کام انھوں نے جگر صاحب سے اختلاف کے باوجود کیا جو ان کی اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔ ان کو علم سے اس قدر شغف تھا کہ خواہ کتنی ہی مصروفیت کیوں نہ ہو دو تین گھنٹہ ضرور مطالعہ کرتے اور اگر کسی دن نہ پڑھ پاتے تو کہتے کہ آج کا سارا دن برباد گیا ایک گھنٹہ بھی نہیں پڑھ سکا۔

جب وہ "دانش محل" آتے تو ساری نئی کتابوں کا جائزہ لیتے بعض کتابیں وہیں بیٹھ کر پڑھ لیتے اور کبھی کبھی احباب سے باتیں کرتے جاتے اور ریڈیو کے لیے کوئی مضمون بھی لکھتے جاتے۔

ہ ادب کا رعب طلبا پر اتنا رہتا کہ وہ ان کے سامنے سے نکلتے ہوئے کتراتے اور اگر کبھی کوئی طالب علم سگریٹ پی رہا ہوتا تو وہ خود
شش کرتے۔ اس دوران اگر طالب علم ان کو دیکھتا تو خود شرم سے پانی پانی ہو جاتا کہ احتشام صاحب کی شرافت دیکھیے کہ وہ
ہے ہیں تاکہ شاگرد کو خفت نہ ہو۔

ء یا ۱۹۵۱ء میں بی اے فائنل کے طلبا نے ان کو ان کی علمی صلاحیتوں کی بنا پر "ادبی ستون" کا خطاب دیا تھا اور واقعی
ابت ہوئے آج معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ستون گر گیا۔

اتھیوں کا بھی وہ بڑا خیال رکھتے تھے ایک دفعہ شعبۂ اردو میں غالباً پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی شعبہ کے ایک صاحب اور بھی اس
ار تھے جب احتشام صاحب سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا آپ بھی اس جگہ کے لیے درخواست دیں گے تو احتشام صاحب نے فرمایا
تھی ہیں میں مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔"

لمی و ادبی صلاحیتوں کے نہ صرف طلبا معترف تھے بلکہ اساتذہ بھی کہتے تھے کہ "بھائی لسانیات کے معاملہ میں ہماری کی بات تو یہ ہے
صاحب ہی پڑھا سکتے ہیں" یہ بات ایک استاد نے اس وقت کہی جب میں نے لسانیات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔
لکھنے پڑھنے کا ذوق انھیں کو دیکھ کر ہوا، ہوا یوں یہ کہ ایم اے میں ایک پرچہ لسانیات کا تھا مجھے اس سے خصوصی دلچسپی تھی اس لیے میں نے
ن کا ارتقا" پر ایک مضمون لکھا اب اس کے چھپوانے کی فکر ہوئی اور اسے سجھاتا کون؟ میں نے احتشام صاحب سے کہا اور انھوں نے
یورسٹی میگزین میں شائع کرا دیا۔ اب رفتہ رفتہ مجھے لکھنے سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ جو اب تک برقرار ہے۔

ے اچھے استاد تھے اشعار کی تشریح ایسی کرتے کہ وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی اردو ادب کی تاریخ میں ہندوستان کا خاکہ بنا کر سارے
ل اور اردو زبان کے ارتقا پر ایسا لکچر دیتے کہ پھر اس کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔

ے اچھے مصنف بھی تھے ادب اور سماج، تنقیدی جائزے، روایت و بغاوت، تنقید جائزے، روایت و بغاوت، تنقید و عملی تنقید
ن کی بہترین تصانیف ہیں۔ "اردو لسانیات کا خاکہ" ڈاکٹر گراہیم بیلی کی کتاب کا سلیس اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے ان کا ایک افسانوی
، وہ بھی شائع ہوا ہے۔

، بیشمار کتابوں پر مقدمے و تعارف وغیرہ ہیں جو بذات خود تصنیف سے کم درجہ نہیں رکھتے مثلاً مراثیِ انیس کا مقدمہ وغیرہ۔
ر کے انتخاب میں بھی وہ اعلیٰ مذاق رکھتے تھے اسی لیے اختر لکھنوی جیسے شاعر و نقاد نے اپنے شعری مجموعہ "نو بہاراں" کا انتخاب
ہی سے کرایا تھا کیونکہ احتشام صاحب خود بھی شاعر تھے احتشام ماہلی تخلص کرتے تھے۔ اسی سال کسی مہینے میں آل انڈیا ریڈیو سے
رت ایک مشاعرہ نشر کیا گیا تھا جس میں انھوں نے بھی اپنے اشعار سنائے تھے کسے خیال تھا کہ احتشام صاحب اتنی جلدی انتقال
ورنہ ان کے چند اشعار ہی محفوظ کر لیتا۔

ن اوقات ذاکری بھی کرتے تھے اس سلسلے کا ایک واقعہ انھوں نے اپنے گھر پر ایک نشست میں بتایا تھا کہ فیض آباد میں کسی صاحب نے
ں میں احتشام صاحب کا نام بھی فہرست میں شائع کرا دیا اور ان کو مجبور کر کے لے گئے احتشام صاحب نے مجلس پڑھی جس سے سب متاثر ہوئے
وش خلق ایسے تھے کہ شاید ہی کبھی انھوں نے کسی کی دل شکنی کی ہو بلکہ ہر وقت ہر شخص کی مدد کرنے کو تیار رہتے اور خوش مزاجی کا
ان پر کیسا بھی عالم گزرے کبھی کسی سے ناراض نہ ہوتے بلکہ دوسروں کی خوشی و خوشنودی کا ہمیشہ خیال رکھتے۔

ادب لطیف کے مدیر کے سوالات

اور

احتشام حسین کے جوابات

سوال: آپ گذشتہ ادب کے بارے میں کیوں لکھتے ہیں؟

جواب: میں گذشتہ ادب کے بارے میں اس لیے لکھتا ہوں کہ حال کے ادب کی طرح وہ بھی ادب ہے، وہ بھی پڑھا جاتا ہے اسے بھی پڑھا جانا چاہیئے، میں بھی اسے پڑھتا ہوں، اس کو سمجھنا اور اس سے لطف لینا چاہتا ہوں۔ میں ہر اچھے ادب کی طرح اُسے بھی زندگی کی دستاویز سمجھ کر پڑھتا ہوں، جس کی مدد سے اس عہد کے مزاج، ذہن، کردار، عقائد، خیالات کی کشمکش اور زندگی سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کبھی جذباتی یا جمالیاتی حظ نہیں حاصل ہوتا تو ذہنی حظ حاصل ہو جاتا ہے۔ ماضی کے اچھے ادب نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا ہے، جب اس کی دنیا سے لوٹا ہوں دامن بھرا ہوا تھا۔ اس کے متعلق اظہار خیال کیوں نہ کروں؟ میرا یہ بھی خیال ہے کہ گذشتہ ادب کے مطالعہ کے بغیر جدید ادب کو سمجھنا بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ ادب تہذیب کی طرح ایک ناقابل شکست تسلسل ہے۔

سوال: ہم عصروں پر لکھنے میں کبھی جھجک محسوس ہوئی ہے؟ ہوتی ہے تو کیوں؟

جواب: جی ہاں ہم عصروں پر لکھنے میں اکثر جھجک محسوس ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ میری سطری کمزوری ہو۔ نخھے آبگینوں کو ٹھیس لگانے میں لطف نہیں آتا۔ جہاں تک ہو سکتا ہے اس سے بچتا ہوں، نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا دل دکھے۔ کوشش کرتا ہوں کہ ہم عصروں کی تخلیقات کے زیادہ سے زیادہ اچھے پہلوؤں کا ذکر کروں، انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہوں اور کمزوریوں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالتا ہوں۔ اگر مجبوراً ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے جو مجھے درست نہیں معلوم ہوتیں تو ان کا اظہار بھی دلآزاری کے انداز میں نہیں کرتا ہوں۔ اب اسے کیا کروں کہ ایک کی تعریف دوسرے کو ناگوار ہوتی ہے۔ ویسے انسان ہی ہوں ممکن ہے کبھی کبھی طنز کے پیرایہ میں کوئی سخت بات قلم سے نکل گئی ہو، احتیاط ضرور کرتا ہوں۔ ہم عصروں میں کچھ ایسے ہیں جن کی "آزردگیٔ بے سبب" کا علاج میرے پاس نہیں ورنہ غالباً کوئی شخص مجھ سے اس بات پر ناخوش نہیں ہوگا کہ میں نے اس کے متعلق لکھتے ہوئے کینہ جوئی یا حسد پروری سے کام لیا ہے۔ میری تحریروں کی ناہمواری، خیالوں کی نارسائی یا ناپسندیدہ استدلالی روش سے کچھ لوگ ناآسودہ ہوں تو یہ دوسری بات ہے۔ اب رہا یہ کہ ہم عصروں پر لکھتے ہوئے جھجک محسوس ہونا چاہیئے یا نہیں تو میرا خیال ہے کہ اگر نہ ہو تو بہت اچھا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ ہمیں ایک دوسرے کی ملامت گندگی اچھالنے یا بھٹیاریوں کی طرح کوسنے کاٹنے کا حق حاصل ہے۔ علمی حدوں کے اندر رہ کر یہ جھجک کم سے کم بھی ہو سکتی ہے لیکن چونکہ بعض دوست کسی جادو کے ذریعہ سے فوراً نیت کا پتہ بھی لگا لیتے ہیں، گروہ بندی کا مجرم ٹھہرا دیتے ہیں اس کے لیے جھجکنا پڑتا ہی ہے۔ علمی کج فہمی اور کم بینی کا الزام اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا جتنا بدنیتی یا اندھی جانبداری کا۔ اس لیے میں احتیاط کرتا ہوں۔ مجھ میں افسانہ سازی کی زبان و طاقت ہے نہ لڑنے کی۔ وہ پیمبرانہ مزاج بھی نہیں ہے کہ اپنے کو خلق خدا کی اصلاح پر مامور سمجھ کر چھیڑ چھیڑ کر سب کو راہ راست پر لانے کی فکر کرتا رہوں۔ پھر بھی غالباً میں نے ہم عصروں کے متعلق بہ دانہ بہت کچھ لکھا ہے۔

ڈاکٹر احسن از نقوی

میرے استاد ــــ احتشام صاحب

یہی موسم تھا، اور یہی مہینہ تھا، فقط چند دنوں کی بات ہے، شہر کے کسی گوشے سے اڑی کہ احتشام صاحب لاہور آئے ہیں، یہ سنا تھا کہ اُن کے ـے اور نئیل کالج کی طرف دوڑ پڑے، مگر محروم دید ہو کر اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔ اور یہی پچھلے جمعہ کی بات ہے کہ احتشام صاحب کی الہ آباد سنائی آ گئی اور نئیل کالج والے انھیں خوش آمدید تو نہ کہہ سکے مگر قسمت کا لکھا ان کا سوگ منانے کے لیے آج سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔ احتشام ـب کو رو رہے ہیں۔

احتشام صاحب کی دل نشین شخصیت مختلف رنگ اور آہنگ کا مرقع ہے۔ مگر اس کا کوئی بیان کس طرح کرے؟ بیان تو ہو ہی نہیں سکتا ـے بچپن کی بات ہے، ایک پھول تھا جس پر سبز پتیوں ہی میں سرخ پنکھڑیاں اس طرح نقش تھیں کہ جب چار سبز پتیاں آپس میں جڑ جائیں ـسا سرخ پھول اندر سے بن جاتا۔ میں حیرت سے ایک ٹک دیکھتا رہتا اور لڑکپن تو ذرا دیکھیے کہ میں چاہتا کہ یہ سرخ پھول اس طرح سے نکال ـکہ سبز پتیاں ہاتھ نہ آئیں۔ سعی پیہم کرتا آخر ش سرخ پھول ہاتھ نہ آتا۔ پھر من مار کے بیٹھ جاتا۔ بالکل اسی طرح آج جب احتشام صاحب ـصیت کے نقوش مرتب کرنا چاہتا ہوں، تو ان کی شخصیت کا ــــ سرخ پھول کسی طرح میرے ہاتھ نہیں آتا۔

بعض شخصیتیں بھی عشق پیچاں کی نازک بیل کی طرح ہوتی ہیں جس کے گھوم گھماؤ کی بھول بھلیوں میں عقل بھی گم اور گنگ ہو جاتی ہے۔ ـشام صاحب بھی اسی طرح کے ہیں۔ میرے خیال سے ان کو کاغذ پر منتقل کرنا ایک خواہش طفلانہ ہے۔ اسی طرح جیسے کوئی بالک چاند کو پڑھ کے ـ کٹورے میں پانی بھر کر چاند کو ہی اس میں اتار دے۔ بس احتشام صاحب کو میں یوں ہی آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ احتشام صاحب کی شخصیت ہمہ جہتی تھی۔ ان کی شخصیت کا کوئی اور چھور نہیں تھا۔ ان سے پہلی بار ملئے تو ان کے لہجے کی ـاس اور دھیمی گفتگو کا آتار چڑھاؤ اور ہر بات میں ایک شیریں متانت اور منطقی توازن ایسا پیدا کرتے کہ سننے والا پہلی ہی ملاقات میں ـن کا گرویدہ ہو جاتا اور جتنا دامن سے قریب ہوتا جاتا ان کے خلوص کے روپ اور رنگ بدلتے جاتے تھے اور جنہوں نے احتشام کو نہیں دیکھا ـد ایک شاعر افسانہ نگار کی حیثیت سے قطع نظر۔ ایک بلند پایہ نقاد کی شخصیت میں انھیں پہچانتا ہے۔ یہاں بھی ان کے کئی روپ ہیں یہ وہی احتشام صاحب ہیں جنھوں نے فکر و نظر کے نئے علاقوں کو تسخیر کر کے اُردو تنقید کی اقلیم میں شامل کر دیا جس نے تنقید کو تیا فوں، ذہنی اندازوں، ـحاتی اور عارضی مسرتوں سے نکال کر تاریخی شعور، مادی بصیرت اور عمرانی ادراک سے وابستہ کر دیا۔ تنقید کو بیچ بونا سکھا کر تنقید میں علمی وفاداری ـو جنم دیا۔ مارکسی نقاد ہونے کے باوجود جمالیاتی صداقتوں اور روحانی وجدان کے سرچشموں سے انکار نہیں کیا بلکہ تنقید کے عمل کو سانس لینے ـکی طرح ناگزیر بنا کر اس میں دائمی مسرتوں کے ذہنی خزانے بھر دیے۔

اس حقیقت کا اعتراف اور اقرار برصغیر پاک و ہند کے تمام نقادوں نے کسی نہ کسی انداز سے کیا ہے۔ ادب کی دنیا میں کسی مخصوص نظریے

سے وابستہ نقاد یا ادیب کا یہی حشر دیکھا کہ اپنے حلقے میں تو اس کی ادبی حیثیت مسلم سمجھی گئی لیکن مختلف العقیدہ دبستان فکر میں اسے مکمل فضیلت نہیں حاصل ہو پائی۔ مگر احتشام صاحب کی ناقدانہ بصیرت کے سامنے سب نے سر تسلیم خم کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ احتشام صاحب کے سلسلے میں لکھتے ہیں "پاک و ہند میں اگر کسی ایک نقاد کا انتخاب کیا جائے تو وہ احتشام حسین ہوں گے"[1] کسی اور کسی نقاد کے سلسلے میں قول ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہو تو پھر اس کی غیر جانبدارانہ معنویت کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

میں بات تو احتشام صاحب کی شخصیت پر کر رہا ہوں مگر دیکھئے بات نکل کر کہاں سے کہاں پہنچی۔ دراصل اُن کی تحریر اور فکر بھی انھیں کی شخصیت کا ایک پرتو ہیں۔ ہے اور یہی پرتو ہیں ان کی شخصیت کے چہرے کا نقاب ہے۔ اسی طرح کے ان گنت رنگیں نقابوں میں ان کی شخصیت ملفوف ہے یا اسی بات کو نفسیاتی منطق کے توسط سے کہنا چاہیں۔ تو پھر یوں کہیں گے کہ یہ ان کی شخصیت کا عدم وہی رخ ہے جہاں وہ اپنی فاضلانہ تخلیقی فکر کو نہایت سنجیدگی سے اور متانت کے اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب مدلل کی سنجیدہ نگاری پر کیپور نے لکھا ہے کہ ـــ تحریر میں کوئی شگفتہ اور رنگین جملہ لکھ جاتے ہیں تو نظر ثانی میں اسے کاٹ دیتے ہیں۔ ان کی تحریر کی دل نواز شگفتگی سے میرے خیال سے انحراف نہیں کیا جاسکتا مگر رنگین بیانی والی بات بالکل تو نہیں ہاں مگر کسی حد تک درست ہے۔ مگر میرے لیے یہ بڑی حیرت کی بات تھی اور اب بھی ہے۔ وہی احتشام صاحب جب اپنے ڈرائنگ روم میں اپنے طالب علموں یا ہم چشموں اور احباب کے جلو میں ہوتے ہیں تو وہ بالکل اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ یا جب یونیورسٹی میں مستغرق تدریس ہوتے یا مختلف ادبی تقریبوں میں محو کلام ہوتے تب بھی وہ ایسے نہیں ہوتے وہاں تو ان کی رنگین بیانی اور شگفتہ کلامی اپنے شباب پر ہوتی۔ کیا شیریں لب و لہجہ تھا اور اس میں الفاظ کی دروبست، سانچوں میں ڈھلے ہوئے جملوں کی ترتیب، ہمارے ذوق جمال کو حسن صد رنگ کا جلوہ دکھا کر ذوق کو آسودہ کرتا وہ اپنی ترنگ میں فکر و خیال کی انجانی شاہراہوں کی اس طور سے سیر کرائے کہ سامعین اپنے خارجی وجود سے غیر حاضر ہو کر اپنا باطنی وجدان کے رنگ کے جو انبساط محسوس کرتے اس کا تاثر نا فراموش برسوں قائم رہتا۔

ان کی آواز بڑی مترنم تھی آہستہ آہستہ بولتے اور جب کسی گمبھیر مسئلے پر اظہار خیال کرتے تو بڑی احتیاط اور توازن سے کام لیتے۔ عام تقریر میں دست و انگشت کے اشارے ان کے وسیلہ اظہار کا محبوب مشغلہ تھا۔ محویت اظہار میں اپنے دونوں ہاتھ کی انگلیوں کو آپس میں جوڑتے اور الگ کرتے اور اس عمل کے ساتھ ان کا اظہار ذہن کے افق پر فکر کی نئی نئی قوسیں بناتا اور گوشۂ ادراک میں دانش و بصیرت کے رنگین قمقموں کو اپنے مخصوص رنگوں کے ساتھ جلاتا اور بجھاتا۔ وہ کلاسوں میں پڑھاتے تو بھی یہی انداز ہوتا۔ میں جب بی۔ اے کا نیا نیا طالب علم ہوا نصاب کی تدریس کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ اقبال اور تاریخ ـــ سرور صاحب، میر، غالب اور لسانیات ـــ احتشام صاحب۔ مرثیہ ـــ یوسف حسین موسوی صاحب، قصیدہ ـــ ڈاکٹر خلیل اور جدید شاعری ـــ ڈاکٹر نورالحسن صاحب پڑھائیں گے۔ مجھے خواہ مخواہ اس ترتیب سے اختلاف تھا۔ میر و غالب سے مجھے پیار اور سرور صاحب کی علمیت کا مجھ پر بڑا رعب تھا لیے بس اتنا چاہتا تھا کہ میر، غالب سرور صاحب پڑھائیں باقی اور جو جس کا جی چاہے پڑھائے۔

پہلی پہلی احتشام صاحب میری جماعت میں بڑے اعتماد سے قدم رکھتے ہوئے آئے۔ کھڑے ہو کر اپنا تعارف کرایا میں احتشام حسین ہوں اور آپ کی طرح مجھے پڑھنے کا شوق ہے۔ پھر رجسٹر کھول کر حاضری لینا شروع کی اور التزام یہ کہ ہر نام سے پہلے مسٹر لگا کر پورا نام پکارتے۔ یہ مسٹر لگا کر حاضری لینے کی احتیاط میں نے صرف احتشام صاحب کے یہاں دیکھی۔ اس حسن سلوک کا مجھ پر

---

[1] ہمایوں خاص نمبر ۱۹۵۳ء)

گہرا اثر ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے میر پڑھانا شروع کیا۔ میر کا زندگی نامہ اور شاعری کے اساسی پہلوؤں پر ایسے دلنشیں انداز سے روشنی ڈالی کہ جو کچھ انھوں نے لکچر دیا اس کا ایک ایک لفظ آج تک اسی طرح سے حافظے میں موجود ہے۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ ایسے میں پھر میر پڑھانے کا دور شروع ہوگیا۔ تو لطف و انبساط کے چشمے پھوٹنے لگے۔ میں نے بڑے بڑے استادوں کو دیکھا ہے۔ اشعار کی تفہیم میں ہمیشہ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اشعار شناسی میں نظر و خبر کے ساتھ وجدان صادق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے ہم عصر بزرگوں میں یہ جوہر میں نے اثر لکھنوی یا اس کے بعد کسی میں دیکھا۔ تو وہ عابد علی عابد صاحب کے یہاں یا پھر احتشام صاحب کے یہاں دیکھا۔ بعض اشعار کا دو دو روز تک مطلب بتاتے اور پھر بھی کہتے شعر کا حق ادا نہ ہوسکا۔ شعر وہ بڑے پرسوز انداز میں پڑھتے تھے۔ مطالب بڑے جذباتی انداز میں بیان کرتے تھے۔ مگر فکر و فن کے انکشافات بھی وہ اس طور کرتے کہ پوری جماعت ان کے ادا انہ سحر سے مبہوت رہ جاتی۔ بعض اشعار سمجھانے کے لیے وہ مصوری کا بھی سہارا لیتے۔

کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس ہم نے دیدار کی گدائی کی!!

شعر کا مفہوم بتاتے بتاتے جیب سے چاک نکالی اور کاسۂ چشم اور دستۂ نرگس کی تصویر بورڈ پر ایسے فنکارانہ انداز میں بنائی کہ ہم سب حیران و ششدر رہ گئے۔ اسی طرح غالب کا شعر

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یا رب تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

پورے منظر کی تصویر بنا کر شعر کی معنوی گہرائیوں کو واضح کر دیا۔ اسی طرح بے شمار اشعار کے مفاہیم دم زدن میں تصویریں بنا کر سمجھا دیے۔ یہ تو کلاس تھا اور اس کے آداب ملحوظ خاطر تھے ورنہ وہ شعر کی روح تک پہنچنے کے لیے بعض اشعار کو ترنم سے پڑھ کر سمجھانے کے بھی قائل تھے۔ ان کے ترنم میں بڑا رس تھا۔ شاید اسی لیے وہ اپنے اشعار ہمیشہ مشاعروں میں ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔

کل تو خیر اُن کی یاد آئی تھی آج کیوں ہے فضا اداس اداس
بھول جانے کی آرزو کیوں ہے کیا محبت بھی ہے زمانہ شناس

اور ایسے ترنم سے پڑھتے کہ ساری فضا مسحور ہو جاتی یہی تو ادائیں تھیں جن پر ان کے دوست اور طالب علم مرتے تھے اور ان کے علم و فضل کا علم اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے طالب علموں کے لیے احتشام صاحب کی من موہنی شخصیت کے کئی بڑے حسین روپ تھے۔ جس میں سب سے دلکش روپ تھا جو ہر طرح کے تعصب سے پاک تھا۔ لکھنؤ آج بھی شیعہ سنی کا شہر ہے اور اب تو پھر ہندو اور سکھوں کا بھی مسئلہ دل خراش صورتیں پیدا کرتا ہے۔ مگر احتشام صاحب طالب علم کو اس کے سچے من اور لگن سے پہچانتے تھے۔ وہ طالب علم کے نام پر دین اور دھرم کی تفریق حرام سمجھتے تھے۔ وہ رنگ برنگے پھولوں کی طرح طالب علموں کو سمجھتے اور بلا امتیاز و مسلک اُن سے پیار کرتے تھے۔ اپنے سب طالب علموں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کیا مجال اس آدرش میں شمہ برابر کمی آجائے، جو کبھی ان کے قدم ڈگ جائیں۔

وہ اپنے ہر قریب آنے والے شاگرد سے سلوک و خلوص کا یکساں پیو پار رکھتے تھے۔ اس توازن پر مجھے اکثر حیرت ہوتی تھی۔ ان کے کسی بھی قریبی شاگرد سے ملیے۔ ان کے پیار کی ایک ہی طرح کی کتھا سنا تا ہے۔ کسی ایک کی شرط نہیں ان کے تمام وابستگان کو احتشام صاحب پر ایمان تھا جو دکھ ہوا ان سے کہہ سنایا پھر وہ دکھ اپنا نہیں رہتا تھا۔ چاہیے وہ دکھ کا مداوا نہ کرسکیں۔ مگر تسلیاں ایسی دیتے تھے کہ پھر غم غم نہیں رہتا تھا۔ اور اپنے سے جو کچھ کر سکتے تھے۔ اس کو کبھی اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ اسی بنا پر طالب علم ان کے رسیا تھے، عاشق تھے دیوانے تھے رشد و ہدایت کے تذکرے ہیں۔ ایسا تقدس کسی اور جگہ نہیں دیکھا۔ ایک بار لکھنؤ میں تکمیل الطب والوں نے مشاعرہ کیا۔ مشاعرے سے پہلے۔ لکھنؤ کی شاعری پر احتشام صاحب کی ایک تقریر کا پروگرام بھی تھا۔ وقت ۹ بجے کا تھا۔ آٹھ بجتے ہی شہر کے تمام اہل ذوق

جمع ہو گئے۔ بال کھچا کھچ بھر گیا۔ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ پر سکون فضا میں بڑے صبر و ضبط کے ساتھ احتشام صاحب نے تقریر کی۔ اب اس کے بعد مشاعرے کا پروگرام تھا۔ مگر شاید ان کو اسی روز دہلی جانا تھا۔ اس لیے منتظمین جلسہ سے اجازت طلب کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرش کی نشست تھی۔ ان کے جوتے کہیں گم ہو گئے۔ جب ادھر ادھر تلاش کرنا شروع کیا کچھ دیر پریشان سے ہوئے تو ان کے شاگرد ایک ایک کر کے ان کے پاس آ گئے۔ احوال ماجرا پوچھا اور سب والہانہ انداز میں ان کے جوتے ڈھونڈنے لگے۔ ہر لڑکے کا یہی اضطراب تھا کہ جوتے مجھے مل جائیں۔ یہ خاکسار بھی انھیں میں شامل تھا۔ اور ذرا یہ دیکھیے کہ ہر طالب علم کو ان کے جوتوں کی پہچان تھی مگر جوتے نہیں مل رہے تھے۔ جگہ جگہ پر سینکڑوں جوتوں کا ڈھیر تھا۔ اتنے میں شکیب رضوی نے (جواب کانپور میں ہیں) تڑپ کر کہا — I GOT اُن کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی فوراً جوتوں کو سینے سے لگا لیا۔ اور مٹھی میں ان کے سلیم شاہی جوتے پکڑ کر ان کے پیروں کے پاس رکھ دیئے وہ منظر مجھے نہیں بھولتا ایک طرف وہ تھے جو کھسیائے ہوئے کھڑے رہے تھے دوسری طرف شکیب رضوی کی مسرت کا عالم جیسے شیعوں میں دولت بیرول کی ہو۔ اور پھر احتشام صاحب کا وہ چہرہ۔ ہائے وہ منظر کبھی بھولتا ہی نہیں۔ شرمائی شرمائی سی صورت اور لجائی لجائی سی آنکھیں خفیف سی گردن کو توڑ کر اور نیم تبسم کو توڑ کر زیر لب کچھ کہا مگر کیا کہا؟ میں تو ذرا دور کھڑا تھا، سن نہ سکا۔

سبحان اللہ ان کے شاگردوں کو ان سے کیسی عقیدت اور کس کس طرح سے انھیں پوجتے تھے ایسے قصے تو ہزاروں ہیں مگر نہ جانے کیوں فقط ایک اور یہ قصہ کاغذ پر منتقل ہونے کے لیے بیتاب ہو رہا ہے۔

ان کی ایک طالبہ ہیں۔ شمیم نکہت کئی برسوں تک میرا ان کا لکھنؤ یونیورسٹی میں ساتھ رہا ہے یہاں تک کہ ایک ساتھ ہم نے پی ایچ ڈی کا مقالہ جمع کیا۔ میں پاکستان کے لیے پر تولنے لگا اور وہ دہلی یونی ورسٹی میں نوکری کا جوگاڑ لگانے لگیں۔ تارے ان کے سید تھے تقرر ہو گیا۔
پھر مجھے ایک بار شمیم نکہت ملیں تو میں نے بڑی بے ساختگی سے پوچھا۔ تم نوکر ہو گئیں چلو ٹھیک ہے مگر بی بی یہ تو بتاؤ کہ تم لاج کی ماری جوان مسٹنڈوں کو کس طرح سے FACE کر لیتی ہو۔ شمیم بولیں کہ بس احتشام صاحب کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔
آئیں — میں نے کہا "وہ کیسے؟"

بولیں قصہ اس کا یہ ہے کہ میرا تقرر جب ہوا تو مجھے خوشی بے انتہا ہوئی مگر تدریس کے تصور سے دل ہولیں کھاتا تھا وہ — رات بڑی بے چینی سے گزری۔ صبح ہوتے ہی حالت اور غیر ہو گئی۔ اب جوں جوں وقت گزرتا طبیعت بے حال ہوتی جاتی۔ میرے ٹائم ٹیبل کا پہلا گھنٹہ جوں ہی — ٹن سے بجا اور میں خوف سے کانپنے لگی۔ بہر حال کلاس روم کی طرف چلی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے احتشام صاحب میرے پاس آئے ہیں اور میری ہمت بندھا رہے ہیں۔ بس مجھے حوصلہ مل گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچیں اور دل سے کہا "یا احتشام حسین" اور پھر میں کلاس میں داخل ہوئی۔ تو اللہ جانے کہاں کی طاقت مجھ میں آ گئی۔ وہ گھڑی اور آج کا دن بڑے اعتماد سے پڑھاتی ہوں۔ کوئی فکر کی منزل درپیش آتی ہے تو احتشام صاحب کو یاد کر لیتی ہوں۔ وہ تو تدریسی الجھنوں کی بات ہے اور مجھ سے پوچھیے میں تو اپنی ہر بپتا میں انھیں یاد کرتا ہوں تعلیمی نوعیت ہی میں نہیں۔ ہر نوع کی بپتا ہی میں وہ آڑے آتے ہیں بلکہ یوں سمجھیے کہ میری پی ایچ ڈی انھیں کا صدقہ ہے۔ ورنہ پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے کیا معنی تھے۔ یہاں جب خاص طور پر ایک منصوبہ کے تحت مجھ پر تحقیق کے دروازے بند کر دیئے گئے تو احتشام صاحب کو بہت جلبلا کر خط لکھا۔ آپ ہی نے مجھے ہجرت پر آمادہ کیا۔ اب ایم اے کرنے کے بعد کیا میرا یہی مقدر ہے کہ کلرکی کروں نہیں تو پاس حیا ہو تو زہر کھا کے مر جاؤں۔ کیا میرے خط کا جواب دیا ہے آج بھی جب وہ الفاظ ذہن میں گونجتے ہیں تو آنسو نکل آتے ہیں ——— "بس اتنے میں دل گرفتہ ہو گئے۔ دل کیوں چھوڑا نہیں کرتے۔ پی ایچ ڈی کرنا ہے تو ابھی چلے جاؤ۔ نہیں تو میرے پاس چلے آؤ شاید میں تمھارے دکھ کا مداوا کر سکوں۔"

میرے دکھ کا علاج ہو گیا مجھے تم سے یہ کہنا ہے جو میں نے ان کے گھر کے علاوہ کوئی درخواست، پرزہ کسی یونی ورسٹی کے دفتر میں یا شعبہ اردو میں دی ہو۔ تمام کاغذات کی خانہ پُری تقریباً پونے تین برس تک اپنے قلم سے کرتے رہے اور مناسب جگہوں پر انھیں ارسال کرتے رہے۔ مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ اس باب میں یونی ورسٹی کا طریقہ کار کیا ہے۔ حتیٰ کہ میری فیس بھی معاف کروا دی۔ لاہور سے بار بار آنے لکھنؤ میں رہنے اور پھر لکھنؤ سے کراچی اور لاہور چلے جانے کی کیا کیسی قباحتیں تھیں۔ اگر احتشام صاحب کی پرخلوص معاونت نہ ہوتی تو یہ کام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر تحقیق کی مسافت میں جو اوکھٹ گھاٹیاں تھیں، اس میں بھی احتشام صاحب کی رہنمائی شامل حال تھی۔ ان دنوں غم تو ہزار تھے اور ہر نوع کی پریشانیاں مگر احتشام صاحب کی ذات سے ڈھارس بہت تھی۔ جب بھی کوئی مجھ سے متعلق یا میری تحقیق میں کوئی بھنور آتا تو میرا یہی عقیدہ تھا۔ احتشام صاحب میرے ساتھ ہیں تو مجھے غم کیا ہے؟

اور یہ وظیفہ صرف میرا نہیں، ان کے تمام طالب علموں کی یہی تحریر ہے۔ کسی استاد کی علمیت سے فیض کی مثالیں عام طور پر مل جاتی ہیں۔ مگر سیرت و شخصیت کے اکتساب اور اتباع کی مثالیں مجھے احتشام صاحب کے تدریسی دبستان کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتیں۔ انھوں نے اعلیٰ صفات اور بہترین اخلاق کی بھی اپنے طالب علموں کو تعلیم دی۔

ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے ملیے وہ بھی اسی انداز سے ان کا ذکر کریں گے۔ ڈاکٹر عبادت صاحب سے ملیے وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی بے خبری وقت پڑا میں احتشام صاحب کو یاد کر لیتا ہوں اور ان کو مثال بنا کر اپنی ہر مصیبت کا مقابلہ کرتا ہوں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے شاگردوں میں عبادت صاحب میں احتشام صاحب کی بڑی شباہتیں ملتی ہیں۔ قناعت، حلیمی، دل سوزی، درویشی اور بُردباری یہ سب احتشام صاحب کی سیرت کے وہ اوصاف ہیں جن سے عبادت صاحب کا پیکرِ خلوص مرتب ہوا ہے۔ انھیں صفات کی جوت ان کے ہر طالب علم کے یہاں کسی نہ کسی طور پر پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

احتشام صاحب کا خلوص بے پایاں کسی خاص حلقے کے لیے نہ تھا۔ وہ تو بہتی گنگا ہے نہ اس کی ابتدا کا اور نہ انتہا کا علم۔ وہ سچ مچ کے انسان تھے۔ احترامِ آدمیت کا کمال یہ تھا۔ نادار و مفلس ہو یا بندۂ سیم و زر ہو۔ ان کے خلوص و سلوک سب کے لیے یکساں۔ انسانی رفاع اور فلاح کے لیے خدا جانے کتنے کام اپنے سر لے رکھے تھے۔ ان کی کسی طالب کی اسپتال میں مدد ہو دوا لانے والا کوئی نہ ہو تو دوا احتشام صاحب لائیں گے۔ کسی شاگرد کی بہن کی شادی کا مسئلہ ہو اور نوبت لڑکی کے زہر کھانے تک پہنچ گئی ہو۔ اور شاگرد گومتی میں ڈوب مرنے کے لیے تیار ہو تو یہ مسئلہ احتشام صاحب کا ہے کہ وہ لڑکی کے سرپرستوں سے ملیں اور شادی طے کروائیں۔ محلے میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ تو ثالث کا کردار احتشام صاحب انجام دیں۔ کیا چیز تھے احتشام صاحب۔ کمرے میں بیٹھے ہیں ان کے حاضر باش جمع ہیں۔ برابر والے کمرے سے آواز آئی۔

ارے احتشام۔ اوا احتشام یہاں آؤ۔

"اچھا ابھی حاضر ہوا" حاضرین سے معذرت کر کے برابر والے کمرے میں داخل ہوئے۔

"احتشام میرے پاس خیر دانی نہیں ہے"

"اچھا آج ہی کپڑا آ جائے گا فکر نہ کیجیے"

دوسرے پلنگ سے ایک اور بزرگ کھانستے ہوئے بولے

"ارے احتشام کچھ فکر نہیں مجھے کھانسی آ رہی ہے"

"اچھا آج ہی آپ کے لیے دوا آ جائے گی"

ابھی وہاں سے فارغ ہوئے کہ بچوں نے ان کو گھیر لیا اور ہر بچہ اپنی جدا فرمائش کر رہا ہے اور سب کو اس کے سن کے مطابق مطمئن کر رہے ہیں۔

پھر آکر کمرے میں بیٹھ گئے۔ تو جدلیاتی فلسفے پر وہیں سے بات شروع کرتے ہیں۔ جہاں سے تار ٹوٹا تھا۔ ہائے ایک جانِ ناتواں پر کیا کیا فرائض اور کیسی کیسی مصروفیات پی ایچ ڈی کا مقالہ اک زانو پر رکھے دیکھ رہے ہیں اور دوسرے پر بچّی کو تھپکیاں دے رہے ہیں۔ شعر کہہ رہے ہیں اور اسی کی لوری بنا کر اقبال کو سُلا رہے ہیں۔ نو آموز شاگردوں کے مضامین اور افسانوں کا انبار ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ پڑھ رہے ہیں ساتھ ہی اس کی اصلاح اور ہدایت بھی لکھتے جارہے ہیں۔ سجاد ظہیر دلّی جارہے ہیں۔ تو ان کی عدم موجودگی میں ان کی کتاب کا پروف بھی پڑھ دیتے ہیں۔

اور سب سے زیادہ مصیبت مقدمے اور دیباچوں کی ہے۔ کیسی ہی کتاب ہو دیباچہ لکھنے سے انکار نہیں۔ چاہے وہ انجینئرنگ پر ہو یا اُردو کے نوحوں پر۔ دیباچہ لکھنے سے انکار نہیں۔ اور لکھنے کا یہ عالم ہے کہ بستر پر بیٹھ کر لکھ رہے ہیں۔ کھانے کی چھوٹی میز پر لکھ رہے ہیں۔ خالی اوقات میں یونیورسٹی میں لکھ رہے ہیں حتیٰ کہ ٹرین وسل دے رہی ہے اور وہ محمود الحسن رضوی کی لسانیات کی کتاب پر مقدمہ لکھ رہے ہیں۔ شام کو گھر سے باہر نکلے ہیں۔ تو پیچھے سے ہانک پڑ رہی ہے — احتشام اے احتشام۔ اور احتشام صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک بزرگ خستہ حال اپنے کمرے میں لے گئے ہیں۔ ٹین کی کرسی پر بٹھا دیا اور اپنے مذہبی رسالے کے اداریے کی اصلاح کروا رہے ہیں۔

اور اسی طرح تقریریں بھی پیچھے نہیں۔ علم و ادب کے جس موضوع پر دیکھئے تقریر کر رہے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں کبھی مغربی مفکرین کے ساتھ (ANTHROPOLOGY) کے کسی موضوع پر بول رہے ہیں۔ تو کبھی شعبۂ عمرانیات کی دعوت پر کسی عمرانی مسئلے پر اپنا مضمون پڑھ رہے ہیں۔ تاریخ کے موضوعات پر تقریریں کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہندی ادب پر بھی وہ نظر رکھتے تھے۔ اکثر و بیشتر ان کی ہندی میں بھی تقریریں کرتے رہتے تھے۔ اور اپنا اردو ادب تو ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ جس موضوع پر چاہیں جب چاہیں ان سے بلوا لیجئے۔ انکار نہیں۔ جس شہر میں جاتے وہاں ان کی آمد سے علم و ادب کی محفلوں میں ہلچل مچ جاتی۔ انکار کسی سے نہیں۔ دن میں دو دو تقریریں کر رہے ہیں۔ ریڈیو والے الگ فی البدیہہ تقریریں ریکارڈ کروا رہے ہیں۔ اور اس کے باوجود سیکڑوں میل کا سفر طے کیے ہوئے چار باغ اسٹیشن پر اترے ہیں۔ اور لکھنؤ یونیورسٹی میں یوم مجاز ہے۔ تو گھر نہیں جائیں گے۔ سیدھے یونیورسٹی میں آموجود ہیں۔ سفر کی تکان سے چہرے پر اضمحلال، رات کی جاگی ہوئی آنکھیں بوجھل بوجھل ہیں۔ مگر مجاز کے فکر و فن پر تقریر کر رہے ہیں۔ شہر کے بڑے بڑے یگانہ روزگار جمع ہیں اور احتشام ہیں کہ علم و فضل کے دریا بہائے دیتے ہیں۔ مجاز کے تغزل کی بحث ہے تو غزلوں کے اشعار سناتے چلے جارہے ہیں۔ رومانیت اور انقلاب کی بحث ہے تو نظموں کے بند کے بند سنا رہے ہیں۔ کیا شگفتہ بیانی اور رنگین کلامی تھی تھکاوٹ کے آثار تقریر پر نہیں۔ فنِ خطابت پر انھیں ایسا عبور تھا کہ کسی جگہ بند نہیں ضرورت پڑ جائے تو مجلس پڑھنے کے لیے بھی تکلف نہیں۔

بیمار ہوتے تو بھی مصروف رہتے جب تک بس چلتا کام کیے جاتے۔ کبھی اڈیٹروں کے بیہم اصرار پر کوئی مضمون املا کروا رہے ہیں نہیں تو پھر کسی کتاب کا مقدمہ لکھوا رہے ہیں۔ ان کے مقدموں میں ایک سب سے طویل مقدمہ وہ ہے، جو انھوں نے مراثی انیس کے لیے اپنی شدید بیماری کے باوجود نائب نقوی کو املا کروایا۔ جس کا انھیں حسب وعدہ معاوضہ بھی نہیں ادا کیا گیا۔ مگر ان کے ابرو پر شکن نہیں آئی۔ جیسا بھی اور جو بھی کچھ ان کے ساتھ ہوتا سب سے نباہ کیے رہتے۔ بڑی سے بڑی کشمکش ہو، چاہے وہ اپنے گھر کے مکان یا رشتہ داروں کے مابین ہو۔ یا اپنی یونیورسٹی نیز شعبے سے متعلق ہو یا اپنے ہم عصر قلمکاروں کے درمیان وہ راہِ مصالحت ہر جگہ تلاش کر لیتے۔ لوگوں کو خوش کرنا لوگوں کو دیکھنا اللہ کی سب سے بڑی عبادت تھی۔ چاہے اپنی ذات پر ستم ٹوٹ جائیں پرواہ نہیں۔

اسی مسلک کی اشاعت وہ اپنے قلم سے بھی کرتے رہتے۔ انسانی برادری میں صلح و آشتی، مسرت اور مساوات کے علمبردار

ان کا قلم ساری عمر سرمایہ داروں کے استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا رہا اور ہمیشہ نئے انقلاب کی بشارت دیتا رہا۔ افسوس ایسا قلمی مجاہد میں نہ جانے کہاں سے اپنے دل کو روگ لگا بیٹھے جیسے کہ بجاتے ہیں یہ چاند سی صورت کس دیس کو سدھار گئی۔

اب ہم ہیں اور ہمارے ادب کی دنیا ہے۔ مگر احتشام صاحب ہی نہیں ہیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک فکر کا دبستان تھے اور اب یہ دبستان قبر میں سو رہا ہے۔

ادبِ لطیف کے مدیر کے سوالات

اور

احتشام حسین کے جوابات

سوال: اگر تقسیم کے بعد اردو میں تنقید نہ لکھی جاتی تو اس سے ہمارے ادب کی تاریخ میں کیا فرق پڑتا ہے؟

جواب: "جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟" یہ طبع آزمائی محض ذہنی ورزش ہے۔ یہ بتانا ناممکن ہے کہ اگر تقسیم کے بعد تنقید نہ لکھی جاتی تو ہمارے ادب کی تاریخ میں کیا فرق پڑتا۔ یہ سوال تنقید ہی نہیں ہر صنفِ ادب کے متعلق پوچھا جا سکتا ہے۔ اگر ناول داستانیں، غزلیاں، قصیدے نہ لکھے گئے ہوتے تو کیا ہوتا؟ معلوم نہیں کیا ہوتا۔ آج کل جو کچھ ادب کے نام پر لکھا جا رہا ہے اس سے کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہیے؟ کچھ لوگوں کے لیے بہت کچھ ہو رہا ہے، کچھ کے نزدیک ادب کی تخلیق سے گردشِ ہفت آسمان میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے۔ ایسے سوالوں پر علمی حیثیت سے غور کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔ دوستوں میں بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے پہیلی کے انداز میں قیاس آرائی کرتے رہنا، دلچسپی کا مشغلہ ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر تنقید نہ لکھی ہوتی تو آپ یہ سوال ہی نہ پوچھتے! تقسیم کے بعد تنقید تو سخت افراتفری کا شکار رہی ہے اس کے اثرات اخری کا کیا سوال یہ سوچیے کہ ارسطو نہ ہوتا، گوئٹے نہ ہوتا، ٹالسٹائے نہ ہوتا، فردوسی نہ ہوتا، بادلیر، کافکا، سارتر نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟ میں سمجھتا ہوں اس سوال کا جواب نہیں ہے عقلی گدّے لگائے جا سکتے ہیں اور کچھ چٹکلا بازی ہو سکتی ہے جسے تنقید سے کوئی واسطہ نہیں۔

سوال: کیا آپ کے دانست میں ہمارے ادب نے تقسیم کے بعد زوال کیا ہے؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو زوال کے اس آپ اپنی تنقید نگاری کا مقام کیسے معین کریں گے؟

جواب: میرے خیال میں تو تقسیم کے بعد اردو ادب میں کوئی ایسا زوال رونما نہیں ہوا ہے جس سے ہراساں ہونے کی ضرورت ہو۔ بعض موضوعات بدلے ہیں، بعض خیالات آگے بڑھے ہیں بعض پیچھے ہٹے ہیں، کچھ پرانے لکھنے والوں نے کم لکھا ہے، کچھ نئے میدان میں نئی اور پرانی نسل کے جھگڑے کھڑے ہو گئے ہیں۔ پاکستانی اور اسلامی ادب کی تحریکیں چلائی گئی ہیں، لڑ جھگڑ کر کچھ کوشش ہوئی ہے بعض اصناف کی طرف توجہ کم ہو گئی ہے بعض کی جانب زیادہ، کچھ کامیاب اور کچھ ناکام تجربے بھی ہوئے ہیں بعض کے گرد ہالے بنانے کی کوشش ہوئی ہے، کچھ نے ادب میں پیمبری کی خواہش کی ہے، کچھ اعصاب کے پکار پر لبیک کہہ رہے ہیں کچھ ادب عہدِ وسطیٰ میں واپس لے جانا چاہتے ہیں، کچھ ایٹم قسم کی چیزوں سے متاثر ہیں اور ادب کو اپنے عہد کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ کیا انھیں زوال کی نشانیاں کہہ سکتے ہیں؟ اسی لیے میں اپنی تنقید نگاری سے بھی کچھ ایسا مایوس نہیں رہا اس کا مقام، تو اس کے متعین کرنے کا حق دوسروں کو حاصل ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں کہ اگر اپنے خیالات کے بامعنی اور درست ہونے پر یقین نہ ہوتا تو انھیں پیش ہی نہ کرتا۔ جہاں میرے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی وہاں اپنی لاعلمی اور شک کا اظہار بھی کر دیتا ہوں۔

مرزا جعفر حسین

احتشام ماہلی

پروفیسر سید احتشام حسین قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ کے ایک محترم اور برگزیدہ نبی سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُسی قصبہ کی روشنی میں آنکھیں کھولیں اور وہیں کی ہواؤں میں پہلی سانس لی۔ قصباتی ماحول میں، جو سیادت کی شرافت، سنجیدگی اور حُسنِ اخلاق سے متاثر تھا، بچپن کے دن گزارے۔ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو اعظم گڑھ گئے وہاں بھی ادبی ماحول تھا طبیعت کی فطری صلاحیتوں نے کسبِ علم کی طرف متوجہ کیا تو قسمت کی ناموافقت نے ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھا لیا۔ اُن کی پوری زندگی پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے صبر و تحمل کے جوہر اُن کے ضمیر میں کوٹ کوٹ کے بھر دئیے تھے۔ یہ سچ ہے کہ چچا کی شفقتیں کچھ کم نہ تھیں۔ سید ابو محمد صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے ہونہار بھتیجے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اور یہ لائق بھتیجا بھی اپنے چچا کا جن کو وہ بڑکے ابا کہتا تھا ہمیشہ پرستار رہا مگر باپ کی فطری شفقتوں سے محرومی یقیناً ایک بہت بڑی مصیبت تھی اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ اعظم گڈھ اور اس کے بعد الہ آباد میں طالب علمی کا زمانہ سکھ سے نہیں گزرا ہوگا اور اُسی زمانہ میں جو دکھ اُٹھائے ان کی آگ میں یہ سونا تپ کر ذہب خالص بن گیا۔ ابھی الہ آباد سے فارغ التحصیل ہو کر نہیں نکلے تھے کہ لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ آنے والے درخشندہ دور کی تابانی اُن کی پیشانی میں اسی وقت سے جھلک رہی تھی۔

الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے پاس کرنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ گو کہ طالب علمی کا زمانہ الہ آباد ہی میں ختم ہوا تھا مگر اُن کے دل میں لکھنؤ سے دیرینہ کشش تھی، اس لیے ملازمت ملنے اور لکھنؤ میں ملازمت ملنے کی بے حد مسرت تھی لیکن اس مسرت کا مظاہرہ ان تعیش پرستیوں میں کبھی نہیں ہوا جس کے لیے یہ شہر معروف تھا۔ اُن کے اوقات کا مصرف یونیورسٹی میں تعلیم دینے، شاعروں اور ادیبوں سے ملاقاتیں کرنے اور لکھنے پڑھنے تک ہمیشہ محدود رہا۔ دماغ میں بلا کی ذہانت اور دل میں علم و ادب کے حصول کا لہریں مارتا ہوا سمندر ہمیشہ موجزن رہا۔ ان صلاحیتوں کی بدولت کتب بینی اور تصنیفات و تالیفات میں نہ دقت ہوتی تھی اور نہ زیادہ وقت صرف ہوتا تھا اس قسم کے کام جو دوسرے مہینوں میں کرتے احتشام مرحوم گھنٹوں اور دنوں میں مکمل کر لیتے تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں چند برسوں کی مدت کے اندر ہی اُن کی تصنیفات اچھی خاصی تعداد میں مکمل ہو گئی تھیں۔ اور ان کی قابلیت اور لیاقت کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ ہندوستان کے باہر بھی اُن کی علمی شہرت پہنچ چکی تھی۔ امریکہ کا سفر اُسی زمانہ میں کیا تھا اور وسائل و سمندر کی تکمیل ہونے کے بعد الہ آباد کے سنگم نے اُن کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر بھی راقم الحروف ذاتی معلومات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے بادلِ ناخواستہ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسری کی جگہ کو قبول کیا تھا۔ یہاں اُن کی حق تلفی ہوئی اور اُس کو انھوں نے اپنی حلیم و متحمل طبیعت کے سہارے انگیز کیا۔ مگر الہ آباد کی پروفیسری قبول کرنے میں بھی کوئی حرص و طمع یا کسی قسم کا بھی جذبۂ حصولِ اقتدار و منفعت شامل نہیں ہوا۔ اگر اُن کو مجبور نہ کر دیا گیا ہوتا تو وہ لکھنؤ یونیورسٹی کا عہدہ لکچرار، الہ آباد یونیورسٹی میں منصب پروفیسری کے لیے ہرگز ہرگز نہ چھوڑتے۔ اُن کی اولوالعزم فطرت میں بلا کی قناعت بھری ہوئی تھی۔

الہ آباد جا کر وہ خوش نہیں رہے۔ حالات مزاج کے مطابق نہیں رہے جتنا جتنا وقت گزرتا گیا اُن کے تفکرات میں اضافہ ہوتا گیا مگر بہت کم ایسے مواقع آئے جب اُن کی زبان سے کوئی کلمۂ شکایت نکلا ہو۔ وہ اپنا دُکھ درد زبان سے کہنے کے قائل ہی نہیں تھے۔ یہی سبب تھا کہ درد دل کے شدید ترین کرب کی حالت میں بھی اُن کے لبوں کو بقدرِ ذات حرکت نہیں ہوئی اور کوئی علاج مرضِ الموت میں نہ ہوسکا۔ بیماری کا وقفہ بہت کم تھا اور وہ صبر و سکون کے ایک ہمالہ پہاڑ تھے جو بڑی سے بڑی تکلیف سے متزلزل نہ ہوسکا۔ اُن کی اس صفت کو ملحوظ رکھتے ہوئے الہ آباد میں کشمکش بلاوجہ کی صعوبت کو اُن کا جھیل لینا سمجھ میں آتا ہے مگر اُن کے اس کارنامے کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے کہ اُن کا علم و ادب کی خدمت میں تبحر اور انہماک ہر حالت میں برقرار رہا۔ درس و تدریس میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔ تصنیف و تالیف کا مشغلہ چلتا رہا، سماجی اور خانگی فرائض کی ادائی میں کوتاہی نہیں ہوئی، اور دوستوں، عزیزوں، شاگردوں اور کسبِ فیض کرنے والوں سے ملاقاتیں بھی بدستور چلتی رہیں۔ پریشانی سی پریشانی آئی مگر ہونٹوں کی مسکراہٹ اور چہرے کی بشاشت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ کبھی کسی ملاقات کرنے والے نے یہ اندازہ نہیں کیا کہ یہ شخص جو اتنی پُرمغز اور پُرکیف گفتگو کر لیتا ہے افکار سے بھرا ہوا دماغ اور الجھنوں میں مبتلا دل بھی رکھتا ہے۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے انسان اپنی داستانِ غم دوسروں کو سنا دیتا ہے۔ احتشام بھی انسان تھے۔ اُن کو بھی کچھ ایسے لوگوں کی قدر تھی جو اُن کے آلام سنتے اور اُن کو سہارا دیتے تھے مگر ایسے لوگوں کی تعداد اتنی کم تھی جن کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا تھا۔ انھیں ہمدردوں میں راقم الحروف بھی شامل تھا اور میں اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر بلاخوف تردید اور پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے مواقع پر احتشام چند جملوں سے زیادہ اور کچھ زبان سے نہیں کہتے تھے۔ اُن کے دل کی تکلیف کا اندازہ کرنے کے لیے ہم کو اُن کے حالات کا بیرونی وسائل و ذرائع کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ یہی نہیں اُن کا یہ بھی وطیرہ تھا کہ داستانِ غم چند جملوں میں ختم کرنے کے بعد فوراً کوئی اور مضمون شروع کر دیتے یا کچھ ایسی باتیں کرنے لگتے جن کے سبب سے سننے والے کا تجسس یا ہمدردانہ تکلیف دماغی فی الفور دور ہو جاتی اور باہمی گفتگو میں فرحت و انبساط کی ایک لہر ضرور آ جاتی تھی۔ اُن کا یہ طرزِ عمل اُن کی رجائیت کا آئینہ دار ہو جاتا تھا۔

یہ بات بہرحال مسلّم الثبوت ہے کہ وہ ایک گراں مایہ ادیب اور فنِ تنقید کے مجدد تھے۔ اردو زبان سے اُن کی محبت اور اردو کی فلاح و بہبود و ترقی کے لیے اُن کی عمر بھر جد و جہد ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس موضوع پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی مدتوں تک بڑے بڑے ادیب اور فنکار برابر لکھتے رہیں گے مگر میں جب ان کو یاد کرتا ہوں تو اُن کی انسانیت، شرافت، مروت، محبت، مہر و وفا اور اُن کی سادہ پُرخلوص گھریلو زندگی کے واقعات یکے بعد دیگرے حافظے میں اُبھرتے اور دل کو مجروح کرتے رہتے ہیں۔ ان کو اپنے تمام عزیزوں سے بے پناہ محبت تھی۔ اُن کا ہر دوست بھی اُن کی محبت کا معترف تھا۔ ظاہر ہے کہ جس کا لطف و کرم اتنا عام ہو وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ کتنی دلی قربت رکھتا ہوگا! چنانچہ میں نے خود دیکھا ہے کہ ماہل سے جب کوئی آجاتا تھا تو اُن کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ ان آنے والوں میں بکثرت قریبی رشتہ دار نہیں ہوتے تھے لیکن ماہلی ہونے کا ناتہ اُن کے نزدیک بہت قوی تھا۔ وہ خود بھی اپنے کو احتشام ماہلی لکھتے تھے اور اس طرح تخاطب کیے جانے پر خوش ہوتے تھے۔ یوں تو ہر انسان اپنے وطن یعنی مولد کا گرویدہ ہوتا ہے لیکن احتشام ماہلی کے دل میں ماہل سے ایک عجیب محبت تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ماہل کا نام سن کر یا ماہل سے آنے والوں کو دیکھ کر اُن کو اپنا بچپن اور اُس کی معصوم تصویر اُن کے سامنے پھر جاتی ہو۔ غیروں اور ہمسایوں کے ساتھ اتنا خلوص رکھنے والا اپنے خاندان والوں کے لیے کتنا شفیق و رفیق تھا اس کا حال وہی جانتے ہیں جنھوں نے اُن کو قریب سے دیکھا ہی نہیں بلکہ اچھی طرح پرکھا بھی تھا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران میں اُن کا عقدِ مناکحت قصبہ نگرام کے ایک معزز سید گھرانے میں ہوگیا تھا۔ شادی کے بعد اُن کا بہت زیادہ وقت گھر کے اندر ہی صرف ہوتا تھا۔ اُن کی رفیقۂ حیات بھی بہت جلد مزاج داں ہوگئی تھیں اس لیے دونوں کی زندگی بیحد خوشگوار گزرتی تھی۔ ایسی مثالیں دوسری جگہ بھی ملتی ہیں جہاں زن و شو کے جذبات و خیالات میں ہم آہنگی ہو اور دل سے دل

ل کر حقیقی معنوں میں یگانگت ہو جائے مگر احتشام صاحب کو کتب بینی اور تصنیف و تالیف سے قلبی لگاؤ منزل عشق تک پہنچا ہوا تھا ان دو محبوبوں کو جس طرح انھوں نے نباہا وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں ہو سکتی ہے۔ انھوں نے ابتدا ہی سے اپنے حجلۂ عروسی کو اپنا کتب خانہ بنا لیا تھا۔ وہیں پڑھتے لکھتے تھے اور بسا اوقات پلنگ پر لیٹے لیٹے پڑھتے اور بیٹھ کر لکھتے تھے۔ اُن کی بہترین تصنیفات اسی کمرہ میں لکھی گئی تھیں۔ اُن کی یہ عادت زندگی کے آخری دن تک برقرار تھی مگر شادی ہونے کے فی الفور بعد اس کاروبار کو انھوں نے کیسے چلایا اس کو لکھنا بھی دشوار ہے اور اپنی اہلیہ کو اس مشغلہ میں کس طرح شریک کیا اس کا بھی پتہ آج تک نہیں چل سکا۔ البتہ یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے دونوں محبوبوں کو برابر خوش رکھتے رہے۔ نہ کبھی ان کی رفیقۂ حیات کو کوئی شکایت ہوئی اور نہ تصنیف و تالیف کے شغف میں کوئی کمی ہوئی ان دونوں میں کبھی کسی کو ایک دوسرے کے خلاف رقابت نہیں پیدا ہوئی۔ ذاتی طور سے میں اُن کے اس کمال کا ہمیشہ معترف رہا اور معترف رہوں گا کیونکہ ایسی کوئی دوسری مثال نہ دیکھی ہے اور نہ دیکھنے کی کوئی امید ہے۔

شادی ہو جانے کے بعد اولاد کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس دار فانی سے چار لڑکوں اور تین لڑکیوں کو چھوڑ کر رخصت ہوئے احتشام صاحب کے ایسے گھر میں پیدا اور پروان ہونے والے بچوں کو سلیم الطبع، خوش خلق اور رشید و سعید ہونا ہی چاہیے تھا۔ بچوں کو باپ سے اور باپ کو بچوں سے جو فطری علاقہ ہوتا ہے وہ یہاں بھی تھا اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ احتشام صاحب اپنی طبیعت کی خصوصیات کی وجہ سے اپنے بچوں پر دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ شفیق تھے لیکن دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے کہ باپ کی شفقت تمام اولاد کے ساتھ بعینہٖ ایک ہی درجہ کی نہیں ہوتی۔ عموماً کسی بچے کے ساتھ زیادہ اور کسی بچے کے ساتھ باپ کی محبت نسبتاً کم درجہ کی ہوتی ہے یہ طرز عمل انسانی فطرت کا تقاضا ہے جس کا مظاہرہ انبیاء اور اولیاء کے خاندانوں میں ہوا ہے اور دیکھنے والوں نے مدارج محبت کے اس امتیازی فرق کو دیکھ کر اُس کا اندازہ بھی کر لیا ہے۔ احتشام صاحب بھی انسان تھے مگر دیکھنے والوں نے اس امتیازی شان کو اُن کے یہاں بہت کم دیکھا حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ہر بچے کے لیے بے پناہ محبت رکھتے ہوئے بھی اُن کو اپنے منجھلے صاحبزادے جعفر عسکری سلمہ المعروف بہ عون سلمہ سے ایک قلبی لگاؤ تھا۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ صاحبزادے دماغی عارضہ میں مبتلا ہیں ان کے علاج اور صحت مندی کی اُن کو ہر وقت فکر لگی رہتی تھی پھر بھی ایک مریض بچہ کے ساتھ جو اُن کا طرز عمل تھا وہ بڑی حد تک غیر معمولی تھا۔ دماغی مریض کو کسی پریشانی میں مبتلا کرنا یا اس کو کسی فکر میں گرفتار کرا دینا دانشمندی کا تقاضا نہیں ہو سکتا بالخصوص ایسے دانشمند کا جو احتشام حسین کے ایسے تفکر و تعقل کا مالک ہو اپنے علیل فرزند کو دماغی الجھن میں مبتلا کرنا یقیناً تعجب خیز ہے۔ مگر یہاں برابر یہی صورت حال رہی احتشام صاحب نے اپنے اس بیمار بچہ کو اپنا رازدار بنا رکھا تھا۔ اپنی ہر تکلیف اُس سے کہہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو درد دل کی تکلیف کا بھی جعفر عسکری سے تذکرہ کیا۔ اس طرز عمل کی غالباً یہ وجہ تھی کہ افراد محبت میں اپنا دکھ درد انھیں سے بیان کر دیا کرتے تھے اور اُن کی دماغی صلاحیت پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُن کو ہر تکلیف کی اطلاع قابل برداشت ہی ثابت ہوگی۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ وہ عون کو بہت چاہتے تھے مگر ایک رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ اُن کے کسی بچہ کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اس کو کم چاہتے ہیں۔ اُن کی محبت میں ظاہرداری قطعاً نہیں تھی اور نہ اُن کے خلوص میں کبھی کوئی کمی ہوئی۔

آجکل ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اُس کے بارے میں حافظ شیرازی کا یہ قول حرف بہ حرف صحیح ہے

ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دارد ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم

احتشام صاحب کے بارے میں جس طرح دوسرا مصرع بے محل ہے اسی طرح پہلا مصرع بھی غیر متعلق ہے۔ اُن کا کردار دونوں مقامات پر اس قول کے برعکس تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ حقیقتاً اپنی اولاد کے لیے شفقت مجسم تھے اور اُن کا رحم و کرم اپنے بھائیوں پر بے پایاں

ملنا اُن کے بھائی بھی مرتبہ شناس تھے اور اپنے بڑے بھائی سے ویسی ہی محبت کرتے تھے جیسی بھائی کو بھائی کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ احتشام صاحب چار بھائی تھے۔ اُن سے چھوٹے سید وجاہت حسین صاحب المعروف بہ مجھن سلمہ ملازمت پیشہ رہے اور اپنے اہل و عیال سمیت علیحدہ ہی سکونت پذیر رہے۔ اُن سے چھوٹے سید انصار حسین صاحب سلمہ طبیعتاً کاروباری ہیں چنانچہ ایک مدت سے سرفراز پریس لال بہجری کا کام بحسن و خوبی چلا رہے ہیں۔ احتشام صاحب لکھنؤ ہی جا رہے تھے اسی وقت سے انصار صاحب اس عہدہ پر مامور ہیں اور مع اہل و عیال لکھنؤ میں مستقل طور پر رہتے ہیں۔ ابتداء ہی سے علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ احتشام مرحوم الہ آباد میں ملازمت کے بعد جب بھی لکھنؤ آتے تھے اپنے انھیں بھائی کے یہاں قیام کیا کرتے تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی سید اقتدار حسین عرف جعفا سلمہ اپنے بڑے بھائی مرحوم کے ہمراہ رہے۔ فارغ التحصیل ہو کر برسرِ ملازمت دلّی چلے گئے اور وہیں کی سکونت اختیار کر لی۔ لیکن دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان میں ہر بھائی احتشام صاحب کو جب "بھیا" کہتا تھا تو ہر ایک کے دل کی گہرائیوں سے ایک ایسی ہمک نکلتی تھی جو یگانگت میں ہم وزن ہوتی تھی اور کبھی یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ محبت میں کوئی ایک بھائی دوسرے پر سبقت رکھتا ہے۔ اسی طرح احتشام صاحب اپنے چھوٹے بھائیوں کو نام لے کر پکارتے تھے تو ہر ایک کے لیے ایک ہی جذبہ اُن کی آنکھوں میں چمک اٹھتا تھا۔ یگانگت اور موانست کی ایسی تصویریں بہت کم نظر آتی ہیں جس کی کشش کا اصل مرکز خود احتشام صاحب کا محبت بھرا دل تھا۔ پھر بھی جاننے والے یہ حقیقت فراموش نہیں کر سکتے کہ احتشام صاحب اپنے سب سے چھوٹے بھائی جعفا سلمہ کو بہت چاہتے تھے، اُن کو مثل اولاد کے انھوں نے پالا تھا اور یہ چھوٹا بھائی بھی ہمیشہ اُن پر پروانہ وار نثار رہا۔ یہ صورتِ حال تعجب خیز نہیں ہے۔ البتہ حیرت خیز یہ مقام آتا ہے کہ اُن کے دوسرے بھائیوں کو کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ بڑے بھائی جعفا سلمہ کو بہت چاہتے ہیں اور ہم کو نہیں چاہتے۔ اپنے تعلقات، اپنے رکھ رکھاؤ، اپنے برتاؤ یہاں تک کہ اپنے انداز گفتگو میں بھی انھوں نے کبھی کوئی ایسی تبدیلی نہیں آنے دی جس کی وجہ سے اُن کے کسی بھائی کو اُن سے شکایت ہوتی یا دوسرے بھائی کے ساتھ حسنِ سلوک کی فراوانی دیکھ کر غصہ ہوتا۔ مثل مشہور ہے کہ جہاں چار برتن ہوتے ہیں وہاں کبھی نہ کبھی ٹکراؤ ضرور ہوتا ہے مگر احتشام صاحب ایسے چار بھائی تھے جن میں کبھی ٹکر نہیں ہوئی۔ اس خوشگوار اور سازگار ماحول کے لیے ہم کو احتشام صاحب ہی کے متوازن اخلاق کو ذمہ دار قرار دینا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کم سنی میں یتیم ہو گئے تھے۔ احتشام صاحب کی زندگی ان لوگوں کے لیے شمع راہ بنی اور اُن کی پُرسکون طبیعت اور صلح پسند فطرت ہی کی یہ برکت تھی کہ یہ چاروں بھائی رشتۂ محبت میں برابر منسلک رہے۔

اپنے بچوں، اپنے بھائیوں اور اپنے اعزاء و اقارب کے ساتھ رفق و مدارا اور خلوص و محبت سے پیش آنے والا یہ مجسمۂ اخلاق و اکرام اپنے دوستوں بلکہ ملاقات کے لیے ہر آنے والے میں ہر ایک سے بےحد موانست سے ملتا تھا۔ خاطر تواضع میں کبھی کسی کے ساتھ کمی نہیں کی۔ بات کرنے کا انداز بےحد دلکش تھا۔ خلافِ مزاج بات سننے یا برتاؤ کے بعد بھی کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ تضییع اوقات البتہ مزاج کے خلاف تھی یہاں تک کہ جوش ملیح آبادی کے ایسے قدر داں دوست کی لہو و لعب والی نشستوں سے بہ قصد و اہتمام گریز کرتے تھے لیکن علم و ادب کا نام لے کر اگر کوئی آتا اور بیکار باتوں میں وقت برباد کرتا تو اس تکلیف کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے اور بہت کم شکایت سے زبان آشنا ہوتی تھی۔ بات میں بات نکالنے اور باریک بینی دلکش مشغلہ تھا۔ تفننِ طبع میں دوسروں کی مہمل باتوں کو بھی اسی طرح مزاح میں شامل کر دیتے تھے کہ سننے والے کو گراں نہ گزرتا اور اُس کی مہملیت مذاق بن کر رہ جاتی تھی۔ بحث و مباحثہ کے دوران اصل موضوع سے ہٹ جانا اُن کا شعار نہ تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایسے مواقع پر موضوع کی افادیت ملحوظ رکھنے پر پوری توجہ مبذول رکھتے تھے۔ پڑھے لکھے لوگ جمع ہو جاتے تو ایسے مباحثے کافی دلچسپ اور افادیت کے مالک ہوا کرتے تھے۔ حافظہ بلا کا تھا۔ دورانِ کلام میں انگریزی، اردو اور فارسی کے اقوال بے تکلف اور برجستہ پیش کر دیتے تھے۔ علم و ادب کے سلسلہ میں ہر موضوع پر فی البدیہہ تبادلۂ خیالات کیا جا سکتا تھا۔ تحریر و تقریر دونوں پر کمال حاصل تھا

فع پر معلومات کا سمندر لہریں مارنے لگتا تھا۔ لیکن اس تبحر علمی کے ساتھ محل شناسی اور مناسب و موزوں گفتگو کرنا اُن کا طرۂ امتیاز تھا
رنے والے سے اُن کا انداز گفتگو ایک انفرادی شان رکھتا تھا۔ ہو کلموا الناس علیٰ قدر عقولہم کے اصل پر سختی سے کاربند
دوستوں اور ملاقاتیوں کے مبلغ علم سے تو وہ کما حقہ واقف تھے لیکن ایک نئے آنے والے کی علمی صلاحیت کا اندازہ بھی چند منٹ کی گفتگو
نکال لیتے تھے اور اسی کی عقل کے مطابق اُس سے گفتگو کرتے تھے۔ ایسے آنے والے اگر کبھی اپنی بساط سے باہر گفتگو کرتے تو اُن کو ٹال
بھی اُن میں زبردست ملکہ تھا اور وہ اس خوبصورتی کے ساتھ بات ٹال دیتے تھے کہ کسی کو برا بھی معلوم نہ ہوتا۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی ذہانت
لطافت سے کام لیتے تھے جس کے پیکر میں طنز و مزاح کے جوہر چمکتے نظر آتے تھے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں رنگ محفل ہی دوسرا
ما ایک دوسرے پر طنز کرتا جملہ کستا اور چٹکیاں لیتا تھا۔ احتشام صاحب بھی کسی سے پیچھے کبھی نہیں رہے۔ جتنے وہ سنجیدہ اور متین تھے
بتوں میں وہ اتنے ہی شگفتہ جا یک دست بھی ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی یہ مشغلہ گھنٹوں چلتا اور گرمی بزم کسی طرح سرد نہیں پڑتی
ان مواقع پر شرکت کرنے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ ہمارا یہ گراں قدر ادیب اور نقاد ایک زاہد خام کی طرح "یبوستًا
بیدا" نہیں ہے۔ ان کے لکھنؤ کے دوران قیام میں نیز وہ جب یہاں آتے ایسی ہنگامہ آرائی دانش محل میں ہوا کرتی تھی۔ دانش محل
ب نسیم احمد صاحب اُن کے مخلص دوست تھے اور اُن کی دکان کو وہ اپنا دارالقرار اور دارالفرار دونوں قرار دیے ہوئے تھے۔
نشستیں برابر وہاں ہوا کرتی تھیں اور احتشام صاحب ہی صدر محفل رہتے تھے۔

اسی سلسلہ میں اُن کے بعض عادات و اطوار کا تذکرہ کر دینا بھی نامناسب
ا اور ان عادات و اطوار میں اُن کے لباس اور طعام کا ذکر مقصود ہے۔ ابتداءً وہ شیروانی اور پائجامہ پہنا کرتے تھے۔ بعد میں بش شرٹ
لون اختیار کر لیا۔ سر پر کوئی ٹوپی نہیں پہنتے تھے۔ لباس کے بارے میں صرف صفائی پیش نظر رہتی تھی۔ گھر میں قمیص پائجامہ ہو یا باہر
پتلون ہر ملبوس کا صاف ستھرا ہونا ضروری تھا۔ جس کپڑے کا لباس بنتا تھا اُس کے لیے سادگی نظر انتخاب کو مرغوب تھی۔ ان کو
سی نے قیمتی کپڑے پہنے نہیں دیکھا اور نہ جہاں تک مجھے علم ہے اُن کے پاس کپڑوں کی بہتات تھی۔ اُن کا مسلک یہ تھا کہ تن ڈھکنے کے
ڑا ہونا چاہیے مگر صاف ستھرا ہو۔ کھانے کے بارے میں بھی سادگی پسند تھے۔ خوش ذائقہ اور بدذائقہ کھانوں میں پورا پورا امتیاز
تے تھے لیکن نہ خوش ذائقہ طعام کے لیے ہوسناکی تھی اور نہ بدذائقہ چیز کھا کر بے مزہ ہوتے تھے۔ آخر عمر میں دن کا کھانا ترک کر دیا تھا
بدہضمی کے مریض تھے۔ سفر کے ضروریات برابر پیش آتے رہتے تھے ایسے مقامات پر میزبان جو کھلا دیتے کھا لیتے اور نقصان رساں غذا
جو تکلیف ہوتی ایک وقت فاقہ کر کے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے۔ بے نفسی اُن کا جوہر حیات تھا اس لیے اپنے آرام و سکون
ن اتنی بے توجہی کرتے تھے اپنے دوا و علاج کی بھی بہت کم فکر رہتی تھی۔ اسی بے فکری کی بدولت صحت بد سے بدتر ہوتی گئی۔
ں اور عزیزوں کے اصرار کے باوجود اپنے فرائض اور اپنے جذبۂ ادب پرستی کو اپنی جان اور اپنی صحت پر برابر ترجیح دیتے رہے۔ خوددار
تھے مگر خود پرستی نام کو بھی نہ تھی۔ ہوا و ہوس میں کبھی اسیر نہیں ہوئے اور اپنے جذبات و احساسات پر ہمیشہ پورا پورا قابو رکھا۔ اُن کی اسی
ری اور جذبات پر قابو رکھنے کی بدولت اُن کے قریب ترین عزیزوں اور دوستوں کو بھی کبھی یہ پتہ نہ چلا کہ ساٹھ برس کی زندگی میں ان کے
ے اندر کیا کیا تمنائیں ابھریں اُن میں کتنی پوری ہوئیں اور کتنی حسرتیں اُن کے ساتھ دفن ہو گئیں۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ملازمت
سبکدوشی حاصل کرنے کے بعد ان کا ارادہ لکھنؤ ہی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لینے کا تھا۔ انھوں نے اپنے لیے ایک مکان بھی خرید
ا مگر اس مکان میں ایک روز بھی رہنا نصیب نہ ہوا۔ الہٰی کی یہ شمع الہ آباد کی آندھیوں میں بجھ گئی اور اُن کا جسد خاکی اسی سرزمین
پیوند ہو گیا۔

ادب لطیف کے مدیر کے سوالات

اور

احتشام حسین کے جواباب

سوال: آپ ادب کو قاری کی حیثیت سے پڑھتے ہیں یا نقاد کی حیثیت سے؟

جواب: نقاد الگ کوئی مخلوق نہیں ہے، وہ بھی قاری ہے، شاید کچھ زیادہ باعلم اور ہوشمند۔ عام قا[رئین] میں اس کا ذہن بے ترتیبی میں ترتیب اور انتشار میں وحدت تلاش کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اس فرق کے باو[جود] قاری ہی رہتا ہے۔ اگر وہ قاری نہ ہو تو نقاد کیسے ہوگا؟

سوال: تنقید لکھتے ہوئے آپ کا مخاطب ادب کا قاری ہوتا ہے یا ادیب؟

جواب: تنقید لکھتے وقت میں خود اپنے آپ سے بھی مخاطب ہوتا ہوں، قاری سے بھی، ادیب سے بھی تنقید نگاروں سے بھی۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہر ایک وقت سب سے مخاطب ہوں۔ اس کی توضیح کی مضامین میں مختصراً یوں عرض کرتا ہوں۔ باقاعدہ حد بندی نہ ہونے کی وجہ سے معمولی رائے زنی، تبصرہ نویسی، تشریح اور پرکھ، اصول سازی، ساری باتیں تنقید ہی کے دائرے میں آجاتی ہیں اس لیے گفتگو کی سطح ہر جگہ یکساں سیدھی سادی وقتی رائے زنی تاثراتی ہوتی ہے، تبصرہ میں قاری کو کسی کتاب سے روشناس کرانا مقصد ہوتا ہے ادیب سے بھی مخاطب ہو جاتا ہے، تشریح صرف قاری کے لیے ہوتی ہے۔ شعر و ادب کی اہمیت، تخلیقی عمل کو اور ہیئت کے رشتہ، ادبی حسن و قبح کے پرکھ کے اصول، فنون لطیفہ کے باہمی ربط، ادب اور انسانی تہذیب کے با[ہمی] تذکرہ کرتے وقت زیادہ تر ادب کے فلسفی اور نقاد نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں۔ اس پردے میں ادیبوں اور [...] بھی باتیں ہو جاتی ہیں۔ عام قاری سے گفتگو کی سطح دوسری ہوتی ہے۔

اختر بستوی

نئے لکھنے والوں کے بارے میں احتشام صاحب کا رویّہ

مرحوم سید احتشام حسین دورِ حاضر کے نقادوں کی پہلی صف کے ایک فرد تھے لیکن جب ہم اردو کے آجکل کے دوسرے بلند پایہ ناقدین سے ان کا موازنہ کرتے ہیں تو انھیں سب سے مختلف پاتے ہیں۔ رجحان و رویے کے اعتبار سے بھی وہ تمام موجودہ نامور نقادوں کی صف میں بالکل ہی منفرد تھے اور عادات و خصائل کے لحاظ سے بھی اُن میں اور اُردو کے دیگر اعلیٰ مرتبت ناقدین میں بہت زیادہ فرق تھا خاص طور پر یہ فرق ہمیں اُس وقت بہت ہی نمایاں طور سے محسوس ہوتا ہے جب ہماری توجہ اس امر کی طرف مبذول ہوتی ہے کہ نئے لکھنے والوں کے بارے میں ایک بڑے نقاد کا کیا رویہ ہونا چاہیئے۔

آجکل اردو کے جتنے بھی اعلیٰ مقام ناقدین ہیں اُن سب کا حال یہ ہے کہ وہ نوجوان اہل قلم کو کسی طرح بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ کسی پان فروش یا برف بیچنے والے کے ساتھ بھی نرمی اور ملاطفت سے پیش آسکتے ہیں۔ لیکن کوئی نیا ادیب یا نو عمر شاعر اُن کی طرف سے رسمی اخلاق کی بھی توقع نہیں رکھ سکتا۔ اُن کی یہ بات ذاتی تعلقات اور نجی معاملات ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اپنی تحریروں میں بھی وہ افقِ ادب پر اُبھرنے والے نئے تاروں کو بالکل ہی نظر انداز کر دینے کے عادی ہیں۔ بیشتر تو ان کی نگارشات میں اکبر و اقبال کی نسل تک کے لکھنے والوں ہی کے تذکرے ہوا کرتے ہیں اور کبھی کبھی جب وہ اس سے آگے بھی بڑھتے ہیں تو بس جوش و فیض کی نسل تک آنے کی زحمت گوارہ کر لیتے ہیں۔ گذشتہ آٹھ دس برسوں میں کون کون سے لکھنے والے سامنے آئے ہیں اس کی انھیں نہ تو خبر ہی ہوتی ہے اور نہ اس قسم کے قلمکاروں کی تخلیقات کا جائزہ لینے کی وہ کوئی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔ کسی نئے اہل قلم کی اہم سے اہم تخلیق یا تصنیف پر قلم اُٹھانا تو وہ گویا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف احتشام حسین صاحب کا اس سلسلے میں جو کچھ رویہ تھا اُسے میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

احتشام صاحب انتہائی خلیق، منکسر المزاج اور بامروت انسان تھے۔ وہ ہر کس و ناکس سے بہت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ملا کرتے تھے خصوصًا نوجوان اہل قلم سے ملتے وقت ان کا حُسنِ اخلاق بہت زیادہ نکھرا ہوا ہوتا تھا۔ میں نے متعدد نوخیز قلمکاروں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ پروفیسر احتشام حسین سے مل کر انھیں روحانی مسرت حاصل ہوئی اور ان کے حوصلوں میں توانائی آگئی۔ لیکن محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے میں نے یہ رائے نہیں قائم کی ہے بلکہ میرے ذاتی تجربات بھی اس کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ میں نہ تو احتشام صاحب کا عزیز تھا نہ رشتے دار، نہ دوست تھا نہ ہم مشرب، نہ روز کا ملنے جلنے والا تھا اور نہ اُن کا پڑھایا ہوا طالب علم۔ بیس سال میں دو ایک بار جب کبھی لکھنؤ یا الٰہ آباد، جہاں کی یونیورسٹیوں میں انھوں نے تدریسی فرائض انجام دیے، جانا ہوتا تھا اور وہ وہاں موجود ہوتے تھے تو تھوڑی دیر کی ملاقات ہو جایا کرتی تھی، یا کسی ادبی جلسے میں مل گئے تو وہاں

شرفِ نیاز حاصل ہو جاتا تھا۔ لیکن ہر بار اُن سے مل کر میں نے ان کی شرافت، وضعداری اور شفقت سے جو خوشگوار اثرات قبول کیے اُن کے نقوش میرے دل و دماغ سے کبھی مٹ نہیں سکتے۔ مرحوم جب اپنے سے چھوٹوں سے ملا کرتے تھے تو اس بات کی خاص طور پر کوشش کرتے تھے کہ ان کے بڑے پن کی وجہ سے ملنے والے پر کسی قسم کا احساسِ مرعوبیت نہ طاری ہونے پائے۔ یہی سبب تھا کہ اس طرح کی ملاقاتوں کے وقت وہ دوسرے بڑے نقادوں کی طرح اپنی شخصیت کے اردگرد ایک مخصوص قسم کے مصنوعی وقار کا حصار بنا لینے کے عادی نہیں تھے۔ اس کی مثال پیش کرنے کے لیے میں مرحوم سے اپنی آخری ملاقات کا حال بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں ــــ احتشام صاحب کی وفات سے کم و بیش تین ماہ پہلے میں اُن سے ملنے کے لیے الہ آباد ان کے مکان واقع نور اللہ روڈ پر گیا تھا اور یہی بدقسمتی سے میری اُن سے آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ جب میں نے ایک لڑکے کی زبانی اپنے آنے کی اطلاع اندر بھجوائی تو بیرونی نشست گاہ کا دروازہ مرحوم نے خود اپنے ہاتھوں سے کھولتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ اُس وقت اُن کا حلیہ یہ تھا کہ وہ ایک جانگیہ پہنے ہوئے تھے اور کاندھے پر ایک تولیہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کے پورے جسم پر کوئی اور لباس نہ تھا۔ مجھے اندر بلا کر بٹھاتے ہوئے انھوں نے فرمایا "معاف کیجیے گا اختر صاحب! میرے لیے غسل کا پانی رکھا جا چکا تھا اور میں بس غسل خانے میں داخل ہی ہونے والا تھا کہ آپ کی آمد کی اطلاع ملی۔ میں نے سوچا کہ آپ سے بیٹھنے کے لیے کہہ کر غسل خانے کی اجازت چاہ لوں۔" احتشام کی زبان سے یہ جملے سن کر مجھے شدید ندامت کا احساس ہوا اور میں نے خفیف سے لہجے میں عرض کیا: "آپ نے مجھے بے حد شرمندہ کیا۔ آپ غسل فرمانے کے بعد تشریف لاتے۔ میں باہر ہی انتظار کر لیتا۔" انھوں نے فرمایا: "بھئی اس میں ایسی کوئی خاص بات ہو گئی۔ میں اسے بہتر نہیں سمجھا کہ آپ باہر کھڑے رہیں ــــ خیر ــــ اب میں ذرا غسل کر آؤں ــــ بس دس منٹ میں آ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر موصوف اندر چلے گئے، اور پھر دس منٹ سے پہلے ہی پہلے نہا دھو کر جب واپس تشریف لائے تو ساتھ ہی ساتھ چائے بھی آ گئی۔ اس کے بعد تقریباً تین گھنٹے تک مجھ سے بڑی ہی مشفقانہ گفتگو کرتے رہے۔

نئے لکھنے والوں کے ساتھ احتشام صاحب کا حسنِ اخلاص محض ظاہری شفقت اور نرمیٔ گفتار تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس میں سچا خلوص بھی ہوتا تھا تو وہ اس کے کام کے لیے بھرپور کوشش کیا کرتے تھے۔ چند سال قبل کی بات ہے کہ میرے ایک نوجوان شاعر دوست اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے لیے کافی فکرمند تھے۔ میں اُنھیں ساتھ لیکر الہ آباد گیا اور مرحوم سے مل کر ان کی پریشانی بیان کی۔ انھوں نے مجموعے کا مسودہ رکھ لیا اور لکھنؤ کے ایک مشہور پبلشر کا نام لیکر فرمایا کہ وہ اُس روز لکھنؤ جائیں گے اور وہاں اس کی اشاعت کا معاملہ طے کرا دیں گے۔ اس طرح ہم لوگ الہ آباد سے کامیابی کی امید لیکر لوٹے۔ اس کے بعد اُس تاریخ کو میرے دوست نے اس خیال سے اصرار کر کے مجھے لکھنؤ بھیجا کہ کہیں احتشام صاحب بھول نہ جائیں۔ جب میں لکھنؤ میں موصوف کی قیام گاہ پر اُن سے ملا تو وہ حسبِ معمول مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور میرے ساتھ ہی پبلشر صاحب کے دولت خانے تک تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے میرے دوست کے مجموعۂ کلام کے مسودے کو خود اپنے ہاتھوں سے پبلشر صاحب کو دیتے ہوئے انتہائی پرزور الفاظ میں اس کی تعریف کی اور اسے چھاپ دینے کی سفارش فرمائی۔ کیا اس قسم کے برتاؤ کی توقع کوئی نوجوان شاعر یا ادیب اردو کے کسی دوسرے بلند پایہ نقاد سے بھی رکھ سکتا ہے؟

پروفیسر احتشام حسین مرحوم جس طرح اپنی زندگی کے ہر دور میں پابندی اور تسلسل کے ساتھ لکھتے رہے اسی طرح وہ ہمیشہ بہت زیادہ پڑھنے کے بھی عادی رہے۔ اردو کے تمام ادبی و نیم ادبی رسائل و جرائد ان کے زیرِ مطالعہ رہا کرتے تھے اور تمام نئے لکھنے والوں کی تخلیقات و نگارشات کو بغور پڑھ کر وہ الگ الگ ان میں سے ہر ایک کی رفتارِ ترقی پر نظر رکھا کرتے تھے۔ میں جب پہلی بار

ں اُن سے ملا تھا تو میری ادبی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے میری چند نظموں کے
ں کا حوالہ دیتے ہوئے میری شعر گوئی کی رفتار و سمت پر روشنی ڈالی تھی، جس سے مجھے ایک عجیب قسم کی مسرت آمیز حیرانی
تی۔ مرحوم کا یہ ایک ایسا وصف تھا جو اردو کے تمام مسلم الثبوت ناقدین کی صف میں صرف انھیں کی ذات تک محدود تھا۔
احتشام صاحب تحریری طور پر بھی نئے لکھنے والوں کو نظر انداز کرنے کے عادی نہیں تھے۔ ان کے بارے میں یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ
دیباچے لکھنے کے معاملے میں وہ بہت زیادہ غیر محتاط تھے اور جو بھی پرانا یا نیا ادیب یا شاعر ان کے پاس اپنی کسی تصنیف کا دیباچہ لکھوانے
جاتا تھا اُسے وہ مایوس نہیں کرتے تھے۔ ایسے حضرات جن کے نزدیک مرحوم کی یہ بات قابل اعتراض ہے اُن سے میں یہ پوچھنا چاہتا
ں سے خود مرحوم کی ادبی حیثیت پر کیا حرف آیا؟ یا اُن کی عظمت میں کیا کمی واقع ہوگئی؟ ان کی اس عادت سے نقصان کچھ بھی نہیں پہنچا،
یہ بہت بڑا ہوا کہ متعدد لکھنے والوں کے حوصلے بلند ہوئے ——— نوجوان اہل قلم کے بارے میں احتشام صاحب کی تحریریں محض
ں ہی تک محدود نہیں تھیں بلکہ جب بھی کسی نو عمر شاعر یا ادیب کی کوئی ایسی تخلیق منظر عام پر آتی تھی جو ادبی طور پر کسی خاص اہمیت کی حامل
ں پر الگ سے بھی قلم اُٹھایا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر میری طویل نظم "نغمۂ شب" جب کتابی صورت میں ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تو
نے فوراً ہی اس کے بارے میں تحریری طور پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا جس کی اشاعت ماہنامہ "شاہکار" میں (جو اُس زمانے میں الٰہ آباد سے
تا تھا) اسی سال ستمبر کے شمارے میں بطور تبصرہ ہوئی۔ تمام نئے لکھنے والوں کی اہم تخلیقات کے بارے میں مرحوم کا یہی رویہ زندگی بھر رہا۔
میں نے سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ دور میں اردو کے جتنے بھی اعلیٰ
قاد ہیں اُن سب میں نئے لکھنے والوں سے مشفقانہ و ہمدردانہ برتاؤ کرنے والے، اور زبانی و تحریری طور پر ان کے کاسن کا اعتراف
ی حوصلہ افزائی فرمانے والے شخص صرف مرحوم سید احتشام حسین ہی تھے اور موت کے ظالم ہاتھوں نے ان کم نصیبوں سے ان کے اس
ں کو بھی چھین لیا۔

ادب لطیف کے مدیر کے سوالات

اور

احتشام حسین کے جوابات

سوال: کیا آپ نے شعر یا افسانہ بھی لکھا ہے؟ اس کام کو چھوڑ کر تنقید لکھنے میں کیا مصلحت جانی؟

جواب: جی ہاں میں نے شعر اور افسانے بھی لکھے ہیں (افسانوں کا ایک مجموعہ دو تین بار چھپ بھی چکا ہے) تنقید کے علا[illegible] بعض اور اصناف سے بھی دلچسپی لی ہے۔ شعر اب بھی کسی کسی وقت کہہ لیتا ہوں۔ شاعری یا افسانہ نگاری چھوڑنے اور تنقید نگار[illegible] اختیار کرنے کا سوال نہیں، ممکن ہے پھر افسانے لکھوں یا شاعری کی رفتار تیز ہو جائے۔ ناول لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ شروع میں [illegible] ڈرامے بھی لکھے تھے، اب بھی کسی کسی وقت خواہش ہوتی ہے کہ کچھ ڈرامے لکھوں۔ تنقید کو خاص طور سے اپنانے کا سبب غالب[illegible] یہ ہوا کہ ۱۹۳۸ء میں جب یہ سارے کام بہ یک وقت جاری تھے ملازمت ملی یونیورسٹی میں پڑھانے کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھانے کے [illegible] کچھ زیادہ باقاعدگی سے پڑھنا پڑا، طالب علموں پر محض اپنی رائے مسلط کرنے کے بجائے انھیں دوسروں کے خیالات سے واقف [illegible] کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ بہت سی الٹی سیدھی، پسندیدہ اور ناپسندیدہ رایوں کو پرکھنا پڑا۔ اس کے لیے کچھ اصولوں کی تلا[illegible] شروع ہوئی۔ کسی طرح دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ادب کا مطالعہ مذہب، فلسفہ، نفسیات، تاریخ، سماجی علوم اور دوسرے فنو[illegible] کا مطالعہ کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح الجھنوں کا دائرہ وسیع ہو تا گیا۔ زندگی کی دوسری فکروں کے بعد جو وقت بچتا تھا وہ ا[illegible] ایک کام کے لیے کافی نہ ہوتا تھا۔ دوست احباب، اخبار اور رسائل بھی تنقیدی مضامین کا مطالبہ کرنے لگے اور آہستہ آہستہ طلب ورسد کا اصول کام کرنے لگا۔

آپ تنقید لکھنے کی مصلحت کو پوچھتے ہیں۔ مصلحت کیا ہو سکتی ہے! شاعری، افسانہ نگاری اور ناول نویسی میں شہرت جلد [illegible] ہوتی ہے، شاید مادی حیثیت سے بھی یہ سودا نفع بخش رہتا ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض حضرات افسانہ نگاری یا شاعر[illegible] معمولی صلاحیت رکھنے کے باوجود اسی لیے چمٹے رہتے ہیں، میں اس سے علاحدگی کیوں پسند کرتا! اپنا جائزہ لیتا ہوں تو کوئی نفسیاتی [illegible] بھی سامنے نہیں آتا۔ نہ تو اپنے مزاج کو تحکمانہ، اقتدار پسند اور ایذا رسانی کا شائق پاتا ہوں کہ تنقید لکھ کر کسی سے انتقام [illegible] کسی کو خوف زدہ کروں، کسی کو تکلیف پہونچاؤں تاکہ آسودگی حاصل ہو اور نہ تنقید نگاری کو شاعری اور افسانہ نگاری سے بلند تر [illegible] رکھتا ہوں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تنقید زیادہ لکھتا ہوں۔ میں اس خیال کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا ادیب نا[illegible] بن جاتا ہے۔ سب اپنا اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور اپنی حدوں کے اندر اہم کام انجام دیتے ہیں۔ تخلیق اور تنقید دونوں بقا [illegible] ارتقائے ادب کے دو رُخ ہیں۔

پروفیسر آغا سہیل

در بغل دارد کتاب

آئے دن کسی نہ کسی کی موت کی خبر آتی ہی رہتی ہے اور فوراً یقین بھی آجاتا ہے کہ مرنے والا سچ مچ مر گیا، لیکن احتشام حسین کے سانحۂ ارتحال کو دل قبول نہیں کرتا۔ خیر، دل اس خبر کو قبول کرنے پر آمادہ ہو یا نہ ہو، دل کو یقین ہو یا نہ ہو، اب تو جی کڑا کرکے یقین کرنا ہی پڑے گا کہ مرنے والا سچ مچ مر چکا ہے اور صرف افسانہ رہ گیا ہے۔

بات بہت پرانی ہے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے کہ احتشام حسین سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ کم و بیش ۲۴-۲۵ سال قبل کی بات ہے۔ غالباً ۱۹۴۸ء کا زمانہ تھا۔ "ادب اور سماج" کو چھپے ہوئے اور مقبولیت حاصل کئے کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کس طرح یہ کتاب مجھے ملی تھی اور کیونکر میں نے اس کے مضامین پڑھ ڈالے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں مجھے خود اپنا بھی اچھی طرح ہوش نہ تھا کہ ایسے فکر انگیز مضامین کی طرف متوجہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ افسانے پڑھ لیتا تھا اور وہ بھی پریم چند، کرشن چندر، منٹو اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے افسانے، سکّہ بند افسانہ نگاروں کے آگے بس آیت تھی، ہاں البتہ خود چند دو چار ٹوٹے پھوٹے افسانے لکھ کر چھپوا لیے تھے اور بزعم خویش خود کو یوں ادیب سمجھے بیٹھا تھا، جیسے ہلدی کی گرہ لے کر پنساری بن بیٹھتا ہے۔ تو گمان تھا کہ گویا ساری دنیا میں ہم ہلڑ مچا چکے ہیں۔ لہٰذا یہ پتہ لگانے کے لئے کہ آخر دیکھیں تو سہی کہ کسی نقاد نے اب تک ہمارا نوٹس لیا بھی تھا کہ نہیں۔ غالباً اسی جذبے کے ماتحت وہ کتاب ہتھے چڑھ گئی اور پڑھ ڈالی گئی۔ مذکورہ کتاب پڑھنے کے بعد میری فکری بلوغت کا آغاز ہوا اور میں ادب کی الف بے پڑھنے پر آمادہ ہوا اور اس کتاب کے مضامین کو بار بار سمجھ سمجھ کر پڑھا، چبا چبا کر ہضم کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس کے مصنف کے بارے میں ذہن نے ایک امیج بنانا شروع کیا کہ وہ شخص ایسا ہوگا کہ یوں لکھتا ہوگا، یوں چلتا ہوگا ــــــ اور اللہ جانے کہ زمین پر چلتا ہوگا کہ آسمان پر۔ خیر حسنِ اتفاق سے کتاب کے مصنف کے ایک لیکچر کا اعلان ہوا اور بصد اشتیاق میں وہاں پہنچا اور اپنے محبوب مصنف کو اسٹیج پر اسی طرح پر مغز تقریر کرتے ہوئے سنا، جس طرح کتاب کے بین السطور میں اس کی شخصیت ابھرتی تھی۔ ایک نرم و لطیف مگر رواں دواں ندی کی لہروں کے مانند خیالات موج در موج بہتے چلے جاتے تھے۔ جیسے کوئی اپنے ذہن نہاں خانے میں چھپا بیٹھا ہو اور بڑی روانی سے کوئی کتاب پڑھتا چلا جائے۔ ایک ایسی کتاب جو سمندر کے مانند بے کراں ہو اور سمندر سے خیالات و افکار کے دھارے ابل رہے ہوں۔ گویا سمندر بلوایا جا رہا ہو۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ادب اور سماج کا مصنف یہی ہے کہ علم کا ساگر ہے اور ساگر کا کوئی اور چھور نہیں۔

ہلدی کی گرہ رکھ کر پنساری بن بیٹھنے کا نشہ تو ادب اور سماج نے ہرن کر دیا اور ادب پڑھنے اور ذہنی تربیت و تہذیب کا چسکا احتشام حسین کی تقریر نے لگا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے جو آل احمد سرور کے مکان پر منعقد ہوتے تھے اور جہاں ایک

ایک جغادری ترقی پسند پہنچا تھا اور دانش و بینش کے موتی بکھیرتا تھا۔ وہاں ایک چودہ پندرہ سال کا منحنی اور نحیف الجثہ سا ج
محض احتشام حسین کی دل آویز ادبی شخصیت میں مسحور ہو کر پہنچنے لگا۔ اور علم کی پیاس بجھانے لگا۔

اس وقت لکھنؤ میں سنوبری کی لت میں ترقی پسندوں کا ایک بڑا طبقہ مبتلا تھا اور مختلف طریقوں سے ادب کی ٹھیکے داری
تھا۔ اور اس کے لئے مختلف پیرائے استعمال کرتا تھا۔ لیکن خود اپنے اعمال سے غیر مخلص ثابت ہو جاتا تھا۔ میں نے محرو
احتشام حسین اس مجہول اور بر خود غلط قسم کے طبقے سے بالکل الگ تھے۔ وہ ایک مخلص، ایمان دار اور راست باز ا
اور مارکسی فلسفۂ حیات کے طالب علم تھے۔ قطع نظر اس سے کہ مارکسی ادب یا مارکسی نقطۂ نظر سے تخلیق شدہ ادب بجا
ہے، یہ بات قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے جس ڈگر پر چلنا شروع کیا تھا۔ اسے وہ سچا اور صحیح راستہ سمجھتے تھے ا
سے اس پر ایمان رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر و تقریر ان کی سوچ اور فکر میں صداقت اور خلوص کے سوا کچھ نہیں۔
نام نہاد ترقی پسندوں کی سنوبری ناکام ہو جاتی تھی اور احتشام حسین کی سادگی اور پرکاری جادو جگاتی تھی۔ میں کیا نہ
وقت کی نئی پود کے اکثر نوخیز اور مبتدی، جو حقیقتاً طالب علم تھے اور بزعم خویش ادیب، احتشام حسین کے والہ و شیدا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس محل پر یہ ضرور بتا دیا جائے کہ باوجود اس ذہنی قربت کے میں اپنے محبوب نقاد سے ا
باقاعدہ متعارف نہیں ہوا تھا، یعنی یہ ساری محبت و مودّت، عقیدت و ارادت مخفی تھی، احتشام حسین کو قطعاً اس با
تھا کہ ان کے شیدائیوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو ہر اتوار کو پرانے لکھنؤ سے سائیکل پر تین چار میل کی مسافت طے کر کے
پسند مصنفین کے جلسوں میں محض انھیں دیکھنے اور انھیں سننے کے لیے پہونچتا ہے اور جب انھیں سنتا ہے تو گوش دل سے ان
بات کو گرہ میں باندھتا ہے۔ بہت جلد تعارف کی ایک صورت نکل آئی۔ آج سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے اور جس قدر ہنسی آ
قدر احتشام حسین کی شخصیت کی بلندی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک دوست نے کہا کہ فلاں فلاں کتاب پڑھ ڈالو، مذکورہ کتاب
ملی تو دوست سے کہا کہ تمھارے پاس ہو تو عاریتاً دے دو۔ اس نے معذرت کی اور کہا کہ خود اس نے بھی احتشام حسین صاحب
کتاب مستعار لے کر پڑھی تھی۔ اس دوست کو بخوبی یقین تھا کہ احتشام حسین صاحب مجھے نہیں جانتے۔ لہذا میں مذکورہ کتا
حاصل کرنے میں ناکام رہوں گا۔ لیکن خدا معلوم کیوں جس لمحے مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ مذکورہ کتاب احتشام صاحب کے
ہے۔ دل کو خود بخود یقین ہو گیا کہ میں اس کتاب کو ضرور حاصل کر لوں گا۔ یہ واقعہ جاڑے کی ایک یخ بستہ شام کا ہے کہ لو
مکانوں میں دبکے پڑے ہوں گے اور میں احتشام صاحب کے گھر گولہ گنج بارود خانے جا پہنچا، وہاں کسی ہم عمر لڑکے نے پوچھا کہ اح
کو تمھارا نام کیا بتایا جائے تو میں سٹپٹایا کہ بھلا وہ میرا نام کہاں جانتے ہوں گے۔ لہذا کہہ دیا کہ بھائی ان سے کہہ دو کہ ایک اجنبی
احتشام صاحب نہ صرف یہ کہ ڈرائنگ روم میں فوراً پہونچ گئے بلکہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب انھوں نے مجھے
سے مخاطب کر کے اس وقت آنے کا سبب معلوم کیا۔ میں نے مدعا بتایا، احتشام صاحب نے کہا کہ ہاں مطلوبہ کتاب
اور مستعار مل سکتی ہے۔ چنانچہ فوری اپنی لائبریری سے خود وہ کتاب لا کر مجھے دیدی۔ یہ سب کچھ چند لمحات میں ہو گیا
مجھے بار بار خود پر رشک آتا رہا کہ اپنے محبوب ادیب سے مخاطب ہوں اس کے در دولت پر موجود — ہوں وہ میرے اعتما
ہے۔ لیکن یہ معمہ سمجھ میں نہ آیا کہ یا اللہ احتشام صاحب بھلا مجھے کیونکر پہچانتے تھے کہ دیکھتے ہی میرے نام سے مجھے مخاط
صبر نہ ہو سکا اور یہ پوچھ ہی ڈالا:

"آپ کو میرا نام معلوم ہے۔؟"

"جی ہاں" انھوں نے جواب دیا "آپ سرورؔ صاحب کے یہاں پی ڈبلیو اے کے جلسوں میں آتے ہیں۔"
اب میری سمجھ میں آیا کہ جلسے میں شرکاء کے دستخط ہوتے ہیں رائے زنی ہوتی ہے اور روداد لکھی جاتی ہے، بہرحال پہلا نقطۂ اعتماد تھا جو میرے اور احتشام حسین صاحب کے مابین قائم ہوا۔ دوسرا موقع وہ تھا کہ مذکورہ بالا کتاب انھیں واپس کرنے گیا۔ گیا تو غالباً ازراہِ اخلاق یا بطور تالیف قلب گفتگو تو کرنا ہی تھی۔ لہٰذا انھوں نے پوچھا:
"آپ تو کچھ لکھتے لکھاتے بھی ہیں؟"
اعترافِ جرم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، لہٰذا مجرمانہ اقرار کیا تو حوصلہ افزائی کے طور پر فرمایا۔
"کبھی کبھی پی ڈبلیو اے کے جلسے میں آپ کو بھی کچھ نہ کچھ پڑھنا چاہیئے۔"
پھر میری دقت کو بھانپ کر خود ہی بولے: "میں خود اس کا انتظام کردوں گا۔"
انتظام ہوا، یعنی انھوں نے اس وقت کے پی۔ ڈبلیو اے کے سکریٹری سے میرے بارے میں کچھ کہا ہوگا دوسرے یا تیسرے ہفتے میں نے وہاں ایک افسانہ دھڑکتے دل کے ساتھ پڑھا، پہلا موقع تھا، آواز کانپ رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا اور ہونٹ خشک تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ تنقید کے ایسے زہریلے تیر برسائے گئے اور یارانِ طریقت نے وہ وہ انتقام لیے کہ بایدوشاید لیکن احتشام حسین نے خلاف توقع اس قدر حوصلہ افزائی کی اور ایسی رہنمائی کی کہ آئندہ کچھ اور لکھنے اور سنانے کا حوصلہ بندھا رہا۔ مجھے احساس ہے کہ احتشام صاحب کی داستان میری کتھا بنتی جا رہی ہے۔ ایک آدھ جگہ ایسا ضرور ہوگا، اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں کہ بغیر اس کے گفتگو کا سرا تلاش کرنا مشکل ہے۔ گزارش ہے کہ میں یہاں احتشام حسین کے بارے میں لمبی چوڑی باتیں نہیں کروں گا اور نہ مجھے کوئی ایسا دعویٰ ہے کہ جو خصوصیت مرحوم کو مجھ سے تھی وہ کسی سے نہ تھی۔ ان کو تمام شاگردوں سے ایک سی خصوصیت تھی۔ لیکن ان کے کردار کی اس عظمت کو ہر ایک محسوس کرتا تھا کہ یہ خصوصیت صرف اسی کی ذات کے لیے مختص ہے۔
وہ بڑی پہلودار شخصیت رکھتے تھے۔ لیکن ہر پہلو میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہوتی تھی وہ ان کا خلوص تھا۔ وہ ایک مخلص شاگرد، مشفق استاد، دیانت دار شوہر اور مہربان باپ تھے۔ اعظم گڑھ اور ماہل کے متعلق مجھے بہت کم علم ہے۔ لیکن ان کے ایک عزیز قریب دوست اعظم حسین اعظم مرحوم، لکھنؤ میں میرے ایک مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ وہ اکثر احتشام حسین صاحب کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے، علی عباس حسینی مرحوم اور شمیم کرہانی سے بھی احتشام حسین صاحب کے بارے میں جو معلومات اکٹھا ہوئیں، ان کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شریف النفس سعید اور ہونہار طالب علم رہے ہوں گے۔ خود احتشام حسین صاحب نے "اعجاز صاحب" کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے اس میں اپنی تعلیم کا الٰہ آباد میں آغاز ۱۹۳۱ء میں قرار دیا ہے۔ جب وہ انٹرمیڈیٹ کے لیے وہاں پہنچے تھے تو الٰہ آباد میں بقول ان کے وہ سہارا ختم ہو چکا تھا جس کے سبب وہ وہاں موجود تھے ۱۹۳۲ء میں اپنے دو بھائیوں (جن میں سبط حسن بھی شامل ہیں) کی معیت میں احتشام صاحب الٰہ آباد میں اعجاز صاحب سے متعارف ہوئے۔ یہ بجائے خود ایک الگ داستان ہے۔ مجھے یہاں پر یہ عرض کرنا ہے کہ اعظم گڑھ ماہل میں بھی ان کی اقتصادی حالت اچھی نہ ہوگی اور انھوں نے مصائب برداشت کر کے تعلیم حاصل کی ہوگی۔[1] ۱۹۱۲ء میں وہ پیدا ہوئے۔ یو۔ پی کے دوسرے قصبات کی طرح اعظم گڑھ بھی مفلوک الحالی کا شکار رہا ہوگا۔

---

[1] احتشام صاحب نے کسی جگہ لکھا ہے کہ عموماً اسکولوں کی عمر کا اندراج صحیح نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں اعظم گڑھ میونسپل بورڈ سے اپنی صحیح تاریخ پیدائش نکلوا رہا ہوں وہ تاریخ پیدائش ابتک معلوم نہیں ہوئی ہے جب تک اسکے باب میں علم نہ ہو جائے اسی تاریخ کو معتبر سمجھنا پڑے گا۔ (آغا سہیل)

جاگیردارانہ نظام اور انگریزی سامراج نے جو جو گل کھلائے تھے اس کے زخم اپنے دل پر احتشام صاحب نے بچپن ہی سے کھانا شروع کر دیئے ہوں گے اور اس جابرانہ نظام کے فرسودہ اقدارِ حیات پر غور کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ ان کے ذاتی مصائب و مشکلات کا محرکات و عوامل بھی یہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ الہ آباد جو نسبتاً ایک بڑا شہر تھا اور انگریزوں کے زیرِ انتظام اس وقت سے چلا آرہا ہے۔ جب سعادت علی خاں سے کڑے اور الہ آباد کا وسیع علاقہ انھوں نے ہتھیا لیا تھا لہذا یہاں زندگی کی رفتار میں کچھ تیزی بھی تھی اور سرکاری دفاتر یا دیگر نیم صنعتی اداروں کی موجودگی کے سبب اقتصادی آسودگی بھی، گنگا اور جمنا کے سنگم کے سبب مذہبی تہواروں کا اڈہ بھی اور تعلیمی مراکز کا یو۔پی کی حد تک بیت السلطنت بھی، اگرچہ صحیح کا بیت السلطنت لکھنؤ تھا، لیکن الہ آباد کئی لحاظ سے لکھنؤ پر تفوق رکھتا تھا، یہ بھی درست ہے کہ بعض لحاظ سے کہیں زیادہ تفوق لکھنؤ کو الہ آباد پر حاصل تھا، لیکن شمالی ہند میں یو۔پی کو اور یو۔پی میں الہ آباد کو انگریزوں کے زمانے میں امتیازی حیثیت حاصل رہی۔ شاہ عالم کے زمانے سے اس شہر کی اہمیت بڑھی، یوں تو لوگ قبل مسیح سے اور اشوک کے زمانے سے الہ آباد کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے تہذیبی اثرات کا کھوج لگایئے تو شاہ عالم اور اس سے بھی پہلے دارا کے وقت کے آثار ایسے ملتے ہیں۔ جن سے اسلامی تہذیب کے نشانات یہاں ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ تاہم انگریزوں نے سعادت علی خاں سے کڑے اور الہ آباد علاقہ سیاسی مصالح اور فوجی اہمیت کے نقطۂ نظر سے حاصل کیا تھا۔ اس لئے غالباً ۱۹۰۹ء سے اس شہر کی حیثیت اور اہمیت بڑھ گئی۔ مسلمان فقرا، اہل حرفہ، اہل علم، صنعت پیشہ اور دوسرے لوگ یہاں آآکر آباد ہونے لگے۔ بیسویں صدی کے ربع اول تک، تو اس شہر کو علم و ہنر کا مستقر مانا جا چکا تھا۔ لکھنؤ جیسا اوپر عرض کیا گیا یو۔پی کا پہلے بھی بیت السلطنت تھا اور آج بھی ہے۔ لیکن اس نے جن تہذیبی اثرات کو اپنے اندر سمویا تھا وہ جاگیردارانہ نظام کے کھینچے ہوئے نقوش تھے تو یہ نقوش بڑے گہرے تھے، مٹتے مٹتے بھی باقی رہے۔ یہ نقوش بڑے خوبصورت اور جاذب نظر تھے۔ لیکن ان کے تمام محرکات و عوامل سست رو اور مدھم تھے۔ الہ آباد کلکتے کی صنعتی زندگی سے براہ راست اثر پذیر ہو سکتا تھا۔ لہذا یہاں جاگیردارانہ نظام کے اثرات و ثمرات نقش بر آب ثابت ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی بیداری الہ آباد میں پہلے اور لکھنؤ میں بعد کو شروع ہوئی۔ احتشام صاحب سنہ ۱۹۳۱ء میں الہ آباد پہنچے اور پھر ایم۔اے اردو میں کرکے لکھنؤ یونیورسٹی میں بہ حیثیت لیکچرر ملازم ہو گئے۔ غالباً ۱۹۳۸ء سے لگاتار ۱۹۶۲ء تک وہ لکھنؤ میں رہے۔ ۱۹۷۱ء میں ایک دوست نے اطلاع دی کہ احتشام صاحب ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہونے کی تیاری کر رہے ہیں اور لکھنؤ میں زمین خرید لی ہے وہیں مکان بنانے کا ارادہ ہے اس کے بعد سوا جنگ میں ہمارے لیے پورا ہندوستان غرق ہو گیا، نہ ادھر کی خبر ادھر اور نہ ادھر کی ادھر والوں کو ہوئی اور ہم پر سے ایک موجِ خوں گزر گئی۔ بہت سے پیارے اعزا اللہ کو پیارے ہو گئے، نہ ادھر والے ادھر والوں سے تعزیت کر سکے۔ نہ ادھر والے ادھر والوں کو پرسہ دے سکے۔ افسوس احتشام صاحب لکھنؤ میں رہنے اور بسنے کی آرزو پوری نہ کر سکے اور الہ آباد ہی میں پیوندِ زمین ہوئے۔ لیکن مجھے یہاں عرض کرنے دیجئے کہ ان کی اصل زندگی اور اس کا نچوڑ لکھنؤ کے حصے میں آیا۔ یہی روداد ہے، جسے میں ایجاز کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اوپر جہاں میں نے لکھنؤ کے سلسلے میں احتشام صاحب کے بارے میں بات نا تمام چھوڑی تھی وہ یہ تھی کہ احتشام صاحب کو ۱۹۴۵ء میں میں نے دیکھا اور ان کی سرپرستی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے حلقے میں متعارف ہوا اس وقت کے احتشام حسین کا حلیہ من و عن میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ بمشکل ۳۵-۳۶ برس کے ہوں گے گندمی چمپئی رنگ، پانچ فٹ ۹ یا ۱۰ انچ کے قریب قد و قامت، خوب اونچی پیشانی۔ سیاہ بال کھڑی ہوئی نمایاں ناک، تنگ دہانہ، سرخ ہونٹ اور ہنستے ہوئے خوبصورت موتی سے چمکتے ہوئے دانت، البتہ سرخ و سپید رنگ میں کہیں کہیں چیچک کے داغ۔ یوں چمکتے جیسے اسٹیل لوہے کی تلوار کے جوہر، لکھنؤی کاٹ کا چوڑی مہری کا پائجامہ، شیروانی ٹوپی اور پاؤں میں پشاوری چپل، بڑی خوبصورت آنکھوں پر معمولی

بشرہ (غالباً) مائینس) کھنک دار باوقار اور شائستہ آواز، نرم لہجے اور رواں لفظوں، مگر ٹھہرے ہوئے انداز میں گفتگو کرتے تھے۔
صنع، نہ الجھن، اور نہ بیان میں رکاوٹ، نہ زبان میں ژولیدگی اور نہ کسی قسم کے نفسیاتی دباؤ کا چہرے پر اثر۔ احتشام صاحب
صاحب سے کبھی کبھار ایک آدھ بات ہو گئی تو ہو گئی ورنہ خاموشی سے جلسے میں شرکت کرتے، سنتے سناتے، رائے دیتے اور اپنی
تے، ہاں اگر کوئی کتابوں کی دوکان اتوار کو بھی کھلی ہوئی مل جاتی تو وہاں جاکر نئی کتابوں کے بارے میں ضرور تفحص ہوتا تھا۔
کے بارے میں اب تک مرنے سے دو سال قبل تک ان کی یہ حالت تھی کہ اگر اطلاع مل جاتی کہ یہاں پاکستان میں فلاں جگہ
وران تک پہنچنے کا امکان نہیں ہے تو ہم جیسے شاگردوں کو بے تکلفی سے لکھ دیتے اور کتاب پہنچ جاتی تو پہنچنے کی رسید مع
بھیجتے خواہ یہ تبصرہ دو سطروں ہی میں کیوں نہ ہو۔ غرض کہ کتاب اور نئی کتاب کی خوشبو ان کی روح کو تازگی بخشتی تھی۔ سچ
تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو چھپی ہوئی کتاب کی خوشبو کسی نئی نویلی دلہن کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو کی طرح ہوتی ہے جو بہر حال
نی طرف متوجہ ضرور کرتی ہے۔ ان میں نئی کتاب کے شوق کی بات محض اردو کی کتابوں کی حد تک نہ تھی۔ انگریزی، ہندی
کی کتابوں پر بھی وہ یوں ہی ٹوٹ کر گرتے تھے، ذاتی کتاب ہو تو اس کے حاشیوں پر شذرات اس قدر لکھتے کہ ایک
کتابچہ ہو جاتی ورنہ ہر کتاب کے ساتھ علاوہ کاپی پر شذرات ضرور لکھتے جاتے تھے۔ رات رات بھر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔
اری کے سبب آنکھیں سوجی رہتی تھی۔ پپوٹے خفیف سے متورم رہتے تھے۔ معدے میں غذا تحلیل نہیں ہوتی تھی اور
بارہ پندرہ سال سے اکثر پیچش کے موذی مرض میں مبتلا رہنے لگے تھے۔ لیکن صاحب چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر
"مجھے یقین ہے، گو اب تک کسی قسم کی کوئی اطلاع فراہم نہیں ہوئی کہ مرتے مرتے وہ ضرور پڑھتے رہے ہوں گے اور
ذہن ضرور کسی نہ کسی گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے کسی نئی کتاب کی باس ان کے طائر روح کو لے اڑی ہو۔
میں نے اکثر ان کے گھر پر دیکھا ہے کہ کوئی بچہ آکر گردن میں لپٹ گیا کان میں کوئی بات کہی احتشام صاحب نے ہولے سے
ہی چپکے سے جواب دیدیا، بچہ چلا گیا، کسی بچی نے آکر کچھ سرگوشی کی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اٹھنی کھینچی۔ بچی اور یہ جا وہ جا —
صاحب باتیں کرتے جاتے اور ساتھ ہی ساتھ بچوں کے مسائل بھی حل کرتے رہتے۔ اندر سے کوئی بزرگ فرماتے: "احتشام
دانی کا کپڑا نہیں آیا ہے" احتشام صاحب کہتے: "کل ضرور آجائے گا۔ محمود سے کہہ دیا ہے محمد میاں کو بھیج دیا ہے۔ ایک تو
تشام صاحب کثیر العیال کوئی آٹھ نو بچے اس پر ماشاء اللہ افراد خاندان کی گھر میں ریل پیل، میں نے احتشام صاحب کے گھر
نوں سے خالی نہیں دیکھا، لیکن حرف شکایت کیسا کبھی چہرے سے اضمحلال یا پژمردگی یا ناگواری کے آثار بھی ظاہر نہیں
بہت سے اہل خاندان کے بچے تو مستقل ان کے گھر پر رہتے اور پڑھتے تھے اور احتشام صاحب اپنے ہی بچوں کی طرح ان
ت بھی کرتے تھے اور سچ پوچھو اپنا ہی فرض سمجھ کر یہ کار خیر انجام دیتے تھے۔ ایک صاحب تو میرے ہی کلاس فیلو تھے ان پر
صاحب کے براہ راست جو جو احسانات تھے اسے میں کیا بیان کروں خود وہ صاحب جانتے ہوں گے یا ان کا دل جانتا ہوگا۔
نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کسی عزیز کی طبیعت ناساز ہے۔ گھر پر کوئی بچہ موجود نہیں ہے۔ احتشام صاحب سائیکل پر بیٹھ کر اسکی
ہیں۔ کسی عزیز کو لکھنؤ میڈیکل کالج میں جاکر داخل کرایا ہے، کوئی رہنے والا نہیں ملا معلوم ہوا کہ خود اسپتال میں رہ گئے
یلو زندگی میں انھیں اپنی اہلیہ سے بے حد لگاؤ تھا۔ سید سجاد ظہیر جب بھی اپنی بیگم رضیہ ظہیر کو لے کر احتشام صاحب کے
رضیہ آپا احتشام صاحب کی بیگم سے ملنے اندر ضرور جاتیں اور کافی دیر تک باہر نہ آتیں۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ احتشام
کی بیگم صاحبہ پردہ نشین تو ہیں لیکن کم آمیز نہیں۔ اس سے زیادہ ان خاتون کے بارے میں مجھے اور کوئی علم نہیں۔ احتشام

احتشام صاحب کے آخر وقت میں انھیں کے ساتھ آ رہے تھے۔ میرے یہاں آ جانے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ جس کی اطلاع احتشام صاحب نے مجھے ایک خط میں دی تھی۔ اپنے نجی معاملات کا کسی سے ہرگز ذکر نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ بچوں کی تعلیم کے باب میں بھی، جس سے انھیں بہت دلچسپی تھی، کوئی بات خود سے نہیں بتاتے تھے، پوچھو تو بس تھوڑا بہت مزید بتا دیتے تھے۔ مجھے ان کے بڑے بیٹے محمد میاں کی تعلیم سے دلچسپی تھی۔ چھوٹے بیٹے اقبال کی تعلیم کے بارے میں بھی کبھی کبھار لکھ کر یہاں سے پوچھ لیتا تھا۔ لیکن ایک آدھ بار یہ محسوس ہوا کہ ان بچوں کی تعلیم سے وہ مطمئن نہیں ہیں۔ لہٰذا میں نے عمداً اس موضوع سے اجتناب کرنا شروع کیا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں دھیرے دھیرے کیونکر ان سے قریب ہوتا گیا، حتیٰ کہ طالب علم کی حیثیت سے یونیورسٹی پہنچا، دو سال بی۔ اے میں اردو ادب کا طالب علم رہا۔ دو سال ایم۔ اے (اردو) کے انہی کے قدموں میں گزرے۔ لسانیات میں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے کی سوجھی تو دو سال تک احتشام صاحب نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے اور بالآخر میرے لاہور آ جانے پر تعلیم سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اس طرح میں شفیق استاد اور عظیم دوست کی محبت سے محروم ہو گیا۔

میں پھر عرض کروں گا کہ احتشام صاحب سے میری ملاقات انجمن ترقی پسند مصنفین سے شروع ہوئی تھی۔ سرور صاحب جب امین آباد میں رحمت اللہ روڈ پر آ کر رہے اور پی۔ ڈبلیو۔ اے بھی وہیں منتقل ہو گئی تو جلسے زیادہ اچھے ہونے لگے۔ کیونکہ امین آباد میں شہر کے نئے اور پرانے دونوں حصوں سے لوگ آ جاتے تھے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب سجاد ظہیر پاکستان کی جیل سے چھوٹ کر ہندوستان پہنچے اور لکھنؤ پی۔ ڈبلیو۔ اے نے ان کا سواگت کیا۔ سرور صاحب علی گڑھ کو پیارے ہو گئے اور لکھنؤ کی مانگ کا سیندور اجڑا تو پی۔ ڈبلیو۔ اے کا سہاگ احتشام صاحب سے ہو گیا۔ بارود خانہ گولہ گنج بھی مرجع خلائق بنا رہتا، جلسے ہوتے اور خوب دھما چوکڑی مچتی۔ سبط الحسن رضوی کے بعد حسن عابد سیکریٹری رہے، حسن عابد پاکستان آ گئے تو پی۔ ڈبلیو۔ اے میں دو طرح کے انتہا پسند عناصر میں چپقلش شروع ہو گیا۔ جس سے اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اس تصادم کے نتیجے میں انجمن کا شیرازہ ہی نہ بکھر جائے۔ بعض سیاسی حلقے اس بات کو ہوا دینا چاہتے تھے۔ لیکن احتشام صاحب کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی اور قرعۂ فال الیکشن کی صورت میں تین سال تک نام نکلتا رہا۔ اور انجمن کا بار گراں میں نے احتشام صاحب کی خوشنودی کے لیے اٹھایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ باوجود اعتراف کم مائیگی کے میری ذات دونوں حلقوں کے لئے قابل قبول تھی اور متنازعہ فیہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کے اوپر سے ایک انتشار کا خطرہ ٹل گیا، یہ محض احتشام صاحب کی دور اندیشی تھی۔ ظاہر ہے کہ میری جگہ کوئی اور اسی طرح غیر متنازعہ فیہ شخصیت کا حامل ہوتا تو غالباً قرعۂ فال اس کے نام نکلتا۔ مجھے اپنے بارے میں ہرگز کوئی خوش فہمی نہیں۔ مجھے احتشام صاحب کی فراست کا ذکر کرنا ہے کہ سیاسی آدمی نہ تھے لیکن سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ ہاں سیاست کے اوچھے اور سوقیانہ ہتھکنڈے استعمال کرنے سے انھیں عار تھا جو اکثر سیاسی حضرات کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔

احتشام صاحب نے امریکہ جانے سے پہلے کبھی مغربی لباس نہیں پہنا تھا یا اگر پہنا ہو گا تو مجھے اس کا علم نہیں۔ البتہ وہ ہر لباس میں بھی جاذب زیب اور پرکشش نظر آتے تھے۔ جاڑے میں گیبرڈین بک اینڈ یک اور دوسرے گرم کپڑوں کے نقرئی میں روٹ بال دیکھتے دیکھتے سفید ہو گئے تھے۔ اور اب کوئی دس بارہ سال پہلے جب آخری بار میں نے انھیں دیکھا تھا تو یہ محسوس ہوتا تھا روئی کا گالا رکھا ہوا ہے۔ پہلے عموماً سائیکل پر یونیورسٹی پہنچتے تھے۔ کچھ عرصہ سے سائیکل ترک کر دی تھی اور سائیکل رکشہ کو کرلیتے تھے۔ دانش محل، نسیم صاحب سے ملنے اور نئی کتابوں کی خوشبو سونگھنے کے لئے امین آباد پیدل جاتے تھے اور آنے شہر کے جدید اور قدیم حلقوں میں وہ یکساں مقبول تھے۔ نخاس میں کاظم ہوٹل کے حلقے کے شاعروں میں بھی ان کو احترام کی نگ

اورادلڈانڈیا کافی ہاؤس کے بیٹھنے والے حلقے بھی ان کے لئے عزت اور احترام کے جذبات رکھتے تھے۔ احتشام صاحب
ں میں شریک بھی ہوتے تھے اور اگر ضرورت پڑتی تو مجلس پڑھ بھی دیتے تھے۔ اور سوشلزم کے کسی بھی ادبی موضوع پر پرمغز
دیتے تھے، لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہوگی، لیکن مجھے معلوم ہے کہ ہر دو جگہ ان کا مقصد ایک ہی ہوتا اور اسی کے حصول
دستان رہتے تھے، وہ مقصد ہوتا تھا آفاقی سچائی کا دریافت کرنا۔

لکھنؤ کے دوران قیام کے آخری زمانے میں علی عباس حسینی اور علامہ اختر علی تلہری احتشام صاحب کے ہم محلہ بن گئے تھے اور انجمن
با بھی آجاتے تھے۔ حیات اللہ انصاری بھی سہ ماہی شستماہی انجمن کے جلسوں میں پہنچ جاتے تھے۔ م م نسیم جو جماعتِ اسلامی کے
ہیں انجمن کے جلسوں میں ضرور پہنچتے تھے۔ دوسری طرف سجاد ظہیر کے معتقدین کا بھی جم غفیر لگتا تھا ان سب گروہوں میں نظریاتی
موجود تھے لیکن کیا مجال کہ کبھی مجادلے یا دنگل کی نوبت آئی ہو۔ ہمیشہ احتشام صاحب کی ذات سے بحث میں میانہ روی قائم
ر بحث ومباحثے کے کچھ نہ کچھ مفید نتائج بھی برآمد ہو جاتے۔ احتشام صاحب چھوٹے بڑوں کے مابین حفظ مراتب بھی قائم
ن اختلاف رائے کی صورت میں اظہار رائے بہت ڈٹ کر شدومد سے کرتے۔

مجھے اصولاً کم از کم ان کی شخصیت کے تین پہلوؤں سے ضرور بحث کرنا چاہیے تھی۔ ایک تو ان کی شخصیت بحیثیت انسان کے
ے بحیثیت استاد کے، تیسرے ان کی وہ حیثیت جو بحیثیت نقاد کے قائم ہوئی ہے لیکن اس مختصر وقت میں چند پراگندہ
قلم برداشتہ لکھ لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ کام محققین اور ناقدین کے کرنے کا ہے۔ ان کی زندگی
پسر وقار عظیم کی تحریک اور پروفیسر حمید احمد خاں کی تشویق پر دانش گدہ پنجاب سے ایم۔ اے کا ایک مقالہ الیاس مرزا
راہی کی زندگی میں بمبئی یونیورسٹی سے اکبر رحمانی نے ان پر پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا، ان دونوں کی خدمت خود مرحوم کے
الامکان میں بجا لایا، لیکن سچ پوچھئے تو ؏

"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

بہت کچھ لکھنے کو پڑا ہے اور بہت کچھ کہنے کو موجود ہے آخر میں ان کے ایک مضمون بعنوان "میں کیوں لکھتا ہوں" سے۔ ایک
س ملاحظہ فرما لیجیے۔ مضمون ہذا" ذوق ادب اور شعور" کے ص۲۱ سے لیا گیا ہے اس سے چند باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

"میں نے پہلے شاعری کی دیوی کو پوجا، شعر سنے شعر پڑھے انھیں اپنی زندگی کا جز بنایا اور اگر اس سے تسلّی نہ ہوئی تو کچھ شعر کہے بھی، ان سب میں اکثر و بیشتر اپنی ذات ہی کے گرد جال بن سکا، زیادہ تر اشعار اور نظموں کی حیثیت سوانحی ہے۔ لیکن میں نے اپنے تجربات کو عام سماجی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ میں اس میں دوسروں کو بھی شریک کر سکوں، پھر افسانے لکھے وہ جیسے بھی ہیں میرے خیالِ ناقص میں زندگی کے بہت اہم مسائل کے ترجمان ہیں۔"

آگے چل کر یوں رقم طراز ہیں۔ —

"یہ تو نہیں کہتا کہ میرے افسانوں کا مجموعہ ویرانے بھی پڑھ لیجیے لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس کا دیباچہ دیکھ لیجیے تاکہ میری طرف سے اس سوال کا جواب ہو جائے کہ میں نے افسانے کیوں لکھے" —؟

ادب لطیف کے مدیر کے سوالات

اور

احتشام حسین کے جوابات

سوال: آپ کی تحریروں میں مغربی ادب کے حوالے کثرت سے کیوں آتے ہیں؟

جواب: یہ سوال شاید دوسرے نقادوں سے پوچھا جاسکتا ہو مجھ سے نہیں۔ میرے یہاں مغربی ادیبوں کے حوالے کم ہیں۔ یہ نہیں کہ مغربی ادیبوں یا نقادوں کو پڑھتا نہیں، میں نے اُن سے بہت استفادہ کیا ہے، ان کے علم و کمال سے مرعوب ہوں لیکن ان کی آواز بازگشت ہونے کے بجائے میں ان کے خیالوں کو اپنے خیالات میں سمونے کی کوشش کرتا ہوں، ان کے حوالے دے کر اپنے خیالوں کے جواز کی صورت نہیں پیدا کرتا۔ یہ اور ایسی دوسری غلط فہمیاں میرے متعلق اس لیے ہیں کہ بدقسمتی سے لوگ پڑھے بغیر رائے زنی کرتے ہیں۔ ایک آدھ جملے اِدھر اُدھر سے دیکھ کر یا سن کر آستینیں اُلٹ لیتے ہیں اور فتوے صادر کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا کہ احتشام صاحب نے روسی ادیبوں پر بہت لکھا ہے، دوسرے نے کہا سارے خیالات مارکس سے ماخوذ ہیں، تیسرے نے کہا بچارے کو ماضی کا شعور نہیں۔ چوتھے نے کہا اخلاق کے مفہوم سے واقف نہیں۔ پانچویں کا ارشاد ہے کہ انسانی اقدار کا خیال نہیں رکھتے، چھٹے نے فتویٰ دیا صرف ایک خاص گروہ کے ادیبوں کے متعلق لکھتے ہیں، ساتویں نے آواز بلند کی ادب کی اعلیٰ اور دائمی قدروں کا علم نہیں، آٹھویں نے فرمایا بہت کچھ جانتے ہیں لیکن ادب اور جمالیات سے ناواقف ہیں ــــــــ ان سب کی جستجو چند مفروضات میں ہے۔ علم سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح میرے متعلق یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ مغربی ادیبوں کے حوالے کثرت دیتا ہوں۔ اگر لوگ میری تحریریں پڑھ کر الزام لگائیں تو مجھے دکھ نہ ہو۔

یکم جنوری ۱۹۶۲ء

سید

احتشام حسین تاثر

م صاحب سے میرے مراسم کچھ بہت خصوصی نہ تھے۔ چند ملاقاتیں جن میں سے بعض سفر کی روداد اور بعض نشستوں کی ہنگامہ خیزی اور تشنہ اور بعض طویل اور سیر حاصل اور دو چار خطوط۔ تعلقات کی اس مختصر بضاعت کے پیش نظر ان کے متعلق میرا لکھنا نا سب ات سے جو دلی ارتباط تھا اس کی بنا پر کچھ لکھے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ احتشام صاحب کی شفقت کچھ اس انداز کی تھی کہ ن کے بعد یہ احساس ہونے لگا کہ ہمیں تو ان کا خصوصی قرب حاصل ہے مگر میرے ساتھ ان کا یہ برتاؤ خصوصی نہ تھا یہ تو انداز تھا، ان کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک دلنواز پہلو۔ ان کے اسی پرخلوص برتاؤ کی بنا پر جو بھی ایک بار ملا کے قریب رافت طبع کا قائل ہو گیا۔ میرے اس قول کی صداقت پر ان کے لا تعداد سوگوار گواہ ہیں۔

می سن تمیز کو نہ پہنچا تھا۔ رفتہ رفتہ شعور کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ میرے دل میں باغیانہ رجحانات کے لیے احترام کا ہ لگا۔ احتشام صاحب کی ذات سے، جو اس تحریک کے سالار کارواں تھے، ایک جذباتی وابستگی پیدا ہو گئی اور میں ان کی ن و شوق سے پڑھتا رہا۔ ہائی اسکول پاس کرتے کرتے میں ان کے عالمانہ وقار سے واقف اور ان کے انداز نگارش کا گرویدہ

یلیمی زندگی کے آخری مراحل علی گڑھ میں طے ہوئے۔ —— علی گڑھ کی سب سے بڑی دین ایک قسم کی شائستگی و تہذیبی اقدار کی شناخت کی بصیرت عطا کرتی ہے۔ اسے آپ چاہیں تو علی گڑھ کی تہذیب کی علامت بھی قرار دے سکتے ہیں رچی ہوئی فضا اور نکھرے ہوئے ماحول نے میرے ذہن کی تربیت اور مزاج کی تہذیب میں بڑا حصہ لیا۔ علی گڑھ کے ہی تعلیمی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ ادبی مصروفیتوں، خصوصاً شعر و شاعری کا سلسلہ بھی کافی بڑھا اور رفتہ رفتہ میں خاصا یا۔

ڑھ چھوڑنے کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں میرا قیام بھوپال میں ہو گیا۔ احتشام صاحب سے میری پہلی تفصیلی ملاقات یہیں ہوئی۔ ان کے اخلاص و محبت نے ایسا نقش چھوڑا کہ اس کی انفرادیت ہنوز قائم ہے۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے مدتوں سے بہ سے واقف ہوں۔ ان کی گفتگو اعتماد پیدا کرنے والی اور حوصلہ بڑھانے والی تھی۔ بہت دیر تک گھر بار کی باتیں، اعزا و اقربا ، آئندہ زندگی کے منصوبے اور ادب کے مسائل موضوع گفتگو رہے۔ ان کا ٹھہرا ہوا لہجہ، چہرے پر پھیلا ہوا سنجیدہ تبسم اور وں چمک میرے تصور میں یوں تازہ ہے جیسے کل کی بات ہو۔

ام صاحب حفظ مراتب کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ بہ قول مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی "ایسی بزرگ داشت، ایسا انکسار،

ایسی لطافت طبع، ایسی سلامت روی، ایسی خوش گوار رواداری، بلکہ میں کہوں گا کہ ایسی بے نفسی اور مشرقی اخلاق کی جامعیت کہیں کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ چھوٹوں کا جیسا پاس و لحاظ احتشام صاحب کرتے تھے، ویسا میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ اکثر اوقات وہ محض لوگوں کی دل شکنی کے خیال سے ضدیں اور بسا اوقات ہٹ دھرمی بھی برداشت کر لیتے تھے۔ کتابوں پر دیباچے اور پیش لفظ جتنے احتشام صاحب نے لکھے ہیں، کم ہی لوگوں نے لکھے ہوں گے۔ یہی حال تبصروں کا تھا۔ راستی سے انحراف نہ کرتے ہوں وہ ہر ایک کا دل رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک بار خود میں نے ان سے ضد کی ہے اور کامیاب ہوا ہوں۔ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کی تقریبات ہو رہی تھیں۔ میرے وطن غازی پور کی صد سالہ جشن غالب کمیٹی نے غالب کے مستند حالات زندگی، تصنیفات کی فہرست مع تعارف، اور کلام کی اہم خصوصیات پر مشتمل ایک مضمون مختصر کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کی ترتیب و تصنیف کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی تھی۔ میرا دل چاہا کہ کتاب کا انتساب احتشام صاحب کے نام ہو کیونکہ ان کے فیضان کے اعتراف کی یہ ایک مناسب صورت تھی اور ان کو خراج تحسین پیش کرنے کا ذریعہ بھی۔ پہلے تو انھوں نے میری تجویز سے اختلاف کیا مگر میرے بلیغ اصرار پر راضی ہو گئے اور لکھا کہ "اگر آپ خلوص سے کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" یہ خلوص کیشی اور کرم نوازی کے ایسے نمونے اب کہاں ملیں گے!

احتشام صاحب تقریر اچھی ہی نہیں بہت اچھی کرتے تھے۔ مطالعہ تو وسیع تھا ہی، حافظہ بھی غضب کا تھا۔ پہلے سے تیاری کے بغیر اس بے تکلفی اور روانی سے بولتے تھے کہ کسی قسم کی تشنگی کا احساس کبھی نہ ہوتا تھا اور موضوع کا ہر گوشہ آئینہ ہو جاتا تھا۔ ان کا ذہن بہت صاف تھا۔ چونکہ جدلیاتی مادیت کے نظریۂ فکر کے ہم نوا تھے لہٰذا افکار و مسائل کا اسی روشنی میں تجزیہ کرنے کے عادی تھے۔ احتشام صاحب کی تقریری صلاحیت اپنے نقطۂ عروج پر اس وقت ہوتی تھی جب وہ کسی نشست کے اختتام پر صدر کی حیثیت سے مختلف مکتبۂ فکر سے متعلق لوگوں کے خیالات کو سمیٹ کر اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کر رہے ہوں۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ وہ حمیدیہ کالج بھوپال کی بزم ادب کا افتتاح کرنے آئے تھے۔ شب میں ممنون حسن خاں صاحب نے اپنے یہاں ایک مختصر نشست رکھ لی تھی۔ بزم ادب کی نشست میں فضل تابش نے جو غزل پڑھی تھی اس کا ایک شعر تھا:

انھیں یہ ضد کہ روایت کا احترام کروں　　　میں اپنی لاش کی بدبو سے بھاگتا پھرتا ہوں

اس نشست میں احتشام صاحب شاعری میں جدیدیت کے رجحانات پر تقریر کر رہے تھے۔ فضل تابش نے درمیان میں سوال اٹھایا کہ "جب پورا معاشرہ ایک سڑی ہوئی لاش کے مانند ہے تو فنکار کیسے اپنی آنکھیں بند کر سکتا ہے؟" سوال معرکے کا تھا کیونکہ احتشام صاحب جس مکتبہ فکر کے مبلغ تھے اس میں ادیب کے ماحول اور سماجی رشتے پر بڑا زور دیا جاتا ہے مگر انھوں نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا "درست ہے۔ پورا معاشرہ اگر سڑی ہوئی لاش کے مانند ہے تو آپ کا فرض کیا ہے؟ کیا آپ اس بدبو کا سبب معلوم کر کے اسے دور کرنے کی سعی کریں گے یا اسے کاندھے پر لیے پھریں گے اور اس کی بدبو اور گندگی کو عام کریں گے؟" اس جواب نے فضل تابش کو لاجواب کر دیا کیونکہ احتشام صاحب نے اپنی تحریروں میں ہر جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ ادیب کا یہ فریضہ ہے کہ وہ سماج کو بہتر بنانے کی جد و جہد میں حتی المقدور حصہ لے اور برائیوں کو دور کرنے کی کوشش میں ہاتھ بٹائے۔ اپنے نظریاتی عقائد کے سلسلہ میں احتشام صاحب نے زندگی بھر کبھی کمزوری نہیں دکھائی اور کسی قسم کی لچک کا اظہار نہیں کیا۔ جن رجحانات کو وہ غیر صحت مند اور غیر صالح سمجھتے تھے ان کے خلاف وہ برابر آواز اٹھاتے رہے۔ اس مسئلہ میں بھی انھوں نے نہ تو کبھی اشخاص کو گھسیٹا اور نہ ذاتیات کو درمیان میں لائے۔ وارث علوی صاحب کے مضامین کے بعض حصوں کی جانب لوگوں نے ان کو توجہ بھی دلائی کہ اس سے ان کی شخصیت پر ضرب پڑتی تھی مگر انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "کوئی حرج نہیں۔ کچھ نئی باتیں تو سامنے آرہی ہیں۔" یہ ان کا علوئے نفس تھا ورنہ لوگ تو اکثر اس سے بہت زیادہ معمولی باتوں پر مشتعل ہو جایا کرتے ہیں۔

بین کالج الہ آباد میں مشاعرہ تھا۔ مولوی جان محمد صاحب نے بڑے خلوص سے مدعو کیا تھا لیکن چونکہ مشاعرہ کے تیسرے ہی دن مجھے
یو، دہلی کے ایک انٹرویو میں شرکت کرنی تھی لہٰذا میں نے مولوی صاحب کو معذرت کا خط لکھ دیا۔ مولوی صاحب کو ہر قیمت پر
منظور تھی۔ انھوں نے میرے برادر خورد عزیزی سید حسین عباس عابدی سے رجوع کیا۔ چنانچہ دو ہی دن بعد ان کا خط ملا۔ انھوں نے
مولوی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں، آپ کی شرکت کی ذمہ داری مجھ پر ہے .... آپ شام کو یہاں سے روانہ ہو جائے گا، ڈائرکٹ
ع سات بجے دہلی پہنچا دے گی ......۔" انٹرویو گیارہ بجے سے تھا۔ مولوی صاحب کی گرویدگی اور حسین عباس کے وعدے کا پاس
رسکا اور مشاعرہ کی شام کو الہ آباد پہنچ گیا۔ مشاعرہ خاصہ رہا، نئے پرانے بہت سارے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ دوسرے دن
نے کے لیے اسٹیشن پہنچا تو پتہ چلا کہ مغل سرائے میں ریلوے ملازمین نے اسٹرائک کر دی ہے اور ادھر کی تمام ٹرینیں بند ہیں۔ میرا
منتشر ہو گیا۔ وقت اتنا تنگ تھا کہ دہلی پہنچنے کی اور کوئی صورت ممکن نہ تھی لہٰذا وہاں کا سفر کینسل ہو گیا۔ چونکہ وقت کافی تھا
دوستوں سے ملنے کا منصوبہ بنایا۔ دن کے دو بجے شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے بنگلہ پر ایک نشست رکھی تھی۔ وہیں ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب
کہ احتشام صاحب لکھنؤ سے واپس آگئے ہیں۔ نشست کے بعد میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ انھیں پورے واقعہ کا علم ہوا تو بیحد ناراض ہوئے
ہو مشاعرے میں شرکت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بھوپال ہی سے دہلی چلے جانا چاہئے تھا ...... اتنا اچھا موقع ضائع کر دیا ......"
شفقانہ ناراضگی میں جو انتہا شفقت تھی وہ اب بھی میرے حافظہ میں محفوظ ہے۔ کسی کا خلوص بھی وہ نقش نہ چھوڑ سکا جو اس شفقانہ
چھوڑا۔

تشام صاحب سے میری آخری ملاقات بڑا گاؤں (جونپور) میں ہوئی تھی۔ وہاں ۸ ربیع الاول کو اسیران کربلا کی یاد میں ایک بہت
باس حسینی صاحب (جاسوسی دنیا) کے اہتمام میں نکلتا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو میرے میزبان نسیم رضوی نے بتایا کہ پروفیسر احتشام
ئے ہیں۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کمال
سے گلے لگا لیا۔ دیر تک گھریلو اور ادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی کہنے لگے "آپ بہت دور چلے گئے ہیں، ادھر بھی کہیں
شش کیجئے۔"

ن بھر جلوس میں ان کا ساتھ رہا۔ سہ پہر کو ان کی تقریر تھی۔ مئی کا مہینہ، تپتا ہوا آسمان، سلگتی ہوئی زمین، بھرے ہوئے دل، چھلکتی
غم میں ڈوبے ہوئے انسانوں کا سیلاب — عجیب عالم تھا۔ احتشام صاحب مائک پر آئے تو پورا مجمع گوش بر آواز ہو گیا۔
بلا پر بولتے رہے اور اس تپتی دھوپ میں ہزاروں انسانوں کا سیلاب ایک دم ساکت تھا بلکہ ان کے ایک ایک لفظ کو اپنے
موتا رہا۔ نہ کسی کو تکان کا احساس تھا نہ دھوپ کی شدت کا خیال۔

لس ختم ہونے کے بعد پھر ایسے کچھ لمحات ملے جن میں احتشام صاحب سے نجی موضوعات پر گفتگو رہی۔ انھوں نے پوچھا "آپ نے
شعری مجموعہ کیوں نہیں شائع کرایا؟" میں نے کہا "اور تو کوئی بات نہیں ہے سوا اس کے کہ شعری مجموعوں کی اس بھیڑ بھاڑ میں اپنے
بانہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" وہ مسکرائے "بھائی اگر مشک میں آمیزش نہ ہو تو لوگ خود بخود اس کے وجود کو تسلیم کر لیتے ہیں
پ کی شاعری کو میں نے ایسا ہی پایا ہے۔" ان کے اس جملے نے حقیقتاً مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ آج بھی وہ میرے ذہن میں محفوظ
قدم بہ کرتا رہتا ہے۔

حالی کے بعد احتشام صاحب اردو کے سب سے بڑے نقاد تھے۔ انھوں نے تنقید کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ جدید اردو تنقید اور احتشام صاحب
نظریات ایک دوسرے کے ہم معنی بن گئے۔ یوں تو تنقید میں سوجھ بوجھ کی باتیں دوسروں نے بھی کی ہیں، دور کی کوڑیاں بھی لائے

مغربی ادب سے واقفیت بھی جا بجا نظر آتی ہے اور مشرقی ادب کے معیارات پر بھی بعض لوگوں کی نگاہ ہے مگر یہ تمام خصوصیات اگر کہیں مجتمع ہو گئی ہیں تو وہ احتشام صاحب کی تحریر ہے۔ احتشام صاحب ادب کے جدلیاتی نظریے کے ماننے والوں میں تھے۔ وہ فنکار کے سماجی اور تاریخی ماحول کے پس منظر میں ان محرکات کا جائزہ لیتے تھے جو فنکار کی فکر کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ سماجی حقیقت نگاری کے علمبردار تھے مگر فن کے جمالیاتی تقاضوں اور فنکار کے انفرادی میلانات کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ نظریاتی تنقید ہو یا عملی تنقید، وضاحت اور سلجھاپن ان کی تحریروں کی امتیازی شان ہے۔ موضوع کا معروضی تجزیہ اور انداز بیان کی صفائی کہ خیال کی تہیں ایک ایک کر کے کھلتی جاتی ہیں، احتشام صاحب کی تنقید کو تخلیق کا ہم پلہ بنا دیتی ہے۔ احتشام صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، فکر و نظر کی دولت دی، اور صحیح مناظر میں تخلیقی ادب کی تحسین و تنقید کا شعور پیدا کیا۔

احتشام صاحب کی صلاحیتیں صرف تنقید و تبصرہ تک محدود نہ تھیں۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور بہت خوشگوار ترنم سے شعر پڑھتے تھے۔ کم ہی لوگوں کو علم ہوگا کہ ان کا مجموعۂ کلام "پرواز"[1] شائع ہو چکا ہے۔ ان کی تصانیف میں افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شامل ہے۔ راک فیلر فاؤنڈیشن نے انھیں دو برسوں کے لیے بلایا تھا۔ امریکہ کے سفر کی روداد "ساحل اور سمندر" کے نام سے محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جرمن ادیب جان پیٹرسن کے ناول "ہماری سڑک" کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ لسانیات پر لکھے ہوئے ان کے مضامین اردو میں اس موضوع کا آغاز کرتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ انھوں نے شستہ اور معیاری ہندی میں اردو ادب کی تاریخ بھی تحریر کی ہے۔ ایک کثیر المشاغل شخصیت کے طویل ادبی سفر کی یہ چند جھلکیاں ہیں، اگر کبھی فرصت ملی تو ان پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

احتشام صاحب کا علم، متانت اور سنجیدگی، اخلاق اور مروت، شفقت اور ہمدردی، انکساری اور رواداری، شرافت اور وضعداری کا اب کہیں دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ موت کے سائے میں پلنے والے ہم خاکی انسان مرنے والے کا غم کیا منا سکتے ہیں۔ مگر افسوس اس کا ہے یہ متاع گرانمایہ قضا و قدر کے ہاتھوں بہت جلد چھن گئی۔ احتشام صاحب کی موت سے جو خلا پیدا ہے اس کا پر ہونا ممکن نہیں۔ تیزی سے مٹتی ہوئی ایک تہذیب کی علامت، وہ عہد ساز شخصیت اب ہمارے درمیان نہیں، ہم ان کی شخصیت کی دلنوازی، ان کی شفقت اور محبت سے محروم ہو گئے ہیں مگر ان کے افکار و کردار کے تابندہ نقوش ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔ ہم ان کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

THOU WERT THE MORNING STAR AMONG THE LIVING
ERE THY FAIR LIGHT HAD FLED
NOW HAVING DIED, THOU ART HESPERUS, GIVING
NEW SPLENDOUR TO THE DEAD

———— PLATO

---

[1] ایسا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ ادارہ

ان

پروفیسر احتشام حسین

ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے اور جب کبھی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو نہ صرف
ہوتی ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے زندگی کا کوئی نامعلوم گوشہ تابندہ ہوگیا ہو۔ پروفیسر احتشام حسین ایسی ہی ایک
ن سے ہر ملاقات میں ایک نئی روحانی مسرت اور دلی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ احتشام صاحب ایک ماہر زباں داں، عظیم نقاد
پرداز، ماہر تعلیم اور شفیق استاد تو تھے ہی مگر عام زندگی اور اس کے متعلقہ پہلوؤں میں وہ ایک ہمدرد اور پرخلوص دوست
ی مسئلہ ہو اس کا مناسب حل احتشام صاحب بہت جلد نکال دیتے تھے۔ نظریاتی طور پر ترقی پسند تھے مگر پھر بھی ایک خاص طبقے
یں تھے۔ سب مکتب خیال کے لوگوں کے لیے ان کے دل میں جگہ تھی اسی لیے وہ ہر نظریے کے ماننے والوں کے لیے محترم تھے۔
سعی خلیل جبران نے ایک بار کہا تھا " وہ شخص بہت قابل ہے جس کی خواہش اس کے خیالات کی طرح تیز ہو۔ ایسا شخص زمین
ن کا دماغ آسمان پر رہتا ہے اور موت سے پہلے ہی آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں" پروفیسر احتشام
کے مالک تھے۔ وہ ذہنی طور پر قطعی آزاد اور تیز تر تھے اور اردو زبان کے تو وہ پروفیسر ہی تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی دوسری
دب پر بھی موصوف کی وسیع نظر تھی۔ یقیناً موصوف کی موت سے نہ صرف اردو کو بلکہ دنیائے علم و ادب کو ناقابل تلافی نقصان
۔ احتشام صاحب ایسی ہی شخصیت تھے جس کے لیے کہا جا سکتا ہے:

ع: کبھی نہ چھپے گا ایسا سورج ہزار گردش کرے زمانہ

م صاحب نیشنل بک ٹرسٹ کی اردو پینل کے بھی ممبر تھے اس لیے موصوف سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ موصوف اتنے ہمدرد
ہر کام میں ان سے بے پناہ مدد ملتی تھی۔ دنیا میں شاید ہی کوئی آدمی ایسا ہوگا جس سے لوگ شاکی نہ ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ احتشام
یسی شخصیت تھے جس سے کسی کو بھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔
نقید اور احتشام لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید اردو تنقید میں جو بانکپن ہے وہ احتشام صاحب ہی کی دین ہے۔ تنقید
مضوع کو نہ صرف اپنے منفرد انداز تحریر میں بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا بلکہ اسے ایک مستقل فن کی حیثیت بھی دی۔ مغربی
سے براہ راست استفادہ کر کے اردو تنقید کو ایک خاص وقار عطا کیا۔ اردو ادب کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر احتشام
لم ہو۔ ادب و اخلاق ہو یا ادب و زندگی۔ ادبی تنقید کے مسائل ہوں یا تنقید اور عملی تنقید۔ ادب و تہذیب ہو یا فرقہ پرستی
دب کا مادی تصور ہو یا روایت اور بغاوت۔ افسانہ ہو یا ناول۔ ڈرامہ نگاری ہو یا شعر فہمی۔ احتشام صاحب نے سب ہی کا پہ
حق تنقید ادا کیا۔ بلاشبہ وہ ایک سماجی حقیقت نگار تھے اور ہر فن پارے کی تعبیر و تشریح جدلیاتی مادیت کے معیار سے کرنا

ضروری سمجھتے تھے:

عموماً ہوتا یہ ہے کہ اکثر لوگ بغیر سوچے سمجھے یا یہ سوچ کر کچھ بھی لکھ ڈالیں گے، قلم اٹھا لیتے ہیں لیکن احتشام صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کافی غور و فکر کے بغیر کچھ نہیں لکھتے تھے، اسی لیے ان کے مضامین میں ایک فلسفیانہ شعور ملتا ہے جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ادب کو زندگی کے لیے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ وہ انسان دوست تھے اور انسانیت کا عالم گیر احساس ان کے مضامین میں مکمل طور سے موجود ہے۔ انھوں نے روایت اور بغاوت کے دیباچے میں خود بھی لکھا ہے:

"جو شخص بھی میرے مضامین پڑھے گا اسے خود اندازہ ہوگا کہ میں انسانوں کی فلاح و بہبود اور اقتصادی انصاف کا ذکر کثرت اور خلوص کے ساتھ کرتا ہوں اور شاید ہی میرا کوئی مضمون ایسا ہو جس میں ان کا تذکرہ کسی نہ کسی پہلو سے نہ آتا ہو۔"

اپنی تنقید نگاری کے بارے میں احتشام صاحب نے تنقید اور عملی تنقید کے دیباچے میں لکھا ہے:

"تنقید نگاری کئی حیثیتوں سے سب سے مشکل اور ذمہ دارانہ صنفِ ادب ہے اور بعض اوقات اس ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اس میں نقاد کی محدود نگاہی اور جذباتی کمزوری کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ تاہم جہاں تک ہو سکتا ہے میں دیانتدار رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

یہ آخری جملہ کسی عظیم شخصیت کی زبان سے ہی ادا ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احتشام صاحب ایک ایسی آفاقی شخصیت تھے جس کا کسی خاص عہد سے ہی تعلق نہیں ہوتا اور جو قوم، طبقے اور نسل کے جذبات پر باطنی فتح حاصل کر لیتی ہے۔ احتشام صاحب جسمانی طور پر ضرور ہم میں نہیں رہے لیکن اپنی تحریروں میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے!

ت شکوہ کشمیری

احتشام حسین مارکسی مسلمان تھے

وقت کی تیز رفتاری کو کوئی مات نہیں دے سکتا۔ ۱۹۴۳ء کو تیس سال گزر گئے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ وہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ سین صاحب اپنی جوانی پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ گولہ گنج لکھنؤ میں جسٹس نصراللہ بیگ کی کوٹھی سے ملحق "بوائز اوِن اسکول" یک پرائیوٹ میڈل اسکول تھا۔ اس مدرسے میں ایک مشاعرہ اپنی بوریت کے منازل طے کر چکا تھا۔ نوسکھیے شعرا کی فہرست دم توڑ رہی نکار شعرا کی باری آنے ہی کو تھی۔ مثلاً آغا ذکی مرحوم۔ ارم مرحوم۔ بسمل مرحوم۔ سالک۔ شاداب اور نبیل وغیرہ بےچینی سے منتظر تھے کہ ام پکارا جائے تو جوہر دکھائیں۔

سامعین نوسکھیوں کی بھرمار سے سر کھجانے لگے تھے۔ شاید چھوٹی جوڑ کے لڑنیتوں کی فہرست کا آخری نام پکارا گیا۔ یہ کوئی شاہجہاں پوری ے انھوں نے آکر مطلع کا پہلا مصرع پڑھا۔ سامعین میں سے غالباً سید علی مہندی ننھن صاحب جو میرے پاس بیٹھے تھے برجستہ بولے "مصرع ں ہے"۔ بزم قہقہوں سے گونج گئی۔ شاعر نے جواب دیا "تو ناموزوں ہے" کسی کی آواز آئی "نکالو اس بیہودہ کو" شاعر نے اس سے واب دیا۔ اب کیا تھا محفل غیر سنجیدہ ہو گئی۔ شاعرے سے محفل ضلع جگت اور اس کے بعد مچھلی بازار بن گئی۔

احتشام صاحب کبھی شاعر کو منع کریں۔ کبھی سامعین کو خاموش کرنے کی کوشش کریں مگر کچھ بنائے نہ بنے۔ شاعر غزل سنائے بغیر تخت ے اترنے پر آمادہ ہے نہ ضبط سے اعتراض سننے پر راضی۔ سامعین ایک مصرع برداشت کرنے پر راضی نہیں۔ احتشام صاحب نے کہا "حضرات ساس ہے کہ آپ تھک گئے ہیں اس لیے مشاعرہ دس منٹ کے لیے موقوف کیا جاتا ہے کہ آپ حضرات چائے نوش فرمالیں۔"

اس حربے نے ہنگامے کو مفلوج کر دیا۔ چائے نوشی ختم ہوئی۔ احتشام صاحب نے ازسرنو آغاز مشاعرہ کرتے ہوئے کہا "حضرات مشاعرہ صرف ے وقت کاٹنے کے لیے نہیں ہوتا۔ یہ علم و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ ضبط و نظم کا گہوارہ بھی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جہاں چند پختہ کلام اپنا کلام سنائیں وہاں مبتدی حضرات بھی اپنا کلام پیش کر سکیں تاکہ ان کو اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کا موقع مل سکے۔ پھر سامعین کے مبتدی شعرا کارآمد ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کے بعد سامعین کو پختہ کار شعرا کے کلام میں مزید لطف آتا ہے۔ ساتھ ہی سامعین کا یہ روایتی حق ہے کہ کلام کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کر سکیں۔ اس کے خلاف احتجاج میں کسی شاعر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ غیر شاعرانہ الفاظ استعمال کرے۔ مین سے میری استدعا ہے کہ وہ اپنے اشاروں کو سلیقہ بنانے کی کوشش کریں۔" اور اس کے بعد پھر انھیں شاعر صاحب سے درخواست کی کلام پیش کریں۔ اس بار ان حضرت نے ایک دوسری غزل پڑھی جسے سامعین نے کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیا جس کے بعد پختہ کار شعرا آئے ور مشاعرہ ڈگر پر آگیا۔

احتشام صاحب لکھنؤ کی فضا میں اس وقت تک تقریباً نووارد تھے۔ اس حادثے کے بعد امکان تھا کہ وہ اس طرح کی محافل سے پرہیز

کرنے لگیں گر وہ اصلاح ادب کے مبلغ تھے اور کوئی بھی مبلغ یا مصلح اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ دھکے سہنے پر آمادہ نہ ہو۔

چند ماہ بعد مقبرہ گولہ گنج میں مشاعرہ منعقد ہونا طے پایا۔ میری تجویز پر مشاعرہ کمیٹی کے سکریٹری سید عسکری رضوی نے احتشام صاحب سے گزارش کی کہ وہ قبل مشاعرہ اپنا کوئی مقالہ پڑھیں۔ اس وقت تک مقالہ ایک محدود طبقے کے لیے مخصوص تھا۔ مشاعروں میں شرکت کرنے والوں کی اکثریت تو شاید اس نام سے بھی ناواقف تھی۔

مقبرے کا ہال تقریباً چار ہزار سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ احتشام صاحب نے "تاریخ مشاعرہ" پر ایک پر مغز پرچہ پیش کیا۔ مجھے یاد ہے کہ چار ہزار کا مجمع ہمہ تن گوش تھا۔ جعفر علی خاں اثر مرحوم۔ پروفیسر موسوی مرحوم۔ ڈاکٹر وحید مرزا۔ میرے استاد محترم نسیم قریشی۔ علی عباس حسینی مرحوم۔ بہزاد لکھنوی۔ سید آل رضا۔ مولانا حسرت موہانی مرحوم پنڈت آنند نرائن مُلّا اور ایسے تمام موجود باکمال حضرات کے چہروں سے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے احتشام صاحب کے ایک ایک لفظ کو تول رہے ہوں۔ اس مقالے کی کامیابی اور مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد سے کئی سال تک عام محافلِ مشاعرہ میں مقالات پڑھنے کا رواج سا ہو گیا تھا۔

یہ بات بھولنے والی نہیں کہ اردو ادب میں عموماً اور شاعری میں خصوصاً "ترقی پسندی" مزاج لکھنؤ پر گراں تھی۔ مگر احتشام صاحب انھیں کی قدامت پسند محفلوں میں اپنے جدید ترین نکتہ نگاہ کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ اہل لکھنؤ کے دل میں بھی ان کی بات گھر کرتی تھی۔

پیدائش تو دور کنار، ان کا بچپن اور زمانۂ تعلیم بھی لکھنؤ میں نہ گزرا تھا۔ وہ غالباً ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کی لکچرارشپ کی تقرری پر لکھنؤ آئے تھے مگر انھوں نے اپنے آپ کو لکھنوی وضع قطع میں جلد ڈھال لیا تھا۔

باوقار شائستہ چہرہ تو خاندانی ورثہ تھا۔ رنگ وروپ نے اس میں چار چاند لگا دیے تھے۔ نمایاں آنکھیں دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ موتی جیسے شفاف دانت ان کے نرم سا تبسم میں جاذبیت پیدا کرتے تھے۔ وسیع پیشانی ان کی ذہانت کا پرچم تھی۔ باوقار آواز ان کی خاندانی شرافت کا اعلان کرتی تھی اور یہ سب کچھ چوڑی مُہری کے لکھنوی کاٹ کے پائجامے، گلے تک بٹن بند شیروانی اور عموماً دوپلی ٹوپی انھیں لکھنؤ کا نمائندہ بنا دیتے تھے۔ یہی نہیں حلم و انکسار، خنداں پیشانی اور وضعداری جیسی خصوصیات نے ان کو مکمل طور پر ظاہری اور باطنی دونوں صورتوں سے لکھنوی بنا دیا تھا۔ وہ ہر شخص سے برابری سے پیش آتے تھے اور دوسروں سے بھی یہی توقع کرتے تھے۔

ممکن تھا کہ امریکی وظیفے پر امریکہ اور یورپ کی سیر کو جانے والے احتشام حسین واپسی پر کچھ مغرب نما دکھائی دیں۔ ممکن ہے کہ وظیفہ دینے والوں کا مقصد بھی یہ ہو کہ اس میزبانی کے ذریعے ان کے ذہن کو مغرب آلود کیا جائے یا کم از کم ان کے مارکسی انداز فکر کو ڈھیلا کیا جائے۔ مگر برخلاف اس کے ان کے سفر نے ان کے خیالات کو اور مضبوط کر دیا۔ وہ یورپ اور امریکہ کی رنگا رنگ زندگی میں اپنے آپ کو کھو نہیں آئے بلکہ انھوں نے ان رنگین پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی بدرنگیوں کو بھی جھانک کر دیکھا جس سے ان کے افکار کو اور جلا ملی۔ انھیں مغرب سے مارے باندھے کا کوئی بیر نہ تھا اس لیے اُس سماج میں جو خوبیاں پائیں ان کو بھی آکر بیان کیا۔

وہ مارکسی فکر کے نمائندے تھے مگر ان کی تحریر و تقریر تشدد پسندی سے بہت دور تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ادب صرف زبان کے چٹخارے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے قوم کا معیار معاشرت اور فکر سیاست بلند ہونی چاہیے۔ "ساحل و سمندر" میں انھوں نے لکھا ہے کہ "کسی ملک اور قوم کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اس کے سماجی نظام میں پیوست ہوتی ہیں۔"

احتشام صاحب کے لیے مقصدِ ادب ایک تھا۔ وہ یہ کہ اس کے ذریعے عام الناس میں ذہنی، سیاسی، سماجی، علمی اور معاشی بیداری ہو۔ وہ ان کے اشعار ہوں کہ افسانے یا تنقیدی جائزے ہر ایک میں یہ حقیقت روشن نظر آتی ہے کہ وہ سماج تک ایک پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ شعر و افسانے کے ذریعے صرف ذہنی تفریح پہنچانے کے قائل نہیں تھے بلکہ شاعر یا افسانہ نگار کے خیالات کو عملی تفسیر کے

تھے۔ وہ قائل تھے کہ شاعر یا افسانہ نگار کا واسطہ براہ راست عوام کے دلوں سے ہونا چاہیے چنانچہ پریم چند کے لیے وہ کہتے تھے کہ ان کا
ں صدی کے سماجی اور سیاسی شعور کا آئینہ دار ہے۔ ادیب اور عوام کے براہ راست رابطے کے تحت ان کا خیال تھا کہ نظیر اکبر آبادی
ے متعلق حیات کی فضاؤں میں دوڑنے والا شاعر تھا۔ وہ آتش کو بھی سراہتے تھے کہ اس کے کلام میں آزادی کی جدو جہد پائی جاتی ہے۔
لاش تھی کہ غالب میں نئے اقدار کی جستجو ہے جسے وہ بت شکنی کے پیغام کے ذریعے ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

وہ کسی ادیب کا کلام پڑھتے وقت اس کے ذہن کا ایکسرے کرتے تھے۔ خود کہتے ہیں کہ "میں جب ادب کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس میں انسان
ں۔ معاشی۔ تاریخی۔ سماجی۔ مذہبی سب ہی حالات کو لے لیتا ہوں تاکہ صحیح تصویریں بن سکے۔ میں نے اسی طریقے کو مفید پایا ہے اور اسی کی
ت کرتا رہا ہوں"۔ بالفاظ دیگر وہ ادب کو معاشی، سماجی اور سیاسی رجحانات کا ذریعہ سمجھتے تھے اور ادیب کو ایک سماجی مصلح سیاسی رہنما اور معاشی
ذر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عملی طور پر سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہوئے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے ایک سیاسی اور سماجی خاکہ پیش
ہے۔

۱۹۴۵ء میں جب احتشام صاحب نے دنیائے تنقید میں اپنی پہلی مطبوعہ تحریر "تنقیدی جائزے" کے ذریعے قدم رکھا تو اعلان کیا کہ "میں ادب
ں کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہرے اثرانداز ہوتے ہیں"۔

قدامت پرست فکر کی مخالفت ان کے قدموں کو ڈگمگا نہ سکی۔ اسی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے پھر نڈری سے اعلان کیا کہ
ت کے ساتھ ساتھ میرا یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تنقید کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن و توانائی کو سمجھنے اور اسے
نے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح عوام کا رشتہ عوامی جدوجہد کرنے والی طاقتوں سے مضبوط ہوتا ہے۔ زندگی ادب کو سنبھالتی ہے اور ادب
کو سہارا دے کر آگے بڑھاتا ہے۔ اچھے ادب کے مطالعے سے انسان کا سماجی شعور بڑھتا ہے اور وہ سماج کو بہتر بنانے اور فطرت کو اپنے
ں لانے کا اہل بن جاتا ہے۔ اگر کوئی ادبی کارنامہ یہ پورا نہیں کرتا۔ اس میں مدد نہیں دیتا۔ وہ صرف ان لوگوں کی نگاہ میں ادب ہوگا جو
ا کو بہتر بنانے کے متمنی نہیں ہیں"۔

اب ۱۹۴۵ء کے بعد سے مرحوم کے تمام تنقیدی مضامین لے لیجئے تو اس میں عنوان تنقید اس خاص اصول کا پابند ملے گا کہ ادب کو تلاقی
ی قید سے آزاد ہو کر میدان عمل کا شہسوار بننا چاہیے۔

احتشام صاحب میدان تنقید کے صرف بیباک شہسوار ہی نہ تھے بلکہ بے لاگ جج بھی تھے اور انھوں نے ہر فیصلہ انتہائی منصف مزاجی سے
ہے۔ اگر کسی مصنف یا شاعر کے چھلکے بھی ادھیڑے ہیں تو گہرائیوں میں پہنچ کر اس کی خوبیاں یا اس کے خیالات سے فوائد بھی تلاش کیے ہیں۔
ا ترقی پسندی کا کوئی جنون نہیں تھا مثلاً اکبر الٰہ آبادی جو عوام کا مقبول ترین شاعر ہے اور جسے ترقی پسند شعراء کی صف میں بھی لایا جاتا ہے
ان کا مضمون "اکبر کا ذہن" دیکھیے تو پتہ چلتا ہے ایک طرف تو اکبر کی کمزوریوں کو واضح کیا ہے کہ وہ عوام کو اپنے انداز فکر اور اپنی خواہشات
ند بنانا چاہتے تھے یا یہ کہ ان کا انداز فکر مختلف مواقع پر ایک دوسرے کے تضاد ہے دوسری طرف نہایت منصفی سے یہ بھی کہا کہ اکبر کی
ری ادب اور مقصد کے لیے ایک دلکش مثال ہے یا اکبر اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں منفرد ہیں یا یہ کہ اکبر کی شاعری آخری انیسویں اور
ع بیسویں صدی کو سمجھنے میں معین و مددگار ہوگی اور ان کا کلام مسلمان طبقے کی اس دور کی بیکسی کا ترجمان ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ
تنقید محض برائے تنقید نہیں کرتے تھے۔ وہ کسی شاعر کا کلام سامنے رکھ کر اس کے دور کے تاریخی۔ سیاسی۔ سماجی۔ معاشی اور مزاجی ماحول کو
کرنے کے بعد اس کے دماغ کی گہرائیوں میں گھس کر معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کسی سخن سے شاعر کا مقصد کیا تھا اور وہ مقصد اس دور کے سماج
لیے فائدہ مند تھا کہ نہیں اور آج اس سے فوائد کے امکانات ہیں کہ نقصانات کے۔

احتشام صاحب دنیائے ادب میں بردبار اور بھاری بھرکم ہونے کے باوجود نئی لکھنے والوں کو بہت سراہتے تھے اور انتہائی نرمی سے اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں میری پہلی ناول "گھر کے چراغ سے" شائع ہوئی تھی اس وقت میں عدن میں تھا۔ میں نے اپنے پبلشرز کو تحریر کیا کہ ایک جلد احتشام صاحب کو بھی نذر کر دیں۔ سنہ ۱۹۶۲ء کے آخر میں میں لکھنؤ واپس آیا۔ احتشام صاحب سے کتب خانہ دانش محل میں ملاقات ہو گئی۔ تھوڑی دیر گفتگو کے بعد میں نے ہمت کر کے پوچھا کہ "آپ نے میری کتاب پڑھی؟" وہ بولے "حضرت میں تو کتابیں خرید کر پڑھتا ہوں وہ کتاب کیوں نہ پڑھتا جو آپ نے براہ کرم نذر کی تھی" میں نے عرض کیا "آپ کو کیا کیا خامیاں ملیں؟" ہنس کر بولے "آپ کو میرے بارے میں بڑی غلط فہمی ہے۔ میں کتاب دشمن نہیں کہ ہر کتاب میں خامیاں ڈھونڈتا پھروں"۔ وہ یہ کہکر خاموش ہو گئے۔ میں نے پھر کہا "کچھ تو رائے دیجئے" وہ بولے۔ "جی۔ آپ کی کتاب اور اچھی ہوتی اگر آپ کو چھپوانے کی جلدی نہ ہوتی۔ جس معیار سے آپ نے شروع کی تھی۔ اس معیار کو آپ نے جلد بازی میں ختم کر دیا۔ اور ان کے ایک جملے نے میرے سامنے اپنی خامیوں کی فہرست رکھ دی۔

کسی بڑے انسان کے لیے یہ خصوصیت ضروری ہے کہ وہ جذباتی نہ ہو۔ یہ خصوصیت احتشام صاحب میں پائی جاتی تھی۔ وہ ہر دلعت سے بڑے پاک انداز میں ملتے تھے مگر اپنی خدائیت کے اظہار سے پرہیز کرتے تھے یہی رویہ اپنے مخالفین سے بھی تھا۔ وہ اپنے مخالف کا نہ رونا روتے تھے اور نہ ہی دوسرے کی زبان سے شکر ہمت افزائی کرتے تھے۔ وہ اکثر میدان ادب میں اپنے مخالفین کا جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے دوران ملازمت میں ایک گروہ ان کا مخالف تھا جس کی وجہ سے ان کو صدمہ بھی تھا مگر انھوں نے کبھی اس مخالفت یا اس کے تاثرات کو جذباتی نہیں بنایا۔ بلکہ اپنی ایک کتاب کا انتساب اپنے مخالف گروہ کے سردار کے نام کیا۔

شاید ان کے معتقدین اس حقیقت کے اظہار کو پسند نہ کریں کہ احتشام صاحب مارکسی انداز فکر کے نمائندے ہونے کے باوجود کمیونسٹ نہیں تھے۔ برخلاف اس کے وہ سچے مسلمان تھے۔ اللہ کے وجود اور اس کی عظمت میں ان کو یقین کامل تھا اور وہ مجالس ذکر حسین میں شرکت اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ ضرورت پڑنے پر وہ مجلس پڑھتے بھی تھے۔ یہ شاید اس لیے کہ وہ اس حقیقت کا اقرار کرتے تھے کہ یاد گار حسین انسان کے دل و دماغ میں آزادی کی جدوجہد کو دوبالا کرتی ہے اور اس کا صحیح راستہ بتاتی ہے۔ ہاں انھیں مارکسی مسلمان کہنا صحیح ہو گا۔

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اردو ادب میں تنقید کے ذریعہ سماجی اصلاح کے جس مشن کا سنگ بنیاد حالی نے رکھا تھا شبلی اور ان کے بعد مجنوں گورکھپوری اور ممتاز حسین نے جس کی دیواریں بلند کیں، احتشام حسین نے اس پر ایک مضبوط یادگاری قلعہ تعمیر کر دیا۔ احتشام حسین فانی تھے وہ نہ رہے مگر ادب کے لیے ان کا پیغام لافانی ہے جسے آنے والی نسلوں کو احتشام حسین ہمیشہ سناتے رہیں گے۔

ہ عسکری

”ابّا ـــــ گوشۂ یادداشت میں“

کبھی رفیق، کبھی رہنما، کبھی ہم راز، کبھی ہم سفر، کبھی ہم سخن اور کبھی صرف ایک شفیق باپ کی صورت۔ ہر ہر قدم پر ابّا سائے کی طرح میرے
ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ پہلی دسمبر کی اُس منحوس صبح کو بھی انتقال سے چند ساعت قبل تک وہ مجھ سے ہم کلام رہے۔ آخری مرتبہ ابّا
کو مجھ سے کی، وہ کچھ یوں تھی۔ ”بیٹے، عون آج کچھ دیر سے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس درد کی نوعیت
؟“ اور پھر میں نے ڈرتے ڈرتے فوراً اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔ ”ابّا! یہ بوجھ کہیں دل کے قریب تو نہیں ہے! آخر آپ باقاعدہ کسی
سے کوئی مشورہ کیوں نہیں لیتے؟“ میرے جملے میں شکایت کے ساتھ ہی احتجاج بھی شامل تھا! لیکن میں نے جملہ ختم بھی نہ کیا ہوگا کہ
آواز، شدتِ کرب کو چھپاتی ہوئی اور میری پریشانی کا جواز پیش کرتی ہوئی حسبِ عادت مجھے بہلاتی ہوئی فضا میں تحلیل ہوگئی!
”... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالباً گیس قلب کی جانب اٹھ رہی ہے، یہ ساری اُلجھن اسی وجہ سے معلوم ہوتی ہے“!
جواب سے تشفی تو کیا ہوتی، پھر بھی خیال ہوا کہ ممکن ہے اسی نوعیت کی کوئی تکلیف ہو۔ لیکن میں اور گھر کے سب افراد اُس وقت حواس
گھر کی دوسری جانب دوڑے جہاں ابّا شدید قلبی دورے میں پڑے ہوئے فرش پر تڑپ رہے تھے۔ یکایک میرے لاشعور میں چھپا ہوا
یقین میں بدل گیا، آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا! اس کے بعد ابّا کسی سے کوئی بات نہ کر سکے۔ ایک ڈاکٹر جو فوراً ہی بلائے
کو دیکھتے ہی آب دیدہ ہو گئے۔ میں نے اور دوسرے بھائی بہنوں نے صدہا آوازیں دے کر ابّا کو پھر سے ہوش میں لانا چاہا، لیکن
شی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی!

خاموشی ابّا کی فطرت میں ہمیشہ سے ایک نمایاں مقام کی حامل تھی۔ زیادہ بولنا اور بے محل ہنسنا ابّا کے اصولوں میں شامل نہ تھا۔ لیکن ایسا
تھا کہ اس قسم کے اصولوں کو برتنے کے لیے انھوں نے کوئی قسم کھائی تھی۔ کیوں کہ بعض مواقع پر ان اصولوں پر عمل پیرا رہنا ناممکن سا
۔ کبھی کبھی ابّا سے ملنے کی غرض سے بعض ایسے لوگ بھی تشریف لاتے، جو کئی کئی گھنٹے بیٹھے رہتے۔ عموماً یہ وہی لوگ ہوتے تھے جو بلا
ہوئے، ہر موضوع پر مسلسل بولتے رہتے ہیں۔ میں نے اُن لمحات میں ابّا کو دیکھا کہ وہ ان صاحبان کی دلجوئی کے لیے خود بھی جبراً باتیں
تے اور اُن لوگوں کے بے محل ہنستے رہنے پر وہ بھی اُن کا ساتھ دیتے رہتے۔ اکثر ابّا کو کوئی اہم مضمون تشنہ چھوڑ کر گھنٹوں بیٹھ
لیکن نہ تو کبھی انھوں نے ان صاحبان سے تنگیٔ وقت کا ہی گلا کیا اور نہ کبھی معذرت کی۔ بلکہ اُن لوگوں کے رخصت ہو جانے کے
درکار ہوتا اُسی میں تشنہ مضمون مکمل کرنے کی کوشش کرتے۔ ہاں اگر بربادیٔ وقت کی کوئی شکایت کرنی ہوتی، تو اس کا اظہار
نے۔ وہ تھکی ہوئی آواز میں مجھ سے کہتے۔ ”دیکھو! ان لوگوں نے تو اچھا خاصہ وقت ضائع کر دیا! ابھی تو مجھے بہت سے کام
!“ اس مختصر سے جملے میں بے پناہ انکسار و سادگی کے علاوہ، ایک ایسے بامروت شخص کا چہرہ ابھر کر سامنے آتا ہے جو خود پر

صعوبتیں برداشت کرنے کا عادی سا ہو گیا تھا جو ہزار ہا زخم چھپائے ہوئے، دوسروں کے دکھ درد کا مرہم تلاش کرتا رہا!

اپنی ذات کی طرف سے آبا نے ایک طرح سے بے رخی سی برتی۔ مثال کے طور پر اگر ہم آبا کے ذوق لباس ہی کا جائزہ لیں تو یہ واضح ہو جاتی ہے۔ امریکہ اور یورپ جانے سے قبل تک جن حضرات نے آبا کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ شیروانی اور پاجامہ پسندیدہ لباس میں شامل تھا۔ اس سے قبل شاید بہت کم انھوں نے پتلون اور بشرٹ زیب تن کیا ہوگا۔ ویسے بھی گرمیوں میں عام طور سے محض بشرٹ اور پتلون میں ملبوس، جیسے آبا خود کو کچھ زیادہ آرام میں محسوس کرتے تھے۔ بشرٹ بھی ایسی جو زیادہ شوخ رنگ کی نہ ہو اور سب سے بڑی بات سادہ ہو۔ اگر آبا کے پاس وقت نہ ہوتا اور بشرٹ کا کوئی بٹن ٹوٹا رہتا، تو وہ اسی بشرٹ کو پہنے ہوئے کسی جلسے یا میٹنگ میں چلا جانا معیوب نہیں تصور کرتے تھے۔ ہم لوگوں کے بے حد اصرار کے باوجود وہ لباس کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وقت کی تیز رفتاری کا احساس آبا کو ہر لمحہ شدت سے رہتا تھا۔ وہ ایک لمحہ بھی فضولیات کی نذر نہ ہونے دینا چاہتے تھے۔ یہی حال آبا کے کھانے کی پسند اور ناپسند کا۔ اس کا اندازہ تو ہم سبھوں کو ہو جاتا تھا کہ چُنے ہوئے دسترخوان پہ کون سی شے آبا کو زیادہ مرغوب تھی۔ لیکن اس بات کا پتہ بے حد دشوار امر تھا کہ کون سی چیز کبھی آبا کو بے مزہ لگی۔ کیونکہ بے مزہ چیز بھی وہ بغیر بُرا سا منہ بنائے ہوئے کھا جاتے تھے اور بڑی مشکل ہی سے اس کا فیصلہ کر سکتا تھا کہ بے مزہ چیز آبا کو مزے دار لگی تھی یا بے مزہ؟ شاید اس سادگی میں بھی یہ نظریہ کارفرما ہو کہ اپنی ذاتی پسند و ناپسند کو جبراً دوسروں پر کیوں تھوپا جائے!

آبا کے لکھنے پڑھنے کا انداز بھی ممکن ہے بہت سے دوسرے ادیبوں اور شاعروں سے مختلف رہا ہو۔ وہ بغیر کسی اہتمام کے لکھتے اور بے تحاشہ پڑھتے تھے۔ گھر میں بیٹھے ہوئے مہمانوں کے بچے چاہے چیخ چلا رہے ہوں، یا ہم لوگ حارج ہو رہے ہوں اور سوالات کر رہے ہوں، اگر آبا کسی مضمون کے لکھنے میں مشغول ہوتے اس وقت بھی قلم چلتا رہتا اور وہ ہم لوگوں کے سوالوں کے تشفی جوابات بھی ساتھ ہی ساتھ دیتے جاتے تھے۔ جیسے ان کے مطالعہ میں دنیا کی کوئی شے حارج نہیں ہو سکتی تھی۔ جس بستر پر لیٹ کر پڑھتے تھے، وہ نصف سے زیادہ کتابوں اور دوسرے کاغذات سے اٹا ہوتا تھا۔ اسی بستر پر ترچھے ہو کر آبا لکھتے پڑھتے تھے یا سے اونچا دھڑ کو سہارا دے کر وہ آسانی سے مقالے لکھتے تھے اور مطالعہ میں غرق رہتے تھے تا آنکہ کوئی ملنے والا اس وقت ہوتا اور آبا کے مطالعہ میں خلل انداز ہو جاتا۔ ایسے مواقع پر اگر مضمون لکھنا چھوڑ کر آبا کو اٹھنا پڑتا تو آبا کو جیسے یہ بات حد درجہ گراں گزرتی۔ وہ خاص طرح سے بُرا سا منہ بناتے، جس سے وہ حارج ہونے والے شخص کی آمد پر خاموشی سے احتجاج کرتے۔ آنے والا اگر کوئی صاحب ذوق ہوتا تو آبا کے چہرے پر جیسے مسرت کی ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ باذوق اور شائستہ حضرات ہمیشہ آبا کا چہرہ کھل اٹھتا تھا۔ یا اگر ملنے والا شخص کوئی ہم وطن، بچپن کا دوست، یا رشتے دار ہوتا تو آبا کی خوشی دونی۔ آنے والا دوست یا عزیز اگر ماضی کا کوئی قصہ چھیڑ دیتا، تو آبا کی آنکھوں میں غم و مسرت کے آنسو صاف چھلکتے ہوئے لگتے تھے۔ شاید ان لمحات میں کچھ دیر کے لیے ان کے ذہن سے شعر و ادب، تنقید و تبصرہ، لسانیات و فنونِ لطیفہ کوسوں دور چلا جاتا ہوگا۔

خوشی کا اظہار تو آبا کسی جھجک کے بغیر برملا کر دیتے تھے لیکن غم و غصہ، ناخوشگواری و بیزاری کا زہر وہ خاموشی کے ساتھ آخر تک پیتے رہے۔ اٹھتے ہوئے طوفانوں کو سینے میں دبائے رہے اور جذبات و خواہشات کا ایک سیل رواں بھی امن و سکون کی منزل کی جانب گامزن رہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے آبا تن و تنہا سماج میں پھیلی ہو ٹکر لینا چاہتے تھے۔ ناداری، بے روزگاری، افلاس اور تمام سیاہ کاریوں کے خلاف اگر ان کا بس چلتا تو وہ مقابلے

ابا جب کسی اچھی کتاب کا مطالعہ کرتے تو مجھ سے بھی اُس کتاب کی خوبیوں کا تذکرہ ضرور کرتے۔ اگر کوئی دلچسپ ناول ہوتا یا کوئی دوسری مزے دار کتاب ہوتی تو ابا مجھے بھی پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ میری ناکارہ نظموں اور غزلوں کو بھی وہ خاص توجہ سے پڑھتے اور مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔ میرے ساتھ تو اسی قسم کا رویہ محض چند برسوں سے تھا، جب سے مجھے شاعری سے کچھ ذوق پیدا ہوگیا تھا، لیکن برسوں سے ابا صاحبانِ ذوق وشوق کی پوری ایک نسل کے ساتھ یہ فرض انجام دیتے چلے آرہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ بعض بہت ہی غیر اہم ادبا و شعراء کے مجموعوں پر پیش لفظ لکھتے رہنا اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے رہنا، وہ اپنا اخلاقی فرض تصور کرتے تھے۔ غیر اہم شعراء و ادباء کی خوبیاں بیان کرنے کی جیسے تمام تر ذمہ داری ابا نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ گھر پر آئے ہوئے پریشان طلباء کی تمام دشواریوں کا واحد حل ابا تھے۔ طلبا بھی اس یقینِ کامل کے ساتھ اُن سے ملنے آتے تھے، گویا علمِ غیب سے انھیں یہ بشارت مل گئی ہو کہ عہدے اور قابلیت میں بڑا ہونے کے باوجود، اپنے چھوٹوں اور کم علموں سے وہ نہایت شفقت اور بے تکلفی سے پیش آتا ہے اور تشنہ لبی عالم کو کبھی مایوس نہیں لوٹنے دیتا۔ غرض مندوں کی حاجت روا کرنے میں جیسے ابا کو ایک روحانی سکون میسر ہوتا تھا۔

علم و ادب کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد بھی، دوسروں کے اوصاف بیان کرتے رہنا اور ان کی قابلیت اور وسیع معلومات کا تذکرہ کرتے رہنا ابا کی عادت میں شامل تھا۔ کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے ابا کو یہ احساس شدت سے رہا ہو کہ وہ جس اعزاز کے مستحق تھے، وہ انھیں نہیں ملا۔ کیوں کہ اُن کے ہم عصروں میں بھی بعض ایسے صاحبان کو بھی اعزازات و اکرام سے نوازا گیا، جو بہرحال اس کے مستحق نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ کبھی ابا نے مجھ سے یا کسی اور سے، اس قسم کی شکایت نہ کی تھی اور نہ ہی یہ محدود طرزِ فکر اُن کی تھی۔ انھوں نے تو اپنے سر جو اہم ذمہ داری لے رکھی تھی، زبان و ادب کی خدمت کی، شاید اُس نے اس کی مہلت نہ دی ہو کہ وہ انعام و اکرام کی فکر کرتے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچی کہ اعزازات سے وہ بچتے تھے۔ شاید ابا ہر اُس دکھاوٹی شئے سے دُور بھاگتے تھے، جس کا حاصل صفر ہوتا تھا۔ اُن کو کئی مرتبہ جموں، کشمیر یونی ورسٹی کی وائس چانسلری کے لیے دعوت دی گئی، شاید الٰہ آباد یونی ورسٹی کے لیے بھی، لیکن وہ بچ بچ کر نکل آئے! اس کی دلیل کے طور پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ الٰہ آباد یونی ورسٹی کے محض اعزازی لائبریرین بن جانے کے بعد سے وہ کچھ اُلجھے اُلجھے سے رہتے تھے، کچھ عجیب قسم کی ذہنی کوفت میں مبتلا رہتے تھے۔ شاید اس کا واحد سبب یہ تھا کہ ابا جتنا بھی زیادہ سے زیادہ مطالعہ کے لیے وقت چاہتے تھے وہ دوسری مصروفیات میں صرف ہوجاتا تھا۔ اور جس وقت وہ مجھ سے یہ کہتے — "بیٹے! بہت سا لکھنے پڑھنے کا وقت یوں ہی برباد ہوا جارہا ہے، میں ان جلسوں سے تو تنگ آگیا ہوں!" تو میرے سامنے ایک ایسے مخلص ادب پرور کا عکس نمایاں ہوتا جیسے ہر ایک لمحہ پرورشِ لوح و قلم کا شدت سے احساس ہو، لیکن وقت کا سیلِ رواں اُسے مہلت ہی نہ دیتا ہو کہ وہ جی بھر کے پڑھے اور ہنوز لکھتا پڑھتا رہے۔ اس کے باوجود، جب بھی ابا کو تھوڑا سا وقت مل جاتا وہ بغیر کسی چیز کا انتظار کیے، علم کے عمیق سمندر میں افکار و مسائل کے جواہراتِ بے بہا تلاش کرنا شروع کردیتے تھے۔

خطوط لکھنے میں ابا ہمیشہ پہل کرتے تھے۔ اعزا، رفقا اور دوسرے اقارب کی فکر، اُن کی خیریت دریافت کرنے میں وہ اس قدر سنجیدہ رہتے تھے کہ سخت حیرت ہوتی تھی۔ جب کسی عزیز یا رفیق کو خط لکھتے تو یہ تاکید بھی ضرور کردیتے تھے کہ "خط کا جواب جلد دیا کرو۔ ساتھ ہی اپنی خیریت سے بھی مطلع کرتے رہو، مجھے فکر رہتی ہے۔" بھلا اس دورِ خلفشار میں کون کس کا پرسانِ حال ہے، زیادہ تر لوگ اپنی غرض کے بندے ہوتے ہیں۔ ابا کو تو کبھی کبھی اُن لوگوں کی بھی فکر لاحق ہوجاتی تھی، اور وہ اُن کے خطوط کے بھیجنے سے منتظر رہتے، جو ابا کو عاجز کرکے پیش لفظ تو لکھوا لیتے تھے، لیکن اُس کے بعد خط کی رسید سے مطلع کرنے کی زحمت بھی نہ گوارا کرتے تھے!

گھر میں ابا بحیثیت ایک تیماردار کے بھی منفرد مقام رکھتے تھے۔ گھر کا کوئی بھی فرد اگر بیمار پڑ جاتا تو ابا کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی، اور وہ اُس کی تیمارداری کے فرائض اس خوبی سے انجام دیتے تھے جو ہم لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔ ابا کو مریض کی طرف سے کچھ ایسی فکر لاحق ہو جاتی کہ نصف شب میں بھی، جب سارا گھر سوتا رہتا اور مریض بھی خراٹے بھرتا رہتا، ابا جاگ کر اُس کی دیکھ بھال کرتے رہتے تھے۔ دوسروں کے دکھ درد میں اس درجہ پریشان و ملول ہو جانے والے ابا، اپنی خرابیٔ طبیعت کا علم کوشش کرتے کہ کسی کو نہ ہو سکے، کیوں کہ اپنی ذات سے کسی کو عاجز کرنا جیسے وہ گناہ کبیرہ تصور کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اپنی تکالیف اس قدر کم کر کے بیان کرتے کہ کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہوتا کہ اُس وقت وہ شدتِ کرب سے نڈھال تھے!

ابا جب کسی سفر سے واپس گھر لوٹتے تو ہم سب بھائی بہن اُنھیں گھیر کے بیٹھ جاتے تھے، کیونکہ سفر میں پیش آنے والے واقعات و حادثات، لطیفے اور نئے نئے تجربات ابا اس دلچسپی سے بیان فرماتے کہ ہم لوگ حیرتی آئینہ بنے تجسس و اشتیاق سے اپنی نگاہیں اُن کے چہرے پر گڑائے بیٹھے رہتے، رودادِ سفر ختم ہو جانے کے بعد تک!

مغرب کے سائنسی اور دوسرے علوم و فنون کی زبردست ترقی سے اس قدر متاثر ہونے کے باوجود، اپنی تنقیدوں میں مارکسی اور سائنٹفک نظریات کا حامل ہونے کے بعد بھی ابا مشرقی تہذیب و شرافت کا مجسم پیکر تھے۔ بلکہ میں تو اسے یوں سمجھتا ہوں کہ اپنے ذاتی اوصاف میں مشرقیت، اور اپنے نظریۂ تنقید میں مارکسی اور مادی نقطۂ نظر رکھنے کے سبب، وہ مشرق و مغرب کے مابین ایک ایسی کڑی کی صورت تھے جس کے دونوں سرے، دو متضاد خصوصیات کی حامل تہذیبوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے!

ابا کے مسکرانے میں مجھے ایک قسم کی لذت کا احساس ہوتا تھا، جس کا اظہار شاید ہی لفظوں کی بازیگری سے ہو سکے۔ وہ جب ہنستے تو سامنے کی صف کے دانت موتیوں جیسے چمکنے لگتے تھے اور میں ہر لحہ منتظر رہتا کہ ابا مسکرائیں تو اُن کے ذہن و قلب جیسے صاف و شفاف دانتوں کا میں نظارہ کر سکوں۔ اُن کے ہنسنے اور مسکرانے میں بھی ایک خاص قسم کا اعتدال تھا۔ لیکن ابا پر طاری رہنے والی ایک خاص قسم کی اُداسی اور غم کی فضا کو میں کبھی نہ سمجھ سکا! مجھے اکثر یہ خیال رہا کہ ممکن ہے بچپن میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے اور کسمپرسی کے عالم میں تعلیم حاصل کرنے سے اُسی زمانے سے اُن کا ایک خاص طرح کا مزاج بن گیا ہے۔ لیکن بعد میں دینی یہ دریافت مجھے خاصی ناقص سی محسوس ہونے لگی۔ ابا کی اُداسی، غالباً ان کی ذاتی زندگی میں پیش آنے والے بہت سے ناخوشگوار واقعات اور تجربات کی پیش خیمہ تھی۔ ابا بلا کے حساس تھے، مجھے اپنی خرابیٔ صحت کی فکر جس قدر کم رہتی تھی، اُتنا ہی زیادہ وہ میری طرف سے نڈھال سے رہتے تھے۔ اگر کسی وقت وہ مجھے خاموش و سنجیدہ دیکھتے تو فوراً اس کا سبب دریافت کرتے تھے اور جب تک یہ اطمینان نہ کر لیتے کہ میں رنجیدہ نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے کوئی خاص تکلیف ہے، اُس وقت تک اُنھیں تسلی نہیں ہوتی تھی۔

"ساحل اور سمندر" میں ویسے آپ نے خود ہی میری بہت سی اُلجھنوں کو کسی حد تک کم کر دیا ہے۔ لیکن بیس سال پہلے اپنی ذات اور اپنے احساسات پر سے اُٹھائے گئے پردے سے بہت سے سوال تشنہ رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ بعد کے بیس سالوں میں ابا کو بہت سے نئے اور تلخ تجربات سے سابقہ پڑا تھا یونی ورسٹی کے ایسے ماحول میں کئی برس گزارنے پڑے تھے جس میں بڑی گھٹن تھی بعض ایسے بدبختوں سے پالا پڑا تھا جو دورِ جدید کی پیداوار معلوم ہی نہ ہوتے تھے بلکہ دورِ جاہلیت کی یادگار معلوم ہوتے تھے۔ ابا روس کے چند دنوں کے دورے پر سے بہت زیادہ متاثر ہو کر واپس لوٹے تھے۔ اسی طرح کے نہ جانے کتنے اہم اور غیر اہم واقعات ان بیس برسوں میں، اُن کے ساتھ پیش آتے رہے۔ ان سب نے ضرور ابا کے خیالات میں تھوڑا بہت رد و بدل کیا ہوگا۔ کاش تبدیلیٔ احساس اور اپنے بارے میں اپنی ذات سے متعلق کوئی قطعی اور آخری رائے مجھے بھی معلوم ہو سکتی! ویسے "ساحل اور سمندر"

اپنے ذوقِ مطالعہ ومشاہدہ کے متعلق، اپنی شخصیت کے متعلق جو کچھ بھی ابّا نے اس آخری اقتباس میں کیا ہے، آخر تک وہ تقریباً
ے ہی تھے بھی۔ جن نظریات وافکار کو انھوں نے اس میں پیش کیا ہے، بنیادی طور پر یہی اُن کے اعتدال پسند مزاج کا آئینہ دار ہے۔
"خیر اس طویل اور تنہا سفر میں میں نے اگر کچھ اور نہیں سیکھا تو اتنا ہی سہی کہ میں نے احتشام حسین کو سمجھنے کی کوشش
...... عجیب انسان ہے۔ متضاد کیفیتوں کا حامل، حقیقتوں سے جدوجہد کرنے کا شائق اور خوابوں کے پیچھے مارا مارا پھرنے
اسے سمندر سے بھی محبت ہے، ساحل بھی عزیز ہے۔ وہ طوفانوں کی خواہش بھی رکھتا ہے اور سکون کا متمنی بھی ہے۔ ایسا
ں ہوتا ہے کہ اُس نے زندگی کے ساتھ بے وفائی برتی۔ اس کی وسعتوں میں سے صرف مطالعہ کو چُن لیا۔ مطالعہ کتنا ہی وسیع ہو
ا ہو سے اور زندگی کی جدوجہد میں شریک ہوکر تجربے حاصل کرنے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ سماجی جانور بننے کے لیے احمق، مجنون
ں بچہ بننے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ وہ ڈرتا رہا کہ کوئی ہنس نہ پڑے، کوئی کچھ کہہ نہ دے۔ یہ
ے سمٹی سہمی ہوئی محدود شخصیت کی نشانی ہے۔ تفریحوں اور لذت کوشیوں کے بہت سے در کھلے ہوئے دیکھ کر اُس نے کچھ کہا بھی تو
طرح جیسے اپنے گرد و پیش سے خوفزدہ ہو۔ جب لوگ دلچسپیوں میں مصروف ہوتے اور وہ پڑھتا، سمندر کی موجیں گنتا رہتا تو میرا
، چاہتا کہ میں کتاب اُس کے ہاتھ سے چھین لوں اور کہوں کہ یہ کھیل کود، یہ شراب نوشی، یہ رقص کے ہنگامے، یہ قمار بازی، یہ محض
سی کے لیے ہنسی، یہ صرف بات کے لیے بات محض حماقت تو نہیں، کچھ نہ کچھ لذت تو حاصل ہوتی ہی ہوگی ورنہ لوگ خوش کیوں
ں میں نے اس سے کہا بھی کہ یہ سنجیدگی بے محل ہے۔ اس طرح اپنے خول کے اندر رہنا بے معنی ہے۔ رقص، کھیل کود، بات چیت
، بہانے دل ملتے ہیں، جسم ملتے ہیں، تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی باتیں سُن کر اُسے کبھی کبھی منا بھی لایا۔ لیکن اُس کی اُداسی،
ں کے فلسفیانہ غم اور اس کے احساسِ تنہائی کو دور نہ کرسکا۔ یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ غالباً اُسے خود بھی اس کا
نہیں۔ شاید اس میں اتنی گہرائی اور پیچیدگی ہے جس کو وہ پا نہیں سکتا ......"

شارب ردولوی کے غزل پر سوال

اور

احتشام حسین کے جواب

سوال:۔ احتشام صاحب میں چاہتا ہوں کہ آپ سب سے پہلے اس بات پر روشنی ڈالیں کہ ادب کی موجودہ رفتار کے پیش نظر غزل کا مستقبل کیا ہے؟

جواب:۔ اس سوال کا مختصراً ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو صنف شاعری کا حشر ہوگا وہی غزل کا بھی ہوگا لیکن شاید یہ جواب ناکافی ہے اس لیے اس کی توضیح ضروری ہے۔ میرے خیال میں ساری دنیا میں نثر نے شاعری پر غلبہ پا لیا ہے اسی وجہ سے بعض لوگ اسے نثر کا دور کہنے لگے ہیں۔ ایسی صورت میں ان اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو شاعری کی ترقی یا ہر دلعزیزی میں مانع ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دور جدید کی شاعری انسان کی تہذیبی زندگی کا اس طرح جزو نہیں بن سکی ہے جیسے پہلے تھی۔ شاعری اس طرح نہ تو معلومات کا ذریعہ بنی ہے جیسے سائنس اور دوسرے علوم، نہ اتنی آسانی سے تفریحی مقصد پورا کرتی ہے۔ جیسے سینما اور دوسرے مشاغل۔ شعراء کی طرف سے یہ کوتاہی ہے کہ وہ عمومیت کے بجائے انفرادیت پر زیادہ زور دے رہے ہیں ان کی آواز میں اس زندگی اور تہذیب کی آواز نہیں ہے جو بہتوں کے لیے باعث تسکین ہے۔ اس وجہ سے شاعری اپنے بلند منصب سے کسی قدر ہٹ گئی ہے اس کا فکری عنصر تھوڑے سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے اور اس کا جذباتی عنصر اس سے بھی کم لوگوں کو۔

یہ تو ہوا عام شاعروں کا حال۔ اب غزل کی صورت یہ ہے کہ یہ صدیوں سے اردو بولنے اور لکھنے والوں کے مزاج سے ہم آہنگ رہی ہے اس نے خلوت و جلوت میں ان کا ساتھ دیا ہے، غم اور خوشی میں انھیں کام آئی ہے۔ اور محبت اور نفرت کے جذبات وہ اس کے ذریعے ظاہر کرتے رہے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عام انسان کے یہاں جو فکری اور جذباتی تسلسل کا فقدان پایا جاتا ہے، غزل اس کی آئینہ دار ہے وہ اپنے فارم کے لحاظ سے ہر جذبہ ہر کیفیت ہر موڑ اور ہر خیال کے بیان کی صلاحیت رکھتی ہے دنیا میں بہت کم انسان ایسے ہیں جو بہت دیر تک ایک مسئلہ پر مسلسل غور کرتے ہوں اور جب غور کرتے ہوں تو اس کا انداز منطقی اور فلسفیانہ ہو اور بہت کم لوگ ہیں۔ جو شدت جذبات کے کسی مخصوص لمحے پر دیر تک قائم رہتے ہوں۔ اس لیے غزل اظہار خیال و جذبات کے لیے بڑے مناسب پیکر کا کام دیتی ہے اس وجہ سے میرا خیال ہے کہ اگر شاعری انسانوں کے لیے آسودگی کا سامان فراہم کرتی رہی، ان کی جذباتی دنیا کی مصوری اس کا کام رہا اور وہ عام واردات قلبی اور ذہنی کے اظہار کا فن بنی رہی تو غزل اس میں سب سے پہلی جگہ رکھے گی۔

اکٹر سید مجاہد حسین حسینی

احتشام صاحب کی باتیں

وقت کتنا گریزپا ہے ——— کتنا برق رفتار! آج کو، کل بنتے کچھ دیر ہی نہیں لگتی۔ پلک جھپکی اور دنیا بدل گئی۔ ابھی کل کی ت ہے کہ ہمارے محبوب ادیب، ہمارے قابل صد احترام ناقد، ہمارے ماہر لسانیات پروفیسر احتشام حسین زندہ تھے۔ کسی ادبی محفل میں ریک نظر آتے، کسی سیمینار میں بولتے دکھائی دیتے، کسی کانفرنس میں مقالہ پڑھتے ہوئے ملتے۔ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کی صبح تک وہ ہم میں جود تھے لیکن یکم دسمبر کی شام اُن کے بغیر سونی تھی۔ وہ صاحبِ نظر مسافر جو دنیا کو دیکھنے اور ہر قدم پر کچھ سیکھنے کا جذبہ دل میں لیے احلِ حیات پر مارا مارا پھرتا رہا اور جو "طغیانِ مشتاقی" کے طفیل انتھاہ سمندروں کو کھنگالتا رہا آخر اس تنگنائے کائنات سے لتا گیا اور عالمِ دیگر کی سیر کو نکل گیا۔ جاتے جاتے اپنے چاہنے والوں اور عقیدت مندوں کو میر کا ایک شعر سنا گیا ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

جی چاہتا ہے کہ آج میں بھی آپ کو احتشام صاحب کی کچھ باتیں سناؤں۔ شاید یہ باتیں میری طرح آپ کے لیے بھی زخمِ مرگ حتشام کا مرہم ثابت ہوں۔ سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں؟۔ اس قصبۂ ماہل (اعظم گڑھ) سے جہاں احتشام صاحب ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے تھے[۵]۔ اور جہاں کے بھولے بھالے لیکن بامروت اور پُرخلوص لوگوں نے اپنی گدڑی کے اس لعل کے لیے، امریکہ جاتے نت الوداعی جلسہ کیا تھا[۶]۔ پھر سوچتا ہوں کہ اُن کی باتیں جو لائنِ گنگ و جمن الہ آباد سے شروع کروں جہاں انھوں نے انتہائی تنگ دستی ے عالم میں دامنِ غیرت کو ہر قسم کی آلودگی سے بچا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے۔ بے شک ان کے سفرِ حیات میں اہل درالہ آباد دو بہت ہی اہم موڑ تھے۔ لیکن زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم مجاز کے اس شہرِ نگاراں لکھنؤ سے گفتگو کا آغاز کریں جو احتشام صاحب بھی بہت پسند تھا اور جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی دن گزارے تھے۔ اسی شہر میں ۱۹۳۸ء میں وہ یونی ورسٹی کے عبۂ فارسی اور اردو میں لکچرر بنے تھے۔ وہ ایک خوش اخلاق اور ماہرِ تعلیم استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باشعور اور اعتدال پسند ترقی پسند ی تھے۔ اس کا اندازہ ان کے تنقیدی مضامین اور تقریروں سے بھی ہوا اور اس وقت بھی جب انھیں لکھنؤ کی انجمن ترقی پسند مصنفین میں قاعدگی سے شریک ہوتے اور سنجیدگی سے بولتے سنا گیا۔ عام طور پر لوگ یہ فرض کرلیتے ہیں کہ ایک ترقی پسند انسان مذہب سے دور بھاگتا ہے لیکن احتشام صاحب نے اس مفروضے کو مہمل ثابت کردیا۔ انھیں مذہبی محافل و مجالس میں بھی شریک دیکھا گیا۔ یہ ان کی بیانہ روی، بیعت کے ٹھہراؤ اور معقولیت کی دلیل ہے۔

---

۵ میری پیدائش واقعی تو ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء ہے لیکن سرکاری کاغذات میں اکثر ۲۱ مئی ۱۹۱۲ء۔ احتشام حسین: مکتوب بنام جناب باقر مہدی

۶ ملاحظہ ہو "ساحل اور سمندر" از احتشام حسین

لکھنؤ میں ان ترقی پسند مصنفین کے علاوہ وہ "دانش محل" بھی انتہائی باقاعدگی سے جاتے تھے۔ شام کو چار اور چھ بجے کے درمیان کوئی ان سے ملنا چاہتا تو جانتا تھا کہ وہ دانش محل میں ہی ملیں گے۔ دانش محل محض ایک کتب خانہ ہی نہیں بلکہ ایک ہی وقت میں ادیبوں دانشوروں کا ڈرائنگ روم، سخن فہموں اور سخن سنجوں کا کلب اور علمی و ادبی اکادمی بھی تھا۔ وہاں احتشام صاحب نہ زیادہ بولتے تھے نہ چپ رہتے تھے۔ لوگ ان کی باتیں سننے کے لیے اسی طرح بے چین رہتے تھے جیسے کہ آج آپ بے چین ہیں۔ وہ سنجیدہ تھے مگر اکل کھرے تھے۔ ان کی باتوں میں خشکی و یبوست اور علم کی خواہ مخواہ نمائش نام کو بھی نہ تھی۔ اکثر زندہ دلی کا بے ساختہ مظاہرہ کر بیٹھتے تھے۔ ایک بار کچھ ادیب و شاعر دانش محل میں جمع تھے۔ ایک صاحب میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ کر رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں انھوں نے احتشام صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

دبیر، انیس کو کبھی نہیں پا سکتے ۔

احتشام صاحب نے کہا :۔

جناب ۔ اگر مرزا صاحب نہ ہوتے تو کون کہہ سکتا تھا ۔ ع

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے ؟

وہ صاحب بولے:۔

زندگی میں بس ایک یہی مطلع کہہ گئے لیکن صاحب ذرا ان کا ایک مصرع سنئے ع

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں !

کوئی معمولی عقل والا بھی یہ نہ کہے گا کہ میں علیہ السلام ہوں۔ کیا امام حسینؑ کے ذہن مبارک سے یہ فقرہ اچھا لگتا ہے؟

مگر جناب یہ مصرع الحاقی ہے۔ دبیر مرحوم سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان کا ہے ہی نہیں۔ احتشام صاحب نے صفائی پیش کی۔

نہیں صاحب، بالکل انھیں کا ہے۔ انھیں کے رنگ کا ہے ——— معترض صاحب مُصر رہے۔

پھر بھی ہمیں، دبیر کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ احتشام صاحب نے مسکرا کر فرمایا

کیوں؟ انھوں نے حیرت سے پوچھا

اس لیے کہ دبیر نے اردو شاعری میں قوس یعنی بریکٹ۔ BRACKT کو رواج دیا۔ دوبارہ پڑھیئے

فرمایا ——— میں حسین، بریکٹ میں (علیہ السلام) بریکٹ بند۔ ہوں!

حاضرین ہنس پڑے اور معترض صاحب چپ ہو رہے۔

احتشام صاحب میں ایک خوبی یہ تھی کہ اگر وہ کسی شخص سے ایک بار مل لیتے تو نہ صرف یہ کہ ان کا نام یاد رکھتے بلکہ عرصے کے بعد ملاقات ہونے پر اس کی پذیرائی اس طرح کرتے تھے کہ وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ بمبئی کی "انجمن نوجوان مصنفین" نے ان کو حسین حالی پر چند تقریریں کرنے کے لیے انھیں مدعو کیا۔ وہ بمبئی تشریف لائے۔ میں بھی بمبئی ہی میں مقیم تھا لیکن اسے اپنی بدنصیبی بدذاتی! سمجھ مجبور رہا کہ میں انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے اسٹیشن تک نہ جا سکا۔ البتہ شام کو انجمن اسلام ہائی اسکول کے ہال میں سننے کے لیے ضرور پہنچ گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ تقریر شروع کر چکے تھے۔ انتہائی پُر مغز، معلوماتی اور دلچسپ تقریر تھی۔ جی چاہتا وہ بولتے ہی چلے جائیں۔ تقریر کے اختتام پر میں تیزی سے ڈائس کی طرف بڑھا تاکہ ان سے مصافحہ کروں۔ انھوں نے دور ہی سے دیکھ لیا اور دیر تک انتہائی بے تکلفی اور یگانگت کے ساتھ بات چیت کرتے رہے۔ میں اپنی جگہ پر شرمندہ تھا کہ اسٹیشن کیوں نہ جا سکا اور یہ بھی

مجھ ایسے کم سواد طالب علم کو یاد رکھنا اور اس درجہ شفقت فرمانا احتشام صاحب کی شخصیت کا کتنا دلنواز پہلو ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی مشہور شاعر یا ادیب سے فرمائش کی جائے کہ وہ فوری طور پر کچھ لکھ دے تو وہ ہزار بہانے تلاش کرتا ہے۔ کبھی کم فرصتی ، کبھی خرابیٔ صحت کی معذوری ، کبھی گھریلو پریشانیوں کا دکھڑا اور کبھی کسی اور مجبوری کا بیان ۔ دنیا جانتی ہے کہ احتشام صاحب اکثر علیل رہتے ، بے حد مصروف انسان تھے اور گھریلو پریشانیاں بھی تھیں لیکن انھوں نے شاید ہی کسی طالب علم ، رسالہ کے ایڈیٹر یا منتظم جلسہ کو مایوس کیا ہوگا۔

۱۹۵۵ء میں جب میں دوسری بار اُن سے لکھنؤ میں ملا تو از راہ عقیدت ان سے گزارش کی کہ وہ میرے لیے کچھ نصیحت آمیز جملے تحریر فرما دیں۔ ... قت میرے ہاتھ میں حضرت صفیؔ لکھنوی مرحوم کا دیوان "صحیفۃ الغزل" تھا۔ آپ نے اسی پر حسب ذیل جملے قلم برداشتہ لکھ دئے جو مجھ ایسے ہر مبتدی ... ن نگار کے لیے ہمیشہ مشعل راہ ثابت ہوں گے :۔

> اگر آپ ادیب بننے کی خواہش مند ہیں تو مطالعہ اور مشاہدہ ، دونوں سے کام لیجئے ، دونوں میں اصول انتخاب پر نظر رکھئے اور دونوں کو نشہ نہ بننے دیجئے ۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ راستے روشن ہو رہے ہیں اور خود آپ کا ذہن اعلیٰ اور ادنیٰ میں تفریق کرنے لگا ہے ، آپ کی تخلیقی قوت اعلیٰ خیالات اور اعلیٰ مشاہدات کی مدد سے پرپرواز حاصل کرنے لگی ہے ۔ یہ ادیب بننے کی پہلی منزل ہوگی۔
>
> (احتشام حسین ۔ لکھنؤ ۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

جس زمانے میں ، میں پی ایچ ڈی کے لیے " علامہ آرزو لکھنوی " پر تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا کئی بار اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہر بار ان سے کافی ... اوہ کیا ۔ ایک مرتبہ اُن سے پوچھا کہ نئی نسل پر آرزو کے اثرات " کے ضمن میں آپ کچھ بتائیں گے ۔ انھوں نے کہا ۔ بہتر یہ ہے کہ آپ بمبئی جاکر یہی سوال ... ے پاس لکھ کر بھیجئے تاکہ جو جواب میں دوں وہ تحریری طور پر آپ کے پاس محفوظ رہے ۔ چنانچہ بمبئی آکر بذریعہ خط میں نے استفسار کیا۔ جواباً ... بر فرمایا :۔

> جہاں تک مجھے علم ہے نئی نسل کے اردو شعرا یا ادیبوں میں سے کوئی بھی خاص طور سے آرزوؔ سے متاثر نہیں ہے۔ اُن کے شاگردوں کا ایک بڑا گروہ ہے جن میں بعض کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس حیثیت سے اُن سے متاثر ہیں لیکن آل رضا لکھنوی اور آرم لکھنوی کی غزلوں میں ان کا رنگ کبھی کبھی نظر آجاتا ہے۔ آل رضا کا مجموعہ "غزل معلیٰ" کے نام سے کراچی میں چھپ چکا ہے ۔ آرم کا کوئی مجموعہ میں نے نہیں دیکھا ہے ۔ لیکن ـــــــ ان لوگوں کو نئی نسل کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے یا نہیں ، یہ محل نظر ہے ۔[۱]

افسوس ہے کہ ایسے مشفق استاد ، ادیب بے بدل ، خطیب بے مثال ، شاعر خوش فکر ، ماہر لسانیات اور صائب الرائے ناقد ـــــــ ان سب سے بڑھ کر ایک مستجمع صفات و مجموعۂ کمالات ہستی سے ہم اتنی جلد محروم ہو گئے ۔ ان کا بدل شاید صدیوں تک نہ مل سکے گا۔

---

۱ مکتوب محررہ ۲۸؍ جولائی ۱۹۷۱ء

شارب ردولوی کے غزل پر سوال

اور

احتشام حسین کے جواب

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ اردو غزل میں چند خیالات ہیں جن کو بار بار توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے؟

جواب: آپ کے اس سوال میں نیم صداقت ضرور پائی جاتی ہے۔ غزل کا دائرہ بہت وسیع ہونے کے باوجود محدود بھی ہے۔ شاعری کے سارے موضوعات جن کا تعلق فکری' بیانیہ، محاکاتی اور اعلیٰ اخلاقی تصورات سے ہے سب کے سب غزل میں نہیں سما سکتے حالانکہ یہ بھی صحیح ہے کہ غزل میں زندگی کے اکثر و بیشتر پہلو اچھی یا بری شکل میں جگہ پا چکے ہیں۔ یعنی اس میں فلسفیانہ، اخلاقی، سیاسی، سماجی صوفیانہ اور منظری موضوعات مختلف ادوار میں جگہ پاتے رہے ہیں لیکن اس کا اصل مزاج عشق و محبت، غم دوراں اور غم جاناں تک ہی محدود رہا ہے۔ یہاں تک کہ فلسفہ و تصوف کے مسائل بھی انھیں علامتوں کے پردے میں بیان کیے گئے ہیں جو ذہن پر عشق ہی کا سا اثر ڈالتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل مربوط و مسلسل خیالات، مناظر کے بیان، رزمیہ واقعات اور داستان طرازی کے لیے کبھی ایک موزوں صنف قرار نہیں دی گئی۔ اس طرح جب اس کا دائرہ محدود ہو گیا تو خیالات کی تکرار اور ایک ہی طرح کے جذبات کا اظہار اس میں لازمی تھا۔ ایک بات اور ہے چونکہ غزل میں ہر شعر تقریباً ایک مکمل جذبے کا اظہار کرتا ہے۔ اس لیے اس چھوٹے سے سانچے میں جو تصویریں بنائی جاتی ہیں ان میں اسا کے ساتھ وہ فرق نہیں کیا جا سکتا جو فکری یا جذباتی مدارج سے پیدا ہونا چاہیے بہت جلد ایک شعر دوسرے شعر کا چربہ اور ایک خیال دوسرے خیال کا عکس معلوم ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ بہت ممکن ہے کہ ان کے محرکات بالکل مختلف ہوں تاہم یہ صحیح ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر یہاں بھی بے انتہا تکرار پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھنا ضروری ہے۔ عشق و محبت اور حیات و کائنات کے معاملے میں بہت سے انسانوں کے جذبات و خیالات یکساں ہو سکتے ہیں اور اگر مختلف لوگ ایک ہی زبان میں اظہار خیال کر رہے ہیں تو ان کے یہاں انفرادیت کے باوجود یکسانیت کا پیدا ہو جانا قرین قیاس ہے۔ یکسانیت کو ہم توارد کہہ سکتے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ شعرا نے ایک دوسرے کی دیکھی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میر تقی میر کے چھ دیوانوں میں بعض خیالات اور جذبات میر کی زندگی کا ایسا اہم عنصر تھے جن کے اظہار کے بغیر انھیں ذہنی یا جذباتی آسودگی میسر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے وہ میر کے لیے تکرار کی حیثیت نہیں رکھتے تھے ہمارے لیے تکرار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام باتوں پر نظر رکھ کر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اچھے شعرا کے یہاں یہ تکرار کبھی کبھی لطف پیدا کرتی ہے اور ان کے اسالیب اظہار کا فنی مطالعہ کرنے میں معین ہو سکتی ہے پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ غزل انسانی فکر و خیال اور جذبے کی ساری دنیا پر حاوی نہیں ہے۔

عیاذ انصاری

احتشام ——

(ایک دوست ایک ساتھی)

احتشام کو مرحوم کہتے طبیعت جھجک رہی ہے۔ ذہن بغاوت پر اتر آتا ہے کہ اس زندگی کو پھر کوئی جبر نہ کہے تو کیا کہے۔ انسانیت کے کیسے کیسے جوہر نایاب ہم سے چھین کر یہ سپرد خاک کر دیتی ہے۔ ارتحال کی دلدوز خبر سے کوئی ایک ماہ قبل علی گڑھ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ کئی برس بعد میں نے کہا تھا۔ اتنی طویل مدت تک ملاقات نہ ہونے کی توہین ہم کو لاحق ہے احتشام بھائی۔ زندگی کی اس تیز روی میں ہماری یہ سست گامی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ لکھنؤ آ جاتے وہاں بڑھاپے کے دن بڑے مزے کے گزرتے مگر پروفیسر آل احمد سرور، تمہاری جان کب چھوڑنے والے تھے۔ یہاں بھی انھوں نے پہل کی۔ اور تمہیں علی گڑھ کے قیام پر انھوں نے مائل کر لیا۔ فرط محبت میں وہ سرور صاحب اور میرے تعلقات میں لطیف سی ایک رقابت کو شامل رکھتے تھے، کہا کرتے تھے۔ "ہم تم سے محبت کرتے ہیں اور تم سرور پر فدا" یہ اس وقت کی باتیں ہیں۔ سرور صاحب کے گھر پر جب ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوا کرتے تھے ملازم سرکار کی حیثیت سے ان جلسوں میں دامن کشاں میں صحن میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ مگر جلسہ میں شریک ضرور رہتا تھا۔ احتشام ان محفلوں کے بڑے سرگرم ممبر تھے۔ ہم سب اس دور کے جوان تھے۔ اور خون گرم کبھی کبھی در خود محفل ہو ہی جاتا ہے۔ احتشام ہم میں لیے فرزانہ تھے۔ جو ہماری دیوانگی پر ایک ممتحن خیری کی طرح ہمیشہ حاوی ہے۔ جلسوں کو نازک مرحلوں سے وہ ہمیشہ کامیاب و کامراں نکال لاتے تھے۔

اردو کے اکثر نوادر شعراء سے ان جلسوں میں تعارف ہوا۔ باقر مہدی، کمال صدیقی۔ وامق، معصوم رضا راہی۔ اور منظر سلیم۔ ان میں سے اکثر کو سرور احتشام ہی کی وساطت سے لکھنؤ کے اردو پروگراموں میں شرکت کا موقع ملتا رہا۔ سرور صاحب سے زیادہ احتشام کو اس کی فکر رہتی تھی کہ لکھنؤ میں وارد اردو کے ادیب اور شاعروں کو ریڈیو اسٹیشن کھینچ لایا جائے اور پروگرام میں شامل رکھا جائے۔ انھیں اپنی اس کارگزاری پر ایک طرح کی خوشی ہوتی تھی۔ اردو پروگراموں کی محدود گنجائش کے باوجود اپنی کوششوں میں کسی طرح کمی نہ کرتے تھے۔ میری طرف سے انھیں مایوسیاں بھی ہوئیں۔ اور شکایتیں بھی رہیں مگر گراں خاطر کبھی نہ ہوئے۔ اس گون کے وہ آدمی ہی نہ تھے۔ جو وقت بھی ان کے ساتھ گزرا اسے میں خوش وقتی ہی سمجھتا ہوں۔ گفتگو میں ان سے ایک طرح کی چھوٹ تھی۔ ہر طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔ میری ہر رطب و یابس کو وہ برداشت کرتے تھے۔ ہر شخص سے اس کی سمجھ اور اسی کے ذوق کے مطابق بات کرنے کا احتشام کو بہت اچھا سلیقہ تھا۔ کوئی آٹھ سال میں نے اپنی ملازمت کے لکھنؤ میں گزارے اور اس تمام عرصے ان سے دوستی اور محبت کا رشتہ قائم ہی رہا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت میں دہلی میں تھا۔ اس دور کی دلی کا ذکر بھی گھناؤنا اور تصور بھی ڈراؤنا۔ رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں جس کی یاد سے پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو بھیانک منظر نگاہوں کے سامنے آتا ہے

ن عریاں، نظام ٹوٹا پھوٹا، درہم برہم، بڑوں بڑوں کا زہرہ آب، بھلے لوگ سر بجیب تھے۔ غنڈوں کی بن آئی تھی۔ وہ بیشتر
ت، لوٹ کھسوٹ کرتے، قتل و غارت مچاتے۔ چھٹے پھرتے تھے۔ عقیدہ کی آڑ ہے۔ ورنہ اس صغریٰ کو میں قیامت کبریٰ
لگتا۔ زمین تنگ، آسمان دور تھا۔ اللہ اللہ کرکے نومبر میں کہیں جاکر مجھے لکھنؤ پہونچنے کا موقع ملا۔ صبح سویرے گاڑی کانپور پہونچی
تین ماہ بعد کہیں اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ سورج دیوتا کی کرنوں میں پہلی بار ممتا کا احساس بیدار ہوا۔ زندگی کا اعتبار جیسے مسکرا
راکر وہ مجھے واپس دے رہی ہیں۔ کانپور سے لکھنؤ کا سفر بھی آزار تھا۔ تین بجے ہوں گے کہ میں عیش باغ اترا، قلیوں کی وہی پرا
نی پکار، تانگہ والوں کی وہی مانوس آوازیں۔ ذہن میں کشادگی، قلب میں غیر محسوس خوشی، سکون و شگفتگی کی طرف مائل طبیعت اٹھتی اور
تیز ہوتی جارہی تھی۔ تانگہ والوں سے باتیں کرنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔ میں نے بیٹھتے ہی ایسے چھیڑا۔ تانگہ کو تو تم نے بنالیا میر صاحب آپ نے۔
خفیف سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل گئی۔ بڑے اعتماد سے اپنی گھوڑیا کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ "چلو بٹیا! میاں دلی سے تشریف لارہے
ہیں۔ امام ضامن بھی ملے گا۔ میں نے کہا دلی کا ذکر نہ کرو، لکھنؤ کی بات کرو۔ کہنے لگا اطمینان رکھئے۔ مولا کا سایہ اس شہر پر ہے تو کیا غم ہے
ہی تھا ملہ گر... صاف بٹیا تھوڑا وقفہ دے کر اس نے گمبھیر لہجہ میں کہا۔ پنتھ جی کا دورہ ہے جو کچھ نہ ہو سو کم ہے۔ طرحیں ابھی کھنچی ہیں۔ گر
ن جانے کب بے سری بولنے لگے۔ سارنگی ہی تو ہے۔ حکومت کو سارنگی سے تعبیر کرنا لکھنؤ کے تانگہ والوں ہی کا حق ہے کسی اور کو نہیں
وجھ سکتی اتنی دور کی۔ کچھ دن، مکان کی تلاش۔ دفتر کی سنبھالی اور دوسری مصروفیات میں نکل گئے۔ سردار صاحب سے ملاقات ہوئی نہ
احتشام سے، یکایک پنڈت نہرو کی تقریر کے دن، خاص اسی پنڈال میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ریڈیو بوتھ کے قریب ہی احتشام بھائی
کھچ میں دھنسے، کنوتیاں بدلتے، دبے اور بھینچے مجھے نظر آئے۔ تو میں نے ہاتھ پکڑ کر انھیں اوپر کھینچ لیا۔ اور وہ اطمینان کا سانس لے کر
ہم میں مل کے بیٹھ گئے۔ میں نے کاغذوں کا پلندہ اور جیب سے قلم نکال کر یہ کہتے ہوئے ان کے ہاتھ میں تھمادیا کہ احتشام بھائی
میں دوسرے کام میں الجھا ہوا ہوں آپ پنڈت جی کی تقریر کا خلاصہ تیار کر ڈالئے۔ مسکراتے ہوئے کچھ تعجب سے انھوں نے کہا۔ "میں
میں کیا کرسکتا ہوں۔ مجھے کچھ بتلاؤ تو۔ خلاصہ ہی تیار کرنا ہے۔ اور کیا کرنا ہے۔ میں نے کہا اتنی بات اور ذہن میں رکھئے کہ پنڈت جی
کب اور کیا کہتے ہیں۔ گھڑی دیکھتے جائیے۔ اور ہر پانچ منٹ کے اندر جو کچھ وہ فرماتے ہیں وقت کے حوالہ سے اسے نوٹ کرتے
جائیے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے میں اس کاغذ پر نظر ڈال لیتا تھا۔ کہ وہ ہدایت کے مطابق چل رہے ہیں یا نہیں۔ بہت سے
فقرے بجنسہٖ انھوں نے نوٹ کرلیے بہت سے فقروں کے نیچے لمبی لمبی لکیریں کھینچ رکھی تھیں۔ کچھ دائرے بنا بنا کر انھیں ایک دوسرے
سے ملا رکھا تھا۔ اور بہت سے سوالیہ نشان قائم کر رکھے تھے۔ مسودہ کیا ایک پہیلی تھا جو انھوں نے تیار کیا۔ میں دیکھ کر کچھ گھبرایا تو
اپنے مخصوص انداز میں آنکھ میں آنکھ ڈال کر مسکراتے ہوئے انھوں نے کہا۔ پنڈت جی لمبی چال چل رہے ہیں۔ میں بھی نقش قدم
پر ہوں۔ پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اطمینان رکھو۔ میرا جی خوش ہوگیا۔ تقریر کے بعد جب ہم اسٹوڈیو کو لوٹ آئے تو میں نے انھیں ایک
کمرے میں بند کرتے ہوئے کہا۔ اب اطمینان سے اپنی اس پہیلی سے ہمیں ایک مسلسل اور مرتب مسودہ تیار کردیجئے تاکہ تقریر کی
کنٹیونٹی کرتے وقت ہم مسودہ سے پورا استفادہ کرسکیں۔ سمجھ گیا۔ کہتے ہوئے اندر جا بیٹھے اور تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ مسودہ ہاتھ
میں لیے کمرے سے باہر نکل آئے۔ ہوگیا۔ میں دور سے چلایا، ہاں ہوگیا۔ اور خاصا ہوگیا۔ احتشام نے بڑی مشکل ہمارے لیے آسان
کردی۔ معاوضہ کا ذکر تک زبان میں نہ آیا۔ وہ مگر بہت خوش تھے۔ میں سمجھتا ہوں احتشام نام تھا ترغیبوں اور تحریصوں سے بلند
انسان کا۔ وہ کام کی تکمیل اور خوبی کے قائل تھے۔ ایک مخلص کارگزار کی طرح۔ ذاتی انتفاع کا حصہ قائم کرکے وہ کسی کام کو کریں۔ بلکہ یہ ان
کا مزاج ہی نہ تھا۔ طلب مال اور طلب جاہ کے اضطراب میں آج ہر شخص مبتلا ہے۔ احتشام کو مگر خدا نے قناعت کی وہ دولت دی تھی جو

ہر کس و ناکس کو مقدر نہیں ہوتی۔ وہ مال اور جاہ دونوں میں صبر و شکر کے قائل تھے۔ کثیر الاولاد ہونے کے باوجود ایک استغنا تھا۔ ان کے قلب میں ایک بے نیازی تھی۔ ان کی طبیعت میں دوسروں کے لیے بعض اوقات وہ اصرار کر کے اڑ جھگڑ کے بھی اپنا کام نکال لے جاتے تھے۔ لیکن دوسروں کے لیے، اپنے لیے نہیں۔ طلب کو وہ موجود پر مقدم نہ کرتے تھے۔ طلب کا خانہ اپنے لیے جیسے ان کا خالی ہی تھا۔ میرا یہ تاثر صرف احتشام کے لیے ہے۔ پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ وہ ایک اچھے دوست، قابل اعتبار اور ہمدرد مشیر، بے لوث اور بے غرض ساتھی تھے۔

مجاز ہم سب کے محبوب شاعر تھے، ان کی بے راہ روی بھی اتنی ہی مشہور تھی کہ شام ہوتے ہی رات کے شغل کا بھوت ان پر سوار ہو جاتا تھا۔ کافی ہاؤس کے بیٹھنے والے تمام احباب کو مجاز کی اس کمزوری پر تاسف تھا۔ مجاز مگر معذوری کی حد تک مجبور تھے۔ کافی ہاؤس میں ایک روز احباب کا پورا مجمع تھا۔ اپنی بچی کے عقیقہ پر میں نے ان سب کو کھانے پر مدعو کیا تھا اور پروگرام بھی تھا کہ کافی ہاؤس سے اٹھ کر سب ساتھ ہی کھانے پر چلیں گے۔ احتشام مسکراتے ہوئے پاس آئے اور بڑی معصومیت سے انھوں نے جواب طلب انداز میں پوچھا۔ مجاز کو کھانے پر نہیں بلایا گیا؟ میں نے کہا، نہیں۔ ان کے پروگرام کے ساتھ کھانے کو کیسے شامل رکھا جاتا۔ وہ تو مگر وعدہ کرتے ہیں کہ شریف آدمیوں کی طرح کھانے میں شریک ہوں گے۔ احتشام نے وثوق سے کہا اور میں یہ سن کر اٹھا۔ مجاز کے پاس پہونچا اور ان سے کہا کہ ابھی ابھی یہ اعلان کرتا ہوں کہ مدعوین میں مجاز کا نام سر فہرست ہے۔ مجاز کی معصومیت کے بھی ہم سب قائل تھے، اتنی بات سے وہ خوش ہو گئے۔ اور اعجاز بھائی کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے اور اپنے مخصوص والہانہ انداز میں کہتے رہے۔ میرے چال چلن کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ احتشام صاحب کی ضمانت کو میں رائیگاں کردوں گا۔ دعوت ہوئی، بڑی دلچسپ صحبت رہی۔ مرغ کی تعریف میں وہ کہا کرتے تھے کہ اعجاز بھائی کے گھر جیسا مرغ کھایا اگر من و سلویٰ والے ایسے مرغ مجھے بھیجا کریں تو شراب حرام ہے حرام ہے۔ اور یہ بھی کہا کرتے تھے کہ مجازی مرغ تو ہر جگہ کھانے کو ملتا رہا مگر اعجاز بھائی نے ایسا روحانی مرغ کھلا دیا ہے کہ جب اس کا تصور کرتا ہوں تو اندر سے وہ بانگ دینے لگتا ہے۔ افسوس ایک ایک کر کے سب رخصت ہو رہے ہیں۔ آج مجاز ہیں نہ احتشام!

ریڈیو کے اس دور میں یادگار مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ جوش اور جگر لکھنؤ کے ان ریڈیائی مشاعروں میں ساتھ ساتھ اور الگ الگ شریک ہوتے تھے۔ جگر کے لیے سرور صاحب اور جوش کے لیے احتشام میرے لیے واسطہ تھے۔ ان دونوں کو میں نے ان مشاعروں میں اپنا توسل بنا رکھا تھا۔ مشاعرہ کی پیش کش کے فرائض میں خود انجام دیتا تھا۔ سلام میرے لیے اعلان کا مسودہ تیار کرتے، تو احتشام مشاعروں کے اندر ترتیب اور مسودوں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے۔ مشاعرہ شباب پر تھا۔ شمع جوش کے سامنے آئی تو یہ مشاعرہ کا نکتہ عروج بھی تھا۔ رباعی کے لیے وہ آزاد تھے کہ اپنی پسندیدہ رباعی پڑھ لیں مگر نظم کے لیے وہ مسودے کے پابند تھے۔ لیکن جوش نے خلاف توقع رباعی کے بعد فوراً ساقی نامہ شروع کر دیا۔ وہ شروع ہو جائیں تو ان کو روکنے والا کون تھا۔ ہم سب سر پیٹ کر رہ گئے۔ اور ایمان کی بات یہ کہ مشاعرہ اس وقت آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ میں نے مگر اس وقت یہ سمجھ لیا تھا کہ داد کے اس شور میں مشاعرہ کے اس زور میں میرا جنازہ بھی شامل احتشام کے کندھوں پر اٹھایا جا رہا ہے۔ حکومت پر تنقید، ہندی والوں پر پھبتی، حال کا افسوس، مستقبل کا ماتم، کیا نہیں تھا ساقی نامہ میں جو ریڈیو پر اس وقت نشر نہ ہوا۔

ٹھیکرے بیچنے والوں کے پرانے گاہک   بند کرتے ہیں جواہر کی دوکان اے ساقی
جس کے ہر لفظ سے سو پھول مہک اٹھتے ہیں   کاٹ دی جائے گی شاید وہ زباں اے ساقی

اس سرکاری ملازم پر کیا کچھ نہ بیت گئی ہوگی جس کی نگرانی میں ایسے باغیانہ اشعار براڈکاسٹ ہوئے۔ کوئی چھ ماہ تک مجھے ساقی نامہ

کی جوابدہی کرنی پڑی۔ احتشام گرجوش کی اس حرکت پر ملول تھے۔ عرصہ تک شرمسار رہے کہتے تھے "یہ آفت عیاذ کے سر میری ہی لائی ہوئی ہے"؛

نواب جعفر علی خاں اثر کے ساتھ ایک روز تانگہ سے اترتے نظر آئے۔ تو میں نواب صاحب کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھا۔ احتشام نے دور ہی سے کہا۔ "نواب صاحب تم سے گلے ملنے آئے ہیں۔" میں نے کہا عید گئی اور عید پیچھے رہ گئی۔ اور اثر صاحب میرے بزرگ، گلے ملنے کا حوصلہ ان سے کیونکر کروں۔ نواب صاحب پھر خود ہی فرمایا۔ مجھے عید کا پروگرام بہت پسند آیا تھا۔ آتے ہی احتشام صاحب سے اس کا تذکرہ ہوا تو انھوں نے کہا چلیے عیاذ کو مبارک باد دے آئیں۔ عید کے اس پروگرام میں پھر کتا ہوا ایک عنوان شامل ہو گیا تھا۔ "نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل" عنوان نواب صاحب کو بے حد پسند آیا۔ فرمانے لگے اردو پروگراموں کے عنوان ایسے ہی ہونا چاہیے۔ کہ جو پڑھے اور جو سنے وہ فرطِ شوق میں دیوانہ ہو جائے، نواب صاحب کی تعریف سے احتشام مجھ سے زیادہ خوش ہو رہے تھے۔ مجھ پر ان کی نوازشوں کی یہ ایک ادنیٰ مثال ہے۔

ایک روز گھر گرہستی کا سامان لیے لدے پھندے کچی گنج سے نکلتے دکھائی دیے تو میں نے کہا احتشام بھائی یہ رنگ ہم نے آج دکھا ہے۔ کہنے لگے مولا کی سنت ادا کر رہا ہوں۔ میں نے کہا تو اب میں مجھے بھی شریک ہونے دیجیے۔ لائیے کچھ سامان مجھے بھی دے دیجیے۔ کہنے لگے تو بزرگوں کی اولاد، کیوں میری عاقبت کے پیچھے پڑا ہے۔

بچے پیدا کرنے کے معاملہ میں وہ ہمیشہ مجھ سے شاکی رہے۔ اور جب عرصہ دراز کے انتظار کے بعد میرے یہاں بچی پیدا ہوئی تو بے حد خوش تھے۔ دن میں دو دو مرتبہ بچی اور زچہ کی خیریت پوچھ جاتے تھے۔ نام پر انھیں بڑا اصرار تھا۔ انھوں نے نصرت پسند کیا تھا۔ میں نے کہا آخر نصرت ہی کیوں؛ شاہ ایران کی "ذیبا" اور "صبا" اور "راگنی" اور آسا وری چھوڑ کر میں یہ نام ہی کیوں رکھوں؛ کہنے لگے۔ تیرے دادوں کے سے یہ نام مجھے پسند نہیں، شریف آدمیوں کے نام زہرہ، زینت اور صغریٰ تم رکھو گے نہیں۔ عدل کا تقاضا پھر یہی ہے کہ نام بھی خوبصورت ہو اور معنی بھی شگفتہ ہوں۔ نصرت ہی ٹھیک رہے گا۔ انھوں نے کہا اور یہی نام تجویز ہو گیا۔ اور تجویز پر وہ بے حد خوش ہوئے۔ احتشام محمدی میں ہوتے تو مادی اور حسی تہذیب کے ادب کا یہ ترقی پسند نقاد مذہبیات پر بڑے مزے کی باتیں کر گزرتے تھے۔ شیعہ اور سنی اختلاف کو وہ مسلک کا اختلاف کہتے تھے۔ مذہب کے لیے مسلک ان کا اپنا لفظ ہے بڑا نہیں۔ انھیں چھیڑنے کی خاطر ایک روز دوران گفتگو ایک قدم آگے بڑھ کر اس اختلاف کو میں نے اجتہادی کہہ دیا تو بگڑ کر کہنے لگے۔ نہ بابا نہ، اجتہاد کا اختلاف ماننے کے بعد تو پاؤں تلے کی زمین ہی نکل جاتی ہے۔ خلیفۂ ثالث کو بھی اس کسوٹی پر کسی نہ کسی ماننا ہی پڑ جائے گا۔ احتشام حسین رضوی اور ڈاکٹر وحید اختر کے سوا شیعہ احباب میں رواداری میں نے کم ہی پائی ہے۔ عقاید کی گفتگو سے وہ پہلو تہی کرتے ہیں۔ اور جب نوبت بحث و تمحیص تک پہونچ جائے تو پھر تیغ بکف وہ اپنی ہی کہتے ہیں دوسرے کی نہیں سنتے۔ محرم کا زمانہ، احتشام بھائی کے لیے گراں اس لیے ہو جاتا تھا کہ گھر والی، بچے اور محلے والے دور قریب کے سب عزیز اس زمانے میں محرم ہی کے ہو رہتے ہیں۔ ایک روز بڑے بے لطف سے خالی الذہن نظیر آباد کے چوراہے پر ٹکرا گئے۔ ان کو دیکھ کر میں نے کہا خیر تو ہے احتشام بھائی۔ یہ سوز خوانوں کی سی صورت کیا بنا رکھی ہے کہنے لگے ٹریجڈی تو یہی ہے کہ سوز خواں بن سکے۔ ارے بھائی بن جاتے تو اچھے رہتے۔ میں نے کہا! کیوں نہیں؛ زردہ پلاؤ روز کی کھانے کو ملتی۔ بڑے زور کا قہقہہ لگا کر کہنے لگے، یہاں تیری ہمیں ٹکیوں ہی پڑتی ہے۔ نجف اشرف کی نیاز اور حسین آباد کے لنگر پر، میں نے کہا کیا گزر رہی ہے، کچھ تو بتاؤ۔ آؤ ایک پیالی چائے ابراہیم ہوٹل کی ہو جائے۔ بادل ناخواستہ کہنے لگے، ارے کیا چائے۔ وہی سوز، مرثیہ، نوحہ اور ماتم، ضریح اور علم اور صلواۃ اور تبرک کی زندگی ہے آج کل اور کیا۔ میں نے کہا اور وہ ناگفتنی اور نہفتی! بگڑ کر کہنے لگے۔ وہی سنی پن کی رگ پھڑک اٹھی۔ تم لوگوں کا کچھ نہیں جاتا ہے ہٹ، ایک طرف ہو، میں تیری چائے واے نہیں پیتا۔ میں نے کہا ناراض نہ ہوئیے احتشام بھائی۔ طبیعت اوب جایا کرے تو میرے یہاں چلے آیا کرو۔ کہنے لگے اس خوف کو کیا کروں۔ قدم نہیں اٹھتے۔ محرم کے زمانے میں تجھ جیسے کٹر سنی کے گھر جا کر تم سید

…شنگی بھی منقسم ہو جائے گی۔ میں نے کہا ترقی پسندی کی سیدھی راہ تو یہی ہے۔ کہنے لگے سیدھی ویدھی کچھ نہیں۔ محرم میں قدم بڑھتے ہیں تو مجلس ہی کی طرف بڑھتے ہیں۔ مجلس کے موجد کو وہ دنیا کا ذہین ترین انسان کہتے تھے کہ سیاست کو کلچر کی آنچ دے کر مذہب کی حرارت رگوں میں دوڑا گیا۔ وہی خون گرم ہے جو شیعان علی کو محرم میں لیے پھرتا ہے۔ میں نے کہا تو پھر مسلک کی بات تو مشتبہ ہوتی جارہی ہے۔ …نے لگے تیری طمانیت خاطر کے لیے ہے۔ کسی اور کے سامنے منہ سے نکال دوں تو آفت برپا ہو جائے۔ نقن صاحب قبلہ جیسے ایک د… …ماٹ ذہن کے انسان کو بھی یاران طریقت نے نہیں چھوڑا۔ مولانا عبد الشکور کا زور تحریر تک کسے سنتے نہیں چوکتے۔ مولوی عبد الشکور کے مخالف احتشام بھی تھے مگر ان کے متعلق الفاظ ان کے جوش جیسے سوقیانہ نہیں ہوتے تھے۔ جو یادوں کی برات میں جوش نے مولوی صاحب …مرن کے متعلق استعمال کیے ہیں۔ شیعہ سنی جھگڑوں کی شدت کا احساس بہت پہلے احتشام کو ہو چکا تھا۔ وہ اس کی ذمہ داری تمام تر مولوی عبد الشکور پر ڈالتے تھے کہتے تھے ایک فتنہ کھڑا کر دیا مولوی نے! اپنے ایک شاگرد کو بڑا ہونہار کہا کرتے تھے۔ جو لکھنؤ کے جاگیردار… …ڈیوڑھیوں پر گرم مجلسیں پڑھ کر داد تحسین لے رہا تھا۔ میں نے کہا، مجلس کی حدود اور اس کے آداب سے باہر نکل کر مجلسیں پڑھنے والا ہر ذاکر …ب کا مولوی عبد الشکور بنتا جارہا ہے۔ ہاں جواب تو پھر یہی ہے لیکن خدانخواستہ یہ کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ قتل و غارت تک نوبت پہنچی …بھارت کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں وہ بڑا منحوس دن ہوگا۔ آج کے برے حالات میں اس تصور سے ہاں رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ …میں نے دفع الوقتی کے طور پر کہا، گھبراؤ نہیں، ایسے بہت سے منحوس دن آئے اور نکل گئے۔ صفویوں کا دور نہیں یاد ہے۔ اور تاتار سے …ماوراء النہر کے اس پار تک بھی دم نہیں لیا تھا انھوں نے، کہنے لگے کثرت پر نازاں ہوا ہی ہے اس خطرہ کی شدت کو محسوس نہیں کرتے۔ میں سنی …لہا جمہوریت کا ترقی پسند نوجوان ہوں۔ اقلیت کو بالآخر جب اکثریت میں ضم ہونا ہی ہے تو غم کاہے کا؛ جلد یا بدیر یہ معاملہ سلجھ ہی جائے گا۔ اب جناح صاحب ہی کو لے لیجیے، دس کروڑ کی مضبوط طاقت کو توڑ کر انھوں نے دو ٹکڑے کروا لے۔ اور اقلیت کے چار کروڑ کے …گلے میں رسی ڈال کر وہ بھارت کے حوالے کر گئے اور اپنی اکثریت کے چھ کروڑ کو انھوں نے بسم اللہ کے گنبد میں لے جا بٹھایا۔ ذرا غور کیجیے اب اکثریت میں ہوتے تو کیا کرتے؟ فوراً بول اٹھے: "سیکولرزم بھی ایک راستہ ہے۔ مولانا آزاد نے جس پر ہماری راہبری کی تھی۔" مولانا کے بڑے قائل تھے۔ بڑی عزت سے ان کا نام لیتے تھے: "روشنی کا مینارہ" کہتے تھے۔ ساری کانگرس اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ہو تو مولانا کے وزن کے برابر نہ ہو۔ ہندوستان کے مسلمان کو ان کا یہی وزن راس آیا۔ جو اس بھنور سے وہ صحیح سالم نکل آئے تقسیم کے جس گرداب میں وہ پھنس کر رہ گئے تھے۔ میں نے کہا یہ کیونکر احتشام بھائی۔؟ جب اکثریت نے ایک پلڑے میں بیٹھ کر آواز لگائی' ہے کوئی؛ جو ترازو کے اس دوسرے پلڑے کو سادہ دے۔ اقلیت کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کا یہ انوکھا حربہ اکثریت نے آزمایا تھا۔ مولانا آزاد نے پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور پھر بڑے اعتماد سے وہی آگے بڑھے۔ "فمن ثقلت موازینه فاولئک هم المفلحون" کہتے وہ خالی پلڑے میں جا بیٹھے۔ ترازو کانپ گئی۔ پلڑہ لرز اٹھا۔ جب انھوں نے آواز لگائی میرا وزن میری جماعت کا وزن ہے!

تعدد جمہوریت کا کاغذی اصول بن کر رہ گیا۔ مجھے اس لمبی تقریر میں بولنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں نے دخل در معقولات کے طور پر انھیں لقمہ دیا: "اور ہم مذہب کا کفن پہننے سے بچ گئے۔" تیور بدل کر بولے۔ یہ میں ہرگز نہ کہوں گا۔ میرے نزدیک یہ الزام تراشی ہے۔ اقبال نے جمہوریت کو استبدادیت کو اور جمہوریت کی ملوکیت کو مذہب کا کفن کہا ہے۔ اقبال کی بات چھوڑیے۔ میں نے کہا۔ اس دیس میں ان کی بات پر اب کون کان دھرتا ہے۔ آپ وہی تعدد اور وزن کی بات پوری کیجیے کیا کہلانا چاہتے ہو۔ اسی رو میں وہ وزن مگر تعدد کا پابند نہیں ہے۔ مولانا آزاد جیسے وزن رکھنے والے ہم لوگوں میں پیدا ہوتے رہے تو اقلیت کو اس دیس کی اکثریت سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرحوم بڑے پکے بھارتی تھے۔ جمہوریت اور سیکولرزم پر پورا وثوق رکھنے والے تقسیم کے

ہندی بھاشا کو جس جد اور سعی سے انھوں نے کم سے کم وقت میں سیکھا اور اس پر عبور حاصل کیا، ہندی ساہتیہ کے علمبرداروں سے جیسے خوش گوار تعلقات انھوں نے استوار کیے یہ احتشام ہی کا دم خم تھا۔ لکھنؤ کے ساہتیہ سماج کے ممبروں میں تھے اور احتشام ہی اردو کی نمائندگی کرتے رہے تقسیم کے بعد اردو کے وہ ادارے جن پر تقسیم سے پہلے کی سیاست کی چھاپ تھی وہ تو معدوم ہو چکے تھے دانش محل کو نسیم صاحب نے کاروبار کے ساتھ ایک ادارے کی بنیاد پر اٹھایا۔ تو احتشام کو اپنا جذبہ علمی مطمئن رکھنے کا میدان آیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اپنے خالی اوقات سوارتھ کر لیتے تھے۔ ان کی تلاش میں کوئی نکلتا اور دانش محل نہ جاتا تو ان کی تلاش عبث تھی! ایک مرتبہ ایسا ہی اتفاق مجھ سے بھی ہوا۔ عادت کے خلاف، رات کو نشر ہونے والی تقریر کا مسودہ بھیجنے میں انھوں نے تاخیر کی تو مجھے خد محسوس ہوا۔ میں خالی الذہن تنہا دانش محل ہوتا ہوا میں نے ان کو گھر پر جا کھٹکھٹایا۔ باہر نکل کر آئے تو گود میں ایک عدد بچہ سوار تھا۔ صورت دیکھتے ہی وہ کچھ کھسیا سے گئے۔ اور کہنے لگے آخر ضبط نہ ہو سکا۔ ارے بھائی تمھارے لیے مسودہ تیار کر رہا تھا۔ گھروالی کسی ض سے عزیزوں میں گئی ہیں اور اپنی ذریات کو میری جان ناتواں پر ڈال گئی ہیں۔ کوئی روتا ہے تو کوئی سوتا ہے۔ کسی کو دودھ کی حاجت کوئی روٹی مانگتا ہے۔ ان صاحبزادی کو آغوش مادر کی یاد ستا رہی تھی۔ میں نے کہا مسودے مایوسی ہے احتشام بھائی! اپنے مخصوص میں پورے بدن کو سمیٹتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے۔ یہ تو عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ گھر کے احتشام کو اس حال میں پاؤ ہوا یہ رنگ کبھی تم نے دیکھا۔ ریڈیو کا مسودہ تو خیر ہمارے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ میں نے تو کتابیں اسی عالم میں لکھ ڈالی ہیں اور کندھے پر ہے تو دوسرا بستر پر لڑھکا ہوا۔ پنسل ہاتھ میں نگاہ کاغذ پر لکھتا جا رہا ہوں۔ اور بچوں کو تھپکتا جاتا ہوں۔ میں نے کہا تمھا لیڈری کا بالآخر آج قائل ہونا ہی پڑا۔ احتشام کی زندگی کا صحیح اندازہ مجھے اسی روز ہوا عیالدار آدمی اور عیالدار جو اعزا و اقربا بھی ہو اور کے دکھ درد کا شریک، گھر کے ماحول میں اتنا گھرا ہوا ہو، پھنسا ہوا ہو۔ علم کی وہ ایسی خدمت کر گیا کہ حیرت ہوتی ہے۔ پھر اس کی تحر قدر بھی ہے اور وزن بھی۔ اس نے بے شمار کام کیا۔ اور جو کچھ کیا۔ ہوش گوش کا سمجھا ہوا۔ اپنے نزدیک ہر کام سنوار کر سجا کر اور سے وہ انجام دے گئے ہیں۔

لکھنؤ کے قیام میں ایک سلسلہ ادبی تراشوں کا میں نے شروع کیا تھا جس میں اردو کے شعرا اور ادیبوں کو ان کے اپنے ماحو پیش کیا جاتا تھا سننے والوں میں یہ سلسلہ بے حد مقبول ہوا۔ غالب پر پہلا فیچر سرور صاحب نے لکھا تھا "مجھے ہم ولی سمجھتے" دوسر لیے احتشام صاحب سے کہا گیا کہ اب آپ کی باری ہے۔ دوسرا فیچر مگر پہلے سے اونچا ہو۔ میرا اصول یہی ہے۔ ولی سے لے کر اور خواجہ گیسو دراز سے لے کر احتشام تک جس شاعر اور جس ادیب، مصنف یا مؤلف پر آپ چاہیں فیچر لکھ سکتے ہیں۔ انھ فوراً نظیر کا نام پیش کر دیا۔ انھیں ستانے کی غرض سے میں نے ناک بھوں چڑھا کر نظیر کو ذرا گرے ہوئے لہجہ میں ادا کر چڑ گئے۔ کہنے لگے تمھیں نظیر سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ میں نے کہا بیر نہیں احتشام بھائی۔ میں چاہتا ہوں کوئی پائے کی معیاری، بھاری بھرکم، اچھا تو پھر آتش رکھو۔ وہ کچھ غور کر کے فرمانے لگے۔ آتش پر فیچر کے لیے میں نے ملا صاحب سے وعدہ لیا ہے بڑے اہتمام سے فیچر کا مواد جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ ان سے چھین کر اس منزل پر آپ کے حوالے کردوں تو کاکوری کے ک تمھیں ملیں گے نہ مجھے۔ کبابوں کا ذکر سنتے ہی ذرا ڈھیلے پڑے، کہنے لگے غضب کرتا ہے۔ سیخ کے کباب اس کے سامنے گر نزاکت ہے۔ اس کے ہاتھ میں کر "ہاتھ آئیں تو ہاتھ لگائے نہ بنے"۔

میں نے کہا بس ایک نزاکت ہی کے ہو رہے۔ کچھ سٹ پٹا گئے۔ کہنے لگے اور کیا۔ ہلاک، نمکین غریب سلوہ دلی کی کا نام ہے سلنے لگے۔ فراجی تجربے سے بالکل یہی مراد ہے۔ مگر غیر سے عشق اور ملسی تجربوں کا مقابلہ ہم جیسے بعد کے ...

کہاں کر سکتے ہیں تاپ کتنی ہی غور شاید کیجیے احتشام بھائی۔ آتش کا نیچر آپ کو نہیں مل سکتا۔ فوراً چمک کر بولے تو نظیر پر سارا صاد ہے۔ ہم نظیر پر لکھیں گے اور ایسا لکھیں گے کہ جی خوش ہو جائے۔ اس قول فیصل کے بعد مزید ان سے کہنے کی مجھے جرأت نہ ہوئی۔ ہاں اتنا ضرور میں نے کہا کہ آپ کے نیچر کی آواز میں ابھی سے میرے کانوں میں گونج اٹھی ہیں۔ جگت بہادر، رام جی داس بابا۔ اور دیہاتی پروگرام کے دوسرے فن کار ڈھول اور تاشے بجاتے ہولی ہے! ہولی ہے کا شور مچاتے چلے آرہے ہیں۔ بیگم اختر کی رفع پرور آواز نہ مجدد کا پرسوز لحن، نہ ستار نہ گٹار، آپ کہئے نظیر پر نیچر، دیہی کھڑتال اور منجیرہ، ڈنڈے اور چوڑی کی گت پر جھومورہ تھرکتا، ناچتا ناچا جائے گا۔ رکھیو کا بچہ۔ چلیے۔ ایسا کہتے ہیں تو ہم اس میں بھی اپنے سننے والوں کی ضیافت طبع کا سامان ڈھونڈھ ہی نکالیں گے۔ جنابہ (بیگم ملا صاحب) کی خدمت میں جا کر کاکوری کے کبابوں کے مصالحوں کا نسخہ حاصل کریں گے اور نظیر کے نیچر میں یہ چٹ پٹا مال جھونک دیں گے۔ ملا صاحب کے استقبالیہ کا لطف تو آہی جائے گا۔ نہ سہی غالب کی نغمہ سرائی۔ نظیر کی تم تراق کا لطف تو کہیں گیا نہیں۔ معلوم ہوگا کہ نظیر خود لکھنؤ میں ہیں۔ ملا صاحب کا ڈرائنگ روم ہے؛ کاکوری کے کباب ہیں۔ ڈاکٹر علیم ہیں۔ وہ سرور بیٹھے ہیں۔ یہ احتشام ہیں۔ مجاز ہیں، اثر صاحب اور رضیہ سجاد ظہیر اور...... اب تو انھوں نے ٹوکا... بس بس نظر نہ لگے خود کو بھول ہی گیا۔ اور جنابہ کے حسن انتظام کو بھی! اس دور کی یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کچھ دیر کے لیے لکھنؤ کی زندگی جیسے جاگ اٹھی تھی۔

شرمائی، لجائی سی اردو کی نئی نویلی کی مسکراہٹیں ابھی زیر نقاب تھی کہ فلک کج رفتار نے دست درازی کی اور پھر دہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ نفسی نفسی! تقسیم کے بعد اردو کا جو طائفہ لکھنؤ میں جمع ہو گیا تھا وہ تتر بتر ہونا شروع ہوا۔ اور ان میں کچھ خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ جھڑ کر گرنے لگے۔ اثر صاحب گئے۔ مجاز گئے۔ اور ابھی آنکھ نم تھی کہ لو وہ بھی گیا۔ درویش خدادوست احتشام حسین کا نام: زہد و قناعت جس کا عمل اور وکلا وعد اللہ الحسنیٰ جس کی شان ہے۔ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شارب ردولوی کے غزل پر سوال

اور

احتشام حسین کے جواب

سوال :- احتشام صاحب آجکل ہر طرف غزل کی تنگ دامانی کا ذکر ہو رہا ہے کیا درست ہے کہ "تنگنائے غزل بقدر فرصت شوق نہیں ہے" ؟

جواب : آپ کے اس سوال کا جواب بہ درحقیقت دوسرے سوال ہی میں پوشیدہ ہے کیونکہ اگر غزل سارے انسا[نی] جذبات اور خیالات کے اظہار پر قادر ہوتی تو دوسرے اصناف کا وجود ہی کیوں ہوتا یا اگر وجود ہوتا تو انھیں دنیا[ئے] شعر میں اہمیت کیوں حاصل ہوتی لیکن ساری دنیا کے ادب میں شاعری کی مختلف اصناف کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ مختلف کیفیات، واردات اور تصورات کے اظہار کے لئے مختلف سانچوں کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے۔ عر[بی] شاعری میں تقریباً ایک ہی سانچہ تھا جو قصیدہ، غزل، مرثیہ، فخریہ، بیانیہ ہر قسم کی شاعری کے لیے کام دے[تا] تھا لیکن ایران میں قصیدے سے ٹوٹ کر غزل نے ایک الگ شکل اختیار کر لی۔ مرثیہ نے ایک نیا روپ دھارا، داستا[نی] طرز نے مثنوی کے پیکر میں جنم لیا، ہجو یہ شاعری کو الگ مقام حاصل ہوا فلسفیانہ افکار کے لیے رباعی اور قطعہ وجود [میں] آئے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزل پوری زندگی کی ترجمان نہیں بن سکتی اور جب ایسا ہے تو ہمیں اس کا اقرار کرنا [ہوگا] کہ دوسرے اصناف بھی اپنے اپنے ڈھنگ سے وہی اہمیت رکھتے ہیں جو غزل کی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ غزل کی تنگنا[ئے] میں کن کن تصورات اور خیالات کی سمائی ہو سکتی ہے، اس کا ذکر میں دوسرے سوال کے جواب میں کر چکا ہوں یہاں فقط [مرزا] غالب کے اس شعر کا خیال آتا ہے جہاں انھوں نے تنگنائے غزل کے ظرف کو چھوٹا بتایا تھا لیکن درحقیقت وہاں ان[کا] مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں تھا کہ غزل اظہار جذبات کے لیے ناکافی ہے بلکہ محض اتنا کہنا تھا کہ اس غزل میں نواب مجل ح[سین] خاں کی جتنی تعریف کرنا چاہیئے وہ نہیں کر سکتا اس لیے یہ سوچنا کہ غالب غزل کو اظہار جذبات کے لیے ناکافی سمجھتے [تھے] درست نہیں ہے تاہم یہ صحیح ہے کہ انھیں اس کا احساس تھا کہ غزل کو قصیدہ نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ایسا کرنا مناسب ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ غزل سے سارے اصناف کا کام لینے کی کوشش نہ صرف اس نازک صنف پر ظلم کے مترادف ہے [بلکہ] بعض حالات میں شاعر کو ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑتا ہے۔

ید حسن
بق پروفیسر و صدر شعبہ فارسی
سہ یونی ورسٹی

پروفیسر احتشام حسین مرحوم
جیسا کہ میں نے انھیں جانا اور پہچانا

یوں تو پروفیسر احتشام حسین مرحوم سے میری غائبانہ عام واقفیت ان کی افسانوں اور تحریروں کی وجہ سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ لیکن ذرا قریبی طور پر انھیں جاننے کا اتفاق ۱۹۵۵ء میں اس طرح ہوا کہ اس سال یا شاید اس سے کچھ قبل اُن کا سفرنامہ "ساحل اور سمندر" شائع ہوا تھا۔ کتاب جب میرے ہاتھ لگی تو میں نے اُسے بڑی دلچسپی سے پڑھا اور بیحد متاثر ہوا۔ اس تاثر کی وجہ یہ تھی کہ میں اسی سال گورنمنٹ آف انڈیا کی ایکسچینج اسکالرشپ پاکر جدید فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے واسطے ایران جا رہا تھا، یعنی میں بھی سمندر پار کر کے بدیس کی سافرت کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ ساحل اور سمندر کے ابتدائی ابواب نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا۔ احتشام صاحب مرحوم کے دل میں وطن چھوڑنے اور اعزہ و احباب سے رخصت ہونے کے وقت جو احساسات دل میں پیدا ہوئے تھے وہ اس وقت میرے دل میں بھی پیدا ہو رہے تھے، اور جب میں نے بمبئی کا ساحل چھوڑا تو اسی قسم کی کیفیت سے دوچار تھا جس کی شرح انھوں نے اپنی کتاب میں کی ہے۔

ایران سے واپس آکر غالباً ۱۹۵۶ء کے اواخر میں لکھنؤ یونیورسٹی کی ایک کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں امین آباد پارک ویو ہوٹل میں اقامت گزیں تھا۔ میں نے ساحل اور سمندر کے مولف سے بھی ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔ چنانچہ میں ایک صبح کو ۸-۹ بجے کے درمیان اُن کے مکان پر حاضر ہوا، اور پہلی مرتبہ اُن سے شخصاً متعارف ہوا، بڑی خندہ پیشانی اور تواضع سے ملے، سلام اور مزاج پرسی وغیرہ کے بعد انھوں نے یہ پیشکش کی کہ میں اُن کے مکان پر اقامت کروں، لیکن میں نے معذرت کر لی، کیونکہ یہ اُن سے میری پہلی ملاقات تھی اور میں اُن کے مزاج و عادات سے واقف نہ تھا، دوسرے یہ کہ ہوٹل کی اقامت کو میں نے اس لیے ترجیح دی کہ وہاں کھانے پینے اور سونے جاگنے میں دوسروں کے اوقات کا پابند ہونا نہیں پڑتا ہے، لیکن میں اُن کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ اُن دنوں ڈاکٹر عابد حسین صاحب بھی اُن کے یہاں مقیم تھے۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب موصوف کو بھی میں نے وہیں دیکھا، وہ بھی اُس وقت موجود تھے اور سید اختر علی تلہری مرحوم بھی آگئے تھے، اُن سے بھی پہلی مرتبہ متعارف ہوا۔ چائے کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی، زیادہ تر موضوع سخن علی نقی صاحب کی متنازعہ فیہ کتاب تھی جس کے متعلق ایک مقدمہ بھی دائر ہوا تھا، میں نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا بلکہ ان تینوں کی باتیں چپ چاپ سنتا رہا اور احتشام صاحب مرحوم کے متعلق رائے قائم کرتا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مرحوم احتشام صاحب۔ شریف، نرم مزاج اور روادار قسم کے انسان ہیں، اُن کے رہن سہن کو دیکھ کر بھی اثر قائم ہوا کہ ان میں تکلف اور نمائش کا مادہ نہیں ہے۔

اس مختصر سی ملاقات کے بعد احتشام صاحب مرحوم سے دوسری مرتبہ ملاقات کا موقع پٹنہ میں نصیب ہوا جب وہ پٹنہ یونیورسٹی کے کسی کام سے یہاں تشریف لائے تھے، اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر میں نے انھیں اپنے غریب خانے پر عصرانہ کی دعوت دی

جسے انھوں نے بڑی مہربانی سے قبول کرلیا۔ میرے چند احباب بھی اس صحبت میں شریک ہوئے، اور تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو ہوئی، لیکن اس وقت یہ یاد نہیں کہ موضوعِ سخن کیا تھا۔ اس کے بعد وہ تقریباً ہر سال کسی نہ کسی غرض سے پٹنہ آتے رہے اور ان سے ملاقات بہت مختصر ہوتی رہی۔ لیکن یہ ملاقات بہت مختصر ہوتی تھی۔

اُن سے قدرے مفصل ملاقات ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء گورکھپور میں ہوئی جہاں میں اور مرحوم احتشام صاحب دونوں ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اُردو کی دعوت پر یونیورسٹی کی کمیٹیوں کی میٹنگوں میں شرکت کی غرض سے پہنچے تھے۔ اُس وقت احتشام صاحب مرحوم الہ آباد میں بحیثیت صدر شعبۂ اُردو مقرر ہو چکے تھے، انھوں نے یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے طلبہ اور اساتذہ کے ایک جلسے کو خطاب کیا تھا، اردو ادب کی رفتار اُن کا موضوع تقریر تھا، دوسرے دن ڈاکٹر محمود الٰہی نے ہم دونوں کو ایک پُرتکلف لنچ دیا۔ کھانے کے بعد گپ شپ کا سلسلہ چلا، احتشام صاحب مرحوم کی گفتگو میں ہلکا مزاح اور لطیفہ گوئی بھی شامل تھی، اُن دنوں میں نے شعر کہنا شروع کیا تھا اور اس کی خبر دوستوں کو بھی مل گئی تھی، چنانچہ ڈاکٹر محمود الٰہی نے مجھ سے اشعار سنانے کی فرمائش کر دی، مجھے اپنی نوآموزتک بندی کا احساس تھا اس لیے میں نے ٹالنا چاہا، لیکن محمود الٰہی صاحب اور مرحوم احتشام صاحب دونوں کے اصرار سے چند اشعار سنانا ہی پڑے۔ میرے بعد مرحوم سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ کلام سنائیں، انھوں نے ہلکے ترنم سے ایک غزل کے چند اشعار سنائے جو اُردو غزل کے جدید رجحانات اور ترقی پسند خیالات کے ترجمان تھے، اُس دن یہ معلوم ہوا کہ احتشام صاحب مرحوم ایک افسانہ نگار اور نقاد کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔

۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں مجھے کئی بار الہ آباد جانے کا یونیورسٹی میٹنگ کے سلسلے میں موقع ہوا۔ ہر مرتبہ میں نے اُن سے اُن کے دیارِ دانشمند میں ملاقات کی اور ایک بار اُن کے مکان واقع کرنیل گنج/ تالاب پر بھی حاضری دی۔ یہاں بھی اُن کے سادہ طرزِ زندگی کا جلوہ نظر آیا، تکلف و آرائش و زیبائش کا سامان دیکھنے میں نہ آیا۔ جو سادگی لکھنؤ میں لکچررشپ کے زمانے میں تھی وہی الہ آباد میں پروفیسری اور شعبہ اردو صدارت کے دور میں بھی رہی اس میں ملاقات کے انداز میں بھی فرق نہ پایا۔

پروفیسر احتشام مرحوم کسی نہ کسی حیثیت سے پٹنہ تقریباً ہر سال آتے رہے، لیکن بورڈ آف اسٹڈیز کے جلسے میں شرکت کی غرض سے کبھی ایم۔ اے اردو کے پرچۂ سوالات کو معتدل کرنے کے واسطے، کبھی پی ایچ ڈی کے ممتحن کی حیثیت سے، یہاں اُن کی اقامت پروفیسر اختر اورینوی کے یہاں ہوتی تھی۔ لیکن یہ اقامت بہت مختصر ہوتی تھی، صبح آئے اور رات کی گاڑی سے واپس گئے۔ البتہ جب کبھی رات کے سفر کا موقع نہیں آتا تھا تو دوسرے دن صبح کو ضرور روانہ ہو جاتے تھے، ایسے موقع پر شام کو اختر صاحب کے یہاں ایک صحبت ہو جاتی تھی جس میں چند احباب شریک ہو جاتے تھے، ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال کے ساتھ ساتھ شعرخوانی سے بھی محفل گرم ہو جاتی تھی، احتشام مرحوم ان صحبتوں میں مرکزی شخص ہوتے تھے اور وہ گفتگو میں بڑی سنجیدگی سے حصہ لیتے تھے۔

مئی ۱۹۷۰ء میں جب احتشام مرحوم اردو پی ایچ ڈی کے امتحان شفاہی کے سلسلے میں پٹنہ آئے تو حسنِ اتفاق سے اُسی دن کلکتہ یونیورسٹی کے ہمراہ اور ناگپور سے ڈاکٹر سید رفیع الدین صدر شعبۂ اردو فارسی ناگپور یونیورسٹی بھی تشریف لائے تھے۔ مجلسِ ادب پٹنہ کی مخصوص نشست میرے غریب خانے پر منعقد کی گئی تھی جس میں مقامی اراکین کے علاوہ ان تینوں مہمانوں کو بھی دعوت دی گئی تھی، اس نشست میں جمیل مظہری، بہاء الدین کلیم، کلیم عاجز اور دیگر مقامی شعرا بھی شریک تھے، بڑی پُرلطف صحبت تھی، اس کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ اس میں مرحوم احتشام حسین، پروفیسر نور الحسن ہاشمی اور ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے بھی شعر پڑھے۔ شعرخوانی کے وقفوں کے درمیان بہاء الدین کلیم اور مجلسِ ادب کے ایک رکن عبدالحمید صاحب کی جملہ بازی اور چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے محفل زعفران زار بن جاتی تھی، یہ دونوں حضرات نقرہ چست کرنے اور جملہ بازی میں خاصے استاد ہیں، مرحوم احتشام صاحب اس کیفیت سے بہت لطف اندوز ہوئے اور بعد میں جب اُن سے ملاقا

انھوں نے اس صحبت کی خوش مزگیوں کا بڑی سنجیدگی کے ساتھ ذکر کیا۔

پروفیسر اختر اورینوی کی افسوسناک علالت سے احتشام صاحب مرحوم بڑے رنجیدہ تھے۔ ۱۹۷۲ء میں وہ کم از کم دوبار پٹنہ آئے۔ اس سے کہ اختر صاحب کو اپنی بیماری کی وجہ سے اپنے گھر میں مہمان ٹھہرانے میں شاید زحمت ہو میں نے پروفیسر احتشام صاحب مرحوم کو ان کی اطلاع پاکر یہ خط لکھا کہ وہ میرے یہاں اقامت کریں، لیکن انھوں نے اس بنا پر میری پیشکش قبول نہ کی کہ اختر صاحب کو ملال ہوگا، چنانچہ آئے تو اختر صاحب کے یہاں ہی مقیم رہے، لیکن دوست کو بیمار دیکھ کر بہت ملول و افسردہ تھے۔ آخری بار جب وہ پٹنہ ایک پی۔ ایچ ڈی کا امتحان لینے آئے تو پٹنہ یونیورسٹی کے مختلف امتحانات کے معاوضے کے چار بل فارم پر دستخط کر کے میرے حوالے کر گئے کہ جاکر وہ امتحانوں کی تفصیلات بھیج دیں گے۔ اور میں بلوں کی خانہ پری کر کے انھیں یونیورسٹی آفس میں داخل کر دوں گا لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہی وہ ایک صبح کو دنیائے فانی سے یکایک رحلت فرما گئے۔ میرا لڑکا سید فیاض احمد افسر سلسلہ ملازمت الہ آباد میں مقیم ہے ان کی موت کے بعد فوراً اُن کے گھر پہنچا تھا اور اس نے اس دردناک ٹریجڈی کا حال کو بڑے دردآگیں الفاظ میں تحریر کیا تھا۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۲ء تک پندرہ سولہ سال کے عرصے میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم سے میری بار بار ملاقاتیں بھی ہوئیں اور وقتاً فوقتاً خط و کتابت بھی ہوئی، مگر ملاقاتیں زیادہ تر مختصر اور مراسلت بیشتر رسمی رہی، اسی لیے میں اس بات کا دعویدار نہیں ہوں کہ میرے اور ان کے درمیان تعلقات نزدیکی اور روابط دوستانہ تھے، نہ ملاقاتوں میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ بے تکلفی قائم ہو اور نہ خطوط ہی میں بے تکلفی کے الفاظ استعمال ہوئے۔ میں بیش از بیش یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اُن کا ملاقاتی یا شناسا تھا، لیکن جس پہلو سے میں نے انھیں جانا اور فاصلے سے پہچانا، اُن کی سیرت و شخصیت کا ایک واضح نقش ذہن میں اُتارنے کے قابل ہو گیا۔ وہ ایک شریف انسان تھے، سادگی پسند، منکسر المزاج، وضعدار، دوست نواز، روادار، اپنے علم و فضل، تحریر و تقریر کی بدولت شہرت و مقبولیت حاصل کرنے اور اعلیٰ عہدے پر فائز رہنے کے باوجود انھوں نے اپنی فضیلت یا پروفیسری کا رعب جمانے کی کوشش نہیں کی، اپنے آشنا و بیگانہ سے خندہ پیشانی سے ملتے دیکھا، مارکسی عقاید رکھنے کے باوجود اُن کے اخلاق میں اخلاص کی خاص جھلک تھی اور وہ بزرگوں کا احترام کرتے تھے، سنجیدہ طبع ہونے کے ساتھ ساتھ خوش مزگیوں سے لطف اندوز ہونے کی بھی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے، اپنے باخلاق و علمی کارناموں کے سبب وہ اتنے ہر دلعزیز تھے کہ جس نے اُن کی اچانک موت کی خبر سنی اس کے سینے کو سخت دھکا لگا اور منہ سے بے اختیار آہ نکل گئی۔ میرے اوپر اس دردناک سانحے کا جو اثر ہوا اُس کا اظہار ایک قطعہ تاریخ میں کیا ہے جو شاید 'فروغ اردو' کے اس خصوصی شمارے میں بھی شامل ہے۔

شارب ردولوی کے غزل پر سوال

اور

احتشام حسین کے جواب

سوال: آخر میں آپ سے ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سے جدید شعراء ہیں جنھوں نے غزل گوئی میں فکر یا نظر کا کوئی نیا طرز داخل کیا۔

جواب: اگر آپ جدید شعراء سے موجود ہی دور کے شعراء مراد لیتے ہیں تو اس میں اثر، جگر، فراق، فیض، جذبی، مجروح، ناصر کاظمی اور حفیظ ہوشیارپوری کا نام لیا جا سکتا ہے ورنہ اگر محض انداز بیان کی ندرت کو لیا جائے تو اس میں اور بہت سے ناموں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے پیش نظر آپ کے سوال کا یہ جزو ہے کہ کن غزل گویوں نے فکر و نظر کا کوئی نیا طرز ——————— غزل میں داخل کیا۔ فکر و نظر کے نئے طرز کا مطالبہ ایک بہت بڑا مطالبہ ہے جو عام شاعر پورا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے علم، مشاہدہ کی انفرادیت، اظہار جذبات پر قدرت اور اپنی انفرادیت کو عمومیت کے سانچے میں ڈھالنے کی قوت ساری چیزیں ضروری ہیں۔ ان سب کا امتزاج بہت کم شعراء کے یہاں ہوا ہے قدیم شعراء میں بھی چند ہی نام ایسے لئے جا سکتے ہیں جنھیں باضابطہ فکر و نظر میں اجتہاد کا درجہ دیا جا سکے۔

(سنہ ۱۹۶۰ء)

الدین احمد

چند یادیں چند ملاقاتیں

۱۹۴۶ یا ۱۹۴۷ء کی مئی جون کی جھلسا دینے والی گرمی، لو کی لپٹیں آندھی کے جھکڑ گرد و غبار کے بگولے لکھنؤ کی سڑکوں پر اوپر
نیچے سے انگارے غرض ساری دھرتی اپنے حسن سا بن رہی تھی، موسم کی گرمی، گرد اور گھٹن سے بڑھ کر اس زمانے کے سیاسی حالات
نور الامان ـ الحفیظ ـ لکھنؤ کے مسلمان نوجوانوں خصوصاً مسلمان طالب علموں کے سر پر تقسیم کا جن جادو جگاتا ہوا جنوں کی سرحد تک
تقسیم کے نعرے اور نظریے نے وہ طوفان اور تہلکہ مچایا تھا کہ پناہ بخدا ـ جوش اور جذبات کا یہ عالم تھا کہ

سینہ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا

اس منظر میں ایک شامت زدہ طالب علم جو ابھی ایف اے کے پہلے سال میں تھا قومی تحریک کا دلدادہ، جامعہ کا فرستادہ لکھنؤ
کے چندے کے لیے نکل پڑا ـ چندہ بھی جامعہ کے جشن سیمیں کے لیے ـ سونے پر سہاگہ یہ کہ کپڑے سب کھدر کے تھے ـ شروانی
نے کھدر کی ـ اس پر قیامت یہ کہ کھدر کی بدنام اور بدہیئت گاندھی ٹوپی ـ حیف ہے اس چارگرہ کپڑے کی قسمت پر جس کی یہ درگت
اس زمانے کے لکھنؤ میں مسلمان رہنماؤں میں راجہ صاحب محمود آباد، راجہ صاحب سلیم پور، چودھری خلیق الزماں، مولانا جمال میاں
نامی گرامی سر اور خان بہادر وکیل اور بیرسٹر تھے جو زعمائے ملت کے زمرے میں تھے، ان کی قیادت اور قابلیت کے طوطی
اور کس طنطنے اور طمطراق سے کہ اللہ اکبر ـ

صاحب مرحوم نے ڈاکٹر علیم کے نام ایک تعارفی خط دیا تھا کہ وہ اس کار خیر کے نشیب و فراز سمجھائیں اور ہر طرح کے خطرات
سے بچائیں ڈاکٹر صاحب لکھنؤ یونی ورسٹی کی چار دیواری تک مستثنیٰ ہی مقبول اور محترم شمار کیے جاتے ہوں لیکن لکھنؤ کے کوچہ و
میں اثر یا اہمیت نہ رکھتے تھے ـ موصوف یونی ورسٹی کے قریب ہی کسی مکان میں تھے جو چاہے بہت شاندار حویلی نہ ہو مگر ہوادار
ضرور تھا ـ صبح کی دھوپ اللہ کے مان سے پھیل کر پھیل کر اب دالان میں پہنچ رہی تھی ـ

موصوف نے اپنی مسکراہٹ کو اپنی لینن کٹ داڑھی میں چھپاتے ہوئے اس نو وارد طالب علم کو قریب کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا
ڈاکٹر صاحب کا خط پڑھنا اور کنکھیوں سے اسے دیکھنا شروع کیا ـ پھر ایک لمبی سی ہوں کہہ کر حقے کا بہت لمبا سا کش لیا اور پس
ال ٹھہرے ہیں؟ اس نے کہا مولانا عبدالسلام ندوی کے ادارہ تعلیمات اسلام امین آباد میں ـ پھر ہوں کے ایک نیم او معورے
تعاش کے ساتھ پے در پے حقے کے کش لینے شروع کیے ـ کبھی چھوٹے کبھی بڑے کبھی درمیانی ـ اور یوں بڑے غور اور قدر سے
ساتھ اس کی زبانی جامعہ کی کہانی کہاوت کی طرح سنتے اور حقہ گڑگڑاتے رہے ـ جب حقے کا تمباکو اور طالب علم کی گفتگو کا
تو موصوف یہ کہکر اٹھ کھڑے ہوئے اب یونی ورسٹی جانا ہے ـ شاید مطلب یہ تھا کہ باقی آئندہ ـ اب پھر کبھی دیکھیے فرمایئے تم

یہ سمجھا کہ موصوف یونی ورسٹی جانے میں اس کی معیت چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ موصوف کے انتظار میں ان کی معیت کے لیے مؤدب کھڑا رہا۔ ڈاکٹر صاحب بن سنور کر آگئے۔ بہت عمدہ شروانی، بہت قیمتی سلک کی۔ بڑے پائنچوں کا پاجامہ، سر پر ہیٹ، منہ میں سگار، ہاتھ میں سائیکل، آنکھوں کا نور اور چہرہ کا سرور بتاتا تھا کہ دل لیلائے انقلاب کی حسین یادوں سے گل و گلزار ہے۔ یونی ورسٹی پہنچے ہی تھے کہ اچانک ایک صاحب نمودار ہوئے۔ معمولی سی شیروانی پہنے ہوئے مگر ٹوپی ندارد۔ دکنی کی اصطلاح میں قد کے اونچے پورے، پختہ عمر، سر پر سیاہ بال مگر بہت گنجان نہیں۔ بھرا بھرا چہرہ۔ چوڑی چکلی پیشانی پر پسینے کے قطروں کی قطار۔ روشن آنکھیں جن سے عزم اور عظمت جھلک رہی تھی۔ چال ڈھال سے سنجیدگی اور متانت نمایاں۔ چہرہ پر کہیں کوئی بہت نمایاں تل جو داغ کی جگہ لیا جاتا تھا۔ آواز سے کچھ تھکن کے سے آثار نمایاں تھے۔ ڈاکٹر علیم نے کہا احتشام صاحب ان سے ملیے یہ حضرت جامعہ کے طالب علم ہیں۔ چندہ کرنے کے لیے آئے ہیں مگر آپ سے چندہ نہیں چندے کا مشورہ لیں گے۔ احتشام صاحب نے اس طالب علم سے ہاتھ ملایا اور اس نے جامعہ کے آداب کے مطابق بجائے ایک ہاتھ کے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ معانقے کے درپے تھا مگر وار خالی گیا۔

احتشام صاحب نے نہ اس کے لباس کی طرف چنداں توجہ کی نہ شان نزول پر کوئی تردد نہ چندے کی طرف سے تذبذب نہ جامعہ پر اعتراض نہ ڈاکٹر صاحب پر طنز نہ کسی قسم کی کوئی بحث۔ کتنی معمولی بات اب یہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس وقت یہی بات اس وقت کے حالات و حوادث میں کتنی غیر معمولی تھی۔ کم سے کم مسلمانوں کا اور خصوصاً مسلم تعلیم یافتہ حضرات کا وطیرہ ان دنوں کچھ اور ہی تھا دل نے اتنی سی بات پر اس وقت کہا تھا یہ تو کوئی اپنے ہی جیسا ضعف الایمان قسم کا مخلص ہے۔ گو وہ شخص اب نہیں رہا مگر اس کی اتنی سی معمولی بات پر اب کتنی رعنائی خیال ہے یہ کوئی اہل دل سے پوچھے۔

احتشام صاحب نے اس طالب علم کو لائبریری میں بٹھایا اور یہ کہکر رخصت ہوئے کہ ابھی آتا ہوں پھر آپ سے باتیں ہوں گی۔ غالباً اسی مدت میں انھوں نے اپنے فرائض منصبی کی تکمیل کی اور توقع سے کچھ قبل ہی تشریف لے آئے۔ اس دوران میں لائبریری میں آنے والا کوئی مسلمان طالب علم اس نووارد کا اس کے شایان شان استقبال اور اپنا ملی فریضہ ادا کیے بغیر نہ رہ سکا کسی نے تبسم زیر لب سے کہا "مہاشے گرام سدھار سے لگتے ہیں" کسی نے بآواز خفی فرمایا "کانگریس سے چونے پاتے ہوں گے" کسی نے نعرہ لگایا "اجی ان کا چرخہ کسی نے چھین لیا ہوگا" کسی نے فکر کا اظہار کیا "کہیں گاندھی بھون کا راستہ تو نہیں بھول گئے"۔ ان بیچاروں میں سے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ جامعہ کا ایک طالب علم ہے ورنہ یقیناً جامعہ اور ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ضرور اس قبیل اور قرینے کے کلمات تحسین و آفرین سننے کا ثواب یا سرزنیہ میسر آجاتا۔

احتشام صاحب نے بڑی اپنائیت سے اس کی تنہائی پر معافی چاہی تو یہ بندہ گستاخ جھٹ بول اٹھا۔ جی نہیں ہم کھدر پوشوں کے نصیب میں تنہائی کی سعادت کہاں؟ میں تو برابر مدح صحابہ کے مناظر میں گم یا گھرا رہا اور خوش رہا۔ احتشام صاحب نے ہنس کر کہا یا تبرا کے؟

ان دنوں لکھنؤ میں مدح صحابہ اور تبرا کا بڑا زور کا دنگل یا دھما کہ تھا طالب علم کا نہ احتشام صاحب سے کوئی تعارف تھا نہ تعلق نہ موصوف کی کوئی کتاب پڑھی تھی۔ نہ کوئی تقریر سنی تھی تنقید کا علم اور جو چار جواب چل نکلا ہے وہ اس وقت اتنا نہ تھا جتنا محفلوں مشاعروں کا تھا۔ محفلیں وعظ کی بھی ہوتی تھیں اور گانے بجانے کی بھی۔ قوالی میں نظم و نثر، وجد و وعظ اور عورتوں اور عالموں کا عمل و دخل خاصا تھا۔ علیم صاحب نے احتشام صاحب کا تعارف صرف برائے نام کرایا یعنی "احتشام صاحب"۔ اس کا علیم صاحب سے اتنا ہی تعارف تھا کہ وہ "سیرت نبوی اور مستشرقین" کے مصنف اور جامعہ کے لائق فرزند ہیں۔ اس وقت بہ منصب کے معقول میں

علم کو دھراری صاحب کہکر پکارا جاتا تھا۔ اور اکثر یہ مغالطہ ہوتا تھا کہ اس زمانے کے ایک مشہور نیم سیاسی نیم مذہبی جماعت مجلس احرار سے نسبت کا اشارہ ہے۔ احتشام صاحب سے گفتگو شروع ہوئی تو یہ مغالطہ موصوف ہی نے دور کیا۔

اس زمانے میں لکھنؤ کی خاص سواری یکے تھے اس سے پہلے ان سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ دلی اور میرٹھ کے علاقوں میں تانگوں کا عام تھا۔ ——— دیہات میں بیل گاڑیوں میں بیٹھنے کی سعادت میسر آجاتی تھی مگر سواری اس درجہ عجیب اور نشست کے لحاظ سے عذاب دہ تھی کہ اس کے سفر میں بڑی کٹھن آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ احتشام صاحب بہت آرام اور اطمینان سے الوتھی پالوتھی مارے اس طرح تشریف فرما تھے جیسے کوئی دلہن پالکی میں یتی کے نیچے یا پنڈت راتما کے گیان دھیان میں مبتلا یا مسرور ہوں۔ موصوف کو یکے کی روانگی کے وقت ہم سفر کی پریشانی کا کوئی خیال یا خطرہ نہیں تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ طالب علم کی تقطیع ہوا چاہتی ہے یا دہ گرنے اور گر ہونے کی منزل سے ہم آغوش ہونے پر مائل ہے تو موصوف نے سنبھل لیتے اور سہارا دیتے ہوئے یکے کے اندر پیر رکھنے کا طریقہ بتایا۔ اس طریقہ نشست نے جامعہ کے طریقہ آداب کو جو بزرگوں سے رتا جاتا تھا برخاست اور برطرف کر دیا۔ اب احتشام صاحب، طالب علم، ایک وکیل چند موکل اور یکہ بان سب اس درجے میں آ گئے تھے کہ تفریق اور تمیز کی کوئی تہ باقی نہ رہی تھی لوگ سب سنبھل کر اور سمٹ کر بیٹھ گئے تھے مگر راستے کے گڑھے اور گھوڑے کی ٹھوکروں کا جدلیاتی عمل اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ سماج کے ارتقا کی طرح سفر کا اختتام بھی خط مستقیم میں نہیں خطوط منحنی میں تھا۔

احتشام صاحب کبھی کبھی طالب علم سے وکیل اکثر اپنے موکلوں سے اور یکہ بان برابر اپنے پوربی لہجے میں اپنے گھوڑے سے اس طرح مخاطب رہا کہ ہر موڑ، مقام اور منزل کی آسودگی سے آگاہی ہوتی رہی۔ بات ادھوری رہے گی اگر یکے کے اس سفر میں اس مظلوم کا ذکر نہ کیا جائے جو دبی ہوئی مخلوق کبھی یاد رکھی جاتی ہے۔ یہ دبی ہوئی مخلوق جب ٹھوکر یا ہنٹر کھا کر اپنا سر اور سینہ اٹھاتی تو اس کی سرکشی کے عزائم سے طالب علم پر کچھ سراسیمگی اور صعوبت کا احساس تیز ہو جاتا تھا اور احتشام صاحب کی تسلیوں لاکی لے بڑھ جاتی تھی۔ یکہ چلنے سے رکنے تک ایک لرزش خفی طالب علم کے سارے بدن پر طاری رہی۔ یکہ رکنے پر احتشام صاحب نے اترنے میں جس سے زیادہ مستعدی یا مہارت دکھائی اس سے معلوم ہوا کہ یہ سفر ان کا معمول تھا۔ نہ شیروانی سمیٹی نہ بازو پھیلائے نہ آگا پیچھا دیکھا ایک ہی جست میں یکے کی بلندی سے زمین کی پستی پر آ رہے۔ طالب علم پہلے مذبذب پھر معلق اور آخر میں مرتب ہو کر سطح زمین پر اس طرح اترا جس طرح خدا کی وحی خدا کے فرشتے کے توسط سے خدا کے برگزیدہ بندوں پر صعوبت اور سختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نازل ہوتی ہے۔

احتشام صاحب کے ساتھ یہ پہلا سفر تھا جس کی ہر صعوبت کی یاد مرحوم کے سنبھالنے اور سہارا دینے کی یاد سے مل کر جیتے ہوئے لمحوں کی حلاوت محسوس ہوتی ہے۔

احتشام صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے کتابوں، کاغذوں اور کپڑوں کے علاوہ کچھ کارکنوں سے بھی لدا پھندا پایا۔ معلوم ہوا کہ احتشام صاحب کا دولت کدہ صرف ان کا مکان نہیں ہے بلکہ کچھ طالب علموں کا اقامت خانہ بعض دانشوروں کا مہمان خانہ کچھ نوجوانوں کا مطالعہ خانہ اور کسی انقلابی جماعت کا اسلحہ خانہ بھی ہے۔ بعد کو پتہ چلا کہ اس جگہ کا نام بھی بارود خانہ تھا اس حسین اتفاق پر جی چاہا کہ ڈھایا دھماکے سے نہیں خوشی سے جھوما جائے۔ احتشام صاحب نے کمرے میں موجود اور مشغول صاحبان سے تعارف کرایا اس طرح کرایا کہ گویا یہ بھی انھی میں سے ایک ہو۔ یہ سب کچھ خلوص و خوشی کے اس معیار پر تھے جو بعد کو احتشام صاحب کا امتیازی طرز بنتے رہے تھے۔

ان میں سے ایک صاحب کا سراپا ابھی تک دل کے چوکٹے میں محفوظ اور موجود ہے۔ یہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں معاشیات کے مقالے لکھ رہے تھے۔ ہندوستان کی معاشیات لکھنؤ کی تہذیب اور اس کے متعلقہ علوم و آثار پر ان کی گہری نظر تھی۔ اشتراکیت سے بہت زیادہ متاثر اور مسرور تھے۔ میرے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ شکل و شباہت مجاز مرحوم سے بہت ملتی جلتی تھی جی نے اس وقت ان کو مجاز ہی صاحب کہنا شروع کر دیا۔ لباس اور لوازمات سب لکھنوی تھے۔ پان کی ڈبیہ جیب میں ہاتھ میں اور بیڑا منھ میں دبائے یا دبکائے رہتے تھے۔ گفتگو، گرد و پیش اور گھر بار سے یہ یکسر غیر طبقاتی معلوم ہوتے تھے۔ خوش خلقی و خوش وضعی کا ایسا مجسمہ یا مجموعہ تھے کہ ان کی کوئی بات کیفیت یا کرامت سے خالی نہ تھی۔ احتشام صاحب کو احتشام کہہ کر پکارتے، احتشام صاحب ان کو ان کے نام کے ساتھ بھائی سے مخاطب کرتے تھے۔ احتشام صاحب نے بتایا کہ نو وارد طالب علم ہے جامعہ کے لیے چندے کے لیے آیا ہے۔ بس یہ سنتے ہی بے تحاشا خوش اور بے تامل بغلگیر ہو گئے۔ جامعہ کے بعض حضرات سے واقف تھے، ایک کی نام بنام خیریت اور مصروفیت معلوم کرتے رہے بڑے خلوص سے مصر ہوئے کہ لکھنؤ کے قیام تک احتشام صاحب کا مہمان رہوں ہی میرا کیا جائے۔ اور ادارہ تعلیمات اسلام سے اپنا بوریہ بستر احتشام صاحب ہی کے اس کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔ ان کو ان کی قربت یا قیادت سے مستفید اور مسرور ہو۔ مذہب مذہبی حضرات اور اداروں سے بہت برہم بلکہ بیزار تھے لیکن ملتے تو ہمیشہ ردولی شریف کہتے تھے۔

اس عرصے میں اندر سے ماحضر برآمد ہوا۔ ایک بڑی سی سینی اس میں بہت سے برتن سب ایک بہت بڑے خوان میں چھپے اور ڈھکے ہوئے سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جھومتے جھکتے ہوئے نہایت سیدھا سادا صاف ستھرا کھانا تکلفات یا تصنعات سے یکسر پاک کھانے کی مقدار کھانے والوں کی تعداد پہ بھاری مگر کھانے کے برتن کھانے کے مقابلے کے تھے یعنی کھانے میں روٹی سالن، دال خشکہ اور سبزی تھی لیکن برتنوں میں ہر طبقے یا طرح کے برتن تھے چینی کی پلیٹیں تانبے کی رکابیاں، پیتل کے پیالے اور ایک آدھ جام سفال بھی۔ کتابوں، کاغذوں اور کاؤنٹروں پر نظر ڈالتا ہوتا تھا کہ جیسے یہ سب ہمہ وقت احتشام صاحب کی مصروفیت اور خدمت کے لیے مخصوص ہوں لیکن کھانے پر نظر ڈالتا ہوں کتابیں کاغذ اور کھانے ہی نہیں خود احتشام صاحب بھی سب کی خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد اور مصروف رہتے تھے احتشام صاحب کی ذات سے اور یہاں کوئی چیز کسی کے لیے مخصوص نہ تھی۔

کمرے میں نشست کے سامان خاصے تھے۔ کرسیاں، تپائیاں، چارپائی اور فرش بھی لیکن برخاست کے راستے محدود تنگ و تاریک تھے۔ ابتدا ہی اس وجہ سے اس گنجان آبادی میں ماحضر کا محل وقوع کسی کی سمجھ میں نہ آیا طالب علم نے کادی سے کمرہ کا ایک پٹ کھول دیا۔ اس وجہ سے کمرے میں یکایک روشنی اور کچھ ہوا کا گذر ہوا مگر احتشام صاحب توقف کے بغیر پٹ پھر سے بند کر دیا۔ فرمایا "مکھیاں آپ کو پریشان کر دیں گی اور کھانے میں خلل ڈالیں گی۔"

کھانے کو تاریکی میں کھلانے کھانے کی ایک کیفیت یا کرامت کی تصدیق اس دن ہوئی گھر میں بزرگوں سے سننے میں آیا تھا کہ دادا کے استاد اور پیر حضرت گنگوہی ایک بار میرٹھ تشریف لائے تھے قیام محلہ کی مسجد میں کیا۔ استاد اور مرشد کو شب کے کھانے پر گھر پر مدعو کر لیا جو گھر کم اور دواخانہ یا عبادت خانہ زیادہ تھا۔ پرانے لوگوں میں استاد اور مرید میں چنداں تکلف نہ ہوتا۔ دادا نے حضرت سے پوچھا کہ اگر کھانے میں کسی خاص چیز سے رغبت ہو تو۔ حضرت گنگوہی نے کہا صرف میٹھے چاول گڑ سے تیار کیے جائیں اور کچھ نہیں۔ مرید مرشد کا حکم حرف بحرف بجا لایا

چاول تیار کیے گئے لیکن ان میں متعویات کا زیادہ سے زیادہ صرف اور مقدار ملحوظ رہی۔ میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا ان کے قصے اور قول ہی سنے ہیں لیکن دادی کے قدم چھونے کی سعادت مجھے میسر آئی ہے اور ان کے ہاتھ سے بھی کام و دہن نے لذت پائی ہے۔ دادی نے اپنی مہارت اور فن طباخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ چاول تیار کر لیے۔ مغرب کے بعد جب دادا نے حضرت سے کھانے کی استدعا کی تو حضرت اپنے سب معتقدین سمیت گھر پر تشریف لے آئے۔ یہاں اتنے مجمع کی گنجائش نہ تھی۔ مسجد کے سارے مصلیوں کی یہ سمائی مشکل نظر آئی تو دادا نے اپنی پریشانی حضرت سے کہی۔ حضرت نے ایثار و مالی یا کفی اصطلاح میں اپنی دستی دادا کو دی اور حکم دیا کہ کھانے کے برتن پر یہ ڈھانپ دیا جائے اور کھانا سب کو کھلانا شروع کر دیا جائے۔ جب تک سب لوگ نہ کھا لیں یہ کپڑا بدستور کھانے کے برتن پر اسی طرح سوار یا سایہ کیے رہے۔ والد مرحوم کی روایت ہے کہ اس طرح جب سب مصلیوں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھا لیا تو حضرت نے دادا سے دریافت کیا کہ اب کوئی اور تو کھانے والا باقی نہیں ہے۔ دادا نے کہا حضرت کی برکت سے سب فارغ ہو چکے تو انھوں نے اپنا کپڑا واپس لے لیا۔ اس روایت کی چشم دید تصدیق اس دن عملی تقریب کے مصنف کے کمرے میں دیکھنے میں آئی۔ احتشام صاحب نے کھانے کی سینی کی چارپائی کے نیچے سب سے محفوظ جگہ تاریکی اور تنگی میں پائی معلوم ہوتا تھا کہ کسی مصلحت سے کھانا انڈر گراؤنڈ کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر کھانے کی تقسیم یا ماحضر کے طریقۂ تقسیم کا مسئلہ بھی محل نظر تھا۔ مغربی یو پی میں کھانا روٹی کو کہا جاتا ہے۔ دکن میں صرف چاول کو۔ روٹی کے ساتھ سالن کا استعمال لازمی ہے جس کی مقدار روٹی سے بہت کم ہوتی ہے۔ چاول کے ساتھ دال کا استعمال مساوی اور مزید ار ہوتا ہے۔ دکن میں صرف چاول کا استعمال ہوتا ہے اور اس کی بقدر سالن یا دال کا۔ مغربی یو پی میں صرف روٹی کا استعمال ہوتا ہے لیکن مشرقی یو پی میں روٹی اور چاول دونوں ایک ساتھ لائے اور کھائے جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر تقدیم و تاخیر کا اختلاف ہوتا ہے۔

احتشام صاحب نے اس اختلاف کو اس طرح دور کیا کہ کھانے والوں کو حق خود ارادیت کی آزادی با عزت بخشدی۔ اور قومی یک جہتی یا بقائے باہمی کا اولین تجربہ کیا جو کامیاب رہا۔ بعض صاحبان نے روٹی کھانے میں سبقت کی بعض نے اسے مؤخر رکھا۔

ایسی پُربرکت بے تکلف اور باسعادت دعوت کی یہ مثال میرے لیے خلوص و خیر کے حاتم کی ملاقات بن گئی۔

جن حضرات کو کبھی مشہور عالم دین مولانا حسین احمد مدنیؒ کے دسترخوان پر دیوبند میں کھانے کی سعادت ملی ہے وہ گواہی دیں گے کہ مولانا کی آمدنی کا بڑا حصہ اس مد طعام کے فیض عام پہ خرچ ہوتا تھا۔ مولانا کے دل کی طرح ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ البتہ احتشام صاحب کے دسترخوان اور مولانا کے دسترخوان کا ایک خصوصی فرق تھا۔ مولانا کے ہاں کھانا جس طرح ایک ہوتا تھا اسی طرح اس کا برتن بھی وحدہٗ لاشریک تھا۔ مجھے یہ سعادت میسر آئی ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ میری اس سعادت کے ہمراہ میرے ہم نوالہ و ہم پیالہ نہ صرف دینی قسم کے حضرات اور طالب علم ہوتے تھے بلکہ مرحوم ڈاکٹر اشرف بھی اس طریق طعام میں میری طرح مطمئن اور مستجیب پائے گئے۔

احتشام صاحب مرحوم کے پاس وحدت اکیت کا وہ محل اور مرتبہ نہ تھا جسے حضرت مدنی اسلامی طریق طعام فرماتے تھے۔ ڈاکٹر اشرف مرحوم گواہی دیتے تھے کہ اس طرح ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونا محبت و برکت اور خلوص و سعادت سے خالی نہیں ہوتا۔ رکابیوں کی تفریق یا تقسیم میں ایک نفسیاتی حجاب یہ بھی حائل رہتا ہے کہ کس نے کتنی بار کس تعداد سے ماحضر تناول یا تصرف فرمایا۔ جب رکابیوں

یا بیٹیوں کا وسیلہ درمیان میں نہیں ہوتا تو پھر ہر شے اگر اپنے شکم یا شوق کی تکمیل یا تعمیل اپنی شخصیت کے شایان شان کرتا ہے۔
احتشام صاحب کے دسترخوان پر اس دن لکھنؤ کی مٹھائیاں نہ ہوتیں تو مجھے اس کا شبہ یا اس کی شکایت رہتی کہ ادب کی طرح کھانا بھی اپنی معاشرت سے کچھ نہ کچھ واسطہ اور وابستہ ہے ادب کے مذاق کی طرح کھانے کے مزے اطوار یا اشیاء اپنے ماحول کے مطابق اور متعلق ہوئی ہیں۔ احتشام صاحب کا پورب کے ساکنوں سے بہت پائندہ اور پرانا رشتہ تھا۔ مٹھائیاں اور آم اس کے ثمر اور ثبوت تھے۔
بزرگوں میں احتشام صاحب کے علاوہ اور کسی کو میں نے اپنے سے اتنا جلد بے تکلف اور اس قدر قریب نہیں پایا۔
ملک کی تقسیم کے نتیجہ میں جب دہلی خاک و خون میں نہا رہی تھی تو میں جامعہ کے طالب علموں اور کارکنوں کے ساتھ مسلمان پناہ گزینوں کے کیمپ میں ان کی خدمت پر مامور اور مصروف تھا۔ اس زمانے میں گاندھی جی کو بار بار قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ان کے آخری دن تھے اور تقریباً ہر دن ان تک کسی نہ کسی بہانے رسائی ہوتی تھی ذاکر صاحب مرحوم ان کیمپوں کے نگران تھے رفیع احمد قدوائی مرحوم اور ان کا پورا خاندان ہر طرح کی قیدوں اور قاعدوں کو چھوڑ کر ہم سے اس طرح آملا جس طرح سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک۔ علماء اور دلی کے عمائدین میں مولانا حفظ الرحمان مرحوم نے اس نفسا نفسی کے زمانے میں جیسی بے خوفی اور ایمانی قوت کا مظاہرہ کیا اس سے یہ یقین ضرور ہو گیا کہ قیامت میں پیارے نبی کے ساتھ اس کے جو چہیتے اشخاص یا احباب ہوں گے جن کی فہرست الکتاب نے دی ہے وہ کس کمال یا کردار کی وجہ سے اس نبی کے چہیتے ہوں گے۔ جن سے خدا خوش ہو جائے ان کے صاحب نصیب ہونے میں کیا شبہ مگر جو خدا سے خوش ہو جائیں ان کے صاحب نجات ہونے پر جتنا بھی رشک کیا جائے کم ہے۔
دہلی میں قیامت کی یہ نمائش یا نمونہ ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ لکھنؤ میں مولانا آزاد ابوالکلام نے مسلمانوں کی ایک نمائندہ کانفرنس طلب کر لی۔ جامعہ کے بہت سے ساتھیوں اور سرداروں کے ساتھ میں بھی اپنی جان پر کھیل کر لکھنؤ پہنچا تھا سال دو سال پہلے اسی لکھنؤ میں جو نعرے یا نغمے گونج رہے تھے اب وہ نوحوں یا نالوں میں بدل چکے تھے۔ اسی لکھنؤ میں سال دو سال قبل جن عمائدین یا قائدین کے چرچے اور چہچہے تھے وہ سب کے سب دیار پورب سے دیار مغرب میں جا بسے۔ جس شور یا شیخی کا بھوت بول بالا تھا وہ سب شرمندگی یا شامت میں منتقل ہو چکی تھی بقول حفیظ میرٹھی کے ایک سال قبل عالم یہ تھا کہ ؎

کہاں وہ گرمیٔ گفتار ہم ہی سب کچھ ہیں

اور اب سال بھر بعد ساری سیاسی فضا میں یہ المیہ گونج رہا تھا ؎

کہاں وہ سردیٔ کردار ہم تو کچھ بھی نہیں

یہ کانفرنس بھی اپنی نوعیت اور نیرنگی کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھی لیکن یہاں اس کے ذکر کا موقع نہیں۔ اس کانفرنس کا ایک نتیجہ یا تکملہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا وہ اجلاس تھا جو اس کے ساتھ انہی دنوں لکھنؤ میں ہوا۔ مولانا حسرت موہانی، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر علیم، اور بہت سے ترقی پسندوں کے ساتھ پھر احتشام صاحب سے غالباً دوسری ملاقات ہوئی۔ وقت کس کے روکے رکا ہے مگر یہ زمانہ وہ تھا جو قیامت کی چال چل رہا تھا۔ اور قوموں کے بننے بگڑنے کی چغلی کھا رہا تھا۔ شاید اس کا اثر تھا کہ اب احتشام صاحب کا چمکتا ہوا چہرہ کملا سا گیا تھا ان کی روشن آنکھیں اب بھی روشن تھیں لیکن ان کے اردگرد ایک سیاہی کا حلقہ نمایاں ہو کر کچھ کہہ رہا تھا ان کا دوہرا بدن اب بھی دوہرا تھا لیکن محسوس یہ ہوتا تھا کہ یہ کسی بوجھ سے دب سا گیا ہے۔ ان کی چوڑی چکلی پیشانی اب بھی چوڑی چکلی تھی مگر اس پر وقت کی چند شکنیں ابھر آئی تھیں۔ بظاہر اب بھی احتشام صاحب ہر طرح مطمئن اور مسرور تھے اب بھی چال ڈھال سے متانت اور سنجیدگی ٹپکے پڑتی تھی۔ اب بھی وہی خلوص اور خیر خواہی کی مستی

سرت ان پر چھائی ہوئی تھی لیکن اس ظاہر کا ایک باطن بھی تھا جسے تقسیم کے سانحے، صدمے نے مضمحل اور مضطرب
یا۔ آسودگی کے احتشام صاحب آزمائش کے احتشام صاحب سے مختلف نہ تھے۔ اب دل نے ان کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا تھا محض
ند وافکار کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی طبیعت کی سادگی اور طرز حیات کی سچائی کی وجہ سے بھی۔ جب تک پی سی جوشی اور ڈاکٹر
رف ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کر رہے تھے تو ان حضرات سے صرف یاد اللہ تھی۔ شرف با ایمان ہونے کی نوبت
ید نہ آئی تھی۔ لیکن کانفرنس میں ڈاکٹر احمد اور ڈاکٹر اشرف کی وجہ سے اور ترقی پسند مصنفین میں حسرت موہانی اور احتشام حسین
جہ سے بیک وقت پارٹی اور ترقی پسندی دونوں سے خاصا بے تحاب اور بے تکلف ہونا پڑا۔ اس کانفرنس کا ایک منظر میں کبھی نہ
لا سکوں گا۔ ڈاکٹر علیم نے جو خلوت میں سنجیدہ اور ساکت لیکن جلوت میں مجسم گل افشاں گفتار بن جاتے ہیں۔ فحاشی کے خلاف ایک
یز پیش کی۔ اور فحاشی لذت اندوزی اور عریانیت کے خلاف ایسی پرمغز دلیلیں دیں کہ حضرات دردو وسلام اور خواتین جامعہ تمام
، مایوس و ملفوف ہونے کے قریب تھیں کہ ایک طرف سے حسرت موہانی نے اپنی خفیف آواز میں یہ ترمیم پیش کی کہ انجمن لطیف
ن کی میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتی۔ پورا مجمع ہنسی سے بے حال تھا۔ احتشام صاحب کھل کھلا کر کم ہنستے تھے مگر اس موقع پردہ
دا پنے کو نہ سنبھال سکے۔ سوائے مولانا حسرت موہانی کے اور کوئی نہ تھا جو ہنسی سے بے حال نہ ہو۔ مگر حسرت موہانی کے چہرے پر تبسم کی
یک لکیر یا لہر تک بھی نہ تھی۔ قوال دوسروں پر کس طرح وجد و رقص یا وصل و وفات کی کیفیت طاری کر دیتا ہے اور خود اپنے حواس بحا
ل رہتا ہے اس کا تجربہ اس محفل اور موقع پر ہوا۔ لطیف ہونا کی ترمیم اور حسرت موہانی کا مقدس سراپا عجیب و غریب بات تھی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ لکھنؤ میں جہاں احتشام صاحب اور دوسرے ترقی پسند اتنی بڑی تعداد میں ہوں وہاں مجاز صاحب نہ ہوں۔
سرت موہانی پر بے تحاشا برس رہے تھے۔ میں نے کہا غصہ دھونے کے لیے ایک پیالی چائے ہو جائے کہنے لگے ہرگز نہیں۔ میں نے کہا
تھا تو پان سہی اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے تو میں نے سگریٹ کی دہائی دی تو مان گئے۔ کہا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر اب
یرے سامنے حسرت موہانی کا نام نہ لیجیے۔

لکھنؤ میں متعدد بار احتشام صاحب سے ملنا ہوا اور ہمیشہ میں نے ان میں خلوص و خیر کی وہ سنبھلی ہوئی کیفیت پائی جس کی مجاز
صاحب میں زیادتی تھی۔ انجمن سے وابستگی کے بعد ان سے ملنے کے ہر طرح کے مواقع آئے۔ وہ برابر انجمن کی قیادت کا حق ادا کرتے
رہے۔

وہ زمانہ جو پی ٹی رنڈیوے کی رہنمائی یا ان کے رزمیہ کا نقطۂ عروج تھا یہی زمانہ انجمن کے لیے بہت کٹھن تھا۔ اس زمانے
میں کمیونسٹ پارٹی، انجمن ترقی پسند مصنفین اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن سب ایک ہی تسبیح کے دانے یا ایک ہی زلف کے دیوانے سمجھے
جاتے تھے عجیب اتفاق ہوا کہ جب پارٹی نیم قانونی قرار پائی تو انجمن کی سرگرمیاں کچھ تیز ہو گئیں اور ادیبوں نے کچھ اس طرح کے
تجربے یا طریقے اپنائے جن میں ادبیت کم یا بہت کسیلی تھی۔ کبھی انجمن کو پارٹی کے تعلق یا توسط کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی۔
اسی زمانے میں انجمن کی ایک کانفرنس پھر لکھنؤ میں ہوئی اور عام خیال یہ تھا کہ یہ کانفرنس کسی طریقہ سے نہ ہو سکے گی۔ حکومت نے
اس میں ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں لیکن کارکن کانفرنس کرنے پر آمادہ بلکہ اڑے ہوئے تھے۔ لکھنؤ میں کانفرنس کے شرکا
آچکے تھے لیکن ان کے قیام کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہ تھی۔ افواہ یہ تھی کہ اگر عام جلسہ کیا گیا تو حکومت اس کی اجازت نہ دے گی۔ اس لیے
اس کانفرنس کی کارروائی نیم خفیہ قرار پائی۔ کارکنوں کو کوئی محفوظ پناہ گاہ تلاش کرنے میں جب کامیابی نہ ہوئی تو اسے تعمیر کرنے کی
کوشش بھی کی گئی۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ ایسے غیر معمولی سیاسی حالات میں سیاسی کام یا شورہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ محفوظ

ام یا تو عبادت خانے یا پھر اس کے بعد مناسب پناہ گاہ طوائفوں کے اڈے۔ ان دونوں مقامات پر صرف انہی حضرات کے حلقے یا وم گوارا کیے جا سکتے ہیں جو اپنے عمل کو یا عبادت کے رنگ میں یا عیاشی کی پھبنک میں۔ سلیقہ کدمیہ دونوں جگہ جنھیں یا اکیان مسا ستا ہے۔ لکھنؤ میں اس نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے ایک عزاخانہ مہمانوں کے قیام کے لیے منتخب کیا گیا جہاں بیک وقت رنگ اور ھنگ دونوں کا سنگم ممکن تھا۔ لیکن بعض خواتین کی موجودگی نے اس قیام گاہ کو مخدوش اور مشتبہ بنا دیا اور مجبوراً تمام کارکنوں کو یام کے لیے ایک معمولی سے ہوٹل میں اس کا وہ ہال لینا پڑا جو ڈرامہ کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں ایک تو جلسوں کی آسانی تھی وسرے قیام و طعام میں بھی چنداں دشواری نہ تھی۔ محل وقوع کے لحاظ سے یہ ہوٹل شارع عام سے بہت ہٹا ہوا اور معیار کے لحاظ ہت گھٹا تھا اس ہوٹل کے ایک تفریحی ہال میں کانفرنس کی سب کارروائی انجام پائی خطرے سے بچنے کے لیے ایک طریقہ یہ ختیار کیا گیا کہ کانفرنس کے سب مباحثے رات کو رکھے گئے۔ رات بھر رت جگے کے بعد جب لوگ بحث و مباحثے سے پوری طرح تھک جاتے تھے تو صبح ہوتے ہوتے یہ دنگل ختم ہو جاتے اور دن بھر لوگ اپنے بستر کھول کر آرام کرتے رہتے تھے۔ ان جلسوں میں احتشام صاحب اور ڈاکٹر علیم صاحب بطور مہمان خصوصی اور میزبان عمومی کے طور پر بڑی پابندی اور پراسرار طریقے پر آتے تھے۔

ڈاکٹر علیم صاحب جس محفل یا مجلس میں شریک ہوں خواہ صدر کوئی ہو مگر صدارت انہی کے پہلو میں اس طرح پہنچ جاتی ہے جس طرح نشیب میں پانی۔ اور ان سے اس طرح نباہ کرتی یا ناتا قائم کرتی ہے جس طرح مچھلی پانی سے۔ صدارت کے فن پر جو قدرت اور قوت علیم صاحب کو حاصل ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا کہ صدارت مادر زاد ہوتی ہے۔ اور پروانے کی طرح یہ تفریق نہیں کرتی کہ چراغ حرم کا ہے یا دیر کا۔ ان سب جلسوں میں علیم صاحب کی صدارت مستقل اور متواتر رہی۔ جب کانفرنس کی ضابطے کی کارروائی پوری ہو گئی یعنی سب تجویزیں پاس ہو گئیں اور کسی قسم کی کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی سب خطرے ٹل گئے تو بعض خطر پسندوں کو اس سے تسکین نہ ہوئی وہ چاہتے تھے کہ کانفرنس ایک جلوس ضرور نکالے۔ کچھ لوگ اس کے حامی نہ تھے ان کا کہنا تھا کہ جب عام جگہ پر جلسہ بھی نہیں کیا جا سکتا تو جلوس نکالنا کیسے ممکن ہے؟ لیکن جب معاملہ جذبات کا ہو تو پھر امکان کی بات خارج از بحث ہو جاتی ہے۔

ابتدا میں احتشام صاحب بھی جلوس کی حمایت میں نہ تھے لیکن جوں جوں اس کے حامیوں کا جوش بڑھتا گیا احتشام صاحب بٹتے گئے۔ اور آخر وہ بھی جلوس کی حمایت کا دم بھرنے لگے۔ بعد کو پتہ چلا کہ احتشام صاحب کے اس رویے کی تبدیلی کی تہ میں آمد نہ تھی آورد تھی۔ چنانچہ جلوس نکالا گیا۔ ڈاکٹر علیم صاحب اور احتشام صاحب نے بھی جلوس کے اول و آخر میں شرکت کی۔ ایسے احتیاط کیے یا اتفاق کہ گلی کوچوں سے اس کے گذرنے میں رات ہو گئی جس وقت جلوس اہم مقامات پر پہنچا تو لکھنؤ کے بڑے بڑے بازار تقریباً بند ہو گئے تھے جلوس کی تعداد صرف کانفرنس کے شرکا تک محدود رہی گو لوگوں نے نعرے لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر کسی جگہ نہ پولیس نے مداخلت کی نہ اور لوگوں نے۔ البتہ جلوس کا استقبال کرنے کے لیے اکثر حلوائیوں کی دوکانوں کے قریب کتوں کا غول ضرور ملتا رہا۔ لیکن مداخلت انھوں نے بھی نہ کی۔ غالباً سوچتے ہوں گے کہ یہ لوگ ابھی رزق کے لیے صرف چیخیتے چلاتے ہیں۔ مزاحمت کرنے یا یلغار کرنے کا وقت رزق میسر آنے پر ہی مناسب ہے۔ غرض انھوں نے بھی ادیبوں اور شاعروں کے جلوس سے مداخلت کرنا کچھ قبل از وقت محسوس کیا۔

جلوس کی قیادت کے لیے مجاز صاحب سے بہتر اور کون شخصیت مناسب ہو سکتی تھی۔ جھنڈا انہی کے ہاتھ میں تھا۔ قدرت نے انھیں قائد بنایا تھا مگر یہ بے چارے معاشیات کے تحقیقی مسئلوں میں پھنس کر بڑی سخت آزمائش میں پڑ گئے۔ نہ محقق بن سکے

بائد۔ میں نے اس کانفرنس سے متاثر ہو کر ایک مضمون میرٹھ کالج میگزین میں شائع کیا تھا جس میں اس طرح کے جلسے جلوسوں پر طنز کیا گیا تھا۔ اسے احتشام صاحب کی خدمت میں بھی روانہ کیا سوا قسمت سے یہ کہیں مجازی صاحب کی بھی نظر پڑ گیا۔ ایسے بگڑے کہ پھر کبھی نہ منے میں نے بہت کوشش کی صلح صفائی ہو جائے مگر اس لڑائی کی مدتوں صفائی نہ ہو سکی۔

لکھنؤ کی اس کانفرنس میں احتشام صاحب سے بار بار ملنے اور بہت بحث کرنے کے مواقع ملے ان میں ایک طرف اپنے خیالات کی پختگی کا عالم تھا دوسری طرف مزاج میں ایسی سادگی تھی کہ کبھی نہ خفا ہوئے نہ بات کہنے کے موقع پر خاموش۔ جس ہوٹل کے ڈرامے کے ہال میں مصنفین کا قیام تھا اس میں تمام ضرورتیں پوری کرنے کی پابندی یا بیچ آ پڑا تھا۔ اس لیے فضا کچھ بہت خوشگوار نہ تھی ہال کے اکثر حصوں میں بستر کھلے رہتے تھے اور رات کو جلسوں کے وقت یہ لپیٹ کر ادھر ادھر کونوں میں چھپا دیے یا چپکا دیے جاتے تھے۔ اکثر ادیب اور فنکار خواتین و حضرات کے زمرے میں تھے ڈاکٹر علیم صاحب اور احتشام صاحب مہمان خصوصی یا مقررین کے درجے اور حیثیت کے تھے۔ اتفاق سے اس ہال میں ایک کرسی مل گئی تھی جو ڈاکٹر علیم کے لیے مخصوص تھی۔ اور علیم صاحب نے اس سے فائدہ بھی خوب لیا۔ احتشام صاحب کے لیے دیر تک بغیر کرسی کے فرش پر بیٹھنا دشوار تھا۔ سب کو اس دشواری کا اندازہ تھا فرش بہت معمولی تھا احتشام صاحب کو اس پر بیٹھنے میں تکلف نہ ہوتا تھا بلکہ تکلیف تھی۔ پہلی بار جب یہ صورت حال پیش آئی تو اس پر خاصی بحث رہی اور کوئی حل نہ نکل سکا۔ ایک بار ڈاکٹر علیم صاحب نے اپنی کرسی پیش کرنی چاہی تو احتشام صاحب نے اسے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ مجھے صدارت نہیں کرنی ہے۔ ہم میں سے کسی کو یہ اچھا نہ معلوم ہوا کہ احتشام صاحب اس طرح تکلیف سے بیٹھیں انسانی کردار کا مظاہرہ کیسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں کیسی خوبی اور خصوصیت سے ہوتا ہے۔ احتشام صاحب کو فرش پر بیٹھنے میں تو تکلیف ہوتی تھی مگر اسے انھوں نے خاموشی اور خوبی سے برداشت کیا مگر جب ان کو یہ احساس ہوا کہ ان کی اس معمولی سی تکلیف سے پورے مجمع میں ایک طرح کی بے چینی اور تکلیف ہے تو اس صورت حال کا احساس ہوتے ہی موصوف نے مجھے اشارہ کیا کہ ایک بستر بند ان کے قریب کر دوں۔ احتشام صاحب اس بستر بند پر جو خاصا بڑا تھا اور دکنی اصطلاح کے مطابق بیٹھا ہاتھی سا تھا اس پر آرام سے سوار ہو گئے۔ موصوف کی اس بے تکلفی پر مجمع نے تالیاں بجا کر اپنی خوشنودی کا سچا اظہار کیا یہ سادگی سچائی اور بے تکلفی احتشام صاحب کے کردار کی بنیادی بڑائی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم اور ادبی محفلوں کے سلسلے میں ان سے ملنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کے بہت سے موقعے ملے اور ان کے خلوص و سادگی کے نقوش جو پہلی بار دل پر نقش ہو گئے تھے وہ نقش بہ نگار اور نور ہوتے چلے گئے۔

باوجود متعدد ملاقاتوں کے میں کبھی مرحوم سے ایک غرض مند کے طور پر نہ ملا تھا غرض مند کے ساتھ غرض پوری کرنے والوں کا معاملہ بڑا نازک اور نرالا ہوتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ غرض مند کو ٹہلانے غرض کو ٹوکنے اور غرض مندوں کو ٹٹولنے میں بہت سا وقت قوت اور عمل صرف ہو جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر اکثر بزرگوں کا بھرم کھل جاتا ہے۔ میرا جی ایسے پیران رسا سے بخوبی واقف اور ان کے حربوں اور حملوں سے اچھی طرح مجروح یا منقش ہے۔ ایک بار ایک غرض مند کی حیثیت سے مجھے بھی احتشام صاحب سے واسطہ پڑا۔ اور میں مطمئن اور مسرور ہوں کہ اپنی حد تک مرحوم نے معاملہ کو سمجھنے اور سلجھانے کی کوششیں کیں ٹالنے اور ٹوکنے کی کوئی چال نہیں چلی اور یہ بھی ان کے کردار کا وہی حسین پہلو ہے جو ہیرے کی طرح انمول اور آبدار ہے

زمانہ وہ تھا جب ہر جگہ سے کالج کی سطح پر اردو کے شعبے ٹوٹ رہے تھے اور جہاں ٹوٹ نہ سکتے تھے وہاں توڑے جانے کا ہر پہلو آزمایا جا رہا تھا۔ اردو میں ایم اے کرنے کی ہمت یا حوصلہ کرنے والے دیوانے تو ہر زمانے میں ملتے ہیں مگر شمالی ہندوستان

کی حد تک آزادی کے اولین پنج سالہ دور میں اردو کی قسمت قتل اور قیامت کی ملی جلی شدت اور مدت کی حامل تھی۔ علی گڑھ میں بھی جسے اردو کا قلعہ یا قصر کہا جاسکتا ہے اُردو کے طالب علم معدودے چند تھے اور یہ بھی جس طرح مہیا یا مفتوح کیے جاتے تھے ان کی کہانی بڑی دلچسپ ہے مگر ابھی بیان نہیں کی جاسکتی یا سننے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

اردو میں ایم اے کرنے کے بعد میں تلاش معاش میں سرگرداں اور سراسیمہ تھا۔

مرحوم رفیع احمد قدوائی میرے بڑے محسن اور مشکل کشا تھے کسی نے کہا وہ اگر چاہیں تو ملازمت کی مشکل آنکھ جھپکتے آسان ہوسکتی ہے۔ رفیع صاحب مرحوم عجیب وغریب خوبیوں کے حامل حاجت مندوں کے بڑے ہمدرد اور دل کے حاتم تھے۔ اگرچہ وہ ایک کامیاب سیاست داں تھے مواقع کے اونچ نیچ کے محرم اکھاڑے پچھاڑ کے فن کے ماہر مگر معاملے کے بڑے معتبر تھے۔ اپنے مخالف کو چیت کرنا گویا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دکنی اصطلاح کے مطابق گھی کھانا شکر سے اور دنیا کرنا مکر سے۔ شکر کھانے کا حال تو ان کے شیدا شکر کے شوقین کو ہوگا۔ مگر دنیا برتنے میں ایک نیکی میں ان کا مرتبہ سب سے برتر تھا۔ یہ نیکی ان میں اپنی نرالی تھی کہ بڑے بڑے عالموں، معلموں، یا درویشی میں بھی شاید ڈھونڈے سے مل سکے۔ وہ اتنی ہی بات کہتے تھے جتنی خود کرسکتے تھے جس بات کو ذرا مشکل یا مشکوک جانتے اس کے کرنے کا کبھی وعدہ نہ کرتے دنیا کی کوئی مشکل ایسی نہ تھی جسے وہ آسان نہ کرنا جانتے ہوں پھر بھی نہ تھے۔ ان کے احسان اور عنایتوں کی بارش مجھ پر اتنی زیادہ تھی جس کا تخمینہ یا تصور کسی طرح نہیں کیا جاسکتا ان کے منصب مقبولیت کی وجہ سے ان کی مصروفیتوں کا دائرہ ان کے دل کی طرح وسیع تھا اس لیے ان سے ملنا آسان نہ تھا۔ ان سے کوئی منوانا بھی جوئے شیر کا لانا تھا لیکن شاید میرے ساتھ یہ خصوصیت تھی کہ عام طور پر جس کام کے لیے کہتا وہ ہوجاتا تھا۔ کسی کام کے خط بھی لکھتا تو عام طور پر وہ کام کر دیتے تھے مگر خط کا جواب کم ہی دیتے تھے۔ ۱۹۴۵ء سے ان سے تعارف اور تعلق تھا اس عرصے ان کے انتقال تک بارہا ان سے ملنا ہوا لیکن کبھی کوئی ملاقات یا گفتگو تین چار منٹ سے زیادہ نہ ہوتی۔ وہ کام کرتے تھے گو بہت کم کرتے تھے۔ لکھنؤ کے کسی کالج میں دکنی اصطلاح کے مطابق ایک جائداد خالی تھی رفیع صاحب چاہتے تو یہ مشکل چٹکی بجاتے ہوجاتی مگر ان تک پہنچنا جائداد پانے سے کم مشکل نہ تھا۔ ان کے منصب کی مصروفیتوں کے علاوہ ان کے احباب کا حلقہ بھی بہت بڑا ہجوم کار کی وجہ سے ان کی صحت بہت متاثر ہوجاتی تھی اور جب معالج انھیں مجبور کرتے تو وہ اچانک جان بچانے کی خاطر روپوش ہوجاتے تھے۔ اپنی خصوصی شفقت کی بنا پر انھوں نے ایک بار اپنی روپوشی کا پتہ بھی بتادیا تھا مگر یہ نہ کہا تھا کہ میں اس سے فائدہ اٹھاؤں میں دہلی میں ان کے تعاقب میں پہنچا تو اتفاق سے اس مدت میں انھیں روپوشی کی حاجت پیش آئی۔ اس بے کاری نے مجھ میں ایک بے صبری پیدا کردی تھی کہ ہر چیز اپنی قسمت کی طرح روپوش سی نظر آتی تھی غرض مندی بھی ہے ان دنوں میرے جنوں نے کہا کیوں نہ نئے ویرانے تلاش کیے جائیں اور میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ان نئے کی تلاش میں دہلی سے لکھنؤ پہنچ گیا۔ قسمت کی قلابازیاں کبھی کبھی قضا و قدر کی شکل یا شبیہ اختیار کرلیتی ہیں۔ لکھنؤ پہنچ کر برآری کا کوئی امکان نہ رہا تو دل نے کہا کیوں نہ اس در پر بھی دستک دیکر دیکھا جائے جس کا پتہ تھے اس قدر معلوم جس قدر پروانے کو شمع کا۔ گو عقل ڈراتی رہی کہ ؎

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

آخر دل اور دماغ کی اس کشمکش میں میں دسس تہ خانہ تک پہنچ گیا جہاں رفیع صاحب ایسی خنکی اور خاموشی میں پلے گئے زیادہ خفیہ اور خوبی کی جگہ خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ مجھے یہاں دیکھ کر چکرا سے گئے پوچھا یہاں کیسے پہنچ گئے؟ میں

صرف یہ عرض کروں گا کہ کیوں حاضر ہوا؟ پہلے کچھ ہنسے پھر آنکھیں بند کرلیں اور کچھ سوچنے لگے۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے اب میں
دیکھتا ان کے لیے! محرم ہو گیا ہوں یا انھیں اپنی روپوشی کی جگہ کا راز فاش ہونے کا کچھ ملال سا ہے۔ توقع کی نزاکت دیکھ کر
میں بھی کچھ چپ سا ہوا تو کہا اچھا مطلب کہیئے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کے لکھنؤ میں ایک جگہ خالی ہے۔ آپ سے مشورہ کرنا ہے
کہ درخواست دوں کہ نہیں۔ کہا نہیں۔ اب تو مجھے مزید پریشانی لاحق ہوئی۔ میں نے ابھی عرض مدعا بھی نہ کیا تھا کہ رفیع صاحب نے اچانک
القط کر دیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیسے آگے بڑھے کہ انھوں نے خود ہی ذرا ترش لہجے میں پوچھا آپ کے کتنے بچے ہیں؟ میں نے کہا
ابھی بچوں کا کیا سوال؟ کہنے لگے کہنے شادی ہو گئی۔ میں نے کہا ابھی وہ بھی نہیں۔ پھر پوچھا کیا آپ کے ذمے کچھ عزیزوں یا متعلقین کی کفالت
ہے؟ میں نے پھر نفی میں جواب دیا تو فرمایا پھر آپ کیوں ملازمت کے پھیر میں پڑتے ہیں اپنی علمی قابلیت کیوں نہیں بڑھاتے؟ میں نے
عرض کیا ایم اے کر چکا ہوں قابلیت اس سے بھی بہت زیادہ ہے اب ملازمت مل جائے تو پھر قابلیت کے کام بھی کر دکھاؤں! پھر ہنسے
مگر آنکھیں بند نہیں کیں کنکھیوں سے دیکھنے لگے معلوم ہوتا تھا کہ فکر و فرار میں کچھ آنکھ مچولی سی ہو رہی ہے پھر کہنے لگے کیا ایم اے کے بعد
کوئی اور ڈگری نہیں ہے؟ میں نے کہا ریسرچ کی جا سکتی ہے مگر اس میں وقت بہت لگے گا، مصارف بہت ہوں گے، داخلے میں دشواریاں
ہوں گی اور پھر اس کے بعد آخر ملازمت ہی کی اس کٹھن وادی میں گزرنا پڑے گا۔ یوں معذوریاں مشکلیں اور مصارف یہ سب مرحلے تو انھوں
نے آنکھ جھپکتے طے کر دیے پھر پوچھا اردو کا سب سے اچھا استاد کون ہے؟ میں نے بلا تامل احتشام صاحب کا نام لیا یہ سن کر بہت
مطمئن اور مسرور ہوئے گھڑی دیکھی یہ گویا اس بات کا الارم تھا کہ اب تین منٹ ہو گئے۔ میں بھی کھڑا ہو گیا اجازت چاہی مصافحہ کے لیے
ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے انداز ایسا اختیار کیا جیسے یہ کوئی بہت غیر ضروری کام ہو پھر کہنے لگے احتشام صاحب سے ابھی مل لیجیے اگر
ضرورت ہوئی تو میں اچاریہ نریندر دیو کو فون بھی کر دوں گا۔ آچاریہ نریندر دیو اس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر
تھے۔ رفیع صاحب کے دوست اور سوشلسٹ پارٹی کے مشہور رہنما تھے بڑے ہی شریف، سیدھے اور کھرے آدمی تھے۔ دھلے
ہوئے کھدر کی طرح بے داغ مگر ذرا کھردرے سے۔ میں اسی وقت احتشام صاحب کے مکان سیدھا بارود خانہ پہنچا۔ ان کا کمرہ
ان کے کردار کی طرح کھلا پایا۔ پوری صورت حال سے میں نے انھیں واقف کر دیا۔ مجازی صاحب کو اسی طرح اسی جگہ اسی حال میں پایا۔
ان کی موجودگی سے ابتدا میں ذرا جھجکا مگر جونہی مصافحے اور معانقے کے مرحلے طے پائے میں نے محسوس کیا کہ ان کا دل آئینہ کی طرح
صاف تھا۔ مگر ان کی ترقی پسندی اور انقلاب کی آمد کے انتظار میں کوئی کمی یا کسر میں نے نہیں پائی۔ یہ لوگ بھی خوب ہوتے ہیں دل موم
کی طرح نرم مگر خیالات کی سختی کہ لوہے کے چنے چبا جائیں مگر یہ کسی طرح نہ پگھلیں نہ پسیجیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کی طرف
انجمن کی سرگرمیاں کیسی ہیں؟ میں نے کہا آپس کے اختلافات کا شکار ہے۔ ہندی والوں میں بہت زیادہ برتری کا جنون ہے اردو
والوں میں بے حد کمتری کا احساس ہے کہنے لگے یہ سب سرمایہ داروں کی چالیں ہیں بورژوا دانشور ہیں جس کل نچاتے ہیں ہم ناچتے
ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ گوئینکا ان کا ایجنٹ نہیں ہے؟ میں نے محسوس کیا کہ ہوا مخالف اور رنگ بے وفا ہیں اس لیے جلد اگر موضوع سخن
نہ بدلا تو کہیں بنتی بات نہ بگڑ جائے۔ میں نے کہا مجازی صاحب لکھنؤ آنے کی نیت صرف اس لیے ہے کہ احتشام صاحب کی رہنمائی اور
آپ کی رفاقت میسر آجائے تو شاید دماغ کے کچھ جالے صاف ہو جائیں۔ بہت خوش ہوئے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر پھر چپ ہو گئے
جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ پھر مجھے غور سے دیکھا پوچھنے لگے مولانا! مذاق تو نہیں کر رہے؟ جب میں نے صدق
نیت سے پوری سنجیدگی کے ساتھ نفی میں جواب دیا تو پھر چہرہ خوشی سے کھل کھلا اٹھا۔ احتشام صاحب سے مخاطب ہوئے احتشام!
ہیں تو مولانا مگر ہیں اپنی جامعہ کے۔

میں نے دیکھا کہ اس تمام مدت میں احتشام صاحب خاموش خاموش رہے میں نے ان کی خوشی یا جذبہ خیر خواہی میں کوئی کمی تو نہیں پائی مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کھلتے کیوں نہیں۔ چپ چپ سے کیوں ہیں؟ مجھے توقع یہ تھی کہ وہ میری آمد کی خوشی سے مجازی صاحب کی طرح بہت مسرور اور مطمئن ہوں گے مگر چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے کوئی گتھی حل کر رہے ہوں کوئی گرہ کھول رہے ہیں کسی گرانی کا اندیشہ کر رہے ہوں؟ مجازی صاحب نے سکوت کو توڑ کر کئی بار لقمہ بھی دیا کہ آپ کے لیے لکھنؤ بہترین جگہ ہے یہاں آپ کو کام کرنے کے بہت مواقع ملیں گے۔ آپ بہت خوش رہیں گے احتشام صاحب نے انھیں ایک آدھ بار ٹوکا جب دیکھا کہ بات اب پائنٹ آف آرڈر کی آ گئی ہے تو اعظمی ہنس کر بولے "بھائی مجھے بھی تو کچھ کہنے دیجیے پھر کچھ تامل تذبذب اور تغافل کے بعد بولے یہاں شاید آپ کے لیے کوئی خاص سہولت نہ ہو لیکن مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب جب آپ آ ہی گئے ہیں تو معاملہ کی بات سرور صاحب سے کر لیجیے مجھ سے جو ہو سکتا ہے وہ تو میں کروں گا ہی مگر سرور صاحب کی اجازت ضروری ہے۔ آپ ان سے مشورہ کر لیجیے اور وہ جو مشورہ دیں اس پر عمل بھی کیجیے۔ مجھے موصوف سے اس سے زیادہ کی توقع تھی ان کی اس اعانت سے میری تسلی نہ ہوئی۔ سرور صاحب سے ملنا ضروری تھا لیکن میں اس وقت تک سرور صاحب کے مزاج اور معیار سے چنداں واقف نہ تھا۔ آچاریہ نریندر دیو سے ملا تو انھوں نے بھی بہت ہمدردی کا اظہار کیا مگر وہی ٹیپ کا بند کہ سب کچھ سرور صاحب پر منحصر ہے۔ سرور صاحب سے بار بار ملتا رہا ان کے مکان پر اندازہ ہوتا کہ گفتگو شعبے میں زیادہ مفید ہوگی۔ شعبے کی صورت حال سے اندیشہ ہوتا کہ گفتگو کا سازگار ماحول شاید گھر پر آ سکے۔ رفیع صاحب، مولانا ابوالکلام ڈاکٹر عبدالحق اور دوسرے بزرگوں کا ملنے کا بہترین وقت صبح کا ہوتا تھا۔ سرور صاحب کے ہاں صبح ہوتی ہی نہ تھی۔ سرور صاحب کا دن دوپہر سے شروع ہوتا ہے اور رات کو کچھ دیر گئے ختم ہو جاتا ہے۔ بار بار گفتگو ہوتی جب سرور صاحب سے عرض مدعا کرتا مگر یہ معمہ میں حل نہ کر سکا کہ آخر سرور صاحب کیا چاہتے ہیں؟ جب کوئی گتھی اس معمہ کو نہ سلجھا سکی اور میں لکھنؤ کے قیام سے پوری طرح مایوس سا ہو گیا تو آخری طور پر سرور صاحب سے ملا نعمت اللہ روڈ سے میں اس درجہ مانوس یا منسلک ہو گئے تھے کہ لکھنؤ میں کہیں بھی جاتا نعمت اللہ روڈ پر پہنچ جاتا۔ اور سرور صاحب کے مکان پر رک جاتا۔ حسن اتفاق کہ اس ملاقات میں جب سرور صاحب یونی ورسٹی جانے کے لیے پا بہ رکاب تھے ابھی بات بھی نہ کھلا تھا کہ نہ معلوم کس سلسلے میں ذاکر صاحب کا نام آ گیا۔ اس اسم اعظم نے قفل ابجد کا کام کیا۔ سارے مرحلے اس خوبی اور خیریت سے طے ہو گئے کہ میں نے بڑے خشوع و خضوع سے لکھنؤ سے علی گڑھ کے قبلہ کی طرف رخ کیا۔ سرور صاحب نے بڑے اصرار بڑے اشتیاق اور بڑے انہماک سے مجھے یہ باور کرایا کہ میرے لیے سب سے بہتر جگہ علی گڑھ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ راز علی گڑھ آنے پر کھلا کہ اصل بات یہ تھی کہ خود سرور صاحب جلد علی گڑھ آنے والے تھے۔ میں نے یہ ساری روداد احتشام صاحب کو سنائی تو خاموشی سے سنتے رہے۔ اور فرمایا مجھے ذرا تامل اس وجہ سے تھا کام آپ یہاں کریں یا علی گڑھ میں لیکن وہاں آپ کے لیے مواقع زیادہ ہیں۔ آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔ میں نے دیکھا کہ مجازی صاحب اس تبرا کی خبر سے خوش نہیں ہیں بلکہ متاسف اور کسی قدر متغیر سے ہیں۔ ان کو اس صورت حال سے خاصی ناگواری ہوئی مگر چونکہ چائے آ چکی تھی اس لیے قدرتاً ان کی توجہ ادھر سے ادھر ہو گئی۔ ایک پیالی کے بعد ایک پیالی اور پی۔ یہ دوسری پیالی محض ان کے خلوص کی ترجمان اور طبیعت کی تسلی کی تائید میں تھی جیسے بچے کبھی غصے میں آدھی روٹی زیادہ ہی کھاتے ہیں اس طرح مخلص آدمی کم سے کم ایک پیالی چائے زیادہ پی لیتے ہیں۔ مجازی صاحب کہنے لگے چائے غصے کو دھو دیتی ہے۔ میں نے کہا غفلت کو بھی۔ علی گڑھ آنے پر وقتاً فوقتاً احتشام صاحب سے ملاقاتیں بھی رہیں اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی۔

احتشام صاحب کئی بار مختلف کاموں اور کانفرنسوں کے سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے اور میں ہر بار ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا غالباً تنقید اور عملی تنقید کے موضوع پر ان کا ایک توسیعی لکچر بھی وہاں ہوا تھا جلسے کی صدارت ضابطے کے مطابق صدر شعبہ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے کی۔ رشید صاحب عینک کا استعمال مسلسل کرتے ہیں۔ احتشام صاحب تقریر کے دوران دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے تھے۔ مقرر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے صدر جلسہ نے کچھ اس طرح کا جملہ کہا کہ مقرر نے موضوع کو ایک خاص عینک سے دیکھا ہے ڈاکٹر علیم صاحب جو جلسے میں تشریف فرما تھے اور صدارت نہیں کر رہے تھے۔ برجستہ بول پڑے جناب صدر لیکن عینک کے رنگ مختلف ہوسکتے ہیں۔ حاضرین اور ان سے بھی زیادہ خواتین اس جملے سے محظوظ ہوئیں صدر جلسہ نے خواتین کی خوشی کی خاطر یا علیم صاحب کا دل رکھنے کے لیے جلسے کی برخاستگی کا اعلان کر دیا۔

میں نے علی گڑھ آکر ریسرچ کا کام شروع کر دیا تو ایک لطیفہ یہ بھی ہوا کہ موضوع تحقیق بجائے ابوالکلام کے نظیر اکبرآبادی طے پایا۔ صدر شعبہ ابوالکلام کا بڑا احترام کرتے تھے مگر انھیں ان کے معیار تحقیق پر پہنچ جانے یا پائے جانے میں کچھ تامل یا تحقیر کے پہلو نظر آتے تھے۔ موصوف کی سب سے بڑی دلیل جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا ابوالکلام کی زندگی تھی۔ یعنی کسی شخص کا بقید حیات ہونا صرف تحقیق کی نہیں بلکہ موضوع کی سلامتی بھی۔ بہت سے موضوع پیش کیے شعبے کے اساتذہ کرام نے بھی اس مصرع طرح پر بہت سی غزلیں کہیں مگر آخر معاملہ نظیر پر آکر طے پا گیا۔ احتشام صاحب سے جب میں نے اس تبدیلی کا ذکر کیا تو تعجب کے بعد تبسم کے ساتھ نظیر ہی کا مصرع دہرایا ؎

بچاری کھیر تھی قسمت سے ہو گیا دلیا

میں نے کہا علی گڑھ کا دلیہ بھی برا نہیں اگر دال مسور کی ہو اور منہ میرا۔ کہنے لگے میں منہ کا منکر نہیں ہوں مگر موضوع کی اہمیت کا معترف ضرور ہوں۔

۵۵ء میں جب ملازمت کے سلسلے میں دیار دکن میں اقامت نصیب ہوئی یا کو بنی تو ناچار تحویل قبلہ کی صورت پیش آئی قلب اور قبلہ کا بدلنا آسان ہو تو ہو صورت اور سیرت کی تحویل یا تبدیلی کسی طرح ممکن نہیں۔ میں نے ذاکر صاحب کی آنکھیں دیکھی تھیں اور جامعہ کو اپنے سکون کا آنگن بنایا تھا مگر قسمت کی قلابازیاں قاضی الحاجات کا کام یا کارنامہ انجام دیتی ہیں ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی سرپرستی میں اب ساتھ پاسا تھا پروفیسر سروری مرحوم کا ہوا۔ ۵۵ء میں میں نے اپنے پانچ روپے کا چندہ پروفیسر سروری صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کا غالباً یہ سب سے پہلا چندہ تھا اور شاید سب سے پہلے شخص کا تھا۔ انجمن کے منصوبے بن بن کر بگڑتے رہے اور پھر بگڑتے بگڑتے آخر انجمن بن ہی گئی۔

اس طرح انجمن کی تشکیل کے بعد احتشام صاحب مرحوم کی ملاقاتوں کی تجدید ہونے لگی۔ وہ جب تک زندہ رہے انھوں نے ہر اجلاس میں شرکت کی اور جس اجلاس میں وہ شریک ہوئے میں بھی اس کی شرکت سے محروم نہ رہ سکا۔ ان کی ہر ملاقات کی کتنی ہی یادیں ہیں جن دل پر نقش بنے اور پھر سر نقش نور بن رہا۔ ادھر عرصہ سے ملاقات نہوئی تھی۔ عرصے سے انجمن کا سالانہ اجلاس نہوا تھا لیکن خط و کتابت رہتی تھی۔ نومبر ۷۲ء میں مرحوم نے اپنی آخری علالت کی اطلاع آخری صحت یابی کی بشارت سے دی تھی۔ لکھا تھا کہ مجھے انفلوئنزا ہو گیا تھا اب اچھا ہوں۔ علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ سب سیدھے راستے پر ہیں مگر آپ کہیں زد میں نہیں آئے ورنہ ضرور ملاقات ہوتی۔ میں نے سال بھر پہلے اپنی کتاب مرحوم کی خدمت میں ان کی گرانقدر رائے کے لیے حاضر کی تھی۔ جب تک کتاب پوری نہ پڑھ لی سوائے کتاب کی رسید کے اور کچھ نہ لکھا۔ میں یاددہانیاں کراتا رہا وہاں خاموشی ہی رہی۔ اس خاموشی میں ایک مدت بیت گئی۔ مجھے بھی کسی قدر شکایت سی ہوئی خطوں میں سب کچھ لکھتے رہے مگر کتاب کی بات گول کر جاتے تھے۔ آخر میں نے بھی ناچار ذکر کرنا چھوڑ دیا۔

سال بھر بعد جب ساری کتاب پڑھ ڈالی تو بڑی گرم جوشی سے مجھے لکھا کہ اردو میں اتنی اچھی کتاب ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری۔ آپ نے موضوع کا حق ادا کر دیا۔ میں اس پر بہت جلد بہت تفصیل سے لکھوں گا۔ اسے پڑھ کر آپ اتنے ہی خوش ہوں گے جتنا میں لکھ کر خوش ہوں گا۔

فطرت بشری کی یہ بوالعجبی بھی خوب ہے کہ آدم زاد اپنے سے براہ راست آگاہ اور اپنے کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے پھر بھی اس کا منتظر اور متمنی رہتا ہے کہ اپنی صورت کسی سکندر کے آئینے میں یا اپنی سیرت کسی اور کے آئے یا الفاظ میں دیکھے اور خوش ہو۔ اس بشریت کی بنا پر جی چاہتا تھا کہ مرحوم سے نہیں موت سے شکایت کروں ؎

کیا تیرا بگڑتا جو مرتا کوئی دن اور

مرحوم نے اپنا یہ وعدہ پورا کیے بغیر اس دیار کا رخ کیا جہاں صرف خلوص کی سوغات کی رسائی ہے اور یہ سرمایہ صالحہ اس عزیز، ہنا اور دیچے رفیق کے پاس اپنے ہم عصروں میں سب سے بڑھ کر ہے۔

میں نے اپنی یادوں اور ملاقاتوں کے درد اور ذہنوں میں بسے کیسے بھی احتشام حسین مرحوم کی تنقید یا ترقی پسندی پر کچھ لکھنے سے اس طرح اجتناب کیا ہے جس طرح آتش پرست آگ سے۔ اس کا وقت شاید ابھی نہیں آیا ان کی رحلت اردو تنقید کی بے وقت موت ہے۔ ان کی تنقید پر لکھنا بڑی ذمہ داری اور بہت پتا مارنے کا کام ہے لیکن اپنے دل کا بوجھ اتارنے کی خاطر اس مرد خدا کے دل کی خاطر نہیں کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دولت، صدارت، ممبری، انعام، عہدے، اعزاز اور مناصب جو حیثیت شاہوں کے مصاحبوں کے لیے رکھتے تھے ٹھیک وہی حیثیت اور حقیقت گداگروں کے مداحوں کے لیے بھی رکھتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین نے جو کچھ لکچروں میں لکھا اس کی روشنائی وقت کے ساتھ مدھم یا مستور ہو سکتی ہے لیکن ان کی ترقی پسندی کا ایک پہلو جو لکچروں سے اعلیٰ اور لفظوں سے اوپر ہے ان کی وہ ترقی پسندی ہے جسے نہ تلوار کاٹ سکتی ہے نہ طنز۔ اس ترقی پسندی کو خدا کے لفظوں میں جنت اور خلق خدا کے نزدیک دل کا سکون و سرور کہتے ہیں۔ اس تحریک سے مرحوم کا رشتہ قلمی یا قولی نہ تھا قلبی اور قطعی تھا۔ انھوں نے اپنے خلوص کا سودا کسی سے نہ کیا ترقی پسندی کی مشینری سے بھی نہیں۔ ان کے کردار میں ترقی پسندی وہی وقعت اور وقار رکھتی تھی جو آدم سے جنت کا تھا۔ انھوں نے ہاں صرف انھوں نے کبھی اس کا سودا نہیں کیا۔ عہدے، اعزاز، مناصب، مواقع اور مجبوریاں یہ سب ارواح خبیثہ کے وہ چھلاوے ہیں جو بھیس بدل بدل کر دل کے سکون و سرور پر شب خون مارتے ہیں۔ احتشام حسین کی ترقی پسندی کی جہت اور ان کے خلوص کی جنت کردار کی یہی استواری اور عظمت ہے جس کے پروفیسر احتشام حسین خود معمار بھی تھے اور معیار بھی۔

بہت سے اللہ والے حور و قیام کے بغیر جنت کا تصور نہیں کرتے نہیں کر سکتے۔ کتنے ہی ترقی پسند ہیں جو بغیر بادہ و جام کے بہار پر ایمان نہیں لاتے نہیں لا سکتے۔ لیکن کچھ خاک کے پتلے ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاک ہو کر بھی خاک سے پیوند نہیں رکھتے۔ وہ اپنے دل کے سرور و سکون کی خاکستر میں ہر طرح کے محول حادثوں اور دلاروں سے محفوظ یا با وقار رہتے ہیں۔ احتشام حسین ان ترقی پسندوں میں ایک نہیں اولین تھے۔

سید نجم الدین نقوی

پروفیسر سیّد احتشام حسین

(چند یادیں)

پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی نے اچانک یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو حرکت قلب رُک جانے کے باعث اپنی قیام گاہ دمبرا نور اللہ روڈ الہ آباد میں انتقال فرمایا اور وطن عزیز کی ساری علمی اور ادبی فضا کو مدتوں کے لیے سوگوار بنا گئے۔ آج جبکہ تقریباً ایک مہینہ گذر چکا ہے مرحوم کی موت پر برابر تعزیتی جلسے ہو رہے ہیں اور تجاویز منظور کی جا رہی ہیں، ملک کی شاید ہی کوئی قابل ذکر علمی اور ادبی شخصیت ہو جس نے احتشام صاحب کی موت پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار نہ کیا ہو اور ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بلند سے بلند خراج تحسین نہ پیش کیا ہو۔

عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کسی فرقہ، ملت، مذہب یا ادبی اور سیاسی جماعت کی کوئی عظیم ہستی اُٹھ جاتی ہے تو اُس کی موت پر ایک محدود اور اُس سے متعلق سماج ہی اس کے غم میں شریک ہوتی ہے مگر احتشام صاحب مرحوم اُن منتخب لوگوں میں تھے جن کا غم ان محدود اور تنگ حلقوں سے بلند ہو کر اُن سب کا غم بن جاتا ہے جو کسی عنوان بھی علم و ادب، فلسفہ و حکمت، سیاست و معاشرت، سائنس اور تاریخ یا قومی زندگی کے کسی پہلو سے بھی متعلق ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں احتشام صاحب اردو زبان و ادب کے عالم تھے اور لگ بھگ ۴۴ برس تک الہ آباد اور لکھنؤ یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کے فرائض شاندار طور سے انجام دیتے رہے۔ کتابیں لکھیں، تقریریں کیں، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بنائے، ڈی لٹ۔ پیدا کیے لیکن اس کے علاوہ بھی ایک حقیقت ہے وہ جہاں بھی رہے وہاں کی پوری علمی، ثقافتی اور تہذیبی فضا پر چھائے رہے۔ علم و ادب سے متعلق کوئی مجلس، کوئی کانفرنس، کوئی تنظیم اُن کے بغیر نامکمل ہوتی تھی۔ مختلف یونیورسٹیوں کی اردو کمیٹیاں ہوں یا مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی لسانی اور ادبی تنظیمیں اُن سب پر احتشام صاحب برابر نامزد ہوتے تھے۔ ساہتیہ اکیڈمی، ترقی اُردو بورڈ، ہندوستانی اکیڈمی، گجرال کمیشن، انجمن ترقی اُردو، اُردو اکیڈمی، اردو انعام کمیٹی ان تمام جماعتوں کے وہ نہایت سرگرم اور موثر رکن تھے۔ اُردو والے اُنھیں اپنا کہتے تھے، ہندی والے اپنا سمجھتے تھے، بنگال ادب سے انھیں اتنی دلچسپی تھی کہ ۱۹۶۱ء میں جب گنگا پرشاد میموریل ہال میں ٹیگور کی صد سالہ برسی منائی گئی تو احتشام صاحب کی تقریر کو بے حد پسند کیا گیا۔

اُنھوں نے امریکہ، یورپ اور روس میں ہمارے ملک کی علمی اہمیت اور اُس کی تہذیبی برتری کی پوری پوری نمائندگی کی۔ وہ ان عظیم ممالک میں جانے کے لیے مرحوم نے اپنی جانب سے کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اُن کو ان سیاحتوں کے لیے مدعو اور منتخب کیا گیا۔ اُن کی موت پر مختلف بلکہ متضاد ادبی اور سیاسی نظریات رکھنے والوں نے اظہار ہمدردی کیا اور اُن کی علمیت، شرافت، انسانیت کو کھلے دل سے خراج عقیدت پیش کیا۔ کانگریس والے ہوں کہ سوشلسٹ، کمیونسٹ ہوں کہ جماعتی، جن سنگھی ہوں یا ہندو اور سکھوں نے ایک

زبان ہو کر مرحوم کو زبردست عالم، عظیم محب وطن اور بلند انسان بتایا۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں میرے لیے نہایت مشکل ہے کہ احتشام صاحب مرحوم کے کمالات پر کسی عنوان سے بھی روشنی ڈال سکوں۔ اُن کی تحقیقی، تنقیدی اور ادبی عظمتوں پر وہی لوگ کچھ لکھیں گے جو اُن کی سطح کے ہوں گے، میں تو اپنے قلم کا میدان صرف کچھ یادوں تک محدود رکھ سکتا ہوں اور یہ کچھ یادیں بھی اتنی ہیں جن کے لیے کسی رسالہ کے چند اوراق کافی نہیں ہو سکتے۔

۱۹۳۲ء میں جب میں الہ آباد میں نویں درجہ کا طالب علم تھا تو احتشام صاحب یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور کبھی کبھی عم محترم پروفیسر ضامن علی صاحب مرحوم کے یہاں آتے رہتے تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، دبلا جسم، ایک کان میں دُر، پیشانی بلند اور سر سے پیر تک سنجیدگی کا نمونہ۔ اس انداز میں احتشام صاحب مرحوم کو میں نے دیکھا اس وقت بھی وہ گفتگو کم کرتے تھے مگر جب بھی لب کشا ہوتے تو اُن کے ساتھی ہی نہیں بلکہ اساتذہ بھی گوش بر آواز ہو جاتے تھے۔ وہ اُس وقت بھی شعر کہتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اُن سے کوئی غزل یا نظم نہیں سُنی بلکہ پتھر گلی الہ آباد کی ایک محفل قصائد میں اُن کی زبان سے غالباً تیسری شعبان کو ایک قصیدہ سنا تھا جو امام حسینؑ کی مدح میں تھا اور جس میں قصیدے کی روایتی تکنیک کے ساتھ جدید ذہن کی پوری پوری کارفرمائی نظر آتی تھی۔ تشبیب سے لیکر مدح تک پورا یہ قصیدہ مرصع تھا۔ اُن لوگوں سے بھی داد کم مل رہی تھی جو اُس عہد کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے اور اپنے زعم میں قصیدہ جیسے مشکل فن کو خود ہی برت سکتے تھے اور کسی نوجوان کا اس سرحد میں داخل ہونا برداشت نہ کر سکتے تھے۔ احتشام صاحب کے پڑھنے کا انداز ترنم اور سوز و گداز سے مملو تھا۔ ایک ایسا انداز جسے موسیقی نہیں کہا جا سکتا اور اُس سے علیحدہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے شعر پڑھنے کا یہ انداز آخر دم تک قائم رہا۔ اُن کی آواز کا سوز و گداز، اُن کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میر کی طرح اُن کا دل بھی چوٹ کھا چکا تھا اور یہ چوٹ ایسی تھی جس کی کسک آخر وقت تک باقی رہی اور جان لیوا ثابت ہوئی۔ وہ زندگی بھر "تمنا کی رہِ دور دراز" طے کرتے رہے اور انھیں اس راہ میں "نہ کوئی نخل نہ گلزار نظر آیا"۔ "محبت کی کڑی دھوپ کا جلال" بڑھتا ہی گیا اور جس دیوار کا سایہ وہ عمر بھر ڈھونڈتے رہے اُنھیں کبھی میسر نہ آیا یہاں تک کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے فرمایا تھا ؎

کیسے طے ہوگی تمنا کی رہِ دور دراز — نہ کوئی نخل نہ گلزار نظر آتا ہے
نہ محبت کی کڑی دھوپ کا گھٹتا ہے جلال — نہ ترا سایۂ دیوار نظر آتا ہے

میرے اس خیال کی تصدیق کسی حد تک اُن کے ایک خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے نہایت محتاط انداز میں ۱۳ر مئی ۱۹۵۳ء کو لندن سے مجھے لکھا تھا جس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے:-

"کئی دن سے سوچتے سوچتے آج خط لکھنے کی نوبت آئی ہے، امید ہے کہ آپ معاف کریں گے۔ کچھ کاہل اور آرام طلب سا ہو گیا ہوں، اس کے علاوہ کچھ موڈ بھی عجیب سا ہو گیا تھا۔ امید ہے کہ آپ غم دوراں اور غم جاناں دونوں کی طرف سے مطمئن ہوں گے۔ معلوم نہیں کس مٹی سے بنایا گیا ہوں کہ کہیں وہ مسرت نہیں ہوتی جو عام حالات میں ہونا چاہیے۔ زندگی میں وہ ولولہ اور وہ حوصلہ مفقود ہے جو اُکتا ہے۔ جذباتی حیثیت سے میری زندگی بہت پیچیدہ ہے اور میرا المیہ یہ ہے کہ نہ تو میں اس المیہ کو شعروں میں ڈھال سکا اور نہ کسی سے کہہ سکا اور نہ کہنے کا ارادہ کیونکہ اس میں کسی کا مشورہ بھی کام نہیں آ سکتا۔ نہ جانے کیوں اور کس موڈ میں یہ لکھ رہا ہوں۔ اس پر قطعے اور افسانے نہ بنائیے گا، یوں ہی لکھ دیا ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ احتشام صاحب جیسے سنجیدہ اور عالی ظرف انسان کے قلم سے یہ چند جملے جو بلاغت کی جان ہیں میرے مندرجہ بالا خیال کی پوری پوری تائید کرتے ہیں۔ جہاں تک غمِ دوراں کا تعلق ہے اُس کا کھلا ہوا اور ناقابلِ تردید ثبوت اُن کی پوری زندگی اور عمل سے ملتا ہے عزیزوں اور کنبے والوں سے لیکر نہایت وسیع انسانی برادری کا ہر غم احتشام صاحب کا اپنا غم بن جاتا تھا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو انھوں نے اپنے امریکہ اور یورپ کے سفرنامہ میں روزن برگس کے پھانسی پانے پر نہایت دل گداز جملے لکھے ہیں، جن سے اُن کی انسان دوستی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یادوں کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۹۶۲ء کا ایک تاثر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں اس وقت آگرہ میں تھا۔ سیزدہ صد سالہ یادگارِ حسینی کی ملک گیر تحریک اپنے شباب پر تھی۔ آگرہ میں بھی ایک جلسۂ عام ہونے والا تھا میرے مشورے پر احتشام صاحب کو امام حسینؑ کی سیرت پر تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تو اس کے جواب میں انھوں نے مجھے لکھا کہ مذہبی جلسوں میں تقریر کرنا میرے احاطے سے الگ ہے۔ اگر کوئی ادبی تقریب ہوتی تو ضرور آتا۔ بزمِ اقبال والوں کو جب اس کی اطلاع ملی کہ احتشام صاحب یادگارِ حسینیؑ کے جلسے میں مدعو کیے گئے ہیں تو انھوں نے اپنی دلی تمنا ظاہر کی کہ احتشام صاحب اُن کے یہاں اقبال پر ایک تقریر فرمائیں۔ میں نے مرحوم کو لکھا کہ لیجئے اب نہ آنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہا۔ بزمِ اقبال والے بھی آپ کو سننے کے لیے بے چین ہیں۔ چنانچہ احتشام صاحب تشریف لائے۔ رات کو بزمِ اقبال میں نہایت پُر بصیرت تقریر کی جس میں اقبال کی تعریف کے ساتھ ساتھ اُن کے خیالات و نظریات پر تنقید بھی کی۔ اُس بزم میں اقبال کے بڑے بڑے پرستار موجود تھے۔ تقریر کے بعد احتشام صاحب نے فرمایا کہ اگر کسی صاحب کو کوئی سوال کرنا ہو تو وہ کر سکتے ہیں لیکن کسی گوشے سے کوئی سوال نہ اُٹھا۔

صبح کو آگرہ کے سب سے بڑے پارک بکٹریہ گارڈن میں یادگارِ حسینیؑ کا جلسہ تھا۔ جلسے میں شرکت کرنے والوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ مقررین میں اس عہد کے بہترین خطیب جلسے میں موجود تھے۔ جن میں کچھ نام یہ ہیں ـــــ مولوی علی نقی صاحب، مولوی صبغۃ اللہ مرحوم فرنگی محلی، خواجہ حسن نظامی مرحوم وغیرہ۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ احتشام صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہیں اس لیے اُن کا دینی اور مذہبی علم نہایت محدود ہوگا، جلسہ کے سکریٹری نے سب سے پہلے اُن سے گذارش کی کہ وہ تقریر کریں۔ احتشام صاحب نے پونے دو گھنٹے تک سیرتِ حسینی پر نہایت دل افروز اور پُر مغز تقریر کی۔ سارا مجمع ہمہ تن گوش رہا اور تقریر کے خاتمہ پر کسی کو یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ ـــــ احتشام صاحب پونے دو گھنٹے تک خطابت کے جوہر دکھلاتے رہے۔ اُن کے بعد جب اس عہد کے مسلم الثبوت خطیب اور عالم مولانا صبغۃ اللہ صاحب مرحوم کو تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تو انھوں نے اپنی تقریر کی ابتدا میں یہ فرمایا کہ احتشام صاحب نے اپنی پر مغز تقریر میں حسینیؑ سیرت کے تمام گوشوں پر اس انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ اُن کی اس جامع و مانع تقریر کے بعد میرے لیے اور میرے بعد آنے والے مقررین کے لیے صرف اتنا رہ گیا ہے کہ ہم لوگ اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے رہیں۔ جو احتشام صاحب اپنی تقریر میں پیش کر چکے ہیں۔

میں عرض کروں گا کہ اتنے بڑے عالم سے بھرے مجمع میں کسی نوجوان کو اتنا بڑا خراجِ تحسین شاید مشکل ہی سے ملا ہو۔ میرے روابط ایک نیاز مند کی حیثیت سے احتشام صاحب سے آخر وقت تک برقرار رہے۔ میں اپنی بدمزاجی اور لڑنے بھڑنے کے لیے اپنے تمام حلقوں میں کافی شہرت یافتہ بن چکا ہوں بہت دنوں تک مجھ سے کسی سے نہیں بنتی، ہو سکتا ہے کہ یہ نتیجہ ہو میری اپنی کمزوریوں کا یا اس دنیا اور اس کی سماجی خامیوں کا جس سے اب تک میں مفاہمت نہیں کر پایا اور آئندہ بھی کوئی توقع نہیں رکھتا لیکن احتشام صاحب کی ذات ستودہ صفات اس کلیہ میں استثنا کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں اپنی مزاجی کیفیت میں میر تقی میر کے اس شعر کا مصداق ہوں۔

اے مجھ نحیف و زار کو مت کچھ کہا کرو ـــ جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اٹھائی بات

یاد نہیں تھا بلکہ جلسہ برخاست ہونے کے بعد تنہائی میں کیا جاتا۔ وہ تھا کہ ایک بار لکھنؤ کی ایک ادبی مجلس میں سب کے سامنے انھوں نے مجھے ڈانٹا۔ پہلے تو مجھے
برا لگا پھر فوراً ہی احتشام صاحب کی سرزنش میں محبت کی جو گھلاوٹ شامل تھی اس نے مجھے ایک نارمل آدمی بنا دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ لن
یونیورسٹی کے اردو کے ایک پروفیسر مسٹر رالف رسل لکھنؤ آئے ہوئے تھے، وہ لندن میں میر انیس پر بھی لیکچر دیتے تھے۔ اس لیے چاہتے
تھے کہ ایسی نمائندہ مجلس ہو، اگر شرکت کر لیں جس سے خود انھیں مجلسوں کی اہمیت اُن کا نظام اور مرثیہ خوانی کا انداز معلوم ہو۔
لندن پہونچکر وہاں کے طلباء کو اس ماحول سے روشناس کرا سکیں جس ماحول میں اودھ میں مجلسیں ہوتی تھیں اور میر انیس مرثیے پڑھتے
تھے۔ خیال یہ جب لکھنؤ کے ایک مرثیہ گو منبر پر اپنی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے جوہر دکھا رہے تھے تو میں نہ صرف تعریف میں مخل ہو رہا
تھا بلکہ تنقید بھی کرتا جاتا تھا جو ظاہر ہے کہ آداب مجلس کے منافی تھا۔ چاہے میری تنقید حقائق پر ہی کیوں نہ مبنی رہی ہو۔

جولائی ۱۹۴۹ء میں جب میں رضا کالج رامپور میں آیا تو رامپور کے ادبی ماحول میں میرے اندر مشاعرے اور ادبی جلسے منعقد کرنے
کا شوق اور بھی بڑھ گیا۔ سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ عبدالشکور صاحب مرحوم جو خود ایک اچھے ادیب تھے وہ اس کالج کے پہلے پرنسپل ہو
کر آئے۔ اردو کا قیام عمل میں آیا اور اس کے تحت ادبی جلسے ہونے لگے چنانچہ سب سے پہلے پریم چند پر تقریر کرنے کے لیے میں نے احتشام
صاحب کو بلایا۔ پریم چند سے چونکہ ہندی اور اردو والوں کو یکساں لگاؤ ہے اس لیے میں نے رامپور کے ہندی حلقوں میں بھی دعوت نامے
بھیجے۔ احتشام صاحب کی تقریر سنکر بلا استثناء سب کی یہ رائے تھی کہ انھوں نے اس سے پہلے پریم چند پر اتنی پرمغز تقریر کبھی نہیں سنی۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں جب انھیں راک فیلر نے امریکہ مدعو کیا تو جانے سے پہلے انھوں نے جن لوگوں سے مشورہ کیا ان میں سے ایک
میں تھا جس کا ذکر اپنے سفرنامہ میں فرمایا ہے۔ احتشام صاحب اپنی افتاد طبیعت کے باعث سیر و سیاحت، نام و نمود، تفریح و عیش پسند
نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ خلوص کے پیکر تھے اسی لیے ایسے ماحول سے بچتے تھے جہاں بناوٹ کی چمک دمک اور خلوص کا فقدان ہو۔
میں ہی نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ امریکہ اور یورپ کا سفر ضرور کریں، چنانچہ وہ تشریف لے گئے مگر امریکہ پہونچکر ان کا دل نہ لگا اور
جلد واپسی کا پروگرام بنانے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک خط میں جو تیرہ اکتوبر کو مجھے واشنگٹن سے بھیجا تھا لکھا۔

"اپنے تاثرات کیا لکھوں، جو آپ لوگ سمجھتے ہوں گے اس کے برعکس ہے۔ جو تعصبات لیکر آیا ہوں ممکن
ہے اس کا بھی عمل ہو رہا ہو۔ مجھے نیویارک تو بالکل ہی پسند نہیں آیا۔ پرنسٹن خاموش جگہ تھی، فلاڈلفیہ
میں ایک عالم پروفیسر مل گئے اس لیے جی لگ گیا۔"

آگے چلکر پھر اسی خط میں لکھتے ہیں:-

"میرا جی یہاں لگ نہیں رہا ہے اور کسی کسی وقت تو خیال ہوتا ہے کہ قفس کے کونے ہی میں بڑا آرام تھا
یہ سب بے سود کیا ہے میرے بس کی نہیں ہیں اگر کسی ایک جگہ رہ کر کسی ایک موضوع پر کام کرنا ہوتا تو شاید
آسانی ہوتی اور مجھے بھی لگتا کہ اس طرح ایک کام کر رہا ہوں۔ ابھی تو یہاں لوگوں سے ملنا ہی جا رہی ہے۔
آپ مجھے جانتے ہیں، میں کم آمیز اور USSOCIAL قسم کا آدمی ہوں، بس جن لوگوں سے تعلقات
ہیں اُن سے ہیں۔ ہر شخص سے ملنا، ریاکارانہ طور پر خوشی کا اظہار کرنا، الٹی سیدھی باتیں کرنا، احتیاط
مد نظر رکھنا اور اجنبی کی طرح مارے مارے پھرنا بہت سے لوگوں کے لیے لطف کا سبب ہو سکتا ہے
میرے لیے نہیں۔"

آج جبکہ احتشام صاحب کی موت پر ساری علمی فضا سوگوار ہے اور اُن کا غم ایک دنیا کا غم بن گیا ہے تو میں یہ سوچتا ہوں کہ

ب کم آمیز اور UN SOCIAL نہ ہوتے تو اُن کی موت پر کیا عالم ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ کم آمیز تھے اور نہ UN SOCIAL بلکہ
کی شخصیت اپنے اندر بے پایاں خلوص کی وہ کشش رکھتی تھی جس کے لیے اِس معروف اور خود غرض دنیا کا ہر شخص ترستا ہے اور یہی وجہ ہے کہ
شام صاحب کم آمیزی کے باوجود اتنے ہر دلعزیز تھے کہ اُن کے بغیر ہر شے میں ایک کمی سی معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ امریکہ اور یورپ گئے دوسرہ
فعہ تو میں نے اُنھیں اپنے کسی خط میں لکھا تھا کہ وہ اپنے قیام کی مدت کو کم نہ کریں بلکہ کوشش کر کے اُس میں توسیع کرا دیں اس لیے کہ یہ صورت
حیثیت سے نفع بخش ہو سکتی ہے تو اس کے جواب میں انھوں نے مجھے اپنے خط میں لکھا:۔

"میں دیکھتا ہوں کہ زمینداری کھو کر آپ بنیوں کی سی بات کرنے لگے"

اکہ میں نے بتایا ہے کہ احتشام صاحب اپنے خلوص اور ایک رنگی کے باعث کسی ایسے ماحول میں زیادہ دن نہ رہ سکتے تھے جو اُن کے مزاج
وافق نہ ہو۔ چنانچہ امریکہ پہونچنے کے ایک مہینہ کے اندر ہی انھوں نے آٹھ نومبر ۲۵۲ء کو جو خط لکھا اُس کے کچھ اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں۔

"اگر ارادہ پورا ہو گیا تو شروع اپریل میں انگلینڈ جانے کا ارادہ ہے وہاں شروع جولائی میں گھر پہونچ جانے کا۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ میرے کام کا نقصان ہو رہا ہے۔ کتابیں ادھوری پڑی ہیں، دل نہیں لگ رہا ہے۔ کیا کروں اس آسیب زدہ دنیا سے مجھے پیار نہ ہو سکا چنانچہ آج میں اپنے آتا یانِ نعمت کو بھی اس پروگرام کی اطلاع دے رہا ہوں۔ کسی لائبریری یا کسی شخص سے فائدہ اُٹھانا میرے امکان میں نہیں ہے، دلچسپ باتیں کرتے ہیں، آپ کی سنتے ہیں پھر بھی غالب کا شعر یاد آتا ہے ؎

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیا دوست کا کھاؤں فریب
...."

ی زمانہ میں مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ رامپور کی ادبی خدمات پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کروں۔ چنانچہ احتشام صاحب کو میں نے
کی اطلاع دی۔ انھوں نے نہ صرف اِس خیال پر دلی مسرت کا اظہار کیا بلکہ مقالہ کی پوری اسکیم مرتب کر کے بھیج دی اور اُسی کے ساتھ کچھ
وری ہدایات بھی بھیجیں جن میں لکھا:۔

"رامپور کی لائبریری میں ہزارہا شعرا کے دواوین ملیں گے۔ اگر سب کو سمونے کی کوشش کی گئی تو غضب ہو جائے گا اس لیے ہوشیاری سے کام کرنا چاہئے۔ بہت سی باتوں کا خیال کرنا ہوگا۔ میری رائے میں صرف شاعری ہی لینا چاہئے، ممکن ہو تو دورِ جدید کو بھی چھوڑ دینا چاہئے۔ جلال کا انتقال جہاں تک یاد آتا ہے ۱۹۱۰ء میں ہوا اور اُسی پر ختم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے باب میں ضمناً مختصر طور پر دکن، ٹانڈہ، فرخ آباد، عظیم آباد، پٹنہ کے درباروں کا بھی ذکر ہو سکتا ہے تاکہ درباری شاعری کی نوعیت بھی واضح کی جا سکے۔ دوسرے باب میں اس کا پتہ بھی لگانا چاہئے کہ رامپور کی ریاست قائم ہونے سے پہلے وہاں کوئی ادبی روایت تھی یا نہیں، اگر کچھ چیزیں نکل آئیں تو پھر آپ محقق تسلیم کر لیے جائیں گے۔ کیا محض اسلامی اثرات ہیں یا وہاں کی زندگی میں ہند و مسلم تہذیب کے مشترکہ اثرات بھی ملتے ہیں جیسے اندر سبھا (لکھنؤ) میں۔ ظاہر ہے کہ یہ مطالعہ تاریخی زیادہ ہوگا تنقیدی کم۔ بس آخری باب میں تنقید کا حق ادا کرنا ہوگا یعنی اُس باب میں جہاں رامپور اسکول کے متعلق بحث ہوگی۔ آخری باب میں یہ دلچسپ بحث ہوگی کہ جاگیردارانہ نظام کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں شاعری کی قدیم روایات آخری وقت،

تک زندہ رہیں اور دورِ جدید کے اثرات یا تو تھے ہی نہیں یا بہت ہلکے تھے!!

احتشام صاحب جب امریکہ سے واپس آئے تو میں لکھنؤ ہی میں تھا۔ "کابل جانے، مغل ہو آنے اور ترکی بولی بولنے" کے انداز اُن میں یک لخت نہ پائے گئے۔ وہی بارہ دری خانے کے احتشام صاحب سامنے تھے۔ میرے ذہن میں بار بار فارسی کا یہ شعر گونج رہا تھا۔

فروتنی ست نشانِ رسیدگانِ کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

مضمون طویل ہوتا جارہا ہے اور یادوں کے سلسلے ٹوٹتے نہیں جن میں دانش محل، ادارۂ فروغ اردو، کافی ہاؤس وغیرہ کی یادیں ایک ایک کرکے اُبھر رہی ہیں اور اسی کے ساتھ چشم نم کی کار فرمائیاں بھی جاری ہیں۔ اور دیکھئے یہ سلسلہ کب تک باقی رہتا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے کبھی احتشام صاحب کی جناب میں عرض کیا تھا کہ میں نے اپنی پوری زندگی بس یوں ہی ضائع کردی ہے۔ میرے بعد اگر آپ چند سطریں لکھ دیں گے تو شاید میری محدود دنیا کے لوگ میری قدر کریں گے۔ مرحوم نے یہ سُن کر نہایت ہمدردانہ سرزنش کی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب خود مجھے احتشام صاحب مرحوم پر یہ ٹوٹے پھوٹے جملے لکھنا ہوں گے۔

مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (لاہور)

مشرقی آداب و مغربی افکار کا سنگم

احتشام حسین

پروفیسر احتشام، میرے آغاز مطالعۂ ادب کے زمانے میں اردو کے قدآور نقاد تھے۔ میں دینی مدرسے کا طالب علم تھا۔ احتشام صاحب یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ میں سخت مذہبی آدمی، احتشام صاحب مارکسی مشہور تھے۔ احتشام صاحب کے بعض طلبا رنجی طور پر مجھ سے بھی پڑھتے تھے اور میں بھی ان کے مضامین پڑھتا رہتا تھا۔ ایم۔ اے کے طلبا، احتشام صاحب کے اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے ان کے خیالات و رجحانات کے بارے میں کسی شدت یا تبلیغ کا ذکر نہ کرتے تھے اور میں بھی ان کے مضامین میں مذہب سے بغاوت، معاشرے سے بغاوت، روایت سے نفرت محسوس نہ کرتا تھا۔ میرے خیال میں احتشام صاحب معتدل ترقی پسند، منطقی نقاد، اور فلسفی مصلح افکار تھے۔ میرے بی۔ اے، ایم۔ اے کے دوست طلبا، سوشلسٹ اور کمیونسٹ قسم کے لوگ بھی تھے اور دینی عقائد و اعمال کے پابند بھی۔ اس لیے آہستہ آہستہ مجھے اس گروہ سے مانوسیت ہو گئی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ چوں کہ یہ لوگ دینی علمی تعلیمات اور اس کے فلسفے سے ناواقف ہیں لہٰذا دوسرے افکار کو سراہتے ہیں، حقوق بشر، تقسیم زر، ارتکاز دولت۔ طبقاتی درجہ بندیوں میں اسلامی احکام اگر ان کو معلوم ہوتے تو ہرگز ہرگز بالشویک نظام کے گرویدہ نہ ہوتے۔ ان لوگوں سے سیکھنے اور سمجھنے، افہام و ابلاغ کے لیے ملنے میں فائدہ دیکھ کر میل ملاقات بری بات نہیں۔

جیسے اصحاب طریقت اہل شریعت کو طبعاً پسند نہیں کرتے اسی طرح بکسی حضرات دینی افراد سے طبعاً دور رہتے ہیں، اور دینی حلقے انھیں بے دین سمجھ کر قریب نہیں جاتے، یہ فاصلے یہ بعد، سات سمندر، درمیان بن جاتے ہیں اور میں بھی احتشام صاحب سے نہ مل سکا، ایک روز میرے محترم دوست اجاد علی صاحب دیوان غالب پڑھ رہے تھے اثنائے گفتگو میں غالب کی مکتوب نگاری پر بات چل نکلی میں نے "خطوط غالب" از مہیش پرشاد کی نایابی کو ذکر کیا انھوں نے فرمایا، آپ نے احتشام صاحب سے بھی پوچھا؟ میں کالج کے اساتذہ اور یونیورسٹی کے بعض پروفیسروں سے پوچھ چکا تھا اور جواب میں ناکامی ہوئی تھی۔ خود مہیش پرشاد صاحب نے کہا تھا کہ "خطوط غالب" کا کوئی نسخہ ان کے پاس نہیں۔ ایک ہی کتاب ہے جو ڈاکٹر عبدالستار صاحب اور ان کے درمیان مشترک ہے اور جب ڈاکٹر عبدالستار صاحب سے ضرورت بیان کی تو انھوں نے فرمایا کہ: "میں مسعود حسن صاحب کے یہاں مقیم ہوں، کتاب میرے ساتھ ہے آئیے اور وہیں دیکھ کر نوٹ لے لیجیے۔ دوسرا نسخہ میرے پاس نہیں" اس کے بعد احتشام صاحب سے کتاب کے بارے میں سوال بیکار تھا۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے مگر چونکہ تعارف درمیان نہ تھا اس لیے سلام و مصافحہ، گفتگو کا مسئلہ بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ مذہبی تقریبات میں بھی بہت کم نظر آتے ہوں گے۔ اور میں ادبی تقریبات میں نہ جاتا تھا۔

میرے گھر پر ہفتے میں دو ایک نشستہ ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ بے خود موہانی، محشر لکھنوی، مانی جائسی، منظر لکھنوی، منے آغا ذکی

سالک صاحب اور متعدد حضرات جمع ہوتے تھے۔ بخشو بے خود کے بعد اس محفل میں حکیم صاحب عالم مل گئے۔ اور میں اپنے گھر کی محفل سے نکل کر حکیم صاحب عالم مرحوم کے مطلب میں جانے لگا۔ معدن الادویہ وکٹوریہ اسٹریٹ کا گلستاں صدا بہار تھا۔ خوش نوایان شعر و ادب، اور سرو و صنوبران فکر و فن کا خوبصورت اجتماع رہا کرتا تھا حکیم صاحب عالم، پابند مذہب، نمازی پرہیزگار، روایتی آدمی اور اخلاق کا مجسمہ تھے، وہاں جوش بھی نظر آتے تھے اور جعفر علی خاں اثر دیاس یگانہ چنگیزی بھی۔ مولانا صبغۃ اللہ صاحب، مولانا محمد نصیر صاحب اور مولانا اختر علی تلہری بھی۔

ایک روز مانی صاحب، مولانا ثاقب حسین صاحب، جناب شدید صاحب۔ اور جناب احتشام صاحب صبح صبح مطلب میں بیٹھے تھے میں بھی حاضر ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا، حکیم صاحب شعر سنا رہے تھے لوگ داد دے رہے تھے، فقرے قافیہ کا ذکر شروع ہو گیا۔ اور احتشام صاحب نے فرمایا "شعر کے لیے قافیے کی شرط اب ختم ہو چکی ہے" بس اب کیا تھا، سب کے سب بولنے لگے، حکیم صاحب نے مجھ سے کہا تم کیوں نہیں بولتے، میں نے عرض کیا۔ احتشام صاحب سے گفتگو ہو رہی ہے مجھ اجنبی کے لیے کچھ کہنا مناسب نہیں ۔۔ ہم دونوں کھڑے ہوئے، ہاتھ ملایا، احتشام صاحب نے ازراہ خورد نوازی فرمایا "میں نے تمہارا پہلا مضمون منظر پر پڑھا اور اب نیا مضمون شاہنامہ پر بھی دیکھا ہے ..... کو ادب میں آنا چاہیے سن کے خوشی ہوتی ہے کہ تم غالب پر محنت کر رہے ہو۔

جی ہاں، ہمارا تنقیدی سرمایہ منطقی بھی ہے اور عقلی نظام کا پابند بھی ہے۔ روایت کہہ کر نظر انداز کرنے سے کچھ نہیں ہوتا اگر نقد و ادب کے اصول متعین نہ ہوں تو فن میں طوائف الملوکی، ادب میں انارکی، اور انتشار پیدا ہو جائے گا۔ مشرقی ادب، مسلسل ارتقا، مسلسل تاریخ، مسلسل رشتۂ فکر و نظر رکھتا ہے۔ عروض اس کی تکنیک اور معانی و بیان اس کی ہیئت کو متعین کرنے میں ہمیشہ مدد دیتے ہیں، ہماری نئی تنقید چند مستعار افکار کو منتقل کر سکی ہے۔ لیکن شناس نے اصول وضع کیے ہیں نہ قانون و ضابطے کو مدون کیا ہے۔ نہ ہماری زبان و ثقافت کے مزاج کو ملحوظ رکھا ہے۔ کم و بیش سو سال سے حملے ہو رہے ہیں، ہمیں تو صرف معیب ہی عیب گنوائے جا رہے ہیں، آخر ایک، زندہ زبان، تاریخی ادب، اور مستقل ثقافت پر غیروں کے ہتھیاروں سے یہ حملے منظر کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ محمد حسین آزاد، حالی، اقبال، جوش، ن م راشد اور دوسرے معترضین اب تک ہمارے شعری اسالیب کو کیوں نہیں بدل سکے؟

جی ہاں، ابھی ابتدا ہے، اگر سو برس کا مسلسل عمل "ابتدا" ہے تو اس سے ہمیں کوئی مفید انتہا کا سراغ نہیں ملتا اور ہماری روایتی اثر کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے، اور یقیناً یہ نتیجے اپنے زمانی تاثرات قبول کرتے اور اعتدال کے ساتھ بہتر ہوتے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدرسہ میں پڑھائے جانے والے علوم اس قدر مضبوط اصولوں پر مبنی ہیں جو آگے بڑھ سکتے ہیں فنا نہیں ہو سکتے ـــ جی ہاں، درست فرمایا، انگریز بھی یہ سے چلا جائے گا اور اس کے افکار بھی یہاں پنپ نہ سکیں گے۔ ہمارے یہاں سورج نکلتا ہے ان کے یہاں برف، ہماری زمین دریا سے سیراب ہوتی ہے ان کے یہاں سمندر ہے۔

احتشام صاحب، اپنے مضبوط، باوقار، اور دانشمندانہ انداز سے سوال اٹھاتے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ نئے ادب میں بے ضابطگی کو پسند نہیں کرتے، وہ فکر کے نقیب اور نکتہ آفریں ذہنوں میں فرق کو بڑی اہمیت دیتے ہیں مگر دونوں کو دور نہیں رکھنا چاہتے وہ رعایت کے باغی تھے لیکن اسے قتل کرنے کے خلاف تھے۔ احترام و تقلید کی طرف ان کا دھیان ہی نہ تھا، وہ روایت کو جانتے تھے مگر اس کا حوالہ پسند نہ کرتے تھے۔ وہ یورپ کے انقلابی ادب اور روس کے انقلابی افکار سے سرشار تھے۔ وہ جدت کے زبردست حامی تھے۔ اس کا ... کرتے تھے۔ مگر ان کے نقد و انتقاد میں چیخ و پکار اور نعرے بازی کے بجائے، استدلال، منطق، افہام و تفہیم کا آہنگ تھا۔ وہ ادیب، لیڈر نہ تھے۔ وہ مفکر تھے مناظر نہ تھے اسی وجہ سے احتشام صاحب نئی تنقید میں اصولوں کی دریافت اور ضابطے کی بات کرتے تھے۔ انھوں نے تنقید کو لکچر سے ہٹا کر کتاب اور تفریح کے بجائے اصلاحی مقاصد کے وزن سے ممتاز بنایا، وہ تعارف کے بجائے ٹھوس حقائق لکھنے کے

اردو ادب کی تاریخ میں مسلسل فکری تحفظات کا نقیب اور فکری حرکت کا داعی اور فکر و عمل میں ارتقا، نقاد مشکل سے ملے گا۔ احتشام صاحب اس قسم کے نقادوں میں سر فہرست تھے۔ اور مستقبل بتائے گا کہ انھوں نے دبستان کا باقی ہونے کی حیثیت سے کتنا بڑا کام کیا ہے۔

احتشام صاحب کے زمانے میں لوگوں نے تنقید کو افسانے کی ایک شاخ بنا دیا تھا۔ بہت سے حضرات کی تنقید چھوٹے افسانے، بعض حضرات کے مضمون متوسط ناول اور کچھ تنقیدیں کالج کے لکچر ہوتے تھے۔ احتشام صاحب کے بیشتر مضامین تنقیدی شعور اور تنقیدی فکر انگیز نکتوں سے مالا مال ہوتے تھے۔ انھوں نے جدید لٹریچر کو ہضم کیا، ان کے روشن دماغ نے نئے افکار کو خوش گوار لطیف پیرایوں میں سمجھا سمجھا کر بیان کیا۔ یہ انداز جدید و قدیم کے درمیان سنگم بن گیا۔ اور احتشام صاحب اس کے بہت بڑے سبب بنے۔

میں نے کہا، مہیش پرشاد کے مرتب کردہ "خطوط غالب" کی جستجو ہے، پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی ساحل نہ موج کی۔ مدرسے اور یونیورسٹی کی کس خندہ پیشانی سے فرمایا "آج سہ پہر کو لیتا آؤں گا" تین بجے گھر پر حاضر ہوا، بڑے تپاک سے ملے، بڑی محبت سے باتیں کیں اور دیر تک تحقیق و تنقید پر گفتگو کرتے رہے اور مجھے پہلی مرتبہ ہمت افزا خیالات سے قوت ملی۔ نیاز فتح پوری صاحب نے غالب پر لکھنے پڑھنے کو سب سے زیادہ منع کیا اور احتشام صاحب نے سب سے زیادہ غالب کو موضوع بنانے کی حمایت کی اور میں ایک وہ قوت محسوس کرتا ہوں۔ میں کتاب لے آیا، احتشام صاحب نے تقاضہ نہ کیا۔ کتاب میرے پاس رہی۔ میں پاکستان آنے لگا تو کتاب لے کر گیا۔ احتشام صاحب نہ ملے۔ لاہور میں ان کا خط آیا جیسے کسی پرانے بچھڑے دوست کا خط تھا۔ خط آتے رہے وہ لاہور کے اپنے احباب کو میرے بارے میں لکھتے رہے، وہ خط لکھتے تھے۔ میں بھی زحمت کر دیتا تھا۔ وہ یورپ چلے گئے اور خط و کتابت ختم ہو گئی میں نے عود ہندی ایڈٹ کی اور احتشام صاحب کو بھیجی۔ انھوں نے رسید نہیں بھیجی۔ مجھے ان کی اخلاقی، انسانی اور دل کش شخصیت سے یہ امید نہ تھی۔ میں سمجھا کہ شاید کتاب ان تک نہیں پہنچی یا زمان و مکان کے فاصلوں نے بھلا دیا۔ اکتوبر کے آخری دنوں میں ان کا خط آیا:

۵ر اکتوبر ۶۷ء

مکرم و محترم

سلام شوق

گرامی نامہ ملا۔ اگر میں نے اس سے پہلے خط نہیں لکھا تو یقیناً عالم خیال میں ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کوئی دو ہفتے ہوتے ہیں میں نے مغل پورے ہی کے پتے پر عود ہندی کی رسید لکھتے ہوئے ایک مفصل تحریر بھیجی جس میں لکھنؤ اور حکیم صاحب عالم مرحوم کی یاد بھی شامل تھی۔ میں نے آپ کو خط لکھنے کا ذکر آغا سہیل کے خط میں بھی کیا، لیکن آج آپ کا خط ملا تو میں اس شک میں مبتلا ہو گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے صرف ارادہ کیا اور لکھا نہیں کئی بلد ایسا ہو چکا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے واقعی لکھا ہو اور کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہو۔ بہر حال اگر میں نے نہیں لکھا یا میرا مکتوب نہیں پہنچا تو مجھے افسوس ہے۔

آپ نے اپنے خط میں ماضی کی یادوں کے ساتھ اپنا تعارف کرایا ہے، میں آپ کو کیوں کر بھول سکتا ہوں، صحیفہ اور دوسرے رسائل میں آپ کی تحریریں برابر آپ کی یاد دلاتی رہتی ہیں، جن اہل علم سے واسطہ رہتا ہے انھیں یوں بھی نہیں بھولتا۔

"عود ہندی" کو نئی طرح ترتیب دے کر آپ نے قابل رشک کام کیا ہے، ہندوستان اور پاکستان میں چند ہی ایسے محقق اور ادیب ہیں جو اس جامعیت کے ساتھ اسے مرتب کر سکتے۔ کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو۔ اگر کسی کو یہ بھی معلوم ہو کہ اس میں غالب کے حالات کسی قدر اور تفصیل سے ہوتے تو اس کے لیے یہ بشارت موجود ہے کہ آپ نے مرزا پر ایک مبسوط کتاب لکھ دی ہے۔ تصحیح متن کے ساتھ آپ نے اتنے حواشی یکجا کر دیے کہ بہت سے غالب شناسوں کے لیے بھی اس میں سامان نشاط و آگہی مل جائے گا۔ مجھے "عود ہندی" کا یہ ایڈیشن کئی سطحوں پر مفید معلوم ہوتا ہے، جو عام طلبہ ان خطوں کے معانی اور مطالب سمجھنے کے لیے اسے

پڑھیں گے وہ بھی اسے مفید پائیں گے اور وہ محقق بھی جو برسوں سے غالب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ آپ نے ان خطوط کے مرتب کرنے میں جو محنت کی ہے وہ ہر محقق کے لیے ایک چیلنج ہے۔ آپ سے جو تعلق خاطر رہا ہے اس کی وجہ سے یہ مسرت بھی ہے کہ یہ کام آپ نے انجام دیا ہے۔ فرصت ہوئی تو کہیں تفصیل سے اس پر تبصرہ کروں گا۔ دعا ہے کہ آپ ایسے ہی بہت سے کام کرنے کے لیے بخیریت رہیں۔

میری صحت اچھی نہیں، ہتی بعض افکار بھی ہیں جتنا کر سکتا ہوں اور جو سوچتا ہوں وہ بھی نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

احقر

احتشام حسین

یہ ایک نجی خط ہے۔ اور احتشام کی تحریر ہونے کی بنا پر اسے پڑھنے کا حق سب کو ہے۔ میں نے یہ خط صرف اس لیے لکھا ہے کہ میرے پاس ان کا یہ سب سے بڑا خط ہے۔ اس آئینے میں ان کے خد و خال واضح اور ان کی محبت و شفقت نمایاں ہے۔ اس میں مشرقی آداب، مشرقی انداز، مشرقی اسلوب، مشرقی بزرگی کی دل کش تصویر ابھری ہوئی ہے۔

احتشام حسین، زندہ ہیں اس لیے کہ ان کا تخلیقی عمل زندہ ہے۔ ان کی فکر زندہ ہے، ان کے اخلاق، ان کی عظمت ان کی کاوش فن زندہ ہے۔ ان کا دھیما پن ان کا فکر انگیز اسلوب ان کی زندگی کی ضمانت ہے۔ ان کی شخصیت بہت سی شخصیتوں کی معمار ہے۔ بہت سی شخصیتیں ان کی بڑائی کا نشان ہیں۔ اور وہ قدیم و جدید کے درمیان سنگِ میل ہیں، یہ نشان ہر راہی کو شاندار منزل کا پتہ دیتا رہے گا۔

سار حسین

ایک شائستہ آدمی ـــــ ایک مہذب نقاد

دور دیس سے خبر آئی ہے کہ پروفیسر سید احتشام حسین اللہ کو پیارے ہو گئے۔

احتشام صاحب نے افسانے بھی لکھے اور شعر بھی کہے مگر آخر کو تنقید اُن کا فن ٹھہرا۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ظہور کرنے والے اس ٹرامی نقاد کی تنقیدی تحریریں تو ہم سب ہی نے پڑھی ہیں مگر میں اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ آدمی کیا تھا جو اُٹھ گیا۔ اس شہر میں احتشام ـب کے ایسے ہم عصر بھی ہیں جو اُن سے مل چکے ہیں۔ وہ شاگرد بھی ہیں جو اُن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھے اور اُن کی شائستگی اور علمی بصیرت کا تاثر لے کر اُٹھے۔ مگر میں نے احتشام صاحب کو کبھی نہیں دیکھا۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ آدمی کیا تھا جس کے شاگرد ملنے والے اُس کی انسانیت کے اتنے معترف ہیں۔ پھر مجھے یاد آتا ہے کہ خطوط کے ذریعے تو میں اُن سے ملاقات کر چکا ہوں۔ میں اپنے ـنے کاغذات ٹٹولتا ہوں۔ احتشام صاحب کا کوئی نہ کوئی خط ضرور میرے پاس محفوظ ہونا چاہیئے۔ لیجئے ایک خط نکل آیا۔ اس کی کچھ ـطریں میں آپ کے ساتھ ساتھ پڑھتا ہوں:۔

"اب تو بالکل گوشہ نشین ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ انتہائی کوشش کے باوجود بہت سی نظمیں اور بہت سے مضامین سمجھ میں نہیں آتے۔ کسی قسم کا کایا کلپ ممکن ہوتا تو عمر کا ایک حصہ اُن کے سمجھنے پر صرف کرنے کی کوشش کرتا۔ غالب کو کسی موقع پر احساس ہوا تھا ؂

کس زبان مرا نمی فہمد　　بعزیزاں چہ التماس کنم

یہ جذبہ بالکل صحیح رہا ہو گا ورنہ ایسے بے پناہ پرخلوص شعر کیسے نکلتا۔ لیکن شاید ان کی بات کے نہ سمجھے جانے کا صرف ایک مختصر سا دور تھا۔ آج لوگ انھیں سمجھ رہے ہیں۔ میں بھی جب مایوس ہوتا ہوں تو کچھ اسی طرح سوچتا ہوں۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ لاکھ اختلافات ہوں، ادبی مسائل پر بحث سنجیدگی سے ہوتی رہے۔ حرف آخر تو کہیں بھی نہیں ہے۔

ہاں ایک بات جو خود غرضی بھی ہو سکتی ہے۔ لکھنؤ میں تھا تو پاکستان کی کتابیں مل جاتی تھیں یہاں بالکل سناٹا ہے۔ اگر کبھی کبھی اچھی کتابیں اِدھر اُدھر سے آئیں تو بھجوا دیا کیجئے۔"

یہ خط فروری ۷۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک کے ادب کے احتشام صاحب شاید سب سے سمجھدار مفسر تھے۔ اُن کا لکھا ہوا مستند مانا جاتا تھا لیکن ۶۰ء تک آتے آتے ایسے لکھنے والے بھی جو اپنے آپ کو انقلابی بتلاتے تھے میراجی سے بڑھ کر ابلاغ کے منکر ہو چکے تھے۔

احتشام صاحب کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے ایک مستند نقاد بن کر اُس ادب کو یکسر رد نہیں کیا۔ اپنے عجز کا عذر کیا اور جب ہو گئے، لکھے ہوئے کو یکسر رد کرنا اور فتوے جاری کرنا احتشام صاحب کا شعار نہیں تھا۔ اس لیے کہ اُن کی دانست میں "حرفِ آخر تو کہیں بھی نہیں ہے۔"

احتشام صاحب کا یہ رویہ کسی قدر غیر مارکسی ہے۔ مارکسی آدمی تو مارکسیت کے بنائے ہوئے معیار کو حرفِ آخر سمجھتا ہے۔ جبھی تو وہ اتنے تیقن سے فتوے جاری کرتا ہے۔ مگر احتشام صاحب ایسے نقاد تھے جو ادب کو مارکسی حوالوں سے پڑھتے اور پرکھتے تھے، اس کے باوجود انھوں نے اپنے دماغ کے دریچے کھلے رکھے تھے۔ اسی لیے اُن کی تنقید محض اور صرف مارکسی تنقید نہیں ہے بلکہ اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے اور اسی لیے وہ ادبی بحث مباحثہ میں کبھی مشتعل ہوتے نہیں دیکھے گئے۔ "میری خواہش صرف یہ ہے کہ ادبی اختلافات ہوں۔ ادبی مسائل پر بحث سنجیدگی سے ہوتی رہے۔" اور احتشام صاحب نے بحث ہمیشہ سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے کی۔ ادبی مسائل پر بھی اور ایسے مسائل پر بھی جن کی نوعیت سیاسی تھی۔ اور میرے سامنے اس وقت اُن کا ۴۸ء کا خط پڑا ہے۔ اُس وقت بھی انھوں نے یہی لکھا تھا کہ اختلاف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ ہم اپنے اختلافات میں پرخلوص ہوں۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب تقسیم کے مسئلہ پر بحث کرنے والے ادیب بہت مشتعل تھے اور مجھ ایسوں نے اس حوالہ سے احتشام صاحب کے خلاف بھی آگ کے انگارے اگلے تھے۔

اُس شخص کے دل و دماغ کے دریچے کھلے ہونے کا اندازہ آپ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ وہ شخص پاکستان میں پیدا ہونے والی فکر کو جاننے اور سمجھنے کے لیے کتنا بے تاب ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا بیان بھی یہی ہے کہ پاکستان کی کتاب کے لیے وہ مستقل تقاضا کرتے رہتے تھے۔

ایک نظریہ کا پورے خلوص سے قائل ہونا اور پھر دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرنا، اس رویے کے ساتھ کہ "حرفِ آخر تو کہیں بھی نہیں ہے" ایسی تہذیب ہر لکھنے والے کو نصیب نہیں ہوتی۔ احتشام صاحب اپنی اسی تہذیب کی بنیاد پر ادب سے نکل کر زندگی کے معاملات میں بھی شرافت اور شائستگی کا نمونہ بن گئے تھے۔

اقبال ماہر

عکس احتشام حسین۔ یادوں کے آئینہ میں

احتشام صاحب سے میں اس وقت واقف ہوا جب میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ کالج الہ آباد میگزین شائع ہوئی۔ موجودہ مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر سید نورالحسن صاحب بھی اس کالج کے طالب علم تھے اور وہی میگزین کے ایڈیٹر بھی تھے۔ میگزین سے میری دلچسپی اس لیے تھی کہ اس شمارہ میں میری ایک نظم شامل تھی۔ لیکن میگزین کا سب سے پہلا اور بصیرت افروز مقالہ تھا "ادب اور دنیا کا مستقبل" اور اس کے مصنف تھے جناب سید احتشام حسین رضوی ایم اے اکس اسٹوڈنٹ۔ ظاہر ہے اس وقت میری ادبی سوجھ بوجھ کیا تھی۔ لیکن احتشام صاحب کے اس مضمون نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کا تقرر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ہو گیا تھا۔ لیکن جلد ہی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا۔ ماضی کے دھندلکوں سے آج بھی وہ خوبصورت چہرہ ابھرتا ہے پیشانی پر بلند حوصلگی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ موضوع گفتگو میں سنجیدگی اور انداز گفتگو میں شگفتگی تھی۔ زمانے رجحانات کے ہنگامی دور میں بھی ان کی باتوں میں توازن تھا۔

اس کے بعد ہمارے ان کے درمیان زمان و مکاں کی خلیج حائل رہی۔ وہ لکھنؤ میں اور میں الہ آباد میں۔ کارزار حیات میں قدم رکھنے کے بعد میں دیگر مسائل سے دوچار رہا۔ لیکن ادبی ذوق بدستور برقرار رہا۔ رسائل میں شائع شدہ احتشام صاحب کے مضامین برابر میرے زیر مطالعہ رہے۔ انھوں نے میرے ذہن کو ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات سے روشناس کیا۔ وہ بہت جلد میرے محبوب ادیب اور ادبی رہنما بن گئے۔

صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی حیثیت سے احتشام صاحب دوبارہ الہ آباد میں سکونت پذیر ہوئے تو ان کو قریب سے دیکھنے اور ملاقات کا زیادہ موقع ملا۔ میں جب بھی ان کے مکان پر پہنچا وہ بڑی خندہ پیشانی اور شفقت سے پیش آئے۔ مجھے مفید ادبی مشورے دیتے تھے۔ ہمارے درمیان بے لوث اور بے ریا تعلق قائم ہوا۔ وہ میرے بزرگ، رہنما اور محسن تھے۔ میں ان کی اعلیٰ ظرفی سے بے حد متاثر تھا۔

ہم جب کبھی کسی ادبی انجمن کی داغ بیل ڈالتے ان سے ضرور مشورہ لیتے۔ ان کی قیمتی رائے ہماری رہنما ہوتی تھی۔ شاعروں، ادبی جلسوں اور نشستوں کی صدارت کے لیے ان ہی پر نظر پڑتی تھی۔ اپنے صدارتی خطبوں میں وہ نیک صالح اور مفید مشورے دیتے۔ اردو زبان و ادب کی توسیع اور ترقی کے وہ مبلغ تھے۔ بہ اصرار ان کی شعری تخلیقات بھی ان کے مترنم لہجے میں سنی جاتی تھیں۔ ان کے کلام میں شعریت، تغزل سوز و گداز، رومانیت اور رجائیت کی شگفتگی بھی تھی۔

اردو زبان و ادب پر جب سکرات کا عالم طاری تھا۔ افسوس کہ اس کی مسیحائی کرنے کے بجائے اردو ہی کے خود ساختہ احساس کمتری کے شکار ادیبوں اور قلم کاروں نے آخری وار کر کے زبان و ادب کو ختم کرنا چاہا۔ احتشام صاحب نے بروقت نئے تیشے نئے کوہکن' لکھ کر

سے آگاہ کیا۔ تخریب کاروں کو بے نقاب کر دیا۔ تعجب ہے اس وقت ادب برائے حیات کے پرانے علم بردار محبان اردو کو ایک بڑے خطرے سے قائدین نے مصلحت آمیز خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ ان کے صالح اور افادی نظریات کی توہین ہوتی رہی۔ ادیبوں، شاعروں، ناقدین اور نیلین ان کی غیرت کو جوش نہ آیا۔ صرف احتشام صاحب کی واحد ذات تھی جو تباہی کے اس طوفان سے نبرد آزما رہی کر کے حملے ہوتے رہے گوں اور تقریروں سے ادب میں غلط رجحان کی مخالفت کی۔ صحت مندانہ ادب کی زندگی آموز قدروں کو برباد ہونے سے بچا لیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بے سمتی کا مفروضہ بھی کسی نہ کسی شکل میں سماجی پس منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ علامات کی ندرت کا تعلق الفاظ سے ہے اور الفاظ کچھ ردو بدل کے ساتھ سماجی زندگی ہی سے حاصل ہوتے ہیں اس معرکہ میں بھی ان کے قلم کی سلامت روی اور شائستگی برقرار رہی۔ انھوں نے کسی ناقد پر ذاتی حملہ کر کے اس کی دل آزاری نہیں کی۔ یہ حقیقت اور واضح ہو گئی کہ عالمی ادب پر احتشام صاحب کو بے پناہ عبور حاصل ہے۔ ان کے مخالفین ان کے سامنے بالکل طفل مکتب معلوم ہوتے تھے۔ احتشام صاحب کا ایک مخصوص معروضی نکتۂ نظر تھا جس پر وہ آخر وقت تک نہایت ایمانداری اور پختگی کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

اردو ادب پر جب بھی جمود کے آثار نظر آئے احتشام صاحب نے ادب میں نئے نئے گوشے، زاویے اور راہیں تلاش کیں۔ نئی منزل کی نشان دہی کی۔ انھوں نے بتایا کہ نہ زندگی جمود آشنا ہے اور نہ ادب ہی جمود پذیر ہو سکتا ہے۔ ان کی رہنمائی نے قلمکاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو نئے حوصلے عطا کیے۔

پچھلی مردم شماری کے زمانے میں احتشام صاحب کافی فکرمند تھے۔ اس موضوع پر ان سے گفتگو رہی۔ مردم شماری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مردم شماری کے فارم پر مادری زبان کے اندراج کے لیے ایک مہم کی ضرورت ہے اور اس کا تعلق عوام کے اشتراک سے ہے۔

"لیکن یہ کام ہوگا کیسے؟" احتشام صاحب نے تشویش ظاہر کی۔

"آپ مشورہ دیجیے۔ رہنمائی کیجیے۔ کام تو ہم لوگ کریں گے۔" ہم نے کہا

اس کے بعد جلد ہی ادیبوں شاعروں اور محبان اردو کی ایک نشست منعقد ہوئی۔ لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ مرکزی کمیٹی کے تحت علاقائی کمیٹیاں بنائی گئیں اور تگ و دو شروع ہو گئی۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ باشعور تعلیم یافتہ طبقہ کو اردو سے محبت نہ تھی۔ لوگوں نے شہر کے عمائدین، اکابرین اور دانشوروں کی ایک بڑی میٹنگ کی۔ بڑی بڑی تجویزیں پیش ہوئیں اور رسمی تائید بھی ہوئی۔ چائے اور سگریٹ سے تواضع بھی ہوئی۔ پھر سب اپنے اپنے دولت کدے پر جا کر آرام فرمانے لگے۔ بس ہو گیا کام۔ دانشور صرف دانشوروں سے بات کر سکتے تھے۔ عوام سے ان کا کوئی ربط نہ تھا۔ سرمایہ دار نے سوچا کہ اردو مادری زبان ہونے سے اس کے سرمایہ میں کون سا اضافہ ہوگا۔ اردو کے نام پر ووٹ لینے والے سیاست داں خاموش تھے کیونکہ ابھی اسمبلی کے انتخابات کا زمانہ دور تھا۔

لیکن احتشام صاحب تھے کہ ہم لوگوں کے ساتھ محلہ محلہ گلی گلی پیادہ دورہ کرتے۔ عوام کو عام فہم زبان میں مردم شماری کی اہمیت سمجھاتے۔ ان کے ساتھ ہم لوگوں کی ہمت بھی بڑھتی گئی اور کام تیزی سے ہونے لگا۔ ان تاریک گلیوں میں نہ شہرت تھی نہ دولت کی تقسیم ہوتی تھی۔ احتشام صاحب کے دل میں اردو زبان کا درد تھا۔ وہ اردو جس کا ایک تمدن، ثقافت، تاریخ، سماج اور زندگی سے تعلق تھا۔ وہ زبان عصبیت کا شکار ہو رہی تھی۔ احتشام صاحب اپنی زبان کو جیتے جی مٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

موسم گرما کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ میں علی الصباح گھر سے دواخانہ کے لیے نکل پڑا۔ وقت کافی تھا۔ راستے میں محمود احمد ہنر کے مکان پر

جا پہنچا۔ ہنر صاحب ابھی اندر تھے میں باہری کمرہ میں بیٹھ گیا۔ وہی ڈرائنگ روم تھا اور وہی شاہکار کا دفتر۔ میں رسالہ دیکھنے میں محو تھا۔ سامنے ایک سایہ سا حرکت کرتا محسوس ہوا۔ نظر اٹھائی اور اس کے ساتھ ہی آداب عرض کہتا ہوا خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے احتشام صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ ہنر صاحب بھی اطلاع پاتے ہی کمرہ میں آگئے۔ احتشام صاحب کو غیر متوقع اپنے گھر میں دیکھ کر سوالیہ نشان بن گئے۔

"یہ لیجیے شاہکار کے لیے تازہ کتابوں پر تبصرے۔" احتشام صاحب نے فرمایا۔

"آپ نے ناحق زحمت فرمائی۔ میں خود حاضر ہوتا۔" ہنر صاحب نے کہا

"میں محلہ احسن منزل جا رہا تھا۔ سوچا راستے میں آپ کا مکان پڑے گا۔ یہ تبصرے دیتا چلوں۔" دو منٹ شاہکار کی طباعت اور اشاعت سے متعلق باتیں کیں اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے چائے تو پی لیجیے تیار ہو گئی ہے۔ لاتا ہوں۔" ہنر صاحب نے التجا کی۔

"چائے تو میں گھر سے پی کر چلا ہوں اور جہاں جا رہا ہوں وہاں مجبوراً پھر پینی پڑے گی۔ پھر کبھی سہی۔"

ہم دونوں احتشام صاحب کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ کیا شخصیت تھی کیسی انکساری تھی۔ کیا وقار تھا کیسی انسانیت تھی۔ یہ باتیں یاد آتی ہیں تو آج بھی کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ انسانیت اور شرافت کے ایسے نمونے اب کہاں ملیں گے۔

شاہکار کے بنارس منتقل ہونے کے بعد بھی احتشام صاحب کا عملی تعاون حاصل رہا۔ الہ آباد میں تازہ موصولہ کتابیں لے کر جانا اور ان پر تبصرہ لکھوانے کا کام میرے ذمہ تھا۔ دو تین دن کے اندر جب بھی ان کے دولت کدے پر جاتا۔ اطلاع ہوتے ہی باہر آجاتے۔

"بھئی کیسے آنا ہوا" احتشام صاحب مسکراتے ہوئے پوچھتے۔

"جی — وہ ...." میں جملہ پورا نہ کر پاتا اور

"لیجیے چار کتابوں پر تبصرہ ہو گیا ہے۔ اس ماہ کے لیے کافی ہوں گے۔" احتشام صاحب فرماتے۔

"جی شکریہ" کہتا ہوا میں اٹھ کھڑا ہوتا

"بیٹھیے بیٹھیے۔" احتشام صاحب فرماتے۔

کچھ دیر شاہکار سے متعلق باتیں ہوتیں۔ ہنر صاحب کی مصروفیات ضرور دریافت کرتے۔ اس درمیان چائے آجاتی۔ اردو کی رفتار ترقی ہندوستان کے مختلف ادبی اور سماجی اداروں اور کانفرنسوں کی سرگرمیوں کا ذکر ہوتا۔ گفتگو کے دوران کوئی تکلف حائل نہ ہوتا۔ کبھی مجھے ان کے گھر انتظار کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔ کسی طرح کا تردد نہیں ہوتا تھا۔

یہاں میں ان دانشوروں سے مقابلہ کر کے اس موضوع کو داستان در داستان بنا کر طول نہیں دینا چاہتا جو ناموری حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں لیکن کام کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ جو قلمی معاونت کا وعدہ تو کر لیتے ہیں لیکن دو سطر لکھنے میں تساہلی برتتے ہیں۔ مہینوں دوڑاتے ہیں۔ حرم سرا سے اطلاع ملتی ہے کہ حضور آرام فرما رہے ہیں۔ اکثر تو مخلص کارکن خود سے نہیں ان بزرگوں سے) مایوس ہو کر تعاون کا تقاضا کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ نئی نسل کی ہمت افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ یہ بزرگ ادیب و شاعر بظاہر صداقت کے علم بردار دراصل منافق کا رول ادا کرتے ہیں۔ دوسروں کو اخلاق و ایثار کی تعلیم دیتے ہیں اور احتیاط کرتے ہیں خود اس دام میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ یہ دوہرے کردار کے مالک زبان سے عوام کی باتیں کرتے ہیں لیکن ان کا قلم اہل اقتدار کی تصویریں بناتا ہے۔ یونیورسٹی کے طلبا تو احتشام صاحب کو اپنی تمام مشکلات کا حل تصور کرتے تھے۔ طالب علموں کو آسانیاں بہم پہنچانا ان کی رہنمائی کرنا اور ان کی صحیح ہمت افزائی کرنا ان کا مسلک تھا۔

مقامی اور بیرونجات سے حاجت مند ان کے پاس آتے تھے۔ اپنے لیے، اپنے احباب و اقربا کے لیے مدد اور سفارش کے خواستگار تے۔ احتشام صاحب انھیں ہر طرح کی سہولت دیتے اور جائز سفارش سے دریغ نہ کرتے۔ انسانیت کی خدمت کر کے انھیں یک گونہ سکون مل ہوتا تھا۔

ان کی خدمت میں ہر مقام سے ادیب، شاعر، سیاست داں اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگ حاضر ہوتے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اخلاق سے پیش تے تھے۔ ادب اور زندگی کے مختلف مسائل پر ان کی رائے لی جاتی تھی۔ احتشام صاحب کی باتیں بڑے انہاک، احترام اور عقیدے سے سنی ی تھیں۔ اکثر حضرات تو صرف اپنی سنانے آتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ احتشام کس تحمل کے ساتھ ایسے لوگوں کی غیر ضروری اور فضول گفتگو برداشت کرتے تھے۔ کبھی کبھی اچھا۔ ہوں۔ ہاں کرتے رہتے۔ جو شخص بھی اس بارگاہ میں آتا مطمئن ہو کر اور ایک خوشگوار اثر لیکر واپس جاتا۔

اُن کی ہر دلعزیزی کا اس سے بڑا علمی ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انتقال کے آدھ گھنٹے کے اندر ان کے دروازے پر ہزاروں کا مجمع جود تھا۔ یونیورسٹی اور بیشتر تعلیمی ادارے فوراً بند ہو گئے۔ ریڈیو اسٹیشن کا عملہ اور اخبارات کے نمائندے ان کے دروازے پر چشم دید واقعات م بند کر رہے تھے۔ ریڈیو سے اُن کے انتقال پر ملال کی خبر نشر ہو رہی تھی۔ ملک کے گوشے گوشے سے وزیروں، سیاسی رہنماؤں، ادیبوں، اعروں اور احباب کے تعزیتی پیغامات اور ٹیلیگرام آ رہے تھے۔ ادبی انجمنوں اور سماجی اداروں کے تعزیتی جلسے ہو رہے تھے۔ انگریزی دو اور ہندی کے اخبارات اور رسائل ان کا سوگ منا رہے ہیں۔

احتشام صاحب کوئی عزلت نشین فلسفی نہیں بلکہ ایک باعمل عالم اور متحرک ادارہ تھے۔ وہ ایک عصر ساز ادیب، شاعر، افسانہ نگار، ناد، ماہر تعلیم اور صاحب طرز مصنف تھے — اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ وہ انسان دوستی اور وضع داری کے پیکر تھے۔ ان کی تہذیب اور شائستگی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ تمام عصبیت سے پاک اور روشن خیال۔ مجسم انسانیت اور سراپا خلوص۔ ر یہی خلوص ان کی تخلیقات میں بھی موجود ہے۔ یہ ان کے خلوص کی حرارت تھی جو ان کی تحریروں اور تقریروں میں تاثر پیدا کرتی تھی۔ علم و انش اور شرافت و انسانیت کا ایسا دل آویز امتزاج بہت کم شخصیتوں کو نصیب ہوا ہے۔ ان کا تنقیدی و تخلیقی کارنامہ ہمارے اردو ب ہی نہیں، عالمی ادب کی تاریخ کا بیش قیمت اور غیر فانی سرمایہ ہے۔ احتشام صاحب نے علم و دانش کی جو شمع روشن کی، اسے تابندہ کھنا ہی در اصل ہماری عقیدت، محبت اور احترام کا صحیح ثبوت ہوگا۔

رئیس فروغ

احتشام حسین کی روشنی میں

ہمارے ہاں ذاتی پسند کے گلیشیروں، بے دلیل دالوں کے آبشاروں اور خوشنما فقروں کی گنگناتی ندیوں نے جب ایک دریا کا روپ دھارنا شروع کیا تو وہ آزاد، حالی اور شبلی کا زمانہ تھا۔ لیکن تنقید کے اس دریا میں نئے موسموں کا پانی اس صدی کے چھتیسویں سال کے لگ بھگ آنا شروع ہوا یہ ترقی پسند ادب کا ابتدائی زمانہ تھا۔

ترقی پسند ادب کے پلیٹ فارم پر جمع ہونے والوں میں کچھ ایسے تھے جو ہجوم کی نفسیات کے تحت چلے آئے تھے، کچھ ایسے تھے جنھوں نے اس تحریک کو فیشن کے طور پر اپنایا اور کچھ وہ تھے کہ جب انھیں چھو کر دیکھا گیا تو وہ نہ تھے، ان کے سائے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ اس پلیٹ فارم سے بعض نوکریوں کے زینے سے اوپر چڑھ گئے بعض شادیوں کی سیڑھی سے نیچے اتر آئے۔ مگر شور جاری رہا۔ اور جب یہ شور دھیما پڑا تو ممتاز حسین نے لکھا

"ادب جہاں قدم قدم پر زندگی اور اس کی سیاست سے الجھا ہوا ہے، وہاں وہ اپنی اضافی آزادی بھی رکھتا ہے۔ اور زندگی سے اتنا براہ راست رشتہ نہیں رکھتا، جتنا ترقی پسندوں نے، بشمول میرے، سوچ رکھا تھا۔ اس اضافی آزادی کی دنیا میں ادب کی ذہنی جمالیاتی اور فنی قدریں بھی ہیں۔ حسن کو خیر سے جدا کرنا تو ناممکن ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حسنِ اظہار حسنِ معنی کی توسیع ہے۔ اس پہلو پر ترقی پسند ادیبوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور ان کا ادب بالعموم چند اچھے ادیبوں کو چھوڑ کر یا تو خطابت کا انداز لیے ہوئے تھا یا پھر راست قسم کا تھا۔"

ممتاز حسین صاحب نے اس تبصرے میں چند اچھے ادیبوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ یہاں چند ادیبوں کے ساتھ اگر چند نقادوں کا بھی اضافہ کر دیا جائے تو ان میں احتشام حسین یقیناً ہوں گے جنھوں نے وقتی نعرہ بازی سے اجتناب کیا اور اپنے نقطۂ نظر کو منطقی استدلال کے ساتھ پیش کیا اور اس طرح ہماری تنقید میں اس رجحان کو زیادہ واضح زیادہ روشن اور زیادہ جاندار ہونے کے لیے فضا کو سازگار بنایا جس کی جھلکیاں آزاد حالی اور شبلی کے یہاں ملتی ہیں۔ وہی رجحان جو کچھ اور توانا ہو کر رائے پوری کے مضامین میں نمودار ہو چکا تھا۔ احتشام حسین انسان دوستی کو ادب کا معیار قرار دیتے ہیں۔ ادب کو زندگی کا عکاس ہی نہیں زندگی کے ارتقا میں معاون مانتے ہیں اور اس ارتقا کے پیچ در پیچ اسباب و نتائج کا سائنٹیفک تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ اردو تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"بیسویں صدی میں ہندوستان کی تاریخ جن راہوں سے گذری، وہ بہت ہی پیچیدہ پُرخطر اور ناہموار تھیں۔ ایسے نشیب و فراز مشکل ہی سے کسی ملک کی تاریخ میں ہوں گے آویزشوں کی اتنی شکلیں اور کہیں نظر نہیں آئیں گی یہاں پُر پیچ وادیوں سے انسانی ذہن کا گزرنا اور مختلف آویزشوں گھٹتی بڑھتی لہروں، قومی اور بین الاقوامی جذبوں، مادی اور

روحانی الجھنوں کا احاطہ کرکے اپنی راہ متعین کرنا ایسا آسان نہیں ہے، جیسا آسان نظر آتا ہے اس لیے تنقید نگار کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ اگر وہ ان تمام عناصر کو پیش نظر رکھے، ان تمام علوم سے کام لے جو انسان کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور اس کے خیالات وجذبات کی گتھیاں کھولتے ہیں تو وہ یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ اس نے فلاں شاعر یا ادیب کے مافی الضمیر کو سمجھا ہے،،

ب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ناقد ہو یا ادیب ہو یا شاعر ہو، تمام علوم سے کام کس طرح لے۔ کام لینے کے لیے تمام علوم پر دسترس ضروری ہے اور آج عالم یہ ہے کہ علم انسان کے سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ ایک سائنس ہی کے کتنے شعبے کے ساتھ ذیلی شعبوں کا کتنا طویل سلسلہ ہے۔ ہم اسپیشلائزیشن کے عہد میں جی رہے ہیں نظر اٹھائیے تو ستارے اور ان کا نظام، نظر جھکائیے تو زمین اور اس میں چھپے ہوئے فطرت کے راز۔ مادی حقائق کے پیچھے کارفرما اسرار، خوابوں کی پرپیچ وادیاں، ایٹم کی تنگنائے میں کائنات کی وسعتیں۔ طبقات الارض، فزکس، بیالوجی، فزیالوجی، نفسیات، معاشیات۔ علم کی نئی نئی شاخیں، پرانے علوم کی تشکیل جدید ہیگل، فرائڈ، آئن اسٹائن اور مارکس کی دنیا۔ ایسے میں ادب کہاں جائے۔ وہ کسی آنے والے کے انتظار میں ہے جو احتشام صاحب کے الفاظ میں ان تمام علوم سے کام لے سکے جو انسان کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور اس کے خیالات وجذبات کی گتھیاں کھولتے ہیں۔

یہ خیالات وجذبات کی گتھیاں بھی کوئی ٹالی کی گرہ نہیں ہیں۔ انھیں کھولنے میں انگلیاں فگار ہوتی ہیں۔ دراصل ہم انسان کے خورد بینی شاہدے کے عادی رہے ہیں۔ کبھی ہم اسے شعوری تجربے تک محدود سمجھتے ہیں کبھی صرف تخیل تک، جس طرح سماجی نظام کے تمام شعبے مل کر ایک کل بناتے ہیں۔ سیاسیات اقتصادیات اعتقادات سب ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہوئے اور ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہوئے معاشرتی اکائی بناتے ہیں۔ اسی طرح آرٹ بھی ہمارے ذہنی تجربے کے کسی ایک حصہ کا عکس نہیں ہوتا۔ وہ ہمارے تجربے کی تمام گہرائیوں اور تمام وسعتوں کا عکاس ہوتا ہے یہاں اجتماع ضدین ہوتا ہے۔ داخلیت اور خارجیت کا ملاپ۔ خواب اور حقیقت کا وصال۔ جی ہاں داخلیت اور اور خارجیت یا خواب اور حقیقت کا تضاد ہی تو ہمارا سب سے بڑا دکھ ہے۔ اس تضاد سے رہائی پاکر ہی ہم کل وجود کا شعور حاصل کرسکتے ہیں اور وجدان کے سرچشموں تک پہونچ سکتے ہیں۔ نیچرلزم، آئیڈیلزم، اخلاقیات کے ساتھ ساتھ زندگی کی لاشعوری قوتیں بھی ہیں۔ لاشعوری قوتیں جو فن کی جان ہیں ہم انھیں کس طرح نظر انداز کرسکتے ہیں۔

یہ قصہ ہے خیالات اور جذبات کی گتھیوں کو سلجھانے کا جس کی طرف احتشام حسین اشارہ کرتے ہیں اور انھیں کے الفاظ میں یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا آسان نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر سید رفیق حسین
صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی۔ الہ آباد

احتشام صاحب کی عظمت

(میرے جذبات و تاثرات)

اوائل عمری کے روابط و مراسم زندگی میں بڑے استوار اور اہم ہوتے ہیں۔ لڑکپن کی دوستی بے لوث و غرض سے پاک اور صدق و اخلاص سے مملو ہوتی ہے اس میں ایسی روحانی تب و تاب ہوتی ہے جو آخری دم تک قائم رہتی ہے۔ سفر حیات کے نشیب و فراز کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جب اور جہاں ملے شیر و شکر ہو گئے۔

ویسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ سے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد جب احتشام حسین نے جولائی ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد میں گیارہویں درجے میں داخلہ لیا تو میں وہاں ایک سال پہلے ہی سے انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ بہت جلد میرے اور ان کے خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔ اور ایک دوسرے سے روابط بڑھنے لگے۔ وہ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور میں فیض آباد کا۔ اور ہم دونوں میں ایک آدھ بات اور بھی مشترک تھی۔ اردو فارسی ان کی بڑی اچھی تھی۔ اور مجھے بھی فارسی اور اردو سے اچھا خاصا شغف تھا۔ بارہویں درجے کے طالب علم ہونے کی وجہ سے میں لٹریری سکریٹری اور مشاعرہ سکریٹری منتخب ہو گیا تھا۔

احتشام مرحوم بڑے سیدھے سادے طالب علم تھے۔ انتہائی منکسر مزاج، میں طلبا کے معاملے میں پیش پیش رہتا۔ اور وہ بہت خاموش۔ گورنمنٹ کالج میں ایک آدھ بار مرحوم نے مباحثوں میں حصہ لیا تھا۔ لیکن ان کی شعری صلاحیتوں کا نہ مجھے علم ہو سکا اور نہ اساتذہ کو۔ یونی ورسٹی میں بھی ہم دونوں یکے بعد دیگرے داخل ہوئے۔ شعبہ اردو سے ہم دونوں کی وابستگی ہو گئی۔ یہاں ان کے جوہر کھلنے لگے۔ وہ نظمیں کہنے لگے۔ اور مضامین بھی لکھنے لگے۔ جس سال وہ شعبہ میں آئے۔ میں نے ایک سہ ماہی رسالہ موسوم بہ "نیسایں" نکالنے کی تجویز طلبا اور اساتذہ کے سامنے پیش کی۔ شعبہ کے طلبا میں احتشام مرحوم بی اے سال اول اور میں سال دوم، نثار عظیم ایم اے سال اول، حامد حسن بلگرامی ایم اے فائنل سے نائب مدیر نامزد ہوئے۔ پروفیسر سید محمد ضامن علی مرحوم صدر شعبہ اردو اس سہ ماہی رسالے کے مدیر تھے۔ اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب اس کے منیجر۔ مضامین کی فراہمی اور اشاعت کی ذمہ داری طلبا کے سر تھی۔ جتنے مضامین آتے ان پر تبصرہ کرنا اور ان کو ترتیب دینا نائب مدیروں کی ذمہ داری تھی۔ اور یہ کام انتہائی تندہی اور ذوق و شوق سے کیا جاتا تھا۔ اسے آپ ستم ظریفی سمجھئے یا کچھ اور کہ ایم اے کے طلبا اور اساتذہ کے مضامین بھی ہم دونوں بی اے کے طالب علموں کو سونپے جاتے کہ ان پر تنقید و تبصرہ کریں۔ ہم دونوں اس کام کو بے دھڑک انجام دیتے۔ اور کسی طرح کی رعایت نہ کرتے۔ جب تک ہم دونوں شعبہ میں رہے یہ رسالہ مالی دشواریوں کے باوجود نکلتا رہا۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب ہم لوگوں کی ہمت افزائی کرتے اور ہاتھ بٹاتے۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد احتشام مرحوم چند سال کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی میں لکچرر مقرر ہو گئے اور میں نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ فرائض منصبی کی انجام دہی میں مجھے اکثر لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ میں ان سے برابر ملتا رہتا تھا۔ جب بھی ان سے ملنے گیا میری اچھی خاصی تواضع ہوئی۔

اردو سے شغف ہونے کی وجہ سے ۱۹۴۰ء میں انھوں نے ریسرچ کرنے کے لیے محکمہ سے رخصت لینے کے بعد شعبہ اردو میں پھر داخلہ لے لیا اور احتشام مرحوم اپنے منصب پر قائم رہتے ہوئے برابر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ اور نام پیدا کرتے رہے۔ الہ آباد میں رہتے ہوئے ہی ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی تو بہت جلد اس کے سرگرم رکن ہو گئے۔ اور جب اس کی باقاعدہ تشکیل ہوئی تو یہ اس کے اچھے ممبروں میں شمار ہونے لگے۔ جلسوں میں اچھی خاصی تقریر کرتے۔ رسالوں میں تنقیدی مضامین لکھتے۔ اچھی نظمیں کہتے اور ڈرامے تحریر کرتے۔ لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوتے ہی وہ اس کے مستقل مقرر ہونے لگے۔ تقریروں اور تحریروں کے وسیلے سے ان کی شہرت میں چار چاند لگنے لگے۔ یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ ترقی پسند تحریک نے انھیں سنوارا یا انھوں نے ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ بہرحال شہرت و مقبولیت کے سایے میں وہ نومبر ۱۹۶۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔

پچھلے گیارہ بارہ سال میں میرے تعلقات اور زیادہ خوشگوار و استوار ہوئے۔ میں ان کو ہمیشہ صدر مانتا۔ اور وہ مجھے دیرینہ اخلاص و محبت سے نوازتے۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں میری تقرری (Dean of Students Welfare) کی ہوئی تو مرحوم نے مجھے بادل ناخواستہ رخصت کیا۔ لیکن شعبہ سے دور ہونے کی تلافی ہم دونوں کرتے رہے۔ جب مجھے موقع ملتا ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اور جب وہ کئی دن مجھے نہ دیکھتے تو بلا کہے سنے میرے کمرے میں آ جاتے۔ یونیورسٹی کے حلقوں میں میری ان کی دوستی اور خلوص تقریباً ضرب المثل بن گئی تھی۔ شعبہ اور یونیورسٹی کے معاملات میں ہم دونوں ایک دوسرے سے صلاح و مشورہ کرتے اور کسی صحیح نتیجے پر پہونچنے کی کوشش کرتے۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے ڈاکٹر عقیل صاحب مجھے شعبہ لے گئے۔ جہاں احتشام مرحوم چائے پی رہے تھے۔ مجھے بھی چائے دی۔ بسکٹ اور دوسری کھانے کی چیزیں میری طرف بڑھائیں۔ اور اصرار سے کھلانے لگے۔ میرے کاموں کی کثرت اور مصروفیت پر اشتباہ کرتے ہوئے کچھ میں اور ان میں دو چار مشورے ہوئے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

۲۷، ۲۸ نومبر کو سینیٹ ہال (Senate Hall) میں وائس چانسلر صاحب نے تمام اساتذہ کو بلایا تھا۔ میں وہاں پہلے سے موجود تھا۔ جلسہ شروع ہونے کے بعد احتشام مرحوم سینٹ ہال میں داخل ہوئے۔ ادھر ادھر دیکھا اور جہاں میں بیٹھا تھا وہیں آ گئے۔ ان کے لئے ایک کرسی خالی کر دی گئی۔ اور ہم دونوں چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ میں اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد ان سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کی صبح کو میں اپنے کمرے میں ایک رفیق کار سے ضروری باتیں کر رہا تھا کہ ڈاکٹر مسیح الزماں کا ٹیلی فون آیا اور انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر صاحب غضب ہو گیا۔ احتشام صاحب پر شدید دل کا دورہ پڑا! میں جا رہا ہوں"۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا ٹیلی فون ڈاکٹر ابرار صاحب نے کیا۔ اور اس جانکاہ سانحہ کی اطلاع دی۔ میرے ہوش و حواس جاتے رہے۔ وائس چانسلر صاحب کو میں نے فون پر اطلاع دی۔ موصوف نے اپنا چپراسی بھیجا اور اطلاع دی کہ وہ آ رہے ہیں۔ اور مجھے ساتھ لے جائیں گے۔ میں نے چپراسی سے کہلا بھیجا کہ میں بھی آ رہا ہوں۔ ہم دونوں تھوڑی دیر کے بعد احتشام مرحوم کی جائے رہائش پر پہونچ گئے۔ ان کی پرسکون صورت دیکھ کر مجھے یارائے ضبط نہ رہا۔ احتشام مرحوم کی قیام گاہ سے چلتے وقت جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کے بعض اعزا کا ارادہ ہے کہ ان کی لاش لکھنؤ لے جائیں تو میں نے مخالفت کی۔ میری تائید وائس چانسلر صاحب نے بھی کی۔ میں نے ڈاکٹر محمود الحسن سے کہا کہ وہ میری رائے بیگم احتشام تک پہونچا دیں۔ اتنا کہہ کر میں وائس چانسلر صاحب کی معیت میں یونیورسٹی واپس آیا۔ اور تعزیتی اجتماع میں حصہ لیا۔ شام کو جب میں ان کی جائے رہائش پر دوبارہ پہونچا تو معلوم ہوا کہ ان کی تجہیز و تکفین دوسری دسمبر کی صبح کو ہو گی۔

ہر مذہب و ملت کے افراد نے اس میں شرکت کی۔ شیعہ سنی دونوں نے نماز جنازہ پڑھی اور بلا تفریق مذہب و ملت طلبا اور اساتذہ

رجا دیا۔ ڈاکٹر ابوالم سکینہ، وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی نے قبرستان تک پیدل چلکر جنازہ کی مشایعت کی۔ دو روز تک یونیورسٹی نے سوگ منایا۔

میرے اور احتشام مرحوم کے رابطوں کی یہ کہانی بڑی طویل ہو سکتی تھی۔ لیکن مختصراً میں نے بیان کر دیا۔ ان الفاظ و سطور کو عرض صورت ہی ہا جائے۔ میرے لیے نقش معنی کا بنانا بہت دشوار ہے۔ ممکن ہے کہ میں جذبات کی رَو میں کچھ ایسی باتیں لکھ جاؤں جن میں معروضیت سے زیادہ نوعیت ہو تو میں معذور سمجھا جاؤں۔

احتشام حسین کی سیرت و کردار میں آئینے کی کا صفائی اور آب و تاب ہے بہتے ہوئے دریا کی سطح پر سورج کی کرنوں کی حالت نہیں ہے۔ برابر تھرتھراتی، لرزتی اور کانپتی رہتی ہیں۔ ان کی ساری زندگی میں جس چیز کی سب سے زیادہ کارفرمائی تھی وہ ان کی محنت اور تن دہی تھی۔ محنت پڑھتے، محنت سے لکھتے، محنت سے تقریر کرتے۔ انسان کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ محنت کرنے میں انھیں وہ مہارت تھی کہ سننے پڑھنے والے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان کی رواں دواں عبارت اور شیوا بیانی کے پس پشت اسی محنت کی کارفرمائی ہے۔ نئی لیے ں کتابوں کو شروع سے آخیر تک پڑھتے اور ان کے مطالب و معانی کو ذہن میں خزانے کی طرح محفوظ رکھتے۔ جب چاہتے اور جتنا چاہتے ں میں سے صرف کرتے۔ وہ تقریر و تحریر کے خادم نہ تھے۔ بلکہ وہ دونوں اُن کے خدمت گزار تھے۔ ہر موضوع پر بلاکسی تکلف اور تکلیف کے وہ لتے اور لکھتے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ان کا یہ وصف ان کی عظمت کا باعث ہے۔ ظاہر ہے کہ ادیب کی عظمت ویسی نہیں ہوتی جیسی سیاسی ہاؤں کی ہوتی ہے۔ دونوں میں بین فرق یہ ہے کہ ادیب کی عظمت اس کی اپنی محنت و کاوش کی بنا پر بہت زیادہ تابناک نہ ہو تو نہ سہی لیکن اکثر اس کا باہم پایہ ہوا کرتی بلکہ استوار تر۔

بڑا آدمی ہمیشہ محنت کرنے کا عادی ہوتا ہے اور جب اسے محنت کرنے کا موقع نہیں ملتا تو اپنے کو معدوم و مجہول سمجھتا ہے۔ بڑے آدمی کے اوصاف کی مثبت اور منفی تعریف کولٹن (Coltom) نے بڑے اچھے انداز سے کی ہے۔ کولٹن ایک انگریز پادری تھا۔ وہ کہتا ہے کہ:

"In life we shall find many men that are great and some men that are good, but very few men that are great and goo

(زندگی میں ہم بہت سے بڑے آدمیوں کو پائیں گے اور کچھ اچھے آدمیوں کو، لیکن بہت تھوڑے انسان وہ ہوں گے جو بڑے بھی ہیں۔ اور اچھے بھی)

آگے چلکر وہ بڑے آدمی کی منفی تعریف پیش کرتا ہے۔

"Subtract from the great men all that he owes to opportuni all that he owes to chance, and all that he has gained by the wisdom of his friends and the folly of his enemies, and the giant will often be seen to be a pigmy."

(بڑے آدمیوں سے وہ سب چیزیں لے لیجئے کہ جو اسے موقع پرستی سے ملی ہوں۔ یا وہ چیزیں جو اتفاق سے ملی ہوں اور وہ تمام چیزیں کہ جو اس نے اپنے دوستوں کی عقلمندی سے ملی ہوں۔ یا اپنے دشمنوں کی بے وقوفی سے تو اکثر تو دیو ہیکل دیو بڑے چھوٹے سے قد کا بالشتیا نظر آئے گا)

ان دونوں اقتباسات کی روشنی میں احتشام مرحوم کی سیرت و اوصاف کو جانچا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ وہ نہ صرف بڑے ادیب بلکہ اچھے انسان بھی تھے۔ بڑے شاعر و ادیب کی خوش فعلیوں سے آپ اور ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ کیا کچھ بڑے شعراء و ادیبوں نے نہیں

لیا یا نہیں کرتے۔ اور احتشام مرحوم کو تو ہم بہت قریب سے جانتے ہیں کہ نہ تو انھوں نے سگرٹ پی اور نہ کبھی منہ میں لگا کر لگایا۔ وہ تو پان تک نہیں کھاتے تھے۔ سیدھی سادی معمولی غذائیں اور وہ بھی صرف ایک وقت کھاتے تھے۔ جو کچھ گھر میں پک گیا۔ اسے شوق سے کھا لیا نہ پکانے والے کا شکوہ اور نہ کھلانے والے کی شکایت۔ کھانے میں اگر مرچ و نمک تیز ہے یا کم تو بھی منہ سے کچھ کہتے۔ کم کھاتے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میزبان سے کبھی کوئی فرمائش نہ کرتے۔ ایک سے زیادہ کھانے کی چیزیں اگر دسترخوان یا میز پر ہوں۔ تو انھیں بہت زیادہ خوشی نہ ہوتی۔ نہ بھنے ہوئے گوشت کی فرمائش کرتے اور نہ تلے ہوئے بادام کھاتے۔ روغنیات سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اور یہ اس وقت جب سب کچھ کھا سکتے تھے۔ اور پی سکتے تھے۔ بڑے لوگوں کی صحبتوں میں رہتے۔ دعوتوں میں شریک ہوتے۔ اور اپنا دامن بچا کر چلے آتے۔ اچھائی کا یہ پہلو ان کی سیرت میں نمایاں تھا۔ اور اس سے ان کا بڑاپن بھی ظاہر ہوتا تھا۔

احتشام حسین بڑے جامہ زیب تھے۔ معمولی کپڑوں میں بھی وہ بہت اچھے لگتے تھے۔ قیمتی سوٹ اور رنگین ٹائی سے انھیں کوئی مطلب نہ تھا۔ کپڑوں اور ٹائیوں کے انتخاب میں بعض لوگ زندگی کے قیمتی اوقات صرف کر دیا کرتے ہیں۔ احتشام مرحوم اپنے لیے معمولی وضع دار کپڑے کسی اچھی دکان سے فوراً پسند کر لیتے اور درزی کو دے دیتے۔ مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ لکھنؤ میں ان کا کوئی خاص خیاط تھا بھی یا نہیں۔ وہ زیادہ تر شیروانی اور ڈھیلے پائنچے کا پاجامہ پہنتے۔ جس وقت دل کا دورہ پڑا وہ کالی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ جو غسل کے وقت کاٹ کر ان کے جسم سے علاحدہ کی گئی۔ کبھی کبھی گرم سوٹ موسم سرما میں پہنتے۔ گرمیوں میں بش شرٹ اور پتلون پہنتے تھے۔ لکھنؤ میں ملازم ہونے کے بعد شاید انھوں نے ایک بار گھر تبدیل کیا۔ اس کے بعد جس گھر میں قیام پذیر ہوئے اسی میں تا قیام لکھنؤ بود و باش رہی۔ الٰہ آباد آنے پر بھی کچھ دنوں اہل و عیال وہیں رہے۔ بڑے شہروں میں آسانی سے مکان نہیں ملتا۔ میرے بار بار کہنے سے یونیورسٹی میں مکان کے لیے انھوں نے درخواست تو دے دی۔ اور جب انھیں ایک نئے مکان میں رہنے کی اجازت بھی مل گئی تو وہ اپنی موجودہ جائے رہائش سے منتقل ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس میں بہر حال ان کی کوئی مصلحت ہوگی۔ میری دریافت پر وہ صرف مسکرا دیتے اور کہتے رفیق صاحب وہیں آرام سے ہوں۔ میں بھی اصرار نہ کرتا۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے غور کیا تو بات سمجھ میں آگئی۔ عالی شان عمارتوں اور بنگلوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ عام لوگوں میں مل جل کر رہنے سے انھیں خوشی ہوتی تھی۔ وہ اچھے سے اچھے مکان میں بھی رہ سکتے تھے۔ اچھی سے اچھی غذا کھا سکتے تھے۔ لیکن وہ تو سادہ مزاج انسان تھے۔ گراں بہا ڈنر سیٹ میں کھانے کے بجائے معمولی برتنوں میں انھیں کھانا پسند تھا۔ اور یہ بھی۔ ان کے بڑے پن کی علامت۔ بڑا انسان تو اپنے مٹی کے برتنوں کو بھی نقرئی اور طلائی برتنوں پر ترجیح دیتا ہے۔ کھانے پانی کے لیے جیسے بھی ظروف استعمال کیے جائیں۔ اس کی خاصیت اور ماہیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ تھی ان کی اچھائی اور ان کا بڑاپن۔

مندرجہ بالا کوٹیشن کے اقتباس سے میرے خیال کو اور زیادہ تقویت پہونچتی ہے کہ احتشام مرحوم کی شخصیت بہت بڑی تھی۔ وہ ترقی پسند تھے۔ اور ہمیشہ ترقی پسند رہے۔ وہ اسے اچھا سمجھتے اس لیے اس کی تائید اور ترویج کرتے تھے۔ مصلحت پسندی سے کام لیتے تو شاید لکھنؤ ہی میں وہ اور زیادہ ترقی کرتے: "اگر زمانہ نہ سازد تو بہ زمانہ بساز" کے اصول پر عمل کرتے تو اور زیادہ ترقی کر سکتے تھے لیکن مصلحت بینی سے تو انھیں نفرت تھی۔ سادگی، سچائی اور صفائی سے جسے محبت ہو وہ ابن الوقت کیسے ہو سکتا ہے۔ کٹھن سے کٹھن اوقات میں بھی وہ اپنے اصولوں پر ڈٹے رہے۔ ان کی زندگی سے اچھے مواقع کے نکال لینے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جس کا کوٹیشن نے اپنے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ اکثر دوستوں کو ان سے فائدہ پہونچا ہے۔ ان کو شاید ہی کسی دوست سے ـــــ ایسا فائدہ پہونچا ہو جس کا ذکر کیا جا سکے۔ دوسروں کو انعام دلاتے۔ اور اپنے لیے زبان بند رکھتے نہ جانے کتنے دوستوں اور شاگردوں کو مصنف بنا دیا کتنے دوستوں اور شاگردوں کی تصنیفات و تالیفات پر حک و اصلاح کی زحمت گوارا کی۔ مشورے دیئے اور اس لائق بنا دیا کہ وہ

مصنف کہلائے بتمام وہ جملے اور پیراگراف اکٹھے کر دیے جائیں جو ان کے قلم کے مرہون منت ہیں تو یقیناً ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے گی۔ لیکن ان کی تصنیفات و تالیفات میں دوسروں کے دو چار جملے بھی نہ ملیں گے۔ احتشام ایسا بڑا ادیب اس جرم کا ارتکاب کر ہی نہ سکتا تھا

اب رہ گیا کولنس کا فقرہ کہ بڑے انسان کو بہت کچھ اتفاق سے ملتا ہے۔ اور یہ سب اس کی زندگی سے نکال لیا جائے تو کچھ نہیں رہتا۔ احتشام مرحوم کی زندگی میں اتفاق کو کوئی دخل ہی نہ تھا۔ انھیں تو جو کچھ ملا وہ اپنی کنت، صلاحیت اور قابلیت سے ملا۔ کوئی اتفاقیہ امر ان کی زندگی میں آیا ہی نہیں۔ میرے ذاتی علم میں ہے کہ انھیں اچھے سے اچھے عہدوں کی طرف رغبت دلائی گئی لیکن مرحوم نے کبھی ان عہدوں پر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ جو کچھ انھیں مل بھی جاتا اسے واپس کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ الہ آباد یونیورسٹی ٹیچرز ایسوسی ایشن کی صدارت کے لیے جب ان کا نام تجویز ہوا تو مرحوم کسی صورت سے اسے قبول کرنے کو تیار ہی نہ ہوتے تھے۔ میں نے برادرانہ فرائض کی اہمیت پر جب بہت زیادہ زور دیا تو بڑی مشکل سے یہ عہدہ انھوں نے قبول کیا۔ اور کئی سال تک بھائیوں کی خدمت کرتے رہے۔ اسی طرح کے چھوٹے موٹے مواقع اگر ان کی زندگی سے نکال بھی لیے جائیں تو ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مجھے اس کا بھی علم ہے کہ انھیں اور بڑے بڑے عہدے دینے کی تجویزیں ہوئیں لیکن مرحوم نے شرف قبولیت نہ بخشا۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ان کا کوئی دشمن نہ تھا۔ ہر بڑے آدمی کے دشمن پیدا ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ دشمنی مول لینا نہ چاہے۔ ہر شخص اپنے دشمنوں کی حماقتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے یا اٹھا سکتا ہے۔ احتشام مرحوم نے کبھی اپنے دشمنوں کی حماقتوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے دشمنوں نے ان کے سیدھے سادے مزاج اور رواداری سے فائدہ اٹھایا ہو۔ دوستوں نے تو یقیناً ان کی رواداری سے بے انتہا فائدے اٹھائے۔ یہ بھی مرحوم کی بڑائی تھی کہ ان کا ذکر کبھی اپنی زبان سے نہیں کیا۔ ان کے قریبی رشتہ دار ان چیزوں کی تصدیق مجھ سے کہیں زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ ایسا بے غرض انسان اپنے دوستوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ دشمنوں سے۔ اس کی شخصیت سے ایسے فائدوں کو نکالنے سے بھی اس کی شخصیت اور کردار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بڑے آدمی کی جو تعریف کولنس نے مثبت اور منفی انداز سے کی ہے بہ نظر اعتبار انھیں دیکھا گیا ہے دونوں حیثیتوں سے دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ واقعی وہ بڑے ادیب اور معلم تھے۔

عبادت بریلوی نے اپنے "تنقیدی تجربے" میں لکھا ہے کہ جو روایت حالی نے اسلوب تنقید کی قائم کی تھی اس کے اصل جوہر مجنوں گورکھپوری اور سید احتشام حسین کے تنقیدی اسالیب میں کھلتے ہیں۔ مجنوں کے تنقیدی اسلوب کا ذکر کرنے کے بعد اسلوب احتشام کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

"حالی کی قائم کردہ اسلوب تنقید کی یہ روایت احتشام صاحب کے تنقیدی اسلوب میں کچھ اور بھی نکھرتی ہے۔ اس کا رنگ روپ اس اسلوب میں کچھ اور بھی کھلتا ہے اور اس کے خد و خال کچھ اور بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ احتشام کے یہاں نظریاتی صفائی اور یا قاعدگی پر شباب پر نظر آتی ہے۔ اسی لیے ان کے اسلوب تنقید کی اس روایت کا یہی شباب نظر آتا ہے۔ احتشام صاحب کے شعور میں جو پختگی ہے اس نے ان کے اسلوب میں بھی ایک پختگی اور استواری پیدا کی ہے۔ ان کے یہاں ڈھیلا ڈھالا پن نام کو بھی نہیں ملتا۔ بلکہ ایک ڈھلا ڈھلایا سا انداز نظر آتا ہے۔ اس ڈھلے ڈھلائے انداز میں تراش خراش کی کیفیت نہیں ملتی۔ کیونکہ احتشام صاحب کا تنقیدی تفکر ان کو ایسا کرنے سے باز رکھتا ہے۔"

عبادت بریلوی کے اس نقطۂ نظر کی میں تائید نہیں کرتا۔ حالی کے سیدھے سادے مدلل اسلوب تنقید کی پرچھائیں تو ہر نئے نقاد پر پڑ سکتی ہے اس لیے کہ انھوں نے تنقید پر قلم اس وقت اٹھایا تھا جب اردو کی جیب میں کچھ نہ تھا۔ صرف شبلی اور آزاد کے اسلوب تنقید ہی سامنے

آئے تھے۔ لیکن یہ کہنا کہ مجنوں اور احتشام دونوں ان کے اسٹائل کے مقلد اور پیرو ہیں صحیح نہیں ہے۔ یہ دونوں عصر نو کے نقاد ہیں جن کی نظر دوسری زبانوں کی تنقید پر حالی سے بہت زیادہ گہری ہے۔ اتنا تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ حالی، شبلی اور آزاد انگریزی بہت کم جانتے تھے ان کی تعلیم و تربیت مغربی انداز سے نہیں ہوئی تھی۔ مجنوں اور احتشام دونوں انگریزی کے اچھے نقاد اور انگریزی کے تنقید پاروں سے بہت زیادہ واقف تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے مبلغ علم کی بنا پر اردو میں تنقید کی روایت کو سائنٹی فک بنانے میں بہت زیادہ کوشش کی۔ یہ ممکن ہے کہ تنقید کے سائنٹی فک اصولوں کو بہت زیادہ واضح نہ کر سکے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سائنٹی فک تنقید کے ڈھلے ڈھلائے سانچے بھی یہ دونوں پیش نہ کر سکے ہوں، یہ دونوں اسلوب حالی کے مقلد نہیں کہے جا سکتے۔ ان کا شمار دور حاضر کے اچھے نقادوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ——————— ان کا اسلوب بھی ایک دوسرے سے الگ ہے! نرمی، رواداری اور ہمدردی دونوں میں مشترک ہے دونوں اپنی تنقید میں بہت زیادہ عیب جوئی سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں جلال سے زیادہ جمال ہے اتنے اشتراک کے باوجود یہ اپنے اپنے اسلوب کے مالک ہیں۔ ایک دوسرے کے اسلوب پر ہلکی سی پرچھائیں مل سکتی ہے۔ کہیں دونوں کا طرز نرالا اور بے نظیر ہے نہ یہ ان کی نظیر اور نہ وہ ان کی مثال۔ عبادت بریلوی کے طرز انتقاد میں جو کمال ہے، اعادے اور ابہام پائے جاتے ہیں وہ قارئین سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان کے چند جملے ہی جو میں نے اوپر لکھے ہیں۔ میرے بیان کی تصدیق کر دیتے ہیں۔

آگے چل کر دونوں کے رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے، دونوں کو مارکسی نقاد کہا ہے۔ مجنوں کو لکھتے ہیں کہ وہ "مارکسی ضرور ہیں لیکن ان کی اصولوں سے تنقید میں اس طرح کام نہیں لیتے کہ وہ میکانکی ہو جائے۔ احساس توازن ان کے یہاں کسی انتہا پسندانہ کیفیت کو بھی پیدا نہیں ہونے دیتا یہی وجہ ہے کہ وہ متوازی رہتی ہے۔ مجنوں صاحب کی تنقید اسی لیے ایک نئے انداز کی علمبردار ہے"۔ احتشام نے مجنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مجنوں کو مارکسی تنقید کا علمبردار اور احتشام حسین کو مارکسی نظریئے تنقید کے علمبرداروں میں سب سے بڑا نقاد کہا ہے۔ ان کی عبارت حسب ذیل ہے

"پروفیسر احتشام حسین نے تنقید کے اس رجحان کی طرف باقاعدگی سے توجہ کی۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس رجحان کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ تنقید ان کا خاص میدان ہے۔ ان کی تمام تر توجہ اسی فن کی طرف رہتی ہے۔ اسی لیے وہ صحیح معنوں میں نقاد نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں بڑی گہرائی ہے۔ توازن ہے، بڑی بے باکی ہے۔ بڑا خلوص ہے، بڑی ہمدردی ہے۔ اور ان سب باتوں نے انھیں مارکسی نظریۂ تنقید کے علمبرداروں میں سب سے بڑا نقاد بنا دیا ہے"۔ (تنقیدی تجربے ص ۱۲۴)

عبادت بریلوی ایک مارکسی نقاد کہہ کر اور دوسرے کو بڑا مارکسی نقاد کہہ کر خوش ہو سکتے ہیں لیکن اردو کے اچھے پڑھے لکھے ادیب و علم ان کے فیصلے کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ ان کے عطا کردہ خطابات کے نہ تو مجنوں مستحق ہیں اور نہ احتشام حسین۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ دونوں خطابات پانے کے بعد خطاب دینے والے سے خوش گماں نہ ہوئے ہوں گے۔ جہاں تک مارکسی اصولوں کا تعلق ہے ان سے دنیا کے پڑھے لکھے لوگ واقف ہیں۔ اور بعض اصولوں کی حمایت بھی کرنے لگتے ہیں جیسے جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی، اقتصادی کشمکش، جدلیاتی مادیت کے اثرات عالمی تخلیقات، تصنیفات میں غیر شعوری طور پر مارکس سے پہلے اور شعوری طور پر مارکس کے بعد ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔ ان حقیقتوں کو منکشف کرنے والے نقاد محض صدی مارکسی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ ادب ہے زندگی کا رشتہ، دولت کی غیر مساوی تقسیم، نادار طبقے کی بے چارگی، سرمایہ داروں کے ظلم و استبداد، ادبیات میں نمایاں ہونا ضروری اور لازمی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان چیزوں سے کوئی شعوری طور پر اور کوئی غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے۔ شعوری طور پر جو ادیب اور شاعر متاثر ہوتے ہیں انھیں مقصدی یا ترقی پسند کہہ سکتے ہیں مارکسی نہیں اور جو غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر ان حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں انھیں مقصدی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن انھیں لا مقصدی بھی نہیں کہہ سکتے۔

ید بھی ادبی تصنیفات کی ایک قسم ہے۔ زیادہ سے زیادہ مجنوں اور احتشام حسین کو ترقی پسند مقصدی نقاد کہہ سکتے ہیں
توازن ذہن کے ترقی پسند ادیب سب کے سب مقصدی ادیب رہے ہیں۔ کمیونزم کے سارے اصولوں کو وہ ترقی پسندی
ری نہیں سمجھتے تھے۔ کرشن چندر ایسے انتہا پسندوں کی بات میں نہیں کرتا۔ جو ترقی پسندی اور کمیونزم کو لازم و ملزوم
ایک دوسرے کا مترادف جانتے ہیں۔

• و منصب کی اس منزل پر پہونچنے کے بعد جس پر احتشام حسین مامور تھے۔ ملت و فرقے کے قیود سے ہر پڑھا لکھا
ملند ہو جاتا ہے۔ وسیع النظری اس کا شعار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی موت پر ہر مذہب و ملت کے ماننے والو
سف کیا۔ ہزاروں تعزیتی تجاویز پاس ہوئیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں ان کی اچانک موت پر اظہار رنج و غم کیا گیا
لکھا ہے :-

(سب کچھ بخیر ہے۔ جن کا انجام بخیر ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی انجام ہی زندگی کی معراج ہے")

ے بعد ہی انسان کی جانچ و پرکھ ہوتی ہے۔ احتشام حسین ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی تحریر و تقریر کتابوں اور رسالوں
شتوں پر محفوظ ہیں۔ ان کی جانچ اور پرکھ آئندہ اور موجودہ نسلیں کرتی رہیں گی۔ وہ کیسے نقاد تھے۔ پورے طور پر کچھ
بد ہی معلوم ہو سکے گا۔ میں تو انھیں ایک اچھا اور بڑا نقاد اور معمار تنقید سمجھتا ہوں اور سمجھتا رہوں گا۔
نیائے علم و ادب میں جو عظمت انھیں اپنی زندگی میں ملی میرا خیال ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی نصیب ہوتی رہے گی۔ کم سے کم ان
در دوست تو انھیں ایسا ہی سمجھتے رہیں گے۔ ظاہر بظاہر وہ ہم سے بہت دور ہو گئے لیکن سچ پوچھئے تو موت نے انھیں ہم سے
یا ہے

"ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق"

مرتبہ سیّد اقتدار حسین

مرحوم احتشام حسین کے

تاثرات و اقوال

- رنج مجھے بیحد رنجیدہ کر دیتا ہے اور خوشیاں زیادہ خوش نہیں کرتیں۔ (ساحل اور سمندر۔ ص ۹)
- میری خاندانی زندگی بھی کچھ اس قسم کی رہی ہے کہ میں اپنے متعلقین سے اور وہ سب مجھ سے بہت زیادہ وابستہ ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نہ رہوں تو شاید ان لوگوں کو تکلیف ہو (س س ص ۱۷)
- میں سفر سے بہت خوش ہوتا ہوں اور ضروری خیال کرتا ہوں، قرآنِ مجید میں خدا کی زمین پر چلنے پھرنے، اسلامی تاریخوں میں تجربہ اور حصولِ علم کے لیے سفر کرنے کے متعلق جو ہدایتیں ہیں، میں نے انھیں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا ہے۔ (س س۔ ص ۳۴)
- امریکہ۔ ۱۲ر ستمبر عزیزوں کو خط لکھ رہا تھا تو خیال آیا کہ آج وہاں محرم کی پہلی تاریخ ہو گی اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ (س س۔ ص ۱۱)
- مرنا تو سبھی کو ہے لیکن افراد مرتے ہیں تاریخ نہیں مرتی۔ (س س۔ ص ۲۵)
- بیمار ہونے کا احساس ہے، نہ جانے کیوں خیال بار بار دل کی طرف جاتا ہے، دل کی بیماری، شاعرانہ مفہوم میں نہیں، واقعی ـــــــ (س س۔ ص ۲۵۸)
- ...... مرنے والے کے ساتھ تم یہ کر سکتے ہو کہ اس صداقت کو پھیلاتے رہو جس سے ان کے خیال روشن تھے، یقین کی وہ گرمی پیدا کرو جس سے ان کے سینے منوّر تھے۔ (س س۔ ص ۳۳۷)
- ...... بہت دن ہو گئے لیکن جب کبھی کسی قسم کی کامیابی ہوتی ہے تو آپ کی (والد مرحوم کی) دلدوز یاد ستاتی ہے۔ (روایت اور بغاوت)
- ...... یہ درست ہے کہ رونے سے یا اظہارِ غم کرنے سے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ لیکن احساس کی لطافت اور شدّت، انسانی رشتوں کی نزاکت اور طاقت اسماجی روابط کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔
  (سرفراز۔ کلبِ مصطفیٰ نمبر۔ ص ۹)

●●

الدین حمید (ایم اے)
انٹرمیڈیٹ کالج۔ الہ آباد

احتشام، احتشام صاحب، احتشام مرحوم

رشنبہ ۹ بجے صبح کی کتنی منحوس تھی وہ گھڑی جب علم وادب کا ایک درخشندہ آفتاب یکایک گہنا گیا۔ گھر اور باہر کی ساری ـــــــ فن تنقید کے میر کارواں، ماہر تعلیم، مستند مصنف، ممتاز ادیب اور بلند پایہ مقرر سید احتشام حسین اپنے عارضی جائے الہ آباد ـــــــ میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے راہیٔ جنت الفردوس ہو گئے۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے مرحوم اپنے عزیز ٹہل رہے تھے۔ اور جب وہ لوگ گھر پہونچے تو عجب قیامت کا سماں دیکھا.......

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش است زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

ہوتی ہے مگر یہ تلخی کتنی کربناک ہو جاتی ہے اس وقت جب ایک ہی لمحہ شادی وغم اور ہستی و نیستی کی حکایت دہرا رہا ہو یہ فانی دنیا اسی تضاد پر قائم ہے؟ اور کیا یہی تضاد ہماری زندگی ہے؟

خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ یونیورسٹی بند ہو گئی۔ گوشہ گوشہ سے ہر طبقہ و خیال کے ہزاروں لوگ پہنچنے لگے۔ سانحہ تھا ہی ایسا اور وہ بھی بالکل اچانک۔ نہ مرنے والے کو خبر نہ سننے والے اس کے لیے تیار۔ بے ثباتی حیات کا مشاہدہ تھا۔ جو سنتا اسے یقین نہ ہوتا۔ جو دیکھتا اپنی بصارت پر شبہ کرتا ـــــــ آدمی سونے میں بھی تو بے حس و حرکت ـــــــ ہاں احتشام صاحب سو ہی رہے تھے۔ ابدی نیند!

ن ہمارے یقین کرنے نہ کرنے کی پابند نہیں ہوتیں ـــــــ وہ مر نہ گئے ہوتے تو پیوند خاک کیوں کئے جاتے؟ "پیوند ـــــــ جو عارضی حیات کی انتہا اور لامعلوم زندگی کی ابتدا ہے ـــــــ اس وقت بھی اور بعد میں مہینوں ملک کے بلکہ بیرونی ممالک میں بھی احتشام مرحوم کا سوگ منایا گیا۔ تعزیتی جلسے ہوئے۔ ان کی پیاری "شخصیت" ان کی ادبی ذہنی کیفیت ان کی سیاسی حیثیت، ان کی اخلاقی وسعت اور ان کی مذہبی عقیدت کے مختلف اور متضاد پہلوؤں پر ملک ں، پروفیسروں، نقادوں، مقرروں اور شاعروں نے اپنے اپنے علم و تجربہ کی بنیاد پر احساسات و تاثرات کا مخلصانہ اظہار وہی تھے جو احتشام کو "احتشام صاحب" کے دور سے جاننے اور پہچاننے لگے تھے لیکن جس مدت میں وہ احتشام سے بن رہے تھے اس وقت کے لوگ اول تو کم ہوں گے اور جو ہوں گے بھی وہ مراحل حیات طے کرنے میں اس درجہ معروف و کہ انھیں اپنے حال سے نکل کر دوسروں کے ماضی میں جھانکنے کی فرصت ہی کہاں؟ ایسے لوگوں سے نہ توقع ہے نہ تقاضا ۔شیبے لیکر عمر کے نصف سے زائد حصہ تک اُن سے مختلف حیثیتوں میں کبھی قریب اور کبھی قریب تر ہو تا رہا ہوں، مرحوم کے ایک ہلکا سا عکس سامنے لانے کے لیے اپنی عمر کو نہ سہی اپنے ذہن کو آج سے چالیس بیالیس سال قبل پٹا رہا ہوں۔

جولائی ۱۹۳۰ء کا غالباً دوسرا ہفتہ تھا۔ گورنمنٹ انٹر کالج میں داخلے کے لیے لڑکوں کا اژدہام تھا۔ ہر ایک نفسی نفسی میں مبتلا تھا۔ کالج کی تعلیمی شہرت نے اپنے اور دوسرے شہروں بلکہ صوبوں کے ممتاز طالب علموں کی کثیر تعداد کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اور تقریباً ہر شخص امید و بیم کی حالت میں پرنسپل آفس کے قریب چکر کاٹ رہا تھا۔ اسی دوا دوش میں ایک چھریرے بدن کا ایک لڑکا، منھ پر چیچک کے داغ، چہرے پر بلا کی متانت، آنکھوں میں چمک، کان کی داہنی طرف پھانسنا کا ڈر ——— جیسے ماں کی مامتا نے پہنایا ہوگا ——— سانولے رنگ کی معمولی شیروانی اور پیجامہ میں نظر آیا۔ سیکڑوں سوٹ بوٹ میں ملبوس ہجوم میں معمولی حیثیت ایسی غیر معمولی ہو کر ابھری کہ خواہ مخواہ ملنے کو دل چاہا ——— یہ تھے "سید احتشام حسین ماہلی" جو ویسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرنس پاس کر کے گورنمنٹ انٹر کالج میں داخلہ کے لیے آئے ہوئے تھے ——— دوپہر ہوگئی اور فیصلہ معلوم نہ ہو سکا۔ مقابلہ سخت تھا۔ فرسٹ کلاس اور امتیازات رکھنے والے طلبا کی اکثریت تھی۔ دوران گفتگو معلوم ہوا کہ ہم دونوں ہم عقیدہ بھی ہیں۔ عقیدہ و خیال کو ہم ظاہراً چاہے کوئی اہمیت نہ دیں، وسیع القلبی اور آزاد خیالی کا فرضی اور مصنوعی دعویٰ کریں۔ مگر یہ بات بھی ان چند خدا فریبیوں میں سے ہے جو ہر شخص جان بوجھ کر اپنے کو دیتا رہتا ہے۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ بات ہم دونوں کو جلد ہی قریب لائی اور پھر تعلقات بے تکلفی میں تبدیل ہو گئے۔ کالج سے اکثر ہم ساتھ ہی لوٹتے وہ ہمارے مکان سے قریب بہارانی منڈی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

کئی روز انتظار کرنے کے بعد ہماری خلش دور ہوئی اور جناب پروفیسر سید مقصود حسین صاحب نقوی کی توجہ خاص سے ہم لوگوں کا داخلہ فرسٹ ایر آرٹس میں ہو گیا۔ اب کلاس روم میں بھی ساتھ رہتا اور صرف دو پیریڈ میں ہم جدا ہوتے۔ وہ تاریخ اور فارسی کے طالب علم تھے اور میں اقتصادیات و عربی کا متعلم تھا۔ درجہ میں ان کی فطری متانت اور بھی بڑھ جاتی تھی وہ ایسا ہمہ تن گوش ہو کر لکچر سنتے گویا معلوم ہوتا آنکھوں سے بھی سن رہے ہیں۔ خاموشی سے سنتے اور خود کبھی کوئی سوال نہ کرتے۔ ہمارے ساتھیوں میں محمد نیلو مرحوم آئی سی ایس ہو کر ایک کی کھنڑی پر رکتے ہوئے راستہ میں موٹر کے اندوہناک حادثہ کا شکار ہو کر فی الفور مر گئے۔ شمس الاسلام خاں آئی سی ایس جو پاکستان میں کسی اعلیٰ عہدہ پر ہوں گے۔ شاہ عزیز احمد مرحوم آئی اے ایس، محمد زبیر آئی ایس، معز حسین ایڈوکیٹ سلطان پور، اور شکل ان کے علاوہ بھی ہونہار اور باصلاحیت طالب علم تھے۔ مگر جو بات احتشام حسین مرحوم میں تھی وہ کسی میں نہ ملی۔ وقفہ فراغت میں ہم لوگ کھیل کود اور دوسرے مشغلوں میں لگ جاتے مگر احتشام مرحوم کالج کی لائبریری میں پہونچ جاتے اور مختلف زبانوں کی مختلف موضوعات پر کتابیں پڑھا کرتے۔ کالج کی لٹریری ایسوسی ایشن کے جلسے مہینہ کے آخری ہفتہ میں منعقد ہوتے جس کے سکریٹری مسٹر سی پی داؤ سابق آئی سی ایس اور موجودہ وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی تھے۔ اردو، ہندی اور انگریزی میں پرنسپل اور پروفیسران کی موجودگی میں باقاعدہ مذاکرہ ہوتا اور جس ہفتہ EROPMETXE ہی بولنا ہوتا۔ چنانچہ یو پی کے اردو انٹر کالج ڈبیٹ میں جو کرسچین کالج الہ آباد میں منعقد ہوا تھا کالج کی طرف سے جناب محمد یونس صاحب ایڈوکیٹ الہ آباد اور مجھے بھیجا گیا تھا ہم لوگ نہ صرف یہ کہ انفرادی انعامات کے مستحق قرار پائے تھے بلکہ کالج کے لیے ٹرافی بھی لائے تھے۔ کالج کی اس چلتی پھرتی زندگی میں بھی احتشام مرحوم کوئی حصہ نہ لیتے تھے معلوم نہیں وہ خاموشی کے ساتھ کس مہم کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اس وقت کسے معلوم تھا اس خاموش پیکر میں قوت بیان اور قدرت اظہار رکھنے والا ایک باکمال مقرر بھی چھپا ہوا ہے۔ کبھی کبھی خالی گھنٹوں میں ہم کالج کی گراؤنڈ میں لگے پیپل کے نیچے جو آج بھی اسی شان سے سینہ تانے کھڑا ہوا ہے مل بیٹھتے اور مختلف علمی و مذہبی باتوں پر تبادلہ خیالات کرتے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ محبت کے موضوع پر بات چل پڑی۔ ہم لوگ اس نقطہ پر تو متحد تھے کہ یہ فطری اور جبلی جذبہ ہے مگر اس بارے میں اختلاف تھا کہ اس کی تہ میں جو محرکات ہوتے

کا نتیجہ ہیں یا ذہنی وابستگی کا۔ یعنی محبت خواہشات نفس کا پرتو ہے یا تقاضائے عقل کا نتیجہ ـــــــ مرحوم ذہانت
اہی تھے اور میں ایسے خالص ذہنی رجحان سے تعبیر کر رہا تھا۔ یہ بحث اتنی بڑھی کہ انٹرول ختم ہو گیا اور ہم بحثوں
ا کہ جب دوسرا تعلیمی گھنٹہ سناٹے میں گونجا تو ہم چونکے اور بھاگتے ہوئے درجے میں پہونچے۔ احتشام مرحوم سے
آتا تھا۔ وہ معمولی بات کو بھی اس ڈھنگ سے کہتے تھے کہ دل میں اتر جاتی۔ ان کی گہری علمیت اور فکر انگیز انداز تخاطب
پُراعتماد لب و لہجہ ہر سننے والے کو مسحور و متوجہ کر دیتا۔ مضامین بھی وہ اسی زمانہ سے لکھنے لگے تھے۔ میں بھی کچھ لکھ لیتا
و علامت یادبی، رومانی افسانوی اور تنقیدی مضامین پر قلم اٹھانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ وہ بھی زیادہ تر اس زمانہ
ت پر ہی لکھتے تھے اور مذہبی جرائد و رسائل میں چھپنے لگے تھے۔ اسی دور کی بات ہے نیاز فتحپوری مرحوم نے اپنے
ر میں جو مذہبی رجحانات کی عجیب و غریب اور انقلاب انگیز تاویلات کر کے دلچسپ بحثوں کے آغاز کرنے کی قدرت
تلاش بحث "خلافت و امامت" کے عنوان سے چھیڑی۔ جس کا پہلا مضمون کسی تاریخ دال ہندو اہل قلم "…" کے نام
ع ہوا۔ اس مضمون کے نکلتے ہی مختلف نقطہائے نظر کے علماء اور اہل قلم بحث میں شریک ہو گئے تو تقریباً ایک سال یا
ت تک چلتی رہی اور موافق و مخالف خیالات و آراء کا اچھا خاصہ مواد جمع ہو گیا۔
مرحوم نے بھی ایک طویل جوابی مضمون لکھا تھا جو نگار ہی کی کسی اشاعت میں شائع ہوا۔ بعد میں امامیہ مشن لکھنؤ نے
سلسلہ وار یکجا کر کے چھ سات حصوں میں شائع کیا۔ پھر امامیہ مشن پاکستان نے سب حصے یکجا مبسوط جلد کی صورت

کے علاوہ بھی ہم مختلف بہانوں سے برابر ملتے رہتے۔ قومی، مذہبی اور نجی صحبتوں میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے
وہ جو سب سے اہم بات ہماری ملاقات کا ذریعہ تھی وہ ہم چند لڑکوں کا قائم کردہ شیعہ مشن تھا جس کے مختلف شعبے
شعبۂ تصنیف و تالیف، شعبہ لائبریری، شعبۂ تقریر اور شعبہ فروخت کتب وغیرہ۔ شعبۂ تعلیم کے زیر انتظام مدرسہ
تھا یہ ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا جو بعد میں یادگار حسینی اسکول پھر ہائر سکنڈری اسکول اور اب انٹر کالج ہے۔ اس کے
محمد صاحب جن کے پاکستان چلے جانے کے بعد یہ خدمت مجھے سونپی گئی۔ شعبۂ اشاعت کا کام احتشام مرحوم کے سپرد تھا چنانچہ
"تعلیم اور ہم" مصنفۂ علامہ ہندی مرحوم شائع ہوا۔ تو اس کا پیش لفظ خود مرحوم نے لکھا تھا۔ دوسرا رسالہ 'حسین' ہندی میں
ہمدانے حیدر مہدی صاحب وکیل مرحوم کی تعمیل ارشاد میں مرتب کیا تھا اور آخری باب میں مشاہیر ہند، ماہرین تعلیم اور ممتاز
خیالات بھی یکجا کیے تھے جو انھوں نے حسین ڈے کے اجتماعات میں شہید انسانیت حضرت امام حسینؑ کے بارے میں ظاہر کیے
مرحوم ہی کے زیر نگرانی شائع ہوا تھا اور دوسرا ایڈیشن امامیہ مشن لکھنؤ نے شائع کیا۔ شعبۂ لائبریری کی طرف سے امجدیہ
سید امجد حسین قبلہ مجتہد طاب ثراہ قائم کی گئی تھی۔ یہ شعبہ مجھ سے متعلق تھا۔ تقریباً ۴ ہزار کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ اور آدھے درجن
آنے لگے تھے۔ شعبۂ فروخت کتب میں ہم سب ہی کام کرتے تھے مگر ذمہ داری سید علی نقی صاحب
شعبۂ تقریر کی جانب سے ہر ہفتے جلسے ہوتے جس میں ہم سب کو باری باری مقررہ موضوعات پر
نی منڈی میں ہوتیں جہاں احتشام صاحب رہتے تھے اور کبھی میرے مکان سے ملحقہ مسجد میں
بہتر انداز میں پُرمغز تقریر کرتے تھے وہیں احتشام جو کالج میں ہمیشہ خاموش رہتے تھے۔ مشن کا
بولہ تھا۔ ارکان مشن نے یہ بھی طے کیا کہ محرم کے دنوں میں جلوس کے ساتھ سڑکوں پر اردو

VIVAVOC.

تقریریں کی جائیں چنانچہ احتشام مرحوم، میں اور احمد حسین خاں (جو عرصہ سے انڈین ایکسپریس دہلی کے ایڈیٹوریل بورڈ میں ہیں) جو ذاکر ہول پر مشتمل رکھکر واقعات کربلا پر تقریریں کرنے لگے۔ نا واقف عوام کا ایک جمع غفیر ہم لوگوں کی آسان مگر معلوماتی تقاریر سننے کے لیے امنڈ آتا تھا یہ بدعت، بزرگانِ قوم خصوصاً بانیانِ جلوس کو پسند نہ آئی اور کلبر کے نقیبوں نے ہماری بہت تنکی میں تشدد سے بھی کام لیا مگر ہم ایسے کہاں کے حیادار تھے، پھر عوام کا اصرار اور اُن کا تعاون ہمیں حاصل تھا اس لیے اس سال تو ہو گیا مگر دوسرے سال احمد حسین جو ہم سب میں چھوٹے تھے، اپنے والد کے خوف سے نہ آ سکے اور احتشام صاحب بانی منڈی کا مقام ترک کر کے راجہ پور کھتری ڈاکٹر اعجاز صاحب کے بنگلہ پر منتقل ہو گئے، شیرازہ بکھر گیا اور صرف میں تنہا رہ گیا جو اسے فریضہ سمجھکر باوجود بانیوں کی مزاحمت کے اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔

وقت گذرتا رہا، حالات بدلتے رہے اور حالات کے ساتھ ساتھ دل و دماغ میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ اکثر لڑکے تعلیم کے بعد ملازمتوں سے لگ گئے، کچھ باہر چلے گئے۔ احتشام مرحوم شہری سے نیم شہری ہو گئے، کبھی کبھی ادھر آنا ہوتا زیادہ وقت تحصیل علم میں صرف کرتے الہ آباد یونیورسٹی کی تعلیمی فضا اُن کے لیے بڑی سازگار ثابت ہوئی۔ ذوقِ علمی نے کثرت مطالعہ کا عادی بنا دیا۔ ہر موضوع اور مذاق کی کتابیں پڑھتے اور زیادہ وقت وہاں کی لائبریری میں گذارتے۔ اشتراکی و اشتمالی ادب سے بھی دلچسپی ہو گئی۔ اس لٹریچر نے اُن کے عقائد کو متاثر کیا ہو یا کیا ہو، ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنے لیے جگہ بنائی ہو یا نہ بنائی ہو مگر لوگ انھیں TSIKPAM سمجھنے اور کہنے لگے تھے۔ حالات کی تبدیلی اور وقت کی مجبوری نے سب ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا مگر میں کچھ اس طرح سے اس "طلسم کدہ" میں پھنس گیا کہ اب نکلنا بھی چاہوں تو نکلنے نہ دے! اس وقت کے صرف دو ساتھی رہ گئے ہیں، ضمیر حسن کاظمی اور مرزا معشوق حسین جو اسی عقیدہ و عمل کے ساتھ میرا ساتھ دیے جا رہے ہیں اور میں آج تک اسی ڈگر پر چلا جا رہا ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے ازراہِ شکوہ دوستانہ مرحوم سے کہا کہ تم نے تو اپنی پٹری بدل دی مگر مجھے مستقل طور پر ان "خبطوں" میں مبتلا کر گئے۔ مرحوم نے اپنی فطری حسین مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ اگر سب ہی عقلمند ہو جائیں تو پھر یہ سارے کام کیسے ہوں گے؟ ان کا ہونا بھی تو ضروری ہے۔ سچ کہا تھا احتشام مرحوم نے قومی اور مذہبی کاموں کے لیے دیوانگی شرط اولین ہے۔

طالب علمی کے زمانہ سے لیکر آخری لحۂ حیات تک انھیں میں نے کبھی غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ بڑی ٹھنڈی مٹی سے ان کا خمیر تیار تھا۔ انھیں تو کبھی تیز آواز میں بولتے اور سخت لہجہ میں گفتگو کرتے بھی نہیں سنا گیا۔ ہر چھوٹے بڑے سے بحد اخلاق و اخلاص سے آتے مگر مزاج کا رکھ رکھاؤ اور طبیعت کا ٹھیراؤ بگڑنے نہ پاتا۔ حق بات ہی کہتے مگر کچھ اس انداز سے کہ دوسرے کو ناگوار نہ ہو گریجویشن کے بعد مرحوم نے انگریزی کے ایم اے کلاس میں داخلہ لیا تھا مگر پھر کیا ہوا کہ انگریزی چھوڑ کر اُردو میں آگئے اور اسی ذوق محنت سے پڑھتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف اسی مضمون میں فرسٹ کلاس فرسٹ نہیں ہوئے بلکہ ہر مضمون کے ایم اے پاس طلبا پوری یونیورسٹی میں فرسٹ آئے تھے اور گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد ہی تو احتشام سے احتشام صاحب بننے کی منزل قریب آگئی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں غالباً وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ پھر ریڈر اور پھر اپنی یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ اُردو قرار پائے اور اپنے علمی کارناموں کی بدولت دنیائے علم و ادب میں روز بروز متعارف ہوتے چلے گئے اور اب وہ مکمل طور پر احتشام صاحب بن چکے تھے اور ۳۰ نومبر کی رات تک احتشام صاحب رہے مگر صد حیف کہ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کی منحوس صبح سے ہمارا احتشام اور دنیائے علم و ادب کا احتشام صاحب ہمیشہ کے لیے احتشام مرحوم ہو گیا ——— علم و فن کا یہ قیمتی سرمایہ زیر زمین دفن کر دیا گیا۔ اعزہ و ... نے مٹھیوں میں خاک لیکر ڈالدی اور اس طرح اتنے طویل دور کی محبتوں اور رفاقتوں کا حق ادا ہو گیا۔

DWST THOU ARE TO DUST RETERNES

'تھا مشتِ خاک خاک میں آخر چلا گیا'

بریاتسم

معین اعجاز

"........روشنی کہاں گُم ہے"

(احتشام صاحب کی یاد میں)

"THE WOODS ARE LOVELY DARK AND DEEP BUT I HAVE PROMISES TO
KEEP, AND MILES TOGO BEFORE I SLEEP
AND MILES TOG BEFORE I SLEEP.—ROBERT FROST

۲ دسمبر ۷۲ء کی شام تھی۔ میں خضر پور (کلکتہ) کے بک کاؤنٹر کے پاس کھڑا کتابیں اور اخبارات دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر روزانہ آبشار کی اس خبر پر پڑی "احتشام حسین چل بسے" خبر واضح طور پر حاشیہ کے ساتھ چھپی تھی۔ اس وقت میرے دل کی جو کیفیت تھی اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ یوں تو ہر متوقع اور غیر متوقع موت کی خبر سن کر ایک جھٹکا سا لگتا ہے لیکن اس منحوس خبر نے دل ہلا کر رکھ دیا تھا میرے منہ سے زوردار آواز نکلی تھی۔ "ارے یہ کیا ہوا؟" میرے ارد گرد کھڑے تمام لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میرے ذہن اور دل نے احتشام صاحب کی موت کو سرے سے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ "روشنیوں کا شہر" "تاریکی کے غار" میں بدل گیا ہے۔ میں چاہ رہا تھا کہ کہیں سے کسی صورت سے اس خبر کی تردید ہو جائے۔ کیونکہ

ذہن نے موت کی ہر بات کو جھٹلایا ہے

جی چاہا کہ اخبار کے دفتر میں فون کروں اور ایڈیٹر سے کہوں کہ "تمہارے نمائندہ نے کہاں سے بے پر کی اڑا دی" مجھ پر عجیب دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی اخبارات دیکھ ڈالے۔ دہلی سے نکلنے والا صرف ایک ہی اخبار "پیٹریاٹ" مل سکا جس میں احتشام صاحب کی تصویر کے ساتھ یہ خبر چھپی تھی "XIOTED URDU CRITIC DEAD" اخبار مذکور نے مشہور خبر رساں ایجنسی یو۔این۔آئی کے حوالے سے یہ خبر شائع کی تھی۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ شہر کی ساری چہل پہل بھاگ دوڑ اور برقی قمقموں کی چمک دمک مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی اور رات کے وقت شہر کی ہنگامہ خیز دنیا سے الگ میں اپنے کمرے میں بیٹھا بڑی دیر تک اخبار میں چھپی ہوئی احتشام صاحب کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ میری آنکھیں بری طرح نم تھیں۔ یہ تصویر میں نے بارہا دیکھی تھی۔ یہ تصویر جانی پہچانی تھی۔ ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں میں وقتاً فوقتاً چھپتی رہتی تھیں۔ کل تک جب کسی رسالے میں یہ تصویر نظر آتی تو اسے اتنی حسرت سے نہیں دیکھتا تھا کیونکہ بقول مسلام مچھلی شہری ؎

خیال تھا کہ کبھی اس کو سجدہ کر لوں گا
یہ روشنی تو بہر حال تھی مرے گھر کی

آج ۲ دسمبر ۷۲ء کی رات کو یہ تصویر خون کے آنسو رلا رہی تھی۔ میری نظر کوشش کے باوجود اس پر سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس تصویر سے ایک زندہ تصویر ابھری۔ احتشام صاحب زندہ میرے سامنے موجود تھے۔ ان کے ساتھ آل احمد سرور اور معین احسن جذبی بھی تھے۔ خود میں انہیں بزرگوں کے درمیان تھا۔

یہ واقعہ ۱۹ مئی ۷۲ء کا ہے۔ میں علی گڑھ میں تھا۔ ایم۔اے پریویس کے تمام پرچوں کے امتحانات ختم ہو چکے تھے اور اب NAVOCE

کی تیاری تھی۔ اس کے لیے الٰہ آباد سے احتشام حسین صاحب آنے والے تھے۔ سچ پوچھئے تو مجھے امتحان سے اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مجھے خوشی صرف اس بات کی تھی کہ میں ایک عظیم اسکالر، ماہر لسانیات اور بابائے تنقید جدید سے اسی بہانے مل لوں گا۔ خیر جب میری باری آئی تو میں بھی HEAD OF THE DEPART MEMT کے کمرے میں گیا۔ وہاں آل احمد سرور اور جذبی صاحب کے علاوہ احتشام صاحب بھی تھے جنھیں آج میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ (آہ! کسے معلوم تھا کہ یہی آخری دیدار ہوگا)۔ سوال و جواب میں کوئی ۱۵۔۲۰ منٹ لگے ہوں گے۔ اپنے بعض جوابات کو وزنی بنانے کی غرض سے میں ممتحن احتشام حسین کے سامنے نقاد احتشام حسین کا حوالہ بھی دے رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حسرت موہانی کی شاعری سے متعلق احتشام صاحب سوالات کر رہے تھے اور جواب کے ساتھ میں حسرت موہانی کے اشعار بھی سناتا جا رہا تھا۔ میں نے ان کے سامنے جب حسرت مرحوم کا یہ شعر پڑھا۔ آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے تو احتشام صاحب کے منھ سے بے ساختہ نکلا تھا "واہ"۔ پھر انھوں نے کہا "اچھا صاحب! اشعار تو آپ کو بہت یاد ہیں۔ اب آئیے نثر نگاری پر بھی کچھ باتیں ہوں"۔ اور کچھ دیر نثری ادب پر سوالات کرنے کے بعد ان لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ حالانکہ میں چاہتا تھا برسوں سوال و جواب کا یہ سلسلہ چلتا رہے۔

احتشام صاحب کی شخصیت کوئی ایسی ویسی نہیں تھی۔ اس نے کتنے ہی "ٹوٹے ہوئے تاروں" کو "رہ کامل" بنایا تھا۔ اتنی بڑی قسمت کہاں کہ میں احتشام صاحب کا شاگرد ہوتا لیکن میری زندگی میں ۱۵۔۲۰ منٹ کے اس وقفہ کی بڑی اہمیت ہے۔ میں نے یہ لمحات اپنے ذہن کے گوشوں میں اس طرح چھپا رکھے ہیں جیسے میرے لیے قیمتی موتی ہوں۔ احتشام صاحب کی موت سے پوری اردو دنیا متاثر ہوئی ہے نہیں کہا جا سکتا اردو والوں کو ان کا غم کب تک رہے گا! ادب کے متوالے طلبہ پر یہ خبر بجلی کی طرح گری ہوگی۔ ہندو پاک اور بنگلہ دیش میں نہ جانے احتشام صاحب کے کتنے شاگرد ہیں اور ان پر کیا گذری ہوگی۔

علم و ادب کا کون سا شعبہ تھا جس پر احتشام صاحب کی نظر نہ رہی ہو۔ وہ ایک ترقی پسند مارکسی نقاد ہی نہیں تھے بلکہ بلند پایہ محقق، ماہر لسانیات اور عظیم تاریخ داں بھی تھے۔ انھوں نے جان بیمس کی لسانیات کی مشہور کتاب AN OOTLINE OF THE PHILO LOGY OB INDIA کا ترجمہ "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کے نام سے کیا تھا اور اس کے ساتھ ایک طویل مقدمہ بھی لسانیات سے متعلق سائنٹفک انداز سے لکھا تھا اور اس طرح سے اردو والوں کے لسانی شعور کو آگے بڑھایا تھا۔ احتشام صاحب درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو میں تنقیدی کتابوں کے علاوہ انھوں نے ہندی میں بھی ایک کتاب "اردو ساہتیہ کا اتہاس" (تاریخ ادب اردو) لکھی ہے۔ انھوں نے امریکہ سے واپس آنے کے بعد اپنا سفرنامہ "ساحل اور سمندر" کے نام سے شائع کرایا۔ غرضیکہ انھوں نے جو کچھ بھی جہاں سے بھی حاصل کیا اسے اردو والوں تک پہنچایا۔ انھوں نے غیر اردو داں دانشوروں تک اردو کی چیزیں پہنچائیں۔ اور ایسی ہی بھاری بھرکم ادبی شخصیتوں کی موجودگی میں اردو والے اس لائق ہو سکے ہیں کہ کسی کے سامنے زبان ہلا سکیں۔

انھوں نے اردو ادب میں ترقی پسند اور صحت مند رجحانات کی رہنمائی کی تھی۔ ترقی پسند مصنفین کو بھی انھوں نے ایک انداز اور معیار بخشا تھا۔ احتشام صاحب نے تعمیری اور تخلیقی ادب کے خاکوں میں رنگ بھرا تھا۔

احتشام حسین رخصت ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کے قلم کی جولانیاں بھی چلی گئیں۔ افسوس کہ اردو میں علم و ادب کے وہ ستون اب نہیں رہے جو ٹیپو گیگ جواب تک سہارتے رہے ہیں۔ اردو تنقید کا اتنا بڑا معمار اب مشکل ہی سے پیدا ہوگا۔ یہ اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہے اور یوں تو جینے کو وہ بھی جی لیا کرتے ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔

احتشام صاحب دو درجن سے زیادہ کتابیں ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں جو ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کتابوں کے الفاظ خوشبو کی طرح پوری اردو دنیا پر بکھرے ہوئے ہیں۔ اُن کا جسم تو دفن ہو گیا لیکن خوشبو کا یہ ذخیرہ نہیں دفن ہونا چاہیئے۔

دفن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ یہی خوشبو تو ہے اس بزم کا حاصل ساقی

فخر الکریم صدیقی

احتشام حسین ــــ ایک کامیاب استاد

احتشام حسین اعلیٰ پایہ کے نقاد، مفکر، افسانہ نگار، شاعر اور ماہر لسانیات تھے ہی ایک اچھے اور شفیق استاد بھی تھے۔ ان کی رہنمائی میں لاتعداد تشنگانِ علم و ادب اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گزرا۔ اس کام سے انھیں اوائل عمر سے ہی دلچسپی تھی۔ انھوں نے ایم۔اے اُردو میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور اس کے بعد وکالت پڑھنے کی غرض سے ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کی مگر ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بحیثیت اردو لکچرر تقرر ہو جانے پر آئی سی ایس بننے کا خیال ترک کر دیا۔ اور پورے انہماک اور دیانتداری سے درس و تدریس میں تا دم آخر لگے رہے۔

وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے کبھی کبھی یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ایک بڑے عالم تھے یا بڑے انسان یا ایک عظیم استاد۔ علمی و ادبی موضوعات پر گرفت کے علاوہ ان کی شخصیت بہت سی اعلیٰ صفات کا مجسمہ تھی۔ خلوص۔ لگن۔ دیانتداری۔ رواداری اور انسان دوستی کا ملا جلا نام احتشام حسین تھا۔ ان کی شخصیت ایک ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی جس کا خمیر مشرقیت سے اٹھا تھا لیکن انھوں نے مغربی افکار و خیالات کو تنقیدی نظر سے پرکھا اور اردو ادب اور نظام تعلیم کے لیے جو باتیں مفید تھیں ان کے اپنائے جانے کی پرزور حمایت کی۔

ان کے تنقیدی نظریات کیا تھے؟ اردو ادب اور لسانیات میں ان کا کیا مقام تھا؟ وہ ادب کو کن شاہراہوں پر لے جانا چاہتے تھے ان ساری باتوں سے ہر وہ شخص واقف ہے جو اردو ادب کا طالب علم رہا ہے لیکن ایک استاد کی حیثیت سے وہ کتنے کامیاب تھے اس کا کچھ اندازہ انھیں لوگوں کو ہے جو ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں سے انتہائی ہمدردی اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ انھوں نے خود بعض ناموافق حالات کے درمیان اپنی تعلیم مکمل کی تھی اس لیے وہ طلباء کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھ کر ان کی ہر ممکن اور جائز امداد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی جس کی بنا پر ہندوستان کے اطراف و اکناف و بیرون ملک سے آنے والا طالب علم اور استاد ان سے کسب فیض اٹھانا ضروری سمجھتا تھا۔ ان کے شاگردوں کی طویل فہرست میں بہت سے بڑے ادیب اور فنکار بھی ہیں۔

ان کی تحریر و تقریر دونوں میں جامعیت اور معنویت ہوتی تھی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ کسی کو قوت تحریر ودیعت ہوتی ہے اور کسی کو قوت تقریر۔ احتشام صاحب دونوں پر یکساں قادر تھے۔ بھرپور مطالعہ نے ان کی شخصیت پر اور جلا کر دی تھی۔ کلاس میں وہ بڑی رواں شستہ اور سلیس زبان استعمال کرتے تھے کہ زیر بحث موضوع آسانی سے ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ جو باتیں ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتی تھیں وہ ان کی مختصر سی گفتگو سے سمجھ میں آ جاتی تھی۔ لسانیات، تاریخ اور تنقید جیسے خشک مضامین کو بھی بہت دلچسپ انداز میں پڑھاتے تھے۔ نتیجہ میں طلباء بھی ان مضامین کو خاص دلچسپی سے پڑھتے تھے جبکہ عام طور پر یہ مضامین طلباء کو بے رنگ محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو شگفتگی اور مزاحیہ نکات سے بھرپور ہوتی تھی۔ پڑھاتے وقت اُن کی نظر ہر لڑکے پر رہتی تھی جس کی بنا پر ہر ایک خود کو ہی مخاطب سمجھتا۔

کلاس میں دوران گفتگو جن بزرگوں اور ادیبوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئی تھیں ان کے ذاتی کردار اور ادبی نقطۂ نظر کو روشن کرنے والے بہت سے واقعات جو انھوں نے دیکھے اور سنے تھے طلبا کو بتاتے چلتے تھے اور طلبا اپنے کو انھیں واقعات کے درمیان محسوس کرتے تھے۔

احتشام صاحب کی تحریروں میں جو سنجیدگی دکھائی دیتی ہے اس پر کچھ لوگوں کو خیال ہو سکتا ہے کہ وہ خشک مزاج اور غیر دلچسپ شخص رہے ہوں گے لیکن یہ خیال حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ فکر میں سنجیدگی اور گہرائی کے باوجود ان کے مزاج میں مزاح کی حس نہایت لطیف اور تیز تھی وہ کبھی زور سے قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے۔ دوسروں کو ہنسانے کے بعد خود ان کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ باتوں کے درمیان ان کی آواز کبھی بلند نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ معتدل لہجہ میں بولتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی آواز اچھے خاصے مجمع میں بھی اپنی خود اعتمادی اور انفرادیت کی وجہ سے صاف پہچانی جا سکتی تھی۔

احتشام صاحب بظاہر اردو کے استاد تھے لیکن دوسرے سماجی علوم کا مطالعہ محض سرسری طور پر نہیں بلکہ اسی گہرائی سے کرتے تھے جتنا کہ اردو ادب کا۔ مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میں احتشام صاحب سے ملنے گیا۔ میرے پاس GIRFFITH TAYLOK کے ادارت میں شائع شدہ شہرۂ آفاق تصنیف GEOGRAPHY IN 20TH CENTURY تھی۔ انھوں نے میرے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ان کی نظر ان صفحات پر پڑی جس میں قدرت اور انسان کے باہمی رشتے کا تجزیہ کرتے وقت خاص طور پر جرمن اور فرانسیسی مفکروں کے نظریات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے کہ قدرت کی جبریت اور انسان کی قادریت کا موضوع عرصے سے زیر بحث رہا ہے۔ کبھی قدرت کی برتری کو مان کر انسان کو مجبور محض بتایا اور کبھی انسانی صلاحیتوں کو قدرت پر فوقیت دی گئی۔ موافقت اور مخالفت میں بڑی باریک موشگافیاں کی گئی ہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے جرمنی اور فرانسیسی مکتبۂ فکر کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اتنے تفصیل سے ایسے موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں جو بظاہر ان کا میدان نہیں ہے اور وہ بھی اتنی عالمانہ کہ کہیں بھی سطحیت کا شائبہ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ سماجیات ہو یا نفسیات عمرانیات ہو یا تاریخ۔ لسانیات ہو یا فلسفہ۔ ملکی زبانوں کا ادب ہو یا غیر ملکی زبانوں کے ادبیات ہوں ان کی معلومات میں نہایت گہرائی اور گیرائی ہوتی تھی۔ اور ان علوم کا ذکر وہ اپنے لکچروں اور تقریروں میں بڑی تفصیل سے کرتے تھے۔ ایک حقیقی استاد کی حیثیت سے وہ اپنے شاگردوں کو کبھی مایوس نہیں ہونے دیتے تھے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ایک طالب علم سال میں صرف ایک مرتبہ امتحان دیتا ہے مگر استاد کا امتحان نہ جانے کتنی بار ہوتا ہے معلوم نہیں کہ اس سے کس وقت کون سا سوال پوچھ لیا جائے اور اسے جواب دینا پڑے۔ اکثر طالب علم ان سے بڑے طفلانہ سوالات کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک ایم اے کے طالب علم نے پوچھا کہ امتحان میں ایک سوال کا جواب کتنے صفحات میں لکھنا چاہئے۔ اور اس کو بھی احتشام صاحب بڑی تفصیل سے اسے سمجھا رہے تھے تاکہ اس کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ اس نے کوئی معمولی سوال پوچھ لیا ہے۔ احتشام صاحب ہمیشہ SIMPLE LIVING کے اصول پر کاربند رہے۔ لباس کے معاملے میں سادگی ان کا شعار تھا۔ زیادہ تر معمولی کپڑے کا پینٹ اور بش شرٹ اور جاڑوں میں شیروانی پاجامہ اور سوٹ پہنتے تھے۔ 'ادبیت' کے علمبردار مگر دنیوی شان و شوکت سے بے نیاز۔ سگریٹ اور پان کا شوق بھی نہیں تھا بس پڑھنا اور پڑھانا ان کا ایمان تھا۔ وہ صرف کلاس ہی میں نہیں گھر پر، ادبی مجلسوں اور دوسری یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبہ میں جا کر طالب علموں سے ملتے تھے اور گھنٹوں ان سے گفتگو کرتے اور انھیں مفید مشورے دیتے تھے۔ اس باہمہ اور بے ہمہ شخصیت کے باوجود ان کا انکسار ملاحظہ ہو کہ ایک طلبا کی پوری نسل کو اردو ادب کے نئے ذائقوں سے روشناس کرانے والا اپنے کو ادب کا طالب علم ہی سمجھتا تھا۔ ان کی نا وقت موت سے اردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے اور عربی کا یہ مقولہ بے اختیار زبان سے نکلتا ہے کہ "ایک عالم کی موت ایک عالم کی موت ہوتی ہے"۔

لئیق اختر فیض آبادی

احتشام بھائی

آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب ہے اور دل میں ٹیسوں کے زلزلے۔ ۲ بجے دن میں یہ سنانے والے نے کیا سُنا دیا ــ "احتشام صاحب انتقال ہو گیا" ــــــ بس انہیں چند لفظوں نے بھری دوپہر کو تیرہ و تار بنا دیا ــــ ہر طرف اندھیرا، ایک گھنگھور تاریکی ــــ احتشام بھائی مر گئے ــــ ؟ بالکل غلط، بالکل جھوٹ،

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

جب آنا سہل نہ تھا تو مر جانا سہل کیوں کر ہو سکتا ہے ؟ لیکن حقیقت پھر حقیقت ہوتی ہے ــــــ موت برحق ہے ــ اب آسان ہو یا دشوار لیکن یہ بارِ غم کو اُٹھانا ہی پڑے گا، احتشام بھائی کی موت اگر ایک ایرے غیرے کی موت ہوتی تو تو پھر یہ غم ایک گھر، ایک خاندان یا زیادہ سے زیادہ ایک شہر تک محدود ہو کر رہ جاتا ــــ لیکن میرے احتشام بھائی جو کبھی ماہلی رہے ہوں گے لیکن اب تو وہ ہر دل کی دھڑکن، ہر ملک کے شہری، ہر خاندان کے فرد تھے ــــ وہ تو ایک ادارہ تھے۔ ایک انجمن تھے۔ وہ نمائندہ تھے کئی صدیوں کی اعلیٰ قدروں کا وہ پیکر تھے۔ تہذیب و شرافت اور مرقع تھے خلوص و محبت کا۔ وہ جیتی جاگتی تصویر تھے انسانیت کی۔ وہ سرچشمہ تھے لطف و عنایت کا ــــ اسی لیے تو ــ صرف ہم پر صرف اہلِ ماہل، یا ایک فرقہ یا ایک مکتبۂ فکر ہی کے افراد سوگوار نہیں بیٹھے ہیں ــــ اُن کی جدائی کا غم کہاں نہیں ہے۔

گونڈہ سے واپسی میں ایک ہم سفر سے احتشام بھائی کی اچانک موت پر رنج و غم کے ساتھ بات چیت ہو رہی تھی کہ ایک صاحب فرمانے لگے۔ "کون احتشام صاحب! وہی جو اردو میں مضمون و ضمون لکھتے تھے ؟" مضمون کے ساتھ ضمون سن کر جیسے دل پر آرے چل گئے ــــ پھر بھی میں نے عرض کیا ــــــ "جی ہاں! وہی"

کہنے لگے "ہے ہے ــــ"

میں نے پوچھا ــ "آپ نے اُن کی کوئی کتاب یا کوئی یا کوئی مضمون تو ضرور پڑھا ہوگا" ؟

کہنے لگے ــــ "نہیں صاحب، میاں الف، ب، تو پہچانتے نہیں مضمون یا کتاب پڑھنا بھلا کیا جانیں ــ"

جی ہاں! وہ صاحب جو حقیقتاً انگوٹھا لگانا جانتے تھے ــــ لیکن وہ بھی اس غم میں شریک نکلے ــــــــ

احتشام بھائی میری چچی کے حقیقی خالہزاد بھائی تھے (لیکن نہ جانے میں نے کیوں انہیں ہمیشہ احتشام بھائی کہا ــــ ہائے وہ میرے ساتھ اُن کی محبتیں، شفقتیں اور سلوک (کہاں سے جاؤں اُن لمحوں کی ان یادوں کو جو مجھے ڈسے لے رہی ہیں) ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۲ء تک میں

مستقل لکھنؤ میں رہا۔ اور لکھنؤ کے اس قیام کے دوران زیادہ تر میرا وقت اُن کے دولت کدے پر گذرتا۔

کنبہ پروری کے کتنے ہی عینی واقعے اور اقربا نوازی و دوستوں کی دلدہی کے کتنے ہی چشم دید قصے آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں، اس دور کے صفِ اول میں شمار کیے جانے والے کتنے ہی ادیب، افسانہ نگار، اور شاعر احتشام بھائی کی سرپرستیوں کا ثمرہ ہیں۔

آج بھی وہ شامیں میرے خزانۂ ذہن کا قیمتی سرمایہ ہیں جن شاموں میں نو آموز ادیب کہنہ مشق اُدبا کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے، وہ علم و ادب میں ڈوبی ہوئی شامیں جس کی آغوش ترقی پسندوں اور قدامت پسندوں کے لیے برابر سے بار رہتی تھی۔ اُن شاموں میں وہ بھی آتے تھے جو غزل کو "ہر جگن" سمجھتے تھے اور وہ بھی آتے تھے جو غزل کو "عروسِ شاعری کا سہاگ" جانتے تھے۔ مجھے وہ شامیں بھی یاد آتی ہیں جو محترم مرزا جعفر حسین صاحب ایڈوکیٹ کے دولت کدے پر جام و سبو کے ساتھ "طلوع" ہوا کرتی تھیں، جہاں رندانِ بلا نوش کے جمگھٹے بھی رہتے تھے اور صاحبانِ زہد و تقویٰ کی صفیں بھی۔ احتشام بھائی بھی اکثر ان شاموں میں شریک ہوتے، ایک دن جوشؔ صاحب سے اور احتشام بھائی سے شراب پر بحث چھڑ گئی۔ دونوں طرف سے دلائل چلتے رہے۔ کون جیتا کون ہارا؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس بحث کے تین چار دن کے بعد جوشؔ صاحب نے "رندِ ہم مشرب" یا "رندِ ہم مسلک" کے عنوان سے ایک نظم بہت گرج گرج کر سنائی تھی۔ جو بعد میں "ادبِ لطیف" میں شائع بھی ہوئی تھی اور جس کا جواب بھی نظم میں احتشام بھائی نے دیا تھا۔

احتشام بھائی پندرہ سولہ دن کے بعد کشمیر اور دلّی سے تھکے ماندے واپس آئے تھے اور اُس دن خلافِ معمول ۹ بجے شب ہی میں سو گئے تھے۔ رات کے ۱۰ بجے ہوں گے کہ پتہ چلا کچھ لوگ احتشام بھائی سے ملنے آئے ہیں۔ بجنؔ اور خورشید بھائی نے پہلے تو اس بات کی کوشش کی کہ وہ لوگ صبح ملاقات کریں لیکن وہ سب ملنے پر مصر تھے، احتشام بھائی کی آنکھ کھُل گئی اور وہ اُن لوگوں سے ملنے کے لیے اپنی نشست گاہ میں آ گئے۔ جو لوگ ملنے آئے تھے اُن کے سرپنچ تھے احتشام بھائی کے پُرانے دھوبی صاحب اور مسئلہ تھا برادری کی کسی لڑکی کی رخصتی کا، بعد میں پتہ چلا کہ جس مسئلے پر کئی بار پنچایت بیٹھ چکی تھی۔ اور کئی بار لاٹھی ڈنڈے کی نوبت آ چکی تھی۔ احتشام بھائی نے اُس مسئلے کو دونوں حریفوں کی بات سننے کے بعد چند لمحوں میں بحسن و خوبی طے کرا دیا۔

کیا بتاؤں ان کے پاس کیسے کیسے دُکھ درد بیان کرنے والے آتے تھے۔ کوئی تانگہ چلاتا ہے، تو کوئی سبزی فروش، کسی کا رشتہ رفت ہے تو کوئی مالکِ مکان ہے، کوئی ادیب ہوتا، کوئی ڈاکٹر ہوتا۔ کوئی وکیل ہوتا۔ بہر صورت ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد مختلف مشوروں کے لیے ان کے پاس آتے اور مسرور و شاداں جاتے۔

ایک دن ایک ریٹائرڈ پرنسپل صاحب آئے اور فرمانے لگے۔ "میں نے فلاں پلاٹ خرید لیا ہے جس کی لمبان اور چوڑان یہ ہے۔ اب آپ میرے مکان کے لیے ایک نقشہ بنا دیجیے۔"

دوسرے دن میں نے دیکھا کہ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب۔ اوورسیر احتشام حسین بن چکے ہیں۔ یعنی وہ ایک سادہ کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہے تھے اور خانے بنا رہے تھے۔ جی ہاں اُس دن کی وہ الٹی سیدھی لکیریں اور خانے آج ایک خوبصورت کوٹھی کی صورت میں موجود ہیں۔

ٹنگ سے درست لباس پہنتے تھے جب بھی شیروانی پہنتے تو کیا مجال کہ کوئی بٹن کھلا رہ جائے اور سر پر ٹوپی نہ ہو۔۔۔۔
کا مصنف جب امریکہ جانے لگا تو میں نے اپنی یادداشت میں پہلی بار اُن کو ایک دن بش شرٹ اور پتلون میں دیکھا۔
ی کیا۔۔۔۔ "لباس کے ساتھ نظریات بھی بدل گئے ہوں گے ؟"
سم زیر لب کے ساتھ فرمایا ۔۔۔۔ "بے وقوف۔۔۔"

ا ہوئے فیض آباد گورنمنٹ انٹر کالج میں مشاعرہ تھا احتشام بھائی صدارت فرما رہے تھے۔ ایک ڈال کا مشاعرہ چل رہا
ام دھوم مچا تا۔ میں اُس مشاعرے کو اناؤنس کر رہا تھا، میں نے اور ڈائس پر تشریف فرما بہت سے سامعین نے
رش کی کہ صدر محترم بھی اپنے کلام سے سرفراز فرمائیں۔ لیکن ۔۔ وال صرف اک "نہیں" کے سوا اور کچھ نہ تھا
بھالا اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
صدر محترم بڑے قادر الکلام شاعر ہیں۔ اب تک ہر سعی ناتمام اور ہر التجا رائیگاں ہو چکی ہے، کیونکہ اب دورِ جمہوریت ہے
حضرات یہ یک آواز اُن سے استدعا کریں تو وہ یقیناً لاج رکھ لیں گے جمہور کی۔۔۔"
، "سنائیے" کا وہ شور اُٹھا کہ احتشام بھائی شرماتے مسکراتے مائیک پر آ ہی گئے اور پھر وہ غزل سنائی جو حاصل مشاعرہ ٹھہری۔
ب میں سناٹا ہے، شہر شاعری ویران ہے، دنیائے تنقید گریباں چاک ہے، پرچم انسانیت سرنگوں ہے، اُردو ماتم
وست پریشاں حال۔ واہ رے الہ آباد تیرے نصیب! تو نے اس گنجِ گرانمایہ کو ابد الآباد تک کے لیے آغوشِ لحد میں
م اپنا دُکھ درد کس سے بیان کریں گے؟ جب کوئی ادبی بحث چھڑ جائے گی تو کون سلجھائے گا اس کی گتھیوں کو؟ جب
وئی شعر معرضِ بحث بنے گا تو کس کے فیصلے کے سامنے ہم سرِ تسلیم خم کریں گے؟ جب کوئی گھریلو معاملہ درپیش ہوگا تو
مشکل کشائی کرے گا؟ ۱۹۶۱ء کے بعد جب کبھی لکھنؤ جاتا تھا اور عم محترم مرزا جعفر حسین صاحب ایڈووکیٹ
د پر حسین صاحب مرحوم کے دولت کدے پہ حاضری دیتا تو کچھ دیر کے لیے اس در دولت پر بھی چلا جاتا اور ادب سے سر
سے نہ جانے مجھے کیا کیا حاصل ہو چکا تھا۔ ہر غم کا مداوا، ہر فکر کا علاج، دنیا بھر کی مسرتیں، اور پریشانی میں ایک
اما۔

عُرفی اگر بہ گریہ میسر شود وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

- میں یا تو بے حس ہوں یا پھر اپنے جذبات پر کسی قدر قابو رکھتا ہوں کیونکہ نہ تو لوگوں کی تعریفیں مجھے بہت زیادہ مدہوش بناتی ہیں اور نہ نکتہ چینیاں اور عیب جوئیاں مجھے بہت زیادہ تکلیف پہنچاتی ہیں۔

(ادب اور سماج)

- ...... میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی ملک اور قوم کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اس کے سماجی نظام میں پیوستہ ہوتی ہیں اور ان کو الگ کرکے دیکھنا کبھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا

....

(س۔ ح)

- "...... میں جس زبان میں لکھتا ہوں وہ اُردو ہے۔ جسے ابھی بیسویں صدی کی ابتدا تک ملک کی عام زبان کی حیثیت حاصل تھی لیکن حالات اس قدر تیزی سے بدلے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاست نے وہ ابتری پھیلائی ہے کہ ہندوستان میں اس کی زندگی مشکل ہو رہی ہے۔ تاہم یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں اعلیٰ ادب موجود ہے اور اب بھی پیدا ہو رہا ہے اور میں اس کی حیثیت منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا ......"

ت حسین

بھیّا مرحوم کے ذہنی رجحانات کے چند نمونے

ا مرحوم کی ولادت ۱۲ اپریل ۱۹۱۲ء بہ مقام اترڈیہہ ضلع جون پور ہوئی۔ (جو اصل وطن قصبہ ماہل سے ۹ میل جانب
ونکہ اس زمانہ میں قصبہ ماہل میں پلیگ کی بیماری پھیلی ہوئی تھی یہ موضع ہمارے پھوپھا سید محمد قاسم صاحب مرحوم کی زمینداری میں
مکان تعمیر تھا کچھ قبل ماہل سے لوگ یہیں آکر مقیم تھے۔ غالبًا یہی وجہ تھی کہ پھوپھا صاحب مرحوم کو بھیا سے جو محبت تھی
کے تھی۔ پھوپھا مرحوم کے صرف ایک صاحبزادی جو بھیا سے عمر میں ۳ سال بڑی ہیں کوئی دوسری اولاد نہ تھی اس محبت کا نتیجہ
۔ ۳ سال ہی کی عمر میں پھوپھا صاحب کے ساتھ ان کی ملازمت پر چلے گئے اس زمانہ میں ضلع گورکھپور کے کسی تھانہ پر تعینات رہے
ت اور ناز و نعم سے پرورش ہوتی رہی اُسی کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی انھوں نے ایک مولوی صاحب کو رکھ کر کیا۔ بھیا نے ۱ سال
ن ختم کیا اور ساتھ ساتھ مسئلہ مسائل سے بھی کما حقہ واقفیت حاصل کر لی تھی یہ اُن کی ذہانت کی ابتدا تھی۔

۱۹۱۶ء میں ہم لوگوں کی بسم اللہ کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہوئی جس میں پھوپھا صاحب مرحوم بھی شریک ہوئے اُنھیں کے ساتھ
آ گئے تھے جن صاحب نے ہم لوگوں کی بسم اللہ کرائی تھی انھوں نے چند سوالات کیے جس کا جواب سن کر انھوں نے گلے لگا لیا
تھے ایسے کم عمر بچے سے ایسے جواب کی امید نہیں تھی۔ غالبًا اس کے بعد مرحوم پھوپھا صاحب کے ساتھ گورکھپور نہیں گئے ماہل
ں میں ہم دونوں کا نام لکھا دیا گیا اس کے علاوہ گھر پر ایک مولوی صاحب ماہل سے قریب کے رہنے والے تھے مستقل قیام کر کے
بی و دینی تعلیم کا بھی سلسلہ شروع ہوا۔ بھیا مرحوم سے میں دو سال چھوٹا تھا اُسی حساب سے اسکول میں عمر کے تناسب سے
مجھے جہاں تک یاد ہے وہ سال کے اندر دو درجے پاس کیا کرتے تھے اسکول کے ماسٹر بھی انتہائی محبت کرتے تھے۔ گھر پر بھی
ب اُن کو جو سبق دیتے تھے اور دوسرے وقت اس کو سنتے تھا اس سے آگے کا سبق بھی سنا دیا کرتے تھے اور مجھے اپنے پرانے
نے بر سر املا کرتی تھی حالانکہ جب بھی سبق یاد کرتے ساتھ ساتھ یاد کرتے اور ساتھ ہی کتاب رکھتے تھے اس کے علاوہ کبھی اُن کو
میں دیکھتے تھے۔ بہرحال بھیا جلد ہی مڈل اسکول جو اُس زمانہ میں درجہ ۵ سے درجہ ۷ تک تھا قصبہ ہی میں تھا وہاں ان کا داخلہ
درجہ تک پیچھے رہ گئے۔ اُس زمانہ میں درجہ ۷ کا امتحان بورڈ کا امتحان ہوتا تھا اس سال اس امتحان کا سنٹر اعظم گڑھ تھا۔ امتحان
مرحوم کو کھجلی کی بیماری ہو گئی اور دونوں ہاتھوں میں اس قدر دانے نکل آئے کہ قلم کا پکڑنا بھی مشکل تھا مگر اس حالت میں وہ امتحان
تھے امتحان کی تاریخ سے ــــــ ایک روز قبل اعظم گڑھ روانہ ہوئے۔ جہاں تک یاد ہے مڈل اسکول کی طرف سے ماسٹر
صاحب لڑکوں کے ساتھ اعظم گڑھ گئے تھے وہاں پہونچ کر امتحان کے روز معلوم ہوا کہ بھیا مرحوم کو امتحان دینے کی اجازت نہیں
بیماری کی وجہ سے لڑکوں کے ساتھ امتحان نہیں دے سکتے۔ ہیڈ ارشاد صاحب نے انتہائی کوشش کر کے ڈاکٹر و انسپکٹر آف اسکول

کے یہاں دوڑ دھوپ کرکے امتحان دینے کی اجازت حاصل کر لی شرط یہ لگائی گئی کہ الگ ایک کمرہ میں یہ امتحان کے پرچے کریں۔ اس دوڑ دھوپ میں کافی وقت صرف ہوگیا یہ سوال اسی قلیل وقت ہی میں انھوں نے جوابات لکھے اس وقت ہی پر کاپی دینی پڑی مگر جب نتیجہ نکلا تو بہت اچھے نمبروں سے کامیاب تھے قصبہ کے اسکول کی پڑھائی ختم ہوگئی اعظم گڑھ ویسلی ہائی اسکول میں داخلہ ہوا۔ جہاں سے امتیازی نمبروں سے پاس کرکے الٰہ آباد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اتفاق سے اسی زمانہ میں پھوپھا صاحب مرحوم گورکھپور سے تبدیل ہوکر الٰہ آباد آچکے تھے اس طرح ان کا ساتھ پھر کالج تک رہا جب وہ کالج سے نکلے اور یونیورسٹی میں داخلہ کا وقت آیا تو پھوپھا صاحب کا تبادلہ دوسرے ضلع میں ہوگیا۔ اب وہاں قیام کا سوال تھا جس کے لیے جناب پروفیسر سید اعجاز حسین صاحب جو الٰہ آباد یونیورسٹی میں تھے انھوں نے اپنے یہاں قیام کی بڑی خندہ پیشانی سے اجازت دیدی اس طرح موصوف کے یہاں لکھنؤ یونیورسٹی کی تقرری تک رہا۔ مجھے ان کے الٰہ آباد کے قیام اور ادبی زندگی سے قطع نظر صرف ان کے رجحانات جو ادبی زندگی سے الگ ہیں عرض کرنا مقصود ہے بی اے فرسٹ کلاس پاس کرنے کے بعد سوال تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے اعزا دوست احباب اپنی اپنی رائے دیتے رہے مگر مرحوم نے ایم اے میں داخلہ کو زیادہ مناسب سمجھا۔

جنوری ۱۹۲۹ء میں والد سید ابو جعفر صاحب مرحوم کا انتقال ہوچکا تھا مرحوم ہی زمینداری کے تمام کام انجام دیتے رہے ان کی وفات کے بعد زمینداری کے کام کا مسئلہ تھا ایسی صورت میں مجھے تعلیم ترک کرکے زمینداری کے کام میں لگا دیا گیا ویسے ہمارے چچا سید ابو محمد صاحب جو والد مرحوم سے بڑے تھے وہ حیات تھے مگر موصوف نے اپنی تمام عمر کتب بینی، شعر و شاعری میں صرف کی زمینداری یا گھریلو زندگی سے اپنے کو اتنا دور رکھا کہ ان کو اپنی زمینداری کے الف۔ بے سے بھی واقفیت نہیں تھی اُس کتب بینی کے شوق سے حکمت، ڈاکٹری، ہومیو پیتھک میں بھی اچھی خاصی مہارت ہوگئی تھی جس سے اچھا خاصا ہجوم صبح و شام مریضوں کا ہوا کرتا تھا۔ دوائیں عموماً مفت تقسیم کیا کرتے بدرجہ مجبوری کبھی کسی مریض کو باہر سے دوائیں خریدنی پڑتی تھی۔ یہی کام زندگی بھر کرتے رہے۔

بھیا مرحوم جب کبھی چھٹیوں میں یا گرمی کی تعطیل میں اعظم گڑھ یا الٰہ آباد سے آتے تھے تو ہمہ وقت شعر و شاعری، بیت بازی، مجلس و ماتم کا چرچہ ہوا کرتا جس میں چچا مرحوم انتہائی دلچسپی سے حصہ لیتے تھے اور قصبے کے لوگ جس میں سن رسیدہ بھی اور ساتھیوں کا ہجوم رہا کرتا تھا عموماً رات کے بارہ بارہ بج جایا کرتے تھے اس طرح اُس زمانہ میں گھر درسگاہ ہو جایا کرتا تھا۔ اس طرح کی صحبت کا اثر بھیا مرحوم پر یہ ہوا کہ قصیدہ، غزل — نوحہ جات بھی کافی کہہ لیا کرتے تھے میر انیس مرحوم کے پورے پورے مرثیے زبانی یاد تھے۔ یوں تو کم عمری ہی سے مجلس و ماتم کا شوق اس قدر تھا کہ مجلس پڑھنا، اپنا تصنیف کیا ہوا نوحہ، قصیدہ، مجلس، محفل میں پڑھا کرتے تھے۔ اس طرح کی محفل یا مجلس جو قصبہ میں ہوا کرتی تھی بھیا کے چھٹیوں کے انتظار میں روک دی جایا کرتی تھی جب چھٹیوں میں آتے تب ہوا کرتی تھی۔ بھیا مرحوم کی ذہانت کا جہاں تک تعلق ہے میں نے بچپنے سے آخر عمر تک دیکھا جتنے شعر ان کو زبانی یاد تھے مشکل ہے کوئی دوسرا نظر آتا شعر ہی نہیں بلکہ اکثر ایسا ہوا کہ قرآن پڑھا جا رہا ہے اس کے آگے آگے زبانی تلاوت کرنے لگتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون سا وقت نکال کر قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام آئمہ کی ولادت و شہادت کی تاریخ ان کو اس طرح یاد تھی کہ وہ اس روز یاد دلایا کرتے تھے کہ آج فلاں امام کی ولادت کی تاریخ ہے اور آج فلاں کی شہادت کی تاریخ ہے۔ یہی نہیں جب بھی قصبہ میں کسی امام کی ولادت یا شہادت کی تاریخ پر محفل یا مجلس ہوا کرتی تھی اگر یہ موجود ہیں تو بغیر کسی مطالعہ کے اس امام کے بارے میں پوری پوری مجلس یا محفل منبر پر جاکر بیان کر دیا کرتے تھے اور جب منبر سے اترتے تو بزرگوں کو کہتے سنا گیا کہ یہ واقعہ جو بیان کیا فلاں کتاب سے تم نے پڑھا حالانکہ وہ کتاب کم از کم اس وقت ان کے سامنے نہیں ہوا کرتی تھی۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد جیسا میں عرض کر چکا ہوں کہ انھوں نے ایم۔ اے میں داخلہ کرانے کو طے کر لیا اس وقت چچا مرحوم کی

م ایم اے میں داخلہ ضرور لو مگر آئی۔سی۔ایس کے کمپٹیشن کی بھی تیاری کرو جس پر چچا کے سامنے تو کہہ دیا کہ اچھا مگر جب فیس
رنے کا زمانہ قریب آیا اور ذریعہ خط ان کو اطلاع دی گئی کہ لکھو کہ فیس کب داخل ہوگی تاکہ وہ بھیج دی جاوے تو ہر خط کچھ نہ کچھ
باتیں لکھ دیا کرتے تھے اس طرح فیس جمع کرنے کی تاریخ بالکل قریب ہوگئی مجبوراً مجھے فیس کا روپیہ لیکر الہ آباد جانا پڑا چونکہ
کم رہ گیا تھا جب میں وہاں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ میں موجودہ حکومت (یعنی انگریزوں) کی ملازمت نہیں کرنا چاہتا یہ صاف صاف
نامناسب نہ سمجھا بہر حال میں نے بھی اصرار کیا تو یہ کہکر روپیہ جمع کر دیا کہ چچا کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ اس طرح آئی سی ایس
ایس دونوں کی فیس جمع کر دی۔ اس وقت ان کے اس خیال کا اندازہ ہوا کہ ان کو اس حکومت سے کس قدر تنفر ہے باتوں میں
گاندھی جی۔ جواہر لال جی سے بھی کافی متاثر تھے۔ مگر کبھی کسی پارٹی کے ممبر نہیں ہوئے۔ جب آئی سی ایس کا نتیجہ نکلا اور نمبروں
ی تو معلوم ہوا کہ بہت اچھے نمبر ہیں مگر زبانی امتحان میں ایک لڑکے کا نمبر ان سے زیادہ تھا غالباً وہ کسی بڑے آدمی کا لڑکا
دت پی۔سی۔ایس میں ہوئی۔ اتفاق سے اس سال آئی۔سی۔ایس میں ایک مسلمان اور پی۔سی۔ایس میں تین مسلمانوں کو لینا تھا۔
رحوم کے بارے میں بچپنے کے حالات سے لیکر آخری زندگی تک کے حالات پر ——— بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر
باتیں لکھکر میں بھی اس بزم میں شریک ہو گیا جس کے لیے کچھ لوگوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ یوں اب تک
بت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ آخر میں یہ بھی مجھے تکلیف ہو رہی ہے کہ تجہیز و تکفین کے بعد میں الہ آباد پہونچا جبکہ وہ
ن مٹی کے نیچے ہمیشہ کے لیے آرام کرنے پہونچ چکے تھے کاش آخری بار صورت ہی دیکھ لیتا جس کا صدمہ زندگی بھر رہے گا۔

خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ——— آمین

ذوقِ ادب اور شعور

صفحہ ۷۰: جنس کا ذکر ادب میں آیا ہے اور آتا رہے گا اور یہ ذکر زیادہ تر اپنے عہد کے جنسی میلان کا مظہر ہوگا۔ بعض حالتوں میں انفرادی گھٹن نا آسودگی کجروی یا بیماری کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے تاہم اسے سمجھنے کے لیے اس جذبہ کی بدلتی ہوئی تاریخ اس کی ترتیب اور تہذیب اخلاق سے اس کے تعلق اس کے معاشی پس منظر کا جاننا ضروری ہوگا اگر اس میں توازن قائم کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو یہ محض ایک حیوانی حیاتیاتی جذبہ ہے جو اسی طرح ظاہر ہوگا اور اگر سماج کو متوازن بنا لیا جائے تو اس کے اظہار کے ذرائع بھی متوازن ہوں گے اس لئے موجودہ دور کے ادیبوں پر اس کے اظہار میں بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یعنی انہیں غور کرنا ہوگا کہ اس کا اظہار کن کن شکلوں میں سماجی اہمیت رکھتا ہے اور کن شکلوں میں محض فحش نگاری بن جاتا ہے جب تک ان کا فنی اور سماجی شعور ان کی رہنمائی نہیں کرے گا یہ دشوار گذار منزل آسانی سے طے نہیں ہو سکے گی۔ ذرا سی غفلت ایک اچھے سماجی مسئلہ کو فحش بنا سکتی ہے "

٭ ٭ ٭

امیر احمد صدیقی اسسٹنٹ ایڈیٹر نیا دور لکھنؤ

پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

احتشام صاحب — ایک ہمہ گیر شخصیت

پروفیسر احتشام حسین کی ناوقت موت سے اُردو زبان و ادب کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے وہ احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ وہ صرف ایک جلیل القدر اور بلند پایہ ادیب ہی نہیں تھے بلکہ اُن کا شمار اردو ادب کے معماروں میں کیا جائے گا۔ یوں تو وہ افسانہ نگار بھی تھے، شاعر بھی تھے اور انشا پرداز بھی تھے اور انھوں نے ان سبھی اصنافِ ادب میں اپنے جوہر دکھائے ہیں لیکن ان کا اصل میدان تنقید ہے۔ اُن کو اگر ہم جدید اُردو تنقید کا امام کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ انھوں نے اُردو نقد و نظر میں وہ نئی نئی راہیں نکالیں اور اس کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا کہ اب وہ دنیا کی اہم اور ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ اس طرح اُردو تنقید کو جن صاحبِ فکر نقادوں نے بحیثیت ایک فن کے پروان چڑھایا اُن میں احتشام صاحب کا نام سرفہرست ہے۔

وہ غالباً اُردو کے سب سے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے تنقید کے اصول و ضوابط وضع کئے اور اپنے تنقیدی مضامین میں اُن کو واضح طور پر پیش کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو تنقید کو وہ فلسفیانہ گہرائی اور گیرائی عطا کی اور اُس کو ایسا علمی، سماجی اور سائنسی نقطۂ نظر دیا جو اُردو تنقید میں اب تک ناپید تھا۔ ان کی علمیت اور تنقیدی بصیرت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، امتیاز علی عرشی اور پروفیسر آل احمد سرور جیسے عظیم، نامور اور مستند دانشوروں، ادیبوں اور نقادوں نے احتشام صاحب کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے تو اِس عہد کو ہی احتشامی دَور سے تعبیر کیا ہے۔

احتشام صاحب ایک بلند پایہ ادیب، متبحر عالم اور عظیم نقاد کے ساتھ ہی ساتھ اخلاق و مروت اور شرافت و انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ان کی شخصیت ہر پہلو سے ہمہ گیر تھی۔ اُن سے جو کوئی بھی ایک بار ملتا، ان کی محبت اور خلوص کا گرویدہ ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا۔ اُن میں تصنع اور ظاہرداری نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ہمیشہ انکساری اور بے تکلفی سے تو پیش آتے ہی تھے، اپنے خوردوں خاص طور سے اپنے شاگردوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اُن کی یادداشت اتنی تیز تھی کہ اگر کوئی اُن کا پرانا شاگرد برسوں بعد اُن سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتا تب بھی وہ اُس کو فوراً پہچان جاتے اور اُس سے وہ اُسی طرح تپاک سے ملتے۔ مجھے متواتر چار سال (۱۹۴۴ سے ۱۹۴۸) تک ان کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ ناممکن تھا کہ کوئی شاگرد اُن کے پاس اپنی حاجت لے کر جائے اور نامرادو ناکام واپس آئے۔ میرے ساتھ بھی ایسے ہی دو واقعات پیش آئے۔ جو احتشام صاحب کی عالی ظرفی اور بے پناہ خلوص و محبت کا آئینہ دار ہیں اور جن کو شاید میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ اس موقع پر میں اُن واقعات کو دہرانا مناسب نہیں سمجھتا ہوں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ احتشام صاحب میں اخلاق، مروت اور ہمدردی کا

جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اکثر تمام مروجہ اصول وضوابط کی پرواہ کئے بغیر اپنے شاگردوں کی ہر ممکن اعانت کرتے تھے۔ اس میں دو رائے نہیں ہیں کہ مرحوم اس وقت یونیورسٹی میں سب سے زیادہ ہردلعزیز اور شفیق استاد تھے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ ہر استاد کے کچھ منظور نظر شاگرد ہوتے ہیں لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ احتشام صاحب میں یہ بات قطعی نہیں تھی۔ وہ اپنے تمام شاگردوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے اور حتی الوسع ہر ضرورت مند کی امداد اور رہنمائی کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مذہب انسانیت کے سچے پیرو تھے اسی لیے وہ ہر قسم کی عصبیت یا جنبہ داری سے بالاتر تھے۔ کلاس میں وہ جیسے ہی داخل ہوتے بالکل خاموشی چھا جاتی، وہ صرف اس لیے کہ ہم سب طلباء اُن کی علمیت اور شرافت کے سبب اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔

میں لکھنؤ یونیورسٹی کے جس دور کا ذکر کر رہا ہوں وہ اُس کے اُردو شعبے کا زریں دور کہا جا سکتا ہے کیونکہ برصغیر ہند میں یہی واحد یونیورسٹی تھی جہاں احتشام صاحب کے علاوہ صدر شعبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی، پروفیسر آل احمد سرور اور موجودہ صدر شعبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی جیسے بلند پایہ محقق، ادیب اور نقاد بیک وقت جمع ہو گئے تھے۔ احتشام صاحب اپنے تمام رفقائے کار کی بے حد عزت و تکریم کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ حفظ مراتب کا خیال رکھا۔ کسی کے خلاف حرف شکایت زبان پر لانا اُن کی وضع داری کے بالکل خلاف تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ جب محمد حسین صاحب مرحوم کے انتقال کے فوراً ہی بعد شعبے میں ریڈر کا عہدہ قائم کیا گیا تب احتشام صاحب کو توی امید تھی کہ اُن کا اس عہدے پر انتخاب عمل آ جائے گا لیکن ڈاکٹر عبدالحق نے جو بطور ایکسپرٹ بلائے گئے تھے انھوں ان کے مقابلے میں آل احمد سرور صاحب کو ترجیح دی اور اس طرح احتشام صاحب منتخب نہ ہو سکے لیکن پھر بھی انھوں نے سرور صاحب کی ایک سینیر رفیق کار کی حیثیت سے عزت کی اور ان کی علمیت کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

احتشام صاحب کے درس و تدریس کا طریقہ بھی بہت ہی پُرلطف ہوتا تھا۔ ہم لوگ کبھی اُن کے کلاس میں بور نہیں ہوتے تھے وہ اکثر ادبی نکتوں اور لطیفوں سے کلاس کو گل و گلزار بنا دیتے تھے۔ چونکہ ماہر لسانیات کے ساتھ ہی ساتھ بے انتہا ذہین تھے اس بات میں بات پیدا کرنے میں اُن کو خود بھی لطف حاصل ہوتا تھا۔ ایم۔ اے (اردو) کے طلبا کو وہ ہندی بھی پڑھاتے تھے۔ اس وقت کورس میں منشی پریم چند کے ہندی افسانوں کا ایک مجموعہ تھا۔ احتشام صاحب کی ہندی میں استعداد کسی بڑے ودوان پنڈت عالم سے کم نہ تھی۔ وہ ہندی کا درس اس روانی کے ساتھ دیتے تھے گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ہندی کا بڑا عالم یا پروفیسر پڑھا رہا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ ہندی زبان میں بھی لکھی ہے جو ہندی میں اُن کی علمیت اور قابلیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ فراق گورکھپوری کا کہنا ہے کہ احتشام صاحب کو ہندی زبان پر بھی اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ ہندی کے بڑے بڑے پنڈت ودوانوں کو ہندی پڑھا سکتے تھے۔

ہندی زبان کے ساتھ ہی ساتھ اُن کو انگریزی زبان و ادب پر بھی پورا عبور تھا۔ انگریزی زبان پر ان کو کتنی قدرت حاصل تھی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے انگریزی میں احتشام صاحب کی تقریر کو سنا ہے یا اُن کی تحریر کو دیکھا ہے۔ مجھے اس موقع پر اپنا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ محکمہ اطلاعات، اترپردیش کی جانب سے "اترپردیش" نام کا ایک انگریزی ماہنامہ بھی شائع ہوا کرتا تھا جس کی اشاعت اب ادھر کئی برسوں سے بند ہے۔ سنہ ۱۹۶۱ء کے ابتدائی مہینوں کا ذکر ہے اُن دنوں اُس کے ایڈیٹر جناب کول صاحب جا طویل رخصت پر چلے گئے تھے اور اُس کی ایڈیٹری کا کام عارضی طور پر میرے سپرد کیا گیا تھا جس کے نگراں محترمی صباح الدین عمر صاحب جو اس وقت سکریٹری اُردو اکاڈمی، اترپردیش تھے۔ انھیں ایام میں حضرت جگر مرادآبادی کا انتقال ہوا تھا۔ صباح الدین صاحب نے مجھ کو ہدایت کی آئندہ ماہ "اترپردیش" میں جگر صاحب سے متعلق ایک مضمون شائع ہونا بہت ضروری ہے اور فرمایا کہ اس کے لکھنے

ن احتشام حسین صاحب ہیں۔ چنانچہ اُسی دن شام کو میں احتشام صاحب کے دولت کدہ واقع بارود خانے پر حاضر ہوا مدعا ان
پنے آنے کا مدعا بیان کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ چونکہ پریس کو مسودہ جلد از جلد دینا ہے اس لیے اگر آپ یہ مضمون دو تین دن کے اندر
، تو عین نوازش ہوتی۔ وہ بے چون و چرا مضمون دینے کے لیے تیار ہو گئے اور مجھے وقت کے اندر ہی مضمون لکھ کر دے دیا۔
نے حضرت جگر مراد آبادی کی غزل گوئی پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا اور شاعر تغزل کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ اتنے
دان اور شستہ انگریزی میں اتنا طویل مضمون قلم برداشتہ لکھ دینا جس میں کہیں بھی کانٹ چھانٹ نہ ہو، صرف وہی شخص کر سکتا
ی زبان و ادب پر پوری قدرت حاصل ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں جن کو اردو کے ساتھ
یہی زبانوں پر بھی بیک وقت پورا ملکہ ہو۔
ظیم اور جلیل القدر نقاد کے علاوہ احتشام صاحب ایک اچھے افسانہ نگار اور شاعر بھی تھے اُن کے افسانوں اور شاعری میں بھی
نمایاں ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے
تحریک اور اشتراکی نظریات سے متاثر تھے۔ وہ متمول گھرانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ ایک متوسط طبقے سے تعلق
ن سن بلوغ کو پہنچے بھی نہ تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور خاندان میں سب سے بڑے ہونے کے سبب گھر کی تمام ذمہ داریوں
لیا تھا لیکن چونکہ بچپن ہی سے وہ بہت ہی بردبار، قناعت پسند اور محنتی تھے اس لیے انھوں نے حادثات زمانہ کے تھپیڑوں
سے مقابلہ کیا۔ چونکہ طبیعتاً بہت ہی حساس تھے اس لیے اُن کے افسانوں اور شاعری میں غم و الم، افسردگی اور محرومی کی ہم کو
نائی دیتی ہے۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ "ویرانے" بہت عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اُن کا کوئی شعری مجموعہ
آیا ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ احتشام صاحب مشاعروں کے شاعر نہیں تھے اور نہ وہ کسی شاعرے
ت سے کبھی شریک ہی ہوتے تھے اور نہ اُن کی یہ خواہش ہی تھی کہ لوگ اُن سے ایک شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوں لیکن
محفلوں میں اپنے بے تکلف دوستوں، احبابوں کے اصرار پر اپنا کلام ضرور سناتے تھے۔ بحیثیت شاعر کے بھی احتشام صاحب
تا وسیع ہے۔
ام صاحب اگرچہ مغربی ادب و تنقید کے دلدادہ تھے اور اُس کا انھوں نے عمیق مطالعہ بھی کیا تھا لیکن مشرقی ادب اور اُس کی
کے بھی دل سے قدردان تھے۔ ان کے ادبی نظریات میں توازن اور تنقیدی لہجے میں متانت اور سنجیدگی ہے جس میں
روت اور شرافت نفس کا بھی کافی دخل ہے۔ تحریر ہو یا تقریر وہ کسی کی دل آزاری کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ اُن کی شخصیت اگرچہ
سے عظیم، قد آور اور پُر وقار تھی۔
م صاحب ادبی دنیا میں کتنی محبوب شخصیت کے حامل تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک بھر میں جتنا
یا گیا ہے اتنا سوگ بہت ہی کم ادیبوں اور شاعروں کا منایا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اُن کے ٹکر کا کوئی دوسرا
نقاد برصغیر ہند میں نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک بلند پایہ ادیب اور نقاد سے زیادہ ایک عظیم انسان تھے۔ اُن
اور نقاد تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اُن سے بڑا انسان اس زمانے میں پیدا ہونا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے ع۔

مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

ذوقِ ادب اور شعور

صفحہ ۹۹ ۔ " بیسویں صدی میں ہندوستان کی تاریخ جن راہوں سے گذری وہ بہت ہی پیچیدہ پُرخطر اور ناہموار تھیں ایسے نشیب و فراز مشکل ہی سے کسی ملک کی تاریخ میں ہوں گے آویزشوں کی اتنی شکلیں نظر نہیں آئیں گی ان پُرپیچ وادیوں سے انسانی ذہن کا گذرنا اور مختلف ۔ گھٹتی بڑھتی لہروں۔ قومی اور بین الاقوامی جذبوں مادی اور روحانی الجھنوں کا احاطہ کر کے اپنی راہ متعین کرنا ایسا آسان نہیں ہے جیسا آسان نظر آتا ہے ۔ اس لئے تنقید نگار کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں ۔ گر وہ ان تمام عناصر کو پیش نظر نہ رکھے اُن تمام علوم سے کام نہ لے جو انسان کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور اس کے خیالات و جذبات کی گتھیاں کھولتے ہیں تو وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے شاعر یا ادیب کے مافی الضمیر کو سمجھا ہے ۔ فن کے مقصد و منہاج کو سمجھا ہے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے متعدد نقادوں کے یہاں شعر و ادب کے پرکھنے کی بالکل ۔ بدلی ہوئی شکلیں ملتی ہیں جو یکسر قدیم روایات سے اپنا رشتہ نہیں توڑتی "

احمد جمال پاشا

اُستادوں کے اُستاد

میری ادبی زندگی کی ابتدا، احتشام صاحب کی حوصلہ افزائی سے ہوئی تھی۔ میں کامرس کا طالب تھا اور وہ بھی کالج میں لیکن میرے چند احباب اور ہم جماعت جو اس وقت اردو کے ممتاز ترین شاعر، ادیب اور ناقد ہیں مجھے "انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں لے گئے۔ گیا تو میں صرف اس لیے تھا کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ ہم لوگ "ٹی پارٹی" میں جا رہے ہیں جہاں میری چائے پکی ہے۔ اس زمانے چائے انتہائی اہم قدر مشترک تھی۔ اس لیے چائے کسی بھی صورت میں "مِس" نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے باوجودیکہ نامدعو تھا گر پہنچ گیا۔ بلا چائے کے بحث و مباحثہ ممکن نہیں۔ غور و فکر کے لیے چائے کا ہونا اس لیے لازمی ہے کہ پہلے چائے آتی ہے اور پھر فکر۔ چنانچہ پہونچا۔ جلسہ میں کسی کا صورت آشنا تک نہ تھا۔ حاضرین کی تعداد بھی کوئی پچاس سے کیا کم تھی۔ ہر شخص ملکر کی طرح خاموش تھا اور اقبال مجید اپنا افسانہ "عدو بچا" سنا رہے تھے افسانہ ختم ہوا تو اس پر دھواں دھار بحث ہوئی۔

میں جلسے میں جا کر بالکل ایک کونے میں جوتوں کے پاس انتہائی نروس، حیران و پریشان بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک صاحب نے انتہائی شفقت سے بلایا۔

"ادھر تشریف لائیے"۔ ان بزرگ نے فرمایا۔

"مجھے احتشام حسین کہتے ہیں۔ آپ کی تعریف؟"

چونکہ میرے دوست کلو کو بھی یہاں جس نام سے یاد کیا جا رہا تھا وہ انتہائی حسین و جمیل نام تھا۔ اور میرے کئی دوستوں کو دوسرے ناموں سے استعمال کیا جا رہا تھا۔ میرا کالج کا نام "آغا محمد نزہت پاشا" تھا جس میں سے آغا تو لڑکیوں نے "آغا مرغی لیکر بھاگا" چڑھا چڑھا کر چھڑوا دیا تھا مگر بقیہ نام (محمد نزہت پاشا) میں بھی "نزہت" عجب سیتا رام قسم کا نام تھا جو میں خود بتاتے شرماتا تھا مگر گھر میں جمال کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی "جمال پاشا" بھی کہہ دیتا تھا۔ اور ایک بزرگ "احمد شجاع پاشا" کے نام سے اردو ادب پر بڑے مشہور تھے چنانچہ میں نے بہت سوچ کر اپنا نام "احمد جمال پاشا" بتا دیا۔

انھوں نے پوچھا۔ "آپ کیا لکھتے ہیں۔؟"

چونکہ اردو آٹھویں تک پڑھی تھی اور آٹھویں تک سب سے زیادہ اردو ہی کے درجہ سے غائب غلّہ رہے تھے اس لیے یہ تک نہیں جانتے تھے کہ لکھنا کھانا کس چڑیا کا نام ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد عرض کیا۔

"مزاحیہ ـــ"

احتشام صاحب بہت خوش ہوئے اور بولے "اچھا آپ کو طنز و مزاح میں دلچسپی ہے اگلے اتوار کو آپ اپنا مزاحیہ سنائیے

جس کو میں نے بہت خوشی سے منظور کر لیا۔

جلسہ میں افسانے پر بحث میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہی تھی۔ "افسانہ، کردار، شعور، سماجی معنویت" جیسے بھاری بھرکم الفاظ کانوں سے ٹکرا کر جہالت کا احساس اور دل کی دھڑکن تیز کر رہے تھے۔ مگر اس سب میں بھی مزا آ رہا تھا جو کسی عاشق کو اپنی محبوبہ سے اس غیر متوقع ملاقات میں آئے جس میں وہ اس سے کہنا تو سب کچھ چاہے مگر ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکے۔ بس صرف تھر تھر کانپتا رہ جائے۔ یہ تھا اردو ادب سے میرا پہلا پہلا پیار۔

جلسے میں سب سے زیادہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی احتشام صاحب ڈاکٹر محمد حسن اور سرور صاحب نے مجھے متاثر کیا۔

جلسہ جب برخواست ہوا تو میرے سر پر فکروں کا ایک ٹوکرا تھا جس میں "طنز و مزاح اور مزاحیہ" جیسے دو کوئنٹل رکھے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے دوست عابد سہیل کو الگ لے جا کر بڑی منت سماجت کی کہ "خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ "طنز و مزاح" کس کو کہتے ہیں اور مزاحیہ کیا چیز ہوتی ہے"۔

عابد سہیل صاحب نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کہا۔ "واہ! اتنی بڑی چیز یونہی نہیں بتائی جاسکتی طنز و مزاح معلوم کرنے کے لیے چائے پلانی ہوگی اور مزاحیہ کے لیے ایک سگار دینا ہوگا۔" میں نے دونوں شرطیں انتہائی بے تابی سے جب پوری کر دیں۔ تو انھوں نے مجھے ہر ہر طرح سے طنز و مزاح اور مزاحیہ کے معنی بتائے۔ جو میرے سر پر سے گذر گئے۔ مگر ایک بات سمجھ میں آ گئی وہ یہ کہ "جس چیز پر اور جیسے بھی دل چاہے لکھ کر لے آؤ۔ پھر میں ٹھیک ٹھاک کر دوں گا۔"

چنانچہ میں نے ایک مضمون لکھا۔ "سگریٹ پینا" اور عابد صاحب کو یحییٰ گنج اُن کے گھر پر جا کر اگلی صبح سنایا جسے انھوں نے "چائے پلانے کی شرط" پر سنا مگر مضمون سُن کر اُچھل پڑے اور بولے۔ "اماں تم تو شوکت تھانوی کی طرح لکھ سکتے ہو اور اگر محنت کرو تو پطرس اور شفیق الرحمان کی کمی پوری کر سکتے ہو۔" انھوں نے دو تین جملے ٹھیک ٹھاک کر دیئے۔ تو ہم نے بڑی خوشامد کی کہ آپ میرے اُستاد بن جائیے۔ مگر وہ انکار کرتے رہے کہ "بھئی تم شاگردی کے اخراجات نہیں برداشت کر سکتے۔" مایوس ہو کر نکلا تو سیدھا احتشام صاحب کے پاس۔ بڑے تپاک سے ملے اور بلا میرے اصرار کے میرا "مزاحیہ" سن لیا بہت پٹیہ ٹھونکی میرے سر پر ٹوکرے میں تین نئے کوئنٹل تھے وہ میں نے اُن کے سامنے اُتار کر رکھے اور پوچھا۔ "شوکت تھانوی، پطرس اور شفیق الرحمان کے بارے میں کچھ بتائیے۔"

احتشام صاحب نے میری جہالت کو بلا کریدے ہوئے بہت ہی سیدھے سادے الفاظ میں سمجھا دیا کہ بس یہ سمجھ لو کہ جیسے احمد جمال پاشا نے ایک مزاحیہ مضمون "سگریٹ پینا" لکھا ہے۔ اسی طرح شوکت تھانوی، پطرس اور شفیق الرحمان نے بھی مضمون لکھے ہیں۔ اس کے بعد ایک فہرست دی کہ ان کی یہ، یہ کتابیں پڑھ ڈالو۔ بھئی "شاہراہ" رسالہ خرید کر پڑھو، ادب لطیف اور نقوش پڑھو۔ سویرا اور شاعر پڑھو جو کتاب نہ ملے وہ لائبریری سے لاکر پڑھو اور ٹھہرو۔" یہ کہکر وہ اندر گئے اور شفیق الرحمان کی "پرواز"، "پطرس کے مضامین" اور شوکت تھانوی کی "طوفان تبسم" لاکر مجھے دیتے ہوئے بولے پطرس کے علاوہ جو بھی مزاح نگار پسند آئے تلاش کر کے اُس کی سب کتابیں پڑھو اور روز مزاحیہ لکھو۔ لکھتے وقت خوب سوچو کہ اور کون ایسا نکتہ لا سکتے ہو کہ پڑھنے والا پھڑک اُٹھے بالکل نئی بات اور انتہائی مہذب طریقے سے کہو۔" انھوں نے مزاح و طنز میں شائستگی اور توازن طنز کی چبھن اور مزاح کی گدگدی سے قہقہے تک پر بہت دیر تک ہر ہر پہلو سے سمجھایا پھر میں نے گڑگڑا کر درخواست کی کہ "عابد سہیل صاحب نے شاگرد بنانے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ ہی میرے استاد بن جائیے تاکہ میرا قلم گرفتہ ہو جائے۔ میں مزاح نگار بننا چاہتا ہوں۔" انھوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ "استادی شاگردی کچھ نہیں آپ خوب پڑھئے،

خوب نکلے۔ خوب چھپئے اور میں جو بھی آپ کی مدد کر سکتا ہوں وہ ایک "دوست" کی حیثیت سے کرتا رہوں گا" دوسرے معلوم نہیں کس طرح اٹھنے میں میری جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکل کر گر پڑی تو انھوں نے بہت اصرار کیا کہ سگریٹ پیتے ہو تو پیو"

غرض ہم نے فیصلہ کر لیا کہ احتشام صاحب ہمیں شاگرد مانیں یا نہ مانیں مگر ہم انھیں پابندی سے استاد مانتے رہیں گے۔

گھر لوٹ کر میں کالج نہیں گیا اور جب تیسری اور آخری کتاب اور دوسرا مضمون ختم کیا تو رات کے ۲ بج رہے تھے۔ دوپہر کو میں نے کتابیں واپس کر دیں اور مضمون سنا دیا۔ اس دوران اگر کوئی مضمون انھیں پسند نہ آیا تو ہم بلا کسی تکلف کے اسے پھاڑ ڈالتے۔

احتشام صاحب کے سائے تلے ہماری ادبی ریاضت کا سلسلہ اس تیز رفتاری سے جاری تھا کہ سال بھر کے اندر ہم اردو کا سارا ذخیرۂ ادب کھنگال چکے تھے۔ ہمارے مضامین ہندو پاک کے ممتاز ترین ادبی رسائل میں چھپ چکے تھے۔ درجنوں ادبی رسالے ہمارے پاس آنے لگے تھے۔ لکھنؤ کے ہر چھوٹے بڑے ادیب سے لیکر باہر کے ممتاز ادیبوں تک سے ہماری دوستی سے لیکر قلمی دوستی تک ہو چکی تھی۔ اور اس عظیم الشان کامیابی کے ساتھ ساتھ ہم انٹر کے سالانہ امتحان میں بری طرح فیل بھی ہو چکے تھے۔

پھر استاد محترم کے مشورے سے ہم نے کامرس چھوڑ کر "آرٹس" میں داخلہ لے لیا اور آئندہ کبھی فیل نہ ہوئے۔

زمانہ طالب علمی احتشام صاحب کی قابل فخر قربت میں بڑے ٹھاٹھ سے گزر گیا۔ اُن کے یہاں اور اُن کے گھر میں ہونے والے ادبی جلسوں میں ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز ترین ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ سبط حسن، آلِ حسن، ممتاز حسین، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، جوش ملیح آبادی، محمد طفیل، چودھری محمد علی ردولوی، نیاز فتح پوری، اثر لکھنوی، ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر عبدالقادر سروری، آنند نرائن ملا، مانی جائسی، نجیب لکھنوی، حمید صدیقی، سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر اعجاز حسین، یگانہ چنگیزی اور فراق گورکھپوری ان مشاہیر کی فہرست اتنی طویل ہے کہ صحیح معنوں میں یہ اُس کی ایک جھلک بھی نہیں قرار دی جا سکتی۔

ادب تو خیر احتشام صاحب کا اوڑھنا بچھونا تھا مگر اُن میں جو گہری انسانیت، خلوص، سچائی، محبت، شفقت اور تواضع تھا۔ اُسی کا یہ فیض ہے کہ آج جو کچھ بھی ہوں اور جیسا بھی ہوں مگر اُن کا پھر بھی ایک فیصد بھی نہیں۔

آخر میں ایک بات یہ بھی بتا دوں کہ میری نسل اور مجھ سے آگے پیچھے کی تقریباً سب ہی نے اس پیکر انسانیت اور منارۂ علم و عرفان سے نور، روشنی اور ہدایت حاصل کی ہے ورنہ سچ پوچھیے تو یہ عاجز اپنے آپ کو احتشام صاحب کا سب سے نالائق شاگرد سمجھتا ہے۔ وہ استاد نہیں استادوں کے استاد تھے۔

ذوقِ ادب اور شعور

صفحہ۱۹۱: "وہ ادیب جو عوام کے لیے لکھنے کا مدعی ہے محض کہہ دینے سے عوام کا ادیب نہیں بن جاتا۔ جب تک اس کا شعور عوام اور محنت کش طبقے کے شعور سے ہم آہنگ نہیں ہو جاتا دعووں کے باوجود محض زبانی ہمدردی سے وہ محنت کش طبقے کا ترجمان یا ادیب نہیں بن سکتا متوسط طبقے کے ادیبوں کے شعور میں متضاد پہلوؤں کا موجود ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن اگر وہ پوری توجہ سے اس تضاد کو دور کرنا چاہیں تو ایسا کرنا ناممکن نہ ہوگا۔ یہ شعوری طور پر زندگی کے سمجھنے کی بات ہے۔ قدروں کو جاننے اور پورے فنی شعور کے ساتھ اظہار کی ساری قوت اور لطافت کے ساتھ اسے پیش کرنے کی بات ہے۔ اس طرح ہر ادیب اس سوال کا جواب اپنے شعور کے مطابق دے گا اور اگر وہ دنیا کو امن آسودگی اور حسن سے مالامال دیکھنا چاہتا ہے تو اس کا یہ جواب نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے لیے لکھتا ہے یا اُن کے لیے لکھتا ہے جو ان قدروں کے دشمن ہیں۔ ترقی پسند اور انسان دوست بننے کے لیے عملاً ان طاقتوں کا ساتھ دینا پڑے گا جو ان ہمدردوں کو حاصل کرنے یا انھیں برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ اس سوال کا یہی ایک جواب ہے جو ایک اچھا ادیب دے سکتا ہے۔

اے ۔ اے ۔ فاطمی

استادِ محترم پروفیسر احتشام حسین مرحوم

گھر سے قبرستان تک

میں ایک ادنیٰ طالب علم میرے قلم میں اتنی طاقت نہیں، الفاظ میں اتنی گرمی نہیں، تخیل میں اتنی بلند پروازی نہیں کہ اتنی عظیم ہستی کہ جس کے سامنے عظمت نے کبھی گھٹنے ٹیک دیے ان کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کروں مگر جب بھی ان کا تذکرہ ہوتا ہے یا کبھی ان کے بارے میں کچھ لکھنے کی جرأت کرتا ہوں یا کبھی ان کی تصنیفات پر نظر دوڑاتا ہوں تو اپنے آپ کو ایک سلجھی ہوئی سنجیدہ و شائستہ سی شخصیت جس کا وجود ہی محبت اور شفقت پر مبنی ہو آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔

میرے اور احتشام صاحب کے درمیان کس طرح کے تعلقات تھے؟ میری اور ان کی پہلی ملاقات کس انداز سے ہوئی؟۔ یونیورسٹی میں قدم رکھنے کے بعد ان کا رویہ میرے ساتھ کیسا رہا؟ میں نے ایم اے (اردو) میں داخلہ کیوں لیا تھا؟ ان کا پڑھانے کا انداز کیسا تھا؟ وہ کس طرح سے ہم سب کی رہنمائی کرتے تھے؟ ہم لوگوں کو ایک نفسیاتی سکون کیوں حاصل تھا؟ شعبہ میں آب و تاب کیوں رہتی تھی؟ سب لوگ ان کی بے پناہ عزت کیوں کرتے تھے؟ اگر ان تمام سوالوں کے جواب رقم کیے جائیں تو صدہا صفحات بھرے جاسکتے ہیں اور پھر بھی ان کی شخصیت واضح طور پر اجاگر نہ ہوسکے گی لہٰذا میں صرف اتنا بتا کر کہ میری احتشام صاحب سے باضابطہ طور پر پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۶۶ء میں ہوئی جب میں سی اے وی کالج میں انٹرمیڈیٹ سال اول کا طالب علم تھا اور اس سال بزمِ ادبِ اردو کا سکریٹری تھا اور وہ ہمارے جلسے میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے تھے آگے کسی اور بات کو طول نہ دے کر میں صرف ان اوقات اور ان مناظر کا تذکرہ کروں گا جو میں نے اپنی ان منحوس آنکھوں سے دیکھے ہیں یعنی پہلی دسمبر ۱۹۷۲ء کی صبح جب وہ دارِ فانی سے رخصت ہوئے اور دوسرے دن جب وہ کربلا کے میدان میں دفن کیے گئے۔

۳۰ نومبر ۱۹۷۲ء — یعنی موت سے ایک دن قبل وہ کلاس میں ولی دکنی کی شاعری پر روشنی ڈال رہے تھے اور ولی سے متعلق چل رہے ادبی مباحثے (کہ ولی گجرات کے شاعر ہیں یا اورنگ آباد کے) سے انھوں نے آگاہ کیا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اس مباحثے سے ہم سب کو کوئی تعلق نہیں رکھنا ہے۔ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا —— "سر اس مباحثے کے سلسلے میں آپ کس نتیجے پر پہنچے۔؟" انھوں نے گھڑی کی طرف نظر دوڑائی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے —— "آج وقت ہوگیا ہے اس سلسلے میں بقیہ باتیں کل ہوں گی۔" 'کل' کل کا خیال آتے ہی وہ تھوڑا رک کے پھر بولے۔ "ہوسکتا ہے کل میں نہ آپاؤں —— مگر آپ لوگ آئیے گا ضرور اگر آگیا تو کلاس لوں گا ورنہ کل میرا کلاس نہ ہوگا۔" —— آہ —— یہ الفاظ آج بھی دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں اُس وقت تو ان الفاظ کی کوئی اہمیت نہ تھی مگر آج —— آج لگتا ہے کہ انھوں نے بالکل سچ فرمایا تھا کیونکہ دوسرے دن وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے صرف اپنی کرسی اپنا کلاس اور اپنا شعبہ ہی نہیں بلکہ ساری کائنات کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلے گئے۔

مجھے افسانہ نویسی کا بہت شوق ہے اور اس سلسلے میں میں اپنے استاد محترم سے اکثر و بیشتر اصلاح لیا کرتا تھا۔ ۳۰ نومبر کی رات تقریباً ۹ بجے میں ان کے گھر پر موجود تھا وہ مجھے اس شوق کو پورا کرنے میں جن جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کے نشیب و فراز سے آگاہ کر رہے تھے۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بیحد قیمتی ہوتا تھا جس کی قدر و قیمت سے صرف ادب پرست ہی واقف ہو سکتے ہیں اور میں اپنی قسمت پر نازاں اس بیش بہا خزانے سے فیض یاب ہوتا رہا اور تقریباً دس بجے واپس آیا اور جب بستر پر پہنچا تو سوچتا رہا کہ ہم لوگ کس قدر خوش قسمت ہیں کہ اتنی عظیم ہستی کے زیر سایہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا اپنی قسمت پر رشک کرتا رہا۔

اب آیئے اس دن کا تذکرہ کریں جس دن اردو ادب کی دنیا میں ایک زبردست زلزلہ آگیا ـــ جس دن ایوان ادب کا ایک اہم رکن گر جانے سے ساری عمارت لڑکھڑا گئی، اور یہ وہ دن ہے جس سے ہم سب کی خوشیاں نہ دیکھی گئیں جس نے ہماری زندگی کو غم واندوہ سے لبریز کر دیا، جس نے ہمارے سارے مقاصد کو منتشر کر دیا۔

ـــــ یہ وہ دن ہے جس کا خیال آتے ہی آج بھی ہماری آنکھیں اپنے محبوب رہنما کو یاد کر کے اشکبار ہو جاتی ہیں ـــــ یعنی پہلی دسمبر کا دن ـــــ یہ وہ دن ہے جس دن ہمارے ہوش و حواس غائب ہو چکے تھے۔ اور اگر میرے دل میں کبھی فلک شگاف ہوک اٹھی ہے اور جس دن سب سے شدید صدمہ پہنچا ہے تو وہ پہلی دسمبر کا دن ہے جو میرے لیے یوم عاشور سے کم نہ تھا۔

ابھی ناشتہ کر کے اپنی میز پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میرا ایک بھانجہ اچانک میرے کمرے میں داخل ہوا اس کو قبل از وقت دیکھ کر میں نے پوچھا ـــــ "آج تم اسکول سے جلدی کیسے آگئے ـ ؟"

"وہ آپ کے یونیورسٹی میں کوئی احتشام صاحب ہیں ان کا انتقال ہو گیا ہے ـــ !"

"اچھا ـ !!" یہ ایک اچانک اور زبردست حملہ تھا جس کی میں تاب نہ لا سکا۔ دل میں ایک ہتھوڑا سا لگا مگر مجھے یقین نہ آیا اور یقین کرتا بھی کیسے رات کافی دیر تک جس کے پاس بیٹھ کر آیا ہوں وہ اس معاملہ میں جلدی کیسے کر سکتا ہے۔

"کیا بکتے ہو ـــــ صحیح صحیح بتاؤ ـــــ" میں نے ایک عجیب کیفیت سے پوچھا

"نہیں ماموں جان میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں ـــــ اسی وجہ سے آج جلدی چھٹی ہو گئی۔"

بس اس وقت میری کیا کیفیت تھی بیان سے باہر ہے گھر والے میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بدحواس ہو گئے۔ میں کسی سے کچھ بولے بغیر فوراً سائیکل اٹھائی اور احتشام صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا اگرچہ میرا گھر ان کے گھر سے بالکل قریب ہے مگر یہ مختصر سا راستہ کس طرح کٹا بتا نہیں سکتا گھر پہنچا تو ان کے باہر متعدد اشخاص تصویر غم بنے کھڑے نظر آئے بس یقین ہو گیا جلدی سے اندر پہنچا تو ـــــ آہ ـــــ وہ منظر دیکھا جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا سوگواروں کا ایک ہجوم آہ و زاری و گریہ و فریاد کرتا نظر آیا اور ان سب کے درمیان احتشام صاحب کی میت نظر آئی وہ شخص جو کل تک دوسروں کو زندگی دیتا رہا آج خود زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا نہ جانے کیا سوچ کے میری آنکھوں میں آنسو تیر آئے سامنے ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر محمود الحسن اور ڈاکٹر جعفر رضا نظر آئے جو زار و قطار رو رہے تھے ان سب کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کلیجہ پھٹ گیا دل و دماغ میں ایک کاری ضرب لگی اور میرے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی ڈاکٹر جعفر رضا آگے بڑھے اور بانہیں پھیلا دیں ان سے لپٹنا تھا کہ میرے اندر سے ایک فوارہ پھوٹ پڑا اور میں اپنے استاد کو یاد کر کے جو کل رات تک مجھے نصیحتیں دیتا رہا آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گیا ـــــ روتا رہا ـــــ زار و قطار روتا رہا ـــــ آنسو رکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ڈاکٹر جعفر رضا سے الگ ہوا تو ڈاکٹر مسیح الزماں کے آنسوؤں کو دیکھ کر لرز گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی لپٹا لیا ـــ آ

آپ نے اس قدر جلدی کیوں کی ذرا دیکھئے آپ کے چاہنے والے آپ کی یاد میں کس قدر تڑپ رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الحسن کی تھی ہر ایک سے لپٹ کر رو رہے تھے اور فریاد کر رہے تھے ان کو دیکھتے ہی میں ان کی طرف بڑھا انھوں نے ایک ہیجانی مجھے بھینچ لیا اور رو کر بولے " فاطمی ——— احتشام صاحب چلے گئے ہم سب کا رہنما ہم سے روٹھ گیا " ہم روتے رہے تڑپتے ہم لوگوں کو الگ کیا میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مجھے اپنے سارے دوست بیٹھے نظر آئے سب کی آنکھیں اشکبار رہے تھے۔ ریسرچ کے طلباء کی عجیب کیفیت تھی میں ان کے درمیان چلا گیا ——— میں یہ سوچتا تھا کہ میرے لیے ہمارا یہ ہے مگر نہیں بعد میں محسوس ہوا کہ سب کے غم یکساں ہیں کیونکہ سب اسی تکلیف میں مبتلا تھے ——— سامنے ڈاکٹر عقیل کی صورت بنائے داخل ہوئے پھر ایک کہرام برپا ہو گیا سب رو رہے تھے آہ و زاری کر رہے تھے اپنی اپنی فریاد احتشام رہے تھے اور آنے والے غموں و پریشانیوں کو ان کے سامنے رکھ رہے تھے مگر احتشام صاحب خاموش بستر مرگ پر لیٹے رہے دوسروں کی سنتا رہا مشکل کشائی کرتا رہا دوسروں کے کام آتا رہا آج خاموش ہے یہاں تک کہ اپنے چہیتے بیٹے جعفر عسکری شام صاحب کی میت کے سرہانے بیٹھے چہرے پر چہرہ رکھے عجیب آواز کے ساتھ رو رہے تھے پھر میری نظر ان کے چھوٹے بیٹوں پر پڑی یہ لوگ ایک ایسے نالہ و فریاد کے ساتھ رو رہے تھے کہ جس کو سن کر ہم سب کے دلوں میں ایک آرا سا چلتا ہوا تھا۔ ان سب کے درمیان میں اپنی کیفیت کیا بیان کروں میرے ساتھی مجھے باہر لے آئے باہر مجھے یونیورسٹی کے طلباء کا ایک یونیورسٹی کے سیاسی لیڈران و پروفیسران جن میں پروفیسر پی۔ این۔ آر۔ شرما۔ ڈاکٹر رام کمار ورما۔ ڈاکٹر رگھو ونش۔ پروفیسر سیاست۔ پروفیسر ڈی۔ این۔ شکلا صدر شعبۂ تاریخ اور پروفیسر ڈی۔ این۔ سنہا صدر شعبۂ نفسیات اور شہر کے دیگر معزز حضرات حسینی صاحب شکیل جمالی صاحب جناب ایس پی۔ مالویہ سابق میئر الٰہ آباد کامریڈ ضیاء الحق اپنی اپنی جگہ میں کھڑے غمگین صورت ان کی اچانک موت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ چند لمحے بعد میں نے دیکھا کہ سامنے ایک کار رکی جس میں سے یونیورسٹی کے ڈاکٹر بابو رام سکسینہ اترے ان کے پیچھے چند اور معزز بزرگ نظر آئے جن میں ڈاکٹر اے۔ این۔ اگروال، اپیندر ناتھ اشک، امرت نندن پنت کے نام خاص ہیں۔ اور اس کے علاوہ ہندوستانی اکیڈمی کے مختلف عہدہ داران تھے۔ احتشام صاحب یونیورسٹی بریری بھی تھے۔ لائبریری کا ہر فرد اسسٹنٹ لائبریرین ڈاکٹر مسیح سے لیکر ایک ایک چپراسی اپنی پوری افسردگی اور عقیدت کے ر رہا تھا۔ گرد و نواح کے لوگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا آ رہا تھا ان کے پیچھے میں نے دیکھا کہ ہمارے شعبہ کے دوسرے ظل حسین و ڈاکٹر ایف الف نصیر اور ڈاکٹر رفیق حسین ڈی۔ ایس۔ ڈبلو۔ (جو اس وقت شعبۂ اردو کے صدر ہیں) شہر کے ہر رہنے کی وجہ سے تاخیر سے دیوانہ وار بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ جناب اے۔ ڈی پنت، مارکنڈے صاحب۔ جناب ظہیر کاظمی ننکر شکل۔ جناب جلا چند جوشی۔ کامریڈ جی۔ پی سنگھ۔ پروفیسر محمد رفیق۔ جناب حافظ غلام مرتضیٰ۔ جناب بائیکر وال۔ جناب ویدی۔ ڈاکٹر دیو داہر لی۔ جناب غضنفر اللہ صاحب وغیرہ وغیرہ شہر و یونیورسٹی کی اہم ہستیاں ایک گوشے میں کھڑی اپنے یاد میں افسوس سے ہاتھ مل رہے تھے۔

ل صبح تقریباً ساڑھے آٹھ اور پونے نو کے درمیان ہوا اور دس بجتے بجتے تل رکھنے کو جگہ نہ رہی ایک جم غفیر کا سامنا ——— سب ہی تو ان کے شاگرد نہ تھے سب ہی ان کے دوست و عزیز نہ تھے مگر پھر بھی اتنا مجمع کیوں ہم سب جانتے ــــ اہم وجہ یہ ہے کہ احتشام صاحب کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ جس نے ان سے ایک بار بھی ملاقات کی عجیب و غریب ہ والپس ہوا اور ہمیشہ ہمیش کے لیے اس کے دل میں احتشام صاحب کی صورت ان کا انداز بیان اور ان کی شیریں گفتگو سما جاتی

اس کا اندازہ میں نے اس وقت لگایا جب لان سے باہر نکل کر سڑک پر آیا تو اچانک تیزی سے جاتی ہوئی ایک موٹر سائیکل میرے قریب آکر رُکی اور موٹر سائیکل سوار مجمع کو دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگا ——— کیوں صاحب یہ اس قدر مجمع یہاں کیوں جمع ہے ——— ؟"

"پروفیسر احتشام حسین صاحب کا انتقال ہو گیا ہے ———" میں نے جواب دیا۔

"ارے وہی احتشام صاحب صدر شعبۂ اردو ——— "

"جی ہاں ——— جی ہاں ———" میں نے تائید کی۔

"اوہو بیچارے بہت شریف اور نیک آدمی تھے میں اُن سے ایک بار ملا ہوں ——— مٹی کب اُٹھے گی کچھ پتہ ہے آپ کو ——— ؟

"مٹی کے بارے میں میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا ان کے عزیزوں کا انتظار کیا جائے گا پھر اعلان بھی ہو گا۔"

یہ صاحب اے۔جی آفس میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔

احتشام صاحب کے گھر کے قریب ایک چائے خانہ ہے اس کا مالک اتنی بھیڑ کو دیکھ کر حیرت سے بولا "میں بھیا کو جانتا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ اتنے بڑے آدمی ہیں بہت خاموشی سے گھر سے نکلتے رکشہ کرتے اور چلے جاتے ہم لوگ کوئی اہمیت ہی نہ دیتے۔"

طوفان تھا ہوش و حواس کچھ درست ہوئے تو سب جگہ تار دیے جانے لگے دہلی جہاں احتشام صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی اقتدار حسین اور سب سے بڑے لڑکے جعفر عباس جو ایم۔اے کر کے اب ریسرچ کر رہے تھے۔ لکھنؤ میں ان کے ایک بھائی انصار حسین۔ بہنیں اور دوسرے عزیز رہتے تھے۔ ماہل ان کی جائے پیدائش جہاں سے انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔

دن کے بارہ بجے مجمع بڑھتا رہا آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا لوگ روتے رہے تڑپتے رہے مگر صرف رونا ہی ایک کام نہ تھا موت جب آتی ہے تو اپنے ساتھ الجھنوں، پریشانیوں اور کاموں کا ایک ہجوم لیکر آتی ہے سب جگہ اطلاعیں دی جانے لگیں یونیورسٹی بند کر دی گئی صرف ایک روز نہیں بلکہ مسلسل تین روز تک بقول فراق گورکھپوری "کہ میں آج سے نہیں بلکہ گذشتہ پچاس سال سے یونیورسٹی سے میرا تعلق رہا ہے اور اس طویل وقفہ کے درمیان ایک سے ایک عظیم ہستی کی موت واقع ہوئی متعدد مایۂ ناز پروفیسران و لیڈران کا انتقال ہوا ہے مگر اتنا زبردست اظہار غم میں نے کسی کا نہ دیکھا نہ تو کسی کے غم میں تین روز تک کبھی یونیورسٹی بند رہی اور نہ ہی اتنے تعزیتی جلسے ہوئے اور نہ ہی اخبارات اور رسالوں میں اتنا زبردست رنج و غم کا اظہار کیا جتنا کہ احتشام کے مرنے کے بعد ہوا۔ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے کیونکہ احتشام میرے خاص شاگردوں میں سے تھے میں ان کا استاد تھا اور استاد کی حیثیت ایک باپ کی طرح ہوتی ہے اور آج میں باپ ہو کر یتیم ہو گیا جبکہ یتیم تو اولاد ہوتی ہے ———"

چاہے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے یا خوشیوں کا انبار لگ جائے کوئی پھولوں کی سیج پر رات گزارے یا کانٹوں کے بستر پر مگر وقت کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا اگر کوئی اس کی پرواہ کرتا ہے تو وہ اسے لافانی بنا دیتا ہے اور جو اس کا مطلق خیال نہیں کرتا اور خواب خرگوش میں ڈوبا رہتا ہے تو وقت اُسے گمنامی و بدنامی کے گہرے غار میں ڈھکیل دیتا ہے بارہ سے ایک بجے اور ایک سے دو احتشام صاحب کی مٹی کا شام آٹھ بجے اٹھنے کا اعلان ہو چکا تھا عزیزوں کا انتظار بے چینی سے تھا اس درمیان ذرا فرصت سے ادھر اُدھر نظر جو دوڑائی تو اچانک شارب ردولوی۔ ڈاکٹر حکم چند نیّر۔ ہاشم رضا (ایڈیٹر قومی جنگ بام بید) اس کے علاوہ دو ایک اور ہستیاں جن کو میں پہچان نہ سکا ڈاکٹر محمود الحسن ڈاکٹر مسیح الزماں اور ڈاکٹر جعفر رضا اپنے دلوں پر غم کا ایک بوجھ لیے ان سب کا استقبال کرتے رہے۔ اب ذہن میں ایک خیال اُبھرا کہ اگر شام کو مٹی اٹھتی ہے تو لکھنؤ کے عزیز تو شامل ہو سکیں گے مگر دہلی کے اعزا کی شمولیت ممکن نہ ہو سکے گی باہم رائے زنی ہوئی اس وقت تک ماہل کے کچھ عزیز آ چکے تھے سب نے یہ طے کیا کہ بجائے شام

بجے میّت اٹھائی جائے مگر دقت یہ تھی کہ سارے شہر میں رات کا اعلان ہو چکا تھا اب ان کو دوبارہ کیسے اطلاع دی جائے سخت
تھا مگر یہ ذمہ داری میں نے سنبھالی اور دوبارہ بذریعہ لاؤڈ اسپیکر سارے شہر میں صبح میّت اٹھنے کا اعلان کرتا رہا۔ اور
مجھے کن کن واقعات اور کس طرح کے لوگوں سے دوچار ہونا پڑا اس کا تذکرہ ممکن نہیں کیونکہ ابھی تو وہ منزلیں باقی
قلم کرنے کے لیے راقم الحروف کا قلم اور ذہن و دماغ تھرا رہا ہے۔
تقریباً آٹھ بجے شب میں اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو اور واپس احتشام صاحب کے گھر پہنچا تو سوگواروں کا وہی مجمع موجود
اشتیاقانہ تنا ہوا تھا لوگ اس کے نیچے بیٹھے آپس میں احتشام صاحب کی شخصیت اور ان کے خلوص و ایثار کا تذکرہ کر رہے
مجھے کچھ نئے لوگوں کا اضافہ محسوس ہوا جن کو پہچاننے سے میں قاصر رہا اندر پہنچا تو جعفر عسکری۔ اقبال اور ارشد کو اسی
تڑپتے پایا دیگر افراد ان کے قریب بیٹھے کوئی ابا۔ کوئی بھیّا اور کوئی چچا وغیرہ سے مخاطب کر کے اپنے کرب و
بسی کا اظہار کر کے اپنے شدت غم سے۔ آہ و زاری سے دوسروں کے دلوں میں نشتر پیوست کر رہے تھے میں بھی روتا رہا
الدین پاس کھڑے تھے تسلی دینے لگے کہ ـــــ بے شک تم لوگوں کو صدمہ ہوگا تم لوگوں کی تکلیف کا اندازہ لگانا مشکل ہے
تم ہی نہیں بلکہ پورے اردو ادب کو ایک نقصان عظیم پہنچا ہے جس کی تلافی جلدی ممکن نہیں۔" میں باہر نکل آیا اور ایک گوشہ
نے مستقبل ان کی اولادوں کے مستقبل اور اردو کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا سوچتا رہا آنکھوں سے آنسو جاری رہے
بج گئے مجمع کچھ کم ہو چکا تھا میں اپنے خیالات میں غرق تھا کہ اچانک محمود صاحب کی آواز میرے کان میں گونجی۔ "لکھنؤ
گئے۔" ہم سب کی نظریں سامنے اسٹیشن والی سڑک پر دوڑ گئیں دیکھا تو ایک لاری سامنے سے چلی آ رہی ہے ابھی وہ کچھ دور
میں سے رونے اور چلّانے کی آواز سنائی دینے لگی ایسا لگا جیسے کوئی بے حد ضبط کرنے کے بعد بے پناہ درد و کرب کے ساتھ
پڑا ہو لاری قریب آ گئی اس میں سے ان کے سارے اعزا اترے جناب انصار حسین احتشام صاحب کے منجھلے بھائی اور
بیوی بچے۔ جناب اولاد اصغر صاحب۔ احتشام صاحب کی بھانجی و نیز یوسف حسین موسوی کے فرزند اس کے علاوہ کچھ اور لوگ
عجیب نالہ و فریاد کے ساتھ کہ ہم سب کے سب وہ کھڑے ہوگئے۔ بڑا دردناک منظر جس کو بیان کرنے کے لیے میری قوت
ایک ایسی تکلیف کے ساتھ چند لڑکیاں محمود صاحب سے آکر لپٹ گئیں کہ محمود صاحب خود چیخ چیخ کر رونے لگے ہم
منظر کی تاب نہ لا سکے برداشت نہ ہو سکا وہ سب کے سب اندر میت کے پاس پہنچے ایک شور اور واویلا برپا ہو گیا جس کو سنکر
کائنات لرز گئی۔
رات کافی ہو چکی تھی اور ٹھنڈک بھی تیز ہو چلی تھی رفتہ رفتہ لوگوں کی تعداد کم ہونے لگی میں بھی اپنے گھر واپس آ گیا۔ صبح
ایسی صبح جو کبھی نہ ہوتی تو بہتر تھا مگر وقت کبھی نہیں رکتا ایسا بے رحم کہ خراش کو ناسور بنا دینے والا اور ایسا رحم دل کہ
زخم کو بھر دینے والا۔ اخبار کی تلاش میں لگ گیا اور اس مشغولیت میں فرصت میں چند اخبار سرسری طور پر دیکھ سکا۔ پتر یکا اور
کے پورے پورے صفحات کالے خانوں میں موت کی خبر سے بھرے تھے پائنیر اور قومی آواز نے تو اپنا پورا اخبار ہی ان کی
نذر کر دیا تھا۔ تقریباً آٹھ بجے تک احتشام صاحب کے گھر پہنچا تو لوگوں کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی لوگ دوڑ دھوپ کر رہے
ایں ہو رہی تھیں میں نے دہلی کے اعزا کے بارے میں دریافت کیا مگر وہ لوگ ابھی تک نہ آئے تھے دس بجے میت اٹھنے کا
شدت سے انتظار تھا نو بجے تک احتشام صاحب نہلائے جا چکے تھے ان کا جسد خاکی کفن میں ملبوس تابوت میں رکھا جا چکا تھا
نو اور دس کے درمیان دہلی سے ان کے بھائی جناب اقتدار حسین اور سب سے بڑے لڑکے جعفر عباس اور ان کے ساتھ احتشام

صاحب کے ہم زلف جناب شمیم کرہانی اور ان کے صاحبزادے و دیگر اعزا تشریف لے آئے۔ افتخار حسین صاحب کے آنسو خشک تھے۔ مگر دل رو رہا تھا بس اتنا کہتے ـــــ "ہائے بھیا اتنی جلدی کیوں کی ـــ!" یہ ایسا جملہ تھا جس میں سارے درد و کرب پوشیدہ تھے۔ جعفر عباس صاحب کی عجیب کیفیت تھی کہ ایسا لگ رہا تھا ایک ایسا مرد جو سیکڑوں غموں اور تکلیفوں کو برداشت کرسکتا ہے مگر یہ غم ناقابل برداشت ہے ایک بار پھر سب پر ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی اور ایک ایسا دور پھر آگیا جبکہ سب اپنے استاد کی یاد میں اپنے باپ کی یاد میں اپنے بھائی کی یاد میں اپنے چچا کی یاد میں اپنے دوست کی یاد میں زار و قطار رو رہے تھے۔

دس بجتے بجتے تقریباً ان کے سارے اعزا آچکے تھے جنازہ اٹھنے کا وقت قریب آچکا تھا فوٹوگرافر گھیرے ہوئے تھے ہم سب لوگ آگے بڑھے ایک زبردست نالہ و فریاد کے ساتھ جنازہ اٹھا کاندھا دینے والوں کی بھیڑ ہر شخص یہ چاہتا کہ سارے کا سارا بوجھ اسی کے اوپر ہو جنازہ اندر سے باہر لایا گیا تب میں نے ایک بار پھر مجمع پر غور کیا ـــــ اُف ـــــ ایک ایسا مجمع جو میں نے اس سے پہلے کسی کی میت میں نہ دیکھا تھا۔ آدمی ہی آدمی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور ان کے درمیان احتشام صاحب کے سفر ابدی کا آغاز ہوا ایسی بھیڑ کہ اندازہ لگانا مشکل کہ کون کس حالت میں ہے اور کہاں جارہا ہے میت اٹھ چکی تھی اور برائے نماز جنازہ اس کا رُخ دولت حسین مسلم اسکول کی طرف تھا جو بالکل احتشام صاحب کے گھر کے سامنے۔ اسی بھیڑ میں میری نظر ڈاکٹر رفیق حسین پر پڑی جو چشمہ اتار اپنی گیلی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہے تھے اور کچھ لوگ انھیں سہارا دے رہے تھے۔ فوٹوگرافر ادھر ادھر ناچ رہے تھے اور بےقرار تھے۔ جنازہ اسکول میں داخل ہوا اور قبلہ کی سمت رکھ دیا گیا اس سے قبل کہ نماز جنازہ کا آغاز ہوتا احتشام صاحب کا منہ کھول دیا گیا تاکہ ان کے چاہنے والے ان کا آخری دیدار کرلیں سفید کفن میں لپٹا ہوا منہ ماتھے پر بندھی پٹی چہرے پر معصومیت کی فراوانی کہ جس کو دیکھ کر موت نے بھی شرم کے مارے اپنا منہ ڈھانپ لیا جیسے کوئی فرشتہ لیٹا ہوا اور اس پر دیکھنے والوں کا اس قدر ہجوم کہ قابو سے باہر اس کے بعد ان لوگوں کی باری آئی جو بڑی دیر سے اپنے ہاتھوں میں گلہائے عقیدت کے ہار لیے میت پر چڑھانے کے لیے بےچینی سے انتظار کر رہے تھے ایک سفید چادر جنازہ پر بچھا دی گئی۔ میں نے دیکھا کہ وائس چانسلر ڈاکٹر بابو رام سکسینہ اپنے ہاتھوں میں ہار لئے آگے آنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کو آگے کرنے میں ڈاکٹر جعفر رضا و عباس حسینی صاحب ان کی مدد کر رہے ہیں اس کے بعد جن سنگھ کے مشہور لیڈر جناب مُرلی منوہر جوشی صاحب آگے بڑھے اور جنازہ پر پھول بکھرا کر واپس چلے گئے ہندوستانی اکیڈمی کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر ستیہ دت سنہا آگے بڑھے پھولوں کے ہار چڑھا کر آخری ملاقات کی رسم ادا کی پھر مختلف لوگ آتے رہے تھوڑی دیر میں احتشام صاحب پھولوں سے لد چکے تھے۔

وہ چادر جو جنازہ پر بچھادی گئی تھی پھولوں سے بھر چکی تھی اس کو ہٹا دیا گیا اور نماز جنازہ کی تیاریاں ہونے لگیں سب سے پہلے شیعہ حضرات نے حضرت مولانا ذیشان حیدر صاحب کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی اس کے بعد سنی حضرات نے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کے زیر امامت نماز ادا کی نماز پڑھنے والوں کی تعداد کچھ اس طرح کی تھی کہ پورا میدان لبریز تھا لوگ بے انتہا عقیدت اور جذبات کے ساتھ نماز جنازہ ادا کر رہے تھے۔

ـــــــــــ ایک بات اور میں عقیدت اور جذبے کے سلسلے میں کہنا چاہوں گا کچھ طلبا و دیگر اشخاص تو اس قدر خلوص اور جذبے میں تھے کہ جذبات فراوانی میں غرق تھے ہو کر انھوں نے دونوں نمازیں ادا کیں میں نے خود دونوں نمازیں پوری طرح سے اور اطمینان کے ساتھ ادا کیں۔ فوٹوگرافر بے کسی موقعے کو بھی ہاتھ سے کھونے نہیں دے رہے تھے۔

جنازہ پھر اٹھایا گیا اور اب اس کا رُخ کربلا کے قبرستان کی طرف تھا خلد آباد سے گذرتا ہوا جنازہ آگے کی طرف بڑھا مجمع کا یہ عالم

لوآگے بڑھکر رکشے۔ تانگے اور موٹر والوں کو روکنا پڑا تاکہ دشواری نہ پیش آئے۔ کچھ رکشے و تانگے بغیر روکے ہی اتنی
لِ دیکھ کر اپنے آپ رک جاتے۔ ہر رہ گذر ہر دوکاندار حیرت سے منہ کھولے جنازہ کو اور اس کی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک
، کانوں سے متعدد لوگوں کو یہ کہتے سُنا ——— "کس کی مٹی ہے بھیا اتنی بھیڑ تو ہم کبھی نہیں دیکھا۔" اور یہ سچ تھا کہ میں نے خود
، مٹی میں نہ دیکھا تھا طلبا لپک لپک کر کندھا دینے کے لیے بیتاب تھے جنازہ نہایت آہستہ آہستہ قبرستان کی طرف گامزن
یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑ رہے تھے جتنی بھی سست رفتاری کے ساتھ لے جایا جاتا مگر آخر یہ سفر تو ختم ہونا ہی تھا اور ٹھیک
لوگ کربلا کے قبرستان میں تھے۔ سارا قبرستان بھرا ہوا تھا۔ جنازہ کو قبر کے پاس لاکر رکھ دیا گیا۔ قبر کو اس طرح لوگوں نے گھیر لیا
شکل ہو رہا تھا رفتہ رفتہ ساری رسومات ادا کی جانے لگیں اور میت قبر میں اتار دی گئی ایک بار پھر منہ کھول دیا گیا ———
ماں تک بیان کروں بس اتنا سمجھ لیجئے کہ آنسوؤں کی یہ حالت تھی، درد کا یہ عالم تھا، تکلیف کی یہ کیفیت تھی کہ جدھر نظر
ا نظر آ رہا تھا اور چند لمحے بعد ہمارے شفیق استاد ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیش کے لیے روپوش ہوگئے۔ جعفر عباس
لیا گیا تاکہ آکر وہ مٹھی دیں وہ قریب آئے اور اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کے اوپر مٹی ڈالنے لگے جس نے ہمیشہ اپنی اولادوں
ح پالا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ مٹی پڑتی گئی اسی وقت احتشام صاحب کے چھوٹے بھائی سید وجاہت حسین اور ان کے
ے جعفر مہدی صاحب شاہ گنج سے آئے۔ مگر احتشام صاحب ہم سب سے بہت دور ہو چکے تھے۔ ان کا بدن منوں مٹی کے نیچے
نے میں ہم کو اطلاع ملی کہ اسی قبرستان میں حضرت مولانا ذیشان حیدر ایک تعزیتی مجلس کو خطاب کریں گے سب اکٹھا ہوگئے
نی تقریر شروع کی زبردست تقریر دل کو چیر دینے والی۔ کلیجہ پھاڑ دینے والی کیا ہندو۔ کیا مسلمان۔ کیا شیعہ۔ کیا سنی سب تھرا
مجلس ختم ہوئی بس میں بھی اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

ع احتشام صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں سنتے ہیں کہ وقت جیسے جیسے گذرتا جاتا ہے غم دور ہوتا جاتا ہے ویسے تو یہ دنیا
ے لبریز ہے مگر کچھ غم ذہن کو کرب و اذیت اور بے بسی۔ بے کسی کی اس شدت پر پہنچا دیتے ہیں کہ جس کے زخموں کو وقت کے
ے لمحات بھی مندمل نہیں کرسکتے۔

——— اور آج احتشام صاحب کو سپرد خاک ہوئے دس مہینے ہو رہے ہیں مگر آج بھی اس کا غم تازہ ہے اور ہمیشہ تازہ
ان کی موت سے اردو ادب کو ایک زبردست نقصان پہنچا ہے وہیں پر وہ زندگیاں جو ان سے وابستہ تھیں انھیں موت
۔

ذوقِ ادب اور شعور

صفحہ ۱۱۲ : حقیقت نگاری کی مختلف تعبیریں پیش کی گئی ہیں جن سے مختلف اور بعض اوقات متضاد نتائج برآمد ہوتے ہیں اس لیے اس حقیقت پسندی کو جو مادّی تصور تاریخ سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرح کی حقیقت نگاریوں سے الگ اور ممتاز کرنے کے لیے اشتراکی یا سماجی کی تحدید ضروری قرار پائی اس انداز نظر یا اصول کا مطالبہ یہ ہے کہ فن کار کو حقیقت کا ادراک اس طرح کرنا چاہئے کہ حقیقت اپنی ارتقائی اور انقلابی شکل میں تمام تاریخی اور مادی پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس کے فن میں متشکل ہو۔ اس کی یہ کاوش انفعالی نہیں ہوسکتی بلکہ لامحالہ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ عوام کے شعور میں اس فن کے مطالعہ سے ایسا تغیر پیدا ہو جو اشتراکیت کی سچائی خوبی اور برتری کے تصورات کو راسخ کرے۔ یہ ظاہر یہ ایک سیدھی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جب کوئی ادیب یا نقاد اسے تسلیم کرے گا تو اُسے ہر حقیقت کی نوعیت، ماہیت اور سماجی اہمیت کا اندازہ کرنا ہوگا سماج کے تشکیلی عناصر کو دیکھنا ہوگا اور واقعات کی بنیادوں کو سمجھنا ہوگا اسی وقت وہ یہ جان سکے گا کہ کون سے حقائق زندگی کو کس جانب لے جا رہے ہیں اور لے جا سکتے ہیں ہر لحظہ بدلتی ہوئی اور متحرک دنیا میں حقائق کی اصل نوعیت کا گرفت میں لانا آسان نہیں وہی فن کار یا ادیب اس سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوسکتا ہے جو جدلیاتی نقطہ نظر رکھتا ہے اور حقائق کے سمجھنے میں اس سے کام لیا ہے۔"

حیف نقادِ اعظم اُردو زباں اُٹھ گیا

۱۹۷۲ء

(خیالؔ ماہلی)

فکر و فن

روش روش چمن چمن

رعنائی خیالِ جہاں ماننا پڑا
رازِ حیاتِ فکرِ جواں ماننا پڑا
میخانۂ ادب کو سنوارا کچھ اس طرح
اہلِ قلم کو پیرِ مغاں ماننا پڑا

اعجاز خورشید کاشمیری

عبد القوی دسنوی

احتشام صاحب کے دیباچے

انسانی جسم میں جس طرح چہرے اس کے اندر کے چھپے ہوئے جذبات احساسات، افکار کی غمازی کرتے ہیں اسی طرح کتابوں کے دیباچے کتاب کے بارے میں، اس کے مصنف کے بارے میں، ادب سے متعلق، ملک اور بیرون ملک مختلف قسم کی لہروں کے بارے میں جو مختلف وقتوں میں اٹھتی رہتی ہیں اور جن سے ادب متاثر ہوتا رہتا ہے، رہنمائی کرتے ہیں۔

عام طور سے مصنف اس میں موضوع سے متعلق، مواد کی فراہمی سے لیکر، کتابت، طباعت، اشاعت کی دشواریوں اور مشکلات کا اظہار کرتا ہے، معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہے چاہے وہ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ہوں یا مواد کی فراہمی کے سلسلے میں،

البتہ ایک بات کا دیباچہ نگار خاص خیال رکھتا ہے کہ دیباچہ طویل نہ ہو اس لیے کہ اس کے اختصار میں حسن بھی ہے، جاذبیت بھی اور افادیت بھی، اس لیے دیباچہ نگار کوشش کرتا ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں، کتاب کے بارے میں، کتاب کے موضوع کے بارے میں اپنے بارے میں قاری کو اتنا بتادے کہ وہ مطالعہ شروع کرنے سے پہلے جان جائے کہ وہ کس قسم کی کتاب پڑھنے جارہا ہے۔

احتشام صاحب کے دیباچے عام طور سے ان باتوں کو پورا کرتے ہیں ان کے دیباچے مختصر بھی ہوتے ہیں اور مفید بھی، ان سے کتاب کے بارے میں، نظریات کے بارے میں، تنقیدی شعور کے بارے میں معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کیا سوچتا ہے؟ کیا کہتا ہے؟ کیوں کہتا ہے؟ اس میں اُن کی مسکراہٹ جھلکتی ہے۔ جھنجھلاہٹ ٹپکتی ہے اس میں ان کے حوصلے اور عزائم کا اندازہ ہوتا ہے بعض کاموں کی طرف اشارے ملتے ہیں اور کچھ کام نہ کرنے کے افسوس کا احساس بھی ہوتا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کے علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین کے آٹھ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جن میں دیباچے کے علاوہ ۱۲۶ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہ مضامین فن تنقید، ناول، افسانہ، ڈرامہ، تاریخ ادب، لسانیات اور شخصیات سے متعلق ہیں "افکار و مسائل" میں دیباچہ کی جگہ معروضات تحریر کیا ہے اور "اعتبار نظر میں" چند سوالات کے جواب کو "مقدمہ کے طور پر" شائع کیا گیا ہے۔

؎ میں نے انھیں آٹھ مجموعوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

(۱) تنقیدی جائزے ۱۹۴۴ء
(۲) روایت اور بغاوت ۱۹۴۸ء
(۳) ادب اور سماج اکتوبر ۱۹۴۹ء
(۴) تنقید اور عملی تنقید ۱۹۵۲ء
(۵) ذوق ادب اور شعور ۱۹۵۵ء
(۶) عکس اور آئینے اکتوبر ۱۹۶۳ء
(۷) افکار و مسائل اپریل ۱۹۶۳ء
(۸) اعتبار نظر ۱۹۶۵ء

ان دیباچوں کے مطالعے سے نہ صرف ان کی تصانیف، مضامین، نظریات، افکار، خیالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ ان تصانیف کے منظر عام پر آنے کا سبب بنے ہیں بلکہ بہت سے ایسے جذبات اور احساسات بھی ہمارے قلب کو متاثر کرتے ہیں جو عام طور سے محسوس نہیں کیے جا سکتے، ان کے مطالعہ سے تقریباً بیس سال کے پھیلے ہوئے زمانہ (۱۹۴۴ء سے ۱۹۶۵ء) کے تجربات اور ذہنی تبدیلیوں اور ترقیوں کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ان دیباچوں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ احتشام کے اوراق منتشر پڑے ہیں۔

ادب کیا ہے، ماضی میں اسے کیا سمجھا جاتا تھا، اس دور میں لوگ اسے کیا سمجھتے تھے، جہاں تہاں انھوں نے پر واضح الفاظ میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جن سے ادب اور اس کی ماہیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے انھوں نے بلوے میں صاف الفاظ میں کہا ہے:

"۔۔۔ ان مضامین کا مصنف غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ ادب مقصد نہیں ذریعہ ہے ساکن نہیں متحرک ہے، جامد نہیں تغیر پذیر ہے اسے تنقید کے چند مقررہ، فرسودہ اصولوں اور نظریوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ ہی کام آ سکتا ہے جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو"[۱]

"ان مضامین میں ایک حکیمانہ شعور کو رہنما بنانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں"[۲]

یہ ۱۹۴۴ء کا زمانہ ہے ادب سے متعلق مختلف نظریات یا خیالات جنم لے رہے ہیں۔ ہر فرد ادب سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار برملا کر رہا ہے۔ چنانچہ احتشام صاحب تحریر کرتے ہیں:

"آج کل ادب تعبیروں کی کثرت سے خواب پریشاں بن رہا ہے غور و فکر کا زمانہ ہے، آزادیٔ رائے کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ علوم و فنون چند لوگوں کی ملک سمجھے جاتے تھے، اب اس اجارہ داری کا دور ختم ہو رہا ہے اور ہر شخص جو سوجھ بوجھ رکھتا ہے شعر و ادب کے متعلق کچھ خیالات پیش کرنا چاہتا ہے"[۳]

چنانچہ لکھتے ہیں:-

"بعض لوگوں کے لیے ادب روحانی، الہامی اور مابعد الطبیعاتی ہے بعض کے لیے مادّی۔ بعض ادب کی قدروں کو ناقابل تغیر مانتے ہیں بعض تغیر پذیر، بعض لفظوں کو سب کچھ سمجھتے ہیں، بعض خیالات کو الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں"[۴]

لیکن احتشام صاحب کو اس کا افسوس تھا کہ نظریوں کی اس جنگ میں غیر علمی انداز اختیار کیا گیا:

"پرانے ادیب سب اسی بات پر متفق ہیں کہ کسی عہد میں شعر و ادب کے متعلق جتنے نظریے

---

[۱] [۲] تنقیدی جائزے ص ۱۰ ۔ [۳] [۴] تنقیدی جائزے ص ۹

نہیں پیش کیے گئے اصول اور بے اصولی، ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی، مقصدیت اور لذت اندوزی کے تصورات میں جنگ چھڑی ہوئی ہے افسوس یہ ہے کہ یہ جنگ عالمانہ اور فلسفیانہ انداز سے ہٹ کر بعض حالتوں میں بالکل غیر علمی اور جذباتی بن گئی ہے۔[۱]"

اس وقت کے بعض لوگوں نے تنقید ادب کے نظریہ کو، یورپ، امریکہ اور روس سے مستعار کہا تھا اس کا جواب احتشام صاحب نے اس طرح دیا ہے:

"۔ ۔ ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تنقید ادب کے جدید نظریے یورپ امریکہ اور روس سے مستعار ہیں۔ ان کے ذریعہ سے اردو یا مشرقی ادبیات کو سمجھنے کی کوشش صحیح نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اگر معترضین نے اس مجموعہ کو خلوص سے پڑھا تو وہ یہ ضرور مانیں گے کہ ادب مخصوص خارجی حالات کا مظہر ہوتا ہے یہ بات ساری دنیا کے ادب میں مشترک ہے اس لیے اگر خارجی حالات کا مطالعہ عالمانہ شعور کے ساتھ کسی خاص اصول کو مدنظر رکھ کر کیا جائے تو پھر نقالی کی بحث باقی ہی نہیں رہ جاتی۔[۲]"

جب ۱۹۴۸ء میں اپنے تیسرے مضامین کا مجموعہ "ادب اور سماج" کا دیباچہ لکھا تو اس میں انھوں نے واضح طور سے اس کا اظہار کیا کہ وہ جن نظریات کے حامل ہیں ان کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے:

"ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں جو سماجی حقائق کو ان کے اصلی روپ میں پیش کر کے زندگی کے مختلف خارجی اور داخلی رشتوں کو واضح کر رہے ہیں وہ لوگ بھی جو اپنی کشتی ساحل ہی سے لگا کر چلانے کے عادی تھے ٹھوکریں کھا کر منجدھار میں بہہ نکلے ہیں۔ جو ادیب سیاست اور ادب کے رشتہ کو ایک ناجائز تعلق سمجھتے تھے آج وہی بڑے ناجائز اور بھونڈے طریقہ سے دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رہے ہیں اور محاذ بدل بدل کر ترقی پسند عناصر پر حملہ کر رہے ہیں۔ ادب برائے ادب اور ادیب کی مکمل داخلی آزادی کا نشان اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا ہے اس لیے اب کچھ خود اپنے اصول تنقید کے واضح کرنے کی زیادہ ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ کام اچھے برے طریقے پر دوسرے کر رہے ہیں۔[۳]"

یہ سچ ہے کہ احتشام صاحب نے افسانے بھی لکھے، ڈرامے بھی اور مختصر مضامین بھی۔ انھیں شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رہی، انھوں نے "تاریخ ادب اردو" کے اوراق بھی سمیٹے اور ترتیب دینے کی کوشش کی، لسانیات سے بھی گہرے شغف کا اظہار کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کا اصلی میدان تنقید تھا۔ وہ صاف ستھرے اور واضح خیالات رکھتے تھے اور صحت مند تنقیدی شعور۔ اسی لیے وہ افراط و تفریط کے کبھی شکار نہیں ہوئے بلکہ اس کی مدد سے صداقت کو پانے کی کوشش کی۔ یہ کام بہت مشکل ہے جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

---

[۱] تنقیدی جائزے۔ ص ۹ [۲] تنقیدی جائزے ص ۱۱ [۳] ادب اور سماج ص ۸

"تنقید نگاری کی حیثیتوں سے سب سے مشکل اور ذمہ دارانہ صنفِ ادب ہے لیکن بعض اوقات اس ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہوتا اس میں نقاد کی محدود نگاہی اور جذباتی کمزوری کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اس لیے میں کبھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ یہ مضامین حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم جہاں تک ہو سکتا ہے میں دیانتدار رہنے کی کوشش کرتا ہوں[1]"

———— یہی دیانتداری تنقید نگاری کا جوہر ہے لیکن جب لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ نئے ادیبوں کا پر جو رائے دیتے ہیں وہ اس میں جانبداری سے کام لیتے ہیں تو وہ صاف طور سے کہتے ہیں کہ تعارف اور تنقید میں بڑا فرق ہے۔ انھوں نے نئے لکھنے والوں کے لیے جن رایوں کا اظہار کیا ہے اس کا مقصد محض ہمت افزائی ہوتی ہے:

"بدقسمتی سے لوگ بعض نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف پر (زیادہ تر پہلی ہی تصنیفوں پر) ہمت افزا تعارفی خیالات اور چند جملوں میں لکھے ہوئے تبصروں کو تنقید کا مرتبہ دے کر یا تو دوست نوازی اور جانبداری کا الزام لگاتے ہیں یا سطحیت کا۔ لیکن انھیں اس کا اندازہ ہونا ہی چاہیے کہ تنقید اور تعارف یا پیش لفظ میں بڑا فرق ہوتا ہے[2]"

ان کے یہ خیالات کہ

"نقاد ایک لحاظ سے عام پڑھنے والوں اور مصنفوں کے درمیان رابطہ کا کام دیتا ہے[3]"

اور "..... خود ادبی تنقید بھی ایسی ہی ایک کوشش ہے جس کے ذریعہ سے شعر و ادب کے صحیح مفہوم، عملی تخلیق اور مقصد اظہار کو سمجھنے کی طرف قدم اٹھایا جاتا ہے[4]"

ادبی تنقید اور ناقد کو سمجھنے میں بہت مفید ہوں گے۔ ناقد کے سلسلے میں ان کا یہ خیال بھی بہت درست ہے۔

"..... گو میں نے اپنے پہلے مجموعے میں اپنا نقطہ نظر بتلانے کی کوشش کی ہے لیکن اب سوچتا ہوں تو یہ بات بہت زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی نقاد اپنا اصول پہلے بیان کر دے اور چاہے وہ اپنے مضامین میں اس کی پابندی کر سکا ہو یا نہ کر سکا ہو لیکن دوسروں کی رائے کو مضامین کے مطالعہ سے قبل ہی متاثر کر دے۔ اگر کوئی اصولِ تنقید اس کی تحریروں سے مترتب ہوتا ہے تو اسے ذہین پڑھنے والے کے سامنے خود آنا چاہیے۔ لکھنے والے کا بتانا ضروری نہیں[5]۔"

احتشام صاحب کے مضامین اور کتابیں جب منظرِ عام پر آنے لگیں تو لوگوں نے ان کے خلاف اور موافق رایوں کا اظہار شروع کر دیا۔ ان دیباچوں میں ان کا ذکر کہیں سرسری اور کہیں تفصیلی ملتا ہے اور احتشام صاحب کے ذہن پر کس قسم کے چھوڑتے تھے ان کے عکس بھی ملتے ہیں۔ وہ کبھی سمجھانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کبھی رایوں کے اختلاف پر متحیر اور پریشان ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب عزیز احمد صاحب نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" شائع کیا تو انھوں نے احتشام صاحب کے مضامین

---

[1] [2] تنقید اور عملی تنقید ص۱۰ [3] تنقید اور عملی تنقید ص۷ [4] افکار و مسائل ص۸ [5] روایت اور بغاوت ص۱۰۰۔

کرتے ہوئے کہا کہ وہ "قدروں کی انسانیت" پر زور نہیں دیتے۔ احتشام صاحب اس کا حیرت سے جواب دیتے ہیں:

"...... جو شخص بھی میرے مضامین پڑھے گا اسے خود اندازہ ہوگا کہ میں انسانوں کی فلاح و بہبود اور اقتصادی انصاف کا ذکر کس شدت اور خلوص کے ساتھ کرتا ہوں اور شاید ہی میرا کوئی مضمون ایسا ہو جس میں ان کا تذکرہ کسی نہ کسی پہلو سے نہ آتا ہو یہ اور بات ہے کہ میرے یہاں "انسان کی فلاح و بہبود" اور "اقتصادی انصاف" کا مفہوم اس سے مختلف ہو جو عزیز احمد سمجھتے ہیں[1]:

بعض اعتراضات کے سلسلے میں انھوں نے اس طرح کے بھی اشارے کیے ہیں:

"ادھر تین چار سال کے اندر بعض حضرات نے میری تنقید نگاری کی جانب خاص طور سے توجہ کی ہے سنجیدہ اور غیر سنجیدہ رایوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ ان رایوں میں اتنا تضاد ہے کہ میں خود کوئی نتیجہ نکالنے سے معذور ہوں۔ رائے دینے والوں میں بعض حضرات ایسے ہیں جن کی میرے دل میں عزت ہے اور بعض ایسے ہیں جنھوں نے میری تحریریں پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ مگر رائے دینا ضروری سمجھا[2]"

احتشام صاحب کے بارے میں مختلف حضرات نے مختلف قسم کے اور عجیب عجیب خیالات کا اظہار کیا کہ وہ خود متحیر تھے کہ اپنے متعلق کس طرح کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں:

"اپنے متعلق صرف دوسروں کی تنقیدوں سے متاثر ہو کر کسی نتیجہ پر کس طرح پہونچ سکتا ہوں؟ یہ سوال تمام نقادوں سے کرنا چاہتا ہوں کئی حضرات نے لکھا ہے کہ احتشام حسین کی تحریر اتنی مدلل اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے کہ ان سے اتفاق نہ بھی ہو لیکن ان کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ احتشام کی تحریریں الجھی ہوئی ہوتی ہیں کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں ایک صاحب نے لکھا کہ وہ نقاد تو کہیں سے نہیں ہیں ہاں مورخ ضرور ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ نے یہ پتہ لگایا کہ ان پر روسی ادب کا اتنا اثر ہے کہ ان کے یہاں اس کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں (چنانچہ اس کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے میرے ایک مضمون کا نام بھی رکھ دیا "روسی ادب میں ترقی پسندی" حالانکہ میں نے اب تک روسی ادب کے متعلق کوئی مضمون نہیں لکھا ہے اور اپنے نکتہ چینوں کو باور کرانا چاہتا ہوں کہ بدقسمتی سے میں نے روسی ادب کا مطالعہ بھی بہت کم کیا ہے) ایک نقاد نے لکھا ہے کہ احتشام حسین کی نگاہ صرف ایک نقطہ نظر کی پابند ہو گئی ہے اس لیے وہ ادب کا پورا جلوہ نہیں دیکھتے ایک دوسرے نقاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ ہر پہلو پر نگاہ رکھتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ مطالعہ وسیع اور نظر گہری ہے کسی کو گہرائی کی کمی نظر آتی ہے، کسی نے لکھا ہے کہ تحریر جاندار ہے کسی کا خیال ہے کہ انداز بیان روکھا پھیکا ہے[3]"

---

[1] روایت اور بغاوت ص[illegible] [2] ادب اور سماج ص[illegible] [3] ادب اور سماج ص[illegible]

مختلف قسم کے ادیبوں اور تبصروں کا کسی قسم کا اثر احتشام صاحب قبول کرتے تھے اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے جس سے ان کو سمجھنے اور ان کی عظمت کا اقرار کرنے میں آسانی ہوتی ہے:

"...... میں یا تو بے حس ہوں یا پھر اپنے جذبات پر کسی قدر قابو رکھتا ہوں کیونکہ دوسرے لوگوں کی تعریفیں مجھے بہت زیادہ مدہوش بناتی ہیں اور نکتہ چینیاں اور عیب جوئیاں مجھے بہت زیادہ تکلیف پہونچاتی ہیں۔ میں تمام رایوں کو غور سے پڑھتا ہوں ان کی روشنی میں اپنی تنقید خود کرتا ہوں اور اندر ہی اندر مجھ میں وہ تبدیلی ہو جاتی ہے جسے قبول کرتے ہوئے میرا ضمیر جھجک محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اتنا ضرور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ تنقید کے بنیادی نظریات کے متعلق میرے وہ خیالات اور پختہ ہو گئے ہیں جو میں آج سے کئی سال پہلے رکھتا تھا۔"[۱]

عملی تنقید کے سلسلے میں خلیل الرب صاحب نے اپنی کتاب "مبادیات تنقید" میں تحریر کیا کہ اس کا مفہوم واضح نہیں ہے تو احتشام صاحب کو حیرت ہوئی:

"....... میرا خیال ہے کہ میرے یہاں اس لفظ کا استعمال ڈاکٹر رچرڈس کے یہاں پریکٹیکل کے لفظ سے مختلف ہے اور اسی چیز نے انھیں الجھن میں ڈالا ہے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ میں صرف ادب پاروں کے لفظی و معنوی تجزیہ اور ادبی تشریح کو عملی تنقید نہیں کہتا بلکہ سارے تنقیدی عمل کو، جو کسی تنقیدی نقطۂ نظر کے ماتحت ہو عملی تنقید کہتا ہوں۔"[۲]

عبدالمغنی صاحب نے احتشام صاحب کی تنقید نگاری کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اس سلسلے میں انھوں[۳] نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ قابل قدر ہے جس سے ان کی وسیع النظری، بلند فکری، انصاف پسندی اور شریفانہ انداز کا اظہار ہوتا ہے دوسروں کے لئے ان کے یہ خیالات قابل تقلید ہیں:

حال میں ایک نسبتاً نئے ادیب عبدالمغنی صاحب کا ایک مضمون میری تنقیدی کاوشوں کے متعلق رسالہ ادیب علی گڑھ میں شائع ہوا ہے۔ شدید اختلافات کے باوجود مجھے یہ مضمون بہت پسند آیا کیونکہ اس سے کم سے کم میری ایک خواہش پوری ہوتی ہے میں چاہتا ہوں کہ مجھ پر سخت سے سخت اعتراضات کیے جائیں لیکن اعتراض کرنے والے نے میری تحریریں غور سے پڑھی ہوں۔ میں عظمت کا مدعی نہیں ہوں۔ اپنے نقطۂ نظر کو حرف آخر نہیں سمجھتا یہی نہیں بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جتنا سمجھتا ہوں اسے اچھی طرح پیش کرنے میں بھی ناکام رہتا ہوں۔ میں اس امید میں نہیں لکھتا کہ تمام پڑھنے والے میرے ہم خیال ہو جائیں گے بلکہ محض یہ مقصد ہوتا ہے کہ شاید ان خیالات سے غور و فکر کے اور دروازے کھلیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر مجھے اس لیے تسکین ہوئی کہ اس کے لکھنے والے نے ہمدردانہ میرے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور جہاں اس کے ذہن اور عقیدے نے اتفاق کی گنجائش نہیں پائی وہاں اختلاف کیا ہے۔"[۴]

۱؎ ادیب اور سماج ص۹۰ ۲؎ تنقید اور عملی تنقید ص۹ ۳؎ احتشام صاحب ۴؎ تنقید اور عملی تنقید ص۱۱

سب سے زیادہ مفصل اور کڑی تنقید کلیم الدین احمد صاحب نے کی تھی جس کے بارے میں احتشام صاحب لکھتے ہیں:

"میری تنقیدات پر سب سے زیادہ مفصل تنقید پروفیسر کلیم الدین احمد کی ہے اپنے طنزیہ اور تحقیر آمیز انداز کی وجہ سے وہ بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ کلیم الدین احمد صاحب نے جو کچھ میری تنقیدوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

—— میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مارکس کا عطیہ ہے۔ میرے پاس خود کچھ کہنے کو نہیں ہے۔

—— میں اپنا ذکر خود بہت کرتا ہوں اور خود نمائی سے کام لیتا ہوں۔

—— فرائڈ کی مبادیات سے بھی واقف نہیں ہوں۔

—— اخلاق کے معنی سے اسی طرح نابلد ہوں جیسے مولانا حالی۔

—— بات سلجھا کے نہیں الجھا کے کہتا ہوں، باتوں میں تضاد ہوتا ہے اور اسلوب میں بھی کوئی رنگینی نہیں ہے[1]"

اس سلسلے میں احتشام صاحب کا جواب ملاحظہ کیجئے:

(۱) "مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اگر یہ سارے الزامات صحیح ہیں اور میری تحریروں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے تو مجھے لکھنا چھوڑ کر کوئی اور کام سنبھالنا چاہئے۔"

(۲) "لیکن جب انسان کی ساری کتابیں اور سارے مضامین کچھ سیکھنے، سمجھنے اور اپنی اصلاح کرنے کے لیے بار بار پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم دونوں کی تخلیق بالکل دو طرح ہوئی ہے۔ اور ہم کبھی ایک دوسرے سے ادبی مسائل کے متعلق متفق نہیں ہو سکیں گے۔"

(۳) "کچھ تسکین اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ جس کی کسوٹی پر میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، مومنؔ اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ، فراقؔ، آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، مجنوںؔ، سرورؔ سب ناقص ٹھہرتے ہیں ممکن ہے کہ کسوٹی ہی میں کوئی خرابی ہو اور اس نے لکھنے والے کے مافی الضمیر کو سمجھنے ہی کی کوشش نہ کی ہو یا نفسیاتی طور سے وہ ایک ایسی شخصیت رکھتا ہو جو متوازن اور صحت مند نہیں ہے بلکہ احساس برتری یا کمتری نے اسے مریض بنا دیا ہے اس لیے خاص طور سے ان الزامات یا اعتراضات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی[2]"

احتشام حسین صاحب کو اس کا بھی شدید احساس تھا کہ وہ کوئی مبسوط کتاب نہ لکھ سکے، تنقیدی مضامین کتابوں کا بدل نہیں ہے لیکن وقت کی کمی اور مختلف الجھنوں اور دشواریوں نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا:

"ادب اور تنقید پر مبسوط اور مفصل کتاب لکھنے کے بجائے محض مختصر اور طویل مضامین لکھتے رہنا۔ چاہے وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں کسی مستقل علمی کارنامے کی حیثیت نہیں رکھتا[3]"

"بار بار یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ ایسے مختصر مضامین تنقید پر مبسوط تصانیف کا بدل نہیں

---

[1] تنقید اور عملی تنقید ص۱۰ [2] تنقید اور عملی تنقید ص۵

قرار دیئے جا سکتے۔ یہ تو صرف مسائل کو چھیڑتے اور ذوق کی تشنگی کو بڑھاتے ہیں۔ یہ ان موضوعات کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں جن کی جھلک یہاں دکھائی دیتی ہے۔ ان میں کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا ہے کہ یہ موضوع زیر بحث کے تمام پہلوؤں یا کسی ایک پہلو کے لیے حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی یہ بہت سے اہم مسائل نقد کے لیے اشاریہ کا کام دیتے ہیں اور بہت سے ایسے گوشوں کو نمایاں کرتے ہیں جن پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہی جواز ہے انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں ترتیب دینے اور شائع کرنے کا۔[1]

لکھ چکا ہوں کہ احتشام صاحب کے مختلف مضامین کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں انھوں نے دو کتاب "ذوق ادب او[ر شعور" ا]ور عکس اور آئینے" کے نام سے متعلق دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ باقی چھ کتاب کے نام ایسے نہیں ہیں جن کے سمجھنے میں د[قت] تھی اسی لیے ان سے متعلق روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ذوق ادب اور شعور

"میرے تنقیدی اور ادبی مضامین کا پانچواں مجموعہ "ذوق ادب اور شعور" آپ کے پیش نظر ہے چند الفاظ عنوان کتاب کے متعلق کہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ نام تنقید ایک بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ کرتا ہے جس پر ایک علاحدہ مضمون کی ضرورت تھی لیکن جو اس مجموعہ میں شامل نہ کیا جا سکا میرا خیال ہے کہ تنقید کتنی ہی انفرادی اور تاثراتی کیوں نہ ہو تربیت ذوق میں ضرور معین ہوتی ہے اس سے محض تاثر کی ترسیل نہیں ہوتی پڑھنے والے کے علم اور شعور میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بات نہایت خاموشی سے بتدریج بھی پیدا کی جا سکتی ہے اور علمی انداز میں دلائل و براہین کو ٹکرا کر بھی، نتیجہ دونوں صورتوں میں یہی ہوتا ہے کہ تنقید نگار جارحانہ طور پر اپنا نقطہ نظر مسلط کیے بغیر ادب اور اس کا مطالعہ کرنے والوں کے درمیان ایک کڑی بن جاتا ہے۔ اس لیے تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں سے بحث ادب کی ایک اہم خدمت بھی ہے اور ادب کا ایک ناگزیر جز بھی۔ جو مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں یہ فرض انجام دیتے ہیں۔ اگر یہ خیال نہ ہوتا تو انہیں شائع ہی نہ کیا جاتا۔"[1]

"عکس اور آئینے" کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اس مجموعہ کا نام تجویز کرتے وقت میرے ذہن میں یہ خیال بار بار ابھرا کہ تنقید اور ادب میں ایک رشتہ وہ بھی ہو سکتا ہے جو آئینہ اور اس کے عکس میں ہے اگر آئینہ اچھا ہے تو اس میں عکس بھی صحیح دکھائی دے گا یعنی اگر تنقید کے اصول اور نظریات معقول اور مدلل اور قابل اعتبار ہیں تو تصنیف یا مصنف کی پرکھ میں بھی اعتدال کی صورت پیدا ہو سکتی ہے میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ یہ تنقید کا محض ایک پہلو ہے اور آئینے اور عکس کی تمثیل مکمل طور پر تنقید اور ادب کے تعلق کو مکمل طور سے ظاہر نہیں کرتی تاہم میرے خیال میں ایک اشاریہ کا ضرور کام دے سکتی ہے۔"[2]

---

[1] ذوق ادب اور شعور ص[illegible]   [2] عکس اور آئینے ص[illegible]

ان دیباچوں میں بعض ان کتابوں کا ذکر بھی ملتا ہے جنھیں لکھنے کا احتشام صاحب کا ارادہ تھا۔ کاش حالات موافق پیدا ہو جاتے کہ یہ کتابیں اردو ادب میں اضافہ ہو سکتیں، ۱۹۵۳ء میں اپنی کتاب روایت اور بغاوت میں لکھتے ہیں :

"ادبی تنقید (اب اس کا نام "ادبی تنقید کے مسائل" ہے) ایک مکمل کتاب کا خاکہ ہے۔"[1]

"دوسری کتاب "اردو ادب کا تہذیبی پس منظر" ہندوستانی اکیڈمی یوپی کے لیے لکھی جا رہی ہے۔"[2]

آج آزاد ہندوستان میں اکثر قومی یک جہتی کے سلسلے میں آوازیں بلند ہوتی ہیں اکثر سیاسی پارٹیاں اس نعرے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں لیکن قومی یک جہتی کے جذبے اور احساس کو ابھارنے میں صحیح خدمت اردو نے کی ہے اس کا اظہار احتشام صاحب اس طرح کیا ہے :

"ان مضامین میں سے اکثر و بیشتر اس قومی یک جہتی کے ترجمان ہیں جس کو گویا نایاب سمجھ کر سیاست داں، ماہرین تعلیم، ادبی کارکن اور شعرا سب اپنے اپنے انداز میں ڈھونڈ رہے ہیں لیکن اردو ادب کے ادنیٰ خدمت گزاروں کی انسان دوستی جسے سیکڑوں سال سے دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی بنیادی خصوصیت یہی رہی ہے کہ اس کی تہ میں اتحاد، آزادی اور عالمگیر محبت کے جذبات ابھرتے رہے ہیں اور کبھی علامتوں اور اشاروں میں، کبھی کھل کر ان قدروں کی تلقین کرتے رہے ہیں۔"[3]

آخری مضامین کا مجموعہ "اعتبار نظر" ہے جس میں دیباچہ نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ مدیر ادب لطیف کے دس سوالات اور ان کے جوابات "دیباچہ کے طور پر" درج کیے گئے ہیں۔ اس کی اہمیت ضرور ہے لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ احتشام صاحب کے مضامین کے مجموعوں کے دیباچے ان کی تحریروں کو اور خود ان کو سمجھنے میں بہت مفید و مددگار ہیں۔

---

[1] یت اور بغاوت ص۱۷۱ [2] تنقید اور عملی تنقید ص۵ [3] افکار و مسائل ص۸

ذوقِ ادب اور شعور

صفحہ ۱۵۵: "زبان اور شاعری کا تعلق اس قدر گہرا ہے کہ اکثر اس کی طرف نگاہ بھی نہیں جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑے شاعر نے زبان کے استعمال میں اپنی شخصیت کا اظہار کیا ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی سماجی اور طبقاتی حیثیت کو نمایاں کر دیا ہے۔ الفاظ۔ محاورات اور فقرے اپنے استعمال سے استعمال کرنے والے کے سماجی روابط کا پتہ دیتے ہیں یہی نہیں بلکہ شعر و ادب کے مقصد اور نظریہ فن کا اندازہ بھی انھیں سے ہوتا ہے۔"

صفحہ ۱۸۰: "انیسویں صدی کا ہندوستان اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے لحاظ سے سترھویں اور اٹھارویں صدی کا زائدہ تھا۔ لیکن ہر زمانی تسلسل کی طرح نہ تو خالص ارتقائی نہ خط مستقیم کی طرح سیدھا۔ روایتوں کی سخت جانی تہذیبی اثرات کے اختلاط معاشی تغیرات اور سیاسی حالات نے ایسے پیچیدہ مرکب اور متضاد عناصر پیدا کر دیے تھے کہ تصورات اور اقدار کے نئے نئے حلقے بن گئے تھے۔ جو زوال پذیر معاشی حدوں کے اندر اپنے پکاری رکھتے تھے یہ ہل چل اور اضطراب بننے اور بگڑنے کی یہ جدوجہد اور کشمکش نہ بے معنی تھی اور نہ اتفاقی بلکہ اس کے اندر مرنے اور پیدا ہونے کا کرب تھا کسی سانچے میں ڈھل جانے کی بے چینی تھی بگاڑنے کا خوف اور بنانے کا احساس اور ولولہ تھا اور یہ سب کچھ صدیوں کے کھلے ہوئے ارادوں اور خوابوں مشرق و مغرب کے تصادم سے پیدا ہونے والے تاریخی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔"

اختشام احمد ندوی
دو و کمیشنو رویونیورسٹی ترپن آندھرا

احتشام و سرور، ایک تقابلی مطالعہ

زنہ سے صفات میں وضاحت پیدا ہوتی ہے اس لیے اکثر معاصر فن کاروں کے درمیان یہ تنقیدی عمل رسم چلی آتی ہے عموماً دو معاصر ازنہ پایا جاتا ہے مگر آج میں اردو کے دو صاحب طرز اسالیب بیان کے حامل ناقدوں کے درمیان تقابلی مطالعہ پیش کرنے رہا ہوں جس کا مقصد کسی کی تنقیص نہیں بلکہ دونوں کی خوبیوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ان کی فنی عظمت کو سامنے لاتا ہے۔ اسی ں طور سے میں نے اسلوب بیان کو پیش نظر رکھا ہے مگر کہیں کہیں مواد کی بحثیں بھی آگئی ہیں۔

شام صاحب پہلے ایک فضا تیار کرتے ہیں جس میں نظریات کی بارش ہوتی ہے پھر اس پس منظر میں وضاحت سے اپنی بات لیکن سرور صاحب کے یہاں نظریاتی فضا کم سے کم تر ہوتی ہے سرور و نشاط اور ادبی مسرت و بصیرت کی فضا ان کے تنقیدوں سیس کر سکتا ہے۔ احتشام صاحب کے یہاں دل کا سوز ہے مگر سرور صاحب کے یہاں محبت کا اجالا ہے۔

یقت دونوں کے فکری اور طبعی دھارے کہیں باہم ملتے ہیں اور کہیں ٹکرا جاتے ہیں دونوں کے اسالیب بیان کا اختلاف ت کا اختلاف ہے۔ اگرچہ سرور صاحب سماجی انصاف کے حامی ہیں مگر اشتراکیت کے علمبردار نہیں اور نہ اس آئینہ میں ہر جانچتے ہیں اس کے برعکس احتشام صاحب ہر ادیب کو مارکسی نقطہ نظر سے جانچتے ہیں چونکہ اسلوب شخصیت کی ترجمانی کرتا ہے ام صاحب اپنی طبیعت کے لحاظ سے سنجیدگی اور مفکرانہ انداز اختیار کرتے ہیں مگر سرور صاحب کی طبیعت میں خوش دلی و اسرہا سمی ہیں۔ ان فروق نے ان دونوں کے اسالیب بیان کو بالکل مختلف کر دیا ہے۔

ل پروفیسر کلیم الدین احمد سرور صاحب کا اسلوب زیادہ ادبی ہوتا ہے اس میں رنگینی جملوں کا حسن، الفاظ کی رعنائی اور کا خاص پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اسلوب پر شعوری طور سے توجہ مبذول کرتے ہیں وہ اشعار سے استشہاد کرتے ہیں مگر ب اشعار کم سے کم پیش کرتے ہیں۔ اب میں ذرا تفصیل سے احتشام صاحب کے اسلوب کی خوبیوں کو پیش کرتا ہوں۔

شام صاحب کے اسلوب میں ہاتھی کی "خوش فعلیاں" نہیں نظر آتیں۔ یہ محض ان پر الزام ہے۔ ان کا اسلوب محکم اور نظریاتی ہے کی تنقید میں تخلیقی اور نظریاتی ہیں وہ اپنے نظریاتی مقاصد کے بیان کے لیے ایک دلکش، پر مغز اور مدلل انداز بیان اختیار ان کے الفاظ جملوں اور پوری عبارت پر نظریات کی چھاپ ہوتی ہے ان کے نظریات ان کی عبارتوں سے اس طرح نمایاں ہوتے روں بھری راتوں میں بلکی بجلی روشنی نگاہوں کو نور و سرور سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ احتشام صاحب کے نظریات کو ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے افکار نے ان کے حکیمانہ اسلوب کو جنم دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عمدہ اسلوب میں تین خوبیاں ضروری ت و سلاست اور دلکشی، احتشام صاحب کی نثر میں الفاظ سلیس ہوتے ہیں، جملوں کی بندش چست ہوتی ہے باوجود دلائل کے

ان کے یہاں خشکی کا وجود نظر نہیں آتا۔ احتشام صاحب کے یہاں وقار اور دلکشی عبارت میں حسن الفاظ اور اصطلاحات کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔ چونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہیئت کو مواد پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، بلکہ ہمیشہ ادب میں مواد کو بنیادی اہمیت حاصل رہے گی اس نظریہ کے پیش نظر انھوں نے ہمیشہ مواد پر نظر رکھی مگر انھوں نے کبھی اپنی نثر کو ایک مخصوص و بلند معیار سے گرنے نہیں دیا۔ ان کے اسلوب بیان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اسلوب میں یکسانیت برقرار رکھی ہے ورنہ اکثر صاحب اسلوب ادبا کے یہاں کہیں ادبی مسرت زیادہ ہوتی ہے اور کہیں عبارتیں بے کیف نظر آتی ہیں۔ احتشام صاحب کا اسلوب اس عیب سے پاک ہے۔

ان کے اسلوب کو ان کی شخصیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک مغربی مفکر ایلن وارنر لکھتا ہے کہ: (ALAN WARNAR

IT IS ALMOST IMPOSSIBLE TO SEPARAT WHAT WHAT IS SAID FROM THE WAX IT IS SAID

یہ تقریباً ناممکن ہے کہ جو بیان کیا گیا ہے اس کو اس کے انداز بیان سے الگ کر کے دیکھا جائے۔

دوسرے الفاظ میں مواد کی حیثیت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ بات احتشام صاحب کے اسلوب میں خاص طور سے نمایاں ہے کہ ان کے تنقیدی نظریات، فلسفہ جدلیت، اور مادی نقطہ نظر نے ان کے اسلوب کی تشکیل کی ہے۔ ویسے مجنوں گورکھپوری، پروفیسر عبدالعلیم اور دوسرے اشتراکی ناقد ہیں مگر احتشام صاحب کی تنقیدوں میں ان کا اسلوب ایک خاص مزاج، ماحول اور اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ وہ مخصوص نظریاتی اصطلاحوں کے ذریعہ ایک تنقیدی ماحول پیدا کرتے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر احتشام حسین اردو تنقید کے دو روشن ستارے ہیں۔ ان کے یہاں جدید تنقیدی تقاضوں کا احساس ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین سے فکر و نظر کی دولت عام کی ہے یعنی تنقیدی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر دونوں نے مربوط مسلسل اور منظم انداز سے کسی ایک موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔ یہ دونوں ناقد صاحب اسلوب ہیں مگر ان کے انداز نظر میں اور اسلوب بیان میں بنیادی فرق موجود ہیں۔ پھر یہ بھی اتفاق دیکھیے کہ احتشام صاحب اور سرور صاحب مدتوں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک ساتھ رہے۔

اردو کے یہ دونوں ناقد تخلیقی صلاحیتوں سے نوازے گئے ہیں احتشام صاحب کے افسانے چھپ چکے ہیں۔ سرور صاحب کا مجموعہ کلام منظر شہود پر آچکا ہے۔ اب جہاں تک ان کی تنقیدوں کا تعلق ہے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ دونوں محض خشک تنقید پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کی تنقیدیں تخلیقی ہوتی ہیں۔ ان تنقیدوں میں تقابلی مطالعہ ہوتا ہے۔ مغربی ناقدوں کے خیالات سلیقہ اور مناسبت سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں تخلیق کی عظمت ہوتی ہے فکر کا آہنگ اور عبارتوں میں ادبی مسرت واضح ہوتی ہے اسی بنا پر اردو میں ان دونوں ناقدوں نے بغیر کسی مربوط تصنیف کے ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہے اگرچہ اس میں اس حقیقت کو بھی دخل ہے کہ اردو میں نظریاتی اور مغربی انداز کی تنقیدیں تھی ہی نہیں۔ یہ دونوں ناقد اپنی تنقیدوں کو ایک تنقیدی انشا کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے مضامین میں نہ کسی کتاب کا حوالہ ہوتا ہے اور نہ کبھی یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی مغربی ناقد کا اقتباس اس کی کس کتاب سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ان مضامین میں دو اعلیٰ درجہ کی خوبیاں پوشیدہ ہوتی ہیں یعنی شعور کو جگانے کی بصیرت اور اسلوب بیان کی دلکشی، اس لیے ان مضامین کو اردو کے تنقیدی ادب میں اہمیت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

سرور صاحب کی زبان بڑی دلکش اور مرصع ہوتی ہے اس میں رنگینی زیادہ ہوتی ہے وہ ادبی حسن و مسرت کا خاص لحاظ رکھتے ہیں وہ تشبیہ و استعارہ سے بھی موقع موقع سے کام لیتے ہیں حسین ترکیبوں اور جملوں کے ذریعہ وہ اسلوب میں ادبی لطافت کو بڑھاتے ہیں۔۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی طرح وہ ایسے حسین و دلکش جملے لکھ جاتے ہیں جو دل کو اپیل کرتے ہیں۔ سرور صاحب کے یہاں فکر کی جولانی

رتی ہے وہ کسی فن کار کے بارے میں اس کی ادبی کاوشوں کا مجموعی جائزہ لیتے ہیں جس سے قاری کے سامنے اس کے فن کا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

اس کے برعکس احتشام صاحب فن کار پر جب تبصرہ کرتے ہیں تو وہ اس کے ادبی کاموں میں اس کے نظریۂ حیات وکائنات کو پرکھنے میں اور کوشش کرتے ہیں کہ اشتراکی عناصر کو اس کے یہاں تلاش کریں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان سماجی عناصر کو نمایاں کریں جو زندگی کی نمائندگی کرتے ہوں۔ وہ موقع موقع سے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کی نشان دہی بھی کرتے جاتے ہیں۔ وہ اپنے نظریے کے پس منظر سے فن کار کا جائزہ لیتے ہیں۔ اکثر وہ صحیح رائے پیش کرتے ہیں مگر کبھی کبھی نتیجۃً کھینچ تان بھی ہوجاتی ہے۔
دراصل کسی فن کار کے بارے میں نظریہ قائم کرنا آسان بھی نہیں ہے۔ احتشام صاحب کی فکری عظمت یہ ہے کہ وہ نظریات قائم کرتے ہیں یا اپنے نظریہ کے ذریعے اس کے خیالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ اپنے اسلوب میں سماجی، جدلیاتی، اشتراکی اصطلاحوں کے ذریعہ سے ایک مخصوص ماحول پیدا کرتے ہیں جس میں فلسفیانہ انداز نظر کی کارفرمائی ہوتی ہے اس لیے ان کا اسلوب ایک مخصوص کیفیت کا حامل نظر آتا ہے جس میں ادبی مسرت کم ہوتی ہے مگر بصیرت کی فراوانی نظر آتی ہے چونکہ وہ ایک نظام فکر کے داعی ہیں بار بار اس کی وضاحت کرتے ہیں اس لیے ان کے یہاں تکرار کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ احتشام صاحب کے یہاں طوالت پسندی بھی ملتی ہے اس لیے کہ وہ اپنے نظریہ کی تشریح دل کھول کر کرتے ہیں۔ معمولی بات کو دل نشین کرنے کے لیے وہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کسی موقع پر پُرجوش انداز بھی اختیار کرتے ہیں۔ البتہ وہ ہمیشہ اس کے جلال وجمال پر نظر رکھتے ہیں نہ اس کو خشک فلسفیانہ ہونے دیتے ہیں اور نہ اس کی ادبیت کو زیادہ بڑھنے دیتے ہیں بلکہ ہر جگہ حکیمانہ وقار قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سرور صاحب سرمایہ داری سے نفرت ضرور کرتے ہیں مگر اشتراکیت کے پرزور و پرشور حامی نہیں وہ جمہوری قدروں کے ترجمان ہیں کسی فن کا اندازہ اس کے مجموعی کام سے لگاتے ہیں اور جچی تلی رائے پیش کرتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اصل علمی تنقید میں فکری عظمت پیش کرتے ہیں احتشام صاحب کا قلم علمی تنقید میں خوب چلتا ہے۔ ان کے مضامین کے مجموعے دیکھئے تو محسوس ہوگا کہ انھوں نے نظریاتی موضوعات پر کم لکھا ہے شعراء، ادباء، اور بعض ادوار، اشخاص یا کبھی کبھی کسی مسئلے پر قلم اٹھایا ہے مگر ان کا رجحان ادباء وشعراء کے فن کا تجزیہ کرنا اس انداز سے ہے کہ ان کی عظمت مجسم ہوکر سامنے آجائے۔

سرور صاحب تنقید اشاروں میں کرتے ہیں خصوصاً عیوب کا بیان وہ کم کرتے اور اس موقع پر رمز وکنائے سے کام لیتے ہیں۔ اگرچہ وہ نقائص کو چھپاتے نہیں مگر اس کے مقابلے میں وہ خوبیوں کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔

احتشام صاحب اس کے برعکس تفصیل پسند ہیں۔ اور صرف ایک پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور وہ ان کے مخصوص نظریہ کی موافقت ومناسبت کا پہلو ہوتا ہے۔ مگر اس کی عظمت یہ ہے کہ وہ نظریہ قائم کرتے ہیں جس سے ان کی مفکرانہ عظمت سامنے آتی ہے۔ سرور صاحب حقیقت اصل شکل میں اور عیاں دیکھتے ہیں احتشام صاحب اس کو سماج، معاشرہ اور جدلیت کے آئینہ میں تلاش کرتے ہیں۔ تنقید میں ان کو برتری ان کے نظریاتی مباحث کے باعث ہے۔ سرور صاحب کی تنقیدی عظمت ان مجموعی خوبیوں کو نمایاں کرنے میں پوشیدہ ہے جو وہ فن کار میں تلاش کرتے ہیں اور انھیں بصیرت انگیزی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

عکس و آئینے

صفحہ ۳۵ : "تہذیب انسانی کی صبح اولیں میں شاعری نے سحر اور موسیقی کے پردوں میں جنم لیا۔ کیونکہ انھیں ذرائع سے انسان اپنی قوت عمل اور قوت تسخیر دونوں کو آزماتا تھا اسی وجہ سے شاعری آج بھی اثر اور ترغیب عمل کا فرض انجام دیتی ہے یا کم سے کم اس کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔"

صفحہ ۶۰ : "اس وقت شاعری موضوعات کے انتخاب کا نام نہیں زندگی کے اظہار کا نام ہے فرد اپنے پردے میں وقت کی تصور پیش کرتا ہے وہ محض شاعر نہیں۔ مفکر بھی بننے کی کوشش کر رہا ہے اور یہیں اس کی دشواریاں اور ذمہ داریاں بڑھ رہی ہیں۔"

محمد ایوب واقف ایم۔اے

ساحل اور سمندر

(ایک تنقیدی مطالعہ)

نوٹ:

اعظم گڑھ کی تحصیل پھولپور میں قصبہ ماہل احتشام صاحب کا وطن تھا اور ماہل سے دو میل مشرق میں پورہ نوروم جو میرا وطن ہے تقریباً پانچ سال پرانی بات ہے۔ انھیں دو مقامات کے درمیان ابادی کے چوراہے پر کھڑا میں رکشا کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک خاہ گنج کی طرف سے آنے والی بس سے احتشام صاحب غیر متوقع طور پر اترے۔ انھوں نے کہا میں صبح سویرے الہ آباد واپس ہو جاؤں گا تم کو موقع ہو تو ماہل چلو میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ راستے بھر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے دورانِ گفتگو ان سے کہا کہ "ساحل اور سمندر" پر ایک مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کے کچھ بیانات سے شدید اختلاف ہے۔ احتشام صاحب مسکرائے اور کہا ضرور لکھو۔ لیکن کسی رسالہ میں بھیجنے سے پہلے مجھے دکھا لینا۔ افسوس کہ ان کی زندگی میں میں "ساحل اور سمندر" پر لکھنے کی اپنی آرزو کی تکمیل نہ کر سکا۔ آج جب ان کا انتقال ہو چکا ہے میں ان کے اس عظیم کارنامے پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔ احتشام صاحب زندہ ہوتے تو میرے ان بے ربط خیالات کو پڑھ کر کتنا ہنستے اور کہتے میاں واقف، بات یوں نہیں یوں ہے۔"

کلام اللہ میں انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ خدا کے اس ارشاد پر ہمیں اتنا ہی پختہ یقین اور عقیدہ ہے جتنا خود اس کی ذات والاصفات پر۔ اگر خدا نے اپنی کتاب میں اس امر کی نشان دہی نہ کی ہوتی تو بھی ہم انسان کو اس کی فہم و فراست کی بالیدگی کے پیشِ نظر اشرف المخلوقات تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہوتے انسانی فطرت میں تغیر و تبدل اس کا لازمی عنصر ہے۔ وہ ایک خیال، ایک فکر اور ایک نہج پر ہمیشہ قائم رہنا کبھی چاہے تو اس کے لیے ممکن نہیں۔ مشیت ایزدی نے اسے دل اور دماغ جیسے عطیات سے نوازا ہے۔ دماغ انسان کو سوچنے اور حقائق و اشیاء کی ماہیت پر غور کرنے پر اکساتا ہے۔ نت نئی تحقیق و تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے تو دل اُسے خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمہ وقت مصروف و منہمک رکھتا ہے بس یہی زندگی کے ارتقاء کا راز ہے اور اسی سے حیاتِ انسانی مسلسل ہنگامہ خیز اور شور و شغب سے دوچار ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی تعجب خیز ترقی صرف خواب ہوتی اور بعید نہیں کہ انسان آج بھی جنگلوں اور پہاڑوں میں نیم وحشی زندگی بسر کرتا ہوتا۔ پھر اللہ نے اس امر کی بھی بشارت دی تھی کہ زمین تا آسمان ہر چیز انسان کے تصرف میں ہے۔ اس لیے درمیان کی ہر چیز پر انسان کی دسترس ناگزیر تھی۔ لیکن کائنات پر بندۂ خدا کی تحویل اور اس کا محاصرہ یکایک ظہور پذیر نہیں ہوا۔ اس کے لیے صدیاں گذری ہیں۔ جیسے جیسے اس کے ذہن نے رہنمائی کی وہ اپنی زندگی کے

اصول و ضوابط ایجاد کرتا گیا اور پھر ایک بہتر نظام کے لیے پوری روئے زمین کو اس نے خانوں میں تقسیم کر دیا۔ اسی کی عقل نے ذ
اور ساتھ دیا تو اس نے ان خانوں کو مختلف ناموں میں تبدیل کرکے ملکوں کی تعمیر کی اور پھر ان ملکوں کے حدود متعین کیے اور ان مختلف
حدود میں مختلف قسم کی حکومتیں قائم کر دیں۔ اس طرح زندگی کے کاروبار چل نکلے۔ جہاں جہاں انسان کے قدم نہیں پہنچے تھے، اُن کی
کی دید و دریافت کی غرض سے وہ اس طرف چل نکلا۔ اس طرح صدیوں کی تگ و دو اور جانفشانی کے بعد اللہ کی زمین کے بیشتر
دونوں حصوں پر اُس کے بندوں کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ پھر انسان نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک ملک کی تعمیر و ترقی کا سارا انحصار
اندرونی ذرائع و وسائل ہی پر نہیں بلکہ اس کے لیے دوسرے ممالک کا تعاون و اشتراک بھی ضروری ہے۔ اس کے برعکس انسان کی
فتح بھی اس کا خاص نشا تھا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ایک ملک سے دوسرے ملک میں اس کی آمد و رفت کا آغاز ہوا لیکن آمد
کا یہ سلسلہ کسی ایک نوعیت کا حامل نہیں رہا۔ کچھ لوگ کاروبار کے سلسلے میں آتے جاتے رہے، کچھ کا مقصد تہذیبی و ثقافتی لین دین تھا
بعض محض تفریح و تفنن کے طور پر سفر کا قصد کرتے۔ یہ خیال اس وقت نہ جانے کیوں لوگوں کے دلوں میں نہ ابھرا کہ وہ اپنے سفر
تجربات و مشاہدات و معلومات کو تحریری شکل میں محفوظ کر دیں تاکہ بعد میں آنے والی نسلوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ چنانچہ آج
سفری داستان قلمبند کرنے کی رسم عام نہیں ہو سکی ہے۔ آج کے سائنس اور ٹکنالوجی کے عہد میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ ایک
سے دوسرے ملک میں آتے جاتے ہیں لیکن سفرنامے شاذ و نادر ہی وجود میں آتے ہیں۔ دنیا کی بعض ترقی پسند زبانوں میں اس صنف
کی ترقی ہوئی ہے لیکن اردو میں تو یہ صنف بالکل نئی چیز ہے۔ بس گنتی کے چند سفرنامے دستیاب ہیں اُن میں چند ہی ایسے ہوں گے
کارآمد کہا جا سکے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں نے اردو کے سبھی سفرنامے پڑھے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ سفرناموں کا مطالعہ میرا دلچ
مشغلہ رہا ہے۔ اردو اور دیگر زبانوں کے بیشتر سفرنامے اور روزنامچے میری نظر سے گذر چکے ہیں۔

بیسویں صدی میں اردو میں جتنے بھی سفرنامے لکھے گئے ہیں ان میں دو کی افادیت میرے نزدیک بہت زیادہ ہے۔ ایک
شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ "سفرنامہ شام و مصر و روم" اور دوسرا ہے عہد جدید کے عظیم نقاد پروفیسر سید احتشام حس
کا سفرنامہ "ساحل اور سمندر"۔ ان دو سفرناموں کا کوئی موازنہ مقصود نہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ دونوں کا موازنہ ہو بھی
سکتا۔ اس لیے کہ موضوع اور طرز فکر کے اعتبار سے دونوں دو الگ الگ نوعیتوں کے حامل ہیں۔ شبلی نعمانی نے اسلامی ممالک کا
ایک خاص مقصد کے تحت کیا تھا۔ ہندوستان میں وہ اس بات کا تجربہ کر چکے تھے کہ یہاں کے مسلمان اسلامی ممالک کی طرز زندگی
و مراتب، اور ان کے علم و اخلاق سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں اور اگر یہ حالت جاری رہی تو بعید نہیں کہ دونوں کے درمیان
معلومات کی ایک خلیج پیدا ہو جائے۔ کچھ انھیں نامناسب حالات سے گھبرا کر انھوں نے اسلامی ممالک کے سفر کا قصد کر لیا۔ ترکی
اور مصر کے مسلمانوں کی علمی، تعلیمی، اخلاقی اور تمدنی حالات کا انھوں نے بہ نفس نفیس مطالعہ کیا اور جو کچھ مناسب سمجھا اسے سفر
مصر و شام و روم" میں درج کیا۔ اس کتاب میں دیگر وقائع اور حوادثات سفر کو شبلی مرحوم نے جزوی طور پر بیان کیا ہے۔
سفرنامے سے جو زبردست فائدہ ہوا وہ یہ کہ ہندوستان کا مسلمان قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس اور قاہرہ وغیرہ جیسے
بڑے شہروں کی اجمالی حالت، وہاں کے قابل دید مقامات، سررشتۂ تعلیم، دارالعلوم، مدارس، بورڈنگ، طلبا کی تربیت،
نسواں، مصنفین اور تصنیفات، کتب خانے، اخبارات و رسائل، مشہور بادشاہوں اور ارباب کمالات کی ملاقاتوں، ترکوں اور
کے اخلاق و عادات سے سرسری طور پر آگاہ ہو جاتا ہے۔ شبلی نے اپنا سفرنامہ دوران سفر ترتیب نہیں دیا تھا بلکہ وطن و

وضواسط، تجارتی کیفیت اور عمارتوں کے نقشوں وغیرہ کی شمولیت سے کتاب کے حسن و وقار میں بیش قیمت اضافہ کر سکتے تھے اگر ایسا ہو سکتا تو سفرنامہ مصر و شام و روم شاید دنیا کے چند بہترین سفرناموں میں اہم سفرنامہ ہوتا۔ اس کے باوجود بھی شبلی مرحوم کے سفرنامے کی اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔

ساحل اور سمندر کے وجود میں آنے کا سبب مذکورہ بالا سفرنامے سے مختلف ہے۔ احتشام صاحب نے امریکہ کا سفر وہاں کے ادب و تنقید کے عام رجحانات کا مطالعہ کرنے اور کتب و رسائل کی اعلیٰ اشاعت و طباعت کے ہنر سے واقف ہونے کی غرض سے کیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب احتشام صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ انھیں ایام میں ایک امریکی مسٹر گل پیٹرک سے جو راک فیلر فاؤنڈیشن کے رکن اور روحِ رواں تھے ان کی ملاقات ہوئی۔ چند گھنٹوں کی بات چیت سے مسٹر گل پیٹرک نے احتشام حسین صاحب کے اندر چھپے ہوئے ایک سربرآوردہ ہندوستانی نقاد کو ڈھونڈ نکالا (امریکی اس فن میں ماہر ہوتے ہیں) اور اسی وقت انھوں نے راک فیلر فاؤنڈیشن کی فیلوشپ پر انھیں امریکہ کی صنعتِ تنقید اور اشاعتی و طباعتی طریقوں کا مطالعہ کرنے کی دعوت دے دی۔ اس وقت تو احتشام صاحب نے کوئی جواب نہ دیا، لیکن ان کے دل میں انکار و اقرار کی شدید جنگ شروع ہو گئی۔ ایک طرف برسوں کے غیر ملکی سفر کی خواہش و آرزو کا طوفان امڈا آ رہا تھا اور دوسری طرف سفر کے خطرناک حالات اور اجنبی ملک میں اجنبی بن کر رہنے کا خوف، بہرحال اس ذہنی جنگ میں جیت اُن کی اس آرزو کی ہوئی جسے انھوں نے برسوں سے پال رکھا تھا بالآخر اپنے فیصلے کی اطلاع انھوں نے مسٹر گل پیٹرک کو بھیج دی۔

"ساحل اور سمندر" کُل دس ماہ کے دورۂ امریکہ و انگلستان کی دلچسپ داستان ہے اس میں ۳۰۶ صفحات اور ۶ مختلف حصے ہیں۔ پہلا حصہ "گذارش" کے عنوان سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ اس میں قارئین کو احتشام حسین نے اپنے سفرنامے کے متعلق صاف صاف لفظوں میں بغیر کسی پس و پیش کے بتایا ہے اور اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ تاثرات جو "ساحل اور سمندر" میں پیش کیے گئے ہیں ضروری نہیں کہ قبولِ عام کا شرف حاصل کریں یا ہر شخص انھیں جوں کا توں تسلیم ہی کرے۔ ان میں بہت سی خامیاں اور کوتاہیاں بھی ہو سکتی ہیں جن کے تدارک میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس سفرنامے کو بہت سے ادبی، فلسفیانہ یا علمی مباحث سے بوجھل بھی نہیں ہونے دیا ہے۔ دوسرا حصہ "کشمکش اور سمجھوتہ" کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں احتشام حسین نے سفر کے متعلق فیصلہ کرنے تک کی اپنی پریشانیوں اور الجھنوں کو اختصار سے پیش کیا ہے۔ تیسرا حصہ "فکریں" پر محیط ہے۔ جب انھوں نے راک فیلر فاؤنڈیشن کو اپنے فیصلہ سے مطلع کر دیا تو پریشانیاں اور الجھنیں ختم نہیں ہو گئیں بلکہ ان میں اور اضافہ ہو گیا۔ مثلاً لکھنؤ یونیورسٹی سے ایک سال کی چھٹی کی منظوری کا مسئلہ یونیورسٹی سے کچھ قرض حاصل کرنے کی فکر اس کے ساتھ ساتھ ماں، بہن، بیوی، بچوں، بھائیوں، عزیزوں اور دوستوں کو ایک سال کے لیے خیرباد کہنے کا شدید احساس۔ ان تمام کشمکشوں کو انھوں نے "فکریں" کے عنوان سے قلمبند کیا ہے۔ اس مرحلے تک انھوں نے روزنامچہ لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ لیکن جب وہ گھر کے در و دیوار اور لکھنؤ کے گلی کوچوں پر حسرت بھری نگاہ ڈال کر "رخصت اے جانِ وفا" کی درد بھری آواز میں سلام پیش کر کے دہلی روانہ ہوتے ہیں تو وہ یادگار دن اگست کی ۲۹ تاریخ کا دن ہوتا ہے اور خدائی برکتوں سے معمور یومِ جمعہ بھی اسی تاریخ میں اتر کر احتشام حسین صاحب کو "الوداع اے گوہرِ ہندوستاں" کہنے لگتا ہے تو احتشام حسین صاحب ہاتھ کی گڑگڑاہٹ، احساس کی پائمالی اور روح کی گھبراہٹ تھرتھراہٹ کے ساتھ ڈائری لکھنا شروع کرتے ہیں۔ اس مبارک دن سے جس ڈائری کی تحریر کا آغاز انھوں نے کیا تھا وہ کل دس ماہ تک مسلسل جاری رہے گا۔

۲۹ اگست بروز جمعہ سے لیکر ۱۴ ستمبر ۱۹۵۲ء تک وہ دہلی سے نیویارک تک کے سفر میں رہتے ہیں، اٹھارہ دنوں تک کے

اس طویل سفر کو انھوں نے "سفر کے اٹھارہ دن" کے زیر عنوان لکھا ہے۔ ۱۷ر ستمبر بروز اتوار سے لیکر ۳۰ر مارچ بروز جمعہ تک وہ امریکہ کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں شب و روز گذارتے ہیں تو اس کا نام وہ "نئی دنیا" رکھتے ہیں۔ ۳۰ر جمعہ بجاکے مبارک دن کو امریکہ کی سرزمین سے یورپ کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو اس کا ذکر وہ اپنے روزنامچے "پرانی دنیا" کے نام سے کرتے ہیں اور یورپ کے چند ممالک میں رہ کر ۹ر جولائی بروز دوشنبہ کو لکھنؤ پہنچتے ہیں اور رات کو بارہ بجے تک کا حال لکھکر ڈائری کو ختم کر دیتے ہیں۔ کتاب کا آخری حصہ یعنی چھٹا حصہ "سخن ہائے گفتنی" ہے۔ یہ حصہ اس اعتبار سے بیحد اہم ہے کہ اس میں انھوں نے امریکہ کی سیاسی، سماجی، ادبی، اخلاقی، جنسی اور اقتصادی صورت حال کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ چند صفحات میں بیان کیا ہے۔ اس حصے کو پڑھکر یہ کہنا مشکل نہیں کہ تھوڑے سے مواد سے زیادہ سمجھانے کا ہوشمندانہ طریقہ احتشام حسین صاحب کو بدرجۂ اتم معلوم تھا۔ اس حصہ کی دوسری خوبی یہ ہے کہ امریکہ کے دورانِ قیام میں انھوں نے جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا اسے حق اور ایمانداری کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ چاہے تہذیبی ترقی اور سرمایہ دارانہ نظام کی بے ہنگم کیفیت ہو یا امریکہ کی مہمان نوازی، خاطر داری اور مجلسی آداب کے رموز و نکات، جنسی جرائم اور غلط جنسی رجحان کا مسئلہ ہو یا عام ذہنی کیفیات کا معاملہ، حبشیوں کے ساتھ ناز یبا سلوک کی بات ہو یا علم و فضل، اداکاری اور ادب و فن کے معائب و محاسن، ہر موضوع پر مختصر مگر سیر حاصل مواد فراہم کرکے احتشام حسین نے "ساحل اور سمندر" کے اس حصے کو غیر معمولی بنا دیا ہے۔ اظہار خیال میں احتشام حسین صاحب نے اپنے طور پر انتہائی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ مثلاً جہاں انھوں نے امریکی شہریوں کی وطن پرستی کو حق بجانب اور مناسب قرار دیا ہے، وہیں ان دوسروں کی آرزوؤں اور خواہشوں کا خون کرکے آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کے جذبے کی شدید مذمت بھی کی ہے اور اس امر پر اظہار افسوس کیا ہے کہ یہی عمل امریکہ کا قومی فلسفہ بن چکا ہے جس کے اردگرد وہاں کا پورا نظام تعلیم، نظام اخلاق اور ادب طواف کرتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے امریکہ کے ادیبوں کی شعوری کوششوں کو سراہا ہے جو امریکہ کی جمہوریت کے سچے علمبردار ہیں، لیکن انھوں نے اس بات کا انکشاف بھی کیا ہے کہ فنکاروں کا ایک بڑا گروہ امریکی سرمایہ داری اور حاکم طبقے کا پابند ہے۔ اس گروہ میں مختلف مکاتب فکر مثلاً پریگمٹزم (عملیت)، نیو ہیومنزم (جدید انسان دوستی) نیو کریٹی سزم (تخلیقی تنقید) اور کیتھولک دبستانِ ادب وغیرہ شامل ہیں۔ ان پر احتشام صاحب نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ یہ تمام اسکول ادب کو زندگی کی جد و جہد سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔

سفر کے اٹھارہ دن احتشام حسین صاحب کے ذہنی خلفشار کے دن ہیں۔ اُن دنوں کی ان کی اُلجھنوں اور کشمکشوں کا سبب محض اتنا طویل سفر اپنی زندگی میں انھوں نے پہلی بار کیا تھا۔ یقینی طور پر اُلجھن ہونا چاہیئے تھی پھر ایک انجان سمت میں انجانے لوگوں کے درمیان "اجنبی" کی حیثیت سے رہنے کا شدید احساس تھا جس نے دورانِ سفر انھیں خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا ہوگا لیکن امریکہ کے بعد بھی ۶ ماہ تک مسلسل اقامت میں ان کی ذہنی بے چینی اور بددلی جو ختم نہیں ہوئی تو اس کی وجہ اب یہ نہیں کہ وہ ایک اجنبی ملک میں اجنبی لوگوں کے ساتھ ہیں، بلکہ ان کی الجھنوں اور کشمکشوں کا اصل سبب ان کی وہ شدید نفرت ہے جو امریکہ کی سرمایہ داری، امریکہ کے نشۂ دولت و ثروت اور دوسرے ممالک کو ذہنی طور پر اپنا غلام بنانے والی گندی پالیسی کے خلاف ان کے سینے میں پیدا ہو گئی تھی۔ نفرت و حقارت کا دل میں یہ طوفان وہ ہندوستان سے ساتھ لیکر گئے تھے اور ان کی جڑیں اتنی مضبوط تھیں کہ ان کا تدارک کرنا مشکل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں قیام کے ۶ ماہ ان کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ اس کے برعکس احتشام حسین صاحب انگلستان کی حیات اور وہاں کے طور طریق سے خوش نظر آتے ہیں۔ وہاں پہنچکر انھیں سکون اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ ایک جگہ امریکہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"انگلستان کو دیکھا جائے تو انگریزوں کی سنجیدگی، متانت، گہرائی، بردباری، تحمل، آزمائشوں پر آزمائشیں جھیل لینے کی صلاحیت، بڑی معنویت رکھتی ہے گو محض سرسری نگاہ سے دیکھنے والا امریکہ کی چمک دمک، ظاہری اظہار ہمدردی، مصنوعی اخلاق سے جلد متاثر ہو جائے گا۔ اس کے برعکس انگریز تحکم آمیز اور دیر آشنا معلوم ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صدیوں کے تہذیبی نکھار نے یہ باتیں پیدا کی ہیں اور ان میں حسن و وقار ہے۔"

اس سے قبل کہ احتشام حسین صاحب کے امریکہ اور انگلستان کے متعلق نظریات و خیالات کا جائزہ لیا جائے، انگلستان کے متعلق "ساحل اور سمندر" سے ان کی تحریر کے ایک اقتباس کو پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس اقتباس میں انھوں نے انگلستان سے اپنی ذہنی وابستگی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی خوشی کی توجیہہ کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"کون کہتا ہے کہ زندگی حسین نہیں ہے یہ خوبصورت دن اور حسین راتیں پرجلال آفتاب اور یہ ہجائے ستاروں کا حسن یہ نور و نکہت کی فراوانی، یہ بادلوں کی ہماہمی۔ یہ گل بیز چمن اور پھولوں کے یہ عناں گیر رنگین تختے، یہ نغموں کا بہتا ہوا سیلاب اور مصوری اور مجسمہ سازی کے معجزے، یہ شاندار عمارتیں اور ہنستے ہوئے بے فکر لوگ، یہ تفریح گاہیں اور یہ رقص گاہیں، یہ کتب خانے اور میوزیم یہ تہذیب کی برکتوں سے مالا مال زندگی۔ کون کہتا ہے زندگی حسین نہیں ہے۔"

جہاں تک امریکہ کی سرمایہ داری کے مضر اثرات کا تعلق ہے، احتشام حسین صاحب کے تمام تر بیانات حق بجانب ہیں۔ اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج جو پوری دنیا رہ رہ کر عالمگیر جنگ کے دہانے پر پہنچ جایا کرتی ہے، اس کی اصل وجہ امریکہ کی خارجہ پالیسی ہے۔ امریکہ نے اپنی دولت کا خاصل حصہ دنیا کے مفلوک الحال ممالک میں پھیلا کر اپنی فراخدلی اور انسان دوستی کا ثبوت نہیں دیا ہے بلکہ اس کے پس پشت اس کی وہی دنیا کو ذہنی طور پر غلام بنانے والی پالیسی اور اپنے ہر فعل اور عمل کو تسلیم کیے جانے کی شدید خواہش کارفرما نظر آتی ہے۔ دنیا میں بحیثیت ایک ملک اسرائیل کا وجود تاریخ کی ایک بھیانک غلطی ہے۔ جسے پوری دنیا تسلیم کرتی ہے لیکن امریکہ نے اس بھیانک غلطی کو تسلیم کرنے کی بجائے اس کی طاقت کو غیر معمولی طور پر مضبوط کیا ہے۔ اس سے امریکہ کا جو مقصد ہے وہ ظاہر ہے۔ امریکہ یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ عرب ممالک طاقت اور اتحاد میں مستحکم ہوں۔ اگر وہ طاقت اور اتحاد میں مضبوط اور مستحکم ہو جائیں گے تو امریکہ کی وہ پالیسی جسے ہم دوسروں پر ذہنی شہنشاہی سے تعبیر کرتے ہیں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ امریکہ کی نیت کے اس کھوٹ اور اس کی ایسی انسانیت سوز سرگرمیوں کی مذمت ہی کی جائے گی۔ احتشام حسین صاحب کے بیانات کی تردید نہیں بلکہ تائید کرنا پڑے گی۔ لیکن امریکی سرمایہ داری کی سخت تنقید اور انگلستان کے نظام زندگی کی تحسین پر مکمل اعتماد اور اس کی تہذیب کو آب مصفا کی طرح صاف و شفاف کہنا ہمارے ذہنوں میں بعض شکوک کو جنم دیتا ہے۔ اس لیے کہ اگر امریکہ نے اپنے دولت مندانہ جاہ و جلال کے بل بوتے پر اقوام عالم کے سینے پر ہتھوڑا مارا ہے اور بھوکی ننگی دنیا کو روٹی کے ٹکڑے اور کپڑوں کے چیتھڑے دکھا کر اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق اسے چلنے پر مجبور کیا ہے تو انگلستان کی تہذیب میں بھی ایسے مہلک عناصر کی کمی نہیں ہے۔ انگلستان کا نظام فکر بھی بربریت اور آمرانہ طرز عمل کا شکار رہا ہے۔ دوسروں کی عزت و آبرو دوسروں کی غیرت اور حشمت کو روند کر اپنی عزت و عظمت کا تارہ چمکانا صدیوں سے انگلستانی عوام کا طرۂ امتیاز رہا ہے، یہ بات نہ جانے کیوں احتشام حسین صاحب نے محسوس نہیں کی۔ حالانکہ تاریخ کے صفحات پر اس کے مزاج کے بے رحمی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ انگلستان کی طرفداری اور اس سے ذہنی وابستگی اور والہانہ قلبی لگاؤ نے امریکی نظام سے ان کی نفرت اور بد دلی کو انتہا پسندی کی سرحد سے

ملا دیا ہے۔ اس کا ثبوت "ساحل اور سمندر" کے وہ اقتباسات ہیں جو انھوں نے امریکہ کی عورتوں کے حسن و قبح کے متعلق رقم کیے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"یہاں کی جوان عورتوں کے چہرے، خط و خال، رفتار و گفتار میں وہ دلکشی نہیں ہے جس کی آرزو کی جاتی ہے کبھی بھولے بھٹکے کوئی چہرہ ایسا نظر آ جاتا ہے جسے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہو۔ وہ نہ عام طور پر نہ وہ معصومیت ہے جو متوجہ کرے نہ وہ چال ہے جس میں شراب کی سی مستی ہو۔ نہ آنکھوں میں وہ رس ہے جو انسان کو مدہوش بنا تا ہے نہ تبسم میں وہ دلکشی ہے جو نشتر کا کام دے۔ نہ انداز میں وہ جلال ہے جو شہزادیوں کے استغنا اور غرور کی یاد دلائے عورتیں بس عورتیں ہیں شعر و شراب نہیں ہیں میرا خیال ہے ان کے چہرے میں جنسی کشش کا زمانہ بہت مختصر ہوتا ہے اور وہ وہی ہے جب جوانی طفلی سے گلے ملتی ہے۔"

یہ تھے امریکی عورتوں کے بارے میں سید احتشام حسین صاحب کے تاثرات : اب ذرا انگلستان کی زہرہ جبینوں کے حسن و قبح کا جادو اُن کے دل کے نہاں خانے میں جھانک کر دیکھئے انگلستان میں ورود کے بعد انھیں وکٹوریہ البرٹ میوزیم دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہاں کے نوادر مثلاً لباس، اسلحے، ظروف، تصاویر اور دیگر سامانِ آرائش سے تو لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن جب وہ وہیں کے ایک خوبصورت ریسٹورنٹ میں ذرا قریب ہی سے کچھ پری رخوں سے نگاہیں ملاتے ہیں تو بے بسی کے عالم میں یہ کہہ اٹھتے ہیں۔

"اندر بہت خوبصورت ریسٹوراں ہے۔ وہاں وقت اچھا گذر سکتا ہے۔ کیونکہ میوزیم کے نوادر دیکھتے ہوئے شاید آپ کو انسانی چہروں کو دیکھنے کا وقت نہ ملا ہو، یہاں بیٹھے بیٹھے نگاہوں کو اس گستاخی کا اذن بھی دیا جا سکتا ہے اور اگر جگہ کی کمی کی وجہ سے آپ کی میز پر کوئی زہرہ جبیں آپ سے اجازت لیکر بیٹھ جانا چاہے تو پھر موسم کی بے کیفی، گھنٹوں چلتے رہنے کا احساس بھی باقی نہ رہے گا۔"

عورت بہر حال عورت ہوتی ہے چاہے وہ امریکہ کی ہو یا انگلستان کی، ہندوستان کی ہو یا کسی اور ملک کی۔ رنگ روپ، قدوقامت میں فرق ہو سکتا ہے لیکن اس طرح کا فرق اس کے نسوانی عشوہ و ناز اور جوش و امنگ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ یہ خداداد عطیہ ہے اور خدا کا یہ عطیہ جغرافیائی اور نسلی حد بندیوں میں مقید نہیں ہے۔ یہ کیسے اور کیونکر تسلیم کر لیا جائے کہ انگلستان کی زہرہ جبیں موسم کی بے کیفی اور گھنٹوں چلتے رہنے کی تھکن کے احساس تک کو آن کی آن میں غائب کر دیتی ہے اور امریکہ کی عورت کے چہرے، خط و خال، رفتار و گفتار میں کشش نام کی کوئی چیز نہیں۔ حسن کو حسن کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے اور حسن جس رنگ میں بھی ہو اس کا احترام ضروری ہے اگر امریکہ کی عورتوں میں احتشام صاحب کو دلبستگی کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تو یہ امریکہ کی عورتوں کی خامی نہیں بلکہ احتشام صاحب کے ذہن و نظر کی دوسرے قسم کی وابستگی کا نتیجہ تھا کہ حسن کو بھی انھوں نے دو خانوں میں تقسیم کر دیا۔ بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ محض ان کی امریکہ سے نفرت تھی جس نے امریکہ کی ہر چیز میں نقائص ہی تلاش کیے۔

امریکہ اور انگلستان کے دورانِ قیام میں بعض مواقع ایسے بھی آئے تھے جب انھیں امریکہ اور انگلستان کے ادیبوں، شاعروں اور تصنیفات پر رائے قائم کرنے کے لیے کہا گیا۔ ایسے آراء کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہاں بھی وہ جذبات کی آڑ میں بہہ گئے کہیں کہیں ان کی انا انتہا پسندی کا شکار ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

"رات کو مسٹر جیمس ٹی فیرل سے ملاقات ہوئی میں نے غالباً ۱۹۳۰ء میں ان کی ایک کتاب نوٹس آن لٹریری کریٹی سزم پڑھی تھی اور اس زمانے میں اس کے بعض حصے پسند بھی آئے تھے۔ اب تک تاثیر

کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ پانچ بار یورپ جا چکے ہیں، بہت دیر تک باتیں ہوئیں۔ باتونی معلوم ہوتے ہیں۔ ملنے جلنے کے شائق ہیں، یورپ کے بہت سے ادیبوں کو جانتے ہیں۔ نظر گہری نہیں رکھتے مگر ناول چھپوا تے اور پیسہ پیدا کرتے ہیں۔"

جمس نیل کے متعلق احتشام حسین صاحب کی رائے درست ہو سکتی ہے لیکن دائے میں توازن اور ادبی و علمی رکھ رکھاؤ ہونا چاہیے وہ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک جگہ پروفیسر ولٹ اور مسٹر زابل کے ذکر میں فرماتے ہیں:۔

"پروفیسر ولٹ سے ملاقات ہوئی، یہ ادبیات وغیرہ کے ڈین ہیں۔ مسٹر زابل سے ملا۔ کوئی بھی واضح طور پر یہ دکھا سکا کہ شکاگو اسکول" کی تنقید کے اصل عناصر کیا ہیں۔ اتنا تو میں نے پہلے ہی سے جان لیا تھا کہ یہ لوگ ارسطو کے مقلد ہیں کلاسیکی انداز نظر رکھتے ہیں اور ادب پارے کا محض ادبی تجزیہ کرتے ہیں ایک صاحب سے ادب کے نفسیاتی تجزیہ کے متعلق بھی باتیں ہوئیں۔ ساری باتیں پہلے سے جانتا ہوں۔ جہاں ضروری معلوم ہوا ہے ان سے کام بھی لے چکا ہوں۔"

دوسروں پر افضلیت اور فوقیت جتانے کے لیے اپنے متعلق ستائش کے یہ جملے ان کی گہری انا پرستی کا ثبوت ہیں۔ یہاں بھی یہی کہنا پڑے گا کہ احتشام صاحب کی باتیں جو انھوں نے اپنے متعلق کہی ہیں وہ چاہے درست ہوں لیکن بیان کی جذباتیت نے ان باتوں کو باوقار و باوزن بنانے کے بجائے بے اثر کر دیا ہے۔ جذبات نگاری کی اس طرح کی انتہا پسندی ان کے بعض تنقیدی مضامین میں بھی مل سکتی ہے، لیکن اس طرح کی مثالیں ان کی عمر کے اس حصے سے وابستہ ہیں جب آدمی پر جذباتی کیفیت طاری رہتی ہے اور اس سے بچنے کی شعوری کوششوں کے باوجود بھی تقریر و تحریر میں اس کا رنگ جھلک آتا ہے۔ لیکن عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اس ناگزیر عیب سے انسان کو نجات مل جاتی ہے۔ احتشام صاحب کے یہاں بھی جذبات میں بہہ جانے والی کیفیت موجود ہے لیکن پہلے کی تحریروں میں، بعد کی تحریروں میں وہ انکساری بردباری اور علمی رکھاؤ ہے کہ بس پڑھئے اور جھومتے رہیئے۔ بعد کی تحریروں میں کہیں کہیں اگر انا اور خود ستائی کی کیفیت ہے بھی تو اس کو بیان کرنے میں اتنی خوبصورتی سے کام لیا ہے کہ وہ تحریر کا نقص نہیں بلکہ حسن بن گئی ہے۔

نظریاتی اختلافات سے قطع نظر اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو "ساحل اور سمندر" ادب کا ایک گراں قدر صحیفہ اور ہر دور میں پڑھا جانے والا لازوال ادبی دستاویز نظر آئے گا۔ یہ انواع و اقسام خیالات اور حسین و جمیل افکار کا نادر و کمیاب مرقع ہے، جس کی اہمیت اور افادیت سے کسی بھی باذوق کو انکار نہیں ہو سکتا۔ امریکہ اور انگلستان کے پردے پر انھوں نے نہ معلوم کیا کیا دیکھا ہوگا، ان کے دل و دماغ میں کیسے کیسے خیالات ابھرے ہوں گے لیکن ان خیالات و افکار کی رو میں بہنے کے بجائے انھوں نے اعتدال و توازن کی راہ اختیار کی۔ بے شمار پھولوں میں سے ایسے پھول چنے جن کی ملی جلی خوشبو سے مشام جاں معطر ہو جاتا ہے۔ ایسی باتوں کے بیان سے احتشام حسین صاحب نے قطعاً احتراز کیا ہے جو ان کے قارئین کی دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتی تھیں۔ جہاں اشاروں اور کنایوں میں بات کہنے کی ضرورت تھی وہاں اشاروں اور کنایوں کی زبان استعمال کی ہے، جہاں بات کو واضح اور مفصل طور پر کہنے کی ضرورت تھی وہاں وضاحت اور تفصیل سے کام لیا ہے۔ ایک واقعہ، خیال اور بیان کو دوسرے واقعہ خیال اور بیان سے جو ربط اور ہم آہنگی ہونی چاہیئے وہ بہر حال موجود ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں سیدھے سادے الفاظ کے ذریعہ بڑے سے بڑے فلسفۂ زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض بعض جگہ تو انھوں نے ایسے انوکھے اور بہترین جملے لکھے ہیں جو واقعتاً تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں اور جن کی گرفت میں طویل داستانیں ہیں۔ مثلاً:۔

"انسان کے خیالات میں بدی نہیں بلکہ حالات اسے ایسا بنا دیتے ہیں۔"

"حقیقتیں دور ہوں تو انسان خواب ہی دیکھتا ہے۔"

"انسان کی آنکھیں کھلی ہوں ضمیر میں جان ہو اور احساس کند نہ ہوا ہو تو وہ ظاہر کے نیچے بھی بہت کچھ دیکھ سکتا ہے۔"

"زندگی کے سفر میں کوئی ہمسفر مشکل سے ملتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

کتاب لکھتے وقت یا مضمون لکھتے وقت اگر قلمکار نے قاری کی پسند اور ناپسند کو ایک لمحہ کے لیے بھی ذہن سے نکال دیا تو اس کی تحریر بے راہ روی کا شکار ہو سکتی ہے۔ احتشام حسین کی یہ خوبی ہے کہ وہ کسی لمحہ بھی اپنے قاری کو نظرانداز نہیں کرتے۔ اس کی پسند اور ناپسند کا التزام کرتے ہوئے وہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تحریر شوق و انہماک سے پڑھی جاتی ہے۔ "ساحل اور سمندر" کی جاذبیت، حسن اور دلکشی بھی اسی انداز تحریر کی رہین منت ہے۔ بحیثیت مجموعی "ساحل اور سمندر" خوبصورت انداز بیان، روانی خیال اور حسن زبان" کا بیش قیمت خزانہ ہے، جس کی عظمت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ احتشام حسین کی ادبی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ساحل اور سمندر کا مطالعہ ضروری ہے۔ "ساحل اور سمندر" کے مطالعہ کے بغیر احتشام صاحب کے نظریۂ ادب و زندگی کا سراغ نہیں مل سکتا۔ دیکھنے والے احتشام حسین کو "ساحل اور سمندر" کے آئینے میں دیکھیں پھر سمجھ میں آئے گا کہ احتشام حسین کون تھے!!

ہارون ایوب

پروفیسر احتشام حسین کا ایک افسانہ

"بیزاری"

پروفیسر احتشام حسین کا افسانہ نگار ہونا بعض لوگوں کے لیے شاید انکشاف کی حیثیت رکھتا ہو۔ کیونکہ وہ ایک نقاد کی حیثیت سے ہمارے ادب میں جانے جاتے تھے اچانک ان کے انتقال سے اردو ادب کی محفل سونی ہو گئی اور ایک بہترین نقاد، انسان دوست، محسن ہمدرد، غمخوار اور ایک لاجواب پروفیسر ہم سے بچھڑ گیا۔

یوں نقاد تو اردو ادب میں بہت پیدا ہوئے ہیں لیکن ایک بڑی تعداد ایسے نقادوں کی ہے جو ذاتی مفاد اور ادبی سیاست کو پیش نظر رکھ کر تنقید کرتے ہیں۔ لیکن پروفیسر احتشام حسین ان سب برائیوں سے پاک تھے۔ انھوں نے تنقید کو صرف تنقید کی حدوں تک محدود رکھا اور اپنے ذاتی تعلقات کو بیچ میں نہیں آنے دیا، ان کی تنقید ہمیشہ حقیقت پر مبنی ہوتی تھی، صاف ستھری اور پاکیزہ اس لیے قدر کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی اور ہمیشہ اردو ادب میں زندہ رہے گی اور آنے والے نقادوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

یہ ان کا فطری مزاج تھا جو ابتدائی دور میں افسانوں کی شکل میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے کئی افسانے لکھے جو بعد میں ایک مجموعے کی شکل میں بھی شائع ہو گئے ہیں ــــ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی اور پروفیسر احتشام حسین اس کے سرگرم کارکن تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک نے جو کچھ اردو ادب کو دیا اس میں پروفیسر احتشام حسین بھی شامل ہیں ـــ

ـــ ساتھ تحریک کی ترجمانی کسی نہ کسی انداز سے اُن کے ہر افسانہ میں نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ آپ دل بدلی کے قائل نہیں تھے۔ آخر وقت تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ جبکہ آج کے بہت سے بڑے بڑے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں نے وقت کے بدلتے ہوئے دھاروں کا سہارا لیا اور اپنے نظریات تک بدل ڈالے۔

"بیزاری" پروفیسر احتشام حسین نے ۱۹۴۲ء میں لکھا تھا جو سب سے پہلی بار "ادب لطیف" میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے اور آج جبکہ افسانہ ذہنی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر چکا ہے۔ یہ افسانہ فنی اعتبار سے کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں انھوں نے اپنے دور کی بدلتی ہوئی قدروں کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے اور ان کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ کہانی کا تانا بانا ایک ایسے شخص کے تصورات اور خیالات سے تیار کیا ہے جو دنیا کی ہر چیز میں بیزاری محسوس کرتا ہے، حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ دنیا کے کاروبار میں بڑی دلچسپی اور گرم جوشی سے حصہ لیا کرتا تھا لیکن اب اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ـــ اس کا جواب واضح الفاظ میں تو پورے افسانہ میں کہیں نہیں ملے گا لیکن یہ انسانی فطرت ہے اور اس کی نفسیات ہے کہ جب وہ کسی سے محبت کرتا ہے اور ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اور پھر محبوب بے اعتنائی برتے تو وہ دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور محبوب کے بغیر اسے دنیا کی ہر چیز

بھیکی معلوم ہونے لگتی ہے ـــ وہ صرف محبوب کی یاد میں اس کے تصور کے سہارے زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جہاں کہیں بھی ک
لڑکی دیکھتا ہے اس میں نجمہ کی کوئی نہ کوئی ادا تلاش کر لیتا ہے اور اسی کے سہارے محفل میں بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد دوسروں کو اس کے قر
پاتا ہے تو اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے تو پھر بے کیفی اور نامرادی کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور اسے اپنی ناکامی یاد آ جاتی ہے۔ تن
میں ہر چیز سے بیزاری اور اکتاہٹ کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے ـــ کبھی کبھی وہ خود اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ م
غلطی کی، مجھکو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مجھکو ظفر سے ہمدردی کرنا چاہیئے تھا۔ اس کی محبوبہ کا انتقال ہو گیا، جسے وہ ایک لمبے عرصے پ
کرتا رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ ان کی شادی نہ ہو سکی۔ لیکن پھر ایک دم عورت کے تصور کے ساتھ نجمہ اس کے ذہن پر چھا جاتی ہے اور دوست
لیے ساری ہمدردیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

"بیزاری" ایک بہترین افسانہ ہے جس میں انسان کی اس نفسیات کی طرف مخصوص طور پر اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کی خواہشات کی تکمیل
کے باعث وہ بیزاری اکتاہٹ اور ذہنی الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا ہے اور دنیاوی کاروبار سے فرار چاہتا ہے لیکن مر بھی نہیں سکتا ہے۔ خاص
سے محبوب کی یاد میں، اس کے تصور میں کھو کر جینا چاہتا ہے تو لوگ اسے زبردستی محفلوں میں لے جاتے ہیں، چونکہ اس کا دل اداس ہے غمگین
اس لیے اس کا دل کہیں نہیں لگتا ہے اور وہ ہر چیز میں بیزاری محسوس کرتا ہے۔ اس کی لاجواب غمازی اس افسانہ میں کی گئی ہے۔

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ پروفیسر احتشام حسین نے اس افسانہ میں بیزاری کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اکثر و بیش
پر ایسا بھی وقت آتا ہے جب اسے ساری دنیا کی مسرتیں میسر ہونے کے باوجود وہ اکتاہٹ اور بیزاری محسوس کرتا ہے۔ کسی کام میں اس کا جی نہ
ہے اس بیزاری کا ردعمل نئی نئی شکلوں میں نظر آتا ہے۔ مثلاً وہ ایک کام شروع کرتا ہے اور جلد ہی اس سے اکتا کر دوسرا کوئی کام شروع کرد
اور پھر اسے مکمل کیے بغیر دوست سے ملاقات کے لیے چل دیتا ہے لیکن بس سلام دعا کر کے واپس آجاتا ہے ـــ اسی طرح جلسے میں شریک ہوتا ہ
کی کارروائی سے اکتا کر ہال کی سفید چھت کو دیکھتا ہے۔ سفیدی کا تصور واضح ہو کر سفید کفن کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر اسے محسوس ہوتا ہ
چھت ایک بہت بڑا کفن ہے اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ اس میں لپٹے ہوئے ہیں پھر وہ ہال ایک مقبرے کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے۔ دراصل
ذہنی انتشار اور بے چینی کا نتیجہ ہے اور ایک ایسی کیفیت ہے، جس کو کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا دل گھبراتا ہے اور وہ
بیزاری محسوس کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سوچنے کا ڈھنگ تک بدل جاتا ہے ـــ دراصل یہ ایک کیفیت ہے ایک حالت ہے جس میں
و بیشتر انسان مبتلا ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اسی احساس کی شدت لوگوں کے دل و دماغ میں تیاگ کا تصور پیدا کر دیتی ہے۔ اسی حقیقت کے
پروفیسر احتشام حسین نے اس افسانہ میں انسانی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے۔

یہ افسانہ ایک انتشار پذیر ذہن کی بہترین غمازی کرتا ہے، جس میں موضوع اور مواد کے ساتھ وسیلہ اظہار کو بہت اہمیت
یہی وہ خلوص ہے جو افسانہ میں تازگی اور شگفتگی بخش دیتا ہے۔ ساتھ ہی تنقیدی شعور اور طنز کی ہلکی سی چاشنی افسانہ میں ایک نیا لا
کر دیتی ہے۔

"بیزاری" کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ واقعات تسلسل سے پیش آتے ہیں۔ قاری کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔ کردا
میں تیکھا پن ہے۔ پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ زبان اور بیان کی یہ خوبی ہے کہ وہ قاری کو یہ احساس نہیں ہونے دیتی کہ افسانہ اس کے لیے لکھا
بلکہ واقعہ میں سے واقعہ اور بات میں سے بات نکلتی چلی آتی ہے اور افسانے میں افسانہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ میں "بیزاری" معمول
ساتھ منظم بھی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پہاڑی چشمہ بہہ رہا ہو اور اس کو بغیر کسی حیل و حجت کے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہی ط
معمولی کارنامہ نہیں ہے اور یہی ایک سچے فن کار کی پہچان ہے۔

شہید صفی پوری ایم۔اے

احتشام حسین نقاد کی حیثیت سے

تنقید کا وسیع تصور

احتشام حسین ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، افسانہ نگار بھی تھے اور انھوں نے سیاسی، سماجی اور ادبی مضامین بھی لکھے لیکن اپنی مخصوص ذہنی صلاحیتوں اور اپنے رجحانات کی بنا پر انھوں نے اپنے لیے تنقید کے میدان کو منتخب کر لیا۔ تنقید اُن کے لیے محض ادب کے جمالیاتی اور نشاطی پہلوؤں کی تلاش کا ذریعہ نہ تھی بلکہ وہ اُن کی پوری وجدانی، جذباتی اور ذہنی زندگی کی ترجمانی کا ذریعہ بن گئی تھی۔ انھوں نے تنقید میں اپنے مذہبی عقائد کو بیان نہیں کیا لیکن اُن کے تنقیدی مقالات میں اُس وسیع انسانیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو اُن کے نزدیک مذہبی شعور کا جوہر ہے۔ کسی سیاسی پارٹی سے اُن کا تعلق نہ تھا لیکن تنقید میں اُن کے اُن سماجی نظریات کا عکس نظر آتا ہے جن کی نوعیت سیاسی ہونے کے ساتھ فلسفیانہ بھی ہے اس لیے کہ باشعور اور ذمہ دار فرد بحیثیت سماجی زندگی بسر کرنے کے لیے سماجی مسائل اور اُن کے حل کے بارے میں کچھ نہ کچھ نظریات اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ان معنوں میں فلسفی نہ تھے کہ انھوں نے کسی نئے فلسفۂ حیات کی داغ بیل ڈالی ہو۔ لیکن فلسفیانہ تفکر سے اُن کو گہری دلچسپی تھی تنقید ہی کے میدان میں انھوں نے اپنے فلسفیانہ افکار کا اظہار کیا ہے۔ خشک فلسفیانہ مسائل سے دلچسپی کے ساتھ ان کا دل شاعر کی طرح درد آشنا تھا اور اپنے احساسات اور جمالیاتی تاثرات کو بھی وہ تنقید ہی میں سمو دیتے تھے اس طرح تنقید اُن کی نظر میں بیک وقت خیر اور حقیقت کی جستجو کا دوسرا نام تھا۔ اس جستجو میں وہ مختلف علوم سے مدد لیتے تھے اور اپنے وسیع مطالعہ اور گہرے غور و تعمق سے نتائج اخذ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید میں احتشام حسین کی پوری شخصیت اور پوری زندگی اپنے تمام خط و خال کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے اس امر کا اندازہ ہو جائے گا کہ خود اُن کی نظر میں تنقید کا مفہوم کتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا اور یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اُن کے نقطۂ نظر کی اس وسعت ہی کی بنا پر دوسرے نقادوں کے نقطۂ نظر سے وہ مطمئن نہ ہو پاتے تھے اور دوسرے نقادوں کو بھی اُن کا نقطۂ نظر سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی۔

"اس طرح اردو کے کئی اہم نقاد اچھے تنقیدی اسلوب، وسیع مطالعہ، تیز ذہن اور گہری نگاہ کے مالک ہونے کے باوجود تنقید کے بنیادی مسائل کو حل نہیں کر رہے ہیں۔ اس وقت تنقید کا مسئلہ محض ادب کی پرکھ کا مسئلہ نہیں، اپنی زبان اور اپنے ادب سے دلچسپی لینے کا مسئلہ بھی نہیں ہے بلکہ ادب کے عالمی معیاروں کو پیش نظر رکھ کر ہر اُس علم و فن سے کام لینے کا مسئلہ ہے جس سے انسانی ذہن و عمل اور محرکاتِ عمل کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ادب کی تنقید زندگی اور زندگی کی قدروں کی تنقید ہے، کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے کی تنقید اور ادب کے اندر عقیدے اور بہتر نظامِ زندگی کی تلاش ہے۔ تنقید نہ تو تاریخ ہے نہ فلسفہ، نہ سیاست ہے

اور نہ سائنس لیکن علوم جس حد تک انسانی ذہن میں داخل ہوتے اسے متاثر کرتے اور شعور کا جزو بنتے ہیں اس کی جستجو ہے۔۔۔ اگر تنقید کوئی علمی کام ہے اور محض تاثرات کا بیان نہیں ہے تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا جن سے زندگی اور ادب کو سمجھا جا سکتا ہے پھر اصل دشواری یہ ہے کہ ان متضاد اور متصادم نقطۂ نظر رکھنے والوں کی تنقید کرنے کی بھی ضرورت ہوگی جو مشکل اور ذمہ دارانہ کام ہے۔"

(ذوقِ ادب اور شعور ص ۲۵۴)

جس نقاد کی نظر میں تنقید کا بنیادی مقصد ہی ایک ایسے مربوط فلسفۂ حیات کی جستجو ہو جو زندگی کے تمام بنیادی مسائل کو حل کر سکے کسی دوسرے نقاد کے یہاں نقطۂ نظر کے فقدان کو کبھی پسند نہیں کر سکتا۔

"وہ نقاد جو ہر ادبی کارنامے پر سر دھنتا ہے، ہر ادیب اور شاعر کو پسند کرتا ہے اور کسی نقطۂ نظر سے تعرض نہیں کرتا بقول آسکر وائلڈ اس کا حال اس نیلام کرنے والے کا سا ہے جو ہر مال کی تعریف کرتا ہے۔"

(تنقید اور عملی تنقید ص ۲۲)

اور نہ وہ ان تنقید نگاروں کی تائید کر سکتا ہے جو ادب کے بارے میں فیصلہ کن انداز میں رائے دینے سے کتراتے ہوں اور محض کیفیات کی باز آفرینی، پُر لطف اثر پذیری اور تشریح و تفسیر ہی کو تنقید کا مقصد قرار دیتے رہیں۔

"بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تنقید نگار کا کام ادب کے متعلق فیصلہ کن انداز میں رائے دینا نہیں ہے۔ بلکہ ان کیفیات کو دہرا دینا ہے۔ جو ادیب پر تخلیق کے وقت طاری ہوئی تھیں۔ اس گروہ کی نمائندگی کسی نہ کسی شکل میں وہ تمام نقاد کرتے ہیں جنھیں تاثر پسند کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کی سب سے زیادہ پُر جوش حمایت اور دلچسپ وضاحت امریکہ کے ایک نقاد اسپنگارن نے کی ہے۔ اور اپنے نقطۂ نظر کا نام "تنقید جدید" رکھا ہے۔"

(تنقید اور عملی تنقید ص ۲۲)

مفکرانہ سنجیدگی ہی نے احتشام حسین کو بہت سے ان تنقیدی اسالیب سے غیر مطمئن رکھا جن کا دائرۂ عمل محدود ہوتا ہے یا جو سطحی بنا دیتے ہیں۔ وجہ یہ نہیں ہے کہ ان اسالیب نقد کو کسی مخصوص نقطۂ نظر کی حمایت میں سرسری طور پر رد کر دیا گیا ہو بلکہ غائر نظر سے جائزہ لینے کے بعد انھوں نے اُن کی داخلی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک کتب نقد "تقابلی مطالعہ" ہی کو تنقید کا واحد ذریعہ تقابلی مطالعہ یقیناً مفید ہو سکتا ہے لیکن اس کی افادیت محدود ہے۔ اس میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ نقد کی ساری عمارت اسی پر بلند کی اسی طرح ادب کو کلاسیکی اور رومانی میں تقسیم کر دینا بھی صحیح نہیں ہو سکتا اس لیے کہ داخلیت اور خارجیت کے عناصر ہر ادیب کے یہاں خالص داخلیت اور خالص خارجیت محالِ عقلی ہے۔ ان کا امتزاج ہر ادیب کے یہاں ملے گا محض ایک عنصر کے غالب ہونے کی بنا ہم کلاسیکی یا رومانی قرار دے لیتے ہیں۔ اسی طرح لفظی تحقیق قدیم ادب کے سلسلے میں ناگزیر ہے اور اس کی افادیت اپنی لیکن وہ محض تنقید کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے اور بجائے خود کافی نہیں ہے۔

"کچھ نقاد تقابلی مطالعہ کو سب سے اچھا تنقیدی مطالعہ قرار دیتے ہیں۔ تقابلی مطالعہ کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تقابلی مطالعہ ہمیشہ ناقص ہوتا ہے کیونکہ تقابل کے تمام عناصر کو پیشِ نظر رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور اگر ایک یا کئی اہم پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں تو نتائج بالکل غلط ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کچھ نقاد موضوعات کے اعتبار سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کچھ سارے ادب کو کلاسیکی

اور وجدانی میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ہر شاعر اور ادیب کو اسی چوکھٹے میں بٹھانا ضروری سمجھتے ہیں کچھ تحقیقی میلان رکھتے ہیں اور صرف لفظی مطالعہ کو اہم جانتے ہیں اُن کی ساری قوت اس پر صرف ہوتی ہے کہ مختلف نسخوں میں کسی خاص لفظ کی کیا کیا شکلیں ملتی ہیں۔ اس ضمن میں بہت سی کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں لیکن انھیں تنقید سے کوئی واسطہ نہیں۔" (تنقید اور عملی تنقید ص۳۱)

احتشام حسین کا نقطۂ نظر عقلی تھا اور وہ زندگی کے مسائل کا شعوری ادراک اور ان کا باشعور حل تلاش کرنا چاہتے تھے۔ نفسیاتی نقادوں سے ان کے اختلاف کا سبب یہی تھا کہ اس کے بعض مکاتب ذہن کی پہنائی میں تھوڑی دور تک کرتے ہیں اور بہت سے اہم سوالات کو تشنہ چھوڑ دیتے ہیں اور بعض مکاتب بالخصوص تحلیل نفسی محض ادب ہی کو نہیں بلکہ زندگی کو بھی ایک چیستاں بنا دیتے ہیں:۔

"نقادوں کا ایک بہت بڑا گروہ ادب کے نفسیاتی مطالعہ کا قائل ہے اس قسم کے مطالعہ کی کئی شکلیں ہیں۔ کئی اہم مشہور نقاد ادیب اور شاعر کی سوانح عمری کی روشنی میں اس کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کو تنقید کہتے ہیں یعنی وہ ادب کو صرف شخصیت کا اظہار سمجھتے ہیں۔ اور کچھ نہیں۔ لیکن ہر ادب پارے کو اسی ترازو پر تول کر صحیح نتائج تک نہیں پہونچا سکتے۔ اس کے علاوہ اس طریق کار سے نقطۂ نظر محدود ہو جاتا اور ادبی روایات سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تحلیل نفسی کے رسیا اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فن کی تخلیق شعور کا نہیں لاشعور کا نتیجہ ہے۔ ادیب اور شاعر کا ذہن کسی اندرونی طاقت سے تپتا ہے جس طرح بچہ کھیل میں رم جاتا ہے ویسے ہی فنکار اپنے فن میں غیر اختیاری طور پر مصروف ہوتا ہے۔ ادیب نارمل انسان ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ اپنے احساس جسم کے لئے حفاظتی تدابیر ڈھونڈھتا ہے اور اس کا لاشعور اس کی تحریروں میں نمایاں ہو جاتا ہے ان تجزیہ نفسی والوں نے ادب کو عجیب معمہ بنا دیا ہے۔ جس کا تعلق شعور سے ہے ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ نقاد لاشعور کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکے گا۔ اور پھر بھی صحیح نتائج تک اس کی رسائی ہو سکے گی یا نہیں یہ کوئی نہیں بتا سکتا پھر اگر اس سلسلے میں نقاد کے لاشعور نے بھی کوئی راہ اختیار کر لی تو اس بھول بھلیاں سے باہر نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔"

"............ نفسیاتی مطالعہ کے کئی پہلو اور ہیں جیسے کسی مصنف کا نفسیاتی مطالعہ اس کے تخلیقی عمل کا مطالعہ تصنیف کے کرداروں، موضوع کا مطالعہ تصنیف کا جو اثر پڑھنے والوں پر پڑے گا۔ اس کا نفسیاتی مطالعہ، سبھی باتیں نفسیاتی مطالعہ میں شامل ہیں اور نقاد ان میں سے ایک یا کئی پہلوؤں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ نفسیات کے جتنے نظریے ہیں اتنے ہی ادبی نظریے بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی ادیب کو جنسی بیماری کا شکار کہتا ہے جس کی بیماری جسمانی نہیں ذہنی ہے۔ کوئی احساس کمتری اور برتری میں مبتلا دیکھتا ہے۔ کوئی ایذا پرست اور ایذا دہندہ میں تقسیم کرتا ہے۔ کوئی متوازن مزاجیت پسند اور تفریح پسند میں پھر ان کے اندر بھی چھوٹی چھوٹی قسمیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نفسیات کی مدد سے کسی ادبی کارنامے کی قدر و قیمت اور عظمت کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔"

(تنقید اور عملی تنقید۔ ص۳۳-۳۲)

عقلی، علمی، فلسفیانہ، رجائی اور مثبت نقطۂ نظر

احتشام حسین کا ذہنی رجحان عقلیت پسندی اور حقیقت پسندی بالخصوص سماجی حقیقت پسندی کی طرف تھا اسی لیے وہ عینیت

پسندی اور رومانیت پر اعتماد نہ کرتے تھے اور ان کی ہمیشہ یہ کاوش رہتی تھی کہ وہ ذوقی اور وجدانی تصورات کو عقلی معیاروں میں تبدیل کر دیں تاکہ وہ عقلی حیثیت سے قابل قبول بن جائیں۔

> نقاد ہونا اور بعض چیزوں کو بعض چیزوں پر ترجیح کی صلاحیت نہ رکھنا متضاد باتیں ہیں اور جیسے ہی اپنی قوتِ ممیزہ کے استعمال کا سوال پیدا ہوتا ہے ویسے ہی نقطۂ نظر کا سوال بھی درمیان میں آ جاتا ہے اس سے گھبرانا مفید نہیں اسے تسلیم کرنا صحیح راہِ عمل ہے۔" (ذوقِ ادب اور شعور ص۶۱)

عقلیت پسند مفکر کی طرح احتشام حسین ایک واضح، مربوط اور مکمل فلسفۂ حیات کو شعوری طور پر اختیار کرنے کو ضروری خیال کرتے تھے اور ایک نقاد کی حیثیت سے وہ اس فلسفہ کو مدون کرنا چاہتے تھے جو ادب میں چھپا ہوا ہے اور جس کی تدوین ہی پر ادب کی با معنی تشریح تفسیر اور تنقید ممکن ہے۔ لیکن جو بات لائق توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ان کے فلسفۂ حیات اور فلسفۂ ادب میں تضاد نہ تھا بلکہ ہم آہنگی تھی اور تنقید کے دائرہ میں آ کر وہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

> "اس سے پہلے کہ نقاد زندگی کو ایک کل، ایک وحدت کی حیثیت سے نہیں دیکھتے تھے اس لیے شعر و ادب زندگی کے دوسرے مظاہر سے کوئی گہرا رشتہ رکھتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تھے ایسی حالت میں واضح تنقیدی اصولوں کا وجود میں آنا آسان نہیں تھا۔" (ذوقِ ادب اور شعور ص۶۹)

وہ تنقید اور عملی تنقید کے دیباچہ طبع دوم میں وہ لکھتے ہیں:

> "غلط یا صحیح میرے ذہن میں تنقید کا تصور فلسفۂ ادب کا سا ہے اور میں تقریباً اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ادب کی محض ادبی تنقید ایک مفروضہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ادب جن اجزا سے مرکب ہے وہ محض فن کے تصور سے گرفت میں نہیں آ سکتے۔ انھیں ادیب کے مکمل علم و شعور میں تلاش کرنا اور اس کے مقصد کی روشنی میں اس کا جائزہ لینا چاہیے۔ ادیب کے شعور کی پرکھ میں ہر نقاد اپنے پیمانۂ علم و احساس کی وجہ سے افراط و تفریط کا شکار ہو سکتا ہے اور میں خود کو اس سے ماورا نہیں سمجھتا۔ لیکن میں اس فریب میں آنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ادب کو سمجھنے کے سلسلہ میں سماج، معاشرہ، انسانی افکار، سائنس، زندگی، تہذیب اور علوم کا تذکرہ ایک غیر ادبی، غیر تنقیدی فعل ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ادب انھیں سے وجود میں آتا ہے اگرچہ ان سے وجود میں آنے کے بعد اس کی ایک منفرد کیفیاتی حیثیت ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ادب میں مظاہر حیات کی جستجو کرنے والا ادب کے اصل منصب سے بے بہرہ ہو۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ پانی کو ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایک خاص تناسب کا نتیجہ بتانے والا پانی کی اہمیت، افادیت یا انفرادیت کا منکر ہے۔"
> (تنقید اور عملی تنقید ص۱۲)

مندرجہ بالا اقتباس سے ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ نقاد جب عقلی نقطۂ نظر کو اختیار کر کے اصول مدون کرنا شروع کرے تو اس کا نقطۂ نظر لازمی طور پر علمی اور سائنٹفک ہو جاتا ہے اس لیے کہ بغیر علم کے عقل کی صحت کا کوئی معیار نہیں ہو سکتا۔ احتشام حسین زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس کی تشریح مختلف علوم کرتے ہیں۔ ادب بھی زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے اور ایسا شعبہ جس میں زندگی کے تمام مسائل سمٹ آتے ہیں اس لیے ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ ادب کی تشریح کے لیے ہمیں اپنے پورے علمی ذخیرے کا جائزہ لینا چاہیے اور اگرچہ فلسفۂ ادب کی تدوین کے لیے علم کا کوئی ایک شعبہ کافی نہیں ہو سکتا لیکن ادب کے اجزائے ترکیبی کے سمجھنے میں

ضرور ملتی ہے۔ اگر غور سے تنقیدی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ نقادوں کی تنگ نظری کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ جس نقاد کو جس شعبۂ علم میں زیادہ دخل ہوتا ہے یا جس سے اُسے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اسی سے وہ اُصولِ نقد اخذ کر کے سارے ادبی تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادب کے بعض سے پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں اور بہت سے غلط نتائج نکل آتے ہیں۔

علمی نقطۂ نظر متوازن ذہنوں کو جبر اور قنوطیت کی طرف نہیں لے جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ علم کی مختلف شاخوں کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے اور علوم کا آپس میں اب تک ایسا رشتہ نہیں قائم ہو سکا ہے جس سے وہ سب مل کر انسانی ذہن کی ایک ہی منزل کی طرف رہنمائی کریں اس لیے ذہن کے انسان کے یہاں اس سے بددلی پیدا ہوتی ہے اور اس کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے لیکن انسانی علم کا ارتقا اب ایک ناقابلِ حقیقت بن چکا ہے اور اس سے انسان کا حوصلہ بلند ہوا ہے اور اس کے زندہ رہنے اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے عزائم کو تقویت ہے۔ اسی لیے تعمیری اور مثبت طرزِ فکر اختیار کرنے والا ذہن کبھی جبر اور قنوطیت کو قبول نہیں کرتا۔ ایک مقالہ میں احتشام حسین "اقبال کی ت کا تجزیہ" کرتے ہوئے خود اپنی رجائیت کا بھی اظہار کر دیتے ہیں:-

> "یہ بالکل واضح ہے کہ جبر کا عقیدہ انسان کو متشائم اور قنوطی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ شوپن ہار کا انسان جبر کی چکّی میں اس طرح پس رہا ہے کہ وہ اپنی آرزوؤں کے مطابق جی ہی نہیں سکتا۔ اقبال کے خیالات اس تصور کی زبردست تردید کرتے ہیں۔ اُن کا انسان فاعلِ مختار ہے اور یہی اختیار اس کے ارتقا کی نوعیت متعین کرتا ہے۔ انھیں کے الفاظ میں کسی شے کی تقدیر نہ مٹنے والی مقسوم نہیں جو خارج سے جبریہ طور پر عائد کی گئی ہو بلکہ وہ خود شے کی اندرونی رسائی اور اس کے قابلِ تحقق امکانات ہیں جو اس کی فطرت میں پوشیدہ تھے۔"
>
> (تنقید اور عملی تنقید ص۱۵۸)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جبر یا تقدیر پرستی کا نہ صرف فرد کے ارتقا پر خراب اثر پڑتا ہے بلکہ اس سے اجتماعی زندگی کے ارتقا میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ اور یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ روحانیت کے نام پر عقیدۂ جبر کی تبلیغ کرنے والوں کا نظریۂ جبر علمی نہ تھا بلکہ سیاسی تھا عام طور پر اس کا سہارا اسی لیے لیا گیا تاکہ کمزور طبقوں کو محکوم رکھا جائے اور عوام کے ذہنوں میں سماجی انصاف اور عدل کا تصور راسخ نہ ہونے پائے۔

> "بعض مفکروں کا خیال ہے کہ مشرق کی روح قنوطی ہے اور اس میں شک نہیں کہ مشرقی ادب کا بڑا حصہ زندگی سے بیزاری، بیراگ اور فرار کی تلقین کرتا رہا ہے۔ کیونکہ یہاں جن فلسفیوں نے عروج پایا اُن میں سے اکثر و بیشتر نے روح اور جسم کی دوئی کو تسلیم کر کے روح کو آسمان تک پہنچانے اور جسم کو مٹی میں ملا دینے پر اتنا زور دیا کہ دنیا اپنی ساری لذتوں اور نعمتوں کے باوجود ہیچ نظر آنے لگی اور جس طرح کی معاشرتی زندگی رائج تھی اس نے برہمن آقا، بادشاہ اور جاگیردار کو مختلف ادوار میں سربلند کر کے عوام کو پستی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ روحانیت کے نام پر تقدیر پرستی نے زور پکڑا اور تقدیر پرستی نے ان اخلاقی قدروں سے محبت کرنا سکھایا جو حالات کو بدلنے سے روکتی ہیں کیونکہ یہی برسرِ اقتدار طبقہ کے لیے ایک مفید فلسفۂ زندگی کا کام دے سکتا ہے۔"
>
> (تنقید اور عملی تنقید ص۱۴۸-۱۴۹)

جبر کا نظریہ انسانی عظمت کی نفی کرتا ہے اور اس کی خود اعتمادی کو مجروح کرتا ہے اسی طرح انسان کے فاعلِ مختار ہونے کے نظریہ

ہے ساتھ انسان کی قوت عمل پر اعتماد اور اُس کی عظمت کا تصور جُڑا ہوا ہے اور وہ تسخیر فطرت اور انسانی معاشرہ کی تہذیب و ترقی کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

"تسخیر فطرت کا تصور گوناگوں حیثیتوں سے انسانی عظمت کا تصور ہے کیونکہ انسان کے اندر جو حرکت اور قوت ہے وہ اُسے عمل پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ اور اگر قوانین فطرت اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں تو وہ اُن کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بجائے اُن پر قابو پانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ سائنس کی ترقی اس کے اس عمل کا ایک جزو ہے۔" (تنقید اور عملی تنقید ص۱۵۱)

زندگی کو جب ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھا جائے گا اور انسان کو فاعل مختار اور باشعور تسلیم کیا جائے گا تو زندگی کو با مقصد بھی تسلیم کرنا ضروری ہو جائے گا اور تمام اعمالِ حیات اسی مقصد کے تابع قرار پائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جو نقاد اس نقطۂ نظر کا حامل ہو گا وہ ادب کو مقصدیت سے مستثنیٰ نہیں قرار دے سکتا بلکہ اسے بھی ارتقا کی جدوجہد کا ایک مظہر قرار دے گا اور عدم مقصدیت کو کبھی پسند نہ کرے گا۔

"دنیا کے قدیم اور جدید اعلیٰ ادب کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ لکھنے والے کا پورا نقطۂ نظر پوری قوت اور پوری ادبی رعافت کے ساتھ ادب کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

...... عدم مقصدیت ایک طرح کا فریب ہے ادیب کا مقصد کسی نہ کسی طرح اس کے تخلیقی یا توضیحی کارناموں میں داخل ہوتا ہے۔" (تنقید اور عملی تنقید ص۵۰-۵۱)

مارکسی تنقید تنقید کو بامقصد قرار دینے کے بعد ضروری تھا کہ احتشام حسین تمام مکاتب نقد میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں اور انھوں نے مارکسی تنقید کو پسند کر لیا اس لیے کہ وہ اُن کی نظر میں سب سے زیادہ بامقصد کارآمد اور سائنٹیفک تھی:۔

"نقادوں کا ایک اور گروہ ہے جو تاریخی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ بعض جرمن نقادوں نے اس تصور کو ایک حد تک پہونچا دیا اور روح عصری کو سب کچھ قرار دیا کبھی کبھی اس نقطۂ نظر سے دیکھنے والے ادبی کارناموں کا اچھا تجزیہ کر لیتے ہیں لیکن یہ نقطۂ نظر خود تاریخی حقائق کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہتا ہے اور سماجی ارتقا کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس سے زیادہ سائنٹفک نقطۂ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر نقطۂ نظر ہے۔ اور ادبی مطالعہ کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا گو اس پہلو کو پیش نظر رکھنے والے تمام نقاد یکساں بصیرت نہیں رکھتے بعض محض تجزیہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ بعض ادب اور معاشی ارتقا کو میکانکی طور پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض تاریخی جبریت کو پیش نظر رکھ کر ادیب کو اس کی سماجی ذمہ داری سے معذور قرار دیتے ہیں۔ بعض ادیب سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ماحولیت کے جبر کو توڑ کر بہتر زندگی کی جانب رہنمائی کر سکتا ہے اور اسے ایسا کرنا چاہیئے۔ نقطۂ نظر کے یہ نازک فرق بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ انھیں سے سماج اور زندگی میں ادب کی اصل جگہ متعین ہوتی ہے۔ اور ادب، ارتقا تہذیب اور جدوجہد حیات میں ایک مضبوط مگر پُر اثر آلہ بنتا ہے۔ ادب کی یہ حیثیت کہ اس میں سماجی حقائق اپنی طبقاتی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور ادیب کے سماجی رجحان کا پتہ اس کے خیالات سے چلتا ہے۔ ادیب زندگی کی کشمکش میں شریک ہو کر اُسے بہتر بنانے کی راہ بتا سکتا ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری اور مارکسی تنقید میں سب سے نمایاں

شکل میں ملتی ہے۔ جو نقاد اس نظریۂ تنقید کو اپناتے ہیں وہ روحِ عصر سماجی نفسیات، عمرانیات، یعنی ان تمام باتوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ جو طبقاتی سماج میں پیداوار کی معاشی بنیادوں کے اوپر فکری اور فلسفیانہ حیثیت سے وجود میں آتی ہیں۔ تعبیرِ ادب کے اس مادی نظریہ پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس پر عمل کرنے والے ادب میں ادبیت کے بجائے فلسفۂ تاریخ، معاشیات اور دوسرے عناصر کی جستجو کرتے ہیں یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ کیونکہ ادب محض چند فنی خصوصیات کا مجموعہ نہیں ہے اس سے زیادہ ہے پھر فنی خصوصیات خود تاریخی حالات اور سماجی ارتقاء سے وجود میں آتی ہیں۔ اس وقت عملی تنقید کا یہی طریقہ سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں خارجی اور داخلی کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پاتا۔ لیکن زور انھیں باتوں پر زیادہ دیا جاتا ہے جو ادیب کے سماجی اور فنی طرح کے شعور سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ نظریہ نہ تو جمالیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کرتا ہے نہ ادب کو عمرانیات اور سیاست کا بدل قرار دیتا ہے۔"
(تنقید اور عملی تنقید ص ۳۲-۳۳)

مارکسزم کے بنیادی اُصول یہ ہیں کہ ذہن مادہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہیگل کا تصورِ کائنات ذہنی تھا اور اُس نے اپنے اصول کی بنیاد جدلیات (Dialectics) پر رکھی تھی جس میں متضاد تصورات کے ٹکراؤ سے ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے جو ان کو اپنے میں جذب کرکے ایک نئی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مارکس نے اس کا انطباق مادہ پر کر کے جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) کے فلسفہ کی بنیاد رکھی جس کی رو سے تاریخ کو قانونِ ارتقا کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ یہ ارتقا متضاد قوتوں کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں یہ تصادم سرمایہ داروں اور مزدوروں کے طبقات میں ہے جس میں سرمایہ داروں کا مقصد ذاتی منافع اور مزدوروں کا مقصد اُن کی کوششوں کو ناکام بنا کر اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ہے۔ مارکس نے صرف مذہب ہی نہیں بلکہ تمام طبیعیاتی فلسفوں کو بھی بے اصل قرار دیا اور کہا کہ بنیادی شے معاشی نظام ہی ہے اور طریقِ پیداوار ہی پر قانون، سیاست، اخلاق اور مذہب کی بنیاد بھی قائم ہوتی ہے۔ اخلاق و مذہب حکمراں طبقہ کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں مگر تاریخ کا قانون بوسیدہ معاشی نظام کو شکست دے دیتا ہے اور انقلاب کے ذریعہ ایک نیا اور ترقی یافتہ نظام اُس کی جگہ لے لیتا ہے چونکہ تمام طبیعاتی نظام ہائے فکر کا بنیادی مقصد ناقابلِ تغیر اصول کی تلاش ہے اور وہ محض کائنات کی تفسیر کرتے ہیں اس لیے مارکس کو خیال پیدا ہوا کہ ناقابلِ تغیر اصول انقلاب کی مخالفت کرتے ہیں اور کائنات کی تفسیر کا مطلب محض یہ ہے کہ دنیا جیسی ہے ویسی ہی رہے گی اور اس میں کسی تبدیلی لانے کی کوشش کرنا عبث ہے۔ اور اس کے شدید ردِ عمل میں اُس نے ناقابلِ تغیر اصول و قوانین ہی کا انکار کر دیا اور چونکہ رہبرانِ مذاہب کی وفات کے بعد اُن کے جانشینوں نے حصولِ اقتدار کے لیے اُن کی تعلیمات کو مسخ کرکے ایسے اصول وضع کیے جن سے خود اُن کے اقتدار یا برسرِ اقتدار طاقتوں کو تقویت پہنچتی تھی اس لیے مارکس نے ایک کلیہ بنا لیا کہ تمام اخلاق و مذاہب نے حکومتوں کے ظلم و جور اور سماج کے طاقتور طبقوں کی حمایت کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ مارکس نے کہا کہ فلسفہ کا مقصد کائنات کی تفسیر نہیں ہے بلکہ دنیا کی ازسرِ نو تخلیق ہے اور قانونِ فطرت کا علم حاصل کر کے قانونِ ارتقا کے ماتحت فطرت کی تسخیر!

مارکس نے لاینحل مابعد الطبیعاتی مسائل اور فرد سے متعلق ذہنی، اخلاقی اور روحانی مسائل سے قطع نظر کرکے پورے انسانی معاشرہ کو تاریخ کی روشنی میں مادی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا اور مابعد الطبیعاتی سطح پر محض قانونِ ارتقا، اور اخلاق و سیاسی سطح پر محض معاشی مساوات قرار دیا۔ تاریخ نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ انسانی معاشرہ ہمیشہ سے طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حاکم ہوتا ہے ایک محکوم،

ایک ظالم ہوتا ہے دوسرا مظلوم اور جب اُس نے انسانی افکار کا جائزہ لیا تو اُسے معلوم ہوا کہ ہر دور میں نظریاتی جنگ بھی جاری
جس میں ایک طبقہ ظالموں کا حامی رہا ہے اور ایک طبقہ نے مظلوموں کی حمایت کی ہے اس لیے اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسانی معاشرہ
ارتقاء طبقاتی تصادم اور انقلاب کے ساتھ وابستہ ہے۔

مارکس پوری کائنات اور پورے انسانی معاشرہ کا ایک مخصوص نقطۂ نظر سے جائزہ لیتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد تمام
ہے یعنی نوع انسانی میں سماجی عدل اور انصاف اور معاشی مساوات کا قائم کرنا اور لوٹ مار، ظلم اور ناانصافی کو ختم کر کے سب ا
کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع فراہم کرنا اور چونکہ سرمایہ دار طبقہ ہر ملک میں برسر اقتدار طبقہ سے ساز باز رکھتا
اسے ہمیشہ ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اُن کے مفادات کے تحفظ کے لیے روحانی اور اخلاقی فلسفے گڑھتے رہتے ہیں اس لیے اُس
اپنے بنیادی مقصد کے حصول کے لیے ایک فلسفہ کی تدوین کی تو اُن تمام راستوں کو بند کر دیا جن سے نظریاتی طور پر اُس کے مقصد کی مخا
پہلو پیدا ہو سکتا تھا۔ مارکس کے خلوص کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کے بنیادی مقصد سے کسی بھی باشعور اور انسان دوست
اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ مارکس کا فلسفۂ حیات صرف معاشیات پر مبنی ہے اور جب اس فلسفہ کو ا
تک پھیلا دیا جائے گا تو معاشیات کے علاوہ دوسرے شعبوں سے متعلق جو نتائج اخذ کیے جائیں گے وہ کبھی صحیح ہوں گے او
کبھی اُن میں محض نصف حقیقت ہوگی اور کبھی وہ حقیقت سے بالکل معرا ہو جائیں گے۔ کبھی اصول بن جائیں گے اور بجائے خو
نظر آئیں گے لیکن عملی تنقید میں حقائق پر اُن کا اطلاق نہ ہو سکے گا اور کبھی اُن سے متضاد نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کی نہایت وا
یہ ہے کہ ایک طرف مارکس انسان کے تخلیقی عمل پر اتنا زور دیتا ہے کہ فلسفہ کا مقصد تفسیر کائنات کے بجائے کائنات کی از
قرار دیتا ہے اور دوسری طرف تاریخ کے اصول ارتقاء کے عمل کے جبر کی تبلیغ کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکسی تنقید کا حامی ن
کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہے کہ وہ تاریخی ارتقاء کے جبری طور پر ظہور پذیر ہونے پر زور دے اور نتیجۃً ادیب کو اس کی ذمہ دا
سبکدوش قرار دے کر محض معاشی نظام کا ایک بے بس آلۂ کار قرار دے یا انقلاب لانے اور مظلوم طبقہ کی حمایت کرنے کی شعور
ذمہ دار قرار دے اور مارکسی نقادوں میں سے بعض نقادوں نے اول الذکر نظریہ کو اپنایا اور بعض نے دوسرے نظریہ کو اختیا

جب انسانی علوم کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ہمیں دو طرح کے علوم نظر آتے ہیں ایک وہ ہیں جن کا مقصد ہے قوانین فطرت
اور دوسرے وہ ہیں جن کا مقصد ہے انسانی اقدار کی تدوین۔ پہلے قسم کے علوم کا علوم طبیعی یعنی سائنس میں شمار ہوتا ہے۔ سائنس
یہ بتاتی ہے کہ قانونِ حرکت کیا ہے۔ یعنی کوئی بات کس طرح ہوتی ہے اور کن قوانین فطرت کے ماتحت ہوتی ہے۔ لیکن سائنس
کہ کیا ہونا چاہیے یعنی اقدار سے بحث کرنا اس کے حدود سے خارج ہے۔ فلسفہ، مذہب، ادبی تنقید، جمالیات وغیرہ
ہیں جو اقدار ہی سے بحث کرتے ہیں لیکن ان علوم میں عیب ہے کہ وہ سائنس سے اپنا ربط قائم نہیں رکھ پاتے ہیں۔ وہ یہ تو بت
کہ کیا ہونا چاہیے" لیکن "کیا ہے" اور "کیا ہونا چاہیے" میں رشتہ نہیں قائم کر پاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر ہوا
ہو جاتے ہیں وہ خالص عینیت اور روحانیت کی شکل اختیار کر کے مادی دنیا کے حقائق یعنی قانونِ فطرت کو یکسر نظر اندا
مارکس نے اپنے فلسفہ کی "مادیت" پر اسی لیے زور دیا ہے تاکہ اس قسم کے فلسفوں کو ذہن میں راہ پانے کے تمام راستے مسدود
مارکس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد مادی اور تاریخی حقائق پر رکھی ہے اور اسی لیے وہ اس کے سائنٹفک ہونے کا دعویدار ہے وہ
اصول ارتقا کو اسی طرح اخذ کرتا ہے جس طرح مادی اجسام کی حرکت سے نیوٹن نے قانونِ کشش کو اخذ کیا تھا۔ اب اگر یہ
قانونِ فطرت Law of Nature ہے تو یہ محض "کیا ہے" کی ترجمانی کرتا ہے اور اس سے مرف جبر کا پہلو

لیکن انسانی مسائل پر بحث کرتے ہوئے انسانی اقدار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اقدار کا تصور بغیر انسان کو فاعل مختار مانے ہوئے ممکن نہیں ہے اور یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی۔ساں ان کے ذہنی اور جسمانی اعمال جن قوانین فطرت کے تابع ہیں اُن میں اتنی وسعت ہے کہ ایک ہی قانون کے تحت انسان متضاد راستے اختیار کر سکتا ہے جن میں ایک صحیح اور ایک غلط ہوتا ہے۔ قانون ارتقاء میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ وہ اختیار کے ان دونوں اچھے اور برے پہلوؤں کو سمیٹ سکے اب اگر یہ قانون ارتقاء "کیا ہونا چاہیئے" کی ترجمانی کرتا ہے تو اس سے انسان کے شعور اور باختیار عمل کا پہلو ہی نمایاں ہوگا اور "کیا ہونا چاہیئے" کے ساتھ کمیونزم کے بنیادی اصول میں عینیت پسندی کا ایک عنصر لازمی طور پر داخل ہو جائے گا جس کا مارکس مخالف تھا۔ "کیا ہے" اور "کیا ہونا چاہیئے" میں ہم آہنگی کا نہ ہونا ہی کمیونزم کی ایک فلسفہ کی حیثیت سے بنیادی کمزوری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حقیقت پسندی کے لیے یہ بات ہرگز ضروری نہیں ہے کہ عینیت پسندی کو یکسر ناقابل قبول قرار دے دیا جائے۔ ذہن یقیناً مادہ کا پابند ہے اور مادہ ہی سے پیدا ہوتا ہے لیکن انسانی ذہن کسی شے کا تصور کرنے کے لیے اُس کے مادی وجود کا ہرگز پابند نہیں ہے۔ غیر طبقاتی سماج کا خواب پورے طور پر اس وقت بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے لیکن مارکس نے اتنے عرصہ قبل اس کا تصور کر لیا۔ انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے اس کی بنیاد اُس کے ذہن کی تخلیقی صلاحیت پر ہے۔ وہ موجود مادی اشیاء کے تصورات کی آمیزش سے ہمیشہ ایک نئی شے کا تصور کر لیتا ہے اور اس کے بعد اس کی کاوش سے اُس کا خواب سچا ثابت ہوتا ہے۔ عینیت پسندی اپنی تمام خامیوں کے باوصف انسانی فطرت کا ایک اہم جزو ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم اپنی اس فطری صلاحیت سے تخلیقی اور تعمیری کام لیں اور محض ہوائی قلعے بنانے میں اس کو ضائع نہ کریں۔ ہیگل کی تصوراتی کائنات کے ساتھ اس کا قانون ارتقا ہم آہنگ تھا لیکن وہ مارکس کے سائنٹفک اور مادی فلسفہ سے میل نہیں کھاتا اس لیے کہ اگر خالص سائنٹفک نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس تصور کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی کہ انسانی معاشرہ کے طبقات باہمی تصادم سے لازمی طور پر ارتقا کے منازل طے کر رہے ہیں۔ جہاں تک تاریخ سے نتائج اخذ کرنے کا سوال ہے، تاریخ ہی سے ایسی مثالیں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں جن سے ظاہر ہو کہ انسان نے حقیقی معنوں میں اب تک کوئی ترقی نہیں کی ہے۔ اور بہت سے مفکرین نے یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ انسانی معاشرہ ارتقا کے بجائے روبہ زوال اور مائل بانحطاط ہے۔

مارکس کا ناقابل تغیر اصول کا انکار بھی کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہے اس لیے کہ اگرچہ وہ زندگی کے کسی شعبہ میں کسی ناقابل تغیر اصول کا قائل نہیں ہے لیکن خود اس کا اصول ارتقا جس کا اطلاق وہ زندگی کے تمام شعبوں پر کرتا ہے ایک ناقابل تغیر اصول ہے۔ اس لیے کہ اگر اسے بھی قابلِ تغیر مان لیا جائے گا تو خود کمیونزم ہی کی عمارت زمین پر آرہے گی۔ طبقاتی آویزش کو ختم کر کے مساوات، عدل اور باہمی تعاون کی بنیادوں پر ایک نئے سماج کی تعمیر خود ایک آئیڈیل ہے جس کے حصول کے بعد جدلیات (DIALECTIES) کا اصول شکست ہو جائے گا اس لیے کہ اس کے بعد متضاد عناصر کے ٹکراؤ سے ایک نئی اور بہتر شے کے وجود میں آنے کے لامتناہی عمل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

احتشام حسین نے اپنے تنقیدی مقالات میں بار بار مارکسزم کے اصول کو دہرایا ہے۔ ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن میں انھوں نے مارکسزم کے بنیادی نظریات کی تائید کی ہے۔

۱۔ شعور مادہ کا پابند ہے

"تاریخ اور سماج کے مطالعہ نے بتایا کہ خیالات اور اُن کے فنی مظاہر بھی انسان کی مادی زندگی کے عروج و زوال سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان جس طرح کا سماجی اور معاشی نظام رکھتا ہے اُسی کے مطابق اُس کے خیالات اور شعور کا ارتقا ہوتا ہے اس تاریخی

حقیقت نے اس فلسفیانہ اصول کی طرف رہنمائی کی کہ انسان کا مادی وجود اس کے شعور کا تعین کرتا ہے دوسرے لفظوں میں اس کا ہے کہ ذہن حقیقتوں کا خالق نہیں بلکہ مادی حقائق خود ذہن کی تخلیق کرتے ہیں اور انسانی ذہن سے باہر ان کا ایک مادی وجود اس اصول کو پیش نظر رکھکر دیکھیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ادیب کے تخلیقی کارنامے ان حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں جو سماج میں جاتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی ادیب اس فلسفہ سے واقف نہ ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی تخلیق میں وہ حقیقتیں کسی نہ کسی شکل میں نمایاں ہوا اس کے گرد و پیش ہیں جو اس کے ذہن کی تشکیل کرتی ہیں یوں دیکھا جائے تو خیال اور شعور کی حیثیت بھی مادی ہو جاتی ہے۔ اور جب او مادی تصور پر غور کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ادب میں جن جذبات، خیالات اور تجربات کا اظہار کیا گیا ہے اُن کے مادی پس منظر کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ حقائق کی اصل بنیاد کا علم ہو سکے۔"

(ذوق ادب اور شعور۔ صفحہ ۱۰۲۔۔۔۱۰۳)

۲۔ ذرائع پیداوار اور ادب کا رشتہ

"اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی مخصوص دور کے ذرائع پیداوار اور اس دور کے ادب یا فنون لطیفہ کا رشتہ کس طرح ظاہر اس کو واضح ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس کو مثال سے سمجھنا چاہیں تو اس کی ایک اچھی مثال ابتدائی انسانی سماج میں مل سکتی ہے جو پیچیدہ نہیں تھا۔ ذرائع پیداوار سیدھے سادے تھے۔ ایک ساتھ مل جل کر کام کرنے میں ابتدائی انسان کو اندازہ ہوا کہ ایک کے ساتھ کام کرنے، مخصوص قسم کی آوازیں نکالنے اور جسم کو ایک خاص طرح حرکت دینے میں کام جلد بھی ہوتا ہے۔ تھکن بھی کم اور اچھا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے ان حرکات، سکنات، آوازوں اور بولیوں کو انھوں نے اپنے کام کے طریقوں اور ذہنی ذریعوں سے وابستہ کر لیا۔ یہی زبان، رقص، موسیقی اور شاعری کی بھدّی گر فطری ابتدا تھی جس کا تعلق براہ راست پیداوار کے سے تھا سماج اور ذرائع پیداوار میں جتنی پیچیدگی بڑھتی گئی فنون لطیفہ اور ادب سے ان کا تعلق پیچیدہ ہوتا گیا۔"

(ذوق ادب اور شعور صفحہ ۱۰۵)

۳۔ سماجی طبقات اور ادب

"یہاں اس بات کی وضاحت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مکمل اشتراکی سماج کے علاوہ ہر سماج اپنے ذرائع پیداوار سے طبقوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے۔ اور عام طور پر ہر شخص کا ذہن اس طرح کے طبقاتی مفاد سے وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی لازمی ہے۔ انسان اپنی شعوری کوشش سے اپنے طبقاتی تصورات چھوڑ سکتا ہے ایسی حالت میں اس کا طبقہ وہ طبقہ ہو جائے گا جس کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے اور چونکہ ذرائع پیداوار پر قبضہ رکھنے والوں اور محروموں میں اپنے حقوق اور مفاد کے لیے کشمکش جاری اس لیے عام طور سے یہ بات تسلیم کر لی جاتی ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں ادیب کے شعور نے بھی اس کشمکش کو اپنے ادب بارے میں ہوگا۔"

(ذوق ادب اور شعور صفحہ ۱۰۹)

۴۔ ناقابل تغیر مطلق نظریوں کی رد

"طبقاتی سماج میں طبقات کی آویزش اور طریقہ پیداوار کی تبدیلیوں کی وجہ سے انسانی اعمال کے دائرے بدلتے اور نظریات میں ترمیمیں ہوتی رہیں گی۔ ان باتوں کے سمجھنے کے لیے کسی خاص طرح کے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ناقابل تغیر مطلق نظریوں کا فلسفہ ہمیشہ اس سماج یا سماج کے اس طبقہ میں مقبول رہا ہے جو سماجی تبدیلی کو یا تو تسلیم نہیں کرتا یا تسلیم کرنا نہیں چاہتا۔"

(تنقید اور عملی تنقید صفحہ ۱۷)

۵۔ اخلاق و مذہب حکمراں طبقہ کو تقویت پہنچاتے ہیں

"حکمراں اور برسر اقتدار طبقہ مختصر ہوتا ہے لیکن مذہب اور اخلاق سب اسی کے لیے ہوتے ہیں اسی کے لیے علوم و فنون کے دروازے کھلے ہوتے ہیں علم و حکمت پر اسی کی مہریں لگتی ہیں اور جب کوئی گروہ تغیر کی اس معاشی اور معاشرتی اہمیت سے واقف ہو کر کچھ ایسا کہتا ہے تو علاوہ تاریخ اور انصاف کے تمام دوسری طاقتیں اس کے خلاف صف آرا ہو جاتی ہیں گویا اس تصور کے خلاف آواز بلند کرنے والا نہ تو تہذیب سے واقف ہے اور نہ ادب سے۔ نہ اخلاق کے "مسلمہ اصول" جانتا ہے اور نہ "قدیم" کی عزت کرتا ہے۔" (تنقیدی جائزے صفحہ ۱۶-۱۷)

۶۔ مذہب حکومت کا ساتھ دیتا ہے

"حاکم طبقے فائدے میں رہتے ہیں اور محکوم اپنے ملک میں بھی آزاد نہیں ہوتے۔ تہذیب اور تمدن کے نام پر قومیں غلام بنتی ہیں مذہب حکومت کا ساتھ دیتا ہے۔ اور عوام کو قناعت کی تعلیم دے کر خاموش رکھتا ہے۔ آزادی کی ایک بے پناہ لہر اٹھی اور ایسے نظام زندگی کی تلاش ہوئی جس میں انسانی زندگی کی قید ہو۔ جس میں زیادہ سے زیادہ لوگ خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کر سکیں۔ یہ کوئی خواب نہ تھا بلکہ انیسویں صدی کے وسط میں ایسے فلسفہ حیات کا پتہ چلایا گیا تھا جو انسان پر انسان کی حکومت کا خاتمہ کر سکے۔" (تنقیدی جائزے صفحہ ۲۹)

۷۔ اخلاق کیا ہے

"اخلاق کیا ہے؟ کیا ساری دنیا میں ایک ہی نظام اخلاق رائج ہے۔ کیا ہر زمانے میں ایک ہی قسم کا اخلاق رہا ہے؟ اخلاق پیدا کن حالات میں ہوا؟ کیا ہر طبقے کے لوگ اخلاق کے ایک ہی مرتبہ پر ہیں؟ کیا کوئی ایسا نظام اخلاق بنایا جا سکتا ہے جسے سب اپنے لیے مفید جانیں؟ سچ تو یہ ہے کہ ان سوالات کا جواب دینے سے پہلے تمدن کی تاریخ پر نظر ڈالنی ضروری ہوگا جس کا موقع نہیں ہاں نتائج سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان بدیہیات پر نظر ڈالی جا سکتی ہے جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ زیادہ گہرے فلسفیانہ مباحث میں پڑنے کی جگہ مثالوں سے اخلاق کے مسئلہ کو سمجھنا چاہیے۔ آقا کا اخلاق یہ ہے کہ وہ اپنے نوکر کو معمولی خطا پر جوتے لگائے اور نوکر کا اخلاق یہ ہے کہ وہ سر نہ اٹھائے سرمایہ دار کا اخلاق یہ ہے کہ وہ مزدوروں کو ان کی محنت کا پھل نہ دے ان کی گاڑھی کمائی سے نفع اٹھائے اور مزدوروں کا اخلاق یہ ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت نہ کریں۔ سخاوت ایک اچھا فعل ہے مہمان نوازی کا کیا کہنا مدرسوں اور اسپتالوں کی امداد کرنا بھی خوب لیکن کیا ان باتوں پر عمل پیرا ہو کر خوش خلق بننے کا حق اس غریب کو بھی ہے جس کے پاس اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ فقیروں کو بھیک نہیں دیتا، اگر وہ مہمان نوازی کے فرائض انجام نہیں دیتا تو کیا حق ہے کہ اسے کج خلق کہیں! کل تک جب اس کے پاس دولت تھی وہ بھی ان اخلاقی فرائض سے غافل نہیں تھا اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق کے ان اصولوں کے برتنے کا تعلق معاشی اور معاشرتی حالت سے بھی ہے جنہیں کھاتے پیتے لوگوں نے بنایا ہے ——— پھر کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ کیوں نہ غریب بھی اپنی حالت درست کرے کیونکہ اس کا سیدھا جواب یہی ہے کہ اونچے طبقات اور حکومت نے اسے اس کا موقع نہیں دیا ہے۔ آج بنگال میں جوان لڑکیاں اپنی عصمت ایک وقت کی خوراک کے لیے بیچ رہی ہیں۔ مائیں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو چند پیسوں میں اپنے پاس سے جدا کر رہی ہیں۔ کیا ہم کو حق ہے کہ ایسی عورتوں کو بداخلاق کہیں؟" (تنقیدی جائزے صفحہ ۵۶-۵۷)

۸۔ ادیب اور نقاد غیر جانبدار نہیں رہ سکتا

"ادیب کا ذہن اچھائی، برائی یا خیر و شر کے معاملے میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا وہ اپنے اصل خیالات اور مقاصد پر پردہ ڈال سکتا ہے تعصبات کو منطقی اور فلسفیانہ شکلیں دے سکتا ہے۔ انداز بیان کی رنگینیوں سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کر سکتا ہے، متضاد تصورات کے درمیان درمیانی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن یہ نہیں کر سکتا کہ زندگی کے ہر مسئلہ پر خاموش رہ جائے یا ایسی رائے دے کہ اس کے رجحان

کا پتہ نہ چل سکے۔ اگر کوئی ادیب یا نقاد ایسا سمجھتا ہے تو وہ یا تو خود فریبی کا شکار ہے یا دوسروں کو دھوکا دینا چاہتا ہے جو بات ادیب کے لیے درست ہے وہی ایک با شعور نقاد کے لیے بھی ٹھیک ہوگی اگر چہ دونوں کے ذہنی عمل کی شکلیں مختلف ہوں گی۔"

(تنقید اور عملی تنقید صفحہ ۲۹)

"اسپنگارن وغیرہ ادب کے معاملے میں اس طرح غیر جانبدار رہ کر حاکم طبقہ کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں ہر ملک کے ادیب اور نقاد جب حالات کو بہتر بنانے والی عوامی جد وجہد سے دور رہنا چاہتے ہیں تو یہی کرتے ہیں اور دھوکا دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ہم کسی طرف نہیں ہیں ادیب اور نقاد کو جانب داری یا سماجی اور سیاسی اقدار کی تبلیغ اور تلقین سے کیا واسطہ لیکن ہر نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ ان کا رویہ منطقی طور پر کس کی حمایت کرتا ہے اور کس کا طرفدار بن جاتا ہے۔"

(تنقید اور عملی تنقید صفحہ ۲۲)

"حقیقت پسندی کے خلاف یہی وہ جد وجہد ہے جو مختلف شکلوں میں اکثر سرمایہ دار ممالک میں جاری ہے جہاں ادب اور زندگی کی بے تعلقی کا فلسفہ پیش کر کے حاکم طبقہ کے اقتدار کو استوار رکھنے کی کوشش جاری ہے کبھی سیاست ادب اور سیاست کو الگ رکھنے کی تلقین کر کے کی جاتی ہے کبھی ادیب کی ذہنی آزادی کے نام پر۔ نتیجہ کے لحاظ سے ہر حال میں یہ کوششیں ایک ہیں جن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ادیب اس طبقاتی کشمکش، ظلم وجور لوٹ کھسوٹ کا ذکر نہ کرے جس سے عوام میں حاکم طبقہ کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ بیدار ہو ...... ایسے لوگ بے تعلقی کے پس پردہ زبردست پروپیگنڈا کرتے ہیں اگر یہ لوگ کسی معجزہ سے غیر جانبدار بنائے جا سکتے تو ان کے خلوص فن کے لیے دل میں جگہ ہوتی لیکن ان کی غیر جانبداری مظلوموں کے لیے بے ظالموں کے لیے نہیں۔"

(ذوق ادب اور شعور صفحہ ۱۷)

۹۔ ادب اور پروپیگنڈا

"اچھے فنکاروں نے ہر دور میں طبقاتی حد بندی کے طلسم توڑ کر عام انسانوں کے دلوں کی آرزوئیں حسین الفاظ اور رنگین پیکر میں پیش کی ہیں اور اس طرح انسانی سرمایۂ تہذیب میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے ادبیت پسند فلسفی اور مفکر ادیبوں سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذہن کی گرمی اور قلم کی طاقت کو محنت کش عوام کی ترجمانی اور خدمت کے لیے وقف کر دیں۔"

"جو لوگ اپنے طبقاتی مفاد یا ذہنی کجروی کی وجہ سے اس نقطۂ نظر کے مخالف ہیں وہ ادیبوں سے خالص ادب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک ناممکن بات کا مطالبہ ہے کیونکہ ادب کا موضوع جیسے ہی انسان بنتا ہے وہ کسی نہ کسی نقطۂ نظر کا ترجمان بھی بن جاتا ہے۔ ادیب لاکھ غیر جانبدار رہنے کی کوشش کرے اس کے کردار، اس کا موضوع، اس کے خیالات کسی نہ کسی کی جانبداری کا پتہ ضرور دیتے ہیں اور پروپیگنڈے سے بچنے کے دھوکے میں وہ بعض دوسری باتوں کا پروپیگنڈا کرنے لگتا ہے فلسفۂ مادیت سے متاثر ادیب شعوری طور پر جانبدار ہوتا ہے یہ جانبداری سیاسی، سماجی، تہذیبی، فلسفیانہ کسی نہ کسی شکل میں ہو سکتی ہے۔ وہ اس جانبداری سے ڈرتا یا شرمندہ کبھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ کسی قسم کی ناانصافی، ظلم، انسان دشمنی، مایوسی، بدصورتی، تنگ نظری کا ترجمان یا نمائندہ نہیں ہے بلکہ اُن قدروں کی اشاعت کر رہا ہے جو تمام انسانی مسرتوں میں اضافہ کرتی ہیں۔"

(ذوق ادب اور شعور صفحہ ۱۱۰—۱۱۱)

احتشام حسین نے تمام مکاتب نقد میں مارکسی **عقلی ذہانت، ذہنی توازن، اور انفرادی قوت امتیاز** کو سب سے بہتر پایا اور اسی کا نمونہ بنایا کرلیا۔ مارکسی تنقید کو اختیار کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھنے کے لیے وہ ایک ...

نقطۂ نظر کو تلاش کر رہے تھے جس میں اتنی وسعت ہو کہ تمام اخلاقی، سماجی اور تنقیدی مسائل پر اس کا یکساں طور پر اطلاق ہو سکے۔ احتشام حسین کا ذہن عقلیت پسند تھا اور جذباتی حیثیت سے اُن کی زندگی کا محور انسان دوستی تھا۔ ان دونوں باتوں نے اُن کو مارکسی تنقید کو قبول کرنے پر آمادہ کر دیا لیکن احتشام حسین کی خلوص یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی عقلی دیانت داری، اپنے ذہنی توازن اور انفرادی قوت امتیاز کو زندہ رکھا اور مارکس کے فلسفہ کو انھوں نے دوا کے طور پر بند کرکے قبول کیا۔ عام ترقی پسند نقادوں کی طرح انھوں نے مارکسی اصول نقد کا ادب پر میکانکی انطباق کیا۔ اس کے برخلاف انھوں نے مارکسی تنقید کی خامیوں کی نشاندہی کی اور جہاں تک ممکن ہو سکا انھوں نے اُن رخنوں کو بھرنے کی کوشش کی جن کی وجہ سے مارکسی تنقید عقلی حیثیت سے ناقابل قبول نظر آتی ہے۔

ذرائع پیداوار اور ادب کے مارکسی نظریہ کا وہ تذکرہ کرتے ہیں لیکن اس نظریہ سے پیدا ہونے والی میکانکی عمل تنقید اور تنگ نظری سے وہ اپنا دامن بچا لیتے ہیں۔

"اس سلسلے میں ایک اور بات یاد رکھنا ضروری ہے۔ ذرائع پیداوار اور ادب کے رشتہ کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا غلط ہوگا کہ دونوں کے زوال یا ارتقا کی سطح بھی یکساں اور متناسب ہوگی۔ کسی ملک کی تاریخ دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ معمولی سماجی ارتقا کے عہد میں بھی اعلیٰ ادب پیدا ہوا ہے۔ یونان نے غلامی کے عہد میں افلاطون، ارسطو، ایس کائی لس اور یوریپیڈیز ہی کو نہیں ہومر کو بھی جنم دیا۔ یہ سمجھنا بھی درست نہ ہوگا کہ ایک عہد کا ادب اُسی عہد کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور نئے عہد میں ماضی سے سارے رشتے توڑ کر نیا ادب ابھرتا ہے۔ اس کی ایک کھلی وجہ تو یہ ہے کہ ایک عہد کے پیداواری رشتے دوسرے عہد کی انقلابی منزل میں داخل ہوتے ہوتے بہت سی عبوری اور ارتقائی منزلوں سے گذرتے ہیں۔ اور انسانی ذہن جب تک پوری شعوری کوشش سے تغیر کی کشمکش کو نہ سمجھے، ایک دور کا دوسرے دور سے الگ کرنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے کسی عہد کے تمام ادیب شعور کی ایک ہی سطح پر نہیں ہو سکتے ذہنوں پر خاندانی، طبقاتی اور سماجی روایتوں کا بوجھ ہوتا ہے جسے زندگی کی کشمکس کو سمجھے بغیر اتار پھینکنا تقریباً ناممکن ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ جب ایک دفعہ ادبی روایتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں تو آسانی سے ختم نہیں ہوتیں اور معاشی ڈھانچے کے بدل جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں۔ جو لوگ ادب کی مادی ترجمانی پر الزام لگاتے ہیں کہ اس طرح ادیب کو ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے محض معاشی تغیرات یا طریق پیداوار میں تبدیلی ہو جانے والے اثرات کے تحت دیکھا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت اس رشتے کے مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ اصل بات یہ ہے کہ مادی حقائق زبان، اسلوب، انداز بیان اور محسوسات کے اتنے دائروں سے گذر کر ادبی پیکر اختیار کرتے ہیں کہ انھیں نیچرل سائنس کی سطح پر رکھ کر نتائج نہیں نکالے جا سکتے۔"

(ذوق ادب اور شعور، صفحہ ۱۰۵-۱۰۶)

ادب کو معاشی ارتقا سے میکانکی طور پر ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کرنے والے اور تاریخی جبریت کے اصول پر ادیب کو اس کی سماجی ذمہ داری سے معذور کرنے والے مارکسی نقادوں کی احتشام حسین تائید نہیں کرتے بلکہ وہ ادیب کو ایک باشعور اور فاعل مختار انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اُس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ انسانی سماج کو بہتر بنانے کی جد و جہد میں وہ کھل کر حصہ لے گا۔

"مارکسی تنقید ایک ہمہ گیر نقطۂ نظر ہے اور ادبی مطالعہ کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتی۔ گو اس پہلو کو پیش نظر رکھنے والے تمام نقاد یکساں بصیرت نہیں رکھتے۔ بعض محض تجزیہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ بعض ادب اور معاشی ارتقا کو

میکانکی طور پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض تاریخی جبریت کو پیش نظر رکھ کر ادیب کو اس کی سماجی ذمہ داری سے معذور قرار دیتے ہیں۔ بعض ادیب سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ماحولیت کے جبر کو توڑ کر بہتر زندگی کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے۔ اور اُسے ایسا کرنا چاہیئے۔" (تنقید اور عملی تنقید صفحہ ۲۲-۲۳)

عام تنگ نظر مارکسی نقادوں کی طرح احتشام حسین ہر دور کے ادبی تخلیقات کو مارکسی فلسفۂ حیات سے ناپ کر اُن کی قدر و قیمت متعین کرنے کو حق بجانب نہیں سمجھتے بلکہ جو ادیب ارتقا کی جس منزل میں ہے اُسی کے لحاظ سے اُس سے توقعات وابستہ کرنے کے معتدل رویہ کی حمایت پر زور الفاظ میں تلقین کرتے ہیں۔

"ترقی پسندی کچھ بھی نہیں ہے اگر وہ کسی بندھے ٹکے اصول کے ماتحت ہر مسئلہ کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ یا اگر وہ ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانک دیتی ہے۔ ترقی پسند تنقید کا خیال ہے کہ ادیب اپنے سماجی شعور کی بنا پر اپنے طبقاتی رشتے میں، اپنے معاشرتی عقائد اور فنی تصورات کی روشنی میں ایک نیا مسئلہ پیش کرتا ہے۔ ہر ادیب کے خیالات کا کوئی پس منظر ہوتا ہے۔ اس کے خاص مسائل پر زور دینے کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں پر نظر رکھنے کے بعد کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ اور جیسے ہی ان تمام باتوں کو کسی ادیب کے ادبی کارناموں کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے نازک تجزیہ اور ترکیب کی وہ منزل آجاتی ہے جہاں صرف ایک چابکدست نقاد ہی کا ذہن کام دے سکتا ہے انسانی شعور کی پیچیدگیوں کو سلجھا کر فنکار کے اصل مقصد کو ڈھونڈھ نکالنا اُس کے فن کے محرکات کا پتہ لگالینا اچھے ترقی پسند نقاد کا کام ہے۔ اگر وہ اپنے اس ہمہ گیر اور ہمہ جہتی سماجی شعور سے کام نہ لے تو ان ادیبوں اور فنکاروں کے علاوہ جو سو فیصدی اس کے ہم خیال ہیں اور کسی کو وہ ادیب اور فنکار تسلیم ہی نہ کرے لیکن ایسا نہیں ہوتا جو ادیب سماجی ارتقا کی جس منزل میں ہے اُسی کی مناسبت سے وہ جانچا جاسکتا ہے۔ اور اسی نقطۂ نظر سے اس کی ترقی پسندی یا عدم ترقی پسندی کے متعلق رائے قائم کی جاسکتی ہے۔" (تنقید اور عملی تنقید صفحہ ۱۶۷-۱۶۹)

مارکسی تنقید میں دو بنیادی نقائص ہیں ایک تو یہ کہ نقاد کا تاریخی اور سماجی نقطۂ نظر ادیب کی انفرادیت اور شخصیت کے سمجھنے میں حائل ہوجاتا ہے اور دوسرے یہ کہ سیاسی اور معاشی نظریات پر اس کی توجہ اتنی مرکوز ہوجاتی ہے کہ ادب کی جمالیاتی قدر و قیمت کو وہ نظر انداز کر دیتا ہے۔ احتشام حسین مارکسی تنقید کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں نہایت متوازن رائے رکھتے ہیں۔ اور اس کا نہایت دیانتداری اور صفائی کے ساتھ اظہار بھی کر دیتے ہیں:-

"تاریخی اور سماجی نقطۂ نظر سے ادب کی تنقید روایت، تبدیلی ذوق، تہذیبی اقدار قومی اور آفاقی معیار، اخلاقی مقصد اور ادبی شعور کے متعلق بہت سی گتھیاں سلجھاتی اور بہت سے سوالوں کا جواب دیتی ہے لیکن کبھی کبھی کسی شاعر یا ادیب کی انفرادیت اور عظمت کا اندازہ لگانے میں زیادہ دور تک ساتھ نہیں چلتی حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ایسے نقاد کو اُن امتیازی خصوصیات کی وضاحت پر بھی قادر ہونا چاہیئے جو کسی فرد کو سماج کے دوسرے افراد سے الگ کرتی ہیں، یہ بات اس فرد کے فنی اور سماجی شعور کے تجزیہ سے نمایاں کی جاسکتی ہے پھر بھی کبھی کبھی تاریخی اور سماجی تنقید میں یہ نقص ضرور پیدا ہوگیا ہے کہ اس سے ادب کی جمالیاتی قدر پس پشت پڑ گئی ہے۔" (تنقیدی نظریات حصہ دوم صفحہ ۳۲۷)

انسانی قدروں کے قابلِ تغیر ہونے کے معنی بھی احتشام حسین کی نظر میں یہ نہیں ہیں کہ جن اُمور کو قدیم زمانہ میں اچھا سمجھا جاتا تھا وہ اب بُرے ہو گئے ہیں یا جن باتوں کو بُرا سمجھا جاتا تھا وہ اب اچھی ہو گئی ہیں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ شعور کے ارتقا کے ساتھ قدیم قدروں کا بدلے ہوئے حالات کے لحاظ سے انسانی مسائل پر اس طرح انطباق کیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بہتر ثابت ہو سکیں۔ [illegible] قدیم و جدید قدروں میں ایک تسلسل ہے اور بنیادی انسانی اقدار کبھی نہیں بدلتے صرف اُن کی ماہیت اور حقیقی مفہوم کی [illegible] اُن کی تشریح و تفسیر میں تبدیلی ہو جاتی ہے:-

"تبدیلی کا یہی مفہوم ہے کہ مادی حالات کے بدل جانے سے انسان کا شعور بھی بدلتا ہے اب جو تبدیلیاں ہوں گی ان میں نیا پن ہو گا۔ وسعت ہو گی۔ انسان کی طاقت پر بھروسہ ہو گا اور فطرت کے متعلق خیالات بدلے ہوئے ہوں گے لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ محبت کی جگہ نفرت، اخلاق کی جگہ بد اخلاقی اور انسان دوستی کی جگہ انسان دشمنی پیدا ہو گئی۔ شروع میں کہا جا چکا ہے کہ عارضی طبقاتی استحصال کے باعث ایسا ہو سکتا ہے لیکن وہ کسی قوم کی ارتقائی زندگی سے ہم آہنگ نہ ہو گا۔ اس لیے قدیم تہذیب کے وہ اجزا جو انسانی زندگی کی بقا اور جدوجہد کے مظہر ہیں کسی نہ کسی شکل میں نئی تہذیبی قدروں میں بھی جگہ پائیں گے ان کے حاصل کرنے اور اُن پر زور دینے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کا وجود ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ تسلسل زندگی کے تسلسل کا پتہ دے گا اور ایک قوم کو اس کے ماضی سے تعلق رکھنے میں معین ہو گا اور زبان، ادب اور فنونِ لطیفہ اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں بڑا حصہ لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی قوم اپنی زبان کے بدل جانے اور اپنے ادب سے غفلت برتنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔"
(زبان، ادب اور شعور صفحہ [illegible])

احتشام حسین کو مذہب سے بھی دلچسپی تھی اور مارکسزم سے بھی دلچسپی تھی۔ ممکن ہے تنگ نظر مذہبی لوگ [illegible] انھیں مذہبی یعنی جھوٹا کمیونسٹ کہیں لیکن تنگ نظر افراد کے یہ دونوں فتوے غلط ہوں گے [illegible] کا کوئی تضاد نہیں تھا۔ اُن کے مذہب اور مارکسزم دونوں سے دلچسپی لینے کے بنیادی اسباب [illegible] اُن کی رجائیت، اُن کی انسانی معاشرہ میں نظامِ عدل کو لانے کی خواہش [illegible] انسان کے [illegible] کا تصور، اُن کی ظالم سے نفرت، مظلوم سے محبت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کا انسانی اقدار میں تسلسل کا تصور [illegible] وہ ان اصل تفسیر [illegible] ہوتے [illegible] مذہبی انسان احتشام حسین ہی تھے۔ وہ شخص جو فنی قلعیت اور [illegible] کے خلاف تھے جو نوعِ انسانی [illegible] اور مظلوم کو اپنے بنیادی انسانی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد [illegible] وہ اُسی مذہب کو سچا سمجھتے تھے جو نوعِ انسانی کی وحدت کی تبلیغ کرے اور انسانی معاشرہ میں نظامِ عدل و مساوات کو قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ کمیونسٹ بھی احتشام حسین ہی تھے اس لیے کہ وہ کمیونسٹوں کی [illegible] تنگ نظریات کو [illegible] خود دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی صلاحیت نادر تھی۔ انھوں نے نہ مذہب کو مذہب کے [illegible] نہ ادب سے اس کو ادب کے لیے دلچسپی تھی۔ ان کو تمام دلچسپیاں تھیں لیکن ان دلچسپیوں میں مرکزیت زندگی کو حاصل تھی [illegible] مذہب لامذہبیت میں، اخلاق بداخلاقی [illegible] زندگی کی تندرستی کا صحیح اندازہ لگایا۔ انسان [illegible] اور ادب تفریح میں بدل جاتا ہے [illegible] کا اعتراف کیا، اس کی تسخیرِ فطرت کی طاقتوں کو سراہا، اُس کے حوصلوں کو تقویت پہنچائی [illegible] کے سمجھنے اور اُن کا مقابلہ کرنے کی [illegible] انسانی قدروں کی اہمیت کو تسلیم کیا جو مذہب [illegible] اور

فلسفے کے ذخیرے میں انسان نے صدیوں کے غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد جمع کیے ہیں اور اُن کو بدلے ہوئے حالات کے لحاظ سے ایک نئی زندگی عطا ایک نئی قدر تلاش کرنے کی کاوش کی۔ وہ فرد کی ذمہ داری اور اہمیت کے منکر نہیں تھے لیکن اُن کی نظر میں فرد کی زندگی با معنی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اُسے معاشرے کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ اسی لیے اُن کا تصورِ اخلاق بالکل بے معنی ہے اگر تنہا جس میں کہ ہر طبقے کے افراد کو اُن باتوں کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے جو اُن کے حدودِ اختیار سے باہر ہوتی ہیں اور با اقتدار طبقے کے اُن غیر انسانی عیوب کو حق بجانب قرار دیا جاتا ہے جو انتہائی مکروہ اور قابلِ نفرت ہیں۔ احتشام حسین نے انسانی مسائل کی سنگینی کو محسوس کیا اور اُن کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے جو کچھ سوچا وہی محسوس کیا اور جو کہا وہی لکھا۔ قابلِ قدر بات یہ ہے کہ وہ پُر خلوص تھے اور سچے تھے۔ وہ سچے تھے اور ہمیشہ سچائی کی جستجو کرتے رہے۔ اگر اُن کا کوئی قصور ہے تو بس اتنا ہے کہ نہ انھوں نے اپنے آپ کو دھوکا دیا نہ دوسروں کو دھوکا دیا۔ اور اس سے بڑا قصور یہ ہے کہ انھوں نے دھوکا کھایا نہیں اور فریب کے ہر دام کو شکست کر دیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کو نوعِ انسانی کا ایک جزو بنا لیا اور اُن کے مفاد ہی کو اپنا مفاد سمجھا۔ اسی لیے کمزور اور مظلوم انسانوں کی عدل و انصاف کی جد و جہد میں انھوں نے بھرپور حصہ لیا اور اپنی ساری ذہنی و جذباتی طاقتوں کو ایک ہی نقطہ پر مرکوز کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ایک ہی نقطۂ نظر اور ایک ہی مقصد کے ماتحت لکھا۔ نہ انھوں نے لوگوں کے خوف سے کسی غلط بات کو صحیح تسلیم کیا اور نہ شہرت یا عہدہ یا دولت کے لالچ میں کبھی اپنے مسلک کو بدلا۔ انھوں نے انسانیت کی خدمت کو اپنا مذہب بنا لیا اور اسی پر ثابت قدم رہے۔ انھوں نے جس فلسفۂ ادب کو ادب میں اور جس فلسفۂ حیات کو زندگی میں تلاش کیا اُسے پا لیا۔ اُن کا فلسفۂ ادب اُن کے فلسفۂ حیات سے الگ نہ تھا اس لیے وہ محض ادب ہی کے نہیں بلکہ زندگی کے بھی نقاد بن گئے۔ زندگی کی تنقید ہی اُن کی تنقید نگاری کا مقصد تھا اور اس میں انھیں پوری پوری کامیابی حاصل ہوئی اور ادب کے نقاد کی حیثیت سے زیادہ وہ زندگی کے نقاد اور انسانیت کے ترجمان کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔

ق احمد

احتشام حسین کا تنقیدی ذہن

احتشام حسین اردو تنقید میں مارکسی فکر و نظر کی سب سے معتبر محترم اور بھاری بھرکم آواز بن کر ابھرے اور اپنی اس حیثیت کو دوامی بنا گئے۔ ان کی
تنقید پر اعتراض و نکتہ چینیاں بھی کی گئیں ہیں۔ اُن کے نقطہ نظر سے اختلاف بھی کیا جاتا رہا ہے لیکن کسی کو آج تک یہ کہنے کی جرأت نہیں
کہ وہ اپنے مسلک میں غیر سنجیدہ تھے یا یہ کہ وہ اس میں مخلص نہیں تھے بلکہ بعض اوقات تو انہیں یہ طعنہ بھی سننا پڑا کہ وہ ہر پھر کر ہر بات
اشتراکیت ہی پر توڑتے ہیں۔ ہر چند کہ احتشام حسین کے بارے میں یہ بات ان کے تنقیدی مسلک کا مضحکہ اڑانے کے لیے کہی گئی ہو
ان کے نقطہ نظر سے اُن کے لازوال خلوص کا گواہ بھی بن جاتا ہے۔

احتشام حسین کا پہلا مجموعہ مضامین (تنقیدی جائزے) ۱۹۴۵ء میں آیا تھا۔ اس مجموعے میں دو مضامین (۱) قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد (۲) نظیر
کی اور عوام ۱۹۳۹ء کے ہیں۔ ہر چند کہ یہ دونوں مضامین احتشام حسین کی اولین تحریریں نہیں ہیں (اس لیے کہ بقول خود انھوں نے اپنی
کے زمانے ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا)۔ پھر بھی بہ حیثیت نقاد کے یہ دو مضامین ترقی پسند مکتبہ فکر سے اُن کے شعوری لگاؤ کا ثبوت
سامنے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے احتشام حسین کے فکری اور شعوری بنیادوں کا احاطہ اور اُن کی تلاش و جستجو بہت آسان ہو جاتی ہے۔
احتشام حسین کے فکر و شعور کی بلوغت کا دور اور برصغیر کی سیاسی و معاشی بیداری اور جدوجہد آزادی میں پختگی اور شدت کا دور ساتھ ساتھ
آتے ہیں۔ وہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں انٹرنس کا امتحان اعظم گڑھ سے پاس کر کے الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم بنے۔ ان ذیل
انھوں نے مختصراً اپنے اس سوانحی خاکے میں کیا تھا جو انھوں نے امریکہ جانے سے پیشتر راک فیلر فاؤنڈیشن کو بھیجا تھا اور اس کا کچھ حصہ
"رسندز" میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ میں نے اپنی سوانحی عمری میں جو باتیں لکھی تھیں اُن میں سے چند یوں تھیں۔

"..... ۱۹۳۱ء میں تعلیم کے لیے الہ آباد پہونچا۔ الہ آباد اس وقت انگریزی سول نافرمانی کی تحریک کا مرکز تھا۔ بدیسی اور خاص کر
ل کا بائیکاٹ ستیہ گرہ اور سیاسی جیل ہیل اپنے شباب پر تھی۔ میں بھی فطری طور پر قومی آزادی کے جذبے سے معمور ہو گیا۔ الہ آباد میں
تھا میں نے اسے جذب کرنے کی کوشش کی..... ۱۹۳۶ء سے میرے خیالات ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ ملک میں جو جمہوری ترقی پسند
ہی تھیں اور یورپ میں جو فاشزم کی مخالفت کا زور بڑھ رہا تھا میں خود کو اُن سے ہم آہنگ کرنے لگا۔ میں نے اپنی تحریروں کی مدد سے
سمجھنے کی کوشش شروع کی جو بہت ہی تند اور طوفانی لیکن بہت پیچیدہ شکل میں ملک کے اندر رونما ہو رہی تھی اور جس کے اندر جمہوری
عناصر چھپے ہوئے تھے۔ مختلف گروہوں اور طبقوں کے عمل میں یہ باتیں جس طرح ظاہر ہو رہی تھیں میں ان کی حقیقت کو جاننا تھا..... میرا ہمیشہ
رہا ہے کہ کسی ملک کا ادب اور فن کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اس کے سماجی نظام میں پیوست ہوتی ہیں اور ان کو اس سے الگ کر کے دیکھنا
ممکن نہیں ہو سکتا۔" (صفحات ۱۹-۲۰)

احتشام حسین کی تحریروں کے ان گنت صفحات کے مقابلے میں اس انتخاب کا تناسب پہاڑ اور رائی ایسا ہے۔ لیکن اس ایک ہی انتخاب م
ذہن، فکر اور شعوری سانچے کا پورا عکس ملتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے ماحول سے پورے طور پر باخبر تھے۔ اس کے تاریخی شعور کا ایک تجزیاتی خاکہ ان
میں موجود تھا۔ وہ اس ماحول کے اندر کی کشمکش کو بہت قریب سے جانتے اور سمجھتے تھے اور اپنے ارد گرد کے سماجی نظام سے ترتیب پانے والی تہذ
پورے طور پر باخبر تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ماحول میں انقلاب کی بڑھتی اور سمٹتی ہوئی لہروں اور اُن کے پس منظر میں کام کرنے والے محرکات کا پورا
بھی رکھتے تھے اور ان کا مطالعہ مسلسل اُن کی سب سے بڑی دلچسپی بھی تھا۔ ان تمام عناصر کی آمیزش نے احتشام حسین کے ادبی ذوق اور فکر و نظر کے ر
بنیاد رکھی تھی۔

اوپر کہیں اشارتاً یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ احتشام حسین کے فکر و شعور کی رَو اور غیر منقسم ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کی لہریں
بل اور بڑھی ہیں۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ اُن کے فکر و شعور کی پرورش غیر منقسم برصغیر کے اس ماحول میں ہوئی جو اپنی انقلاب پسندی کے اعتبار
تاریخ میں سب سے اہم دور تھا۔ ۱۹۲۹ء سے لیکر ۱۹۴۶ء تک کے سولہ سترہ سال کا عرصہ اپنی تمام انقلاب سامانیوں کے ساتھ جب بالآخر سکوا
اس کے تار تار اندھیروں سے صبح آزادی کا درخشاں چہرہ سب کے سامنے تھا۔ اس اعتبار سے احتشام حسین اور ان کی نسل کے فکری جائزے کے تذکر
میں سب سے مقدم یہی امر ٹھہرتا ہے کہ اس نسل نے جدوجہد کے اس دور کو کس نظر سے دیکھا؟ اور اس جدوجہد کو آگے بڑھانے میں کیا کردار ادا کیا؟

احتشام حسین نہ سیاست داں تھے اور نہ کبھی اس کا انھوں نے دعویٰ کیا۔ حالانکہ ان کی تحریریں گواہ ہیں کہ ان کا سیاسی شعور ان
کے بہت سے سیاست دانوں سے بہت زیادہ پختہ، واضح اور حالاتِ حاضرہ کو سمجھنے میں بڑا روشنی دکھانے والا تھا۔ ادب میں سیاست کو وہ بھی
اہم عنصر سمجھتے تھے جس کے بغیر کسی ادبی تحریر کا تجزیہ صائب اور قابلِ بھروسہ نہیں ہو سکتا۔ اس سب کچھ کے باوجود احتشام حسین کے فکر و
عملی سیاست داں کے معیار سے کرنا انتہائی اہم ہوگا۔ وہ ادیب تھے اور ان کے فکر و شعور کا جائزہ ان ہی حدود میں رہ کر کرنا ہوگا۔

اپنے پہلے مجموعے "تنقیدی جائزے" کے طبع اول کے دیباچے میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں ادب کو زندگی کے عام شعور
سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں"۔ ادب کی اس نوعیت کو مان کر انھوں نے د
بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ تنقیدی نقطۂ نظر "ایک حکیمانہ شعور کو رہنما" بنائے بغیر اپنا اصل فریضہ ادا نہیں کر سکتا۔ اسی
ثانی کے دیباچے میں انھوں نے پھر ایک مرتبہ اور اپنے ذہنی رویے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ "وقت کے ساتھ ساتھ میرا یہ خیال
جا رہا ہے کہ اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تنقید کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن اور توانائی کو سمجھنے اور اُسے ابھارنے میں مدد ملتی ہے۔
کا رشتہ عوامی جدوجہد کرنے والی طاقتوں سے مضبوط ہوتا ہے۔ زندگی ادب کو سنبھالتی ہے اور ادب زندگی کو سہارا دے کر آگے بڑھ
ادب کے مطالعہ سے انسان کا سماجی شعور بڑھتا ہے اور وہ سماج کو بہتر بنانے اور فطرت کو اپنے قابو میں لانے کا اہل بن جاتا ہے۔ اگ
کارنامہ یہ کام پورا نہیں کرتا، اس میں مدد نہیں دیتا وہ صرف ان لوگوں کی نگاہ میں ادب ہوگا جو زندگی کو بہتر بنانے کے متمنی نہیں ہیں"

ان دونوں اقتباسات کو ملا کر پڑھنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ادب اور زندگی کا جو رشتہ ہونا چاہیے احتشام حسین کے ذ
میں نہ صرف واضح اور دو ٹوک ہے بلکہ وہ اس رشتے کو ایک ایسی صداقت بھی جانتے ہیں جو حال ہی میں ادبی تخلیق کے لیے ناگزیر نہیں
کا ادب بھی اگر اس رشتے پر پورا نہیں اترتا تو وہ ویسا ادب ہوگا "جو زندگی کو بہتر بنانے کا متمنی نہیں" تھا۔ احتشام حسین کے تنقیدی
پر ایک نظر ڈالیے تو ان کو تین شقوں میں تقسیم پائیے گا۔ ایک اصولی تنقید پر مضامین ہیں۔ دوسری شق کی ذیل میں ماضی کے ادب کا جا
شق کی ذیل میں معاصر ادب کا تنقیدی تجزیہ ملے گا۔ دوسری اور تیسری شق کی ذیل میں آنے والے تنقیدی مضامین کا جائزہ اور تجزیہ
دلجمعی کے ساتھ ان ہی اصولوں کی روشنی میں کیا ہے جن کا مختصر سا اظہار ان کے مندرجہ بالا اقتباسات میں ملتا ہے۔ یعنی یہ کہ

ذہنی، فکری اور تخلیقی رویوں کو ان بنیادی اصول سے بحث کر نہیں جانچتے کہ اس کی نظم و نثر نے اپنے پڑھنے والے کے "سماجی شعور کو آگے بڑھانے اور سماج کو بہتر بنانے" میں کیا کام ہے۔ نیز یہ کہ اس ادب کے ذریعہ سے اس ادیب کے اپنے عہد موجود کے "عوام کا رشتہ عوامی جدوجہد کرنے والی طاقتوں سے مضبوط ہوتا ہے" یا نہیں؟۔ اس ضمن میں یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ احتشام حسین مارکسی نقطۂ نظر کے پیرو تھے اور جہاں اُن کے یہاں "عوامی جدوجہد کی طاقتوں" اور "سماجی شعور" اور زندگی کے الفاظ آتے ہیں تو ان کا مفہوم مارکسی نقطۂ نظر کی تاویلات ہی سے ادا ہوسکتا ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت دو وجوہ کے پیش نظر ضروری ہے۔

اولاً یہ کہ گذشتہ دنوں ان کے انتقال کے بعد دو ایک تعزیتی جلسوں میں اُن کے اس نقطۂ نظر کو خاصا (DISTORT) کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً ایک محترم مقرر نے احتشام حسین کے مارکسی نقطہ نظر کو بھی اپنے دل پسند جمالیاتی نقطۂ نظر ہی کے تابع کر کے رکھ دیا۔ ایک اور بزرگ نے فتویٰ جڑ دیا کہ احتشام حسین کو ترقی پسندی لے ڈوبی" اور ان کے یہاں جو کچھ پڑھنے پڑھانے کے قابل رہ گیا ہے وہ وہی کچھ ہے جہاں وہ اپنے تہذیبی ثقافتی ادب و آداب کو ملحوظ رکھ کر ان کی حدود میں لکھتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام نے بھی آج کل اپنے یہاں ایک خود ساختہ "عوامی جدوجہد" کی اصطلاح رائج کر لی ہے اور اس کے تحت اس "جدوجہد کی طاقتوں" "سماجی شعور" اور "زندگی" کا مفہوم اپنے آخری تجزیے میں استحصالی نظام کو برقرار رکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا جس پر وہ اپنے "زیر نگیں" معاشرے میں دولت کی ریل پیل اور اس کی چمک دمک کی چھب دکھا کر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اس طویل جملۂ معترضہ سے قطع نظر اصل بات یہ ہو رہی تھی کہ احتشام حسین نے سوچ سمجھ کر ادب اور شعر کو سمجھنے اور پرکھنے کی جس راہ پر قدم دھرا تھا وہ ان کے سماجی ثقافتی اور تاریخی ماحول کا وہ اہم ترین تقاضہ تھا جس سے روگردانی ان کے عہد کی زندہ دل اور بیدار مغز نسل کے کسی فرد کے لیے ممکن نہیں تھی۔ احتشام حسین کی تحریروں میں جو ٹھہراؤ رکھ رکھاؤ، نظم و ضبط اور عالمانہ وقار رہتا ہے سطحی نظر سے دیکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے ان تحریروں میں سوائے اس کے اور کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ ان کے اس رویّے کو یوپی کی اُس ثقافتی اور تہذیبی رواداری کا جزو سمجھیں جو اُن کی نظروں میں گویا ادب اور تہذیب کا سب سے بڑا معرکہ ہے۔ احتشام حسین کی اس "معرکہ آرائی" کی تعریف اور توصیف نے غالباً ان کے مخالفین سے زیادہ اُن پر ظلم کیا ہے اس لیے کہ یہی وہ پہلو بھی ہے جو غالباً استحصال پسندانہ سیاست اور ہتھکنڈوں کے خلاف اس اعلان جنگ کی زد میں آتا ہے" جسے خود احتشام حسین ادب اور زندگی کے اٹوٹ رشتے کی بنیاد جانتے اور مانتے ہیں اس لیے کہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ماحول میں یہی ثقافتی تہذیبی اور اخلاقی رواداری وہ میٹھی چھری ہوتی ہے جس سے معصوم عوام کو ذبح کیا جاتا ہے نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ثقافتی تہذیبی اور اخلاقی رواداری کوئی جرم ہے اور نہ ہی اس کا مطلب یہ نکالنا چاہیے کہ احتشام حسین ان جذبات کے دشمن تھے۔ اصل بات البتہ جو سمجھنے کی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ جن رواداریوں کو کسی معاشرے میں بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اس کا سرچشمہ کیا جذبہ انسان دوستی کا ہے؟ یا انسان دشمنی کا؟ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ ماحول کی سب سے بڑی قباحت یہی ہے کہ اس میں انفرادیت پسندی اور استحصال پسندی کا رواج اتنی چالاکی اور عیاری کے ساتھ ہوتا ہے کہ سطحی فکر و نظر رکھنے والے انسان دوستی اور انسان دشمنی کی پرکھ میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔

احتشام حسین کے فکری اور شعوری زاویۂ نظر کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ پوری ہوشمندی کے ساتھ ہر تحریر اور صاحب تحریر کو اُن کے اپنے تاریخی، ثقافتی، تہذیبی اور معاشی پس منظر میں رکھ کر اس طرح سے دیکھتے ہیں کہ کھرا اور کھوٹا صاف نظر آجائے چاہے فنکار نے اپنی نیت اور ارادہ دل کی کتنی ہی بے حد پوشیدہ کیوں نہ کی ہو۔ اس ضمن میں اُن کا مضمون "اکبر کا ذہن" ان کی باریک بینی اور الفاظ کے اُلٹ پھیر سے حقیقت پوشی کے فن کو اس کی اصلی شکل میں [illegible] دیکھنے کی بہترین مثال ہے۔ اس مضمون کا آغاز کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا "اکبر کی شاعری ادب اور مقصد کے تعلق سے ایک نمایاں [illegible] مثال ہے [illegible] شاعری ہی منظر ہیں"... وغیرہ وغیرہ یہ جملے اکبر کی شاعرانہ اہمیت کو پہلی ہی نظر میں واضح اور مسلم

کردیتے ہیں لیکن جوں جوں یہ مضمون احتشام حسین کے مخصوص تجزیاتی انداز میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے تخیل کے جھکے قریب تر ہوتے جاتے ہیں ان کا خاکہ اور خد و خال واضح اور روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے لیکن دو ایک جملے جو اکبر کی فکری روش پر حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں نقل کیے جاتے ہیں

"یہ بہت اچھی بات تھی کہ اکبر انقلاب کو بھی تحریک واقعہ تسلیم کرتے تھے (وہ انقلاب کے خلاف نہیں تھے) زمانے میں یک [illegible] انقلاب آئیں انقلاب ہی کیا لیکن وہ زمانے کو اپنے انداز نظر اور اپنی خواہشات کا پابند بنائے رکھنا چاہتے تھے۔۔۔ اکبر کے متعلق ان کی رائے میں کہ مشرق اور مغرب کا تصور ان کے ہاں جغرافیائی تھا اس نظریہ کا نقص یہ ہے کہ جب اس کے ذریعہ سے زندگی کی بدلتی ہوئی رو کو روکنے کی کوشش کی جائے تو یہ تصور رجعت پسندانہ اور غیر سائنٹفک بن جاتا ہے۔۔۔ اکبر کے یہاں بنیادی تضاد کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں "ایک عجیب طرح کا تضاد سامنے آتا ہے۔ اکبر روز کی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے ایک حقیقت پسند نظر آتے ہیں یہاں تک کہ وہ اردو شعرا کے بہت سے مفروضات کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن جب زندگی کو مجموعی طور پر دیکھنے اور اس کو ترقی کی راہ پر لگانے کا سوال آتا ہے تو وہ عام طور پر محض تصور پرست رہ جاتے ہیں۔" اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے احتشام حسین نے اکبر کے یہاں اس تضاد کی وجوہات بھی بیان کی ہیں "اکبر کا فن ان کے خلوص اور جوش کی وجہ سے غیر معمولی قوت رکھتا ہے اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی انفرادی آسودگی کے لیے نہیں بلکہ جماعتی آسودگی کے لیے اسے استعمال کر رہے تھے۔ حالانکہ جماعتی مفاد کا مادی تصور نہ ہونے کی وجہ سے وہ عملاً صرف ان کی انفرادی ذہنی آسودگی تک محدود رہ جاتا تھا۔ یہی تضاد انہیں ناکامی اور شکست کا احساس دلاتا ہے جس کی تہہ تک وہ نہ پہنچ سکے۔"

اکبر الہ آبادی کی شاعری پر اس کھلی اور بے لاگ تنقید کے باوجود احتشام حسین اس قسم کی شاعری کا کچھ نہ کچھ مصرف ضرور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کے خاتمے پر وہ اس افادیت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اکبر کی شاعری اور فن کا مطالعہ انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں کے ابتدائی بیس سالوں کو سمجھنے میں بہت معاون ہوگا اور ان کا کلام خاص کر مسلمان خواص اور متوسط طبقہ کی بے بسی اور ذہنی کیفیت کا ترجمان بن کر اس دور کی معاشی اور تہذیبی کشمکش کا اندازہ لگانے میں بڑی مدد کرے گا۔"

ان اقتباسات کو ملا کر پڑھنے سے احتشام حسین کے تنقیدی رویے کی کئی اہم سمتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ان کے نزدیک شعر و ادب کا کم سے کم یہ مصرف ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے دور کی معاشی اور تہذیبی کشمکش" کا اندازہ لگانے میں مدد کرے۔ دوسرے یہ کہ جو ادب اپنے دور کی سیاسی انقلابی اور آزادی فکر و نظر کے لیے جدوجہد اور کشمکش کی نشاندہی کرنے اور ایسے جذبات اور ایسی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں ان کا معاون نہیں ہے گا وہ ان سے کم سے کم تعلق اور لگاؤ کی عکاسی اور نشاندہی سے بھی عاری ہوگا۔ خود ادب اور زندگی کے تعلق سے بھی وہ جس جذبے سے سب سے زیادہ بیدار کرسکتا وہ زندگی میں آزادی کی تڑپ اور آگے بڑھنے کی کشمکش تھی۔ چنانچہ ان کی زندگی کا کوئی ایسا انفعالی نظریہ جو اس کی زیریں سطح اور بالائی سطح کی کی کھوج لگانے سے گھبرائے اور محض اوپری اضطراب اور انفرادی مایوسیوں کو زندگی کی اصل سمجھتا ہو، وہ کبھی ادب کی ترقی، اس کی نشو و نما اس کے اندر اظہار و بیان اور ادبی رویے میں تبدیلی لانے کا اہل نہیں بن سکتا۔ یہ تو ان کے نزدیک تخلیق شعر و ادب کے لازمی اور کم سے کم تقاضے ہیں اور ان ہی تقاضوں کو وہ نقاد کے پیش نظر رہنا اور عملی تنقید کے دوران ان کی جستجو اور تفتیش کرتے رہنا بھی لازمی سمجھتے ہیں۔

ادب کے مادی اور اشتراکی نقطۂ نظر کے سلسلے میں عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہاں فرد کی ذات اور اس کی انفرادیت کو اجتماعیت اور اجتماع پر قربان کر دیا جاتا ہے اس موقع پر اس نزاعی مسئلہ پر بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں ہے۔ اشارۃً صرف اس بات کی طرف کرنا ہے کہ احتشام حسین ادب کے مادیات اور اشتراکی انقلابی نقطۂ نظر کے اتنے متوازن اور اتنے بڑے مبلغ تھے کہ وہ اس معیار سے ہٹ کر کبھی ادب کے متعلق سوچتے بھی نہیں تھے ان کا معیار جمال و جمالیات بھی [illegible] نہیں انقلابی ہی تھا اور فرد کے نفسیاتی تجزیے کی بنیاد بھی ان کے یہاں اس کے معاشی سیاسی [illegible] [illegible] [illegible]

کر نظریات کو رد کر دینے میں بھی بے باک تھے۔ چنانچہ اس مقام پر ذرا سا ٹھہر کر ہمیں "انسان" احتشام حسین پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

احتشام حسین کی تحریریں اتنی واضح اور اتنی بردبار ہیں کہ ان کے توسط سے جو احتشام حسین ہمارے سامنے آتے ہیں وہ انتہائی گمبھیر، لیے دیئے، سنجیدہ اور ٹھہرے ہوئے اور خشک مزاج عالم احتشام سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ کسی کا مشہور فقرہ ہے اگر ان کی تنقید میں بھولے سے بھی کوئی شگفتہ جملہ آ جاتا ہے تو وہ اسے کاٹ پھینکتے ہیں لیکن ان تحریروں میں زیر سطح ایک عجیب سے اضطراب اور حساسیت کا احساس مجھے بار بار ہوتا رہا ہے جب وہ ادق مباحث اور خشک مسائل پر بے حد ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے انداز میں مصروف فکر و تحریر ملتے ہیں تب بھی یوں لگتا ہے کہ کوئی چیز انھیں بے قرار کیے ہوئے ہے کہ کہیں وہ اس چیز سے دامن کش تو نہیں ہو رہے ہیں۔ انھیں کیا چیز کا جذبہ۔ کیا احساس اس طرح سے آتش زیر پا رکھتا ہے؟ یہ تڑپ کیا ہے؟ وہ کس جستجو میں مصروف فکر و تحریر ہیں؟ یہ ان کی انفرادیت کا اہم پہلو ہے۔

ان تمام سوالوں کا جواب صرف ایک لفظ میں ہے اور وہ لفظ "کش مکش" ہے۔ احتشام حسین کے یہاں یہ کشمکش بڑی پہلو دار ہے۔ مثلاً ان کی اپنی انفرادی حیثیت کی یہ کشمکش کہ وہ اپنی نظریاتی شخصیت اور اپنی سماجی اور گھریلو شخصیت میں کہیں تضاد عمل کے شکار تو نہیں ہیں؟ جس نظریے کو انھوں نے اپنایا ہے وہ اس کی صداقتوں کو بار بار TEST کرتے ہیں۔ فکر میں، تحریر میں، تقریر میں، عام گفتگو میں، عام نقل و حرکت میں ہر جگہ وہ اپنے آپ کو امتحانی کمرہ میں مستقل اور مسلسل طور پر محصور کر لیتے ہیں۔ اس کی چہار دیواری سے نکلنا چاہتے تھے اور نہ نکل سکتے تھے۔ پھر وہ شدید طور پر اپنی سماجی اور نقادانہ ذمہ داریوں کا خاص پاس کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ ایسا ادیب جو زندگی اور ادب دونوں کو سمجھنے اور تخلیق کرنے سے سرسری گذر رہا ہو وہ اسے کبھی معاف نہیں کرتے تھے اور اس کے برعکس زندگی اور ادب کے اس رشتے کے حامل ادیبوں اور ان کی تحریروں کا بڑا تفصیلی مطالعہ پیش کرتے تھے یہی کچھ ان کے اندر اس انتشار اور اضطراب کی نشاندہی کرتا ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک بار پھر ان کی ڈائری "ساحل اور سمندر" سے رجوع کرنا پڑے گا۔

"ساحل اور سمندر" کا پہلا باب "کشمکش اور سمجھوتہ" اس ضمن میں سب سے اہم تحریر ہے۔ وہ امریکہ جاتے ہوئے بھی اس بات کو نہیں بھولے کہ امریکہ کا تصور ان کے یہاں "ایک سرمایہ دار اور اپنا معاشی حلقہ اثر بڑھانے والا جنگ جو ملک" کا ہے (صفحہ ۱۵) اس ملک کو جانا اور اپنے نظریاتی مسلک پر نظر ڈالنا ان کے ضمیر میں "باریک اور نازک سوئیاں" چبھتے رہنے کے مترادف رہا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا واقعہ ان ہی سے سن لیجیے جو کسی درجہ ان کے لیے سوہان روح بنا۔

"کچھ دیر کاغذات کی خانہ پری کے بعد ویزا مل گیا۔ دونوں باتوں نے ضمیر اور خود داری کو ضرور مجروح کیا۔ ایک فارم پر دستخط کرنا پڑے کہ کسی فاشسٹ یا کمیونسٹ جماعت سے تعلق نہیں اور ہاتھوں کی دسوں انگلیوں کے نشان دو تین جگہ مختلف شکلوں میں دینے پڑے۔ ممکن ہے اور جگہوں پر بھی ایسا ہی ہوتا ہو لیکن مجھے یہ بات غیر شریفانہ سے معلوم ہوتی ہے۔ میرے ذہن میں انگوٹھے کا نشان کچھ جہالت اور جرائم سے متعلق ہو گیا ہے" (صفحہ ۳۹)

"ساحل اور سمندر" احتشام حسین کا سفرنامہ امریکہ بھی ہے اور ڈائری بھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہی کتاب ہمیں اس احتشام حسین کو بھی دیکھنے اور سمجھنے میں مدد دیتی ہے جو اپنے معاشرے کے ایک حساس فرد، ایک باپ، عزیز و اقارب کے غم گسار اور درد مند رشتہ دار، اپنے شاگردوں کے لیے شفقت اور محبت بھرے استاد، ایک خلاق ادیب اور شاعر اور ایک ایسے باہوش نقاد کی حیثیت میں چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، سوچتے اور غور و فکر کرتے ہوئے۔ علم و ادب کی خشک وادیوں میں محو سفر اور اپنے اردگرد کے ماحول، لوگوں، عمارتوں، سبزہ زاروں، یادگاروں، جلسوں اور تقاریب میں ہر جگہ دیدۂ بینا لیے ملتے ہیں۔ "ساحل اور سمندر" ان کی چھوٹی بڑی خوشیوں، چھوٹے بڑے غموں اور تفکرات، ذہنی پختگی اور جذباتی استحکام کی بڑی مکمل اور واضح تصویر ہے۔

اس کتاب کا پہلا باب ہمیں احتشام حسین کی نظریاتی پختگی، ان کے اندر تہذیبی رواداری کا پتہ دیتا ہے۔ وہ زندگی بھر سامراج اور اس کے

سیاسی، تہذیبی، سماجی اور ادبی رجحانوں کے خلاف جہاد کرتے رہے، یہی نہیں بلکہ سوشلسٹ فلسفہ، طرز فکر اور نظام زندگی کے پرچم بردار بھی سمجھے جاتے تھے یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی تھی کہ وہ ان امریکی اداروں کی کارکردگی کا ایک ایسا احسان مول لیتے جو ان پر کبھی سرمایہ دارانہ نظام کا حامی ہونے والوں کی فہرست میں شامل ہو جانے کا الزام بن جاتا۔ چنانچہ ان کے ذہنی خلفشار کا وہ عالم تھا کہ کسی طور پر وہ آپ کو راک فیلر فاؤنڈیشن کے تحت امریکہ جانے پر آمادہ نہیں کر پاتے۔ ان کے وائس چانسلر ڈی پی مکرجی جب مسٹر گل پیٹرک سے انھیں ملاقات کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں "ہوشیاری سے گفتگو کرنا شاید تمھارے فائدے کی صورت نکل آئے" تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"میں چلا آیا (مکرجی کے پاس سے) "فائدے کی صورت!" فائدے کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے فکر سی ہو گئی" پھر وہ گل پیٹرک سے ملے۔ بات ہوئی، امریکہ جانے کی دعوت ملی تو وہ اپنے ذہن اور عقائد کو نہیں چھپا سکے۔ اس موقع پر لکھا ہے "اس مشورہ کے لیے (یعنی امریکہ وظیفے پر جانے کے) آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن مسٹر گل پیٹرک! میرے کچھ خاص قسم کے خیالات ہیں۔ ممکن ہے جو نتیجے میں نکالوں اُن سے آپ کو دلچسپی نہ ہو۔"

"کشمکش اور سمجھوتہ" کے عنوان سے یہ باب پورے کا پورا اسی تکرار "دیر و حرم" سے بھرا پڑا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس باب میں احتشام نے اپنی گھریلو زندگی کے اس پہلو کو بھی لیا ہے کہ وہ کبھی لمبے عرصے کے لیے گھر سے باہر نہیں نکلے۔ سفر کرنا بھی اُن کی طبیعت کے خلاف نہیں تو عادت کے خلاف ضرور ہے۔ پھر امریکی شہروں کی چمک دمک والی زندگی اور وہاں کا اکھڑا اکھڑا طرز بود و باش بھی انھیں ڈراتا تھا لیکن اہم ترین بات ان کی نظریاتی ناہم آہنگی کا مسئلہ اور ساتھ ہی اتنے لمبے سفر کی صعوبتوں کے بعد جو نتائج وہ نکالنا چاہتے تھے ان کا ناقبول ہونا ان کے لیے سب سے مرحلہ تھا۔ چنانچہ "ساحل اور سمندر" کی ایک ایک سطر میں اُن کی یہ ذہنی کشمکش نمایاں ہے۔ بحیثیت افراد کے وہ جن جن امریکی لوگوں سے ملتے ہیں، اخلاق کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ ان کے کام کرنے کے طریقوں میں نظم و ضبط کی داد بھی دیتے ہیں۔ لیکن فکری ہم آہنگی کی شکایت اگر لبوں تک نہ آ پاتی تو کم از کم ان کی تحریر اسے ہضم نہیں کر سکتی۔ وہ بار بار "ساحل اور سمندر" میں اس کی طرف اشارے کرتے ہیں اور جا بجا کھل کر بھی کہہ جاتے

احتشام حسین کی انفرادی روش کی یہ خاصیت ان کی تمام تحریروں سے بھی نمایاں ہے۔ اپنے نظریے کے بارے میں وہ بلا کے حساس تھے۔ ان میں نظریاتی سطح پر ان کا ذہن کبھی کشمکش میں مبتلا ہوا اور نہ کبھی اس باب میں انھوں نے سمجھوتہ کے بارے میں سوچا۔ چنانچہ اس نظریاتی پختگی کا تھی کہ وہ اردو تنقید میں روایتی انداز فکر و نظر کے خلاف باغی نقاد کی حیثیت سے آئے اور اسی حوالے سے جانے پہچانے گئے۔ احتشام حسین سلسلے میں اتنے حساس تھے کہ انھوں نے اپنے دوسرے تنقیدی مجموعے کا نام ہی "روایت اور بغاوت" رکھا۔ اس کتاب میں ان کے نو مضامین ہیں۔ پہلے مضمون "ادبی تنقید" سے لیکر آخری مضمون "نیا ادب اور ترقی پسند ادب" تک ہر جگہ احتشام حسین نے اردو تنقید کے بنے بنائے سانچوں ہی نہیں بلکہ نئے کچھ پرانے ادب اور ادیبوں کی بلکہ مسلم ادیبوں اور شاعروں (مثلاً اقبال اور روح اقبال کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اور متعلق نقادوں اور ادب کے مفسروں کی آرا کا جائزہ اشتراکی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں لیا۔ ان کی تفسیر نو REVALUATION کی دور کے نوجوان ذہنوں کو نئی بنائی تنقیدی لکیروں CRITICAL TRACKS کے بارے میں نیا شعور اور نئی روشنی دی۔

احتشام حسین کے یہاں بغاوت کوئی خارجی یا وہبی عنصر نہیں ہے بغاوت کا یہ مفہوم صرف توڑ پھوڑ سے تعلق رکھتا ہے اور محاذ آرائی سے آگے نہیں جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ توڑ پھوڑ والی بغاوت کبھی تعمیری کردار ادا نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس احتشام حسین بغاوت کو محض روایات سے انحراف کرنا یا اس کو صرف جذبات کی رو میں آکر رد کر دینا نہیں جانتے بلکہ وہ اس انحراف یا رد کو آگے بڑھنے، تعمیر کرنے اور نئی طرز کا کو ہموار کرنا سمجھتے ہیں اور یہ کام فرد کے اندر انقلاب آفریں قوت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ احتشام حسین کا ذہن بلا کا انقلاب آفریں ذہن تھا۔ تنقید کا وہ ہیولیٰ جو حالی نے تنقیدی عمل میں عقل اور شعور پسندی کو بروئے کار لانے کے لیے رکھا تھا احتشام حسین کے انقلاب آفریں ذہن نے ایک پیچیدہ اور عظیم الشان عمارت تعمیر کر دی جو کہ بیسویں صدی کے نصف سے ہماری تنقید میں ہر نئے ذہن کو ادب کی چھان پھٹک میں جلا بخش رہی ہے کہ

دکھا رہی ہے۔ خود احتشام حسین نے حالی کی اس انقلاب پسندی کو بھی سراہا ہے جو انھوں نے اردو تنقید میں مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر پہلی مرتبہ رائج کی تھی چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ خیال بغیر مادّے کے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ انقلابی تصور فلسفۂ علم و عمل کا سنگ بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی دفعہ ہیئیت پسندی اور بے معنی تصور پرستی پر بھرپور وار کیا گیا ہے۔" (ادبی تنقید)

حالی کے تنقیدی رویّے کے ضمن میں اوپر کے خط کشیدہ الفاظ خود احتشام حسین کے اپنے ذہن کی بھی تفسیر ہیں۔ وہ خود بڑی شدت سے اردو شعر و ادب اور تنقید نگاری میں ہیئیت پسندی اور بے معنی تصور پرستی کی روایات پر اپنے مضامین میں پے بہ پے وار کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ فلسفۂ علم و عمل کے انقلابی تصور کو بھی اپنی فکر اور تحریروں میں برتتے رہے۔ ادب اور زندگی کے رشتے کے سلسلے میں اُن کے خیالات کا اوپر کہیں پہلے ہی تذکرہ آچکا ہے۔ انقلاب پسندی کے باب میں ان کا کھلا اظہار دیکھنا ہو تو ایک بار پھر ساحل اور سمندر سے رجوع کیجئے۔ وہ امریکہ سے ہندوستان واپس ہوتے ہوئے لندن پہنچے۔ قیام لندن کے دوران ہی وہ پیرس دیکھنے گئے۔ پیرس دنیا کا سب سے زیادہ انقلابی شہر ہے۔ احتشام حسین نے اپنی ڈائری میں پیرس کو سب سے بڑا خراج عقیدت اسی نظریے سے پیش کیا ہے "اب تک میں نے جو شہر دیکھے ہیں ان میں پیرس سب سے زیادہ پسند آیا..... پیرس ایک شہر نہیں دنیا ہے۔ ایک فضا ایک تاثر ہے اس کا ایک مزاج ہے اور یہ سب کچھ صدیوں کے انقلابات کا نتیجہ ہے۔ اس میں شاہوں کے جلال اور انقلابیوں کے نفس شعلہ بار کے اثرات کی رنگ آمیزی ہے اس کے اسٹیج پر محض ڈرامے نہیں ہوئے ہیں دنیا کی تقدیر بنتی اور بگڑتی رہی ہے..... تربیت ذوق اور فکر انگیزی میں پیرس کا بڑا حصہ ہے اس لیے پسند نہ کرنا کفر ہوگا۔" (صفحہ ۳۳۱-۳۳۰)

پیرس کے بارے میں احتشام حسین کے خیالات محض جذباتیت نہیں۔ یہ ان کے اپنے عقائد کے بارے میں ان کے بے حد حساس ہونے کی بھرپور دلیل بھی ہیں جس "تربیت ذوق" اور "فکر انگیزی" کو انھوں نے پیرس کا طرۂ امتیاز مانا ہے وہی کچھ اُن کے اپنے ادبی ذوق اور تنقیدی رویّے کی بنیادی خصوصیت بھی ہے۔ اور اس کا فقدان ان کے نزدیک ادب میں بھی کفر سے کم کا درجہ نہیں رکھتا۔

چنانچہ احتشام حسین کی علمی اور اصولی تنقیدوں نے صرف نئے تنقید لکھنے والوں ہی کی نہیں بلکہ ۱۹۴۵ء (اُن کے پہلے مجموعے کی اشاعت اوّل) کے بعد شعراء اور افسانے لکھنے والوں کی پوری پود کے ذہن اور ذوق کی رہنمائی اور ساخت میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اُردو تنقید کی روایت پرستی کا تذکرہ کرتے ہوئے جو نئی تنقیدی ڈگر وہ ڈالنا چاہتے تھے (دونوں کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ (ہماری تنقید میں) "قوتِ نقد کا اظہار انھیں مقررہ اصولوں کے مطابق ہوتا تھا جو صدیوں سے چلے آتے تھے اور جو اردو شاعری یا ادب کی پیدائش سے پہلے بن چکے تھے اور چونکہ یہ اصول شاعری کے بنے بنائے سانچوں کی طرح مل گئے تھے۔ اس لیے ان میں طاقت اظہار کی کمی تھی..... اب یہ بات کچھ نہ کچھ ہر شخص نے سمجھ لی ہے کہ ہمارے اقتصادی اور سماجی ادارے ہمارے شعور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اگر ہم شعوری طور پر انھیں بدلنے کی کوشش نہ کریں تو آخر کا یہ عمل یک طرفہ ہوتا ہے۔ یعنی ہم حالات کے غلام رہتے ہیں اور عملی جدوجہد میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے خیال کی دنیا میں معمولی ناپ و تول سے آگے نہیں بڑھتے۔" (ادبی تنقید) چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ محض بغاوت کا عنصر اُن کے یہاں ایک معمولی سی بات ہے اور اصل کام ذہن کی اس تعمیر نو کا ہے جس کے بنیادی عناصر میں "تربیت ذوق" اور "فکر انگیزی" شامل ہیں۔

تنقید نگاری کا یہ عمل محض نعرہ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی وہبی علم ہے کہ یہ کہا جائے کہ "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"۔ اس کے کچھ اپنے تقاضے ہیں۔ کچھ شرائط اور کچھ لوازمے ہیں جن کو بہرحال پورا کرنا پڑتا ہے۔ ایک نقاد کو اپنا فرض منصبی پورا کرنے کے لیے اپنے گرد و پیش کے احوال و کوائف علوم سے کتنا باخبر رہنا چاہیئے۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "نقاد کو فطری اور سماجی علوم، انسانی تمدن کی تاریخ، زبان کی پیدائش اور نشو و نما کی تاریخ کا مطالعہ کیے بغیر تنقید کے میدان میں قدم رکھنا چاہیئے ورنہ اس دشوار گذار منزل سے گزر سکے گا۔" (ادبی تنقید)۔ ایک اور جگہ تنقید کے بارے میں اساسی نقطۂ نظر کے متعلق لکھتے ہیں: "ادب کی یہ حیثیت کہ اس میں سماجی حقائق اپنی طبقاتی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور

ادیب کے سماجی رجحان کا پتہ اس کے خیالات سے چلتا ہے۔ ادیب زندگی کی کش مکش میں شامل ہو کر اسے بہتر بنانے کی راہ بتا سکتا ہے۔ آخر کار تنقید نگاری اور مارکسی تنقید میں سب سے زیادہ نمایاں شکل میں ملتی ہے جو نقاد اس نظریہ تنقید (یعنی مارکسی نقطۂ نظر) کو اپناتے ہیں وہ وسیع سماجی نفسیات، عمرانیات یعنی ان تمام باتوں پر نگاہ رکھتے ہیں جو طبقاتی سماج میں پیداوار کی معاشی بنیادوں کے اوپر فکری اور فلسفیانہ حیثیت سے وجود میں آتی ہیں۔ (تنقید اور عملی تنقید)

احتشام حسین کی تنقیدی فکر کے اساسی عناصر، اور تھوڑا بہت اُن کی انفرادی طبیعت اور مزاج کی اس نشاندہی کے بعد اُن کے تنقیدی رویے کی ایک واضح تصویر ہمارے سامنے آجاتی جا چکی ہے۔ اُن کا تنقیدی کام کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ہمارے دور کے تمام نقادوں سے زیادہ بھاری بھرکم اور عددی اعتبار سے سب سے زیادہ ہے۔ اب تک خالص تنقید کے آٹھ مجموعے چھپ چکے ہیں، ایک کتاب ہندوستانی لسانیات پر اور ایک ادبی تاریخ اس کے علاوہ ہیں۔ ان کا آخری مجموعہ "اعتبارِ نظر" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا اور اس مجموعے کے بعد بھی احتشام حسین کی تحریریں چھپتی رہی ہیں۔ انتقال کے وقت تک دو ایک مجموعے اتنا انھوں نے یقیناً لکھا ہے۔ اسی اعتبار سے صرف تنقیدی مضامین کی تعداد ڈیڑھ سو کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ان اعداد و شمار سے قطع نظر اس باب میں دو رائیں ہرگز نہیں ملیں گی کہ احتشام حسین نے اتنی بڑی تعداد میں مضامین لکھے کے باوجود اتنی ٹھوس تنقیدیں لکھی ہیں کہ اُن کی ایک سطر بھی بلا مقصد اور محض بات بنانے کی خاطر نہیں ملتی۔ یہ بات بھی امر مسلّم ہے کہ اُن کے ہر مضمون میں متعلقہ نفسِ مضمون کے ان گنت پہلوؤں کے بارے میں اتنے اشارے ہوتے ہیں کہ ایک ہی مضمون سے دسیوں مضامین کے لیے فکر کی راہیں کھلتی ہیں۔ بظاہر یہ تمام باتیں ان کے تنقیدی رویے کے ضمن میں بے جوڑ محسوس ہوں گی لیکن ان تمام باتوں سے بھی ایک نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ احتشام حسین۔ تنقیدی عمل میں اُن کی علمیت اور سائنسی نقطۂ نظر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نقاد کی علمیت اور اس کی بصیرت کے بارے میں جو کڑی شرط انھوں نے عائد کی تھی (جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے) خود احتشام حسین اس کا عملی نمونہ تھے۔ انھوں نے قدیم اور جدید کے سارے ہی اہم ادیبوں (بہ استثنا میر) پر لکھا ہے۔ ہر ادیب اور شاعر کو انھوں نے اس کے تاریخی، سماجی، سیاسی اور معاشی پس منظر میں رکھ کر اس کی تخلیق کو جانچا پرکھا اور اس کا تجزیہ کیا ہے اور یہ بھی ہے کہ جو نتائج انھوں نے اخذ کئے اور جس طرح سے انھوں نے نئے اور پرانے ادیبوں کو REVALUATE کیا وہ اتنا وقیع کام ہے کہ اگر محض ضد کے تحت مخالفت کو نظر انداز کر دیا جائے تو کوئی احتشام حسین کے تنقیدی فیصلوں کو نہ چیلنج کر سکتا ہے اور نہ انھیں نظر انداز کر سکتا ہے۔ ان کے ادبی تجزیوں کا سائنٹیفک SCIENTIFIC انداز اتنا منفرد ہے کہ باوجود کوشش کے اس کی نقل ممکن نہیں ہو سکتی اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے احتشام حسین کا تنقیدی رویہ جس کے اہم عناصر میں تاریخی، سماجی، سیاسی اور معیشتی کے ساتھ ساتھ انقلابی جذبہ بھی سرفہرست ہے۔ ان کے ذہن اور اُن کی شخصیت کا ایسا جزو اور لازمہ تھا جیسا کہ عام آدمی کے یہاں حواسِ خمسہ کے عام افعال و اعمال ہوتے ہیں۔ اردو ادب کے ترقی پسند دور اور ترقی پسند تحریک کا وہ اتنا بڑا ذہن تھے کہ اب احتشام حسین اور ترقی پسند تنقید دو جدا باتیں نہیں رہ گئی ہیں۔ صرف احتشام حسین کہئے تو اردو کی ترقی پسند تنقید کا پورا مکتبۂ فکر ذہن میں آ جائے گا۔ سچ بات یہ ہے کہ اپنی ذات میں خود ایک علمیت، سائنسی نقطۂ نظر اور سائنسی فکر اور ادب کے انقلابی اور مادّی نظریات کا انسٹی ٹیوشن تھے۔ احتشام حسین کی موت ایک ایسے عالم کی موت ہے جسے "موت العالم" کہا گیا ہے۔ ممتاز حسین کو چھوڑ کر احتشام حسین کے تنقیدی مکتبۂ فکر میں کوئی دوسرا ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے اور یہ کوئی اچھی فال نہیں ہے۔

محمد حسن

احتشام صاحب کے تنقیدی نظریات

لکھنؤ یونی ورسٹی کے وہ دن کبھی نہیں بھولیں گے اور ان دنوں کے متعلق احتشام صاحب کی شخصیت کی وہ دل آویز اور حسین یادیں! ۱۹۴۲ء کا قصہ ہے جب میں نے بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ احتشام صاحب کا نام ان دنوں ادبی حلقوں میں شہرت پانے لگا تھا۔ میں صرف انھیں "نگار" لکھنؤ اور "ادب لطیف" لاہور کے واسطے سے جانتا تھا۔ زمانہ وہ تھا جب سردار جعفری یونی ورسٹی سے نکالے جا چکے تھے۔ انصار ہروانی، ڈی پی دھر جا چکے تھے مگر سیاست کا بول بالا تھا۔ آزاد نظم معرض بحث میں تھی اور تمام کلاسیکی اور نیم کلاسیکی ذوق رکھنے والے نظم کا مذاق اڑانے میں لگے ہوئے تھے اور اس کے ذریعے ترقی پسندوں پر بھی لے دے کرتے رہتے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کا شعبہ اردو بھی کلاسیکی اور آزاد نظم پسندانہ تذبذب میں بٹا ہوا تھا۔ صرف احتشام صاحب آزاد نظم اور ترقی پسندوں کے کلمہ گو تھے باقی پورا شعبہ مخالف۔

احتشام صاحب کو پہلی بار دیکھا تو کچھ عجیب سا لگا۔ ڈھیلی ڈھالی شیروانی، ہاتھ میں کتابوں کے ساتھ تہہ کی ہوئی کپڑے کی ٹوپی جو شیروانی کی ہم رنگ تھی، باتوں میں بڑی نرمی، ٹھنڈک اور کسی قدر ڈھیلا ڈھالا انداز۔ ایسا مرنجاں مرنج شخص بھلا ایسی غیر مقبول، "غیر ثقہ" تحریکوں کی حمایت میں تیغ برہنہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ پھر کلاس میں آئے تو ان کے کلاسیکی ذوق کا ثبوت ان کے طریق تدریس سے ملتا۔ فانی اور غالب کے اشعار کی تشریح کرتے تو ان میں اس طرح ڈوب جاتے تھے جیسے انھوں نے ہی یہ اشعار کہے ہوں۔ خود وضاحت اور صراحت ایسی کہ غبی سے غبی ذہن بھی ان کے کلاس میں دلچسپی اور بصیرت کا سامان پاتا۔ شفقت وہ کہ ہر طالب علم احتشام صاحب سے قربت محسوس کرتا۔ البتہ کلاس کے دوران یا اس کے بعد جو باتیں ہوتیں ان میں کہیں کہیں بت شکنی کے آثار نظر آجاتے وہ نئے خیالات کے حامی تھے نئی اقدار کے حامی تھے مگر اس طرح کہ کسی دل کو گزند نہ پہنچے کوئی پرانی قدر صدمے سے چور چور نہ ہو جائے۔

پھر احتشام صاحب کی تحریریں غور سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے مکاتیب پڑھے خاص طور پر وہ مکاتیب جو انھوں نے مجھے لکھے ان میں ایک ایسے شائستہ سلجھے ہوئے مگر دوسروں کے احترام میں خود کو دبائے جھجکے ہوئے شخص کی تصویر ہے جسے دنیا نے نہیں پہچانا۔ زمانے کے رجحان نے ان کی شخصیت کو کھلنے نہیں دیا۔ شاید اسی لیے وہ اپنے سے کہیں زیادہ دوسروں کو عزیز رکھتے تھے اور دوسرے ان کی تعریف کرتے تھے ان کے کام نہ آتے تھے۔ دوسروں کے لیے اس طرح آسان زیست کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ان کے سینے میں جو آتش فشاں دہکتے رہے ان کا دل جس طرح خون ہوتا رہا، ان کا علم دوسروں کو کیا ہوتا گمان تک نہ ہوا اور وہ اپنے اور دوسروں کے غم کا دل پر کوہ گراں اٹھائے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اچھے انسان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کی اچھائی معاملات میں شامل معلوم ہوتی ہے جو ہمارے چاروں طرف موجود ہے اور اس کے بغیر ہمارا جینا مشکل ہے مگر ہم اکثر اس کے وجود سے بھی بے خبر ہو جاتے ہیں وہ نہ اپنا نام بتاتی ہے نہ گرجتی گرجتی ہے بس خاموشی سے نرمی

سے بھتی رہتی ہے۔ اچھے انسانوں کا بھی یہی حال ہے کیونکہ اچھائی ان کی فطرت ہوتی ہے اس لیے ان کی اچھائی دوسروں کے نزدیک معمولات
زندگی میں خاال بھولی جاتی ہے تخریب میں بڑا شور و شر ہوتا ہے۔ تعمیری کام خاموشی اور ان تھک اور لگاتار محنت مانگتے ہیں بڑی چھو
عمارتیں ڈھانے والوں کی چھینی اور ہتھوڑی سے پوری فضا گونج اٹھتی ہے مگر وہ مالی جو روز صبح کو چپکے چپکے پودوں کو پانی دیتا ہے یا مردہ
تراشتا ہے یا ان کی گھاس کو ہموار کرتا ہے۔ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہتا ہے اور لوگ متوجہ نہیں ہوتے اور جب پھول کھلتے ہیں اور سبزہ
لہلہاتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں جیسے یہ ہمیشہ سے اسی طرح تھے۔

احتشام صاحب کا بھی یہی کچھ حال تھا۔ پچھلے تیس چالیس برس میں اردو حلقوں کا ایک خاص ادبی ذوق بنا ان کی پسند اور ناپ
کے سانچے تیار ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا ادبی ذوق نے اپنی سمت اپنے آپ ڈھونڈھ لی مگر اس کی تہہ میں جائے
اندازہ ہوگا اس ادبی ذوق کی آبیاری میں احتشام صاحب کی تحریروں کا بڑا دخل تھا۔

احتشام صاحب نے یہ خاموش کارنامہ کس طرح انجام دیا؟ احتشام صاحب حالی کے دبستانِ تنقید سے تعلق رکھتے تھے اسی۔
حالی پر جتنے اور جیسے مضامین انھوں نے لکھے کسی اور نقاد اور شاعر نے نہیں لکھے وہ حالی کے اسی لیے بھی گرویدہ تھے کہ حالی کی شخصیت
اور ان کی اپنی شخصیت میں بڑی مماثلت تھی وہی ہمواری وہی توازن وہی خاموشی وہی چونکا دینے والی حرکات سے پرہیز وہی شخصیت
سادگی اور غیر جذباتیت۔ لیکن احتشام صاحب نے جب تنقید نگاری شروع کی اس وقت حالی کو لوگ بھول چکے تھے جس قسم کی تنقید
کا چرچا تھا وہ بڑی حد تک تشریحی تھی یا پھر لفظی گرفت سے واسطہ رکھتی تھی۔ ان دونوں کے وہ جگمگاتے جاگتے جملوں کی روانی اور
تنقید میں تھیں جو عبدالرحمن بجنوری اور سجاد انصاری کے یہاں ملتی ہیں جو چونکاتی تو ہیں مگر طویل المدت بصیرت نہیں بخشتیں۔ وہ تو
بجلیاں نہیں برقی دھچکے ہیں جو ذہن کو جھکولا تو دیتے ہیں مگر اسے منور نہیں کرتے۔

ترقی پسند تحریک کے ساتھ جو تنقید آئی اس میں بھی ٹھہراؤ نہ تھا احمد علی اور اختر رائے پوری وغیرہ کی مثالیں ہیں۔ یہ ٹھہراؤ احتشام صاحب
نے پیدا کیا۔ سب سے پہلا نکتہ یہ تھا کہ تنقید محض بے لگام تاثرات کا نام نہیں اس کے پیچھے کسی نہ کسی معروضی بنیاد کا ہونا لازمی ہے۔
تاثرات کو ہم خاص داخلی کہتے ہیں ان کے پیچھے بھی اقدار کا کوئی نہ کوئی نظام ضرور ہوتا ہے کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہوتی ہے جس
کی جانچ کی جانی چاہیے گویا تنقید ادب اور علم کو ملانے کے لیے ایک درمیانی واسطے کا کام دیتی ہے وہ محض مجذوب کی بڑ یا احساس کا اچانک
تنقید کی اسی معروضی بنیاد کو تلاش کرنے کے عمل میں احتشام صاحب ادب کے سرچشموں تک پہنچنے اور ادب کے سماجی رشتوں
کرنے پر مجبور ہوئے

جاتا ہے ادب کا سب سے بڑا حصہ انفرادی تاثرات اور احساسات پر مبنی ہے لیکن افراد خلا میں سانس نہیں لیتے وہ ایک معا
جڑے ہوتے ہیں اور سماجی رشتوں میں بندھے ہونے کی وجہ سے ان کے بعض سے احساسات اور افکار مشترک ہوتے ہیں اسی
حالی کے اس جملے میں پوشیدہ ہے جسے احتشام صاحب نے سب سے زیادہ نقل کیا ہے

"خیال بغیر مادے کے پیدا نہیں ہوتا"

اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو مادے سے یہاں ماحول مراد ہے اور ماحول دیگر عناصر کے علاوہ معاشرے سے بھی بنتا ہے ایک معاشرے
والے لوگ دوسرے معاشرے میں رہنے والوں کے مقابلے میں ایک دوسرے سے زیادہ ملتے جلتے ہوتے ہیں ان کے احساسات
جذبے بھی ملتے جلتے ہوتے ہیں ان کے اقدار اور تصورات میں بھی مماثلت ہوتی ہے پھر اسی معاشرے کی مختلف طبقوں
مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد گویا انفرادی طور پر الگ الگ احساسات و افکار رکھتے ہیں لیکن ان میں

دوسرے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے مقابلے میں باہمی اشتراک اور مماثلت کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر یہ مماثلت ماحول کی پیدا کردہ ہے تو پھر ادب اور سماج کا رشتہ کہیں زیادہ گہرا قرار پاتا ہے اور ایک دور کے ادب میں فکر و جذبے کی جو تبدیلیاں آتی ہیں ان کا سبب احول کی تبدیلیوں میں تلاش کیا جانا چاہیے۔"

احتشام صاحب نے اپنی سبھی تنقیدی تحریروں میں ادب اور سماج کے اس باہمی رشتے کو پہچاننے کی کوشش کی ہے دوسری طرف وہ برابر اس رشتے کی پیچیدگی اور تہہ داری پر زور دیتے رہے ہیں ادب اور سماج کے تعلق کو میکانکی انداز سے سمجھنے کی صورت میں احمد علی اور اختر رائے پوری کے تنقیدی مغالطوں کا اندیشہ ہے کبھی غزل کو جاگیرداری صنعت کہہ کر گردن زدنی قرار دیا گیا ہے تو کبھی اقبال کو فاشسٹ کہہ کر ملعون کیا گیا۔ یہ دونوں غلطیاں دراصل ادب اور سماج کے تعلق کو میکانکی انداز سے سمجھنے سے پیدا ہوئیں۔

احتشام صاحب کے طرزِ تنقید کا شاید سب سے مثالی کارنامہ ان کا مقالہ "غالب کا تفکر" ہے وہ چاہتے تو غالب کو کسی ایک خانے میں رکھ کر مطمئن ہو جاتے لیکن انھوں نے غالب کی پوری شخصیت کو منزل بمنزل ارتقا کو پیش نظر رکھا اور اسی کے ساتھ ساتھ غالب کے دور کی بدلتی ہوئی متنوع اور متضاد حقیقتوں کی تصویر بھی سامنے رکھی وہ غالب کی نسلی وراثت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے پھر غالب کی گھریلو فضا۔ خاندانی حالات، افراد خاندان کے باہمی تعلقات۔ غالب کی نفسیاتی اور فکری زندگی کی پیچیدگیاں پھر ان کے دور کی مجلسی زندگی ان کے احباب اور ان کے مشاغل غرض انسان پر جو جو اثرات مرتسم ہوتے ہیں احتشام صاحب تقریباً سبھی کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں پھر یہاں محض متاثر ہونے والا بے عمل پرزہ نہیں وہ خود بھی ان تاثرات و احساسات کے رد و قبول میں حصہ لیتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے جب ان تمام پہلوؤں سے وہ غالب کی شخصیت کو پہچان لیتے ہیں تب سماجی رشتوں اور معاشرے کی تبدیلیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اس مقالے کا بنیادی سوال یہ ہے کہ غالب کے کلام میں جو نیا عنصر داخل ہوا اس کی سماجی بنیادیں کیا تھیں۔ احتشام صاحب نے اس دور کی مختلف تحریکات کا جائزہ لیا ہے اور اس کے بعد اس نئے عنصر کی نشان دہی کی ہے جو کلکتے میں نئی انگریزی حکومت کی وجہ سے استحکام پا رہا تھا غالب پہلے اہم اردو شاعر ہیں جو اس عنصر سے براہ راست دوچار ہوتے ہیں اور ممکن ہے فکر کی جو تازگی اور انداز احساس کی جو ندرت غالب کے ہاں آئی ہے اس میں اس عنصر کا عمل دخل ہو۔

عملی تنقید کے اعتبار سے یہ مقالہ جس قدر مثالی ہے نظریاتی تنقید کے اعتبار سے "تنقید اور عملی تنقید" کے عنوان سے ان کا مقالہ نمایندہ ہے یہاں احتشام صاحب نے اس سوال سے بحث کی ہے کہ ایک طرف اظہار اور دوسری طرف تفہیم سماجی سطح پر ممکن بھی ہیں یا نہیں؟ احتشام صاحب نے اس مقالے کے علاوہ بھی جگہ جگہ اس موضوع سے بحث کی ہے اس کا عام انداز فکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکمل ترسیل تو کیا مکمل اظہار بھی ممکن نہیں ہے بلکہ مکمل دراصل محض ایک تصور ہے لیکن اگر ایک فرد کے محسوسات تک دوسرا کوئی فرد پہنچ سکتا ہے اور ایک فرد کے استعمال کیے ہوئے الفاظ دوسرے فرد کے لیے بامعنی ہو سکتے ہیں اور دونوں کے درمیان کسی قسم کی عمومی مناسبت یا مطابقت ممکن ہے تو یقیناً وہ تجربات بھی جو فنون لطیفہ کے ذریعے ادا ہوتے ہیں پڑھنے، دیکھنے اور سننے والوں کے لیے بامعنی ہو سکتے ہیں اور فن کار کا مفہوم کسی نہ کسی حد تک سہی سمجھا جا سکتا ہے۔

یہاں مسئلہ یہ بھی ہے کہ جمالیاتی تجربات کیا اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے دوسرے تجربات سے مختلف ہوتے ہیں کیا وہ سب انسانوں کے لیے یکساں نہیں ہوتے؟ اور جمالیاتی جذبے اور احساس کے لیے اعصاب کا کوئی مخصوص نظام ہوتا ہے؟ اگر تمام انسانوں کا حیاتیاتی اور اعصابی نظام یکساں ہے تو بھی لازم ہے کہ ان کے محسوسات کی طاقت بھی یکساں ہو گی۔ دوسری صلاحیتوں کی طرح یہ صلاحیت بھی کم یا زیادہ تربیت یافتہ ہو سکتی ہے۔ اس سے ملحق کئی سوالات ہیں۔ اگر جمالیاتی احساس صرف چند افراد کے لیے مخصوص ہے تو پھر عام قاری کی رسائی اس تک نہیں ہو سکتی جب تک قاری خود اس منزل تک کسی صورت سے نہ پہنچ جائے اگر جمالیاتی احساس اور جمالیاتی تجربے

وہ دوسرے محسوسات و تجربات سے یکسر مختلف ہے تو پھر جمالیات منفرد و بالذات شعبہ قرار پاتی ہے اور اس پر وہ صفت سائنسی علوم کے اطلاق نہیں ہوتا یہی نہیں بلکہ ادب اور سماج کے رشتے کی نوعیت بھی یکسر بدل جاتی ہے اس کے مقابلے جو لوگ جمالیاتی تجربے کو تجربوں میں ملا دیتے ہیں اور دوسرے تجربات کے اصول جمالیاتی تجربوں پر بھی نافذ کرتے ہیں وہ میکانکی طرز فکر کی بدولت طرح طرح کے شکار ہوتے ہیں۔ احتشام صاحب نے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک متوازن رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ جمالیاتی تجربے کو دوسرے تج سے فی نفسہ جدا نہیں مانتے گو کیفیت کے اعتبار سے مختلف ضرور تسلیم کرتے ہیں۔

اسی سے ملحق مسئلہ انداز بیان اور اظہار کا ہے۔ اگر تجربات اور جمالیاتی تجربات کی بنیادیں مشترک ہیں تو دونوں کی جڑیں ہم پیوست ہوں گی اور قاری اور فن کار دونوں کا باہمی رشتہ کافی گہرا ہوگا ایک کا تجربہ بظاہر انوکھا اور منفرد معلوم ہوگا مگر اپنے عنصر کی وجہ سے بالکل نامانوس نہ ہوگا اس وجہ سے ناقابل تفہیم ہونا لازم نہیں۔ احتشام صاحب لفظ کی معنوی، صوتی اور دیگر ادبی آشنا تھے اسی لیے ان کی نظر اظہار اور ابلاغ کی پیچیدگیوں تک جاتی تھی۔ "شاعر" کے سالنامے میں ان کا آخری مقالہ بھی اسی موضوع تھا جس میں انھوں نے تلسی داس کے ایک دوہے کی مدد سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنکھ کی زبان نہیں ہے اس لیے وہ جو بے ادا نہیں کر سکتی اور زبان کے آنکھیں نہیں ہیں اس لیے وہ جو بیان کرتی ہے وہ دیکھ نہیں سکتی یعنی مختلف وسائل سے حاصل کیے مشاہدات اور ان سے عبارت تجربات کے لیے جو وسائل اظہار ہیں وہ بڑی حد تک روایتی ہوتے ہیں اس لیے ان میں نئے تجربے کی اور ندرت نہیں آپاتی۔ لیکن یہ ہفت خوان خواہ کتنی ہی دشوار کیوں نہ ہو ہر عظیم شاعر کو طے کرنی ہوتی ہے غالب اسی لیے بڑے کہ انھوں نے نسخۂ حمیدیہ کے ایسے ادق اور ناقابل فہم دلکش اور خیال انگیز اشعار کہے بلکہ اس لیے عظیم ہیں کہ وہ ترسیل اور ا لگاتار جدوجہد کر کے اس منزل سے آگے بڑھ سکے۔

یہ اور اس قسم کے سوال پہلی بار اردو تنقید میں اٹھائے گئے تھے اور یہ اولیت احتشام صاحب کے حصے میں آئی تمام عمر وہ ان پر غور کرتے رہے اور آخری دور میں انھیں ان کے لیے نئے سرے سے جہاد کرنا پڑا۔ جدیدیت کی نئی طغیانی آئی تو ان تمام سوالوں کے فراہم کیے گئے ادب برائے زندگی کو رد کر کے پھر فن برائے فن کے نظریہ کا ادعا ہونے لگا۔ اس رجحان سے سب سے پہلی اور کھلی ٹکر احتشا نے لی وہ کسی کو خفا کرنے کو مشکل ہی سے آمادہ ہوتے تھے لیکن یہاں سوال ادبی معتقدات کا تھا جو انھیں اس لحاظ سے بھی عزیز تھے عمر بھر کی کمائی تھے ان کے تحفظ کے لیے انھوں نے کھل کر بات کہی اور بہت سے دوستوں کی خفگی مول لی۔

جہاں تک نظریاتی تنقید کو برتنے کا سوال ہے احتشام صاحب کے اصول اور عمل میں تضاد بہت کم ملے گا اس کی سب سے حسرت موہانی، اختر شیرانی اور فانی بدایونی پر ان کے مضامین میں سامنے آئی حسرت ان لوگوں میں تھے جو اپنے کو مسلم اشتراکی اور سوویت آئین کے زبردست حامی تھے۔ مغربی حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بار بار جھیلیں اپنی شاعری پر جہاں تک ہو سکا ان صعوبتوں ہی کا نہیں اپنے سیاسی معتقدات کا سایہ بھی پڑنے نہیں دیا تھا۔ اختر شیرانی سرتا تھے جذبات کے پتلے اور تخیل کے شہزادے جن کا تعلق نہ مربوط عقیدے سے تھا نہ سیاسی نظریے سے وہ خوابوں کی دنیا میں آزاد بادلوں کی طرح جھومتے ہیں اور خیالی لیلا اور سلمیٰ کے گیت گاتے ہیں ان کے تخیل کی حکمرانی کراں تا کراں پھیلی ہوئی ہے اور اس کوئی ضابطہ اور نظام ایسا نہیں جو ربط اور آہنگ پیدا کر سکے۔ فانی قنوطی ہیں وہ یہی ایسے کہ بہار کا ذکر بھی کرتے ہیں تو موت میں موت کو محبوبہ کی طرح سجاتے ہیں اور قضا کی بے رحمانہ ادا پر دل و جان نچھاور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں شاعر مارکسی نقطۂ نظر شاعر تھے ان پر سپاٹ فیصلہ صادر کرنا آسان تھا لیکن احتشام صاحب نے دشوار راستہ پسند کیا اور سپاٹ سا فیصلہ دینے کے بجائے

شاعروں کی ذہنی نشو و نما کو ان کے دور کے سماجی حالات اور تہذیبی محرکات کی روشنی میں سمجھنے کی ہمدردانہ کوشش کی وہ فانی کو اس لیے رد نہیں کرتے کہ فانی قنوطی تھے وہ اس قنوطیت کے پیچھے فرد اور سماج کی غیر فطری کشمکش دیکھتے ہیں اسی طرح اختر شیرانی کی رومانیت کا تجزیہ وہ اپنے طور پر کرتے ہیں جہاں تخیل محض عمل سے گریز نہیں رہتا بلکہ زندگی کا تصور بن جاتا ہے گو اسے بروئے کار لانے کے وسائل محدود ہونے کی وجہ سے ———— وہ خیال کی دنیا تک محدود رہتا ہے حسرت کی شاعری کا بھی انھوں نے اسی قدر گہرائی اور ہمہ گیری کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور ان کی شاعری اور مزاج میں جو سیاسی اور غیر سیاسی منطقوں کی جو تقسیم نظر آتی ہے اسے اس پورے دور پر پھیلا کر سمجھنا چاہا ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ ادب کیا محض سماج کا وفادارانہ عکس ہے یا اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے؟ احتشام صاحب کی تحریروں میں مختلف پہلوؤں سے یہ سوال سامنے آیا ہے۔ احتشام صاحب کا نقطہ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کا کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر اپنانے پر مجبور ہے اور یہ نقطۂ نظر جہاں ایک طرف ان ابھرتے ہوئے حالات سے پیدا ہوتا ہے جو اس وقت موجود ہیں وہاں وہ سماج پر لازمی طور پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور پڑھنے اور سننے والوں کے ذہن اور جذبے کو کسی ایک سمت موڑتا بھی ہے یہ فعل شعوری بھی ہو سکتا ہے اور غیر شعوری بھی اور دونوں صورتوں میں ادیب اپنی سماجی ذمہ داری سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ جب ادب اور سماج کا رشتہ اس قدر گہرا ہو تو اس غیر شعوری اثر اندازی کے عمل کو شعوری طور پر اختیار کرنا زیادہ کارگر ہو سکتا ہے یہ اس لیے بھی لازمی ہے کہ ذہنی رویے اور نقاط نظر سماج دشمن بھی ہو سکتے ہیں اور سماج کو آگے بھی لے جا سکتے ہیں رویہ اختیار کرنا یوں بھی ضروری کہ یہ رویہ جو آگے چل کر نظریہ بن سکتا ہے تمام مشاہدات و تاثرات کی شیرازہ بندی کر کے ادیب کو زندگی کی ایک ہمہ جہت نظام اقدار بخش سکتا ہے ادب جذبے اور خیال کا کھیل ہے اور جذبے اور خیال کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر متاثر کرتا ہے اور یہی دونوں عمل کی بنیاد بنتے ہیں اس لحاظ سے ادب کم و بیش انفرادی اور اجتماعی عمل کو متاثر کر کے سماج کے ڈھانچے میں بدلنے کے کام میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

زمانہ ہر دور میں اپنے سوالوں کے مختلف جواب دیتا ہے احتشام صاحب کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور میں نئے سوالات اٹھائے اور انھیں اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش بھی کی اور اس طرح کہ ان کے جوابات لگ بھگ ربع صدی تک اپنے دور کا ادبی مزاج بنے رہے ان کی تحریروں نے اردو تنقید کو بالکل مختلف سطح پر لا کھڑا کیا وہ لفظی موشگافیوں یا تاثراتی جملہ بازیوں سے نکل کر سنجیدہ علمی فضا میں سانس لینے لگی اور ایک طرف سماجی علوم سے اور دوسری طرف جمالیات سے اس کے رشتے مضبوط ہوئے اور ان دونوں کی مدد سے تنقید کی ایک معروضی بنیاد استوار کرنے کی کوشش کی گئی ذوق ادب اور شعور میں جو تبدیلیاں آتی ہیں احتشام صاحب انھیں محض اتفاق نہیں مانتے بلکہ ان کے پیچھے سماجی عوامل کی کار فرمائی کے قائل ہیں انھوں نے اس موضوع کو اتنی اہمیت دی کہ اپنے ایک مجموعے کا نام یہی رکھا ان تبدیلیوں کے پیچھے مشترک محرکات ہونے کی بنا پر گو ایک دور کے مختلف افراد کا ذوق مختلف ہو گا اس دور کے مختلف افراد کا عام مذاق کسی دوسرے دور کے مختلف دور کے عام مذاق کے مقابلے میں ایک دوسرے سے زیادہ مشترک ہو گا اور اسی اشتراک سے ادب کو روایت اور بغاوت کی راہ ملتی ہے روایت مختلف ادوار کی مشترک اقدار سے جنم لیتی ہے اور بغاوت اس اقدار [illegible] ئے سماجی حالات کے پیش نظر تشکیل نو کرتی ہے اور ان میں اضافہ کرتی ہے۔ احتشام صاحب کی تنقید نے اردو کے تنقیدی سرمایے کو نیا آہنگ بخشا ہے جس سے اس کا نیا لہجہ اور سمت ہی نہیں ملے بلکہ ایک نئے شعور کی طرف رہبری ہوئی۔ زندگی بھر کی لگن، محنت، استقلال اور تخلیقی بصیرت کا یہ ورثہ اور تنقید ہمیشہ عزت اور احترام کے ساتھ محفوظ رکھے گی۔

عکس اور آئینے

صفحہ ۲۲۰ : " یوں تو ہمیشہ فن کا مقصد عام زبان میں یہی رہا ہے کہ ایک ادیب شاعر یا مصور اپنے جذبات اور محسوسات کو خاص فنی ذرائع سے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ترسیل کا یہ عمل بے پیچیدہ ہوتا ہے اس لیے محض اتنا کہہ دینے سے حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ ارادہ اور انتخاب کا سوال پھر اٹھتا ہے اور زبان کے استعمال پر منحصر ہو کر ادیب کے شعور و فن سے وابستہ ہو جاتا ہے ہر لکھنے والا کچھ کہنا چاہتا ہے کسی زبان کے ذریعے کہنا چاہتا ہے اور کسی واقعے یا مفروضہ ہستی یا گروہ سے کہنا چاہتا ہے اس کے سامنے فن کا جو تصور بھی ہو ان منازل سے اس کا گزرنا لازمی ہے اس طرح ہم جس پہلو سے بھی دیکھیں ادیب کا رشتہ سماجی زندگی سے قائم ہو جاتا ہے اور اس ادّعا کے باوجود کہ وہ صرف اپنے لیے لکھتا ہے اور اس کا جو جی چاہے وہی لکھتا ہے کئی باریک زنجیریں اُسے باندھے رہتی ہیں۔"

اخلاق اثر

احتشام حسین ــــ اور ــــ فنِ افسانہ

احتشام حسین اردو کے ان گنے چنے ناقدین میں سے ایک ہیں جنھوں نے تنقید اور تحقیق کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیے۔ ...شام حسین کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ انھوں نے مزاحیہ خاکے، ڈرامے، نظمیں ...ا بھی لکھیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی تنقید میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ یونیورسٹی میں ملازمت کے بعد تدریسی تقاضوں کی وجہ سے ...بڑھتی گئی۔ اس میں دوستوں، ادبی سالوں کے مدیروں اور ذاتی ذوق و شوق کو بھی دخل حاصل تھا۔

احتشام حسین نے افسانہ نگاری کئی بار ترک کی اور کئی بار اختیار کی۔ اس ترک اور اختیار میں انھوں نے افسانہ نگاری کو تنقید سے کمتر نہیں سمجھا۔ انھیں افسانہ نگاری ترک کرنے پر تاسف بھی ہوا اور تکلیف بھی۔ افسانہ نگاری چھوڑنے کے بعد بھی وہ ...یں پوری دلچسپی لیتے رہے اور اس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ہیں جو ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعوں "عکس اور آئینے"، ...ت اور بغاوت"، "افکار و مسائل"، "ادب اور سماج"، "ذوقِ ادب و شعور"، "تنقید اور عملی تنقید"، "اعتبارِ نظر" میں شامل ہیں۔ افسانہ ...نگاروں اور افسانوی ادب سے متعلق ایسے مضامین کی تعداد تقریباً پندرہ ہے۔ ان مضامین کے علاوہ "ویرانے" کا دیباچہ، ڈاکٹر شمیم حنفی کے سوانحی ...احتشام صاحب" (کتاب فروری ۱۹۶۵ء) اور "احتشام حسین سے ایک انٹرویو" میں رام لعل، قاضی عبدالستار اور عابد سہیل کے ...کے جواب میں، احتشام حسین نے افسانے سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے "نقشِ نگارشات" میں بھی ...ین کی ایسی دس تحریروں (مضامین، انٹرویو، تاثرات، گفتگو) کی نشاندہی کی ہے جن میں افسانہ نگاروں اور افسانوی ادب ...ع بنایا گیا ہے۔

احتشام حسین کی افسانوی ادب سے متعلق تحریروں کے تنقیدی تجزیے سے یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے افسانہ کے ...لہ سے کوئی مضمون نہیں لکھا۔ اور غالباً اسی وجہ سے احتشام حسین کے کچھ ناقدین کو یہ تاثر ملا کہ ان کو "نظریہ" زیادہ عزیز تھا۔ انھیں ...سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس نے احتشام حسین کے طریقۂ کار کو ذہن میں نہیں رکھا ہے۔

احتشام حسین نے اردو افسانہ کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا۔ ان کے سامنے افسانوی تنقید کے لیے چار راستے تھے۔ ...ان میں ...سا کو انھوں نے منتخب کر لیا۔ اس کا ان کے پاس جواز تھا۔ "اردو افسانہ (ہندوستان میں)" میں انھوں نے اپنے طریقۂ کار اور وجہ ...کی وضاحت کی ہے:

"ادب کی ہر دوسری صنعت کی طرح مختصر افسانے کا مطالعہ بھی کئی نوعیتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ محض معروضی انداز نظر اختیار کر کے یہ دیکھا جائے کہ اردو کے مختصر افسانوں میں انسانی زندگی کے کون کون

ے پہلو کس کس طرح پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں تنقید کے بجائے تجزیہ اور تحلیل سے کام لیا جائے تاکہ کچھ افسانوں کا حسن ہم پر آشکار ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ افسانوں کا مطالعہ افسانہ نگار کی نفسیات، اس کے تجربوں کی نوعیت اور مقصد اظہار کی روشنی میں کیا جائے تاکہ افسانہ اور افسانہ نگار دونوں کا مطالعہ ساتھ ساتھ ہوتا جائے۔ اس صورت میں بھی تنقید سے پہلو تہی کی جا سکتی ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ افسانے کو ایک سماجی دستاویز کی حیثیت سے دیکھا جائے اور اس میں پیش کی ہوئی زندگی کی بنیاد پر قومی مزاج اور کردار کے بنیادی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس حالت میں افسانے کی فنی حیثیت پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ صرف اس کا مواد جاذب توجہ بنتا ہے۔ اور چوتھا طریقہ یہ ہے کہ افسانے کے تاریخی ارتقاء کو بنیاد بنا کر اوپر بیان کی ہوئی تمام صورتوں کو اس میں شامل کر لیا جائے یعنی موضوع کے انتخاب، فن پر گرفت، مواد کی پیش کش اور مقصد اظہار کو افسانہ نگار کے شخصی رجحان اور سماجی شعور کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ فکر و فن کے ارتقاء کا اندازہ ساتھ ساتھ ہوتا چلے۔ یہ طریقہ کیوں اور کیسے کا جواب بھی دیتا چلتا ہے، مصنف یا افسانہ نگار کے خلوت خانۂ دل تک بھی پہنچتا ہے اور افسانے کے کسی پہلو یا لطف اندوزی سے محروم نہیں رکھتا ہے۔[۱]

احتشام حسین کی اس تحریر سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ تیسرا طریقہ اس لیے پسند نہیں کرتے کہ اس میں "افسانے کی فنی خصوصیات پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی صرف اس کا مواد جاذب توجہ بنتا ہے" اور وہ چوتھے طریقہ کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ اس میں فکر و فن کے ارتقاء کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ احتشام حسین نے افسانے کے مطالعہ میں "تاریخی ارتقاء" کو بنیاد بنایا اور اس میں ان کے اپنے فکر و فن کے تصورات واضح ہوئے۔ چونکہ ان کے مضامین میں "فن افسانہ" پر کوئی الگ سے تحریر طلب ہے اس لیے اس مضمون میں احتشام حسین کے "نظریہ فن" سے متعلق تحریروں کو اپنی اصل حالت میں پیش کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے۔

احتشام حسین نے "افسانہ" کے ارتقاء، ترقی، کردار، مزاج، مقصد اور اہمیت میں فن کو بڑی اہمیت دی ہے۔ انہوں نے افسانہ کی مخصوص خوبیوں اور فنی تقاضوں کے پیش نظر ہندوستان، ایران، چین اور عرب میں لکھے گئے "قصّوں کو" جو مختصر افسانے سے کیا نسبت رکھتے تھے۔ افسانہ تسلیم نہیں کیا اور اس کی ابتداء "گذشتہ صدی" یا "انیسویں صدی" میں تلاش کی۔[۲] یہ "صنعتی تمدن"[۳] کے اثرات کا پروردہ ہے۔ "ایک نئے شعور کا اظہار اور ایک نئی دریافت ہے جو اپنی تہ در تہ معنوی خصوصیات کی وجہ سے کہانی کی اس ہیئت کا عکس معلوم ہوتا ہے جس کا ارتقاء انیسویں صدی کے یورپ اور امریکہ میں ہوا۔[۴]" اردو افسانہ کی ابتداء اور نشو و نما کی کہانی بیسویں صدی کے ادبی شعور اور ذہنی ارتقاء سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سے عناصر کے اشتراک اور سطحی مماثلت کے باوجود اردو کا مختصر افسانہ عصری تقاضوں ہی کا نتیجہ ہے۔[۵]

اردو افسانہ کی ترقی میں دوسری زبانوں کے افسانوں کے ترجموں نے اہم حصہ لیا۔ فکر و فن کے نئے معیار سامنے آئے اور ان کے دور رس اثرات اردو افسانہ پر پڑے۔ احتشام حسین نے کئی جگہ ترجموں کا خصوصیت سے ذکر کیا اور ان کو اس لیے اہمیت دی کہ اردو افسانہ کا فن ان سے بہت متاثر ہوا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اردو میں شائع ہوئے افسانوں کے ترجموں کے اثرات کے بارے میں انہوں نے "اردو افسانہ" میں لکھا کہ "پلاٹ بنانے کا شعور، تکنیک، رکھنے کا ڈھنگ اور فنی لوازمات کی طرف توجہ دی جانے لگی تو اردو افسانہ نے ترقی

۱؎ عکس اور آئینے۔ احتشام حسین ص۹۱ ۲؎ افکار و مسائل۔ احتشام حسین ص۲۵۲ ۳؎ روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین ص۱۳ ۴؎ عکس اور آئینے
احتشام حسین۔ ص۸۵ ۵؎ اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص۱۱۱

(۱۹۶۲ء) میں انہوں نے تحریر فرمایا۔

"اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے روسی، فرانسیسی اور انگریزی افسانوں کے ترجمے بڑی تیز رفتاری سے اردو رسائل میں شائع ہونے لگے تھے اور بہترین مغربی افسانوں کے معیار نگاہوں کے سامنے آ گئے تھے ...... ان ترجموں سے موضوع کے انتخاب، پلاٹ کی تعمیر، ڈرامائی خاتمہ اور تکنیک کے تنوع کی طرف متوجہ کیا لیکن محض نقالی کے بجائے یہ اثر بڑی خاموشی سے افسانہ نگاروں کے شعور میں داخل ہو گیا۔"[1]

احتشام حسین نے کچھ ناقدین سے اتفاق کرتے ہوئے افسانہ کو ادب اور صحافت کے درمیان ایک صنف کا درجہ دیا ہے[2] اور دوسری جگہ ... داستان اور ... کی افسانہ نگاری سے بحث کرتے ہوئے افسانہ نگاری کو "زندگی کی عکاسی، تفریح اور تعبیر"[3] کہا ہے۔ تیسری جگہ یہ لکھا ہے کہ "افسانہ زندگی کا ادبی نقش ہے"[4]۔ ان کے نزدیک ایک کمتر درجہ کا افسانہ بھی حقیقت کے بغیر نہیں تخلیق کیا جا سکتا۔ "ہم ... بلندی پر جا سکیں یا نہ جا سکیں، بغیر حقیر سے حقیر افسانے کی تخلیق ممکن نہیں"[5]۔ احتشام حسین کو اپنے نظریات پر صداقت کا یقین تھا اور ان کا یہ ... تھا کہ افسانہ اور زندگی ایک حقیقت کے دو رخ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے افسانہ نگاری کا جائزہ اسی عقیدے کی روشنی میں لیا۔

"ہندوستانی زندگی دس سال میں کتنی بدلی ہے اس کا اندازہ ہندوستان کے افسانوں سے لگ جاتا ہے"[6]

وہ ناولوں اور افسانوں کو زندگی کا مظہر کہتے ہیں۔ "جب سے صنعتی تمدن کی ابتداء ہوتی ہے یا سائنس اور حکمت کی ترقی کا اظہار ہے اس وقت سے ناولوں اور مختصر افسانوں میں زمان و مکان کی حقیقت اور صداقت کو عروج حاصل ہوتا ہے اور ہم اس صنف ادب میں ... کی پوری مشین کی حرکت، محنت اور سچائی کے ساتھ تلاش کرتے ہیں"[7]۔ احتشام حسین کی دوسری تحریروں میں ان کا نظریہ زیادہ وضاحت ... پیش ہوتا ہے کہ انہیں حقیقت یا زندگی کی تصویر کاری عزیز ضرور ہے مگر فنی قیود کا احترام بھی ضروری ہے :-

"حقیقت افسانہ کی روح میں گھلی ہوئی ہے بشرطیکہ افسانہ نگار محض داستان گو بن کر نہ جانا چاہتا ہو۔ بلکہ انسانی روح کا انجینیئر ہونے کی حیثیت سے اسے اپنی بصیرت کے اظہار میں کوتاہی کا مجرم نہ ہونا چاہیئے۔ معمولی آدمی بڑا شاعر یا افسانہ نگار نہیں بن سکتا۔ یہاں معمولی انسان کہہ کر کسی قسم کا طبقاتی زینہ بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ شخص مراد ہے جس کی بصیرت معمولی ہے اور جس میں ذمہ دارانہ طور پر انسانی مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے کا شعور نہیں ہے۔ نظام زندگی کو پوری طرح سمجھنا، ان تعلقات کی وجہ سے پیدا ہونے والے تہذیبی ڈھانچے کو سمجھنا اور پھر ان سب کو زمان و مکان کی وسعت میں متحرک دیکھنا۔ یہی چیزیں انسانی کردار، اس کی امنگوں اور تمناؤں، اس کی فتح اور شکست، اس کی ترقی اور پسپائی کی صحیح تصویریں کھینچنے میں افسانہ نگار کی مدد کر سکیں گی اور وہ خود اعتمادی کے ساتھ معمولی معمولی واقعات میں زندگی کی پوری مشین کی حرکت دکھا سکے گا۔ افسانے میں اس مکمل حکیمانہ حقیقت کی آمیزش افسانے کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے بغیر اسے زندگی کے قریب کر دے گا"[8]

احتشام حسین نے مختصر افسانہ کی کچھ خصوصیات بیان کی ہیں اور ان پابندیوں کا ذکر کیا ہے جو مختصر افسانہ کے لیے ضروری ہیں :

---

[1] ... آئینے۔ احتشام حسین صفحہ ... [2] افکار و مسائل۔ احتشام حسین صفحہ ۲۵۲ [3] اعتبار نظر۔ احتشام حسین۔ صفحہ ۱۳۶-۱۳۹

... روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین صفحہ ... [6] روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین صفحہ ۱۸۸

... روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین صفحہ ۱۳۷ [7] روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین صفحہ ۶۱-۶۲

"مختصر افسانہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو اپنی گہرائی اور حد بندی کے لحاظ سے زندگی کے چند ہی عناصر پر مبنی ــــــــــ
ــــــــــ اور چند ہی پہلوؤں تک وسیع ہو سکتا ہے۔ اس کے مختصر خاکے میں چند کردار، چند واقعات اور چند مناظر سے زیادہ نہیں سما سکتے پھر چاہے کسی مخصوص تکنیک کی پابندی نہ بھی کی جائے، وحدت زمان و مکان اور وحدت تاثر کا کسی حد تک خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اس لیے افسانہ نویس کو کبھی کبھی بہت دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے"[1]

انھوں نے مختصر افسانے کی خصوصیات بیان کی ہیں ان کے مطابق مختصر افسانہ طویل ہو سکتا ہے مگر اس کا خاکہ مختصر ہوتا ہے۔ خاکہ میں چند کردار، چند واقعات اور چند مناظر پیش ہوتے ہیں۔ وحدت تاثر کے لیے وحدت زمان و مکاں کا کسی حد تک خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ زندگی جو مختصر خاکہ میں پیش ہوتی ہے چند عناصر اور چند پہلوؤں پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کی تکنیک کو اپنایا جا سکتا ہے۔ مختصر افسانہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔

مختصر افسانہ میں زندگی کا عمل طویل ہو سکتا ہے۔ کسی کردار یا کرداروں، ایک خاندان یا خاندانوں کے افراد کی زندگی بچپن سے موت تک۔ پیش ہو سکتی ہے مگر وحدت تاثر کے لیے افسانہ نگار۔ ایجاز و اختصار سے۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو کسی خاص پہلو یا گوشہ یا کسی خاص کردار کی مخصوص صفت، کیفیت یا نفسیات وغیرہ کے پرتاثر اظہار میں بروئے کار لاتا ہے۔ احتشام حسین نے جو کرداروں، زندہ تحریروں، زندگی کی مکمل ترجمانی، اعلیٰ نقوش اور گہرے خطوط کو اعلیٰ معیار تسلیم کیا۔ "ویرانے" کا دیباچہ ان خیالات کا آئینہ دار ہے۔

احتشام حسین نے افسانہ نگاری کے لیے چند بندھے ٹکے موضوعات نہیں پیش کیے بلکہ انھوں نے موضوعات کا انتخاب افسانہ نگار کے شعور اور رجحان پر چھوڑا اور ہاں پر فن کی پابندی عائد کی:

"وہ اپنے رجحان کے مطابق موضوع چنیں گے۔ لیکن جب وہ اسے پیش کریں گے تو فن کے کچھ لوازم ہوتے ہیں ان کا احترام کریں گے۔ ان کو پیش نظر رکھیں گے۔ یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ وہ لکیر کے فقیر ہوں اور جس طرح سے دوسروں نے افسانے لکھے ہیں وہ بھی ویسے ہی افسانہ لکھیں۔ ان کا جی چاہے فن میں تجربہ کریں، انسانی تجربوں کو ایسی شکل دیں جو انفرادیت کی حامل ہو، لیکن انھیں اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ ان کا فن موضوع اور ذاتی تجربے عام لوگوں کے تجربہ کی دسترس میں آجائیں۔"[2]

اس اقتباس میں کئی اہم باتیں بیان کی گئی ہیں۔ موضوع کے انتخاب میں اور فن میں تجربوں کے لیے افسانہ نگار کو آزادی دی گئی ہے۔ فنی لوازمات کی پابندی پر اصرار کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ افسانہ نگاروں کا فن اور ذاتی تجربے عام لوگوں کے تجربے سے بہت مختلف نہ ہوں۔ ان کی پہنچ سے بالاتر نہ ہوں۔ موضوع کے بارے میں تو احتشام حسین نے کہہ دیا تھا کہ "کوئی موضوع جو ہم کو بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ ادب کا موضوع نہیں بڑا موضوع ہو سکتا ہے۔۔۔۔ جس بات پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی موضوع ادب میں بذات خود اہم یا غیر اہم نہیں ہوتا بلکہ اس موضوع کو برتنے کا طریقہ اسے اہم بناتا ہے۔"[3]

جہاں تک ذاتی تجربے کی بات ہے، احتشام حسین نے نئے افسانہ نگاروں سے اس بات کی شکایت کی تھی کہ "امو

---

[1] تنقید اور عملی تنقید - احتشام حسین ص ۲۰۹ [2] اعتبار نظر - احتشام حسین ص ۱۶۹ [3] اعتبار نظر - احتشام حسین ص ۱۷۰-۱۷۱

تک انھوں نے اپنے ذاتی تجربوں کو کسی آفاقی تجربہ سے ملانے کی پوری کوشش نہیں کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کام کسی خاص طرح کے میکانکی عمل سے نہیں ہوگا.......... ہر واقعہ انسان کی زندگی میں ایک بڑے طربیہ یا المیہ کی بنیاد بن سکتا ہے لیکن اگر انفرادی طور پر الگ کر کے بیان کیا جائے تو اس کی حیثیت ایک تنہا اور مجرد تجربے کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس حالت میں افسانہ عظیم نہیں بن سکتا۔[۱] انھوں نے مزید کہا کہ

"جو شخص تخلیقی ادب یعنی افسانے اور ناول کا مطالعہ کرتا ہے وہ واقعات کو واقعات کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ انفرادی اور محدود ہوتے ہوئے بھی بہت سے دوسرے واقعات کا نمائندہ اور ترجمان بن جائے۔"[۲]

احتشام حسین کے مذکورہ اقتباسات میں "ذاتی تجربے" "مجرد تجربے" اور علامتی اندازِ بیان" مخصوص انداز اور مخصوص معنوں میں استعمال ہوئے اور بعد میں ان پر مباحث کے دروازے کھلے۔ ذاتی تجربے اور آفاقی تجربے، مجرد تجربے اور علامتی اظہار بیان کا تعلق اور سلسلہ ترسیل سے جڑا ہوا ہے۔ رام لعل، قاضی عبدالستار اور عابد سہیل نے احتشام حسین سے ایک انٹرویو لیا تھا (کتاب اگست ۱۹۶۵ء) رام لعل نے تجریدی آرٹ یا غیر تجریدی کہانیوں کو غیر ترقی پسند کہے جانے کے بارے میں ان سے سوال کیا تھا۔ اس سوال کے جواب سے احتشام حسین کے ترسیل کے نظریہ کی وضاحت ہو جائے گی۔ انھوں نے جواب میں کہا تھا کہ:

"ترقی پسندی سے اگر ہم وہ ادب مراد لیں جو وقت کے تقاضوں کا خیال رکھتا ہے تو میرے خیال میں تجریدی شاعری اور آرٹ کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ اس وقت نقصان دہ ہو جاتا ہے جب تجرید کی وجہ سے ترسیل خیال ناممکن ہو جائے۔ ایسی صورت میں اسے ترقی پسندوں یا دوسروں کے پسند یا ناپسند کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ ایسے ادب، فن یا شاعری سے گہری وابستگی ممکن نہیں جو دل کے تاروں میں جھنکار نہ پیدا کرے۔ اگر علامتی شاعری جذباتی طور پر آسودگی بخشتی ہے تو اسے ناپسند کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن ایسی صورت میں علامتوں کا استعمال ایسی تجریدی کیفیت کے اظہار کے لیے نہ ہونا چاہیئے کہ اس کے معنی سمجھ ہی میں نہ آسکیں اور رابطہ قائم نہ رہ سکے۔ برخلاف اس کے پروپیگنڈائی ادب بھی انتشار کے زمانے میں اہمیت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ وہ ذہن کو کریدتا ہے۔ اگر علامتوں کا استعمال محض ایک مخصوص گروہ کی ذہنی آسودگی کے لیے ہو تو وہ ادب میں مقبول نہیں بن سکتیں، علامتوں کو عام خیالات کا ترجمان بننا چاہیئے تاکہ وہ اپنا مقصد پورا کریں۔"[۳]

احتشام حسین نے رام لعل کے ایک اور سوال "علامتوں کی شکل الگ الگ لوگوں کے لیے الگ الگ ہوتی ہے" کے جواب میں فرمایا تھا:

"علامتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی۔ طوفان۔ دستِ صبا۔ گلشن وغیرہ ایسی علامتیں ہیں جن کی طرف ہمارا ذہن فوراً منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم ایسی علامتیں بنائیں جو صرف ہماری ذاتی نفسیات کی مظہر ہوں تو ان تک دوسروں کی رسائی مشکل ہو جائے گی (PERSONAL SYMBOL) میں عام طور سے ترسیل خیال کا عمل بے حد محدود ہو جاتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی ایسی علامتیں جو بہت SUGGESTIVE ہوتی ہیں آفاقیت بھی حاصل کر لیتی ہیں۔ علامتی شاعری ایک تحریک کی حیثیت سے جدید ضرور ہے لیکن ادب میں علامتوں سے کام ہمیشہ لیا جاتا رہا ہے۔"[۴]

۱؎ اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص۳۳ ۲؎ اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص۳۴ ۳؎ احتشام حسین سے ایک انٹرویو۔ رام لعل۔ قاضی عبدالستار۔ عابد سہیل۔ کتاب ستمبر ۱۹۶۵

احتشام حسین نے ترسیلِ خیال کو بہت اہمیت دی اور اسے "بنیادی مسئلہ کہا۔" لکھنے والوں کے لیے بنیادی مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی تجربوں کو، اپنی ذاتی معلومات کو، اپنے ذاتی سوچنے اور غور کرنے کے طریقوں کو جب کسی ایسے سانچے میں ڈھال جائے جس کو وہ دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے اس پوری دنیا سے ہم آہنگ کرے جو اس کے گرد و پیش ہے۔ اگر وہ اس میں ناکام رہتا ہے تو اس حد تک اس کا فن محدود ہو جاتا ہے۔ یہاں کوئی حد نہیں ہو سکتیں۔ بڑا کوئی بڑے سے بڑا لکھنے والا ہو اس کے پڑھنے والے جا ہئیں۔ وہ لوگ لکھنے والے کے تاثرات میں شریک ہو سکیں۔[1]

اس طرح احتشام حسین نے قابلِ فہم اندازِ بیان اور ایسا علامتی انداز اختیار کرنے پر زور دیا ہے جس سے ترسیل خیال ممکن ہو افسانہ میں آفاقیت پیدا ہو سکے۔ جب ترسیل کے عمل کو ذہن میں نہیں رکھا جائے گا تو تخلیق ادب ایک معمہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

"لفظ و معنی میں کوئی ایسا انوکھا تعلق پیدا کرنا۔ ایسی علامتیں بنانا یا لفظوں سے ایسی مصوری کرنا جو سماجی حیثیت نہ رکھے افسانہ نگار کے لیے مناسب نہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ اپنے مقصد سے دور جا پڑے گا اور اچھے تخلیقی ادب کے بجائے ایک معمہ دے جائے گا جسے پڑھنے والے حل کرتے رہیں گے۔"[2]

احتشام حسین نے افسانے کی زبان کے بارے میں مختلف مقامات پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لطافت و رعنائی، تازگی اور شگفتگی، شعریت اور اظہار کی روانی، ہلکے پھلکے اشارے اور کنایے، تشبیہوں اور استعاروں کا قابلِ فہم اور انوکھا استعمال افسانے کو قبول عام بخشتا ہے۔ آفاقیت عطا کرتا ہے۔ اس اسلوب کی خوبیوں کے ساتھ انھوں نے ان ذرائع پر بھی روشنی ڈالی ہے جن سے افسانوں میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ عملی تنقید کے نمونوں سے بخوبی ہو جائے گا۔

احتشام حسین نے "مقصدیت" اور "افسانہ نگار کی شخصیت" کے تعلق سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو حقیقت نگاری کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بھی اپنے نظریات اور تصورات سے اپنی تخلیقات کو محفوظ نہیں رکھ پاتے۔ انھوں نے لکھا کہ:

"افسانے کی تخلیق میں کسی غیر شعوری جذبے کی کارفرمائی کو تسلیم نہیں کرتا، یہ نہیں مانتا کہ کوئی افسانہ نگار کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے اور لاشعور کی تحریک پر ایک افسانہ لکھ دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس کو CONSTRUCT کرتا ہے، تعمیر کرتا ہے۔ اس کا عمل تعمیری، تخلیقی اور شعوری ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اسے اپنے خام مواد کو ایسی شکل میں پیش کرنا پڑتا ہے جو اس کے خیالات اور جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ یہ وہ نہیں کر سکتا کہ اپنے جذبات اور ضمیر کی آواز کے خلاف اسے وہاں جا کر ختم کر دے کہ جہاں اس کا ضمیر اس کے خلاف احتجاج کرتا رہا ہو۔"[3]

"افسانہ میں نفسیات کا عنصر" میں احتشام حسین نے مقصدیت پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ "دنیا کے قدیم اور اعلیٰ ادب کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ لکھنے والے کا پورا نقطۂ نظر پوری طاقت اور پوری ادبی لطافت کے ساتھ ادب کی شکل جلوہ گر ہوتا ہے"[4] یا "ادیب کا مقصد کسی نہ کسی طرح اس کے تخلیقی یا توضیحی کارناموں میں داخل ہو جاتا ہے۔"[5]

"اردو افسانہ (ہندوستان میں)" میں وہ افسانہ نگار کی شخصیت، اس کے افسانے پر اس کے اثرات، افسانہ نگار اور قاری کے رشتہ اس کی اہمیت اور افادیت پر اظہار خیال کرتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ اصل افسانہ فن کار کی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ یہ شخصیت موضوع کے انتخاب سے لے کر فنی تخلیق

---

[1] اعتبارِ نظر۔ احتشام حسین ص ۱۲۰ [2] تنقید اور عملی تنقید۔ احتشام حسین ص ۲۵۔۲۶ [3] اعتبارِ نظر۔ احتشام حسین ص ۱۴۲۔۱۴۳ [4] تنقید اور عملی تنقید۔ احتشام حسین

کی آخری منزل تک انفرادیت اور آفاقیت میں رشتہ جوڑنے میں معروف رہتی ہے جس سے فن کار اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان رشتہ قائم ہوتا ہے۔ جو افسانہ نگار اس راز کو جتنا زیادہ سمجھتا ہے اتنا ہی کامیاب ہے۔ زندگی کی وسیع دنیا میں اچھی دنیا کی تخلیق اس طرح ہونا چاہیئے کہ تنوع میں قدرت کا تصور پیدا ہو۔ یہ بات موضوع سے گہری واقفیت، زبان پر قدرت، فن کے شعور اور عقیدے کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس بات پر دوسروں سے زیادہ ہمارے افسانہ نگاروں کو غور کرنا چاہیئے۔"[١]

احتشام حسین نے ہر موقع پر اور ہر لمحے فنی شعور، فنی لوازمات اور فنی ضرورتوں اور تقاضوں کا خیال رکھا ہے۔ "مقصد کے بغیر کوئی اعلیٰ تخلیق نا ممکن ہے اور مقصد کے بھدّے اظہار سے فن کا خون ہوتا ہے۔"[٢] انھوں نے افسانہ نگاروں کو حیات انسانی کے مطالعہ اور فنی ضرورتوں کے التزام کی طرف متوجہ کیا اور ان خوبیوں کو ادب العالیہ کی تخلیق کے لیے ناگزیر کہا۔ "وہ حیات انسانی کا گہرا مطالعہ کریں اور فن کی ضروریات پر نظر رکھتے ہوئے ایسے افسانے لکھیں جن سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات اور سماجی زندگی کے راز کھلیں۔ کل ایسے ہی کارناموں کا شمار ادب العالیہ میں ہوگا۔"[٣] وہ ایک افسانہ نگار کی عظمت کی بنیاد میں فن کو بھی شامل کرتے ہیں:

"ایک افسانہ نگار کی اہمیت عظمت اور کامیابی کا تعین زندگی پر اس کی گرفت، مشاہدے کی طاقت، فنی چابکدستی اور مقصد کی بلندی سے ہوتا ہے۔"[٤]

افسانہ کی اہمیت ان کے لیے اس لیے بھی ہے کہ اس میں فن اپنی تمام نزاکتوں کے ساتھ جلوہ فگن ہوتا ہے:

"فن کی ایسی متنوع نزاکتیں اور رنگا رنگ باریکیاں کسی دوسرے شعبہ ادب میں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ ایسے تخلیقی کارناموں کو معمولی چیز سمجھ کر نظر انداز کرنا یا غیر اہم سمجھنا صرف بدذوقی ہی نہیں بلکہ ترقی کے صحت مند سوتوں کا منہ بند کر دینا ہے۔"[٥]

احتشام حسین کو افسانہ کے فن کی عظمت عزیز تھی۔ "نئے ادبی رجحانات" میں انھوں نے اسی غرض سے نئے ادیبوں کی فنی لغزشوں پر گرفت کی۔ "کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ادیب یا شاعر فن کے لوازم کو پیش نظر رکھتے ہوئے گہرائی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا اور فنی کمزوریوں کا اظہار کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی وہ خطیبانہ اور واعظانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی کبھی لفظوں اور اصطلاحوں کے استعمال ہی کو کافی سمجھ لیتا ہے۔ کبھی اپنی بے مائیگی کو نئی نئی اصطلاحوں کے پردے میں چھپا دینا چاہتا ہے۔ کبھی معمولی اور بھدّی چیزوں پر زور دے کر اسے جدت سے تعبیر کرتا ہے لیکن تجربہ کے دور میں یہ سب ممکن ہے۔"[٦] ان کی اس گرفت میں ہمدردی کا جذبہ بھی شامل تھا۔ ان کی باتوں میں خلوص تھا اس لیے انھوں نے اپنے مقصد کو ان الفاظ میں بیان کیا:

"جس بات کو میں بار بار دہرا چکا ہوں اسے پھر سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ابھی اس ادب کی ابتدا ہے۔ ابھی تو بہت کچھ سیکھنا ہے۔ بہت کچھ تبدیلی کرنا ہے اور بہت سی گہری حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنا ہے اور اس سلسلہ میں انھیں فن کی لطیف ترکیبوں سے مدد لینا پڑے گا۔ جو چیزیں رجحانات کے طور پر ظاہر ہو رہی ہیں انھیں ادب کا جزو بن جانا ہے۔"[٧]

---

١ عکس اور آئینے۔ احتشام حسین ص [illegible] ٢ تنقید اور عملی تنقید۔ احتشام حسین ص [illegible] ٣ ادب اور سماج۔ احتشام حسین ص [illegible]
٤ عکس اور آئینے۔ احتشام حسین ص [illegible] ٥ ادب اور سماج۔ احتشام حسین ص [illegible] ٦ تنقیدی جائزے۔ احتشام حسین ص [illegible]
٧ تنقیدی جائزے۔ احتشام حسین ص [illegible]

احتشام حسین نے جہاں افسانہ نگاروں کو فن میں تجربے کی اجازت دی وہاں انہوں نے ٹکنیک کو افسانہ نگاروں کا ذاتی طریقہ اور ــــــــ قرار دیا کہ موضوع اور ٹکنیک کے لحاظ سے افسانہ کی کائنات کافی وسیع ہے۔

"موضوع اور مواد کو پیش کرنے کی ٹکنیک لکھنے والے کا ذاتی طریقہ ہے۔ موضوع اور ٹکنیک کے لحاظ سے جسے مختصر افسانہ کہا جاسکے اس کی حدیں کافی وسیع ہیں .... اچھا لکھنے والا جب اپنے انداز سے اپنا مواد پیش کرتا ہے تو اس کی ٹکنیک الگ ہو جاتی ہے۔ کوئی تفصیلات میں جاتا ہے، کوئی واقعات کو مختصر طریقے سے پیش کرتا ہے، کوئی کردار کو ابھارتا ہے، کوئی پس منظر کو، کوئی پس منظر کو کم نمایاں کرتا ہے کوئی فضا اور تاثر پر زور دیتا ہے، کوئی مرکزی خیال پر۔ یہی سارے جدید افسانہ نگار کر رہے ہیں"[1]

افسانے کے بارے میں احتشام حسین نے جن نظریات کو پیش کیا تھا افسانوں کی عملی تنقید میں انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ عملی تنقید کے کچھ معیار و میزان پیش ہیں۔ ان میں سے کچھ کی جھلکیاں تو پہلے ہی سامنے آچکی ہیں اور ان میں کچھ نئے خیالات بھی شا احتشام حسین نے "ویرانے" کے دیباچہ میں اپنے ہی افسانوں پر تنقید و تبصرہ کیا ہے وہ اپنی فنی صلاحیت کو اعلیٰ درجہ کی نہیں گردان کو یہ یقین ہے کہ انہوں نے افسانوں میں زندگی کی جھلک ضرور پیش کی ہے:

"اس کی فنی صلاحیتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوں، اس کے نقوش اور خطوط گہرے نہ ہوں، اس کی تصویروں میں رنگ دھندلے ہوں، اس کے کردار بے جان ہوں۔ اس کے اشارے مبہم ہوں اور اس کی زندگی کی ترجمانی ناقص ہو، پھر بھی اپنی بساط بھر اس نے اس کی کوشش ضرور کی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی وہ جھلک تھوڑی بہت ضرور دکھا سکے جسے اس نے دیکھا اور سمجھا ہے"[2]

احتشام حسین نے افسانوں میں "زندگی کی جھلک" کو بہت اہمیت دی۔ وہ اعلیٰ فنی صلاحیت، گہرے نقوش و خطوط، تصویر کے روشن رنگ اور واضح اشاروں کے قائل ہیں۔ افسانوں میں جاندار کرداروں کی پیش کش پسند کرتے ہیں۔ کردار نگاری کے تعلق انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بہت اہم باتیں کہیں ہیں۔ ان کا اظہار ان کے نظریات کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ قاضی عبدالستار نے پو "......! چند سال قبل تک ہمارے ملک کی آبادی (WATER TIGHT) طبقات میں بٹی ہوئی تھی اور ہمارے یہاں اف ادب میں فرد سے زیادہ (TYPE) پر زور دیا جاتا تھا۔ مثلاً اگر کوئی کسان ہے تو وہ کیسا بھی خراب کیوں نہ ہو اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ا طرح اگر کوئی زمیندار ہے تو چاہے وہ کیسی ہی خوبیوں کا مالک کیوں نہ ہو اسے خراب سمجھا جاتا تھا۔ پہلے کے ادیبوں نے ان دو فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کے طبقاتی رشتہ کے پس منظر میں دیکھا تھا جبکہ آج کی نسل نے ان کو صحیح طرح سے دیکھا ہے کردا کی طبقاتی خوبیوں اور خامیوں کو نہیں بلکہ انفرادی خامیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ احتشام حسین نے جواب میں فرمایا" اصل یہ ہے کہ کچھ دن پہلے تک نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے ادب میں ٹائپ پیش کرنے کا رواج تھا۔ ایک TYPICAL کردا ذریعہ ایک حد تک ہی سچائی کی عکاسی ہو سکتی ہے مکمل طور پر نہیں اسی لیے ہمیں فرد کو فرد کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیئے مثلاً کو لیجئے وہ کردار کو شروع میں ایک فرد کی حیثیت سے ہی پیش کرتے ہیں لیکن آگے بڑھتے بڑھتے وہ کردار عینیت پسندی کے زیر آجاتا ہے لیکن فرد پر زیادہ زور اس زمانے میں ممکن بھی نہ تھا۔ فرد اور شخصی آزادی پر آج جتنا زور دیا جا رہا ہے اتنا پہلے کبھی

---

[1] اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص۱۱   [2] ویرانے۔ احتشام حسین ص۸

دیا تھا اس لیے یہ تبدیلی فطری ہے۔ قاضی عبدالستار کا اگلا سوال تھا۔ "تو فرد کی نمائندگی ترقی پسندی کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔" احتشام حسین کا جواب تھا۔ "ترقی پسندی پر یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے۔ ہمیں آدمی کی کھوج ایک آدمی کی حیثیت سے بھی کرنا ہے۔ محض طبقہ کے فرد کی حیثیت سے نہیں۔ رالف فاکس نے اپنی مشہور کتاب NOVEL AND THE PEOPLE میں ناول کو فرد کی کہانی قرار دیا ہے (TYPE) کی کہانی نہیں۔"[۱] احتشام حسین نے فرد کی نمائندگی کو ترقی پسندی کے خلاف نہیں سمجھا۔ وہ افسانوں میں اختصار کی طرف خصوصیت سے توجہ دیتے تھے۔ "میں نے تاثیر کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی بات کو کم سے کم جگہ میں کہنے کی کوشش کی ہے۔"[۲] دوسری جگہ کہا کہ "میں نے صرف اتنی باتیں کہی ہیں جتنی اس افسانے کے لیے ضروری ہیں۔"[۳] اپنے افسانوں میں خارجی اور داخلی حقیقتوں کی پیش کش میں ان کا نظریہ یہ تھا۔

> "میں داخلی حقیقتوں کی اصلیت کا منکر نہیں ہوں لیکن جانتا ہوں کہ داخلی حقیقتیں خارجی حقیقتوں کا بھی عکس ہوتی ہیں اور کچھ نتیجہ ۔۔ اس لیے داخلی حقیقتوں کا اس طرح بیان کہ ان کا تعلق خارجی حقیقتوں سے نہ ظاہر ہو، میرے خیال میں حقیقت نگاری نہیں ہے۔ حقیقت ایک پیچیدہ عمل ہے اس لیے اسے حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، عشق و محبت معاشی اور سیاسی مسائل، عمل اور خیال سب ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں اور میں نے اپنے بیشتر افسانوں میں اس کا خیال رکھا ہے۔"[۴]

انھوں نے "حقیقت نگاری" کے علاوہ دلکشی کا بھی مختلف طریقوں سے التزام کیا۔ "میں نے کہانی لکھتے وقت اس دلکشی کا خیال ضرور رکھا ہے جو کہانی کے لیے ضروری ہے۔ یہ دلکشی کبھی پلاٹ سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی انداز بیان سے اور کبھی صرف موضوع کے انتخاب سے۔"[۵] احتشام حسین نے افسانوں کی تنقید میں فن پر خاص توجہ دی ہے۔ ان کی پریم چند، نیاز، کرشن چندر، بیدی، منٹو، شاہد، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے افسانوں پر تنقید اس حقیقت کی شاہد ہے۔

پریم چند کے افسانے "بڑے گھر کی بیٹی" کی تنقید میں دلکشی، دلچسپی، مقصد، زبان کی لطافت کے ساتھ پلاٹ کی تعمیر کو بھی اہمیت ملی ہے۔ "وہ افسانہ پہلی بار اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ حقیقتاً کہانی میں دلکشی، دلچسپی، مقصد، زبان کی لطافت اور پلاٹ کی تعمیر ساری کی ساری چیزیں کیسے ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔"[۶] یہی انداز نظر پریم چند کے افسانہ "کفن" کی تنقید میں نمایاں ہے۔

> "انھوں نے اپنے آخری دنوں میں کفن کی تخلیق کی تو ان کے یہاں فکر و فن، مواد اور ہیئت کا ایسا حسین امتزاج ہو چکا تھا جو عروج فن کی آخری منزل ہے۔"[۷]

ان کے لیے پریم چند کے افسانے اس لیے اہم ہیں کہ ان میں "فکر و فن" کا حسین امتزاج بھی ہے۔ نیاز کے افسانوں میں فن افسانہ کے مطالبات پورے نہیں کیے گئے ہیں اس لیے احتشام حسین ان سے مطمئن نہیں۔ "افسانے کے مطالبات پلاٹ، کردار نگاری، ڈرامائی تاثر اور ارضی فضا کے مطالبات ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزوں کی طرف سے نیاز افسانوں میں غفلت برتتے ہیں۔ فلسفیانہ مباحث، نفسیاتی موشگافیوں، قول محال اور رنگین بیانی سے ان چیزوں کی کمی پوری نہیں ہوتی۔"[۸] کرشن چندر کے افسانوں

---

[۱] احتشام حسین سے ایک انٹرویو۔ رام لعل۔ قاضی عبدالستار۔ عابد سہیل۔ کتاب اگست ۱۹۶۵ء [۲] ویرانے۔ احتشام حسین صفحہ ۳ [۳] ویرانے۔ احتشام حسین صفحہ ۱۱ [۴] ویرانے۔ احتشام حسین صفحہ ۱۱ [۵] اعتبار نظر۔ احتشام حسین صفحہ ۱۲۶ [۶] عکس اور آئینے۔ احتشام حسین صفحہ ۱۰۱

[۸] اعتبار نظر۔ احتشام حسین صفحہ ۱۱۶

کے تنقیدی تجزیے میں احتشام حسین نے فن افسانہ کے مطالبات کو پیش نظر رکھا ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کی تنقید سے احتشام کے اندازِ نظر کے، ان کے تنقیدی رویے کے بہت سے ورق کھل جاتے ہیں۔ افسانوں میں زندگی کی نمائندگی اور اس کا پُر لطف بیان ملاحظہ فرمائیے:

کرشن چندر کے افسانے زندگی کے سرچشموں سوتوں سے رس چوستے ہیں اور اس کی لطافت کا اظہار ان کے اندازِ بیان، ان کے ہلکے پھلکے اشاروں اور کنایوں، ان کے اظہار کی روانی، شعریت اور اثر انگیزی میں ہوتا ہے۔ یہ خوبیاں ایسی ہیں جو افسانہ نگاری کے ہر پہلو پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ آخر ایک فن کار کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے کہ اس کے مواد کی شگفتگی اس کے طرزِ اظہار میں باقی رہ جائے۔ اس کے موضوع کی گہرائی اس کے بیان میں جھلک اٹھے اس کی کہی ہوئی کہانی کی لطافت پڑھنے والے کو ہر طرف سے گھیر لے۔ کرشن چندر کے زیادہ افسانوں میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔[۱]

افسانہ کی تکنیک اور دلکشی کے کیمیاوی عمل کا بیان دیکھیے:۔

"اس وقت ہندوستانی ادب میں مختصر افسانہ ہی ہر طرح کی نفسیاتی، فلسفیانہ، سیاسی اور جذباتی تحریکوں کا مظہر بن گیا ہے۔ اس کی غیر متعین تکنیک اور لچک کے راز کو سمجھنے والا افسانہ نگار ہر قسم کے موضوع کو دلکش بنا سکتا ہے۔ عمومی نقطۂ نظر سے تو افسانے میں صرف دلکشی چاہیے لیکن یہ دلکشی ایک مستقل اور کیمیاوی عمل کے بعد حاصل ہوتی ہے جب لکھنے والا اپنے موضوع اور مواد کو سیال بنا کر اپنے اسلوب کے سانچے میں ڈھال لے اس وقت افسانے میں وہ دلکشی پیدا ہوتی ہے جسے خواص اور عوام دونوں پسند کرتے ہیں۔"[۲]

کرشن چندر کے یہاں مضبوطی اور پائندگی، ان کے نزدیک، "مادی تصورِ حیات" کا نتیجہ ہے۔ "زندگی بظاہر کتنی متضاد اس تضاد کی وجہیں ہیں۔ افراد مختلف حالات میں مختلف بن جاتے ہیں۔ اس کی بھی وجہیں ہیں۔ لیکن افسانہ ان وجہوں کے لکا خارجی بیان کو اپنے اندر جگہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے افسانہ نگار کے لیے اچھی خاصی فنی دشواری کا سامنا ہوتا ہے یا تو وہ علل کے اس رشتہ کو ہاتھ سے چھوڑ دے اور اپنے ذہین پڑھنے والوں کو غیر آسودہ رکھے یا انھیں اس طرح بیان کرے کہ اس کے نہ آئے ...... ان کی جابکدستی، ان کا فنی شعور سبب اور نتیجے کے اس تعلق کو ایک مطلق یا تجریدی شکل میں نہیں دیکھتا زندگی کے ہر لمحے بڑھتے اور بدلتے ہوئے احساس میں کردار کی نشو و نما میں اس کے افعال کے تخلیقی جوہر میں اس تعلق کو ڈھونڈ پاتا ہے۔ زندگی اور ادب کے تعلق کا یہی مطلب ہے اور افسانہ میں حقیقت کا یہی مفہوم ہے۔"[۳] کرشن چندر کے یہاں داخلیت کے امتزاج کا بیان دیکھیے:۔

"حقیقت کا احساس، خیال اور ذہن کے کشمکش سے گزرتا ہوا رنگ جذبات میں آمیز ہوتا ہوا پھر ہر ایک سے اپنی چمک دمک کے سامان لیتا ہوا حقیقت کی فنی شکل متعین کرتا ہے۔ خارجی مظاہر اگر شدتِ احساس کی اس بھٹی میں پگھلائے نہ جائیں تو اخبار کی رپورٹ بن کر رہ جائیں اور ناپائیدار خیالات کے پروں میں اڑنے والی داخلیت اگر خارجی اور مادی زندگی سے طاقت حاصل نہ کرے تو سارے شعور کو تھکا دینے والی چیز بن جائے وہ داخلیت جو افسانہ

۱؎ روایت اور بغاوت ۔ احتشام حسین ص ۱۹۰-۱۸۹ ۲؎ روایت اور بغاوت ۔ احتشام حسین ص ۱۸۱ ۳؎ روایت اور بغاوت ۔ احتشام حسین ص

کہانی میں زندگی کا جذباتی رخ اختیار کر کے سطح پر ابھرتی ہے۔ سچ پوچھا جائے تو وہ بھی خارجی حقائق ہی کا ایک حصہ ہے اس لیے اس کا بیان واقعات کے خارجی بیان سے بے تعلق ہو کر کرنا حقیقت کے مفہوم ہی کو مجروح کر دے گا۔ کرشن چندر کے یہاں داخلیت اور خارجیت کا یہ توازن موجود ہے۔[1]

کرشن چندر کے افسانوں میں مقصد اور اس کے فنی اظہار اور اعلیٰ ادب کے معیار پر نظر ڈالیے "کرشن چندر جیسے افسانہ نویس سے یہ امید نہیں ہو سکتی کہ وہ محض زیب داستاں کے لیے اپنے فرض سے غافل ہو جائے گا۔ اچھے فن کار کی یہی پہچان ہے کہ نہ اس کا مقصد اس کے فن کو مجروح کرتا ہے اور نہ صناعی مقصد کو۔ دونوں کا حسین امتزاج اعلیٰ پایہ کا ادب تیار کرتا ہے۔[2] اثر انگیزی کا راز دیکھیے :۔

"کرشن چندر اپنا مقصد، نظر ذہن نشین کرنے کے لیے ترغیب اور اثر انگیزی کے تمام فنی حربے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ طنز کو سب سے زیادہ بے پناہ استعمال کرتے ہیں۔"[3]

احتشام حسین کے نزدیک ابہام کے اسباب ہیں :۔ "ابہام زیادہ تر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب افسانہ نگار تکنیک پر قدرت رکھتا ہو۔ اپنے موضوع سے پوری طرح واقف نہ ہو یا شعور کے بجائے لاشعور کی کھوج میں نکل جائے۔"[4] اشاریت اور علامیت کے حق استقلال پر انداز نظر ملاحظہ کیجئے :۔

"کرشن چندر کے کچھ افسانوں میں گہری اشاریت اور علامیت پائی جاتی ہے۔ بے نقاب حقیقتوں کے اظہار کے لیے ضروری ہے یا نہیں اس کا بہت کچھ انحصار فن کار کے شعور پر ہے۔ جس کے لیے طرز اظہار اور افسانے کی معنویت میں اگر فن کارانہ ربط قائم ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا وحدت اثر کا مکمل احساس کرتا ہے تو اشاریت ابہام پیدا کرنے کی جگہ افسانے کے حسن میں اضافہ کر دیتی ہے۔"[5]

مختصر افسانہ کے معیار اور فن کی میزان پر ایک نظر یہ ہے "مختصر افسانہ معیاری اور فنی نقطۂ نظر سے ایسا کوئی جملہ، کوئی لفظ، کوئی خیال اپنے میں شامل نہیں کر سکتا جو بالکل ضروری نہ ہو جس کے بغیر تاثر میں کسی طرح کی کمی رہ جائے۔ ایسی حالت میں کہانی کو پھیلا دینا اس میں مختلف تاثرات کا شامل کر دینا۔ مرکز سے ہٹ کر ضمنی باتوں میں الجھ کر رہ جانا اکثر افسانوں کے توازن کو خراب کر لیتا ہے اور زیادہ تر افسانہ نگار اس سے نہیں بچتے ہیں۔"[6] کرشن چندر کی ساحری کا راز احتشام حسین کے الفاظ میں یہ ہے :۔

"کرشن چندر کے افسانوں میں تازگی اور شگفتگی، شادابی اور رعنائی ہے۔ زبان کی لطافت، تشبیہوں کی جدت، اسلوب کی ندرت، موضوع اور طرز بیان کی ہم آہنگی، موضوع اور مواد کی سماجی اہمیت، انسانیت کا درد اور اس کی ترقی کی امید یہ باتیں جس افسانہ نگار میں اکٹھی ہو جائیں وہی ساحری کر سکتا ہے۔"[7]

احتشام حسین نے مختلف افسانہ نگاروں کے مقام اور مرتبہ کے تعین میں ان کی "فن افسانہ" پر گرفت کی صلاحیت کو پیش نظر

1۔ روایت اور بغاوت ۔ احتشام حسین ص ۱۹۳
2۔ 〃 〃 〃 ص ۲۰۲
3۔ 〃 〃 〃 ص ۲۰۵
4۔ 〃 〃 〃 ص ۲۰۶
5۔ روایت اور بغاوت احتشام حسین ص ۲۰۱
6۔ 〃 〃 〃 ص ۲۰۲
7۔ 〃 〃 〃 ص ۲۰۵

دکھا۔ بیدی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے تصویرِ فن کا مظاہرہ کیا۔ منٹو کی افسانہ نویسی کی سب سے نمایاں خوبی ان کا فنی شعور تھا۔ "دلی کی بپتا" کے مصنف کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ شاہد کا "نقطۂ نظر فنی" نہیں تھا۔ احمد ندیم قاسمی اس لیے کامیاب افسانہ نگار ثابت ہوئے کیونکہ وہ فن کے "شعور" "موضوع کی بصیرت" اور "مواد پر قدرت" رکھتے تھے۔ احتشام حسین اردو افسانہ میں پیش ہوئے موضوعات کا ذکر کرتے ہیں اور جن افسانہ نگاروں نے ان کی پیش کش میں عمر جاوداں پائی ان کی خوبیوں کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔ "جن افسانہ نگاروں نے فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ ان موضوعات کو اپنایا ان میں چند اہم نام یہ ہیں۔۔
اردو افسانہ صرف موضوع کی بنیاد پر مقبول نہیں ہوتا اس کا راز تکنیک کا تنوع بھی ہے۔" اس مختصر سی مدت میں اردو افسانہ موضوع کی اور تکنیک کے تنوع کے اعتبار سے ادب کی سب سے زیادہ مقبول اور اہم صنف بن گیا[2]

احتشام حسین نے اردو افسانہ کے ساتھ پورا خلوص برتا۔ انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ ان سے بہتر افسانے لکھے جا رہے ہیں تو ا نے افسانہ لکھنے سے زیادہ پڑھنا مناسب سمجھا۔ جب انھیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے موزوں صنف نہیں ملی تو انھوں نے افسا لکھ کر اپنے داغ و درد کا اظہار کیا۔ احتشام حسین کو اپنے نظریات بہت عزیز تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اپنے نظریا سونپ دی۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ انھوں نے نظریہ کے ساتھ ساتھ فن کی پاکیزگی اور عظمت کا احترام بھی کیا۔ انھوں نے فن کو پوری کائنات نہیں سمجھا۔ احتشام حسین نے اپنے لیے ایک راہ بہت سوچ سمجھ کر ڈھونڈ لی تھی۔ یہ بات کم اہم نہیں کہ انھو اس خلوص اور جذبہ کے ساتھ اپنے نظریہ کو ادب میں عام کیا۔ انھیں اپنی راہ منتخب کرنے کی پوری آزادی تھی۔ انھوں نے زند آمریت کے خلاف سوچ لیا۔

---

[1] عکس اور آئینے۔ احتشام حسین ص ۱۰۳
[2] ״ ״ ״ ״

ڈاکٹر سید محمود الحسن

احتشام حسین بحیثیت شاعر

(ایک تاریخی جائزہ)

کوئی نقاد اگر شعر و فن کی نازک وادیوں سے گذرنے کے بعد تنقید کی سخت اور سنگلاخ زمین پر قدم رکھتا ہے تو انسانی احساسات و جذبات کا صحیح ترجمان بن کر فن و ادب پر اپنی بے لاگ رائے دے سکتا ہے۔ ایسا نقاد جب تنقید اور تبصرے کے لیے قلم اٹھاتا ہے تو وہ نوکِ خار سے شعر و شاعری کے رنگ و بو کو بکھیرتا نہیں ہے بلکہ اس کی نزاکت اس کے لطف و دلکشی اور اس کے حسن کو پوری طرح سمجھ کر یہ پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کرتا ہے کہ شاعر اور فن کار نے واقعی اس میں کس قدر خون جگر صرف کیا ہے۔ حقیقتاً ایسا ہی ادیب نقاد کے صحیح فرائض بھی انجام دے سکتا ہے وہ کلام پر تنقیدی قلم اٹھانے سے پیشتر شاعر کی کاوشوں پر غور کرے گا اس کے خلاف نشتر زنی نہیں کرے گا بلکہ اس فن کے لیے دل میں ہمدردی خلوص اور دلچسپی کا پہلو بھی شامل رہے گا ایسا نقاد شاعر کے دماغ میں سما کر اس کے تجربے کے ہر عنصر کو سمجھ سکتا ہے بلکہ اُن خیالات کو دوسروں تک آسانی سے پہنچا بھی سکتا ہے۔ وہ اس تجربے کی اہمیت کا اندازہ کرتا ہے اور تخلیقی کارنامے کو قدر کی نگاہ سے دیکھ کر فن کار کے لیے جوش، ولولہ، ہمت، اولوالعزمی پیدا کرتا رہے گا تاکہ شاعر کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا رہے۔ اسی حالت میں طرح طرح کے خوش نما اور خوش رنگ پھول کھلتے ہیں ایسے نقاد شاعر کی دیوی کی پرستش خود کرتے ہیں۔ یہ ذاتی تجربہ تنقیدی صلاحیت کی بہت بڑی بنیاد ہے چنانچہ شاعر اور ناقد اگر ایک دوسرے کے احساسات و جذبات کو سمجھ کر ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں تو ایسی حالت میں شعر و ادب اپنی بلند ترین منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ نقاد کے لیے شعری لوازمات کا سمجھنا ضروری ہے وہ فن و ہئیت کے اصول اس کے تاثرات اور تجربات کے ادراک و احساسات کو خود اپنے ذہن میں رکھتا ہے اور شاعر کے جذبات سے اشتراک کر کے تجزیے کی اس منزل کو اجاگر کر دیتا ہے جس سے ادب میں حقیقت آمیزی وسعت اور زندگی سے قربت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ایسا نقاد ادبی اور علمی مسائل کو سمجھنے، جانچنے، پرکھنے، تولنے اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کے ساتھ ساتھ شاعر کی انفرادیت جذبات نگاری کی قدرت اور انسانی تجربات کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کے سلیقے پر غیر معمولی نظر رکھتا ہے۔

اردو ادب میں تنقیدی شعور کو صحیح اور مکمل شکل میں پیش کرنے والوں میں احتشام حسین کا نام سب سے زیادہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں میں جہاں بہت سے عناصر کا ہاتھ رہا، ہاں یہ چیز بھی اہمیت رکھتی ہے کہ تنقید کی شاہراہ پر گامزن ہونے سے پہلے انھوں نے شعر کی دیوی کے سامنے عقیدت کے جو پھول چڑھائے تھے اس نے ان کی تنقید میں اعتدال پسندی کے ساتھ ساتھ تخلیق کی وہ کیفیت پیدا کر دی جو دنیا کے بہت کم نقادوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ شعر و شاعری کے میدان میں اس وقت قدم رکھ چکے تھے جب غالباً تنقید کے بنیادی اصولوں اور اس کی خصوصیات سے بھی واقف نہ تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب

ہو گا کہ ان کا ذہنی شعور ابھی ارتقا کی اس منزل تک پہنچ ہی نہ سکا تھا کہ وہ تنقید کے مختلف پہلوؤں پر غور کر سکتے۔ انھوں نے شعر کہنے کی ابتدا کر دی تھی اور اسی سلسلے کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ تنقیدی شعور پیدا ہونے سے پہلے ہی انھوں نے شا کے میدان میں بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ شاعری کے خوشگوار، دلکش اور لذت آگیں راستے پر چلتے ہوئے جس میں حسن کی آبنرر ذہنی الجھنوں کو سکون دماغی کش مکش سے نجات اور جذبات و احساسات کی ترجمانی ملتی تھی اس کو چھوڑ کر تنقید کی خشک اور دو بر راہ پر گامزن ہونا اور اس پر چلتے ہوئے بلند ترین منزل تک پہنچ جانا ایک غیر معمولی ذہن کے ہی انسان کا کام ہو سکتا ہے۔ اس طر میں ایک نئے موڑ پر قدم رکھ کر احتشام حسین نے اردو تنقید کو نہ صرف نئی منزلوں سے آشنا کیا بلکہ اس کے ارتقا کے نئے نئے درو کھول دیے۔

احتشام حسین یو پی میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبہ ماہل میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے یہ وہ دور تھا جب ایک طرف انگریزی حکو مکمل طور پر ملک پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھی دوسری طرف عوام میں اس سے بیزاری کا میلان بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ زندگی نئے طو سے آشنا ہو رہی تھی سماجی نظام کی جاگیردارانہ قوتیں زوال پذیر اور روبہ انحطاط تھیں لیکن وہ پوری طرح سے مٹ نہ سکی تھیں ا زمانے کے ایک خوش حال گھرانے میں انھوں نے آنکھ کھولی۔ دنیا میں جنگ کے بادل منڈلاتے رہے تھے یورپ اور ایشیا دونوں جگہ پر کسی بڑے انقلاب کے آثار پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ فسطائیت کی طاقتیں ابھر رہی تھیں اور یہی اثرات تھے کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی عظیم شروع ہو گئی ابھی یہ جنگ ختم بھی نہ ہو سکی تھی کہ روس میں انقلاب برپا ہوا۔ اس طرح ہوش سنبھالتے ہی احتشام حسین کو اس سے واسطہ پڑا جو ایک عبوری دور سے گزر رہی تھی اور جس کے تغیرات کا اثر عالم کے چپے چپے پر نمایاں تھا۔ خاص کر ہندوستان انقلابات سے بہت زیادہ قریب تھا وہ انگریزوں کی طرف سے کسی نہ کسی طرح جنگ میں شرکت پر مجبور تھا۔ امرا و روسا کو ر پیسے سے مدد کرنی پڑ رہی تھی، نوجوانوں کو فوج میں بھرتی ہونا لازمی تھا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سبب غریب طبقہ مفلوک الحال ہو چ غرضیکہ سارا ملک تباہیوں اور بربادیوں سے متاثر تھا۔ گاؤں، قصبہ، شہر ہر جگہ جنگ کے خطرات نمایاں تھے احتشام صاحب اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور جس طرح قدیم رئیس گھرانوں کا قاعدہ تھا سب سے پہلے گھر میں مکتب کی تعلیم شروع ہوئی۔ سماجی حا اور ابتدائی زندگی کے تجربات شاعر و ادیب کے مزاج اور اس کی مجموعی شخصیت کی تربیت و ترتیب کرتے ہیں، جب پورے سماج میں انقلاب کے اثرات رونما ہو رہے ہوں تو کسی فرد کی زندگی اور اس کے فنی مظاہر کی بنیاد اور تخلیقی نقوش کے پرکھنے کے تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

احتشام صاحب کے گھر پر شعر و شاعری کا چرچا رہا کرتا تھا، خود ان کے چچا شاعری کرتے تھے شاعری کی محفلیں بھی ہوتی رہتی تھیں شعر کی خوبیوں اور خامیوں پر بحثیں سنتے تھے اور یہی تمام ابتدائی نقوش تھے جن کے اثر سے انھوں نے بچپن ہی سے شعر و شاعری کے اصولوں سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا چنانچہ ان کی شاعری کی ابتدائی منزل نوحوں، سلاموں مذہبی قصائد کی شکل میں نظر آتی ہے اور یہی اثرات تھے جن کے نتیجہ میں جب ۱۹۲۶ء میں ابن سعود نے جنت البقیع میں مظالم ڈھائے تو نے ایک پر درد اور موثر نظم لکھی۔ البتہ عام رواج کے مطابق غزل گوئی کی طرف بھی متوجہ رہے۔ احتشام صاحب کی انگریزی تعلیم کی ابتدا سے ہوئی اور یہیں پر ۱۹۲۸ء میں مرزا احسان بیگ کے گھر پر ایک مشاعرے میں سب سے پہلے شاعر کی حیثیت سے غزل پڑھی۔ ممکن اس سے پہلے وہ بعض غزلیں کہہ چکے ہوں لیکن یہیں سے وہ ہمارے سامنے ایک شاعر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں اس مشاعرے کی طرح جلسوں کے انہدام نے حیران کیا مجھے" جس میں جناب اصغر گونڈوی، سہیل اعظمی اور جگر مرادآبادی وغیرہ نے بھی شرکت کی تھی۔ احتشا

دو دوست فرید جعفری اور سعید جعفری (جو آئی۔سی۔ایس ہیں اور آج کل لندن میں ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے مقیم ہیں) انھیں حضرات کے اصرار پر احتشام صاحب نے باقاعدہ غزل کہنی شروع کی۔ اس سلسلے میں احتشام صاحب خود لکھتے ہیں۔

"یہ ۲۹-۱۹۲۸ء کی بات ہے جب میں اعظم گڑھ (یوپی) میں آٹھویں نویں درجہ کا طالب علم تھا۔ شعر و شاعری سے معمولی دلچسپی تو اس سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی کیونکہ گھر پر اس کا چرچہ تھا لیکن اعظم گڑھ کے دوران قیام میں کچھ ایسے ساتھی ملے جن کی صحبت میں یہ اس پر جلا ہوئی۔ میرے خاص ساتھیوں میں سید فرید۔ جعفری تھے جو اس وقت پاکستان میں ممتاز زندگی بسر کر رہے ہیں ان کے والد سید نجم الدین جعفری انھیں دنوں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے تبدیل ہو کر اعظم گڑھ آئے تھے کیونکہ ڈاکٹر جعفری خود ادبی ذوق کے مالک تھے .... ہم لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ادبی بحثوں اور دلچسپیوں میں حصہ لے کر ہمت افزائی کرتے تھے .... اپنی کم آمیزی کے باوجود ادبی و شعری محفلوں میں شریک ہونے کے مواقع نکال لیا کرتا تھا اور بڑی خاموشی سے اندر ہی اندر ایسا محسوس کرتا تھا کہ اگر ان سے دلچسپی نہ ہو تو صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ زندگی بھی ادھوری رہے گی۔"

چنانچہ اس دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ وہ غزل گوئی کی طرف توجہ دینے لگے جو رفتہ رفتہ ممتاز مرتبے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں "حیراں" کا بھی تخلص ملتا ہے، اسی زمانے میں ایک غزل لکھی تھی جس کے مقطع میں یہی تخلص موجود ہے ـــــ "حیراں کو تم نے اور حیراں بنا دیا" ـــــ غزل گوئی کا یہ سلسلہ برابر آگے بڑھتا رہا بی۔اے تک ان کا تخلص حیراں ہی رہا لیکن عرصے تک پھر کبھی مشاعرے میں غزل نہ پڑھی یہاں تک کہ جب الہ آباد میں انٹرمیڈیٹ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اس زمانے میں بھی بہت سے شاعروں کی طرح پر غزلیں کہیں لیکن کسی مشاعرے میں شاعر کی حیثیت سے شرکت نہ کی یہ ضرور ہوا کہ ان کا فنی شعور روشن سے روشن تر ہوتا گیا۔ اور غزلوں میں پختگی برابر بڑھتی رہی۔

احتشام صاحب کا ذہن و شعور جیسے جیسے ارتقا کی طرف قدم بڑھاتا رہا اسی رفتار سے شاعری کی دنیا میں اُن کی انفرادیت ابھرتی رہی چنانچہ جب اعظم گڑھ سے وہ الہ آباد حصول تعلیم کی غرض سے پہنچے تو اب ان کو شعر و ادب کی وہ وسیع دنیا نظر پڑی جس میں صرف غزل گوئی ہی سب کچھ نہیں تھی بلکہ ذاتی تجربات کے اظہار اور زندگی کی مختلف کیفیات کی عکاسی کے لیے انھوں نے نظم کا سہارا بھی لیا۔ اس کے ذریعہ انھوں نے عشق و محبت کے دلکش نغمے بھی الاپے اور سماجی انتشار، عوام کی بے بسی و بیکسی، سرمایہ داروں اور غریبوں کی کش مکش اور مظلوموں کی آہ و بکا میں کہ زمانے کے تقاضوں کو بھی شامل کر دیا چنانچہ تقریباً بائیس سال کی عمر سے انھوں نے غزل گوئی کے مقابلہ میں نظم گوئی کی طرف زیادہ توجہ دینی شروع کر دی، اور ان کی انفرادیت اس بات سے پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ جب اردو شعر و ادب کی ساری فضا میں غزل کا جادو چھایا ہوا تھا، عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کا یہ بہت بڑا ذریعہ بنی ہوئی تھی، ایک طرف حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے اشعار پر سر دھنے جاتے تھے دوسری طرف صفی، عزیز، ثاقب، یگانہ کا کلام ہی اردو شاعری کی روح بن گیا تھا ایسی منزل پر اپنے جذبات و تاثرات کے اظہار کے لیے نظموں کو سہارا بنانا غیر معمولی صلاحیت اور خود اعتمادی کا احساس دلاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں جب وہ بی اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اس وقت "نہ جا" اور "فریب" کے عنوان سے نہایت پُر اثر نظمیں کہیں جو اُس زمانہ میں "آئینہ" میں شائع ہوئیں۔ ان دونوں نظموں میں رومانیت کی لطیف سی افسردگی، درد کی لذت اور جذبات کی مصوری اتنی شدت سے پیش کی گئی ہے کہ ایک طرف شاعر کی عمر کی اس منزل کا پتہ چلتا ہے جس میں جذبہ و احساس ہی سب کچھ ہے۔ دوسری طرف مایوسی، حزن و یاس اور محرومی و ناکامی کے پرخلوص جذبات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ خاص کر "نہ جا" میں جذبات کے نازک مراحل کو جس دلکش پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ عام پڑھنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے :-

تیرے چھٹنے کا سماں اس وقت ہے پیشِ نظر
دیکھ کر، وہ خوفِ رسوائی سے ہر سو دیکھ کر
میرا دامن تھام کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
دیکھنا اور مسکرا کر تیرا وہ کہنا " نہ جا "

مسکرائی جا رہی ہے چشم بھی نمناک ہے
اُف مری صبحِ مسرت کا بھی دامن چاک ہے
التجا کی یہ ادا بھی کس قدر سفاک ہے
اشک بھر کے سر جھکا کر تیرا وہ کہنا " نہ جا "

وہ کشاکش میں مرا گھبرا کے رو دینا کبھی
اپنی ہستی کو ترے جلووں میں کھو دینا کبھی
باتوں باتوں میں ترا نشتر چبھو دینا کبھی
سر مرے شانے پہ رکھ کر تیرا وہ کہنا " نہ جا "

میری کچھ مجبوریاں رکنے سے مانع ہو گئیں
جاگ کر ساری تمنائیں یکایک سو گئیں
عالمِ اسباب کی تاریکیوں میں کھو گئیں
پھر نہ کچھ بولا میں سنکر تیرا وہ کہنا " نہ جا "

اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا خونِ دل کرتا ہوا
تجھکو مضطر چھوڑ کر میں ناسزا رخصت ہوا
آج تک کانوں میں ہے لیکن وہی شیریں صدا
دور جانے پر بھی مڑ کر تیرا وہ کہنا " نہ جا "

ان اشعار میں ذاتی زندگی کے تجربات کا پتہ بھی چلتا ہے اور جذبات کے اظہار میں اُس سچائی کا احساس بھی ہوتا ہے جس میں محبوب رخصت کے وقت مایوسی، خوف، آنسو، التجا، حسرت، کشمکش اور مجبوری کے علاوہ سکونِ قلب اور سہارے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں۔ ممکن ہے مشقِ سخن کی اس منزل پر احتشام صاحب کی نظموں میں فن اور تخلیق کے کسی نازک اور صناعانہ قوت کی تلاش کی جائے لیکن جس جذبہ اور جس منظر کو شاعر نے پیش کیا ہے اس کی عکاسی میں کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس وقت تک اس سے زیادہ چیز کا تقاضہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی ہندوستانی نوجوانوں کے لیے بڑا صبر آزما اور کشمکش کا دور تھا، وہ ایک طرف ملک کو پستی اور معاشی و معاشرتی زبوں حالی سے باہر نکالنے کی جدوجہد میں دوسری طرف مغربی ادب اور فلسفیانہ خیالات کے مطالعے سے ادبی ذوق کو وسعت دینے میں مصروف تھے۔ یہی حالات تھے جب ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی جس میں زندگی اور ادب کے رشتے کے ساتھ ساتھ اس کی حرکت عمل اور جدوجہد پر بھی زور دیا گیا۔ احتشام صاحب ان سارے تغیرات سے متاثر ہو رہے تھے۔ ان کا ابھی تک

ی اور ان منزلوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور جب ترقی پسند تحریک نے اپنے نظریات واضح کیے تو جیسے اپنے ذہنی کرب و اضطراب کے اظہار کے لیے
ن کو بہت بڑا سہارا مل گیا۔ شاید انہیں ناسازگار حالات کا اثر تھا کہ ۱۹۳۳ء کے بعد انھوں نے تقریباً تین سال کی مدت یعنی ۱۹۳۶ء تک
وئی نظم نہیں کہی۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے جیسے اپنے جذبات کے ابال کو باہر نکالنے کا کوئی ذریعہ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ معاشرتی بے اطمینانی
نے اپنے ذاتی اور انفرادی تجربوں کے اظہار کی طرف متوجہ ہونے دیا۔ البتہ اتنی مدت کے دبے ہوئے جذبات کی شدت کا نتیجہ رہا ہو خود انکی
اخلی دنیا کی کشمکش کہ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے ہر سال سے زیادہ نظمیں کہیں۔ تغیر، قیدی عالم خیال میں، احساس تنہائی، ایک رات،
واب میں آنے والی سے، اور (الہ آباد کی) نمائش یہ ساری نظمیں اس ایک سال کی مدت میں کہی گئیں اور ہر ایک اپنے تاثر اور جذبات کی
شدت کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ "تغیر" میں محبت کی مختلف منزلوں میں امید و یاس کی جو کیفیت پیش آتی رہتی ہے اسے کتنے
پُراثر انداز میں بیان کیا گیا ہے :- ایک منزل وہ تھی جب :

پہلے " تمائیت میں وہ بھی دور کبھی — رات دن چاندنی برستی تھی
گرچہ ہر لمحہ وقف عشرت تھا — زندگی وقت کو ترستی تھی

اس کے بعد" اب لرزتے ہیں ہر قدم پہ پاؤں — اب محبت سبک خرام نہیں
جس سے پی کر تھرا اٹھتا تھا — حیف ان آنکھوں میں وہ جام نہیں
ٹوٹ جاتی ہو بار بار جو ڈور — اس میں گرہیں لگائیں کے کب تک
عقل جب روشنی دکھاتی ہو — دل کے دھوکے میں آئیں گے کب تک
یونہی گر ٹوٹتی رہی اک دن
آخری بار ٹوٹ جائے گی

احساس تنہائی" رومانی اور عشقیہ جذبات کی گہری عکاسی کرتی ہے۔ حسن و عشق کے خوشگوار لمحات، چاند، تارے، شبنم، گلاب،
فطرت کی رعنائی و دلکشی یہ ساری فضا عاشق کو سرشار و بیخود بنا دیتی ہیں لیکن ان بہار آمیز کیفیات کے ساتھ ساتھ اداسی اور مایوسی
کن برابری شدت سے چھائی رہتی ہے۔ اس نظم کا پہلا بند اسی تاثر کی منظر کشی کرتا ہے کہ :-

چاند نکہ ہے ہوا میں خنکی ہے

اور پھر آگے چل کر اسی بند میں یہ کیفیت بھی ملتی ہے کہ :-

چاند پر ہے یہ ابر ہلکا سا — یا امید دل پہ یاس کا سایہ

اور یہ یاسیت محبت کی ناکامی، بے بسی اور محبوب سے جدائی ذہنی کرب کی اس منزل تک پہنچا دیتی ہے کہ :

خوف ہے دل کا خوں نہ ہو جائے — کہیں مجھ کو جنوں نہ ہو جائے

خواب میں آنے والی سے" میں محبوبہ اپنی تمام فطری اور جسمانی خصوصیات کے ساتھ نظر آتی ہے جس میں خود سپردگی اور جوانی کے فطری
تقاضے جنسی جذبہ کی نہایت رنگین اور لذت آگیں کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہاں حسن و عشق کے جذباتی مراحل کو عام انسانوں سے بہت
قریب کر دیا گیا ہے اور ہر پڑھنے والا اسے اپنی زندگی کا ایک تجربہ سمجھ کر متاثر ہو سکتا ہے :-

چھاؤں تھی تاروں کی میں تھا اور تمہاری یاد تھی — ہر طرح کی کوشش صبر و سکوں برباد تھی

فطرت نے سارا تھا پر ابھی طرح کی دلکشی بکھیر رکھی تھی کہ :

ناگہاں ٹھنڈی ہوا کی زلف لہرانے لگی | رات کی ساکن فضا میں مجھ کو نیند آنے لگی
آج بیداری بھی میری نیند سے شرما گئی | تو جھجکتی مسکراتی غم کدے میں آ گئی
چھپ کے مجھ سے مل رہی ہو اس قرینے کے نثار | خواب میں آنے کے اور تسکین دینے کے نثار
لب تک آ کر سارے شکوے دل کے زائل ہو گئے | تیرے بازو میری گردن میں حمائل ہو گئے

مل گئے چھوٹے ہوئے دوشیزہ کا مانِ وفا
عشق کی تاریک دنیا میں اجالا ہو گیا

بظاہر شاعر کا خواب ہے لیکن اس میں نہ معلوم کتنی خواہشات، آرزوؤں اور حسرتوں کی دبی ہوئی چنگاریاں ملتی ہیں کہ ہر انسان اس خو کو اپنی حقیقی زندگی کا ایک پرکیف لمحہ سمجھ کر اپنے کو انھیں تصورات میں جذب کر دیتا ہے۔

ابھی تک احتشام صاحب کی نظمیں حسن و محبت اور انفرادی جذبات کے اظہار سے آگے نہیں بڑھی تھیں البتہ اب نظموں حسن کی فطری دلکشی جس انداز میں بیان کی گئی ہیں وہ فرضی یا خیالی نظر نہیں آتی بلکہ ہماری اس دنیا کے تجربات محسوس ہوتے ہیں۔ ا نہیں ہے کہ احتشام صاحب کا یہ رومانی انداز اردو میں موجود نہیں تھا، خود اس زمانے میں اختر شیرانی کی رومانی نظمیں ساری فضا میں گو رہی تھیں اور نوجوانوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کیے ہوئے تھیں پھر بھی انھوں نے جن کیفیات کو بیان کیا ہے وہ خالص انھیں کے تجر ہوتے ہوئے بھی عام لوگوں کے جذبات سے گہری ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی سطحی، ریکانہ یا عمداً بظاہر نظر نہیں آتی لیکن پڑھنے والا اپنے تجربات کے لحاظ سے ان میں اپنی اپنی محبوبائیں تلاش کر سکتا ہے اور یہی مقبولیت کا بہت گہرا راز ہے۔ اس وقت محبت کے جذبات کی مصوری اور قلبی واردات کے اظہار کے لیے غزل ہی کی دنیا بہت کچھ تھی، بیسویں صدی کے رومانی شعراء نے غ روح کو نظموں میں سمو دیا اور اس کام کو انجام دینے میں احتشام صاحب کی نظموں نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کی شاعری میں حزن و یا پہلو کے ساتھ ساتھ نشاط و امید کے دلکش دھارے کا امتزاج نئے ذہن کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور ہر جگہ ان کے وقار کی گہرائی اور موجود رہتی ہے۔ احتشام صاحب نے ایک جگہ خود لکھا ہے کہ "صحت مند محبت خود ایک افادی عمل ہے" اور ان کی نظموں میں محبت کی بلندی اور صداقت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ عوامی سطح سے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت لیے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ اس کے اظہار نے ان کے فن میں لطف، دلکشی اور حسن شامل کر کے ایک طرح کی عظمت بخش دی۔

کسی فنکار کی زندگی میں اگر محض رومانیت اور حسن و عشق ہی کے عناصر اس کی ساری تخلیقی صلاحیت کا موضوع بن جائیں تو ا ہمہ گیری اور وسعت نہیں مل سکتی جو کسی بڑے فنکار کو نصیب ہوتی ہے خاص کر جب سماجی زندگی میں ایک ہیجانی اور انتشاری کیفیت ہو تو ارتقائے فن کے لیے ان مسائل کی آمیزش لازمی جز بن جاتی ہے جو ساری فضا کو اپنی گرفت میں لیے ہوں۔ احتشام صاحب کی شاعر ابتدائی منزل بھی عوام کی زندگی میں بے بسی و بیکسی کی جس کیفیت سے دوچار تھی اس میں صرف محبوبہ کے حسین تصور کے اظہار سے ہماکر شاعر کا فرض پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ احتشام صاحب ہی کے الفاظ میں اس وقت "ہندوستان کی زندگی تیزی سے بدل رہی تھی، نے قبول کرنے اور کچھ روایات کے چھوڑنے، اپنے عزم و عمل کی تنقید کرنے حوصلوں کی نئی آگ میں جلنے اور انفرادی اور اجتماعی آسودگ اور بے کنار جد و جہد میں شریک ہونے کا زمانہ تھا" اردو ادب ان تمام تبدیلیوں سے پوری طرح متاثر ہو رہا تھا اور انھیں حالات کا کہ بہت سے شاعر رومان سے انقلاب کی طرف متوجہ ہو گئے، چنانچہ احتشام حسین نے بھی اسی زمانہ میں بعض ایسی نظمیں کہیں جن میں چند سے آگے بڑھ کر سماجی شعور اور فکری پہلو شامل کر کے اپنے فن کو زیادہ وسعت اور ہمہ گیری بخشی۔ ۱۹۴۳ء میں ان کی ایک نظم "تمہیدی نظم

اس سلسلہ کی ایک نظم یہاں درج کی جاتی ہے:-

صبح کا دلکش سماں تھا اور گلگوں تھی فضا
ہو رہی تھی خلق کی سرگرمیوں کی ابتدا
مہرِ عالمتاب نکلا لیکے پیغامِ حیات
ہو گئے بیدار زنداں میں ناکامِ حیات
زندگی کا عکس ہر ذرہ سے جلوہ گر ہوا
بھوک کا مارا ہوا مزدور بھی گھر سے چلا

جس کو دیکھو اس فضائے مست میں دیوانہ تھا
ایک میں قیدِ ستم میں لطف سے بیگانہ تھا

وہ کہ جس سے کانپتی تھی روحِ استبداد کی
جس پہ مدت سے نگاہِ قہر تھی صیاد کی
جو مئے حبِ وطن سے سر بسر مدہوش تھا
جس کا سر تنگِ غلامی سے وبالِ دوش تھا
جس کے دل میں حسرتِ تعمیرِ ملک و قوم تھی
ظالموں کی بھول کر بھی جس نے پابوسی نہ کی
قصرِ ظلم و جور جس کے سامنے تھا سرنگوں
خون رلواتا تھا جس کو قوم کا حالِ زبوں

آہ اس کے دست و پا میں آہنی زنجیر تھی
ملک کی الفت کا دم بھرنے کی یہ تعزیر تھی

قیدِ تنہائی ملی تھی ساتھیوں سے چھوٹ کر
جیسے گر جائے ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
کام رکنے کا الم تھا قید کا کچھ غم نہ تھا
رنجِ بیکاری کا تھا زنجیر کا ماتم نہ تھا
ناگہاں ہنگامہ برپا کن صدا آنے لگی
برق بنکر قلبِ افسردہ کو گرمانے لگی
بخشنے زنداں کی گذرا کاروانِ انقلاب
قید سے پہلے کے ساتھی رہروانِ انقلاب
فاقہ کش چہروں پہ ان کے محنت و جرأت نثار
ان کے ملبوسِ کہن پر دولت و ثروت نثار
توڑ کر زنداں کا در آئی ہوائے انقلاب
صور کی آواز تھی وہ یا صدائے انقلاب
روحِ آزادی تڑپ اٹھی رگ و شریان میں
میں تھا زندانی مگر دل آ گیا ہیجان میں
عالمِ تخئیل میں طوفان سا برپا ہو گیا
قید سے پہلے کی دنیا میں پہنچکر کھو گیا

یعنی اس برباد حالت میں بھی میں دل شاد تھا
جسم زنجیروں میں تھا لیکن خیال آزاد تھا

یک بیک زنجیر کا بارِ گراں گھٹنے لگا
کوئی پردہ سامنے سے آنکھ کا ہٹنے لگا
طائرِ تخئیل مجھ کو ساتھ لیکر اڑ گیا
اور ہوا محسوس میں زنداں کے باہر آ گیا
باہر آ کر پھر اسی مقصد پہ عامل ہو گیا
جس کو ناقص چھوڑ کر میں قیدیٔ زنداں بنا
ہو موافق ہو گئی تقدیر بھی تدبیر بھی
خوابِ آزادی کی پوری ہو گئی تعبیر بھی
مٹ گئے یکسر غلامی کے سب آئینِ کہن
میرے ہی دستِ قوی سے نکلا ارمانِ وطن
دل میں ایسا جوش جیسے آگ سے شعلہ اٹھے
وہ مسرت تھی کہ میرے دست و پا تھرا اُٹھے

ناگہاں زنجیر کی جھنکار نے جو نکا دیا　　قید سے باہر نہیں ہوں یہ مجھے بتلا دیا

ہائے جب تک عالم تخئیل یوں آباد تھا

اتنے لمحوں کے لیے میرا وطن آزاد تھا

آزادی کی یہ خواہش صرف تخئیلی دنیا کی آواز نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس میں ایک ایسی تڑپ، لگن اور آرزو پوشیدہ ہے جو وطن کے ہر محبت کرنے والے کے دل میں موجزن رہتی ہے یہ آواز احتشام صاحب کے دل کی تنہا آواز نہ تھی اس میں ہندوستان کے کروڑوں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں دبی ہوئی سنائی دے رہی تھیں ان کا احساس پسند ذہن بدلتی ہوئی دنیا سے منہ موڑ کر نہیں گزر سکتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جہاں انسانیت کروٹ بدل رہی تھی، آزادی کی عملی جدوجہد جاری تھی، سماج کی نامنصفانہ عمارت کی چولیں ہوئی کڑیاں ٹوٹ رہی تھیں، ہر شے میں آزادی کا جذبہ انگڑائی لے رہا تھا۔ سرمایہ دارانہ قوتیں، غربت و افلاس اور اقتصادی شکنجے کے اضافہ میں پوری کوشش کر رہی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سارا تمدنی سرمایہ ایک کش مکش میں مبتلا تھا۔ شاعر و فنکار سماجی نظام کے ان دوی تبدیلیوں سے بچ کر آگے نہیں بڑھ سکتا زندگی کے تلخ و تند۔ دلکش و خوشگوار تجربات کو فن کی شکل دیے بغیر اُسے مقبولیت کی سند نہیں مل سکتی پھر احتشام صاحب ایسے ذہین اور حساس فنکار کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سماجی تقاضوں کو نظر انداز کرتے۔ یہی منزل تھی کہ ان کی نظموں میں رومانیت کے ساتھ انقلاب کی چنگاریاں بھی شامل ہوتی گئیں اور انھوں نے محبت کی حسین وادی سے باہر نکل کر ایک زیادہ وسیع اور ہنگامہ خیز دنیا کو اپنی شاعری کا مرکز بنا دیا۔ مندرجہ بالا نظم انھیں کیفیات کا احساس دلاتی ہے اس میں آزادی کی لگن اور اس کے حصول کے لیے قید و بند کی مصیبتوں کو برداشت کرنے کی پوری تلقین ملتی ہے، زندگی میں عزم و استقلال اور جد و جہد کا جذبہ، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کش مکش ملک و قوم کے لیے حسرتِ تعمیر اور انقلاب کے آہنی قدموں کی چاپ، اس نظم میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں دوسری طرف احتشام صاحب کی نظم گوئی کی تاریخ میں ایک نئے شعور کی جھلک نئے احساسات نئے افکار و خیالات نئے تصورات اور نیا طرزِ اظہار نظر آتا ہے۔

وطن پرستی اور آزادی کا یہ جذبہ برابر نکھرتا گیا جو ملک کی معاشی بے بسی اور اقتصادی بدحالی کا پوری طرح آئینہ دار ہے "تعمیر حیات" میں ایک طرف قوم کی قوتِ بازو پر یہ اعتماد ہے کہ ؎

نہ فکر موت کی کر یہ جہاں بدل دیں گے　　لہو میں ڈوب کے تیرے شہیدا ے ساقی

تو دوسری طرف عوام کے عزم و عمل پر بھی ان الفاظ میں فخر کیا ہے ؎

جسے ہرا نہ سکیں قوتیں زمانے کی　　کچھ ایسے زور کا طوفان اٹھا گئے ہم لوگ

یہاں تک کہ مستقبل میں کامیابی حاصل کرنے پر اتنا گہرا یقین و اعتماد ہے کہ ؎

قدم پہ فاقہ کشوں کے گرا کے تاج اک دن　　غریب رہنے کا دل سے یقین چھینیں گے

اور آخری شعر میں اپنی خواہش کا اظہار اس طرح کر دیا کہ ؎

جہاں خیال بھی ہوگا نہ دشمنِ جاں آزاد　　لگی ہے ایسے جہاں کی امید اے ساقی

یہی کیفیات ان کی ۱۹۳۶ء کی نظم "نظامِ کہنہ" میں بھی نظر آتی ہیں اس میں اگر ایک طرف سسکتی ہوئی انسانیت کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہے تو دوسری طرف دنیا کو تاریکی، ناانصافی، ہوس پرستی اور بیچارگی کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ یہاں سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تمدنی مسائل کے حقائق کو بہت کامیاب انداز میں بیان کیا گیا ہے جس میں شاعر کی روح اور اس کے مزاج کی بدلی ہوئی بغاوت بھی نظر آتی ہے۔ کہیں وہ مفلسی اور غریبی کی تصویر کشی کر کے ان پر آنسو بہانے پر مجبور کرتا ہے اور کہیں نظامِ تمدن کے اس تضاد

…ـصہ کا اظہار کرتا ہے جس کا دعا یہ ہے کہ تنزل ہونے کے باوجود مظالم ڈھانے سے باز نہیں آتا ؎

وقت کی آواز ہے ہم کو ابھرنا چاہیئے اس تضادِ زندگی کو ختم کرنا چاہیئے

لیکن ایسا نہیں تھا کہ سماجی انتشار اور زمانے کے مصائب و آلام کی مصوری کرنے کے بعد احتشام صاحب اپنے ذاتی، رومانی …ت اور عشق کی رنگین داستانوں کے اظہار سے بالکل دور ہٹ گئے ہوں اس عالم میں بھی محبوب کے نام پیام کا سلسلہ اکثر ان کے جذبات …طوفان برپا کر دیتا تھا اور وہ اپنے انفرادی احساسات کے اظہار پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ۱۹۳۹ء ہی میں "دولت نایافت سے" (ایک …ے جواب میں) جو نظم لکھی اس سے ان کی زندگی کے عشقیہ تجربات پر بہت گہری روشنی پڑتی ہے اور داخلیت کی شدت کے باوجود فنی حسن …ی پوری طرح نظر آتی ہے اس میں فکر و نظر اور فن کو نہایت ٹھیک و سڈول سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے اور اس کے مطالعے سے یہ …پتہ چلتا ہے کہ ان کو ہر قسم کے موضوع کے اظہار پر پوری قدرت حاصل ہے یہاں آواز کا ترنم، آبشار کی نغمگی، پھول کی لطافت، بہار …شگفتگی اور دل میں کسک کی کیفیات محسوس ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کی وہ دنیا ملتی ہے جس نے ساری نظم کو تاثرات کا مجموعہ …یا ہے اسے پڑھ کر ہم سکون و دلکشی کی اس وادی میں پہنچ جاتے ہیں جہاں انسان پوری طرح گم ہو کر رہ جاتا ہے ؎

پھر آج ہے جو سر نامہ و پیام مجھے حریم حسن کے ساکن مرا سلام تجھے
اب عہدِ عشق کی ناکامیوں کا ذکر نہ کر شکستِ عہدِ محبت پہ آہ سرد نہ بھر
قسم ہے تیری محبت بھری نگاہوں کی کبھی جو میرے لیے تھیں قسم ان آہوں کی
قسم ہلال سے ہم شکل سرخ ہونٹوں کی جنھیں تراش کے فطرت بھی مسکرا اٹھی

مجھے خبر ہے کہ الفت کی شعلہ بار ہوا بھڑک کے کرتی ہے بجھنے میں پیش و پس کتنا
مگر بھلا دے مجھے ناشناسِ غم بن کر کہ اس طرح کہیں ہوتی ہے ساری عمر بسر
کیا ہے جس کے مقدر نے اب سپرد تجھے اسی کو مرکزِ امید و آرزو کر کے
ترا خیال مصیبت سے روشناس نہ ہو خدا کرے مرے غم میں کبھی اداس نہ ہو
وفا کے باغ کے اے سروِ بے نیاز خزاں خدائے عشق کے ہاتھوں کی بے پناہ کماں
بھلا سکوں گا تو میں بھی تمھیں بھلا دوں گا
کہ اب خیال محبت نہ دل میں لاؤں گا

زمانے کے ظلم و ستم اور سماجی پابندی اور مجبوری کا جو دردناک تذکرہ اس نظم میں ملتا ہے اس سے کوئی حساس انسان بھی متاثر ہوئے …یر نہیں رہ سکتا ایسا نہیں ہے کہ احتشام صاحب سے پہلے شعرا نے ان خیالات کو اپنی نظموں میں جگہ نہ دی ہو البتہ ان اشعار میں تاثر کی جو …شدت اور جذبے کی جو کیفیت ابھر کر سامنے آتی ہے اس کے اظہار کی صلاحیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ؎

فریبِ وقت کا ہم پر بھی چل گیا افسوس مری دمن کا زمانہ بدل گیا افسوس
نظامِ کہنہ نے مجبور کر دیا ہم کو قریب لا کے بہت دور کر دیا ہم کو

لیکن ان مجبوریوں کے پس منظر میں بھی شاعر کو سماجی زندگی کی وسی غلامی اور پابندی کا ہاتھ نظر آتا ہے جس میں عوام کا ہر فرد گرفتار ہے البتہ وہ مستقبل سے مایوس نہیں ہیں اور امید کا پیغام ان الفاظ میں دے رہے ہیں ؎

تمام دورِ غلامی کے جب ستم ہوں گے   ہماری طرح کے ناکام عشق کم ہوں گے

۱۹۴۳ء میں "بیماری کی خبر" کے عنوان سے جو نظم کہی اس میں بھی محض شاعر کی مجبوری و مایوسی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ انفرادی اور سماجی زندگی کی کامرانیوں اور پسپائیوں کے آئینہ میں ساری تہذیب کے خط و خال نظر آجاتے ہیں۔ البتہ مستقبل کی تابناکی اور زندگی کی عظمت کا احساس جد و جہد اور عزم و ہمت سے کام لینے پر برابر اکساتا رہتا ہے۔

جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا   میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں

کچھ اندھے کوڑھی دیوانے آنکھوں میں سمانے لگتے ہیں   کچھ قحط زدہ بھوکے پیاسے جان دے دے کر خاموشی سے

دنیا میں مفلس رہنے کی تعزیریں پانے لگتے ہیں

پھر خود ہی دل بول اٹھتا ہے یہ وقت بدلنے والا ہے

ذرّے سورج بن جائیں گے وہ وقت بھی آنے والا ہے

نہ جانے سماج کے دکھ درد کا احساس احتشام صاحب کے دل میں کس شدت سے موجزن ہے۔ ان کی شخصیت کے خمیر میں انسانیت کی مایوسی و بیکسی کا کتنا زہریلا نشتر پیوست ہے کہ محبت کے شیریں نغمات بھی اب ان کو تسکین نہیں دے سکتے :۔

میں نے بھی محبت کی ہے مگر اس وقت نہ اس کا ذکر کرو   وہ تنہا میرا غم ہے اسے تنہا مجھکو ہی اٹھانے دو

ان کا ذہن عوام پر ڈھائے جانے والے جبر و تشدد سے نجات حاصل کرنے میں غرق رہتا ہے۔ شہری آبادی کی ہلچل، عوام کے چہروں پر خوف و دہشت کے آثار، بھیانہ سُروں کے گیت، خون کے دھبّے، اور بارود کی بو، جیسے یہ چیزیں شاعر کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو کر اس کے دل میں ایسا طوفان اٹھا رہی ہیں کہ وہ سارے سماجی ڈھانچہ کو اکھاڑ پھینک دینا چاہتا ہے۔

یوں دیکھ کے نوعِ انساں کو پستی کی اندھیری منزل میں   طوفاں بداماں اٹھے گی اک موجِ جنوں میرے دل میں

احساس عمل میں بدلے گا جلد ایسا وقت بھی آئے گا   یہ آتشِ غم بجھ جائے گی یہ دورِ ستم مٹ جائے گا

اور شاعر حسن و عشق کے راگ الاپنے کے لیے اسی وقت تیار ہو سکتا ہے جب ظلم و ستم کی یہ حکمرانی مٹ جائے۔

جب امن و اماں کے دن ہوں گے جب عیش و مسرت کی راتیں   اس وقت سناؤں گا اکثر میں عشق و محبت کی باتیں

ذاتی محبت کے احساس کو ترجیح نہ دے کر اس کے مقابلہ میں عوام کے دکھ درد کو فوقیت دینا شاعر کی شخصیت کی عظمت و بلندی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ اس کے دل و دماغ کے ہر ہر گوشہ میں اسی قسم کی چنگاریاں دبی ہوئی معلوم پڑتی ہیں اس کی زندگی، اداسی، مایوسی اور آرزوؤں کا مجموعہ بن کر ابھر آئی ہے اور یہ ساری چیزیں احتشام صاحب کے شعور اور ان کے تجربہ کی آئینہ دار ہیں۔

۱۹۴۵ء کی ایک نظم "چند لمحے" احتشام صاحب کی نظم گوئی کے ارتقا کا مطالعہ کرنے والے قاری کو ایک بار پھر حسن و محبت کی تر و تازہ وادی میں پہنچا دیتی ہے۔ اس نظم میں شاعر کی محبوبہ اپنے خد و خال اور حسن و جمال کے پورے پیکر کے ساتھ سامنے آئی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاعر کی زندگی کا ایک لازمی جز بن چکی ہے۔ لطیف رومانیت، داخلی جذبہ کی شدت، پُر خلوص محبت کی چاشنی اور طرب کے لمحات کے ساتھ شکست و ناکامی کا خوف، یہ ساری ملی جلی کیفیات اس فن پارہ کے حسن کو اور زیادہ دلکش و تاثر بخش دیتی ہیں۔

یاس میں ڈوبی فضا دیکھ کے میخانے کی
آگئی یاد ترے یک بیک آ جانے کی

کون غم خانے میں آیا تھا چراغاں کرنے
غم سے بجھتے ہوئے دل کو شرر افشاں کرنے
یاس کے قصر جنوں خیز کو ویراں کرنے
کس کا سایہ در و دیوار پہ رقصاں تھا ابھی
کس کی آنکھوں کا فسوں خون میں جولاں تھا ابھی

کون سننے کو بڑھا تھا مرا افسانۂ غم
کس کی آنکھیں مری احساس تباہی سے تھیں نم
کس نے کھائی تھی ابھی میری محبت کی قسم
کون تھا جس نے محبت کو زباں بخشی تھی
قلب کو گرمیٔ خورشید جواں بخشی تھی
اپنی گفتار کے سایہ میں اماں بخشی تھی
کس کی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں سویا تھا ابھی
آستیں کس کی بھگو دینے کو رویا تھا ابھی

کر کے روشن نہ بجھا شمع محبت اے دوست
زندگی میرے لیے پھر ہے مصیبت اے دوست

آ پھر اک بار کہ جی جانے کی ڈھارس ہو جائے
گھر مرا شام اودھ صبح بنارس ہو جائے

یہاں حسن و رومان کی جس فضا کی مصوری کی گئی ہے اس کے لیے الفاظ کا ترنم لہجہ کا کیف اور پُر اثر بندش سے مدد لیکر شاعر پڑھنے
کو نہ صرف جمالیات کا دلکش نمونہ پیش کر دیتا ہے بلکہ احساسات کی یہی کیفیت اس کے دل پر بھی پوری طرح طاری ہو جاتی ہے اور
کے ان پیکروں کو یہ دیکھ کر اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر زبان و بیان کی سحر کاریوں پر کتنی قدرت رکھتا ہے۔
پروفیسر احتشام حسین اگر اس دور کے سب سے اہم نقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں تو موجودہ دور کے شعراء میں جوش
دی کو بھی یہی اہمیت حاصل ہے اور اردو شعر و ادب کی یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب رہے
نا یہ ہے کہ جوش کی شاعری کو ایک مخصوص طرز فکر عطا کرنے میں احتشام صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ خود جوش نے ان کی تنقیدی
بتوں اور فکری باریکیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں (احتشام صاحب کو) لکھا ہے کہ :-

"آپ کو اندازہ نہیں کہ میں یہ محسوس کر کے کس قدر خوش ہوا ہوں کہ آپ کی ذات میں جو وسعت نظر، دقیقہ سنجی، گیرائی،
خورد بینیت، اور عصر حاضر کے علمی و ادبی رجحانوں اور تقاضوں کی آگاہی قدرت نے جس توازن کے ساتھ مجتمع
کر دی ہے اس کی نظیر ہندوستان میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ مجھکو اپنی دلبری پر ناز کرنا چاہیئے"

یہ جملے ممکن ہے مضمون سے غیر متعلق معلوم ہوں لیکن ایک دوسرے سے یہ دونوں کتنا متاثر ہیں اور ذاتی طور پر کتنا قریب اس پس منظر
بار کے لیے اسے نامناسب نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کے دوران قیام میں اگر کسی دن احتشام صاحب کی ملاقات جوش سے نہ ہو تو

وہ اس طرح گرج پڑتے تھے:

کل نہ آئے جو احتشام حسین　　　دل میں غصہ کی بدلیاں گرجیں

اور خود احتشام صاحب نے بھی ان ملاقاتوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"جوش صاحب "کلیم" بند کرکے ملیح آباد میں رہنے لگے تھے، وہاں سے کبھی کبھی ایک آدھ دن کے لیے لکھنؤ آتے کسی ہوٹل میں قیام کرتے اور چاہتے کہ ان کے دوست اور قدرداں شام کو وہیں اکٹھے ہو جایا کریں۔ پینے والے پئیں، اور شاعری سے دلچسپی لینے والے ان کا تازہ کلام سنیں میں شام کی صحبت میں بیٹھنے کے بجائے دوپہر میں ان سے ملنا زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ تنہائی میں کچھ علمی ادبی باتیں بھی ہوتی تھیں......... میں شام کو بھی جایا کرتا تھا کیونکہ وہ اسی وقت کے ملنے کو ملنا سمجھتے تھے۔"

دونوں کے ذاتی تعلقات کا یہی پس منظر تھا جس میں ۱۹۴۵ء میں جوش ملیح آبادی سے خطاب کرتے ہوئے احتشام حسین صاحب نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا "ایک رند نصیحت مشرب سے" اتنے گہرے مراسم ہوتے ہوئے بھی جوش کی شاعری کے بعض کمزور پہلوؤں کی طرف احتشام حسین صاحب متوجہ کرتے رہتے تھے اور شاعر اسے قبول کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتا تھا۔ وہ اس سوال کا جواب بھی احتشام صاحب ہی سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے کہ کس طرح وہ دنیا کے یا اردو کے عظیم شعرا کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا نظم کے پڑھنے سے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ کس طرح احتشام صاحب اپنے اصولوں کو پیش کرنے میں مستحکم اور اپنے ارادوں پر کتنی پختگی اور مضبوطی سے جمے رہتے تھے۔

مت بار بار پوچھ میں کیوں سوگوار ہوں　　　ہوتا ہے مجھکو شک تری صحبت پہ بار ہوں
ہاں سچ ہے مجھ پہ فکر کے بادل سے چھائے ہیں　　　خود میں نے اپنے گرد یہ حلقے بنائے ہیں
جب ہر قدم پہ ٹھوکریں کھاتی پھرے حیات　　　جام و سبو میں غرق کروں کیسے کائنات
اللہ رے زندگی کا نظر آفریں جہاد
جام و سبو کو دیکھ کے آتا ہے خون یاد

نظم کے ہر شعر میں کرب و بے چینی آزمائش اور زیادتی ناکامیوں اور دشواریوں کے ساتھ ساتھ ان جذبات کی کشمکش کا احساس بھی ہوتا ہے جس میں آزادی کی حسین دوشیزہ کے حصول کی خواہش نوجوانوں کو انقلاب اور بغاوت کی طرف لے جا رہی تھی ملک میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے کرب انگیز نتائج سامنے تھے شاعر کی نظر میں کائنات پر سیاہ ابر چھایا ہوا تھا، خون میں تھڑی ہوئی جوانیاں غم واندوہ کے بادل اور ساری فضا کا زہریلا پن، احتشام صاحب نے ان تمام دردانگیز کیفیات کو جسے اپنے اندر سمو لیا تھا ان کی نظر میں اگر ایک طرف ؎

محنت کشوں کے فرق پہ کانٹوں کا تاج ہے

تو دوسری طرف ساری تہذیبی زندگی ہیجان و انتشار میں مبتلا تھی ؎

آندھی کی زد پہ آج تمدن کا ہے چراغ　　　لو دے رہا ہے سینۂ انسانیت کا داغ

اور آخر میں وہ جوش کی رنگین صحبت کا ساتھ دینے سے اس لیے معذوری ظاہر کرتے ہیں کیوں کہ ؎

بزم طرب میں ساتھ ترے کیسے ہوں ہم　　　جب زندگی کے بوجھ سے اٹھتے نہیں قدم

۱۹۳۶ء میں احتشام صاحب کی دو اہم رومانی نظمیں ملتی ہیں۔ فروری میں "ایک یادگار رات" اور مارچ میں "آج اور کل" کہی ان دونوں نظموں میں نغمگی اور دلکشی کے ساتھ جذبات کی پوری ہم آہنگی ملتی ہے جس میں محبت کے نرم و نازک خیالات بھی موجود اور ماضی کے خوشنما لمحات کا ماتم بھی کیا گیا ہے۔ "ایک یادگار رات" میں کہتے ہیں ؎

آج بھی تم کو کیا وہ رات ہے یاد — دل پہ جو نقش ہے وہ بات ہے یاد
تھی فضاؤں میں نغمہ ریز ہوا — ایسے میں تم نے بھی بہ پاسِ وفا
گیت سا مجھکو اک سنایا تھا — میرے سازِ طرب پہ گایا تھا
کیا ترنم تھا کیا روانی تھی — جیسے ہر چیز پہ جوانی تھی

س یادگار رات کی دلکشی اور دل آویزی کے بعد اس شعر سے کتنی حسرت و مایوسی ٹپک رہی ہے ؎

زندگی پھر نہ مسکرائے گی — کیا وہی رات پھر نہ آئے گی

"آج اور کل" مارچ ۱۹۳۶ء میں کہی گئی جس کے ہر شعر میں محبت کے اثر سے پیدا ہونے والی ناکامی، مایوسی اور حزن و ملال چھایا نظر آتا ہے اس نظم میں ذہنی دلکشی کی جو شدت ملتی ہے اس نے شاعر کے سکون اس کی سرمستی، جوش و ولولے کو کمزور بنا کر رکھ دیا اس کی محبت کے چراغ کا بجھنا حسرتوں کا خون ہونا ذوقِ سکون کی شکستگی، آنسوؤں کا سلسلہ اور یاس و حسرت کے سارے عناصر نظم میں چھائے ہوئے ہیں ؎

جس کا خیال وجہ سکون و قرار تھا — اللہ اس کو دل سے بھلانا پڑا ہے آج

ی احتشام صاحب مستقبل سے مایوس نہیں ہیں وہ ناکامی کے احساس کی شدت سے مغلوب ہو کر بے حسی یا قنوطیت کا شکار نہیں ہو جاتے گی کے حقائق سے گریز و فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ رجائیت کے قائل ہیں اور ہمت سے کام لے کر آگے قدم بڑھانے پر اعتماد ہیں ؎

کل روشنی تھی آج اندھیرے کا دور ہے — لیکن جیوں گا میں کہ ابھی کل اک اور ہے

اسی طرح رومانی ماحول میں بھی احتشام صاحب ترقی، بیداری اور جد و جہد کے جذبے کو نظر انداز نہیں کرتے ان نظموں میں شعریت بلندی، تفکر کے ساتھ ساتھ مقصدیت بھی پوری طرح نمایاں ہے انھیں فن زندگی اور انسان سے روحانی عقیدت ہے اور اسی لیے ا ہر نظم میں فنی حسن و تنوع اور بلندی و گہرائی بھی ملتی ہے۔ بعض نظمیں انسانی زندگی کے نفسیاتی پہلوؤں کے اہم نقوش کو ابھارتی ان میں محض جذباتیت یا سطحیت نہیں بلکہ انسانی فطرت کی بہترین مصوری بھی ملتی ہے۔ مئی ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور میں "روشنی کہاں وں" کے عنوان سے جو نظم کہی گئی اس میں یہ ساری خصوصیات موجود ہیں۔ اس نظم کی تخلیق کا دور وہ تھا جب تقسیم ہند کو کل تین مہینے تھے۔ پھر بھی ملک کی آزادی کا حصول امید و بیم کی حالت میں تھا۔ غیر ملکی حکومت کے مظالم، غلامی کے اندوہناک اثرات اور عوام الی اپنی آخری منزلوں تک پہنچ چکی تھی۔ ان حالات کو دیکھ کر شاعر بے اختیار چیخ پڑتا ہے ؎

دل ہے تاریک تو ہر وقت یہ کرتا ہے سوال — رات ہی رات رہے گی کہ سویرا ہوگا

برہنہ، بھوکے، ستم کش غلاموں کے لیے — کوئی دولت نہیں کیا ظلم کی دولت کے سوا
ہر طرف مٹتے ہوئے شہر تڑپتی مخلوق — کیا زمانے میں نہیں کچھ بھی مصیبت کے سوا

قت خود احتشام صاحب ایسی پسند بننا نہیں چاہتے انھیں بھی سکون اطمینان اور لطف و کرم کا جذبہ پسند ہے ؎

چاہتا ہوں کہ غم و یاس کی باتیں نہ کروں

ں وہ مرجھائے ہوئے دل کو شگفتہ کرنے کا کوئی ذریعہ تلاش کرنے کا طریقہ سوچنے میں غرق رہے اور اس کا کوئی حل نہ مل سکا کہ سماجی
ل اور کشاکشِ حیات کی گتھیوں کو کیسے سلجھائیں ان نظموں میں ان کا سیاسی اور سماجی شعور بڑی بلندی پر نظر آتا ہے اور سماج کی
ں کو نمایاں کرنے میں کسی طرح کا گریز نہیں کرتے۔ "شہرت" بھی اسی زمانے کی لکھی ہوئی ایک خاص انداز کی نظم ہے جس میں انسان
نام و نمود حاصل کرنے کی فطرت اور بامِ ترقی تک پہنچنے کے تمام مراحل پر بہت اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

احتشام صاحب نے کبھی سنجیدگی سے شاعری کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ ان کے فلسفیانہ ذہن نے تنقید نگاری کے فن کو اہمیت دے کر یہ
ت کر دیا کہ شعر و فن کی تخلیق کے مقابلہ میں افادیت کے لحاظ سے تنقید بھی کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ شاید اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ اکثر
و ئی کی طرف انھوں نے برسوں دھیان نہ دیا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا جیسے ایک طویل مدت تک ان کی شعر گوئی کی صلاحیت جمود کی کیفیت
کار ہو کر رہ گئی۔ یہی حالت ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۵۹ء تک قائم رہی جبکہ بارہ سال کے اس درمیانی وقفہ میں انھوں نے نظم گوئی سے
لکن ر وگشی اختیار کرلی تھی۔ دراصل وہ شعری تخلیق کی طرف اسی وقت متوجہ ہوتے تھے جب کوئی غیر معمولی جذبہ بیقرار و بے اختیار
نے ۱۹۴۷ء کے بعد غالباً ان کے دل کی وہ چنگاری بھی دب چکی تھی جو عشق و محبت کے جذبات اور انفرادی و داخلی کیفیات
بھار کر شاعری کے رموز و کنایہ میں اظہار پر مجبور کرتی اور دوسری طرف آزادیِ ملک کے بعد انقلاب و بغاوت کے راگ گانے کا کام
باقی نہ بچا تھا   البتہ یہ ضروری تھا کہ جب بھی ان کے احساس کو کسی قسم کی چوٹ پہنچی اس وقت جیسے ان کے دل کی آواز
مارے ٹپک پڑی۔ چنانچہ شاید یہی جذباتی تعلق تھا کہ لکھنؤ میں کافی ہاؤس بند ہو جانے کے بعد جب دوبارہ کھلا تو ایک نظم کے
بعد اس کا استقبال کیا۔ "دوبارہ کافی ہاؤس کھلنے پر" نہ صرف شاعر کے انفرادی جذبے کی عکاسی کرتی ہے بلکہ ان سارے
ں کی ترجمانی کرتی ہے جو ایک طرف غمِ حیات کی کشمکش سے بچ کر چند لمحوں کے لیے سکون حاصل کرنے کی غرض سے کافی ہاؤس تک پہنچ
تے تھے۔ دوسری طرف وہاں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی زندگی کے نہ معلوم کتنے پہلوؤں پر بحث مباحثہ
کے بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرلیا جاتا تھا۔

قومی ترقی، انسان دوستی، عوام کی ہمدردی، غریبوں کے دکھ درد یہ تمام چیزیں نہ تو احتشام صاحب کی ذاتی زندگی سے کبھی الگ
یں نہ ان کی نظموں میں ان کو کسی منزل پر نظر انداز کیا گیا۔ آزادیِ وطن کے بعد بھی یہ جذبہ بیچین کیے رہا کہ ترقی، خوشحالی، اطمینان اور
یش و عشرت کی چاہت امیں لوگوں کے دلوں میں بیقراری برپا کیے تھی وہ اب بھی کم نہیں ہے اور اس کے لیے جد و جہد، عمل، عزم
ستقلال اور مستقبل پر بھروسہ کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۶۱ء کی ایک نظم "عزم کو ہکن" میں ملک کی خدمت کے لیے
نثاری اور قربانی کے اسی جذبہ کے حصول کی تلقین کی گئی ہے۔

دکھا کے حال کے رُخ میں جمالِ مستقبل   وطن کی عظمتِ رفتہ کی آبرو بن جائیں
زمیں سے عشق ہے انساں سے پیار کرتے ہیں   متاعِ شعر انھیں پر نثار کرتے ہیں

ر اس نظم کے بعد تقریباً ۵، ۶ سال کی مدت تک احتشام صاحب پھر نظم گوئی سے دور رہے، شاید اس لیے کہ ان کے ذہن یا جذبہ
پر کوئی گہرا اثر پیدا نہیں ہوا تھا جس سے ایک قسم کی تحریک یا ابال پیدا ہوتا۔

۱۹۶۰ء کے بعد اردو شاعری میں "جدیدیت" کے جس رجحان کی ابتدا ہوئی احتشام صاحب اس کی انتہا پسندانہ شکل سے
ری طرح اختلاف رکھتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کا ذہن ادب میں کسی جدت یا تبدیلی کو پسند نہیں کرتا تھا البتہ اپنی غیر معمولی تنقیدی

ور مطالعہ کی قوت کی بنا پر وہ محسوس کر رہے تھے کہ شعری تخلیق کی علامتوں کو ابلاغ و ترسیل کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے جس کے ذریعہ شاعر اور قاری کے درمیان ایک قسم کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ چنانچہ جدید رجحانات کے بعض پہلوؤں کو قدر کی نظر سے دیکھنے کے باوجود ایسے انفرادی مسائل لاشعوری کیفیات اور غیر واضح استعارات کے استعمال کرنے کے سختی سے مخالف تھے جس کے نتیجہ میں بعض شعرا نے جدت اور تجریدیت پسندی کو بالکل بے معنی، مبہم اور انتشار کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ ان کے یہاں ترسیل اور ابلاغ مطالب کا مطالبہ کسی ناقد کے خیال میں ایسا تھا جیسے صحرائے اعظم میں صنوبر کا سایہ تلاش کیا جائے۔ احتشام صاحب بے ترتیبی، ابتری اور ہیئتی انتشار کے خلاف تھے اور ان کے خیال میں ذاتی اور انفرادی علامتیں، اور دور از کار استعارے یکسر انحراف شاعر کو صحت مند عناصر سے دور کر دیتی ہے۔ انھوں نے جگہ جگہ "جدیدیت" کی اس شدت پسندی کے خلاف آواز اٹھا کر اپنے تصورات و نظریات کی وضاحت کی اور یہی جذبہ تھا جس کے تحت وہ "ا، ح، نور ازل" کے نام سے ایسی نظموں کی تخلیق کی طرف بھی متوجہ ہوئے جو جدیدیت کے معتدل اور مفید پہلوؤں کی نشاندہی کر سکیں اس طرح نہ صرف اپنے نظریات کے ذریعہ بلکہ عملی طور پر اس کے نمونہ کو پیش کر کے شعری تخلیق کی طرف متوجہ کیا۔ ا، ح، نور ازل، احتشام صاحب نے ابتدا میں ایک فرضی نام کی حیثیت سے اس لیے استعمال کیا تھا کہ بے معنی، بے سروپا اور ایسی نظمیں کہی تھیں جس کے ابہام کی شدت نہ صرف پڑھنے والوں کی سمجھ سے باہر تھی بلکہ خود شاعر نے مقصد سے کہی بھی تھیں کہ ان غیر سنجیدہ تخلیقات کو بھی جدیدیت کے پرستاروں میں بلا سمجھے بوجھے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ جدیدیت کا کوئی بڑا ہمدرد ان کی صف میں داخل ہو رہا ہے جو بعض وجوہ سے اپنا نام پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے   پھر جلد ہی اسی شاعر کی ایسی نظمیں رسائل میں شائع ہونے لگیں جن میں موجودہ دور کی تلخی و ناکامی، اداسی و تنہائی و بے بسی یہ سارے عناصر ہونے کے باوجود وہ لاشعور کی ایسی مبہم زبان نہ تھی جہاں تک انسانی ذہن کی رسائی نہ ہو سکے یا خود شاعر کے سامنے اس کی شعری تخلیق کا مقصد و معنویت واضح نہ ہو۔ احتشام صاحب نے ایسی نظمیں کل ایک سال کی مدت میں یعنی مئی ۱۹۶۶ء تا مئی ۱۹۶۷ء تک کہیں، اور ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا ثبوت یہ ہے کہ اکثر ایک ایک دن میں پانچ پانچ، چھ چھ نظمیں کہیں پھر بھی ان میں کسی طرح کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان نظموں کا کہنا ان کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا اور شاید ہر روز یا دوسرے یا تیسرے دن وہ کئی کئی نظمیں مکمل کر لیتے تھے۔ اس سلسلہ کی پہلی نظم ۲ر مئی ۱۹۶۶ء کو کہی گئی جس کا عنوان "فرد" تھا۔ اور اسی دن ساحر الموت، جنون و خرد، سبز رنگ، حقیقت پسندی، ایک خواب، ایک ہی کشتی میں، اور دوسری ساری نظموں کی تخلیق ہوئی۔ ساحر الموت میں زندگی کے بعض حقائق کو سماجی زبان میں پیش کر کے ان کیفیات کی گہری مصوری کی ہے:۔

کون یہ کھیل رہا ہے مرے ارمانوں سے
زندگی ڈھونڈلے انسانوں سے
ہم سے دیوانوں سے

آندھیاں زرد جنوں خیز رواں کٹ بہ دہاں
ہر طرف سرخ عقابوں کے پرے
خوں میں لتھڑی ہوئی لاشوں پہ گدھوں کی پرواز

ادھر کٹے جسم بڑی لاش، ہجوم فریاد
اور پھر ساحر الموت کی جنت کا فریب
جس کا پھیلا ہوا جال مجھ کو پرواز سے پہلے ہی پھنسا لیتا ہے
اک بڑا ساحر الموت کہیں اور جو ہے
اس کی جنت بھی فریب

سبز رنگ میں بعض سیاسی اشارے پیش کر کے علامات کو کس قدر دلکش اور واضح انداز میں استعمال کر دیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

یوں تو ہر رنگ میں جی سکتے ہیں
ہو کسی رنگ کی مئے زیست کا،
پی سکتے ہیں
سرخیٔ خوں جو گھٹی زردیٔ رخسار بڑھی
ہٹ گیا نور تو ظلمت چمکی
ہاں مگر بانکپن کچھ اور ہی ہے سبز پرچم کی مرے
زندگی بخش جواں سال بہاروں کا رنگ
جذبۂ کوہکنی، تیشہ زنی، دل شکنی
سبز پتی نے پہاڑوں کے جگر کاٹ دیئے
بن کے الماس کبھی اور کبھی خنجر بن کر
بن گیا زہر ستمگر کے لیے
ان پہاڑوں میں صنم بھی نہ رہے
سبز ہے رنگ مرا، میرے ارماں کا بہاروں کا یہ رنگ
سبزہ آغازیٔ محبوب کا رنگ
اور پھر زہر کا رنگ
مرگ بھی زیست بھی
سب کچھ اسی اڑتے ہوئے سبزے کے تلے

اور اسی طرح اسی دن جو نظم "لہو کا سفر" کے عنوان سے کہی ان میں بھی بعض کیفیات کی وضاحت میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

تجھے جو رکل میں دیکھا تھا اک ہجوم کے بیچ
نہ جانے کون تھے وہ
رقیب تھے کہ محافظ عزیز تھے کہ حبیب

انھیں خبر نہ ہوئی
بجائے ان کی ہوسناک خشمگیں نظریں
یں لے گیا تجھے کنج خیال میں اپنے

ان نظموں کے بعد دوسرے ہی دن یعنی ۲۹ مئی ۱۹۶۶ء کو "بے چارہ" اور "ہجرت" دو نظمیں کہیں اور ۳۰ مئی کو ایک موثر نظم "ملکۂ شب" لکھی گئی۔ رات کی تاریکی میں کیا کیا ہوتا ہے اس چیز پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اس کے نیچے زاہد و عابد سب کو جگہ مل جاتی ہے
دل کی کلی کھل جاتی ہے
مجرم، زانی، عابد، زاہد
سب کی بات بن آتی ہے

"آندھی" اور "نقطہ" یہ نظمیں بھی ۳۰ مئی ۱۹۶۶ء ہی کی تخلیق ہیں۔ "کچھ کھلے اصول" ۳۱ مئی کو کہی گئی جو ماہنامہ کتاب لکھنؤ میں اگست ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی اس کے چار مصرعے اس طرح نظم کیے ہیں:

طرفگی رسم و رہِ عام کی مت پوچھ ندیم
جھوٹ جو مصلحت آمیز ہو سچائی ہے
روح ننگی ہو تو اخلاق کی زد سے باہر
جسم عریاں ہو تو قانون کے کوڑوں کا شکار

اسی طرح اگر تاریخ وار ان نظموں کی فہرست لکھی جائے تو اس کا سلسلہ اس طرح قائم کیا جا سکتا ہے:۔

۴ جون ۱۹۶۶ء کو "ذوقِ ناخواندہ" اور "ایک تصویر" لکھی گئی۔ اس کے دوسرے دن ۵ جون کو "زرد رنگ سرخ رنگ" اور "تخلیق" کہی، پہلی دسمبر ۶۶ء کو "میری پہچان" نظم کی جو ماہنامہ "شب خوں" الہ آباد کے جون ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ ۲۲ جنوری ۱۹۶۷ء میں "نیند سے پہلے" کہی گئی جو شب خون کے جولائی ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں چھپی اور پھر اس کے پانچ ماہ بعد ۲۵ مئی ۱۹۶۷ء کو ایک نظم "کیڑے" تخلیق ہوئی۔ اس سال جون میں ۴ تاریخ کو "وہم" اور ۵ کو "خشک سالی" اور "ریاکاری" کہی۔ اس سلسلہ کی نظموں میں احتشام صاحب کی آخری نظم "کون ہے خالق ان نظموں کا" ملتی ہے جس میں ا، ح، نورِ ازل کے نام سے تخلیق کرنے والے نے جن جن پہلوؤں سے متاثر ہو کر یہ گمنامی اختیار کرنے کی کوشش کی، ان کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ شاعر نے زندگی کے ان گنت مسائل، عوام کے دکھ درد اور فنکار کے دل کی تڑپ کا کتنا موثر نقشہ پیش کر دیا ہے۔ یہ تاثیر پوری گہرائی سے ہر مصرعہ میں نمایاں ہے:۔

کون ہے خالق ان نظموں کا
اس کو جان کے کیا پاؤ گے
کیا وہ ان لفظوں میں نہیں ہے؟ جن کے لمس سے
ذہن و قلب تمہارے جاگ اٹھے ہیں
فرض کرو وہ کوئی نہیں ہے

رنگوں کا اک مجموعہ ہے، موسیقی ہے، رقصِ صدا ہے، آوازوں کا اک جھرنا ہے
جس نے کرب و مسرت کی دنیا میں
مرگ و زیست کا زہر پیا ہے
جس نے تخلیقی لمحات میں اکثر
پھولوں کی آواز سنی ہے لفظوں کی خوشبو سونگھی ہے
چاند کی کرنوں کی ٹھنڈک کو چکھ چکھ کر محسوس کیا ہے
پھول اور پتھر ہاتھ میں لیکر شہر کی گلیوں میں پھرتا ہے
چہروں کی شکنیں پڑھتا ہے۔ نظروں کی باتیں سنتا ہے
اس کی فکر کے آئینہ میں ہر تصویر چمک جاتی ہے
اچھا پھر کچھ ایسا سمجھو!
وقت کے دریا میں بہتا اک زندہ شعلہ
نورِ ازل کی ایک علامت
وارثِ ذوقِ گناہِ آدم معمولی سا اک انساں ہے
اس کو جان کے کیا پاؤ گے
اس کو دیکھ کے کیا سمجھو گے
کیا وہ ان شعروں میں نہیں ہے ؟

اگرچہ اس نظم کے خالق کا نام قاری کے سامنے نہیں تھا لیکن شاعر نے اپنی ذات کی وہ خصوصیات یکجا کر دی ہیں جن کے مجموعہ سے اس کی شخصیت کے خط و خال کی تصویر پوری طرح کھنچ سکتی ہے اور جو لوگ احتشام صاحب کے طرزِ فکر اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں سے واقف ہیں ان کو اشعار کے اس ڈھانچہ میں احتشام صاحب کی جیتی جاگتی تصویر اور ان کے انفرادی و ذاتی کردار کی پوری جھلک بھی نظر آجائے گی ساتھ ہی ان کے دل کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دیں گی۔

مختصر یہ کہ احتشام صاحب کی نظم گوئی کی ہر منزل پر ایک چیز پوری آب و تاب سے نظر آتی ہے اور وہ ہے انسانیت کا دکھ درد، مفلسی و غربت سے ہمدردی، معاشرتی بے اطمینانی سے مایوسی اور مقصدیت کا احساس۔ سب سے بڑھ کر عصرِ حاضر کی ہیجانی کیفیات سے ان کی داخلی دنیا کی کشمکش کے امتزاج نے ان کے فن کی مخصوص انفرادیت کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور انسان اور اس کے جذبات جہاں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے وہاں احتشام صاحب کے تخلیقی کارناموں اور ان کے فکر انگیز خیالات کو مقبولیت حاصل ہوتی رہے گی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مشقِ سخن کی ابتدائی منزلوں میں احتشام صاحب نے غزل گوئی کی طرف خاص توجہ دی تھی جس کے پیچھے اس زمانے کی شعری فضا، اور عوام کا ذوق ان دونوں چیزوں کا گہرا اثر تھا۔ لیکن غزل میں جذباتی دنیا کی مصوری اور وارداتِ قلبی کے اظہار کی جو صلاحیت موجود ہے اس سے احتشام صاحب اتنا متاثر تھے کہ کسی منزل پر غزل گوئی سے دلچسپی کم نہ ہوئی۔ یہ ضرور تھا کہ اکثر اپنے ذاتی جذبہ کے بجائے لوگوں کے طرحی نشستوں میں شرکت کے اصرار پر غزل کہتے تھے۔ صنفِ غزل سے وہ کتنا لگاؤ رکھتے تھے اور اس فن کی

وسعت کے کتنی شدت سے قائل تھے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"غزل صدیوں سے اردو بولنے اور لکھنے والوں کے مزاج سے ہم آہنگ رہی ہے، اس نے خلوت و جلوت میں ان کا ساتھ دیا ہے۔ غم اور خوشی میں انھیں یاد آئی ہے اور محبت و نفرت کے جذبات وہ اس کے ذریعہ ظاہر کرتے رہے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عام انسانوں کے یہاں جو فکری اور جذباتی تسلسل کا فقدان پایا جاتا ہے غزل اس کی آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے فارم کے لحاظ سے ہر جذبہ، ہر کیفیت، ہر موڈ اور ہر خیال کے بیان کی صلاحیت رکھتی ہے......

......اگر شاعری انسانوں کے لیے آسودگی فراہم کرتی رہی، ان کی جذباتی دنیا کی مصوری اس کا کام رہا اور وہ عام واردات قلبی اور ذہنی کے اظہار کا فن بنی رہی تو غزل اس میں سب سے پہلی جگہ رکھے گی۔"

اور حقیقت یہ ہے کہ احتشام صاحب کی غزلوں سے نہ صرف ان کے ذہنی و داخلی دنیا کی الجھنوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ عشقیہ شاعری کے پردے میں عصرِ حاضر کی نہ معلوم کتنی مخفی کروٹوں کے اشارے ملتے ہیں۔ چند اشعار کی مدد سے یہ بات آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے کہ ان غزلوں میں فکر انگیز خیالات اور جذباتی پہلو کا کتنا گہرا امتزاج پایا جاتا ہے:

کام لاؤ حیات ہی سے لیں   تھک گئے موت کی دعا کرکے

کل تو خیر ان کی یاد آئی تھی   آج کیوں ہے فضا اداس اداس
سخت ہے پر عزیز ہے کتنی   ہائے رے تلخ زندگی کی مٹھاس

مت سمجھ آسودۂ ساحل ہمیں اے ہم نشیں   آپڑا جب وقت طوفانوں سے ہم ٹکرا گئے
کوئی مستِ ناز عزمِ میکشی کرتا ہے آج   خود ہی پیمانوں سے اٹھ اٹھ کر سبو ٹکرا گئے
یوں نہ ان کو دیکھ اے گلچیں بڑے نازک ہیں یہ   پھول کتنے تیری چشمِ گرم سے کمھلا گئے

ترکِ وفا کو سوچ کے گھبرا رہا ہے دل   اپنا خیال ہے کہ تمھارا خیال ہے

یہی کونین کو سنبھالے ہیں   مری دیوانگی شباب ترا
ڈوبتی روح کو سنبھال گیا   وقتِ رخصت وہ اضطراب ترا

سوئے دار و رسن اس شوق سے دیوانہ آتا ہے   تڑپ کر جیسے روشن شمع پر پروانہ آتا ہے

مسکرا کر آگئے وہ سامنے   اپنی بیتابی پہ شرمانا پڑا

جب ترا غم بھی ساتھ دے نہ سکا   مجھ پہ گذری ہیں ایسی راتیں بھی

ابتک رہِ حیات اندھیری ہے ہم نشیں   کیسے یقین ہو کہ شبِ غم گذر گئی
مارا ہوا ہوں گو ستمِ روزگار کا   یہ دل شکستگی بھی محبت کے سر گئی

ہزار بار کفن سر سے باندھ کر نکلے   ہزار بار تری راہ میں حیات ملی
مری وفا کو تغافل کا ہوگیا دھوکا   اس احتیاط سے وہ چشمِ التفات ملی

جب نہ سلجھی حیات کی گتھی   ہم لگے زلفِ دوست سلجھانے
جو لرزتا ہو خوفِ طوفاں سے   کون ایسے کو ناخدا مانے

شبِ غم سہی سہی یاد ان کی   اندھیرے میں دیا سا جل رہا ہے

ہم ہی شہرِ تمنا سے وفا کی اٹھ جائے — اس طرح تو نہ کوئی اہلِ محبت کو ستائے
دشتِ امید میں جلتا ہے مرے خوں کا چراغ — راہ منزل کی کہو میرے سوا کون دکھائے

ڈر ڈر کے جیسے میں سن رہا ہوں — کھوئی ہوئی اپنی ہی صدا ہوں
جب آنکھ میں آ گئے ہیں آنسو — خود بزمِ طرب سے اٹھ گیا ہوں
عریانیٔ فکر کھل نہ جائے — خوابوں کے لباس سی رہا ہوں

محفلِ دوست میں گو سینہ فگار آئے ہیں — صورتِ نغمہ بہ اندازِ بہار آئے ہیں
ایک پندارِ خودی جس کو بچا رکھا تھا — آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں
اے رفیقانِ رہِ شوق کہاں ہو بولو — ہم تمھیں شہر و بیاباں میں پکار آئے ہیں

وقت کے شور میں یوں چیخ رہے ہیں لمحے — بہتے پانی میں کوئی ڈوب رہا ہو جیسے
دل نے چپکے سے کہا کوششِ ناکام کے بعد — زہر ہی دردِ محبت کی دوا ہو جیسے

ان اشعار میں حسن و رعنائی بھی ہے، کیف و گداز بھی۔ یہاں زندگی کے نرم و نازک احساسات کے ساتھ غم و الم کی ترجمانی بھی اور فکری و فلسفیانہ پہلوؤں کی مصوری بھی۔ اور سب سے زیادہ قابلِ توجہ چیز یہ ہے کہ سیاسی و سماجی مسائل اور قومی جوش وطن کی آزادی و عظمت کے راگ الاپ کر یہ بات واضح کر دی کہ غزل محض زلف و رخ کے موضوعات میں پابند نہیں رہتی بلکہ شاعر کی فنی صلاحیت اور ذہنی وسعت اسے اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق موڑ سکتی ہے۔

کل سنیں گے وہی مژدہ مری آزادی کا — آج جو دیکھ کے ہنستے ہیں تہِ دام مجھے
کس میں جرأت ہے جواب لوٹے یہ کی رونق — غنچہ غنچہ مجھے بیدار نظر آتا ہے
روشن نہ ہی صبحِ وطن اے دلِ پرشوق — بے رونقیٔ شامِ غریباں تو نہیں ہے
خزاں گذر گئی لیکن گلوں کے رنگ ہیں زرد — بہار کو صلۂ خونِ کشتگاں نہ ملا
بھلے کے یاد کی لاشیں گذر گیا غمِ دہر — میں ڈھونڈتا رہا زخموں کا بھی نشاں نہ ملا

شاعر و ادیب کا ذہن جتنا زیادہ گہرا اور وسیع ہوگا، اس میں عالمِ انسانی کے دکھ درد سے متاثر ہونے کا جذبہ جس شدت سے بیقرار ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کی شعری دنیا بھی وسعت و گیرائی سے قریب ہوتی جائے گی اور ایک منزل وہ آتی ہے جہاں صرف قوم و ملک کی محبت کے موضوعات سے اس کا دائرۂ فن محدود نہیں رہ جاتا بلکہ انسانی ہمدردی، کائنات کا غم اور عالم کے ہر خطہ کے بے بس و مجبور انسان اس کی تخلیق کا موضوع بن جاتے ہیں اور ظلم و جبر کی ہر علامت ان کے لیے قابلِ نفرت و حقارت قرار پاتی ہے۔ احتشام صاحب کا فن بھی اپنے اندر وسعت و عظمت کی ان ساری خصوصیات سموئے ہے۔ ان کی غزل "بہ یادِ دیت نام" ان سارے پہلوؤں پر گہری روشنی ڈالتی ہے:۔

پھر خون میں غرق ہیں فضائیں — کیوں کر غمِ زندگی بھلائیں
پھر حادثۂ ظلم سر ہوا ہے — سینوں کو چلو ہدف بنائیں
ہر سمت محیط سوزِ غم ہے — کب تک اسی آگ میں نہائیں
برہم ہے مزاجِ زندگانی — پھر آؤ جنوں کے گیت گائیں
جانبازِ الم ہیں ہم سے پوچھو — جھیلیں کس شان سے بلائیں

نکلیں گے تو سرخرو رہیں گے — سیلاب بلا میں ڈوب جائیں
شل ہو گئے دستِ ظلم آخر — کہتے تھے نہ ہم کو آزمائیں
ہم سنگِ گرانِ زندگی ہیں — ممکن ہو تو راہ سے ہٹائیں
نکلا جو ترے خیال کا چاند — چھانے لگیں درد کی گھٹائیں
آئی دبے پاؤں یاد کس کی — اوڑھے ہوئے خواب کی ردائیں
وہ آئے نہ مجھ کو نیند آئی (ق) — روتی رہیں رات بھر ہوائیں
کیا گذرے جو وہ اچانک آجائیں — کیا ہو جو نصیب جاگ جائیں
کچھ بھی تو نہیں ہے اپنے بس میں — یاد ان کو کریں کہ بھول جائیں

شعلے بھی تو پھول بن چکے ہیں
زخموں سے کہو کہ مسکرائیں

ـنے ایک مظلوم قوم کا مرثیہ غزل کے پیرایہ میں جس طرح بیان کیا ہے اس کا تاثر ہر شعر میں پوری طرح ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ـرانھیں نظموں پر احتشام صاحب کی فنی بلندی اور تخلیقی صلاحیت کا قائل بھی ہونا پڑتا ہے اور ان کی انسان دوستی کا بھی۔ ان کے ـعار میں دل کی دھڑکنوں کی آواز بھی سنائی دیتی ہے اور الفاظ کے اس خوبصورت لباس میں زندگی کے اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں پر ـبھی پڑتی ہے اور ایسے ہی شعرا کے لیے یہ بات صادق آتی ہے کہ بڑے شاعر کو ایک مفکر ہونا ضروری ہے۔

یہاں احتشام صاحب کی شاعرانہ عظمت یا ان کی فنی بلندی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے البتہ ان کے تخلیقی مدارج ـاس مطالعے سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ ایک روایتی شاعر ہیں لیکن ان کی روایت پرستی محض نقالی تک محدود نہیں بلکہ اس میں ـکے تاریخی شعور کی گہرائی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ روایت پرست شاعر قدیم ادب کے سارے سرمایہ سے واقفیت رکھتا ہے اور اسی مطالعہ کی ـوہ اس چیز کی طرف شدت سے متوجہ رہتا ہے کہ وہ خود شاعری کے سرمایہ میں ایسا اضافہ کرے جس میں جدت اور نئے پن کا احساس ہو۔ ـطرح شاعری میں ایک نئی تبدیلی کا پتہ بھی چلتا ہے اور اسے وسعت بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ احتشام صاحب کی شعری تخلیقات بھی ـا روایتی انداز تک قائم رہنے کے بجائے حالات کے نئے تقاضوں کو ساتھ بڑھتی رہیں، وہ کسی ایک مقام پر ٹھہر بھی نہیں سکتے تھے۔ ـوں نے اپنی شاعری کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"میں نے پہلے شاعری کی دیوی کو پوجا، شعر سُنے، شعر پڑھے انھیں اپنی زندگی کا جز بنایا اور جب اس سے تسلی نہ ہوئی تو کچھ شعر بھی کہے۔ ان سب میں اکثر و بیشتر اپنی ذات ہی کے گرد جال بُن سکا۔ زیادہ تر اشعار اور نظموں کی حیثیت سوانحی ہے لیکن میں نے اپنے تجربات کو عام سماجی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کر سکوں" (ذوقِ ادب و شعور ص۲۷)

اپنے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے کی اسی خواہش نے نہ صرف تنقید کو بلکہ ان کی شاعری کو بھی بلندی سے قریب کر دیا اور یہاں بھی وہ اپنے ـکے شاعروں کے بہت بڑے نمائندے کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

عکس اور آئینے

صفحہ ١٠٩: "١٨٥٧ء کا انقلاب ایک خاموش کسی حد تک غیر منظم اور مبہم قومی احساس کا وہ نقطۂ آخر تھا جس کے بعد سے ہندوستانی ذہن نے ایک نیا سفر شروع کیا اور گو اس میں قدیم افکار و خیال اور چھوڑی ہوئی منزلوں کی گرد بھی شامل رہی لیکن آگے کی منزلوں میں قدم اٹھاتے وقت ایک نئے شعور کی رہبری ضرور کام آئی اس لیے اسے غدر کے بجائے انقلاب کہنا ہی موزوں ہوگا۔ یوں بھی ہے کہ اس بغاوت ہند کو غیر ملکی حکومت نے غدر کا نام دیا اور چونکہ اپنے فوری نتائج کے لحاظ سے یہ بغاوت ناکام رہی تھی اس لیے غدر کے نام کی ترویج میں آسانی بھی ہوئی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ انقلاب ایک پیچیدہ سماجی تاریخی۔ معاشی اور سیاسی عمل کا مظہر تھا جسے سیاسی کامیابی یا ناکامی کے نقطہ نظر سے دیکھنا زیادہ مفید ہوگا۔"

صفحہ ٢١٥: "بیسویں صدی کا ہندوستان زبوں حالی۔ پستی۔ غلامی اور خواب آفرینی کے حصار سے باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا اس کی رفتار ترقی تیز نہیں تھی لیکن اسے اپنے مستقبل پر یقین اور اپنی قوت پر اعتماد ہو رہا تھا جو ادیب اور شاعر محض اپنے خیالوں کی دنیا میں گم نہیں تھے وہ بھی زندگی کے افق پر آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کی یہ دھوپ چھاؤں دیکھ رہے تھے کاروانِ ارتقا کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ اس شب تاریک کی سحر بھی ہوگی۔"

سبطِ محمد نقوی

احتشام صاحب کے تہذیبی افکار

ہندوستان میں قومیت اور تہذیبی آویزش کے مسئلے نے جو صورت اختیار کی اور ملک کی اجتماعی زندگی پر جو اثرات مترتب کیے اُن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بمشکل مل سکے گی اور وہ آپ اپنی مثال ہے۔ اس تنقیح کا انفصال قطعی تو اس مسئلے کے محقق کے ذمے ہے کہ دھوانی ی تہذیب کے مسلک نے ——— جو واحد طرزِ معاشرت اور واحد زبان سے عبارت ہے ——— دو قومی نظریے کو جنم دیا یا جدید جمہوری تحریک نے دو قومی نظریے کی تخلیق کی لیکن پروفیسر احتشام حسین نے علی گڑھ تحریک پر اپنے سیر حاصل مضمون میں جو اشارے کیے ہیں وہ سمت کے تعین میں مددگار ہو سکتے ہیں، فرماتے ہیں۔

"اُنھوں نے (یعنی سرسید نے) دردمندی اور جرأت کے ساتھ انگریزی حکومت کی بعض چیرہ دستیوں کو بے نقاب کیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ انگریزوں نے کبھی ہندوستانیوں پر بھروسہ نہیں کیا اس لیے وہ ان برکتوں کو نہ تو اچھی طرح محسوس کر سکے اور نہ اُن سے فائدہ اٹھا سکے جو انگریزی حکومت اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کے بعد ہندوستانی سیاست میں سرسید کی جگہ بن گئی اور انھوں نے اپنی ساری قوت اس بات پر صرف کر دی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں دوستی ہو جائے۔ سیاسی مفاہمت کی تکمیل مذہبی مفاہمت کے بغیر ممکن نہ تھی اس لیے انھوں نے وہ تمام ذریعے اختیار کیے جن سے انگریزوں اور مسلمانوں کے مذہبی تصورات، نظامِ اخلاق، اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے آپس کی معاشرت میں یکسانی اور اشتراک پیدا ہو۔ لیکن اس کوشش کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم سمجھتے تھے بلکہ جب وہ اپنے سیاسی تصورات کی توضیح کرتے تھے تو دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیتے تھے۔ اس زمانے میں اُنھوں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مساوات پر زور دیا، بار بار یہ کہا کہ جو عہدے انگریزوں کو ملتے ہیں ہندوستانیوں کو ملنے چاہئیں، کونسلوں اور لوکل بورڈوں کے انتخاب کے اصول کی تائید کی اور ہندوستانیوں سے کہا کہ وہ ایسی تعلیم حاصل کریں جو انھیں حکومت کے قابل بنائے ...... تاہم اُس وقت کا ہندوستان اپنے غیر متوازن اور ناہموار قومی ارتقا کی وجہ سے مذہبی اختلاف کے جراثیم کی پرورش کر رہا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی سرسید کے یہاں جب جب اس بات کا پتہ لگانا چاہتے ہیں کہ اُن کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کیسے پیدا ہوئی تو یہ واقعہ اُن کے سامنے آتا ہے۔

"۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا

جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے مشترک کوشش محال ہے۔ ان کا بیان ہے

انہیں دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کے میری گفتگو سن رہے تھے، آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت و عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

جس "آگے آگے" کی پیشین گوئی سرسید نے کی تھی وہ آگے رہا اس وقت کے لوگوں میں تو کوئی زندہ نہ تھا جو دیکھتا۔ لیکن اس نسل نے رواں صدی کی تیسری دہائی میں پیش سنبھال لی تھی دیکھا اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور "تہذیبی تعصب و تنگ نظری" کا جو عالم ہے اس کو ڈاکٹر عابد حسین کے محتاط قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

"تہذیبی تعصب اور تنگ نظری اس قدر عام ہے کہ شاید ہی کوئی شخص اس سے خالی ہو۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ یہ تعصب اور تنگ نظری ایک اونچے اصول کا بھیس بدل کر دلوں پر راج کرتی ہے اور وہ متحدہ قومیت کا اصول ہے۔ بہت سے لوگ نیک نیتی سے سمجھتے ہیں کہ ایک مضبوط اور پائیدار ہندوستانی قومیت کی تعمیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ سارے ملک میں ایک ہی تہذیب اور ایک ہی زبان ہو اور اُن کے خیال میں اس وحدت کے پیدا کرنے کے لیے اقلیتوں کی تہذیبوں اور زبان کا مٹانا یا کم سے کم دبانا اور اکثریت کی زبان اور تہذیب کو جس طرح بھی ہو ملک میں رواج دینا ایک مقدس فرض ہے جسے ہر صورت میں ادا کرنا ہے۔"

تعصب اور تنگ نظری نے کیوں کر اونچے اصول کا بھیس بدلا اور اس کو نیک نیتی کے ساتھ کیسے مقدس سمجھا جانے لگا۔ اس اصول کا احتشام صاحب نے چند لفظوں میں دیا ہے،

"بعض ملکوں کی قدیم تہذیبیں نئے حالات میں بہت کچھ کھونے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور اس قدیم تہذیب کے پرستار اس کو پسند نہیں کرتے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تہذیب کی قدریں متعین نہیں ہونے پاتیں اور پرانے خیالات نئے لباس پہن کر عقل کی مسند پر بٹھا دیے جاتے ہیں یا نئے خیالات کو محض وقتی یا مادی کہہ کر ان کی اہمیت کم کر دی جاتی ہے۔"

یہاں سوچ کرنا مناسب ہو گا کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ آخر تہذیب کیا ہے، اس کا تشکیلی عمل کیا ہے۔ اس کے تقاضے اور کارفرمائیاں کیا ہیں جو ا[illegible] شدید الجھن کا باعث بنی ہوئی ہیں کہ سیاست اور معیشت کے مورچوں پر سکون و امن کے آثار پیدا ہو جانے کے باوصف، تہذیبی محاذ پر [illegible] کا عالم اب بھی ہے۔ اتنی زبردست اور جاندار تہذیب جو صدیوں مشترک تہذیب کا منصب بلند سنبھالے رہی ہے آج کیوں مستحق دار و رسن ہوئی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ یہ ہے کیا۔

"تہذیب کیا ہے؟ اس کے متعلق میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ "جب ہم یہ لفظ تہذیب استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی یا خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد

ہوتی ہیں جنہیں اس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ ان ہی
قدروں کے بنانے اور محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے، وہ تہذیب اس کے
ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور دنیا کی عام رفتار ترقی سے نسبت رکھتی ہے۔ تہذیب قومی زندگی کی ساری
جذباتی، روحانی اور مادی امنگوں اور خواہشوں کا احاطہ کر لیتی ہے اس کو بناتی اور سنوارتی ہے اسے ایک
ایسا نصب العین بخشتی ہے جو زمانے کی ضروریات کا ساتھ دے سکے وہ ان ساری طاقتوں کو سمیٹتے ہوئے آگے
بڑھتی ہے جو ماضی نے اسے عطا کی ہیں" میرے خیال میں تہذیب سے عام طور پر یہی باتیں مقصود ہوتی ہیں اس
طرح تہذیب ایک قوم کے شعور کی مظہر بن جاتی ہے"

ہندوستان کی اصل گتھی یہی ہے کہ یہاں متحدہ قومیت کے پرستار، جنہیں ایک عالم سیاست داں نے جارح قوم پرست کے نام سے یاد کیا ہے اس بات پر اپنے کو آمادہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے یا آمادہ کرنا نہیں چاہتے کہ تہذیبی کارواں ماضی کی عطیہ ساری طاقتوں کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ نئی اور پرانی تہذیبوں کی باہمی آویزش اور اس کے قدرتی انجام کو گوارا نہیں کرنا چاہتے اور ہر اس لہر کو جس کی جنبش انہیں اپنی قدیم تہذیب کی ندی میں نظر نہیں آتی اس پر فوراً بدیسی کا لیبل چپکا کر اسے دریا برد کرنے کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ اور اس ذہنیت کا نام ان کے نزدیک "قومی تہذیب کی تعمیر" اور یہ کام ان کے خیال میں ایک مقدس فریضہ ہے۔ اور اس انتہا پسندی میں تہذیب کے تشکیلی عمل کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ حقیقت سمجھ ہی نہیں پاتے کہ:۔

"چراغ سے چراغ جلتا ہے اور انسان جتنی ترقی کرتا جاتا ہے جغرافیائی اور ملکی حدیں ٹوٹتی جاتی ہیں۔ آج جو
لوگ انسانی تہذیب کا مطالعہ کر رہے ہیں انھیں سب سے زیادہ دشواری اس بات میں پیش آتی ہے کہ
تہذیب ٹھہری ہوئی یا جامد چیز نہیں ہے۔ سمندر کے پانی کی طرح اس میں اتنے دریاؤں سے پانی آ کر گرتا ہے کہ
دوبارہ انھیں جدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی ایک کلچر کے سفر کی منزلوں پر نظر ڈالئے۔ ابھی یقینی
طور پر تو نہیں معلوم لیکن جتنی تحقیقات ہو چکی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آریہ وسطی ایشیا سے قبیلوں اور گروہوں کی
شکل میں چلے۔ ان کا جو کچھ بھی تہذیبی سرمایہ تھا وہ ان کے ساتھ تھا۔ ان کے بعض گروہ یورپ میں پہونچے
بعض بحر روم کے ساحل پر بس گئے، کچھ عراق ہوتے ہوئے ایران آئے اور ایران سے ہندوستان پر داخل ہوئے۔
جغرافیائی اثرات، آب و ہوا اور ضروریات کی وجہ سے ہر جگہ ان کی تہذیب نے نیا روپ اختیار کیا۔ یہی نہیں،
بعض علاقوں میں یہ دوسرے لوگ آباد تھے، کبھی ان سے متاثر ہوئے اور کبھی انہیں متاثر کیا..... کوئی
کلچر نہ تو خالص ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کوئی کلچر فرقے کے تنگ دائرے میں اسیر نہیں رہ سکتا۔ فرقہ نام ہے
انسانوں کے ایک مجموعے کا جس میں مختلف طبقے ہوتے ہیں یہ طبقے اپنا الگ الگ کلچر رکھتے ہیں"

اس پیچیدہ سوال کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ تہذیب اور مذہب کا باہمی رشتہ کیا ہے۔ اس سوال کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اسی نے مذہبی اختلافات ہمارے سامنے کر کے ہندوستان میں فرقہ وارانہ سیاست کا بیج بویا جو تقسیم ملک کی صورت میں ثمر ہوا اور آج بھی یہی سوال ہندوستان کی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اس سلسلے میں احتشام صاحب کا فرمانا ہے کہ:۔

"تہذیب کے سلسلے میں ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ مذہب اور تہذیب میں کیا تعلق ہے، مذہب تہذیب
کا حصہ ہے یا تہذیب مذہب کا، لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ مذہب کے نام پر جتنے ظلم کئے گئے ہیں تاریخ میں

ان سے زیادہ کسی اور سلسلے میں ظلم کا تذکرہ نہیں ملے گا۔ کیا ہم ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کو یاد رکھتے ہوئے بھی مذہب اور تہذیب کو ایک دوسرے سے وابستہ کر سکتے ہیں؟ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کے اصول اور ہیں اور فرقہ پرستی اور، لیکن یہاں اس کی بحث نہیں ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ کسی قسم کی تنگ نظری تہذیب کے ڈھانچے میں نہیں سما سکتی، جہاں رواداری کا خون ہوتا ہے وہاں تہذیب ختم ہو جاتی ہے۔"

مطالبہ پاکستان کی حمایت میں چونکہ یہ دلیل دی گئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی تہذیب و تمدن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک وطن کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کی قابل لحاظ اکثریت نے اس کے حق میں ووٹ بھی دیئے تھے ایسی صورت میں ان سے وفاداری کا مطالبہ کیا جانا ان حالات اور خیالات کے پیش نظر، ملک جن کی گرفت میں ہے کوئی غیر متوقع بات نہ تھی چنانچہ یہ مطالبہ اجتماعی و طبقاتی شکل میں شدت کے ساتھ ظاہر ہونے لگا کہیں کہیں تو انفرادی طور پر بھی لوگوں کو جواب دہ ہونا پڑا۔ جب یہ مطالبہ ادیبوں کے سامنے پیش ہوا تو پھر احتشام صاحب نے جو مسائل ہمیشہ حکیمانہ نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اپنے مخصوص انداز میں اس سوال کی تحلیل کی۔ فرماتے ہیں:-

"ملک اور قوم سے وفاداری اور حب وطن سے مطالبہ کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن عصر جدید میں اس مطالبہ کی نوعیت میں بھی فرق آگیا ہے اور وفاداری اور حب الوطنی کے تصور میں بھی اخلاقیات کی حدوں سے نکل کر اب یہ خالص سیاسی مسئلہ بن گیا ہے جسے حسب ضرورت مذہب اور اخلاق کی شکل بھی دے دی جاتی ہے لیکن حقیقتاً اس کی بنیاد سیاسی ہوتی ہے اس مطالبے کا تذکرہ علم الاخلاق کے صحیفوں میں یا علمائے دین کے مواعظوں میں نہیں بلکہ قومیت کے موضوع پر لکھی ہوئی سیاسی کتابوں اور قومی رہنماؤں کی تقریروں میں پایا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اخلاقیات کا ایک دبیز غلاف چڑھا ہوا ہونے کے باوجود یہ محض اخلاقی مسئلہ نہ تھا لیکن اس کی یہ نوعیت نہ تھی جو آج ہے۔ اس کی ابتدا کا سراغ لگانا تو مشکل ہے لیکن سیاسی اخلاقیات میں اس کی ابتدا یورپ میں "نشاۃ ثانیہ" اور تحریک "اصلاح دین" کے بعد سے ہوتی ہے۔ جب قومی حکومتیں اپنے نئے جارحانہ قومی تصور کے ساتھ وجود میں آئیں وفاداری، غداری، حب الوطنی اور قوم پرستی، یہ محض الفاظ یا غیر مرئی تصورات نہیں ہیں۔ ان کی تہیں کھولی جائیں تو ان کے رشتے حکومتوں کے تعصبات اور حاکم طبقے کے مفاد کے تقاضے سے مل جائیں گے۔ یہی چیز اسے ایک خطرناک حربہ بنا کر حاکم طبقہ اور اس کے کاسہ لیسوں کے ہاتھ میں دے دیتی ہے اور وہ وفاداری اور حب الوطنی کا نام لے کر عوام کا خون چوستے اور مسرور ہوتے رہتے ہیں۔"

زبان ہی تہذیب کی سب سے گویا علامت اور موثر مظہر ہے۔ تہذیب کا ست بھی غیر مادی اور فکری خزانہ ہوتا ہے اور اس خزانے تک پہنچنے کا ناگزیر وسیلہ زبان ہے اسی لیے وحدانی تہذیب کے حامیوں نے جنھیں آپ جارح قوم پرست بھی کہہ سکتے ہیں سب سے کاری ضرب اقلیتوں کی زبان پر ہی لگائی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ احتشام صاحب کا دائرہ فکر بہت وسیع، بہت متنوع اور رنگا رنگ ہے پھر بھی زبان کے مسئلہ پر انھوں نے جس قدر توجہ دی ہے اور جتنی جہات سے اس کا احاطہ کیا ہے وہ بات کسی دوسرے موضوع کے لیے شاید ہی کی ہو۔ آئیے سب سے پہلے زبان اور تہذیب کے ربط باہمی کا احتشام صاحب کے گلستان فکر میں نظارہ کریں۔

"زبان اور تہذیب کا رشتہ بڑی گہری معنویت رکھتا ہے۔ دونوں میں جبر اور زبردستی کے بجائے ترغیب اور ضرورت کا عمل کار فرما ہو کر اس رشتے کو مضبوط کرتا ہے۔ آج کل ماہرین لسانیات زبان کے اس پہلو پر زیادہ

دے رہے ہیں کہ انسان کے اعضا خاص کر حلق، تالو، زبان، دانت اور ہونٹ کس طرح زبان اور اس کی آوازوں کی شکل متعین کرتے ہیں۔ یقیناً زبان کے علمی مطالعہ کے لیے یہ بات ضروری ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ الفاظ نے کس طرح انسانی دلوں اور دماغوں کو خاص قسم کے تہذیبی سانچوں میں ڈھالا ہے اور زبان میں اس کی قوت ہے کہ وہ ان کی زندگی کو استوار، پائیدار اور ترقی پذیر بنا سکے۔ عام آدمی کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہوتا کہ (ب) (ع)، (غ) یا (ف) کی آواز جب نکلتی ہے تو اس کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے، زبان کس حالت میں ہوتی ہے۔ تالو سے چھو جاتی ہے یا نہیں، ہونٹ بند رہتے ہیں یا کھلتے ہیں، آواز جھٹکے کے ساتھ نکلتی ہے یا نرمی سے۔ لیکن اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ جب ایک خاص لفظ استعمال کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کیا ہوتا ہے اور سننے والا اس لفظ سے وہی بات سمجھ رہا ہے یا نہیں جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ اس لیے اپنے زمرہ کے استعمال کے لحاظ سے زبان کے یہ پہلو کہ اس سے کاروبار حیات استوار ہوتا ہے، سماج کے مخصوص گروہ میں اشتراک خیال و عمل پیدا ہوتا ہے۔ خیالوں اور تجربوں میں جان آتی ہے اور انسان اپنے کو پہچانتا ہے، زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ انہیں وجہوں سے زبان زندگی میں ایک گہرا یا بلند مقام حاصل کر لیتی ہے اور کوئی انسان اس بات پر رضامند نہیں ہوتا کہ وہ تہذیبی اقدار جن سے وہ پہچانا جاتا ہے، جن کے ذریعے وہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے، اس سے چھین لی جائیں۔

سیاست کسی رخ پر جائے لیکن تاریخ تمدن میں زبان کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ عمل ساکن اور جامد نہیں ہوتا بلکہ تغیر پذیر اور ترقی پذیر ہوتا ہے اور انسانی ضروریات اور خواہشات کا تابع ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کی زبانوں اور تہذیبوں میں نہ تبدیلی ہوتی نہ ترقی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زبانیں اور تہذیبیں دونوں کچھ چیزیں قبول کرتیں اور کچھ چھوڑتی رہتی ہیں اس طرح وہ اپنی ضرورت کے مطابق زندگی کی ہر منزل میں انسان کا ساتھ دینے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں۔ جو شخص بھی زبان اور تہذیب کا الگ الگ یا ملا کر مطالعہ کرے گا اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ زبان تہذیب کا تحفظ بھی کرتی ہے اور اس کی اشاعت میں بھی معین ہوتی ہے۔"

کبھی زبان کو محض اظہار خیال کا آلہ قرار دے کر کبھی اس کی بنیادی نوعیت کو انفرادی ٹھہرا کر اس کے عمل کو محدود کر دیا جاتا ہے۔ ایک موثر سماجی عمل اور فعال قوت کی حیثیت سے زبان کا مقام اور منصب کیا ہے اسے آپ مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمائیں۔

زبان کی ضرورت اس قدر عام ہے کہ اکثریت اس پر غور ہی نہیں کرتی کہ اس سے زندگی کا خلا کہاں کہاں پر ہوتا ہے لیکن ذرا بھی غور کرنے پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا واسطہ زبان سے نہ ہو۔ کچھ علما نے زبان کے دو کام قرار دیے ہیں، ایک سماجی دوسرا جذباتی (یعنی انفرادی) اس تقسیم سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں کام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ زبان کا جذباتی اظہار جو شعر و ادب کے سانچے میں ڈھلتا ہے، ایک منزل پر وہ بھی سماجی نوعیت اختیار کر لیتا ہے، اس لیے زبان کی بنیادی نوعیت انفرادی نہیں ہو سکتی۔

جب یہ بات ہر طرح روشن ہو جاتی ہے کہ زبان ایک سماجی عمل ہے تو ہم بڑی آسانی سے سماج اور اس کے

مختلف مظاہر سے زبان کے ہر تعلق کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ سماجی نشو و نما مختلف اداروں کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ یہ ادارے تعلیمی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی بقا کے لیے زبان سے کام لینا پڑتا ہے۔ تعلیم کا سارا نظام، سیاست کے سارے ہتھکنڈے، مذہب کی ساری اشاعت، تہذیب کی ساری بقا زبان ہی پر منحصر ہے، اس سے تہذیب کے نقش و نگار محفوظ بھی رہتے ہیں اور وسیع تر بھی ہوتے ہیں۔ جب ایک قوم دوسری قوم پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسے محکوم بنا لیتی ہے جب ایک ملک کا سیاسی وقار دوسرے ملک کو متاثر کرتا ہے جب زوال کے عہد میں ایک گروہ دوسرے گروہ کا اقتدار تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس وقت تہذیبی قدروں کا احساس ہی قومی زندگی کا محافظ بنتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے نمایاں کام زبان کرتی ہے کیونکہ وہی روایات کے تسلسل کو برقرار رکھتی ہے اور تہذیبی اقدار کی مظہر بن جاتی ہے۔ اس میں قوم کے تمام افراد شریک ہوتے ہیں یا اگر وسیع ملک ہے اور اس میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں تو ہر خطہ کے لوگ اپنی اپنی زبان کو قومی زبان قرار دیتے ہیں وہ نہ صرف اسے محفوظ رکھنے اور دوسری زبانوں کے برے اثرات سے پاک رکھنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس کے دائرے کو وسیع تر بنانے کی مسلسل جد و جہد کرتے رہتے ہیں۔ تاریخ اس کے مواقع برابر فراہم کرتی رہتی ہے کہ ایک زبان اپنے دائرے کو وسیع تر کرتی چلی جائے یہاں تک کہ سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی وجوہ سے اسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو جائے۔"

ہم زبان اور تہذیب کے رشتے کو ابھی احتشام صاحب کے حکیمانہ افکار میں دیکھ چکے اب ادب اور تہذیب کے تعلق کو بھی دیکھیں —— ادب اور تہذیب کا رشتہ بھی ان خوابوں میں ہے جنھیں کثرت تعبیر نے پریشان بنا رکھا ہے۔ یہ پریشانی فرد و جماعت کی کشمکش کو لازمی سمجھنے والے اور انسانی فطرت کو غیر تغیر پذیر جاننے والے علمائے نفسیات نے پیدا کر رکھی ہے اس گتھی کا حل آپ احتشام صاحب کی لفظوں میں ملاحظہ کریں۔

"ادب تہذیبی زندگی سے اسی وقت تعلق رکھتا ہے جب وہ اپنے اندر قوم کی منصفانہ اور انسان دوست تمناؤں کا اظہار کرے اس کے کسی ایک طبقے کی جارحانہ اور ظالمانہ خواہشات کبھی تہذیب اور ادب کا جزو نہیں بن سکتیں۔

ادب کو تہذیبی زندگی سے متعلق کرنے کے سلسلے میں جو اصل دشواری پیش آتی ہے اور جس کا اظہار بہت سے لوگ کھل کر نہیں کر سکتے یہ ہے کہ عام طور پر ادب کو محض فرد کی خیال آرائیوں اور شخصی تصورات کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں آرٹ میں انفرادیت کی بحث کے علاوہ فرد اور جماعت کے تعلق کی بحث بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ادیب کی انفرادی خواہشات اور خیالات کو کسی قوم یا ملک کے مجموعی تہذیبی تصورات کا جز کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ادبیات کا بڑا حصہ افراد کی کاوش فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اعلیٰ درجہ کی تخلیق میں ادیب اور فن کار کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے لیکن جس بات کو نظر انداز کر دینے سے یہ مسئلہ الجھن پیدا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ بعض نقاد اور مفکر فرد اور جماعت میں کشمکش کو لازمی چیز تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ تحلیل نفسی کی عمارت کا بڑا حصہ اسی مفروضہ پر قائم ہے کہ انسان سماج کے ساتھ مجبوراً تعاون کرتا ہے ورنہ اس کی انفرادیت تو سماج سے بالکل الگ تھلگ رہنا چاہتی ہے یہی

خیال دوسری الجھنوں تک لے جاتا ہے کیونکہ اس میں ایک طرف تو انسانی فطرت کو بعض جبلتوں کا مجموعہ قرار دے دیا جاتا ہے جو بدل نہیں سکتیں اور دوسری طرف یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ کسی سماجی نظام میں افراد کو بحیثیت فرد کے مسرت حاصل کرنے اور اپنی جائز خواہشات پوری کرنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا۔ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں نہ تو انسانی فطرت غیر تغیر پذیر ہے اور نہ سماج فرد کا دشمن ہے اس لیے وہ ادیب جو اپنی انفرادیت کو سماج کے عام مفاد سے الگ لے جاکر اپنی خواہشات اور اپنے افکار کو لوگوں پر لادنا چاہتا ہے وہ گویا تہذیب کی ان اقدار کی مخالفت کرتا ہے جسے انسانوں کی عام جد و جہد نے صدیوں کی صبر آزما کوششوں کے بعد جنم دیا ہے اور اسے انسان کے مستقبل پر بھروسہ نہیں ہے بلکہ وہ اس اندھی جبلت کا وکیل ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ ان عقائد کے ساتھ کوئی ادیب انسانوں کے تہذیبی ارتقا کا قائل ہی نہیں ہو سکتا، اس لیے یہاں ادب اور تہذیب کے تعلق کی جستجو فضول ہو گی کیونکہ اس کی وہ انفرادیت جو سماجی زندگی سے صرف اپنی یا اپنے چند ہم خیالوں کی بات منوانے کے لیے برسرپیکار ہے عام تہذیبی زندگی کا جز کبھی نہ بن سکے گی۔ اچھا ادب اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنی ادبی جد و جہد کو سماج کے عام مفاد کے کام میں لاتا ہے اور اپنے خیالات کے پردے میں اجتماعی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادب ایک تہذیبی عمل ہے اور تہذیب کا کوئی ادارہ محض فرد کی کاوش کا مرہونِ منت نہیں ہے اس میں قوم کی زندگی کا دل دھڑکتا ہوا ہونا چاہیے۔"

تتمۂ کلام میں اتنا اور عرض کر دوں کہ اگرچہ آپ ان طول طویل اقتباسات سے اوب گئے ہوں گے پھر بھی اس نتیجے پر پہونچ چکے ہوں گے کہ اس بات کے باوجود کہ احتشام صاحب نے تہذیب کے مسئلے پر اگرچہ کوئی مستقل تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی ہے ــــ اپنی حد درجہ ہمدرد اور مروت سے مملو طبیعت کے باعث وہ طرح طرح کے چھوٹے بڑے کاموں میں جس طرح گھرے رہتے تھے اس میں بہت سی مستقل تصانیف کی گنجائش تھی بھی نہیں، پھر بھی کوئی زاویہ نہیں ہے جس سے تہذیب کے مسئلے پر انھوں نے نظر نہ ڈالی ہو۔ یہ جوشِ حامی اور مخصوص نقطۂ نظر کے مبلغ کی نظر نہیں۔ بلکہ فیلسوف اور حکیم کی نظر ہے جو اپنے ایک دعوے کے لیے صدہا عقلی دلیلوں سے لیس ہوتا ہے۔ اور کسی عالم میں بھی احتشام صاحب کی عقلیت پسندی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے اردو زبان کی جاں بخشی کی جو شرطیں پیش ہوئیں ان میں سے ایک خاص شرط یہ بھی تھی کہ اردو کا رسم خط بدل دیا جائے کچھ لوگوں نے دیوناگری اور دوسروں نے رومن کو بدل کی شکل میں تجویز کیا۔ احتشام صاحب نے زبان اور رسم خط کے تعلق کا جائزہ کیا لیا ایسے مسئلے پر کہ جس کے بارے میں جذبات اتنے بھڑکے ہوئے ہوں یا پھر بھڑکائے جا چکے ہوں رسم و رہ عام سے ہٹ کے بے لاگ رائے دینا انھیں کا کام تھا۔

"ہر زبان میں رسم خط کا مقصد ایک ہی ہے۔ آوازوں کی علامتیں معین کرکے انھیں استعمال کرنا لیکن کبھی یہ علامتیں معنی کے تعین کرنے میں مدد نہیں دیتیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر بغیر لکھے ہوئے لفظ کے معنی کا تعین ہی نہ ہو سکتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ تقریر کرتے وقت ہم لفظ کے معنی محض اس کی صوتی حیثیت کو سامنے رکھ کر سمجھ لیتے ہیں اب اگر یہ بات طے ہو جائے کہ زبان اور رسم خط دو الگ الگ چیزیں ہیں اور کوئی زبان کسی رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے تو پھر اردو کے لیے دیوناگری لاطینی اور فارسی رسم خط میں سے کسی ایک کے منتخب کرنے کا سوال دوسری نوعیت اختیار کرے گا، فطرت مزاج اور لغویات کے نام پر بہت سے علمی مغالطے تیار کیے گئے ہیں انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر رسم خط بدل دیا جائے گا تو زبان بدل جائے گی یا خراب ہو جائے گی۔ اگر اس بحث سے معقول نتائج برآمد ہوئے تو پھر یہ بحث شروع کی جا سکتی ہے کہ کسی رسم خط کے اختیار کرنے میں کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے اور آج اس مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔"

روایت اور بغاوت

صفحہ ۷۹: "افسانے میں جذبات نگاری کرنا۔کردار کے خیالات کی رَو کا اندازہ لگانا اور انفرادی یا اجتماعی زندگی سے پیدا ہونا ضروری ہے اس لیے یہ بات ہر افسانہ نگار کے لیے ضروری ہو جاتی ہے کہ وہ شعور اور لاشعور کے تعلق کو محسوسات اور خیالات کی پیدائش کو خیال پر مادّی زندگی کے اثر اور پھر مادّی زندگی پر خیال کے اثر کو سمجھے ورنہ یا تو اس کی خیال آرائیاں ہوائی قلعہ بنانے لگیں یا وہ شعور کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرنے لگے گا، جس کے اصل محرکات کو وہ انسانوں کی ابتدائی زندگی۔ پیدائش سے قبل کی زندگی قبائلی زندگی کے فطری ارتقا میں ڈھونڈنے لگے گا اور اس کا تعلق صحت سے زیادہ بیماری سے۔ اُجالے سے زیادہ اندھیرے سے اور واقعیت سے زیادہ خیال آرائی سے ہو جائے گا۔ اپنی جگہ پر یہ چیز کتنی ہی کامیاب ہو انسانی جدوجہد کی زندگی میں اس کی قدر و قیمت ہمیشہ مشتبہ رہے گی۔ حقیقت سے فرار یا تو خود فریبی ہے یا لاعلمی۔ اور دونوں حالتیں ایسی ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔"

صدیقی

نقّاد احتشام حسین

ایک مشہور نقاد نے جذبہ رقابت سے مغلوب ہو کر تعزیتی ادبی نشست میں کہا کہ مرحوم سید احتشام حسین کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ ترقی
اگر وہ ترقی پسند نہ ہوتے تو یقیناً بہت بڑے نقاد ہوتے۔ اگر اس تبصرے میں واقعیت ہوتی تو بھی کوئی باشعور نقاد تعزیتی جلسے کے حدود کو
ہوئے ایسی تبصرہ آرائی سے گریز کرتا۔ ادبی قلمرو میں زیرِ نظر مثال پستی اور ابتذال کی مثال کہی جا سکتی ہے۔ ہم اگر ہم احتشام حسین کے تنقیدی
اصولوں کی مدد سے اس واقعہ کا مشاہدہ و مطالعہ کریں تو اس قسم کا ابتذال کوئی تعجب خیز مسئلہ نہیں رہتا کیونکہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ سماج کا
نوعیت کی پستیوں کو فروغ دینے میں نمایاں کردار انجام دیتا ہے۔ احتشام کا کمالِ فن یہی ہے کہ انھوں نے سرمایہ دارانہ سماج کے مثبت و منفی
اور تضادات کے ابہام کو واضح کر دیا ہے چونکہ یہ مضمرات اور تضادات معاشرے کے ہر فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ادیب و شاعر
کا ذہین و حساس فرد ہوتا ہے اس لیے وہ ان مضمرات و تضادات معاشرے کے ہر فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ادیب و شاعر معاشرے کا
س فرد ہوتا ہے اس لیے وہ ان مضمرات و تضادات کے اثرات کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ احتشام صاحب کسی مرحلہ پر سطحی اور عامیانہ قسم
میں رہے چنانچہ اپنے نظریات کی وضاحت میں اسباب و علل (R E A S O N S) اور منطق کا دامن ترک نہ کر سکے۔ اسباب و علل کے
کی سچی حدود تک پہنچنے کے لیے کلچر، ادب، سیاسیات، معاشرتی و عمرانی علوم، فلسفہ اور سائنس جیسے علوم کی انتہاؤں کا سراغ لگانا ضروری
شام ہماری تنقیدی تاریخ کا پہلا چراغ ہے جو ان انتہاؤں تک پہنچنے میں کامیاب نظر آتا ہے احتشام ایک دیو پیکر نقاد ہے اس کی
ہم قابلیت ترقی پسند ہونا ہے۔

دب کے منصب کی توضیح کرتے ہوئے آرنلڈ نے کہا کہ ادب کا فریضۂ اوّل تنقیدِ حیات و کائنات بھی اور تعبیرِ حیات و کائنات بھی۔ یہی وہ
ہ نے انگریزی ادب میں قابلِ قدر نظریاتی اور معنوی تعمیر پیدا کر دیا اور انگریزی ادب زندگی کے لیے صحت بخش اور مادی قدروں کی جستجو ہی نہیں
رقی پذیر نظامِ تمدن اور مضبوط جدید سماج کی دریافت میں معاونت کا رول ادا کرتا رہا۔ جاگیردارانہ تہذیب اور رومانوی کلچر کے جال کو توڑنے
یشنگف تہذیبی قدروں کے استحکام میں انیسویں صدی کے آخری عرصے کی ادبی نگارشات نے نمایاں کردار ادا کیا اس کردار کا عالمگیر تاثر
پ جواور ایشیا افریقہ کے تصوراتی ادب میں جدید فکری نظام نے جگہ بنانی شروع کر دی اور اردو ادب کی قلمرو میں معنوی اور افادی قدروں
بلا واسطہ اسی عالمگیر تاثر کی دین ہے جس کے غالب، حالی اور سرسید کی کلاسیکیت میں ترقی پسند نقطہ ہائے فکر کے لیے راستے بنا دیئے
تاریخ کا یہ ابتدائی سفر اصلاحی دور کا آغاز تھا۔ غالب اور حالی کا نظریاتی عمل قدیم سامنتی کلچر، عقائد، ذرائع پیداوار اور سماجی و سیاسی
یہ طرز میں بدلنے کا عمل تھا۔ سرسید بھی اس عمل کے ایک جزو لازم تھے لیکن ان کے یہاں بنیادی طور پر یہ سارا عمل ادب کے دائروں سے باہر
لب و حالی کے یہاں یہی عمل ادب و تنقید کے وسیلے کی دین ہے۔ غالب کی شخصیت حالی کے مقابلہ میں بدرجہا بلند اس لیے کہی جائے گی کہ اس کے

یہاں ایک آزاد (LIBERAL) اور غیر فرقہ وارانہ (SECULAR) رویہ ملتا ہے جبکہ حالی کی انقلابیت پر مذہب کی چھاپ اتنی ہی واضح ہے جتنی کہ سرسید پر ہے۔ احتشام روایت سے بغاوت کے جو حدود متعین کرتے ہیں اس کی رو سے نقاد یا ادیب ماضی سے قطعی بے نیاز نہیں رہ سکتا چنانچہ احتشام حسین کے یہاں بھی اس تعلق کا وجود رد نہیں کیا جا سکتا ان کی تصانیف کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ وہ غالب سے بہت زیادہ۔ حالی سے زیادہ اور سرسید سے خاصے متاثر رہے ہیں لیکن اس تاثر پر روس کی ادبی تحریکات پرولتاری انقلاب کے نظریاتی خطوط اور پرولتاری سائنسی تہذیب کی ادبی روایات کا رنگ گہرا اور وسیع نظر آتا ہے۔ قبل از انقلاب کے روسی ادب نے روس میں معاشرتی انقلاب کا شعور پیدا کرنے میں انگریزی سے زیادہ اہم اور مرکزی کردار انجام دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احتشام نے ٹالسٹائی اور چیخوف کی سماجی مقصدیت سے گہرا تاثر قبول کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"چیخوف کے یہاں بھی زندگی ہی زندگی ہے بلکہ اکثر تو وہ خود زندگی سے بڑا ثابت ہوتا ہے"

بعد از انقلاب روس میں ادب کے کردار کو احتشام نے بہت قریب سے دیکھا ہے کیونکہ یہی عرصہ ان کے سن بلوغت کا تھا اور اسی عرصے میں روس کے اقتصادی سماجی اور سیاسی انقلاب کے عالمی تاثرات نے برصغیر ہند و پاکستان اور ایشیا و افریقہ کے محکوم خطوں کو متاثر کیا۔ مرحوم سید احتشام حسین اسی عہد کے نمائندے ہیں وہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ دوسری جنگِ عظیم کے وقت ان کی عمر بمشکل چوبیس سال ہوگی اس وقت کے برصغیر کی سیاسی سماجی، معاشی اور جمہوری صورت غلامی کے خلاف جدوجہد بین الاقوامی نظریات کے بڑھتے ہوئے اثرات اور اس کے اجتماعی نظام کی آہنگ یہ سارے مجموعی محرکات احتشام کے ذہن کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ مارکسی اور سائنسی دبستان تنقید کی طرف ان کے سفر کا آغاز ان مجموعی خارجی محرکات کا حاصل ہے۔

۱۹۳۴ء کے بعد یہ احساس پیدا ہوا کہ آزاد روی، جمہوری مزاج اور جدید صنعتی سماج کا شعور جو سرسید اور حالی کے توسط سے اردو ادب اور تنقید میں رونما ہوا تھا آزادی کی طرف بڑھتے ہوئے برصغیر کے لیے ناکافی ہے یہی احساس ترقی پسند نقطۂ نظر کا آغاز تھا۔ ترقی پسندیت کا یہی شعور بعد میں ایک ملک گیر تحریک بن گیا اس تحریک کے زیرِ اثر متعدد نقاد منظرِ عام پر آئے احتشام بھی ان میں سے ایک ہیں جنہوں نے ادب کو سائنسی اور مارکسی نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ان کی ہستی اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ وہ نہ صرف مارکسی اور سائنسی دبستان تنقید کے امام اول ہیں بلکہ اس کو پائیدار بنیادوں پر مستقل صورت دینے والوں میں ہیں۔ احتشام ہی سے اردو تنقید کو حقیقی مفاہیم اور معیار و تہذیب کی منازل دستیاب ہوئیں۔ تنقید جس سنجیدگی، توازن علمی بصیرت اور حکیمانہ بالغ نظری کی متقاضی ہے۔ سید صاحب کے یہاں اس کا مجموعی عکس بہت دور تک روشن نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں چند ایسی روایتوں کا احترام دکھائی دیتا ہے جن کا احترام ملحوظ رکھنے میں بڑے ناقدین بھی لڑکھڑا جاتے ہیں۔ غیر جانبداری اور ذاتی پسند و ناپسند سے احتراز ایک ایسی قدر ہے جو احتشام کے یہاں شروع سے آخر تک نمایاں ہے۔ انھوں نے کبھی تنقید کو ذاتی (PERSONAL) نہیں بننے دیا یہی وہ خوبی ہے جس نے اختر جیسے شاعر کو اپنے کلام "نو بہاراں" پر دیباچہ لکھنے کے لیے احتشام کے انتخاب پر مجبور کر دیا۔ قدیم کلاسیکی شعراء کے یہاں جو مثبت قدریں اور فنی محاسن احتشام کو نظر آئے ان کی داد و تحسین میں احتشام نے کمی نہ کی۔ ان کا یہ کارنامہ بھی کم نہیں ہے کہ انھوں نے کلاسیکی ادب کی عظمت و افادیت کا تعین کیا۔ ان کے لب و لہجہ میں کبھی اور کہیں تندی و تلخی اور جھنجھلاہٹ و جارحیت کا دخل نہیں ملتا۔ زندگی اور انسانیت کا وہ احترام جو ان کی شخصیت کا جزو رہا ہے ان کے تجزیات و اختلافات میں جھلکتا ہے۔ انھوں نے تنقید کے ذریعے مروجہ معاشرتی۔ تہذیبی اور ادبی اقدار کے جن زوال آمادہ رجحانات کی عکاسی کی ہے وہ آج انتہائی واضح شکل میں اپنی نااہلی (INCOMPETENCY) شکست خوردگی اور محرومی کا اظہار کر رہے ہیں۔ انھوں نے تنقید کے ذریعہ امن و آزادی عالمگیر اخوت و باہمی اشتراک خوشحالی ترقی یافتہ سماج اور حسن و محبت کی لازوال قدروں کے جس مستقبل کی تشکیل کو ممکن بنانے کی جدوجہد کا شعور ابھارا تھا آج دنیا اسی مستقبل کے حصول کی خواہاں ہے اور یہی مستقبل جو کل تک چند باشعور ذہنوں کی آرزو تھا اب پسماندہ ذہنوں کی آرزو بن چکا ہے اس آرزو کی

اجتماعی قوت اب اس منزل پر ہے جہاں عالمی سطح پر جبر و تشدد اور فوجی شکر داؤ کی سامراجی مہمات اپنی نامرادی پر شرمندہ نظر آ رہی ہیں۔

احتشام ایک ایسے ادب کی جستجو کرتے ہیں جہاں اجتماعی شعور اور اجتماعی واقعیت کا واضح انعکاس فن کے آئینے سے روشنی بن کر نمودار ہو۔ چنانچہ نئی قدریں اور موضوعات کا اشتراک ان کا نظریہ فن بن جاتا ہے اس طرح قدیم ادب کی بے مقصد خیال آرائی اور جدید ادب میں انتشار، پراگندگی، بے مقصد تجربوں ابہام اور ذاتی محسوسات کی مصوری دونوں ہی سے ان کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں محسوسات کی افادیت کو تلاش کرنے کا جذبہ ہے چنانچہ وہ ادب میں ان نتائج کو تلاش کرتے ہیں جو سائنسی حکمت اور مادی نظریے سے منطبق ہوں۔ سائنس کے نام لیوا ادیبوں رجعت پسندوں کی تنقید جو کہ جذبۂ رقابت و حسد کا مظہر ہے متقاضی ہے کہ ہم اصطلاح سائنس کا ادبی مفہوم متعین کر لیں کیونکہ احتشام سائنس کو ایک متعین مفہوم کے تحت استعمال کرنے والوں میں ہیں سائنس اور ادب اس وقت بہت قریب آ جاتے ہیں جب عقل تجربوں کے نتائج سے مطابقت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرتی ہے۔ سائنس اور ادب کا سفر احساس و اظہار سے شروع ہوتا ہے اور دونوں ہی احساس و اظہار میں تجرباتی نتائج کو جگہ دینے کو فطری محسوسات میں تراسیم کرتے ہیں۔ غالب کے یہاں سائنسی نقطۂ نظر کا وجود اس وقت پیدا ہو گیا جب اس نے واضح لفظوں میں کہہ دیا کہ کیا اگلوں میں احمق نہیں تھے۔ یا سے

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو . جو مئے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

سائنسی حکمت سے مراد اشیا اور عوامل کی ماہیت اسباب و علل کے ذریعہ دریافت کرنا ہے۔ احتشام نے اپنی ادبی تنقید میں اس حقیقت کا تعین کیا ہے کہ زندگی سماج اور ذرائع پیداوار اجتماعی زندگی کو کس طرح متاثر کرتے ہیں اور ادب کس طرح مجبور ہو جاتا ہے کہ ان تاثرات کا اظہار کرے۔ احتشام تجربوں اور دلائل کے بعد اس صداقت کے ترجمان بن جاتے ہیں کہ ادب اور زندگی کے رشتے ناقابل تردید ہیں۔ ادب اور زندگی کے فطری رشتے ایک ایسی صورت حال کو جنم دیتے ہیں جہاں ادیب تاریخی تسلسل کے تاثر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ احتشام تاریخ کی حرکت کو محسوس کرنے والوں میں ہیں اور یہی حرکت سائنسی ارتقا کے مضمرات کی ترجمان ہے چونکہ زندگی اور زندگی کے مسئلے تاریخ اور زمان و مکان کے دائرے میں صورت پذیر ہوتے ہیں اور لازمی طور پر زندگی کی عکاسی ہے اس لیے ادب اور تاریخی تسلسل کے ارتقا ایک اکائی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ احتشام کی تنقید نے ادب میں اس اکائی کی تلاش کو ہمیشہ اولیت دی ہے۔ سائنس کے اس تاثر نے احتشام کے یہاں اقدار کا صحیح تعین کرنے والی قوت کو جنم دیا ہے۔ یہی تعینات جن کی تردید کے لیے دلائل و اسباب دستیاب نہیں ہوتے جب ادبی شعور میں جگہ پاتے ہیں تو ہمیں قوت بخش ادب، فکری ادب تخلیق پاتا ہے جس کی روشنی انسانوں کی تقدیر بدل دیتی ہے۔ احتشام کی تنقید نے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ صداقتیں ——— جامد نہیں بلکہ متحرک اور تغیر پذیر ہوتی ہیں اور تحرک (MOTION) و تغیر (CHANGE) سے انکار کرنے والے احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ احتشام کے یہاں جدلیاتی اور ارتقائی (EVOLUTIONARY AND DILECTICAL) رویّہ اور طرز (PATTERN) نمایاں نظر آتا ہے۔ احتشام کی تنقید اہل بصیرت کے لیے شعور و آگہی کا چراغ ہے۔ وہ تنقید ادب میں حقائق کے جن نکات کی ترجمانی کرتے ہیں ان کی افادیت میں کوئی عقیدہ، کوئی طرز زندگی اور کوئی طبقہ مزاحمت نہیں کرتا۔ کیا اس تاریخی حقیقت سے انکار ممکن ہے۔

" زندگی میں جس طرح تبدیلیاں ہوتی ہیں حقیقت کے مفہوم بھی اسی طرح بدلتے ہیں "

برصغیر کی سیاسی اور سماجی زندگی کی تاریخ اور اس تاریخ کی عکاسی کرنے والا ادب تغیرات کی تاریخ ہے۔ یہی اسلوب و تیور ہمیں عالمی تاریخ میں نظر آتا ہے کل یہ حقیقت بعید از قیاس تھی کہ امریکہ کا سامراجی سرمایہ دار چین کی اشتراکی معیشت سے تعاون کرے گا۔ لیکن ۱۹۷۱ء اس تعاون کو حقیقت میں بدلنے والا سال ثابت ہوا۔ احتشام نے اصولی طور پر اس صداقت کو تسلیم کیا ہے کہ ادب اجتماعی مقصدیت اور اجتماع سے ربط کا ترجمان ہے اب اگر زندگی کے لیے رہنمائی کا فرض انجام نہیں دے سکتا، زندگی کی توانا قدروں کو فروغ نہیں دے سکتا۔ روح عصر کے انعکاس کا متحمل

نہیں ہو سکتا اور معاشرتی مسئلوں کا صحیح حل تلاش کرنے میں معاونت نہیں کر سکتا تو اس کا وجود اور تاثر بے سود ہو گا۔

"صدیوں تک زندگی اپنے ڈگر سے نہیں ہٹی اور چند جامد ادبی عقائد کے ساتھ ادب و شاعری منسلک رہے۔ ادب نے رہنمائی کے فرائض ترک کر کے تفریح کی صورت اختیار کر لی"

"اظہار ایک سماجی عمل ہے اور سماج کی خواہشات کا پابند ہے۔ طرزِ اظہار ہر عہد میں یکساں نہیں رہ سکتا"

اظہار کو سماجی عمل قرار دے کر احتشام ادب کو سماجی عمل کا ایک شعبہ بنا دیتے ہیں۔ احتشام کی تنقید کا ہیولیٰ متذکرہ بالا نظریات سے عبارت ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں حکیمانہ بالغ نظری، تفکر کی جلوہ گری، وسعت اور تنوع ہے وہ کسی ادب پارے پر اظہار رائے کرتے ہوئے اولاً ادیب کی شخصیت اس کی علمی اور تجرباتی اہمیت اور سماجی دنیا سے اس کے تعلق کو مدنظر رکھتے ہیں پھر وہ یہ سراغ لگاتے ہیں کہ ادیب نے زندگی اور سماج کے منفی اقدار کو بدلنے کے لیے کن مثبت قدروں کی نشاندہی کی ہے تاہم اس تلاش میں وہ کبھی خیال، ہئیت، ٹیکنیک مروجہ فنی اقدار۔ معائب اور محاسن سے پہلوتہی نہیں کرتے۔ مجاز کے فن پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"احساس و فن کا ارتقا محض اندازِ بیان کی پختگی نہیں ہے اور نہ ہئیت کے نت نئے تجربے۔ بلکہ فنکار کی اس صلاحیت کا ارتقا ہے جو موضوع۔ مواد اور ہئیت کو ایک کرتی ہے"

احتشام نے جگہ جگہ ادب کی جمالیاتی صورت و آہنگ اور نغمگی کی اہمیت کا اقرار کیا ہے۔ اقبال پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اقبال صرف مسلمانوں کی بیداری اور حق خودارادیت کی بنا پر ان کی آزادی کے مفکر اور فلسفی ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسے قدر اول کے شاعر کی حیثیت سے بھی زندہ رہیں گے جو غیر معمولی لطافت و حسن اور طاقت سے بھرے ہوئے گیت گاتا ہے۔ اقبال کے یہاں زبان و بیان کی کمزوریوں کا ذکر کر کے خوش ہونے والوں نے اس آہنگ کو محسوس نہیں کیا جو قوموں کی تقدیر بدلنے والی قوت رکھتا ہے" احتشام نے جمالیات کے مابعد الطبیعاتی نظام فکر کو البتہ رد کیا ہے جمالی اور ازلی وابدی مسرتوں کا احساس ان کے نزدیک کوئی ایسی کیفیت نہیں ہے جو ماورائے مادہ کوئی شے ہو۔ احساس جمال کا تعلق کسی عالم مثال سے نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر مادی رشتوں سے ہے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ جس انداز سے مادی حالات میں تغیر رونما ہوتے ہیں اسی انداز سے رنج و ماتم اور شادی و نغمہ کی کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں" ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ترقی پسند نقاد یہ نہیں بھولتے کہ خود ان کا احساس جمال مادی رشتوں اور رابطوں سے اثر پذیر ہوتا ہے"

سید احتشام حسین کے مجموعی تنقیدی افکار پتہ دیتے ہیں کہ ان کا ٹیکنیک اور مکمل اسلوب اور نقطہ نظر ہے ان کے ادبی نظریات ایسی تحریک ہیں جو معاشرے کو اجتماعی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کی طرف لے جانے میں ممد و معاون ہیں۔

احتشام کے تنقیدی افکار کا مطالعہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ ان کے نظریات و احساسات تمام تر کسی نظریہ حیات سے مستعار نہیں ہیں کیونکہ ان کے افکار کی لے میں برصغیر کے کلچر اور ادبی ثقافتی روایتوں کا بھرپور جاؤ نظر آتا ہے فطرت پرستی کے جوش میں وہ کبھی فن کا رد عمل قدروں اور حسن کاری کو مسترد نہیں کرتے۔ ان کی ابتدائی تحریریں قدرے جذباتیت لیے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک قسم کا نکھار اور ایک خاص یک رنگی ہے لیکن ذہنی ارتقا کا مرحلہ اول طے کرتے ہی ان کے یہاں سنبھل جانے والی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ مقصد یعنی۔ نظریہ۔ مواد ہئیت اور ٹیکنیک کے باہمی اشتراک کی اکائی کو پا لیتے ہیں۔ ان کی تنقید اور تنقیدی نظریات میں استقلال (CONSISTENCY) کے عنصر کو بڑی اہمیت حاصل رہے گی۔

شرف الدین ساحل ایم اے
شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج گلبرگہ

احتشام حسین : ایک مطالعہ

احتشام حسین ۲۱ر اپریل ۱۹۱۲ء میں قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے امتیازی نمبرات سے کامیاب کیا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۶۱ء تک لکھنؤ کے شعبۂ اردو، فارسی سے وابستہ تھے۔ ۱۹۶۱ء سے اپنی عمر کی آخری سانس تک یعنی یکم دسمبر ۱۹۷۲ء الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کے عہدہ پر فائز تھے۔ علاوہ ازیں ساہتیہ اکیڈمی، انجمن ترقی اردو اور ترقی اردو بورڈ کے ممبر بھی تھے۔ "ویرانے" اُن کی پہلی اور "تنقیدی نظریات" اُن کی آخری تصنیف تھی۔

احتشام صاحب نے آزادئ ہند کی جدوجہد کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ ترقی پسند جمہوری عناصر کو ہندوستان میں ایک نئے سانچے میں ڈھلتے دیکھا۔ مختلف گروہوں اور طبقوں کی کشمکش کا بغائر مطالعہ کیا۔ ان کا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا کہ "قوم کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اس کے سماجی نظام میں پیوست ہیں اور اُن کو اس سے الگ کر کے دیکھنا کبھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے جو جامد نہیں بلکہ متحرک ہے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ انسان فطرتاً بد نہیں بلکہ حالات اسے بگاڑتے اور سنوارتے ہیں۔ انسان دوستی ہماری اصل منزل ہے اور اسی کی بنیاد پر بین الاقوامی سطح پر دائمی امن قائم ہو سکتا ہے۔ اچھے انسان اور اچھے ادیب اس جانب رہنمائی کرتے رہے ہیں۔" احتشام صاحب نے بھی اپنی ساری عمر امن اور انسان دوستی کے پیام کی اشاعت میں صرف کی۔

(۲)

احتشام حسین اس دَور سے تعلق رکھتے ہیں جو اُردو زبان و ادب کا ایک انقلابی دور کہلاتا ہے۔ اس دَور میں زندگی کا ہر شعبہ انقلاب پذیر تھا۔ مروجہ قدریں دم توڑ رہی تھیں اور نئی قدریں اُن کی جگہ نمودار ہو رہی تھیں۔ وہ اس انقلابی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے سنجیدہ جذبۂ عدم تشدد کے ساتھ ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دیا۔

۱۹۳۵ء کے بعد ترقی پسند تحریک کو فروغ حاصل ہوا۔ ابتداً اس تحریک کو جوشیلے مبلغ ملے جنھوں نے ترقی پسندی کا ایک تنگ و ناقص فارمولا تیار کیا۔ اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، احمد علی، ممتاز حسین، سجاد ظہیر وغیرہ نے اس تحریک کو نئی تقویت اور معنویت عطا کی۔ احتشام صاحب اس تحریک کے امام کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اردو تنقید میں خیالات، تصورات اور اقدار سے بحث چھیڑی ہی نہیں بلکہ ان اقدار و تصورات کی تخلیق کرنے والے سماجی و تہذیبی عوامل کی تلاش کو رواج دیا۔

ترقی پسند تنقید نے ماضی کے ادب سے منہ پھیر کر اسے جاگیردارانہ نظام کی یادگار تصور کیا۔ میر و غالب کو قنوطی اور اقبال وغیرہ کو رجعت پسند قرار دیا۔ غرض صحت مند اور غیر صحت مند داخلیت، بے لاگ خارجیت، سماجی شعور، آفاقی شعور، طبقاتی شعور،

ثنالیت، سرمایہ داری، استحصال، فرسودہ کے نظام، مادیت، جدلیت، ترقی پسندی اور تغیر پذیری وغیرہ اصطلاحات نے جہاں مارکسی فلسفۂ تنقید کی ترجمانی کی وہاں ایسی الجھنیں پیدا کیں کہ بالآخر یہ تحریک ادبی طور پر بانجھ ہوگئی۔ عملی تنقید کو اس نے "کھوکھلا" سمجھا ہے۔
ان تمام اعتراضات کے باوجود ترقی پسند تحریک کے رول اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہر دور میں ایک نیا ذوقِ ادب اور تنقید میں ایک نیا لب ولہجہ جنم لیتا ہے۔ ہر طرزِ تنقید میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ ترقی پسند تحریک نے اردو تنقید کو علمی و سماجی آگہی بخشی اور ادب کا رشتہ مارکسی بصیرت سے اُستوار کیا۔

(۳)

ترقی پسند تحریک کے محاسن و معائب سے قطع نظر، ہمیں احتشام صاحب کی شخصیت کا مطالعہ کرنا مقصود ہے۔ احتشام صاحب ہمہ گیر ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ بظاہر ایک فرد تھے مگر کسی ادارہ سے کم نہ تھے۔ اُن کی ادبی زندگی کا آغاز شعروشاعری سے ہوا۔ انھوں نے شعر سُنے، شعر پڑھے اور بعض اوقات دل کی تسلی کے لیے شعر بھی کہے۔ اُن کے اشعار ذاتی و سوانحی قسم کے ہیں اور یہ اُن کی شخصیت کے شعری گوشے کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ مگر افسوس کہ یہ اشعار نایاب ہیں۔ البتہ غالبؔ، حالیؔ، اقبالؔ، جگرؔ اور مجازؔ وغیرہ پر لکھے ہوئے مضامین اُن کی سخن آزمائی و سخن فہمی کا پتہ دیتے ہیں۔
احتشام صاحب شاعر ہی نہیں بلکہ افسانہ نگار بھی تھے۔ "ویرانے" اُن کے افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے جو زندگی کے متنوع مسائل و سماجی حقائق کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ چاہے ان کی فنی صلاحیتیں اعلیٰ درجہ کی حامل نہ ہوں لیکن اُن کے افسانوں میں سرمایہ داروں کے مظالم، غریبوں کی خستہ حالی اور مزدوروں کی بے بسی کی بہترین تصویرکشی ملتی ہے۔ "بیزاری"، "مجبوریاں"، "دعوت"، "دوسرا نکاح" وغیرہ اُن کے عمدہ مقصدی افسانے ہیں۔
احتشام صاحب افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ایک کامیاب ترجمہ نگار بھی تھے۔ ترجمہ نگاری ایک فن ہے۔ ہر فن کی طرح یہ فن بھی خلوص، ریاضت اور مہارت چاہتا ہے۔ دونوں زبانوں پر عبور رکھنا، ترجمہ نگاری کی بنیادی شرط ہے۔ "لسانیات کا خاکہ" اور "ہماری سڑک" ایسے کامیاب اور خوبصورت ترجمے ہیں کہ اُن کی فنی صلاحیتوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

(۴)

احتشام صاحب جس میدان میں سب سے زیادہ مقبولِ عام ہوئے وہ تنقید کا میدان ہے۔ انھوں نے مختلف پہلوؤں سے اُردو تنقید کے گیسوؤں کو اُسی طرح سنوارا جس طرح مرزا غالب نے اُردو شاعری کو سنوارا تھا۔ وہ عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ منفرد فکر و مزاج رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو تنقید میں ایک نئی راہ نکالی۔ وہ ادب، زندگی اور تنقید میں اشتراکیت کے علمبردار تھے۔ وہ اشتراکیت کے مبلغ ہی نہیں بلکہ ادب شناس بھی تھے۔ انھوں نے ادب میں مارکس کے فلسفۂ جدلیت کی ترجمانی سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ادبی نقطۂ نگاہ سے کی تاکہ مارکسی تنقید پروپیگنڈہ نہ بن جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی تنقید اعلیٰ اخلاقی و انسانی قدروں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے انسانی فلاح و بہبود کے دائمی اقدار کو ادب میں جس مستقل مزاجی کے ساتھ اُبھارا اور نکھارا ہے وہ کسی کارنامہ سے کم نہیں۔ اُن کے مارکسی نقطۂ نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اُن کے علمی وقار، تنقیدی شعور اور حکیمانہ اسلوب سے کسی کو انکار ممکن نہیں۔ بقول ظ انصاری "تنقید کے قلم کو انھوں نے نہ نوکِ نشتر بننے دیا نہ حجام کا اُسترا۔ وہ اس سے صرف سرخ پنسل کا کام لیتے تھے"
احتشام صاحب آخر وقت تک اپنے نظریہ پر قائم رہے۔ یہ اُن کے شعور کی پختگی، کردار کی بلندی اور علم کی گہرائی و گیرائی کا بین ثبوت ہے۔ اُن کا مقصد مارکسی پروپیگنڈہ نہیں تھا بلکہ وہ ادب کا زندگی سے رشتہ جوڑنا چاہتے تھے۔ اردو ادب میں سب سے پہلے

انسانی عظمت کی تلاش، سماجی عوامل کی جستجو، عصری میلانات کی اہمیت، اور ادب و زندگی کے رشتہ کو نظریاتی وفاداری اور مبلغانہ جوش کے ساتھ احتشام حسین نے اجاگر کیا جو ہمارے لیے کسی احسانِ عظیم سے کم نہیں۔ اُن کے موضوعات میں تنوع اور وسعت ہے۔ انھوں نے نثر و نظم کے مختلف اصناف، تہذیب و رسم الخط، شخصیات و تاثرات اور آرٹ و زندگی کے متنوع مسائل پر علمی دیانت داری کے ساتھ لکھا لیکن اپنی تحریروں کو مبالغہ آمیزی و انتہا پسندی کا شکار ہونے نہ دیا۔

اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کے منصب کی اہمیت کو واضح کیا جو بظاہر کوئی آسان کام نہ تھا۔ تنقید کے منصب کا تعین بڑی صلاحیت و بصیرت کا تقاضا کرتا ہے۔ اُن کی شخصیت فنِ تنقید کے تقاضوں اور مطالبوں سے آگاہ تھی۔ انھوں نے تنقید کے فطری خد و خال کو نہایت حسن کے ساتھ ابھارا اور دلآویز بنایا۔ تنقیدی جائزے، روایت و بغاوت، تنقید اور عملی تنقید، ذوقِ ادب اور شعور، عکس اور آئینے، افکار و مسائل اور اعتبارِ نظر، احتشام صاحب کے قابلِ قدر تنقیدی مجموعے ہیں ایک طرف ادب اور اخلاق، اُدبی تنقید کے مسائل، 'ترقی پسند نقاد' اور 'مواد اور ہیئت' وغیرہ مضامین اُن کی انقلابی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں تو دوسری طرف 'سجاد ظہیر' 'اقبال' اور 'اختر شیرانی' وغیرہ مضامین تعصب اور جانبداری کی عکاسی کرتے ہیں۔ احتشام صاحب کی سہولت پسندی کہئے یا اُردو تنقید کی بدقسمتی کہ انھوں نے فنِ تنقید پر نہ کوئی مستقل کتاب لکھی اور نہ کسی فنکار پر کوئی مبسوط تنقیدی کتاب پیش کی۔

احتشام صاحب کسی مکتبۂ فکر کے بانی تو نہیں لیکن بلاشبہ وہ ادب میں مارکسی، سماجی یا اشتراکی تنقید کے امام کہے جا سکتے ہیں۔ بقول آلِ احمد سرور اُردو میں سماجی تنقید کے اصولوں کو سنجیدہ اور سائنسی طور پر برتنے میں انھیں اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے مارکسی کی جدلیاتی مادیت کی بنیاد پر ادب کی سماجی و اقتصادی تشریح کے مسلک کو محض اپنایا ہی نہیں بلکہ اس کی بڑی وفاداری کے ساتھ تبلیغ کرتے رہے۔ انھیں اپنے نظریہ کی بنیادوں پر غیر معمولی اعتماد تھا۔ انھوں نے جا بجا اپنے نظریہ کی صداقت اور اپنے موقف کی صحت پر مبلغانہ اصرار سے کام لیا ہے۔ دراصل وہ سماجی حقیقت نگار تھے اور ہر فنی تخلیق کا تجزیہ جدلیاتی مادیت کے معیار سے کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

بقول مجنوں: "ادب کے اس نئے تصور کی ابتدا مارکس کے فلسفہ سے ہوتی ہے۔ اور اس کا تعلق اس عالمگیر اقتصادی و تمدنی تحریک سے ہے جو اشتراکیت کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ مارکس مادہ کی اولیت کا قائل تھا۔ مادہ متحرک الذات ہے۔ حرکت مادہ کی فطرت ہے اور تغیر، انقلاب اور ترقی اس کی دائمی غایت ہے۔ حرکت مادی، ایک مسلسل اور غیر متناہی ارتقائی تاریخ ہے۔ مادہ کے اس نئے تصور کو اگر مان لیا جائے تو وہ تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں جو مادہ اور نفس، جسم اور روح، خارجی و داخلی، اور عملی و تصوری کے بے بنیاد امتیاز کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ مادہ اور شعور میں دراصل کوئی تضاد نہیں۔ شعور مادہ کے اندر موجود ہے۔ حقیقت وجود ہے اور شعور وجود کے تابع ہے۔ جوں جوں وجود ترقی کرتا اور سدھرتا جائے گا، شعور بھی اسی نسبت سے رچتا اور منزل بہ منزل زیادہ مہذب اور مکمل ہوتا چلا جائے گا۔ اب حیاتِ انسانی اور اس کے اقتصادی اور تمدنی نظام کو جدلیاتی روشنی میں دیکھا جائے تو ادب کے بارے میں چند نہایت واضح نتائج اُبھرتے ہیں ...... عام زندگی کی طرح ادب کی فطرت میں بھی تضاد نظر آتا ہے۔ ادب ایک ماحول کی مخلوق اور دوسرے ماحول کا خالق ہوتا ہے۔ اقتصادیات ادب کی اندرونی ترکیب میں داخل ہے لیکن ادب اقتصادیات کا غلام نہیں ہے۔ یہ بیک وقت ماضی کی یادگار، حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ترقی نام ہے تواتر کی تسلسل کا۔ ادب میں جبر و اختیار اور اجتماعی شعور و انفرادی ارادہ کے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ ادب جماعتی ہوتا ہے اور ماورائے جماعت بھی۔ ادب میں خارجی، داخلی،

نظری، عملی، مادی، تصوری، افادی اور ذوقی، تمام عناصر باہم شیر وشکر ہوتے ہیں۔ روایت اور انقلاب دونوں ادب کے مزاج میں داخل ہیں۔ فکر و اسلوب اس کی ترکیب میں اس طرح حلول ہوتے ہیں کہ ان کو پھر ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ غرض جدلیات ہی کا کرشمہ ہے کہ ادب میں اقتصادی، غیر اقتصادی ہو کر جمالیاتی ہو جاتا ہے۔" نہ مادہ کی حرکی ہونے سے کسی کو انکار ہے اور نہ زندگی کے تغیرات سے۔ مگر زندگی کے بعض پہلو ایسے ہیں جو کبھی نہیں بدلتے جنھیں بنیادی اخلاقی قدریں کہا جا سکتا ہے۔ اشتراکیت بھی ایک اخلاقی قدر ہے لیکن اشتراکی زاویہ نظر اپنے تمام حکیمانہ پیچ و خم کے باوجود "اقتصادیات" کو زندگی کا منتہائے نظر ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

احتشام صاحب کی سب سے بڑی خوبی اُن کا احساسِ ذمہ داری ہے وہ بغیر مطالعہ و مشاہدہ کے قلم نہیں اُٹھاتے۔ اُن کی نظر میں فن کا مقصود صرف مواد ہے اور ہیئت محض وسیلہ۔ ادب و فن کے اس پیچیدہ مسئلہ کی انھوں نے بڑی قطعیت کے ساتھ تشریح کی ہے۔ اُن کے خیال میں حقیقت اشتراکی تصور میں محدود ہے۔ اُن کے نزدیک فن کی عظمت، فن کی ہئیت سے نہیں بلکہ فن کے فلسفیانہ معیار سے متعین کی جا سکتی ہے۔ ہیئت اور مواد کے تعلق کے سوال پر "جمالیات" کو معیار بنانے کی بجائے "جدلیات" کو وہ اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ ادب کی روحانی بنیاد سے انکار کے باوجود وہ زندگی کے حسن و افتد ار سے روشناس نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادبی اصولوں سے زیادہ سماجی ضرورتوں پر زور دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کے بعض مضامین ادبی تنقید کی بجائے عمرانی تجزیہ معلوم ہوتے ہیں۔ "اشتراکی جدلیت" اُن کی سب سے بڑی جذباتی کمزوری ہے۔ "حکیمانہ نقطۂ نظر" کے لفظ سے انھیں بڑا جذباتی لگاؤ ہے۔ آخر یہ حکیمانہ انداز نظر ہے کیا؟ تاریخ کی مارکسی تعبیر؟ ادب کا مادّی تصور؟ فنی تخلیقات کا سماجی تجزیہ؟ میری رائے میں حکیمانہ نقطہ نظر سے احتشام حسین کی مراد یہی کچھ ہے۔ اشتراکی تحریک کو ادبی سطح پر تسلیم کرانے میں احتشام صاحب نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

(۵)

ذیل کے اقتباسات جہاں احتشام صاحب کے ادبی موقف و تنقیدی نقطۂ نظر کے عکاس ہیں وہاں اُن کی عظمت کے بھی ترجمان ہیں۔

(۱) ادبی موقف:۔ "ان مضامین میں ایک حکیمانہ شعور کو رہنما بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں۔" (دیباچہ تنقیدی جائزے)

(۲) مواد اور ہیئت:۔ "ترقی پسند ادب کا زاویۂ نظر مواد اور ہئیت کے تعلق کے بارے میں بہت واضح ہے۔ وہ تمام شعرا اور نقاد جو زندگی کو نامیاتی مانتے ہیں، جو مقدار سے خصوصیتوں کے بدلنے کے قائل ہیں، جو شاعر کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں۔ جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آلہ سمجھتے ہیں اور جو تمدن کو عام کرنا اور فنونِ لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے۔" (مقالہ مواد اور ہئیت)

(۳) جدلیاتی ادب:۔ "ادب کی یہ حیثیت کہ اس میں سماجی حقائق اپنی طبقاتی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور ادیب کے سماجی رجحان کا پتہ اس کے خیالات سے چلتا ہے۔ ادیب زندگی کی کشمکش میں شریک ہو کر اسے بہتر بنانے کی راہ بتا سکتا ہے۔"

(تنقیدی نظریات)

(۴) تنقید نگاری:۔ "تنقید جب حقیقت کے عام اور سطحی مفہوم سے گزر کر حقیقت کے ہر شعبہ کو اس کے مثبت اور منفی اثرات کو اس کے مادی اور نفسیاتی وجود اور تعلق کو گھیر لیتی ہے تو اسے اشتراکی حقیقت نگاری کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں فرد کا تجزیہ ایک باشعور سماجی انسان کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔" (روایت اور بغاوت)

(۵) فرائض نقاد:۔ "ادب کی تخلیق و تنقید کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے کہ نقاد بھی ادیب کے خیالات کی

بنیاد کو ڈھونڈ کر اس کی ادبی کاوشوں پر اعلیٰ ادبی رنگ میں اظہارِ خیال کرے اور ادیب کے سماجی شعور کا جائزہ لے۔ فن کی نزاکتوں پر نگاہ ڈالے اور عام پڑھنے والوں کی رہنمائی کرے۔ اگر کوئی نقاد اس سے بچتا ہے تو وہ تنقید کا حق ادا نہیں کرتا۔

(تنقید اور عملی تنقید)

(۶)

احتشام حسین صاحب کا اسلوب اُردو تنقید کے لیے ایک حقیقی دین ہے۔ اُن کا اسلوب بڑا حکیمانہ، سائنٹفک اور شگفتہ ہے۔ وہ تخلیقی تنقید کے حامی ہیں۔ ان کی نثر معنی خیز ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی صاف ستھری ہے۔ اُن کا پیرایۂ اظہار علمی اور اُن کا طرزِ تحریر بہت سنجیدہ، متین، ہموار اور اُستوار ہے۔ اُن کے بیان میں سادگی اور ان کے انداز میں ادبیت ہے۔ اُن کی تنقیدی تحریریں جہاں اُن کی ادبی بصیرت کی پیداوار ہیں، وہاں اُن کے اسلوبِ نگارش کا بھی دلکش نمونہ ہیں۔

غرض احتشام صاحب کی تنقیدی اہمیت مارکسی حدود میں محصور نہیں۔ انھوں نے اُردو تنقید کے فکر و فن میں کئی اضافے کیے ہیں۔ نظریاتی مباحث اُن کا خاص عطیہ ہیں۔ ادب اور سماج نظریہ اور کردار کے ناگزیر ربط کو انھوں نے اُجاگر کیا ہے۔ عہدِ حاضر کے ادبی رجحانات و تحریکات کی انھوں نے رہنمائی کی ہے۔ فن، فنکار اور قاری کے رشتوں کو متعین کرنے کے لیے مارکس کے جدلیاتی پیمانہ کو استعمال کیا ہے۔

جدید نقادوں میں احتشام صاحب کو اپنی علمی و تنقیدی بصیرت کے باعث ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اکثر و بیشتر اردو تنقید شعری تنقید رہی ہے۔ اس نے شعری مسائل سے بحث تو ضرور کی ہے لیکن نثر کو بڑی حد تک یتیم بنا دیا ہے۔ احتشام صاحب نے نہ صرف اس یتیم کی سرپرستی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی بلکہ اِسے ایک معتدلانہ مزاج، اور متوازن لب و لہجہ عطا کیا۔

روایت اور بغاوت

صفحہ ۱۲۱: "کوئی نقاد اپنے عہد سے اتنا بلند نہیں ہو سکتا کہ وہ شعر و ادب کی تمام مروجہ روایتوں سے رشتہ توڑ لے اور بالکل نئی روایتیں پیش کردے۔ یہ کسی حد تک اسی وقت ممکن ہے جب سماج کا کوئی اہم حصّہ عصری روایات سے بیزار ہو جائے اور تاریخ اس بیزاری کے لیے وجہ جواز بھی مہیا کردے۔ ضرورت یا ضرورت کا احساس مادی حالات کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور وہی شعور رکھنے والے ادیبوں اور نقادوں کو نئی راہ پر چلنے اور نئی منزل کی جانب اشارہ کرنے کی طاقت بخشتا ہے ادبی تنقید کی صلاحیت براہ راست اس عالم شعور کا ایک عکس ہوتی ہے جو سماج میں پیدا ہو جاتی ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ادبی تنقید کی ترقی یافتہ شکل میں پائی جائے اور زندگی کے دوسرے مظاہر کو جانچنے اور پرکھنے کے طریقے بالکل ناقص یا ابتدائی صورت میں ہوں۔ سماج جتنا پیچیدہ ہوتا جائے گا۔ تنقید کے آلے اتنے ہی تیز ہوتے جائیں گے۔"

ظر سلام سندیلوی

پروفیسر سید احتشام حسین کی
تنقید میں عوام کی اہمیت

پروفیسر سید احتشام حسین کی تنقید کا غائر مطالعہ اس امر کو منکشف کرتا ہے کہ ان کی توجہ کا مرکز عوام ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں
ہ اپنی تنقید میں سماج پر بھی زور دیتے ہیں مگر یہ سماج افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کے سماج میں شہنشاہ، بادشاہ، امیر، وزیر، جاہ پرست
سرمایہ پرست کا گزر نہیں ہے بلکہ ان کی تنقید کے دائرے میں کسان، مزدور، مفلس، محتاج اور پیشہ ور لوگ داخل ہوتے ہیں جن کی ترقی
بہبودی کے وہ خواہاں ہیں۔

چونکہ پروفیسر سید احتشام حسین ایک ترقی پسند نقاد ہیں اس لیے ان کے خیالات پر کارل مارکس کی گہری چھاپ ہے۔ مارکس نے
م کی بہبودی اور ان کی ترقی پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ اس کے دائرہ فکر میں بورژوا طبقہ داخل نہیں ہو سکتا ہے بلکہ وہ پرولتاریا
ہ کے مفاد پر غور کرتا ہے۔ اسی لیے اس نے غیر طبقاتی نظام (CLASSLESS SOCIETY) پر زور دیا ہے جس میں
انسان سکون کی سانس لے سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سیاسی مفکرین نے ہر دور میں عوام کے مفاد کی بحث چھیڑی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی سیاسی مفکر کے یہاں
م کھل کر سامنے آگئے ہیں اور کسی کے یہاں وہ پس پردہ رہے ہیں۔ مگر کسی سیاسی مفکر نے عوام کو یکسر نظر انداز نہیں کیا ہے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے پہلے سیاسی مفکر افلاطون (۴۲۷ ق م — ۳۴۷ ق م) نے جمہوریہ (REPUBLIC)
شکیل کا تصور پیش کیا مگر اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اس کے دور میں یونان میں مختلف جمہوری ریاستیں قائم تھیں جن میں باہم اختلاف
ا تھا۔ اسی اختلاف کی بنا پر ایتھنس اور اسپارٹا میں ٹروجن جنگ (TROJAN WAR) ہوئی۔ جو دس سال تک جاری رہی۔
لیے ہر ریاست کے باشندے اپنی ریاست کی ترقی کے لیے کوشش کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ افلاطون نے ایتھنز میں مثالی جمہوریہ کے
م کا تصور پیش کیا۔ اس کے باوجود اس نے افراد کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ اچھی اور مضبوط ریاست کے لیے
ت کش طبقے (PRODUCERS) کی محنت ضرورت ہے۔ لیکن افلاطون کی نظر میں محنت کش طبقے کا مفہوم بہت وسیع ہے
طبقے میں مالکان جائداد، تجار، کاشتکار، دوکاندار اور دستکار وغیرہ شامل ہیں۔ افلاطون نے اس بات کو بھی واضح کر دیا کہ
ت کی تقسیم اس طرح نہ ہو کہ کچھ لوگ مالدار ہو جائیں اور کچھ مفلس رہ جائیں۔ کیونکہ اس طرح طبقاتی جنگ (CLASS WAR)
ہ جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ ہم اس موقع پر غور کر سکتے ہیں کہ کارل مارکس سے قبل افلاطون نے غیر طبقاتی نظام کی بنیاد ڈال دی تھی۔
اطون کے نظریات کا عکس واضح طور پر کارل مارکس کے یہاں نظر آتا ہے۔

افلاطون نے ریاست کا منظم نظریہ (THEORY OF ORGANIC STATE) پیش کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے

کہ مختلف اعضا کا جو تعلق جسم سے ہے وہی تعلق شہریوں کا ریاست سے ہے اس نے واضح طور پر یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جمہوریہ کا قیام عوام کی بہبودی کے لیے ہونا چاہیئے۔ غرضیکہ دنیا کے پہلے سیاسی مفکر نے عوام کی بہبودی کا خیال رکھا ہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں سائنس نے زبردست ترقی کی اس لیے ریاست کے متعلق یونان کا منظم نظریہ باطل قرار دیا گیا بلکہ ریاست کا مشینی نظریہ منظر عام پر آیا۔ ڈیکارٹس (DESCARTES) نے کہا کہ ریاست ایک مشین کی حیثیت رکھتی ہے اور شہری اس مشین کے پرزے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے افراد کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ انگلینڈ کے سیاسی مفکر ٹامس ہابس (THOMAS HOBBES) (۱۵۸۸ء ـ ۱۶۷۹ء) نے اس نظریہ کو اور آگے بڑھایا۔ اس نے انفرادیت (INDIVIDUALISM) پر زور دیا ہے۔ اس نے کہا کہ قوانین اسی قسم کے ہوں جو افراد کی خواہشات کی تکمیل کریں۔ اس کی نظر میں اجتماعی مفاد کی کوئی اہمیت نہیں ہے اگرچہ اس نے ریاست کے وجود کو تسلیم کیا ہے مگر وہ افراد اور ریاست کے مابین ایک قسم کے معاہدے (CONTRACT) پر یقین رکھتا ہے جس میں فرد کی اہمیت زیادہ ہے۔ دراصل ہابس کا نظریہ اسٹیوارٹ بادشاہ کے ظلم کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ اسی ظلم و ستم کی بنا پر چارلس اول (۱۶۲۵ء ـ ۱۶۴۹ء) کو پھانسی دی گئی اور جیمس دوم (۱۶۸۵ء ـ ۱۶۸۸ء) کو انگلینڈ چھوڑنا پڑا۔

انگریز مفکر جان لاک (JOHN LOCKE) (۱۶۳۲ء ـ ۱۷۰۴ء) نے ہابس کی ہم نوائی کی ہے۔ اس کا بھی قول ہے کہ افراد اور ریاست میں ایک طرح کا معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدے کی روشنی میں ریاست کا فرض ہو جاتا ہے کہ عوام کی بہبودی کا مکمل طریقے سے خیال رکھے۔ اس کا یہ بھی قول ہے کہ ریاست کے قوانین کو ربانی قوانین (DIVINE LAWS) اور فطری قانون (NATURAL LAWS) کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اگر اس قسم کی ریاست کا قیام ہوگا تو افراد مساوی حقوق حاصل کر لیں گے۔

جریمی بینتھم (JEREMY BENTHAM) (۱۷۴۸ء ـ ۱۸۳۲ء) بھی انگلینڈ کا ایک سیاسی مفکر گزرا ہے۔ اس نے ہابس اور لاک کی طرح انفرادیت پر زور نہیں دیا۔ کیونکہ انگلینڈ میں ہنوویرین خاندان کے عہد تک انفرادیت کی فتح ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کے فلسفہ نے ایک اور قدم آگے بڑھایا اس نے "دبستانِ افادیت" (UTILITARIAN SCHOOL) کی بنیاد ڈالی۔ اس کا قول ہے کہ ریاست کو ایسے قوانین منضبط کرنا چاہیے جن سے افراد کو مسرت اور لذت حاصل ہو۔ اس کا نظریہ "فلسفۂ لذتیت" (HEDONISM) سے بہت قریب ہے۔

جان اسٹوارٹ مل (JOHN STUART MILL) (۱۸۰۶ء ـ ۱۸۷۳ء) انگلینڈ کا ایک ذہین سیاسی مفکر ہے۔ اس نے افادیت پسندی کے نظریہ کی مزید ترویج کی۔ یہی نہیں بلکہ مخالفین کے اعتراضات کی روشنی میں اس نے اس میں ترمیم بھی کی۔ مثلاً کارلائل نے اعتراض کیا تھا کہ افادیت پسندی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ فلسفۂ لذتیت بذات خود کوئی بلند فلسفہ نہیں ہے مگر مل نے کہا کہ انسان کی بہت سی مسرتیں اعلیٰ وارفع ہوتی ہیں جو اس کو لذت بخشتی ہیں۔ اس لیے یہ جذبہ قابل طعن و تشنیع نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مسرتوں میں کیفیتوں کے اعتبار سے فرق بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارا مقصد اعلیٰ مسرتوں کا حصول ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ سڈوک (SIDWICK) نے اعتراض کیا کہ مسرتیں کمیت کے اعتبار سے فرق رکھتی ہیں مگر کیفیت کے اعتبار سے یکساں ہوتی ہیں لیکن مل نے جواب دیا کہ مسرتوں کو خارجی نقطۂ نظر سے جانچنا مشکل ہے۔ اس لیے کمیت کے اعتبار سے مسرتوں میں تفریق کرنا مہمل بات ہے۔

ان مفکرین کے بعد سیاسی خیالات میں کچھ تغیر واقع ہوا۔ چونکہ اس دور میں سائنس نے کافی ترقی کی اس لیے ہر ملک میں جذبۂ مقابلہ پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس دور میں صنعتی ترقی بھی ہوئی جس نے قومیت کے جذبات کی لہروں کو زور سے گتھا دیا مگر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اس دور میں فرانسیسی انقلاب (۱۷۸۹ء ـ ۱۷۹۳ء) رونما ہوا جس نے خیالات کی دنیا بدل دی

اب اس دور کے مفکرین نے کہا کہ ریاست ایک مشین نہیں ہے اور نہ ریاست کا مقصد حصولِ مسرت ہے۔ بلکہ ریاست قوم کی تجسیم (EMBODIMENT) کا نام ہے۔ یہ ایک زندہ وجود (LIVING ORGANISM) ہے۔ مگر اس وجود کے احساس کے لیے خود آگاہی (SELF CONCIOUSNESS) کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اسی بنا پر رضائے عام (GENERAL WILL) کا تصور منظر عام پر آگیا۔ اس نظریے کا علمبردار روسو (ROUSSEAU) (۱۷۱۲ء۔ ۱۷۷۸ء) تھا جو جنیوا میں پیدا ہوا تھا مگر بعد میں فرانس آ گیا۔ اس پر فرانس کی معاشرتی اور معاشی حالات کا اثر پڑا۔ اس نے فرانسیسی انقلاب سے قبل ہی اپنے خیالات سے فرانسیسیوں کو متاثر کیا تھا۔ اس کے نظریات اس کی تصنیف معاشرتی معاہدہ (SOCIAL CONTACT) میں موجود ہیں۔ اس نے اس نکتے کو واضح کیا کہ عوام اپنی رضا کی بنا پر ریاست سے ایک معاشرتی معاہدہ کرتے ہیں۔ رضائے عام سارے شہریوں کی رضا ہوتی ہے۔ اس رضائے عام کو فرمانروا (SOVEREINGTY) کی قوت حاصل ہونا چاہیئے۔ اس کا یہ بھی قول ہے کہ چونکہ ریاست کی تشکیل رضائے عام کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ اس لیے شہریوں کا فرض ہے کہ وہ قانون کا احترام کریں۔ بہرحال روسو نے رضائے عام کے اصول کی ترویج کی ہے اور اس طرح عوام کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

فرانس کے علاوہ جرمنی میں بھی عظیم مفکر گزرے ہیں۔ چنانچہ کانٹ (KANT) (۱۷۲۴ء۔ ۱۸۰۴ء) اپنے عہد کا ایک مشہور و معروف سیاسی مفکر تھا۔ اس پر روسو کے خیالات کا اثر واضح طور پر ثبت ہے۔ کانٹ نے سیاسی مسائل کو اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا اور اخلاقی خواہش کی خود اختیاریت (AUTONOM OF MORAL WILL) کو فروغ دیا۔ اس نے آزادی کو شہریوں کے لیے پیدائشی حق قرار دیا مگر وہ اس آزادی کے تعہد کا قائل تھا جس کی تشکیل عالمی اصولوں کی روشنی میں کی گئی ہو۔ کانٹ نے شخصیت کے احترام پر زور دیا اور بتایا کہ اس کی تکمیل کے لیے آزادی اور مساوات کی فضا ضروری ہے۔

جب فرانسیسی انقلاب کے بعد اس ملک میں جمہوریہ قائم ہوگئی تو اس کا زبردست اثر جرمنی پر پڑا۔ اس عہد میں جرمنی مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا جن کی تعداد تقریباً انتالیس تھی۔ ان میں سب سے مشہور ریاست پروشیا (PRUSSIA) کی تھی۔ ان ریاستوں پر الگ الگ بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ جب فرانس میں جمہوریت کو فروغ حاصل ہوا تو جرمنی کے باشندوں کے دل میں بھی آزادی اور قومیت کے جذبات انگڑائی لینے لگے۔ وہاں کے پروفیسروں اور طالب علموں نے ایک تنظیم قائم کی۔ جس کا نام BURCHES CHART تھا۔ اس تنظیم کا مقصد حصولِ آزادی تھا۔ اس انجمن کا جلسہ واٹ برگ میں ہوا مگر آسٹریا کے وزیر مٹرنک (METTRINCH) نے اس جماعت کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس جماعت کے خلاف آسٹریا کا بادشاہ فریڈرک ولیم سوم بھی تھا۔ اس نے کارلس باڈ (CARLSBAD) میں ۱۸۱۹ء میں کانفرنس کی اور نیو یونیورسٹیوں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وہاں کی آزادی کی تحریک کچل دی گئی مگر جرمنی کے سیاسی مفکروں نے اپنے خیالات اور نظریات سے اس ملک میں ہلچل مچا دی۔ ان مفکرین میں فشتے (FICHTE) (۱۷۶۲ء۔ ۱۸۱۴ء) اور ہیگل (HEGEL) (۱۷۷۰ء۔ ۱۸۳۱ء) بہت مشہور ہیں۔ ان دونوں میں بھی ہیگل نے دنیا کے سارے مفکرین کو متاثر کیا ہے۔

ہیگل نے "روح اور جدلیات" (SPIRIT AND DIALECTIC) کے عنوان سے کچھ اہم خیالات پیش کیے ہیں۔ اس کے خیالات پر عینیت کا رنگ غالب ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ کائنات ایک مربوط وحدت ہے، جس میں خیال (IDEA) یا روح (SPIRIT) یا عقل (REASON) یا الٰہی دماغ (DIVINE MIND) ایک حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دنیا کی ہر شے اسی روح کی تخلیق ہے۔ روح مختلف مدارج کی منزلوں سے گزرتی ہے یہاں تک کہ وہ کامل (ABSOLETE) ہوگئی ہے۔ اس نے روح کو عقل سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ عقل حقیقت ہے اور حقیقت عقل ہے اس لیے وہ عقل کو سارے کائنات کا فرمانروا (SORAREIGN) ...

تصور کرتا ہے۔ ہیگل کے ان خیالات پر افلاطون کی عینیت غالب ہے۔

ہیگل نے تاریخ کے بارے میں بھی اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ارتقا کے عالم کے آغاز میں عقل سلیم سے محروم تھی۔ مگر جب وہ تاریخ عالم سے گزری تب اس کو زیادہ سے زیادہ علم حاصل ہوا یہاں تک کہ وہ عرفان کل پر قابض ہوگئی۔ اور پھر آخر میں کامل (A BSOLETE) ہوگئی۔ اس نے تاریخ کے لیے ایک حسین جملہ استعمال کیا ہے "تاریخ کائنات میں روح کے سفر کی داستان ہے" اس مسلسل تغیر کے اظہار کے لیے اس نے ایک اصطلاح ایجاد کی ہے جس کا نام اس نے جدلیات (DIALECTIC) رکھا ہے۔

ہیگل نے ریاست کے بارے میں بھی اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اس کا قول ہے کہ روح کائنات کی مختلف اشیا کی صورت میں نمودار ہوتی ہے تاکہ اس کو خود آگہی حاصل ہو۔ اس طرح وہ غیر جسمانی دنیا سے جسمانی دنیا میں قدم رکھتی ہے۔ اور ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزرتی ہوئی انسان کے پیکر میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ انسان اس دنیا میں تنہا نمودار نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک جماعت ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلی جماعت خاندان ہے۔ جس کو وہ مترادف (THE...) کہتا ہے۔ اس کے بعد انسان خاندان سے نکل کر معاشرہ میں داخل ہوتا ہے۔ جس میں خاندان سے مختلف قسم کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ اس کو وہ متضاد (ANTITHESIS) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ آخر میں ایک تیسرا ادارہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس میں خاندان اور معاشرے کے بہترین عناصر شامل ہوتے ہیں۔ یہ ادارہ ریاست ہوتا ہے۔ اس کو وہ امتزاج (SYNTHESIS) کے نام سے پکارتا ہے۔ اس لیے ہیگل کی نظر میں ارفع ترین ادارہ ریاست ہے۔ دراصل ہیگل نے ریاست کو پراسرار بلندی (MYSTICAL HEIGHT) تک پہنچا دیا ہے۔ اس نے یہاں تک لکھا ہے کہ "ریاست زمین پر خدا کا سفر ہے" اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ریاست کی اہمیت کو مبالغہ آمیز طریقے پر بیان کیا ہے۔ مگر اس ارفع و اعلیٰ ریاست کے شہری بھی بلند ہوں گے۔ دراصل ریاست کو بلند کر کے ہیگل نے افراد کے مرتبے کو بھی بلند کیا ہے۔

گرین (۱۸۳۶ء - ۱۸۸۲ء) ایک انگریز مفکر ہے۔ مگر اس پر ہیگل بڑی حد تک حاوی ہے۔ اس لیے اس نے عقل کی ربانی روح کو تسلیم کیا ہے۔ اس نے ریاست کو بھی اہم ترین ادارہ قرار دیا ہے مگر گرین اپنی جگہ پر انفرادیت پسند بھی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انگلینڈ میں ہیگل کے نظریات پسند نہیں کیے گئے۔ ہیگل کے نظریات کی صرف بوسانکویٹ (BOSANQUET) اور بریڈلے (BRADLEY) نے تعریف کی مگر عام طور سے انگریز اس کے خلاف تھے۔ اس لیے گرین کے لیے یہ ضروری تھا کہ افراد کی اہمیت کو بھی تسلیم کرے۔ اسی بنا پر اس نے کہا کہ ریاست کے قیام کا مقصد عوام کی بہبودی ہے۔

ہیگل کے بعد جرمنی کا مشہور مفکر کارل مارکس (۱۸۱۸ء - ۱۸۸۳ء) گزرا ہے وہ صرف جرمنی ہی کا مفکر نہیں ہے بلکہ اس کا شمار دنیا کے اعلیٰ ترین مفکرین میں کیا جاتا ہے۔ کارل مارکس پر ہیگل کے کسی نہ کسی حد تک اثرات قائم ہیں مگر اس کی کامیابی کے اور بھی اسباب ہیں۔

دراصل مارکس کا زمانہ طبیعی اور تکنکی کامیابی کا دور ہے۔ اس سے بہت قبل انگلینڈ میں سترھویں صدی عیسوی میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں وہاں صنعتی انقلاب واضح طور پر رونما ہوا۔ مثلاً ۱۷۳۳ء میں جان کے (SOHN KEY) نے حرکت کرنے والی شٹل ایجاد کی جس سے سوت کاتنے میں مدد ملی۔ ۱۷۶۴ء میں انگلینڈ کے ایک جولاہے ہارگریوز (HARGRAVES) نے سوت کاتنے کی مشین بنائی جس کا نام اس نے جینی رکھا۔ ۱۷۶۹ء میں انگلینڈ کے ایک نائی آرک رائٹ (ARKWRIGHT) نے ایک آبی مشین سوت کاتنے کے لیے بنائی جو جینی سے بہتر تھی۔ اس کے بعد کرامپٹن مشین ایجاد ہوئی۔ غرضیکہ روئی کی صنعت نے بہت ترقی کی۔ ۱۷۶۹ء میں جیمس واٹ نے بھاپ سے چلنے والا انجن بنایا۔ اس زمانے میں لوہے کا استعمال کافی بڑھ گیا۔ لوہے اور کوئلے

کا فقہ کے پاس بہت سے کارخانے کھل گئے۔ خصوصاً شیفلڈ اور برمنگھم میں عالیشان کارخانے قائم ہوئے۔ کچھ ہی وقت کے بعد امریکہ کے باشندے وٹنے (WHITENEY) نے کپاس سے بنولا جدا کرنے کی مشین بنائی۔ اس کے علاوہ کاشتکاری اور برتن سازی میں بھی ترقی ہوئی۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کے لیے سڑکیں، نہریں اور ریلیں بنائی گئیں۔ ۱۸۲۵ء میں پہلی بار اسکاٹ لینڈ میں بھاپ کے انجن سے ریل گاڑیاں کھینچنے کا کام لیا گیا۔ پھر جہاز بھی بھاپ سے چلنے لگے۔ اس طرح انیسویں صدی عیسوی میں صنعت و حرفت اور مشین کی انڈسٹری نے بے حد ترقی کی۔

صنعتی دور کے علاوہ مارکس کا دور عقلی (RATIONAL) دور ہے اس دور میں سائنس نے بے حد ترقی کی۔ سولھویں صدی عیسوی میں قطب نما اور دوربین کی ایجاد ہوئی۔ اس دور میں جغرافیہ اور نجوم کے بارے میں دریافتیں ہوئیں۔ اس عہد میں زمین کی کشش کا راز معلوم کیا گیا۔ علم حساب، علم کیمیا اور علم الابدان میں کافی ترقی ہوئی۔ سائنس کی اس ترقی کی وجہ سے انسان ہر معاملہ میں عقل سے کام لینے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسی دور میں مذہب پر زوال آ گیا۔ مارکسی دور میں تہذیب اور کلچر پر بھی زوال آیا۔ نازک احساسات اور جذبات کے پھول مرجھا کر رہ گئے۔ ذوق اور وجدان کے شگوفوں پر اوس پڑ گئی۔ سارا زمانہ مادیت کی لپیٹ میں آ گیا۔ اب ہر شے کو مادی اور افادی نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا۔

چونکہ کارل مارکس کے عہد میں انڈسٹری اور سائنس کی ترقی کی بنا پر کارخانوں اور فیکٹریوں کا جال بچھ گیا جن میں ہزاروں اور لاکھوں مزدور کام کرنے لگے۔ اس لیے سرمایہ دار اور محنت کش طبقے کے درمیان کشمکش کی بنیاد پڑ گئی۔ اس کشمکش سے مارکس نے فائدہ اٹھایا۔ وہ دراصل مزدوروں کے لیے ایک مادی پیغمبر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے مزدوروں کو بیداری کا پیغام دیا۔ اس نے بتایا کہ مزدور لوگ گھاٹے میں ہیں۔ کیونکہ اصل منافع مالکان تک حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح مارکس نے نہایت واضح طور پر دو طبقے الگ الگ کر دیے۔ ایک بورژوا طبقہ (BOUR GEOISIE) دوسرا پرولتاری طبقہ (PROLTARIAT) اس نے پرولتاری طبقے کی حمایت کی۔

مارکس نے اپنا مادی نظریہ ہیگل کی مدد سے تیار کیا۔ اس نے جدلیاتی مادیت (MATERIALISM) کا فلسفہ پیش کیا اور میکانکی نظریہ کو مسترد کر دیا۔ میکانکی نقطہ نظر کے مطابق مادہ ماحول کے تحت ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے مگر مارکس نے بتایا کہ مادہ مجہولی (PASSIVE) نہیں ہے بلکہ حرکی (ACTIVE) ہے۔ وہ اپنی فطرت کے تحت بذات خود حرکت کرتا ہے اور جماعت کی تکمیل کی جانب بڑھتا ہے۔ اس سے قبل ہیگل نے بھی کہا تھا کہ مادہ حرکی ہے مگر اس کا قول تھا کہ وہ روح کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

مارکس نے تاریخی مادیت (HISTORICL MATERIAIS) کے بارے میں بھی اپنا فلسفہ پیش کیا ہے۔ دراصل یہ تاریخ کی اقتصادی تاویل ہے۔ اس نظریے کے مطابق تاریخ کے سارے مظاہر اقتصادی محور کے گرد گردش کرتے ہیں۔ کارل مارکس کا تصور سیاسی اور معاشی فلسفہ میں ایک زبردست اضافہ ہے۔ اس نے اپنے نظریات کو منضبط کرنے کے لیے کچھ نکات پیش کیے ہیں۔ اس کا قول ہے کہ انسان کو زندگی کے لیے خوراک کی ضرورت ہے۔ خوراک کو حاصل کرنے کے لیے پیداوار بہت ضروری ہے۔ مگر پیداوار کسی تنہا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ اجتماعی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس اجتماعی کوشش کی بنا پر سوسائٹی کی تشکیل ہوتی ہے۔ چونکہ سوسائٹی میں مختلف خیالات کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے نظریات میں تصادم واقع ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک طبقہ دوسرے طبقے کو کچل کر اپنا اقتدار جما لیتا ہے۔ اس لیے ایک طبقہ نفع رساں (EXPLOITER) بن کر ابھرتا ہے اور دوسرا طبقہ (EXPLOITED)

ہوجاتا ہے۔ اس بنا پر طبقاتی جنگ (CLASS WAR) چھڑ جاتی ہے۔ در اصل مارکس نے مادی وسائل کو زندگی کی بنیاد کا دولت تصور کیا ہے۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سارے سماجی سیاسی اور ذہنی تعلقات، سارے مذہبی اور قانونی طریقے اور سارے نظریاتی مباحث جو تاریخ کے پردے سے نمودار ہوتے ہیں۔ مادی حالات کی روشنی میں قائم ہوتے ہیں۔

مارکس کا اقتصادی تجزیہ (ECONOMIC ANALYSIS) بھی بہت اہم ہے۔ جو ریکارڈو (RICARDO) کے اصول کی توسیع ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز کی قیمت کا اندازہ اس میں صرف کی ہوئی محنت کی روشنی میں لگانا چاہیے۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مالک کی اصل چیز کی قیمت نکل آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مزدوروں کو ان کی محنت کا ثمرہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ جو ان کے بیوی بچوں کے کام آتا ہے۔ مارکس نے اس اصول کا نام قدر زائد (SURPLUS VALUE) رکھا ہے۔ اس کا قول ہے کہ فیکٹریوں اور ملوں میں مالک اصل چیز کی قیمت نکالنے کے بعد بھی مزدور سے کام لیتے رہتے ہیں۔ اس طرح مزدور تناسب سے زیادہ کام کرتا ہے مگر اس کو فائدہ محنت کے لحاظ سے کم پہنچتا ہے۔ مارکس کے اس نظریہ نے اس کو عالمی شہرت کا مالک بنا دیا۔ چونکہ اس دور میں مالکوں اور مزدوروں میں تنازعہ شروع ہوگیا اس لیے مارکس کے نظریے کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس وقت اس کے نظریات ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ہر ملک میں مارکسی خیالات کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

سیاسی مفکرین کے ان نظریات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عوام کی اہمیت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ کبھی عوام کو ایک جسم کے مختلف اعضا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کبھی ان کو ایک مشین کے پرزوں کی شکل میں دیکھا گیا ہے۔ کبھی ان کا تجزیہ افادیت پسندی کی روشنی میں کیا گیا ہے اور کبھی ان کی رضائے عام پر ریاست کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ غرضیکہ ہر حال میں عوام کی ترقی اور بہبود کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ خصوصاً کارل مارکس نے کچلے ہوئے طبقے کے مفادات کے لیے ایک فلسفۂ حیات مرتب کیا ہے اور مزدوروں کی ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا ہے۔

چونکہ پروفیسر سید احتشام حسین ایک ترقی پسند نقاد ہیں۔ اس لیے ان کو عوام سے ہمدردی ہے۔ عوام سے ہمدردی کا اظہار انھوں نے کارل مارکس کے اصولوں کی روشنی میں کیا ہے۔ انھوں نے پست اور مفلس طبقے کی ترقی کے لیے اپنا قلم اٹھایا ہے۔ اور انسان کی مساوات کے لیے اپنا قدم آگے بڑھا دیا ہے۔

احتشام حسین نے ہمیشہ اس ادیب اور شاعر کی تعریف کی ہے جس نے عوام کی بہبودی کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے اس فنکار کے فن کو وقعت کی نظر سے دیکھا ہے جس نے عوامی مسائل پر تبصرہ کیا ہے اور ان کی پیچیدگیوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ رجحان ان کی ساری تحریروں میں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ان کے مضمون "اردو ادب دوسری جنگ عظیم کے بعد" کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

احتشام صاحب نے اپنے مضمون "اردو ادب دوسری جنگ عظیم کے بعد" میں عوام کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ چونکہ اس مضمون میں انھوں نے دوسری جنگ عظیم کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے انھوں نے سب سے پہلے ملک و قوم پر جنگ کے اثرات ضمنی طور پر واضح کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ہیگل سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ہیگل نے جنگ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ جنگ مکمل طور سے تباہ کن نہیں ہے۔ بلکہ جنگ بذات خود ایک فعل (VIRTUOUS ACTIVITY) ہے۔ ہیگل نے یہ بھی کہا ہے کہ امن تباہ کن ہے اور مستقل امن مستقل تباہی لاتا ہے۔ اس کے قول کے مطابق جنگ کے اعلیٰ مقاصد ہیں۔ اس کے ذریعے عوام کی اخلاقی صحت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ جس طرح ہوا کے چلنے سے سمندر کی گندگی دور ہو جاتی ہے اسی طرح جنگ سے [illegible]

ہوتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ آلات حرب و ضرب جن کی مدد سے جنگ کی جاتی ہے خباثت خوردہ روح کی سازش میں پیسے ہوتے ہیں غرضیکہ ہیگل کا فلسفہ یہ ہے کہ تعمیر کے پہلے تخریب ضروری ہے۔ احتشام صاحب نے بھی ہیگل کے انداز میں سوچا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"انھوں (ادیبوں) نے انقلاب کی تمنا صرف اس وقت کی ہے جب حالات ناقابل اصلاح نظر آتے ہیں۔ انقلاب کی یہ خواہش تعمیر سے پہلے تخریب کی وہ فطری خواہش ہے جس سے کوئی صحت مند دل خالی نہیں چنانچہ دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں اور بربادیوں اعمال کے اثر سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیتوں پر اظہار تشویش اور اظہار غم کرنے کے ساتھ ادیبوں نے زندگی کے وہ پہلو بھی دیکھے جو تعمیر کے کام آسکتے تھے۔ جنگ سے نفرت کا اظہار آئندہ ایک پائیدار امن کی تمنا ظاہر کرتے ہوئے اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے ان تمام قدروں سے وابستگی کا اعلان کیا جو ترقی، امن اور انسانی بہبودی کی ترجمان تھیں۔"[1]

احتشام صاحب نے اپنے اس مضمون میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اردو کے ادیبوں نے دوسری جنگ عظیم کے اثرات کو محسوس کیا ہے۔ عوام کی بہبودی کے لیے اپنے قلم کو جنبش دی ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"مختلف سیاسی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود ملک کی سیاسی اور معاشی آزادی کی خواہش میں جوش، مجاز، جاں نثار اختر، سردار جعفری، کیفی، تسنیم کرہانی، آنند نرائن ملا وغیرہ ہم آواز ہیں۔ اور گو اس دور کے ادب میں اول درجے کی چیزیں کم ہیں لیکن مفقود نہیں ہیں۔"[2]

احتشام صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو رجحانات صالح ہیں ان پر ہر شاعر آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں عوام کا مفاد ہے۔ اسی لیے انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کو مشورہ دیا ہے کہ "انھیں انسان دوست ہونا چاہیے۔ انھیں ملک وقوم کی آزادی کا محافظ ہونا چاہیے۔ انھیں جمہوریت پسند ہونا چاہیے۔"

احتشام صاحب نے شعرا کو جو مشورہ دیا ہے اس میں عوام کی بہبودی اور ترقی کا راز مضمر ہے۔ آزادی اور جمہوریت پسندی کا خاص تعلق عوام سے ہے۔

احتشام صاحب مارکس کے جدلیاتی مادیت سے بھی متاثر ہیں۔ مارکس نے ہیگل کے تصور روح اور جدلیات (SPIRIT AND DIALECTI) کی روشنی میں اپنی جدلیاتی مادیت (DIALECTIC MATERIALISM) کا نظریہ قائم کیا ہے۔ اس نے اپنے اصول پیش کش سے ہیگل ہی کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ بہر حال مارکس کا قول ہے کہ پہلے کچھ تعمیری خیالات پیدا ہوتے ہیں جن کو مارکس اثبات (THESIS) کا نام دیا ہے۔ پھر یہ خیالات ترقی کرتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔ اس سفر میں ان میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اعتراض اور نکتہ چینی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ تب تضاد (ANTITHESIS) کی شکل نمودار ہوتی ہے۔ آخر حالات تکمیل کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں جس کو وہ امتزاج (SYNTHSIS) کے نام سے یاد کرتا ہے۔

---

1. روایت اور بغاوت۔ "مغربی" اردو ادب دوسری جنگ عظیم کے بعد"۔ ص ۱۷۱ — ۱۷۲
2. " " " " " " " " ص ۱۷۹ — ۱۸۴

پروفیسر سید احتشام حسین کی نظر میں مارکس کی "جدلیاتی مادیت" کا فلسفہ ہے۔ چنانچہ وہ "جدید اردو شاعری اور سماجی کشمکش" مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"قوموں کی تاریخ اقتصادی کشمکش کی وجہ سے اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں اس میں نئے نشانات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ایک تصورِ حیات کچھ دنوں تک نیا رہنے کے بعد پرانا ہو جاتا ہے اور بار بار کے تصادم سے اس میں نئے زاویے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ مواقع تو ہر وقت آتے رہتے ہیں جن میں تبدیلی ہو سکے لیکن جب کوئی نظام اپنے پھیلنے اور بڑھنے کی طاقت کھو دیتا ہے اور مخالف عناصر رکھنے والی قدروں کو اپنے یہاں جگہ نہیں دے سکتا۔ اس وقت تاریخ انقلاب کے دور سے گزرتی ہے اور نئی قدریں بہت واضح ہو جاتی ہیں .... جو حقیقت شروع میں آہستہ آہستہ چنگاری کی طرح سلگتی رہتی ہے۔ وہ کچھ دنوں کے بعد تنظیم کی مدد سے طاقت پیدا کر کے ایک زبردست شعلہ بن جاتی ہے۔ جس میں پرانی قدریں اسی طرح جل جاتی ہیں کہ کام کی چیزیں تپ کر اور نکھر آتی ہیں اور اس طرح راکھ کے ڈھیر سے نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے"[1]

احتشام صاحب کا یہ اقتباس اس امر کو واضح کرتا ہے کہ ان پر مارکسی فلسفہ اثر انداز ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسی انداز سے ہندستان کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے پہلے شاہی نظام کے زوال سے بحث کی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"اردو شاعری کی پیدائش اور ترقی کا زمانہ شاہی نظام کے زوال، صوفیانہ خیالات کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی لیے اس کے اندر وہ سب باتیں آ گئی تھیں جن میں زندگی سے مقابلہ اور کسی نصب العین کے لیے اٹھ کھڑے ہونے اور جد و جہد کرنے کی تاب نہیں ہے"[2]

احتشام صاحب کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاہی نظام میں یکسانیت تھی اور سارا معاشرہ ایک مربوط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا ہیگل اور مارکس کی اصطلاح میں ہم اس معاشرے کو متراد ف (THESIS) کہہ سکتے ہیں۔

اس کے بعد انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جمے۔ ان کی تہذیب اور ان کا کلچر بھی ہندوستان میں پھیلا۔ اس کے علاوہ انگریزی تعلیم کا بھی کہیں کہیں رواج ہونے لگا۔ اس تبدیلی کی طرف احتشام صاحب مندرجہ ذیل سطور میں اشارہ کرتے ہیں۔

"غدر کے پہلے ہی انگریزی تعلیم ہندوستان کے بعض حصوں میں پھیل چکی تھی۔ اخبار نکل رہے تھے نئے علوم سے واقفیت بڑھ رہی تھی۔ اس کے اثر سے فضا میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اور ہندوستان میں کئی طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں"[3]

انگریزی تعلیم جو ہندوستان میں پھیل رہی تھی فارسی تعلیم کے بالکل متضاد تھی۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان اور انگلینڈ کی زبان، مذہب، لباس اور طرزِ معاشرت میں زبردست فرق تھا۔ مگر یہ دونوں تہذیبیں قریب آ رہی تھیں۔ اس قربت کو احتشام صاحب نے

---

[1] روایت اور بغاوت۔ مضمون "جدید اردو شاعری اور سماجی کشمکش"۔ ص ۱۴۰

[2] " " " " " " " ص ۱۴۰

[3] " " " " " " " ص ۱۴۵

ہلکی ہلکی لہروں اور کئی طرح کی آوازوں سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ہیگل اور مارکس کے الفاظ میں ہم اس کو تضاد (ANTI THESIS) کہ
انگریزوں کی حکومت اور ان کی تہذیب سے فی الحقیقت قدیم ہندوستان کا جامہ پارہ پارہ ہو گیا۔ مگر اس لباس حریر سے تہذیب عروس نو اپنا حسین جلوہ دکھانے لگی۔ احتشام صاحب اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"یہ آوازیں ان جھکوں سے بلند ہو رہی تھیں جن پر پرانی اور نئی تہذیب کے میل جول کا اثر پڑا تھا۔ انگریزی تعلیم نے چاہے کچھ اور نہ کیا ہو، چاہے نکلنے کا مقصد اس سے پورا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن یہ ضرور ہوا کہ مشرق کی روحانیت، داخلیت، انفرادیت اور سکون کی تلاش، تصوف اور ایا جال کے پجاریوں کو چوٹ سی لگی۔ اور سوچنے سمجھنے کا طریقہ بدل گیا۔ آنکھیں کھل گئیں اور جاگیرداری کے سوکھتے ہوئے تناور درخت کے سائے میں ایک نئے متوسط طبقے کا پودا پیدا ہو کر پنپتا اور بڑھتا ہوا دکھائی دینے لگا" [1]

احتشام صاحب نے ان سطور میں یہ دکھایا ہے کہ قدیم اور جدید تہذیبیں مل رہی تھیں جس سے نوشگوار نتائج پیدا ہوئے۔ اس نکتے کے اظہار کے لیے اگر ہم ہیگل اور مارکس کی اصطلاح کا سہارا لیں تو ہم اس کو امتزاج (SYNTHESIS) کہیں گے۔
احتشام صاحب نے آگے چل کر اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ اسی امتزاج کی بدولت اردو میں نئے ذہن اور باشعور ادیب شاعر پیدا ہوئے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ سر سید، مولوی محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی جیسے عظیم فنکار اسی تہذیب کی پیداوار ہیں جنھوں نے درباری ادب کے بجائے عوامی ادب کی تخلیق کی۔ اس کے بعد احتشام صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ بہت سے اس نئی سرزمین سے لالہ و گل کی طرح ابھرے ہیں۔ چنانچہ اسی امتزاجی عہد کی پیداوار اقبال ہیں۔ ان کے یہاں انفرادیت اور اجتماعی تصورات نظر آتے ہیں۔ اجتماعیت کے نقطۂ نظر سے ان کی وہ شاعری اہم ہے جس میں انھوں نے ساری اسلامی برادری کو بیداری کی دی ہے۔ انفرادیت کے نظریے کے تحت انھوں نے خودی کا فلسفہ پیش کیا ہے تاکہ عام انسان خواب غفلت سے ہوشیار ہو کر انگڑائی لے زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جائیں۔ احتشام صاحب اقبال کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"سب سے زیادہ ان کو خودی کا فلسفہ اپنی جانب کھینچتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جب تک افراد میں آرزوؤں کا وفور اور نصب العین نہ پیدا ہوگا اور اندرونی طور پر طاقتور بننے کی کمی رہے گی، صرف اجتماعی احساس منظم نہیں کر سکتا۔ ۱۹۱۷ء کے قریب وہ روسی انقلاب سے ایک نئی کرن پھوٹتے ہوئی دیکھتے ہیں اور پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اب دنیا میں مزدوروں کا دور آ گیا ہے" [2]

احتشام صاحب نے اس اقتباس میں واضح طور پر مزدوروں کی حمایت کی ہے۔ انھوں نے اقبال کی تعریف اسی وجہ سے کی ہے انھوں نے مزدوروں کو بیداری کا پیغام دیا ہے۔ وہ جوش کے بھی مداح ہیں۔ کیونکہ وہ بھی عوامی شاعر ہیں چنانچہ ان کا قول ہے کہ

"جوش صرف ہمارے جذبات کو آسودہ نہیں کرتے بلکہ ہماری فکر کو نئی راہ بھی دکھاتے ہیں۔ جس پر سے ہو کر ایک ایسی دنیا کو راستہ جاتا ہے جہاں انسان نسل اور رنگ میں تقسیم نہیں ہوتے ہیں۔

---

[1] روایت اور بغاوت۔ مضمون جدید اردو شاعری اور سماجی کشمکش۔ ص ۱۴۶
[2] " " " " " " " " ص ۱۵۶

جہاں ترقی کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔"[1]

چونکہ جوش بھی عوامی شاعر ہیں، اس لیے احتشام صاحب کو ان کی شاعری پسند ہے۔ انھوں نے احسان دانش کو بھی عوامی شاعر تسلیم کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے۔ اگرچہ ان کا قول ہے کہ احسان دانش کے یہاں جو انقلاب کا جوش نظر آتی ہیں وہ اشتراکی نہیں ہیں بلکہ انفرادی ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے مزدوروں کی ترقی کے لیے نظمیں کہی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری سماجی نقطۂ نظر سے بہت وقیع ہے۔

احتشام صاحب نے ایک مضمون "نیا ادب اور ترقی پسند ادب" کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ مضمون مولوی عبدالماجد دریابادی کے مضمون کے جواب میں ہے۔ جنھوں نے ترقی پسند ادب پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں فرقت کاکوروی کی تصنیف "مداوا" کا بھی ذکر موجود ہے۔ فرقت کاکوروی نے بھی "مداوا" میں ترقی پسند ادب کے خلاف کچھ باتوں کا اظہار کیا ہے۔ بہرحال احتشام صاحب نے ترقی پسند ادب کے بارے میں جو شکوک عام تھے ان کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تنقید میں عوام کی اہمیت زیادہ ہے۔ وہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

> "مختصر یہ کہ ترقی پسند ادب نہ تو مذہبی ہے، نہ فحاشی اور عریانی کی حمایت کرتا ہے۔ نہ مذہب سے بیزاری یا خدا کی توہین اس کے مسلک میں شامل ہے۔ نہ قتل و غارت گری نہ فسق و دہشت پسندی کو زندگی کے کسی شعبہ میں جگہ دینا چاہتا ہے۔ بلکہ زندگی کی کشمکش میں انسانیت کے لیے جو ترقی پذیر عناصر ہیں انھیں تقویت پہنچاتا ہے۔ دنیا کو ہر قسم کے ظلم و جور، ناانصافی، نفع خوری، مایوسی اور شکست خوردگی سے بچانے کا متمنی ہے۔ چاہے اس پر پروپیگنڈے کا الزام لگایا جائے لیکن وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو چند برگزیدہ لوگوں کو نہیں بلکہ عام انسانوں کی ملک بنا دینا چاہتا ہے۔"[2]

اس اقتباس کی آخری سطریں بالکل عوام کی بہبودی کے حق میں ہیں۔ اس مضمون میں آگے چل کر وہ اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

> "ترقی پسند ادب جمہوریت کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ کلچر کو چند انسانوں کی ملک بنانے کے بجائے تمام انسانوں کے فائدے کی چیز بنا دینا چاہتا ہے۔ وہ انسانی ترقی کے لیے اسے ضروری سمجھتا ہے کہ عوام بھی مسرور اور خوش حال ہوں۔"[3]

احتشام صاحب نے اس اقتباس میں ترقی پسندی کے رجحان کی وضاحت بخوبی کر دی ہے۔ انھوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ ترقی پسند تحریک کا مقصد عوام کو مسرور بنانا ہے تاکہ سطح گیتی پر ہر طرف مسرت کے پھول بکھر جائیں۔ اس مضمون کے اختتام پر انھوں نے اپنے نظریات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "کوئی شخص جو ادب کو تاریخی طاقتوں کا اور زندگی کی کشمکش کا مظہر سمجھتا ہے۔ جو آزادی چاہتا ہے۔ جو عام انسانوں کو انسان سمجھ کر ان میں تمدن کی تمام برکتوں کی اشاعت کرنا چاہتا ہے۔ جو جمہوریت

---

[1] روایت اور بغاوت مضمون جدید اردو شاعری اور سماجی کشمکش ص ۱۶۲
[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۲۸۰
[3] روایت اور بغاوت۔ مضمون نیا ادب اور ترقی پسند ادب۔ ص ۲۹۳

پسند ہے، جو حقیقت پسند ہے اور جو ادب کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا وہ ترقی پسند ہے۔" [1]

احتشام صاحب کا ایک مضمون "فرقہ پرستی اور ادیب" ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ہندوستان میں اتحاد کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا قول ہے کہ ہندوستان کے لیڈر تعصب کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ وہ ہندو مسلمان اور سکھ کو لڑا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں جیسا کہ ان کا قول ہے:-

"(میں) اتنا ضرور یاد دلاؤں گا کہ کسی نہ کسی طرح بہت سے لیڈروں نے عوام کی مادی زندگی کو خوش حال بنانے کے لیے ان کی روحانی اور مذہبی نفسی کیفیتوں کا سہارا لیا اور انھیں اپنے ساتھ لیے ہوئے وہاں چلے گئے جہاں وہ قدر مشترک — آزادی اور مادی خوشحالی تو نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور ہندو، مسلمان، سکھ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔" [2]

احتشام صاحب نے سوال کیا ہے کہ ایسی صورت میں ایک ادیب کا کیا فرض ہے؟ اس کا جواب وہ خود دیتے ہیں:

"شخصی مفاد اور سیاسی یا ذہنی مصالح کے باوجود چند بنیادی سوال ضرور ایسے ہیں جن کے متعلق ہر اچھے ادیب کو سوچنا ہے اور کوئی ایسا جواب دینا ہے جو کائنات کے وجود کو اس کے ذہن کا محض ایک لطیفہ نہ بنا دے، دنیا کو مافوق الفطرت انسانوں یا مجنونوں کی دنیا نہ بنا دے بلکہ ایک ایسے انسان کی طرح جواب دے جو دوسرے انسانوں کی توہین اور تذلیل پر خوش نہیں ہوتا اور دنیا کو ایک بڑی برادری سمجھ کر انسانوں کی اجتماعی بہبودی کے نقطۂ نظر سے سوچتا ہے۔" [3]

اس عبارت میں احتشام صاحب نے امرا اور رؤسا کے بارے میں نہیں سوچا ہے بلکہ انھوں نے دنیا کے سارے انسانوں کی بہبودی کا ذکر چھیڑا ہے۔ دراصل یہی صحیح جمہوری نقطۂ نظر ہے۔

احتشام صاحب کا ایک اہم مضمون "ادیب، حب الوطنی اور وفاداری" ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بتایا ہے کہ ایک ادیب کا فرض ہے کہ وہ اپنے وطن سے محبت کرے اور اپنی وفاداری کا ثبوت دے۔ اگر وہ اپنے وطن سے محبت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ کہ عوام سے محبت کرتا ہے اور انسانی برادری سے محبت کرتا ہے۔ احتشام صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ کچھ ادیب طبقاتی رجحان ہیں اس لیے وہ ایک مخصوص طبقے کا ساتھ دیں گے۔ اس کے بعد وہ اپنے نقطۂ نظر کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"یقیناً ایسے ادیب کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ اپنے خیالات کا سچائی کے ساتھ اظہار کرے۔ لیکن ایسی صورت میں اسے اس بات کا حق حاصل نہیں رہتا کہ وہ عوام کی نمائندگی کا دم بھرے اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر جو لوگ حاکم طبقہ کو عوام دشمن یا مخصوص طبقاتی نظام کا علمبردار کہتے ہیں انھیں اس بات کا اختیار بھی ہے کہ وہ اسے عوام دشمن قرار دیں۔" [4]

---

[1] روایت اور بغاوت۔ مضمون نیا ادب اور ترقی پسند ادب۔ ص ۳۱۱

[2] ادب اور سماج۔ مضمون فرقہ پرستی اور ادیب۔ ص ۱۳۶ —— ۱۳۷

[3] " " " " ص ۱۳۳

[4] " " ادیب حب الوطنی اور وفاداری ص ۱۴۲ — ۱۴۳

اس عبارت کا مطالعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ احتشام حسین صاحب کی نظر میں دو طبقے ہیں۔ ایک امیروں یا حاکموں کا طبقہ اور عوام کا طبقہ۔ احتشام صاحب عوام کے طبقے کے ساتھ ہیں۔ اسی مضمون کے آخر میں احتشام صاحب فرماتے ہیں:۔

"ایک ترقی پسند جمہوری نظام آزادی ترقی، آسودگی اور اس کا احساس انھیں وفادار بنائے گا۔
یہی عوام کی ضرورتیں اور خواہشیں بھی ہیں۔" [1]

یہ عبارت مکمل طور پر احتشام صاحب کے نظریے کو واضح کرتی ہے۔ اس عبارت سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کو عوام کی ضرورتوں اور خواہشوں کا احترام ہے۔ اور یہی نقطہ نظر ان کی ساری تحریروں پر چھایا ہوا ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ریاست کی ترقی بغیر عوام کی ترقی کے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے عوام کو ابھارنے اور ان کو ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے کی تلقین کی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیشہ ان فنکاروں کی تعریف کی ہے جنھوں نے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر عوامی ادب کی تخلیق میں حصہ لیا ہے۔ اس بیان کے ثبوت میں ان کا مضمون "نظیر اکبرآبادی" پیش کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین نے اپنے مضمون "نظیر اکبرآبادی" میں نظیر کی اس وجہ سے تعریف کی ہے کیونکہ انھوں نے ہندوستانی عوام کے جذبات کو پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں پہلے انھوں نے نظیر اکبرآبادی کے سماجی ماحول سے بحث کی ہے۔ کیونکہ اسی ماحول میں انھوں نے پرورش پائی ہے۔ دراصل ادب سماج ہی کی پیداوار ہے۔ سماج کے اثرات ادب پر واضح طور پر یا ضمنی طور پر ضرور پڑتے ہیں۔ ادب میں سماج کی دھوپ چھاؤں کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آئے گی۔ اور اس سماج کی چہار دیواریوں سے ایک شاعر یا ادیب اپنا چہرہ دکھائے گا۔ چنانچہ احتشام صاحب نے اپنے مضمون میں سب سے پہلے ولبھ اچاریہ کی وشنوی تحریک کا ذکر کیا ہے۔ جس نے آگرہ کی فضا کو روشن کیا۔ اس کے بعد ولبھ اچاریہ کے آٹھ شاگردوں نے روشنی پھیلائی۔ اس وقت یہاں کی بولی برج بھاشا تھی۔ چنانچہ اسی زبان میں آگرہ کے شاعروں نے سخن گوئی کا آغاز کیا۔ سودا اس کے پڑوس اور میر اسی کے بیچ اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ اس کے بعد احتشام صاحب نے اس سرزمین کے عوام کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"برج کے اس خطہ کو دو تہذیبی روایتیں جمع کرنے کا موقع ملا جو جاگیردارانہ سانچے میں تشکیل پانے کے باوجود عوام کے ذوقِ حیات کی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ کیونکہ عوام مختلف قدیم نظامہائے معاشرت میں دبے اور کچلے ہوئے ہونے کے باوجود زندگی کی ہر تکالیف کو برداشت کرنے کے لیے گیتوں میں مذہبی اور قومی تہواروں، مثالی قصوں اور سیدھے سادے تجربوں میں ایسے تہذیبی پہلو ڈھونڈ نکالتے تھے جو ان کی زندگی سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی امنگوں اور خواہشوں کا پتا دیتے تھے۔" [2]

اس عبارت کے مطالعہ سے دو باتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں۔ (۱) برج کے خطے کی تشکیل جاگیردارانہ سانچے میں ہوئی۔ (۲) عوام مختلف قدیم نظامہائے معاشرت میں دبے اور کچلے ہوئے تھے۔

ان خیالات میں واضح طور پر کارل مارکس کی آواز گونج رہی ہے۔ احتشام صاحب نے بتایا ہے کہ آگرہ میں ایک طبقہ نغمہ

---

[1] ادب اور سماج۔ مضمون ادیب حب الوطنی اور وفاداری ص ۱۵۴۔

[2] ذوقِ ادب اور شعور۔ مضمون نظیر اکبرآبادی۔ ص ۱۴۲ — ۱۴۳

(EXPLOITER) کا تھا اور دوسرا طبقہ مظلوم (EXPLOITED) کا تھا۔ چونکہ دوسرا طبقہ کمزور تھا اس لیے وہ کبھی صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکا۔ یہی نہیں کہ یہ حالت ہندوستان کی تھی بلکہ جہاں کہیں استبدادی حکومتیں قائم تھیں وہاں عوام دبے اور کچلے ہوئے تھے۔ چنانچہ انگلستان میں ٹیوڈر خاندان کے بادشاہ ہنری ہفتم (۱۴۸۵ء۔ ۱۵۰۹ء) نے استبدادی حکومت قائم کی جس میں عوام کا کوئی حصہ نہیں تھا پھر ہنری ہشتم (۱۵۰۹ء۔ ۱۵۴۷ء) نے مزید طاقت حاصل کر لی اور من مانی حکومت کی۔ اس کے بعد ٹیوڈر خاندان کی استبدادیت ملکہ ایلزبتھ (۱۵۵۸ء۔ ۱۶۰۳ء) کے عہد میں عروج پر پہنچ گئی۔ اگرچہ ان بادشاہوں نے پارلیمنٹ کو قائم کیا مگر وہ اس کا اجلاس بہت ہی کم طلب کرتے تھے اس لیے پارلیمنٹ عوام کی نمائندگی کرنے سے قاصر تھی۔ فرانس میں بھی استبدادی حکومت قائم تھی۔ چنانچہ فرانس کے بادشاہوں کی قوت بوربن (BOURBON) خاندان کے عہد میں بہت زیادہ ہو گئی۔ اس خاندان کے بادشاہ تیرھویں لوئی نے بہت قوت حاصل کر لی۔ اس کے وزیر رشلو (RICHELIEU) نے اس کی قوت میں اور اضافہ کیا۔ اس خاندان کا چودھواں لوئی بھی بہت طاقتور بادشاہ تھا۔ اس کو استبدادی حکومت کا اوتار کہا جاتا تھا۔

اسی طرح آسٹریا میں ہیپس برگ (HAPSBURGS) خاندان کی عظمت مسلم تھی۔ اسی خاندان کا مشہور بادشاہ میکسی ملین (MAXIMILLIAN) گزرا ہے۔ اس کے پوتے چارلس پنجم (۱۵۱۹ء۔ ۱۵۵۶ء) کے قبضہ میں آسٹریا، اسپین، پرتگال، اٹلی، جرمنی اور نیدرلینڈ کے ممالک تھے۔ آسٹریا کی ملکہ میریا تھیریزا (۱۷۴۰ء۔ ۱۷۸۰ء) نے بھی استبدادی حکومت قائم کی۔ اس کے لڑکے جوزف دوم (۱۷۶۵ء۔ ۱۷۹۰ء) نے اپنی قوت میں بے حد اضافہ کر لیا۔

ان بادشاہوں کے علاوہ روس میں زار پیٹر اعظم (۱۶۸۲ء۔ ۱۷۲۵ء) بھی ایک جابر بادشاہ تھا۔ اسی طرح پرشیا کے بادشاہ فریڈرک اعظم (۱۷۴۰ء۔ ۱۷۸۶ء) نے بھی جابرانہ حکومت قائم کی۔ دیگر ممالک میں بھی استبدادی حکومتوں کا جور و ستم جاری تھا۔ مثلاً پرتگال ناروے، سوئیڈن، ہالینڈ، بلجیم اور اسپین میں اسی طرح کی حکومتیں قائم تھیں۔

اگرچہ تقریباً اسی دور میں ہندوستان میں بھی مغل بادشاہوں کی حکومت عروج پر تھی۔ مگر وہ لوگ جابر بادشاہ نہیں تھے۔ مثلاً بابر (۱۵۲۶ء۔ ۱۵۳۰ء) ہمایوں (۱۵۳۰ء۔ ۱۵۵۶ء) اکبر (۱۵۵۶ء۔ ۱۶۰۵ء) جہانگیر (۱۶۰۵ء۔ ۱۶۲۷ء) شاہجہاں (۱۶۲۷ء۔ ۱۶۵۸ء) اورنگ زیب (۱۶۵۸ء۔ ۱۷۰۷ء) نے شاندار طریقے سے حکومت کی۔ ان لوگوں نے ہندوستان کی عظمت میں اضافہ کیا اور بڑی حد تک عوام کا خیال رکھا۔ اس کے باوجود ہندوستان کے عوام قعر گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ جس کی طرف پروفیسر سید احتشام حسین نے اپنے مضمون "نظیر اکبر آبادی" میں اشارہ کیا ہے۔ دراصل خود مختار حکومتوں میں عوام کو ابھرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اس قسم کے مواقع صرف جمہوری حکومتوں کے قیام ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اس مضمون میں احتشام صاحب نے آگے چل کر ہندوستان کے عوام پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"طاقتور حکمرانوں کے نیچے کھیتی کرنے والے معمولی تبدیلیوں کے باوجود ایک ہی طرح کی خاموش زندگی گزارتے تھے۔ پیداوار کا زرعی نظام جس پر معاشی زندگی کا انحصار تھا۔ جمود کی منزل میں تھا"[1]

احتشام صاحب کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسان خاموشی سے اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ جن کو اپنی محنت کا صلہ نہیں ملتا تھا۔ ان کی محنت سے جاگیردار فائدہ حاصل کرتے تھے اور کسانوں کے بیوی بچے فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اگر ہم کارل مارکس کے اقتصادی اصول کی

---

[1] ذوق ادب و شعور، مضمون "نظیر اکبر آبادی" ص ۱۴۳

معاشی میں کسانوں کی اس حالت کا جائزہ لیں تو ہم یہ کہیں گے کہ کسان قدرِ زائد (SURPLUS VALUE) سے بہرہ ور نہیں تھے اس لیے وہ مفلسی کی زندگی گزار رہے تھے۔

احتشام صاحب نے کارل مارکس کی طرح اس بات کو واضح کیا ہے کہ سارے سماجی ڈھانچے کا انحصار معاشی حالات پر ہے۔ معاشی حالات ہی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں لاتے ہیں۔ اس لیے ہم کسی ملک کے معاشی حالات کو نظرانداز نہیں کر سکتے ہیں۔ احتشام صاحب اس سلسلے میں اپنے نظریات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"یہاں کی صنعت، تجارت اور زراعت سب آہستہ آہستہ تباہی کے غار میں گر رہی تھی اور وہ معاشی دیہی نظام ابتر ہو رہا تھا جس نے صدیوں سے عوام کو مختلف پیشوں اور طبقوں کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔" [1]

اس مضمون میں احتشام صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ آگرہ کی اس بدحالی کا احساس اس دور کے شعرا کو واضح طور پر نہیں تھا۔ یہاں تک کہ خود نظیر اکبرآبادی کے یہاں اس احساس کی جھلکیاں آئینہ کی طرح روشن نہیں ہیں۔ احتشام صاحب کا قول ہے:۔

"یہ آگرہ اپنی روایتوں کے لحاظ سے کرشن کنھیا، اکبر، شاہجہاں اور سورداس کا آگرہ ہے۔ معاشی حیثیت سے وہ زوال پذیر شہر ہے جس میں افلاس، بیکاری، بے روزگاری اور پیشہ وروں کی بدحالی کا زور ہے۔ جو ایک طرف تو مغل حکومت کا ایک حصہ ہے۔ دوسری طرف برطانوی استحصال کا شکار بن رہا ہے۔ وہ عملی کی اس کیفیت کو سمجھنے اور دیکھنے والی آنکھیں اس وقت موجود نہیں تھیں۔ لیکن ان کے نتیجے میں جو اثر عام زندگی پر پڑ رہا تھا اور خارجی حالات کی وجہ سے جو داخلیت پیدا ہو رہی تھی اس کی پرچھائیاں شعر و ادب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس وقت کے شعرا کو جاگیرداری نظام کی چولیں ہل جانے کا اندازہ نہ ہو لیکن وہ تنازع اس عام بے دلی کے شکار ضرور تھے۔ جو اس زوال پذیر زمانے میں پیدا ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ نظیر اکبرآبادی اپنی ساری شاعری میں کہیں واضح طور پر بدلتے ہوئے حالات کی مادی توجیہ پیش نہ کر سکے حالانکہ اردو کا کوئی شاعر نظیر سے زیادہ بھدّے پن کی حد تک سادہ طریقے پر عوام کے قریب نہیں ہے۔" [1]

پروفیسر احتشام حسین کا یہ کہنا درست ہے کہ نظیر اکبرآبادی اپنی ساری شاعری میں بدلتے ہوئے حالات کی مادی توجیہ پیش نہ کر سکے اور یہ نظیر اکبرآبادی کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ درحقیقت اس دور کا کوئی اردو شاعر حالات کا تجزیہ مادی نقطۂ نظر سے نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور کے شعرا زیادہ تر درباری زندگی گزارتے تھے اس لیے ان کی نظر اسی ماحول تک محدود تھی۔ اگرچہ نظیر اکبرآبادی دربار کے اسیر نہیں تھے مگر ان کو کوئی سیاسی شعور حاصل نہیں تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کے عوام اس سیاسی شعور سے محروم تھے جو اس زمانے میں ممالک میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ مثلاً نظیر اکبرآبادی سے کچھ قبل نیدرلینڈ کے عوام اسپین کی حکومت کے خلاف بغاوت کر چکے تھے اور آزادی حاصل کر چکے تھے۔ انگلینڈ کے عوام نے اسٹوارٹ خاندان کے جور و استبداد کے خلاف آواز اٹھائی اور ۱۶۴۹ء میں چارلس کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا۔ امریکہ کے باشندوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی اور جنرل واشنگٹن کی رہبری میں ۱۷۸۳ء میں آزادی حاصل کر لی۔ فرانس کے باشندوں نے سولھویں لوئی اور اس کی بیوی کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور ۱۷۹۳ء میں جمہوریہ قائم کر دی۔ اسی طرح ۱۸۱۰ء اور ۱۸۲۲ء کے درمیان میکسیکو، مغربی الجزائر، وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ میں بغاوتیں ہوئیں اور ان ملکوں نے بھی اپنے

---

[1] ذوقِ ادب و شعور۔ مضمون نظیر اکبرآبادی۔ ص ۱۴۵

ری پبلک قائم کر دی۔ تقریباً اسی دور میں نظیر اکبر آبادی بھی ہندوستان میں سخن گوئی میں مصروف تھے۔ مگر اس وقت یہاں کے عوام اس قدر بیدار نہیں تھے۔

یہی نہیں کہ ہندوستان کے عوام بیدار نہیں تھے بلکہ یہاں سیاسی مفکرین بھی اس وقت موجود نہیں تھے۔ نظیر اکبر آبادی کی ولادت ۱۷۲۴ء میں ہوئی۔ اسی سال جرمنی میں کانٹ پیدا ہوا۔ جس نے گہرے سیاسی تصورات پیش کیے۔ ہندوستان میں اس وقت کانٹ کے مقابل کا کوئی سیاسی مفکر نہیں تھا۔ نظیر اکبر آبادی کا انتقال ۱۸۳۰ء میں ہوا اور ۱۸۳۱ء میں جرمنی کے عظیم فلاسفر ہیگل کا انتقال ہوا۔ ہیگل نے سیاسی فلسفہ کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دیا مگر اس وقت ہندوستان میں کوئی سیاسی فلسفی موجود نہیں تھا۔ دراصل حصول جمہوریت کی دوڑ میں ہندوستان کافی پیچھے رہا، اسی لیے ہندوستان کے عوام سیاسی حقوق سے ایک مدت تک محروم رہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے معاشی اور مادی حالات کو بھی سدھار نہیں سکے۔

پروفیسر سید احتشام حسین نے اپنے مضمون "نظیر اکبر آبادی" میں اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ان کے (نظیر) عوام جمہوریت پسند اور اپنے حقوق کے لیے جد و جہد کرنے والے عوام نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ہیں جو جاگیرداری کے زوال پذیر دور میں اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، تفریحوں اور غموں کے ساتھ قسمت پرست رہے ہیں۔ جو زندہ اور متحرک ہیں لیکن جنھیں آگے بڑھنے کا راستہ یا اپنی منزل نہیں معلوم۔ یہ اس عہد کے شعور کا نقص تھا۔"[1]

نظیر کا سیاسی شعور بالیدہ نہ سہی مگر وہ عوام کے شاعر ضرور تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ عوام میں مل جل کر رہتے تھے۔ جبکہ اس دور کے دیگر شاعر بادشاہوں کے دربار سے وابستہ تھے۔ نظیر کے اس عوامی رجحان کی وجہ سے احتشام صاحب نے ان کی تعریف کی ہے اور ان کو اردو کا ایک قیمتی شاعر تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"نظیر نے پہلی دفعہ عوام کو موضوعِ شعر کا مستحق سمجھا اور ان کی زندگی کو مع اس کی سادگی اور نقائص کو پیش کر کے ان کی انسانیت کو نمایاں کیا۔"[2]

اس مضمون میں نظیر اکبر آبادی کے خلوص کی ایک جگہ تعریف کی گئی ہے:۔

"ان کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ اس میں سچی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ انسان کی عظمت اور محبت، انصاف اور مساوات کا احساس بھی ہے یہی وہ انسانی پہلو ہے جو نظیر کی شاعری کو محض ایک جماعت کی شاعری بنا کر نہیں چھوڑ دیتا۔"[3]

احتشام صاحب نے نظیر اکبر آبادی کے کلام میں جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ یہ خصوصیات بہت اہم ہیں۔ انسان کی عظمت اور محبت، انصاف اور مساوات کی تلقین دنیا کے عظیم سیاسی مفکرین نے کی ہے۔ ہابس اور لاک نے اپنی تحریروں میں انسان کی انفرادیت کو تسلیم کیا ہے۔ روسو کی ساری فکر کا ماحصل مساوات ہے۔ اس نے عوام کے ساتھ انصاف اور مساوات پر یہاں تک زور دیا کہ اس کے نظریے کے مطابق ریاست کا قیام رضائے عام GENERAL WILL پر ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد کارل مارکس نے خاص طور سے مفلس طبقے کے ساتھ انصاف پر زور دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ نظیر اکبر آبادی کا شعور ان مفکرین کی طرح اس قدر بالیدہ، ان کی نظر اس قدر وسیع اور ان کی عقل اس قدر پختہ نہیں تھی مگر ان کا پیغام وہی تھا جو ان سیاسی مفکرین

---

[1] ذوق ادب اور شعور۔ مضمون نظیر اکبر آبادی ص ۱۴۶
[2] 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۱۴۶
[3] 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۱۴۷

تھا۔ اسی لیے احتشام صاحب کی نظر میں نظیر کی قدر و قیمت ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین کے مضمون "اردو ناول اور سماجی شعور" کا مطالعہ بھی اس امر کو منکشف کرتا ہے کہ ان کی نظر میں عوام اور افراد کی اہمیت ہے۔ اس مضمون میں پہلے انھوں نے بہ حیثیت پس منظر فرد اور سماج کی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"تاریخ کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو ناول ایک صنف کی حیثیت سے عہد سرمایہ داری کی پیداوار ہے۔ جب فرد اور سماج کی کشمکش بڑھی جب جاگیرداری دور کی قدروں کے متعلق شک کا اظہار کیا جانے لگا۔ اور جب سائنس نے عقاید اور روایات کی پرکھ پر آمادہ کیا تو اس وقت انسان اور اس کے مسائل کو بہت سے پہلوؤں سے دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔" [1]

یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی ترقی سے قبل انسان بیدار نہیں ہوا تھا۔ دورِ احیا میں جب علم و ادب کی ترقی ہوئی تو اس کے ساتھ سائنس ترقی کی۔ اس لیے انسان کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس وقت سے جاگیردار اور کسان، سرمایہ دار اور محنت کش طبقے میں کشمکش پیدا ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مضمون میں اردو ناول نگاری کے سلسلے میں احتشام صاحب نے سماج اور ماحول کا تجزیہ کیا ہے۔ مگر ان کے خیالات کی تان عوام ہی پر ٹوٹتی ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں پہلے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے بحث کی ہے۔ پھر سرشار، شرر، محمد علی طبیب اور رسوا کی ناول کی خصوصیات پیش کی ہیں۔ مگر آخر میں انھوں نے پریم چند کے ناولوں پر اپنے مضمون کو ختم کیا ہے۔ دراصل پریم چند کی ناول نگاری دورِ جدید کی جس میں عوام کی سسکیاں شامل ہیں۔ وہ پریم چند کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"انھوں نے پہلی دفعہ معمولی میں غیر معمولی اور خاموشی میں اضطراب کی جستجو کی۔ انھوں نے عام انسانوں کو بھی انسان سمجھا اور ان کے دل میں جھانک کر دیکھا۔" [2]

اسی مضمون میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

"پریم چند نے اپنے لیے ہندوستان کے عام انسان چن لیے۔"

دراصل احتشام صاحب کی تنقید کا خاص موضوع عام انسان ہی ہے انھوں نے "اردو ناول اور سماجی کشمکش" مضمون میں پریم چند پر پھولوں کی بارش کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے کسانوں اور مزدوروں کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ چونکہ کارل مارکس نے پست اور مفلس طبقے کی ترقی کے لیے اسی لیے احتشام صاحب کے یہاں بھی اس طبقہ کی فریاد سنائی دیتی ہے۔

اس بحث و مباحثے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ احتشام صاحب کا نقطۂ نظر جمہوری ہے۔ وہ بادشاہوں، امیروں، رئیسوں اور حاکموں کے ثنا خواں نہیں بلکہ عوام سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ انھوں نے عوام کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں جن سے ان کے دل میں سیلابِ غم امنڈ آیا ہے۔ انھوں نے غریبوں کے دھڑکن کو سمجھا ہے۔ جس نے ان کے ناولوں کے تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ ان کے گوش ہوش مظلوموں کی فریاد سے ٹکراتے ہیں جس نے ان کے رگ و پے کو درہم برہم کر دیا ہے۔ غرضیکہ پروفیسر سید احتشام حسین جمہوری خیالات کے علمبردار ہیں۔ ان کے ان خیالات نے ان کو اردو داں طبقے میں کافی مقبول بنایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب تک تخت نشینوں اور خاک نشینوں میں، جب تک سرمایہ داروں اور مزدوروں میں اور جب تک امیروں اور غریبوں میں کشمکش باقی رہے گی تب تک احتشام صاحب کے نظریات زندہ رہیں گے۔ اور ان کے آشوبِ حیات و کائنات کی تاریک راہوں میں چراغ کا اجالا پھیلاتے رہیں گے۔

---

[1] ذوقِ ادب اور شعور۔ مضمون اردو ناول اور سماجی شعور۔ ص ۳۳

[2] " " " " ص ۳۶

ڈاکٹر عبدالغفار شکیل
شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پروفیسر احتشام حسین کی لسانی تحریریں ایک جائزہ

عہد حاضر میں پروفیسر احتشام حسین نے اردو کے مشہور و معروف اور ممتاز و منفرد نقاد اور ادیب کی حیثیت سے جو مقام حاصل کیا اس سے اردو کے اہل علم حضرات بخوبی واقف ہیں۔ میدان تنقید میں ان کا اپنا سوچنے کا ڈھنگ اور نقطۂ نظر تھا۔ ان کی تحریریں اور تنقیدیں اس کی غماز ہیں۔ احتشام صاحب کی علمی و ادبی سرگرمی اور دلچسپی کا میدان زیادہ تر ادب اور اس کے مختلف موضوعات خصوصاً نقد و انتقاد رہے کبھی کبھی اپنی دلچسپی کے میدان سے ہٹ کر انھوں نے ایک ایسے موضوع کی طرف بھی توجہ کی ہے جس کی طرف ہمارے شعر و ادب کے رسیا بہت کم آئے ہیں، وہ ہے لسانیات۔

احتشام صاحب پیشے کے اعتبار سے معلّم تھے۔ ایک اچھے معلّم کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم اور اپنی معلومات کا دائرہ جتنا زیادہ وسیع کر سکے کرے۔ احتشام صاحب کو اس کا احساس تھا ان کا مطالعہ وسیع تھا اپنی زبان و ادب کے علاوہ وہ دوسری زبانوں کے علم و ادب کا بھی مطالعہ کرتے تھے لسانیات کی بھی چند کتابیں انھوں نے پڑھیں لیکن کبھی اس کا دعویٰ نہ کیا کہ وہ ماہر لسانیات ہیں۔ ان سے میری علی گڑھ میں کئی بار ملاقات ہوئی اور لسانیات میں آئے دن جو نئے انکشافات ہو رہے ہیں ان پر تبادلۂ خیال بھی ہوا لیکن ہر بار احتشام صاحب ان نئی باتوں سے لاعلمی کا اظہار کرتے اور اس بات پر حیرت بھی کہ یہ علم اب دن بدن کتنا سائنٹفک ہوتا جا رہا ہے۔ لسانیات کا مطالعہ احتشام صاحب نے چند وجوہات کی بنا پر کیا تھا ان میں سے ایک ہندی اردو کا مسئلہ بھی تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ہمارے ملک میں ہندی اردو کا مسئلہ اتنا زیادہ الجھ گیا تھا کہ جس کے سلجھانے میں ملک کی نامور ہستیوں مثلاً گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، بابائے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین اور بہت سے لوگوں کی کوششیں اور خیالات بےسود ویے کار ثابت ہوئے۔ اس مسئلے پر جن جن لوگوں نے سوچا ان میں سے اکثر و بیشتر عالم، سیاست دان، مدبر، مفکر سب کچھ تھے مگر ان میں کوئی ماہر لسانیات نہیں تھا اور نہ لسانیات کے آئین و اصولوں سے واقف۔ لسانی مسائل کو جب تک لسانیات کے اصولوں اور زبانوں کی خصوصیات اور ان کی ارتقائی تاریخ کی روشنی میں نہیں دیکھا جاتا کسی مفید نتیجے پر پہنچنا محال ہے احتشام صاحب کو لسانیات کے مطالعے نے اس بات سے آگاہ کیا چنانچہ انھوں نے ہندی اردو کے نزاعی مسئلے کو بجائے جذبات کی روشنی میں دیکھنے کے اپنی لسانی معلومات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اس پر سنجیدگی سے غور کیا اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے خیالات و افکار کو ہمارے سامنے پیش کیا۔

احتشام صاحب نے ۱۹۴۸ء میں جان بیمز کی کتاب "این آؤٹ لین آف انڈین فلولوجی" کا اردو میں ترجمہ

کیا اور اپنے جامع و مبسوط مقدمہ کے ساتھ اس کو شائع کرایا بیمز کی یہ کتاب ایک مختصر سی کتاب ہے لسانیات کی کتابوں میں اور بیمز کی کتابوں میں یہ کتاب کچھ زیادہ اہم کتاب نہیں ہے تاہم اردو کے لسانیاتی ادب میں جس کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے احتشام صاحب کی ترجمہ کی ہوئی یہ کتاب نہ صرف ایک اہم اضافہ ہے بلکہ اس میں جو معلومات زبانوں کے خاندان ان کی گروہ بندی، ان کے ارتقاء کے مدارج اور خصوصیات وغیرہ سے متعلق دی گئی ہیں ان سے بہت سے اردو والے واقف بھی نہ تھے۔ اسی ترجمے سے احتشام صاحب کی لسانی دلچسپی کا آغاز ہوا۔

جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ احتشام صاحب نے جس مقصد سے کیا اس کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں:۔

"اس وقت اردو، ہندی اور ہندوستانی کی جو گتھی ہر ناخن کے لئے حوصلہ شکن بن رہی ہے اس کے حل کرنے میں قومی جذبات سے زیادہ لسانیات کا مطالعہ مدد دے سکتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس کا ترجمہ پیش کرنے کی جرأت کی ہے...... اردو پڑھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ صرف علم ہی میں اضافے کا باعث نہ ہوگا بلکہ اپنی زبان کے صحیح قواعد مرتب کرنے اور اس کے ارتقاء کے صحیح راستے سے واقفیت حاصل کرنے میں بھی معین ہوگا۔"[1]

لسانیات اور لسانی معلومات کو پڑھانے میں احتشام صاحب کو جان بیمز کی کتاب کے ترجمے کے وقت اس قدر دلچسپی ہوئی کہ انھوں نے اسی زمانے میں "فلسفۂ لسان" پر اردو میں ایک مختصر سی کتاب لکھنے کا منصوبہ بھی بنا لیا۔ اس کے علاوہ بیمز کی مشہور و معروف کتاب "جدید آریائی زبانوں کی تقابلی قواعد" جو تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے اس کی پہلی جلد کے مقدمے کے ترجمے کا بھی احتشام صاحب نے ارادہ کیا تھا لیکن افسوس کہ ان کے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوئے۔ تاہم ان کا "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" نہ صرف ایک اچھا ترجمہ ہے بلکہ اس میں شامل ان کا جامع و مبسوط مقدمہ اپنی معلومات اور نوعیت کے اعتبار سے بے حد اہم ہے اور اردو لسانیات کے طالب علم کے لئے نئی چیز۔

احتشام صاحب کا یہ ترجمہ منظر عام پر آیا تو اہل علم حضرات نے اس کی بڑی قدر کی مختلف رسالوں میں اس پر تبصرے ہوئے اور سب نے احتشام صاحب کی اس اولین لسانی کوشش کو سراہا اور ان کی بصیرت کی داد دی۔ اس کی توثیق میں میں سمجھتا ہوں کہ ماہنامہ "نگار" اور "معارف" کی ذیل کی دو تحریریں کافی ہیں:۔

"...... ترجمہ تو خیر احتشام صاحب کو اچھا کرنا ہی تھا لیکن اس سے قطع نظر خود ۵۶ صفحات کا مقدمہ لکھ کر انھوں نے اس کتاب کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے اس موضوع پر اس سے قبل بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو تحقیقی و تاریخی معلومات اس کتاب سے حاصل ہو سکتی ہیں اور دوسری کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔"

(نگار بابت مئی ۴۴ء ۱۹)

"...... لائق مترجم کا مقدمہ اصل کتاب سے زیادہ کار آمد ہے۔ اس کے بغیر یہ ترجمہ ناقص تھا زبان کا مسئلہ ہر ملک و قوم میں خالص لسانی حیثیت رکھتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں اس کو قومی اور سیاسی بنا دیا گیا ہے اس کتاب سے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مترجم نے خاص طور سے اس کو مقدمے میں پیش نظر رکھا ہے"

(معارف جلد ۶۲ نمبر ۱)

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ــــ دیباچۂ مترجم ص۴

اس میں کوئی شک نہیں کہ احتشام صاحب کا مقدمہ جامع مبسوط اور پر از معلومات ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی ہو۔ اس مقدمے میں انھوں نے لسانیات، جو ایک نیا علم ہو اس کا تعارف کرایا ہو۔ علمی حیثیت سے اس علم کی جو قدر اور ترقی خصوصاً یورپ میں ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے بیمز کی ہندوستان کی زبانوں اور ہندوستانی لسانیات سے دلچسپی اور ہندی اردو کے بارے میں اس کے خیالات کو پیش کیا ہو نہ صرف خیالات کو پیش کیا ہو بلکہ اپنی طرف سے جہاں ضرورت پڑی حواشی بھی دیئے ہیں۔ اس سے بیمز کے یہاں کے ابہام کو دور کرنے میں مدد ملتی ہو مثلاً احتشام صاحب نے بتایا ہو کہ بیمز نے اس بات کو کئی جگہ تسلیم کیا ہو کہ ہندی ہی ملک کی سب سے زیادہ عام زبان ہو مگر اس کی ابتدا کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ بیمز کے خاکے سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح نہیں ہوتی کہ اردو کو وہ ہندوستان کی زبانوں میں کون سی جگہ دینا چاہتا ہو۔ بیمز نے ہندی اردو کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہو ان سے احتشام صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بیمز اردو ہندی کو الگ الگ زبانیں تسلیم نہیں کرتا اور دونوں کی مجموعی حیثیت کے لئے ہندی ہی کا لفظ استعمال کرتا ہو۔ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے خصوصاً ہندی والوں نے بیمز کو ہندی کا حامی سمجھ لیا ہو۔ احتشام صاحب اس سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہو کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے
اردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں
ہو کسی عالم لسانیات نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا،
اسی وجہ سے بیمز بھی ان کا ذکر الگ الگ نہیں کرتا"

احتشام صاحب نے بیمز کی کتاب "جدید آریائی زبانوں کی تقابلی قواعد" سے ایک اقتباس کا ترجمہ پیش کرکے بیمز کے اس مبہم خیال کی صریحاً وضاحت کردی ہو اور بتایا ہے کہ بیمز کی مراد ہندی سے اردو ہی ہو۔ اور نیز یہ کہ وہ اردو کو ہندی کی اردو بولی یا ہندی کا اردو دور کہتا ہو کیونکہ اردو کا کوئی جملہ لکھنا ناممکن ہو جس میں آریائی لفظ نہ ہوں۔

احتشام صاحب نے اپنے مقدمے میں اردو کی لسانیاتی حیثیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہو۔ ہمارے بہت سے سیاست داں اور عالم ابھی تک اردو کو بدیسی زبان سمجھتے آئے ہیں اردو میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش اور کثرت نے انھیں ایسا سمجھنے پر مجبور کیا ہو۔ کسی زبان میں غیر زبانوں کے لفظوں کی آمیزش کسی نئی زبان کو جنم دینے یا اس کو بدیسی قرار دینے کا باعث نہیں ہو سکتی جو چیز زبان کی اصلیت اس کے خاندان وغیرہ کا پتا دیتی ہو وہ اس کی ساخت (STRUCTURE) ہو جس میں اس کی صوتی، حرفی و نحوی خصوصیات شامل ہوتی ہیں جو دوسری ہر زبان سے مختلف ہوتی ہیں اور پھر اس زبان کا لسانیاتی اعتبار سے جس خاندان السنہ سے متعلق ہو اس کی ارتقا کی تاریخ اس کے سلسلے کو جوڑنے یا ملانے میں مدد معاون ہوتا ہو اردو اپنی اصلیت، نوعیت اور ساخت کے اعتبار سے ہند آریائی شاخ السنہ سے تعلق رکھتی ہو اور عربی سامی خاندان السنہ سے۔ دونوں زبانوں کی ساخت اور صوتی، حرفی و نحوی خصوصیات سے صاف ظاہر ہو کہ یہ ایک خاندان کی زبانیں نہیں ہیں اس حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر لوگوں نے ہندی کو ہندوستان کی اور اردو کو بیرونی ہند کی زبان قرار دیا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ہند آریائی زبانوں کی تاریخ کی روشنی میں اردو کی لسانیاتی حیثیت کو واضح کیا جائے احتشام صاحب نے اس کی کوشش اپنے مقدمے میں کی ہو اس سلسلے میں سب سے پہلے انھوں نے چند لسانی حقائق کو پیش کیا ہو۔ مثلاً لسانیات کیا ہے اس کی مختصر سی تشریح کرنے کے بعد زبان اور لسانیات، زبان اور سماج دنیا کی زبانیں۔ ان کی لسانی خصوصیات

اور خاندان، ہندوستان کی زبانیں اور ان خاندانوں کا ذکر جن سے یہاں کی زبانوں کا تعلق ہے۔ ہندوستان میں آریوں کی آمد، اور ہند آریائی زبانوں کے عہد بعہد ارتقاء کی مختصر داستان، پراکرتوں کے ادوار، ہندو اور اسلامی تہذیبوں اور ثقافتوں کا اختلاط جدید ہند آریائی زبانوں کا ظہور کھڑی بولی اور اردو کا تعلق۔ اردو کا ارتقا وغیرہ پر احتشام صاحب نے مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

ان باتوں کے علاوہ احتشام صاحب کے مقدمے میں دو اور اہم باتیں بھی ہیں جن کی طرف خاص طور پر اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک اردو کی ابتدا کے بارے میں ہے۔ اور دوسری اردو کے مستقبل کے بارے میں اردو کی ابتدا کا مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔ مختلف لوگوں نے مختلف خیالات اور نظریات اس مسئلے میں پیش کیے ہیں ایک طرف اردو والوں میں میر امن، سر سید احمد خاں، محمد حسین آزاد۔ راجہ شیو پرشاد۔ مولانا سید سلیمان ندوی مولانا محمود شیرانی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں۔ پروفیسر جیولس بلوخ۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی۔ گریہم بیلی وغیرہ کے اردو کی ابتدا کے بارے میں خیالات و نظریات کا تضاد ابھی تک باقی ہے احتشام صاحب نے اس مسئلہ پر اپنا کوئی نقطۂ نظر یا خیال تو پیش نہیں کیا مگر اشارہ ضرور کیا ہے اور اس مسئلے سے دلچسپی بھی لی ہے۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں جن مشہور اہل علم نے اپنے نظریے پیش کیے ہیں ان میں سے چند پر احتشام صاحب نے تنقیدی اشارے بھی کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دو تحریروں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ایک تو ان کے مقدمے ہی میں موجود ہے دوسری ایک چھوٹے سے مضمون کی صورت میں جس میں ڈاکٹر زور کے خیالات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

میں نے ابھی اوپر کہا ہے کہ احتشام صاحب نے اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنا کوئی نظریہ یا خیال نہیں [illegible] کیا ہے مگر اشارہ ضرور کیا ہے جس سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ اردو کھڑی بولی کا نیا روپ ہے۔ کھڑی بولی کا یہ نیا روپ ہند میں مسلمانوں کی آمد اور یہاں ان کی تہذیب اور ان کے تمدن سے ان کا سابقہ اور [illegible] اور ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل و مستحکم حکومت قیام کی وجہ سے ظہور میں آیا۔ مسلمانوں کی ہند میں آمد کی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے" اور اس کا ذکر سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور لسانی کڑیوں کو ملانے کے لئے بے حد ضروری ہے آریوں سے لے کر محمود غزنوی اور پھر مغلیہ سلطنت کے زوال تک متعدد صدیوں میں تبدیلیاں اس برصغیر میں ظہور پذیر ہوئیں ان کی داستان طویل ہے جن کو پیش کرتے ہوئے احتشام صاحب لکھتے ہیں:

"مختصر ترین لفظوں میں یہ تاریخ کے ان ادوار کا خاکہ ہے جن میں جدید ہند آریائی زبانوں کی تشکیل عمل میں آئی۔ ان متعدد صدیوں میں تہذیبی اختلاط کی کیا مختلف نوعیتیں رہیں۔ زمان و مکان میں اس اشتراک کی جڑیں کتنی گہری پیوست ہوئیں اس کا پتہ زندگی کے ہر شعبے سے چلتا ہے تفصیل کا موقع نہیں لیکن اشارے ضروری ہیں کیونکہ ان کو سمجھے بغیر لسانی ارتقا کی ماہیت اور نوعیت کا سمجھنا دشوار ہو جائے گا" [1]

احتشام صاحب نے دو تہذیبوں کے اختلاط اور اس کے اثر کی وضاحت کی اور بتایا ہے کہ یہ الگ الگ دو زبانوں [illegible] طرح پڑتا ہے جبکہ ایک قوم فاتح ہو اور دوسری مفتوح۔ [illegible] سلسلے میں انھوں نے مشہور ماہر لسانیات آٹو یسپرسن کی [illegible] زبان، اس کی ماہیت، ارتقا و ابتدا" کے ایک حوالے [illegible]

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ دیباچۂ مترجم ص [illegible] [2] ایضاً

ترجمہ دیا ہے جو ایک اور عالم لسانیات جارج ہمبل کی تحقیقات کا خلاصہ ہے۔ ان خیالات کو احتشام صاحب نے اردو کے سلسلے میں یوں مربوط کیا ہے۔

"یہ خیالات بہت اہم ہیں کیوں کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے جو معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر اثر انداز ہوا اور جس نے یہاں کے لسانی ارتقا کو ایک مخصوص شکل میں متاثر کیا ....

یوں ہندوؤں مسلمانوں کے میل جول میں صرف مادی اور خارجی صورتوں کا مطالعہ ہم کو کسی نتیجہ تک نہ پہونچائے گا بلکہ اشتراک کے جو باطنی اور روحانی پہلو پیدا ہوگئے تھے وہ بھی اہم ہیں۔ ہمارے پیش نظر اس وقت صرف اس اختلاط کے لسانی پہلوؤں کا مطالعہ ہے اس میں بھی اس مذہبی اختلاط کا آنا لازم ہے کہ اس کا تذکرہ چاہے کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو ناگزیر ہے۔"

احتشام صاحب کی نظر میں کھڑی بولی کے نئے روپ اختیار کرنے کے بہت سے اسباب تھے ان میں سے سکندر لودھی اور ٹوڈرمل کے فرامین کو بھی انھوں نے اہمیت دی ہے جن کی وجہ سے ہندو فارسی کی طرف مائل ہوئے۔ دوسری طرف عوامی زبان میں فارسی عربی الفاظ کا استعمال خاص کر دہلی کے گرد و پیش کی زبانوں میں جن سے ایک مشترکہ تہذیب کی نمائندگی اور تشکیل ہو رہی تھی۔ اردو کے آغاز یا اس کی اساس کے بارے میں احتشام صاحب نے جو اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اردو کی اساس کھڑی بولی ہے یا بالفاظ دیگر اردو کھڑی بولی کا نیا روپ ہے۔ اس نئے روپ کو شروع شروع میں زبان دہلوی، ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ دکن پہنچ کر دکنی کہلائی اور گجرات میں گجری۔ پھر ریختہ زبان اردو، اردوئے معلّٰی کہی گئی۔ مغربی مصنفین نے ہندستانی یا ہندستانی کا لفظ بھی اس کے لئے استعمال کیا۔ جتنی ترقی کی منزلیں اس نے طے کیں اتنے ہی اس کے نام پڑے چنانچہ احتشام صاحب آسانی کے لئے اسے اردو یا ہندستانی کہنا مناسب سمجھتے ہیں اور لکھتے ہیں؛

"جب کھڑی بولی اردو کی شکل میں ترقی کر گئی تو ہندو مسلمان دونوں اس کے گرد جمع ہو گئے کسی نے اسے یہ کہہ کر نہیں ٹھکرا دیا کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا"[1]

اردو کی ابتداء کے بارے میں کئی لوگوں نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے ہیں ان میں سے چند کا ذکر اوپر آچکا ہے ان خیالات میں کچھ سنجیدہ بھی ہیں اور کچھ غیر سنجیدہ۔ غیر سنجیدہ خیالات کو چھوڑ کر جن لوگوں نے واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے میں دلچسپی لی ہے ان میں جیولز بلاخ، پروفیسر چٹرجی، ڈاکٹر زور، مولانا محمود شیرانی، پروفیسر مسعود حسین خاں ہیں لیکن ان کے آرا سے بجائے اتفاق کے اختلاف ہی پیدا ہوتا آیا ہے مثلاً جیولز بلاک، چٹرجی اور زور کے خیالات کو احتشام نے خلاصہ کر کے یوں پیش کیا ہے اور اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے۔

"جیولز بلاک (فرانسیسی ماہر لسانیات) نے جو نظریہ پیش کیا ہے اور جسے ڈاکٹر زور نے تسلیم کیا ہے اور جو چٹرجی کے یہاں بھی ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا بعد میں ایک بولی پنجابی بن گئی دوسری کھڑی بولی۔ اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کا مشترک سرچشمہ تھی یہی وجہ ہے کہ اردو میں دونوں کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن چونکہ دہلی مدتوں صدر مقام رہا

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ دیباچہ مترجم ص ۲۵-۲۶

اس لئے اردو کا تعلق کھڑی بولی سے زیادہ ہے" ۔

مولانا محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" مطبوعہ ۱۹۲۸ء میں بڑی شد و مد کے ساتھ اردو کا جنم دیس پنجاب کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ پنجابی میں انہیں چند ایسی باتیں نظر آئیں جو اردو میں بھی موجود ہیں انھوں نے اردو کو پنجابی سے بعد کی پیداوار سمجھ لیا اور دونوں زبانوں میں چند لسانی مماثلتوں کو بنیاد بنا کر یہ نظریہ قائم کیا کہ اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی اور اس بات پر زور دیا کہ اردو کی ابتدائی ساخت کو پنجابی سے متعلق تسلیم کیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے احتشام صاحب نے اپنی لسانی بصیرت اور مطالعہ کی بنیاد پر اتفاق نہیں کیا اور اس نظریے کے تسلیم کرنے میں جو دشواری انھیں نظر آئی تھی اس کی طرف یوں اشارہ کیا۔

> لیکن دشواری یہ ہے کہ اول تو خود پنجابی کے تشکیل پانے کا وہی زمانہ ہے دوسرے یہ کہ دہلی میں خود لاہوری سے مختلف ایک بول چال کی زبان تھی جسے امیر خسرو نے دہلوی کہا ہے اس لئے اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دہلی کے نواح کی بولیوں میں جس نئی بولی کا نشو و نما ہوئی وہ نئی الگ حیثیت رکھتی تھی اور پنجابی سے بہت سی مماثلتیں رکھنے کے باوجود محض اس کا تسلسل یا روپ یا نتیجہ نہیں تھی اور نہ اس کی ابتدا غلاموں کے عہد میں پنجابی مسلمانوں کے دہلی آنے کے بعد ہوئی" ۔[1]

پروفیسر احتشام نے یہاں جو بات کہی ہے وہ ایک لسانی بصیرت کا ثبوت ہے جو ان میں لسانیات کے مطالعے سے پیدا ہوئی تھی۔ احتشام صاحب نے جب بیمز کی کتاب کا ترجمہ کیا اس وقت پروفیسر مسعود حسین خاں کی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" منظر عام پر آ چکی تھی صاحب نے اس کا مطالعہ کیا اردو زبان میں یہ کتاب ہے جو اردو کی لسانیاتی حیثیت کی صحیح تصو[یر پیش] کرتی ہے اس میں اردو کا سلسلہ ہند آریائی شاخ سے ملاتے ہوئے ہند آریائی زبان کی ہندوستان[ی] اور اس کے ادوار کی نشاندھی کی گئی ہے۔ میرا [خیال ہے کہ اس وقت کسی بھی اردو کے اہل علم نے] پروفیسر مسعود حسین خاں کی کتاب کو اتنا نہیں سمج[ھا] اتنا فائدہ نہیں اٹھایا جتنا پروفیسر احتشام حسین [نے]۔ احتشام صاحب نے پروفیسر مسعود حسین کی بہت سی [باتوں] سے اتفاق کیا ہے مثلاً اردو کی ابتدا کے سلسلے [میں] مسعود حسین دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں کو اہ[میت] دیتے ہیں اور ان کے مطالعہ پر زور۔ احتشام صاحب بھی اس خیال سے متفق ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی کتاب "اردو [زبان] کا ارتقا" میں یہ خیال پیش کیا کہ اردو کا ماخذ پا[لی ہے] کیونکہ قواعدی ساخت کے اعتبار سے اردو سب سے زیادہ پالی سے ہی مماثلت رکھتی ہے۔ اردو کی قد[امت] کو زیادہ سے زیادہ یعنی مسلمانوں کی ہند میں آمد [سے] صدیوں تک پیچھے لے جانے کی دھن میں شوکت [صاحب] نے اردو کا سلسلہ پالی سے ملانے کی کوشش کی۔ [احتشام] صاحب نے ان کے اس خیال کے بارے میں ص[رف] اتنا کہا کہ:

> یہ بہت بحث طلب مسئلہ ہے اور ابھی اس کے تسلیم کئے جانے کا کافی مواد فراہم نہیں ہے[2]

البتہ احتشام صاحب نے جیولز بلاک کی رائے [کو] قرین قیاس سمجھا ہے۔ لکھتے ہیں:-

---

[1] ہندستانی لسانیات کا خاکہ صفحات ۵۷۔ ۵۸

"ابتدائی تحریری مواد کے کم ہونے کی وجہ سے قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہو لیکن جیولز بلاک نے جو بات کہی ہو وہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہو اس سے اس نظریہ کو بھی نقصان نہیں پہنچا کہ اردو کی ابتدائی ہیئت ترکیبی میں پنجابی کا زبردست ہاتھ ہو۔ اردو کی صوتی خصوصیات اسے برج بھاشا سے دور رکھتی ہیں لیکن پنجابی ہریانی اور کھڑی بولی کی صوتی خصوصیات ابتدائی اردو میں پائی جاتی ہیں بعد میں ایسی تبدیلیاں ہوتی گئیں جنھوں نے اسے پنجابی سے اور دور کر دیا اور کھڑی بولی نکھرتی گئی یہاں تک کہ محض بولی چال کے دائرے سے نکل کر وہ ایک ادبی زبان بن گئی"۔ ۳۵

اردو کی ابتدا کے بارے میں احتشام صاحب کا ذہن بھی کچھ الجھا الجھا ہی رہا کبھی وہ جیولز بلاک، جیرجی زور کے خیالات سے متفق نظر آتے ہیں کبھی پروفیسر مسعود حسین کے خیالات سے البتہ انھوں نے مولانا شیرانی اور شوکت سبزواری کے خیالات کو تسلیم نہیں کیا ہے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہو۔

احتشام صاحب کے مقدمے میں بہت سی باتوں کا ذکر ملتا ہو جن میں سے اہم اردو کی پیدائش وارتقا کی مختصر داستان ہو اور اس کے پس منظر میں احتشام صاحب نے قومی زبان کے مسئلہ کو چھیڑا ہو جو ان کے لئے اس کتاب کے ترجمہ کرنے اور اس میں ایک طویل مقدمہ لکھنے کا محرک ہوا۔ سب سے پہلے انھوں قومی زبان کے مسئلہ کی نوعیت سمجھائی ہو اور بتایا ہو کہ ہندوستان میں زبان کے مسئلے نے جو شکل اختیار کی ہو اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کبھی اور کسی جگہ نہیں ملتی۔ یہ مسئلہ پیدا ہوا ہو رجعت پسندی، گمراہ حب الوطنی، فرقہ پرستی، لاعلمی، بدنیتی اور کسی حد تک علمی اور عملی دشواریوں کی وجہ سے۔ اٹھارویں صدی میں ہندو اور مسلمان دونوں اردو کو اپنی مشترک زبان سمجھتے تھے۔ بھارتیندو ہریش چندر نے جو جدید ہندی کے بڑے مصنف اور مبلغ تھے اس بات کو انیسویں صدی کے وسط میں تسلیم کیا۔ گلکرسٹ، گارساں دتاسی، راجہ شیو پرشاد سب اس بات کی شہادت دیتے رہے کہ اردو ہی ملک کی قومی زبان ہو لیکن جو زبان ایک زمانۂ دراز سے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان بن چکی تھی اب اس کی مخالفت کی جانے لگی تھی۔ احتشام صاحب بڑے دکھ کے ساتھ اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جاہل لوگ اپنی سیاسی اغراض کے پیش نظر زبان کو مذہبی بنا رہے ہیں۔ تاریخ میں کہیں ایسا نہیں ہوا۔ صدیوں سے ایک زبان جو کسی مخصوص مذہب یا طبقے سے وابستہ نہیں تھی جو قومی وحدت کی شیرازہ بندی کا ذریعہ تھی اس کے ہوتے ہوئے پھر ایک قومی زبان کا مسئلہ کھڑا کیا گیا ہو۔ یہ بات انھیں الجھن میں ڈال رہی تھی اس کا جواب وہ اس طرح دیتے ہیں۔

> انیسویں صدی میں جب انگریزی سیاست نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریقی رجحانات کو بڑھایا نئے متوسط طبقے نے اصطلاحی تحریکیں پیدا کیں جنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں الگ الگ اصلاح کا کام شروع کیا۔ ہندو اور مسلم قوم پرستی کی جداگانہ جذبہ پیدا ہوا اس وقت زبانیں بھی مذہب کی ترازو پر تولی جانے لگیں فورٹ ولیم کالج میں پہلی اہم ہندی کی نثر کی کتاب ایسی ہندی میں لکھوائی گئی جو قدیم ہندی کی کسی ادبی شاخ سے تعلق نہ رکھتی تھی..... لیکن جب للو لال جی سے پریم ساگر

لکھوائی گئی اس وقت سے جدید ہندی یا ادبی ہندی کی بنیاد پڑی"۔ ؎۵

ہندوؤں نے اپنی ہندی میں سنسکرت کے تحت قسم کے الفاظ استعمال کرنے شروع کئے اور زبان جو کسی زمانے میں ایک تھی اب دو روپ بدل کر سامنے آنے لگتی ہے احتشام صاحب کے خیال کے مطابق کھڑی بولی فارسی عربی اور سنسکرت کے عام فہم الفاظ کے ساتھ ہندوستان کی عام زبان ہو زیادہ فارسی آمیز کھڑی بولی کو وہ مسلمانوں کے اونچے طبقے کی پسندیدہ زبان مانتے ہیں اور زیادہ سنسکرت آمیز ہندی کو قوم پرست اونچے طبقے کے ہندوؤں کی اس طرح ان کے خیال میں اردو ہندی کے بنیادی حصے میں وحدت ہو صرف اس کے اوپری ڈھانچے میں فرق لیکن احیائے تہذیب کے جوش نے مشترک حصے کو نظر انداز کر کے تفریق پیدا کرنے والے حصے کو اور بڑھا دیا اس طرح ہندی اردو کا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ احتشام صاحب کا یہ بھی خیال ہو کہ جدید ہندی کے کھڑی بولی پر مبنی ہونے سے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی فائدہ یوں کہ جدید ہندی مشترک زبان کی بنیادوں سے قریب ہی لیکن نقصان یہ ہوا فارسی عربی کے وہ لفظ بھی نکالے جانے لگے جو عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے اور مشترک سرمایہ کا جزو تھے، اور ان کی جگہ نامانوس سنسکرت لفظ استعمال کئے جانے لگے۔ عربی فارسی الفاظ کی وجہ سے اردو کو بدیسی زبان کہا جانے لگا تھا اس لئے اہل علم وسیاست کو یہ یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ ہند آریائی تاریخ کی روشنی میں اردو کا مقام اور اس کی حیثیت ایک بدیسی یا اجنبی زبان کی نہیں بلکہ دیسی اور فطری زبان کی ہو اسی بات کو ظاہر کرنے کے لئے احتشام صاحب نے آتنا طویل مقدمہ لکھا اور پھر قومی زبان کے مسئلہ کو چھیڑا ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم عمل میں آئی ملک تقسیم انسان تقسیم ہوئے اور زبان کو بھی تقسیم کی ضرب لگائی گئی جدید ہندی جس کا ارتقا انیسویں صدی میں ہوا پورے ملک کی سرکاری زبان قرار دی گئی مختلف یعنی صوبوں میں وہاں کی زبانیں سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج ہوئیں۔ دستور ہند میں اور زبانوں کے ساتھ اردو کو بھی جگہ ملی مگر اس کا کوئی علاقہ یا صوبہ متعین نہیں کیا گیا۔ کیونکہ جدید ہندی اور اردو دونوں ایک ہی صوبے میں صدیوں سے رائج تھیں دونوں کا ایک ہی علاقہ تھا۔ پاکستان میں بھی اردو کا علاقہ یا صوبہ کوئی نہ تھا وہ وہاں کی سرکاری زبان تسلیم کی گئی احتشام صاحب نے اپنے مقدمہ میں قومی زبان کے مستقبل کے تحت ہندوستان و پاکستان میں قومی زبان کے مسئلے کا جائزہ لیا ہے اس میں کچھ کہنے سے پہلے وہ اپنے لسانی مطالعے کی روشنی میں اس حقیقت کو پیش کرتے ہیں کہ "زبان کے مستقبل یا مستقبل بعید کے متعلق کچھ کہنا عقل کی بات نہیں لسانیات اور تاریخ کا طالب علم مستقبل قریب کے بارے میں چند اشارے ضرور کر سکتا ہے تاکہ لسانی گتھی نہ الجھ پائے۔ زبان کے مسئلے پر قومی وحدت کا تصور اثر انداز نہ ہو، زندہ اور مستعمل زبانوں کا ارتقا رکنے نہ پائے۔ کسی زبان کے معاملے میں کوئی ایسی ناانصافی نہ ہو جو ظلم اور دباؤ کی شکل اختیار کرلے۔ ان باتوں کے متعلق سائنٹفک اور منصفانہ نقطۂ نظر رکھے بغیر اردو کے مسئلے کو نہ تو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ حل کیا جاسکتا ہے"۔

قومی زبان کے مسئلہ پر احتشام صاحب کا ذہن برابر سوچتا رہا۔ پھر انھوں نے اپنے طور پر کچھ تجاویز اس سلسلہ میں سوچ کر اپنی کتاب میں لکھیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندی قومی زبان قرار دیدی گئی ہے

؎۵ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۶۳

تسلیم کرتے ہوئے علمی انداز میں اسے آسان ہندوستانی ہونے سکے لئے جدوجہد کی جائے۔ اردو کو پنجاب سے لے کر بہار تک علاقائی زبان کی حیثیت دلوائی جائے یہاں احتشام صاحب علمی حیثیت سے ہندی اردو کو الگ زبانیں اور لسانیاتی مفہوم میں ایک زبان تسلیم کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے لیکن اردو کو نظر انداز کر کے نہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اگر کھڑی بولی اردو کی شکل میں پہلے سے موجود نہ ہوتی تو جدید ادبی ہندی وجود میں نہ آتی اس کے علاوہ اردو کی تعلیم ان گھروں اور خطوں میں بھی ہو جہاں یہ لوگوں کی مادری زبان ہو اردو کے لئے فارسی رسم خط ہی بحال رہے۔ ہندوستانی لسانیات کی تعلیم یونیورسٹی میں لازمی کر دی جائے تاکہ زبان کے بارے میں وہ غلط فہمیاں رفع ہوں جو کشمکش کا سبب بنی ہوتی ہیں۔ علمی اصطلاحات بنانے میں فراخدلی سے کام لیا جائے۔ ہندی اردو کے مشترک سرمایہ کا جائزہ لیا جائے آخر میں حکومت کو یہ صلاح دی ہے کہ وہ زبان کے معاملے کو رجعت پسندوں اور موقع پرستوں کے ہاتھ نہ چھوڑے لسانی سامراجیت اور لسانی رومانیت کا مقابلہ کیا جائے۔ احتشام صاحب کے خیال میں اردو زندہ زبان ہے جس میں ملک کے بہت سے بسنے والوں کی ذہنیت ادب کی صورت میں متشکل ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی اسے زندہ رہنا اور ترقی کرنا چاہئے

احتشام صاحب نے ۱۹۴۸ء میں ایک مضمون "اردو کا لسانیاتی مطالعہ" لکھا تھا۔ اپنی لسانی معلومات اور لسانیات کے مطالعے نے ان پر اس حقیقت کو آشکار کر دیا تھا کہ زبان کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے زبان کا علم جاننا ضروری ہے بدقسمتی سے اردو میں اس سلسلے میں کام نہ ہونے کے برابر تھا اردو کا لسانیاتی مطالعہ اردو کی پہچان اور اس کی بنیاد معلوم کرنے کے لئے ضروری تھا۔ اردو میں شعر و ادب کی پڑھائی تو خوب ہوتی رہی لیکن اردو زبان کے مطالعہ کی طرف توجہ نہیں کی گئی اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے احتشام صاحب نے یہ مضمون لکھا اور خاص طور پر لسانیاتی مطالعۂ زبان اور زباندانی کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ "زباندانی زبان کی سماجی نوعیت کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتی جب تک زبان کی لسانیاتی حیثیت کا صحیح علم نہ ہو اس وقت تک اس کی اردو کی تشکیل اور ضرورت کے تحت قابل قبول تغیر یا تبدیلی کی راہ میں قدم بڑھانا درست نہ ہوگا۔ ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے اور مسائل کے ساتھ لسانی مسئلے کی پیچیدگی کو سمجھنے کے لئے اردو زبان کا لسانیاتی مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس طرح کے مطالعے سے کیا مراد ہے اس کا جواب، ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"سب سے پہلی ضرورت تو خود لسانیاتی مطالعہ اور علم اللسان کی اہمیت اور حقیقت کو سمجھنا ہے ..... کہ زبان کی ماہیت کیا ہے۔ اس کے ارتقا اور تغیرات کے محرکات کیا ہیں۔ اس کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں ..... یہ وہ نازک معاملات ہیں جن کا احساس کئے بغیر زبان کے ارتقا کا صحیح علم نہیں ہو سکتا۔"[1]

"زبان اور رسم خط" کے بارے میں احتشام نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہیں کہ "زبان ہی کی طرح رسم خط کا مسئلہ بھی علمی اور غیر جذباتی غور و فکر کا مستحق ہے اس موضوع سے متعلق انھوں نے چند سوالات اٹھائے ہیں مثلاً کیا کسی زبان اور اس کے رسم خط میں باطنی تعلق ہے [illegible] زبان [illegible] کے لئے جو رسم خط استعمال کیے

---

[1] ادب اور سماج از احتشام حسین ص ۴۴

جدا ہو وہی اس کے لئے مناسب ترین ہو اور کیا ایک زبان کو دوسرے رسم خط میں نہیں لکھا جا سکتا اور اگر لکھا جائے تو کیا یہ کوئی غیر فطری کوشش ہوگی؟ کیا اس سے زبان کی اصلیت اور حقیقت بدل جائے گی؟

ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے رسم خط کی ابتدا اور زبان اور اس کے رسم خط کے تعلق کو بتایا ہے رسم خط میں زمانے کے ساتھ ساتھ جو تبدیلیاں ہوتی آئی ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جب رسم خط نہیں تھا زبان کا استعمال محض صوتی حیثیت رکھتا تھا۔ اس وقت زبان کسی رسم خط سے ——— وابستہ نہ تھی۔ تدریجاً رسم خط کا وجود ہوا اور کئی ہزار برس کی مدت میں کئی رسم خط بن گئے لیکن دنیا کا کوئی رسم خط مکمل نہیں ہے۔ زبان اور رسم خط میں جو تعلق ہے وہ کوئی خاص تعلق نہیں بلکہ یہ ہماری روایت اور عادت ہے جو ان میں تعلق پیدا کرتی ہے جس طرح کی عادت ڈالی جائے پڑ جائے گی یعنی اگر انگریزی زبان کو فارسی رسم خط میں اور اردو کو لاطینی یا انگریزی رسم خط میں لکھنے لگیں تو یہ کوئی غیر فطری ناممکن العمل یا علمی حیثیت سے غلط فعل نہ ہوگا۔ ہر زبان میں رسم خط کا ایک مقصد ہوتا ہے آوازوں کی علامتیں مقرر کر کے انھیں استقلال بخشنا۔ کہیں بھی یہ علامتیں معنی کے تعین میں مدد نہیں دیتیں آخر میں احتشام صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زبان اور رسم خط دو الگ چیزیں ہیں اور کوئی زبان کسی بھی رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو اردو کے لئے دیوناگری، لاطینی اور فارسی رسم خط میں سے کسی ایک کے منتخب کرنے کا سوال دوسری نوعیت اختیار کرے گا۔ فطرت، مزاج اور نفسیات کے نام پر بہت سے مغالطے تیار کیے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رسم خط بدل جائے گا تو زبان بدل جائے گی یا خراب ہو جائے گی اگر اس بحث سے معقول نتائج برآمد ہوئے تو پھر یہ بحث شروع کی جا سکتی ہے کہ کسی رسم خط کے اختیار کرنے میں کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے اور آج اس مسئلے کی نوعیت کیا ہے؟ احتشام نے یہاں اس بات پر غور نہیں کیا رسم خط کے پیچھے بھی ایک تہذیبی تعلق ہے جو زبان والوں کو عزیز ہوتا ہے رسم خط ایک طرح سے لباس ہے اور اسے اتار کر دوسرا لباس جس سے پہلی نظر میں اجنبیت کا احساس ہو کسی طرح مناسب نہیں ہاں رسم خط میں ضرورت کے مطابق مناسب و معقول تبدیلیوں کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے اور کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔

پاکستان میں اردو کے مسائل اور اس کی حقیقت کے بارے میں احتشام صاحب نے ایک فکر انگیز مضمون لکھا ہے اور وہاں کی لسانی پیچیدگیوں کی دوری کو سمجھانے کے بارے میں چند باتیں بتائی ہیں جو باتیں پاکستان میں اردو کی ترقی کے لئے سازگار ہیں ان میں پشتو، بلوچی، سندھی اور اردو کا رسم خط ہے جس میں تھوڑی بہت یکسانیت ہے دوسرے شمالی ہند کے اردو پناہ گزینوں کا اجتماع تیسرے وہاں پہلے سے اردو ادب کی روایت کا موجود ہونا۔ مضمون کے آخر میں قومی زبان بنانے کے لئے اردو کے لئے کیا کرنا چاہیئے اس کے سلسلے میں تجاویز پیش کی ہیں۔

احتشام صاحب نے بچوں کے لئے آسان زبان میں "اردو کی کہانی" لکھی ہے جس میں اردو زبان کے آغاز سے لے کر اب تک کی ترقی کی مختصر کہانی آسان اور عام فہم زبان میں ہے۔ یہ کتاب کافی مقبول ہوئی ہے۔ اردو میں اس سے پہلے ایسی کوشش کسی نے نہیں کی تھی۔ اپنی زبان کے بارے میں معلومات رکھنا ہر آدمی کا فرض ہے اردو والوں کو ابھی تک اس فرض کا احساس نہیں تھا۔ احتشام صاحب کی کتاب سے کم از کم کچھ تحریک تو اس سلسلے میں ہوئی۔

اپنے مضمون "مسلمان اور ہندی" میں احتشام صاحب نے جتلایا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کوئی امر اتفاقی نہ تھا بلکہ اس کے دور رس نتائج نکلے ان میں ایک لسانی انقلاب بھی ہے ۱۰۰۰ء کے قبل ہندوستان سے جو مسلمانوں کے روابط تھے ان کا ہندوستان کے لسانی ارتقا پر کوئی گہرا اثر نہیں پڑا ۱۲۰۰ء کے بعد جب مسلمان یہاں آ کر آباد ہو گئے ان کے ساتھ آئی ہوئی زبانیں فارسی عربی وغیرہ نے یہاں کی زبانوں پر اثر ڈالا۔ مسلمانوں میں ایک لسانی تال میل اور لین دین ہوا۔ ایک انڈو مسلم کلچر کی بنیاد پڑی مسلمانوں نے سنسکرت سیکھی مثلاً البیرونی، فیضی، بدایونی، دارا شکوہ وغیرہ نے ایک نئی زبان کا ظہور ہوا جس کا نام "ہندی" بھی مسلمانوں کا تجویز کردہ تھا۔ ویسے مسلمانوں نے لفظ ہندی سے مراد ہندوستان کی کسی بھی زبان سے لی ہے مگر اب یہ لفظ ایک خاص زبان سے مخصوص ہو گیا ہے۔ ہندی مختلف شکلوں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رائج رہی۔ ہندو اور مسلمان برابر اس میں لکھتے پڑھتے اور ادب کی تخلیق کرتے رہے برج بھاشا کے ادب میں عبدالرحیم خان جاناں۔ رحمن، رس کھان، تان سین کے نام میرا بائی۔ سورداس۔ بہاری لال کے ساتھ ساتھ عزت سے لئے جاتے ہیں۔ اودھی میں قطبن۔ ملک محمد جائسی کو کبیر اور تلسی داس کے برابر جگہ دی جاتی ہے وغیرہ چنانچہ ہندی جن شکلوں میں رائج تھی ان میں مسلمانوں نے بھی خاطر خواہ اضافہ کیا اور انھیں یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا گیا کہ وہ مسلمان ہیں۔ مسلمان شعرا نے صرف ہندی زبان میں شاعری نہیں کی بلکہ انھوں نے اپنے اندر بھگتی کی روح کو بھی جذب کر لینا۔ مسلمان بادشاہوں اور امیروں نے ہندی شاعری کی سرپرستی کی تو دوسری طرف اپنے بچوں کو ہندی پڑھانے کا انتظام کروایا

مرزا خاں کی تحفۃ الہند جو برج بھاشا کی قواعد سے متعلق ہے یہ اسی مقصد کے تحت لکھوائی گئی تھی۔ مسلمان فارسی عربی کے ساتھ ہندی پر بھی عبور حاصل کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دہلی کے گرد و پیش میں جو ایک نئی زبان کا نشو و نما ہو رہا تھا اس میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں لکھتے پڑھتے رہے یہ زبان کسی مخصوص لسانی علاقے میں محدود نہیں تھی بلکہ ملک کے ہر ایک حصے میں پہنچ رہی تھی مسلمانوں نے ہندی کی سرپرستی کی اسے اپنایا اس میں شاعری کی مگر جب سے انگریزی حکومت شروع ہوئی مسلمان ہندی سے دور ہوتے چلے گئے اس لئے کہ انگریزوں کی شاطرانہ چالبازی سے ہندوستانی کی دو شکلیں ہندی اور اردو کے نام سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ الگ منسوب کر دی گئیں۔ ہندی اردو کا جھگڑا کھڑا کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ دلوں میں دوری آ گئی آج مسلمان ہندی نہیں پڑھتے بہت کم مسلمان ہندی کو عالمانہ حیثیت سے جانتے ہیں۔ مسلمانوں کو ہندی اور ہندوؤں کو اردو سیکھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ دونوں اس ملک کی زبانیں ہیں دونوں ہمارے تہذیبی ڈھانچے میں اپنی جگہ رکھتی ہیں پہلے انھیں کبھی یہ خیال نہیں ہوا تھا کہ ہندی کی خدمت ہندو دھرم کی خدمت ہے اور اردو کی خدمت دین اسلام کی لیکن آج بہت سے لوگ اس بیمار ذہنیت کا شکار ہیں اس لئے اس بیماری کا علاج ہونا چاہیئے۔

"زبان اور تہذیب" کا کیا رشتہ ہے۔ معاشرے میں ان دونوں کی اہمیت اور نوعیت کیا ہے اس چیز کو احتشام صاحب نے اپنے اس مضمون میں واضح کیا ہے۔ انسان کو ہر ہر قدم پر زبان کی ضرورت ہے، زبان ایک سماجی عمل ہے۔ سماجی نشو و نما مختلف اداروں کے ذریعے ہوتی ہے یہ ادارے تعلیمی، سیاسی، مذہبی

تہذیبی وغیرہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی بقا کے لئے زبان سے کام لیتا ہے۔ تعلیم، سیاست، مذہب، تہذیب سب کی بقا کا انحصار زبان پر ہے جب کسی پر کسی دوسری قوم کا غلبہ ہو جاتا ہے تو محکوم قوم کو اپنی تہذیبی قدروں کا احساس ہوتا ہے اور یہی قومی زندگی کا محافظ بنتا ہے ایسے میں زبان ہی سب سے نمایاں کام انجام دیتی ہے۔ احتشام صاحب نے مختلف قوموں اور ملکوں کی مثالیں پیش کر کے بتایا ہے کہ کس طرح زبان کسی قوم کی تہذیب کی دین ہوتی ہے اور زبان اور تہذیب کے رشتے میں کتنی گہری معنویت ہے۔ ماہرین لسانیات کی علمی تحقیقات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احتشام صاحب ان پر ایک اعتراض یہ کرتے ہیں۔

"آج کل ماہرین لسانیات زبان کے اس پہلو پر زیادہ زور دے رہے ہیں کہ انسان کے اعضاء خاص کر حلق، تالو، زبان، دانت اور ہونٹ کس طرح زبان اور اس کی آوازوں کی شکل متعین کرتے ہیں۔ یقیناً زبان کے علمی مطالعے کے لئے یہ بات ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ الفاظ نے کس طرح انسانی دلوں اور دماغوں کو خاص قسم کے تہذیبی سانچوں میں ڈھالا ہے"

احتشام صاحب کا یہ اعتراض بجا بھی ہے اور نہیں بجا یوں کہ زبان کے مطالعہ کو اگر محدود کر دیں تو وہ ایک خاص علمی بحث کا موضوع بن کر رہ جائے گا حقیقت میں ایسا نہیں ہے لسانیات اب ایک وسیع علم بنتا جا رہا ہے اس کی مختلف شاخیں اب زبان کے ہر پہلو کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہیں ——— (SOCIOLINGUISTICS) یعنی سماجی لسانیات جو لسانیات کی ایک شاخ ہے اس میں زبان اور تہذیب کے گہرے رشتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ابھی یہ علم ابتدائی منزلوں میں ہے اور اس کے آئین و اصول بھی ابھی بن رہے ہیں۔

احتشام صاحب کا ایک مضمون "صحت زبان کے لسانیاتی پہلو" ہے اس مضمون میں انھوں نے زبان کے معیاری ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس سوال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اس میں صوتی، صرفی اور معنوی تغیرات ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس کی ابتدائی اور آخری شکل میں زمین آسمان کا فرق معلوم ہونے لگتا ہے تاریخی اور سیاسی، تہذیبی اور تجارتی اثرات کے تحت زبانوں میں لین دین تعلیم و تربیت کے ماتحت لسانی تبدیلی، قواعد کی پابندی، ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں کے استحکام معیار اور عوامی ضروریات کے زیر اثر تلفظ میں تبدیلی نئے الفاظ و تراکیب کا ظہور، قواعد نویسوں اور علم لغت کے ماہرین کی سخت گیری یہ ساری بیرونی زبان کے ڈھانچے میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہیں اور ہر دور اپنی ضروریات اور محرکات کے زیر اثر اپنی زبان کا معیار بدل دیتا ہے۔ بعض لوگ اسے زبان کی خرابی کا نام دیتے ہیں اور جہالت سے موسوم کرتے ہیں لیکن زبان کا دھارا بنتا رہتا ہے۔ عہد وسطیٰ کی پراکرتوں میں ایسا ہی ہوا۔ قدیم اردو کے دکنی روپ میں یہ ہوا شمالی ہند کی اردو میں بھی یہی عمل ہوا شمالی ہند میں آگرہ کے دار السلطنت ہونے کی وجہ سے دہلی کی اردو پر گوالیار آگرہ اور متھرا کی برج کا اثر اتنا زیادہ پڑا کہ خان آرزو نے زبان گوالیری سے سندلی اور دلی کی بول چال کی اردو کے مقابلے میں اسے معیاری مانا۔ کچھ دنوں بعد جب فارسی سے متاثر اردو شعراء اور محققین نے زبان کا معیار بدلنے کے لئے برج بھاشا سے زبان کو

ور متروکات کا سلسلہ شروع کر کے زبان سے بہت
اظ نکال دیئے اور ایک نیا لسانی معیار بنایا جس
، دہلی اسکول کے شعرا کرنے لگے یہی شعرا جب
نچے تو تھوڑے ہی دنوں میں لسانی معیار پھر بدلا
ن کی مرکزیت کے بارے میں بحثیں چھڑ گئیں۔
صاحب کہتے ہیں کہ ان بحثوں میں لوگ دلچسپی
سامنے رکھتے ہیں کیا یہ کافی ہے۔ اس کا جواب
ے وہ کہتے ہیں کہ زبان کا اصل مقصد ترسیل
زبان کے لئے صحیح اور غلط کے الفاظ استعمال
ست نہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ قابل فہم یا نہیں یہی
صحت کا معیار ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا
ان کی صحت کے مسئلے پر ایک جرمن عالم کے
ے مطابق تین نوعیتوں سے بحث ہوسکتی ہے
تاریخی نقطۂ نظر سے (۲) تعیر لسانی کے
نظر سے اور (۳) قابل فہم ہونے کے نقطۂ نظر
ھنا چاہیئے یہی صحیح نقطۂ نظر بھی ہے آخر میں
ہیں کہ ان کی باتوں سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ
ن کے معاملے میں رواج یا لاقانونیت کے حامی
صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب ہم صحیح اور غلط
ق فیصلہ صادر کریں تو محض لغت اور قواعد کو
د رکھیں بلکہ بہت سے ان پہلوؤں کا بھی جائزہ
زبان کا معیار بنانے اور بدلنے پر اثر انداز
یں۔

ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کا پس منظر مختصر طو
کرنے کے بعد احتشام صاحب لکھتے ہیں کہ اس
ایں اردو زبان کے سائنٹفک اور لسانیاتی
کا مطلب یہ ہے کہ زبان کی سماجی پیدائش کو تسلیم
ن کے ارتقا اور تغیر پر اصولی حیثیت سے غور
ے۔ احتشام صاحب کا مطالعہ لسانیات بہت

محدود تھا انھوں نے اپنے اس مختصر سے مضمون میں اردو کے لسانیاتی مطالعے میں جن باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ دینی تھی ان کا ذکر نہایت ہی سرسری اور نامکمل طریقے پر کیا ہے آج زبان کے لسانیاتی مطالعے میں زبان کا مطالعہ دو پہلوؤں سے کیا جاتا ہے (۱) توضیحی (۲) تاریخی۔ احتشام صاحب نے اپنے مضمون میں اردو زبان کے تاریخی اعتبار سے لسانیاتی مطالعے پر زور دیا ہے توضیحی مطالعے کے سلسلے میں کچھ نہیں کہا۔ توضیحی مطالعہ میں زبان کی اصوات، الفاظ اور ان کے اجزا کی تشکیل، نحوی ساختوں کا بیان، معنوی ساختیں وغیرہ شامل ہیں آج جدید لسانیات میں توضیحی لسانیات نے حیرت انگیز ترقی کر کے زبان کے مطالعہ کو ریاضی کے جیسے اصول دے دیئے ہیں۔ احتشام صاحب سے جب کبھی میری ملاقات ہوئی میں نے ان سے جدید لسانیات کی اس ترقی اور کوشش کا ذکر کیا اس پر وہ نہایت دلچسپی کا اظہار کرتے اور کبھی کبھی یہ کہتے کہ بھئی یہ باتیں، ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ آپ لوگ اس میدان میں ہیں آپ اپنی دلچسپی کو جاری رکھئیے اور اردو پر کام کیجئے۔

احتشام صاحب کی لسانیات میں دلچسپی زیادہ تر تاریخی پہلو سے رہی۔ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے رسالہ "ہند آریائی، مسلمانوں کی آمد سے پہلے" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا اور اس مضمون کی تیاری میں انگریزی اور ہندی کی مشہور لسانیاتی کتابوں سے مدد لی۔ احتشام صاحب کا یہ مضمون ان کے مقدمہ کے مضمون سے زیادہ تفصیلی اور زیادہ معلوماتی ہے

احتشام صاحب کی لسانی مسائل سے دلچسپی برابر جاری رہی موقع بموقع انھوں چھوٹے چھوٹے مضامین اس سلسلے میں لکھے۔ انھوں نے آسان الفاظ میں زبان

کی اہمیت، سماج میں اس کا رول۔ کلچر کی تشکیل میں اس کا حصہ، زبان کا معیار وغیرہ سے متعلق اپنی معلومات اور خیالات کو بھی کہا ہو احتشام صاحب کے یہ مضامین اردو کے لسانیاتی ادب میں ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھے اور پڑھے جائیں گے۔ ان مضامین میں معلومات کے ساتھ ساتھ دعوت فکر و نظر بھی ہے جو احتشام صاحب کے مضامین کا خاص وصف ہے۔

آخر میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ ہے احتشام صاحب کی ترقی اردو بورڈ حکومت ہند کی اردو لسانیاتی اصطلاح سازی کمیٹی میں شرکت اس کمیٹی میں میں بھی ایک رکن ہوں پچھلے سال احتشام صاحب اگست میں اس کمیٹی کے سمینار میں علی گڑھ آئے تھے ان سے میری یہ آخری ملاقاتیں تھیں جو ان کے علی گڑھ میں تین دن کے قیام میں ہوئیں اس کمیٹی میں پروفیسر مسعود حسین۔ پروفیسر گیان چند۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی بھی ہیں۔ ہم سب لسانیات کی اصطلاحوں پر غور کرتے بحث مباحثہ کرتے اور اصطلاحیں وضع کرتے تھے احتشام صاحب بیشتر خاموش رہتے اور نہایت سوچ سمجھ کر کوئی لفظ یا اصطلاح پیش کرتے۔ اصطلاح سازی کے دوران انھوں نے ہمیشہ رائے عامہ کا احترام کیا معقول اور مناسب اصطلاح کو پسند کیا۔ ترقی اردو بورڈ کی جانب سے احتشام صاحب کو گریرسن کے لسانی جائزہ ہند جلد نہم کا اردو ترجمہ کرنے کی پیش کش کی گئی تھی اس کے علاوہ معنیات پر بھی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ان سے کروایا جا رہا تھا۔ دونوں کام پورے نہ ہو سکے اس کا بے حد افسوس ہے۔ بہرحال احتشام صاحب نے اردو کے لسانیاتی ادب میں اپنی چند تحریروں سے جو اضافہ کیا ہے وہ قابل قدر بھی ہیں اور نہایت وقیع!

صباح الدین عبدالرحمان

احتشام صاحب کا مطالعہ غالب
اور میری ذہنی کش مکش

احتشام صاحب کو مرحوم لکھتے وقت قلم تھرتھرا جاتا ہے، دل روتا ہے، آنکھیں نم ہوتی ہیں، ان کی وفات کو تقریباً تین مہینے گذر گئے، لیکن آج بھی رواں رواں سوگوار ہے، جب کبھی یاد آتے ہیں، دل کو ایک چوٹ لگتی ہے، کسک محسوس ہوتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں، یہ چل رہے ہیں۔ وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جا رہے ہیں، لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش کر رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔

آخری بار ان سے ۵ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو علی گڑھ میں جامعۂ اردو کے ایک جلسہ میں ملا، ان کو تمام رعنائیوں کا مظہر اور ان میں تمام رنگینیوں کا منظر پایا، جلسہ میں تمام اراکین کچھ نہ کچھ بول رہے تھے، مگر ان کی رنگین خاموشی میں رنگین پیام اور رنگین کلام کا اظہار ہو رہا تھا، وہ بڑے ہی شیریں بیاں مقرر تھے، مگر جلسوں کی کارروائیوں میں اپنی طلاقت اور فصاحت کو اپنی شرافت اخلاق سے ٹکرانا پسند نہ کرتے۔ سب کی سن لیتے، سن کر خاموش رہتے۔ اور جب بولتے تو معلوم ہوتا کہ وزن اور وقار بول رہا ہے۔ وہ مجھ سے دارالمصنفین اور شبلی کالج کے ناطہ سے بڑی گرم جوشی سے ملتے، اور اس میں دو آتشہ کی کیفیت اس لیے بھی پیدا ہو جاتی، کہ دارالمصنفین اور شبلی کالج دونوں ان کے وطن مالوف میں تھے، علی گڑھ میں اپنے دیرینہ اخلاق سے ملے، شبلی کالج کی بزم ادب کے سالانہ جلسہ میں نہ پہنچنے کی معذرت کرتے رہے، اور پھر وعدہ اور حتمی وعدہ کیا، کہ وہ نومبر میں شبلی کالج میں ضرور آئیں گے، اور شبلی منزل ہی میں قیام کریں گے۔ مگر جب ان کے آنے کے دن قریب ہوتے تو ہوا کے دوش پر ان کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی۔

ان سے بارہا ملاقاتیں ہوتی رہیں، کبھی دہلی، کبھی لکھنؤ، کبھی الہ آباد اور کبھی اعظم گڑھ میں، ۹ ستمبر ۱۹۷۲ء کو الہ آباد میں ہندستانی اکیڈمی کے جلسہ میں ملاقات ہوئی۔ اردو کے مایۂ ناز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی ان سے اسی طرح محبت، شفقت اور اخلاص سے ملے، جس طرح جن تھ کے ایک لاکھ روپیہ کا انعام پانے والے ہندی کے مشہور شاعر سمترا نندن پنت ان سے ملے۔ مولانا عبدالماجد اور احتشام صاحب کے ذہنی رجحانات اور میلانات میں بعد المشرقین تھا، لیکن دونوں اس طرح ایک دوسرے کے قدرداں رہے کہ معلوم ہوتا تھا، کہ خیالات اور نظریات کے دریاؤں کی دوری کے باوجود بھی سنگم کا پیدا ہونا ممکن ہو سکتا ہے۔ ہندستانی اکیڈمی کے اس جلسہ میں احتشام صاحب اتنے بلند اور شریف دکھائی دیے، کہ متنازع فیہ مسائل کو طے کرانے میں ہر شخص کی زبان پر ان ہی کا نام ہوتا۔ اس جلسہ کے بعد مجھکو اپنے گھر لے گئے، جہاں جاکر ایسا محسوس ہوا، کہ اپنے کسی قریبی عزیز کے گھر پہنچ گیا ہوں، میرے جیسے ملنے والے ان کے بہت تھے، اور ہر شخص ان سے مل کر اپنے دل میں اثر لیتا، ان کے ملنے جلنے اور ان سے گفتگو کرنے کا کچھ انداز ہی ایسا دلکش اور دل نشین تھا، کہ جو کوئی بھی ان سے ملتا، ان کا گرویدہ ہو جاتا، میں ان سے کہتا کہ مولانا حالی کی شرافت کا جو تذکرہ ان کے سوانح حیات میں پڑھتا ہوں، وہ آپ میں پاتا ہوں، شنیدہ کے بود مانند دیدہ، ہنسنے لگتے، اور کہتے کہ آپ کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں شبلی کالج میں پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے ساتھ ان کی ایک تقریر ہوئی تھی، سرور صاحب کی تقریر کا عنوان "ماضی کا احترام" تھا، یہ موضوع کچھ ایسا تھا کہ اس میں ادب کی چاشنی، تقریر کی رنگینی اور قوت گویائی کی دل نشینی بن کر اپنے موضوع کی پڑی کے حسن کو خوب دوبالا کیا، احتشام صاحب کا موضوع اردو رسم الخط تھا، ظاہر ہے کہ موضوع بڑا خشک اور بے کیف تھا، مگر احتشام صاحب جب بول رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ چاندی کے سکوں کی کھنکھناہٹ فضا میں گونج رہی ہے، شیریں بیانی اور خوش نوائی کا ایک بلبل علم و ادب کے گلستاں میں چہچہا رہا ہے۔ یہ دونوں تقریریں اعظم گڑھ کے علمی و ادبی حلقے کے کام و دہن کو اب بھی لذت بخش رہی ہیں۔

وہ جب بھی مجھ کو خط لکھتے تو اس کو پڑھتے وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا، کہ ان کی شرافت طبع یا ان کا عجز و انکسار تحریر کر رہا ہے، گزشتہ برسوں میں ان کا ایک خط ملا، کہ سید نذیر احمد ندوی کو اردو میں ایک یادگار کتاب پیش کی جا رہی ہے، اس کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی ہے، اس سلسلہ میں مجھ سے بھی ایک مقالہ مانگا اور خود ہی عنوان تجویز کیا "البیرونی اور اس کے عہد کے ہندوستان کے معاشرتی حالات" ان کے حکم کی تعمیل کرنا ضروری تھا مجھ سے جو کچھ بن پڑا، ایک مقالہ لکھ کر ان کے پاس بھیج دیا، اس کی رسید میں لکھ بھیجا کہ "آپ نے ایک خوبصورت اور پیارا مضمون بھیج کر مجھ کو ممنون کیا" شکریے کا یہ جملہ لکھا گیا ہو، یہ جملہ خود ان کی پیاری اور خوبصورت طبیعت کی ترجمانی کر رہا تھا۔

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو شبلی کالج کے ڈاکٹر محمد یاسر صاحب ان منزل پر شام کے وقت آکر خبر دی کہ پروفیسر احتشام حسین کی وفات ہو گئی، یہ خبر سننے کے لیے میں تیار نہ تھا، یقین کرنے کو جی نہ چاہا، رات کو دہلی اور لکھنؤ کے ریڈیو سے ان کی وفات کی خبر کے ساتھ ان کے گوناگوں اوصاف کا ذکر خیر سنا تو بے چین ہو گیا، سونے کے لیے بستر پر گیا تو ان کی یاد میں کروٹیں بدلتا رہا، نیند نہ آئی، وہ یاد آتے رہے، ایک ادیب، ایک نقاد، ایک شاعر، ایک مفکر اور سب سے زیادہ ایک لا انتہائی شریف انسان کی حیثیت سے آنکھوں کے سامنے تھے، دوسرے دن شبلی کالج کی بزم ادب کی طرف سے ایک تعزیتی جلسہ ہوا، اس میں بولنے کے لیے کھڑا ہوا تو رقت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، مگر میرے آنسوؤں کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ خدا جانے احتشام صاحب مرحوم کے لیے محبت، عقیدت اور اخلاص کے کتنے آنسو بہائے گئے ہوں گے، اگر ان آنسوؤں کے قطرات جمع کر دیے جاتے تو ایک دریا بن جاتا! وہ اپنی وفات سے پہلے کیسے توانا، کیسے تندرست اور کیسے شاداب نظر آتے تھے، معلوم ہوتا تھا، کہ جتنی عمر گزار چکے ہیں، اتنی ہی عمر اور پائیں گے۔ لیکن مصلحت خداوندی اور مشیت ایزدی پر کس کا بس ہے، وہ آئے اور گئے بھی ختم فسانہ ہو گیا، لیکن جانے کے بعد اپنی یادوں کا ایک شیش محل بنا کر گئے۔

میرا اور ان کا علمی و ادبی ذوق مختلف سمتوں میں تھا۔ وہ ترقی پسندوں کے رہنماؤں میں تھے، اور میں قدامت پسند والے گروہ کا ایک ادنیٰ فرد ہوں، مگر میں ان کی شرافت طبع سے کچھ ایسا متاثر رہا، کہ ان کی جب کوئی تحریر کسی رسالہ میں دیکھتا تو ضرور پڑھتا، اور پھر ان کی بہت سی تصانیف میں تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، ذوق ادب اور شعور، ساحل اور سمندر، عکس اور آئینے، تنقیدی نظریات کا مطالعہ بھی کیا، جس کے بعد محسوس ہوتا تھا، کہ بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں، جو پہلے معلوم نہ تھیں، مگر میں انتہائی ابتلا اور آزمائش میں اس وقت مبتلا ہوا، جب میں اپنی کتاب "غالب: مدح و قدح کی روشنی میں" لکھتے وقت غالب پر ان کے مضامین کا مطالعہ شروع کیا، ان میں انھوں نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں، ان سے بالکل اتفاق نہ تھا، تو ان کو رد کرنا چاہتا، مگر ان کی شرافت طبع مجھ میں حائل ہو جاتی، ان کے خیالات کے کلیسا کو منہدم کرنے میں ان کے ذاتی اخلاق کا کعبہ ذہن میں کھڑا نظر آتا۔

سید احتشام حسین صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے، تو انھوں نے ۱۹۴۸ء میں اپنی ایک تصنیف ادب اور سماج کے نام سے شائع کی، جو ان کے تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ تھا، اس میں غالب پر ان کا ایک مضمون "غالب کی بت شکنی" پر ہے، پھر ۱۹۵۳ء میں ان کے مضامین کے

بت شکن غالب کا تفکر" کے عنوان سے ہے، میں نے ان دونوں مضامین کو پڑھا، تو اس نتیجہ پر پہنچا، کہ احتشام صاحب نے غالب کو ان کے
، کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے اپنے مخصوص نظریے کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، اس نتیجہ پر پہنچنے کے باوجود یہ بھی خیال آیا،
نہیں غالب کی شاعری میں یہ کرامت ہے کہ وہ اپنے نقادوں کی نظر میں ہر طرح دکھائی دے سکتے ہیں یا احتشام صاحب نے اپنی بصیرت
کے کلام میں واقعی ایسی بات پائی جو کسی اور کو نظر نہیں آئی، احتشام صاحب اپنی فطری سلامت روی، شرافت اور غیر معمولی انداز
ساتھ مارکسی نظریے کے حامی کی حیثیت سے مشہور ہیں، اسی لیے انھوں نے غالب کے کلام کو اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے، دل کہہ رہا
شش وہ مارکسی نقطۂ نظر کے حامی نہ ہوتے، بلکہ جس طرح اپنے معاشرتی اخلاق میں پرانی روایت کو تازہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے
لات بھی ہوتے، اگر وہ خود ماضی کی ریشمی ڈور کے سہارے جینا پسند نہ کرتے تھے، اسی لیے وہ اپنی تنقیدوں میں عام خیالات کے
وڑ کر اپنی راہ الگ بنا کر چلنا پسند کرتے تھے، انھوں نے اپنے مضمون غالب کی بت شکنی میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ ان ہی کے
میں یہ ہے،

"غالب کی انفرادیت تمام بتوں کو توڑ کر پھینک دینا چاہتی تھی، اور انھوں نے انھیں توڑا بھی لیکن ان کی راہ میں
خود ان کی ذات تھی، جو حسرت و یاس کا مجسمہ ہونے کے باوجود انھیں بے حد عزیز تھی۔" (ص ۱۱۰)
"حساس انسان رسم پرستی اور تقلید کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، لیکن جس شاعر کی آواز میں بت شکنی کے نعرے
کی گونج پیدا ہوتی ہے، وہ غالب ہیں۔" (ص ۱۲۱)
"تشکیک کے جال سے نکلنے کے لیے رومانیت کی مقررہ قدروں کو چھوڑ کر، وہ نئی قدریں بھی بنانا چاہتے تھے۔"
(ص ۱۲۳)

"وہ مذہب سے بالکل علیحدگی تو اختیار نہ کرنا چاہتے تھے، لیکن مذہب کے نام پر جو بت تراشے جاتے تھے
ان کو پوجنا بھی نہ چاہتے تھے۔" (ص ۱۲۵)
"زندگی کو نئے تجربوں کی راہ پر ڈالنا، بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف کرکے زندگی میں نئی قدروں کی
جستجو کرنا بت شکنی ہے، اور یہ عمل خیال کی دنیا میں غالب بار بار دہراتے رہتے تھے، کبھی بت شکنی کی لے
اتنی بڑھ جاتی تھی، کہ محبت اور محبوب بھی خطرے میں پڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔" (ص ۱۲۶)
"ایک بہتر اور آزاد زندگی کی جستجو میں نئے اقدار حیات کی تلاش میں غالب بتوں کو توڑتے رہے، لیکن
ان کے پیروں میں تخیلیت، انفرادیت اور روقت کی زنجیریں تھیں، جن سے باہر نکلنا ان کے امکان میں نہ تھا،
اگر مستقبل امید کی راہ دکھاتا تو غالب صرف ماضی کی یادوں کے ریشمی ڈورے کے سہارے نہ جیتے رہتے،
بلکہ زمانے سے اپنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا انتقام لیتے، لیکن اس وقت کا ہندوستان جس سیال حالت
میں تھا، اس میں آئندہ کا عکس دیکھ لینا اور اس کی امید پر جینا ممکن نہ تھا، غالب دیدہ ور تھے، اور
رگ و سنگ میں اصنام کا رقص دیکھ لیتے تھے۔" (ص ۱۲۲)
"قبل اس کے کہ زمانہ راہ پر آئے، اور وہ نظام حیات دم توڑے جس نے غالب کو جکڑ رکھا تھا، بت
شکن غالب کی زندگی کا بت خود ہی ٹوٹ گیا۔" (ص ۱۳۰)
ان خیالات کو پڑھنے کے بعد احتشام حسین کی نرم، دھیمی، بے ضرر اور میٹھی گفتگو کانوں میں گونجنے لگی، خیال آیا کہ جو شخص زبان کا

اشتمال ہو اور بیٹھا ہو وہ اپنے خیالات میں اتنا انقلابی اور جدت پسند کیسے نظر آرہا ہے، احتشام صاحب نے اپنے مذکورہ بالا دعوے کو مستحکم کرنے کے لیے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے اس کے کچھ نمونے یہ ہیں:۔

"غالب کے سامنے بھی زندگی نے بہت سے الناک کھیل کھیلے، زندگی کی تمام قدریں انھیں مشکوک نظر آنے لگیں، کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کا سہارا لیکر وہ کھڑے ہو جاتے، اس لیے کبھی کبھی وہ بھی برکلے کی طرح ساری دنیا کو انسانی ذہن کا مفروضہ اور انسانی خیال کا عکس سمجھنے لگے تھے، اور کہہ اٹھتے تھے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

لیکن پھر ان کا دل سوال کرنے لگتا تھا۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیا ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

حقیقت کی اسی جستجو نے انھیں بت شکن بنا یا۔" (ص ۱۱۸)

اس کو پڑھ کر سوچنے لگا کہ یہ طرز استدلال قائل کرنے والا ادبی استدلال ہے، یا محض ان کی ذاتی نظر و فکر کا جدلیاتی استدلال ہے جو چاہا کہ لکھ دیا، یہ جو بیں استدلال ہے، مگا خیال آیا کہ کہیں احتشام صاحب کی گلاب جیسی طبیعت کے لیے یہ گراں نہ گذرے۔ مگر بار بار ذہن میں یہ بات آئی کہ احتشام صاحب نے یہ سب کچھ کیسے لکھ دیا۔ کیونکہ یہ وہ اشعار ہیں جن پر غالب کے بعض نقاد، ان کے عارفانہ خیالات کی بنیاد رکھتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ ان اشعار میں ماسوا کی ہستی کو فریب بتایا گیا ہے اور وہم اس عالم کو حلقۂ دام خیال قرار دیا گیا ہے یعنی اس عالم کی ہستی اس کے خالق سے الگ کوئی حقیقت نہیں رکھتی، وہ دراصل اس ہستی مطلق کا پرتو ہے، اس کے ساتھ قائم ہے اور اسی کے سہارے سے برقرار ہے، وہ ہستی ہی کیا جو عدم یا نیستی کا شکار ہو جائے۔ اور چونکہ ماسوا اللہ کی ہستی ایسی ہی ہے، اسی لیے اس کو وہمی یا خیالی بتایا گیا ہے، (فلسفۂ غالب از شوکت سبزواری ص ۳۰۶)۔ ایک دوسرے نقاد نے ان اشعار پر یہ تبصرہ کیا ہے، کہ غالب جیسے وجودی فلسفی لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ لا موجود الا اللہ اور لا موثر فی الوجود الا اللہ کا بھی کلمہ پڑھتے تھے۔ خدا کی ذات کو تمام صفات سے منزہ اور وراء الورا کہتے ہوئے ایسی ذات بحت پر پہنچ جاتے تھے جہاں سے تکوینی کثرت کا سرزد ہوتا ایک مسئلۂ لاینحل بن جاتا تھا (افکار غالب از خلیفہ عبدالحکیم ص ۲۵۵)

نقادوں کی ان توضیحات کے بعد میری سمجھ میں نہیں آیا کہ احتشام صاحب نے غالب کے اشعار کی جو تعبیر کی ہے اس کو کس چیز پر محمول کروں، ان کا ذہن اُن کے خاص نظریے کی تبلیغ میں کارفرما ہوا، یا شعر و ادب کے بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف کر کے اس کے تمام بتوں کو توڑ کر پھینک دینے میں ان کا قلم تلوار بن گیا ہے، یا واقعی ان اشعار میں وہی معنی ہیں جو انھوں نے پہنانے کی کوشش کی ہے۔

اسی مضمون میں احتشام صاحب یہ بھی لکھ گئے ہیں، کہ:۔

"غالب ان حقیقتوں کی نفی نہیں کر سکتے تھے، جو اُن کی مادی زندگی پر اثر انداز ہوتی تھیں، وہ "میں" کا بت نہ تو پاش پاش کرنا چاہتے تھے، اور نہ یہ ان کے امکان میں تھا کہ کل تخریب کر کے کائنات سے زندگی کی آگ بجھا دیں، ان کی انفرادیت اور خود ستائشی تو کوئی اور ہی خواب دیکھ رہی تھی،

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، نہ ہوتا میں خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

سوا اپنے اور کوئی سہارا نہ تھا، اس لیے ذہنی طاقت سے اس سہارے کو عظیم الشان بنانا چاہتے تھے۔" (ص ۱۱۹)

اس کو پڑھ کر احتشام صاحب کی جدت فکر کی پرواز کی داد دینے کو ضرور جی چاہا، مگر انھوں نے اس شعر کے اصلی معنی کو اپنی مبلغانہ تجدد پسندی ؍ جس طرح بدل دیا ہے، اس میں مجھ کو ان کی وہ فکر زیادہ کارفرما نظر آئی جس کی وہ ترویج اور تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ یہ خیال ؍ کہ اگر ان کے کہنے کے مطابق غالب خدا کا سہارا لینے کے بجائے اپنی ذہنی طاقت کو عظیم الشان سہارا بنانا چاہتے، تو پھر اسی غزل کے اس ؍ ر کا کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے :-

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

؍ میں تو ذہنی طاقت کے عظیم الشان سہارے کا نشان نہیں ملتا ہے، بلکہ بے حسی کا اظہار ہے،

اسی سلسلہ میں احتشام صاحب یہ بھی لکھتے ہیں، کہ

"باپ دادا کی جاگیر کا سہارا ختم، پنشن ختم، حکومت مغلیہ کا سہارا ختم، بعض سلوک کرنے والے امرا ختم اور جو دو ایک سہارے رہ گئے تھے ان کا بھی کیا ٹھکانا، اس لیے ایسا انسان اپنی ذات پر بھروسہ کرنا چاہتا ہے، اگر اس کی زبان سے یہ نکلے کہ

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

تو اس خواہش کے پیش نظر اس میں مبالغہ کا نہیں حقیقت کا اظہار ہوتا ہے، وہ اپنی تنہا طاقت سے ہر کمی پورا کرنا چاہتا ہے۔ غالب کی نفسیات میں یہ پہلو مطالعہ کے قابل ہے۔" (ص ۱۱۹)

؍ام صاحب غالب کے ان اشعار سے جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس میں بڑی جدت فکر ہے، ان کے مطالب کو کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ عبدالرحمان بجنوری ؍ب سے عقیدت مندانہ جوش میں ان اشعار میں مایا کا فلسفہ نظر آیا۔ میں احتشام صاحب اور عبدالرحمٰن بجنوری کی تحریکات کو پڑھنے کے ؍ سوچنے لگا کہ غالب کے اشعار کی طرح طرح کی نکتہ آفرینیوں میں کون سی چیز کو زیادہ دخل ہے، غالب کے کلام کی بوقلمونی کے سحر کو یا نقادوں ؍ کی رنگا رنگی کو، اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کر لیا جائے، کہ غالب اپنی تنہا طاقت سے ہر کمی کو پورا کرنا چاہتے تھے تو پھر جس زمانہ میں ؍ انھوں نے یہ اشعار کہے ہیں، اسی زمانے میں تو یہ بھی کہہ گئے ہیں :-

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

ع غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
ع گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

؍ غالب کی نفسیات یہ تھی، کہ ہر کمی کو اپنی طاقت سے پورا کرنا چاہتے تھے تو پھر غالب کا ایک قادح کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے مرنے سے پہلے ؍رام پور سے اپنے کو غلام زر خرید، مفلس، کنگال اور اپاہج فقیر بنا کر، خیرات مانگنا گوارا نہ کرتے۔ خیال آیا کہ احتشام صاحب نے غالب ؍ زندگی کو الگ رکھ کر، ان کی شاعری کے اندر جو پیام ہے اسی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہوگی، مگر اسی کے ساتھ غالب کے ایک لمبے

پرستار شیخ محمد اکرام کی یہ رائے ذہن کے سامنے آئی کہ غالب کے خیالات کے متعلق کوئی بھی نظریہ قائم کیا جائے تو اس کی تردید کے لیے بیسیوں اشعار مل جائیں گے۔ (غالب نامہ میں ۱۳۰، پہلا اڈیشن) احتشام صاحب نے جس طرح غالب کے کلام میں اپنے تصورات کی دنیا آباد پائی ہے، اسی طرح ڈاکٹر سید محمود مرحوم نے غالب کے کلام میں اس زمانہ کے خوں چکاں سیاسی واقعات کی عکاسی پائی تھی، اور ان کو بہت بڑا وطن پرست ثابت کرنے کی کوشش کی تھی جس سے ادبی حلقہ بہت برہم ہوا تھا، اس کے خلاف احتجاج کرنے میں ڈاکٹر سید عبداللطیف بہت آگے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ احتشام صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ کسی سرسری یا وقتی یا جذباتی مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ ان نقادوں میں تھے، جو بڑی تن دہی اور شفقت سے ادب کی ماہیت کو سمجھتے، نقاد کے منصب کو متعین کرتے، ادب کی جمالیاتی اور افادی حیثیتوں میں تعلق پیدا کرتے، ماضی کی حقیقی نوعیت کا اندازہ لگاتے، مواد اور ہیئت کے رشتے کو سمجھتے اور تنقید کے ذریعہ ادبی ذوق کی تربیت کرنے میں لگے رہے، احتشام صاحب کی تنقید نگاری کے اس اعلیٰ معیار کو جب سامنے رکھا تو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ انھوں نے غالب کے اشعار کی ایسی تاویلیں کیوں کیں جو دور از کار ہونے کی وجہ سے ادبی ذوق کو مجروح بھی کر سکتی ہے۔

احتشام صاحب نے موجودہ تنقید نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ:۔

> ۱۹۳۶ء کے بعد سے متعدد نقادوں کے یہاں شعر و ادب کے پرکھنے کی بالکل بدلی ہوئی شکلیں ملتی ہیں
> ...... جو ادب کے متعلق پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہیں، ان کے دوش
> بدوش دوسرے کارواں بھی چل رہے ہیں، کہیں ان کی راہیں ایک دوسرے کو کاٹ جاتی ہیں، کہیں
> متوازی چلتی ہیں، اور کہیں بہت دور جا پڑتی ہیں، (ذوق ادب اور شعور ص ۷۰)

غالب پر ان کی تنقیدوں کو پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ ان کی تنقیدیں تو یقیناً بدلی ہوئی شکلوں میں سے ہیں، ان کی رائے دوسرے کی رائے کو ضرور کاٹتی ہے اور وہ یقیناً متوازی نہیں ہے، لیکن یہ یقین کرنے کو طبیعت مائل نہیں ہوئی، کہ ان کی راہ غالب کے دوسرے نقادوں کے کارواں کی راہوں کو کاٹ کر دور اور بہت دور جا پڑی ہے، کیونکہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں نئی بات کو محض کہنے کی خاطر یا انوکھی بات کو محض برملا اظہار کرنے کی خاطر، صحیح بات کو قربان کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ وہ کون سے عوامل تھے، جن کے ماتحت وہ غالب کے اشعار سے متعلق عام لوگوں کے خلاف نئی اور انوکھی تاویل اور تشریح کرتے رہے،

ان کو یقین کامل رہا کہ "ہندوستان میں کل کا سماج اشتراکی ہوگا، اس لیے کل کے اشتراکی سماج میں غالب کی جگہ بنانے کی فکر ان پر چھائی رہی" (تنقید اور عملی تنقید، ص ۲۰) لیکن وہ غالب کے اشعار کو اپنے اشتراکی تخیل کی تائید میں پیش کرتے رہتے، تو پھر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا تھا، لیکن اگر یہ ظاہر کیا جائے، کہ غالب اشتراکی خیالات ہی سے متاثر ہو کر اپنے اشعار کہتے رہے، تو پھر ایک غیر معمولی ادبی اور تنقیدی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہو جاتا ہے، اشتراکیت کی ترویج کے لیے سیکڑوں راہیں کھلی ہیں۔ اس کے لیے غالب جیسے مقبول شاعر کا دامن پکڑنا ضروری نہیں،

ان کا دوسرا مضمون "غالب کا تفکر" تقریباً ۴۱ صفحوں پر مشتمل ہے، اس کے شروع میں ۲۰ صفحوں میں جا بجا سماجی تصورات، طبقاتی نظام، طبقاتی رجحان، طبقاتی شعور، طبقاتی کشمکش، جدلیاتی نظریہ، زندگی کے تقاضے، سرمایہ دارانہ تصورات، جاگیردارانہ شعور، استحصال، اقتصادی تاراجی، جاگیردارانہ قوتوں کی مذبوحی حرکت، ذہنی معنویت وغیرہ کا ذکر آ گیا ہے۔ اس حصہ کو پڑھ کر اندازہ ہوا، کہ ان کی خاموش طبیعت کی اندرونی تہوں میں اور نقادوں سے الگ سماجی تصورات، طبقاتی کشمکش، جدلیاتی نظریے اور زندگی کے تقاضے کا ایک سمندر موجزن تھا، جو اپنی گو ان کی زبان پر تو نہیں، لیکن ان کی تحریروں میں نظر آنے لگتا تھا، اسی لیے اگر یہ کہا جائے تو شاید

ہوگا، کہ ان کی تنقیدیں ان کے ذاتی نظریے کے نیچے دبی نظر آتی ہیں، ان کے خاص خاص نظریے کیا تھے، ان پر روشنی ڈال کر میں اپنے
ع سے الگ ہونا پسند نہیں کرتا، مگر ان میں جو خلقی شرافت تھی اس بنا پر یہ بھی لکھ گئے ہیں،

"اگر کسی خاص قسم کی تنقید کسی کے خیال میں ادب کو نقصان پہنچاتی ہے تو اس کا علاج یہ بھی ہو سکتا ہے
کہ جس کو اس کا اندیشہ ہو، وہ اس کے جھوٹ سے بچنے کے لیے اسے نہ پڑھے، اگر پڑھے تو اپنے خیالوں کی
مضبوطی کی وجہ سے اس سے متاثر نہ ہو، بلکہ اس کے دلائل اور نتائج کو ناقابل قبول سمجھ کر ٹھکرا دے۔

(اعتبار نظر ص ۲۷۴)

اب کسی کو احتشام صاحب کی تنقیدوں میں ان کی ذاتی نظری اور فکری پیوندکاریوں سے اختلاف ہو تو ان کی اس نصیحت پر عمل کر سکتا ہے،
تشام صاحب ان نقادوں میں تھے، جن کی رائے سے اختلاف بلکہ شدید اختلاف رکھنے کے باوجود ان کی تحریروں کو پڑھنے کو جی چاہتا تھا،
اس میں آتا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کس ذوق اور شعور سے کہتے تھے۔

انھوں نے اپنی کتاب تنقید اور عملی تنقید میں لکھا ہے، کہ

"بعض تنقید نگار اپنے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کہنے کا حق ہو جاتا
ہے، کہ خود احتشام صاحب نے ایک تنقید نگار کی حیثیت سے اپنے خاص خاص اصولوں کو سامنے رکھ کر غالب
کے کلام کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اس کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ان کے اصولوں کی عکاسی
واقعی غالب کے اشعار میں ہوتی ہے، یا انھوں نے ان میں بالارادہ ڈھونڈ نکالی ہے، غالب کی غزلوں کی
نیرنگی میں یک رنگی پیدا کرنا آسان کام نہیں۔"

تشام صاحب سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے غالب کی غزلوں کی نیرنگی میں یک رنگی پیدا کر دی تو ان کے ناقد ان پر اعتراض کرنے سے باز
آئیں گے۔ اس لیے وہ اعتراف کرتے ہیں، کہ

"غالب کی غزلوں میں ان کے بہترین خیالات کی بنیادوں کا یقینی علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک
کہ واضح اشارہ اس کے متعلق نہ پایا جائے۔ داخلیت اور اشاریت سے مضامین کی شکل بدل جاتی ہے، اور
اور یہ چیزیں شاعر کے نظریہ فن کا جزو بن کر اصل خیالوں کو انداز بیان میں چھپا دیتی ہیں …… اس طرح
غزل کے اشعار سے شعور کے خارجی محرکات پر رائے قائم کرنا صحت سے دور ہو سکتا ہے۔

(تنقید اور عملی تنقید ص ۹۶)

گر انھوں نے اپنے ناقدوں کا گھراؤ تو ضرور کر لیا ہے، لیکن وہ اپنے خیالات کی ترویج بھی چاہتے تھے، اس لیے فوراً یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"غالب کی تشکیل شعور میں جس قسم کے حقائق نے جس قسم کے سماج نے، جس قسم کی ذاتی الجھنوں نے حصہ لیا، ہم ان سے کسی قدر واقف ہیں، اور یہ ہم آہنگی اتفاقی نہیں ہو سکتی۔ (تنقید و عملی تنقید ص ۹۷)

یہ فکر کر وہ اپنے ذہنی رجحانات کی عروس کو غالب کے اشعار کا خلعت پہنا کر جس طرح رعنا بنایا ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا
نہ غالب کی نباتات النعش ان کے کلام کے گردوں پر جو پنہاں تھیں وہ احتشام صاحب کی تنقیدوں میں کچھ اور عریاں ہوئی ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"وہ یعنی غالب اخبار پڑھتے اور دنیا کے خیالات سے باخبر رہنا چاہتے تھے، اسی وجہ سے وہ اس
بات سے واقف تھے، کہ اگر بے عملی کی زندگی ختم ہو جائے، تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ دنیا امکانات

سے بھری ہوئی ہے،

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ۔ ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

...... لیکن وہ جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، وہ انھیں وقت کی حدود سے باہر نکلنے سے روکتی تھیں اسی وجہ سے ان کا احساس شدید ہے، اور انفرادی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود مستقبل کی طرف کوئی اشارہ کرنے میں معذور ہیں ۔" (ص ۹۰)

مذکورۂ بالا شعر کی تشریح عبد الباری آسی نے اس طرح کی ہے

"میرے جنون نے نارسائی کی اور اپنی حد پر نہ پہنچ سکا، ورنہ حد جنون کے مقام کا ایک ایک ذرہ رشک خورشید عالمتاب تھا۔ مولوی نظم طباطبائی صاحب یہ کہتے ہیں کہ جنونِ نارسا نے کچھ نہ کیا، یعنی آفتاب فیض سے اور اس کا معشوق سے محروم رکھا ورنہ ایک ایک ذرہ نے آفتاب نور کیا تھا کہ رشک وہ آفتاب تھا اس میں حالات ماضی کا خیال کیا گیا ہے، اور یہ ناممکن ہے۔ اگر زیادہ غور کیا جائے تو یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ جہاں یعنی جس مقام تک جنون پہنچ چکا تھا، اس مقام کا ذرہ بھی روکش خورشید عالم تاب تھا ۔"

(مکمل شرح دیوان غالب ص ۳۴)

احتشام صاحب نے غالب کے شعر سے کیا مراد لے کر اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے، اس کا فیصلہ عبد الباری آسی کی شرح کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔

احتشام صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں، (ص ۱۰۰)

"جس طبقہ سے غالب کا تعلق تھا وہ نشاط زندگی سے بہرہ ور تھا۔ لیکن جب حالات بدل گئے تو یہ جہاں تھا کہ

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب ۔ اس رہ گذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

وہ دور مٹ رہا تھا، اور اسے پھر زندہ کرنا ناممکن تھا،

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے ۔ متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

...... یہ یقین بار بار مختلف اشعار میں ظاہر ہوا ہے،

گھر ہمارا جو نہ روتے تو بھی ویراں ہوتا ۔ بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا"

پہلے شعر میں شگفتہ خاطری اور افسردہ دلی کی تصویر کھینچی گئی ہے جس سے موجودہ اور گذشتہ زندگی کا تقابل ضرور ہوجاتا ہے لیکن کیا اس کو محض غزل کا ایک شعر سمجھا جائے یا اس دور کی کہانی غالب کی زبانی سمجھی جائے۔ عبد الباری آسی نے اس شعر پر یہ اعتراض کر کے اس کی اہمیت گھٹا دی ہے، کہ ایسے مضامین میں جگر کا وہی بے کار ہے اس میں آورد زیادہ اور آمد کم ہے، پھر اسی کے مقابلہ میں داغ کا ایک شعر پیش کیا ہے۔

کبھی یہ دل تماشا گاہ صد عیش و مسرت تھا ۔ اب اس میں حسرت و یاس و تمنا سیر کرتے ہیں

اب اگر غالب نے اپنے شعر میں اپنے دور کی مصوری کی ہے، تو پھر داغ کے اس شعر کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے، ایسے اشعار ہر غزل گو کے یہاں مل جائیں گے جس کے یہ معنی ہیں کہ غزل کا یہ روایتی مضمون ہے، جو ہر زمانہ میں مختلف انداز سے کیا گیا ہے، اسے کسی غزل گو کے دور کے طبقہ سے منسوب کرنا مناسب نہیں۔

دوسرے شعر میں فلک کا شکوہ ہے، یہ بھی غزل کا روایتی مضمون ہے۔ مگر غالب نے عام انداز سے الگ ہو کر اپنے نرالے

وتے اسلوب میں بیان کر کے شعر کو جاندار کر دیا ہے، جس کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ غالب نے اس پس منظر میں اس شعر کو قلم بند کیا تھا"
ام صاحب کا مطلب ہے۔

تیسرے شعر کو اوپر کے دونوں شعر سے ہم آہنگ کرنا نفسِ مضمون کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے تو بہت خوب ہے لیکن اس کے لیے بھی وہی
پیدا ہوتا ہے کہ کیا غالب کے ذہن میں وہی بات تھی، جس کا اشارہ احتشام صاحب نے کیا ہے، غالب کے اس شعر پر

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

احتشام صاحب کا یہ تبصرہ ہے کہ

"یہ خیالات جہاں ایک طرف ان تاریخی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو غالب کے دور کو یقینی بربادی
کی جانب لیجا رہے تھے، وہاں دوسری طرف تعمیری نقطۂ نظر کے فقدان کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ اس سے تو
یہی ظاہر ہے کہ غالب اپنے دور کے تعمیری نقطۂ نظر کے فقدان سے مایوس ہے، ان کی شاعری کی ساری
کہانی اسی فقدان کی کہانی ہے۔ (ص ۱۰۱)

آیا ہے، کہ احتشام صاحب نے غالب کی اس نفسیات کو قابل مطالعہ قرار دیا ہے، کہ وہ اپنی تنہا طاقت سے ہر کمی کو پورا کرنا چاہتے تھے،
کا پیام بھی ہو سکتا تھا۔ پھر تعمیری نقطۂ نظر کے فقدان سے مایوس ہونا ان کے لیے مناسب نہ تھا۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ ان کے ایک شعر کے خیال کی تردید اُن کے دوسرے شعر سے آسانی سے ہو سکتی ہے، اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ
اگر ان کے یہاں یاس و حسرت ہے تو ان کے یہاں ایسے اشعار بھی مل سکتے ہیں جس سے یہ ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں زندگی میں
ن اور نرالی شان پیدا کرنے کا بھی پیام ملتا ہے، اور وہ یاس و غم کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے رہے مثلاً

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو — چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد — صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے

ی شعر میں زندگی کی تعمیر کا جوشِ جنوں مراد لیا جائے تو پھر اس شعر کے معانی اسی طرح بدل جاتے ہیں، جس طرح کہ احتشام صاحب نے
کے شعر کے معانی کو بدل دیا ہے۔

احتشام صاحب نے غالب کے حسب ذیل شعر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی ذرا غور طلب ہے،

نظر میں ہے ہماری جادہ راہ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے احتشام صاحب رقم طراز ہیں:۔

"یہ خیالات جہاں ایک طرف ان تاریخی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو غالب کے دور کو یقینی بربادی
کی جانب لے جا رہے تھے، وہاں دوسری طرف تعمیری نقطۂ نظر کے فقدان کا بھی پتہ دیتے ہیں، غالب
اپنے طبقہ کی بے عملی اور مردہ دلی سے اکتا چکے تھے لیکن اس سے رشتہ توڑ لینا ان کے لیے ممکن نہ تھا،
تاہم وہ یہ تو ظاہر ہی کر دیتے ہیں کہ ان کے دل میں جو کچھ ہے وہ کھل کر نہیں کہہ سکتے۔ تنہائی اور رجعیت
کا احساس بھی اسی جذبہ کی غمازی کرتا ہے،

جاتا ہوں چراغ حسرت ہستی لیے ہوئے — ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں　　　　آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

تین مختلف غزلوں کے متفرق اشعار سے معانی و مطالب میں ہم آہنگی پیدا کر لینا تو جدتِ فکر کی دلیل ضرور ہے۔ غزل کے شعر کی یہ مسلمہ کرامت ہے کہ یہ دلِ حسرت زدہ کے لیے لذتِ درد کا مادہ بن سکتا ہے، اور اس سے بقدرِ لب و دنداں کام لیا جا سکتا ہے۔ اوپر کے پہلے شعر سے غالب کے دور کی یقینی بربادی کی جھلک دکھائی دے سکتی ہے تو ایک شارح کو غالب کے اس شعر میں ان کا یہ فلسفیانہ نقطۂ نظر آ سکتا ہے کہ کائنات کی ساری منتشر چیزیں فنا کے رشتہ سے منسلک ہیں۔ غالب زندہ ہوتے تو وہ خود ہی فیصلہ کر سکتے تھے، کہ ان کے اشعار سے طرح طرح کے مطلب نکالنے والے کہاں تک صحیح ہیں۔ احتشام صاحب نے اس شعر کے ساتھ دو اور اشعار ملا کر جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی غور طلب ہے۔ ان میں سے ایک کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے داغِ حسرتِ ہستی کو تغزل کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے، اور دوسرے کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آتشِ عشق کی تباہ کاری کا بیان ہے اب حدِ فکر سے اس کے جو بھی معنی پہنائے جائیں اس میں معنی سے زیادہ جدتِ فکر کی کارفرمائی ہوگی، مثلاً تیسرے شعر کے متعلق ایک شارح نے لکھا ہے، کہ اگر گھر کے لفظ کو وسعت دی جائے، یعنی دل کے بجائے سلطنتِ دہلی کو اس کا مشارالیہ قرار دیا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں پر ایسی تباہی نازل ہوئی ع لیلیٰ ماں فراموش کردند عشق۔ (شرح دیوانِ غالب از پروفیسر سلیم چشتی ص ۲۵۳)

احتشام صاحب یہ بھی لکھتے ہیں، کہ کبھی غالب کو تشکیک، مزاج، لاشئت کے قریب پہنچا دیتی تھی، وہ انھیں روایتوں کے توڑنے پر اکساتی تھی۔ یہاں تک کہ رسم پرستوں اور روایت پرستوں کی دنیا میں وہ اپنے کو تنہا محسوس کرنے لگے تھے، اور وہ لوگ جو ان کے گرد و پیش تھے۔ ان کے دل کی واردات کو سمجھنے کے ناقابل نظر آنے لگتے ہیں، اور ان کے لیے زبان کھولنے اور ان سے ہمدردی کرنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا،

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا　　　　کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غالب کا یہ اعترافِ شکست اس نظام (یعنی ان کے دور کے نظام) کی شکست کا اعلان ہے (ص ۱۰۷)

غالب کو اگر تشکک، نراجی اور لاشئت پسند ثابت کیا جا سکتا ہے تو ان کو مسائلِ تصوف، توحید، وجود کا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا، پھر خجستہ فکر و خجستہ خو، اگر نیر، عدل گستر، جہاں افروز، فلک رفعت، ستارہ حشم، ملکہ و کلثوم، یہ اور مہر پیکر، پروین لشکر، ماہ درخشاں، فرخ شمائل، چیف کمشنر دہلی کا پرستار، اور پھر بہادر شاہ ظفر کی بھیجی ہوئی بیسنی روٹی اور رسم کے بیج کا مادح بھی ثابت کیا گیا ہے، پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ غالب رسم پرستوں اور روایت دوستوں کی دنیا میں وہ اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے، اور وہ لوگ جو ان کے گرد و پیش تھے۔ ان کے دل کی واردات کو سمجھنے کے قابل نظر آنے لگتے تھے۔ اور ان کے لیے زبان کھولنے اور ان سے ہمدردی کرنے کو ان کا جی نہ چاہتا تھا۔

احتشام صاحب نے اپنے مضمون کے خیالات کو اعتراضات سے محفوظ کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ غالب کے یہاں تضاد ہے اور اس کے لیے حسنِ تاویل یہ کیا ہے کہ "لیکن ایسا فلسفہ جو تضاد سے خالی ہو محض غیر طبقاتی اشتراکی سماج میں جنم لے سکتا ہے" اور پھر اس مقالہ کو بقول ان کے دنیا کے سب سے بڑے انقلاب پسند لینن کی یہ رائے نقل کر کے ختم کر دیا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ ادبی تحقیقات سب سے کم کسی معیاری میکانیکی ناپ تول کی متحمل ہو سکتی ہیں، اس میں بھی شک نہیں کہ ادبی کاموں کے لیے یہ بات قطعی لازمی ہے کہ انفرادی تخلیقی عمل اور شخصی رجحانات، سرمایہ تخیل اور مواد سب کے وسیع ترین استعمال کا موقع فراہم کیا جائے۔ (ص ۱۰۸)

آخری حصہ ان کے اس ناقدانہ ذہن کی غمازی کرتا ہے جو اس مقالے کے لکھنے کا محرک ہوا، وہ اپنی اس کتاب کے مضمون تنقید اور تنقید میں ایک جگہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ نقاد کبھی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ (ص ۲۶) اب یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ غالب جیسے پر ادبی تنقید لکھتے وقت احتشام صاحب ان کا صحیح مطالعہ کرنے کے بجائے اپنے انفرادی تخلیقی عمل، شخصی رجحانات اور ذہنی سرمایہ اور مواد و ہئیت سے دب کر رہ گئے ہیں، ان پر کسی صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ ادب پر جب کچھ لکھتے ہیں، تو اس میں کے سوا اور تمام چیزیں ہوتی ہیں، ان میں اقتصادیات اور عمرانیات کا پہلو زیادہ نمایاں رہتا ہے۔ یہ کہاں تک صحیح ہے، اس پر کرنا میرے موضوع سے باہر ہے۔

میں ان کے مذکورۂ بالا دونوں مضامین مطالعہ کرتے وقت ان کی مرنجاں مرنج ذات، شریفانہ اخلاق، اور اوصاف کے بارے دبا ہوا ان کے مضامین میں اپنے خیالات کی تطبیق نہ پائی تو خیال ہوا کہ انھوں نے اپنی علمی بصیرت اور ادراک حقیقت سے جو کچھ لکھ دیا ہے، وہی ہوگا۔ ایک بار ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ غالب پر آپ کے مضامین پر کچھ مخالفانہ تنقید لکھی ہے اور ابھی کچھ اور چاہتا ہوں۔ مگر آپ کی ذات سے کچھ ایسا متاثر ہوں کہ قلم رکتا ہے، اور لکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا، جواب دیا کہ "آپ اپنی مخالفانہ لکھ کر مجھکو ممنون کریں، اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے، تو ہماری اصلاح کیونکر ہوگی"۔ اس جواب سے شرمندہ ہوا، یہ جانی ہی کا جملہ ہے ام صاحب نے اپنی زبان سے دہرادیا، اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے ذہنی رجحانات و میلانات میں نہ سہی لیکن اپنے ذاتی اوصاف میں وہ اس دور کے ی تھے ——— میں اس نتیجہ پر پہنچا، کہ میں احتشام صاحب کے خیالات سے خواہ کتنا ہی اختلاف رکھوں لیکن اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی ہے وں نے اردو ادب کی موجودہ تنقید نگاری کو ایک سائنٹفک مزاج عطا کیا جس کے لیے انھوں نے دوسری زبانوں کے تنقیدی اصولوں کے ات کو زیادہ سے زیادہ اردو ادب میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار منشی ذکاء اللہ کے لائق فرزند اور اردو کے مشہور مترجم عنایت اللہ صاحب سے فرمایا کہ والد صاحب فرماتے تھے، کہ میں تو اپنے کو ایک ایسے دریا کے کنارے پاتا ہوں جس کے دوسرے کنارے پر علمی جواہرات کے ڈھیر ہیں رکھتا ہوں، وہ تمام ڈھیروں کو میں چاہتا ہوں کہ اس کنارے سے اس کنارے لے آؤں، اسی کوشش میں انگریزی زبان کی کتابیں اردو میں ترجمے کرتا ہوں، اور یہی بات احتشام صاحب کے لیے صادق آتی ہے، وہ اردو کی تنقید نگاری کے ساحل پر کھڑے ہو کر دوسری زبانوں کی تنقید نگاری کے دوسرے ساحل کے جواہرات کے ڈھیر کو اپنی طرف لانے کی کوشش میں لگے رہے، انھوں نے اپنی تنقید نگاری کے ذریعہ اردو کو کیا کچھ نہیں دیا ہی تجربے کی گہرائی، ادب میں ماحول کی اقتصادی اور سماجی زندگی کی ترجمانی، ادب میں اجتماعی خواہشات اور صحت بخش تصورات کی عکاسی، ادب مادی اور جمالیاتی پہلو کی ہم آہنگی ادیبوں اور شاعروں میں عمرانی اور اقتصادی شعور کی بیداری۔ جدلیاتی مادیت کے سیلاب پر فن پارے کی تشریح، اردو کی تنقید نگاری کے بندھے ٹکے میکانکی اصولوں سے بغاوت، مواد اور ہئیت کا اتحاد و تعلق وغیرہ یہ وہ کارنامے ہیں جن کی بدولت م صاحب اپنے معاصروں میں ایک اونچے مینار کی حیثیت سے نظر آتے رہے۔ انھوں نے اپنے مضامین پر یہ لکھ کر خود ہی تبصرہ کیا ہے کہ

"جو شخص میرے مضامین پڑھے گا اسے خود اندازہ ہوگا کہ میں انسانوں کی فلاح و بہبود اور اقتصادی انصاف کا ذکر کس خدمت اور خلوص کے ساتھ کرتا ہوں، اور شاید ہی کوئی مضمون ایسا ہو جس میں ان کا تذکرہ کسی نہ کسی پہلو سے نہ آیا ہو۔"

(دیباچہ روایت اور بغاوت)

اردو شعر و ادب میں ان کی تنقید نگاری کی شکلیں خواہ کتنی ہی بدلی ہوئی ہوں اور دوسرے کارواں کے دوش بدوش نہ ہوں بلکہ ان کی کات کر بہت دور کیوں نہ جا پڑی ہوں۔ لیکن اس کے اندر ان کے مذکورۂ بالا بیان کے مطابق جو مخلصانہ جذبات ہیں۔ وہ ضرور قابل قدر ہیں ہیں گے۔

"وہ شاعر جسے اپنے خیالوں کی توانائی، صحت، آفاقیت اور افادیت پر اعتماد نہیں ہوتا وہ جلوۂ صورت اور نیرنگی الفاظ پر زور دیتا ہے۔ غالب کے تصورات اور خیالات، انداز فکر اور نقطہ نظر سے ہمیں اتفاق اور اختلاف کا حق حاصل ہے لیکن انھیں نظر انداز کر کے ان کے فن کو سمجھنے کا دعویٰ کرنا درست نہیں۔ ان کی شاعری صناعی نہیں فن ہے۔ لفظوں کی بازی گری نہیں خیالوں کا بیوپار ہے۔ ایسے خیالوں کا جنھیں گہری بصیرت گہرے جمالیات ذوق کے ساتھ حسین ترین لباس میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے"

غالب کا نظریۂ فن

از

پروفیسر احتشام حسین مرحوم

ڈاکٹر سید محمد عقیل

احتشام حسین ——

تنقید اور نظریات کے آئینے میں

یہ کہنے میں بھلا کسے باک ہو سکتا ہے کہ احتشام حسین بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے اس وقت تک کے اردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔ احتشام حسین جنھوں نے ادب کے محاسبے کو صرف محاسبہ، چند بندھے ٹکے تنقیدی جملوں، چٹکلوں اور رسمی تنقیدی گرفت کے طریقوں سے نکال کر، فن تنقید کا اصول نقد، تجزیہ اور شاعر و ادیب کے شعری اور ادبی محرکات سے رشتہ جوڑ کر ان ذہنی کرشموں کی چھان بین شروع کی جن کے درمیان سے گزر کر شاعر یا ادیب کا شعور تخلیقی سوتوں کو تلاش کر کے فکر و فن کی آبیاری کرتا ہے۔ ان تاریخی اور سماجی نیرنگیوں کو تلاش کرنے کے طریقے بتائے جو کسی فن کار کی تخلیق کے پیچ و خم کو بہتر یا بدتر ہی نہیں بناتے بلکہ اس زندگی کی ذہنی اور حسی تاریخ بھی مرتب کرتے ہیں جس میں فن کار یا اس کا فن سانسیں لیتا ہے۔ کبھی شخصی طور پر، کبھی غیر شخصی حیثیت یا اجتماعی طور طریقوں سے اپنی فکر و نظر کو محض گھسے پٹے کلیشے (CLICHES) میں لپیٹ کر خود اپنی تخلیقوں میں نکھر جاتا ہے۔ لیکن یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے؟ کسی کو اس دعوے میں حسن ظن بھی نظر آسکتا ہے لیکن جنھوں نے احتشام حسین کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور جنھیں ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے وہ اس مقالے کے لکھنے والے کے اس دعوے کو بے بنیاد نہیں سمجھیں گے۔

سید احتشام حسین نے تنقید کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب تنقید کی دنیا ایک عبوری دور سے گزر رہی تھی۔ محمد حسین آزاد، شبلی، سرسید، اور حالی کے بعد عبدالرحمان بجنوری، نیاز فتح پوری، اور مجنوں، تنقید کو تاثراتی، رومانی اور کسی قدر اشتمالی حقیقت نگاری کی طرف لے کر چل پڑے تھے۔ تنقید میں اصولی کی باتیں کم اور بڑی حد تک لفاظی و مرعوبیت کے ساتھ ادیب کے فکر و فن کو پرکھنے کی وجدانی صورتیں بہت عام تھیں۔ تنقید نگار، شاعر یا ادیب کی تخلیقات کو کھنگالنے سے زیادہ اپنی بصیرت اور تبحر علمی کا مظاہرہ کرتے اور برے بھلے تنقیدی محاسبہ اپنی جانب دارانہ پسند و ناپسند سے کرتے۔ یہاں تک کہ شبلی جیسے دائی و راہین کے ساتھ چلنے والے نقاد بھی اس سے بری نہیں۔ موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم کے بہت سے حصے اس کے غماز ہیں۔ صرف حالی کو کسی حد تک اس رنگ تنقید سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ دیوان غالب اور وید مقدس کو ہندوستان کی دو الہامی کتابیں سمجھنا تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے مگر غالب کے اس رنگ و آہنگ کو پیش کرنا اس سماجی شعور اور تاریخی اشراف سے ان کے ذہن کو جانچنا، اس کے ذہنی رویے کا اندازہ لگانا نامناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کوئی یہ نہ سوچتا کہ غالب "انیسویں صدی کے اس ہندوستان میں پیدا ہوئے جو مخصوص روایات کا حامل تھا۔ خاص طرح کا طبقاتی نظام رکھتا تھا تابع ذہب اور فلسفہ میں پوری طرح اس زندگی کی جھلک نہ تھی جو اس وقت کے معاشی اور معاشرتی انحطاط نے پیدا کیا تھا۔ بلکہ کچھ عقیدے روایت بن کر طرز فکر پر اثر انداز ہوتے رہتے تھے" یہ انحطاط اور معاشی بحران طبقات پیدا کرتا ہے جس کا ادراک وہی کر سکتا ہے جو اس بحران سے گزر رہا ہو۔

ل۔ "غالب کا تفکر" — سید احتشام حسین

غالب ایک طرف تو بدلتے ہوئے حالات کا احساس کر رہے تھے، دوسری طرف اس جاگیردارانہ شعور کو بھی ختم کرنا نہیں چاہتے
وہ پروردہ تھے اور جس نے اُن میں وہ خودداری پیدا کی تھی جو انھیں دلّی کالج کے دروازے سے ملازمت کی خواہش کے باوجود
واپس لائی تھی کہ اُن کا اس ملازمت میں وہ احترام، وہ وقعت نہ ہو سکتی جس کے ایک جاگیردار کی حیثیت سے وہ حامل تھے۔ احتشا
کی تنقید نے اردو تنقید کو یہی شعور عطا کیا کہ ناقد وجدان سے نکل کر حقائق اور تاریخ کی روشنی میں اُن سماجی حالات کا جائزہ
جن میں ادب کی تخلیق ہوتی رہتی ہے یا ہو سکتی ہے۔

تاریخ اور اس کی ماضیت، حال اور اس کی ماضی دانی، سماج اور حقیقت نگاری جو طبقاتی کشمکش کے سبب سے وجود میں آ
ہے، وہ بنیادی پتھر ہیں جن پر احتشام حسین کی تنقید نگاری کی عمارت کھڑی ہے۔ ان کے تمام تنقیدی مضامین اور مقالوں میں یہ باتیں
اصول تنقید، تجزیہ، عملی تنقید اور ادب پاروں کے ارتقا کی تاریخ متعین کرتے وقت دیکھی جا سکتی ہیں کیونکہ احتشام حسین کے خیال کے
کوئی ادبی جائزہ مکمل نہیں اگر اس میں اس دور کی زندگی کا عکس اور طبقاتی اتار چڑھاؤ نہیں ملتا۔ بعض معترضین احتشام حسین کے اس طرز
کھوج اور جستجو کو ادب کے لیے قطعی غیر اہم اور غیر مفید سمجھتے ہیں۔ ان کا تقاضہ ہے کہ ادب میں صرف لطیف پہلوؤں کی کھوج اور جستجو ہو
کیونکہ یہی وہ پہلو ہیں جو کسی ادب کو شاہکار کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ اعتراض کی اور بہت سی نوعیتیں ہو سکتی ہیں۔ پروفیسر کلیم
احمد اور فراق صاحب اس طرح کے معترضین میں سرفہرست ہیں۔ گر میں ان معترضین کا دھیان انگریزی ادب کے اُن شہ پاروں
منعطف کرنا چاہتا ہوں جن میں ادیب، شاعر یا ناول نگار نے اپنا سارا زور اسی طرح کی جستجو پر صرف کیا ہے۔ چاسر سے لے کر
ایلیٹ تک چلے آیئے۔ کینٹربری ٹیلیس (CANTERBERY TALES) اور اس کا پرولاگ (PROLOGUE) سوا چودھویں
کے سماجی حالات کی تصویر کے اور کیا ہے۔ ہنری چہارم میں شیکسپیئر کے کیڈ سنس (CADE SCEANS) جولیس سیزر کے مجمع
(MOB SCENES) اور میری وائفز آف ونڈسر میں عہد الزابتھ کے متوسط طبقے کے حالات، فیلڈنگ اور اسمولٹ کی
جن میں اٹھارویں صدی میں جو ایک نیا بورژوائی طبقہ ابھر رہا تھا اس کی کشمکش، بالزاک کی ڈراؤل کہانیاں، بڑھا گوریو کی داستان
ستان وال کے ناولیں اور ماتلاسب کلیسائی نظام اور متوسط یا اونچے طبقوں کی سماجی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا انعکاس ہیں۔ گالزوردی،
ہارڈی، شا، ایچ۔ جی۔ ویلز کے سائنسی ناول ڈکنس، جارج ایلیٹ، اپنے ناولوں میں جس زندگی کی کشمکش پر زور دیتے ہیں وہ کون
ہے۔ اس کا اس سماج سے کتنا گہرا تعلق ہے جس میں یہ ناول نگار زندہ تھے؟ ترگنیف، ٹالسٹائے اور گورکی کا نام لینا تو خیر ایک
نقطۂ نظر کی غمازی کر سکتا ہے لیکن اسٹائن بک کے گریپس آف راتھ، ساسون کی جنگی نظمیں، ٹینیسی ولیم، فاکنر اور خود ٹی۔ ایس۔
کی ویسٹ لینڈ کا تجزیہ، ان بنیادی باتوں کے بغیر کس طرح ہوگا؟ ظاہر ہے کہ جو لوگ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی طرف متوجہ ہو گئے
روحانی کیفیات اور لطف و انبساط کو کیونکر اہمیت دیں گے؟ یہ باتیں ارونگ بیبٹ (IRVING BABIT) جیسے نقاد
سکتے ہیں جو ان رومانوی راستوں سے فکری پریشان نظری، ذہنی انتشار، یاسیت، اُداسی اور خلا کی اتھاہ پہنائیوں میں پرواز کرتے ہیں
معاشرے کا تنہا آدمی بناتی ہیں۔ مگر یہ لوگ اس نظام فکر کی تہوں تک نہیں پہنچ سکتے جس نظام فکر سے احتشام حسین کا ذہن وابستہ
یہ لوگ ٹی۔ ای ہیوم (T. E. HULME) کی طرح یہ سوچتے ہیں کہ شعری موضوعات کے لیے کوئی چیز مخصوص نہیں ہونی چاہیے۔
سوا صحت اور اختصار کے اور کچھ نہیں۔ شاعر کا کام محض فن کاری ہے۔ شخصیت کے اظہار سے اس کو کیا کام؟ دور اولڈ ماننے کا اس سے
واسطہ؟ شاعری تو بنیادی طور پر استعاروں اور پیکروں (IMAGES) کا مسئلہ ہے۔ امیجیں اور پیکر محض تزئین کاری
وہ وجدان کا جوہر ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ کوئی پوچھے کہ محض وجدان کی بنیاد پر کیا مسائل حیات سمجھے جا سکتے ہیں؟ کیا فن کار کی شخصیت

ا کوئی حصہ ہوتا ہے یا نہیں ؟ کیا فن پارے ، اپنے خالق کی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے غیر منسلک ہوتے ہیں ؟ یہ بات کوئی لیٹس
یہ جو رومانوی ہونے کے باوجود زندگی کی ان تلخیوں سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے جو انسانوں کو رنج و غم کے بوجھ تلے پیسے ڈالتی
ن اسی وجہ سے اس کی نظر میں خوش قسمت ہے کہ وہ انسانوں کی طرح اس پریشانی سے دور ہے ۔ اس دنیا میں جہاں ہر طرف پریشانیا
قراری ہے ، امراض ہیں ، جہاں انسانوں کی کراہیں ہیں ، جہاں جوانیاں مصائب سے زرد ہو جاتی ہیں ، انسان محض ڈھانچے رہ جاتے
بعد کو فنا ہو جاتے ہیں ۔ یہ دنیا جہاں سوا غم و الم کے اور کچھ نہیں ، کیا کیٹس کے فن کو اس ناآسودگی سے الگ کیا جا سکتا ہے ۔ پھر یہ
فرانسیسی انقلاب سے صنعتی انقلاب تک کے مسائل تک پھیلی ہوئی ہے اور محض "تزئین کاری" نہیں اور نہ صرف وجدان ہے ، بلکہ اس
اس معاشرے اور زندگی سے گہرا تعلق ہے جس میں کیٹس کا فن جوان ہوا تھا ۔ فن کار کو اس کی زندگی سے الگ کر کے ، تنقید اپنے صحیح
نہیں رہ سکتی ۔ احتشام حسین کی تنقید میں فن تنقید کا یہی مرکز ہے ۔ صرف فن کی تلاش ان کا مسلک نہیں بلکہ فن کار کی زندگی کے ساتھ ساتھ
تاریخ ، شعری ، ادبی اور تہذیبی روایتیں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا کرتی ہیں ۔ انھیں چھوڑ کر ادب کے مزاج کو صحیح طور پر پرکھا نہیں
یہ صحیح ہے کہ ہر نسل اپنے ساتھ اپنا شعری مذاق لاتی ہے ، اپنے تجربے ، اپنے فن کا تصور لاتی ہے لیکن وہ نسل عمرانی تسلسل حیات
پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے رابطے ، رشتے اور ذہنی ارتقا کی سمتیں ، اُن ادبی قدروں اور عمرانی جہتوں سے متعین ہوتے ہیں ، جن میں
ر کا سماج سانس لیتا ہے ۔ سماج جاندار ہوگا ، تغیر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھے گا تو ادبی تخلیقات میں وہی تحرک اور تغیر ہونا چاہیے
اور فکری راستوں سے آئے گا ، مگر آئے گا ضرور ۔ اگر سماج مردہ ہو چکا ہے ، اپنی عمرانی تاریخ میں "بو دینے والا بن گیا ہے" بن
ادبی تخلیقات میں یہی پژمردگی ، بے جان کیفیت اور تعفن کا احساس ملے گا ۔ یہ بات میر اور سودا کے دور سے لے کر ، انشا ، رنگین ،
جرات ، خلیل ، رند ، صبا ، یا جدید شعرا کی بہت سی لایعنی تخلیقات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے (اگرچہ جدید شعرا کے تجربے انفرادی زیادہ
فن پرستی کا شکار) ۔ یہی سبب ہے کہ احتشام حسین خواہ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا جائزہ لیں یا فسانۂ آزاد کے خوجی کا مطالعہ پیش
غالب ، پریم چند ، اکبر الہ آبادی ، فانی ، فراق کسی کا ذہنی تجزیہ کریں ، وہ تنقید کے ان اصولوں کے بغیر دو قدم بھی آگے نہیں بڑھتے ۔
ان کے بہت سے مضامین جو مصوری ، رقص اور تہذیبی عناصر کا جائزہ پیش کرتے ہیں ، اُن میں بھی یہ کوشش دیکھی جا سکتی ہے ۔
اقتباسات اس بات کی وضاحت کریں گے ۔

(۱) " مغلوں کے زوال کے زمانے میں مصور اور فن کار دوسری ریاستوں میں پہنچ گئے اور وہاں مقامی اثرات کے ساتھ مغل قلم کی
کرنی شکلیں وجود میں آئیں ۔ اس حیثیت سے راجپوت ، کانگڑہ ، سکھ ، لکھنؤ وغیرہ کے قلم وجود پذیر ہوئے ...... مقامی خصوصیات
لباس ، عادات اور رسم و رواج کی وجہ سے موضوعات میں فرق ہو گیا ہے ۔ کمار سوامی نے مغل اور راجپوت مصوری میں جو خاص فرق بتائے
وہ زیادہ تر انھیں باتوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ انھوں نے خاص طور سے اس بات پر زور دیا ہے کہ مغل فن درباری اور شاہانہ تھا ۔ راجپوت
لیکن یہ بہت بحث طلب بات ہے ...... کیونکہ مصوری نے اکثر انھیں راجپوت درباروں میں ترقی کی جن سے مغلوں کا گہرا
تھا ۔"

(قدیم ہندوستانی مصوری)

(۲) " گئودان کا مطالعہ کرنے والا اپنے مطالعے کے درمیان میں سے اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ یہ ناول کس عہد کا ترجمان
نظام زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے ، کس نقطۂ نظر پر مبنی ہے اور کن حقائق کی عکاسی کرتا ہے ۔ اس کے کردار ، نہ تو خیالوں کی
فریب دنیا میں بسنے والے لوگ ہیں ، نہ اس کا میدانِ عمل ایک فرضی سرزمین ہے ..... بلکہ سب کچھ وہی ہے جس کا اندازہ بیسوی
صدی کی دہائی کے ہندوستان میں بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے .... اس ناول کا مختصر سے مختصر جائزہ بھی لیا جائے تو

تو ان سیاسی، سماجی، اور معاشی مسائل کی توضیح ضروری ہوگی جو اس ناول کے تانے بانے میں بنے ہوئے ہیں۔"

(۳۱) "اس میں شک نہیں کہ شاعر

اور فن کار کا طبقاتی رجحان، اس کے فلسفۂ حیات کا بہت کچھ پتہ دیتا ہے لیکن محض یہ دیکھنا کہ شاعر کس طبقے میں پیدا ہوا یا سماج کے کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے، کافی نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے زندگی کی کشمکش کے سمجھنے میں اپنے ذہن اور شعور کی توسیع کس طرح کی اور عصری مسائل کے سمجھنے کے سلسلے میں اس کا کیا رویہ رہا .... جو باتیں غالب کے مطالعے کے لیے مفید ہو سکتی ہیں، ان میں سب سے اہم اس دور کی تہذیبی کشمکش، روایات اور اس سے انحراف کا مطالبہ ہے۔ اس مرکزی مسئلے کی جستجو بھی مفید ہوگی جو ذہن اور شعور پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ امرا کیا تاریخی حیثیت رکھتے تھے، اور دوسرے طبقات سے ان کا کیا تعلق تھا۔ کوئی نیا طریقہ بن رہا تھا یا نہیں اور اگر بن رہا تھا تو اس کی خصوصیات کیا تھیں۔ کوئی شاعر یا فن کار اس میں اپنی خواہشوں اور امنگوں کی جھلک دیکھ سکتا تھا یا نہیں۔" (غالب کا تفکر)

احتشام حسین ذہن کی اس تلاش اور جستجو کو ادب، ناقد اور ادیب کی تلاش اور جستجو اس لیے بنانا چاہتے ہیں کہ ادیب کے ذہن اور اس کی تخلیق کے پیچھے کون کون سے عناصر کام کرتے رہتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ تاکہ ان لوگوں کو ہو سکے جو کسی خیال کو شعر کی کڑی یا کسی کرب کو ناول کے کردار میں ڈھلتے دیکھ کر اسے محض لطف اور انبساط کی چیز سمجھتے ہیں۔ جیسے فن کار محض تفنن طبع کے لیے پیش کرتا رہتا ہے۔ فن کار کو اس طرح سمجھتے رہنا ادب کی گہرائی اور معنویت کو بڑی ہلکی پھلکی اور سطحی چیز بنا تا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادب بالکل بے مقصد چیز ہے۔ وقت گزاری کا ایک مشغلہ اور اس کی افادیت اتنی بھی نہیں کہ کوئی یہ سمجھے کہ اس سے زندگی کی تصویر مرتب ہوتی ہے۔ شاعر یا ادیب کے تجربے اپنی نسلوں کی مشعل راہ ہیں۔ اس نقطۂ نظر کا جس قدر جلد خاتمہ ہو سکے اچھا ہے۔ کیونکہ اس کا باقی رہنا اسی طرح ادب کے لیے مہلک ہے جیسے بقول شخصے غلاموں کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرنا۔ غلامی سے نفرت کے بھڑکتے ہوئے احساس کو کم کرتا ہے اور اس طرح اس رواج کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو دباتا ہے اگرچہ ہمدردی بڑی اچھی چیز ہے۔ غلامی کے ساتھ جتنی رعایت برتی جائے گی۔ اس رسم کے خلاف بغاوت کی آواز دبتی جائے گی کیونکہ لوگوں کو اس میں کچھ اچھی باتیں بھی نظر آئیں گی۔ مفلسی اور بیکاری کی اس طرح مدد کرنا کہ مفلسی اور بیکاری ایک خاص طور پر باقی بھی رہے، اس نظام زندگی کو برقرار رکھنے کی کوشش ہے۔ جس طرح سرمایہ دارانہ نظام، پس ماندہ ملکوں میں پسماندگی کے اسباب ختم کرنے کے بجائے انھیں وقتی امداد پہنچا کر اپنا دست نگر رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے نہ انھیں ان اسباب سے دوچار ہونے دیتا ہے کہ وہاں کے عوام باغی ہو کر اس نام نہاد حکومت کا تختہ الٹ دیں اور نہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے دست کرم سے لوگ بے نیاز ہو جائیں۔ ادب میں تفنن طبع کا مزاج جس قدر جلد ختم ہو جائے گا اسی قدر ادیب جلد سے جلد حقیقت نگاری اور ادب کے عملی و افادی نقطۂ نظر کی طرف متوجہ ہوں گے اور ادیب و شاعر سے محض فن، محض زبان، محض جمالیات، محض انفرادیت کے تقاضے ختم ہو جائیں گے اور اس طرح ادب میں وسعت اور گہرائی کا احیا ہوگا۔ اگر کوئی جمال الدین افغانی، مہدی سوڈانی، ستیز کلیم و خلیل، بازوئے حیدر، نان جویں، ذوق انقلاب میں ندرت فکر و عمل اور ملت اسلامیہ کے اس خلفشار کو چھوڑ کر، جس میں وہ اقبال کے زمانے میں گرفتار تھی، محض جمالیات، اور زبان غزل یا محض فن کا قائل سے متقاضی ہو تو وہ اردو شاعری کو اسی تنگنائے میں قید رکھنا چاہتا ہے جسے لکھنؤ اور دلی اسکول کے دور انحطاط کے شعرا چھوڑ گئے تھے۔ آسکر وائلڈ (WILDE) نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جن مصوروں اور فن کاروں نے کرائسٹ کو مافوق الفطری رنگ میں پیش کیا وہ انھیں انسانوں سے بہت دور لے گئے اور اسی وجہ سے نشاۃ الثانیہ کے مصور جو انسانی قدروں کے معترف تھے (HUMANIST) تھے انھوں نے کرائسٹ کو سماج اور انسانیت سے زیادہ قریب کر دیا۔ احتشام حسین جیسے ناقدوں کی تنقید میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ جب کرائسٹ BE THY SELF کہتے ہیں تو اس سے ان کا کیا مطلب تھا۔ اگر وہ ایک سماج میں نہ پیدا ہوتے جہاں دولت اکٹھا کرنا انسانی زندگی کا

سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ خدا کی رحمت غریبوں پر ہوتی ہے اور انہیں کے لیے جنت ہے"¹ نہ کہتے۔ دراصل انسان کو یہ اپنی صلاحیتوں کے بڑھنے کا راستہ تھا اور اس کے ارتقا کی نصیحت تھی جس کے آگے دولت قارون کی کوئی حقیقت نہیں۔ دنیا سے بے نیازی ان معنوں میں نہیں ہونی چاہیے کہ انسان اپنی مادی ضروریات کی بھی فکر سے بے نیاز ہو جائے۔ بلکہ مادے کی مدد سے اپنے ارتقا کی تکمیل کر سکے۔ کیونکہ انسان صرف روحانی ارتقا کے لیے نہیں پیدا کیا گیا اگرچہ یہ بھی بحث طلب بات ہے کہ روحانی ارتقا بھی بغیر مادے کی مدد کے ممکن ہے یا نہیں۔ تنقید کی یہی جستجو یہی تجزیہ، تاریخ اور سماج کے انہی آثار چڑھاؤ کی تلاش، ادب اور فن یا فلسفہ کا صحیح محاسبہ ہے۔ آرٹ صرف آرٹ نہیں، حسن صرف مجرد حسن نہیں، شعر صرف الہام نہیں۔ ان سب میں زندگی کی بینائی، پستی اور بلندی، تجربہ اور ناتجربہ کاری، شکست و فتح، سادہ لوحی اور عیاری عمل اور بے عملی، سب کچھ شامل ہے۔ ان تمام باتوں کا سلسلہ زندگی سے ملتا ہے۔ یہ زندگی جس کے تسلسل میں آج تک کا انسان اپنی وسیع و عریض تاریخ کے ساتھ چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ احتشام حسین کا سارا سرمایۂ تنقید ادب کی ایسی ہی تعبیر میں منہمک ہے۔

"ادب میں روایت کی کیا جگہ ہے؟ ادبی تسلسل کا کیا مفہوم ہے۔ ہر ادیب اور اس کی تصنیف اپنی جگہ ایک وحدت کی حیثیت رکھتی ہے یا ادیب کی مسلسل رفتار میں اس کی جگہ متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ ماضی سے کتنی علاحدگی ممکن ہے۔ قدیم اور جدید کے درمیان کوئی خط فاصل ہو سکتا ہے یا نہیں، نئی زندگی اپنے ساتھ بیان اور اظہار کے سانچے لاتی ہے یا قدیم سانچوں ہی میں نئی زندگی کے تقاضوں کو بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ قدیم طرز اظہار میں تبدیلی کا حق کسے ہے اور کتنا اس تبدیلی کے اصول کیا ہوں گے اور انھیں کون متعین کرے گا۔ ادب میں حسن اور حقیقت کی کیا جگہ ہے۔ حسن و قبح کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ حقیقت ابدی ہے یا تغیر پذیر۔ ہر زمانے میں حقیقتوں کے سمجھنے اور ماننے کی ایک ہی صورت رہی ہے یا مختلف۔ ہر انسان یا ہر طبقہ کے لیے ایک ہی حقیقت یکساں مفہوم رکھتی ہے یا مختلف، جس کا کوئی افادی پہلو بھی ہے یا نہیں۔ اسلام کے لیے کفر اور عشق کے لیے قبح ضروری ہے یا نہیں ...... یہ بھی چند سوالات ہیں جن کا حل نقاد کو تلاش کرنا چاہیے۔ ایسے ہی بہت سے سوال ہیں جنھیں کوئی زندگی کے دوسرے مسائل سے بے تعلق ہو کر حل نہیں کر سکتا۔" (اعتبار نظر)

یہیں تھوڑی دیر کے لیے رک کر ایک مصوری اور سنگتراشی کے مغربی مبصر کے خیالات بھی دیکھتے چلیے جس نے اس بات کو اہمیت دی ہے کہ سماجی حالات مصوری، فن اور ادب کا مزاج کس طرح بدلتے ہیں۔

ولیم فلنگ (WILIAM FELING) اپنی کتاب 'آرٹ اینڈ آئیڈیاز' میں تاریخ اور سماج کے اثرات اٹلی کے آرٹ پر کس طرح ظاہر ہوتے ہیں، اس کو یوں بیان کرتے ہیں اقتباس قدرے لمبا ہے مگر اس میں اس نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے گی جس کی بحث اوپر کی گئی ہے۔

"چودھویں صدی کی پہلی تیسری دہائی میں سب کچھ درست تھا قصباتی زندگی میں مرفہ الحالی تھی۔ زندگی بہت اچھی نظر آتی تھی۔ آرٹ بھی خوب ترقی کر رہا تھا ...... ۱۳۴۰ء کی ابتدا میں مصائب کا ایک سلسلہ اس جزیرہ نما میں شروع ہوا جس کا آغاز فصل کی تباہی، قحط اور وباؤں کی پے در پے آمد سے ہوا جس کا نقطۂ عروج بندرگاہوں کے پلیگ کی شکل میں ۱۳۴۸ء میں نظر آیا۔ سیاہ موت کے نام سے پکاری جانے والی وبا میں، فلورنس، سائینا اور پیسا کی تقریباً آدھی آبادی کا خاتمہ ہو گیا ......

ایک ایسا حادثہ جو اس قدر سنگین اور خوفناک تھا اور جو پورے براعظم میں رونما ہو رہا تھا، اس کے اثرات کا ملک کی ثقافتی اور سماجی زندگی پر پڑنا لازمی اور لابدی تھا ...... نفسیاتی ردعمل یہ ہوا کہ ہر شخص اپنی زندگی میں اپنے محسوسات کو تیز پانے لگا۔ 'کھاؤ پیو اور خوش رہو' کا فلسفہ ایک طرف تو بوکاچیو کی ڈیکامیران (DECAMERON) کی شکل میں ہر طرف پسند کیا جانے لگا دوسری طرف طرح طرح کے مذہبی جذبات بھی بھڑک اٹھے۔ لوگ زندگی کو لایعنی اور آخرت کو اہم سمجھنے لگے۔ ہر طرف اخلاق اور گناہوں

1. BLESSED ARE THE POOR FOR THEIRS IS THE KINGDOM OF HEAVEN

سے پاکیزگی کا احساس جاگ اٹھا جو بوکاچیو ہی کی ایک بعد کی تصنیف کاربا چیو (CORBACCIO) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ گناہ کے ڈر سے لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کردیا کہ یہ اُن کے گناہوں کا نتیجہ ہے..... جو خدا کے قہر کی شکل میں اس طرح بلیک (سیاہ موت) بن کر ظاہر ہورہا ہے تاکہ گناہگار بندوں کو سزا ملے اور وہ اپنے بُرے راستوں سے ہٹ جائیں۔ بوکاچیو اور پیٹ (PETRARCH) جو اس وقت کے ادبی ستون تھے، دونوں نے اس نظریئے کو اپنایا۔ اور جو کچھ کہ ادب نے اختیار کیا وہی ا... کی مصوری نے بھی اختیار کیا۔ یہ بات آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے کہ خدا کی قہاری کا یہ تصور، اس کے اس محبوبیت کے تصور برعکس تھا جو فرانسس کے نظریات نے پیش کیا تھا۔[۱]

اس وقت کے مصوروں نے اپنی تصویروں میں اخلاقی قدروں کا کافی لحاظ رکھا۔ اس وقت کے نمونوں میں جنس یا اعضائے نمائش کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ پیسا کے گرجاگھر میں مصوری کے نمونوں میں موت کی فتح جیسی تصویریں ملتی ہیں جن میں تابوت رکھے جسم اپنی بے ثباتی اور دنیا کی ناپائداری کا اعلان کررہے ہیں۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ وہی سماجی اور تاریخی دباؤ ہے جو فن کار تخلیق میں اپنے گردوپیش کے حالات سے رونما ہوتا ہے۔

مارکسی نقادوں کے بارے میں یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ وہ ادیب، شاعر یا ادیب کا محاسبہ نہیں کرتے بلکہ اشتمالی رج... کو ادب میں فروغ دینے کے لیے اپنی تنقیدوں کا زورصرف کرتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ صرف اشتراکی رجحانات رکھنے والے شعرا... ادبی حسن نظر آتا ہے۔ مارکس، اینگلز اور لینن کے نظریات کی بنیاد پر ادب کی پرکھ ان کا معیار ہے۔ انھیں اُس ادب میں کو... نہیں آتا جو انفرادی ہے اور کسی مکتب خیال سے وابستہ نہیں۔ اس اعتراض میں بہت سی باتیں صحیح ہیں اگرچہ اس کی توجیہ صحیح طور پر کرتے ہیں۔ اور کچھ تو بالکل بے بنیاد ہیں۔ احتشام حسین اور تقریباً تمام اچھے ترقی پسند نقادوں کے یہاں نظریاتی جانب دار... عام نہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ مارکسی نقاد شخصی رجحانات کے مخالف ہیں۔ وہ ایسے رجحانات کے بھی مخالف ہیں جو فرد کا رشتہ سماج سے کاٹ دیتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ مارکس اور لینن کے اس اشتمالی رجحان کے حلیف ہیں جو ادب کو سماجی تغیر کا عکس عمل سمجھتا ہے، جو اس کا رشتہ تاریخ اور عمرانیات سے ملاتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ مارکسی نقاد صرف اشتمالی ادیبوں کے معترف ہ... سوچنے والوں کو احتشام حسین کے وہ تنقیدی مضامین دیکھنے چاہئیں جو انھوں نے خانۂ آزاد کے خوجی، چکبست، نظیر اکبرآبادی فانی، علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو، جگر مرادآبادی، مہدی افادی، اردو میں بچوں کا ادب، آغا حشر کی ڈرامہ نگاری۔ قطب لسانی خصوصیات حالی اور پیروی مغرب، مسدس حالی اور اس کے نقاد، شبلی اور موازنہ انیس و دبیر۔ غالب کا تفکر۔ ند... ناول نگاری۔ قدیم ہندوستانی مصوری، آتش کی صوفیانہ شاعری وغیرہ کے عنوانات سے لکھے ہیں یا وقتاً فوقتاً غیر ترقی پسند اد... کتابوں پر تبصرے کی شکل میں لکھے ہیں۔ ہاں یہ بات بھی درست ہے کہ جس طرح کسی مکتبۂ فکر سے وابستہ ہونے والے نقاد کا ... ہوتا ہے، احتشام حسین کا بھی تنقید میں ایک نظریہ ہے، ایک معیار ہے جس سے وہ ادب پاروں کو پرکھتے ہیں۔ اگر نقاد صرف ... نقطۂ نظر رکھنے پر مجبور کیا جائے گا تو یہ بھی آواز اٹھے گی کہ یہ بات بھی ایک نظریہ سے کمٹ منٹ (COMMITMENT) ہے کہیں سے کوئی یہ بھی کہے گا کہ کوئی کسی کو مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ ایک مخصوص نقطۂ نظر ہی اپنائے۔ اگر آزادی ادیب کا حق ہے ا... معاملے میں بھی آزاد ہے کہ وہ جو مکتبۂ فکر چاہے اپنائے اور اسی کے مطابق اپنے تنقیدی اصول بنائے تو اشتمالی نقطۂ نظر... اپنے نقطۂ نظر کا اعلان کرے اور اپنے معیاروں سے ادب کی جستجو کرنے میں حق بجانب ہے۔ لیکن احتشام حسین نے ہر نقطۂ نظر

...T AND IDEAS BY WILLIAM FELMING P. 315-16. NEW YORK.

تیں لے لی ہیں جو ان کے نقطۂ نظر کی بنیادی طور پر تردید نہیں کرتیں اور اسی طرح وہ ادبی محاسبے کے وقت تمام ان لوگوں اور شاعروں کو بھی اپنے دائرہ عمل و تنقید میں لیتے ہیں جو کسی بھی مکتبۂ فکر سے وابستہ ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں جا بجا ایسے نام بکھرے نظر آتے ہیں ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کی کوئی ادبی حیثیت نہ پہلے تھی اور نہ آج مسلم ہو سکی۔ جن لوگوں کو سید احتشام حسین کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کتنے مبتدی ان کے مضامین کی زینت بنے ہیں۔ یہ ایک طرح سے ان کا نقص بھی ہے۔ کیونکہ بہت سے مبتدی تاریخ کے پیچ و خم میں ایسے غائب ہوئے کہ آج اُن کا پتہ بھی نہیں مگر احتشام حسین کی یہ کوشش محض اس لیے ہوا کرتی تھی کہ شاید کوئی جوہر قابل ان میں سے نکل آئے۔

یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ اصول نقد پر اس میں باقاعدہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اگرچہ بہت سے مضامین بکھری ہوئی صورت میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔ مشرقی تنقید اپنی بہت سی روایتوں میں مغرب سے الگ ہے۔ اس لیے تنقید کے مغربی اصول، ضروری نہیں کہ ہر وقت منطبق ہو سکیں۔ بہت سے اصولوں میں مماثلت بھی ہے لیکن مغربی تنقید میں اصول تنقید کی کتابوں کی کمی نہیں۔ ویلک، ایبسن، ہائی میں، سوتمین، اسٹائل مین، آئی اے رچرڈس، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی کتابیں اصول تنقید پر اچھی کتابیں ہیں۔ سید احتشام حسین کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اردو ادب کے اصول نقد پر کوئی کتاب لکھتے مگر مکروہات دنیا اور زندگی نے انھیں اس کی فرصت نہ دی تاہم انھوں نے اصول تنقید پر بہت سے بکھرے ہوئے مضامین کو دو جلدوں میں تنقیدی نظریات کے نام سے جمع کر دیا۔ اس کتاب میں سب طرح کے لوگوں کے مضامین شامل ہیں۔ مارکسی بھی اور غیر مارکسی بھی اسی کے ساتھ ساتھ یہ اس بات کا بھی پتہ دیتے ہیں کہ تنقیدی نظریات کے یہ تمام اصول انھیں پسند تھے اور انھیں معیاروں سے وہ ادب کو پرکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ نظریاتی تنقید کی انگریزی کتابوں میں احتشام حسین، ویلک کی تھیوری آف لٹریچر، ہائی مین کی 'آرمڈ ویژن'، میری کالم کی 'فرام ورڈز ورتھ' اور چلک، مصنف اور ادیب لوکاچ سے بہت متاثر تھے۔ ان کتابوں سے اکثر حوالے بھی ان کے مضامین میں ملتے ہیں۔ اگرچہ آئی۔ اے رچرڈس کی تھیوری آف کریٹیسزم، کچھ کم اہم کتاب نہیں لیکن احتشام حسین، رچرڈس سے متاثر نہیں۔ اُن کی میٹا فزیکل قسم کے نظریات میں انھیں الجھن ہوتی تھی تاہم وہ رچرڈس کی عظمت کے قائل تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اُن سے نظریاتی طور پر متفق نہ تھے۔ رچرڈس کی کتاب پریکٹیکل کریٹیسزم کے طریق کار کو احتشام حسین پسند نہیں کرتے کیونکہ عملی تنقید میں رچرڈس صاحب کا نظریہ ان راستوں کو کھولتا ہے جو محض فن برائے فن کا راستہ ہے۔ بایں ہمہ احتشام حسین عملی تنقید کو ایک مفید عمل سمجھتے ہیں کیونکہ اس طریق کار میں نقاد کو شاعر کے ذہن کے تمام گوشوں کو جھانک لینے کا موقع ملتا ہے۔ لفظوں کی قدر و قیمت، ان کی مختلف تہیں، ان کی رنگا رنگیاں اور نیرنگیوں سے کسی ادب پارے میں کیسے کیسے موڑ پیدا ہوتے ہیں۔ احتشام حسین کے مضامین میں اکثر یہ بحثیں ملیں گی۔

"اصول نقد پر غور کرتے ہوئے ان تاریخی قوتوں کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنا چاہیئے جن سے ادب وجود میں آتا ہے، جن سے انسان کی تمنائیں اور خواہشیں پیدا ہوتی ہیں جن سے تنقید کی صلاحیت وجود میں آتی ہے۔ جن سے انسانی تمدن بنتا ہے اور جن سے ان قدروں کا تعین کیا جاتا ہے جو انسانوں کو آزادی مسرت اور ترقی کی اس منزل تک پہنچا سکتی ہیں جن کے لیے انسان ہر دور میں بے قرار رہے ہیں کسی اور طرح اصول کا تصور کرنا ناممکن کوشش ہوگی۔ ایسے اقدار کی جستجو کرنے کی جن سے ادب کو اس کے ہر پہلو سے سمجھا جا سکتا ہے ...... اصول نقد کا تعین کرنے میں تحقیق کے ہر گوشے تک نگاہ کو جانا چاہیئے۔ ہر علم سے مدد لے کر ادب کو سمجھنا چاہیئے۔ اعلیٰ ادب ادنیٰ ادب سے اس بنیاد پر علاحدہ کرنا چاہیئے کہ وہ ادب اعلیٰ ہو ہی نہیں سکتا جس سے انسانی مسرت اور انسانی امنگوں میں اضافہ ہو۔ کوئی اصول جو تاریخ اور سماج کی ہمہ گیر قوتوں کو نظر انداز کر دے اس نقطۂ نظر سے اصول ہی نہیں رہتا۔" (تنقیدی نظریات جلد اول)

(۲۲) " زبان کی صوری اور لغوی حیثیت کے مقابلے میں اس کی جذباتی اور صوتی حیثیتیں کچھ کم اہم نہیں۔ لفظ کے معنی لغت سے معلوم ہوتے، استعمال سے معلوم ہوتے ہیں بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسی استعمال کی بنیاد پر لغت میں جگہ پاتے ہیں۔ اب یہ کوشش ناکام ہے کہ مستقر دلی کی طرح ہر لفظ کے معنی متعین کر لیے جائیں پھر بحث ہو بلکہ کہا جاتا ہے کہ ہر لفظ اپنے محل استعمال سے ترکیب پیدا کرنے کا وہ بولنے والے کے مفہوم تک پہنچانے کے لحاظ سے اپنے معنی کا پتہ دیتا ہے۔ لفظ میں زندگی اسی وقت آتی ہے جب وہ استعمال کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کے استعمال کو استعمال کرنے والے کے نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور اگر درحقیقت اس لفظ سے مفہوم تک رسائی نہ ہو تو اُسے رد کر دینا چاہیئے " (صحت زبان کا مسئلہ)

نیو کریٹیسزم (NEO CRITICISM) سے متاثر لوگ اس طرز تنقید کو بہتر نہیں سمجھتے جس کے حامی ترقی پسند نقاد ہیں ادب میں سے افادیت کو نکال پھینکنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ سماجی تجزیہ اور تاریخ کی ادب سے وابستگی کے نام پر چیں براغ یا ہوتے کسی بھی ادب پارے کو صرف اُن الفاظ کے گرد دیکھنا چاہتے ہیں جو اس میں استعمال ہوئے ہیں۔ نہ انھیں خیالات کے اُن سوتوں سے غرض ہوتی ہے جہاں سے ادیب کے ذہن میں یہ سوتے پھوٹتے ہیں نہ انھیں اس کی تلاش ہوتی ہے کہ مرور ایام اور سیاسی سماجی تبدیلیاں اور ادیب پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ امریکی تنقید میں کلینتھ بروک، یوویہ ونٹر، اور ایلین ٹیٹ صاحب اسی طرز تنقید کے مخالف ہیں۔ اُنھیں لوگوں سے متاثر ہو کر اُردو میں کچھ جدید کچھ قدیم ناقدین بھی اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں ادب کو کسی تجزیہ سے کیا واسطہ، ادب صرف جمالیاتی حظ ہے اور کچھ نہیں۔ کچھ لوگ احتشام حسین کے طرز تنقید کے اس لیے بھی مخالف ہیں کہ اُن کے یہاں تنقید میں جمالیات کی تلاش نہیں ہوتی۔ ایسے معترضین میں اگر بے شعور اور ناتجربہ کار ادیب ہوتے تو کوئی بات نہ تھی تعجب تو یہ ہے کہ ان میں کچھ دیدہ ور شاعر اور نقاد بھی شامل ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ معترضین جمالیات کی تاریخ بھی پڑھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں یا نہیں۔ انھوں نے احتشام حسین کے مضامین بھی ملاحظہ کیے ہیں یا یوں ہی ہوا میں تیر چلا رہے ہیں۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمالیات سے اُن کی کیا مراد ہے؟ پھر آج کا ناقد کس دور کی جمالیات کو اپنائے۔ جمالیات کی دنیا میں اتنے نظریات بکھرے ہوئے ہیں کہ کسی نقاد کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اُن تمام نظریات سے ادب پاروں کو پرکھے۔ جمالیات کی تاریخ اور اس سے متعلق کتابوں کا ایک ڈھیر ہے اور اُن میں ہر ایک اپنے اپنے دور اور سماج کی جمالیات کو پیش کرتا ہے۔ افلاطون، ارسطو، فلوطینس، سینٹ اگسٹائن سے شروع کر لیجیے۔ جمالیات، مابعد الطبیعیات، فطرت کا انعکاس، حُسن مجرد، حُسن مطلق، حُسن حقیقت نگاری اور حُسن کے نظریات سے بھری پڑی ہے۔ نظریات کی حد نہیں۔ کبھی اس کی بحث ہے کہ کیا غیر مرئی، مرئی ہو سکتا ہے اور اگر نہیں ہو سکتا تو اس کا جمالی عکس کیونکر پیش کیا جائے۔ کوئی صرف فطرت کی عکاسی کو حُسن سمجھتا ہے۔ کوئی صرف اضافی حسن کا قائل ہے۔ کوئی نظریۂ جمال کو بھی اضافی سمجھتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ

ITX IS THE CHARACTER OF ADAPTATION TO A PURPOSE
OUT RELATION TO AN ACTUAL PURPOSE

کوئی محض علامتوں میں حُسن کو اسیر کر لینا چاہتا ہے۔ ان علامتوں میں بھی کوئی صرف نغموں کی علامتوں ہی کو حُسن سمجھتا ہے۔ کوئی نغموں میں باقاعدہ اظہار کو احساس جمال خیال کرتا ہے۔ اسٹوئکس (STOICS) کے فلسفے نے کرائسیپس (CRYSIPP.US) سے یہ کہلایا کہ دنیا میں بہت سے جانور صرف حُسن کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور فطرت صرف اُن کے نقش و نگار اور رنگ ڈھنگ سے محظوظ ہوتی ہے۔ یہ سسترو اس کائنات کو ہر معنی میں مکمل سمجھتا ہے اور آدمی کو ناقص خیال کرتا ہے۔ انسان کا کام محض اس دنیا کی نقل اتارنا ہے اگرچہ وہ اس پر بھی قادر نہیں دکھتا۔ کیونکہ وہ ناقص ہے اور کائنات مکمل (اس لیے انسان کا نظریہ جمال محدود اور ناقص ہوگا) اس کے برعکس ایکیورین

کہتا تھا کہ موسیقی اور حسن نغمہ غیر تعقلی (IRRATIONAL) ہیں اور یہ جذبات کی روح کو متاثر کرنے میں قاصر ہیں اس کا اظہار جو بھی نہیں سکتا
اور اگر ہو سکتا ہے تو کھانا پکانے کے فن سے زیادہ نہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں نغمے کی آواز اور تار چڑھاؤ میں گدھے سے کرخت چیخنے جانے
کی آواز میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

عیسائی سماج میں حسن اور جمالیات کا تصور پھر بدلنا شروع ہوتا ہے کہیں حسن صرف مابعد الطبیعاتی ہے تو کہیں اس کا ادراک حادثے
کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ سینٹ فرانسس اور سینٹ ٹامس نے بارھویں اور تیرھویں صدی میں مسیحی تصورات کے ساتھ یونانی تصورات بھی جمالیات
کے تصور میں بھینٹ دیئے۔ رنگوں کی شوخی اور توازن اور اس توازن میں دیکھنے والے کا حسین شے سے قرب و دلچسپی، خوبصورتی کے احساس
کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن حسن کے تمام لوازمات کا منبع صرف حسن حقیقی یعنی خدا کی ذات ہے اور کچھ نہیں۔ یہی تصور قریب قریب اسی دور
میں صوفیوں کے یہاں بھی پیدا ہوتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ جلوہ، کو جمالیات کی دنیا میں اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات بھی صوفیوں کے یہاں
بہت اہم ہے۔ اردو شعرا کے یہاں 'جلوہ'، 'پردہ' کی اصطلاحیں اپنی شکلیں تاریخ کے ساتھ بدلتی رہی ہیں۔ ہند و فلسفے میں درشن، کو بھی اہمیت
حاصل ہے۔ لیکن مسیحی فلسفے سے لیکر اسلام اور ہندو مت سب میں خواہش (DESIRE) کو ختم کر دینا چاہیئے۔ 'حسن' کے ساتھ 'خواہش'
کا تال میل نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ افلاطون کے نظریۂ جمال کی شق ہے۔ انھیں میں سے کچھ نے کہا کہ 'حسن جسمی شکل میں اسباب کے
اظہار کا نام ہے۔ کوئی اسے اسباب الٰہی کی علامت سمجھتا ہے جسے صرف ظاہری آنکھیں اور کبھی دل کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں جمالیات
کی تاریخ پر انھیں مسیحی اور یونانی تصورات کی حکومت رہی ہے جو بکھری ہوئی شکل میں آج بھی اردو ہندی شاعری میں کبھی کبھی نظر آ جاتی ہے۔

یورپ کے نشاۃ الثانیہ نے حسن اور جمالیات کا تصور بالکل بدل دیا۔ انسانی اخوت نے فن اور احساس جمال کو انسانی زندگی
بلکہ مادی زندگی سے زیادہ قریب کر دیا۔ مابعد الطبیعاتی رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ دانتے اور شیکسپیر کے یہاں احساس جمال بالکل الگ مسائل
کے ساتھ پیش ہوتا ہے۔ دانتے کی دنیا اگرچہ مادیت سے ملوث ہے مگر اس کے مسائل روح کے لیے دوسری دنیا کے مسائل ہیں اور شیکسپیر
انسانوں کی دنیا اور اُن کے معیار حسن کو پیش کرنے میں بالکل آزاد ہے۔ اس کا احساس جمال مادیت کے راستوں سے پیدا ہوتا ہے اگرچہ
اس پر افلاطون کی پرچھائیاں بھی کبھی کبھی سایہ فگن ہو جاتی ہیں۔ تقریباً یہیں انفرادی (INDIVIDUAL) اور اجتماعی یا عام
(UNIVERSAL) احساس جمال کی بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں۔

سترھویں صدی، ڈیکارٹ، لاک، لائبنیز، اسپنوزا اور بیکن کے ساتھ تشکیک سے ہوتی ہوئی اسباب و علل کے ساتھ حقیقت
کے بہت قریب آ گئی۔ فکر و فن میں بھی اور احساس جمال میں بھی۔ پھر ڈیوڈ ہیوم نے ایک نئی بات کہہ دی کہ 'حسن ایک توازن ہے جو روح
کو طمانیت اور حظ بخشتا ہے، اور آگے چل کر فرماتے ہیں کہ 'ذکاوت (WIT) کی طرح حسن کی بھی شرح یا تعریف نہیں ہو سکتی۔
لیکن یہ صرف لمس یا ذائقہ سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کبھی یہ کہا کہ حسن اپنی افادیت سے لذت احساس کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد جمالیات
کی دنیا میں اور بہت سے مکاتب فکر ہیں۔ جرمنی میں لیسنگ، گوئٹے، شلر، کانٹ، ہیگل، ژاں ترینے اور خلینگل کے تصورات نے
جمالیات کی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ جمالیات، افلاطونی نظریے سے لے کر ہیگل کے حرکی تصور، خوبن ہار کی مطلق جمالیات ——
(ROMATIC NATURALISM) رومانی فطرت نگاری، (CARRIERE) کیریئے کا تصور اور بصورتی (EXACT AESTHETICS)
کروچے، سنتیانا (SANTYANA) برگساں، وائٹ ہڈ، جان ڈیوی کا سماجی فلسفہ اور اس کی جمالیات، میک ڈوگل اور سیمونڈ
الیگو سینڈر کے فن کار کے تجزیے، فن میں صرف جمالیات کی تلاش، ٹی ایس ایلیٹ صاحب کا نظریہ جمال جیسے سیکڑوں نظریے پڑے ہیں
وہ ناقدین اور معترضین جو اشتراکی ادب پر سب سے بڑا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ اشتراکی ادیب جمالیات کو اہم نہیں سمجھتے اولاً تو وہ

غلط کہتے ہیں کیونکہ اشتمالی ادیب جمالیات کو اہم سمجھتے ہیں۔ دوسری بات اُن سے یہ دریافت طلب ہے کہ وہ کس جمالیاتی نقطۂ نظر کی بات
ہیں۔ جمالیات سے اُن کا مفہوم کیا ہے؟ جمالیات خود بدلتی ہوئی تاریخ اور بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ بدلتی جاتی ہے۔ آخر وہ مطلق
کون سا احساسِ جمال ہے جس کا نعرہ ہر وقت بلند کیا جاتا ہے۔ احتشام حسین کی تنقید نگاری میں خاص طور پر یہ کہ جمالیات کے عملی تجزیے پر
بحثیں بھی ملتی ہیں۔ جو شخص زندگی کی قدروں کا پاس کرتا ہے وہ تمام اقدار کا محاسبہ بھی کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں کرتا تو اس کی تنقید
اور اس کا فنِ نقد یک رُخا ہے۔ کیا جمالیاتِ مطلق کا مطالبہ کرنے والے اس نکتے سے باخبر نہیں کہ احساسِ جمال میں جو نفسیاتی جذ
عمل ہوتا ہے وہ جذبۂ آسودگی، جذبۂ حقارت اور معاشی و معاشرتی پریشانیوں کے راستوں سے اپنی صورتیں بدلتا جاتا ہے۔ یہ جذ
حالات، جمالیات کا احساس بھی ایک مخصوص طریقے پر کرنے یا نہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک ہی منظر کسی کو ایک وقت دل فر
آتا ہے تو دوسرے موقع پر "غمِ روزگار" میں اُسے زیادہ دلچسپی نظر آتی ہے اور معشوق میں کم۔ کوئی کسی وقت چاند سے محبوب کا
روشن تصور کرتا ہے تو کوئی اُسے محض 'خونِ داغِ دل' سمجھتا ہے۔ اقبال کو مخصوص سیاسی حالات میں شفق، مغرب اُفق پر خو
کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتی اور کبھی یہی 'شفق' لعل بدخشاں کے ڈھیر کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب — لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب (مسجدِ

سامانِ بہار، معاشی بہتری کے دور میں جب لطیف جمالیاتی احساس بیدار کرتا ہے تو شاعر پر اس کا ردِ عمل یوں ہوتا ہے۔

لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا — جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
نزاکت اُس گلِ رعنا کی دیکھیو انشا — نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

لیکن جب سماجی حالات، معاشی بدحالی اور رفتارِ زمانہ کے ہاتھوں وہی شاعر پریشان ہوتا ہے تو اس پر یوں ردِ عمل ہوتا ہے

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

ایک پریشاں حال اور بھوکے آدمی کو بقول نظیر اکبرآبادی چاند، سورج صرف روٹیاں نظر آتے ہیں۔ اب اگر جمالیات کوئی مطلق قدر ہے تو اسے
از کم ایک انسان پر جو اچھی حس بھی رکھتا ہو، ایک ہی طرح ہونا چاہئیے لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس جذبے یا خیال کے ردِ عمل کے
کو تلاش کرنا ہی پڑے گا جو ایک مخصوص وقت میں ایک خاص طرزِ اظہار پر کسی فن کار کو اُکساتے ہیں لیکن وقت اور محرکات کی تبدیلی کے
اپنے اظہار میں بھی تغیر پیدا کر لیتے ہیں۔ احتشام حسین کی تنقید میں ایسے ہی ردِ عمل کی تلاش پر پہلے زور دیتے ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق
احساس بھی زندگی کے بہت سے رشتوں سے جڑا ہوتا ہے۔ جب تک ان رشتوں کو سمجھ لیا جائے، فن کار کے خلاء اور ذوقِ لطیف تک نقاد محض
وجدان کی روشنی میں نہیں پہنچ سکتا۔ اور اگر کوئی ناقد محض اپنے انفرادی وجدان کو رہبر بنا کر ذوقِ جمال کی جستجو کرے گا تو اس کی تلاش
جستجو اور اس کی تنقید معتبر نہیں ہو سکتی۔ سید احتشام حسین کی تنقید میں جا بجا ایسے ٹکڑے دیکھے جا سکتے ہیں جن سے اُن کے جمالیاتی نقطۂ نظر کی
وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) "جمالیاتی ذوق میں بھی نہ صرف اضافیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے بلکہ دوسرے احساسات اور جذبات سے اس کا جو تعلق ہے
غور طلب ہے۔"

(۲) "جمالیاتی قدر کو فنونِ لطیفہ میں بنیادی مقام حاصل ہے اس لیے اس کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئیے۔"

(۳) "جمالیاتی قدر نہ تو معین اور یکساں ہے اور نہ کسی ادب کی تاریخ میں ہر شاعر اور ہر ادیب ہر عہد میں ایک ہی طرح مقبول
یا غیر مقبول رہا ہے۔ تبدیلیِ ذوق کے نفسیاتی اور سماجی اسباب احساسِ جمال کو اتنا متاثر کرتے ہیں کہ خالص کلاسکی انداز

رکھنے والا یا روایت پرست اُسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ہر دور اپنا ذوق اپنے ساتھ لاتا ہے اسی وجہ سے ادب کے ہر طالب علم کو اس عہد کے تاریخی سماجی اور نفسیاتی میلانات کی واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے جس عہد کے ادب کا وہ مطالعہ کر رہا ہے۔"

(۴) "ترقی پسند نقاد جمالیات، لفظی خوبیوں اور دوسری چیزوں کا احساس رکھتے ہیں، اس سے متاثر ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں بھولتے کہ خود اُن کا احساسِ جمال مادی رشتوں اور رابطوں سے اثر پذیر ہوتا رہتا ہے۔"

(۵) جمالیاتی نقادوں کی پہنچ شعروادب کی خوبیوں تک ایک گہرے وجدان کے ذریعے سے ہوتی ہے اور ایک قسم کا صوفیانہ شعور ان کا رہنما ہوتا ہے۔ یہ کہیں بھی مکمل طور پر ادب کے اجتماعی اور سماجی محرکات کا پتہ نہیں دیتی۔ اس تنقید سے انھیں آسودگی نہیں ہوتی جو ادب کو اجتماعی کش مکش کا مظہر مانتے ہیں۔"

یہ تمام اقتباسات احتشام حسین کے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کر دیتے ہیں جو جمالیات کے متعلق ایک ہوشمند اور کھلے ذہن کے نقاد کا نظر ہونا چاہیئے۔ اب اگر اس تلاش اور جستجو کو رد کر کے کوئی امریکی نقاد ایلن ٹیٹ (ALLEN TATE) صاحب کی طرح یہ کہہ دے شاعری "تیسار ٹیری کی چیز نہیں" یا کسی نقاد کو یہ کیا حق ہے کہ وہ ناک کے نیچے رکھی ہوئی چیز کو چھوڑ کر دور اُفق پر اس چیز کے امکانات پر تجسس آمیز نظریں ڈالے، اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ محض ایسا لکڑہارا ہے جو لکڑی کو چھوڑ کر یہ سوچنے بیٹھ جائے کہ کلہاڑی جس سے وہ درخت کاٹ رہا ہے اس کا لوہا کہاں سے آیا۔ تو ایلن ٹیٹ صاحب سے صرف یہ کہنا ہے کہ لکڑہارا سوچے یا نہ سوچے مگر ادب کے ایک طالب علم کا تجسس ذہن یہ تو ضرور سوچ سکتا ہے کہ ایلن ٹیٹ صاحب کا ادب کے متعلق یہ رویہ کیا ہے؟ کہاں سے اور کس لیے۔ اور جیسے ہی وہ یہ سوال کرے گا، امریکی تنقید کا نقطہ نظر اس پر واضح ہو جائے گا۔ کہ ادب صرف ادب ہے اور کچھ نہ چاہیے اس ادب کا مہیج وہ جذبہ ہو جو عالمی جنگ کے اثرات نے پیدا کیا یا وہ ناآسودگی جو ویسٹ لینڈ کے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی جنگ عظیم کے بعد "لندن کا پل گر رہا ہے۔ گر رہا ہے" کی علامتی شکل میں نظر آئی تھی۔ لکڑہارا کلہاڑی کے لوہے کو سوچے یا نہ سوچے مگر ضرور سوچ سکتا ہے کہ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ وہ روز صبح سے شام تک لکڑی کاٹتا ہے اور ایلن ٹیٹ صاحب جیسے لوگ مسائل کی تلخیوں سے بے نیاز لیموزن پر فراٹے بھرتے ہیں۔ یہ معاشی اور سماجی بلندی اور پستی کیوں ہے اس کے اسباب اُس معاشی نظام میں جس سے وہ زندہ ہے یا یہ محض اس کا مقسوم ہے۔ لکڑی کا اس کی زندگی اور اس کے گھر سے کیا رشتہ ہے۔ بازار میں لکڑ بھاؤ چڑھنے اور اترنے سے اس پر کیا اثر پڑے گا۔ اور پھر جب اسی سوچ بچار کے درمیان اُس کی کلہاڑی کا پھل ٹوٹ جاتا ہے وہ اس کے ساتھ فوراً یہ بھی سوچتا ہے کہ اس کی گرہ میں اتنا مال بھی ہے کہ وہ دوسری کلہاڑی خرید سکے گا یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیوں نہیں بس یہی کچھ ایک تنقید نگار، شاعر اور ادیب کے سلسلے میں سوچتا ہے اور جب ناک کے نیچے ان باتوں کا جواب نہیں پاتا تو دور اُفق پر زمانے کے پیچ و خم اور اسباب و علل پر غور کرنے لگتا ہے۔ احتشام حسین کی تنقیدیں ایسے اسباب و علل کو بنیادی چیز مانتی ہیں۔ اُن کے افہام و تفہیم کے دائرے انھیں خطوط پر پھیلتے اور سکڑتے رہتے ہیں۔ اُن کے بیانات، سوالات، تشکک اور ایقان میں فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ وہ انداز ملتا ہے جو شبلی کے تنقیدی مزاج سے لے کر حالی کے اسلوب تک پھیلا ہوا ہے۔ نپے تلے جملے، دلائل و براہین سے آراستہ، تحقیق و تعریف سے دور، جدید ذہن کی موشگافیوں اور جدید سائنس اور نفسیات کے پیچ و خم سے گزر کر جب کسی نتیجے پر اُن کا قلم پہنچتا ہے تو وہ سامنے ایک ایسے قدآور نقاد کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جن کے نکالے ہوئے نتیجوں کو رد کرنا آسان نہیں۔

لیکن اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیئے کہ احتشام حسین اپنے مباحث اور نظریات کو حرف آخر کی شکل میں پیش کرتے ہیں ان کی دیدہ وری اور ژرف بینی نئے آنے والوں کے لیے ادب کے مطالعہ کا راستہ کھولتی ہے۔ اُن سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے

لوگوں کو اُن کی تحریروں میں روحانیت کا فقدان نظر آتا ہے اور اس طرح ان کے خیال میں ایسا ادب اور ایسی تحریریں عظیم کلچر کی تدوین میں مددگار نہیں ہوسکتیں۔ ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو۔ دراصل احتشام حسین ادب اور اچھے ادب کو تہذیب کرنا ہی بہتر اور اعلیٰ کلچر کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ وہ ادب کے تمام روحانی اور عمرانی راستوں سے کلچر تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن صرف مذہب اور اخلاق کے راستوں سے نہیں۔ مذہب اور روحانیت، کلچر اور ثقافت کا جزو ہیں جن کی رنگ آمیزی تو کسی تہذیب میں ہوسکتی ہے لیکن محض مذہب اور روحانیت ہی، کسی عظیم کلچر کو تخلیق نہیں کرتے۔ ہر کلچر میں مادّے کی کارفرمائی لازمی اور یقینی ہے۔ احتشام حسین کی تنقید میں "ادب میں روحانیت کا انکار" کرتی ہیں یا نہیں، اس بحث میں جانے سے پہلے "مذہبی عقیدے میں کیتھولک" CATHOLIC IN RELIGION والے کی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ صاحب کی باتیں سُن لیجئے ۔

" LITERATURE IS NEITHER PHILOSOPHY, NOR RELIGION,
NOR METAPHYSICS. ART IMPLIES NO MEDIATION
BETWEEN THE PHENOMENAL AND THE REAL "

ترقی پسند تو اس نظریہ کے قائل نہیں کیونکہ اس طرح ادب نہ صرف مذہب بلکہ ہر سلسلۂ حیات سے الگ ہوجاتا ہے۔ لیکن ایلیٹ کے یہ خیالات اُن لوگوں کے لیے ہیں جو احتشام حسین کی تنقیدوں کو روحانیت سے خالی پاتے ہیں۔ اور اس لیے دوسرے الفاظ میں تنقید کی عظیم الشان ممکت سے باہر۔ یہ وہی ایلیٹ صاحب ہیں جو دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

" WHAT I WANT IS A LITERATURE WHICH SHOULD BE UNCONSCIOSLY
RATHER THAN DELIBERATELY, AND DEFIANTLY CHRISTIAN.

اسے ایلیٹ صاحب کے نقطۂ نظر کا تضاد نہ سمجھئے گا بلکہ بہت گھوم پھر کر یہ سب کچھ "ادب برائے ادب" کی تبلیغ کا ایک نادر نمونہ۔ یعنی ادب کو صرف ادب ہونا چاہیئے اور کچھ نہیں۔ "ادب و فن کے تہذیبی مظاہر کی تشریح کے لیے روحانی اخلاقیات کا پیمانہ" ڈھونڈھنے والا بھی "طبقاتی جانب داری، نفسیاتی بیچارگی یا ذہنی مجبوری" میں کیوں گرفتار نہ ہوگا۔ اور ایسا ناقد اپنی "جذباتی کمزوری" سے کس طرح الگ سمجھا جائے گا۔ پھر تو اس کی بھی وہی حالت ہوتی ہے جو مُسے مارکسی نقادوں میں یکسانیت کے روپ میں نظر آتی ہے۔ جب بھی کوئی ادب کی تعبیر و تشریح کے لیے کسی نقطۂ نظر کو استواری سے اپناتا ہے، اس کے یہاں دوسروں کو جانب داری اور یکسانیت کا احساس ہوگا۔ اسی طرح سے جس طرح کسی نقطۂ نظر کے نہ رکھنے والے کو "بے اصولی" اور "پریشاں نظری" کا گرفتار کہہ سکتے ہیں۔ انگریزی ادب میں SWEETNESS AND LIGHT والے آرنلڈ سے لے کر CLASSICIST IN LITERATURE والے ایلیٹ تک ادبی نقاطِ نظر کا ایک انبار لگا ہے جو ہر دوسرے نظریے کی تکذیب کرتا ہے اور صرف اپنے نظریہ کی تصریح اور تہذیب پر مُصر نظر آتا ہے۔ اس سے ادبی تنقید کا کوئی دور خالی نہیں۔ آج اگر شاعری کو " EMOTION RECOLLECTED IN TRANQUILITY " سمجھنے والے ورڈسورتھ کو ایلیٹ صاحب کی شعر کی یہ تعریف کہ

" POETRY IS NOT TURNING LOOSE OF
EMOTION BUT AN ESCAPE FROM EMOTION.'

سنادی جاتی تو اُن پر کیا گزرتی۔ یا رومانوی دور کو اصل شاعری کا دور ماننے والوں پر اس تعریف کا کیا اثر ہوگا۔

لیکن جو لوگ ادب میں اُن نظریات کے قائل نہیں جنھیں سید احتشام حسین پیش کرتے ہیں، وہ بھی اُن کی دلیلوں اور اُن کے نظر کی پختگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ احتشام حسین کی تحریروں نے نئے نقادوں میں تنقیدی ذوق اُکسانے اور نئے موضوعات تنقید کی دنیا کو مالا مال کرنے کی تمنا اور جد و جہد کو بیدار کیا ہے۔ اختلافات، موضوعی مباحث، نظریاتی مسائل، ادب کے عصری اور ... تقاضے سب سے گزرنے کے لیے جب تک اُن کا فلسفہ، معلومات ملکی و غیر ملکی، علم و فن کے سمندر کا امرت منتھن نہیں کر لیتا، اس وقت ... نہیں نہ تو تسکین ہوتی ہے اور نہ کوئی نتیجہ برآمد کرتے ہیں۔ ادب میں SWEEPING (بغیر سوچے سمجھے) باتیں کرنا تنقید کا ... نہیں کیونکہ اس سے نہ صرف یہ کہ فن نقد مجروح ہوتا ہے بلکہ نقاد کا کھوکھلا پن ظاہر ہوتا ہے اور ادب کا صحیح محاسبہ بھی نہیں ہو ... جدید اردو تنقید اس انداز کے لیے احتشام حسین کی مرہون منت ہے جنھوں نے تنقید کو ان تمام راستوں سے گزار کر اس میانہ ... پر لا کھڑا کیا جس کے باعث تنقید، محض جانب داری، خودستائی، مرعوبیت کا اظہار نہ کر، سائنٹفک اور حقیقت نگاری کے ... پر گامزن ہو گئی۔

اردو تنقید کی تاریخ میں احتشام حسین کی آواز اسی وجہ سے اپنی گونج قائم رکھے گی۔ وہ ترقی پسند تنقید کے سب سے بڑے نقاد سمجھے جائیں گے۔

روایت اور بغاوت

صفحہ ۱۶۱: سماجی کشمکش سے پیدا ہونے والے ادیب کا جتنا ذخیرہ اردو میں فراہم ہوگیا ہے اتنا شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے اگر صرف ایسے شاعروں کا نام لیا جائے جو انقلاب کی دھمک اپنے سینے میں محسوس کر رہے ہیں تو ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے گو ان میں سے اکثر کے یہاں انقلاب کا مفہوم معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی آزادی کا حصول نہیں ہے وہ انقلاب کے اصل تاریخی مفہوم سے واقف نہیں ہیں لیکن موجودہ نظام کی خرابیوں سے بہت بد دل ہیں اور اسے بدلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

احتشام حسین کا اسلوب

اسلوب کو بجائے خود شخصیت قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو احتشام حسین کی شخصیت اور اسلوب میں بھی کوئی حد فاصل نہیں۔ احتشام حسین کی شخصیت کو سمجھے بغیر اُن کے اسلوب کو اور اُن کے اسلوب کو سمجھے بغیر اُن کی شخصیت کی پہچان ممکن نہیں۔ یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ بلکہ یہ دونوں مل کر ایک تصویر کی تکمیل کرتے ہیں۔ احتشام حسین نے شعر بھی کہے اور افسانہ نگاری بھی کی ہے اُن کے افسانوں کا مجموعہ اپنے طور پر اہمیت رکھتا ہے لیکن دنیائے ادب میں اُن کی منزلت ایک نامور نقاد کی حیثیت سے ہے۔ انھوں نے تنقید سے جو منصب بھی حاصل کیا ہو اُس سے زیادہ اپنی تنقیدات سے اردو کے تنقیدی سرمایہ کو وقیع اور حجیم کیا ہے اس کی آبرو میں اضافہ کیا ہے اس کو تابندگی اور روشنی دی ہے۔

نقاد سے عموماً کسی اسلوب کی توقع نہیں کی جاتی۔ رجحان یہ ہوا کرتا ہے کہ نقاد کو اپنی بات دو ٹوک اور صاف صاف کہنی چاہیئے۔ اس کو اسلوب اور طرزِ ادا پر نہیں مواد پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ کسی موضوع یا کسی کے فن پر اپنے خیالات، اپنی آرا و پیش کر دیے فصاحت اور سلاست سے اور بس ـــــــ اس میں شبہ نہیں کہ نقاد کے لیے کس طرح کہنا چاہیئے کی بہ نسبت کیا کہنا چاہیئے کی اہمیت زیادہ ہے لیکن اچھا نقاد صرف، کیا کہنا چاہیئے، پر توجہ نہیں دیتا بلکہ اس کیا کو اپنے طرز، اپنے ڈھنگ، اور اپنے اسلوب سے پیش کرتا ہے کہ اس کا مواد قاری کے لیے جاذبِ توجہ۔ دلکش اور دلنواز بن جائے۔ اُس کے ہاں 'کیا' کی اہمیت زیادہ سہی لیکن وہ کس طرح کہنا چاہیئے" کو یکسر نظرانداز نہیں کر سکتا اور نہ نظرانداز کرنا چاہیئے۔ ایک اچھے نقاد کے ہاں مواد کی طرح اسلوب کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ کامیاب اسلوب وہ ہے جو مواد کا جزو بن جائے اس سے علٰحدہ اس کا تصور ممکن ہی نہ ہو گویا موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں! مواد اور اسلوب میں ہم آہنگی اچھی تنقید اور اچھی نثر کی ضمانت ہوتی ہے۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے احتشام حسین کے ہاں یہ ہم آہنگی موجود ہے اپنے ایک مضمون "جدید اردو نثر کا اسلوبی ارتقاء" میں تحریر کرتے ہیں:

> "نثر کی خصوصیات، اظہارِ خیال کی برجستگی۔ روانی، ادبی لطافت اور استدلالی انداز میں رونما ہوتی ہیں۔ انھیں پر قدرت حاصل کر کے ادیب صاحبِ اسلوب بنتا ہے اور اگر اسلوب کی جستجو میں مواد اور موضوع کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے یا ادبی شان پیدا کرنے کی خواہش میں صرف بات میں بات پیدا کرنے پر اکتفا کیا جائے تو نثر مکمل طور پر ادبی نہیں کہی جاسکتی۔ محض اظہارِ خیال۔ اظہارِ معلومات یا خوبصورت الفاظ کی قطار نثر نہیں ہے بلکہ اس کا اندرونی معنوی ربط بھی اتنا ہی اہم ہے کیونکہ دونوں کے امتزاج کے بغیر وہ پُر آہنگ۔ جاندار اور معنی خیز نہیں بن سکتی اور نہ پڑھنے والوں پر اپنا جادو کر سکتی ہے۔"[1]

---

[1] "عکس اور آئینے" ص ۹۳

ارتباط اور امتزاج ہی کا نتیجہ ہے کہ احتشام حسین کی نثر پُر آہنگ، جاندار اور معنی خیز بن گئی ہے اور قاری اس کے سحر سے مغلوب! اس کا شکار!

اچھا نقاد مواد اور اسلوب کو ساتھ ساتھ لیے رکھنے کی سعی شعوری طور پر نہیں کرتا۔ اس طرح شاید یہ ممکن بھی نہیں کیونکہ وہ اپنے موضوع سے جس قدر مخلص اور اُس میں جس قدر محو ہوگا وہی خلوص اور محویت خود اسلوب کی تخلیق و تشکیل کا باعث ہوگی۔ گویا اسلوب کوئی اوپر سے لادی ہوئی شے نہیں ہے بلکہ وہ تو مواد سے اُبھرتی ہے یہ کسی پھول کا نکھار ہے جو کسی بیرونی شے کا محتاج نہیں خود پھول کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔

——— احتشام حسین اردو کے ان تنقید نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کی تحریر و تصنیف کا اپنا ایک مقصد ہے۔ اردو میں سماجی تنقید کو شعوری طور پر عام کرنے۔ مارکسی تنقید کو ہندوستانی مزاج سے ہم ساز و ہم آہنگ کر کے مقبول بنانے میں احتشام حسین کا بہت زیادہ اور اہم حصہ ہے۔ ایسا ادب جو کسی صحت مند مقصد اور سماجی صلاح و فلاح کے کام میں نہیں لایا جا سکتا۔ احتشام حسین کے نزدیک بے معنی اور لاحاصل ہے۔ ایسا فنکار ظاہر ہے مواد پر زیادہ توجہ صرف کرے گا تاکہ اُس کے مقصد کی ترویج، اشاعت اور مقبولیت ہو۔ اس کے نزدیک اسلوب مقصود بالذات نہیں اس کا نقطۂ نظر مقصود بالذات ہوگا۔ اسلوب کو وہ ذیلی اور ضمنی حیثیت دے گا لیکن چونکہ اپنے نقطۂ نظر سے اس کا اخلاص ہے اس لیے اُس کے مواد سے اسلوب خود بخود اُبھر آئے گا۔ اس خصوص میں احتشام حسین کے وہ مضامین اہمیت رکھتے ہیں جو انھوں نے ترقی پسند تحریک پر اعتراضات کے جواب میں سپردِ قلم کیے تھے۔ ان میں ایک مولوی اختر علی تلہری کا مضمون مطبوعہ "عالمگیر" اکتوبر ۱۹۴۴ء ہے۔ احتشام حسین نے اس کے جواب میں "عالمگیر" ہی کی اشاعت بابتہ دسمبر ۱۹۴۴ء میں ایک مضمون قلمبند کیا تھا۔ کسی درشتی، کسی سختی، کسی اشتعال کے بغیر اور نری جذباتیت سے دور رہ کر۔ بحث ہے کتنی سلجھی ہوئی اور اسلوب ہے کتنا واضح اور کتنا شگفتہ! اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"موصوف (مولوی اختر علی تلہری) ادب کو لفظوں کا حُسنِ استعمال سمجھتے ہیں۔ میں اسے معنی اور لفظ کے ایک ایسے امتزاج کا نتیجہ سمجھتا ہوں جس میں بہرحال پہلی جگہ معنویت کی ہے۔ موصوف کے لیے ادب خود ہی مقصد ہے۔ میں اسے زندگی کا ترجمان، نقاد، کشمکش کا مظہر، اور ادیب کے اس شعور کا آئینہ دار جانتا ہوں جو مادی کشمکش کا لازمی نتیجہ ہے۔ موصوف اخلاق کی قدروں کو ہمیشہ کے لیے قائم مانتے ہیں میں اسے سماج کے بڑھتے اور پھیلتے مٹتے اور ترقی کرتے ہوئے عناصر کے ساتھ بدلتا ہوا جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انسانی فطرت بدلتی رہی ہے، بدل رہی ہے بدلے گی اور اگر حالات بدل دیے جائیں تو کشمکش سے بھی بدلی جا سکتی ہے۔ موصوف لفظوں کے مطلق مفہوم کو لیتے ہیں اور اسی سے فیصلہ کر لیتے ہیں۔ میں لفظوں کے مفہوم کو استعمال کرنے والے اور استعمال ہونے کی حالت کے مطابق تغیر پذیر مانتا ہوں۔ اس لیے میں بعض چیزوں کے معانی اس سے مختلف سمجھتا ہوں جو موصوف سمجھتے ہیں۔"[1]

یہاں نہ زبان کی رنگینی ہے اور نہ عبارت آرائی۔ تحریر مقفیٰ یا مسجع بھی نہیں ——— اپنے موقف کی توضیح سیدھے سادے انداز میں کر دی گئی ہے۔ فنکار کو اپنے نقطۂ نظر سے جو جذباتی اور پُرخلوص وابستگی ہے اس کا اعلان و اظہار ہو ہی جاتا ہے۔ نقاد، فنِ نقد میں اونچا مقام رکھنے کے باوصف، اپنے گنجلک اندازِ بیان، بدحصل تحریر اور تصنع کی وجہ سے صاحبِ اسلوب نہیں ہوتے۔ وہ اپنی بات کہہ دیتے ہیں کسی سلیقہ اور ہنر مندی کے بغیر۔ احتشام حسین کو اپنے ہمعصر بیشتر نقادوں سے جس وجہ سے ممیز اور ممتاز کیا جاتا ہے وہ ان کے وقیع موضوعات اور گرانبہا مواد ہی نہیں دامنِ دل کو کھینچنے والا اسلوب بھی ہے۔ حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری میں جو کچھ فرق رہا ہو

---

[1] "روایت اور بغاوت" ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۸ء طبع دوم ص ۱۹۵/۱۹۶

…سرت کی شاعری زندگی سے دور نہیں کر دیتی زندگی سے قریب کر دیتی ہے۔ احتشام حسین کو حسرت کی زندگی کے بعض پہلو بھاتے ہوں
…ن کی زندگی دوست ہونے کے پہلو نے اُن کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ کیسے جادو جگاتے اسلوب میں وہ اظہارِ خیال کرتے ہیں :

"حسرت کی شاعری کا مطالعہ کیجئے تو نہ کہیں فلسفیانہ موشگافیاں ملتی ہیں نہ فکر انگیز خیالات نہ والہانہ پن اور
…ربودگی نہ غیر معمولی کرب اور اضطراب لیکن زندگی ہے کہ ان سے پھوٹی پڑتی ہے کیونکہ حسرت نے زندگی کی فطری خواہشات
محبت اور جد و جہد سے کبھی دوری اختیار نہیں کی۔ اسی میں اُن کی حقیقت پسندی کا راز بھی پوشیدہ ہے"[لے]

…ی شاعری ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں احتشام حسین کے اسلوب سے بھی زندگی ہے کہ پھوٹی پڑتی ہے یہاں تو خیر حسرت کی
…ں کو احتشام حسین نے پسند کیا ہے، وہاں بھی اُن کے اسلوب کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے جن کے ادب اور زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر سے
…ں طور پر انھوں نے اختلاف کیا ہے۔ حسن عسکری کے ذہن و فکر سے احتشام حسین نے کبھی ہم آہنگی نہیں کی، دونوں متخالف رجحانات
…ل ہیں۔ وہ حسن عسکری کی "جاندار، خوبصورت اور ادبی نثر" کے بارے میں اپنے خیالات کسی لاگ اور لپٹ کے بغیر ظاہر کرتے ہیں۔ ذہنی
…ات کو خاطر میں لاتے ہوئے وضاحت، سلاست اور نکھرے ہوئے اسلوب میں :

"عسکری کی جاندار، خوبصورت اور ادبی نثر نقدِ ادب کے متعلق بہت سے سوالات اٹھاتی ہے سوالوں کا جواب
نہیں دیتی۔ ایک "مبہم سا ذائقہ" پیدا کرتی ہے۔ توانائی نہیں بخشتی، شک میں مبتلا کرتی ہے۔ یقین کے دروازے نہیں
کھولتی۔ کہیں وہ ان باتوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ اُن کا مقصد نہیں ہے اور کہیں ادب کے ذریعہ ان خصوصیات تک رسائی
حاصل کرنے کا فرد نہ بتاتے ہیں۔ ان کی عدم مقصدیت میں ایک مقصد ہے۔ اُن کی غیر جانبداری میں تعصب ہے اُن کے
دلائل میں جذباتیت ہے اور یہ باتیں زندگی کی تغیر پذیر طاقتوں کو قوت پہنچانے کے بجائے کمزور کرتی ہیں"[لہ]

اپنے موقف پر شدت سے قائم رہتے ہوئے مخالف رجحانات رکھنے والوں کے باب میں اس خوش اسلوبی سے تنقید کرنا اُسی وقت ممکن ہے
…کہ نقاد مخالف رجحانات کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تجزیہ کر چکا ہو اور اسی کے ساتھ الفاظ کا مزاج داں اور واقفِ اسرارِ معانی ہو۔
اسلوب کا تعلق فکر سے بے حد گہرا ہوتا ہے کسی مسئلہ اور موضوع پر فنکار کا فکر جتنا صاف اور ستھرا ہوا ہوگا اس کے اسلوب میں اسی
…صفائی اور سلجھاؤ کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور تو اور احتشام حسین نے ذہن و فکر کی اس پس و پیش کی کیفیت کو خلاقانہ فنکارانہ طریقہ پر
…لکس و نقاب کر دیا ہے ــــ انسان کی ذہنی کشمکش، گومگو کی کیفیت، اور اُس کی اپنے آپ سے نبرد آزمائی کا بیان کرنا، اس کی
…ی پیش کر دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ لگتا ہے کسی نے انسان کے داخل ہونے والی اس مہابھارت کو ہمارے سامنے چلتا پھرتا، اپنی ہر
…ت اور ہر کیفیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یا سامنے پردۂ فلم ہو اور یہ سب کچھ پردۂ فلم پر اپنے "حقیقی" خد و خال میں جلوہ گر ہو۔ احتشام حسین
…اس داخلی آویزش۔ ذہنی الجھنوں کو کتنے پُرسکون، ٹھہرے سنبھلے ہوئے لب و لہجہ میں، کتنی خوبصورتی اور رعنائی کے ساتھ آئینہ کر دیا
…ہے۔ قاری کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ کیا پڑھ چکا ہوگا۔ یہ ہے اسلوب کی ندرت :

"کتنی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ کیا کبھی انھیں لکھ سکوں گا! ناکامی اور نامرادی کا نہیں، بے دلی اور بے حوصلگی کا احساس
ہے۔ جاگتا ہوں، سوجانا چاہتا ہوں، اٹھتا ہوں، گر پڑتا ہوں۔ ذہن میں سخت جنگ ہوتی ہے۔ جیتتا ہوں ہار جاتا ہوں،
مقدمہ عجیب ہے۔ خود ہی مدعی خود ہی مدعا علیہ۔ خود ہی وکیل اور خود ہی گواہ اور خود ہی فیصلہ کرنے والی عدالت اور خود ہی سزا کا

لے "منتخب ادب"۔ ترتیب دینے والے: سید احتشام حسین، غلام ربانی تاباں۔ حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ بار اول ص۱۰
لہ "ذوقِ ادب اور شعور"۔ ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ۔ ۱۹۵۵ء۔ بار اول ص۲۵۳

نفاذ کرنے والا حاکم ہے۔[1]

احتشام حسین نے ادبی مسائل ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں کسی بند اصولوں کی روشنی میں غور نہیں کیا ہے۔ اُن کا اپنا انداز نظر ہے۔ اسی باعث بعض مسائل پر مسلمہ اصولوں اور آرا پر اُن کے خیالات میل نہیں کھاتے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ اُن کے خیالات سے اختلاف کیا گیا ہے۔ کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کے افکار و خیالات کی صداقت سے انکار ممکن نہیں یہی کسی فنکار کی کامیابی اور عظمت کا نشان ہے۔

احتشام حسین کے ہاں موضوعات کا بے حد تنوع پایا جاتا ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات، مختلف مسائل اور موضوعات و مسائل کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے موضوعات میں قدیم ہند و شانی مصوری بھی ہے اور ایرانی تہذیب بھی۔ ٹیگور اور تلسی داس پر بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے اور آغا حشر کی ڈرامہ نگاری پر بھی۔ قطب مشتری پر بھی اور داغ کے رام پور سے تعلق پر بھی۔ افسانہ میں فسادتی عناصر پر بھی اور غزل میں محبوبہ کے بدلتے ہوئے کردار پر بھی۔ ادب کا مادی تصور اور ادب میں جمود جیسے موضوعات تو اُن کے ہیں ہی۔ پھر ادھر اپنے ہم عصر کئی فنکاروں پر اُن کے پُرمغز مقالات کو جس قدر بھی اہمیت دی جائے کم ہے ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا بھی ذکر ہے اور راشد الحق کا بھی۔ اپنے قصبہ ماہل کی یادوں سے اُن کے مضامین روشن ہیں تو لندن کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کا قلم چمکنے اور قاری کے ذہن کو مہکانے لگتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ ہر مقام پر موضوع سے اسلوب کو بڑی چابکدستی اور ہنرمندی سے مربوط کر جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس طرح غیر ارادی طور پر ہوتا ہے جوں صریر خامہ نوائے سروش بن گیا ہو۔ یہی اسلوب کا حسن ہے، احتشام حسین کے ہاں ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ ایک جگہ رومانیت کی توضیح کرتے ہیں قطعی رومانی انداز میں:

> "آزادی کی خواہش، نئے اثرات، نئے وقوف اور تجدد کے ذوق نے خیالات کو نئی دنیاؤں میں آوارہ کیا۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں بے تکان اور بے روک ٹوک گلگشت کرنے کے سلسلہ میں بہت ہی روایتی رکاوٹیں دور ہوئیں اور بہت سے نئے قطعے سر ہوئے۔ اسی کو ہم رومانیت کہتے ہیں۔"[2]

مہدی افادی پر احتشام حسین کا مضمون کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ میرے نزدیک اس کی اہمیت ایک وجہ سے یہ ہے کہ یہاں انھوں نے اپنے اسلوب کو مہدی افادی کے اسلوب سے ہمدوش و ہمکنار کر دیا ہے۔ ہر طرح سے کامیاب! یوں لگتا ہے مہدی افادی کا قلم ہی گہر افشاں ہے۔ ان کی روح کچھ دیر کے لیے احتشام حسین کے قالب میں ڈھل چکی ہے۔

> "یہ وہ شرر تھا جو شعلہ نہ بن سکا لیکن بجھ کر بھی وہ ایک دبی ہوئی چنگاری کی طرح اب تک گرمی اور حرارت کا چھوٹا سا خزینہ بنا ہوا ہے۔ کوئی کرید کر اسے دیکھے تو اس میں آج بھی تابندگی اور حرارت سے آنکھیں خیرہ کرنے اور دل میں گرمی پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔"[3]

احتشام حسین کے اسلوب میں تیکھا پن نہیں ہے۔ شدت نہیں ہے۔ تندی بھی نہیں۔ کوئی داؤ پیچ بھی نہیں۔ سلامت روی ہے۔ ایک دھیما پن ہے۔ اُن کی تحریریں پڑھئے خنکی اور ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ ایک آہستگی کا، شائستگی اور تہذیب کا۔ ان کے اسلوب میں ایک مرنجاں مرنج کیفیت ہے جیسا کہ خود احتشام حسین تھے۔ ذکر خواہ کسی شخص کا ہو یا شہر کا۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے بارے میں انھوں نے دو چار جگہوں پر لکھا ہے۔ ایک خصوصی مضمون کے علاوہ دیگر مضامین میں بھی اعجاز صاحب کا تذکرہ ملتا ہے۔ کتنے سہانے انداز میں۔ اسے

---

[1] "ساحل اور سمندر" ص ۲۹۶
[2] "افکار و مسائل" نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۶۳ء۔ بار اول۔ ص ۱۲۳
[3] "عکس اور آئینے" ص ۵۹-۱۰

اعجاز صاحب کی شخصیت کی خوبی کہئے یا احتشام حسین کے اسلوب کا بانکپن۔ یہ دیکھئے:

"اعجاز صاحب کا آنا ہمیشہ اسی طرح خوشگوار ہوتا ہے جیسے سخت گرمی میں برسات شروع ہو یا خزاں میں بہار آجائے اور واقعی وہ آئے تو بارش بھی ہوئی اور موسم بھی بدل گیا"۔[۵۱]

اسی طرح ایک اور اقتباس سے اعجاز صاحب کی شخصیت ہی کو نہیں احتشام حسین کے اسلوب کو بھی سمجھنے میں مدد ملے گی:

"خیر تو ذکر تھا اعجاز صاحب کا، اور اُن کی انفرادیت کے پیش نظر میں انھیں اکبر یا امرود کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہتا۔ اگرچہ اُن کا تعلق دونوں سے ہے۔ اکبر پر انھوں نے ہندی میں ایک کتاب لکھی ہے اور امرودوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ اکبر کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، امرود کھاتے اور کھلاتے ہیں"۔[۵۲]

اپنے ایک بزرگ دوست کے بارے میں تاثرات تھے۔ اسٹالن سے اُن کو جو ذہنی اور فکری وابستگی رہی ہے اس کا اظہار بھی کتنے سوال اسلوب میں کرتے ہیں:

"۶ مارچ جمعہ۔ آج صبح اسٹالن کے مرنے کی خبر آئی۔ ایک بہت بڑا عالم، دانشور، انسان دوست، امن پسند، عوام کا محبوب رہنما دنیا سے اُٹھ گیا! اس کے علم کی ضیا اور اس کے یقین کی گرمی سے میرے شعور نے بھی کچھ نہ کچھ روشنی اور گرمی حاصل کی ہے۔ وہ اپنے کارناموں میں اور اچھے انسانوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا!"۔[۵۳]

احتشام حسین کے تنقیدی مضامین میں بھی اُن کے اسلوب کی دلآویزی اور دلربائی کا حامل ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اردو کے بیشتر نقادوں کو میسر نہیں لیکن جہاں تک غیر تنقیدی مضامین اور انشائیوں کا تعلق ہے یہ دلآویزی اور دلربائی اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے۔ نکھار کچھ اور نکھر جاتا ہے پن کچھ اور بانکپن کا حامل ہوتا ہے، جس کی کیف سرشاری اور دل آسائی کی ساری کیفیات باہمدگر مربوط ہو جاتی ہیں، یوں لگتا ہے بہار بہار ہے اور کوئی حسین محوِ گلگشت! خراماں خراماں لطف و انبساط کی دولت لٹا رہا ہے۔ اسلوب کے تعلق سے ایسی مثالیں اُن کے سفرنامہ ریکھیے "ساحل اور سمندر" میں بہت زیادہ ہیں۔ اپنے قصبہ ماہُل کا ذکر کرتے ہیں:

"ماہُل اعظم گڑھ کے ضلع میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جو میرے بچپن میں بہت بارونق معلوم ہوتا تھا لیکن اب اجاڑ سا نظر آتا ہے۔ تاہم اس ویرانے سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں جن کا بدل کوئی اور زندگی، زندگی کی کوئی پُرمسرت گھڑی نہیں ہو سکتی۔ اب بہت کم وہاں جانا ہوتا ہے لیکن اب بھی وہاں جانا اتنی ہی آسودگی بخشتا ہے جتنی ماں کی محبت بھری آغوش"۔[۵۴]

اور اب ذکرِ لندن ہے، میرے خیال میں لندن کی ایسی تفسیریں کم ہی کی گئی ہوں گی۔ اتنی مختصر، اتنی مفصل!

"۶ مارچ، سنیچر۔ اور یہ لندن ہے! اس لفظ میں کتنی داستانیں، رنگین اور خونیں کہانیاں، تہذیبی مرقعے، تاریخی واقعات شعر و ادب کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اس لفظ سے کتنی باتیں، کتنی یادیں متعلق ہیں۔ اسے تو خاص نظر سے دیکھنا ہے! لندن کو دنیا کے سب سے بڑے شہر کو، جس کی رونق اور گرم بازاری میں ہمارا لہو بھی صرف ہوا ہے"۔[۵۵]

ایسے ہی ایک اور اقتباس کا مطالعہ کیجئے۔ اسلوب کی اس سے زیادہ رنگین اور سحر انگیز مثال اور کیا ہوگی:

"پکیڈلی کے ایک رسٹوراں میں بیٹھ گیا۔ کون کہتا ہے کہ زندگی حسین نہیں ہے! یہ خوبصورت دن اور یہ حسین راتیں یہ پُرجلال آفتاب اور یہ چاند ستاروں کا حُسن، یہ نور و نکہت کی فراوانی اور بادلوں کی ہمہ ہمی، یہ گل، سبزہ، چمن اور

۵۱ "ساحل اور سمندر" ص ۳۲ ۵۲ "ساحل اور سمندر" ص ۱۹ ۵۳ "ساحل اور سمندر" ص ۲۵۹ ۵۴ "ذکار و مسائل" ص ۹۱، ۹۲ ۵۵ "ساحل اور سمندر" ص ۲۳

پھولوں کے یہ شاداب رنگین تختے، یہ نغموں کا بہتا ہوا سیلاب اور یہ مصوری اور مجسمہ سازی کے معجزے، یہ شاندار عمارتیں اور یہ ہنستے ہوئے بے فکر لوگ، یہ تفریح کدے اور یہ رقص گاہیں۔ یہ کتب خانے اور یہ میوزیم، یہ تہذیب کی برکتوں سے مالا مال زندگی ــــ کون کہتا ہے کہ زندگی حسین نہیں ہے!

یہ انسانی حسن، یہ جامہ زیب جسم، یہ گوشت اور پوست کے اندر تھرکتی ہوئی جوانی یہ اختلاط اور پیار کے نظارے۔ یہ جرأت شکن بے اعتنائی۔ یہ رنگین ہونٹوں کے دلآویز خطوط، اور یہ آبشار کی طرح گرتی ہوئی زلفیں، یہ جسم کے اندر دہکنے والا شباب (سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا) کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی حسین نہیں ہے۔"[1]

احتشام حسین کے اسلوب کے بارے میں بھی بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا! اقتباسات شاید طویل ہوتے جا رہے ہیں لیکن میں ایک اور اقتباس دوں گا۔ قدرے طویل سا ہی ــــ لکھنؤ سے اردو ادب اور اردو تہذیب کا تعلق رہا ہے اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ احتشام حسین نے لکھنؤ کے بارے میں پڑھا اور سنا ہی نہیں، دیکھا اور محسوس بھی کیا ہے۔ کئی طرح سے لکھنؤ سے ان کی وابستگی رہی ہے ادبی تعلیمی اور تہذیبی ان کے کئی مضامین میں اس کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔ اودھ کی ادبی فضا بیان کرتے ہوئے وہ لکھنؤ کا تذکرہ چھیڑتے ہیں۔ اقتباس پڑھئے گویا مانی یا بہزاد نے تصویر کھینچ دی:

"لکھنؤ کا نام آتے ہی بغداد اور قاہرہ کا خیال آتا ہے جو الف لیلیٰ کی کہانیوں میں رنگ و بو کے پر اسرار جزیرے بن کر سامنے آتے ہیں۔ شیراز و صفاہان کی جانب ذہن منتقل ہوتا ہے۔ جن کے گلی کوچوں میں شعر و سخن کا چرچا تھا۔ لکھنؤ کے ساتھ نہ جانے کتنی رنگینیاں، کتنے نشاط آور خواب، کتنے نازک خیالات وابستہ ہیں۔ ان رنگینیوں اور رونقوں میں ایک نئی حکومت کا جاہ و جلال، شان و شوکت، امارت و ثروت، سرپرستی اور داد و دہش بھی شامل ہے۔ میلے ٹھیلے کی رونقیں بھی ہیں۔ رہس اور سبھا کے جھگڑے بھی، شعر و سخن کی مجلسیں بھی ہیں، علوم کے مرکزوں کی سنجیدگی بھی ہے اور مذہبی اداروں کی دھوم دھام بھی۔ اگر عید اور محرم میں سارا شہر خوشی اور غم کا مرقع بن جاتا ہے تو ہولی اور بسنت میں رنگ و بو کا دیار نظر آنے لگتا ہے۔ ایک ترشے ہوئے ہیرے کی طرح اس کے بہت سے پہلو ہیں اور ہر پہلو دیکھنے والوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔"[2]

ان اقتباسات کے بعد احتشام حسین کو، سپاٹ تنقید نگار کہنا ممکن نہیں جو روکھے، پھیکے، اکھڑے اکھڑے یا زیادہ سے زیادہ واجبی واجبی سے اسلوب کا مالک ہوتا ہے۔ احتشام حسین نے نہ صرف تنقیدی سرمایہ کو گرانبار کیا بلکہ اپنے اسلوب کی دلنوازی اور دلداری سے اردو تنقید کو ایک نئے اور جاندار اسلوب سے روشناس کرایا۔ ان کے ہاں اسلوب اور انتقاد یکجا ہو گئے ہیں کہ ان کو علحدہ کرنا ممکن نہیں۔ وہ اردو کے چند نقادوں میں شامل ہیں جو اپنی تنقیدات ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنے اسلوب کی وجہ سے بھی اردو ادب کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیے جا سکیں گے۔

---

[1] "ساحل اور سمندر" ص ۳۰۲

[2] "اعتبار نظر" - کتاب پبلشرز - لکھنؤ - ۱۹۶۵ء بار اول ص ۶۵-۶۶

ڈاکٹر حنیف فوق

احتشام حسین کے فکر کی فلسفیانہ بنیادیں

احتشام حسین کی آواز اردو تنقید میں فکر و استدلال کی آواز ہے۔ احتشام حسین سے پہلے پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی نگارشات نے ادب کی تعبیر کے لئے نئے پہلو پیش کر دیئے تھے اور اردو ادب کا سلسلہ عالمی سطح پر رونما ہونے والی نئی انقلابی جدوجہد اور نئے ذہن سے قائم کر دیا تھا لیکن ترقی پسند شعور کو عام کرنے اسے مقبول بنانے، ادب کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے سماجی مضمرات و اثرات کا پتہ چلانے، ادبی فکر کے غیر منطقی پہلوؤں پر منطق و استدلال کی ضرب لگانے، طبقاتی جدوجہد کے شعور کو آگے بڑھانے اور حاصل شدہ علوم اور ادب کے درمیان سلسلۂ مفاہمت کو وسیع تر کر کے انسان دوستی کے آدرش کو فروغ دینے میں احتشام حسین کی خدمات نمایاں اور ناقابلِ فراموش حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی تنقید منطقی استدلال کی تابع ہے اور یہ منطقی استدلال سب خود ادب اور زندگی کے فلسفیانہ تجزیہ کا نتیجہ ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع فلسفیانہ ادراک کا حامل ہے۔ اس منطقی استدلال میں جہاں ایک جانب ادبیات کے گہرے مطالعے کی جھلک ملتی ہے۔ وہاں دوسری جانب انسانی اعمال و محرکات، تاریخی حقائق و عمرانی نظریات اور سماجی تنظیمات و تحریکات کا عالمانہ شعور بھی کارفرما ہے۔ اس لحاظ سے احتشام حسین کی تنقید صرف ادب کی تنقید نہیں، ادبی تخلیقات کے ذرائع و محرکات کی تنقید بھی ہے۔ وہ تخلیق کی گرفت کے ساتھ ساتھ تخلیق میں جاری و ساری تصور کی گرفت بھی کرتے ہیں اور اس اعتبار سے ان کی تنقید ادبی میلانات اور رجحانات کا تجزیہ کرتے ہوئے زندگی کی اعلیٰ اقدار کا تحفظ کرتی ہے۔ وہ ادبی میلانات میں پنہاں یا نمایاں، انسان دوستی یا انسان دشمنی کے خیالات و تصورات کا خود اپنے وسیع سماجی شعور کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے ان خیالات و تصورات کی طبقاتی بنیادوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا تجزیہ استدلال کی قوت اور تاریخی آگہی کی صفت رکھتا ہے۔ مزید براں ان کی تنقید جہاں دوسروں کے افکار کا مطالعہ کرتی ہے۔ وہاں خود اپنے اندر بھی فکر و تامل کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے اور یہی ان کی تنقید کی دل کشی کا راز ہے۔ لیکن احتشام حسین کی بڑائی یہ ہے کہ وہ حقیقت کو اپنی فلسفیانہ نظر کا عکس نہیں سمجھتے بلکہ خود ان کا نظامِ فکر حقیقت اور وہ بھی زمینی حقیقت سے نور و حرارت حاصل کرتا رہا ہے۔

احتشام حسین سے پہلے اردو تنقید کئی اہم منزلیں طے کر چکی تھی اور ترقی پسند ادب کے ساتھ ساتھ خصوصاً مجنوں گورکھپوری اور اختر حسین رائے پوری کی تنقیدوں کے ذریعہ ترقی پسند تصوراتِ نقد بھی فروغ پا رہے تھے۔ اس ضمن میں مجنوں گورکھپوری نے اہم مضامین لکھے تھے اور ان مضامین میں نئے نئے تصورات کے ساتھ ساتھ اپنے سرمایۂ ادب کا شعور بھی جھلکتا تھا۔ ان تصوراتِ تخلیق و نظریاتِ تنقید کی بنیاد وہ تبدیلی تھی جو معاشرے میں رونما ہو رہی تھی۔ اس برصغیر میں سرمایہ دارانہ دور کا آغاز ہو چکا تھا جس کے ساتھ ساتھ نئی سماجی قوتیں بھی ابھر رہی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اہم سماجی اور سیاسی تحریکیں اس برصغیر میں قوت پکڑتی جا رہی

تھیں۔ سیاسی آزادی کی جنگ میں شدت آ چکی تھی اور خود اس آزادی کے تصورات اور معاشی حدود بھی متعین ہونے لگے تھے۔ نہ صرف یہ کہ اس تصور آزادی میں انقلابی تحریکات کی گرمی شامل ہو چکی تھی۔ بلکہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد عالمی جدوجہد سے ابھرنے والے استحصال سے پاک نئے انسانی معاشرے کے خط و خال بھی کسی نہ کسی حد تک واضح ہونے لگے تھے۔ اس لئے پہلی بار ادب میں ایک عالمی شعور آیا تھا۔ اور انسانی جدوجہد کی حدیں مشرق سے مغرب تک وسیع ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ وہ عوامل تھے جنھوں نے احتشام حسین کی نظر جانے میں حصہ لیا۔ اس میں شک نہیں کہ احتشام نے ترقی پسند تحریک، اور ترقی پسند تصورات کو آگے بڑھایا لیکن خود ان کے ذہن کی تربیت میں اس تحریک، اس تحریک کے ادبی کارناموں اور فکری معیاروں نے جو اہم حصہ لیا ہے، وہ قابلِ توجہ ہے۔ اس لئے احتشام حسین کی فکر کو ترقی پسند تحریک سے منسلک کر کے ہی اس کا صحیح جائزہ لیا جا سکتا ہے اور اس فکر کی بڑائی بھی دراصل ترقی پسند تحریک کی بڑائی ہے۔

ادبی فکر کے فلسفیانہ پہلو کی وضاحت سے بعض لکھنے والے منحرف اور تنقید کا کوئی خام شعور رکھنے والے گریزاں رہے ہیں۔ لیکن تنقید صرف تبصرہ نگاری نہیں اور نہ کیفیات کی بازیافت کا نام ہے۔ احتشام حسین نے طرزِ اظہار اور کیفیاتِ بیان سے گزر کر ادبی فکر کو اکثر موضوعِ بحث بنایا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ادب کی حیثیت صرف ارتعاشاتِ لطیف کی نہیں بلکہ یہ سماجی مقصدیت کا حامل ہے اور ادیب بھی معاشرے کے ذمہ دار فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس پر بھی اپنے خیالات و افکار کے صحیح یا غیر صحیح مفید یا مضر، متحرک یا جامد، ترقی پذیر یا تنزل آمادہ ہونے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ادبی فکر کے تجزیہ سے گریز کا عمل خود ایک طرزِ فکر کا پتہ دیتا ہے۔ اور غور سے دیکھئے تو کسی نہ کسی تصورِ حیات کا حامل ہے۔ اس لئے زندگی کے دوسرے تصورات کی طرح خود اس تصور کو خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ادبی شاہکار انسان کے ذہنی اور تہذیبی ارتقا کی تاریخ کا حصہ ہے۔ اسے صرف لاشعوری خواہشات، شخصیت سے گریز یا اظہار، قوانینِ ہیئت اور تخیل کی کرشمہ سازی کی نسبتوں سے سمجھنا ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس فکر میں یہ نسبتیں بھی شامل رہتی ہیں لیکن وہ انسان کی بہتر زندگی کی مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں پروان چڑھنے والے علم و آگہی کا عکس بھی ہے۔ احتشام حسین نے ادبی فکر کا جائزہ خاص طور پر اسی تاریخی علم و آگہی کے پس منظر میں دیکھ لیا ہے کیونکہ خود ان کی فکر تاریخی تسلسل کے شعور اور مادی اسباب ارتقا کے عرفان پر مبنی ہے۔ وہ تاریخ کے عملِ ارتقا کا ایک واضح فلسفیانہ تصور رکھتے ہیں۔ اور اس کی روشنی میں ادبی فکر کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے ادبی تخلیقات اور ادبی رجحانات کے خوب و زشت کا تعین کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ذوقِ ادب تصورِ جمالیات اور تعینِ معیارات محض انفرادی عمل نہیں، بلکہ ادب اور تاریخ کی وہ ملی جلی کسوٹی ہے جس پر ادبی تخلیقات اور ادبی رجحانات کو کسا جائے تو بڑی حد تک غیر ذاتی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے احتشام حسین نے اصولوں کی تدوین زیر بحث ادب پارے کے عصری میلانات سے تعلق، اس کی ہیئتی صورت پذیری، عمرانیات، معاشی علوم اور سائنسی انکشافات سے حاصل شدہ معلومات کے ادب پارے پر اثرات، اظہار کے مختلف پیرایوں میں زبان و بیان کے رموز سے واقفیت اور ادبی قدر و قیمت کے تعین کے تمام پہلوؤں میں ارتقائے تاریخ کی فلسفیانہ مادی تعبیر کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس تعبیر کی روشنی میں وہ ادبی اصولوں کی ترتیب اور معیاروں کی تفسیر و توجیہ کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے نتائج انفرادی ذوق کی سطح سے بلند ہو کر بڑی حد تک ایک نظامِ فکر کے نتائج بن جاتے ہیں اور جہاں اس فکر سے تعلق رکھنے والوں کے لئے بڑی حد تک قابلِ قبول و لائقِ اعتبار ٹھہرتے ہیں وہاں اختلافات رکھنے والوں کے لئے بھی انھیں سمجھنے کی منطقی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

فلاسفہ نے جستجو، اشیاء کو وہم اور صورت یا نام کو محض نام [illegible] دیا تھا لیکن تاریخ کی مادی تعبیر کے مطابق [illegible] پیداوار و نظام

م کی معاشی بنیادوں سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں وہ اپنے حل کی خاطر ایک وسیع اور بنیادی انقلابی تبدیلی کے لئے میدان
ار کر رہے ہیں۔ لیکن اس انقلابی تبدیلی کے لئے انسانی جدوجہد ضروری ہے اور ادب بھی اس جدوجہد کا حصہ بن سکتا ہے۔
شام حسین ادب کو اسی انقلابی جدوجہد کی ترجمانی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں . . . . ان کی ناقدانہ فکر بھی برابر ان رجحانات سے
سر پیکار رہتی ہے جو مختلف ادبی یا غیر ادبی وسیلوں سے اس تبدیلی کے عمل میں مزاحمت کرتے اور پیداوار و تقسیم کے غیر منصفانہ
شتوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں یا انسانی ذہن کو بھول بھلیوں میں گرفتار رکھنے کے جتن کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادیب کی فکر
ا اس کے ماخذات غیر ادبی ہی کیوں نہ ہوں، براہِ راست یا بالواسطہ ادبی صورت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ احتشام حسین نے ادبی فکر
جائزہ لیتے ہوئے اپنے دائرہ کار کو صرف ادبی صورت یا صرف ادب تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان تمام نا ادبی (غیر ادبی کے
مابلے میں شاید ترکیب بہتر ہو) عوامل کو بھی شامل کر لیا ہے جو ادیب کے ماحول سے عبارت ہیں۔ جن سے ادیب کی فکر مجموعی اعتبار سے
ذا حاصل کرتی اور اپنے لئے ادبی صورتِ اظہار کے راستے تلاش کرتی رہتی ہے۔ اس لئے ان کی تنقیدوں میں وہ نا ادبی سیاق و سباق
گیا ہے جو اگرچہ ادب کے نازک مزاجوں کو گراں گزرتا ہے لیکن جس کے بغیر خود نزاکت کے فنی تصور کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔ جب اس
سیاق و سباق میں ادب کا مطالعہ کیا جائے تو (اقبال کے لفظوں میں) احساس ہوتا ہے کہ خارا شگافی کا عمل شیشہ سازی سے
مختلف ہے اور نیا سماجی شعور اپنے ساتھ نئے معنی تصورات بھی لاتا ہے۔

ہر باشعور نقاد نے اپنے طور پر ادب کی ماہیت، ادبی اقدار کے تعین، ادبی نظامِ اظہار کے وسائل اور جمالیاتی معنویت کے مسائل پر کسی نہ کسی حد تک غور کیا ہے۔ کوئی تنقید نگار نظامِ اظہار کے وسائل اور جمالیاتی معنویت کے پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کرتا ہے، کسی نے ادبی اقدار کے تعین پر زیادہ سے زیادہ زور دیا ہے اور کچھ نے خود ادب کی ماہیت کو اپنی تلاش و فکر کا مرکز بنایا ہے۔ ان کے باہمی تعلق کے باوجود نقاد کی فکر و رسائی کا طریق کار بعض پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کرتا ہے اور بعض سے نسبتاً سرسری گزرتا جاتا ہے۔ پھر جس طرح ادب پارہ خود نظامِ موجودات میں جگہ پا کر اضافی صورتِ حال کا عکس ہوتا ہے اسی طرح فکر و تنقید بھی بدلتے ہوئے حالات میں برابر فن اور زندگی کے بدلتے ہوئے رشتوں کو پیش کرتی رہتی ہے۔ ہر باشعور نقاد ان رشتوں کو نئی ترتیب دیتا ہے۔ لیکن انفرادی طریق کار اور طرزِ رسائی کے اختلافات کے ساتھ ساتھ خود فن کی فطرت و ماہیت کے تصورات اور اغراض و مقاصد کے مفہومات بھی بڑے اختلافات کی بنیاد رہے ہیں۔ فن خود قائم بالذات اکائی ہے یا ذہنی تجربہ کے اظہار کی حیثیت سے اسے اہمیت حاصل ہے؟ فن اشیاء کو پیش کرتا ہے، خیالات کی ترسیل کا نام ہے یا محض ذہنی تمثال سازی؟ فن کی ابتدا اور اغراض کے چیاں اور چنیں کے ساتھ کیا اور کیوں کے جوابات بھی مختلف ہوتے رہے ہیں۔ فن توازن و تناسب سے عبارت ہے یا ادراک کے فرسودہ وسائل کی شکست کا نام ہے؟ اسے ذہنی اور اخلاقی نظاموں کے استحکام کا عمل سمجھنا چاہئے یا احساساتی و جذباتی تجربوں کا مرکب؟ فن کی صورت سازی خود اندرونی فنی حرکت کا نام ہے یا یہ بیرونی تحریک کی محتاج ہے؟ فن اعلیٰ اقدار کی نمو ہے یا ذہنی مجذوبیت کا جمالیاتی ابلاغ؟ اس کا سرچشمہ اجتماعی لاشعور ہے یا قدرِ مطلق کا وجود؟ اس کی محرک خارجی حقیقت ہے یا اسے داخلیت کی استعارہ سازی کہا جا سکتا ہے؟ فنی ذکاوت تبلیغ صداقت میں صرف ہوتی ہے یا صرف مغالطے اور فریبِ نظر کا جال اُمنتی ہے؟ فنی حسن جلوۂ صورت کا نام ہے۔ یا ماورائے حقیقت کی جستجو؟ اسے اثباتِ صداقت کا تخلیقی پیچ و تاب کہا جا سکتا ہے یا تہذیبی سفر کا سنگِ میل؟ ادب کو موضوعِ فکر بناتے ہوئے نقاد کو ان تمام سوالوں کا جواب دینا ہے۔ اور مختلف طور پر فن و مقاصدِ فن کی تعبیریں کی ہیں۔ جان ڈیوی (JOHN DEWEY) جمالیاتی تجربہ کی گرفت کے لئے انسانی

سطح کے نیچے حیوانی زندگی کی تہہ تک رسائی ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں فن کا صحیح کام دراصل حیاتیاتی اور ماحولیاتی
توانائیوں کے ایک دوسرے پر عمل سے کسی تجربۂ سالم کی تعمیر ہے۔ جہاں فنی تجربہ کو سماجی زندگی سے ربط بخشنے کی جستجو بعض نقادوں
کو زندگی کی حیاتیاتی و حیوانی بنیادوں تک لے گئی ہے، وہاں تجربۂ زندگی کو فن سے الگ ملا کے دیکھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ پولاک
(T.C.POLLOCK) نے ادب کو تجربات زندگی سے الگ کر کے زبان کے وسیلوں کی مدد سے سمجھنا چاہا ہے اور پھر ادبی زبان
اور دوسرے انسانی تجربات کے سلسلے میں کام آنے والی زبان میں بھی فرق قائم کیا ہے۔ اس کے برخلاف بعض بڑے لکھنے والوں نے جو
خود تخلیقی عرفان رکھتے ہیں۔ ادب اور قاری کے رشتے کو پہچانتے ہوئے میر کی طرح " پر مجھے گفتگو عوام سے ہے" کا اعتراف کیا ہے۔
گوئٹے (GOETHE) کہتا ہے کہ "اے میرے دوست عام پڑھنے والوں میں تمہارے بغیر کیا ہوتا۔ تمہارے بغیر میرے سب تاثرات خود
کلامی رہتے اور میری تمام تر مسرتیں تماشہ"۔ ان پڑھنے والوں میں تنقید نگار بھی ہوتا ہے اور بعض تنقید نگار بھی تنقید نو کے نام سے
خود تخلیق نو کا تصور پیش کرتے ہیں۔ اسپنگارن (SPINGARN) ادب کو خواب اور تنقید کو اس خواب کے دوبارہ دیکھنے کا عمل سمجھتا
ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "میں شاعر کا خواب دوبارہ دیکھتا ہوں" یہ الگ بات ہے کہ تنقید اس خواب سے بیداری کے بعد وجود میں آئی ہو لیکن
وہ تنقید کو تخلیقی عمل نہیں، بذاتِ خود تخلیق قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں فن کا انائے محیط (AL TERE GO) خود فن
ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خود جمالیات کی تعبیر بھی ہربرٹ اسپنسر (HERBERTSPENCER) نے زندگی کی افادیت سے
منقطع کر کے پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جمالیاتی مسرتیں دراصل حواس کی صلاحیتوں کے وہ افعال ہیں جن کا سلسلہ زندگی میں کام
آنے والے اعمال سے منقطع کر دیا گیا ہو۔ ایک طرف جمالیاتی مسرت کا یہ غیر افادی تصور تھا اور دوسری طرف ایمرسن (EMERSON)
نے فن کی بلندی کے تصور کو یہاں تک بلند کیا تھا کہ اس کے خیال میں شاعر تو کئی تھے لیکن شاعری یا نظم نہیں ملتی تھی۔ غور سے
دیکھا جائے تو یہ سارے تصورات فن زندگی کے کسی نہ کسی فلسفیانہ تصور کا عکس ہیں اور یہ تصور سماجی ارتقاء کے مختلف مراحل سے
گزرتے ہوئے انسانی شعور کی خارجی زندگی میں مادی اور طبقاتی بنیادوں کو پیش کرتے ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S. ELLOT)
نے ایک جگہ جیکوئس ریویر (JACQUES RIVERE) کا قول نقل کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر سترھویں صدی میں مولیر
(MOLIER) اور ریسائن (RACINE) سے پوچھا جاتا کہ وہ کیوں لکھتے ہیں تو وہ یقیناً صرف یہی ایک جواب دیتے کہ وہ
نفیس لوگوں کی تفریح طبع کے لئے لکھتے ہیں۔ دراصل تحریک رومانیت کے اثر سے ہوا ہے کہ تخلیقی عمل کو "مطلق" پر ایک طرح
کی حملہ اور اس کے نتیجہ کو انکشاف یا الہام سمجھا جانے لگا ہے۔ احتشام حسین نے اپنے مضمون ـــ " میں کیوں لکھتا ہوں" کسی
پراسرار قوت، نامعلوم طاقت اور مابعد الطبیعاتی آفاقیت کے نظریات کو رد کرتے ہوئے محنت کش طبقہ کی جدوجہد میں جانبداری
کے ساتھ ادراکِ حقیقت کو دوسروں تک پہنچانے کے تصور کو پیش کیا ہے۔ کسی نقاد کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مختلف نظام ہر
حقیقت میں اپنے دور کی سچائی تلاش کر سکے۔ کیونکہ کارل مینہم (KARL MANNHEIM) نے بڑی حد تک سچ کہا تھا کہ حقیقت سے مختلف
سیاق و سباق میں مختلف چیزوں سے مراد ہے۔ لیکن مختلف چیزوں میں امتیاز خود فلسفیانہ نظر کا متقاضی ہے اور حقیقت
صرف اپنے عہد کے سماجی کوائف کی بالکل واقعی اور مکمل تشکیل ثانی نہیں جیسا کہ بعض مفکرینِ تنقید مثلاً دورنٹ (DURANT)
نے سمجھا اور سمجھایا ہے۔ جس طرح اٹھارویں صدی میں جو جمالیاتی تصورات کے بڑی حد تک فرد کا زمانہ تھا یہ تصورات محض
خشک مجردات بن کر نہیں رہ گئے بلکہ ان کے پردوں سے سرمایہ دارانہ جمہوریت کے تقاضوں اور مسائل کی جھلک ملتی رہی تھی۔
اسی طرح انیسویں اور بیسویں صدی میں حقیقت کے مختلف تصورات میں صنعتی عہد اور اس کے پیدا کردہ مسائل کا واضح

ں جھلکتا ہے۔ پھر اس صنعتی تہذیب کے استحکام ہی سے اس زوال کے ڈانڈے ملتے ہیں اور ایک نئی انسانی تہذیب کا تصور
پا ہے۔ یہ تہذیب غیر انسانی اقدار کو رد کر کے انسانی مقاصد کے لئے ہمہ گیر جد و جہد کر رہی ہے۔ چنانچہ آج کی سچائی اس جد و جہد
ں و فکری پہلوؤں کی ترجمان ہے۔ احتشام حسین نے بہ حیثیت نقاد اپنے زمانہ میں ہونے والی اس جہد و جہد کی مختلف
توں کو پہچاننا اور تنقیدی بصیرت کے قالب میں ڈھالا ہے۔ وہ ہم عصرانہ ادبی تجربہ کو اپنے دور کی سچائی سے منسلک کر کے دیکھتے
۔ ان کے نزدیک ادبی تصورات خلا میں پروان نہیں چڑھتے بلکہ زمین اور زمین پر بسنے والوں کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔
دبی شعور کے اختلافات کو وہ ایک ہی دور میں مختلف سماجی ارتقا کے مراحل، یا مختلف ادوار میں مختلف منازل یا ایک
معاشرے میں مختلف ارتقائی منزلوں کے پیدا کردہ تصورات کا اختلاف سمجھتے ہیں۔ اسی طرح وہ ادب کی میکانکی تعبیر کو رد کرتے ہوئے
فن کو زندگی کی جد و جہد کا موثر حربہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادبی تخلیق بھی سماجی عمل کی ایک واضح صورت ہے جو سماج
ارتقا کے قوانین سے بندھی ہوئی ہے۔" ایلیٹ نے ایک جگہ فن کے زندگی کے خام اور زندگی کے مسیحا ہونے کے نظریات میں
بق پیدا کیا ہے، احتشام حسین بھی ادب سے حقیقت کی عکاسی اور حقیقت کی پیش بینی کے دونوں کام لینا چاہتے
ہتے ہیں۔"

احتشام حسین نے اپنے ادبی سفر میں تنقید کے علاوہ افسانے بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی کی ہے۔ ان کے افسانوں کا
عہ "ویرانے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے اکثر افسانے اپنے دور کی معاشرت اور معاشرتی مسائل سے تعلق رکھتے
کے نیم رومانی ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ یہی ابتدائی نیم رومانیت ان کی شاعری کے اس دور کی نظموں اور غزلوں میں بھی ملتی ہے
۔ افسانے لکھنا انھوں نے ترک کر دیا کیونکہ خود ان کے قول کے مطابق جب اول درجے کے افسانے پڑھنے کو مل
تے ہوں تو دوسرے درجے کے افسانے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ شاعری سے ان کا شغف جاری رہا اور دل کی باتیں
ن پر آتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ جذباتی ہر چند کبھی تیز نہ رہی تھی احتیاط و تامل سے مغلوب ہوتی گئی۔ محبت کے غم کے علاوہ
، کے بعد کے اشعار میں کہیں کہیں انسان کے غم کی جھلک بھی ملتی ہے۔ لیکن دراصل احتشام حسین نے شاعری کو ذات کے
ں گوشوں کے اظہار کے لئے انتخاب کیا تھا۔ ان کے پورے سماجی شعور کا عکس ان کی تنقید ہی میں ملتا ہے۔ احتشام حسین
بیمز کی کتاب کا "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس پر ان کا عالمانہ مقدمہ اور لسانیات سے تعلق رکھنے
لے چند مضامین اس موضوع سے ان کی دلچسپی اور واقفیت کی دلیل ہیں۔ ادبی اہمیت کے اعتبار سے ان کے تنقیدی مضامین
مجموعوں کے علاوہ ان کے سفرنامے اور ڈائری "ساحل اور سمندر" کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ ساحل اور سمندر محض
مانی سفر نہیں بلکہ ذہنی سفر کی داستان بھی ہے اور اردو کے سیاحت ناموں میں ایک قابل قدر اضافہ۔ اس کے مطالعہ سے
تشام حسین کی دوستی، اصول پرستی اور انسانی اقدار کے احترام کے نقوش واضح ہوتے ہیں اور ان کی فکر کے کئی گوشے سامنے
تے ہیں۔ پھر اس کی نثر میں وہ تابانی ہے جو ان کے تنقیدی مضامین کی نثر سے کہیں زیادہ تخلیقی جوہر رکھتی ہے۔ احتشام حسین
امریکہ کی رنگینیوں میں بھی اپنے آپ کو کھو نہیں دیا۔ بلکہ ذہن اور نظر دونوں کو بیدار رکھا ہے۔ اسی طرح جہاں انھوں نے امریکی
الف اور علمی کاموں کے سامراجی پس منظر کو سمجھا ہے، وہاں خود امریکہ کے دانشوروں سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کے علاوہ
نے مشاہدے و تجربے کی مدد سے وہاں کی خیرہ کن چمک کے پیچھے چھپے ہوئے اندھیروں کو دیکھ کر پایا ہے۔ یہ سفر احتشام
سین کی فکر اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔"

احتشام حسین نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ لیکن ان میں اس سے زیادہ دینے کی صلاحیتیں تھیں۔ تعجب یہ ہے کہ اپنی فکری بڑائی کے باوجود، وجود میں نہ آسکا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ذہانت کی دمک کے باوجود کوئی بڑا تخلیقی اضطرار، نہ آسودہ ہونے والا کرب اور جنون و حکمت کی آویزش کی تیز آنچ ان کی شخصیت و ذات کا حصہ نہیں۔ پھر شاید ان کے شعور نے علم کتابی سے زیادہ سروکار رکھا ہے اور ان کی ذات زندگی کے تجربات کی بھٹی میں اس طرح نہیں پگھلی ہے کہ ہر سانس لو دے اٹھے۔ اسی لئے ان کی تنقیدی نثر دماغ سوزی کا پتہ تو دیتی ہے۔ جگر کاوی کا نہیں۔ اس میں روشنی کے ہالے ملتے ہیں۔ لیکن زمین دوز تاریکیوں میں چھپی ہوئی اشیا کو نئے اسمائے نور بخشنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ احتشام حسین کی فکر خطرات کے سمندر میں گھری ہوئی زندگی کے لئے مینارۂ نور تو ہے لیکن ایسا منبع نور نہیں جو ربط کے ادراک کے بجائے خود ادراک روابط کی نئی روشنی میں اشیا و حقائق کو منکشف کر سکے۔ بہرحال یہ بات ماننے کی ہے کہ احتشام حسین کے تنقیدی مضامین میں جس وسیع مطالعہ کی جھلک ملتی ہے وہ بعض ضخیم و مبسوط کتابوں کو نصیب نہیں۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ احتشام حسین نے سمجھ کر پڑھا ہے۔ اور پڑھ کر سمجھا ہے۔ بعض لکھنے والوں کی طرح غیر ہضم شدہ باتوں کا انبار نہیں لگایا اور نہ بے صیقل ذہن کی نمائش کی ہے۔ وہ اپنے اصولوں کی سختی سے پابندی کرنے کے باوجود متین لہجے اور مدھم آواز میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں اس جھلاہٹ اور تلخی کا شکار نہیں جن سے ضد اور بے زاری پیدا ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ احتشام حسین نے تنقیدی اصولوں پر خاص توجہ دی ہے۔ اور اپنے زمانہ کے منفی رجحانات کی تردید کرتے ہوئے نظریاتی تنقید کو آگے بڑھایا ہے۔ لیکن ان کی عملی تنقیدوں میں بھی ان کی فکری بصیرت صرف ہوئی ہے۔ احتشام حسین سے پہلے چھائے ہوئے رومانی رجحانات کے طلسم کو ترقی پسند تحریک نے توڑا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی حد تک ان کی کارفرمائی جاری تھی۔ احتشام حسین نے ایک طرف ادب سے حشیش کا کام لینے والوں پر حملہ کیا، ادب کے الہامی، متصوفانہ اور نیم متصوفانہ تصورات پر ضرب لگائی اور دوسری طرف وہ رومانی میلانات کے بخشے ہوئے خیال پرستی، زندگی سے گریز، غیر متوازن انانیت اور بے عقل انفرادیت کے عناصر کو اپنی تنقیدی منطق کی ہتوڑی سے پارہ پارہ کرتے رہے۔

احتشام حسین نے مغرب سے آئے ہوئے بعض جدید نظریات کی جو کبھی فرد کی آزادی، کبھی ادیب کی آزادی، کبھی ہیئت کی اولیت، کبھی انسان کی آفاقی حیثیت، کبھی مابعد الطبیعاتی صداقت، کبھی خالص فن کے جوہر لطافت، کبھی عقیدہ پرستی کی مخالفت، کبھی خیال و عقیدے کی ثنویت، اور کبھی فن کی غیر افادیت و معروضیت کے نام پر دراصل سماجی جد و جہد کی نفی کرنا چاہتے تھے، خاصی قلعی کھولی ہے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک پر مختلف سمتوں سے جو حملے ہوئے ان کی مدافعت میں بھی احتشام حسین کا قلم سرگرم رہا ہے۔

احتشام حسین جدید نفسیاتی تحقیقات سے متاثر تو ہوئے ہیں لیکن ان تحقیقات کے فلسفیانہ نظاموں کو وہ کبھی قبول نہ کر سکے البتہ نفسیاتی تجزیہ کا جو رجحان آیا تھا احتشام حسین نے اس سے کہیں کہیں فائدہ اٹھایا ہے۔ راشد کی نظم اور فانی کی غزل کے تجزیہ میں یہ انداز نظر جھلکتا ہے لیکن ان کی فکر ان نفسیاتی عوامل کو مجموعی نظام معاشرہ کا تابع بناتی ہے، اس پر حاوی نہیں ہونے دیتی۔ ادب میں جنسی جذبہ کا جائزہ لیتے ہوئے احتشام حسین نے متوازن سماج میں متوازن جذبات کی ضرورت و باہمی تعلق کو پیش کیا ہے اور سماجی پس منظر کی اہمیت واضح کی ہے۔

غدر سے پہلی جنگ عظیم تک ترقی پسند ادب کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے احتشام حسین اسے خود اپنے ملک کی آزادی کی کشمکش

بتاتے ہیں۔ احتشام حسین نے ترقی پسند تحریک کا اپنی ادبی روایات اور اپنے سماجی ماحول سے رابطہ قائم کرکے اسے ملک کے
شعور کے اثرات کا نتیجہ کہا ہے۔ وہ پریم چند کی ترقی پسندی کا ذکر کرتے ہوئے اسے بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی
کا مطالعہ کہتے ہیں اور اس کی تفصیلات میں اس برصغیر کے عوام کے کرب و اضطراب کی جھلک پاتے ہیں۔ اس سے
نظیر کو عوام سے تعلق رکھنے والا اور زندگی کی وسیع ترین فضا میں پرواز کرنے والا شاعر بتا چکے ہیں آتش کی
ی میں بھی وہ آزادگی پسندی اور عظمت انسانی کے عناصر تلاش کر لیتے ہیں۔ اس طرح غالب کی بت شکنی میں وہ نئی
ں کی جستجو پاتے ہیں۔ حالی اور علی گڑھ تحریک کے اساسی تصورات پر احتشام حسین نے جو کچھ لکھا ہے، وہ کشمکش و بیداری کے
ے بہت سے اہم گوشوں کا فکری مطالعہ ہے۔ اسی طرح اردو ناول اور سماجی شعور میں وہ پھر سماجی ارتقا کے عمل
انین کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ پاکستان میں اردو، اس لحاظ سے بھی دلچسپ ہے کہ وہ ایک اہم لسانی مسئلہ کا
ی اور تہذیبی پس منظر میں جائزہ لیتے ہوئے حکیمانہ انداز نظر اختیار کرتے ہیں اور اسے جمہوری اداروں کی بقا اور ترقی
البتہ قرار دیتے ہیں۔ دراصل احتشام حسین کو اپنے ادبی سرمایہ سے محبت ہے اور جہاں کہیں زندگی کی حرارت پاتے ہیں وہ اس
حرارتوں کا اکتساب کرتے ہیں۔ . . . . . . ان کے مضامین کے تفصیلی مطالعہ کا یہ موقع نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا
ان کے اختصار میں جو مطالب پنہاں ہیں، ان کے اشاروں میں جو منضبط فکر ملتی ہے، ان کے اٹھائے ہوئے سوالوں
جو غور و فکر کے دروازے کھلتے ہیں اور ان کے چھیڑے ہوئے مسائل و مباحث نے جو روشنی بخشی ہے، اس نے ادراک
لی کی سطح کو نہ صرف بلند کیا۔ بلکہ اسے علم اور زندگی کی کلی وحدت کا ترجمان بھی بنایا ہے۔

روایت اور بغاوت

صفحہ ۱۳۷: "ادب کے جتنے شعبے ہیں ان میں کہانی سب سے زیادہ زندگی کے بھید کھولتی ہے سب سے زیادہ تمدن کے بہاؤ کا پتہ دیتی ہے اور سب سے زیادہ انسانیت کی تصویر کشی کرتی ہے کیونکہ اس کے خاکے میں ہر طرح کے نقش و نگار کی گنجائش ہے۔ داخلیت اور خارجیت کی آمیزش زمان و مکان کا کم یا زیادہ احساس، انسانی فطرت کے مختلف عناصر کی تشریح مقصد کی وضاحت کہانی سے زیادہ کہیں نہیں پائی جا سکتی۔ یہی سبب ہے کہ افسانے میں ہر دور حیات کی جھلک باقی رہ جاتی ہے اور نہ صرف ادبیات کا بلکہ تمدن کی قدروں کا اہم ترین جزو قرار پاتی ہے۔"

●

صفحہ ۱۴۳: "غدر کوئی اتفاقی انقلاب نہ تھا۔ پوری اٹھارویں اور آدھی انیسویں صدی میں ہندوستان کے دل میں جو پھوڑا پک رہا تھا وہ پھوٹ گیا۔ چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی اور اگرچہ وہ آگ بجھا دی گئی لیکن اس نے جو گرمی پہنچا دی تھی اور تھوڑی دیر کے لیے جو روشنی دکھا دی تھی اس میں بہت سے تصورات اور خیالات کی عمارتیں کھڑی ہوئی دکھائی دیں اور ایسا معلوم ہوا کہ انحطاطی دور ہمیں اس احساس اور شعور کے سوا اور کچھ دے بھی نہ سکتا تھا۔ غدر میں جو لوگ چونکے انھوں نے اس بڑے واقعے کو زندگی کا نقطۂ آغاز بنا لیا اور اس کے بعد سے ہمارے سامنے بہت سی نئی تحریکیں آ گئیں۔"

●

سحر انصاری

احتشام حسین ــــ ساحل اور سمندر

پروفیسر احتشام حسین یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو الہ آباد میں بعارضۂ قلب انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ساٹھ سال تھی۔ اس خبر نے علمی ادبی حلقوں کو بہت مضطرب اور رنجیدہ کر دیا۔ اس اضطراب اور رنج کے پس پشت شاید وہ احساسِ زیاں کارفرما تھا جو احتشام صاحب کے اٹھ جانے سے پیدا ہوا۔ احتشام صاحب نے جس خلوص، دیانت داری، لگن، انہماک اور شعور و بصیرت کے ساتھ ادبی ذمہ داریاں قبول کیں اور ان سے عہدہ برآ ہوئے۔ اس کی روشنی میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مرنے سے قبل اگر انھیں مرگِ ناگہانی کی آمد کا احساس ہو گیا ہوگا، تو ان کے وجود میں یقیناً ایک شدید اضطراب اور کشمکش کی کیفیت پیدا ہوئی ہوگی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں اردو کی ترویج و بقا کا ایک خود اختیار منصب انھوں نے اپنے سر لے لیا تھا اگرچہ وہ ایک فرد ایک فرد کے حدود اور اس کی بساط سے اچھی طرح واقف تھے اور انھیں اس امر کا بھی زعم نہیں تھا کہ ان کی ذات اردو زبان و ادب کے بقا کی ضمانت ہے۔ لیکن وہ یہ محسوس کرتے تھے جیسے انھیں اس محاذ کو پل بھر کے لئے بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اپنے ادبی سفرنامے "ساحل اور سمندر" میں احتشام صاحب نے اس کشمکش کو بہت موثر اور دیانت دارانہ پیرایے میں اجاگر کیا ہے جو امریکہ جانے کی دعوت ملنے پر ان کے ذہن میں پیدا ہوئی۔ وہ یہی سوچتے رہے کہ ان کی غیر حاضری میں وہ کام آگے نہ بڑھ سکے گا۔ جو انھوں نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ممکن ہے ہستی سے عدم کی سمت جاتے ہوئے انھیں اس کشمکش سے گزرنے کی مہلت بھی نہ ملی ہو۔ ؂

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

احتشام صاحب جب ادب و تہذیب کی یہ ذمہ داری قبول کر لینے اور ذرا سی کوتاہی کے لئے بھی اپنے ضمیر کی عدالت میں جوابدہ ہونے کا رویہ دراصل اس سماجی شعور کی دین تھی جو انھوں نے ترقی پسند تحریک اور مارکسی فلسفے سے اخذ کیا تھا۔ دراصل احتشام صاحب طالب علمی کے زمانے سے سماجی اور سیاسی تغیرات اور ان کے محرکات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس زمانے میں قومی آزادی اور فاشزم کے خلاف جنگ نے ان کی ذہنی تعمیر پر بڑا اثر ڈالا۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"سنہ ۱۹۳۰ء میں تعلیم کے لئے میں الہ آباد پہنچا، الہ آباد اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک میں مرکز تھا۔ بدیسی اور خاص کر برطانوی مال کا بائیکاٹ، ستیہ گرہ اور سیاسی چہل پہل اپنے شباب پر تھی، میں بھی فطری طور پر قومی آزادی کے جذبے سے معمور ہو گیا۔ الہ آباد میں جو بیداری تھی۔ میں نے

اسے جذب کرنے کی کوشش کی..... یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں میں نے لکھنا شروع کیا۔ افسانے، ڈرامے نظمیں، تنقیدی مقالات، علمی مضامین، سب کچھ۔ پڑھنے کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی خاص ترتیب یا خیال سے نہیں پڑھتا تھا، لیکن ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، نفسیات اور جنسیات سبھی سے دل چسپی لینے اور تنقیدی مضامین لکھنے پر صرف ہونے لگا۔ ۱۹۳۶ء میں میرے خیالات ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ ملک میں جو ترقی پسند جمہوری لہریں اٹھ رہی تھیں اور یورپ میں جو فاشزم کی مخالفت کا زور بڑھ رہا تھا میں خود کو ان سے ہم آہنگ کرنے لگا.....

"میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی ملک اور قوم کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اس کے سماجی نظام میں پیوست ہوتی ہیں اور ان کو اس سے الگ کر کے دیکھنا کبھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا..... (میں) جب ادب کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس میں انسان کے سیاسی، معاشی، تاریخی، سماجی، مذہبی، سبھی حالات کو لے لیتا ہوں تاکہ صحیح تصویر بن سکے۔ میں نے اسی طریقہ کو مفید پایا ہے اور اسی کی اشاعت کرتا رہا ہوں۔"[1]

یہ الفاظ احتشام حسین کی شخصیت اور ادبی زندگی، ترقی پسندانہ نقطۂ نظر اور تنقیدی معتقدات کا منشور کہے جا سکتے۔ ا احتشام حسین کی تحریروں کا مطالعہ کرتے وقت ان عوامل اور علوم کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جن کا اعتراف یا جن پر اصرار خ احتشام حسین نے کیا ہے، ورنہ بقول ان کے "صحیح نتائج تک پہنچنا ممکن نہیں۔"

کلیم الدین احمد جیسے "منفی نقاد" احتشام حسین کی دیانت داری اور سچائی کے قائل ہونے کے باوجود ان کی تنقید کے اس۔ قائل نہیں کہ بقول ان کے "احتشام صاحب کی ہر تان اشتراکیت اور مارکسزم پر ٹوٹتی ہے۔" کلیم الدین احمد ترقی پسندی سے شاید خ ہیں، اسی لئے انہیں ترقی پسندوں کے یہاں کوئی خوبی نظر بھی آتی ہے تو اس کا اعتراف کرنے کے بجائے اسے بھی خامی سے تعبیر کر گئے ہیں۔ احتشام حسین نے مارکسی فلسفے اور اسکی سائنسی، تاریخی، سماجی و ادبی تعبیرات پر اس طرح توجہ دی تھی کہ اسے اپنی فکر ذات کا جزو بنا لیا تھا۔ ان کے اس رویے کو سمجھنے کے لئے جہاں ایک طرف ان کے تنقیدی مجموعوں کا جائزہ ضروری ہے، وہیں دو طرف ان کے سفرنامے اور ڈائری "ساحل اور سمندر" کا بھی مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس سفرنامے سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے احتشام صاحب جب کسی ادارے، یونیورسٹی، کتب خانے یا ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے اور مختلف ادیبوں، فن کاروں، پروفیسروں اور بعض ہم وطنوں سے دیارِ غیر میں ملتے تو ان کے ذہن میں اقدار کو ناپنے کا کونسا پیمانہ ہوتا تھا۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب کوئی نظریہ اور فلسفہ فرد کی ذات کا حصّہ بن چکا ہو۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں ڈاکٹر آئی اے رچرڈس سے ملاقات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ۔

"یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں تنقید میں ڈاکٹر رچرڈس کے اکثر و بیشتر خیالات سے متفق نہیں ہوں، پھر بھی ان سے ملنے کی سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔"

اس جملے کے دو حصّے ہیں اور دونوں احتشام صاحب کی شخصیت کی تصویر ہیں۔ پہلے حصّے میں انھوں نے اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کر دیا ہے اور دوسرے میں ایک عالم کے متجسس ذہن اور ایک ادیب کی وہ شرافت نفس ظاہر کی ہے جو ہر اہل علم کے لئے احترام سکھاتی ہے۔ رچرڈس سے گفتگو کے دوران احتشام صاحب نے ایسی باتیں چھیڑ دیں جن کا جواب ا بعض مفید خیالات کی صورت میں ملا۔

اس ملاقات کے دوران تعلیم میں تنقید سے مدد لینے کی وضاحت کرتے ہوئے رچرڈس نے کہا "ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ جس تہذیب پر ہمارا ادب اور ہماری زندگی کی بنیاد ہے اسے بچے بھی سمجھیں۔۔۔۔ تنقید کے بڑے بڑے اصول بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں۔ لیکن جب تک ابتدائی تعلیم کے ساتھ اسے شروع نہ کیا جائے اس سے کوئی فائدہ نہیں"

غرض یہ اور اس طرح کے خیالات کا احتشام صاحب نے بطور خاص اس لئے تذکرہ کیا کہ وہ خود بھی تنقید کو تعلیم کا ایک اہم جزو سمجھتے تھے اسے ایک طرف تنقید حیات کے طور پر استعمال کرتے تھے تو دوسری طرف وہ سماج کی تعمیر میں تنقیدی شعور کو کارفرما دیکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح ان کے نزدیک نقاد کا منصب دوہری نوعیت کا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی ادیب کے ذہن یا ادب پارے کا تجزیہ تاریخی اور سماجی عوامل کی روشنی میں کرے اور یہ دیکھے کہ طبقاتی کشمکش اور طبقاتی جنگ میں اس کی فکر اور اس کا فن کس طبقے کا ساتھ دیتا ہے۔ اسی طرف داری سے اس کے بامقصد اور بے مقصد اور صحت مند ہونے کا تعین ممکن ہے۔ دوسری جانب وہ سمجھتے تھے کہ تنقید میں تدریس کا بھی ایک عنصر ہونا چاہیئے جو سیکھنے اور متاثر ہونے والے ذہنوں کو تنقید کا صحیح منصب بتانے کے ساتھ ساتھ ان کے شعور اور سماجی رویے کی بھی تربیت کرے۔ احتشام صاحب کی تنقید میں نقاد اور معلم کا خوش گوار امتزاج ملتا ہے۔ نہ وہ نرے نقاد بن کر ایک مخصوص علمی گروہ کے مخاطب بن جاتے ہیں اور نہ صرف معلّم بن کر تدریسی مضامین کی یکسانیت اور سپاٹ پن کا شکار نظر آتے ہیں۔ تنقید میں نقاد اور معلّم کا یہ متوازن آہنگ مجنوں گورکھپوری کے بعد احتشام حسین کے یہاں زیادہ سے زیادہ نمایاں اور نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ادب نگاری کے ساتھ ساتھ "ادب فہمی" پر بھی زور دیتے ہیں۔

احتشام صاحب کے ایک تنقیدی مجموعے "ذوق ادب اور شعور" میں ان کا ایک مقالہ "میں کیوں لکھتا ہوں" ان کے ادبی شعور اور تنقیدی بصیرت کو سمجھنے میں بہت معاون ہو سکتا ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے دو کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں پہلی کتاب تین انگریز ناول نویسوں پریسٹلے، گراہم گرین اور ازبیتھ باؤن کے مجموعہ ہے۔ (WHY DO I WRITE) (میں کیوں لکھتا ہوں؟) اور دوسری کتاب سارتر کی تصنیف کا انگریزی ترجمہ ہے۔ WHAT IS LITERATURE - (ادب کیا ہے؟) احتشام صاحب نے دراصل ان دو کتابوں میں دو انتہاؤں کو سمیٹ لیا ہے۔ ایک طرف پریسٹلے کا کہنا ہے کہ "میں تو اپنے لئے لکھتا ہوں" دوسری طرف سارتر نے کہا ہے کہ "میں اُس آفاقی انسان کے لئے لکھتا ہوں جس کا کسی خاص عہد سے تعلق نہیں ہوتا یعنی جو قوم، طبقہ اور نسل کے جذبات پر باطنی فتح حاصل کر لیتا ہے"

احتشام صاحب ان دونوں انتہاؤں کے درمیان کا ذہن رکھتے تھے۔ نہ وہ اتنے ذاخلیت پسند تھے کہ صرف اپنے لئے لکھنے کا دعویٰ کرتے اور نہ اتنے ماورائیت پرست کہ طبقات اور اقوام کے مسائل، ان کی باہمی کشمکش اور ان کے عارضی و ہنگامی معاملات سے صرف نظر کر کے کسی "آفاقی انسان" کے مستقبل کی تعمیر اپنی تحریروں میں ابھی سے کرنے لگتے۔ وہ ادیب کے منصب اور اس کی آزادی اظہار کے بارے میں بھی واضح ذہن رکھتے تھے۔ اس مضمون میں وہ پریسٹلے کے اس خیال کی تنقید کرتے ہیں کہ "عقیدہ اور تخیل دو چیزیں ہیں اور ادیب کی وہ شخصیت جو کچھ لکھتی ہے، اس شخصیت سے الگ ہے جو عقیدہ رکھتی ہے" گویا احتشام صاحب اس دوئی کی نفی کرتے ہیں۔ جو ادیب اور اس کی شخصیت یا ادیب کے قول اور فعل میں تضاد اور عدم مطابقت پیدا کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"یہی وہ خیال ہے جس سے آج کا سرمایہ دارانہ طبقاتی نظام اپنی بقا کے لئے وجہ جواز پیش کرتا ہے۔ اُسے یہ

دھوکا کھانا اور دھوکا دینا اس تضاد نے سکھایا ہے۔ جس میں دنیا کی سرمایہ داری اور اس کے حلیف آج مبتلا ہیں کیونکہ ایمان داری کے ساتھ سوچنے اور لکھنے والا یہ نہیں کر سکتا کہ وہ مانتا کچھ ہو اور لکھتا کچھ ہو اسے اس دوئی ہی میں فرار کا راستہ ملتا ہے کیونکہ ایسے ادیب کے عقائد کی جانچ نہیں ہو سکتی ہے۔ شاید یہ بات میں نے غلط کہی۔ جانچ تو ہو سکتی ہے لیکن اپنے طور پر وہ کسی کو اس جانچ کا موقع نہیں دینا چاہتا جیسے ہی کوئی نقاد اس کے خیالوں کی چھان بین کرے گا وہ کہے گا یہ میرے عقائد نہیں، میں نے تو محض لکھ دیا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے لئے متضاد باتیں کہتے رہنے کا حق بھی باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اور تنقید سے بچنا بھی یعنی وہ جب چاہے حاکم طبقہ کا طرف دار بن کر عوام کی مخالفت کرنے اور جب چاہے زبانی عوام دوستی کا دم بھرنے لگے۔ ادیب کے شعور کی یہ خطرناک آزادی کہ وہ جو چاہے کہے، جب ایک طبقاتی نظام میں زیر بحث آئے تو اس وقت یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بھیڑئیے بکریوں کو پھاڑ کھانے کا حق مانگ رہے ہیں۔

(ذوق ادب اور شعور ص ۱۳۱)

یہ اقتباس قدرے طویل ہو گیا لیکن یہ اس لئے ضروری تھا کہ اس سے ایک طرف احتشام صاحب کی یک رنگی آجاتی ہے اور دوسری طرف اس تحریر کے آئینے میں ہمارے یہاں کے ادیبوں کے رویے کی بھی جانچ اور تنقید ہو سکتی ہے صاحب ادیب کی آزادی کے مخالف نہیں۔ بلکہ علم بردار ہیں۔ لیکن وہ یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جب طبقاتی نظام میں شعور کی آزادی کا مسئلہ اٹھایا جائے تو یہ خطرناک نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ ادب کو زندگی اور سماج کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے صرف ادب یا ادیب کے لئے کسی خصوصی رعایت یا وقتی اصلاح کے طالب نہیں بلکہ وہ یہ جانتے اس بڑے تغیر کے لئے کوشاں ہونے ہی میں ادیب کے لئے کسی خصوصی رعایت یا وقتی اصلاح کے طالب نہیں بلکہ جانتے ہیں کہ اس بڑے تغیر کے لئے کوشاں ہونے ہی میں ادیب کے شعور کی آزادی کا راز بھی مضمر ہے جسے غیر طبقاتی نظام والا انقلاب کہتے ہیں۔

احتشام حسین شاعر بھی تھے، افسانہ نویس بھی تھے اور ڈرامہ نگار بھی۔ ان کی تنقید میں یہ تینوں اسالیب نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید عمرانی علوم، سائنسی حقائق اور فلسفیانہ مباحث کے باوجود ادبی اسلوب سے کبھی عاری نظر نہیں آتی۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ادب یا تنقید کو معاشیات کا شعبہ نہ بنا دینا چاہیئے۔ اور نہ اس تعلق کو جو معاشی عناصر اور تصوراتی ڈھانچے کے درمیان میں قائم ہو جاتا ہے، ریاضیاتی تناسب سے بدلتا ہوا سمجھنا چاہیئے۔"

(اردو تنقید پر ایک نظر ص ۲۸۹)

احتشام صاحب نے تنقید کے اس اسلوب کو نکھارا ہے۔ جس کی بنا مجنوں گورکھپوری نے اپنی تنقید میں رکھی تھی۔ صاحب کی تنقید میں فلسفیانہ انداز غالب ہے۔ جب کہ احتشام حسین نے سماجیات کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔ مجنوں صاحب گزشتہ دنوں ایک صحبت میں بتایا کہ اگرچہ احتشام حسین کالج یا یونیورسٹی کے واسطے سے ان کے شاگرد نہیں رہے وہ مجنوں صاحب سے بہت قریب اور متاثر تھے۔ اس قرب کی وجہ سے مجنوں صاحب کی رائے بہت صائب اور درست ہے کہ اگر احتشام صاحب اور زندہ رہتے تو وہ اردو ادب کو اور بہت کچھ دے سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی کام کا

نگی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ انھوں نے اپنے پہلے مجموعے "تنقیدی جائزے" سے لے کر "اعتبارِ نظر" تک کے کسی نہ کسی مضمون یا دیباچے میں یہ ضرور لکھا ہے کہ "ان کے تنقیدی مجموعے، مختصر مضامین پر مشتمل ہیں جو تنقید پر مبسوط تصانیف کا بدل نہیں قرار دیے جا سکتے۔ یہ تو صرف مسائل کو چھیڑتے اور ذوق کی تشنگی کو بڑھاتے ہیں۔" اگر احتشام صاحب اور زندہ رہتے تو وہ یقیناً تنقید پر مبسوط تصانیف کی داغ بیل ڈالتے۔

احتشام صاحب کی تنقید مختلف جہات کا احاطہ کرتی ہے۔ نہ وہ صرف نظری اور عمرانی مباحث پر زور دیتے ہیں اور نہ صرف ہم عصر ترقی پسند ادب ہی کے پابند رہنا چاہتے ہیں۔ وہ مغربی ادیبوں سے متاثر ضرور ہیں لیکن انھوں نے انھیں اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا ہے۔ اس طرح احتشام صاحب کی تنقید بیک وقت نظری مباحث کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے، کلاسیکی اور ہم عصر ادب کو مخصوص شعور کی روشنی میں سمجھنے کی راہ بھی ہموار کرتی ہے۔ اور مغربی ادب سے روشنی حاصل کرنے کا متوازن سلیقہ بھی سکھاتی ہے۔

احتشام صاحب کی آرا سے متفق ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کے تنقیدی مزاج کو سمجھ کر اسے قبول نہ کر لیا جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ احتشام صاحب اردو تنقید کی سب سے زیادہ متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ یہ تنازعہ کبھی ادبی اسکینڈل میں اس لیے نہیں بدل سکے کہ احتشام صاحب نے اپنے خلاف لکھی جانے والی رایوں کا تذکرہ تو وقتاً فوقتاً ضرور کیا ہے لیکن جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ "ادب اور سماج" کے دیباچے میں انھوں نے اپنی تنقید پر ہونے والی تنقیدوں کے باب میں یہ خیال ظاہر کیا ہے:

"ان رایوں میں اتنا تضاد ہے کہ میں خود کوئی نتیجہ نکالنے سے معذور ہوں۔ رائے دینے والوں میں بعض حضرات ایسے ہیں جن کی میرے دل میں عزت ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جنھوں نے میری تحریریں پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی مگر رائے دینا ضروری سمجھا۔ میں یا تو بے حس ہوں یا پھر اپنے جذبات پر کسی قدر قابو رکھتا ہوں کیونکہ نہ تو لوگوں کی تعریفیں مجھے بہت زیادہ مدہوش بناتی ہیں اور نکتہ چینیاں اور عیب جوئیاں مجھے بہت زیادہ تکلیف پہنچاتی ہیں۔ میں تمام رایوں کو غور سے پڑھتا ہوں، ان کی روشنی میں اپنی تنقید خود کرتا ہوں اور اندر ہی اندر مجھ میں وہ تبدیلی ہو جاتی ہے۔ جسے قبول کرنے میں میرا ضمیر جھجک محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اتنا ضرور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ تنقید کے بنیادی نظریات کے متعلق میرے وہ خیالات اور پختہ ہو گئے ہیں۔ جو میں آج سے کئی سال پہلے رکھتا تھا۔"

احتشام صاحب اپنے ان بنیادی نظریات پر آخر تک قائم رہے۔ یہ ان کی بڑائی تھی۔ انھوں نے ادب کے فیشن ایبل رجحانات سے رشتہ جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ نظری اور عملی تنقید کے جو نمونے احتشام صاحب نے چھوڑے ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ انھوں نے اپنے پہلے مجموعے "تنقیدی جائزے" کے دیباچے میں اپنے موقف کی وضاحت کر دی تھی جس پر وہ تمام عمر کاربند رہے:

"ان مضامین کا مصنف غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ادب مقصد نہیں، ذریعہ ہے، ساکن نہیں متحرک ہے جامد نہیں، تغیر پذیر ہے، اسے تنقید کے چند مقررہ فرسودہ اصولوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ ہی کام آ سکتا ہے۔ جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے

..اسلوبوں پر لکھی گئی ہو۔"

(دیباچہ تنقیدی جائزے)

"مواد اور ہیئت" "غالب کا تفکر" "اقبال کی رجائیت کا تجربہ" "غالب کی بت شکنی" "علی گڑھ تحریک" پہلو، پاکستان میں اردو، ادب کا مادی تصور، ادب اور جمود، اصولِ نقد، سحرالبیان اور فانی تنقید اور عملی حسین کے فکر انگیز اور منفرد مضامین ہیں ۔۔ ان مضامین نے اردو تنقید کو وزن و وقار عطا کر کے اسے غیر جذبا تجزیاتی بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔"

احتشام صاحب نیو یارک میں تھے تو ماہِ نومبر میں فرانس کے مشہور ترقی پسند شاعر پال ایلوا کے انتقال کی میں شائع ہوئی۔ احتشام صاحب کو اس کی ایک نظم جو "آخری اشعار" کے عنوان سے شائع ہوئی بہت پسند آئی او یہ لکھ کر کہ "ایسا معلوم ہوا کہ اس میں میرے دل کی بات بھی ہے"۔ اس کا ترجمہ کیا اور اپنے سفرنامے "ساحل ا میں شامل کر دیا۔ آج احتشام صاحب کی موت نے اس ترجمے کی یاد تازہ کر دی۔ پال ایلوا کی نظم کا ترجمہ احتشام نے ان الفاظ میں کیا تھا:

"میں سب کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ مجھ میں سبھی سے محبت کرنے کی اہلیت تھی مگر دھا تھی آسمان، سمندر اور زمین نے مجھے نگل لیا تھا۔

انسان نے دوبارہ جنم دیا۔

یہاں وہ محوِ خواب ہے جو اس میں شک کئے بغیر زندہ رہا کہ صبح ہر عہد کے لئے اچھی چیز ہے۔

اسے موت آئی تو اس کے دل میں دوبارہ زندہ ہونے کی خواہش تھی جیسے سورج پھر طلوع ہو جاتا ہے۔

میں اپنے لئے اور دوسروں کے لیے اس طرح جیا، گویا تھکا ہوا ہوں، لیکن میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اپنے کندھے کا بار ہلکا کروں اور اپنے غریب سے غریب بھائی کا بوجھ بٹاؤں۔

جیسے اپنے اوپر لادے ہوئے وہ قبر تک چلا جاتا ہے۔ اسی امید کی محبت میں میں نے اپنا نام تاریکی کے مخالفوں

ٹھہر جاؤ اور ہرے بھرے جنگلوں کو یاد کر دو!

چمکتی ہوئی دھوپ میں کھڑی لہلہاتی ہوئی کھیتوں کو یاد کر دو!

ان مناظر کو یاد کر دو جن پر سایہ کی تاریکی اور غم کا بوجھ نہ تھا! میری زندگی مٹی تو اس جگہ تمھاری زندگی آگئی۔

موسموں کی آمد و رفت اور زندہ رہنے میں ہمارا سلسلہ جاری ہے۔ ہم زندہ رہنے اور پائدار بن جانے کی تکمیل کرتے ہیں۔

احتشام حسین اپنی ذات سے ساحل بھی تھے اور سمندر بھی۔ موسموں کی آمد و رفت میں بھی انھوں نے اپنی حیات و واسطے سے زندہ رہنے اور پائدار بن جانے کے غیر معمولی عمل کی تکمیل کی ہے۔

——— ۞ ———

محمد علی صدیقی

احتشام حسین — نقاد اور سماجی مورّخ

پروفیسر احتشام حسین بھی چل بسے لیکن احتشام حسین کی دنیا اور ان کی فکر ہمارے پاس ہی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین ان لوگوں میں سے تھے جن کے کردار اور حسنِ اخلاق کی خوشبو برصغیر کے اردو داں طبقے میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک مدت تک درس و تدریس اور ترقی پسند تحریک میں غائر دلچسپی کے سبب ان کی عزت و شہرت ہر اس جگہ محسوس کی جاتی رہی جہاں ادب کی سماجی تعبیر کا پودا لگا اور پروان چڑھا۔

مجھ تک بھی وہ اپنی کتابوں، مضامین اور دو اہم شاگردوں کے ذریعے آئے۔ میرے دوست، آغا سہیل اور حسن عابد لاہور اور کراچی میں اردو کے استاد ہیں اور علی الترتیب جانے پہچانے افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ دونوں حضرات کا انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ سے بحیثیت سکریٹری تعلق رہا ہے اور دونوں ایک زمانہ سے احتشام حسین کی ذاتِ گرامی کے گرویدہ رہے ہیں۔ اس قدر گرویدہ رہے ہیں کہ میں اگر اپنے ان دو دوستوں کے بیان کردہ واقعات لکھنے پر آؤں تو ایک دفتر بھر جائے۔ ہر جوان اپنے بزرگوں کا ایک طرح سے شاگرد ہی ہوتا ہے میں اپنے ان دوستوں کے حوالے سے پروفیسر احتشام حسین صاحب کے اتنے رخوں سے واقف ہوں کہ اب میرے دوست مجھ سے احتشام حسین صاحب کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتے ہیں کہ جیسے میں بھی ان کے ساتھ لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم رہ چکا ہوں لیکن کچھ سال پہلے میرے لکھنؤ یاترا کا ایک مقصد پروفیسر احتشام حسین صاحب کی زیارت ہی تھا۔ لکھنؤ پہنچا تو معلوم ہوا کہ الہ آباد تشریف لے گئے ہیں اور الہ آباد میں قدم رکھا تو احتشام حسین صاحب لکھنؤ جا چکے تھے۔ دانش محل امین آباد کے بھی چکر لگائے الغرض احتشام حسین کے بہت سے دیوانے تو مل گئے لیکن دیوانوں کا فرزانہ مل نہ سکا۔

حسن عابد اور آغا سہیل کی نسبت سے میں پروفیسر احتشام حسین سے خود کو ایک عجیب رشتہ میں پیوست پاتا ہوں۔ ایک ایسا رشتہ جو موہوم اور "ادبی" ہونے کے باوجود کافی دل نشین ہے۔ اس رشتہ کو یوں بھی تقویت ملتی ہے کہ مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور ممتاز حسین کی تنقید سے ہمیشہ لگاؤ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ چند تذکروں کے مطالعہ کے بعد جب ترقی پسند تنقید کی طرف رخ کیا تو مجھے اپنے مطالعۂ ادب کے ساتھ ساتھ سماجیات، سیاسیات، معاشیات اور تاریخ کے بارے میں اتنا کچھ ملنے لگا کہ ایک نتیجہ اور دو کا ٹ کی بجائے چار چار کاٹ والا معاملہ نظر آتا تھا۔ اشعارِ غالب کے مطالعہ سے سفر شروع کیا اور دنیا زمانہ کی سیر کر آئے۔ ترقی پسند تنقید کی کامیابی کی بڑی وجہ ہمارے یہاں ان مضامین کے مطالعہ کا فقدان تھا جو ترقی پسند تنقید کے دست و بازو بنے۔ ہر چند کہ شعر بہرحال شاعر کا لمحۂ فکریہ ہوتا ہے اور سماج نہیں کی

کی ایک اکائی ہے. لیکن پھر بھی شعر جذبہ ہے، فکر ہے یا ان ہر دو اجزا کا باہم یا الگ الگ تجربہ ہے. جب یہ سب کچھ ہے آ
اور فکر فرد کے حوالے سے کل کی طرف مراجعت کا نام ہے۔

یہ عمل فرد اور قدرت، فرد اور سماج کے درمیان مغائرت ALIENATION ختم کرنے کا وظیفہ ہے اور چاہے ہم ہیگا
نظریۂ تاریخ کو مانیں جس میں خدا اپنے ALIENATION پر غالب آجاتا ہے یا مارکس کے تصحیح میں "خدا" کی جگہ" انسا
اس خیال کے ہمنوا ہو جائیں کہ انسان اپنے ALIENATION پر غالب آکر تاریخ بناتا ہے. احتشام حسین ان نقادوں
ہیں جنہوں نے ادب کو حکمراں طبقہ سے نکال کر عوام کی میراث بنانے کی جدوجہد کی اور فرد اور سماج میں مغائرت کی جگہ باہم ارتبا
کام کیا. انھوں نے مذہب یا خدا کے متعلق فیورباخ یا موسیز ہیس MOSES HESS کے نظریات سے اجتناب برتا لیکن پرولتاری اور سرا
درمیان مغائرت ختم کرنے کے لئے حتی المقدور کوشش کی. مذہب کے ثقافتی رخ سے ان کی دلچسپی محرم الحرام کی تقریبات میں شر
خود مجالس پڑھنے تک پھیلی ہوئی ہے. پروفیسر احتشام حسین خود کو اشتراکی نہیں سمجھتے تھے. بلکہ صرف ترقی پسند. ہماری سوسائٹی میں
ترقی پسند ہونا بھی کافی RADICAL قدم ہے، جبکہ مغرب میں اس نوع کی انسان دوستی لبرل ازم میں شمار ہوتی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کی تنقیدی عمارت دن بدن اونچی ہوتی جائے گی کیونکہ ترقی پسندوں کی نئی کھیپ زبان و فن کے محاس
درجہ زور دینے پر مقدر نہیں ہے جو احتشام حسین اور ان کی نسل اپنے بہتر کلاسیکی شعور اور ماضی کی صحت مند روایات سے محبت کی بنا پر د
تھی. دوسرے احتشام حسین کی ادبی تنقیدیں بھونچال لانے والے نظریات کے باوجود ایک متانت، سنجیدگی اور دھیماپن ہے جو مخالف
اور ششدر کرنے کی بجائے لطیف انداز میں متوجہ کرنا چاہتا ہے. یہ وصف ہمارے سماج میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہو چلا ہے
برصغیر کے لوگ مغربی لوگوں کے مقابلہ میں جلد ہی برانگیختہ ہونے کے ساتھ ساتھ جلدی ہی ٹھنڈے ہو جانے کے عادی ہیں. یہاں پر اگ
کمیاب بلکہ نایاب ہے تو وہ TEMPERANCE ہے اس لئے ہمارے منطقوں میں کسی بات کے CONTENT سے کہیں
اس کی ادائیگی اہم ہو جاتی ہے. پروفیسر احتشام حسین نے مسدس حالی پر اپنے مضمون میں مولانا حالی کے ساتھ اس مرحلہ پر کمال ہمدردی
دیا ہے جہاں وہ اپنے قارئین کے بے حد مطالبہ کی وجہ سے مسدس کی قنوطی فضا کو بدلنے کے لئے آخر میں چند ایسے بند شامل کرنے
مجبور ہو گئے تھے جو رجائیت میں ڈوبے ہوئے تو تھے لیکن اچھی شاعری نہیں تھے. پروفیسر احتشام کے خیال میں مسدس کا قنوطی کر
حالی کی شاعری کا کمال ہے. ممکن ہے کہ کوئی اور ترقی پسند نقاد یہ رائے دیتے ہوئے جھجکتا. لیکن احتشام حسین فن اور نظریہ
کسی ایک کو دوسرے پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں تھے.

پروفیسر احتشام حسین ایک طرح کے اشتراکی صوفی تھے. تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ امن کے موضوعات پر ان کی ریڈیائی تقاریر شاہد
بھگت کبیر، تلسی داس، امیر خسرو، میرا بائی، گورو نانک اور خواجہ معین الدین چشتی کے بارے میں ان کی آرا جس قسم کی انسان دو
ڈوبی ہوئی تھیں وہ کلاسیکی اشتراکیوں پر کافی شاق گزریں گی. اشتراکیت زبان و بیان کی PHILANTHROPY
نہیں رکھتی. اگر کوئی مصلح عوام کے جذبات کو شانت کرتا ہوا ملتا ہے. بھائی چارہ کی تعلیم دیتا ہے تو اسے طبقاتی جدوجہد کے
میں بے نظر امتحان نہیں دیکھا جائے گا کیونکہ خیر و شر کے درمیان جنگ کو تیز کرنے سے زیادہ کوئی اور مقصد اہمیت نہیں رکھتا.
کے مخصوص حالات میں فرقہ وارانہ امن کیلئے کوشاں رہنا ہی ترقی پسندانہ عمل تھا کیونکہ حکمران طبقہ مختلف مذاہب کے غریبوں کو
لڑوا کر ہی اپنی حکومت کو طول دے سکتا ہے۔

احتشام حسین غربت کو GLAMOURISE کرنے کی بجائے اس کا پوسٹ مارٹم کرنا چاہتے تھے. وہ استحصال کے عنو

سمجھنا چاہتے تھے۔ جس طرح علم الابدان کا پروفیسر لیبارٹری میں جسم کے ایک ایک عضو کے کام اور دیگر اعضا کے ساتھ اسکے ارتباط کا مطالعہ کرتا ہے، ہمارے زمانے کا علم غالباً غربت کے اسباب کی تفہیم کو مسدود کرنے کا نام ہے اور ادب کے انقلابی کردار کے ذریعہ اگر غربت کے درمیان دبیز پردہ کو چاک کر دیا جائے تو غالباً ادبی نقاد معاشرہ کے ساتھ اپنی وابستگی کو واضح کرتا ہوا چلتا ہے۔ اس کے لئے قاری ایک اہم فرد ہے اور ادب اگر زندگی کا راستہ روشن کرتا ہوا نہیں چلتا تو پھر اس کا کیا منصب رہ جاتا ہے۔ اگر یہ کوئی نشہ ہے تو پھر یہ افیون سے زیادہ کیونکر زوداثر ہو سکتا ہے۔ ادب سے فرار چاہنے والے لوگوں کے لئے اور بھی بہت سے نشے ہیں لیکن ادب اور پروپیگنڈہ کا فرق واضح رہنا چاہئے۔ ادب ثقافت اور تہذیب کے قافلہ کو منزل بہ منزل لے جاتا ہے۔ اگر اس نے اگلی نسلوں کی مشعل آگہی کی لَو کو مزید بلند نہ کیا تو پھر آنے والوں کو کیا ملے گا۔ ادب اور ایڈیٹر کے نام خطوط میں فرق رہنا چاہئے۔

ادب کی بڑائی بیانیہ سچائی سے کہیں زیادہ لب ولہجہ کی عمیق و اچھوتی تراش و خراش میں ہے جو چاہے براہِ راست اثر کرے یا بین السطور مفاہیم کی پراسرار اشاریت لئے ہوئے ہو لیکن ادبی نثر و نظم اور غیر ادبی نثر و نظم میں بین فرق رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایلیٹ اور پاؤنڈ کی رجعت پرستانہ شاعری کے بیشمار ترقی پسند قارئین ملتے ہیں۔ جبکہ بعض ترقی پسند شعرا کی شاعری خود ترقی پسندوں کیلئے قابلِ قبول نہیں۔ پروفیسر احتشام حسین کی موت ان قارئین کے لئے بطور خاص باعثِ تشویش ہے جو احتشام جیسے نقاد کی موجودگی کو صحیح ترقی پسندانہ خیالات کا بڑا قلعہ سمجھتے تھے۔

احتشام حسین قاری پر اپنی رائے ٹھونستے ہوئے نہیں ملتے۔ وہ قاری کو بہت ہی محترم ذات سمجھتے ہیں۔ جس نے ان کی باتیں سننے کے لئے میلوں سفر کیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم احتشام حسین کی تنقید اپنی کے ڈرائنگ روم میں پڑھ رہے ہوں۔ ان کی نثر کی یہی خوبی ہے کہ کسی جملہ سے پیدا ہونے والا شک دوسرے جملے سے دور ہو جاتا ہے۔

احتشام حسین آخری عمر میں اس قدر ۱۵ لالا ہو گئے تھے کہ ان کے قلم سے ایک تاریخ مذاہب بھی لکھی جاتی تو کیا اچھا ہوتا۔

احتشام حسین مذاہب کی تاریخ میں اس قدر دلچسپی لیتے تھے کہ کاش یہ کام انہی کے ہاتھ سے ہوتا۔

احتشام حسین کے قلم میں وہ ساری صفات تھیں جو مذہب اور اس کے رد بہ زوال رول پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے لئے ضروری ہیں اور غالباً ان سے اختلاف کرنا صرف بڑی سطح پر ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

وہ خود ایک بڑی سطح کے نقاد اور سماجی مؤرخ تھے۔ اور ہمارے دور کی عقلی ساخت میں انھوں نے بھرپور رول انجام دیا ہے۔

* * *

ذوقِ ادب اور شعور

صفحہ ۱۰۳: "ادیب کے گرد و پیش کی دنیا اُس کا حسن اور اُس کی بد صورتی اُس کی کش مکش اور اس کا سلجھاؤ اس میں بسنے والوں کی امیدیں اور مایوسیاں خواب اور امنگیں۔ رنگ اور روپ۔ بہار اور خزاں اس کے موضوع بنتے ہیں اور مختلف تاریخی ادوار میں انسانی جذبات سے ان کا تعلق یکساں نہیں ہوتا بلکہ انسان کی معاشی زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دور کا ادب اپنا مخصوص رنگ رکھتا ہے جس طرح ہر دور کا شعور اپنی مخصوص ہیئت رکھتا ہے یہی نہیں بلکہ ہر ادیب کے شعور کے مطابق ایک ہی دور کے ادبی کارناموں میں فرق پایا جاتا ہے اس طرح ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے معاشی زندگی اور طریق پیداوار مادی ارتقا۔ اور ادبی شعور میں تعلق تو لازمی طور پر ہوتا ہے لیکن یہ تعلق ایک سیدھی لکیر کی طرح واضح اور متعین نہیں ہوتا اس تعلق کو تلاش کرنے کے لیے کسی ملک قوم یا دور کے معاشی ڈھانچے اور اس ڈھانچے پر بننے والی زندگی اور اس کی تاریخ کو بڑی گہری نظر سے دیکھنا چاہیئے اس کے ساتھ الگ الگ ہر ادیب کے شعور کا مطالعہ بھی اس نظر سے کرنا ہوگا کہ اُس کا تعلق سماجی ارتقا کے ساتھ کس قسم کا ہے۔"

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

احتشام حسین: پروفیسر نقاد

سید احتشام حسین رضوی کی موت کی خبر سن کر مجھے بالکل یقین نہیں کہ وہ مرنے والے لوگوں میں ہو بھی سکتے تھے حقیقت میں ۱۹۳۶ء سے اردو میں جتنے بھی نقاد نمایاں ہوئے اور ان میں تمام تر پروفیسر ہی تھے۔ ان میں احتشام حسین رضوی صاحب تنقیدی مضامین سب سے زیادہ دلچسپ اور جاندار ہیں۔ دوسرے پروفیسر نقاد نے اپنے مضامین کو علمیت سے کافی بھاری بنانے کی کوشش کی اور کچھ نے احتشام صاحب کی تنقید پر سطحیت، کا ٹھپہ لگانے کی بھی کوشش کی مگر حقیقت یہ ہے کہ احتشام صاحب علمیت کا ڈھونگ رچانے کے بجائے اس مقام پر پہونچے ہوئے تھے کہ جب کہ ایک عالم تمام علم کی راہوں سے نکل کر اپنے آزادانہ فیصلے پر پہنچ جاتا ہے اور بجائے ٹکا بندھا علم دینے کے نئے علم کی راہ کھولتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ گفتگو میں بھی، "تلی بندھی"، باتوں پر اعتراض کرتے تھے اور ان کے مضامین میں بھی کسی تنقید کو جانچتے وقت اس کا "ٹکا بندھا ہونا" مذموم چیز تھی۔ وہ ان لوگوں کی خاص قدر کرتے تھے جو "تلی بندھی" باتوں سے بالا تر جاتے تھے اور یہ رجحان ان کی ساری زندگی پر حاوی رہا۔ ادب کے پروفیسر اور نقاد کی حیثیت سے انھوں نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ مخصوص راہوں سے بالا تر جا کر ادب پر نظر ڈالیں اور شاگردوں کو اسی طرح نظر ڈالنا سکھائیں یہی وجہ تھی کہ ان کے لکچر نہایت دلچسپ اور معنے خیز ہوتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں سے ایک نے جن کا نام فاخر حسین تھا اور جو اب پیرس یونیورسٹی کے شعبہ جات میں پروفیسر ہیں مجھ سے کہا "ہم ان کو محقق حقیقی کہتے ہیں"۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس بات سے ان کے شاگرد ان کی تمام استادوں پر فوقیت ثابت کرنا چاہتے تھے۔ خاص طور پر یہاں ان کے ساتھی آل احمد سرور کی طرف اشارہ تھا جن کے لکچر زیادہ ٹھوس سہی مگر جیسا کہ ایک نے کہا "حلق کے نیچے نہیں اترتے تھے"۔ میں نے بہت سی انجمنوں اور بزموں میں احتشام صاحب کو مضامین پڑھتے اور تقریر کرتے سنا۔ ہر دفعہ محسوس ہوا کہ ان کے بولنے پر پوری محفل روشن ہو گئی اور جب تک وہ بولتے رہے ہر شخص نہایت توجہ سے سنتا رہا۔ پروفیسر کی یہ مخصوص صلاحیت اگر مجھے کبھی اور شخص میں دکھائی دی تھی تو وہ میرے پروفیسر این کے سدھانت تھے۔ دونوں دوسروں کی رایوں کا اقتباس کرنے کے بجائے جو زیادہ تر پروفیسر کا رویہ ہے اپنی مخصوص رائیں ایسے انداز میں پیش کرتے تھے کہ خاص مسئلہ نئے رخ سے واضح اور صاف ہو جاتا تھا۔ طالب علموں میں ان کی بے پناہ مقبولیت کا یہی راز تھا۔ ایک دفعہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کلب میں اپنے ایک ساتھی سے اس بات پر بڑی بحث کر رہا تھا کہ انگریزی میں اس وقت سب سے بہتر ناول کا نقاد کون ہے میرے ساتھی کی رائے تھی کہ نکل اسمتھ نے حالانکہ بہت کم لکھا مگر وہ ناول کا بہترین پروفیسر نقاد ہے میں کہتا تھا کہ ناول کا سب سے بہتر نقاد لارڈ ڈیوڈ سل ہے۔ اتنے میں سرور صاحب اور احتشام

اس مضمون میں جناب ڈاکٹر احسن فاروقی نے ترقی پسند تحریک کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے ادارہ متفق نہیں ہے۔

بھی آ گئے۔ میں نے کہا کہ نکل اسمتھ، سرور صاحب کی طرح ہے اور لارڈ ڈیوڈ سسل احتشام صاحب کا سا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کیمبرج میں جہاں لکچروں میں ہر شخص کو شریک ہونے کی اجازت ہے۔ پروفیسر کی مقبولیت کا اندازہ ان طالب علموں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے جو اس کے لکچر میں حاضر ہوں۔ بہر حال پروفیسر کا محض عالم ہونا کافی نہیں ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علم کو طالب علموں تک پہنچا سکے اور اس دوسرے کام میں جو پروفیسر زیادہ کامیاب ہوا اسے بہتر پروفیسر کہنا چاہیئے۔ احتشام صاحب سے زیادہ کامیاب پروفیسر کم ہی دکھائی دیئے۔ اس لئے ان کا شمار بڑے پروفیسروں میں ہونا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بے پناہ قوت تو ضیح سے ہزاروں شاگردوں کے دل میں جگہ بنائی ہے اور جب تک یہ زندہ ہیں ان کی روح بھی ان کے ساتھ زندہ رہے گی۔ اس وقت جب کہ ان کے اچانک فوت ہو جانے کی خبر آئی تو ان کے تمام شاگرد جو نہ صرف اس برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی ہیں یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ایک مایہ ناز ہستی اس دنیا سے اٹھ گئی۔

پروفیسری کی یہ نایاب صلاحیت ان کی تنقید سے بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے ریسرچ بھی کرائی اور ان کے اس سلسلے کے طالب علموں میں عبادت بریلوی نہایت نمایاں ہیں جنھوں نے نہ صرف ہندو پاکستان میں بلکہ انگلستان میں بھی اپنا اور اپنے استاد کا نام روشن کیا۔ انھوں نے لسانیات کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا اور ان کی ہندوستانی لسانیات پر کتاب ہندی اور اردو کے طالب علموں میں بہت مقبول ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں بھی اور ان کے مضامین کے ان مجموعوں میں بھی جو صفت سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ٹھوس موضوع کو پانی کر دینے کی قابلیت ہے۔ اردو تنقید کو اور لوگوں نے بھی جو کچھ دیا ہو اور احتشام صاحب نے بھی بہت کچھ دیا مگر انھوں نے بڑا کام یہ کیا کہ اسے دل چسپ بنا دیا۔ اس وقت تنقید نگاروں کے بھی فرقے ہو گئے ہیں اور وہ اس فرقے سے صاف طور پر تعلق رکھتے رہے۔ جو تنقید کے سماجی پہلو پر زور دیتا ہے اور اشتراکی نقطۂ نظر سے تعلق رکھتا ہے۔ میں انہیں ترقی پسندوں کا سرکاری نقاد کہہ چکا ہوں۔ سید عبداللہ صاحب نے ان کی اس سلسلے میں وفاداری بشرط استواری کی تعریف کی ہے۔ مجھے ترقی پسند تنقید اسٹالن کے ماننے والوں کا فراڈ نظر آئی اور اس لئے میں زیادہ تر احتشام صاحب سے اختلاف ہی کرتا رہا۔ مجھے کوئی وقت یا کوئی معاملہ یاد نہیں آتا جب یہ اختلاف نہ ہوا ہو دو مواقع ایسے بھی یاد آتے ہیں جب یہ اختلاف جھک جھک تک بھی پہونچ گیا اور احتشام صاحب جن کو بہت کم ہی غصہ آیا کرتا تھا کچھ بگڑ بھی گئے مگر یہ بگاڑ ایک لمحہ میں ختم ہو گیا۔ میری رائے یہ تھی اور اب بھی ہے کہ ترقی پسندوں نے ان کا سب کچھ لے لیا اور انھیں کسی طرح بھی کچھ نہیں دیا اور ان کا ترقی پسندوں میں شامل رہنا محض مروت تھی جسے وہ کسی طرح نہیں توڑ سکتے تھے۔ ترقی پسند انجمن کے بارہ سالہ اجلاس میں جو مے فیر سینما کے حال میں ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا اس میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے ایک رپورٹ پڑھی جس کو انجمن کی بارہ سالہ ترقی کا جائزہ کہنا چاہیئے۔ مگر اس میں انھوں نے احتشام صاحب کا نام نہیں لیا۔ اس رپورٹ پر بحث میں احتشام صاحب نے بہت سی باتوں پر اعتراض کئے مگر ڈاکٹر علیم نے سب باتیں مسکرا کر ٹال دیں۔ میں سخت تنقید کرنے کھڑا ہوا تو مجروح سلطانپوری لگام کر کچھ کہنے لگے اور پھر سارے ترقی پسندوں نے مجھے بولنے نہ دیا۔ میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ یہ انجمن محض تالی دینے والوں کی تھی اور اس دن مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی۔ خیر میں نہ باقاعدہ اس میں شریک تھا اور نہ میرے الگ ہونے ہی کو کوئی اہمیت دی گئی۔ مگر میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ احتشام صاحب کو بھی اس میں اس طرح شامل رکھا گیا جیسے کہ کوئی کہے "سارا گھر تمھارا ہے مگر کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔" غرض وہ آخر دم تک ترقی پسند رہے اور مجھے ان کے ترقی پسندوں کے پیچھے لگے ہونے کا ہمیشہ اعتراض رہا۔ میری ان سے آخری ملاقات مارچ ۱۹۷۲ء میں ہوئی اور دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ میں نے ان سے پوچھا: "آپ کی وہ ترقی پسند انجمن کیا ہوئی؟" انھوں نے کہا: "اسے جو کام کرنا تھا وہ پورا ہو گیا اور اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔" خیر وہ تو ختم ہو گئی اب اس نے جو کچھ کیا اس کا اندازہ لگانا الگ بات رہی۔ خیر ترقی پسندی سے مجھے بیر رہا اور اس سے

احتشام صاحب کو کچھ نہیں دیا۔ بلکہ ان سے بہت کچھ چھین لیا مگر یہ امر کہ دلچسپ لیکچر دینے والے اور دلچسپ مضمون لکھنے والے احتشام حسین نے اشتراکی تنقید کو جو کاڈرول ایسے نمائندہ نقاد کی کتابوں میں حد سے زیادہ ثقیل اور مبہم چیز ہے نہایت درجہ دلچسپ بنا دیا اور اس طرح جتنے بھی ترقی پسند نقاد اردو میں ہیں ان کو ان کا شاگرد کہنا چاہیئے۔ اردو میں وہ سماجی نقطۂ نظر والی تنقید کے پہلے اور سب سے زیادہ زندہ رہنے والے رہبر ہیں۔

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ ان کی تمام تنقید ترقی پسندی ہی سے وابستہ ہے اور اگر ترقی پسندی سے ہمدردی نہ ہو تو ان کی تنقید کچھ نہیں رہ جاتی۔ میں یہ دعوے کرتا ہوں کہ ترقی پسندی کا مجھ سے زیادہ مخالف کوئی نہ ہوگا۔ مگر ہر لفظ کی طرح جو عام سطح پر پہونچتا ہے ترقی پسندی بھی بہم سے مبہم ہوتی گئی۔ مولانا روم کہتے ہیں۔ ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار ما درد درون ما نہ جست اسرار ما

حضرت مجنوں گورکھپوری اور حضرت آل احمد سرور صدیقی بدایونی لفظ ترقی کو لے اڑے اور آج بھی ترقی کی نیلم پری کو آسمان پر ناچتا ہوا دیکھ کر کہتے ہیں۔ "دیکھو وہ ہے اسے بھلا کوئی کیوں نہ چاہے گا"۔ ترقی کی دیوی کو میں بھی پوجتا ہوں۔ زندگی کو بہتر سے بہتر کی طرف حرکت سمجھتا ہوں۔ میں اشتراکیت کو انسانی ترقی کی بڑی اہم بلکہ جدید دور میں اہم ترین منزل مانتا ہوں مگر ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتا ہوں کہ لینن برحق ہے۔ لیکن اسٹالن قدیم زاریت کی طرف لینن کا نام لیتا ہوا جاتا ہے۔ یہ ہر تحریک کے سلسلے میں ہوا ہے کہ موقع پرستوں نے تحریک میں شریک ہو کر اس کا رخ الٹ دیا۔ یہ بات بھی ہیگل اور مارکس کے تاریخی مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے اور اس لئے صحیح اشتراکیت پر قائم رہنے کے لئے ہمیں اس کے امپوسٹروں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ترقی پسندی انجمن، عالمگیر پیمانہ پر اسٹالن کا پروپاگنڈہ کرنے کے لئے بنائی گئی تھی اس لئے میں سچا اشتراکی ہونے کے لئے اس پر لعنت بھیجنا مذہبی فرض سمجھتا تھا۔ اور سمجھتا ہوں۔ مجنوں صاحب اور سرور صاحب کا مذہب یہ ہے کہ کسی چیز کو برا نہ کہیں۔

کہاں کا حلال اور کیسا حرام جو صاحب کہے اسکو چٹ کیجئے

احتشام صاحب کا مسلک یہ نہیں تھا۔ ان میں خفی اور جلی کو پہچاننے کی تمیز تھی۔ اس لئے ان کا اس ڈھونگ سے وابستہ رہنا مجھے بڑا شاق گزرتا تھا۔ میں نے اسی زمانہ میں ایک مضمون "نگار" میں لکھا تھا جس کی سرخی تھی "ترقی پسند ادب، ادب نہیں صحافت ہے"۔ اس پر نیاز صاحب نے مختلف لوگوں کی رائے طلب کی تھی اور وہ اسے ایک طویل بحث کا موضوع بنا دینا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحلیم نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ادب اور صحافت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ احتشام صاحب نے سکوت اختیار کیا تھا۔ اور علی گڑھ کے ایک ترقی پسند طالب علم اعظمی صاحب نے جواب دیا تھا۔ ایسے اور بھی موقع آئے اور میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ احتشام صاحب نے میری کبھی تردید نہیں کی بلکہ غور و فکر میں پڑ گئے ہیں۔ سمجھتا ہوں کہ ان کی ادبی زندگی میں یہی المیہ تھا۔ وہ ترقی پسندوں سے کہیں زیادہ وسیع اور بلند نظر رکھتے تھے۔ مگر ان میں کچھ ایسے پھنس گئے تھے کہ ان سے الگ نہیں ہو سکتے تھے۔ ترقی پسند انجمن ایک ہوائی اڈا تھا جس پر ہر قسم کی مشین کو ہوائی جہاز بنا کر اڑا دیا جاتا تھا۔ احتشام صاحب نے اس کام میں بڑی مدد کی۔ زیادہ تر ترقی پسندوں کو اچھالنے کا کام انکے سپرد تھا اور یہ امر داد کے قابل ہے کہ انھوں نے اس کام کو بڑی ذہانت، دیانت اور ذمہ داری سے انجام دیا۔ المیہ کے ہیرو کی ساری عظمت ان میں موجود تھی مگر ان میں ترقی پسندی کا کیڑا لگ گیا اور یہی ان کی المیہ غلطی ٹھہرا۔ لکھنؤ میں ترقی پسند انجمن کی شاخ کی روح رواں وہی تھے مگر سرور صاحب کے آتے ہی انھوں نے اسے ان کے سپرد کر دیا اور خود زیادہ تر حالات پر غور کرتے رہے۔ مجھے ترقی پسندوں میں وہ ہیملٹ کی طرح نظر آتے تھے اور ان کی موت پر مجھے ہیملٹ کے بابت ہوریشیو کے الفاظ یاد آئے۔

FOR HE WAS LIKELY, HAD HE BEEN PUT ON TO HAVE PROVED.
MOST ROYALLY!

مگر ہر ٹریجک ہیرو کی طرح احتشام صاحب کی غلطی ان کے ساتھ گئی اور ان کی عظمت باقی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان کی غلطی سے جو موت کی وجہ ہوتی ہے بالاتر ہے یعنی زندگی موت سے بڑی چیز ہے۔ احتشام صاحب اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ ترقی پسندی کے جال میں گرفتار ہو گئے۔ وہ اس میں پھڑپھڑاتے رہے۔ مگر آخر میں اسے لے کر اڑ گئے۔ ایک دفعہ میری اور ان کی ترقی پسند افسانہ نگاری پہ بات چیت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ترقی پسند ادب کی سب سے زیادہ نمایاں صنف مختصر افسانہ ہے اور اس میں سب سے زیادہ ترقی پسند کرشن چندر ہیں۔ بحث میں "ان داتا" مثال کے طور پر آئی تھی۔ احتشام صاحب کی یہ رائے کہ یہ کرشن چندر کے سب افسانوں کی طرح "بدلتی ہوئی قدروں کا ساتھ دیتا ہے"۔ میں نے مانا۔ مگر ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی کہا کہ اس میں وہ دوام نہیں جو ان کو صحافت سے ممتاز کرتا ہے۔ انھوں نے اس بات کو مانا اور خاموش رہے۔ اسی طرح متعدد اور معاملوں پر گفتگو کی۔ مجھے محسوس ہوتا رہا ہے کہ وہ ترقی پسندوں کے ان کٹھ ملاؤں میں نہیں تھے جو مرغے کی ایک ہی ٹانگ بتانے پر بضد ہوتے تھے اور لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ان میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے مخالف نقطۂ نظر کو سمجھنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ اور ان کے بہت سے مضمون ہیں جن میں وہ ترقی پسندی سے ہٹ کر اپنا انفرادی نقطۂ نظر اور اپنا آزادانہ فیصلہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندی سے فائدہ اٹھانے والے ان سے ڈرتے تھے اور ان کو کوئی خاص مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ بہرحال ان کے مضامین بہت سے پورے کے پورے اور بہت کا زیادہ حصہ ان کی انفرادی نظر اور آزادانہ فیصلے کا ثبوت دیتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے دادا پروفیسر جورج سینٹسبری کی ایک بات یاد آتی ہے۔ وہ ڈاکٹر جونسن کے بابت لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ نقاد کی اہمیت اس میں نہیں ہے کہ اس کی بات کو سب مان لیں نہ اس میں ہے کہ اس کی بات کو سب رد کر دیں۔ بلکہ اس میں ہے کہ اس کی رائے کو بار بار بحث میں لایا جائے اور اس سے اختلاف کیا جائے۔ اس دور کے جو ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ تین نمایاں ترین نقاد مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور اور احتشام حسین ہیں۔ اول الذکر بڑی دبلی پتلی رائے دیتے ہیں جو پھونک مارتے ہی ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ آل احمد سرور کوئی رائے دینے سے گریز کرنے اور گول کر جانے کے لئے مشہور ہیں۔ احتشام صاحب پورے زور سے اپنی رائے دیتے ہیں اور رائے اس قابل ہوتی ہے کہ اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا جائے اور حالانکہ میں نے ان کی رائیوں سے زیادہ تر اختلاف ہی کیا ہے مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کی رائے بھی حقیقت کے ایک پہلو کو اچھی طریقہ پر سامنے لاتی ہے اور اس سے اختلافات کا وسیع میدان کھلتا ہے اور اسی میں اس کا دوام ہے۔

احتشام صاحب کے مختلف مجموعوں کا جائزہ لیا جا چکا ہے اور ان کے بابت فیصلہ کن رائے مجھ سے بہتر لوگ .... کچھ ہی عرصہ میں پیش کرنے والے ہیں۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے منشیانِ تنقید یا پروفیسر نقاد کے مجمع میں جہاں فلاں نے یہ کہا اور فلاں نے وہ کہا کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اور کہنے والے کی بات کی حد تک پہونچنے کے بجائے اس کی رائے کو سلوگن کی طرح چبایا جا رہا ہے احتشام صاحب ہیروں پر پروشنو دیوتا کی طرح کھڑے ہیں۔ یہ ان کی تخلیقی قوت ہے جب کہ ان کے چاروں طرف لگا مجمع۔ یاد آتا ہے کہ ان کا افسانہ "نگار" میں چھپا تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں نے ان سے کہا تھا "آپ کی سب چیزوں سے زیادہ میں نے اسے پسند کیا۔ انھوں نے کہا "یہ میری ابتدائی چیز ہے"۔ میں نے کہا "کاش آپ اس ابتدا کو انتہا تک پہونچاتے اور اس ترقی پسند تنقید میں نہ پھنس جاتے تو پھر جب لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی شاعر اسٹیفن اسپنڈر آیا تھا اور اس نے ہماری انتہا

کرسننے کی التجا کی تو احتشام صاحب نے ایک غزل سنائی تھی۔ جس کا یہ شعر مجھے اب بھی یاد ہے۔

کل تو خیر ان کی یاد آئی تھی　　　آج کیوں ہے فضا اداس اداس

غرض ان کے اندر تخلیقی صلاحیتیں تھیں اور اگر انہوں نے انہیں خالص تخلیق کی راہ پر نہیں لگایا تو وہ بیکار نہیں ان کی تنقید میں پھوٹ نکلتی ہیں۔ وہ جس موضوع کو اٹھاتے ہیں اس کے سلسلے میں تمام علم پر حاوی نظر آتے ہیں مگر ا مظاہرہ کرنے کے بجائے اس کی روح نچوڑ لیتے ہیں اور نہایت واضح طور پر اپنے انداز میں ادا کر دیتے ہیں اس عمل بھی تخلیق کے دائرے میں آجاتی ہے اور ان کی انفرادیت سے معمور ہو جاتی ہے۔ اکثر ذکاوت کا رنگ جمتا ہے جیسے کا صاحب کی اردو تنقید پر ایک نظر کی بابت ان کا یہ کہنا کہ اگر اردو تنقید کا وجود معشوق کی موہوم کمر کی طرح ہے تو ا صفحوں کی کتاب لکھ جانے سے بڑی حماقت نہیں ہو سکتی مگر زیادہ تر لطیف بحث اور وضاحت کا رنگ ان کا ہے۔ ادب کو سماج سے متعلق کرنے میں وہ اس رنگ کو پورا جما لینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کا میر انیس پر جو مضمون علی اینڈ سنز نے مراثی انیس کی سات جلدوں کے مقدمہ کی طرح چھاپا ہے ان کے تمام تنقیدی طریقوں اور ان انداز نثر نگاری کی بہترین مثالوں میں لیا جا سکتا ہے۔ وہ پیدائشی پروفیسر تھے اور وہ پروفیسرانہ تنقید کرتے پروفیسر رالے اور لارڈ ڈیوڈ سسل کی طرح اس قسم کی تنقید کو بھی تخلیقی ادب کے دائرے میں داخل کیا۔ یہی اس وقت کے تمام نقادوں سے نمایاں کرتی ہے اور اردو تنقید نگاری میں ایک مستقل مقام دیتی ہے جو تصانیف ہیں وہ ہمیشہ ادب کو تخلیقی نقطہ نظر سے دیکھنے کا درس دیتی رہیں گی۔ تنقید وہ کسی قسم کی ہو بہر حال ادب کی پروفیسر؟ موجد ارسطو پروفیسر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تنقید کے بڑے شاہکار جو تخلیق کاروں کی تصنیف ہیں ان کے نقطہ نظر کی کچھ نہیں ہیں۔ آج کل تنقید محض پروفیسروں کے ہاتھ میں آ گیا اور ریسرچ میں لگ کر کاغذ کی رائے کے مطابق اد ملحق ہو گئی ہے۔ پروفیسر ادب نہیں محسوس کرتا اور اسے چھوڑ کر اس کے بابت علم میں بلا ضرورت اضافہ کرتا ہے۔ ا ایسے پروفیسروں سے بہت دور ہیں ان کا دل ادب کے عشق سے زندہ ہے اور وہ اس سے دوسروں کو ہمکنار کرنے بھر کوشش کرتے رہے۔ ان کی پروفیسری کی یہ خاص نوعیت رہی اور اس لئے ان پر بھی حافظ کا یہ شعر صادق آ

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ذوقِ ادب اور شعور

صفحہ ۱۸۱ : " جہاں تک مادّی حقائق کا تعلق ہے انھیں گرفت میں لانا بھی بہت آسان نہیں ہے کیونکہ مسلسل حرکت ان کو بدلتی اور دوسرے حقائق سے ان کے رشتے میں تغیر پیدا کرتی رہتی ہے۔ کوئی شخص جو تغیر لانے والے تمام اہم عناصر پر نگاہ نہیں رکھتا اور ان عناصر کے منفی اور مثبت رشتوں کو سمجھنے میں ایک معروضی نقطۂ نظر اختیار نہیں کرتا وہ حقائق کی صحیح توجیہ نہیں کر سکتا۔ واقعات سے آگے بڑھنے میں رشتوں کی ترتیب بدلتی ہے بعض عناصر کی نفی ہو جاتی ہے بعض نئے عناصر داخل ہو جاتے ہیں اس طرح حقیقت اپنے مادّی مفہوم میں نئی ہو جاتی ہے اور خیالوں کے لیے نیا مواد فراہم کرتی ہے ۔"

صفحہ ۲۴۱ : " یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ تنقیدی نظریوں اور اسکولوں میں تبدیلی کیوں ہوتی ہے۔ ایک ہی عہد میں مختلف نظریات کیوں پیش کیے جاتے ہیں اور غیر اہم اسالیب کو بھی نئے لباس کو کبھی نئے لباس اور نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے اصل سبب کا تعلق ادب کے مقصد سے ہے یا کبھی کبھی ادب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی سے اپنا ربط ظاہر کرتا ہے ادب کا مطالعہ کرنے والوں کو بھی اس ربط کی جستجو ہوتی ہے۔ یہی جستجو علمی ہو کر تنقیدی نقطۂ نظر بن جاتی ہے مطالعہ سیدھے سادے طریقہ پر شروع ہوتا ہے لیکن پڑھنے والا جس قدر لکھنے والے کے جذبات اور خیالات تجربات اور افکار میں شریک ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کا مطالعہ معنی خیز ہوتا جاتا ہے یہ معنی خیزی مختلف سطحیں رکھتی ہے کسی کے لذت اندوزی اور جمالیاتی حظ کی منزل پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے کسی کے لیے توسیع شعور اور علم کا ذریعہ بنتی ہے شعر و ادب کے مطالعہ سے معنی تو ہر شخص اخذ کرتا ہے لیکن نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں نقش ہر جگہ بنتے ہیں لیکن ان کی وضع قطع اور ابھار میں یکسانیت نہیں ہوتی اس طرح نقش ابھارنے اور معنی پیدا کرنے میں مصنف اور مطالعہ کرنے والا دونوں شریک ہوتے ہیں اور وہ اپنے علم، شعور، ذوق اور تصور فن کے ساتھ شریک ہوتے ہیں ایک نسل کے بعد دوسری نسل اپنے کو خیالات تصورات اور مادّی حالات کی ایک نئی دنیا میں پاتی ہے اور گزشتہ ادوار کے سرمایہ میں تغیر و تبدل کیے بغیر ذہنی آسودگی کا احساس نہیں کر سکتی۔ بدلتے ہوئے حالات میں قدیم سرمایہ پر قانع ہو جانا محض عدم احساس کا نتیجہ ہو سکتا ہے یہ عدم احساس دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اور لازمی طور پر شعور رد و قبول کی منزلوں سے گزرتا ہے۔ سماجی ارتقا کے مختلف عناصر کو پیش نگاہ رکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ شعور کے ارتقا میں یکسانی اور یک رنگی نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ سماج کے تمام طبقات کے لیے حصول علم کے یکساں ذرائع فراہم نہ ہوں اس لیے نئے اسالیب نقد کے ساتھ قدیم اسالیب بھی نئے روپ دھار کر دنیائے ادب میں موجود ہیں ۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

احتشام صاحب اور جدید اُردو تنقید

احتشام صاحب کے انتقال سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا تصور بھی آسان نہیں اس خلا کا احساس اس حقیقت سے
اور بھی شدید صورت اختیار کر لیتا ہے کہ نئی تنقید اُردو کے جدید نقادوں کے ہاتھوں نہایت تیزی کے ساتھ رو بہ زوال ہے۔ زوال کی یہ علام
اصناف ادب میں بھی نظر آتی ہے لیکن اتنی شدید اور نمایاں شکل میں نہیں جتنی ادبی تنقید میں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید اردو تنقید کی آبرو ا
دم سے تھی۔ ان کے ہم عصر نقادوں میں بیشتر خاموش ہو چکے ہیں۔ بعض کبھی کبھی قلم اٹھاتے بھی ہیں تو تھکے تھکے سے معلوم ہوتے ہیں۔
ایک کلیم الدین احمد صاحب ہیں جو ذرا توجہ اور محنت سے اس میدان میں ابھی تک گامزن ہیں مگر ان کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ آئی۔ اے
(I.A. RICHARDS) سے وہ اپنا دامن چھڑا نہیں پاتے۔ سماجی اور عمرانی علوم کے فقدان اور حسن لطیف کی کمی کے باعث
تنقید کا دائرہ انتہائی تنگ اور اس کا مزاج بالکل خشک ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کی تنقید کی زبان بھی ریاضی کا خشک بیان ہو کر رہ گئی
ان کی تنقید ہماری جمالیاتی تہذیب میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے نہ ادبی بصیرت عطا کرنے کی اہل ہے۔ احتشام صاحب کے بع
میں ممتاز حسین، مجتبیٰ حسین اور محمد حسن میں سے کوئی بھی ابھی تک ان کی جگہ لیتا نظر نہیں آتا۔ اس طرح جدید اُردو تنقید کے وزن
وقار کا سارا بار احتشام صاحب کے کاندھوں پر آ گیا تھا۔ آج تنقید کے نام پر لکھنے والے خاصی تعداد میں ملتے ہیں مگر ینشو، ڈیل،
بروکس، کیٹل، روزنتھال اور راشارکی وغیرہ کے غیر ہضم شدہ خیالات کی ٹکراؤ کے علاوہ ان کے یہاں کچھ نہیں ملتا۔ نہ اپنی بصیرت
نہ اپنا APPROACH ہے اور نہ اپنا ذوق ہے۔ اس طرح کی میکانکی تنقید تخلیقی ادب کے مطالعہ کی پیدا کردہ بصیرت کی رہین
نہیں بلکہ مختلف مغربی نقادوں کے اقوال کی دین ہے۔ اس دردناک صورت حال کی روشنی میں جدید اُردو تنقید کا بے لاگ جائزہ لیا جا
بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جدید اردو تنقید کے "آسمان" پر ان کی ذات تنہا درخشندہ ستارہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔

احتشام صاحب کی ادبی تنقید نظریاتی اور عملی دونوں طرح کے مضامین پر مشتمل ہے۔ نظریاتی طور پر انہوں نے اپنی تنقید کی بنیا
حقیقت نگاری کے اصول پر رکھی ہے اور اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں ادب اور دیگر فنون لطیفہ کو پرکھا ہے۔ اس کی تشکیل و تعمیر میں ان
انسانی علوم کو دخل ہے جو انسانی ذہن اور شعور کی تہہ تک پہنچنے اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ احتشام صاحب
الفاظ میں تنقید کے اس دبستان فکر کی رو سے یہ ادیب اپنے سماجی شعور کی بنا پر اپنے طبقاتی رشتہ میں اپنے معاشرتی عقائد اور
کی روشنی میں ایک نیا مسئلہ پیش کرتا ہے۔ یہ ادیب کے خیالات کا کوئی پس منظر ہوتا ہے۔ اس کی تخییل کا کوئی خزانہ ہوتا ہے، اس
اور اجتناب کا کوئی اصول ہوتا ہے۔ انسانی شعور کی پیچیدگیوں کو سلجھا کر فن کار کے اصل مقصد کو ڈھونڈ نکالنا اس کے اصل محرکات
نکالنا اچھی تنقید کا کام ہے۔ اگر وہ اپنے اس ہمہ گیر اور ہمہ جہتی شعور سے کام نہ لے تو ان فنکاروں کے علاوہ جو سو فیصدی اسی کے ہم خ

اور کسی کو وہ فن کا رتسلیم ہی نہ کرے۔ جو ادیب یا شاعر سماجی ارتقا کی جس منزل میں ہے اس کی مناسبت سے وہ یہ کہا جائے گا۔ سماجی حقیقت نگاری کے اصول پر مبنی اس تنقید کے متعلق احتشام صاحب نے نہایت مدلل اور مفصل مضامین لکھے ہیں جن سے اس کے مختلف پہلوؤں پر پوری طرح روشنی پڑتی ہے اور اس کی ساری خصوصیات نگاہ میں آجاتی ہیں۔

ان مضامین کے مطالعہ سے بعض دوسرے دبستان فکر کے متعلق بھی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہی نہیں انھوں نے الگ سے امریکی تنقید اور مشرقی تنقید کے بعض مکاتب فکر کے بارے میں بھی مضامین لکھے ہیں جن سے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور ہمارا ذہنی افق وسیع ہوتا ہے۔ احتشام صاحب کے علاوہ کسی دوسرے اردو ناقد نے اس طرف توجہ نہیں کی حالانکہ ان میں سے بہتوں کو مغربی نقادوں کے بھاری بھرکم اور مرعوب کن حوالے دینے کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ حیرت ہے کہ بعض نقادوں نے تنقید پر پوری پوری کتاب لکھ ڈالی لیکن اردو تنقید کا نوحہ پڑھنے کے علاوہ نہ تو تنقید کے بنیادی عوامل سے بحث کی اور نہ اس طرف اشارے کئے کہ باہر تنقید کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ جو کام یہ لوگ پوری پوری کتابوں کے ذریعے سے نہ کر سکے احتشام صاحب نے مضامین کے وسیلے سے انجام دے دیا۔

چند دن ہوئے ایک دوست کا جو ایک یونیورسٹی میں لکچرار ہیں احتشام صاحب کے متعلق ایک مضمون نظر سے گذرا۔ سارا مضمون تضاد اور تناقص کا شکار ہو کر مضحکہ خیز بن گیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے اس تمنا کا اظہار کیا ہے کہ کاش احتشام صاحب نے ان مارکسی نقادوں کی روش اختیار کی ہوتی جنھوں نے جدلیاتی مادیت سے الگ ہو کر مارکسزم کے اصولوں کو اپنی تنقید میں برتا ہے۔ یہ بات تو ایسی ہی ہوئی جیسے کوئی کہے کہ فلاں شخص توحید میں عقیدہ نہ رکھنے کے باوجود پکا مسلمان ہے۔ اس بیان کا تضاد ظاہر ہے۔ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جدلیاتی مادیت مارکسزم کے فلسفہ کا جزو لاینفک بلکہ اس کی روح ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے توحید کا تصور اسلام کی جان ہے۔ اسی مضمون میں ایک جگہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ خیال پر مادہ کی اولیت کا تصور ظاہر ہے کتنا مہمل اور مضحکہ خیز ہے۔ اس ادعائیت (DOGMATISM) کا تو جواب نہیں جو بحث فلسفہ کی تاریخ میں ڈیماکریٹس کے عہد سے شروع ہو کر آج تک نہ ختم ہو سکی۔ میرے فاضل دوست نے اسے بیک جنبش قلم ختم کر دیا کاش ڈوبی یا رسل انھیں داد دینے کے لیے زندہ ہوتے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں جدیدیت کے پرستار کا یہ دعویٰ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے۔ اسی طرح ایک صاحب نے احتشام صاحب پر لکھتے ہوئے پہلے کاڈویل کو تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی اور لطف یہ ہے کہ کاڈویل کے ایک جملہ کا مفہوم بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے ہیں۔ اب اس کو کیا کیجیے کہ ایسے لوگ بھی احتشام صاحب پر لکھنے کے لیے قلم اٹھا لیتے ہیں۔ نتیجہ جس نوعیت کا ظاہر ہوگا وہ معلوم ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا اب اصل موضوع کی طرف آئیے۔

احتشام صاحب نے ادبی تنقید میں جس نقطۂ نظر کی اہمیت پر زور دیا اس کے نزدیک ادب اور شعر کی بنیادیں بھی دوسرے سماجی مظاہر کی طرح مادی ہوتی ہیں۔ مادہ ہی کی بنیاد پر خیال وجود میں آتا ہے اور پھر خیال وجود میں ایک بار کے جانے کے بعد مادہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہیں اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ادب کا محنت کے سماجی عمل سے بھی گہرا ربط ہے۔ اور کہانیوں اور گیتوں کی ابتدا اور پیدائش کی جڑیں بھی محنت کے سماجی عمل میں پیوست نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ ادب ہی نہیں بلکہ سماج کے پورے بالائی ڈھانچہ کا انداز نظر عام طبقاتی نقطۂ نظر ہی کا عکس ہوتا ہے اور اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ہر فن کار کے یہاں نقطۂ نظر کا وجود تلاش کیا جا سکتا ہے حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ کسی خاص طبقہ سے آنے والا فنکار لازمی طور پر اس طبقہ کا ساتھ دے۔ ادب اور تنقید کے تعلق کے سلسلے میں ان تمام باتوں کو نظر میں رکھنا چاہیے کیونکہ جب تک کسی نقاد کی نگاہ ادب کے اس پیچیدہ تخلیقی عمل کو نہیں دیکھ سکتی اس وقت تک اسے ادب کی اصل حقیقت کا شعور حاصل نہیں ہو سکتا۔

میرے خیال میں احتشام صاحب کی تنقید نگاری کا اصل وصف اس وقت پورے طور پر نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے جب

اپنے نظریۂ تنقید کی روشنی میں فنکار اور فنی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں اور انھیں پرکھ کر ان کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ مثنوی سحر البیان اور خوجی کا تنقیدی مطالعہ ہو یا غالب، نظیر، حالی، اقبال، حسرت، فانی، اختر شیرانی، جوش، کرشن چندر، فیض، جمیل مظہری، اور احمد ندیم قاسمی کے فکر و فن کا تجزیہ ہو۔ احتشام صاحب کے یہاں نظریہ اور عمل کی ہم آہنگی برابر قائم رہتی ہے۔ ان مقالات کی خوبی اور اہمیت اس وقت اور اجاگر ہوتی ہے جب انہی موضوعات پر لکھے ہوئے ان کے دوسرے ہم عصروں کے مضامین کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اس سے اُن کی نظر کی گہرائی، ان کے مطالعہ کی وسعت، ان کی باریک بینی اور ان کے ذہن و فکر کی ہمہ گیری کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں کلیم صاحب کی طرح الفاظ کی تنقید پر اکتفا کر کے معاملہ کو ختم نہیں کر دیا گیا ہے۔ ان میں شعراء اور ادبا کے خیالات اور ان کے جذبات اور احساسات کے آئینے میں ان کی شخصیت کے پیچ و خم اور ان کے عہد کے نقوش کو پہچاننے کا عمل ملتا ہے، سماجی، فکری اور جمالیاتی بنیادوں کی تلاش و جستجو پائی جاتی ہے اور ان منازل سے گذر کر ان کی جمالیاتی اور فنی قدر و قیمت کے تعین کی کوششیں نظر آتی ہیں ان میں ایک دانشورانہ اور عالمانہ شان نظر آتی ہے جو محض ذوق اور وجدان کے سہارے نہیں پیدا کی جا سکتی۔

احتشام صاحب نے اردو تنقید کو آئینہ کی طرح واضح منطقی اور رُو و تار زبان عطا کی ہے۔ سرور صاحب نے صحیح نہیں کہا ہے احتشام صاحب صاحبِ اسلوب نقاد نہیں تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے یہاں "تاثراتی فقروں اور اشعار کی بیساکھیوں" کے سہارے چلنے والی نثر کا دور دور پتہ نہیں مگر ان کی نثر میں ادبی رنگ اور حسن کی کمی نہیں۔ ان کی تنقید کی زبان انشا پردازی کی مشق نہ بن کر عالمانہ نثر کے سانچے میں ڈھل گئی ہے۔ اس پر احتشام صاحب کی انفرادیت کی چھاپ پورے طور پر موجود ہے۔ اس میں ان کا اسلوب اس طرح نمایاں ہے کہ اسے کسی دوسرے نثر نگار کی تحریر میں شامل کرنے کی کوشش ناکام ثابت ہوگی۔ مولوی عبدالحق نے "ساحل اور سمندر" پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑے پتہ کی بات کہی تھی کہ احتشام صاحب ادبی نثر کے صحیح مزاج داں ہیں۔ وہ اس بنیادی نکتہ سے واقف ہیں کہ زبان کا استعمال اصناف نثر کی نوعیت کے اعتبار سے ہونا چاہیئے۔

مجموعی طور پر احتشام صاحب کے متعلق علی جواد زیدی نے سب سے صحیح بات کہی۔ "وہ ایک بے ساحل سمندر تھے اور سمندر بھی بے پایاں"۔

پروفیسر احتشام حسین میموریل سوسائٹی (رجسٹرڈ) دہلی۔ ڈی۔۱۸/۵

ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۹

احتشام حسین میموریل سوسائٹی دہلی کے عطیات پر انکم ٹیکس معاف

دہلی ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء کمشنر انکم ٹیکس دہلی نے اپنے خط نمبر کے ای۔۳۔(۱۳)/۷۳/۶۰۹۴ کے ذریعہ سکریٹری احتشام حسین میموریل سوسائٹی کو مطلع کیا ہے کہ "پروفیسر احتشام حسین میموریل سوسائٹی رجسٹرڈ دہلی کو دیئے جانے والے عطیات پر انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کی دفعہ ۸۰ جی کے تحت ٹیکس معاف کر دیا گیا ہے۔ یہ رعایت عطیہ دہندگان کو متذکرہ دفعہ کی حدود میں ملے گی۔ اور اس کی مدت صرف ۳۱ مارچ ۱۹۷۶ء تک ہوگی۔

احتشام صاحب کے تمام شاگردوں، احباب، کراس چک، کراس پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر سکریٹری، "پروفیسر احتشام حسین میموریل سوسئٹی رجسٹرڈ ڈی ۱۸/۵ ماڈل ٹاؤن دہلی نمبر ۹ کے پتہ پر جلد از جلد روانہ فرما کر متذکرہ انکم ٹیکس رعایت سے فائدہ اٹھائیں۔ اور سوسائٹی کے مقاصد کی تکمیل میں عملی طور پر شامل ہوکر اردو ادب و تنقید کی اس عہد ساز شخصیت کے شایان شان یادگار قایم کریں۔

(شارب ردولوی)

ڈاکٹر سیدہ جعفر

احتشام حسین کے تنقیدی تصوّرات

احتشام حسین نے زبان و ادب کو ترقی دینے اور تنقید کو وسیع اور بامعنیٰ بنانے میں اپنا جو رول ادا کیا ہے وہ اُردو ادب کی تاریخ میں ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ یہ ایک ایسا امرِ دیب ہے جو وقت کی بہتی ہوئی لہروں پر ہمیشہ لو دیتا رہے گا۔ احتشام حسین نے یوں تو افسانے لکھے اور شاعری بھی کی لیکن ان کی توجہ کا مرکز اردو تنقید ہی رہی اور اسی کے وسیلے سے انھوں نے "آبروئے شیوۂ اہلِ نظر" کو ایک نئی عظمت اور بلندی سے روشناس کیا۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی نقوش حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" میں ابھرتے نظر آتے ہیں جس میں انھوں نے اس تصور پر زور دیا تھا کہ "خیال بغیر مادے کے پیدا نہیں ہو سکتا"۔ جس طرح متھو آرنلڈ کے تنقیدی تصورات نے کارل مارکس کے نئے رجحانات کی مقبولیت کے لیے راہ ہموار کی اُسی طرح حالی کی تنقیدیں ہمارے ادب میں نئے میلانات کا نقطہ آغاز ہیں۔ اُردو تنقید آج اس ابتدائی منزل سے بہت دور نکل گئی ہے۔ زندگی کی نئی رفتار اور فکر کے نئے انداز نے اُسے بہت کچھ دیا ہے۔ سماجی علوم کی ہمہ گیر آگہی، تاریخی بصیرت اور معاشی شعور نے تنقید کے راستے میں جو نئی مشعلیں روشن کر دی تھیں اُن ہی کی روشنی میں ترقی پسند ادیبوں نے نئی راہیں تراشیں اور نئی منزلیں دریافت کیں۔ ادب اور تنقید کے ان رہنماؤں میں احتشام حسین کا نام ایک خاص اہمیت کا مالک ہے کیونکہ ان کی تحریروں نے ہمارے ادب کو سائنٹیفک اور مارکسی تنقید کے اصولوں سے متعارف کروایا۔

احتشام حسین کے تنقیدی مضامین اُن کے ادبی مسلک اور تنقیدی آدرش کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے تاریخی حقائق اور عمرانی روابط کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فنکار کے خیالات و جذبات اور اس کے احساسات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی تنقید میں معاشی میلان کی اہمیت خاصی اجاگر نظر آتی ہے وہ تبدیلی کو دلیلِ حیات و قوت اور بالیدگی کی علامت سمجھتے ہیں۔ احتشام حسین کے خیال میں حرکت اور جدلیاتی عمل سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں ہئیتِ اجتماعی کے لیے ناگزیر ہیں اور اُن کی معنویت کا احساس حقیقی سماجی شعور کا ضامن ہے۔

ابتدا ہی سے احتشام حسین کے پیشِ نظر چند متعین ادبی اصول اور مخصوص تنقیدی نظریات رہے ہیں، جب ہم زمانی ترتیب میں ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت کے بہاؤ نے اُن کے ادبی تصورات کو زیادہ پائیدار، عمیق اور زیادہ پختہ بنا دیا ہے۔ احتشام حسین نے اپنی تصانیف کے دیباچوں میں بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اُن کے سامنے ایک مخصوص نظریہ ادب ہے۔ ان کی زندگی کے آخری ایام تک ان کے اس نظریہ ادب میں تبدیلی یا تغیر کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ اُن کے یہاں ایک ہی نغمہ ہے جس کے سُر آہستہ آہستہ بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ "ادب اور سماج" میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"تنقید کے بنیادی نظریات کے متعلق میرے خیالات اور پختہ ہوئے ہیں وہ تصورات جو میں آج سے کئی سال پہلے رکھتا تھا۔"

احتشام حسین تنقید کو ایک ذمہ دارانہ، ہمہ گیر، وسعت پسند اور مشکل فن سمجھتے ہیں۔ "تنقید اور عملی تنقید" میں ایک جگہ لکھتے ہیں "تنقید نگاری کئی حیثیتوں سے سب سے مشکل اور ذمہ دارانہ صنف ادب ہے۔" احتشام حسین کا یہ بیان ہمیں CRITICISM IN THE MAKING کے مصنف لوئی گزیمان (LOVIS GAZIMAN) کے اس قول کی یاد دلاتا ہے کہ "تنقید کی ہمہ گیر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا معمولی ادیب کے بس کی بات نہیں۔" اپنے مضمون "اصول نقد" میں احتشام حسین نے یہ بات بتائی ہے کہ جب تک نقاد سماجی علوم سے کما حقہ، واقفیت نہ رکھتا ہو وہ ادب اور زندگی کے باہمی روابط پر نظر رکھتے ہوئے کسی فن پارے کو اس کے سماجی ماحول میں پرکھ نہ سکے گا اور نہ اُن تمام مادی مظاہر کا تجزیہ کر سکے گا جو روح عصر اور تہذیبی ارتقاء کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ احتشام حسین کی دانست میں ادب کو محض فنی حیثیت سے پرکھنا کافی نہیں بلکہ اُن تمام "تعلقات اور محرکات" کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو فنکار کی شخصیت اور اس کے ذہن کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ "تنقید اور عملی تنقید" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جو نقاد اس نظریہ تنقید (مارکسی تنقید) کو اپناتے ہیں وہ روح عصر، سماجی نفسیات، عمرانیات، یعنی اُن تمام باتوں پر نگاہ رکھتے ہیں جو طبقاتی سماج میں پیداوار کی معاشی بنیادوں اور فکری اور فلسفیانہ حیثیت سے وجود میں آتی ہیں.....
...... ادب محض چند فنی خصوصیات کا مجموعہ نہیں ہے۔"

تاثراتی تنقید کے علمبرداروں اسپنگرن (SPRINGARN) اور کروچے (CROCE) پر احتشام نے یہ تنقید کی ہے کہ تاثراتی دبستان (IMRESSIONISTIC CRITICISM) میں انفرادی، داخلی اور شخصی میلانات کے اظہار ہی کو تنقید کا منتہا سمجھا جاتا ہے۔ جو نقاد ذہنی طور پر اس دبستان سے وابستہ ہیں ان کے خیال میں نقاد کا کام حسن و قبح ادب کو سماجی رشتوں میں اُلجھا کے نہ دیکھے ادب کو ان سے ماوراء تصور کرے۔ اسپنگرن (SPINGARN) نے "تخلیقی تنقید" کا جو نظریہ پیش کیا تھا اور جس کو اس نے "جدید تنقید" کے نام سے بھی یاد کیا تھا، اس کا بنیادی تصور یہ تھا کہ تنقید اُن جذبات و تاثرات کی بازآفرینی کا نام ہے جو شاعر یا ادیب پر تخلیقی عمل کے وقت گذری تھیں حسن کار کے تاثرات کی بازیافت کرے اور فنکار کے احساسات کی گونج کو اسیر کر کے ہم ایک نئے انداز میں تعبیر کا قالب دے سکتے ہیں۔ اور اس طرح تنقید بھی تخلیق کے دائرے میں شامل ہو سکتی ہے۔ اسپنگرن کے استدلال پر تنقید کرتے ہوئے احتشام حسین نے لکھا ہے "وہ صاف صاف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ادب یا تنقید کا کام یہ نہیں کہ وہ کسی اخلاقی یا سماجی مقصد کا اظہار کرے۔" آگے چل کر وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس قسم کی تنقیدوں سے امریکی نقادوں کا مقصد یہ ہے کہ ادب میں طبقاتی کشمکش سے عوام کی توجہ ہٹا دی جائے اسی دبستان کی ایک اور نقاد مسز پیفر ہو (MRS PIFER HOE) کا خیال ہے کہ تنقید کا مقصد اس سے زیادہ کچھ اور بتلانا نہیں کہ کسی ادب پارے میں لطافت اور دلکشی کیوں پائی جاتی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دبستان تنقید میں خارجی معیاروں پر داخلی محرکات کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس کی بنیادیں انیسویں صدی کے رومانی اسکول کے ان تصورات پر قائم ہے جن کی تشکیل میں والٹر پیٹر WALTER PATER اور آرتھر سائمنس (ARTHUR SIMONS) کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ کروچے (CROCE) کا نظریہ ادب بھی یہی ہے کہ فنکار موضوعات کو حسن عطا کر کے زندگی کو مسرت سے مالا مال کر سکتا ہے۔ کروچے کی دانست میں حسن کاری ایک وجدانی تجربہ ہے جو اپنی غایت آپ ہے اس کو مذہب یا منطق کے از کار رفتہ معیاروں سے نہیں جانچنا چاہئے اس کے نظریے کو AESTHETIC TRANSCENDENTALISM کا نام دیا گیا تھا۔ احتشام حسین کے خیال میں یہ تخیل پرستی انسان اور اس کے معاشرے کے لیے

زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ تبع کو شاعرانہ انداز میں حسن بنا دینے کی کوشش اور ارضیت (THIS WORLDLINESS) سے جھکاؤ نے کلاہ رجحان بعض وقت خطرناک اور گمراہ کن بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں IMPRESSIONIST نقادوں کے بارے میں جو جذباتی ہیجان کو تنقید کا محرک سمجھتے ہیں۔ احتشام حسین نے لکھا تھا:۔

"جمالیاتی نقادوں کی پہنچ شعر و ادب کی خوبیوں تک ایک گہرے وجدان کے ذریعے سے ہوتی ہے اور ایک قسم کا صوفیانہ شعور ان کا رہنما ہوتا ہے۔ یہ کہیں بھی مکمل طور پر ادب کے اجتماعی اور سماجی محرکات کا پتہ نہیں دیتی ....
اس تنقید سے انھیں آسودگی حاصل نہیں ہوتی جو ادب کو اجتماعی کشمکش کا مظہر مانتے ہیں"

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ احتشام حسین ادب کی فنی اہمیت اور جمالیاتی قدروں کو یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ وہ حسن اور جمالیات کو مادی رشتوں اور سماجی تعلقات کی روشنی میں دیکھنے کے قائل ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خود فنکار کا احساس جمال مادی رشتوں اور رابطوں سے اثر پذیر ہوتا رہتا ہے۔

نقادوں کا ایک گروہ فنکار کی شخصیت اور نفسیاتی میلانات پر تنقید کی بنیاد قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انگریزی کے مشہور نقاد I.A.RICHARDS اور C.K.EGDO نے نفسیاتی تنقید کے غیر معمولی امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا تھا کہ تنقید کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ فنکار کے کردار، اس کی شخصیت اور ذہن کا تجزیہ کر کے اس کے آئینے میں فنی محاسن کو اجاگر دیکھے اور یہی حقیقی تنقید ہے۔ تحلیل نفسی PSYCHO ANALYSIS کے رسیا اس سے بھی آگے بڑھ کر شعور اور لاشعور کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شخصیت کے بعض اہم اور بنیادی جوہر لاشعور میں سرگرم عمل رہتے ہیں اور شکلیں بدل بدل کر فن میں سرایت کرتے رہتے ہیں۔ لاشعوری قوتیں اپنے اظہار کے لیے بے چین رہتی ہیں لیکن شعور کے نگراں انھیں روکنے اور ان پر اپنا قابو رکھنا چاہتے ہیں۔ اس روک ٹوک کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ لاشعوری سواد اپنا روپ بدل کر ایسے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے جو بیرونی دنیا اور شعوری قوتوں کو زحمت مزاحمت نہ دے۔ احتشام حسین نے اپنے تنقیدی تصورات میں نفسیاتی طریقۂ تنقید کو راہ نہیں دی ہے۔ نفسیاتی تحلیل کے طریقے سے وہ کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ اس طریقۂ تنقید میں شعور اور لاشعور کی اتنی بھول بھلیاں ہوتی ہیں کہ تنقید کے حقیقی اور بنیادی مقصد کو نقاد ڈھونڈتا ہی رہ جاتا ہے۔ "روایت اور بغاوت" میں احتشام حسین نے فرائڈ کے تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ فن کار کی تخلیقات میں اس کے لاشعور کی قوتیں بھی اپنا جلوہ دکھاتی رہتی ہیں لیکن کسی فن پارے کی تمام حقیقتوں کو اس نظریۂ تنقید کے بل بوتے پر جانچا نہیں جا سکتا اور اس کا خطرہ لگا رہتا ہے کہ نقاد ادب کے سماجی کردار اور اس کی جدلیاتی صداقتوں سے بے پرواہ ہو جائے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:۔ "ہر ادب کو اسی ترازو پر تولنا صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے علاوہ نقطۂ نظر محدود ہو جاتا ہے اور ادبی روایات سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تجزیہ نفس والوں نے ادب کو ایک معمہ بنا دیا ہے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ جنسی محرک فرد کی زندگی میں ایک قوی محرک ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس کو خود کفالتی قدر سمجھ لینا بھی زیادہ درست نہیں۔ یونگ JUNG اور اڈلر ADLER وغیرہ کی نفسیاتی معلومات نے ہمارے علم میں اضافہ ضرور کیا ہے لیکن تنقید میں اس طریقہ عمل کی وجہ سے انسانی شعور اور ارادے کی اہمیت ماند پڑ جاتی ہے اس لیے احتشام حسین اس تنقید کو حرف آخر نہیں سمجھتے۔

سائنٹفک تنقید کے حامی زندگی اور ادب کو جامد تصور نہیں کرتے۔ روسی نقاد بلنسکی نے تنقید کے متعلق کہا تھا کہ وہ جمالیات کی حرکی صورت کا نام ہے۔ وہ فنکار جو ادب کو سماجی اور معاشرتی رشتوں کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ہیئت پرستی کے میکانکی عمل کو جامع تنقید تصور نہیں کرتے۔ سائنٹفک نظریۂ تنقید کے حامی ادب کو تاریخی اور مادی حالات کی پیداوار سمجھتے ہیں اور

ادب کو جامع چیز مانتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین کی تحریروں میں سائنٹیفک تنقید کا جلوہ دیکھا جاسکتا ہے۔ ٹین، مادام ڈی اسٹیل TAINE, MADAME DE STEEL اور ہرڈر HURDER کی طرح وہ اُن اقتصادی، سماجی اور تمدنی رجحانات کی اہمیت کے قائل ہیں جو حسن کار کے تصورِ حسن اور نظریہ ادب اور ابلاغ و ترسیل کی وسیلوں کی تشکیل کرتے رہتے ہیں۔ BRIGHT FIELD نے اپنی کتاب ISSUE IN LITERARY CRITICISM. میں اس بات پر زور دیا تھا کہ ہر ادبی کارنامہ تاریخ کے ایک خاص نقطہ پر تخلیق کا پیکر اختیار کرکے ہمارے سامنے آیا ہے اس لیے اُس ماحول اور فضا کو سمجھنا ضروری ہے جس میں اُس ادب پارے نے جنم لیا ہو۔ احتشام حسین ارونگ IRVING اور PAUL ALMUR MORE کی طرح ادب کو افادی اور مقصدی دیکھنا چاہتے ہیں۔ احتشام حسین اپنی تحریروں کے ذریعہ سے اس خیال کو عام کرنا چاہتے تھے کہ زندگی کے مسائل اور زمانے کی دھڑکنیں ادب میں نئی روح پھونک رہی ہیں۔ ادب میں انفعالیت اور فراریت نے زندگی کی تھکن کا جو احساس پیدا کردیا ہے ادب اور تنقید کے نئے سانچے بنانے ہوں گے۔ احتشام حسین نے سائنٹیفک، مارکسی اور اشتراکی تنقید کو تمام تنقیدی اسالیب سے زیادہ جامع بتاتے ہوئے "ذوقِ ادب اور شعور" میں ترقی پسند نقادوں کی اس طرح تعریف کی ہے:۔

> "جو نقاد ادب کو زندگی کا عکس قرار دیتے ہیں، زندگی کو تغیر پذیر سمجھتے ہیں اور اس تغیر کے وجود کو مادی مانتے ہیں جو ادب کو ادیب کے شعور کا نتیجہ کہتے ہیں اور اس شعور کو زندگی کی کشمکش اور تجربوں سے متشکل ہوتا ہوا تسلیم کرتے ہیں...... سب ترقی پسند تسلیم کیے جائیں گے۔"

کارل مارکس اور اینگلز ANGELS کے خیالات نے ادب کے قدیم نظریوں کو رد کرکے انقلابی ادب کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ان کا فلسفہ چونکہ مادیت پر قائم تھا اس لیے ان کے ادبی اور تنقیدی نظریات میں عینیت IDEALISM خالص جمال پرستی اور ماورائیت کو جگہ نہ ملی تھی۔ انھوں نے ادب اور آرٹ کے سماجی کردار پر زور دیا اور ادب کی تخلیق کو "سماجی فعل" سے تعبیر کیا۔ ان تصورات کے تحت جو تنقیدی نظریہ ابھرا ہے اس کو "انقلابی تنقید کا نظریہ" بھی کہا گیا ہے۔ احتشام حسین نے اس تنقیدی نظریے کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس خیال پر زور دیا ہے کہ سماجی اور سیاسی رجحانات طریقہ پیداوار اور مادی وسائل سے متعین ہوتے ہیں۔ مارکس کے "مادی جدلیت" کے تصور میں اس نقطے کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے کہ اشیا ہمارے تصورات اور مفروضات سے علیحدہ وجود رکھتی ہیں مادہ اور اس کے مظاہر بنیادی حقیقت ہیں اور خیال ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے ادب کو جانچتے وقت مادی حالات اور مجلسی ترتیب کے قانون" کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ احتشام حسین نے ان تنقیدی نظریات کو پہلی مرتبہ قابل قبول انداز میں اردو داں طبقے کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے مارکسی تنقید کے سہارے ہمارے قدیم اور جدید ادب کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی کوشش کی سخت اور متعین اشتراکی تصورات کے حامل ہونے کے باوجود اُن میں وہ وسعت نظر اور رواداری موجود ہے جو دوسرے نقادوں کو بھی برداشت کرسکتی ہے۔ اس لیے احتشام حسین کے تنقیدی تصورات میں مارکسی خیالات کی تکرار کے ساتھ ساتھ اپنے قدیم ادبی سرمائے سے محبت اور احترام کے جذبات بھی ملتے ہیں بعض انتہا پسند نقادوں کی طرح وہ جدید پر زور حمایت کے لیے قدیم کو بے حقیقت ثابت کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ کاڈویل CADWELL نے اپنی کتاب الیوژن اینڈ ریالٹی ILLUSION AND REALITY میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مارکسی نظریہ تنقید ماضی کی صحت مند روایتوں سے رشتہ باقی رکھنا چاہتا ہے۔ احتشام حسین کی تنقیدیں اسی تصور سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔

اردو ادب میں تنقید ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے اس لئے نقاد کے فرائض اور ادبی تنقید کی نوعیت کے بارے میں ابھی بعض

ل میں کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے۔ تنقید کو ہمارے یہاں ابھی تک انشا پردازی اور عبارت آرائی کا تابع مہمل سمجھا جاتا ہے۔ ے تصورات رکھنے والے افراد تنقید میں نقاد کی شخصیت کا عکس ڈھونڈتے اور بعض دوسری اصناف ادب کی طرح اس کو بھی ایک داخلی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اردو کی ایک نامور ادبی شخصیت نے احتشام حسین پر یہ اعتراض کیا تھا کہ "احتشام صاحب کی شخصیت اور ان کی نگارشات ہمیشہ ایک فاصلہ حائل ہوتا ہے"۔ اس قسم کے لوگ نقاد سے یہ توقع کرتے ہیں کہ تنقید کے آئینے میں وہ صرف اپنا عکس دکھائے اور زیر ی شاعر یا ادیب کو پس منظر میں جگہ دے لیکن حقیقی تنقید خود نمائی، جذباتیت اور داخلیت سے بلند ہوتی ہے۔

احتشام حسین کا اسلوب بیان ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے۔ بوفان (BUFFON) نے اسلوب کے بارے میں کہا تھا کہ ٹائل خود انسان ہے"۔ احتشام حسین کی تحریریں ان کی متوازن اور سنجیدہ شخصیت کی غماز ہیں۔ اسلوب کا حسن اس میں نہیں کہ وہ مصنوعی بنوں سے آب و تاب حاصل کرے یا مرصع سازی اور مینا کاری کی خاطر سادہ اور سلجھے ہوئے پیرایہ اظہار سے دور ہو جائے۔ معنوی ، روقیمت پر نظر رکھنے والے ادیب، انشا پردازی کا کمال اس میں نہیں سمجھتے کہ خیال کو مبہم اور پیچیدہ طریقے سے ظاہر کر کے ابلاغ رسیل کے عمل کو مشکل بنا دیا جائے (ENGLISH PROSE STYLE) میں ہربرٹ ریڈ نے الفاظ کے ظاہری حسن اور چمک دمک کو ، حقیقت بتاتے ہوئے الفاظ کی بلاغت اور معنویت پر زور دیا تھا۔ احتشام حسین نے عبارت کے صوتی ترنم کے علاوہ اس کی معنوی لطافتوں ر بھی نظر رکھی ہے۔ احتشام حسین نے حقیقت کے اظہار کا براہ راست طریقہ منتخب کیا ہے جسے تنقید میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تنقیدی اسلوب ن بنیادیں عقل پسندی وقائع رسی اور حقیقت نگاری پر استوار ہوتی ہیں اس لیے اس میں الفاظ کا جادو جگانے یا تخیل کی حنا بندی کا موقعہ ہیں ہوتا۔ احتشام حسین کے تنقیدی مضامین میں ان کے انداز بیان کی وضاحت اور اس کا متعین انداز ہمیں متاثر کرتا ہے۔ ان کی تحریروں بں ادبی صداقتیں اپنی ساری اثر آفرینی اور جلوہ سامانی کے ساتھ موجود نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی بے لاگ تنقیدوں میں ادبی صداقتوں کو حسین الفاظ اور خوبصورت محاورات سے ڈھانکنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ احتشام حسین نے تشبیہات اور استعارات کے سہارے خیال کی کم مائیگی یا اس کے ادھورے پن اور ابہام پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ کنہیا لال کپور نے اپنے مضمون "سالم ہندوستان میں اردو ادب کا پانچواں دور" میں احتشام حسین کے طرز تحریر پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:۔ "ان کی عبارتوں میں رنگینی کی کمی محسوس ہوتی ہے اور یہ کہ ان کی تنقید ایک ہی نقطے پر گھومنے کے بعد اکثر وہاں آجاتی تھی جہاں سے چلی تھی"۔ تنقید میں نقطہ نظر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے ایک خاص دبستان تنقید سے وابستگی رکھنے والے نقاد اپنے مخصوص نظریات و تصورات کی روشنی میں کسی فن پارے کا جائزہ لیتے ہیں اس لیے ان کے یہاں ایک ہی قسم کے ادبی خیالات کی تکرار ممکن ہے۔ ایسے نقاد جو کبھی تاثراتی اسکول کی نمائندگی کرتے ہیں کبھی تقابلی تنقید کے علمبردار بن جاتے ہیں اور کبھی مارکسی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، در اصل کسی دبستان سے تعلق نہیں رکھتے۔ تنقید میں "وفاداری بشرط استواری" کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میں احتشام حسین کے مضامین سماجی بصیرت، فنی ذکاوت، فلسفیانہ گہرائی ذہنی بالیدگی اور رچے ہوئے تنقیدی شعور کی وجہ سے ہمارے ادب میں ایک سدا بہار عظمت کی حامل رہیں گی۔ انھوں نے اردو تنقید میں فکر انگیزی اور وسعت پیدا کی اور اسے نئے سانچے اور افق بخشے۔

غالب اور آم

بنگال میں دونوں کا تعارف ہوا

لکھنؤ، ۱۰ر جون۔ آم سے پہلے مرزا غالب کا تعارف غالباً کلکتہ میں ہوا۔ جہاں وہ تقریباً دو سال قیام پذیر رہے اور مرشد آباد کے آم ان کے کھانے میں آئے۔

اس نقطۂ نظر کا اظہار پروفیسر سیّد احتشام حسین نے آج یہاں "غالب اور آم پارٹی" کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔

آموں کی یہ پارٹی ادارۂ فروغِ اردو ہند کی طرف سے اس کے صدر دفتر میں ہوئی، صدر انجمن مولانا محمد حسین شمس علوی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور صدارت کے لئے احتشام صاحب کا نام پیش کیا۔

"غالب اور آم" کے موضوع پر مولانا خیر بہوروی (صدر آل انڈیا غالب اکاڈمی) پروفیسر نورالحسن ہاشمی، مائل ملیح آبادی، ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل، ڈاکٹر نسیم قریشی، فرقت کاکوروی، عمر انصاری اور احسان علوی نے مقالات اور تقریروں کے ذریعہ روشنی ڈالی۔

شہر کے ادیبوں اور شاعروں کی خاصی تعداد نے اس تقریب میں شرکت کی۔

عبداللطیف اعظمی

احتشام حسین کے مختصر تبصرے

اردو کے مشہور اور بزرگ ادیب اور دانشور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ۱۹۴۸ء میں "نئی روشنی" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا، اس کا پہلا شمارہ ۱۶ جون کو شائع ہوا۔ کل دو سال ڈھائی ماہ جاری رہا، آخری شمارہ ۱۴ اگست ۱۹۵۰ء کو نکلا اور اس کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے ادارۂ تحریر میں، عابد صاحب کے علاوہ راقم الحروف اور بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ بھی تھیں۔

اخبار کی اشاعت سے قبل عابد صاحب نے مشہور اور نامور ادیبوں اور شاعروں کو مضمون اور نظم و غزل کے لیے خطوط لکھے تو ۱۴ اپریل (۱۹۴۸ء) کو پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کو حسب ذیل خط لکھا:

مجی احتشام صاحب، سلام شوق

مطبوعہ خط سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم لوگوں نے ایک نئے کام کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اخبار کے علمی اور ادبی حصے کے لیے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ جب سوچتا ہوں کہ اس بوجھ کے اٹھانے میں، جو اکیلا کسی طرح نہیں اٹھا سکتا، کن احباب سے مدد ملے گی، تو آپ کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ آپ معدودے چند لوگوں میں ہیں جو اخبار کے مقاصد کی پانچویں شق کو سمجھ سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں۔ اس طرح کا صحت مند اور زندہ ادب پیدا کرنے کے اہل ترقی پسند حلقے میں آپ ہی ہیں اور آپ ہی کی تحریریں نئی نسل کے لیے نمونے کا کام دے سکتی ہیں۔ آپ سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بس لکھئے اور لکھوائیے اور ہم جیسے بوڑھوں کے دل میں جوانی کا جوش پیدا کر دیجئے۔ خدا کرے آپ اور سب عزیز خیریت سے ہوں۔

آپ کا عابد

اس خط میں جس مطبوعہ خط کا ذکر ہے، وہ فی الحال مجھے نہیں مل سکا، مگر عابد صاحب نے اخبار کے مقاصد پر سات قسطوں میں اداریہ لکھا تھا اس کی چھٹی قسط میں "زندہ ادب" کی وضاحت کی ہے۔ غالباً مطبوعہ خط کی پانچویں شق کی، جس کا عابد صاحب نے اپنے خط میں حوالہ دیا ہے، اس قسط میں تفصیل بیان کی گئی ہوگی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ: "ہر چیز جو نظم و نثر لکھی جائے ادب تو نہیں ہے۔" ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: "ادب اس نظم یا نثر کا نام ہے جو زندگی کو کسی خاص نظری یا عملی مقصد کے لیے سوا اور بے جان تصویروں میں تحلیل کر کے نہیں دیکھتی بلکہ مجموعی زندگی کا یا اس کے کسی پہلو کا مشاہدہ اس طرح کرتی ہے کہ اس کے گرما گرم بہتے ہوئے دھارے میں غوطہ لگا کر اس کی حرارت اور روانی کو اپنے اندر جذب کرے اور خود اس کی لہر بن جائے۔" نئے اور پرانے ادب پر بحث کرتے ہوئے عابد صاحب لکھتے ہیں: "نئے ادب کا یہ اعتراض پرانے پر صحیح نہیں ہے کہ وہ زندگی کی مصوری یا تعبیر یا تنقید نہیں

کرتا۔ اس میں اگر کچھ اصلیت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ پرانے ادب میں زندگی کی ترجمانی یا تنقید کھل کر نہیں ہوئی بلکہ فن کے پردے میں چھپا ہے اور یہ عیب نہیں بلکہ بہت بڑی خوبی ہے، جس کی نئے ادب کو تقلید کرنی چاہیئے۔ ادیب اور شاعر کا ڈھول پیٹ کر اعلان کرنا کہ یہ ہم زندگی کی تصویر یا تفسیر ہے، نہ صرف ادب و شعر کے لطف کو بلکہ اس کے اخلاقی اثر کو بھی کھو دیتا ہے۔ دراصل جو اعتراض کم سے کم اعلا پرانے ادب پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہے کہ جس زندگی کی اس میں ترجمانی کی گئی ہے، وہ تھکی ہوئی، اونگھتی ہوئی، بیمار اور مریل زندگی ہے، ان لوگوں کی زندگی ہے جو زمانے کی مشکلات سے گھبرا کر کشمکش حیات سے کنارہ کش ہو گئے ہیں ..... نئے ادب کی خصوصیت یہ تھا کہ وہ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو جھنجھوڑ کر جگاتا ہے، اس کی رگوں میں تازہ خون داخل کرتا ہے، کاہلی اور جمود طلسم کو توڑتا ہے، شیش محل کی اونچی دیواروں کو گرا کر تازہ ہوا کو آنے دیتا ہے ——— اس نئے ادب کی لے اردو میں حالی نے شروع کی تھی، اس میں شدت اقبال نے پیدا کی اور وسعت ترقی پسند مصنفین پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں" نئے ادیبوں پر تبصرہ کرتے ہو عابد صاحب نے لکھا ہے کہ: "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سچے ترقی پسند ادیبوں میں خلوص اور جوش ہے، ان کی تحریروں میں شدت اور تازگی، قوت اور اثر ہے، لیکن ان کی صف میں کچھ بہروپیے بھی شامل ہو گئے ہیں، جنہوں نے زمانے کا ڈھنگ دیکھ کر ترقی پسندی کا لبادہ پہن لیا ہے اور پرانے ادب کی کھوکھلی رومانیت اور جذباتیت پرستی پر انقلابی شورش کا رندی اور بوالہوسی پر بغاوت کا اور ترک و تجرد پر فلسفیانہ دیا کا جھول چڑھا دیا ہے۔ اگر ہمارے نقادوں نے ان کھوٹے سکوں کو ڈھونڈ کر الگ نہ کیا تو ترقی پسندی کے زر رائج کی قیمت ادب کے بازار میں بہت گر جائے گی ۱؎"

عابد صاحب نے احتشام صاحب سے علمی اور ادبی مضامین کی فرمائش کی تھی اور موصوف نے دونوں ہی قسم کے مضامین لکھے۔ اخبار کے اجرا کے بعد ایک مہینے کے اندر ہی انھوں نے "ہندوستانی تہذیب کے عناصر" کے عنوان سے ایک طویل مضمون بھیجا جو ۲۱ اور ۲۸ جولائی کے شمارے میں دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ احتشام صاحب نے "نئی روشنی" کے لیے علمی اور ادبی دونوں ہی طرح کے مضامین لکھے ہیں اور تلاش و جستجو کے بعد مجھے جو مضامین مل سکے ہیں، ان کی تعداد دس ہے، اگر میں یہاں ان تمام مضامین کا ذکر کروں اور ان میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان کا مختصر ترین خلاصہ پیش کروں تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا، اسی لیے موصوف نے "نئی روشنی" میں جو مختصر تبصرے کیے ہیں، اس فرصت میں صرف انھیں کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔

تبصرہ نگاری

تبصرہ نگاری اردو کی ایک ایسی صنف ہے، جس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے، عام طور پر پورے اہتمام اور توجہ کے تبصرے نہیں کیے جاتے، یا تو کتاب کا صرف تعارف ہوتا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے کہ

"اردو میں تو خیر سے تبصروں کی ایک روایت وہ بھی رہی ہے جو نیاز فتح پوری جیسے ایڈیٹر کے رسالے نگار کی تھی کہ ریویو سے صفحات کی تعداد، قیمت اور ناشر کے، کتاب کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہ چلنے پاتا تھا اور چند سطروں میں اس طرح ختم ہو جاتا تھا کہ رہے اور بوقت ضرورت کام آئے ۲؎"

یا پھر مصنف یا ناشر کو خوش کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں، بہت کم تبصرے بے لاگ اور سیر حاصل ہوتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین کے تبصرے جو "نئی روشنی" میں شائع ہوئے ہیں، نہ تو اتنے مختصر ہیں کہ محض کتاب کے تعارف تک محدود ہوں اور نہ بہت طویل ہیں، یہ جامع و بسیط تبصرے ہیں جن میں کتاب اور اس کے موضوع پر اچھی خاصی روشنی پڑ جاتی ہے، حسب موقع اور ضرورت مصنف کے علمی و ادبی مرتبے پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔

۱؎ "نئی روشنی" مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۴۸ء صفحہ ۳ ۲؎ "صبح" - تبصرہ نمبر - مرتبہ عبداللطیف اعظمی (۱۹۶۹ء) صفحہ ۳۱

تنقید کیا ہے ؟ اس پر بے شمار مضامین اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر تبصرہ کیا ہے ؟ یا تبصرے اور تنقید میں فرق کیا ہے ؟
پر مبصرے علم و واقفیت کے مطابق اردو میں کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں "ادبی تبصرے" کے نام سے دہلی سے ایک رسالہ جاری کیا گیا تھا، جس کے اڈیٹر ڈاکٹر ظلیق انجم تھے۔ اس میں جو تبصرے شائع ہوئے وہ عام طور پر سیر حاصل تھے اور محنت سے لکھے گئے تھے، اس میں بھی جہاں تک مجھے یاد ہے، تبصرہ نگاری پر کوئی مستقل مضمون شائع نہیں ہوا۔ میرے علم کے مطابق صرف پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا، جو مارچ ۱۹۴۹ء کے "نئی روشنی" میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ مضمون مختصر ہے، مگر سبھی پہلو زیر بحث گئے ہیں۔ مختصر تبصروں اور جامع تنقیدی مضامین کے فرق پر بحث کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:

"مختصر تبصروں اور جامع تنقیدی مضامین میں محض اختصار اور طوالت کا فرق نہیں ہوتا بلکہ کیفیت اور کمیت میں وسعت اور مقصد میں بھی یہ مختلف ہوتے ہیں۔ مختصر تبصروں کے محدود ڈھانچے میں اہم تنقیدی مسائل، ادبی نظریات، فنی تصورات کی بحثیں نہیں چھیڑی جا سکتیں، بلکہ عام ادبی نتائج کی بنیاد پر کسی کتاب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ضرورت کے مطابق یہ تبصرے طویل بھی ہو سکتے ہیں اور اگر ضرورت ہو تو ان میں اہم مباحث کے دروازے بھی کھولے جا سکتے ہیں لیکن ان میں بھی اختصار مد نظر ہوتا ہے تاکہ کم سے کم جگہ میں کتاب زیر تبصرہ کا تنقیدی اور بصیرت افروز تعارف ہو سکے۔"

موضوع بحث پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کبھی بحث کا موضوع کتاب بن جائے گی اور کبھی مصنف، کبھی کتاب کا موضوع اور کبھی پیش کرنے کا طریقہ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے، مختصر تبصرے میں کوئی بحث نہ تو طویل ہو سکتی ہے اور نہ قطعی، اس لئے تبصرہ نگار کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر پہلو کی طرف مختصراً مگر بلیغ اشارے کرتا جائے۔"

اچھے تبصرہ نگار کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اچھے تبصرہ نگار کتاب کے متعلق رائے دینے میں جہاں تک ممکن ہوتا ہے محض ذاتی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو خیالات کی بنیاد نہیں بناتے بلکہ ملک کے ذوق مطالعہ، مصنف کی شخصیت، اہلیت اور رجحان، موضوع کی اہمیت اور مصنف کے متعلق دوسروں کی رایوں کو پیش نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔"

تبصرے کی بنیادی خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہر تبصرے میں کم سے کم یہ تو ظاہر ہی ہو جانا چاہیئے کہ کتاب کا موضوع کیا ہے ؟ مصنف کے خاص خیالات کیا ہیں ؟ وہ کن تحریکوں سے وابستہ ہے ؟ کن کا مخالف یا موافق ہے ؟ کن خیالات یا مصنفین سے متاثر معلوم ہوتا ہے ؟ زندگی کے کن عناصر کو تقویت پہنچانا چاہتا ہے ؟ اور حیات انسانی کے حسن میں کس قدر اضافہ کرتا ہے۔ اسے یہ بھی ظاہر کرنا چاہیئے کہ کتاب عام کتابوں کی طرح ایک کتاب ہے یا علم انسانی میں اضافہ کرتی ہے۔ نئی گتھیاں پیدا کرتی ہے یا گتھیوں کو سلجھاتی ہے۔"

احتشام صاحب کے تبصرے

پروفیسر احتشام حسین صاحب کے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے کہ خود انھوں نے اپنے تبصروں میں ان پر کہاں تک عمل کیا ہے۔ "نئی روشنی" میں حسب ذیل کتابوں پر ان کے تبصرے شائع ہوئے ہیں:
(۱) مضامین عابد (۲) امیر خسرو (۳) ساز نو (۴) تخیل (۵) غم کا کل (۶) اور انسان مرگیا (۷) عرفان اقبال (۸) تحلیل نفسی۔۔

مضامینِ عابد

پہلی کتاب، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مجموعہ کے تعارف میں فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ

"مضامینِ عابد میں آٹھ ادبی اور آٹھ طنزیہ مضامین شامل ہیں۔ ادبی مضامین سبھی اہم ہیں، پہلا مضمون "اقبال کا تصورِ خودی" ہے۔ اقبال پر سیکڑوں مضامین ایسے لکھے گئے ہیں جن میں خودی کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن یہ مضمون ان سب سے زیادہ واضح اور جامع شکل میں اقبال کے خیالات کی تشریح کرتا ہے اور انھیں ترتیب دے کر پیش کرتا ہے۔ اس مضمون میں یہ کمی ضرور ہے کہ اس میں تصورِ خودی کی داخلیت اور تصورِ محض ہونے یا نہ ہونے کی توضیح اور تنقید نہیں کی گئی ہے۔"[1]

اسی طرح دوسرے مضامین کی خوبیوں کو بھی محترم تبصرہ نگار نے اجاگر کیا ہے۔ فاضل مصنف کے اسلوب اور طرزِ نگارش کے بارے میں موصوف نے لکھا ہے کہ:

"ڈاکٹر عابد حسین کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور پرکاری کا میل ہے، کوئی جملہ اور کوئی فقرہ الجھا ہوا نہیں، ہر چیز صاف ستھری اور رواں دواں ہے، جیسے کوئی گہری ندی صاف شفاف پانی کے ساتھ متانت سے بہتی جا رہی ہو۔ فلسفیانہ انداز نظر رکھنے والوں کے یہاں جو پیچیدگی نظر آتی ہے، اس کا شائبہ تک ڈاکٹر عابد حسین کی تحریروں میں نہیں ملتا، مشکل سے مشکل مقام بھی ان کے قلم سے سلجھ کر نکلتا ہے۔ ..."[2]

امیر خسرو

کتاب کا تعارف کراتے ہوئے احتشام صاحب نے لکھا ہے[3]:

"ڈاکٹر وحید مرزا صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کی کتاب "امیر خسرو" حال ہی میں ہندوستانی اکیڈمی یو پی نے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے لندن یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے جو مقالہ لکھا تھا اس کا موضوع بھی "امیر خسرو" ہی تھا۔ یہ انگریزی مقالہ مدت ہوئی شائع ہو چکا ہے، لیکن تصنیف زیرِ نظر نہ تو اس مقالے کا ترجمہ ہے اور نہ خلاصہ بلکہ اسی پر مبنی ایک نئی کتاب ہے، جس میں نئی تحقیقات سے مدد لی گئی ہے اور پرانی تصنیف کے بعض غیر ضروری مباحث چھوڑ دیے گئے ہیں ..... "امیر خسرو" کا بڑا حصہ جسے حصہ اول کہا گیا ہے، حیاتِ خسرو پر مشتمل ہے، جس کے آٹھ باب ہیں اور دوسرا حصہ تصنیفات کے جائزے کے لیے وقف کیا گیا ہے، اس حصے میں بھی چھ باب ہیں۔ کتاب کے شروع میں ایک عالمانہ مقدمہ ہے، جس میں خسرو کی جامع اور مختلف الجہات شخصیت کی ہمہ گیری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقدمے کے بہت سے اجزا خوبصورت اردو نثر کا نمونہ ہیں اور مصنف کے فلسفیانہ مذاق کی غمازی کرتے ہیں ....."

فاضل تبصرہ نگار نے امیر خسرو کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"خسرو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی ان دلکش شخصیتوں میں سے ہیں جن سے ہر محفل میں روشنی، ہر بزم میں رونق پیدا ہو جاتی ہے۔ گروہوں، فرقوں اور طبقوں کی بندشیں ٹوٹ کر خسرو کی مقبولیت عام ہو گئی ہے۔ شاہی دربار سے لے کر نظام الدین اولیا کی محفلِ سماع تک اور بزمِ شعر و سخن سے عوامی گیتوں اور پہیلیوں سے دلچسپی لینے والوں تک تقریباً نصف صدی کی مدت تک خسرو ہندوستان پر چھائے رہے۔"

آگے چل کر احتشام صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] نئی روشنی، ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء، صفحہ ۲ [2] ایضاً صفحہ ۱ [3] نئی روشنی، ۱۰ جولائی ۱۹۶۸ء صفحہ ۹

"کوئی شخص جو تیرھویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس وقت تک اپنے مطالعے کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک امیر خسرو کی نظم و نثر کا اچھی طرح مطالعہ نہ کر چکا ہو کیونکہ ان کی تصانیف میں یہاں کے سماجی اور معاشرتی حالات کے خوبصورت اور سچے مرقعے بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔"

فاضل مصنف کے بارے میں احتشام صاحب لکھتے ہیں:

"جو لوگ اردو کے ارباب قلم کی فہرست رسائل و اخبارات کی مدد سے مرتب کرتے ہیں ان میں سے کم ایسے ہوں گے جو ڈاکٹر وحید مرزا کو اردو کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہوں۔ موصوف ان خاموش علمی خدمت کرنے والوں میں سے ہیں جو نام و نمود کی خواہش مغلوب کر لیتے ہیں۔ لیکن جو شخص بھی امیر خسرو کا مطالعہ کرے گا اسے نہ صرف ڈاکٹر وحید مرزا کے تبحر علمی، وسعت نظر اور نکتہ رسی کا اندازہ ہوگا بلکہ انداز نگارش میں حسن اور طرز اظہار میں توانائی کا احساس بھی ہوگا۔"

احتشام صاحب کا "نئی روشنی" کی اشاعت یکم اپریل [illegible] میں "نظموں کے تین مجموعے" کے عنوان سے "ساز نو" (از مجاز)، "تلخیاں" (از ساحر لدھیانوی) اور "خم کاکل" (از سیف الدین سیف) پر تبصرہ شائع ہوا ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

ساز نو:

"مجاز کا پہلا مجموعہ بھی ہے اور چوتھا بھی۔ دس سال پہلے مجاز کی نظمیں "آہنگ" کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہوئی تھیں پھر یہ مجموعہ کچھ نئی نظموں کے اضافے کے ساتھ اسی نام سے دوبارہ لاہور سے شائع ہوا۔ ان دونوں ایڈیشنوں میں سجاد ظہیر کا دیباچہ شامل تھا۔ ۱۹۴۵ء میں بہت سی نظموں کا اضافہ کرکے ہندوستانی پبلشرز دلی نے مجاز کا مجموعہ "شب تاب" کے نام سے شائع کیا، اس میں سجاد ظہیر کے دیباچے کے علاوہ ایک مختصر سا تعارف فیض احمد فیض کے قلم سے بھی ہے۔ "ساز نو" ابھی شائع ہوا ہے، اس میں جنوری ۱۹۴۶ء تک کی نظمیں اور غزلیں شامل کر لی گئی ہیں، دونوں دیباچے نکال دیے گئے ہیں۔ کیونکہ اب مجاز کی شاعری کو تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔"

مجاز کی شاعری کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ:

"مجاز کی شاعری ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ پروان چڑھی ہے، اس میں اس تحریک کی ہر منزل تلاش کی جا سکتی ہے۔ مجاز کی شاعری ایک جواں سال، آتش نفس عاشق کے دل کی آواز ہے، اس میں محبت کا رومان بھی ہے اور رندی کا بانکپن بھی"

آخر میں لکھتے ہیں:

"مجاز کم کہتے ہیں لیکن جب کہتے ہیں تو ایک دفعہ پھر یقین دلا دیتے ہیں کہ وہ ابھی تھکے نہیں ہیں، وہ دھوکا نہیں کھا سکتے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنی شاعری کے ذریعے سے اپنے مقصد کے لیے جد و جہد کرنا چاہتے ہیں، وہ مقصد ہے ایک آزاد جمہوری سماج جس میں انسان انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ترقی کے تمام ذرائع کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہوا اپنی تقدیر آپ بنا سکے۔ اس لیے وہ موجودہ آزادی کو انقلاب نہیں، انقلاب کا مژدہ قرار دیتے ہیں اور چمن بندیٔ کائنات کے لیے اپنا خون دل تک نچوڑ دینے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اس تصور میں رومان بھی ہے اور حقیقت کا ادراک بھی، خواب بھی اور خواب کی تعبیر بھی۔ مجاز کا لاابالی پن "ساز نو" کی ترتیب میں بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ نئی پرانی نظمیں گڈمڈ ہو گئی ہیں اور کسی قسم کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ جہاں اس معاملے میں شاعر بے پروا ہو وہاں ناشر کو ہوشیار رہنا چاہیے۔"

تلخیاں:

ساحر لدھیانوی کے مجموعۂ کلام "تلخیاں" کے تیسرے ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے احتشام صاحب ساحر اور مجاز کی شاعرانہ پرورشی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ساحر اور مجاز میں کئی باتیں مشترک ہیں جن کا پتہ موضوعات اور انداز بیان دونوں میں چلتا ہے لیکن جو چیز دونوں کو ایک دوسرے سے قریب لاتی ہے وہ زندگی اور انسان کے متعلق ان کا نظریہ ہے، دونوں افق پر نگاہ جمائے ہوئے ترقی اور بہتری کی منزلوں کی تلاش میں پرواز کرتے جا رہے ہیں، دونوں کے عقائد میں بڑی حد تک اشتراک ہے۔ ان دونوں کا ایک ساتھ مطالعہ بڑا دلچسپ ہوگا۔ ساحر کی نظمیں پڑھتے ہوئے ہمیشہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ محبت کی ناکامی نے ان کے ذہن کو سماجی عدم توازن کی جانب پھیر دیا اور بجائے اس کے کہ وہ اپنا گریبان پھاڑتے، ان طاقتوں سے جنگ کرنے پر آمادہ ہیں جو ان کی اور ان کے سے ہزارہا جوانوں کی راہ میں حائل ہیں۔"

زیر تبصرہ ایڈیشن میں جن آٹھ دس نظموں کا اضافہ کیا گیا ہے، ان کے بارے میں فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ:

"نہ صرف ساحر کی نظریاتی زندگی کو واضح کر رہی ہیں بلکہ ان کے فن میں پختگی گرمی، بے باکی اور خروش پیدا کر رہی ہیں۔"

خمِ کاکل:

سیف الدین سیف کا یہ پہلا مجموعہ کلام تھا جو "خمِ کاکل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ احتشام صاحب نے اپنے مختصر تبصرے

"سیف الدین سیف کو شاعری کی دنیا میں داخل ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گذرے لیکن ان کی چھوٹی چھوٹی غزلوں اور نظموں نے کچھ دنوں سے لوگوں کو متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ مجموعہ ان لوگوں کے لیے ایک خوشگوار استعجاب کا باعث ہوگا جنھوں نے سیف کی نظمیں اس سے پہلے نہیں دیکھی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ادھر تھوڑے دنوں کے اندر غزلوں نے جو اپنا رنگ بدلا ہے اس سے سیف بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے یہاں زندگی کے تنوع کے بجائے اس کی لطافت کو قید کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ جذبات میں گہرائی یا بلند خیالی نہیں لیکن کیف اور اثر انگیزی نے ان کی غزلوں کو جاندار بنا دیا ہے۔ نظمیں زیادہ تر رومانی ہیں، ان میں کوئی سماجی حقیقت اجاگر نہیں ہوئی ۔ ۔ سیف کے موضوعات بہت نہیں ہیں، ان میں ہیجان اور خروش نہیں ہے، مگر جو کچھ بھی ہے اس میں صداقت، شعریت اور کسک ہے ۔ ۔ ۔ ۔

اور انسان مر گیا

رامانند ساگر کا یہ ناول ـــ "اور انسان مر گیا" پنجاب کے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں ہے، جس نے اپنے مواد اور خلوص کی بنا پر بڑی شہرت حاصل کر لی۔ محترم تبصرہ نگار نے مقدمے کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اس میں ہندوستان کی سیاست، آزادی، فسادات، فطرت انسانی کے متعلق جو رائیں دی گئی ہیں، ان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اسے پڑھ کر احمد عباس کو "بدنیت" نہیں کہا جا سکتا۔"

آزادی کے بعد بہت سے ناول اور افسانے لکھے گئے ہیں جن کا موضوع ملک کے فرقہ وارانہ فسادات ہیں اور ایسے ناول اور بہت مقبول ہوئے اور ان کی بڑی تعریف کی گئی۔ مگر احتشام صاحب "اور انسان مر گیا" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ[1]:

"فرقہ وارانہ فسادات بہت سے لوگوں کی نظروں میں ادب کا موضوع ہی نہیں ہیں۔ بعض حضرات اسے صرف طبقہ کی

---

[1] نئی روشنی، یکم اکتوبر [illegible] صفحہ

نکلے لیے استعمال کرتے ہیں، بعض کے لیے یہ ایک جذباتی اور رومانی موضوع ہے جس سے دلکش افسانے تیار کیے جا سکتے ہیں کچھ لوگ ایسے ہیں جو فسادات کے متعلق لکھنا بڑی ذمہ داری کا کام سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کا تعلق بہت جلد جذبات سے ہو جاتا ہے اور لکھنے والوں کی نگاہ سطح ہی پر الجھ کر رہ جاتی ہے، ان محرکات تک نہیں جاتی جنھوں نے انسانوں سے ان کی انسانیت چھین لی۔"

زیرِ تبصرہ ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"رامانند ساگر کا ناول بھی جذباتی خیالی اور رقت پسندانہ انداز رکھتا ہے۔ اس کا ہیرو آنند ایک شاعرانہ مزاج کا تخیل پرست انسان ہے جو اس سارے طوفان میں محض چند خیالات کے سہارے اہم کردار بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اخلاقی احساس و تصور کی قوت سے جسے وہ عمل کے ان مواقع پر بھی استعمال کرنا چاہتا ہے جہاں محض خیال آرائی سے کام نہیں چل سکتا۔"

آخری پیرا یوں لکھتے ہیں :

"رامانند ساگر کی یہ تخلیق زندگی کی جدوجہد میں دکھ کو کوئی سہارا دیتی ہے اور نہ کسی سہارے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس میں انسان دوستی کے جذبات کی فراوانی ہے، لیکن ان کے پیچھے کوئی نظریاتی طاقت نہیں ہے۔ ناول کا اندازِ بیان دلکش اور پر اثر ہے۔ لیکن اس کا یاس آفریں ہونا ہی پڑھنے والے کو غلط راہوں پر ڈال سکتا ہے۔ کہانی کہنے کی جو صلاحیت ساگر میں ہے اس سے منفی کیفیات کے اظہار کے بجائے مثبت کیفیات کی ترجمانی کے کام لینا چاہیے تھا اور تھوڑے سے ضبط اور تھوڑے سے غور و خوض سے یہ ناول رجعت پرستی، فرقہ واریت اور مایوسی کے خلاف ایک اچھا حربہ بن سکتا تھا۔ اس حالت میں تو ایک غیر تنقیدی نظر رکھنے والا قاری انسانیت اور انسانوں کے مستقبل ہی سے مایوس ہو جائے گا۔"

عرفانِ اقبال :

کوئی بشیر مخفی القادری صاحب ہیں، جنھوں نے "عرفانِ اقبال" کے نام سے اپنے تین مضامین کا ایک مجموعہ لاہور سے شائع کیا تھا۔ احتشام صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب کا تعارف یوں کرایا ہے[1]

"یہ کتاب اقبال پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے ذرا ایک الگ انداز رکھتی ہے۔ کیونکہ اس میں بشیر مخفی القادری نے ایک یادداشت اور ذاتی معلومات کی روشنی میں اقبال کی صوفیانہ حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے ... التماس کے نام سے ایک طویل مضمون ہے جس میں اقبال کے تصوف کو سلسلۂ قادریہ کے صوفیانہ معتقدات اور مسلک کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بشیر مخفی کا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے اور ان کا خیال ہے (جس کے لیے انھوں نے بہت سے حوالے دیے ہیں اور بہت سی تصوف کی کتابوں سے اقتباسات پیش کر کے ثابت بھی کیا ہے) کہ اقبال سلسلۂ قادریہ سے متاثر تھے۔"

اقبال کے تصوف کے بارے میں فاضل تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ :

"اس میں شک نہیں کہ اقبال نے تصوفِ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا، لیکن ان کی تنقیدی نظر نے انھیں اس میں سے کتنا قبول کرنے اور کتنا رد کر دینے پر مائل کیا تھا، یہ ایک گہری نظر اور زبردست مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اقبال ایک طرف تو صوفیوں کی بے عملی کلاسیکیت، رہبانیت اور کشاکشِ حیات سے دوری کو غلط اور غیر اسلامی ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری طرف بعض صوفیوں سے

---

[1] نئی روشنی، یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء صفحہ، کالم دوم

گہرائی، وابستگی اور اثر پذیری کا اظہار کرتے ہیں۔"

آخر میں تبصرہ نگار نے رائے دی ہے کہ:

"اقبال کی شاعری کی جو قیمر اور فلسفیانہ حیثیت ہے وہ تو اس کتاب سے سمجھ میں نہیں آ سکتی، لیکن اقبال کی اساسی فکر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔"

تحلیلِ نفسی

پیشِ نظر کتاب کے مصنف حزب اللہ (ایم اے) ہیں اور کتاب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ نفسیات پر اردو میں بہت ک
گئی ہیں۔ چنانچہ فاضل تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ:

"اردو میں تحلیلِ نفسی یا تجزیۂ نفس پر ابھی اتنا کم لکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے اگر یہ لفظ نہیں تو ان کا مفہ
مقصود ضرور اجنبی ہوں گے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں جس طرح کارل مارکس کے فلسفہ مارکسزم نے دوسرے م
اور تاریخی نظریات کو پس پشت ڈال دیا، اسی طرح نفسیات کے میدان میں تحلیلِ نفسی نے نفسیات کے دوسرے مک
کی چمک دمک ماند کر دی۔ لیکن دونوں میں کوئی قابلِ ذکر ربط نہیں ہے بلکہ فلسفیانہ اور علمی نقطۂ نظر سے مارکسزم سائ
اور تجزیۂ نفس بہت سے مفروضات کا مجموعہ۔"

موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے محترم تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ:

"تحلیلِ نفسی نے مذہب، اخلاق، نفسیات، ادب اور فنِ طب وغیرہ کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ جب تک اس کے م
تھوڑی بہت واقفیت نہ ہو، جدید ادب کے ایک بڑے حصے کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تحلیلِ نفسی کا بنیادی عقید
لاشعور اور جنس کے گرد گھومتا ہے جن سے بہت سے ذہنی عارضے پیدا ہوتے ہیں اور انسان خود اپنی کش مکش
سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔"

کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے احتشام صاحب نے لکھا ہے کہ:

"حزب اللہ نے تحلیلِ نفسی کی تنقید، جدید سائنس اور جدید نفسیاتی تجربات کی روشنی میں نہیں کی ہے۔ مگر یہ بات
قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے ایسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بہت سا مواد اردو میں اکٹھا کر دیا ہے۔ اگر ان کا
بیان سادہ ہوتا اور وہ تھوڑی سی کوشش کرتے تو کتاب اور زیادہ دلچسپ اور عام فہم بن سکتی تھی۔ اس حالت میں بھی
نفس سے دلچسپی لینے والوں کے لیے اس میں اتنا مل جائے گا جتنا وہ بہت سی مغربی تصانیف سے اکٹھا کرتے"

اس سے پہلے اندازِ بیان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"کتاب کے مصنف کا اندازِ بیان شاعرانہ لیکن مشکل ہے، گو انھوں نے مثالوں کی مدد سے اپنے خیالات کو زیادہ
واضح بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن تحلیلِ نفسی کے متعلق معمولی معلومات رکھنے والوں کو اس کتاب کے سمجھنے میں د
پیش آئیں گی۔"

فاضل تبصرہ نگار نے مشورہ دیا ہے کہ:

"اس کتاب کے شروع میں تجزیۂ نفس کے متعلق عام فہم زبان میں ایسی باتیں لکھنے کی ضرورت تھی جن سے

ہفتہ وار "روشنی" [illegible] اکتوبر [illegible] صفحہ ۲

ابتداء اور فرائڈ کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے"

بہرحال اس کتاب کے بارے میں محترم تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ " اردو زبان میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے"
ہم نے اس مضمون میں تبصرہ نگاری اور تبصرہ اور تنقید کے باہمی فرق پر پروفیسر سید احتشام حسین کے خیالات اور آئندہ کتابوں پر ان کے تبصرے کے نمونے پیش کیے ہیں۔ یہ کتابیں مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں نظم و غزل اور مضامین کے مجموعے ہیں اور سوانح حیات، ناول اور لغنیات پر کتابیں ہیں، مگر جس کتاب پر بھی تبصرہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے موضوع پر ان کی معلومات اور واقفیت بہت وسیع اور گہری ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہی ان کا مخصوص موضوع ہے۔ اس سے مرحوم کے وسیع مطالعہ اور گہرے مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے، جو اردو کے بہت کم ادیبوں اور دانشوروں میں نظر آتی ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

" ہندوستانی تہذیب کے جلوۂ صد رنگ پر احتشام حسین کی
نظر گہری تھی اور ادب اور فنون لطیفہ کے رشتے کو بھی وہ
اچھی طرح سمجھتے تھے"؎

؎ ماہنامہ نیا دور — احتشام نمبر (بابت ماہ مئی و جون ۷۳ء) صفحہ ۱۲۰ کالم دوم

صفحہ۔۱۱۶۔ اعتبارِ نظر:۔

یوں تو ہر افسانہ نگار کے ہاں فطرت، حسن، عورت اور محبت کے وہ تخیلی پیکر ملتے ہیں جن سے رومانیت کا جادو جاگتا ہے، لیکن اس کی ایک دلکش مثال نیاز فتحپوری کی تحریروں میں ملتی ہے۔ ان کے طویل اور مختصر افسانوں اور افسانوی مضمون میں نور و نکہت، رنگ و بو کی اتنی فراوانی ہوتی ہے کہ حصہ سے زیادہ یہی چیزیں اہم معلوم ہوتی ہیں۔ واقعات اور ان کی ترتیب سے جو فضا پیدا ہوتی ہے وہ افسانہ نگار کے ذہن میں وجود رکھتی ہے اور اپنی مبالغہ آمیزی اور شدت احساس کی وجہ سے مصنوعی معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ تصنع زبان کی غیر معمولی ادبیت، عبارت کے پھیر، تشبیہہ اور استعارہ کی کثرت، انداز گفتگو کی اجنبیت کی وجہ اور نمایاں ہو جاتا ہے، خانہ کے مطالبات، پلاٹ، کردار نگاری ڈرامائی تاثر اور ارضی فضا کے مطالبات ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزوں کی طرف سے نیاز افسانوں سے غفلت برتتے ہیں۔ فلسفیانہ مباحث، نفسیاتی موشگافیوں، قول محال اور رنگین بیانی سے ان چیزوں کی کمی پوری نہیں ہوتی۔

مناظر عاشق ہرگانوی

اُردو تنقید کا اقلیدسی نقطہ

اور احتشام حسین کے تنقیدی نظریات

احتشام حسین نے وقتاً فوقتاً تنقیدی سوالات کے جواب دیے اور اپنے تنقیدی مضامین میں بھی سوال قائم کر کے اپنے تنقیدی نظریات کو واضح کرنے کی کوشش کی، جن سے اصول نقد مرتب ہوتے ہیں اور جس میں احتشام حسین کے علم، سماجی شعور اور مقصود حیات کی آزمائش کی جلوہ گری بدرجہ اتم موجود ہے۔

س:۔ اصول نقد کے اعتبار سے نقاد کتنے قسم کے ہوتے ہیں؟

ج:۔ جہاں تک اصول نقد یا اظہار نقد یا اظہار خیال کا تعلق ہے۔ عام طور سے ہمیں تین قسم کے نقاد ملتے ہیں۔ ایک وہ جو چند اچھے اچھے نقادوں کے قابل لحاظ اقوال اور تصورات کو اپنے ذہن میں یکجا کر لیتے ہیں اور خوش ذوقی کے ساتھ انھیں کے سہارے تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے ادبی ذوق کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ لیکن انھیں اس بات کی جستجو نہیں ہوتی کہ وہ ان نقادوں کے نقطۂ نظر یا فلسفۂ خیال کا بھی علم حاصل کریں جن کے بیان سے انھوں نے اپنا سرمایۂ فکر اکٹھا کیا ہے۔ دوسری قسم ان نقادوں کی ہے جو تنقید کے مختلف نقطہ ہائے نظر میں سے کسی ایک کو سب سے زیادہ مناسب اور درست سمجھ کر منتخب کر لیتے ہیں اور اسی کے استعمال میں اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگر ان کا یہ انتخاب فلسفیانہ بصیرت اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے تو وہ اورجنل نہ ہونے کے باوجود مطالعہ ادب اور اظہار مطالب کا ایک ایسا اطمینان بخش طریقہ پیش کرتے ہیں جس میں تخلیقی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور جس پر نگاہ رکھنے سے ادب فہمی کی منزل میں بہت کچھ رہنمائی ہوتی ہے۔ تیسری قسم کے نقاد وہ ہیں جو کسی خاص انداز کے فلسفۂ ادب اور اصول نقد کے خالق قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ یہ نقاد جرأت کر کے مطالعۂ ادب اور ماہیت ادب کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو چاہے مکمل طور پر آسودگی بخش نہ ہوں لیکن اپنی انفرادیت، ندرت اور فلسفیانہ گہرائی کی وجہ سے دنیائے فکر میں اپنا مقام پیدا کر لیتے ہیں۔ نقادوں کی یہ تیسری قسم بہت کم یاب ہے۔ یہ لوگ حقیقتاً فلسفی اور مفکر ہوتے ہیں اور تنقید ان کے ہاتھوں تنقید فلسفہ کے دائرے میں داخل ہوتی ہے اور ایک بلند اور آزاد ادبی مقام حاصل کرتی ہے۔

س:۔ کیا تنقید منطق کی طرح ہر علم و فن کی تشکیل اور تعمیر میں شریک ہے؟ اصول نقد کا مطالعہ کرتے ہوئے کس علم کی ضرورت پڑے گی؟

ج:۔ تنقید منطق کی طرح ہر علم و فن کی تشکیل اور تعمیر میں شریک ہے بلکہ وجدان اور حال کے جن گوشوں تک منطق کی رسائی نہیں ہے تنقید وہاں پہنچتی ہے۔ رنگ و بو اور کیف و کم کے غیر متعین دائرہ میں صرف قدم ہی نہیں رکھتی بلکہ ابہام میں توضیح کا جلوہ اور بے یقینی میں تعین کی کیفیت پیدا کرتی ہے اس طرح تنقید کے سلسلے میں جب اصول کی گفتگو کی جائے گی تو طبعی اور اکتسابی علوم کے علاوہ

ایک اور ایسے علم یا جس سے کام لینے کی ضرورت پڑے گی جو ان علوم کے منافی نہ ہوتے ہوئے بھی ان سب کے علاوہ کوئی بات ایسی بتا سکے جس فیصلہ میں مدد ملے۔ ممکن ہے وہ کئی علوم کے امتزاج کا نتیجہ ہو اور ممکن ہے کسی علم کے ساز کا کوئی ایسا تار ہو جس پر جستجوئے حقیقت کے بحرانی لمحوں میں اچانک کسی نقاد کی انگلی پڑ گئی ہو، ایسی حالت میں نقاد کے الفاظ اور اس کا فیصلہ بالکل عجیب نظر آئیں گے لیکن حقیقتاً وہ زمان میں پیدا ہونے والی تغیر پذیر حقیقت ہی کا پر تو ہوں گے۔ اس طرح ادبی اور فنی کارناموں کے متعلق کبھی کبھی اتنے متضاد، متخالف اور مختلف نظر آتے ہیں جن سے تنقید کی قدریں بالکل مشکوک ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت یہی خیال ہوتا ہے کہ اصول وغیرہ کچھ نہیں۔ اپنے ذوق اور اپنی پسند کی بات ہے اور اگر ذوق پابند کے لیے سانچے بنائے گئے تو وجدان، شعور اور لاشعور کی اس دنیا میں جانا پڑے گا جہاں ناپ تول کے معمولی پیمانے کام نہیں آسکتے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ جب کسی ادیب، شاعر، فن کار یا کسی ادبی اور فنی کارنامے کے متعلق رایوں میں اختلاف ہوتا ہے تو مختلف رائیں دینے والے اسے انفرادی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا مسئلہ سمجھ کر خاموش نہیں رہ جاتے بلکہ ایک دوسرے پر حملے کرتے ہیں۔ بدذوق اور کم ذوق بتاتے ہیں، جاہل اور "ناآشنائے رازِ سخن" کہتے ہیں اور "اصولی" بحثیں شروع ہو جاتی ہیں۔ فیصلے انفرادیت کے تابع نہیں رہ جاتے بلکہ ان میں بعض ایسی مشترک قدروں کی تلاش ہوتی ہے جن پر اگر تمام لوگ نہیں تو کچھ لوگ ہی متفق ہو جائیں۔

س:۔ کیا اصول نقد معین کرنے والے ایک ہی مقصد کی جانب گامزن ہوتے ہیں یا بہت سی انفرادی سماجی اور دوسری وجوہ سے ان کے ذہن میں نتیجہ پہلے سے موجود ہوتا ہے بعد میں صرف دلیلیں فراہم کی جاتی ہیں؟

ج:۔ اصول اگر ہوا میں بنتے ہوتے تو کوئی دشواری نہ ہوتی، اگر ان کے بنانے والے سماجی زندگی سے بے نیاز ہوتے تو اس کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ادب زندگی کی کشمکش کے اظہار کے طور پر پیدا ہوتا ہے اسی طرح تنقید بھی صرف ادب پیدا کرنے والوں کے احساسات اور تجربات کی توضیح کی پابند نہیں ہوتی بلکہ اسی کے ساتھ خود تنقید کرنے والے سماجی ماحول اور افتاد کی مظہر ہوتی ہے۔ نقاد کو فکر کے دو کروں میں سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔ وہ کرہ جس کی تخلیق ادیب نے کی تھی اور وہ کرہ جس نے نقاد کو نظر بنائی ہے۔ ان دونوں ٹکڑوں کی زندگی رنگ، روپ اور آب و ہوا میں مماثلت بھی ہو سکتی ہے اور مخالفت بھی، بُعد زمانی بھی ہو اور بُعد مکانی بھی، نقاد کا دونوں سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ اس کا فیصلہ یک طرفہ اور غلط نہ ہو۔ اصول نقد بناتے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

س:۔ نقاد کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو نقاد کا کام کیا ہے؟

ج:۔ اچھے ادیب اور اچھے نقاد کم سہی لیکن ہیں دونوں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کا وجود ضروری ہی نہیں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا اس لیے لکھتا ہے کہ لوگ اسے پڑھیں، اس سے لذت حاصل کریں یا فائدہ اٹھائیں تو پھر پڑھنے والوں میں سے کسی نہ کسی کو یہ کہنے کا حق بھی پہونچتا ہے کہ مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہوا یا ناکام ــــ ایک لحاظ سے نقاد کا کام مصنف سے زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کی ذمہ داری رایوں اور تنقیدوں کے اس انبار کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جو ہر تصنیف کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ ایک اچھا نقاد نہ تو انھیں نظر انداز کر سکتا ہے اور نہ انھیں کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے اس لیے جب وہ اصول معین کرنے کی کوشش کرے گا تو جہاں اس کے لیے ادب اور ادیب کو اچھی طرح جاننا اور سمجھنا ضروری ہوگا وہیں ہر عہد میں ادب کے متعلق جو رائیں پیش کی گئی ہیں ان کا سمجھنا بھی ضروری قرار پائے گا۔ اس کا کام اس حیثیت سے تجریدی شکل اختیار کرنے کے بجائے بہت سے تعلقات اور روابط کے پیچیدہ اور دشوار گذار راستوں سے ہو کر گذرے گا اور ان روابط کی حیثیت عام طور سے سماجی ہوگی جس میں انفرادی نفسیات سے لیکر اجتماعی نفسیات اور سماجی علوم تک بھی شامل ہوں گے۔

س:۔ تنقید نگاری سے آپ کا مقصد ادب کی تاریخ مرتب کرنا ہے یا ہمعصر ادب پر اثر انداز ہونا؟

ج:۔ تنقید نگاری سے میرا مقصد ادب کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا، شاعر اور ادیب کو اس کی تخلیقی کاوش پر نقاد کو اس کے صحیح شعور اور ادراک پر داد دینا اور ادب کو زندگی کے تہذیبی رشتہ میں دیکھنا ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ ادب کے بعض پہلو بھی واضح ہو جاتے ہیں اور ہم عصر ادب کے بارے میں بعض خیالات کا اظہار بھی اس طرح ہو جاتا ہے کہ سنجیدہ مطالعہ کرنے والے ان سے متاثر بھی ہو سکیں۔ میری یہ خواہش ضرور ہے کہ اگر میرے تنقیدی خیالات مدلل اور مفید معلوم ہوں تو میرے عہد کے ادیب ان پر نگاہ رکھیں۔ میں اپنے خیالات کو صحیح سمجھتا ہوں، اسی لیے پیش کرتا ہوں لیکن میرا یہ اصرار نہیں کہ آپ بھی اس طرح انھیں صحیح مان لیں جیسے میں مانتا ہوں۔

س:۔ تنقید کی نوعیت کا مسئلہ پیچیدگی اختیار کر لیتا ہے؟

ج:۔ میں نے آج تک کسی شاعر یا ادیب کو اس تنقید کی مخالفت کرتے نہیں دیکھا جس میں اس کی یا اس کی تخلیق کی تعریف و تحسین کی گئی ہو۔ چاہے وہ کتنی ہی سطحی ہو یا کتنے ہی ہیچ در ہیچ دلائل کے ساتھ کی گئی ہو، مخالفت اسی کی طرف سے ہوتی ہے جس کی تعریف مبالغہ کے ساتھ نہیں ہوتی (ان چند انصاف پسندوں کی بات نہیں جن کی بات دوسروں کو عجیب معلوم ہوتی ہے) مجھے اس صاف گوئی کے لیے معاف کیا جائے لیکن یہ بات سو فی صدی میرے مشاہدے میں آتی رہی ہے۔ میں یہی دیکھتا رہا ہوں اور برابر یہ سوچتا رہا ہوں کہ غلطی کہاں اور کس کی ہے؟ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوا ہے کہ شاید دونوں قسم کے لوگ مجبور ہیں۔ لکھنے والا اپنی تخلیق کو اچھی اور بے عیب چیز سمجھنے پر اور پڑھنے والا مطالعہ کے بعد اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرنے پر۔ اگر یہ اظہار محض تاثراتی ہو گا جب بھی "سخن گسترانہ" پہلو اور "مقام جنبش ابرو" نکل ہی آئیں گے۔

س:۔ کیا کوئی ایسی تنقید ہو سکتی ہے جسے فن تنقید سے دلچسپی لینے والے تخلیقی فنکار اور عام قاری یکساں طور پر اطمینان بخش پائیں۔

ج:۔ میرا جواب نفی میں ہے۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر نقاد اپنی ہر تحریر کو ایسی سطح پر نہیں رکھ سکتا جس سے ہر ناقد ہر قاری اور ہر ادیب مطمئن ہو سکے۔ نقاد کو یہ سمجھ کر لکھنا چاہیئے کہ وہ کسی کو کچھ سکھا رہا ہے، کسی کی رہنمائی کر رہا ہے، کسی کی ادبی رموز و نکات کے سمجھنے میں مدد دے رہا ہے، کسی کے سامنے اپنا سوچا سمجھا نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اسے تمام لوگ پڑھیں گے، متفق ہوں گے یا پسند کریں گے، وہی پڑھیں گے اور وہی اس سے سیکھنے کی کوشش کریں گے جنھیں اس کی ضرورت محسوس ہو گی، جس کی آنکھوں پر وہ عینک ٹھیک اترے گی اور جو اس کے استعمال سے واقف ہوں گے۔

س:۔ اگر سارے اہم تخلیقی اور تنقیدی ادب کو بہ غور دیکھا جائے تو ادیب اور نقاد میں طرز اظہار اور مواد دونوں کے متعلق اختلافات ملتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

ج:۔ لیکن اہم اختلافات زیادہ تر اس حقیقت سے متعلق ہوں گے جس کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہاں اس نقاد سے یقیناً ادیب اور شاعر کو ناخوش ہونے کا حق حاصل ہے جو بغیر سوچے سمجھے یا محض اپنی انفرادی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی بنا پر، عام انسانی تجربات اور محسوسات کو نظر انداز کر کے شعر و ادب کے متعلق رائے دیتا ہے۔ ایسے ہی نقادوں کے خلاف ہمیشہ شاعروں اور ادیبوں نے آواز بلند کی ہے لیکن صورت حال اگر اس کے برعکس ہو تو نقاد کو بھی فن کار سے اختلاف کا حق حاصل ہوتا ہے جہاں ادراک حقیقت اور حسن اظہار میں ہم آہنگی ہو گی وہاں ادیب اور نقاد کا اختلاف ختم ہو جائے گا یا اگر ہو گا بھی تو بہت معمولی ہو گا۔ پھر بھی یہ مطالعہ کی چیز ہے کہ ادیب اور نقاد کے اختلافات کی نوعیت کیا ہوتی ہے چیخوف نے کہا ہے کہ نقاد وہ مکھی ہے جو گھوڑے کو ہل چلانے سے روکتی ہے۔ ٹینی سن نے اسے ادبیات کے گیسوؤں میں جوؤں سے تشبیہ دی ہے۔ فلابیر نے تنقید کو ادب کے جسم پر کوڑھ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تو بڑے بڑے فنکار ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا ادیب اور شاعر بھی

نقاد کو گالیاں دے لیتا ہے۔ اس لیے اس اختلاف کی بنیاد کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ لیکن اس کو محض معمولی نفسیاتی یا طبعی ا
یکسر محدود رکھنا اس مسئلہ کی اہمیت کو کم کرنا ہوگا۔

س :۔ تنقید کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے بعض اوقات "تخلیقی تنقید" کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے اور اس بات پر زور
کہ تاثراتی یا جمالیاتی تنقید کو تخلیقی تنقید کا مرتبہ دیا جانا چاہیئے۔ اس کا مطلب کیا ہے ؟

ج :۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چونکہ ایسی تنقید، فکر کے خارجی پہلوؤں سے دامن بچا کر کسی ادب پارے کے
جمالیاتی تاثرات کا اظہار کرتی ہے اس لیے اس کی حیثیت تخلیقی ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ایسی تنقید کو تخلیقی کہا جاسکتا ہے جس
نگار کی بصیرت، حقیقت کو سمجھنے کی لگن یا غور و فکر کی روح شامل ہو۔ اس مفہوم میں کوئی تنقید تخلیقی نہیں کہی جاسکتی جس مفہوم میں
شاعری، ڈراما، ناول یا افسانے کو تخلیقی ادب کہتے ہیں اس لیے تنقید کو سرسری مفہوم میں تخلیقی کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ امریکی نقا
تنقید کے سلسلہ میں تخلیقی کے لفظ کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے اسے تاثراتی تنقید کی ایک شکل کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

س :۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تنقید نگار کا کام ادب کے متعلق فیصلہ کن انداز میں رائے دینا نہیں ہے بلکہ ان
دہرا دینا ہے جو ادیب پر تخلیق کے وقت طاری ہوئی تھیں۔ آپ کی کیا رائے ہے ؟

ج :۔ اس گروہ کی نمائندگی کسی نہ کسی شکل میں وہ تمام نقاد کرتے ہیں جنھیں تاثر پسند کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کی سب
پُرجوش حمایت اور دلچسپ وضاحت امریکہ کے ایک نقاد اسپنگارن نے کی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کا نام "تنقید جدید" رکھا ہے۔ اردو میں بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر اس نقطۂ نظر کے حامی، پیرو اور ترجمان موجود ہیں۔ اس لیے اس پر نظر ڈالنا ضر
تاثراتی تنقید کا نظریہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ ادب تاثر ہے اور اس کی تنقید بھی محض ان تاثرات کا مجموعہ ہے جو کسی تصنیف
وقت پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں کہ ان ادبی تاثرات کو سماجی اقدار کی روشنی میں پرکھا جائے۔ اسپنگارن نے انھیں
فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے اس کا نام تخلیقی تنقید رکھ دیا۔ یہیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شعور کا معیار بدلنے کے الفاظ کے معنی
جاتے ہیں۔ تنقید کے لیے تخلیق کی صفت اس طرح استعمال کرنا خود تخلیق کے مفہوم کے متعلق الجھن پیدا کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کسی
پڑھنا اور اس سے لطف حاصل کرنا ہی اصل تنقید ہے۔ اسی پُرلطف اثر پذیری کو تنقید کہنا چاہئے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک کتاب پڑھ
سوا اور کیا کہہ سکتا ہے کہ اس کا اس پر کیا اثر ہوا گویا تنقید کا اصل کام اُن کیفیات کی بازآفرینی ہے جو کسی شاعر یا ادیب پر گز
اسی وجہ سے بعض نقاد کتابوں کی تشریح اور تفسیر ہی کو تنقید سمجھنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تنقید اور تشریح میں کیفیات کی بازآف
نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی اور پر گزرے ہوئے اثرات کو پوری طرح اپنے اوپر طاری کرنا ناممکن ہے اس لیے کہ جذبات خاص قسم کے محرکات
حالات کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے تنقید کا یہ نظریہ فیصلہ اور رائے زنی سے بچنے اور ادب کو سماجی ذمہ داری سے بچانے کا ایک ذریعہ

س :۔ ایسی تنقید کو اسپنگارن نے تخلیقی کیوں کہا ہے ؟

ج :۔ یہ بھی بہت دلچسپ اور پُرلطف بحث ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر ہم لوگ تاثرات کے معاملہ میں حساس ہوں اور ان کے اظہا
قادر ہوں تو ہم میں سے ہر شخص ایک ایسی نئی کتاب کی تخلیق کرے گا جو اس کتاب کی جگہ لے لے گی جس کے مطالعہ سے ہم نے وہ تاثرات حاصل کیے
کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار اسپنگارن کے خیال میں تخلیقی عمل ہے۔ وہ صاف صاف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ادب یا تنقید کا یہ کام نہ
وہ کسی اخلاقی یا سماجی مقصد کا اظہار کرے یا اس سے آگے بڑھائے۔

س :۔ ادب کی تخلیقی تنقید کا مقصد کیا ہوتا ہے ؟

ج :- ادب کی تخلیقی تنقید کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ نقاد بھی ادیب کے خیالات کی بنیاد کو ڈھونڈ کر اس کی ادبی کاوشوں پر اعلیٰ ادبی رنگ میں اظہار خیال کرے۔ اور ادیب کے سماجی شعور کا جائزہ لے، فن کی نزاکتوں پر نگاہ ڈالے اور عام پڑھنے والوں کی رہنمائی کرے۔ اگر کوئی نقاد اس سے بچتا ہے تو وہ تنقید کا حق ادا نہیں کرتا۔

س :- کچھ نقاد تقابلی مطالعہ کو سب سے اچھا تنقیدی مطالعہ قرار دیتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج :- تقابلی مطالعہ ہمیشہ ناقص ہوتا ہے، کیونکہ تقابل کے تمام عناصر کو پیش نظر رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور اگر ایک یا کئی اہم پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں تو نتائج بالکل غلط ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کچھ نقاد موضوعات کے اعتبار سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، کچھ سارے ادب کو کلاسکی اور رومانی میں تقسیم کر دیتے ہیں، اور ہر شاعر اور ادیب کو انہی چوکھٹے میں بٹھانا ضروری سمجھتے ہیں، کچھ تحقیقی میلان رکھتے ہیں اور صرف لفظی مطالعہ کو اہم جانتے ہیں، ان کی ساری قوت اس پر صرف ہوتی ہے کہ مختلف نسخوں میں کسی خاص لفظ کی کیا کیا شکلیں ملتی ہیں۔ اس ضمن میں بہت سی کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں لیکن انھیں تنقید سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ اس میں کبھی ادب کے اندر پیش کی جانے والی سماجی اور طبقاتی کش مکش پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

س :- کیا آپ کی دانست میں آپ کی تنقید سے ہم عصر ادب کو کوئی فائدہ پہونچا ہے اور کیا ہم عصر لکھنے والوں نے کسی طور پر آپ کی تنقیدی فکر سے اثر قبول کیا ہے؟

ج :- یہ سوال کہ میری تنقید نگاری سے ہم عصر ادب کو کوئی فائدہ پہونچا ہے یا نہیں یا کسی ادیب نے میرا اثر قبول کیا ہے یا نہیں، مجھ سے پوچھنے کا نہیں ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایسا اثر کبھی بہت واضح نہیں ہوتا۔ ہمارے ادیب اتنے فراخ دل بھی نہیں ہیں کہ وہ اس کا اعتراف کریں۔ میں اپنی باتیں اسی امید پر کہتا رہا ہوں کہ کچھ لوگوں کو اس سے ادب کے مسائل کو سمجھنے اور اچھے برے ادب کے پرکھنے میں مدد ملے گی۔ میں لوگوں کی کمزوریوں، حماقتوں یا تعصبات سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا بلکہ ان کے ذہن اور علم کو کریدتا ہوں۔

س :- آپ گذشتہ ادب کے بارے میں کیوں لکھتے ہیں؟

ج :- میں گذشتہ ادب کے بارے میں اس لیے لکھتا ہوں کہ حال کے ادب کی طرح وہ بھی ادب ہے، وہ بھی پڑھا جاتا ہے اور اسے پڑھا جانا چاہیئے۔ میں بھی اسے پڑھتا ہوں، اس کو سمجھنا اور اس سے لطف لینا چاہتا ہوں۔ میں ہر اچھے ادب کی طرح اسے بھی زندگی کی دستاویز سمجھ کر پڑھتا ہوں۔ اس کی مدد سے اس عہد کے مزاج، ذہن، کردار، عقائد، خیالات کی کشمکش اور زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کبھی جذباتی یا جمالیاتی حظ نہیں حاصل ہوتا تو ذہنی حظ حاصل ہو جاتا ہے۔ ماضی کے اچھے ادب نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا ہے۔ جب اس کی دنیا سے لوٹا ہوں دامن بھرا ہوا تھا۔ اس کے متعلق اظہار خیال کیوں نہ کروں؟ میرا یہ بھی خیال ہے کہ گذشتہ ادب کے مطالعہ کے بغیر جدید ادب کو سمجھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ادب تہذیب کی طرح ایک ناقابل شکست تسلسل ہے۔

س :- ہم عصروں پر لکھنے میں کبھی جھجک محسوس ہوئی ہے؟ ہوتی ہے تو کیوں؟

ج :- جی ہاں ہم عصروں پر لکھنے میں اکثر جھجک محسوس ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ میری فطری کمزوری ہو۔ مجھے آبگینوں کو ٹھیس لگانے میں لطف نہیں آتا جہاں تک ہو سکتا ہے اس سے بچتا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا دل دکھے۔ کوشش کرتا ہوں کہ ہم عصروں کی تخلیقات کے زیادہ سے زیادہ اچھے پہلوؤں کا ذکر کروں، انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہوں اور کمزوریوں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالتا ہوں۔ اگر بمجبوراً ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے جو مجھے درست نہیں معلوم ہوتیں تو ان کا اظہار بھی ملامت کے انداز میں نہیں کرتا۔ اب اسے کیا کروں کہ ایک کی تعریف دوسرے کو ناگوار ہوتی ہے۔ میں بھی انسان ہی ہوں ممکن ہے کبھی کبھی طنز کے پیرایہ میں کوئی سخت بات قلم سے نکل گئی ہو، احتیاط ضرور کرتا ہوں۔

کے محرکات کا پتہ لگا لینا ...... ترقی پسند نقاد کا کام ہے۔" (تنقید اور عملی تنقید ص۳۱)

"تنقید نگاری سے میرا مقصد ادب کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا، شاعر اور ادیب کو اس کی تخلیقی کاوش پر نقاد کو اس کے صحیح شعور و ادراک پر داد دینا اور ادب کو زندگی کے تہذیبی رشتہ میں دیکھنا ہے۔" (اعتبار نظر ص۶)

"جو نقاد (ترقی پسند) نظریۂ تنقید کو اپناتے ہیں وہ روح عصر، سماجی نفسیات، عمرانیات یعنی ان تمام باتوں پر نگاہ رکھتے ہیں جو طبقاتی سماج میں پیداوار کی معاشی بنیادوں کے اوپر فکری اور فلسفیانہ حیثیت سے وجود میں آتی ہیں ...... ادب محض چند فنی خصوصیات کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ ہے۔ پھر فنی خصوصیات خود تاریخی حالات اور سماجی ارتقا سے وجود میں آتی ہیں۔" (تنقیدی جائزے)

ماضی کا ادبی سرمایہ ہو یا عصر حاضر کا احتشام حسین نے ان ہی تصورات پر اپنے مطالعہ کی بنیاد رکھی ہے۔ تاہم انھوں نے اس پر اصرار کبھی نہیں کیا کہ صرف ان کے تنقیدی طریق کار سے ہی ادب کے بارے میں بنیادی حقیقتوں کا ادراک ممکن ہے۔ ہاں اپنے عہد کے ادبی تہذیبی تقاضوں کے پیش نظر جن پہلوؤں کو انھوں نے قابل ترجیح اور اہم سمجھا ہے ان پر زور ضرور دیا ہے۔

یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ ۳۰ سال میں اردو تنقید تاثراتی توضیح، کورانہ مغربیت، ادعائیت اور کلاسیکی میکانکیت کے غبار آلود دائروں سے نکل کر ایک روشن علمی اور سائنسی سطح کی طرف بڑھی۔ اردو تنقید میں جو وسعت، گہرائی اور فلسفیانہ بینش کی روشنی پیدا ہوئی بلاشبہ اس میں احتشام حسین کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ یہ کہنا بھی شاید بے جا نہ ہو کہ اس دور میں جس ایک نقاد کی فکر اور فکر و شعور کا حلقۂ اثر سب سے زیادہ وسیع اور دور رس رہا ہے وہ سید احتشام حسین ہی ہیں۔ انھوں نے ادب کی ماہیت، انسانی سماج اور تہذیب میں اس کی اہمیت اور غایت، مختلف ادبی رجحانات اور تحریکات اور ادب پر اثر انداز ہونے والے تاریخی عوامل کی نوعیت پر جس تجزیاتی گہرائی حکیمانہ شعور اور معروضی ڈھنگ سے سوچا اور لکھا ہے وہ کسی اور سے ممکن نہ ہو سکا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خود صاحب نے ادب اور اس کے مسائل پر جو کچھ لکھا ہے وہ حرف آخر ہے۔ یا انھوں نے بعض بنیادی ادبی مسائل کا کوئی آخری حل پیش کر دیا ہے۔ اس کے برعکس ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ادب کے بارے میں بعض روایتی مفروضات یا مسلمات کے سامنے ایک بڑا استفہامیہ نشان بنا دیا۔ ادبی تنقید کا رشتہ دوسرے علوم سے جوڑا اور ایسے مسائل پر سوچنے کی دعوت دی جن سے اردو کے طالب علم پہلے روشناس نہیں تھے۔

ہر زبان اور عہد کی ادبی تنقید کے سامنے بالعموم دو طرح کے مسائل ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق حال کی تخلیقی سرگرمیوں سے ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو ماضی کے ادبی سرمایہ کی قدر شناسی اور بازیافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا نقاد جو ادب کو انسانی تہذیب اور سماج کا ایک جاندار ارتقائی مظہر سمجھتا ہے وہ ادب اور اس کے مسائل کو اس طرح تقسیم کر کے نہیں دیکھتا بلکہ ایک نمو اکائی کی صورت میں ادب کا مطالعہ کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نقاد اس مطالعہ میں وہ کون سا طریقۂ عمل یا انداز نظر اپنائے جو اس کے بامعنی زیادہ سے زیادہ صداقتوں کو بے نقاب کر سکے۔ ۔ ۳۰ سال قبل اس سلسلہ میں ایک رویہ تو وہ تھا جس کی نمائندگی ایک طرف کلیم الدین اور دوسری طرف نیاز فتحپوری، فراق اور بعض دوسرے تاثراتی نقاد کر رہے تھے۔ بعض اختلافات کے باوجود ان کا رویہ اپنے ذاتی شعور اور ذوق ادب کی میزان پر ادب کو پرکھنے اور فیصلہ کرنے کا رویہ تھا۔ موضوع خواہ قدیم ادب ہو یا جدید انھیں اس کو پرکھنے اور اس کی اقدار و معیار پر حکم لگانے میں کسی خاص دقت کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی انھیں اس ذمہ داری کا احساس تھا کہ ادب کے طالب علم ان کے تنقیدی محاکموں سے ایسی عصبیت کا شکار ہو سکتے ہیں جو ادبی ذوق اور اقدار کی تعمیر و تربیت میں مضر ہو سکتی ہے۔ مثلاً ان کی تنقید

آئینہ میں عظیم الدین یا مومن اور ریاض کی شاعری اعلیٰ ترین فنی اقدار کی حامل سمجھی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اردو تنقید کے تہی دامن کو اپنے محدود لیکن رچے ہوئے اور گہرے شعور فن سے مالا مال کیا۔ لیکن آج جب سید احتشام حسین اور دوسرے علم دوست نقادوں کی کوششوں سے اردو تنقید میں تجزیہ و استدلال کے سارے ادبی اقدار کے تعیین کی روایت مستحکم ہو رہی ہے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ نوجوان نقاد اسی تنقیدی رویے کی تجدید کر رہے ہیں۔ جو فن و ادب کے ذاتی شعور و مذاق کے سہارے جانچنے پرکھنے اور فیصلے کرنے پر زور دیتا ہے۔ آج کے بہت سے نوجوان نقادوں کی تحریروں میں صرف ادعائیت ہی نہیں ایسی جارحانہ درشتی اور جذباتیت بھی ہے جو ادبی حقائق کو صحیح رنگ میں دیکھنے اور پرکھنے سے باز رکھتی ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے کی اجازت دیجئے کہ دانش گاہوں کے ہم اردو اساتذہ میں سے بیشتر عصری ادب کی برق رفتار تبدیلیوں اور نئے تنقیدی رویوں سے کچھ زیادہ باخبر نہیں ہیں۔ ہم میں سے بعض اس زعم باطل کا بھی شکار رہے کہ اردو زبان و ادب کے بارے میں معقول اور مستند آگہی صرف ہمارا حصہ ہے یا یہ کہ دانش گاہوں سے باہر اردو کے ادیب اور نقاد جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ محض وقتی، فصلی اور سطحی ہے۔ اور اس لیے ناقابل اعتنا۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے بعض کی تحریروں میں طنز و تضحیک، ہرزہ گوئی اور دشنام طرازی بھی ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بعض نوجوان ادیب سنجیدہ انہماک کے ساتھ ادب بالخصوص عصری ادب کے مسائل پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ وہ تعلیم و تدریس نہیں، بلکہ دوسرے شعبوں میں کار منصبی انجام دے کر تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکال لیتے ہیں اس لیے ان کی سرگرمیوں ان کے مسائل اور ان کی خدمات سے چشم پوشی کر کے ہم ادب اور تنقید کی کوئی بڑی خدمت انجام نہیں دے سکیں گے۔ دانش گاہوں کے استاد عالموں اور غیر استاد دانشوروں کے درمیان چشمک اور خلیج دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی رہی ہے لیکن اردو میں وہ جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اس میں ہم استادوں کی بے نیازی کا دخل کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ سید احتشام حسین اردو کے ان نقادوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے ہر زمانہ میں عصری ادبی سرگرمیوں اور نوجوان ادیبوں کے مسائل کا مطالعہ گہری دلچسپی اور ہمدردی سے کیا ہے۔ سرور صاحب کی یہ رائے کہ "وہ جدیدیت کی رو سے خوش نہیں تھے۔ ان کا ایک خاص مزاج بن چکا تھا اور وہ اس عمر میں اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے تھے" میری دانست میں احتشام حسین کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرتی۔ وہ ایسے بہت سے ہم عصر نوجوان ادیبوں کی تخلیقی صلاحیتوں کے قدرداں تھے جن کی تحریروں میں فنی پختگی اور سماجی شعور و معنویت کا احساس ملتا ہے۔ شعر و ادب کے بارے میں ان کے رویے میں بھی تدریجی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی جس کی گواہی ان کے آخری دور کے بعض مضامین مثلاً "قدر و معیار کی جستجو" یا "ادیب کی انفرادیت اور عصری رجحانات" میں ملتی ہے۔ وہ جس شوق و انہماک اور ہمدردی سے نئے ادیبوں کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے تھے دانشگاہوں کے کم استادوں نے کیا ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ نئے تجربات کی چمک دمک اور نئی تنقید کی ادعائیت پسندانہ جارحیت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ نئی تنقید کے علمبردار شعر و ادب کے بارے میں کس نظریے یا مسلک کو لیکر اٹھے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین تنقید کے کس معیار اور کس سطح کو پیش کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے آج بعض باشعور اور ذہین نقاد بھی اصولوں کے ادعا کے باوجود محض ذاتی پسند و ناپسند کی میزان پر فیصلے کر رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں ان کے اکثر تنقیدی محاکمے تنگ نظری اور تعصب اور یک رخی فکر کی غمازی کرتے ہیں میں صرف ایک مضمون سے چند مثالیں دوں گا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ایک ذہین اور باشعور جدید نقاد وارث علوی نے عصری ادب اور تنقید کی صورت حال کا مبسوط جائزہ لیا۔ انھوں نے نقاد کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مقالہ میں لکھا ہے:

"نقاد اگر نقاد کے طور پر کام نہیں کرتا تو اسے خاموش رہنا چاہیئے۔ رائے زنی اور مشورہ پاشی سے خوش ہو لینا اس کے کردار کو زیب نہیں دیتا PAT GENELISATION کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر وہ ایک بھی شاعر سے ناانصافی کرتا ہے تو

نقاد نا قابلِ معافی غلطی کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔"

نقاد کے اس منصب سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے لیکن اب اسی مقالے کے یہ چند اقتباسات بھی دیکھیے۔

"اشتراکی فنکار کبھی بھی بڑا فنکار بن ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اشتراکی فلسفہ میں اخلاق اور انسان دوستی کے تصورات محض اضافی ہیں"۔

"ہماری مارکسی اور معاشرتی تنقید نے سوائے فکری انتشار، ذہنی تعصب اور تہذیبی بربریت کے کوئی اثرات ہمارے ادب پر نہیں چھوڑے۔"

"ڈاکٹر (محمد حسن) صاحب تخلیقی عمل کی نفسیات اور ادبی جمالیات کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔"

"میں....... اس خیال سے اتفاق کرنے لگا ہوں کہ کرشن چندر دراصل NON WRITER ہے۔

یعنی ایک ادیب اور فنکار کے طور پر اب کرشن چندر پر بات چیت ممکن ہی نہیں۔"

"سریندر پرکاش کو تو میں جدید افسانہ نگاری کا ستون سمجھنے لگا ہوں۔"

رائے زنی مشورہ بازی اور GENERALISATION کے سلسلے میں کسی فنکار کے ساتھ بے انصافی کو یہ نقاد ایک ناقابلِ معافی جرم قرار دیتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ مارکسی نقادوں نے سب سے زیادہ اس جرم کا ارتکاب کیا۔ لیکن اپنے اس طویل مضمون کے ہر صفحہ میں شاید غیر شعوری طور پر وہ اس جرم کا ارتکاب کرتے نہیں تھکتا۔ اب اگر ان سے کہا جائے کہ گورکی، مایاکوفسکی، شولوخوف، پیبلو نرودا اور فیض احمد فیض جیسے فنکار سب اشتراکی ہونے کے باوجود بڑے فنکار ہیں تو وہ یہ ماننے سے ہی منکر ہوں گے اس لیے کہ ان کا پختہ عقیدہ ہے کہ اشتراکی فنکار کبھی بڑا فنکار ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح ان کو یہ باور کرانا بھی مشکل ہے کہ تخلیقی عمل اور جمالیات کے بارے میں علم و عرفان صرف ان کا اجارہ نہیں مارکسی اور معاشرتی تنقید کے ہولناک اثرات کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے وہ تخیلی سہی مگر عبرت سے خالی نہیں۔ اب رہی کرشن چندر کے ــــ ادیب و فنکار نہ ہونے اور سریندر پرکاش کا جدید افسانہ نگاری کے ستون ہونے کی بات تو اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ نئی تنقید میں فن و ادب اور اصولِ نقد کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر نہ ہو۔ نئے نقادوں نے تخلیقی تجربات کے تجزیے، شاعری میں لفظ و معانی کے تعلق، شعری ہئیت، لفظیات اور علامات کے بہت سے ایسے نازک مسائل پر گہرائی کے ساتھ غور و فکر کیا ہے جن کا احساس پچھلے دور کی یا مارکسی تنقید میں یا تو سرے سے نہیں ملتا یا اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ شاید ان کے اپنے کچھ اصول بھی ہیں لیکن ان کی تنقیدوں میں اکثر ایسا جوش ایسی جھلاہٹ اور جذباتی خروش ہوتا ہے کہ اصول منہ تکتے نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فیصلے کبھی منصفانہ یعنی معروضی اور علمی جانچ پرکھ کا منطقی نتیجہ معلوم نہیں ہوتے۔ ان کا رویہ کچھ ایسا ہے کہ جب تک جوش، مجاز، مخدوم یا کرشن چندر جیسے مقبول فنکاروں کا چھوٹا یا بونا ثابت نہ کیا جائے۔ نئی پود کے فنکاروں کا قد ابھر نہیں سکتا۔ ان کے مقابلہ میں وہ اپنے ہم مشرب فنکاروں کی تخلیقات میں اعلیٰ فنی اقدار آسانی سے تلاش کر لیتے ہیں۔ اور مشکل یہ ہے کہ یہی توقع وہ احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن جیسے نقادوں سے کرتے ہیں اس طرح نئی تنقید اچھے تبصرہ نگار پیدا کرسکتی ہے نقاد نہیں۔

عصری ادب یا معاصرین کے بارے میں احتشام صاحب کا ایک خاص اور مستقل رویہ رہا ہے۔ جو آج بھی ہمیں روشنی دے سکتا ہے۔ وہ عصری ادب اور نئے رجحانات کا مطالعہ خاص دلچسپی انہماک اور ہمدردی سے کرتے تھے لیکن ان کا اعتقاد تھا کہ ہم عصر ادیبوں یا ادب کے بارے میں معروضی انداز سے سوچنا اور فیصلہ کرنا نہایت دشوار ہے۔ اول تو ہم عصر ادب سے ہر قاری اور نقاد ایک جذباتی ہم آہنگی محسوس کرتا ہے جو اس کے تنقیدی محاکمہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دوسرے ہر زندہ ادیب کا ذہن و شعور ہی نہیں فن بھی مسلسل ارتقا پذیر رہتا ہے۔ اور اس کا امکان بھی رہتا ہے کہ ہر لحظہ بدلتے ہوئے سماجی اور تہذیبی حالات کے زیرِ اثر اس کے فکر و شعور اور فنی اسلوب میں بھی بعض انقلابی

لیاں راہ پا جائیں۔ اس لیے جب تک اس کی شخصیت اور فن میں تغیر و ارتقا کا یہ عمل جاری ہے۔ اس کے فن کی قدر و قیمت کا تعین ممکن نہیں ہے۔ صورت میں نقاد کا منصب یہی ہوتا ہے کہ عصری ادب میں جن رجحانات یا لہروں کی کارفرمائی ہے جو روح عصر ہے اس کا تجزیہ کرے اور مادی یا ارضی محرکات اور ماخذوں کا سراغ لگائے جن کے زیر اثر یہ رجحانات صورت پذیر ہوئے یا ہو رہے ہیں۔ اس تجزیاتی اور توضیحی الم میں حقیقت کو دیکھنے کے نئے زاویہ ہائے نظر، فکر و احساس کے نئے سانچوں اور نئے ہئیتی تجربوں کے امکانات کی تشریح و تعبیر سب ل ہے۔ یہاں تفصیلی اقتباسات یا مثالیں دینے کا موقع نہیں۔ ان کے بے شمار مضامین میں عصری ادب کے بارے میں اس صحت مند یے کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

عصری ادب اور تنقید کا ایک رخ اور رویہ یہ بھی ہے کہ تخلیقی ادب کا رفتار زندگی یا سماجی حالات و مسائل سے کوئی نتیجہ خیز ق نہیں ہوتا۔ ایک جدید ناقد کا قول ہے کہ کسی ادبی تخلیق میں یہ عنصر یعنی عصری حالات اور ماحول کا عکس جتنا زیادہ ہوگا اس کی فنی ر و قیمت اتنی ہی کم ہوگی۔ اس سلسلہ میں جس نظریہ فن اور تخلیقی عمل کے جس تصور پر زور دیا جا رہا ہے اس کا مقصد بھی اس کے سوا کچھ نہیں بنی تخلیق میں زندگی کا شعور، فکر و نظر کی گہرائی یا معنویت کی تلاش ایک غیر ادبی اس لیے لایعنی مشغلہ ہے۔ بعض باصلاحیت فنکار بھی ب میں معنویت کو اسی طرح اضافی عنصر سمجھتے ہیں جس طرح شاعری میں وزن اور قافیے کو۔ اس لیے آج کی شاعری اور افسانہ میں ابہام شاریت اور تجرید کے ایسے انداز اور نمونے ملتے ہیں جن کی تفہیم کا دعویٰ ایک عام قاری تو درکنار نقاد بھی نہیں کر سکتا۔ نئی تنقید کے بعض علمبرداروں نے ایسی تخلیقات کے جو تجزیاتی تجربے کیے ہیں وہ بجائے خود دور از کار جدت طرازی کے ایسے نمونے ہیں جن کی تشریح کی ل ضرورت ہے۔

ادب کے بارے میں اس رویے سے ایک عام طالب علم کے ذہن میں یہ سوال بار بار پیدا ہوتا ہے کہ کیا فن و ادب واقعی کوئی الہامی غیر ارضی چیز ہے جس کا ہماری مادی زندگی اور سماج سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا ادب کے مطالعہ کا حاصل وہ طفلانہ مسرت ہے جو اس کی علامتوں کو کھولنے اور سمجھنے کی ذہنی ورزش سے ہاتھ آتی ہے۔ کیا ادبی تخلیق میں صرف اس کی علامات، پیکروں اور لفظوں کی باہمی ترکیب و ترتیب سے ہی فنی حسن پیدا ہوتا ہے کیا ادب میں انفرادیت ہئیت اجتماعی کے احساس و ادراک کے بغیر ممکن ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو ہر دور کا ادب دوسرے دور سے کیوں مختلف ہوتا ہے؟

ادب کے بارے میں یہ اور ایسے ہی دوسرے اہم سوالات آج پھر سر اٹھا رہے ہیں جن کے بارے میں سوچنا ہر دیانت دار نقاد کا فریضہ ہے۔ احتشام صاحب نے اپنے تنقیدی مضامین میں مختلف زاویوں سے جس طرح ان مسائل کا احاطہ کیا ہے اور فن و ادب کے ان تاریک گوشوں میں علم و آگہی کے چراغ جلائے ہیں اگر ہم تعصب اور تنگ نظری سے کام نہ لیں تو آج بھی وہ ہماری رہبری کر سکتے ہیں۔

اردو ادب اور تنقید کو آج بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ نئی شاعری اور نئے افسانہ میں جس نئی علامت نگاری اور تجربہ کاری کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ ادب کے عام قارئین میں وہ ابھی تک اپنے لیے کوئی جگہ نہیں بنا سکی ہے۔ جو تجربے ہوئے اور ہو رہے ہیں مثلاً نثری شاعری کا تجربہ خیال کی ضرورت اور اہمیت کا احساس بھی عام پڑھنے والوں کو اب تک نہیں ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نئی تنقید نئے ادب کی تفہیم و تعبیر کا فریضہ انجام نہیں دے سکی ہے۔ وہ نئی تخلیقی سرگرمیوں اور نئے تجربوں کی رفتار کے مقابلہ میں پیچھے رہ گئی ہے۔ شاید اس لیے کہ اس نے ادیب اور قاری کے بنیادی رشتے کو نظر انداز کیا ہے۔ اور شاید اس لیے کہ اسے اب تک کوئی احتشام حسین نہیں مل سکا ہے۔ احتشام حسین کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عصری ادب کی افہام و تفہیم کا فریضہ انجام دے کر فنکار اور قاری کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کیا۔ ادب میں افراط و تفریط کو اعتدال کی راہ دکھائی۔ انھوں نے مواد اور ہئیت ہی نہیں جذبہ احساس اور خیال کی ناگزیری سالمیت پر زور دے کر

نئے تجربات کی حقیقی قدر و قیمت سے قارئین کو روشناس کیا۔ اس صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں جدید ادب کے قارئین اور قدر شناسوں کا جو وسیع حلقہ پیدا ہوا، اس میں احتشام حسین کی تحریروں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: "نقاد ایک لحاظ سے عام پڑھنے والوں اور مصنفوں کے درمیان رابطہ کا کام دیتا ہے۔" (تنقید اور عملی تنقید ص۹) "نقاد الگ کوئی مخلوق نہیں ہے۔ وہ بھی قاری ہے شاید کچھ زیادہ باعلم اور ہوشمند۔ عام قاری کے مقابلہ میں اس کا ذہن بے ترتیبی میں ترتیب اور انتشار میں وحدت تلاش کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا۔"

(اعتبار نظر ص۱۲)

یہ کھوکھلا دعویٰ نہیں۔ ان کے بے شمار مضامین اس دعوے کا ثبوت ہیں۔ لیکن گزشتہ دہائی میں نہ صرف اردو کے نئی پود کے شاعروں اور ادیبوں بلکہ نقادوں نے عام قاری کے بارے میں بے نیازی بلکہ حقارت کا جو رویہ اختیار کیا ہے اس نے بڑی عجیب اور افسوسناک صورت حال پیدا کردی ہے۔ ابہام۔ لایعنیت اور ناقابل فہم ہونے کے وصف کو ایک قدر کا درجہ دیا جانے لگا ہے۔ زبان، علامتوں اور استعاروں کے من مانے استعمال سے ادب میں ایک نراجی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ایسی تخلیقات جو عام قاری کے لیے قابل فہم ہوں انھیں نیا نقاد روایتی اور فرسودہ قرار دیتا ہے۔ اپنی تحریروں میں اس کا تخاطب بالعموم نئے فنکاروں اور نقادوں سے ہوتا ہے عام قاری سے نہیں۔ قاری سے مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ نئے شعر و ادب کی تفہیم کے لیے اپنے مذاق اور احساس شعور میں تبدیلی پیدا کرے۔ گو قاری کا کام شعر و ادب کی ہر نئی کروٹ کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتے رہنا ہے۔ نئے تخلیقی ذہن و تخیل کو قوت پرواز کہاں سے ملی؟ نئی تخلیقات میں جو بے جہت بغاوت اور نامانوس اجنبیت ہے وہ کہاں سے آئی؟ یہ دیکھنا اور پرکھنا بھی نئے نقاد کا نہیں قاری کا کام ہے۔ اس نہیں ہے کہ اردو کا قاری نئے تجربوں اور نئے ذہنی اور جذباتی رویوں کو سمجھنے سے قاصر یا بیزار ہو۔ اس کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ اس کے ادبی ذوق کی وہ رشتہ جن زندہ روایات جس مٹی اور جس ماحول میں ہوئی ہے نئے تجربے اسی آغوش سے پھوٹنے والی کونپلیں اور کلیاں ہوں۔ ان میں روایت کا زندہ جوہر اور اسی زمین اسی ماحول کی بو باس ہو۔ اس میں اگر صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام کی دانش اور حسیت ہو تو ایسی ہو کہ اس کے خط و خال کی شناخت کے لیے اس کے احساس و ادراک کے لیے انھیں امریکہ اور مغربی یورپ کے عصر جدید کی تاریخ نہ پڑھنی پڑے لیکن نیا فنکار اور نئے نقاد اس سادہ سی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ چند سال سے اردو ادب میں تعطل اور اضمحلال کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ بہت سے باصلاحیت ادیب اور شاعر جو چند سال قبل تک بڑے جوش و خروش سے لکھ رہے تھے اب یا تو خاموش ہو گئے ہیں یا اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں۔ آج کی تنقید اس نازک اور اہم حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

یوں تو ہر دور کے ادب میں سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کے زیر اثر ادب کی کچھ پرانی اصناف، نئے قالب میں ڈھلتیں، بعض اصناف ساتھ چھوڑ جاتیں اور کچھ نئی اصناف جنم لیتی ہیں لیکن آج کے اردو ادب میں مواد موضوع ہیئت اور زبان کی سطح پر جو تجربات اور تغیرات ہو رہے ہیں ان کی رفتار پچھلے ادوار سے زیادہ تند و تیز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مواد اور ساخت کے اعتبار سے اصناف کی حدیں اس طرح ٹوٹ رہی ہیں کہ باہمی طور پر ان میں فرق کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ شعر و ادب کی مختلف اصناف سے جو روایات جڑی اور تصورات وابستہ تھے ان کی شکست و ریخت سے انتشار کی جو فضا پیدا ہو رہی ہے اس کا اثر تنقیدی رویوں اور نظم و ضبط پر بھی پڑ رہا ہے۔

ابھی کچھ دن پہلے تک اردو کی نمائندہ نثری اور شعری اصناف مثلاً غزل مثنوی رباعی یا تمثیل افسانہ اور ناول سب کے ذ اسلوب، مواد اور اقدار و معیار کا ایک مانوس تصور ہمارے ذہن میں رہتا تھا۔ وہ بہت واضح یا بندھا ٹکا تو نہ تھا پھر بھی جب کوئی ادبی تخلیق ہم پڑھتے تھے تو نفس موضوع یا خارجی ہیئت کے بعض نمایاں اوصاف کو دیکھ کر ہم آسانی سے اس کی شناخت کر لی

زل ہے یا نظم افسانہ ہے یا انشائیہ یا کچھ اور۔ اسی طرح ہر ادبی تخلیق کا تنقیدی مطالعہ بھی اس کی صنفی روایات و مسلمات کو ذہن میں
یا تا تھا جب کہ آج غزل ہو یا نظم افسانہ ہو یا ناول سب کے روح و قالب میں ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں کہ کبھی کبھی ان کی
ت نہ صرف دشوار بلکہ محال نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر غزل کے موضوعات، اس کے اشعار کی معنوی وحدت، اس کی مخصوص زبان اور
یت یا غزل کا جو مانوس تصور تھا جدید غزل میں وہ اگر یکسر نہیں تو بڑی حد تک بدل گیا ہے۔ نظم اپنے آہنگ، اظہار و بیان اور ساخت
سے ابھی نثر کا نعم البدل بنتی جا رہی ہے جبکہ افسانوی ادب کی نثر اپنی داخلیت اور تمثیلی فضا کے اعتبار سے شاعری کے قریب
شمس الرحمن فاروقی نے اپنے ایک مضمون "نظم اور غزل کا امتیاز" میں دلچسپ بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ نظم اور غزل کا
ہے اور مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے ناقد نے جدید افسانہ کی فنی ساخت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"افسانہ ابھی تک حدود کا پابند تھا۔ اور یہ زنجیریں خود افسانہ کے نام نہاد سرپرستوں کی ہی عطا کردہ تھیں (تھیں)
...... اگر وہ ہئیتی اعتبار سے افسانہ کے بندھے ٹکے اصولوں سے نکل کر شعر کے قریب آتا ہے تو اسے آنے
دیجئے"۔ شب خون جون ۱۹۶۲ء قمر احسن

آج صرف نئے افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ انور عظیم، اقبال متین اور جوگندر پال جیسے کہنہ مشق افسانہ نگار بھی افسانہ کی روایتی زنجیروں یا
توڑ کر باہر نکل رہے ہیں۔ ان کے ان گنت افسانوں میں افسانے کا کوئی امتیازی وصف نہیں ملتا وہ پلاٹ اور کردار نگاری کے احساس
ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک ادبی تخلیق کے طور پر متاثر کرتے ہیں۔ ایسے کامیاب افسانوں کی تعداد بھی کم نہیں جن کو افسانہ کے مقابلے
یا انشائیہ کے پہلو میں رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ فن کے مسلمہ اصولوں سے بغاوت اور ایک نئی ہئیت کی تلاش کا یہی رجحان ناول
و نما ہو رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان نئی تخلیقات کو جانچنے اور پرکھنے کی کسوٹی کیا ہو؟ جب کسی خاص صنف کسی خاص فارم سے ان کی وابستگی مشتبہ ہو
فنی معیار و اقدار کا تعین کس طرح کیا جائے۔ بعض نئے نقادوں کا خیال یہ ہے کہ ہر ادبی تخلیق کو ایک آزاد اکائی سمجھ کر اس کے تاثر
کے فنی کا تجزیہ اور مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس کے لیے خارجی اصولوں یا سیاق و سباق کے حوالے کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں ہر نقاد
یا ستہ سے جو تاثر قبول کرے گا اور اپنے ادبی مذاق کی روشنی میں فن پاروں میں جن عناصر کو اہمیت دے گا وہی ان کی تنقید ہوگی۔
دور میں جب ہر تہذیبی مظہر کو عقل و استدلال کی علمی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے ادبی تنقید کے معروضی اصولوں کی تلاش بے سود ہے۔
نہ ناول اور شعری اصناف کے تمام بنیادی فنی اصول اور ضابطے بے معنی ہو جائیں گے؟ ان سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون
ن اور تقاضے ہیں جن کے زیر اثر ادب میں یہ صورت حال پیدا ہوئی۔ اگر ادبی مذاق بدلا ہے۔ جمالیاتی سانچے ٹوٹے ہیں۔ فرسودہ
لب ہوئے ہیں تو کیا یہ سب محض خلا میں ہوا؟ کیا اس تبدیلی کے پیچھے احساس و شعور کے زاویوں اور سماجی رویوں کی تبدیلی کوئی
یں رکھتی؟ اور کیا ان کو مادی حالات ماحول اور زمانے کی تبدیلیوں سے الگ کرکے دیکھنا اور سمجھنا ممکن ہے؟

ادبی تنقید کے سلسلہ میں یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جن پر غور و فکر کرنے کی احتشام صاحب نے طرح ڈالی۔ ذاتی تعصبات تنگ نظری اور
سے بلند ہو کر انہوں نے ادبی حقائق کو مادی حقائق اور تہذیب کے وسیع تر پس منظر میں دیکھا اور سمجھا انہوں نے کبھی اس پر اصرار نہیں کیا کہ ادبی
، جو دوسرے طریقہ کار ہیں وہ سچائی سے عاری ہیں لیکن انہوں نے اس پر اصرار ضرور کیا ہے کہ فن و ادب کو جانچنے کے لیے ایسے خارجی
کی تلاش نقاد کا سب سے بڑا فریضہ ہے جو ادبی صداقتوں تک پہنچا سکیں جو تنقید کو دوسرے سماجی علوم کی سطح تک لا سکیں۔

صفحہ۔ ۲۳۲۔ اعتبارِ نظر:۔ بنے بنائے اصولوں پر عمل کرنا ہونا آسان ہوتا ہے لیکن اصولوں کو بنانا یا سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونا غیر معمولی ذہنی طاقت اور علم کا مطالبہ کرتا ہے۔ جب کوئی پڑھنے والا جو تنقید بھی کرنا چاہتا ہے، کسی تصنیف، کسی ادیب، ادب کے کسی شعبے پہ مجموعی حیثیت سے ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے ذہن میں بعض ایسے سوالات بیدار ہوتے ہیں جو بہت سی صورتوں میں تقریباً تمام نقادوں کے یہاں مشترک ہوتے ہیں، یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ نقادوں سے مُراد وہی نقاد ہیں جو کسی مخصوص اصول کی بنا پر نقد کرتے ہیں اور محض شارح کا فرض انجام نہیں دیتے ہیں۔ سوالات و جوابات پر تنقید کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ ان کی مکمل فہرست تو پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان خاص سوالات کا ذکر ضرور کیا جا سکتا ہے۔ جن سے اصولِ نقد مرتب ہوتے ہیں، جن سے ادیب اور نقادوں کے نقطۂ نظر معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ یہ سوالات نقاد کو بڑی الجھنوں میں ڈالتے ہیں۔ کیونکہ اس میں اس کے علم اور سماجی شعور، اس کے مقصودِ حیات کی آزمائش ہوتی ہے، یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب اور زندگی کے تعلق کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، وہ انسان دوست ہے یا نہیں، وہ تمدّن کی کن قدروں کو عزیز رکھتا ہے، اور انھیں انسانوں کے اندر عام کرنے کا آرزومند ہے۔ اسی لئے وہ خام مواد جس پر بہت سے نقاد کام کرتے ہیں تقریباً یکساں ہوتے ہوئے بھی مختلف بن جاتا ہے۔ وہ سوالات جن کے جواب پر اصولِ نقد کے تعین کا دارومدار ہے کیا ہیں؟

※

سیّد احتشام حسین

پسند تحریک نے اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ شاعری میں اس کے بہترین نمائندے فیض احمد فیض اور
فسانہ نویسوں میں کرشن چندر اور تنقید نگاروں میں سیّد احتشام کہے جاسکتے ہیں۔ اردو کا تنقیدی سرمایہ جناب کلیم الدین
مرحوم کو بہا کیوں نہ نظر آئے مگر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت اردو کا تنقیدی سرمایہ ہوتنا وسیع اور رفیع
ن کے لیے بھی قابل اعتماد ہوسکتا ہے۔ سید احتشام حسین اردو تنقید کے ایسے روشن منارے ہیں جن کی تابناکی موجودہ اور
ں کے لیے مشعل راہ کا کام دے گی۔

احتشام حسین ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے قصبے ماہل میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ عنفوان شباب ہی میں ان کے والد کا یکایک
انتقال ہوگیا۔ خود احتشام حسین بھی اس عارضے سے بڑی مشکلوں سے جانبر ہو سکے۔ مشن ہائی اسکول اعظم گڈھ سے میٹرک کا امتحان
سے پاس کرنے کے بعد الٰہ آباد چلے آئے۔ جہاں انھوں نے الٰہ آباد یونی ورسٹی سے اول درجے میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا
ف حاصل کیے۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار ہو گئے۔ جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے بہترین بائیس سال بسر کیے
کی ملازمت ہی کے دوران انھیں کو راک فیلر فاؤنڈیشن کی طرف سے امریکہ جانے کا موقع ملا۔ جہاں انھوں نے امریکہ کے عصری ادب
کا غور سے مطالعہ کیا۔ واپسی پر اپنی کتاب "ساحل اور سمندر" لکھی۔ جس میں امریکہ کے سفر کے متعلق اپنے تاثرات اور مشاہدات
یا ہے۔ یہ کتاب ادبی حلقوں میں بڑی پسندیدگی اور تحسین کی نگاہوں سے دیکھی گئی۔ ۱۹۶۱ء میں وہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ
ر اور صدر مقرر ہوئے۔ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو شدید قلبی دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ مگر اپنے پیچھے ادب کا ایسا ذخیرہ چھوڑ گئے
و ادب کے طالب علم ہمیشہ تحقیق اور رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

شام حسین اپنی ذاتی، اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ دل آزاری اُن کے مذہب میں گناہ تھی اور رواداری
اق اور دلجوئی ان کی شخصیت کے ایسے عناصر تھے جنھوں نے ایک زمانے کو ان کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ جوڑ توڑ اور سیاست گری سے وہ
ہتے تھے۔ پاسداری اور مروّت کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ اور اپنے اعلیٰ اخلاق سے بدترین مخالفوں کے سارے ہتھیار کند کر دیتے
صاحب کا علم اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ نہ صرف ادب بلکہ تاریخ، اخلاقیات، سماجیات، فلسفہ، رقص، نغمہ، موسیقی کوئی بھی
احتشام صاحب کو ہر ایک میں کچھ نہ کچھ درک ضرور تھا۔ ان کے تنقیدی مضامین کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام ہیں
زے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، تنقید اور عملی تنقید، ذوقِ ادب اور شعور، عکس اور آئینے، افکار و مسائل، اعتبارِ نظر
دو تیچ۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "ویرانے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نیز اردو ادب کی تاریخ بزبان ہندی بھی ان کے

سے ایک کتاب نکل چکی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر راداھا کرشنن، آسکر وائلڈ، سوامی وویکا نند اور رومن رولاں کی بعض تخلیقات کا اردو میں ترجمہ
کیا ہے۔ نیز "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ہے جس میں ہندوستانی لسانیات کی تاریخ اور تشکیل پر کافی
قدر معلومات اکٹھا کر دی ہیں۔

اردو میں تنقید کا سراغ یوں تو قدیم زمانے سے مل جاتا ہے۔ مگر اس کو ایک سائنٹفک نظریہ اور معروضی رویّہ دینے کا سہرا حالی
کے سر ہے۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری وہ پہلی کتاب ہے جس میں ادب کے افہام و تفہیم کی کوشش کے سلسلے میں بعض اصول اور نظریات کا ذکر ملتا ہے۔
احتشام حسین نے حالی کی روایت کو آگے بڑھایا اور ادب کو زندگی اور سماج کے رشتوں سے پرکھنے کی کوشش کی۔ ادب کا مقصد صرف لطف اندوزی
اور تفریح ہی نہیں ہے بلکہ اسے زندگی کی ابھرتی اور بڑھتی ہوئی قوتوں کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ ادب برائے ادب کا نظریہ فریب محض کے
سوا کچھ نہیں۔ ادب اور شاعری کی قدروں کو ناپنے کے لیے ایک ایسا پیمانہ درکار ہوتا ہے جو زندگی کی حرکتوں اور برکتوں پر معروضی نقطۂ نظر
سے غور کرنے کے لیے سماج کے پیداواری رشتوں کو اپنا سطح نظر بنا لیتا ہے۔ وہ برابر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ادب اگر ظالم اور لوٹ کھسوٹ
کرنے والے طبقے کی ذہنی عیاشیوں کا وسیلہ ہے تو اسے صالح ادب نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ صالح ادب وہ ہے جو زندگی کی ابھرتی ہوئی یا ہوتی ہوئی
امنگوں اور آرزوؤں کو فنکارانہ انداز میں پیش کر سکے۔ احتشام صاحب نے اردو تنقید کو جو فکری اور نظریاتی فلسفیانہ گیرائی عطا کی اس سے اردو
تنقید تقریباً نا آشنا تھی۔ وہ مارکسی نقاد تھے۔ مگر کٹرپن سے بالکل مبرا تھے وہ بعض دوسرے تنقید نگاروں کی طرح مارکس لینن یا اینگلز کے
نظریات کو انتہا پسندانہ انداز سے ادب کو پرکھنے کے لیے منطبق نہ کرتے تھے بلکہ ہندوستانی سماج اور ہندوستان کی تاریخ کے پس منظر کو بھی سامنے
رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کا جو جائزہ لیا ہے۔ اس میں توازن اور اصابت رائے کی کارفرمائی ملتی ہے مثال کے طور پر
نذیر احمد کو اردو کا پہلا اور اہم ناول نگار بھی تسلیم کرتے ہیں اور ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور کے بھی قائل ہیں۔ احتشام صاحب
کی بہت بڑی دین یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کے اصول مرتب کیے اور اس کا رشتہ تاریخ، سماج اور پیداواری ذرائع سے جوڑا۔ اور انھوں نے
اپنی بے شمار عملی تنقیدوں سے ان اصولوں کو عملی شکل میں پیش کیا۔ تنقید کو بہ حیثیت فن کے برتنے میں وہ پیش پیش تھے اور ادیب کے ذہنی
اور سماجی شعور کا تجزیہ کرنے اور کھرے کھوٹے کو الگ کرنے میں انھوں نے جگہ جگہ اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے ترقی پسند تحریک
کی انتہا پسندی کے زمانے میں جبکہ غزل کو قابل اعتنا اور فرسودہ سمجھنے کا رجحان پیدا ہو چلا تھا تو احتشام صاحب نے غزل کی بھرپور
وکالت کی اور کہا کہ غزل اگرچہ زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے مطالبات کی مکمل طور سے ترجمانی نہیں کر سکتی تاہم اپنے حدود و قیود میں
ہمارے احساسات، تجربات اور مشاہدات کی جو ایمائی تصویریں پیش کرتی ہے اس کی اہمیت کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔

احتشام صاحب فرائڈ کے جنسی نظریات اور لاشعور کے کرشموں یا تحلیل نفسی کے معجزات کے قائل نہ تھے اور نہ اس بات کے حامی
تھے کہ ادب کو سمجھنے کے لیے ادیب کے لاشعور کی کھوج لگانا ضروری ہے۔ اس طرح وہ مغربی ادب کی تمام تحریکات اور نظریات کے شناسا ضرور
تھے مگر فیشن پرستی کی رو میں بہہ جانا کبھی نہ گوارا کرتے تھے۔ وہ ترقی پسندی کو مقصود بالذات نہیں سمجھتے تھے بلکہ زندگی کی ان کشمکش
کی توضیح تشریح اور اظہار کا آلہ سمجھتے تھے۔ جن سے زندگی کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اپنے سفر امریکہ و انگلستان کے دوران مغرب کے جن ادیبوں
سے وہ ملے اور وہاں کی ادبی تحریکات کا جو مطالعہ کیا اس کے بعد ان کو یہ محسوس ہوا کہ امریکی نقاد ادب کی ادبی حیثیت پر تو زور دیتے
ہیں۔ لیکن سماجی بنیادوں پر فن کے تجزیے کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جبکہ احتشام صاحب کے خیال کے مطابق کسی فن پارے کو پرکھنے کے لیے اس کے
سماجی اور پیداواری رشتوں کے پس منظر کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ احتشام حسین کی تحریریں چونکہ گہرے فلسفیانہ خیالات کی حامل ہوتی ہیں۔ اس لیے
ان میں ایک سپاٹ اور بے رس انداز ملتا ہے۔ اکثر لوگ ان کی تحریروں کی خشکی سے بہت جلد اکتا جاتے ہیں۔ وہ تو رسنے تر شائے جملے

ورشاعرانہ زبان نہیں استعمال کرتے بلکہ اس کے بجائے ایک معروضی انداز میں اپنا نقطۂ نظر جس میں فلسفیانہ گہرائی ہوتی ہے
، ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریریں بوجھل اور ادق معلوم ہوتے لگتی ہیں۔ تاہم جن لوگوں نے احتشام صاحب کی تقریریں سنی ہیں
نغائی اور براہِ راست اثر انداز ہونے والے نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ احتشام صاحب کو ہندوستانی لسانیات سے بھی گہری
، یں انھوں نے بڑی دور رس تحقیقات کی ہیں اور خاصا مواد اکٹھا کر لیا ہے۔ احتشام صاحب نے کبھی کبھی کچھ اشعار بھی کہے ہیں۔
یہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ احتشام صاحب اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے بھی زبردست عالم تھے اور ہندی ادب پر ان کی بہت
، کے بعض معاصرین کا بیان ہے کہ وہ ہندی ادب کے بارے میں ایسے ٹھوس اور گہرے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار
اکے بڑے بڑے پنڈت اور مہا پرشوں سے بھی نہ بن پڑے۔

مارکسی نقطۂ نظر میں بھی انھوں نے جس توازن اور اعتدال کو پیشِ نظر رکھا ہے وہ ان کے معاصرین میں کسی کے یہاں نہیں ملتا۔
وکے ممتاز نقادوں میں ہیں اور وہ بھی ترقی پسند تحریک ہی کے پروردہ ہیں مگر احتشام صاحب اور ان کے نقطۂ نظر میں بین
ماحب کسی فن پارے کو پرکھتے وقت اس کا تجزیہ تو کرتے ہیں مگر وہ کسی واضح نقطۂ نظر تک قاری کی رہنمائی نہیں کرتے
ہے اور کچھ یوں بھی تک" قاری کا ساتھ دے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف احتشام صاحب کسی فن پارے کا تجزیہ
ے تاریخی عوامل اور سماجی رشتوں کی روشنی میں قاری کو ایک واضح نقطۂ نظر تک پہونچا دیتے ہیں۔ ادب کے بارے میں
اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

> قص نہیں ذریعہ ہے، ساکن نہیں متحرک ہے، جامد نہیں تغیر پذیر ہے۔ اسے تنقید کے چند فرسودہ اصولوں اور
> ی مدد سے نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ ہی کام آسکتا ہے۔ جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی
> قا، بالعضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔"

صاحب نے اردو کے ادبی سرمایہ کا جہاں بھی اور جب بھی جائزہ لیا ہے تو انھیں اصولوں کی روشنی میں لیا ہے۔ اس معاملے
ت واضح اور صاف تھا۔ نظریاتی کجی اور گنجلک پن ان میں نام کو نہ تھا۔ وہ ادب اور ادیب کے منصب کو سمجھتے تھے اور قاری
حوصلہ رکھتے تھے۔ احتشام صاحب کی جیسی تنقیدی بصیرت اور صلاحیت کم ہی لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔ بلاشبہ ان کی
ت اردو تنقید میں کوئی دوسری ابتک نہیں پیدا ہوئی۔ وہ اپنے فن کے امام تھے اور انھوں نے اردو کے تنقیدی سرمائے
ر اضافے کیے ہیں۔

صفحہ ۲۴۷۔ اعتبارِ نظر:۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہ کر سکے گا کہ ہندستان اور پاکستان دونوں طبقاتی سماج رکھتے ہیں۔ اور طبقاتی سماج میں عام طور سے ایک طبقے کے مفاد میں دوسرے طبقے کا نقصان پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس طرح سماج میں تضاد رونما ہوتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مختلف طبقوں میں بہت کم چیزیں مشترک رہ جاتی ہیں۔ اس واضح حقیقت کا شعور حاصل کرنے کے لئے کسی مخصوص علم اور بصیرت کی ضرورت نہیں۔ اس حقیقت سے انکار تو کرتے نہیں بنتا تو بعض ادیب اسے کمتر درجہ کی چیز سمجھ کر نظرانداز ضرور کرنا چاہتے ہیں، گویا ان کی چشم پوشی سے وہ حقیقت بھی مٹ جائے گی۔ ایسی صورت میں ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ ادیب جو طبقاتی کش مکش سے پیدا ہونے والی حقیقتوں کو نظرانداز کرتے ہیں وہ اس سماج اور اس کی کشمکش کو برقرار رکھنے کے حامی ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی دیانتداری، وسیع القلبی اور بلند نگاہی کا جھوٹا اثر ڈالنے کے لئے وہ اس کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے ان کے قدم زمین کو چھوتے بھی ہیں تو ان کا غصہ کبھی طنز کی شکل میں کبھی ذہنی برتری کے بھیس میں محکوم طبقہ ہی پر اترتا ہے۔ حکومت سے ٹکر لینے اس سے آنکھیں ملا کر اسے انصاف پر مجبور کرنے کی جرأت ان میں نہیں ہوتی۔ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے وہ اپنی خاموشی اور علاحدگی سے کس حد تک حکومت برطانیہ کے قدم مضبوط کرتے تھے اور آج اپنی وفاداری کے اعلان سے اپنی اپنی حکومتوں کی حمایت یعنی حاکم طبقہ کی حمایت کر رہے ہیں۔ اگر آج عوام برسراقتدار آجائیں تو یا تو ایسے ادیب خودکشی کر لیں گے یا پھر انھیں کے قصیدہ خوان بن جائیں گے۔

سیم علوی

فن تنقید اور احتشام حسین

فن نام گنانے کی بات ہو تو ایک دو نہیں بلا مبالغہ دو ایک درجن ایسے ادیبوں کے نام بتائے جا سکتے ہیں جن کو تنقید نگار کہا
پنے کو تنقید نگار کہلوانے کے خواہشمند ہیں مگر حقیقتاً دیکھا جائے کہ کون ایسا ہے جو کہ تنقیدی پرکھ اور شعور کا متحمل ہے اور
پرکار بند رہا ہے تو بڑی شرمندگی کا احساس ہوگا بمشکل تمام چند ہی نام مل پائیں گے یہ کوئی ویسی بات نہیں جیسی کہ عموماً
دے میں آنکھ بند کر کے کہہ دیا کرتے ہیں اور اس طرح اردو کو حقیر ثابت کر کے عالمی ادب سے اپنی واقفیت کا بے جا اظہار
یا ایک تلخ حقیقت ہے تنقیدی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر حالی سے لے کر عہد حاضر کے جدید سے جدید تر تنقید نگار پر نظر دوڑائیے
ت ہو جائے گی۔ صرف چند ہی ایسے ملیں گے جن پر آپ اعتماد کر سکیں گے۔ ان چند ناموں میں احتشام حسین کا نام یقیناً شامل ہے
س لیے کہ انھوں نے حتی المقدور تنقید کو مفید اور کار آمد بنانے کی کوشش کی بلکہ اس لیے بھی کہ انھوں نے اس کو بڑی ایمانداری
ں نے شعر کہا، سفر نامہ لکھا اور افسانے لکھے، ترجمے بھی کیے مگر جب تنقید کو اپنایا تو پھر اسی کے ہو رہے جس طرح دوسرے ادبا
تفریحاً یا کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے ایک آدھ تنقیدی مضمون لکھ دیا کرتے ہیں انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ایمانداری کی
تنقید کو ضرورت بھی ایک ہمہ وقتی (FULL TIME) شخص کی ہوا کرتی ہے یہ کسی جزو وقتی (PART TIME
نہیں کیونکہ جب تک تنقید نگار ہمہ وقت، ہمہ تن گوش نہ رہے گا وہ صالح تنقید کا حامل نہ ہو سکے گا۔ احتشام صاحب نے
بھی اور پھر اس پر تمام زیست عمل پیرا رہے۔

دو میں ایسے "ہمہ وقتی" سنجیدہ اور باوقار تنقید نگاروں کا بدقسمتی سے ہمیشہ سے فقدان رہا ہے جو تنقید کو ایک کارآمد فن کے طور
اور ایمانداری سے برت سکیں۔ احتشام حسین نے اردو تنقید کو تنقید کی صحیح منزل تک پہونچانے کے لیے اس کے بنیادی اور لازم
سختی سے پابندی اپنے لیے لازم کر لی کہ تنقید کو ایک مکمل فن اور تخلیقی عمل کا درجہ دے دیا گویا اس طرح انھوں نے تنقید کو ج
ے درجے (THIRD GRADE) کی چیز ہوا کرتی تھی ایک دم اول درجے FIRST GRADE کی بنا دیا اور یہ کوئی
دکھتی۔

نکار کی نظروں میں تنقید نگار مختار ہوا کرتے ہیں اس غلط فہمی کی بنا پر کہ تنقید نگار کا کام اس کی نگارشات کی عیب جوئی ہی کرنا ہے
مبث ہیں، احتشام حسین نے تنقید کو تنقیص سے بچا کر اس کو قاری اور فنکار دونوں کے لیے مفید بنایا اور اس طرح یہ باور کرایا کہ تنقید
ہوا کرتی کہ فنکار کی خامیوں کو اس طرح طشت از بام کیا جائے کہ وہ اپنی اور دیکھنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ ہو جائے بلکہ
یادی مقصد فنکار کو اسی کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف کرا کر بہتر سے بہتر ادب کی تخلیق کی راہیں ہموار کرنا ہوا کرتا ہے

احتشام حسین نے تحریر اور تقریر ہر ممکن طریقے سے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ تنقید کو صنفِ محض نہ تصور کیا جائے یا اس کو محض عیب جوئی کا فن نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی اہمیت و افادیت کو سمجھا جائے۔ اس کی قدر اس طرح ہو جس طرح کے دوسرے اصنافِ سخن کی ہوتی ہے۔

ایک طرح سے حالی نے تنقید کی راہوں کو ہموار کرنے کی طرف جو پہلے پہل قدم اٹھایا تھا احتشام حسین نے اس پر چل کر نئی سمتوں کی تلاش جاری رکھی اور یقیناً یہ اسی تلاش و جستجو کا ثمرہ تھا کہ انھوں نے تنقید کو تخلیق کا رتبہ بخشا اور اس کی بھرپور کوشش کی کہ تنقید کو محض عیب جوئی کا فن نہ سمجھ لیا جائے بلکہ یہ سمجھ کر کہ یہ ایک ایسا فن ہے جس کے بغیر بہتر ادب کی تخلیق ممکن نہیں اور قارئین بھی اس کی مدد کے بغیر عظیم فن پارۂ ادب کی قدر و منزلت سے آشنا نہیں ہو سکتے گویا تنقید قاری اور فن کار کے درمیان ایک ایسا مربوط رشتہ قائم کرتی ہے جس کے سہارے ادب کے اعلیٰ مدارج تک رسائی ممکن ہے۔

جہاں اردو کے ساتھ دوسرے قسم کی بدقسمتی کی باتیں منسلک ہیں وہاں یہ بھی ایک بدقسمتی رہی ہے کہ اس میں ہمیشہ ایسے ناقدین کا شمار رہا ہے جو ادیب اور قاری دونوں کے لیے مدد و معاون ہوں کوئی محض ادیب کا ہو کر رہ جاتا ہے تو کوئی قارئین کی طرف سے پیروی کرتا ہے۔ تنقید کے اصول تو ہمیشہ اور ہر عہد میں بہت ہی اعلیٰ اور ارفع رہے ہیں مگر ان پر عمل درآمد اور ان کو ایمانداری سے برتنے کی طرف بہت کم سنجیدگی سے غور کیا گیا اس کا سبب یا کہ ہمیشہ فن کار اور ناقد کے درمیان تناؤ رہا اور کبھی کبھی اس تناؤ اور کشیدگی کو خواہ مخواہ بھی قصداً پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کبھی اپنی عظمت کا سکہ جمانے کے لیے تو کبھی ادیب کو حقیر ثابت کرنے کے لیے اور یہ دونوں باتیں ادب کے لیے مضر رہی ہیں۔

حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ بے لاگ، بے باک اور اصولی تنقید کے دور کا آغاز کیا۔ شبلی نے اس کو علمیت اور وقار بخشا اس اقدام کی تائید کی اس کے بعد پیروی ہی ہوتی رہی کوئی نئی تلاش، نئی قدر یا نئی جہت مفقود رہی ناقدین کی فہرست میں ناموں کا اضافہ ہوتا رہا مگر منزل کی طرف قدم بڑھنے کی رفتار رفتہ رفتہ سست ہوتی رہی۔ تنقید ایک فیشن بن گیا ہر اس ادیب نے جو ذرا بھی شعور رکھتا تھا تنقید کو گھر کی باندی تصور کیا۔ ظاہر ہی ہے اس میں کون تنقید کے اصولوں کو مدنظر رکھتا اور کون اس بات کی فکر کرتا کہ ہر صفحے کے صفحے سیاہ کرنے کا کوئی بھی مقصد ہے یا نہیں۔ گویا تنقید کا کارواں اپنی منزل کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ اس طرح تنقید کے بجائے تنقیص ایک فن بن گئی اور اسی کو تنقید کے نام سے رائج رکھا گیا ہر شخص نے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے اس کو موزوں ترین طرز سمجھا۔ اس طرح تنقید کوئی باوقار فن کے بجائے ایک ایسا معیوب طرزِ تحریر ٹھہرا کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اس سے کنارہ کش رہنے لگے اور اس کا مطالعہ تضیعِ اوقات سمجھا جانے لگا۔

اگرچہ احتشام حسین کی تنقید نگاری پر بھی اعتراضات کیے گئے ہیں اور ہو بھی سکتے ہیں مگر یہ بات بڑے وثوق اور اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ احتشام حسین نے اس عہد میں فنِ تنقید کو صحیح معنوں میں جلا بخشی انھوں نے اس کو کوئی معمولی فن یا سرسری مشغلہ کبھی نہیں تصور کیا ان کی تحریروں کی سنجیدگی اس کی غماز ہے اور اسی سنجیدگی کے سبب وقار پیدا ہوتا ہے۔ کسی بھی تحریر میں سنجیدگی و وقار اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک کہ ادیب کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق نہ ہو اور احتشام حسین میں یہ دونوں خوبیاں موجود تھیں ان کو طرح طرح کے لوگوں سے ملنے اور سیر و سیاحت کا موقع اب تک کے اردو کے کسی بھی تنقید نگار سے کہیں زیادہ میسر ہوا اور وہ اس سے پوری طرح مستفید ہوئے۔

احتشام حسین کی شخصیت کا نمایاں وصف ان کا ذوقِ مطالعہ تھا اور وہ حدود و قیود سے یکسر مستثنیٰ تھا کیونکہ محض اردو کا مطالعہ نہیں بلکہ انگریزی، ہندی اور انگریزی کے توسط سے فرانسیسی، روسی، چینی اور جرمن اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے

پاروں کا مطالعہ ان کا ایک ایسا شوق تھا جس کی تکمیل کے لیے وہ ہمیشہ بیقرار رہا کرتے تھے۔ ہمارے بیشتر ادیب اور ناقد ہندوستان کی ترقی یافتہ زبانوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اس کے برعکس احتشام حسین جدید ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادیبوں سے رابطہ قائم رکھنا ضروری تصور کرتے تھے اور ان کے بڑے اچھے مراسم ملک کی مختلف زبانوں کے نئے اور پرانے ادیبوں سے تھے اور خود اردو کے جس قدر پرانے ادیبوں شاعروں سے واقف تھے اسی قدر نئے ادیبوں اور شاعروں سے واقف تھے بلکہ تو ان کو نئے ادیبوں سے زیادہ واقف پایا گیا اور یہ سب اس لیے تھا کہ وہ اس کے قائل نہیں تھے کہ کیا پڑھنا چاہیے اور کیا نہ پڑھنا چاہئے بلکہ ان کا کہنا تھا تنقید نگار کو سب کچھ پڑھنا چاہئے اس کے لیے اپنی زبان یا غیر زبان نئے ادب یا پرانے ادب کی کوئی قید نہیں۔ دراصل اس وقت تک تنقیدی شعور ہی نہیں پیدا ہو سکتا جبکہ تنقید نگار کے پیش نظر ہر طرح کی کتابیں کھلی نہ رکھی ہوں۔ آج کوئی روسی ادب پڑھتا ہے تو کوئی امریکی کسی کو چینی انقلاب سے دلچسپی ہے تو وہ چینی ادب کا ہی دلدادہ ہے لیکن ایسا کوئی نظر نہیں آتا جو سب کچھ پڑھے تقریباً تمام بستگی کے سبب نہیں بلکہ وسعت نظر کے لیے احتشام حسین میں یہ بڑی خوبی تھی۔ دراصل ان کے ذوقِ مطالعہ ہی نے ان کو اس مقام پر پہونچایا جہاں کہ وہ جلوہ گر ہیں اسی ذوق نے ان کو عالمی ادب سے بخوبی روشناس کرایا اور اسی کی بدولت وہ اردو کے ادبی فن پاروں کو عالمی پیمانے سے ناپ کر اس کی عالمی قدر و قیمت کا ہمیں صحیح اندازہ کرا سکے۔

تنقید نہ تذکرہ نگاری ہے اور نہ تحقیق کا دوسرا نام۔ ہاں اس کے ڈانڈے ضرور اس سے ملتے ہیں مگر عموماً اردو میں تذکرہ اور تحقیقی تحریروں کو بھی تنقید کا نام دے دیا جاتا ہے اس میں ادیب، قاری اور ناقد سب کا قصور ہے تنقید کو محض تنقید اور سب اصنافِ ادب سے جدا کرنے کی کوشش ہی بہت کم ہوئی جس تحریر میں ذرا بھی نوک پلک کی تراش خراش کی بات ہوئی اس کو یا سالی تنقید کا نام دے دیا گیا۔ احتشام حسین نے اس کمزوری کو بڑی شدت اور کرب سے محسوس کر کے تنقید کو تخلیق سے ہم آہنگ کر کے اس کو ایک باوقار اور بالکل جداگانہ صنفِ سخن قرار دیا۔ تخلیقی تنقید کے دور کی ابتدا انہیں سے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اردو میں پہلی بار احتشام حسین ہی نے تنقید کو ایک مخصوص فکر اور زاویہ نگاہ سے اس طرح وابستہ کیا کہ وہ سیاسی نظریے پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی نعرہ بازی سے دور رہی۔ یہ عمل ایک دشوار عمل تھا کہ کہیں جذباتی وابستگی کی بنا پر ایسا نہ ہو کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ادبی تخلیقات نظریات کی عینک پر فٹ نہ ہونے کے سبب خواہ مخواہ معتوب ہو جائیں۔ مگر احتشام حسین نے تنقیدی اصول اور وقار کو ہمیشہ پوری طرح برقرار رکھا۔ انھوں نے اکثر و بیشتر ایسی تخلیقات کو بھی ادبی حیثیت دلانے کی کوشش کی جو کہ مارکسی نقطۂ نظر سے گھٹیا، مخش اور بجر ہو سکتی تھیں یہ ایمانداری بسا اوقات احتشام صاحب کو مہنگی پڑی۔ مارکسی نقطۂ نظر رکھنے والوں نے ان کو متزلزل اور بھٹکا ہوا پایا مگر وہ تنقیدی اصولوں کے پوری طرح پابند رہے۔ کسی خاص نظریے سے وابستہ ہونا اور بات ہے اور تنقیدی اصولوں کی ایمانداری سے پاسداری کرنا اور بات ہے اس حقیقت کا احساس احتشام حسین کی تنقیدوں سے بخوبی ہوتا ہے۔

احتشام حسین کا کمالِ فن ہے کہ ان کے یہاں الجھاؤ اور بیت کا بے جا اظہار اور کہیں بھی کسی بھی تحریر میں جھنجھلاہٹ نہیں ـــــ اس کا خفیف سا احساس بھی نہیں ـــــ جبکہ اردو میں بیشتر ایسے ادیب موجود ہیں جو کہ اپنے کو ناقدین کے زمرے میں شامل کروانے کے لیے اس بری طرح چیر پھاڑ کرتے ہیں کہ یہ احساس شدت سے ہوتا ہے ان کے پیش نظر کوئی واضح اصول نہیں کوئی مقصد نہیں مطلب صرف ذات پھٹکار اور چیخ پکار سے ہے اور سب کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ سب جاہل ہیں اور وہی اکیلے قابل ہیں کسی نے کبھی عالمی ادب کے مزاج کو سمجھا ہی نہیں، انگریزی پڑھی ہی نہیں اس لیے چاہے جس انگریز شاعر یا ناقد کا نام چاہے جہاں رکھ کر یہ احساس پیدا کیا جائے اردو کے ادیب اور شاعر بالکل ہی نا اہل ہوتے

ہیں ان کے یہاں نہ فکر ہوتی ہے اور نہ تخیل۔ اس طرح کی حضرات نے اپنی عظمت کا ڈھنڈورا پنجیوں سے لوہا تو منوا لیا ہے مگر اس سے انہوں نے ادب کو کوئی خاطر خواہ فائدے کے بجائے نقصان پہونچایا ہے۔ احتشام حسین کے پیش نظر ایسے لوگ اور ان کی تحریریں ہمیشہ رہی ہیں اکثر نام نہاد ناقدین نے دوسروں کے ادبی شکستہ قلعوں سے ان سے یہی بات کی ہے مگر احتشام حسین نے تنقیدی وقار کو کبھی مجروح نہیں کیا کبھی اوچھے ترکش نہیں استعمال کیے۔ اور یہ بھی ان کی بڑائی کا ایک جزو لاینفک ہے۔

اردو تنقید نگاری کی تاریخ میں احتشام حسین کا نام ان کی فہم، متانت، ایمانداری، وقار اور صاف گوئی صاف ستھری دلنشین تحریروں کی بدولت زندہ رہے گا۔

اردو تنقید کی تھوڑی بہت پونجی میں احتشام حسین کی تحریریں گنج ہائے گرانمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ زندہ و پائندہ ہیں۔ اگر رشید احمد صدیقی کے لہجے میں کہا جائے تو احتشام حسین اردو تنقید کی آبرو ہیں۔

ع عارف

"تاجدارِ نقد و نظر ـــــ احتشام حسین"

اب روس دوبارہ ناکامیاب ہو کر تیسری بار پہلی جنگ عظیم کے دوران کامیاب ہوا اور کارل مارکس کے نظریہ کو عملی جامہ ہ داری روس کی بالشویک پارٹی نے لی جس کی قیادت لینن کے ہاتھوں میں تھی۔ مارکس کے نظریہ انقلابات نے جہاں مختلف کو متاثر کیا وہاں اس نے ایک عوامی ادب کی بھی داغ بیل ڈالی جو محنت کش طبقہ کی ترجمانی کرنے کا ذریعہ بنا۔
س کے انقلاب کے بعد جیسے جیسے اس نے زندگی کی دوسری دوڑ میں ترقی کی اور ملک آگے بڑھا، ادب میں عوامی اور جمہوری قدم جمتے گئے۔ یہاں تک کہ اٹھارہ بیس سال کے وقفہ میں اس نے یورپ میں بھی اپنے اثرات پھیلائے اور مشرق کے میں بھی اس کی آنچ محسوس ہونے لگی جو برطانوی سامراج سے اپنے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ان مشرقی ممالک میں ہندوستان بھی تھا جہاں کے جوشیلے، محب وطن اور تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اس آنچ کو محسوس کیا اور تاریخ میں سب سے میں مقیم ہندوستان کے چند نوجوانوں نے "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد ڈالی جو ابتداء میں سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ملک راج آنند اور ڈاکٹر جیوتی گھوش وغیرہ پر مشتمل تھی۔

سجاد ظہیر جو ہندوستان آکر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہے لندن کے اپنے ساتھیوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:-

"...... ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفہ کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کے سلجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں ہی رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کر کے تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے، اس نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہوتا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک لامتناہی تحصیل علم کی ابتداء تھی۔"

("روشنائی" از سجاد ظہیر۔ مطبوعہ لاہور)

لندن کے ان ترقی پسند مصنفین نے جو اعلان نامہ مرتب کیا تھا اسے ہندوستان میں بھی ادیبوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ منشی پریم چند جی نے اس تنظیم کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے رسالہ "ہنس" میں لکھا تھا کہ:-

"...... اس نے جو اپنا مینی فیسٹو بھیجا ہے اسے دیکھ کر یہ امید ہوتی ہے کہ اگر یہ انجمن اچھی راہ پر [illegible] ادب میں نئے دور کا آغاز ہوگا۔"

منشی جی نے اس کو مختصر کر کے "ہنس" کے اسی شمارہ میں شائع کیا تھا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :۔

"....... ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں پرانے خیالوں اور عقیدوں کی جڑیں ہلتی جا رہی ہیں اور ایک نئے سماج کا جنم ہو رہا ہے۔ ہندوستانی مصنفین کا فرض ہے کہ ہندوستانی زندگی میں جو انقلاب آ رہا ہے اس کی ترجمانی کریں اور قوم کو ترقی کی راہ پر چلانے میں مد ثابت ہوں۔ ہندوستانی ادیب نے قدیم کلچر کے تباہ ہو جانے کے بعد سے زندگی کی حقیقتوں سے جی چرا کر رومانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ بے روح اور بے جان ہو گیا ہے۔ صورت میں اور معنی میں بھی اور آج ہمارے ادب میں ویراگ کی بھرمار ہو گئی ہے۔ جذباتیت ہی کا مظاہرہ ہو رہا ہے فکر اور شعور کو تلانجلی دے دی گئی ہے۔"

(ہنس بنارس)

"..... پھر جب سجاد ظہیر نے (لندن سے واپس آکر ہندوستان میں) تنظیم کا کام شروع کیا تو انھیں جن لوگوں کا تعاون فوراً حاصل ہوا ان میں بھی اکثر کالجوں کے پروفیسر اور طلبا رہے۔ مثال کے طور پر انھیں الہ آباد میں جو ساتھی ملے ان میں احمد علی، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، پروفیسر سید احتشام حسین وقار عظیم، شیو دان سنگھ چوہان اور نریندر شرما شامل تھے۔"

(ترقی پسند ادب ــــ ایک جائزہ از ہنس راج رہبر صفحہ ۱۳۰)

ظاہر ہے کہ یہ زمانہ احتشام صاحب کی طالب علمی کا تھا مگر کثرت مطالعہ کی وجہ سے ان میں اچھا خاصا ادبی شعور پیدا ہو چکا تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین فرماتے ہیں۔

"....... مگر وہ انگریزی سے بھی کافی دلچسپی لیتے تھے اس کا مطالعہ برابر جاری تھا ادھر اُدھر سے بھی کتابیں لے آتے اور روزانہ گدڑی بازار جا کر پرانی کتابیں دیکھتے اور چن کر خرید لاتے۔ اپنی معلومات میں اضافہ کرتے اور ادبی ذوق کی تکمیل کی صلاحیت بہم پہنچاتے ...."

(ہماری دنیا صفحہ ۳۷۹۔ مطبوعہ ۱۹۶۶ء)

سنے طالب علمی کے ہی زمانہ سے ان کی شعری تخلیقات، افسانہ نویسی اور مضمون نگاری کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ وہ سمٹ کر تنقید پر مرکوز ہو گیا۔

ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر احتشام صاحب نے مارکس کے فلسفہ کو کس حد تک اپنایا، یہ ان کی نگارشات کے ہزارہا صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ نقد و انتقاد کیا ہے؟ اور ادب اور زندگی میں اس کی اہمیت کیا ہے یا سب سے پہلے اس ضمن میں جس نے اس کی معقول تعریف کی اور "ادب اور زندگی" میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی وہ میتھو آرنلڈ تھا۔ ادب جو اس نے تعریف کی ہے وہ آج تک ضرب المثل ہے۔ اس نے "ادب کو زندگی کی تنقید بتایا ہے" یہ اس جدید میلان کی رہنمائی کر رہی ہے جس نے کارل مارکس جیسے مفکر سے "کمیونسٹ مینی فسٹو" مرتب کرایا۔ نقد ادب کا تجزیہ کرنے کا نام ہے۔ وہ اقدار معین کرتی ہے۔ ادب و زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے اور اسی کسوٹی پر تخلیق پرکھی جاتی ہے۔ نقاد کا کام ہے تنقید میں انصاف کو برقرار رکھے۔

ناقد کیا ہے؟ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے جیسے افراد کی علمی اور مادی زندگی کو مربوط کرنے اور ان کے درمیان فاصلہ کو کم کرنے میں جہاں بڑی بڑی خود کار مشینوں نے اہم رول ادا کیا ہے بالکل اسی طرح دنیائے ادب و فن میں فنکار اور قاری کو قریب تر کرنے والا

نقد و نظر ادب میں جینز و لٹیننگ کی حیثیت کیوں اختیار کر چکی ہے! یہ چیز معاشرہ کے تمدنی ارتقار کے مطالعہ سے جانی ادب، قاری اور ناقد، سبھی معاشرتی رشتہ میں منسلک جہت سے آپس میں منسلک ہیں اس نکتہ کو پوری طرح سمجھے بغیر انسان کا، جس کا سب سے بڑا مظہر ادب ہے، کلیتاً واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

تنظیم کا مقصد تھا کہ اس کی "........ ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب، مزدوروں کسانوں اور درمیانہ طبقہ کی جانب استحصال کرنے والوں اور ان پر مظالم ڈھانے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حِس، حرکت، اور پیدا کرنا اور تمام ان آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت، پست ہمتی پیدا کرے........ ترقی پسند نوع انسانی سے دلچسپی اور گہری ہمدردی ضروری ہے۔ بغیر انسان دوستی، آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ...." (اقتباس از: روشنائی، لاہور اڈیشن صفحہ ۹۲)۔

احتشام حسین ترقی پسند تحریک سے بھرپور متاثر ہوئے اسی لیے ان کو شمار ان نقادوں میں ہوتا ہے جو حیات انسانی کی ارتقا کو سمجھے ہوئے تھے اور اس کی اصل و غایت کا صحیح تصور رکھتے تھے۔ اس نئے تصور کی اساس مارکس کا فلسفہ ہے اور اس کا تعلق مادی تمدنی تحریک سے ہے جو اشتراکیت کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ مارکس مادہ کی اولیت کا قائل تھا اسی بنا پر اس کا ملتا ہے۔ وہ مادہ کو تحریک بالذات مانتا ہے کیونکہ حرکت اس کی فطرت ہے اور تغیر، انقلاب اور ترقی اس کی دائمی غایت ہے اس لیے کہ یہ حرکت جدلیاتی ہوتی ہے یعنی ایک صورت خود اپنی تردید کرتی ہے اور اس تردید سے پھر نئی صورت پیدا ہوتی اول سے بہتر ہوتی ہے یہی اس کی ترقی پذیر شکل ہے۔

احتشام حسین ایک حقیقت نگار تھے اور فن کی تفسیر و تشریح جدلیاتی مادیت کے معیار سے کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے ان مندرجہ ذیل الفاظ میں یوں صراحت کی ہے:۔

"ان مضامین کا مصنف غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ادب مقصد نہیں، ذریعہ ہے۔ ساکن نہیں، متحرک ہے۔ جامد نہیں، تغیر پذیر ہے۔ اسے تنقید کے چند فرسودہ اصولوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ کام آسکتا ہے جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔ ان مضامین میں ایک پیمانہ شعور کو رہنما بنانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ میں ادب کو زندگی کے لیے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں۔" (اقتباس از دیباچہ تنقیدی جائزے)

ادیبوں کا ایک گروہ ترقی پسند تحریک سے ایک یہ مفہوم بھی نکالتا تھا گویا منجملہ اس کے اور مقاصد کے ایک یہ بھی ہے کہ ماضی سے رشتہ منقطع کر لیا جائے اور اسلاف کے کارناموں کو یکسر فراموش کر دیا جائے۔ مگر جب تحریک عام ہوئی تو آشکار ہوا کہ یہ خیال کیونکہ ترقی نام ہے تاریخی تسلسل کا اس لیے کہ ماضی کے بطن سے حال اور حال کے بطن سے مستقبل پیدا ہوتا ہے اور ترقی کی انھیں دونوں ستونوں پر کھڑی ہوئی ہے۔

میتھو آرنلڈ نے تنقید کا مقصد یہ بتایا ہے کہ "دنیا میں جو بہترین باتیں معلوم کی گئی ہیں۔ جو کچھ دنیا میں بہتر سے بہتر سوچا گیا ہے۔ تنقید کا اسے جاننا، معلوم کرنا اور پتہ لگانا ہے اور ان کو معلوم کرنے کے بعد دوسروں تک پہنچانا ہے تاکہ وہ نئے اور جدید نظریات و خیالات میں زیادہ سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہو سکیں۔" احتشام صاحب کی تحریریں اس کی شاہد ہیں کہ مندرجہ بالا خیالات کو انھوں نے ان میں خوبی سے برتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اپنے ذوق اور وجدان کے سہارے کسی ادیب یا شاعر کی روح میں اتر جانا آسان ہے لیکن اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے جانا اچھے نقاد ہی کا کام ہو سکتا ہے کیونکہ وہ داخلی کیفیت پذیری اور لذت اندوزی کی وہ لکیر بناتا ہوا نہیں چلتا جو اس کے گذر جانے کے بعد مٹ جائے بلکہ وہ علم کی روشنی میں ایک شاہراہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہی اصول اصول کہے جا سکتے ہیں جو صرف اصول بنانے والے یا اس کے چند ساتھیوں کے کام نہ آئیں بلکہ جو زیادہ سے زیادہ فضا کو روشنی دکھا سکیں جن میں انجان داخلیت اور ہر لمحہ بدلتے ہوئے وجدان کے سہارے منزلیں طے نہ ہوں بلکہ جن میں تاریخ، منطق اور دوسرے علوم سے مدد لی جائے تاکہ غلطی کے امکانات کم ہوں" (اصول تنقید — ادب اور سماج)

احتشام صاحب کا خیال یہ بھی تھا کہ ادب کو عوامی ہونا چاہئے اس لئے کہ وہ اجتماعی شعور کی پیداوار ہے۔ عہد بہ عہد اس میں اجتماعیت کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس کا میلان خصوصاً پہلی عالمگیر جنگ کے بعد سے شخصی سے جمہوری کی طرف بڑھتا رہا ہے بالکل اسی طرح جیسے تمدنی اور سیاسی نظام دن بہ دن جمہوری ہوتا گیا۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں :۔

"وقت کے ساتھ ساتھ یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تنقید کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن اور توانائی کو سمجھنے اور ابھارنے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح عوام کا رشتہ عوامی جدوجہد کرنے والی طاقتوں سے مضبوط ہوتا ہے۔ زندگی ادب کو سنبھالتی ہے اور ادب زندگی کو سہارا دیکر آگے بڑھاتا ہے۔ اچھے ادب کے مطالعہ سے انسان کا سماجی شعور بڑھتا ہے اور وہ سماج کو بہتر بنانے اور فطرت کو اپنے قابو میں کرنے کا اہل بنجاتا ہے۔ اگر کوئی ادبی کارنامہ یہ کام پورا نہیں کرتا اس میں مدد نہیں دیتا تو وہ صرف ان لوگوں کی نگاہ میں قیمتی ہوگا جو زندگی کو بہتر بنانے کے متمنی نہیں ہیں۔"
(تنقیدی جائزے)

ایک جگہ اور فرماتے ہیں :۔

"...... نقاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس نئے پن (ادب میں عوامی رجحان) کو انفرادی اور اجتماعی، نفسیاتی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھے تاکہ فنکار کے شعور کی تمام تہوں اور اس کی تخلیق کی تمام پیچیدگیوں کا جائزہ لینے کے بعد اس کے مقام اور قدر کا تعین کیا جا سکے۔ اسے سماجی حقیقت پسندی کا نقطۂ نظر کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ فرد، سماج، فرد کے سماجی شعور، ادبی روایات کی ابتداء اور ارتقا، ذوق ادب کی بدلتی ہوئی نوعیت، قومی شعور کی حقیقت کو جو ادیب یا اس کی تخلیق پر اثر انداز ہو سکتی ہے، نظر انداز نہیں کر سکتا۔" (عکس اور آئینے)

احتشام صاحب نے مارکسی نظریۂ ادب کو اپنا مرکزی خیال بنایا اور اسی پر وہ تمام عمر کاربند رہے۔ یہ بات ان کے پختہ عزم اور شعور کی محکم دلیل ہے۔ ان کے تنقیدی مقالات میں نظر کی گہرائی اور گیرائی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ان کی عالمانہ بصیرت کی دلیل ہے۔ ادبی فراخ دلی کے باعث وہ اردو ادب کو برابر تازہ ترین مواد سے مالا مال کرتے رہے۔ ان کی نگارشات میں جمود کے بجائے حرکت ہے ان میں ترقی کی نئی راہوں کی نشان دہی کا سلسلہ آخر تک برقرار رہا۔ ادب کے کارواں کو تیز گام کرنے کی زیادہ کوشش احتشام صاحب کے علاوہ کسی اور ناقد نے نہیں کی۔ اس خصوصیت میں وہ منفرد اور ممتاز ہیں اور اس علمی تنقیدی شغف نے ان کو اپنے ہم عصر نقادوں کے مقابلہ میں ترقی پسند ترین بنائے رکھا۔ یہ حقیقت ان کی عظمت اور ان کی تحریروں کی جاودانی کی ضامن ہے۔

سید مصباح الاسلام نقوی

پروفیسر احتشام حسین ایک محقق ایک ادیب

پروفیسر احتشام حسین صاحب شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے نہ صرف صدر تھے بلکہ ایک بہترین محقق اور اعلیٰ درجے کے ادیب بھی تھے۔ اردو تنقید نگاری پر انھیں نے جو کچھ لکھا اور جو کام کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، ان کی اہم تحریریں ان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ احتشام صاحب کا شمار بیسویں صدی کے ان اعلیٰ محققین میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب میں روایات سے ہٹ کر تحقیق و جستجو کے لیے نئی راہوں کی نشاندہی کی ہے۔ احتشام صاحب نے ادب کے دوسرے موضوعات پر لکھنے کے ساتھ ہی اردو لسانیات اور تنقید نگاری پر بھی لکھا ہے وہ چاہتے تھے کہ اردو ادب میں تنقید نگاری اسی درجہ پر پہنچ جائے جہاں مغربی تنقید ہے۔ انھوں نے مغربی و مشرقی تہذیب کے تصادم کا وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب کچھ ہندوستانی نئی تہذیب کو اپناتے جا رہے تھے اور کچھ لوگ ترقی و نئی تہذیب کی طرف بڑھتے ہوئے ہر قدم کو گمراہی سمجھتے تھے۔ احتشام صاحب نے جہاں ایک طرف نئی تہذیب و تعلیم کے اثرات قبول کیے تھے تو دوسری طرف اسلاف کے علمی ورثے سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے جب ہوش سنبھالا تو اس وقت مشرقی و مغربی تہذیبوں کی کشاکش کا دور قریب الاختتام تھا اور ادب میں نئے نئے خیالات و موضوعات تیزی سے جگہ پا رہے تھے۔ اب آئیے ذرا ان حالات اور مغرب و مشرق کے اختلاط کے اس دور پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں جس نے اردو ادیبوں کو نئے انداز سے لکھنے و سوچنے پر اکسایا۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کے ابتدائی دس سال اردو زبان و ادب میں ایک انقلابی درجہ رکھتے ہیں۔ یوں تو ۱۸۵۷ء کے بعد سے اردو ادب میں نئے نئے خیالات پیدا ہو چلے تھے لیکن قدیم رنگ اب بھی موجود تھا۔ غزل بھی اپنا مزاج بدلنے کے لیے کوشاں تھی۔ اردو نثر نگاری نے مختلف انداز سے حالات کی ترجمانی شروع کر دی تھی۔ مولوی نذیر احمد کی نثر نے اور سرسید احمد خاں کے مختلف موضوعات پر مضامین نے نثر نگاری کے لیے نئی راہیں ہموار کی تھیں تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے مغربی اثرات نے ادب کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ غزل کے قدیم رواج اور ماضی کی روایات کے ساتھ ہی عصری رجحانات کی حامل نظم بھی میدان عمل میں آ گئی تھی لمبی چوڑی داستانوں کی جگہ زندگی کی ترجمانی کرنے والی ناول نگاری نے جگہ لینا شروع کر دی تھی گو کہ وہ اس پایہ اور اس انداز کی نہیں تھی جیسی کہ آج ہے۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے ہندوستان میں سیاسی اور سماجی آزادی آ چلی تھی۔ اب ہندوستانی تہذیب، ثقافت اور تمدن کا حال وہ نہیں تھا جو جنگ آزادی کے پہلے یا بعد تھا۔ ادب زندگی اور اس کی جد و جہد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اسی عملی زندگی کا ترجمان اور اسی سے تعبیر ہے نئے حالات اور نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ادب بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ادب میں بھی نئے خیالات و نئے رجحانات داخل ہونے لگے۔ سرسید احمد خاں اور مولانا حالی انگریزی نظم کی پہلے ہی حمایت کر چکے تھے جس میں حسن و عشق، وصال و ہجر، رندی و سرمستی کے موضوعات کے علاوہ قدرتی مناظر موسم بہار و

روزمرہ اور زندگی میں پیش آنے والی صدا باتیں نظم ہوتی تھیں۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے اور اس طرف توجہ دلانے سے اردو نگاری کی ابتدا ہوئی جس میں قدرتی مناظر کے علاوہ روزمرہ پیش آنے والے واقعات کا ذکر ہوتا تھا نظم نگاری کے مقابلے میں ا میں بہت پہلے ہی سے نئے نئے خیالات جگہ پا چکے تھے۔ اب قریب قریب ہر موضوعات پر اردو نثر میں مضمون لکھے جاتے تھے۔ لیکن اس میں کچھ کمیاں تھیں جو آنے والے وقت اور ایسے اشخاص کی منتظر تھیں جو ان کمیوں کو دور کریں۔ اردو میں ناول نگاری کے لیے ر مولوی نذیر احمد ہموار کر چکے تھے بعد میں یعنی بیسویں صدی شروع ہونے کے بعد پریم چند جیسے کچھ ادیبوں نے افسانہ اور مختصر افسا شروع ہو گئے اگر کہ وہ ہو بہو مغربی طرز کے نہیں ہوتے تھے لیکن افسانے اور مختصر افسانے کی تعریف پر پورے اترتے تھے حتیٰ الفطرت عناصر کی کہانی قصے کی جگہ ہندوستان کی حقیقی زندگی اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات پیش کیے جاتے تھے، جو زندگی کے ترجمان تھے۔

یوں تو ادب میں بہت کچھ تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں اور کسی حد تک فن تنقید نگاری کی طرف دھیان دیا جانے لگا تھا۔ با طریقہ سے کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوئے کہ اردو ادب میں فن تنقید نگاری سرے سے بلکہ یہ فن اپنی ملی ہوئی صورت میں موجود تھا اردو زبان و ادب کے ارتقاء کے ابتدائی دور میں جب شعراء ایک دوسرے کے کلا کرتے تھے چاہے وہ کسی بھی انداز میں ہوتا ہو وہ بھی ایک طرح کی تنقید تھی، بعد کے دور میں بھی غالب و مومن تک یہ سلسلہ جا اور یہی صورت حالی نثر کی داستانوں کو پڑھ کر یا سن کر جو تبصرے کیے جاتے تھے وہ بھی تنقید ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزوں کے ر اقتدار میں آنے کے بعد جب دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا تو یہ چیز ذاتی اور زبانی تبصروں اور محفلوں سے باہر تحریری شکل میں ر اور دہلی کالج کے استاد ماسٹر رامچندر نے اپنے اخبار "فوائد الناظرین" میں اپنے ایک مضمون کے ذریعہ آخری مغل شہنشاہ بہادر شا غزل پر تبصرہ (تنقید) کیا جو مکمل طور پر ادب کی حدود میں تھا۔ بعد کے دور میں یہ سلسلہ جاری رہا ہے اور آگے چل کر مولانا حالی نے شعر و شاعری لکھ کر باقاعدہ طریقے سے ارباب ادب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور پھر اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے مغربی تنقید بہت بعد میں شروع ہوئی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ لیکن یہ تنقید آج بھی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکی جہاں پر مغ نگاری ہے۔ گو کہ اس میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے اور ارباب ادب اس کو اس منزل تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں جہاں پ تنقید ہے اردو زبان و ادب کی کم عمری اور ترقی کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں فن تنقید نگاری اس جگہ پہنچ جہاں پر مغربی فن تنقید نگاری ہے۔ ادب کی ایک دوسری شاخ جس کا زیادہ تعلق تحقیق سے ہے، علم اللسان ہے یورپ (LANGUISTIC) لسانیات پر بہت پہلے سے کام ہو رہا ہے اور وہاں کے محققوں نے اپنی مادری زبانوں (انگریزی۔ ف وغیرہ وغیرہ) کا رشتہ دوسری زبانوں کے ساتھ کیا ہے اس کو بہت پہلے ہی دریافت کر لیا تھا اس کے علاوہ انہیں نے دنیا کی دوسری زبا لسانی تعلقات اور رشتہ داری پر تحقیق کی اور اس میں وہ لوگ بہت زیادہ کامیاب رہے۔ اردو ادب میں لسانی تحقیق پر بہت ا دھیان دیا گیا۔ یہ بحث نامکمل رہ جائے گی اگر اس دور کا ذکر نہ کیا جائے جب سے اردو ادب میں ایک سوچے سمجھے طریقے خاص لوگوں نے نئے نئے موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب بھی۔ کچھ لوگوں کی اس کوشش میں شریک ۱۹۲۵ء کے بعد کا دور اردو ادب کے لیے ایک انقلابی دور تھا کیونکہ اس دور میں اردو ادب خود کو عصری رجحانات کے مطا سے ڈھال رہا تھا ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی تو اس گروہ کے لوگوں نے اجتماعی طور پر ادب میں موضوعات پر لکھنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے ایک طرف نظم و نثر میں "روٹی، روزی اور مکان" کے موضو

بد یائی تو دوسری طرف تنقید نگاری اور علم اللسانیات کی طرف توجہ کی گئی۔ ہندوستان کے اردو ادیبوں کے سامنے اب صرف عربی و فارسی
بان کے ادبی ذخائر ہی نہیں تھے بلکہ انگریزی زبان و ادب کے ساتھ دوسری مغربی زبانوں کی ادب کے مختلف موضوعات پر بہترین کتابیں
تھیں اس دور میں ایک طرف پریم چند، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، عزیز احمد، اپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ نے
اردو میں نئے نئے موضوعات پر افسانے لکھے تو دوسری طرف مجنوں گورکھپوری اور پروفیسر احتشام حسین صاحب وغیرہ نے اردو تنقید اور اردو
بان کی نشو و نما علم اللسانیات کی طرف پوری طرح توجہ کی۔ اور زندگی کے آخری لمحوں تک ان موضوعات پر لکھتے رہے۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی
سبب کے زیر اثر اردو ادب میں مغربی طرز کی تنقید نگاری کی طرف توجہ کی گئی۔ اس پر تحقیق و تحریر کا کام شروع ہوا اور یونانی فلسفی ارسطو کی مشہور
انہ کتاب "بوطیقا" کا اردو میں ترجمہ ہوا جس وقت ہندوستان میں تنقید نگاری کی ابتدا ہوئی اس وقت مغرب میں تنقید نگاری ارتقا کی
ست سی منزلوں کو پار کر چکی تھی۔ اب اس کا ایک موضوع نہیں تھا بلکہ متعدد موضوعات پر تنقید ہوتی تھی اور تنقید کی بہت سی شاخیں
پیدا ہو گئی تھیں جیسے سائنٹفک تنقید، کلاسیکل تنقید وغیرہ وغیرہ مغربی تنقید کے مطالعہ کے بعد اردو ادب میں بھی تنقیدی مضامین لکھے
گئے اور بہت سے صاحب قلم حضرات نے اس طرف توجہ دی کسی نے تنقید کے موضوع پر تھوڑا لکھا کسی نے بہت لکھا لیکن احتشام صاحب
نے تنقیدی تحریروں کے ساتھ ہی تنقید کے مختلف موضوعات پر خود لکھا اور دوسروں میں صحیح تنقید نگاری کی تحریک پیدا کرتے رہے ادب کے
میدان میں ان کی انتھک کوششوں اور عملی جد و جہد سے اردو زبان و ادب اور فن تنقید نگاری کو جو فروغ و ترقی حاصل ہوئی وہ کسی سے
پوشیدہ نہیں ہے احتشام صاحب نے تنقید کے ساتھ ہی اردو لسانیات پر بھی بہت ہی زیادہ تحقیق و تفتیش سے لکھا ہے اردو زبان اور
اس سے قریبی و دیرینہ تعلق رکھنے والی زبانوں کو یکجا کر کے اپنی کتاب "اردو لسانیات کا خاکہ" میں پیش کیا ہے۔

احتشام صاحب ایک کامیاب محقق اور بہترین ادیب ہونے کے ساتھ ہی ایک کامیاب استاد اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ احتشام
صاحب اپنی سنجیدہ تحریروں کی طرح خود بھی ایک سنجیدہ اور پر وقار شخصیت کے مالک تھے۔

آخری بار میں احتشام صاحب سے جون ۷۲ء کو ملا تھا جب وہ بھائی صاحب غلام احمد فرقت کاکوروی مرحوم کے گھر ایک دعوت
میں تشریف لائے تھے، لیکن آج نہ احتشام صاحب رہے نہ فرقت صاحب

کہاں ڈھونڈیں جن کو کھو دیا اے میر

بھائی صاحب غلام احمد فرقت کاکوروی مرحوم کے احتشام صاحب سے بہت گہرے تعلقات تھے ان کے انتقال کی خبر سن کر فرقت
صاحب نے جو اشعار کہے تھے انتقال کے بعد ان کی ڈائری میں ملے ان میں چند اشعار یہ ہیں۔

وہ احتشام جو علم و ادب کا حاصل تھا — سپہر علم پہ جو ایک ماہ کامل تھا
اسی کو چھین لیا مرگ ناگہاں تو نے — سواد نقد میں جو اک نشان منزل تھا

فرقت کو اس کا غم ہے ہر سال آہ وہ — کس کی کریں گے دعوتیں کس کو بلائیں گے
یہ سوچ کر حبیب کی آنکھیں ہیں اشکبار — ہر سال کس کو آم بلا کر کھلائیں گے

(غلام احمد فرقت کاکوروی) مرحوم

صفحہ ۴۷۵۔ اعتبار نظر،۔ یہ ان کے بتائے یا سکھائے جانے کی بات نہیں ہے کہ ادیب کو وفادار رہنا چاہیئے۔ یقیناً ادیب اپنی ریاست کے وفادار رہیں گے، مگر اس ریاست کے نہیں جو امن کی دشمن ہو جو ان کے خوابوں کو چکنا چور کر دے، جس کی حدوں کے اندر نفرت اور فرقہ پرستی کا زہر پھیلایا جائے، جس میں کھلم کھلا فاشزم کی اشاعت کی جائے وہ اس حکومت اور اس ریاست کے وفادار ہوں گے جو ان قدروں کو عزیز رکھتی ہے۔ جنھیں انسانی قدریں کہا جاتا ہے۔ جو عوام کے ہاتھوں حکومت کی عمارت کھڑی کرتی ہے۔ جو سرمایہ دار درندوں کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ لوگوں کا خون چوستے پھریں۔ جو بھوک اور بیروزگاری کا علاج کرتی ہے۔ جو غلط اردی پر ٹوکنے والے کو پھاڑ نہیں کھاتی، جو لوگوں کے نسلی مذہبی اور قومی جذبات بھڑکا کر انھیں مسلسل حقیقی حالات سے آنکھیں چرانے پر مجبور نہیں کرتی رہتی۔ یقیناً ادیب اپنی ریاست کے وفادار رہیں گے اگر وہ ان کی اپنی ریاست ہوگی، اگر وہاں محنت کرنے والوں کو محنت کا پھل ملے گا، اگر وہاں کے سارے بسنے والوں کو سچی جمہوریت، سچی تعلیم، روحانی ترقی، مادی خوش حالی اور قلبی آسودگی کی دولت دی جائے گی۔ وفاداری کے مطالبہ میں اور از خود اپنی ریاست کے لئے وفاداری کا جذبہ پیدا ہونے میں بڑا فرق ہے۔

ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ملک کے اندر آسودگی اور اطمینان کا مطالبہ کریں تاکہ باہر کے خطرے کے وقت فطری طور پر لوگ متحد ہو جائیں۔ ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے عالمگیر انسانی نظام کی تشکیل کی خواہش کریں جس میں کوئی ملک کسی دوسرے ملک کا دشمن نہ رہ جائے بکیاولی، نیٹشے، مولینی، ہٹلر، اور گوئبلز کی پیروی کرنے والے ادیبوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ انسان درندے نہیں انسان ہیں جو اپنے شعور اور اپنی کوششوں سے زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں اور بہتر بننے کی یہ خواہش فطری ہے۔ جو حکومت اور ریاست اس میں رکاوٹ ڈالے گی انسان اس سے ضرور غدّاری کریں گے۔ اخلاق اور مذہب کے واسطے، نسلی برتری کے جادو، غدّاری کے الزام، بیرونی خطروں کے بھلاوے عوام کو وفادار نہیں بنا سکتے۔ ایک ترقی پسند جمہوری نظام، آزادی ترقی، آسودگی اور امن کا احساس انھیں وفادار بنائے یہی عوام کی ضرورتیں اور خواہشیں بھی ہیں اور یہی ادیبوں کی بھی۔ اچھے ادیب کا انسان دوست ہونا ضروری ہے۔ حکومت دوست ہونا ضروری نہیں، وہ حکومت سے غدّاری کر سکتا ہے عوام سے غدّاری نہیں کر سکتا۔

اطمہ نقوی

دورِ احتشامی کی اُردو تنقید

اردو کے بہت بڑے ادیب و نقاد اور تاثراتی تنقید کے بہت بڑے رہنما مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ جملہ کہ "دورِ احتشامی سے
پہلے تنقید تھی کہاں" اپنے اندر بہت بڑی معنویت اور گہرائی رکھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کے کسی دور میں تنقیدی سرمایہ کو
ت اور عظمت نہیں مل سکی تھی جتنی صرف ایک نقاد پروفیسر احتشام حسین کے تنقیدی کارناموں سے حاصل ہو گئی۔ انھوں نے اردو
جو کچھ دیا وہ امتیازی طور پر ایک دبستان ایک مخصوص طرزِ فکر اور آج تک کے اہم ترین تنقیدی کارناموں کی شکل میں سامنے آگیا اردو
ائی تنقید اتنی سطحی اور معمولی ہے کہ اسے کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی اور پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں "جس طرح اردو شاعری
وں تک ایک بنے بنائے راستے پر چلتی رہی اور معاشی اور معاشرتی حالات نے زندگی کے سمندر میں کوئی طوفان نہیں اٹھایا اسی طرح
یہ پر بھی ایک جمود سا طاری رہا قوت نقد کا اظہار انھیں مقررہ اصولوں کے مطابق ہوتا تھا جو صدیوں سے چلے آرہے تھے" حالی تک
یہ تقریباً ایک ہی سے بنے راستے پر چلتی رہی شاعری کو تصنع اور بناوٹ تک محدود کر دیا گیا تھا۔ لفظوں کے حسن، محاورات کے
، بندش کی چستی انداز بیان غرض کہ شعر کی لفظی خوبیوں ہی کو فن کا معیار سمجھ لیا گیا تھا۔ اور اساتذہ انھیں بار یکیوں پر جان دیتے تھے۔
ے شعر و ادب کے تجزیہ کی یہی کیفیت قائم رہی۔ دراصل زوال آمادہ سماجی نظام میں کسی اہم تبدیلی کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی جس طرح
کا ہر شعبہ پرسکون انداز میں آگے بڑھتا ہے شعر و ادب بھی اس مناسبت سے چلتا رہتا ہے۔ سماجی زندگی کے ان مایوس کن حالات
ے اوپری سطحی زیبائش ہی لطف دے سکتی ہے۔ اردو شاعری کا سارا قدیم سرمایہ انھیں خصوصیات کا حامل ہے اور انیسویں صدی تک نئے
رتی نظام اور نئے صنعتی دور سے پہلے تنقید کا مقصد بھی یہی تھا کہ فن کی اسی خوبصورتی اور آرائش کو واضح کیا جائے

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستان کی سماجی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا ہوا۔ معاشی حالات میں شدید تبدیلیاں رونما ہوئیں،
رتی زندگی نئی راہ پر گامزن ہوئی۔ سرسید کی تحریک سے سماجی زندگی کی اصلاح پر زور دیا جانے لگا اور یہیں سے ادب اور شاعری سے
اضے شروع ہوئے جس میں محض حسن پرستی، زیبائش، لفظی بازیگری اور صنعت گری شامل نہ ہو بلکہ ہئیت کے ساتھ ساتھ مواد اور
بیان کے ساتھ موضوع کی اہمیت پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ حالی کا ذہنی شعور اسی منزل پر آگے بڑھا۔ انھوں نے یہی اصلاحی
رانیا کر نقاد کا فرض انجام دیا۔ لیکن وہ سب سے پہلے اہم نقاد ہوتے ہوئے بھی اردو کے سب سے بڑے نقاد نہ بن سکے۔
کا یہ جملہ کہ "خیال بغیر مادہ کے پیدا نہیں ہوتا" ایک نئی منزل کا پتہ ضرور دیتا ہے لیکن ان کی تنقید مشرقی اور مغربی نقادوں
ب بن کر رہ گئی ان کے تنقیدی نظریات بعض جگہوں پر شیفتہ کے خیالات سے قربت رکھتے ہیں اور بعض جگہ مغربی تنقید سے
ل خاص کر ملٹن سے۔ حالی کے خیال میں شعر کی تاثیر مسلم ہے اور اس سے سیاسی معاملات میں بڑے بڑے کام لیے جاتے رہے ہیں۔

یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ حالی نے شاعری کو سماجی زندگی کا ایک جز مان لیا تھا وہ شاعری میں افادیت اور مقصدیت کے قائل بھی ہیں۔ انھیں نظریات کی بنیاد پر حالی نے اردو شاعری کے سارے ذخیرے کو پرکھ کر مختلف اصنافِ سخن کی اصلاح کے متعلق اپنے خیالات پیش کیے۔ سرسید کے اثر سے انھوں نے انگریزی ادب اور زبان کے نقادوں کا جو مطالعہ کیا تھا اس نے بھی ان کے خیالات کی وضاحت میں بڑی حد تک مدد دی۔ کلیمی کے الفاظ میں مولانا حالی معلم تھے اور اسلامی اخلاق کے علم بردار" یہی وجہ ہے کہ ادبی تجزیہ پر زور دینے کے باوجود جب وہ غزل کی اصلاح کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کا یہ پہلو پس پشت رہ جاتا ہے اور ان کا انداز قدیم تذکرہ نویسوں سے قریب آجاتا ہے۔ البتہ انھوں نے تاریخی تغیرات اور سماجی زندگی کے تقاضوں کو جس طرح شامل کیا وہ اپنی جگہ پر غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

حالی نے مغربی تنقید کے مطالعہ کو جو جگہ دی تھی اس سے تنقیدی ادب میں کئی شعبے ابھر کر سامنے آئے۔ کچھ نقادوں نے تشریحی انداز کو اپنایا۔ بعض نے تاثراتی اور جمالیاتی پہلوؤں کو اہمیت دی۔ چند نقاد ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے فرائڈ سے متاثر ہو کر تحلیل نفسی کی بنیاد پر شعروادب کو پرکھا لیکن یورپ میں جب مارکس کی جدلیاتی مادیت اور میتھو آرنلڈ کا یہ نظریہ ابھرا کہ شاعری زندگی کی تنقید ہے تو یہیں سے جدید تنقید نگاری کی وہ منزل شروع ہو گئی جس نے آج تک کے اردو تنقید کے سب سے بڑے رہنما احتشام حسین کو جنم دیا۔ لیکن احتشام صاحب ہی کے الفاظ میں "ادب میں رہنمائی اس طرح نہیں ہو سکتی جیسے پیغمبر اپنی اُمت کی، پیر اپنے مریدوں کی، یا سپہ سالار اپنے سپاہیوں کی کرتے ہیں۔ اس میں سیاسی رہنماؤں کی جذباتی اور شخصی اپیل کا سوال بھی نہیں ہے یہ رہنمائی معمار اور قدر اکی باہم جستجو کی شکل میں ہوگی۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش میں ہوگی کہ کیا چیز کس سے بہتر ہے۔ راستوں کو ہموار کر کے اندھیروں کو چراغ جلا کر اچھی اچھی باتیں کرتے ہوئے اپنے ساتھ چلنے کی کوشش ہی میں اچھا ادب پیدا ہوگا۔ اعلیٰ فنکار نقاد کو نیچے گرنے سے بچائے گا اور اعلیٰ تنقید نگار بلند نگاہی اور ریاضت پر اکسائے گا" اور موجودہ دور میں احتشام صاحب میں یہ ساری خصوصیات پوری طرح موجود ہیں۔

احتشام حسین کو اپنی تنقید نگاری کی منزل کی طرف قدم بڑھانے کے لیے بہت سے نظریات اور روایات سے سابقہ پڑا لیکن انھوں نے ایک ایسا مکمل اور واضح نقطہ پیش نظر کیا جو انھیں رجحانات کی پیروی کرنے والے بہت سے دوسرے نقاد نہ کر سکے۔ احتشام حسین سے پہلے اختر حسین رائے پوری، پروفیسر احمد علی اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ ادب اور زندگی کے رشتہ پر توجہ دلا چکے تھے لیکن احتشام حسین نے نہ صرف زندگی اور ادب کے تعلق تک پہنچنا محدود رکھا بلکہ ان کے خیال میں ادب کی اس حیثیت کو سمجھنا۔ ادیب کے ذہنی سرچشموں کا سراغ لگانا، سماج کے ذہنی ارتقا کے مطابق فنی ارتقا کی توضیح کرنا اور قوم کی تہذیبی زندگی میں ادب اور ادیب کے مقام کا تعین کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ اور انھیں خیالات کو عملی جامہ پہنا کر انھوں نے اردو شاعر اور ادیب کی شخصیت اور فن کو نئی حیثیت سے متعارف کرایا۔ بظاہر ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے نقادوں میں سجاد ظہیر، سردار جعفری، ممتاز حسین یہ سب ایک ہی نقطہ نظر کی ترجمانی کر رہے تھے لیکن ان میں احتشام حسین کی عملی تنقید اور نظریاتی مباحث نے اس تحریک میں ایسی توانائی اور زندگی بھر دی کہ اس نے سارے اردو ادب کو اپنے اندر سمیٹ لیا اور خود اُن کی ادبی اہمیت سارے ادب پر چھا گئی۔

احتشام حسین کی تنقید نگاری کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اگر صرف ان پہلوؤں پر توجہ دی جائے کہ اس میں فن پارے کے حسن و عیوب کس طرح پوری طرح سامنے آجاتے ہیں، اس کے ادبی مقام کا تعین ہو جاتا ہے، وہ روحِ عصر کی کروٹوں کی پوری عکاسی کر دیتے ہیں، زبان و اسلوب کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، ادبی حسن کی آمیزش نے ان کی تنقید کو تخلیق کی منزل تک پہنچا دیا ہے یا مغربی ادب اور علوم کے گہرے مطالعہ کے باوجود وہ جدید تصورات پیش کرتے ہوئے اپنی قدیم روایات سے یکسر انحراف نہیں کرتے اور اس طرح قوم و ملک کے بدلتے ہوئے حالات کو شامل کر کے نئے امکانات کی آمیزش کرتے ہیں۔ تو محض انھیں پہلوؤں کی وضاحت سے یہ دعویٰ پورا نہیں ہو سکتا کہ احتشام حسین کی تنقید نے ساری علمی و تخلیقی

یا موڑ پیدا کر دیا اور اپنی تنقیدوں سے ایک ایسے دور کی بنیاد ڈال دی جس کے بغیر اردو تنقید اپنی موجودہ حیثیت سے نہ معلوم کتنی پیچھے ہوتی اور اس کا مستقبل معلوم کتنے اندھیروں میں گم رہتا۔ اپنی تنقید نگاری کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے احتشام حسین صاحب نے ذوق ادب و شعور کے ایک مضمون میں "کیوں لکھتا ہوں" میں لکھا ہے کہ:

"بہ حیثیت نقاد کے میں ادراکِ حقیقت کے عام اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے (جو متعدد علوم کی مدد سے ہاتھ آئے ہیں) اس کی جستجو کرتا ہوں کہ کسی تصنیف کی اہمیت واضح کر سکوں، خود سمجھ اور دوسروں کو سمجھا سکوں۔ ادبی روایتیں کس طرح بنتی ہیں، ان کا تسلسل کس طرح قائم رہ سکتا ہے اور کس وجہ سے ٹوٹتا یا بدلتا ہے اور پھر یہ کہ کوئی تصنیف ایک ادبی روایت میں کون سا مقام رکھتی ہے۔ ادب کے فنی اور جمالیاتی عناصر کا تجزیہ اور ذوق کے ارتقا اور نشو و نما کی تاریخ بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ پہلو ادب کی اثر پذیری میں اضافہ کر کے مصنف اور قاری کے رشتہ کو مضبوط کرتے ہیں..... میں یہ حکم نہیں دیتا کہ یہ لکھو یہ نہ لکھو، لیکن اسے اپنا حق سمجھتا ہوں کہ کسی لکھی ہوئی چیز کے متعلق یہ بتا سکوں کہ اس میں کیا خوبیاں اور خامیاں ہیں، کس طرح لکھنا بہتر ہوتا، دوسروں نے کس طرح لکھا اس کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے کیا وجوہ ہو سکتے ہیں اور زندگی کی کس قسم کی قدروں کو ایسی چیزوں سے فائدہ پہنچے گا اور کس سے نقصان۔"

چنانچہ انھیں چیزوں کو بنیاد بنا کر احتشام حسین نے ادیبوں کے ذہن تک رسائی حاصل کی، تخلیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کی، عام پڑھنے والوں کو شعر و ادب سے فائدہ پہنچایا اور سب سے بڑی بات یہ کہ شاعر و ادیب کی تخلیق میں محض خامیوں پر توجہ نہ دی بلکہ اس پہلو کے مطالعہ پر زیادہ دھیان دیا کہ وہ کون سے سماجی اثرات تھے جن کے سبب کوئی غیر معیاری اور کمتر درجہ کی تخلیق وجود میں آئی۔ اس طرح انھوں نے تنقید کو محض ذوقی، وجدانی اور جمالیاتی دائرہ سے نکال کر علم اور فلسفہ کے حدود میں داخل کیا جس سے پڑھنے والوں کے ذوق و شعور کو وسعت بھی ملی اور ان کی حیثیت ایک ایسے رہنما کی بن گئی جو قاری اور شاعر و ادیب کے ذہن کی تربیت کے ساتھ ساتھ عوام کے ذوق کو متاثر بھی کر سکے۔ ——— احتشام حسین کی تنقیدوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ادب کو تہذیبی ارتقا کا جز بنا کر پیش کیا یعنی ان کے تنقیدی مضامین میں ہندوستان کی سماجی زندگی کے اُتار چڑھاؤ، انسانوں کی عام جد و جہد اور ان کی کامیابی اور ناکامیوں کی پوری تصویر دیکھی جا سکتی ہے خاصکر موجودہ دور کی ذہنی حالت، عوام کے علم و شعور اور سماج کے صحت مند و غیر صحت مند سبھی پہلوؤں پہ گہری روشنی پڑ جاتی ہے اس طرح ان کی تنقید نگاری نہ صرف شعر و ادب کے حُسن و قبح کے مطالعہ تک محدود رکھتی ہے بلکہ تاریخ کے مطالعہ کا بہت بڑا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ ——— بیسویں صدی نے اردو تنقید میں بہت بڑا سرمایہ پیدا کیا، تنقید نگاری کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرنے والوں کی بڑی تعداد سامنے آئی جن میں بہت سے ایسے تھے جو حالی آزاد اور شبلی کی پیروی کرنے تک محدود رہے بعض نے اپنے لیے مغربی اصولوں کو مشعل راہ بنایا، کچھ نے جدید رجحانات سے متاثر ہو کر نفسیاتی، تاثراتی یا جمالیاتی نقطہ نظر پر توجہ دی اور عام طور سے نقادوں کی بڑی تعداد ایسی بھی تھی جس نے کسی مخصوص رجحان کے بجائے ملے جلے پہلوؤں کو تجزیہ کا جز بنایا۔ ایسی حالت میں تنقیدی تاریخ میں بہت سے نام ضرور نظر آتے ہیں لیکن کوئی نام ایسا نہیں حکمتا جس کی روشنی دیر تک قائم رہے۔ یہ کمی عام طور سے اسی لیے محسوس ہوتی ہے کہ شاعر و ادیب کی تخلیق نے عوام اور تہذیبی زندگی کے ذہن کو جھنجھوڑ کر کس طرح جذبات و احساسات میں ہلچل پیدا کی ہے۔ عام طور سے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس پہلو کی طرف صرف احتشام حسین نے توجہ دی جن کے انداز نقد میں ادب کی تعمیر و تشکیل اور شعرا و ادیب کی ایسی رہنمائی ملتی ہے جو کسی دوسرے سے نہ ہو سکی۔ انھوں نے نہ صرف صالح ادب کی پیدائش میں مدد دی بلکہ اردو تنقید کو اس الزام سے بچا کر کہ یہ حالی اور شبلی سے آگے نہیں بڑھی اُسے عالمی معیار نقد کے برابر لا کھڑا کیا۔ احتشام حسین کی یہ بہت بڑی دین ہے اور آج اردو نقاد ان کی تقلید کیے بغیر کوئی قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ انھیں پہلوؤں پر دھیان رکھ کر کسی نے انھیں داد دی تھی کہ "تاریخ ساز اور مفکر ادیب بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ" انھوں نے نہ صرف اقدار و معانی کے پودے لگائے بلکہ انھیں اتنا پروان بھی چڑھا دیا کہ ان پیڑوں پر لگے ہوئے پھلوں کا ذائقہ سارا معاشرہ چکھ سکے" اور ان خیالات کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

صفحہ ۱۹۴۔ اعتبار نظر :۔ سب سے زیادہ جو بات انسان کی راہ میں حائل ہوتا ہے وہ آباؤ اجداد کی تقلید اور رسم و رواج کی پیروی کا بت ہے۔ جس نے توڑ لیا اس کے لئے آگے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ وہ فرد کی حیثیت سے پالی صلاحیتوں کو خود کام میں لاکر نئی زندگی کی تخلیق کر سکتا ہے۔ کہنے کو یہ تو یہ ایک خیالی بت ہے لیکن غور و فکر ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی ساری نوعیت اس سے بدل جاتی ہے اور ذہنی غلامی مادّی اور جسمانی غلامی سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ غالبؔ نے اسے خوب سمجھا تھا اور بار بار اس کے ٹکڑے اڑائے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ عقل و خرد رکھنے والے بھی تقلید ہی کے دائرے میں چکر کھاتے رہتے ہیں اور جب تک یہ پابندی ہے کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا۔ غالبؔ نے اپنے ایک مشہور فارسی شعر میں اعتراض کرنے والوں کو متنبہ کیا ہے کہ میری بے راہ روی پر مجھ سے نہ الجھو، حضرت ابراہیم کو دیکھو، جب کوئی صاحب نظر ہو جاتا ہے تو اپنے بزرگوں کی راہ سے ہٹ کر نئی راہ بناتا ہے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

ترقی پسند ادب کے میر کارواں
پروفیسر احتشام حسین

سید احتشام حسین صاحب سے میری پہلی ملاقات گورکھپور یونی ورسٹی میں جشن غالب صدی کے سلسلے میں ہوئی۔ وہ سادگی کا ...قمیض اور پتلون میں ملبوس۔ چہرے پر ایسا سکون جیسے صدیوں سے تفکر کا گزر ہی نہیں ہوا۔ ادھر تقریریں ہو رہی تھیں۔ بحث و ...ثہ چل رہا تھا۔ ادھر وہ اپنے کام میں مشغول تھے۔ جب جلسہ کو خطاب کرنے کی باری آئی بغیر کسی تیاری کے تقریر کرنا شروع کر دیا ...یک گھنٹے سے زیادہ بولتے رہے۔ سلجھے ہوئے خیالات، الفاظ اور جملوں کا تسلسل، روانی اور سنجیدہ لہجہ۔ اس کے بعد وہ اکثر کسی نہ کسی ...سے گورکھپور یونیورسٹی آتے رہتے اور ملاقات ہوتی رہتی۔ پروفیسر صاحب سے میری آخری ملاقات ۲۴ مارچ ۷۲ء کو ہوئی جبکہ ...شن فراق کے سلسلے میں یونی ورسٹی تشریف لائے تھے۔ جشن فراق میں یوپی کے گورنر اور آل احمد سرور صاحب بھی تشریف لائے۔ تھے فراق ...پوری کی موجودگی ہم لوگوں کے لیے باعث فخر تھی۔ ۸ بجے رات کے قریب احتشام صاحب جلسہ سے اٹھ کر الہ آباد والی گاڑی پکڑنے ...لیے اسٹیشن چل دیے۔ اس کے بعد اس عظیم شخصیت سے ملنے کا کوئی اتفاق نہ ہو سکا اور صد حیف وہ اس دنیائے فانی سے ...کر گئے ؎

اک اور سخن فہم و سخنداں نہ رہا — نقاد تھا بے باک احتشام حسین
کس طرح قرار آئے دل مضطر کو — ہیں آپ تہ خاک احتشام حسین

۱۹۷۲ء

احتشام صاحب ماہل ضلع اعظم گڑھ میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی تعلیم قصبہ ماہل اعظم گڑھ (یوپی) اور الہ آباد ...ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں ۲۴ سال کی عمر میں انھوں نے الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں ان کا تقرر ...کی حیثیت سے لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں ہو گیا تھا۔ چھریرے بدن پر شیروانی اور پاجامہ پہنے ہوئے وہ استاد ...طالب علم زیادہ لگتے تھے، لیکن اپنی ذہانت قابلیت اور وسیع مطالعہ سے انھوں نے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں نمایاں جگہ حاصل ...تھی۔ یونی ورسٹی جاتے اور واپس ہوتے وقت "دانش محل" میں ضرور رکتے تھے۔ اور کبھی کبھی رات کے آٹھ بجے جاتے ...عر و ادب کی نشستیں بھی رہتیں۔ کچھ دنوں کے بعد حلقہ احباب دانش کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں ترقی پسند اور قدامت پسند ...ب دونوں شریک تھے۔ ان محفلوں میں یگانہ صاحب اور اثر لکھنوی بھی تشریف لاتے۔ اور احتشام صاحب کا کلام ...دلچسپی سے سنتے۔ ترقی پسندوں میں سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر اور دوسرے لکھنے والے شریک ہوتے۔ ۱۹۵۳-۵۴ء میں انھوں ...یورپ اور امریکا کا سفر کیا۔ ان کو امریکا کا راک فیلر کا وظیفہ صد ہا ڈالر کا ملا۔ لیکن وہ ایک سال کے اندر ہی وہاں کی [illegible]

تہذیب اور زندگی سے عاجز ہو کر واپس چلے آئے۔ وہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو و فارسی کی حیثیت سے بھی بہت کامیاب رہے اور شعبہ میں ریسرچ کی کارکردگی بہت منہ مندی سے چلاتے تھے۔

احتشام صاحب کی نمایاں خوبی ان کی سادگی اور بھولا پن تھا۔ وہ مخاطب کو اپنی علمیت اور شخصیت سے مرعوب نہیں کرتے تھے بلکہ متاثر کرتے تھے اور ان میں نہ احساس برتری تھا نہ احساس کمتری وہ گفتگو کے دوران مخاطب کو یہ نہیں معلوم ہونے دیتے کہ اردو کے ایک بڑے ادیب اور چوٹی کے نقاد ہیں۔ وہ چھوٹے گھر میں پرورش پانے والے بڑے آدمی تھے۔

پروفیسر احتشام حسین صاحب نے گنجینہ ہائے ادب کو اپنی تصانیف سے بیش بہا خزانہ بخشا ہے۔ احتشام صاحب نے قدیم و جدید اردو ادب، زبان اور ہندوستانی لسانیات پر متعدد تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں "عکس اور آئینے" "تنقیدی جائزے" "روایت اور بغاوت" "ادب اور سماج" "تنقید اور عملی تنقید" "ذوق ادب اور شعور" "اعتبار نظر" "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ احتشام صاحب نے ادب اردو کی تاریخ ہندی زبان میں لکھی۔ اور بچوں کے لیے "اردو کی کہانی" بھی ان کی تصانیف میں شامل ہے انھوں نے اردو ادب کے بارے میں انگریزی میں بھی مضامین لکھے۔ ان کے افسانے کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ اور "ساحل اور سمندر" سفرنامہ احتشام صاحب کا تخلیقی شاہکار ہے۔

احتشام صاحب ادب برائے زندگی کے نظریے کے حامی تھے۔ اور مارکس کے پیروکار تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے ان کا تعلق آخری دم تک رہا۔ انھوں نے اپنی کتاب "روایت و بغاوت" میں لکھا ہے۔ "اعلیٰ ادب اور اعلیٰ مقصد کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن اور توانائی کو سمجھنے اور اسے ابھارنے میں مدد ملتی ہے۔ زندگی ادب کو سنبھالتی ہے اور ادب زندگی کو سہارا دیتا ہے"۔ انھوں نے فکر و فن کے لیے ترقی پسندی کی جو راہ اپنائی تھی اس پر عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ غیر جذباتی انداز میں ہمیشہ گامزن رہے اور ادبی جلسوں میں دوستوں اور حریفوں کے اجتماع کے درمیان اپنی تقریروں اور تحریروں سے ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ ان کی تنقید بے لاگ ہوتی وہ بیک وقت اردو۔ ہندی اور انگریزی زبانوں کے عالم تھے۔ فلسفہ، معاشیات تاریخ اور ادب پر انھیں عبور حاصل تھا۔ ان کا مضمون کسی ضخیم کتاب پر بھاری ہوتا تھا۔

اک قافلہ سالار تھا تو نقد ادب کا ... یہ قافلہ اب دیکھیں کہاں جائے کدھر جائے

اردو ادب میں ایسے تو بہت سے ناقد پیدا ہوئے لیکن ان کی تنقید کا کوئی اصول نہ تھا اور نہ کوئی اپنا طرز۔ یہ احتشامی تنقید کی دین ہے کہ انھوں نے تنقید کو بحیثیت فن، اصولوں اور آدرشوں سے سنوارا اور مغرب کے اصولوں کی روشنی میں پروان چڑھایا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اس سلسلے میں اس طرح لب پیرا ہیں۔

" اردو میں ناقد تو پہلے بھی بڑے بڑے ہو چکے تھے اور سخن فہم و سخن سنج حالی اور شبلی کے جیسے گزر چکے تھے۔ لیکن وہ سخن فہمی تمام ذوقی و وجدانی تھی۔ کسی ترکیب کی ندرت پر جھوم اٹھے کسی فقرے کی نزاکت پر داد کے ساتھ دل دے بیٹھے۔ لیکن تنقید بحیثیت فن کے دور احتشامی سے قبل اردو میں کہاں سے آئی تھی اور تنقید کی اصولی بحثیں مغرب سے لا کر مشرق کے مدرسوں میں کس نے پھیلائی تھیں۔ یہ نئے رنگ نئے وضع کے گل بوٹے۔ لیستان مشرق میں کس نے کھلائے تھے۔ یہ نئے سبق اپنے ہم وطنوں کو کس نے پڑھائے تھے؟"

میرا بھی اپنا خیال ہے۔ جو ادب زندگی کو سنوار نہ سکے وہ بالکل بے کار ہے اور اس کی بنیادیں کھوکھلی ہیں۔ حالی نے ٹھیک ہی کہا تھا خیال بغیر کسی مادے کے نہیں پیدا ہوتا۔ ادب برائے زندگی تو میانہ نظریہ ہے۔ جس کے بغیر ادب کی اہمیت فوت ہو جاتی ہے

بھی بالاتر ایک اور نظریہ ہے۔ ادب برائے انسانیت۔ یہ نظریہ ابد تک قائم رہے گا۔

فیسر احتشام حسین بیک وقت ممتاز شاعر، نقاد اور ترقی پسند ادب کے میر کارواں تھے۔ ان کی سادگی ہی ان کی ادبی
یل ہے۔ اور مدلل اور روح افزا صحیفے بھی۔ پر مغز تنقیدیں بھی۔ وہ اتنے ہر دلعزیز اور سادہ لوح تھے کہ اگر کھانا کھا رہے
ئی ملاقاتی آجاتا تو ویسے ہی بغیر ہاتھ دھوئے اٹھ آتے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی اہمیت اور عظمت کا اس وقت اندازہ ہوتا
ریا ادبی تقریب یا جشن کا افتتاح انھیں کے ہاتھوں ہوتا۔ وہ ایک صاف دل اور سادہ لوح، بے باک عظیم ادبی شخصیت

صفحہ۔ ۲۴۸۔اعتبار نظر:۔ اصولِ نقد پر غور کرتے ہوئے ان تاریخی قوتوں کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیئے جن سے ادب وجود میں آتا ہے جن سے انسان کی تمنائیں اور خواہشیں پیدا ہوتی ہیں جن سے تنقید کی صلاحیت وجود میں آتی ہے، جن سے انسانی تمدّن بنتا ہے اور جن سے ان قدروں کا تعین کیا جاتا ہے۔ جو انسانوں کو آزادی مسرت اور ترقی کی اس منزل تک پہونچا سکتی ہیں جن کے لئے انسان ہر دور میں بیقرار رہے ہیں۔ کسی اور طرح اصول کا تصور کرنا ایک نامکمل کوشش ہوگی۔ ایسے اقدار کی جستجو کرنے کی جن سے ادب کو اس کے ہر پہلو سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اصولِ نقد کا تعین کرنے میں تحقیق کے ہر گوشے تک نگاہ کو جانا چاہیئے ہر علم سے مدد لے کر ادب کو سمجھنا چاہیئے۔ اعلیٰ ادب کو ادنیٰ ادب سے اس بنیاد پر علیٰحدہ کرنا چاہیئے کہ وہ ادب کبھی اعلیٰ ہو ہی نہیں سکتا جس سے انسانی مسرّت اور انسانی امنگوں میں اضافہ نہ ہو۔ کوئی اصول جو تاریخ اور سماج کی ہمہ گیر قوتوں کو نظرانداز کردے اس نقطۂ نظر سے اصول ہی نہیں رہتا۔

اعلیٰ ادب ادیب کی شعوری قوت کا نتیجہ ہوتا ہے اسے اس کے معمولی اور وقتی تجربات اور ہیجانات کا نتیجہ قرار دے کر نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہو سکتا اچھا ادب وقت کی چیز ہوتے ہوئے بھی ہر وقت کی چیز ہوتا ہے اس میں انسانی شخصیت کی جو بالیدگی اور امکانات چھپے ہوئے ہیں انھیں بھی دیکھنا چاہیئے، اور ان حالات کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔ اور انسانی فطرت کو اس کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ سمجھنا چاہیئے۔ روایت اور تغیر کا تاریخی احساس رکھنا چاہیئے۔ اور رائے دینا چاہیئے کہ کسی مصنّف یا ادیب نے کہاں تک زندگی کو حقیقی مسرّتوں سے معمور کیا ہے۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر اگر تاریخ، نفسیات معاشیات اور سائنس کی مدد کی اصولِ نقد معیّن کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ رائیگاں نہ جائے گی۔

(سنہ ۱۹۴۶ء)

...مانکپوری

احتشام حسین کی غزلیہ شاعری

جدید تنقید کا صالح اور صحت مند دور ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے اس دور میں ترقی پسندی کی صحت مند روایت نے زور پیدا کیا۔ زیر تحت نظریہ عقلیت و تجربیت کے ساتھ ساتھ سائنسی طریقہ نقد کی ابتدا ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو نئے زاویے سے پرکھنے کی سعی کی۔ وزن و نقد کے لیے نئے معیار و میزان کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس تحریک نے سب سے زیادہ زور ادب اور زندگی کے رشتہ پر دیا۔ سماجی اور معاشرتی رجحان کے مطالعہ کے ساتھ شخصی، انفرادی اور داخلی کیفیات کے مطالعہ کو بھی اہمیت دی گئی تھی ادب کے ذاتی محسوسات کی تفسیر پر بھی زور دیا گیا ادب کو تنقید حیات سے تعبیر کیا گیا۔ اور اس کی افادیت اور مقصدیت پر توجہ دی گئی۔ ان تمام اصولوں کی بازیابی میں اور بروئے کار لانے میں اور صحت مند ادب و تنقید کی داغ بیل ڈالنے والوں میں احتشام حسین کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے انھوں نے ادب و زندگی کے باہمی رشتوں کی استواری اور پائیداری پر بھی زور دیا۔ انھوں نے براہ راست مارکسزم کا اتباع نہیں کیا بلکہ نقد و ادب میں ایک نئی فکر، نئی لہر پیدا کی اور اپنی انفرادی صلاحیت کی بدولت ہوتے پر ایک نئی تنقید کی بنیاد ڈالی جو در اصل احتشام صاحب کی فکری اور خلاقانہ ذہنیت کا نتیجہ تھی جسے احتشامی تنقید کہہ سکتے ہیں۔

لیکن اس موقعہ پر اُن کی تنقیدی بصیرت کا جائزہ لینا مقصود نہیں۔ ان کی ادبی شخصیت میں بے حد وسعت اور ہمہ گیری تھی۔ وہ بیک وقت ناقد، محقق، افسانہ نگار، شاعر، اور مترجم تھے۔ ان کی شاعرانہ شخصیت اور شاعرانہ فکر سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ وہ ناقد کی حیثیت سے زیادہ ممتاز ہوئے اور اپنی تنقیدی بصیرت اور سوجھ بوجھ سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔

اُن کی شاعری بھی اُن کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ اگر انھوں نے شاعری میں خصوصی دلچسپی لی ہوتی تو وہ اردو کے ممتاز شاعروں میں نمایاں نظر آتے۔

احتشام صاحب کی شاعری ایک فکری یا تی عمل کے زیر اثر حالات و حادثات، واقعات و سانحات، کی مکمل تصویر کشی کرتی ہے شاعری کے لیے ضروری ہے کہ وہ اجتماعی شعور پر نگاہ رکھے تاکہ وہ جدلیاتی عمل کے ذریعہ بہترین تخلیق پیش کر سکے ورنہ شاعری بھی میکینکل کی صورت اختیار کرے گی۔ اس اصول کے تحت اگر ہم ان کی شاعری کا تجزیہ کریں تو روایت کے دھاروں میں جدت کی جو خوشرنگ لہریں اٹھتی دکھائی دیتی ہیں۔ خزاں رسیدہ بہاریں پیام نشاط لاتی ہیں۔ روایت نئے پیرہن کے ساتھ جلوہ پاشی کرتی نظر آتی ہے۔

احتشام صاحب کی شاعری پر جو گہرے سماجی اور ذہنی عوامل کی کارفرمائی نظر آتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر حد حساس واقع ہوئے تھے وہ ذہنی اور سماجی کرب و اضطراب کو شائستگی، سادگی اور جذبہ شرافت سے مملو احساسات کے ساتھ

قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

فن میں رمزیت، معنویت، جمالیاتی اقدار اور آنی و فانی کے پردے میں ابدی و آفاقی حقیقتوں کو سمونے کے لیے برتنے کے لیے زندگی کی کشمکش اور متضاد پر گہری نظر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے شعر معنی خیز، خیال انگیز، فکر آمیز اور صداقت آمیز ہیں۔

احتشام صاحب کے اشعار میں حیرت انگیز جلوؤں کی فراوانی ہے۔ الفاظ نرم، سرل، سلیس اور سادہ ہیں لیکن ان کی تہہ میں شدت احساس، جوش، اور درد کی شدت چھپی ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ کلام میں تہہ داری ہے، جو اشیاء اور الفاظ کے رشتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ الفاظ ایک قوت ہیں جو تہذیبی اور نفسانی رشتوں میں ربط و ضبط پیدا کرنے کا مؤثر رول ادا کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ الفاظ ذاتی اور شخصی احساسات سے بھی منسلک ہوتے ہیں اور ساتھ ہی تہذیبی اور عوامیت سے رشتہ استوار کرتے ہیں۔

موصوف کی شاعری تہذیبی زندگی اور انفرادی احساسات کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ احتشام صاحب نے الفاظ کی تہہ داری اور رشتوں پر خاصہ زور دیا ہے۔ اور جدید فضا میں بھی طلسمی، موسمی اور علمی قسم کے الفاظ منتخب نہیں کیے ورنہ انہیں ابہام گوئی کا جادو چل سکتا بلکہ انھوں نے اس انفرادی تجربہ سے قطع نظر کر کے ایسے الفاظ منتخب کیے ہیں جو ابلاغ کی مشکل راہوں کو آسان تر بنا سکیں اور انفرادی تجربہ کی تیزی، پیچیدگی اور تیکھے پن کو بھی نمایاں کر سکے۔ ساتھ ہی ساتھ تجربہ کا رشتہ تہذیبی اور عمرانیات سے قریب تر ہو سکے۔ انھوں نے نازک اور سجل الفاظ کے استعمال سے اپنی غزلوں میں گیت پن اور ترنم کی لے پیدا کی ہے۔ مثلاً سناٹا، خیال، رنگ، لمحہ، بستی، پیاس، تھکن، نغمہ سے الفاظ کا استعمال اُن کے شاعرانہ مزاج، احساس کی ندرت اور نرم روی کا پتہ دیتے ہیں۔

اُن کی تراکیب پر کسی مصور کے نازک خیال کا دھوکا ہوتا ہے۔ حسین ترکیبوں، استعاروں اور تشبیہوں نے اسالیب بیان میں جدت پیدا کی ہے بعض اشعار میں فارسی کی آمیزش کا رنگ کھل اٹھتا ہے۔ مثلاً

خزاں گزر گئی لیکن گلوں کے رنگ ہیں زرد بہار کو صلۂ خونِ کشتگاں نہ ملا

موصوف کی بعض ترکیب نہایت خوبصورت اور جامع ہے مثلاً دشتِ امید، خوشۂ حق شناسی، صورتِ نغمہ، بادۂ دل، وغیرہ۔

الفاظ کے انتخاب میں سادگی اور سلاست کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ ان کی غزلوں میں سادگی، سلاست، روانی اور زبان کی جملہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مثلاً

اے رفیقانِ رہِ شوق، کہاں ہو، بولو ہم تمھیں شہر و بیاباں میں پکار آئے ہیں

یہ شعر کس قدر پُر اثر اور سادہ ہے انداز بیان میں شدت احساس کی فراوانی ہے۔ الفاظ آسان تراکیب سادہ عام فہم اور معنی یابی سے مملو ہے جس نے شعر میں درد کی کیفیت پیدا کر دی ہے اور لفظ لفظ سے شوق و تجسس اور تلاش کی گئی اپنی تمام تر فکری اور وجدانی کیفیات کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ "کہاں ہو" اور "بولو" نے شعر میں غضب کی اثر انگیزی پیدا کر دی ہے اور خیال کو جانے کہاں تک کی وسعت دے دی ہے۔

جب آنکھ میں آ گئے ہیں آنسو خود بزمِ طرب سے اُٹھ گیا ہوں

اس شعر میں کوئی خاص فلسفیانہ خیال نظم نہیں کیا گیا ہے پھر بھی شعر میں تہہ داری اور گہرائی ہے۔ شعر میں درد و غم کی لہریں موجزن ہیں۔ دوسرے مصرعے نے تو شعر کو مکمل درد کا ترجمان بنا دیا ہے۔ یہ سلاست اور یہ انداز بیان اور اس میں پیدا شدہ درد کی شدت نے شعر کو بہت اچھا شعر بنا دیا ہے لفظ خود اور بزمِ طرب کی ترکیب نے شعر کے معنوی حسن کو دوچند کر دیا ہے۔ اور فکر کا دائرہ لامحدود کر دیا ہے۔

ان مذکورہ اشعار کے علاوہ درج ذیل کے اشعار میں بھی الفاظ کی نشست نے شعر میں بلند آہنگی، معنی خیزی، خیال آفرینی اور جدت پیدا کی ہے۔

اتر کے دیکھ چکا، رنگ کے سمندروں میں — ترے شباب کا وہ رنگ ارغواں نہ ملا
دشتِ امید میں جلتا ہے مرے خوں کا چراغ — راہِ منزل کی کہو، میرے سوا کون دکھائے
یوں گزرتا ہے تری یاد کی وادی میں خیال — خارزاروں میں کوئی برہنہ پا ہو جیسے
دیکھنا لوٹی گئی کون سی بستی یارو — اڑ کے دل تک جو کدورت کے غبار آئے ہیں

...ن نے اپنی غزلوں میں جو تشبیہات اور استعارات استعمال کیے ہیں ان میں نیا پن اور حسن ہے بعید از قیاس مبالغہ اور خلافِ فطرت ...سی خصوصیت رکھنے والی تشبیہات سے پرہیز کیا ہے۔ بلکہ اُن کی استعمال شدہ تشبیہات اور استعارات میں سچائی اور حقیقت پسندی نظر ...بہ کی تاویلیں، غیر مصدقہ افعال، الفاظ کی بازیگری نہیں بلکہ قلبی واردات وکیفیات کی سچی اور منہ بولتی تصویریں ہیں۔ چند ...:-

یوں گزرتا ہے تری یاد کی وادی میں خیال — خارزاروں میں کوئی برہنہ پا ہو جیسے
یوں شفق پھولی ہے مشرق کے افق پر اے دوست — دن کا خوں رات کی چوکھٹ پہ بہا ہو جیسے

...ام صاحب روزمرہ ومحاورات کی افادیت اور اہمیت سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ محاورات اجتماعی زندگی کی عکاسی ...تی اور بے لاگ تصویریں بناتے ہیں، سماجی رویے کا اظہار کرتے ہیں، اور اجتماعی تجربے کی تصویریں اتارتے ہیں۔ محاوروں کا ...ظاہر کرتا ہے کہ فرد سماج سے اپنا تعلق کس نہج پر استوار کرتا ہے اور اس رشتہ کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی یہ ...رتی ہے کہ فرد سماج ومعاشرے میں اپنے آپ کو کھلا دینا چاہتا ہے۔

...شام صاحب نے اس اصول کے پیشِ نظر اپنے کلام میں محاورات کا استعمال شعوری طور پر کیا ہے چونکہ ایک ترقی پسند ادیب ...لے انھیں احساس تھا کہ فرد اکیلا کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ اس کا کسی نہ کسی صورت میں سماج سے اور اس کے معاشرے سے تعلق ...، وہ سماج سے الگ رہ کر زندگی کے کسی شعبہ میں تعمیری رول سرانجام نہیں دے سکتا۔ لہٰذا ان کی غزلوں میں روزمرہ اور ...مال اسی نظریے کے تحت ہوا ہے۔ انھوں نے صرف استعمال پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ انھیں اس طور پر برتا ہے کہ حسن و ...لی ہے۔ شعر میں رعنائی اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دیکھنا لوٹی گئی کون سی بستی یارو — اڑ کے دل تک جو کدورت کے غبار آئے ہیں
عصرِ حاضر کے مسیحاؤں کا انداز یہ ہے — دور بیٹھے ہوئے دامن کی ہوا دیتے ہیں
ایک پندارِ خودی جس کو بچا رکھا تھا — آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں
وادیٔ دل میں کئی راتوں سے سناٹا ہے — کاش بجلی ہی ترے ابرِ ستم سے گر جائے

...دف کے کلام میں درد کی شدت اور بیان کی گھلاوٹ اس قدر زیادہ پائی جاتی ہے کہ اس نے گفتگو کا پیرایہ اختیار کر لیا ہے وہ گفتگو ...دبنی اور وجدانی رشتوں سے واقف تھے یہی سبب ہے کہ انھوں نے گفتگو کو باقاعدہ فن کی طرح سمجھا ہے اور اسے برتنے کی فنکارانہ ...ہے۔ اُن کے کلام میں اُن کی شخصیت کا جو عکس نظر آتا ہے اس کی رو سے وہ سخن طراز (CONVERSATIONALIST) ہی نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

چھپتی نہیں خوئے حق شناسی — سقراط ہوں، زہر پی رہا ہوں

...شام صاحب کی شخصیت کا مطالعہ اُن کے کلام سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے اشعار پڑھ کر قلبی واردات واحساسات، تجربات و ...اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جن اسباب وحالات اور معاشرتی ماحول کے اندر رہ کر اپنی شخصیت کی تعمیر کی ہے وہ رنگارنگ

اور پُر تنوع ہے۔ انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ بیانیہ لب و لہجہ کے لیے جذبہ و خیال کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری شعری روایت میں وبدائع بالخصوص رعایت لفظی شعری تخلیق کے عمل میں فعال کا حکم رکھتی ہے۔ رعایت لفظی کا فن دراصل مشرقی ذہن کی خاص پیداوار جو اشیا، والفاظ کے درمیان معنوی اور صوری ربط اور زندگی کا کوئی جامع تصور قائم کرنا چاہتے ہیں۔ تغزل کے حدود نے اس تیکنک اور بھی وسعت دی ہے۔ لفظی و معنوی حسن پر خصوصی توجہ کے ساتھ ہی آہنگ پر بھی نظر رکھی ہے جو خیال اور الفاظ سے مربوط ہے یہی چیز ہئیت کو ابھار رہی ہے گفتگو میں یہی جذبہ و خیال فطری بہاؤ کے مطابق ظاہر ہوتا ہے لیکن شعر میں تیکنکی پابندی کی وجہ سے اور غزل کے منفرد معنی رکھنے سے جذبہ و خیال پر خاص توجہ مرکوز کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر میں موسیقی اور نغمگی پائی جاتی ہے۔

احتشام صاحب کی شاعری میں لہجے کے تنوعات کا دائرہ کافی حد تک لامحدود ہے اُن کے مخصوص لہجہ اور آہنگ زمانے کی معاشی اور سماجی رشتوں کے کرب میں خارجی اور داخلی نقوش زیادہ واضح صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ موزوں اور مترنم بحروں کے استعمال موسیقیت اور نغمگی میں دلآویزی اور اثر آفرینی پیدا کی ہے۔

ظلمتِ شامِ خزاں یاد کرے گی برسوں — ہم جب آئے ہیں گلستاں بہ کنار آئے ہیں

اس غزل کے چند اور شعر ملاحظہ فرمائیں جو اپنی مترنم بحر اور موسیقیت سے بھرپور آہنگ کی وجہ سے بے پناہ خوبصورت ہی نہ ہوئی بلکہ موثر بھی ہو گئی ہے (موصوف کی یہ آخری غزل ہے جو انھوں نے آخری مرتبہ انھیں کی زبان سے سنی۔ مرحوم کی یہ غزل بیحد عزیز

محفلِ دوست میں گو سینہ فگار آئے ہیں — صورتِ نغمہ، بہ اندازِ بہار آئے ہیں

اس نظر سے کہ ترے ظلم کی تشہیر نہ ہو — بے قراری میں لیے دل کا قرار آئے ہیں

ایک پندار خودی جس کو بچا رکھا تھا — آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں

اے رفیقانِ رہِ شوق، کہاں ہو، بولو — ہم تمھیں شہر و بیاباں میں پکار آئے ہیں

اپنے انجام سے خوش، اپنی وفا پر نازاں — مسکراتے ہوئے ہم جانبِ دار آئے ہیں

احتشام صاحب کی شاعری میں جو معنوی خوبیاں پائی جاتی ہیں ان میں صداقت اور اصلیت کا حسن زیادہ واضح طور پر دکھائی ہے۔ انھوں نے کسی منظر یا حالت یا واقعہ کا بیان لفظ و معنی کے توسط سے اس طرح کیا ہے کہ سامع اُسے زندہ حقیقت تصور کرنے لگتا ہے اور سامنے ایک تصویر کھنچ جاتی ہے اُن کا یہ فن محاکات کے درجہ پر فائز دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے جو بھی خیال نظم کرنے کی کوشش کی یہ رہا کہ شعر کی شعریت قائم رہے اور خیال دور از کار نہ معلوم ہو۔ جہاں بھی انھوں نے اس خیال کو پیش نظر رکھا ہے خواہ وہ زندگی کا فکر غم کی کہانی ہو، خوشی کی داستان ہو، یا حال کا مرثیہ ہو ہر جگہ یہی خیال پیش نظر رہا۔ اسی لیے ان کی شاعری میں بلندیٔ خیال باریکیٔ جیسی معنوی خوبیاں پیدا ہوئی ہیں۔ انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ اور گرد و پیش کا وسیع مشاہدہ اور زندگی اور ادب کے رشتوں کا احترام ان کا مطمح نظر تھا اور یہی نظریہ ان کی شاعری میں اور تنقید میں جاری و ساری ہے۔

بہر حال جہاں بھی اُن کے قلم نے خامہ فرسائی کی ہے وہاں وہاں اُن کا خلوص اُن کی لگن ان کا نظریہ اور سوجھ بوجھ آئینہ ہے جس میں ہم اُن کی شخصیت کا نور، کردار کی چاندنی دیکھ سکتے ہیں اور بار بار یہ شعر پڑھتے رہیں گے اور اس عظیم ناقد، عظیم انسان اور عظیم کو نذرانۂ خراجِ عقیدت پیش کرتے رہیں گے۔

ظلمتِ شامِ خزاں یاد کرے گی برسوں — ہم جب آئے ہیں گلستاں بہ کنار آئے ہیں

شجاعت علی سندیلوی

اُردو تنقید کا ارتقاء

پروفیسر احتشام حسین کی زبانی

کوئی ادب، تحقیق و تنقید کے بغیر اعلیٰ ادب کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ زبان کی تشکیل اور ترقی پر نظر ڈالی جائے، تو اس میں بھی تنقید کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ کوئی زبان ادب کی سرحد میں اسی وقت داخل ہو سکتی ہے، جب اس کے الفاظ کی تراش و خراش نگینوں کی طرح ہے، اس کے الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا رہے، عوام سے اس کا رابطہ جسم و جان کی طرح قائم رہے۔ اس میں اتنی وسعت پیدا ہو جائے کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات اور علوم و فنون کے مسائل کو سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ، دلکش پیرایہ میں بیان کرنے کی پوری صلاحیت ہو اور یہ صلاحیت مطالعہ و مشاہدہ، محنت و ریاضت، اور غور و فکر کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتی۔ کیا کہا جائے؟ اور کس طرح؟ کے مسلمہ اصول سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ تخلیق کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے جس کے لیے فنی شعور کے ساتھ، دوسرے متعلقہ مسائل ہونا بھی ضروری ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں

"تخلیق ایک فنی شعور چاہتی ہے۔ روایت کا علم چاہتی ہے۔ واقعی یا خیالی تجربوں کے اظہار کا سلیقہ چاہتی ہے۔ اسالیب اور استعمال الفاظ سے اثر پیدا کرنے کی صلاحیت اور قوت کا ادراک چاہتی ہے۔"

فنی شعور کے لیے، علم و تجربہ کی ضرورت ہے، روایت کا علم، سماج، اور تاریخ سے واقفیت کے بغیر ناممکن ہے۔ تجربوں کے اظہار کا سلیقہ بیان پر پوری قدرت چاہتا ہے اور آخری بات یعنی اسالیب اور استعمال الفاظ سے اثر پیدا کرنے کی صلاحیت اور قوت کا ادراک" ادب اور شعور، کے بعد ہی ممکن ہے۔ احتشام صاحب نے ان چند جملوں میں تخلیق کے بنیادی اصول واضح کر دیے ہیں لیکن یہ اصول' اسی وقت برتے جا سکتے ہیں، جب، تخلیق کے ساتھ ساتھ، تنقیدی شعور بھی ہو، یعنی نہ صرف زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہو بلکہ حسن و قبح بھی ہو۔ احتشام حسین صاحب کی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے۔

"یہ ساری باتیں خاص قسم کی تنقیدی بصیرت کے بغیر بروئے کار نہیں آ سکتیں تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ تنقیدی عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور فن کار کی قوت ممیزہ بن کر، پرواز و ترتیب خیال، طرز اظہار اور انداز و بیان کی تہذیب و تدوین میں مصروف رہتا ہے۔"

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ادب میں شروع سے ہی، تنقیدی رجحان اور عمل کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔ اردو ادب بھی اس رجحان سے کبھی نہیں رہا، اپنے عہد اور سماج کے بموجب، بہت آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر، یہ رجحان پیدا ہوا اور جسے شعور کا نام دیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے نقوش بہت بعد میں ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ احتشام صاحب اردو تنقید کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"انیسویں صدی کے وسط ہی تک نہیں، ادب میں اس تغیر کے بہت واضح نقوش نہیں ملتے...... پُراثر اور فیصلہ کن انداز

میں ادب کی فنی اور معنوی روایات کو یکا یک بدل نہ سکتا تھا۔ اس لیے تنقید بھی احتیاط پسندی پر مبنی تھی بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۸۵۷ء تک تنقید نے ادب کی پرکھ میں ان آلات علم سے بھی کام نہیں لیا جو اس کی دسترس سے باہر نہ تھے۔"
ان کے خیال میں اس کا سبب یہ بھی تھا کہ

"سترھویں اور اٹھارھویں صدی کا ہندوستان ایک مسلسل انحطاط جاگیردارانہ نظام کے سہارے جی رہا تھا۔ اب اگر سماج زوال آمادہ ہے، طبقات کی کش مکش ہلکی پڑ گئی ہے ذرائع پیداوار کا نشو و نما نہیں ہو رہا ہے۔ دستکاریاں مٹ رہی ہیں، مذہبی اور اخلاقی تصورات ایک دائرے کے اندر ہی چکر لگا رہے ہیں، کوئی بڑا توی یا تہذیبی تصور مفقود ہے، تو زندگی کے کسی شعبہ میں یہ واضح گھرے، بلند مرتبہ تصورات کی جستجو بے معنی ہوگی، تنقید اس سے باہر نہیں ہو سکتی۔" کیونکہ
"ادب جن سماجی عناصر سے وجود میں آتا ہے، جن تضادوں میں پروان چڑھتا ہے اور جن حقائق حیات کا رس چوس کر پنپتا ہے، ان کو نظر انداز کر کے، تنقید کے ارتقا پر غور کرنا بے معنی ہوگا۔" اور
"تخلیقی اور تنقیدی عمل میں نیا پن زور اور ارتقائی رنگ سماج میں ذرائع پیداوار کی ترقی یا تبدیلی کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔"

مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار، اٹھارھویں صدی کے آغاز سے ہی شروع ہونے لگے تھے، مرکزی حکومت کمزور ہوتی جا رہی تھی، نواب، جاگیردار صوبیدار، مرہٹے، سکھ، سب اپنی اپنی جگہ، خود مختاری کا خواب ہی نہیں دیکھنے لگے تھے بلکہ علم بغاوت بلند کر چکے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کی شاطرانہ چالیں کامیاب ہوتی جا رہی تھیں سراج الدولہ میر جعفر کی غداری کی وجہ سے شکست کھا چکے تھے، اور بنگال پر سفید فام مہذب نما تاجروں کا اقتدار ہو چکا تھا، جنوب میں حیدر علی اور اس کے بعد ٹیپو سلطان سے انگریز بہت خوف زدہ تھے، اور مسلسل شکست پر شکست کھا رہے تھے لیکن غداروں کی وہاں بھی کمی نہیں تھی، میر صادق نے انگریزوں سے مل کر، ہندوستان کے اس نازِ فرزند ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا، وہ جس کا قول تھا کہ

"آزادی کا ایک لمحہ غلامی کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

ہمیشہ کے لیے خود خاموش ہو گیا۔ لیکن مادرِ وطن کے سپوتوں کے دلوں میں آزادی کی چنگاریاں بھڑکا گیا، بظاہر پورے ملک پر انگریز کا اقتدار قائم ہو چکا تھا مگر اندر ہی اندر آگ سلگ رہی تھی، یہاں تک کہ وہ آگ بھڑک اٹھی اور ۱۸۵۷ء میں، ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس آگ کے شعلوں سے انگریز کا اقتدار جل کر خاکستر ہو جائے گا، اور مادرِ وطن آزاد ہو جائے گی بہادر شاہ ظفر، جھانسی کی رانی، تانتیا ٹوپی اور نہ جانے کتنے اور کیسے جانباز و جاں نثار، آزادی وطن کے لیے، میدان جنگ میں کود پڑے، مگر اس موقع پر بھی تنظیم کی کمی اور غداروں کی زیادتی کی وجہ سے، انگریز کو فتح ہوئی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا، بے گناہوں کے خون سے مادرِ وطن کی سرزمین لالہ زار بن گئی۔ سب کچھ کھو دینے کے بعد، ہندوستانیوں کے دلوں میں انقلاب کا احساس پیدا ہوا، کیا تھا؟ اور کیا ہو گیا؟ سے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ راجہ رام موہن رائے سرسید احمد خاں اور دوسرے اکابر اور مشاہیر ملک و قوم آگے بڑھے حقائق پر نظر ڈالی، مرض کی تشخیص کی اور پورے عزم و یقین، ہمت و استقلال کے ساتھ علاج کرنا شروع کیا ایشیائی ادب کا بھی انھوں نے جائزہ لیا۔ پروفیسر احتشام حسین کے خیال میں یہ ناگزیر تھا۔ وہ لکھتے ہیں:-

"انیسویں صدی کے ہندوستان میں زبردست معاشی معاشرتی اور سیاسی تغیرات رونما ہوئے ان کے اہم اور دور رس نتائج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ان حالات نے نئے طبقاتی رشتوں کو جنم دیا۔ زندگی نے عہدہ برآ ہونے کی نئی راہیں دکھائیں، غور و فکر کے نئے دروازے، کھولے اور ایک ہمہ گیر شعوراتی انقلاب کی جانب رہنمائی کی۔ اس طرح تنقید کی کند دھار میں پھر روانی آئی۔"

کوئی شک نہیں کہ اردو ادب میں تنقید کی کند باڑھ میں روانی پیدا کرنے میں سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ سرسید احمد نے تہذیب الاخلاق اور اپنی تقاریر کے ذریعہ سے اردو ادب کی اصلاح و ترقی کی طرف توجہ دلائی، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ادب کی زبوں حالی کو محسوس کیا اور اس کی ترقی کے لیے عملی قدم اٹھایا۔ زندگی کی کشمکش اور نئے تقاضوں اور رجحانات نے ادب کو متاثر کیا۔ مغربی علوم و فنون سے استفادہ کیا جانے لگا۔ اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت چلی آ رہی تھی، تذکروں میں تنقید ایک شیر خوار بچے کی طرح کہی جاسکتی ہے۔ تذکرہ نگار اپنے حدود میں رہ کر ہی اس زمانے کے مذاق اور رواج کے بموجب اظہار خیال کر سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں احتشام صاحب لکھتے ہیں:

"تذکرہ نگاری کے کچھ حدود ہیں، ان میں جو تنقیدی جھلک ملتی ہے وہ اس وقت کے عام ادبی شعور کا عکس ہے اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان سے فلسفۂ نقد کے اہم اصول مرتب نہیں کیے جاسکتے سخن فہمی میں تھوڑی بہت مدد ضرور مل سکتی ہے۔"

تنقید کے یہی وہ مبہم اور دھندلے نشانات تھے جن کی مدد سے حالی نے اردو تنقید کے واضح اصول مرتب کرنے کی کوشش کی، یہ کام آسان نہیں تھا، اس کے سمجھنے کے لیے حالی نے مختلف زبانوں کے ادب اور تنقید کا براہ راست یا بالواسطہ مطالعہ کیا وہ تقریباً بارہ سال تک مسلسل اس جد و جہد میں لگے رہے کیونکہ

"سب سے بڑی دشواری جو تنقیدی عمل کے تسلسل کو سمجھنے کے سلسلے میں پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر عہد کی ادبی اور تنقیدی قدروں کو الگ الگ اصولوں کے تحت رکھ کر کسی مخصوص عہد یا دور کے لیے متحقق کر دینا چاہیے۔ یا ایسے اصولوں کی جستجو کرنا چاہیے جو زیادہ سے زیادہ ادوار پر حاوی ہوں۔" لیکن

"اس حقیقت کو تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ تنقید چاہے سانس لینے کی طرح ناگزیر ہو، لیکن اس میں وہ یکسانیت اور نظم ہمیشہ نظر نہیں آتا جو سانس لینے میں ہے۔ نظام تنفس میں ارتقا نہیں، تنقیدی تصور میں ارتقا ہے جو نتیجہ ہے انسانی شعور کا۔ بہرحال یہ بات بالکل واضح ہے کہ تنقید سے ہر دور میں (نہیں بلکہ ایک ہی دور میں) ایک ہی چیز مراد نہیں رہی ہے۔ تشریح و توضیح کو بھی تنقید کہا گیا ہے جمالیاتی تاثر پذیری اور اس کے اظہار کو بھی، تحقیق اور تاریخ کو بھی اسی زمرہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور مناظرہ و محاکمہ کو بھی۔ حالی کے پیش نظر بھی یہ سب مسائل رہے ہوں گے، بعض نہایت واضح طور پر بعض مبہم اور غیر واضح، سرسید احمد، نذیر احمد اور آزاد کے لیکچروں میں ہلکے ہلکے تنقیدی اشارے ضرور ملتے ہیں، مگر ان سے کوئی تنقیدی اصول مرتب کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔"

حالی اپنے طور پر کام کرتے رہے، آزاد نے بھی، آب حیات اور سخندان پارس، میں تنقیدی و تحقیقی خیالات کا اظہار کیا۔ احتشام حسین کے الفاظ میں:

"آزاد اور حالی دونوں ادب اور خاص کر شاعری کو زندگی کے مادی تغیرات سے وابستہ سمجھتے ہیں اور اس کو زندگی کے سنوارنے بہتر بنانے اور زندگی سے غذا حاصل کرنے کا آلہ تسلیم کرتے ہیں۔ آزاد کے یہاں یہ باتیں واضح نہیں ہیں۔ حالی کے یہاں پوری طاقت کے ساتھ آئی ہیں۔ درباری زندگی نے شاعری کو کس طرح متاثر کیا ہے۔ اس کا ذکر دونوں کے یہاں ملتا ہے حقیقت اور سادگی پر دونوں زور دیتے ہیں کیونکہ وہ شاعری کے افادی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح تنقیدی نقطۂ نظر میں انقلاب آتا ہے شاعری سماجی شعور سے وابستہ ہو جاتی ہے اور شاعر براہ راست اپنے تخلیقی عمل سے سماج کے شعور کو وسیع کرنے میں شریک ہو جاتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسی زمانہ سے تنقید کے لیے سنجیدگی کے ساتھ شعوری طور پر غور و فکر کے دروازے کھلے۔ حالی نے اس اہم کام کا بیڑہ اٹھایا آزاد جذبات کی رو میں زیادہ بہہ جاتے ہیں جبکہ حالی عقل و احتیاط کے دامن سے کبھی کنارہ کش نہیں ہوتے۔

"جہاں تک شاعری کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کا تعلق ہے آزاد کا رویہ جذباتی تھا اور حالی کا تعقل پسندانہ اور افادی"

آزاد اور حالی کے ساتھ شبلی نے بھی تنقید کی طرف توجہ کی، وہ عمر میں سب سے چھوٹے ہونے کے باوجود، اپنی ذہانت و لیاقت کی وجہ سے ان کی صف میں شریک ہو گئے اور نئے انداز سے اردو ادب کا جائزہ لیا، احتشام صاحب کے الفاظ میں

"شبلی جمالیاتی تاثر کو بڑی حد تک زمان و مکان سے ماورا محسوس کرتے ہیں میرا مقصد صرف یہ ہے کہ شبلی نے نفس شعر میں مضمون اور مواد کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی ہے"

اس طرح یہ تینوں نقاد عملی تنقید کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے اپنے انداز میں انھوں نے مختلف شعراء کے کلام کا تجزیہ کیا۔ یہیں سے تنقید کے لیے مختلف راہیں پیدا ہوئیں، ادبی تنقید، جمالیاتی تنقید، عملی تنقید وغیرہ کی بنیاد پڑی۔ آزاد۔ حالی، شبلی، انفرادی حیثیت سے ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد خیالات رکھتے تھے۔ لیکن انھیں کے خیالات اور عمل سے اردو میں تنقید کا چراغ روشن ہوا اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان تینوں میں حالی ہی کی بدولت، کاروان نقد آگے بڑھا، ان کی انگلیاں زمانہ اور ادب کی نبض پر تھیں، ان کی نگاہوں میں احول کے تغیرات و اثرات تھے۔ اس لیے

"مادی زندگی میں تغیر اور اس کے نتائج پر ادب اور خیال کے تعلق پر حالی نے جس طرح نظر ڈالی ہے وہ ان کے طرز فکر کا پتہ دیتی ہے، انھیں اس عہد کے دوسرے نقادوں سے آگے بڑھا دیتی ہے، اور ان کے دائرہ خیال میں اس حصہ کا اضافہ کرتی ہے جس سے آج کا نقاد بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت سے تنقید کے لیے نئی راہیں کھل گئیں سماجی نقطہ نظر کی جستجو کرنے والا حالی کے یہاں، اس کی جھلک دیکھ سکتا ہے"

اسی طرح

"ذوقی، وجدانی اور جمالیاتی پہلوؤں سے دلچسپی رکھنے والا شبلی کی شگفتہ بیانی میں اس کا جلوہ تلاش کر سکتا ہے"

حالی اور شبلی کی کوششیں بارآور ہوئیں، تنقید کا پودا اُگ تو پہلے ہی چکا لیکن اس میں سرسبزی و شادابی اور نشو و نما پانے کی صلاحیت حالی نے عطا کی، تنقید کا یہ دور، حالی کا دور ہے حالی کا انتقال، ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ہو گیا اس لیے تنقید کا یہ ابتدائی دور بھی ۱۹۱۴ء ہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حالی نے تنقید کے واضح اصول مرتب کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن اس کے باوجود بھی

"اس وقت تک تنقید کے اصولوں کا ارتقا کسی مخصوص نقطہ نظر کا پتہ نہیں دیتا محض ان کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے"

حالی اور شبلی کے بعد دنیا میں بڑے انقلابات رونما ہوئے، سیاسی، سماجی تغیرات نے دنیا ہی بدل ڈالی، جنگ عظیم، روس کا انقلاب، ہندوستان میں سیاسی تحریکات۔ ان سب نے اردو ادب کو خاص طور پر متاثر کیا اور ۱۹۱۴ء کے بعد اردو ادب میں جدید رجحانات اور خیالات کا سیلاب آ گیا، تنقید بھی اس سے اثر انداز ہوتی رہی۔ اور

"آہستہ آہستہ زمین ہموار ہو رہی تھی اور تازہ کن حالات ایسے خیالات کی تشکیل اور تعمیر کر رہے تھے جو تنقید کو علمی بنیادوں پر کھڑا کر دیں۔ ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ جو انداز تنقید بھی اختیار کیا جائے اس میں وزن گہرائی اور استدلال ہو، یہاں تک کہ خالص تاثراتی نقطہ نظر رکھنے والے بھی اپنے خیالات کے جواز میں بہت سی دلیلیں پیش کرتے ہیں"

غرض اردو تنقید نے ۱۹۳۶ء تک کئی منزلیں طے کر لی تھیں اور اس پر وہ خصوصیتیں نمایاں ہو چکی تھیں جو اب یا تو تکمیل کی جانب بڑھ رہی ہیں یا

حقائق کی جستجو کرنے میں علم و آگہی کے نئے وسائل سے کام لے کر وسیع تر اور عمیق ترین رہی ہیں۔

اس طرح تنقید میں علمی و فنی شعور برابر بڑھتا جا رہا تھا، اسی احساس اور شعور کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد سجاد ظہیر نے ڈالی، ترقی پسندی کی روایات ہمیشہ رہی ہیں لیکن یہ انجمن اشتراکی پرچم کے زیر سایہ اپنے خیالات کا پرچار کرتی رہی، اس نے انسانی مسائل اصلیت کے تپتے میں دیکھے، لیکن سلیقہ کی کمی کہی جاتی ہے یا حقیقت پسندی کے اظہار کے جذبہ کی فراوانی کہ شروع شروع میں ترقی پسندی اور عریانیت لازم و ملزوم سی ہو گئیں۔ اپنے دیس، اپنی زبان کی عظیم الشان روایات کو نظر انداز کر کے اشتراکی نظریات اور خیالات کا پروپیگنڈہ کرنا اس کا نصب العین ہو گیا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ شعر و ادب کے پرکھنے کی شکلیں بدل گئیں۔ احتشام حسین فرماتے ہیں:۔

"۱۹۳۶ء کے بعد سے متعدد نقادوں کے یہاں شعر و ادب کے پرکھنے کی بالکل بدلی ہوئی شکلیں ملتی ہیں جو یکسر قدیم روایات سے اپنا رشتہ نہیں توڑتیں لیکن جو ادب کے متعلق پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہیں۔"

"ترقی پسند تحریک نے تھوڑے ہی دنوں کے اندر اپنے بنیادی اصولوں کی وضاحت کر دی یہاں تنقید انفرادی تاثر پذیری اور ذاتی پسندیدگی کے دائرے سے نکل کر سماجی علوم اور روایات فن کی مدد سے شعر و ادب کے پرکھنے کا ایک آلہ بن گئی۔"

اس لیے ۱۹۳۶ء کے بعد اردو ادب جتنا جاندار اور شاندار ہوتا گیا، اس سے قبل اتنی کم مدت میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ادیبوں شاعروں کا ایک جم غفیر اپنے اپنے نظریات و خیالات و احساسات کا اظہار کر رہا تھا۔ ان کے شعر و ادب کو پرکھنے کے لیے نقادوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جن کی مساعی نے اردو شعر و ادب کو زندہ و توانا بنایا۔ یہ نقاد

"ادب کو زندگی کا عکس قرار دیتے ہیں اور زندگی کو تغیر پذیر سمجھتے ہیں اور اس تغیر کے وجوہ کو مادی مانتے ہیں، جو ادب کو ادیب کے شعور کا نتیجہ کہتے ہیں اور اس شعور کو زندگی کی کشمکش اور تجربوں سے متشکل ہوتا ہوا تسلیم کرتے ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ انھیں تبدیلیوں کی وجہ سے زبان اور اسالیب بیان، ہیئت اور طریقہ اظہار میں تبدیلی کے نتائج کی جستجو کرنا چاہیئے، جو ادب کو ارتقائے تہذیب کا ایک جزو قرار دیتے ہیں اور اسے انسانی سماج کو بہتر و برتر بنانے کی آرزوؤں کا آلہ سمجھتے ہیں، یہ سب ترقی پسند نقاد تسلیم کیے جائیں گے۔ یہ وہ نقاد ہیں جو تنقید کے سائنٹفک ہونے کے قائل ہیں۔" کیونکہ

"تنقید منطق کی طرح ہر علم و فن کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہے بلکہ وجدان اور جمال کے جن گوشوں تک منطق کی رسائی نہیں ہے تنقید وہاں پہنچتی ہے وہ رنگ و بو اور کیف و کم کے غیر معین دائرے میں صرف قدم ہی نہیں رکھتی بلکہ ابہام میں توضیح کا جلوہ اور بے تعینی میں تعین کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس طرح تنقید کے سلسلہ میں جب اصولوں کی گفتگو کی جائے تو طبعی اور اکتسابی علوم کے علاوہ ایک اور ایسے علم یا جس سے کام لینے کی ضرورت پڑے گی جو ان علوم کے منافی نہ ہوتے ہوئے بھی ان سب سے بڑھ کر کوئی بات ایسی بتا سکے جس سے فیصلے میں مدد ملے۔"

یہ صحیح ہے کہ

"تنقید نہ تو تاریخ ہے نہ فلسفہ نہ سیاست ہے نہ سائنس لیکن یہ علوم جس حد تک انسانی ذہن میں داخل ہوتے، اسے متاثر کرتے اور شعور کا جز بنتے ہیں، اس کی جستجو ہو۔"

اور

"اگر تنقید کوئی علمی کام ہے اور محض تاثرات کا بیان نہیں ہے تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا جن سے زندگی اور ادب کو سمجھا جا سکتا ہے ...... ان متضاد اور متصادم نقطہ نظر رکھنے والوں کی تنقید کرنے کی ضرورت بھی ہوگی جو مشکل اور ذمہ دارانہ کام ہے۔"

۱۹۴۷ء کے بعد سے ۱۹۷۲ء تک اردو تنقید کا تیسرا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ۲۵ برس کے عرصہ میں اردو تنقید نے جس جہت ترقی کی تنقید پر تحقیقی مقالے لکھے گئے، سیکڑوں، ہزاروں مضامین میں اظہار خیال کیا گیا، اپنے گراں قدر خیالات سے اردو ادب کو سنوارنے اور آگے بڑھانے میں مدد کی، ابھی یہ کارواں نقد آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ ۱۹۷۲ء آگیا۔ اردو تنقید رسا سلب ہوگئی، اس کو ختم کرنے کی منظم و موثر کوشش کی گئی، یہ حادثہ سخت تھا، حریت پسند دم بخود رہ گئے، ادب کے اہم ستون، لڑکھڑانے لگے، اس نازک موقع پر بھی اردو تنقید نے سہارا دیا۔ اس نے حقائق و واقعات پر نظر رکھی، حالات کا تجزیہ کیا اور ادب کو موت کے غار سے نکالنے کی شعوری طور پر کوشش کی۔ اور ادب

"تنقید کا مسئلہ محض ادب کی پرکھ کا مسئلہ نہیں رہا، اپنی زبان اور اپنے ادب سے دلچسپی لینے کا مسئلہ بھی نہیں ہے، بلکہ ادب کے عالمی معیاروں کو پیش نظر رکھ کر ہر اس علم و فن سے کام لینے کا مسئلہ ہے جن سے انسانی ذہن، عمل اور محرکات عمل کو سمجھ سکتا ہے۔ ادب کی تنقید زندگی اور زندگی کی قدروں کی تنقید ہے، کیا ہو اور کیا ہونا چاہیئے کی تنقید ہے۔"

اسی لیے:-

"موجودہ نقاد کو ٹھوس مطالعہ کی ضرورت ہے۔ یہ مطالعہ قومی اور بین الاقوامی تغیرات کے ان پیچ در پیچ اثرات، تہذیبی اور فکری روایات، قومی زندگی کی خصوصیات کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔"

موجودہ نقادوں کو احتشام صاحب کی یہ رائے بہرصورت پیش نظر رکھنی ہوگی:-

"اردو ادب میں تنقید کی روایت رہی تو ہے لیکن اسے الجھنوں سے سابقہ اب پڑا ہے، اس لیے ابھی اس کا بہت سا حصہ اپنے نقاط نظر کی تشریح، مدرسانہ تاویل اور دفاع میں صرف ہو رہا ہے لیکن جس تندہی اور شفقت سے کچھ نقاد ادب کی ماہیت کے سمجھنے، نقاد کے منصب کا تعین کرنے، ادیب کی آزادی اور سماجی ذمہ داری کا صحیح توازن قائم کرنے ادب کے جمالیاتی اور افادی حیثیتوں میں تعلق پیدا کرنے اس کی حقیقی نوعیت کا اندازہ لگانے، مواد اور ہیئت کے رشتے کو سمجھنے اور تنقید کے ذریعہ ادبی ذوق کی تربیت کرنے میں لگے ہوئے ہیں اس سے مایوس ہونے کی وجہ نہیں ہے، تنقید شعور کا افق روشن کرنے اور ذوق ادب کی تہذیب میں سرگرم ہے تو وہ اپنا فرض ادا کرتی رہے گی۔"

احتشام صاحب آخری لمحات تک اپنے مشورہ اور اصول پر عمل کرتے رہے۔ انھوں نے تنقید کو خشت پہل نگینہ بنا دیا۔ میں نے تنقید کے ارتقا کی کہانی خود انھیں کی زبانی سنانے کی کوشش کی ان اقتباسات سے واضح ہو جائے گا میں کہاں تک اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہوں۔

شمع روشن خموش ہے کہئے

۱۹۷۲ء

(خیالؔ ما ہلی)

تصوّرات و تاثرات

و

تاریخہائے وفات

آہ وہ اُردو کا محسن وہ ادیبِ خوش کلام
ایک بے مایہ زباں کو دے گیا حسنِ دوام
اک بجھی قندیل سے جس نے تراشے آفتاب
دے کے دل پر داغ رخصت ہو گیا وہ احتشام

صمد جاوید

شمیم کرہانی

امتزاجِ شعلہ و شبنم

جانِ برادر

(پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کی یاد میں)

(اضافہ و ترمیم کے بعد)

برادرِ محترم شمیم کرہانی صاحب کی یہ نظم نیا دور میں چھپ چکی ہے لیکن میری استدعا پر شمیم کرہانی صاحب نے اس میں کچھ بندوں کا اضافہ کر دیا ہے نیز کچھ مصرعے اس کے بدل دیئے ہیں۔

(مرتب)

انسانیت کا چاہنے والا کہاں گیا
شانِ ادب تھی جس سے دوبالا کہاں گیا
گنگا کے ساحلوں کا اجالا کہاں گیا
دھرتی اداس ہے کہ ہمالا کہاں گیا

دیر و حرم کے دل کو نہیں یہ الم قبول
گریاں ہیں مومنانِ دلِ افسردہ و ملول
ہندو لٹا رہے ہیں جنازے پہ ہار پھول
اُڑ اُڑ کے آ رہی ہے مری سمت کیسی دھول

دنیائے نگاہ و نقد کی تاراج ہوگئی
غمگیں ہے فکرِ ہند کہ بے تاج ہوگئی

ہر سو، ہجومِ اشک ہے، کیوں ہے، پتہ نہیں
اتنا غبار ہے کہ مجھے سوجھتا نہیں

چھایا ہوا ہے ابرِ سیہ فکر و ہوش پر
نوحے لرز رہے ہیں زبانِ خموش پر
آنسو ٹپک رہے ہیں رخِ گلفروش پر
کون اُٹھ گیا یہ کس کا جنازہ ہے دوش پر

لاؤ ذرا قریب جنازہ تو دیکھ لوں
تابوت کھول دو کہ سراپا تو دیکھ لوں
اجڑی ہوئی بہار کی دنیا تو دیکھ لوں
رخ سے کفن ہٹاؤ میں چہرا تو دیکھ لوں

دنیائے علم و فن میں ہے شور آہ آہ کا
گل ہو گیا چراغ یہ کس بارگاہ کا

اللہ یہ تو نقد و نظر کا امام ہے
جس کے لیے فنا نہیں وہ احتشام ہے

وہ یارِ دل نشیں وہ عزیز بلند بام
اُردو کا تاجدار، ادب کا فلک مقام
رنگیں تھی جس سے صبح، چراغاں تھی جس سے شام
زندہ تھی جس سے رسمِ رہِ نامہ و پیام

حرفِ صبا تھا، بوسۂ موجِ نسیم تھا
گزرا وہ احتشام جو جانِ شمیم تھا

جو افتخارِ نوعِ بشر تھا وہ احتشام
جو ناقدِ علوم و خبر تھا وہ احتشام
جو مایہ دارِ فکر و نظر تھا وہ احتشام
جو تیشہ کار و آئینہ گر تھا وہ احتشام

جس کے قلم پہ ظلمتِ شب ٹوٹتی رہی
لیکن قلم سے فن کی کرن پھوٹتی رہی

"ایمان" جس کی روح کا پیکر وہ احتشام
"عرفان" جس کے ذہن کا محور وہ احتشام
"عرفان" جس کے علم کا جوہر وہ احتشام
کوزے میں بھر گیا جو سمندر وہ احتشام

جدت طرازِ فکر و معانی گزر گیا
دریائے تراش کے پانی گزر گیا

وہ نکتہ رس ادیب وہ نقاد احتشام
تنقیدِ عصرِ تازہ کی بنیاد احتشام
تخلیقِ فن کا تیشۂ ایجاد احتشام
وہ بے ستونِ فکر کا فرہاد احتشام

فن کے لیے عرق میں نہاتا چلا گیا
دیوانہ جوئے شیر بہاتا چلا گیا

مشکل کشائے منزلِ پیچیدہ احتشام
در وا کشائے سینۂ فہمیدہ احتشام
دانائے روزگار و جہاں دیدہ احتشام
تہ میں خروش، سطح پہ سنجیدہ احتشام

دل میں ہزار کرب و تلاطم لیے
لیکن لبوں پہ موجِ تبسم لیے

وہ عزمِ محکم کا وہ بیداریٔ نمو
وہ ذہن اعتبار وہ تخئیلِ جستجو
وہ معتدل مزاج، ملائم وہ گفتگو
جیسے رواں ہو جاگتی سوتی سی آبِ جو

حرف نوا میں، عکسِ مفکر کے
شبنم کے آئینے میں تبسم گلا

تحریر تھی کہ کوئی دوا بہرِ دفعِ زہر
تقریر تھی کہ زندگیٔ جاوداں کی نہر
گفتار تھی کہ لہر کے حلقے کے ساتھ لہر
رفتار تھی کہ جیسے رواں روشنی کا شہر

جب وہ چلا تو فکر کی ضو جھوم
نقشِ قدم کو صبحِ نظر چوم

ہئیت کی وضع، فکر کی تشکیل دیکھیے
تہذیبِ حرف و لفظ کی تکمیل دیکھیے
جذبات کی صداقتِ ترسیل دیکھیے
ذہنِ رسا پہ سایۂ جبریل دیکھیے

ہم پر کھلا، فراقِ مبارک نفس
آتے ہیں ایسے لوگ ہزاروں برس

شغل مطالعہ میں گذاری تمام عمر
نبض حیاتِ ذہن ابھاری تمام عمر
زلفِ نگارِ فکر سنواری تمام عمر
تصویر زندگی کی اتاری تمام عمر

جو نطق ہے، تاثرِ حالاتِ وقت ہے
جو حرف ہے وہ پرتوِ جذباتِ وقت ہے
جو ذہن ہے وہ عکسِ خیالاتِ وقت ہے
جو فکر ہے وہ عہدِ ملاقاتِ وقت ہے

کیا پیکرِ شعور تھا حکمت شعار تھا
رکھتا تھا وہ قلم جو حقیقت نگار تھا

کم ہو سکیں نہ وقت کی پہنائیاں کبھی
پیکر کو چھوڑتی نہیں پرچھائیاں کبھی

دانش میں کائنات کی پہنائیاں ملیں
تخلیق میں حیات کی رعنائیاں ملیں
تنقید میں سماج کی گہرائیاں ملیں
دانا کی بات بات میں سچائیاں ملیں

کردار کیا ہے، رقصِ مہ و سال گم شدہ
اطوار کیا ہیں، ماتمِ افعال گم شدہ
افکار کیا ہیں مظہرِ احوال گم شدہ
اذہان کیا ہیں دفترِ اعمال گم شدہ

ناقد تھا پھر بھی مونس و ہمدم تھا احتشام
کیا امتزاجِ شعلہ و شبنم تھا احتشام

شاعر جو کہہ رہا ہے زبانِ سرور سے
ارسال ہو رہا ہے وہ تحت الشعور سے

"تنقید"[1] تھی کہ تجزیۂ طینتِ دماغ
ذہنوں میں کتنے زخم تھے سینوں میں کتنے داغ
پامالِ بادِ حزن تھا کیوں زندگی کا باغ
جلتا تھا کن ہواؤں میں تہذیب کا چراغ

"لمحہ" دلوں کو ذوقِ سفر کا پیام ہے
"لمحہ" اگر ہے خام تو دانش بھی خام ہے
ہر دور ایک قافلۂ تیز گام ہے
سمجھو کہ زندگی جدلیت[2] کا نام ہے

دل کیوں تپاں تھا ضربِ سنین و شہور سے
کیوں ڈھل رہی تھی ظلمتِ شب صبحِ نور سے

جو اِس معاشرے میں تہہ دام رہ گیا
اظہار کی جدال میں ناکام رہ گیا

ماحول ہی سے ہوتا ہے کردار کا جنم
ملتے ہیں گردشوں سے فطرت کے پیچ و خم
موسم ہے سازگار تو محفل میں جامِ جم
قسمت اگر خفا ہے تو شاعر کی آنکھ نم

پیمانۂ وجود کو حرکت[3] بھی چاہیئے
حرکت کو اک سلیقۂ حکمت بھی چاہیئے
لیکن تغیرات کو ہمت بھی چاہیئے
تھوڑی روایتوں سے بغاوت بھی چاہیئے

تحریر کیا ہے پرتوِ آلام ہی تو ہے
آئینہ دارِ گردشِ ایام ہی تو ہے

جنبش بقدرِ ذوقِ تمدن ضرور ہو
لیکن بغاوتوں میں توازن ضرور ہو

[1] یہاں سے سولہ بند مرحوم کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہیں۔ [2] DIALECTICAL MATERIALISM [3] حرکت کی رہ تحریک ہے۔ لیکن یہاں عام بول چال

نقاد کا وجود ہے کشاف کی طرح
ادوار کو ڈھنکتا ہے نداف کی طرح
لمحوں کو گوندھ دیتا ہے نوباف کی طرح
کھلتے ہیں راز نکہت شفاف کی طرح

ہر لفظ فہم ذات کا اک زینہ ہو گیا
جو عکس آگیا وہی آئینہ ہو گیا

تنہا نہیں ہے فرد غم احتیاج میں
وجدان مشترک ہے تفکر کے راج میں
فن ہے مفاہمت کا ذریعہ سماج میں
کٹتی ہے عمر ذہن اسی امتزاج میں

شاعر کی ذات کیا ہے تقاضا حیات کا
شاعر بھی ایک جزو ہے اس کائنات کا

"رجحان" ایک فرد کی تکریم تو نہیں
"تخیل" ذات و عکس کی تقسیم تو نہیں
"ماضی" شمار و ضرب کی تقویم تو نہیں
"فردا" شعور حال کی ترمیم تو نہیں

فن کار چھوٹ جائے گا کیونکر حیات سے
رشتہ جڑا ہوا ہے زمانے کا ذات سے

"تاریخ" ہے صعود و تکامل کا آئینہ
"تہذیب" کے طراز و تسلسل کا آئینہ
تعمیر کے شکوہ و تجمل کا آئینہ
تزئین کے شعور و تعقل کا آئینہ

لیکن نظر جو باعث تفسیخ بن گئی
تنقید خشت اول تاریخ بن گئی

"تنقید" موشگاف و دقیقہ شناس ہے
ایوان اجتماع کا سنگ اساس ہے
تعذیر اہل فن کے لیے بے ہراس ہے
تنقید ہر ادیب کا ذہنی لباس ہے

کرتی ہے جمع پاک خیالوں کو ڈھونڈ
لاتی ہے ظلمتوں سے اجالوں کو ڈھونڈ

اقدار ہیں شکار ہوائے تغیرات
لیکن ابد قرار ہے عطر تصورات
بنتی ہے انہدام سے تعمیر نو کی بات
پیکر پذیر ہوتی ہے اک تازہ کائنات

تغیر حال، دانش فردا کی دھوپ۔
یہ ارتقائے فکر نئے فن کا روپ۔

ناقد ہے اور ذہن کی بازآفرینیاں
نیرنگ کیفیات کی طلعت جبینیاں
جمعیت شعور کی حکمت گزینیاں
یعنی اسے پسند نہیں نکتہ چینیاں

بڑھتا نہیں ہے فرد پہ خنجر کو تان
ہوتا ہے اس کا وار زمان و مکان

لذت کو انبساط کا کیوں بانکپن ملے
عریانیوں کو پردۂ اظہار فن ملے
ننگے اگر ہیں تن تو انھیں پیرہن ملے
دیکھو جو کوئی لاش تو سوچو کفن ملے

ذہنوں میں دیکھ کر اسے کیوں ارتعاش
آخر وہ لاش بھی تو ہماری ہی لاش

تہ خانۂ بطونِ عوامل ہے شاعری
روادِ کربِ خارج و داخل ہے شاعری
اسرارِ شش جہت سے مقابل ہے شاعری
تنہا اگر ہے ذہن تو مشکل ہے شاعری
ہر سمت ایک قافلۂ صد خیال ہے
شاعر کا بے ہجوم نکلنا محال ہے

غم ہائے زندگی سے پریشاں نہیں ملا
محورفوئے چاک گریباں نہیں ملا
گھر میں ادیب کے کوئی ساماں نہیں ملا
آخر کو دردِ دل کا بھی درماں نہیں ملا
اوروں کا زخم سن کے، جگر اپنا پھاڑ کے
درویش[1] اُٹھ کھڑا ہوا دامن کو جھاڑ کے

لہجے کو بے عمل کوئی ندرت نہ مل سکی
ہیئت کو بے مواد لطافت نہ مل سکی
افسانے کو زبانِ حقیقت نہ مل سکی
فنکار کھو کے رہ گئے عظمت نہ مل سکی
دوراں کے واسطے ہو کہ محبوب کے لیے
پیغام کوئی چاہیے اسلوب کے لیے

علم و ادب کا رعب جماتا نہ تھا کبھی
دولت کی آب و تاب دکھاتا نہ تھا کبھی
قاقم و گل سے گھر کو سجاتا نہ تھا کبھی
احسان کر کے سب کو بتاتا نہ تھا کبھی
کتنا بلند ظرف تھا، عالی وقار تھا
سرمایہ دارِ فن تھا، مگر خاکسار تھا

القصہ نقدِ فن کا تصور عظیم تھا
ہر نقطۂ احتساب جدید و قدیم تھا
خلوت میں شمع تھا سرِ منبر کلیم تھا
پیغام میں صبا تھا سخن میں نسیم تھا
اس دورِ بے خلوص میں لحن اُس کے پیار کا
جیسے خزاں کے دشت میں جھونکا بہار کا

تعظیم کی نظر سے گزرتی تھی خانقاہ
کعبے کے اہلِ درد کی رہتی تھی دل میں چاہ
کاشی کے دوستوں سے بھی ملتا تھا گاہ گاہ
کچھ اشتراکیت سے بھی رکھتا تھا رسم و راہ
رہتا تھا گامزن جو محبت کی راہ میں
محو نماز بھی وہ ملا عید گاہ میں

چارہ تھا رنج و دردِ عزیزاں کے واسطے
مرہم تھا زخمِ قلبِ یتیماں کے واسطے
صبحِ وطن تھا شامِ غریباں کے واسطے
اک نعمتِ عظیم تھا انساں کے واسطے
صبحِ زمیں نواز کی ضو تھی سرشت میں
دل تھا کہ جیسے پھول کھلا ہو بہشت میں

وہ صلحِ کل، وہ بندۂ حق گو وہ باخدا
وہ سوگوارِ غربتِ مظلومِ کربلا
وہ بادہ خوارِ کوثر و مست مئے ولا
وہ اہلِ دل، وہ عاشقِ محبوبِ کبریا
دل کا غنی تھا، خوگرِ نانِ شعیر تھا
مولائے کائنات کے در کا فقیر تھا

[1] میر انیس کے مصرعہ: "شبیر اُٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے" سے استفادہ۔

ظلمت بدوش رات الٹتی تھی جب نقاب
آنکھیں تمام شہر کی ہوتی تھیں محو خواب
شوقِ نگاہ دل کو جگاتا تھا اضطراب
کھلتی تھی اُس کے سینۂ اسرار پر کتاب

ذوقِ مطالعہ تھا کہ جامِ خمار تھا
وہ رند تھا کہ عابدِ شب زندہ دار تھا

دیکھو کتابِ فکر دھڑکتا ہے اُس کا دل
جو حرف ہے گماں کے لیے ضربِ مستقل
جو لفظ ہے اجل کے لیے امرِ جاں گسل
جو سطر ہے وہ صفحۂ ہستی پہ مستقل

نقشِ ابد ہوں پرتو آنی نہیں ہوں میں
نقاش کہہ رہا ہے کہ فانی نہیں ہوں میں

وہ سادگی پسند، بڑا ذی شعور تھا
آرائشِ عبارتِ رنگیں سے دور تھا
مقصد کے انشراح کا قائل ضرور تھا
اظہارِ انتقاد پہ اُس کو عبور تھا

رد کو چلا ستا دوِ فکر رسا کہاں
پائیں گے ایسا ناقد رمز آشنا کہاں

ٹھہرا ابھی تو جنازۂ ذی احتشام کو
اس کی ابھی طلب ہے خواص و عوام کو
کہہ دو کہ لوگ آئے ہیں ذکر و پیام کو
بھائی! کرو قبول ہمارے سلام کو

کیوں ایسی بے رُخی ہے کہ گردانتے نہیں
اپنے شمیم بھائی کو پہچانتے نہیں

دلّی سے آرہا ہوں ملاقات کے لیے
ذکر مزاج و پرسشِ حالات کے لیے
تحصیلِ انبساط مدارات کے لیے
تقصیرِ حاضری کی مکافات کے لیے

مُنھ چادرِ سفید سے کیوں کھولتے نہیں
کیا مجھ سے کچھ خفا ہو کہ تم بولتے نہیں

ہر آنکھ ہے تمھاری ہی جانب لگی ہوئی
جاگو کہ غم کی دھوپ زیادہ کڑی ہوئی
آنسو بہا رہی ہے ثریا[2] کھڑی ہوئی
سوچو ذرا تمھاری سعیدہ[1] بڑی ہوئی

نکھرا ہوا حیات کا چہرا تو دیکھ لو
تم اپنی آرزوؤں کا سہرا تو دیکھ لو

دیکھو تو اُٹھ کے عون[3] و محمد[4] کا حال زار
ارشد[5] ہے اشکبار تو اقبال[6] بیقرار
بے چین ہیں وجاہت[7] و انصار[8] و اقتدار[9]
وہ اقتدار تم کو زیادہ ہے جس سے پیار

جس پر نگاہ رکھتے تھے دلبند کی طرح
پالا تھا جس کو گود میں فرزند کی طرح

ماں کس قدر فراق پسر میں نڈھال ہے
روتے ہیں غیر دیکھ کے یہ اُس کا حال ہے
ہر اک سے پوچھتی ہے کہاں میرا لال ہے
ماں کی طرح بہن بھی اسیرِ ملال ہے

مجروحِ درد ہے دلِ برباد کی طرح
وہ بھی رہینِ گریہ ہے اولاد[10] کی طرح

۱؎ ۲؎ بیٹیاں۔ ۳؎ ۴؎ ۵؎ ۶؎ بیٹے۔ ۷؎ ۸؎ ۹؎ بھائی ۱۰؎ اولادِ اصغر۔ بہنوئی

قسمت نے کیا لیا ہے قیامت کا امتحاں
دیکھو شریکِ زیست کی جانب کہ ناگہاں
آنچل سفید ہو گیا ٹھنڈی ہیں چوڑیاں
آنکھیں لہو میں غرق تو چہرہ دھواں دھواں
صندل کہاں ہے آنگ میں اب گرد یاس ہے
دل ایسا بجھ گیا ہے کہ دنیا اداس ہے

کہتے تھے جس بہن کو محبت سے آیا جانؔ
بیتاب و مضطرب ہے تمھارے لیے ہر آن
بیمار ہے پڑی ہوئی دلّی میں خستہ جان
تم کیا گئے کہ ٹوٹ پڑا اُس پہ آسماں
غم اور بھی زیادہ ہے نا چار کے لیے
آ بھی سکی نہ آخری دیدار کے لیے

لکھا ہے خونِ دل سے جو افسانہ دیکھ لو
کیا غمزدہ ہے جلوۂ جانانہ دیکھ لو
کیسا اجاڑ ہو گیا کاشانہ دیکھ لو
ویران ہے تمھارا کتب خانہ دیکھ لو
کیا ہو گیا کہ فکر ہے تم کو نہ درد ہے
دیکھو ہر اک کتاب کے چہرے پہ گرد ہے

لکھتے تھے جس قلم سے تم افسانۂ ہنر
لپٹا ہوا غبار میں رکھا ہے میز پر
تکتا ہے خشک ہاتھ کی جانب بچشمِ تر
یعنی مجھے سنبھال لے اے دستِ دیدہ ور
زخموں سے چور کرب سے ٹوٹا پڑا ہوں میں
کتنے بلند ہاتھ سے چھوٹا ہوا ہوں میں

کیا اب نہیں لکھے گا حکایاتِ خاص و عام
کیا زندگی کو دے گا نہ اب فکر کا پیام
تحریر کیا کرے گا نہ خط دوسروں کے نام
کتنے نقوش ہیں جو ابھی تک ہیں نا تمام
مالک! رفیقِ علم و ادب کا پیام لے
اٹھ اپنے سوگوار قلم کا سلام لے

اے شارحِ معانی و اسرار السلام
اے تاجدارِ دانش و افکار السلام
اے ناقدانہ تاج کے معمار السلام
اے لازوال میرے قلمکار السلام
حرفِ بقاست نقش و نگارِ پیامِ ما
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

لہ میری شریکِ حیات۔

جمیلؔ مظہری

آہ احتشام

کیسی صدائیں ذہن سے ٹکرا رہی ہیں آج　　یہ آج کس کی موت پہ گریاں ہیں خاص و ع
یہ کس کی لاش ہے کہ پشیماں ہے موت بھی　　شمعِ خموش پر ہے پتنگوں کا اژد
ہے مرگِ ناگہاں کی شقاوت بھی اک سوال　　لیکن جمیلؔ ورد بہ لب ہے خدا کا :

یعنی کہ ہر تاثرِ رنج و نشاط کو　　چین جبینِ شرع کا لازم ہے احتر
کہئے کہ اس جہاں کا ہر اندھیر ہر فساد　　آدم کی نسل سے ہے فرشتوں کا انتق
ہے یہ کہ موت ظلم ہے اور زندگی بھی ظلم　　بنیادِ ظلم پر ہے یہ تخلیق کا نظا

لیتی ہے سینہ زوریٔ فطرت تپش سے نور　　دیتی ہے آہِ گل کو صبا بوئے گل کا نا
نکہت کو اضطراب تجلّی کو التہاب　　آتا نہیں سمجھ میں یہ قدرت کا انتظ
آتی ہے تیرگی میں ستاروں کو نیند سی　　آنکھوں کو موندتے ہیں جگر گوشگانِ شا

گرمی میں جب ہو پیاس تو دریا ہے سوکھتا　　جاڑے میں برف بار ہوائیں بہ التزا
بے جا کہ علم خوار ہے اور جہل سرفراز　　بے جا کہ عشق پا بہ رسن عقل بے زما
بے جا ہیں الغرض کہ امورِ قضا و قدر　　بے جا حیاتِ مظہریؔ و مرگِ احتشا"

وہ احتشام مادرِ اردو کا حوصلہ — وہ احتشام وہ فنِ تنقید کا امام
چپ ہے جو آج وقت کا وہ بولتا قلم — تنقید بے زبان ہے تحقیق بے کلام
اب اس کا کوئی ٹوکنے والا نہیں رہا — رفتارِ فکر و فن کی ہوئی اور بے لگام
اک احتشامِ علم و وقارِ ادب تھا وہ — کرتا ہے ارتقائے ادب آج اسے سلام
اس کے نقوشِ فکر و نظر لازوال ہیں — تاریخ اپنے لوح پہ لکھے گی اس کا نام
با ایں ہمہ کمال دل سادہ و غریب — اس کا نہ تذکرہ ہو تو ہے ذکر ناتمام
اخلاص با خلوص تھا ایثار بے ریا — شائستگی تو جزوِ طبیعت تھی لاکلام
دی اس کے انکسار نے ٹوک اقتدار کو — اترا بلندیوں سے غرورِ بلند و بام
روئے نہ ایسے دوست کو کس طرح دوستی — ہوک اٹھتی ہے دلوں میں جب آتا ہے اسکا نام
ہیں سینہ چاک دانش و دیں اسکے سوگ میں — کہتی ہے عقل بھی کہ نہیں صبر کا مقام

شہر الہ آباد سے اردو زبان سے
ہاتف یہ کہہ رہا ہے "گیا تیرا احتشام"

۱۳۹۲ھ

نورالحسن ہاشمی۔

بہ یادِ سیّد احتشام حسین

میرے پرانے رفیق کار اور دوست سیّد احتشام حسین صاحب کی ناگہانی وفات کا سانحہ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو بوقت صبح پیش آیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء سے ۴ جنوری ۱۹۷۳ء تک انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کا چوتھا سالانہ جلسہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ہوا۔ ان کی کمی ہر جلسہ میں تمام مقامی اور باہر سے آئے ہوئے اساتذہ نے بڑے اندوہ وغم کے ساتھ محسوس کی۔ اسی انجمن کی ایک مختصر بزم مشاعرہ (منعقدہ یکم جنوری ۱۹۷۳ء بوقت شب) کا آغاز اس نظم سے کیا گیا تھا۔)

(ہاشمی)

ناگاہ کوئی دوست جو دنیا سے گزر جائے
اک تیر سا کیونکر نہ کلیجے میں اتر جائے

شاخِ گل صد رنگ ملے صبح جو ٹوٹی
روتی ہوئی گلشن سے نہ کیوں بادِ سحر جائے

مانوس تھے جس شمع سے، بجھ جانے سے اسکے
لگتا ہے اندھیرا سا، نظر اپنی جدھر جائے

ہر بزم ادب میں نظر آتا ہے خلا سا
کس طرح نگاہوں کی یہ افتاد نظر جائے

گم سم نہ ہوں کیونکر ترے احباب اعزّہ
تم یوں گئے جیسے کوئی بن موت کے مر جائے

اک قافلہ سالار تھا تو نقدِ ادب کا
یہ قافلہ اب دیکھیں کہاں جائے کدھر جائے

منقوش دلوں پر ہے تری صورت و سیرت
ممکن نہیں تا زیست دلوں سے یہ اثر جائے

تیرے رفقاء، دوست و شاگرد سبھی ہیں
آجائے اگر تو بھی تو یہ بزم نکھر جائے

★ ★

فتوحؔ کوٹوی (کوٹہ) راجستھان

اے شمعِ علم، چراغِ خرد، ضیائے وطن!

اے شمعِ علم، چراغِ خرد، ضیائے وطن — بلا کشانِ محبت سلام کہتے ہیں
بہ چشمِ زار، بہ طبعِ حزیں، بہ قلبِ ملول — فسردگانِ طبیعت سلام کہتے ہیں
سلجھ سلجھ کے جو اب بن گئے ہیں کیفِ وطن — وہ عقدہ ہائے سیاست سلام کہتے ہیں
ہے لفظ لفظ میں جن کے نہاں پیامِ عمل — وہ خطبہ ہائے صدارت سلام کہتے ہیں
ہے جن میں آج بھی آسودگیٔ قلب و نظر — وہ نکتہ ہائے بلاغت سلام کہتے ہیں
عیاں ہے آج بھی جن سے ضیائے دانش و فہم — وہ جلوہ ہائے فصاحت سلام کہتے ہیں
جو ہمتوں سے تری، غم میں بھی چہکتے تھے — وہ خوش دلانِ مصیبت سلام کہتے ہیں
ملا ہے جن کو ترے درس سے فروغِ نظر — وہ طالبانِ حقیقت سلام کہتے ہیں
ترے اشاروں سے سمجھے ہیں جو مقامِ سلوک — وہ سالکانِ طریقت سلام کہتے ہیں
جو معترف ہیں ترے جوہرِ شرافت کے — وہ بندگانِ عقیدت سلام کہتے ہیں

یہاں مزار پہ اکرام ذوالجلال رہے
وہاں تو گلشنِ فردوس میں نہال رہے

از نسیم واسطی۔ جونپوری۔
(ایم۔اے، بی، ایڈ)

ناقدِ بے مثل۔ ہم پلّہ ترا کوئی نہیں،

اہلِ دانش نے بہت کچھ کھو دیا پانے کے بعد
احتشام خوش طبیعت تیرے اٹھ جانے کے بعد
گلشنِ علم و ہنر میں کیا رہے۔ جب تو نہیں
پھول بھی خوشبو کہیں دیتا ہے مرجھانے کے بعد

باغِ اردو کے لئے تو تھا بہارِ نو بہار
عکس خود جس کا، کتابوں سے ہے تیری آشکار
حشر تک تجھ کو بھلا سکتے نہیں اہلِ قلم
کام میں لائیں گے تیرے مسودوں کو بار بار

ناقدِ بے مثل، ہم پلّہ ترا کوئی نہیں
یوں تو کہنے کو "خدا رکھے" بہت ہیں نکتہ چیں
رات دن اردو ادب کی کر رہے ہیں خدمتیں
اہلِ علم و اہلِ دانش۔ خوش خیال و دوربیں

موت برحق ہے، ترا مرنا بھی لازم تھا مگر
کیوں بھلا۔ دی تھی خدا نے تجھ کو عمرِ مختصر
اور کچھ دن تو رہا ہوتا۔ تو ممکن تھا نسیم
تیری نگرانی میں کرتا کارِ تحقیق و نظر

سید محمد عقیل

روشنی ختم ہوئی

سید احتشام حسین صاحب کی ناگہانی موت پر

روشنی ختم ہوئی
وقت کا جادو ٹوٹا
شاخیں
آوارہ خیالوں کی طرح بیکل ہیں
جن میں پتے ہیں نہ پھل
ہر طرف بادِ خزاں پھرتی ہے پَر پھیلائے

رگِ تخئیل سے بہنے لگا
افکار کا خون

چہرۂ ذہن پہ غمناک اندھیرا کانپا
حسنِ اخلاق و مروّت کی قبا چاک ہوئی
محفلِ علم و ادب وادیٔ خاموش ہوئی

موسموں نے یہ کہا

ہم میں رہا کیا باقی
کیوں فریب اپنی نگاہوں کو کوئی دیتا ہے
فصلِ گل ختم ہوئی
حسن کا جادو ٹوٹا
نغمے
سینوں میں کٹاروں کی طرح چبھتے ہیں
ہر طرف بادِ خزاں پھرتی ہے پَر پھیلائے
زندگی
موت کی سایوں میں سمٹ آئی ہے
چاندنی
ٹوٹ کے سینے میں اتر آئی ہے
روشنی ختم ہوئی
وقت کا جادو ٹوٹا

نسیم واسطی ایم، اے

نذرِ احتشام

اے محسنِ اُردو زباں، خوش فکر، خوش دل، خوش بیاں — تجھ کو بُھلا سکتے نہیں ، اہلِ ادب ، اہلِ زباں

تو لائقِ تعظیم ہے، تجھ سے محبت فطرتاً — کرتے رہیں گے حشر تک اِس ملک کے پیر و جواں

تو علم کے میدان میں رکھتا تھا شاہانہ حَشم — جُھکتا تھا تیرے سامنے، علم و ادب کا آسماں

تیری بزرگی کے لیے کافی ہے کہ دیسنا یہی — لوہا ترا مانے ہوئے بیٹھے ہیں سارے علم داں

تو ناقدِ بے مثل تھا، تو تھا ادیبِ بے بدل — کہنے کو ناقد ہیں بہت پر کوئی تجھ ایسا کہاں

اخلاق میں، کردار میں، گفتار میں، تحریر میں — احباب تجھ کو آج بھی کہتے ہیں میرِ کارواں

رطب اللسانی کا تری منکر جہاں میں کون ہے؟ — جب ہے ثبوتِ مُعتبر شیرینیٔ اُردو زباں

تیرا نشانِ علم و فن دنیا میں جھک سکتا نہیں — گزری ہے تیری زندگی ہر حال میں جب کامراں

توصیف تیری کیا کروں تو سر بسر موصوف تھا — تیرا قصیدہ کہہ سکوں امکان میں اپنے کہاں

تجھ کو وطن سے پیار تھا۔ تجھ پر وطن کو ناز تھا — تجھ کو بھلا سکتا نہیں، تیرا وطن، ہندوستاں

پریاگ ہو یا لکھنؤ، دونوں ترے مدّاح ہیں
تو عرصۂ ہستی میں تھا دونوں جگہ کا میہماں!

اُستادِ احتشام حسین

مُرد اُستاد احتشام حسین   خالی از علم شد جہاں افسوس
مُرد یک نکتہ داں و نکتہ شناس   رفت سرخیلِ ناقداں افسوس
مُرد یک شاعرِ شگفتہ بیاں   رفت سرتاجِ شاعراں افسوس
مُرد یک مردِ عالمِ جیّدؔ   رفت توقیرِ عالماں افسوس
مُرد یک مردِ بے عدیل و نظیر   رفت جانِ یگانگاں افسوس
مُرد شخصے کہ بود صاحبِ نقد   شد سیہ بزمِ ناقداں افسوس
خوں ز چشمم چرا نہ ریزم من   رفت جوہر ز گوہراں افسوس

بیشۂ حرف و لفظ ویراں شد
مُردہ شد ضیغمِ زباں افسوس

وزیر پانی پتی

روشنی

(پروفیسر احتشام حسین کی یاد میں)

اسے روشنی کی تلاش تھی
وہ تمام عمر خیال و فکر کی وادیوں میں رواں رہا
یہ سفر نہ اس پہ گراں رہا
وہ جواں رہا

اُسے روشنی کی تلاش ہے
اُسے کیا خبر کہ یہ جستجو اسے روشنی ہی بنا گئی
وہ خود آج ایک چراغ ہے
وہ چراغ جس سے دیئے جلائے مسافرانِ تلاش نے
وہ چراغ اپنا بنا لیا جسے داستانِ تلاش نے

یہ جدید نسل جو بے شمار صعوبتوں کا شکار ہے
رہِ جستجو کا غبار ہے
اسے احتشام جو مل گیا تو یہ احترام نہ کیوں کرے
بہ ادب سلام نہ کیوں کرے۔

ماتمِ یک شہرِ آرزو

قمر ہاشمی

(پروفیسر احتشام حسین رضوی کے المناک حادثۂ مرگ پر)

ٹی ہیں لکیریں
کے رکنے سے
لگی ہے سیاہی
ق اٹھنے سے
ں کہ ماتم شہرِ علوم برپا ہے
ا نقد و نظر کی ہیں محفلیں سُونی

رسے کی عمارت
س کا سایہ بھی
ایک مدرسۂ فکر احتشام حسین
مدرسے کی فراست
مدرسے کا جلال
اس کا ذوقِ نموشتے
اس کا حسن و جمال

لال عون و محمدؔ ہی بس نہیں ہیں آج
وہ مکتبے وہ مدارس
وہ درس گاہیں بھی
جہاں انھوں نے پڑھا تھا
جہاں پڑھایا تھا
جہاں جہاں بھی ذہانت کا ان کی سایا تھا
کتابیں لفظ و معانی کے
جن میں دریا بند
رسالے فکر جو اُن کا تھا
جن میں شعلہ بند
سیاہ پوش ہیں حلقہ بگوشِ حسن بیاں

لہ پروفیسر احتشام حسین رضوی (مرحوم) کے صاحبزادگان۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی کے تعزیتی اجلاس میں پڑھی گئی)

ساجد رامپوری

تلاشِ مسیحا

میں ادب پارۂ فکر و فن ہوں
ادب پارہ!
جس میں شامل
لہو حسرتوں کا
جس میں تحریر
فسوں رت جگوں کا
ریشمی آنچلوں کی دھنک
زاویے ہیں بدن کے
کرب ماحول کا
"ذات" کے مسئلے ہیں
مجھ میں افسانے ہیں
شعر ہیں داستانیں ہیں
مجھ میں تنقید کی بیکراں وسعتیں ہیں
مگر!

فطرتاً خامشی کے جزیروں میں ہوں
میں گہر ہوں صدف کے لبادوں میں ہوں
سب پہ ظاہر ہوں لیکن کہاں
میرے چہرے کی روشن لکیریں پڑھے
ہر نظر میں وہ روشن سیاہی کہاں
اک نظر جس نے میری طرف غور سے دیکھا، پرکھا مجھے
مجھ کو تہذیب کے سبز "سگنل" دیئے
میرے اوصاف واضح کئے
ہر کثافت کو ٹھکرا دیا
وہ نظر، کھو گئی
اور اداسی کی تہمت لئے

مضطرب!
میں "تلاشِ مسیحا" میں ہوں۔

احمد رئیس۔ لاہور

پروفیسر سید احتشام حسین کی یاد میں

وہ ناقد فکر و فن نہیں تھا
وہ خالق زندگی تھا یارو
اُسے دعا دو
کہ اس نے ہم کو
یہ آگہی
یہ شعور بخشا
یہ علم و عرفاں کا نور بخشا
یہ زندگی دی
یہ زندگی کا نصاب بخشا
یہ نعرہ انقلاب بخشا
اُسے دُعا دو
کہ اس کے دم سے
ہم آج تاریخ بن گئے ہیں
ہماری ہر بات معتبر ہے
ہمارا ہر لفظ جاوداں ہے ،

شاھد علی نقوی ۔ لاہور

احتشام صاحب کی یاد میں

مجھ سے فرمائش کسی نے کی ہے، تم بھی کچھ لکھو
تم سے بھی تھا کچھ تعلق، اپنی ہی جیسی کہو
مشترک غم کے جلو میں، چند ساعت ہی رہو
تم بھی اس سیلِ الم میں چند لمحے ہی بہو
یہ تقاضائے محبت بھی ہے اور فطرت بھی ہے
اقتضائے شرفِ انسانی کی یہ خصلت بھی ہے

(۲)

اہلِ دانش لکھ رہے ہیں اسکے احوال و مقال
ارتقائے فکر کی زد میں تھے جسکے ماہ و سال
جس کا تخلیقی تفکر، فن کا اعجاز و کمال
جس کا تنقیدی تبحر آپ تھا اپنی مثال
ارتقاء کی قوتوں پر فکر جس کی چھا گئی
صبحِ نو کی ہر علامت جس کے دل کو بھا گئی

(۳)

جس کا اسلوبِ صداقت، رفعت فن کا امیں جس کی ہر تحریر میں خود اعتمادی کا یقین
کائناتِ شعر میں جو عاشقِ گوشہ نشیں جس کی ہر شام و سحر تھی روشنیوں کی زمیں

بزم آرا دھر میں، جو خوش خرام ناز تھا
جو مہماتِ قلم کا ہم سفر، ہم راز تھا

(۴)

جاہِ سلطانی، شکوہِ قیصری کی خلعتیں تلخیوں، ناکامیوں، حرص و ہوس کی علتیں
آدمیت کی بدستِ آدمی یہ ذلتیں باہمی آویزشوں میں مبتلا، یہ ملتیں

ہاں محرک تھی یہی تکرار اک رجحان کی
اک نئی دنیا کی خلقت کی، نئے انساں کی

(۵)

خشتِ حرف و صوت سے جس نے تراشے بام و در طبعِ خوش اخلاق جس کی کعبۂ رحمت اثر
ذہن کی کشکول میں آہنگِ ہستی کا شرر سر میں سودائے جہاں، دل میں امیدوں کے قمر

دجلہ و گنگا کی موجیں جس کی ہم آواز تھیں
پیرہن کی سلوٹیں جس کی قبائے ساز تھیں

(۶)

میں کہ جو ناواقفِ آدابِ فن روئے سخن میں کہ جو نا آشنائے سنبل و ریحانِ ختن
میں کہ جو اک اجنبی آوارگی جس کا چلن میں کہ من آنم کہ من دانم درونِ این چمن

میرا منصب اور، توصیفِ سخن کچھ اور ہے
اشکِ الفت اور، فرقت کی چبھن کچھ اور ہے

ڈاکٹر ابوالحسن رضوی

کس کس کا احتشام تھا جو اَب نہیں رہا

اے احتشامِ شیوۂ گفتار السّلام — اے احتشامِ جذبۂ بیدار السّلام
اے احتشامِ قوّتِ اظہار السّلام — اے احتشامِ اردوئے بےیار السّلام

تو علم کی فصیل، ادب کا حصار تھا
ہاں تیرا اعتبار بھی کیا اعتبار تھا

فکر و نظر کا قول ہمارا تھا احتشام — جذب و اثر کا قول ہمارا تھا احتشام
سوزِ جگر کا قول ہمارا تھا احتشام — علم و ہنر کا قول ہمارا تھا احتشام

سایہ میں اُس کے ایک زمانہ مکیں رہا
کس کس کا احتشام تھا جواب نہیں رہا

وہ فرد جو تھا فخر، جماعت کے واسطے — معراج تیری فکر، لطافت کے واسطے
تحریر تیری ناز، فصاحت کے واسطے — تقریر تیری لوح، خطابت کے واسطے

آزاد کر کے قید سے نزدیک و دور کی
تو ہے کہ جس نے دل کو زباں دی شعور کی

کیسی کھٹک ہے کون سے یہ خار دل میں ہیں — کیا درد و داغ اے لب اظہار دل میں ہیں
کیا حسرتیں بیان کی خوددار دل میں ہیں — کیونکر زباں پہ آئیں جو اشعار دل میں ہیں

صحنِ ادب کو حُسنِ چمن کون دے گا اب
کس کو سنائیں دادِ سخن کون دے گا اب

وہ منظرِ خلوص وہ دادِ سخنوری ۔۔۔ جیسے گہر کی آب پرکھتا ہو جوہری
غواصیٔ مزاج وہ ذوقِ سخناوری ۔۔۔ شہرِ سخن میں آئی ہے اب طرفہ ابتری
مضطر ہے فکر ساتھ جو تیری نظر نہیں
اپنا بیاں بھی اپنے لیے معتبر نہیں

کس کو سنائیں جا کے غزل اب غزل سرا ۔۔۔ ہے کون اب مزاجِ قصیدہ کا آشنا
تہذیبِ مثنوی کا تسلسل بگڑ گیا ۔۔۔ اب کون ہے سنائیں کسے جا کے مرثیا
تاریکیٔ مہیب کا ڈیرا ہے ہر طرف
ہر صنفِ شاعری میں اندھیرا ہے ہر طرف

خودداریٔ ادب وہ تری، بے ادب وہ دور ۔۔۔ اس عہدِ بے حسی میں تری شانِ فکر و غور
اظہار کا یہ طرز، یہ تیرے بیاں کا طور ۔۔۔ تنقید کے اصول کی اب سرحدیں ہیں اور
تنقید جیسے پھول پہ شبنم کی آب ہے
یا چاندنی میں تاج محل کا گلاب ہے

اے مہرِ نیمروزِ ادب، اے مہِ تمام ۔۔۔ ہے تیرے فیضِ خاص کا جوہر عطائے عام
صد اعتبارِ فکر و نظر، جرأتِ کلام ۔۔۔ تو آبروئے سوزِ کلیمی کا احتشام
سب کفر و دیں بیاں کا ہنر دیکھتے رہے
تیری نظر کو اہلِ نظر دیکھتے رہے

تفصیلِ ذکر میں وہ لطافت نیاز کی ۔۔۔ آزاد کا عروجِ بیاں، فکر سیدی
حالی کے دل کا درد بہ اندازِ دلبری ۔۔۔ شبلی کے اعتبارِ سخن کی شگفتگی
تحریر کا وقار یہ حُسنِ اتم بنا
جب مجتمع ہوئے ہیں تو تیرا قلم بنا

آئے حدِ بیاں میں تفکر کے معجزات ۔۔۔ صوتِ اذاں میں جذب ہوا، سوزِ سومنات
لفظوں کے انتخاب میں موسیقیٔ حیات ۔۔۔ شانِ خطاب جیسے کہ ہو دل سے دل کی بات
اب "ہاں" رہے زباں پہ ترے یا "نہیں" رہے
"ہر اک کو تھا یقیں کہ مخاطب ہمیں رہے"

وہ اعتدالِ ذوق وہ توازن کی وہ نظر — حُسنِ بیاں سے تیرے حسیں تھا حسین تر
جو خود بھی تھا شریکِ سفر ایسا راہبر — نقشِ قدم ترے رہِ فکر و شعور پر

ہر سمت سنگِ میل ہیں جیسے گڑے ہوئے
یا گام گام خضرِ ادب ہیں کھڑے ہوئے

حُسنِ بیاں کا لیکے جو تجھ سے ہنر گئے — اُن کی نظر سے کتنے مرقع نکھر گئے
کتنے نقوشِ رنگ سے تیرے ابھر گئے — رشتے حیات اور ادب کے سنور گئے

"اقبالؔ" تیرا ذہن تھا "غالبؔ" مزاج تھا
وہ تیرا دل "انیسؔ" کا بس جس پہ راج تھا

تنقیدِ فن میں حُسنِ عمل تیرا آشکار — تیری روایتوں میں بغاوت کا وہ نکھار
ذوقِ ادب، شعور کے جادے کا اقتدار — تیری نظر سمندر و ساحل کا اعتبار

تیرے کمالِ فن کے ہیں پیغام سامنے
یا ہے کوئی صحیفۂ الہام سامنے

حالیؔ کا وہ مقدمۂ شعر و شاعری — خود کہہ رہا ہے ذوقِ نظر سے یہ دلبری
تو ارتقائے فہم و تفکر کی ہے برتری — اب کتنا معتبر ہے مذاقِ سخنوری

عالم سجا ہوا ہے ترے معجزات کا
آزاد جام لائے ہیں آبِ حیات کا

تاریخِ فن کے مثبت و منفی وہ زاویے — مربوط زندگی سے ادب کے وہ فلسفے
سائنس کی ہو راہ کہ جادے ہوں آرٹ کے — ہر راہ ہر روش پہ ہیں نقشِ قدم تیرے

ہر شعبۂ حیات پہ تیری نگاہ تھی
یعنی کہ تیری ذات نہ تھی درسگاہ تھی

ماضی کا وہ تسلسلِ حال آشنا نظام — مستقبلِ حیات کا دیتا ہوا پیام
آیا ترے حضور جو لیکر ادب کا جام — جھک کر تجھے حیاتِ ادب نے کیا سلام

تو یوں بڑھا جو قیدِ سنین و شہور سے
اردو نے اپنے آپ کو دیکھا غرور سے

اُردو تری لحد پہ ادب سے جھکائے سر   ہے یوں لب سکوت سے ہر آن نوحہ گر
مطلق برہنگی ہے چھنا رسم خط اگر   اے آبروئے فکر و نظر جائیں اب کدھر

عُریانیوں کے چلتے ہیں تیر و سناں سلام
اے پاسبانِ عصمت لفظ و بیاں سلام

ہونٹوں پہ نظم و نثر کے ہے خوں بھری فغاں   چہرے سے نقد فن کے ہیں مایوسیاں عیاں
رُخ پر ادب کے بکھری ہوئی ہیں اداسیاں   اردو کے دل سے پوچھیے یہ غم کی داستاں

بے رونقی ہزار تھی پر تیرا نام تھا
سب کچھ اجڑ گیا تھا مگر احتشام تھا

کنبے کا حال غم میں ترے کتنا ہے سقیم   تیری شریک زیست وہ زخمیٔ خوف و بیم
بچوں کے بچیوں کے ہیں دل درد سے دو نیم   احساس بھائیوں کو یہ ہے اب ہوئے یتیم

ہر دل میں تیر درد و مصیبت کا گڑ گیا
تو کیا گیا کہ جیسے بھرا گھر اجڑ گیا

جب تک ادب کی فیض رسانی ہے دہر میں   تحریر کی خلوص بیانی ہے دہر میں
جب تک دلوں کی زمزمہ خوانی ہے دہر میں   جب تک کہ ربط لفظ و معانی ہے دہر میں

جب تک بشر میں ذوقِ شعور و شعار ہے
دنیائے ذکر و فکر کا تو تاجدار ہے

جعفر عسکری

کون ہوا تیرے بعد

والد صاحب کی یاد میں

کون دے شہر و بیاباں میں صدا تیرے بعد
بزمِ احساس میں قائم ہے خلا تیرے بعد

تو نے مایوس ارادوں کو جلا بخشی
دشتِ امید میں روشن ہے دیا تیرے

ایک تری ذات سے قائم تھا جنوں کا بازار
گوشۂ حرفِ جنوں سرد پڑا تیرے بعد

بارشِ سنگِ ملامت میں گزرنا تیر
یاد آیا مجھے اے آبلہ پا تیرے

پار دریائے حوادث کے لگائی کس نے
کشتیٔ فکر و نظر تیرے سوا، تیرے بعد

پی کے خاموش رہا تلخیٔ لمحات کا
حاملِ صبر و رضا کون ہوا تیرے

تو نے ظلمات میں وہ شمع منور کی تھی
تیری تحریر سے چھنتی ہے ضیا تیرے بعد

موسمِ ذہن پہ چھایا ہے تری یاد
کچھ سُراغِ غمِ الفت نہ ملا تیرے

منزلِ راہِ یقین اور ہوئی تابندہ!
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا تیرے بعد

پردۂ گوشِ تمنّا میں برابر جعفر
گونجتی ہے تری دلدوز نوا تیرے بعد!

نذرِ احتشام

م ہے کہ سارا وطن اداس ہے آج
ڈ گئی ہے چمن اداس ہے آج
انجمنِ شعر و فن اُداس ہے آج
یو آبروئے سخن تھا وہ نکتہ داں نہ رہا

ا ہے ایک کچھ ایسی بے اثری
دشت نوردی نہ شغلِ جامہ دری
گا کون اب اہلِ وفا کی راہبری
ہے کارواں تو مگر میر کارواں نہ رہا

تشام کہ تھا جس کا منفرد انداز
لفظ میں پنہاں لطیف سوز و گداز
بیانِ حقیقت کہیں بیانِ مجاز
جمالِ علم و ادب کا وہ پاسباں نہ رہا

ہر اک جام و سبو پر سکوت طاری ہے
نہ پیاس ہے نہ تمنائے میگساری ہے
لبوں پہ آہ ہے ماتم ہے اشکباری ہے
سُنا ہے جب سے کہ وہ جانِ میکشاں نہ رہا

اداس اداس سی ہے آج محفلِ اردو
ہیں بکھرے بکھرے ہوئے نظم و نثر کے گیسو
ہے اب بھی پھیلی ہوئی جس کے پیار کی خوشبو
وہ احتشام وہ فن کا مزاج داں نہ رہا

ہیں یوں تو اب بھی زمانے میں نکتہ دانِ ادب
نظر فروز ہے ہر سمت گلستانِ ادب
سنی تو جائے گی خیر ادب بھی داستانِ ادب
مگر حیات ادب کا وہ رازداں نہ رہا

ثمر بسوانی

سراپائے احتشام

کمالِ طبعِ مفکّر، شعورِ دیدہ ور — عروجِ عقلِ رسا، ارتقائے ذہنِ لب
سپہرِ علم و ادب، آفتابِ فضل و ہنر — امیرِ قافلۂ فن، امامِ نقد و نظ

ز فرق تا بہ قدم اک خلوص کی تصویر — رواں دواں سا محبت کا ایک جوئے ر
حدیثِ مہر و مروت کی مستند تفسیر — کرم کا جوہر آئینہ عفو کی تمثی

تری حیات، دیانت کا خوشنما گوہر — تری حیات، صداقت کا آئینہ بر
تری حیات، شرافت کے حسن کا زیور — تری حیات، امامت کے وصف کی منظ

خرامِ نرم، سبک مثلِ آبِ زمزم تھا — لباس، وضع، قطع سادگی کا پرچم تھ
طریقِ مشرق و مغرب کا ایک سنگم تھا — کلام غنچۂ نورس، مزاج شبنم تھ

مزاجِ ندرتِ تخئیل کے علمبردار — ترے بلند مضامیں، ترے حسین افکا
کہیں پہ قوس و قزح ہیں کہیں عروسِ بہار — قبولِ عام کی پہنے ہیں جبہ و دستا

شفیقِ علم تھا مقصد، زباں کی خدمت تھا — امام نقد تھا، مسلک، خرد کی جدت تھ
ادیبِ عصر تھا مشرب، عمل کی صحت تھا — محبِ دہر تھا مذہب، وطن کی الفت

بساطِ نرگس و نسرین و نسترن کہیے — بہارِ لالہ و گل، فخرِ انجمن کہ
شمیمِ مشکِ خطا، گوہرِ عدن کہیے — غرورِ اہلِ ادب، نازشِ وطن کہ

نثار عباسی

احتشام فکر و فن جاتا رہا

مضمحل تو ہی نہیں ہے اے نثار — ساری دنیائے ادب ہے سوگوار
بزم سے شیریں سخن جاتا رہا — احتشام فکر و فن جاتا رہا
مرثیہ خواں ہے فضائے صبح و شام — اٹھ گیا دنیا سے اک ذی احتشام
کس قدر تھا وہ ملنسار اور خلیق — ہر کس و ناکس کا تھا گویا رفیق
اپنے شاگردوں سے الفت تھی اسے — علم و دانش سے محبت تھی اسے
امتیاز خیر و شر رکھتا تھا وہ — "اختلافی بحث" سے بچتا تھا وہ
اس کی تنقیدوں کا اک معیار تھا — اس کو "کج بحثی" سے یکسر عار تھا
تھی لب و لہجہ میں اس کے اک مٹھاس — ہو گیا اس کا جو بیٹھا اس کے پاس
گل کھلایا ہے یہ قسمت نے عجیب — گل ہوئی ہے دفعتاً شمع ادب
چل بسا اک رہبر اردو زباں — قافلہ سالار و میر کارواں
مادر اردو نے کھویا اک پسر — بحر فکر و فن کا اک اعلیٰ گہر
مضطرب ہیں آج اہل فکر و فن — اٹھ گیا دنیا سے اک شیریں سخن

خالق "تنقید نو" تھا جو نثار
چل بسا دنیا کو کرکے سوگوار

مولوی عبدالسلام بیگ شفیقؔ

نظم

اے پروفیسر احتشام حسین
کم ہے اردو کرے جو تیرا بین

تیرا واللہ نطقِ گوہر بار
بحرِ اردو تھا قلزمِ زخار

نو بہار حدیقۂ اردو
زندگی بھر رہا بہ ہر دم تو

بہر زلفِ عروسِ اردو زباں
پنجۂ کلک تیرا شانہ کناں

تیرے تخئیل پر نثار ادب
تیرے دم سے تھا پُر بہار ادب

علم نازاں تیری بصیرت پر
فلسفہ کو تھا فخر حکمت پر

تھا تو دانائے رازِ حسنِ غزل
زیب کاوش تھی تیری دادِ عمل

تیری تحریر نازشِ تحریر
تیری فکرِ بلند پُر تاثیر

تو عدیم النظیر ناقدِ فن
تو وہ یکتا تھا قدردانِ سخن

تیری گفتار مثلِ باغ و بہار
اشہبِ فکر تھا سبک رفتار

جان نثار فروغِ اردو تھا
یادگارِ فروغِ اردو تھا

تیرا مداح عالم و نقاد
تیرا تلمیذ خاص خاص استاد

میں کہاں اور کہاں تیری توصیف
غیر ممکن ہے مجھ سے ہو تعریف

تیرا آئینہ دار یہ نمبر
خاکہ حالات کا ترے بہتر

تیرا ثانی ہو کون میرے شفیقؔ
تو وہ اردو کا تھا ادیب لئیق

سطوت رسول۔ دہلی۔

احتشام صاحب

لفظ اک علم ہے
حرف اک شکل ہے
اظہار، و الفاظ میں قید
آپس میں مربوط آہنگ

مبسوط جیسے لفظ و معانی
صحیفے، کتابیں، مضامین، اشعار
آنسو ہی آنسو
گریۂ شب کی نوحہ گری
دوشِ شب پر اٹھائے ہوئے
اک جنازہ فرشتے

آہ اب
احتشام ایک آنسو
اور
یاد، صرف پھول ہی پھول۔

ساغرؔ مہدی

نذر احتشام

(پروفیسر سیّد احتشام حسین مرحوم کی ایک غزل پر تضمین)

سر ہتھیلی پہ لیئے جانب دار آئے ہیں
اپنے خوں سے رہِ ہستی کو سنوار آئے ہیں
دشت و صحرا کا ہر اک قرض اتار آئے ہیں
"محفلِ دوست میں گو سینہ فگار آئے ہیں
صورتِ نغمہ بہ اندازِ بہار آئے ہیں"

سی لیئے ہونٹ کہ قصہ کوئی تحریر نہ ہو
پی لیئے اشک کہ چرچا نہ ہو تحقیر نہ ہو
یہ خرابی ہی کہیں خوبیٔ تقدیر نہ ہو
"اس نظر سے کہ ترے ظلم کی تشہیر نہ ہو
بے قراری میں لیے دل کا قرار آئے ہیں"

ایک دیپک سا کلیجے میں جلا رکھا تھا
تیز اور تند ہواؤں سے چھپا رکھا تھا
ورنہ اس قلب کے کشکول میں کیا رکھا تھا
"ایک پندارِ خودی جس کو بچا رکھا تھا
آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں"

زندگی نالہ و فریاد کرے گی برسوں
شہر و صحرا کو یہ آباد کرے گی برسوں
جستجوئے دل برباد کرے گی برسوں
"ظلمتِ شام خزاں یاد کرے گی برسوں
ہم جب آئے ہیں گلستاں بہ کنار آئے ہیں"

آگ ہی آگ ہے ہر سمت برستی یارو
پیار کے نام کو دنیا ہے ترستی یارو
موت مہنگی ہے یہاں زیست ہے سستی یارو
"دیکھنا لوٹی گئی کون سی بستی یارو
اڑ کے دل تک جو کدورت کے غبار آئے ہیں"

حق کی آواز خطا ہے تو خطا پر نازاں
جو بھی دو اس کی سزا ہم ہیں سزا پر نازاں
زندگی آج بھی ہے کرب و بلا پر نازاں
"اپنے انجام سے خوش اپنی وفا پہ نازاں
مسکراتے ہوئے ہم جانب دار آئے ہیں"

عقل و ادراک کو میزانِ جنوں پر تولو
درد کو گیت کرو اشک سے موتی رولو
کچھ تو اسرار و رموزِ غمِ ہستی کھولو
"اے رفیقانِ رہِ شوق کہاں ہو بولو
تم کو ہم شہر و بیاباں میں پکار آئے ہیں"

حسن سوز

احتشام

روشن کیے جو اس نے نئی فکر کے چراغ
ٹوٹا طلسمِ جہل
اندھیرے بکھر گئے
چہرے صداقتوں کے نکھرتے چلے گئے
بزمِ خیال و فکر سنورتی چلی گئی
نقد و نظر کی راہ میں
صدیوں کے بعد —
ذہن کو چھاؤں گھنی ملی
افکار جی اٹھے
اردو کی مانگ چاند ستاروں سے بھر گئی۔

اس دورِ خود پرست میں
انسان دوست تھا
سچ بولتا تھا
سچ کا گنہگار تھا بہت
وہ مصلحتوں کے شہر میں
بیدار تھا بہت

مخدوم منور

منارۂ شب تاب

آج وہ شخص یاد آتا ہے
فکر کا اک منارۂ شب تاب
وقت کی کشتیوں کا راہ نما
منزلوں کا پتہ بتاتا رہا
مارکسی نقطۂ نظر لے کر
ذہن کو روشنی دکھاتا رہا
اور ذہنوں کو روشنی دے کر
آج اک خواب ہو گیا ہے وہ
آہ نایاب ہو گیا ہے وہ
آج وہ شخص یاد آتا ہے

قطعۂ تاریخ مرگ احتشام حسین مرحوم

آں دوست کز عہد قدیم — صہبائے حب بودش بجام
در نقد و تحریر و بیاں — در ملک بر آورد نام
از حسن خلق و منطقش — بگرفت قلب خاص و عام
چوں کرد از دار فنا — رحلت سوی دار المقام
دلہا شدہ ریش از غمش — ہمچوں دلِ ایں مستہام
مردم پئے تشییعِ او — بسیار کردند اژدہام
بردند نعشش تا لحد — با صد شکوہ و احترام

گفتم پئے تاریخ مرگ۔
بد بعد مرگش احتشام

۱۳۹۲ھ

فضل نقوی

قطعاتِ تاریخِ وفات

شمعِ مکتبِ علم و ادب خاموش

۶   ۱۹   ۷۲

افسردہ دل فضل لکھنوی کے پُر درد آنسو۔

۶   ۱۹   ۷۲

دقیق فکر، کو حیرت ہے احتشام کے بعد — زوال وقت، قیامت ہے احتشام کے بعد
۲۰۲۹ء — ۱۹۷۲ء

ادب کی آنکھوں میں آنسو فضا میں بے آبی — اُداس، بابِ محبت ہے احتشام کے بعد
۱۳۹۲ھ — ۱۳۹۲ھ

منظر محمود آبادی

اک اور سخن فہم و سخنداں نہ رہا — نقاد تھا بے باک احتشام حسین
کس طرح قرار آئے دلِ مضطر کو — ہیں آپ تہِ خاک احتشام حسین

۸۷۸   ۱۰۲۶   ۳   ۶۵

۱۹۷۲ء

شاہ کوکب القادری

احتشام آنچہ رحلت فرمود — حشر برپاست بہ دنیائے ادب

(بقیہ صفحہ ۵۳۲)

خیالؔ ماہلی

تاریخ

بزمِ علم و ادب میں ہے کہرامؔ — ہوگئے احتشامؔ کیسا خاموش!
موت پر کیوں نہ جان دے انساں — اجل آئے اگر حیات بدوش
الفت آلِ نبیؐ کی کام آئی — حق کی رحمت ہے آج عصیاں پوش
جو کسی پر کبھی نہ بار ہوا — جا رہا ہے وہ آج دوش بدوش
سن رہا ہے بغور وہ "تلقین" — بند آنکھیں ہیں اور وا ہیں گوش
خلد کے نوجواں ادیبوں میں — بڑھ گیا ہے کچھ آج جوش و خروش
غالبؔ، آزادؔ، حالیؔ و اقبالؔ — بابِ جنت پہ سب تھے دوش بدوش
جا ملے ان سے احتشامؔ حسین — سب نے خوش خوش کیا انھیں گل پوش
احتشامؔ آگیا حسین کے پاس — سُن رہا ہوں یہ میں نوائے سروش
کرکے خالی ضعیف ماں کی گود — باپ سے ہیں جناں میں ہم آغوش
آنکھیں خوں بار ہیں اعزّا کی — دلِ احباب میں ہے غم کا جوش
آسمانِ ادب کا ماہِ مبیں؛ — حیف! زیرِ زمیں ہوا روپوش
جوش میں بھی جو ہوش سے لے کام — ہم میں اب ایسا کون ہے باہوش!

سُونی، سُونی نہ کیوں ہو محفلِ علم
شمع تنقید کی ہوئی خاموش

۷۲ ۱۹ ۶

سیّد اولاد اصغر رضوی
ماہلی

قطعاتِ تاریخ

سانحۂ ارتحال پروفیسر سید احتشام حسین صاحب

بام و در پر ہے کیسی ویرانی — کون ساری بساط لوٹ گیا
نازِ قصرِ ادب تھا جو اصغرؔ — وہ ادب کا ستون ٹوٹ گیا

۱۳۹۲ھ

نام تھا جن کا احتشامؔ حسین — روٹھ کر وہ ادیبِ عصر چلا
لکھو تاریخ ارتحال اصغرؔ — اٹھا اک "عہد ساز شخص اٹھا"

۱۹۷۲ء

علم میں بحر سا بیکراں تھا چلا — اس زمیں پر جو اک آسماں تھا چ
ہو اداس آج اصغرؔ نہ کیوں انجمن — وہ جو سرخیلِ دانشوراں تھا چ

۱۹۷۲ء

خلق ایسا معترف ہر خاص و عام — دل محبت کے مزے لے وہ کا
سینۂ اصغرؔ چشمۂ علم و ادب — نور کا مخزن مزار احتش

۱۹۷۲ء

ایم۔ایم باقر خانی

قطعاتِ تاریخِ وفات

ماہرِ اُردو ادب ۔ ذی فہم ۔ نقادِ ادب
تھا جہانِ نقد میں ان کا بہت اونچا مقام
احتشامِ فکر ہے باقر یہ سالِ انتقال
تبصرے کی بزمِ اُردو میں نہیں ہے احتشام

۷۳۲   ۳۶۰   ۱۳۰   ۷۵۰

۲   ۷   ۹   ۱   ۶

ڈاکٹر۔ایم۔این خیالی

وائے عبرت ہے سکونِ قلب میں پیغامِ موت   حرکتِ پیہم ہے گویا زندگانی کا نظام
آہ دنیا سے اٹھا نقاد تبصرہ سخن   کون ہے تنقید میں اب مثلِ سید احتشام

۱۳۹۲ھ

اُف احتشام چراغِ محافلِ راحت   ہوئی سحر تو ستاروں کو نیند آ ہی گئی
۱ ۹ ۷ ۲ ۶
خیالی مصرع زرمی سے نکلا سنہ وفات   "غم حیات کے ماروں کو نیند آ ہی گئی

۱۹۷۲ء

من ز "روح الہی قدس الفردوس"　　گفتہ ام سالِ وفاتش کوکب (با

۱۳۹۲ھ

دیگر

درغم سید می بینم　　چشم پرآب و دل ناشاد
سالِ رحلت کوکب گفت　　"باد غریق رحمت" باد

۱۹۷۲ء

اردو

دنیائے علم و شعر میں اک حشر ہے بپا　　اہل ادب پہ گزری ہے یہ موت شاق [illegible]
داغِ فراق دے کے گئے سید احتشام　　کوکب سنِ وفات ہے "داغ فراق آ[illegible]

۱۳۹۲ھ

[redacted]

احتشام حسین
خطوط کے آئینے میں

کیا اب نہیں لکھے گا حکایات خاص و عام
کیا زندگی کو دے گا نہ اب فکر کا پیام
تحریر کیا کرے گا نہ خط دوسروں کے نام
کتنے نقوش ہیں جو ابھی تک ہیں ناتمام

مالک! رفیق علم و ادب کا سلام لے
اُٹھ اپنے سوگوار قلم کا سلام لے

(شمیم کرہانی)

مکتوباتِ احتشام حسین

ڈاکٹر محمد حسن کے نام

(۱)

ن

۲۰ر اپریل ۵۳ء

عزیزم۔ دعائیں۔ ۲۰ر مارچ کو لندن پہونچا تو آپ کا خط ملا۔ میں ۱۱ر مارچ کو امریکہ سے کوئن الزبتھ نامی جہاز میں بحری سفر
ے ۱۶ر کو ساؤتھمپٹن پہونچا اور ۱۷ کو لندن ــــ واٹرلو کے اسٹیشن ہی پر آلِ حسن، اُن کی بیوی اور بہن مل گئے اور ایسی مانوس فضا پیدا ہو گئی
با حیرت سے لندن کو دیکھ بھی نہ سکا۔ اب تک کہ یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو رہا ہے بہت کم باہر نکلا ہوں گو یا اپنے خیال میں تھکن اُتار رہا ہوں!

آپ اپنی صحت کے متعلق لکھتے ہیں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے، مجھے اب یہ بھی احساس ہے کہ آپ اس کی طرف سے غافل نہیں۔ جب ایسے جسم
ایسی صحت سے سابقہ ہو تو آپ غافل رہ بھی کیسے سکتے ہیں۔ بہر حال جہاں تک ہو سکے جسم اور دماغ کو آرام کا موقع دیجئے۔

دہلی کانفرنس کے متعلق بہت کچھ جاننے کو جی چاہتا ہے، اب یہ واپسی ہی پر ہو سکے گا۔ پرسوں اتفاق سے ایک دکان پر INDIAN HIT IN/
و نمبر مل گیا جس میں زبان کے مسئلہ پر ڈرافٹ اور جعفری کا مضمون ہے۔ ڈرافٹ تو اتنا بُرا ہے کہ میں اس سے زیادہ غلط، مبہم، شر انگیز اور اُلجھے
ے ڈرافٹ کا تصور ہی نہیں کر سکتا لیکن جعفری کے مضمون سے میں زیادہ تر متفق ہوں۔ میری رائے میں ابھی تک تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے،
یقین ہے کہ مستقبل میں یہ دو زبانیں ایک ہوں گی اور لسانیاتی ارتقا کے فطری عمل سے ــ غالباً موجودہ ہندی کی تعلیم وغیرہ بھی اس پر اثر انداز
ا اور اُردو ایک طرح کی ہندستانی بن کر نیا چولا بدلے گی ــــ زبان اور رسم خط کے تعلق کے متعلق بھی میری رائے وہی ہے جو پہلے تھی لیکن
بھی تبدیلی کی کیا شکل اور کیا ذرائع ہوں گے، ابھی نہیں کہہ سکتا۔ اُردو کے معاملہ میں کچھ ایسی مایوسی کا شکار ہو رہا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیسا
اچاہیے۔ سب اُلجھ گئے ہیں۔

جذبی مجھ سے خوش کب تھے جو اب خفا ہیں۔ بعض دوستوں کی ناخوشی آج تک میری سمجھ میں نہیں آتی۔ غالباً ناخوشی کا سبب فروزاں کا
و ہوگا یا سرور کی شاعری پر مضمون ــــ اور تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر یہ آزردگی بے سبب بھی تو ہو سکتی ہے! یہی حال سلام کا رہتا ہے
ہ کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب اور کیوں خوش یا ناخوش ہیں۔

داد دیجیے کہ میں نے امریکہ میں LOVE IN MACHINE AGE ڈھونڈھ نکالی اچھی خاصی جستجو کے بعد ایک کاپی ملی جو کسی قدر د
معلوم ہوتی ہے۔ میں نے بوجھ کے خیال سے ساری کتابیں امریکہ ہی میں راک فیلر فاؤنڈیشن کے حوالہ کر دی ہیں کہ وہ بھجوا دیں غالباً میرے
پہونچیں گی۔

انگریزی مضامین کے متعلق میں آکر باتیں کروں گا لیکن اس درمیان میں آپ ذرا "امریکی سپلیک" کے نقطۂ نظر سے معلوماتی مضامین یا
افسانوں کے ترجمے اجازت لے کر کروا لیے۔ مجھے لکھیے کہ کوئی مضمون یا افسانہ بھیجنے کے لیے تیار ہے یا نہیں تو میں پتہ لکھوں اور خط بھی
آؤں گا تو اس سلسلہ میں زیادہ تعمیری اور مفید باتیں ہوں گی۔

لندن میں ملنے والے تو بہت ہیں لیکن ابھی تک ملاقات دو تین ہی سے ہوئی ہے۔ فیروز کو میں نے ٹیلی فون کیا اور پھر ان سے
انڈیا ہاؤس بھی گیا، آج پھر ملنے کا وعدہ ہے۔ تمھیں پوچھ رہی تھیں، غوث وغیرہ سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی بعض میرے پرانے
والے یہاں ہیں جنھیں آپ نہ جانتے ہوں گے، آہستہ آہستہ ہر ایک سے ملوں گا، کافی وقت پڑا ہوا ہے۔ میں یہاں گھبرا تو نہیں رہا ہوں لیکن
جی چاہتا ہے کہ واپس آؤں اور اسی فضا میں، گھریلو زندگی کی انھیں الجھنوں میں کھو جاؤں جو زندگی کا جز بن چکی ہیں۔

صفیہ اختر کے مرنے کی خبر مجھے نیویارک ہی میں کسی کے خط سے مل گئی تھی، اختر کا پتہ مجھے معلوم نہیں اس لیے تعزیت کا دو سطر
نہ لکھ سکا۔ یہاں اُن کی وہ نظم بھی دیکھی جو انھوں نے لکھی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ مجاز بہن سے بہت مانوس ہیں اگر اُن پر اثر ہے تو
کوئی بات نہیں۔ میں اب ان رشتوں کی طاقت اور تقدس کا قائل ہوں۔ سردار کو بھی آج ہی کل میں خط لکھوں گا۔

اِدھر مسعود صاحب اور سرور صاحب کے خطوط بھی ملے۔ سرور صاحب کے خط سے یونیورسٹی کے متعلق بہت سی باتیں معلوم
کلب کا حال ملا اور انھوں نے اپنی ایک بہت اچھی غزل بھی بھیجی۔ اُردو پر انھوں نے جو نظم لکھی تھی وہ مجھے پہلے بھیج چکے ہیں، بہت
ہے۔ انھوں نے خود اس خطرے کا اظہار کیا ہے کہ کہیں شاعری اور کاموں کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔ میں نے کل ہی مسعود صاحب کو ا
صاحب کو خطوط لکھے ہیں۔ تین دن کے اندر میں نے قریب قریب بیس خط مفصل اور طویل ــ لکھے ہیں، اب چند خطوں کے جواب ا
رہ گئے ہیں۔

گھر کے خطوں سے آپ کے خبر لیتے رہنے کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ میری کتاب کے خوبصورت چھپنے کا حال کئی ذرائ
معلوم ہوا، آج میں نے اس کے اور دستِ صبا کے لیے خط لکھا ہے۔ دیکھوں کب تک آتی ہیں۔

آلِ حسن اچھے ہیں۔ کبھی کبھی مستقبل کی باتیں کرتے ہیں، یعنی اگلے سال جب یہاں کا معاہدہ ختم ہوگا تو پھر اس کی تجدید کرا
یا ہندوستان واپس جانا چاہیے، اُن کی بیوی اچھی ہیں۔ اپنے LAW کے امتحان کی تیاری کر رہی ہیں۔

میری طرف سے سب جاننے والوں کو تسلیم کہیے
مجاز، کمال، سلام اور دوسرے دوستوں سے بھی سلام کہیے۔

خیر طلب
احتشام حسین

دو خانہ ۔ لکھنؤ
۱۴ر اگست

عزیزم سلام و دُعا

کل خط ملا۔ خوشی ہے کہ آپ کسی حد تک بمبئی کے سفر اور اس کے امکانات سے مطمئن ہیں ۔ ۱۰ر اگست کی صبح کو میں سو کر اٹھا تو پیٹ
ہلکا ہلکا درد تھا، تھوڑی دیر میں بہت بڑھ گیا، معلوم ہوا کہ RENEL COLIC ہے۔ انجکشن وغیرہ ہوئے، درد سے تو شام تک نجات مل گئی
ن ہنوز اب تک ٹھیک نہیں۔ بے دلی اور بے دلی کا یہ حال ہے کہ ہر روز صبح اور شام ڈاکٹر فریدی سے ملنے کا ارادہ کرتا ہوں اور رہ جاتا
ں۔ پہلے بھی علاج کی طرف دیر میں طبیعت مائل ہوتی تھی لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے معمولی تکالیف کو خاطر میں لانا بزدلی معلوم ہوتا تھا اور
ب کاہلی اور دوسرے افکار زرا اور روکتے ہیں۔

مجھے تو بالکل یقین ہے کہ اگر بہت سے دوسرے مصالح حائل نہ ہوں تو آپ کی چیزیں، دالمیں اور تجویزیں فلمی دنیا میں ضرور
ند کریں گے۔ مہتاب کے متعلق معلوم نہیں آپ نے کیا رائے قائم کی، مجھے تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ آدمی اچھے ہیں لیکن "انا" زیادہ ہے۔
ایداس خود اعتمادی کے بغیر مقابلوں کی دنیا میں کام بھی نہیں چل سکتا۔ نرگس کی سادہ مزاجی نے مجھے بھی متاثر کیا تھا، ذرا دیر کے
ے محبوب ہی کے اسٹوڈیو میں ملاقات ہوئی تھی۔ محبوب مجھے ذہین اور فنکارانہ حس رکھنے والے انسان معلوم ہوئے۔ یہ نقی جن کے
ال آپ نے دعوت میں شرکت کی۔ کون نقی ہیں، وہی تو نہیں جنھیں میں جانتا ہوں ۔ وہ بھی اچھے آدمی ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ غالب جلد تیار ہو جائے گی۔ معلوم نہیں کس نے کہانی لکھی ہے اور کیسی ہے؟

باس آپ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ تعارف کی ضرورت نہیں، میں یوں بھی چین میں اردو پڑھانے والے سلسلے میں آپ کا ذکر کر چکا ہوں
در یہ بھی ہے کہ وہ پڑھتے رہتے ہیں اور آپ سے واقف ہیں۔ یوں بھی وہ اتنے معقول انسان ہیں کہ چاہے مدد نہ کر سکیں لیکن ملیں گے
خلوص سے۔ میرا بہت بہت سلام کہیے گا۔ کرشن چندر، ساحر، بیدی وغیرہ سے بھی ملاقات ہو تو سلام کہیے گا۔ مدت سے ان
حضرات سے ملاقات نہیں ہوئی۔

سرور صاحب سے آپ کا سلام کہہ دوں گا، شکایت بھی پہونچا دوں گا لیکن غالباً وہ یہی جواب دیں گے کہ طالب علموں نے سب کچھ
چانک طے کیا اور بالکل موقع نہ تھا کہ کسی کو اطلاع دی جائے ۔۔۔ میں تو اسی دن بیمار ہوا تھا۔

علی گڑھ کے متعلق ابھی قطعی اطلاع تو نہیں، خلیق نقوی آئے تھے (وہاں شعبۂ معاشیات میں لکچرر ہو گئے) کہہ رہے تھے کہ
۲۶ر اگست تک کچھ ہونے کی خبر تھی۔ انھیں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔ ابھی تک سرور صاحب کے پاس کوئی خط نہیں آیا۔ اگر عارضی جگہ
کا معاملہ ہے تو میری رائے میں اس کے لیے فکر مند رہنا فضول ہے حالانکہ جتنی دیر ہوتی جائے گی اس قدر آپ کے یونیورسٹی میں پہونچنے
کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔ مجھے کوئی اطلاع ملی تو لکھوں گا۔

ریڈیو اسٹیشن پر ابھی کوئی اطلاع نہیں ۔ میں احتیاطاً کل پھر پوچھ لوں گا۔

یہاں اس وقت لوگ سب سے زیادہ بچوں کی پر اسرار بیماری کی وجہ سے پریشان نظر آتے ہیں۔

دعاگو

احتشام حسین

باروو خانہ - لکھنؤ
۲۲ر جولائی

عزیزم   دُعا و سلام

اس دفعہ تو واقعی ہم سب کا سارا وقت اُردو کانفرنس کی نذر ہوگیا، کاش یہ کوشش کچھ پھل بھی لائے۔ سرورؔ صاحب اور آ
نے جس طرح یہ کانفرنس کی ہے اُس کے لیے مبارکباد شاید رسمی چیز ہوگی۔ سرور صاحب کو بھی خط لکھنا چاہتا ہوں لیکن محض مبارکباد نہ
واقعی داد دینا چاہتا ہوں، یہ اُن کے غیر معمولی خلوص اور انہماک کا نتیجہ تھا ملک کے ہر گوشے سے اتنے مختلف الخیال لوگ یکجا
اب تو وہ غالباً اپنے ہال کے جھگڑوں میں پھنس گئے ہوں گے۔

روسی اسکالرشپ تو خیر، فرانسیسی کے لیے ضرور کوشش کرنا چاہیئے تھا، روس کے لیے سنا ہے حسینی صاحب کا انتخاب ہوگیا ہے
باخبر رہنا چاہیئے اور جیسے ہی پھر یہ موقع ملے اس کی طرف متوجہ ہوجانا چاہیئے۔ جو آپ کے دل کی "ناخلگی" ہے اس کا ایک علاج یہ بھی
ہے کہ کچھ دنوں کے لیے اس ماحول سے باہر نکلنے کا موقع ملے، دوسرا علاج وہی ہے جس کا میں کئی بار ذکر کر چکا ہوں یعنی شادی کا جوا -
یہاں ذو معنی ہے۔ اس کے متعلق اس وقت اور کچھ نہیں لکھوں گا آپ کے یہاں اگر کوئی CONFUSION ہے تو وہ ذرا مقدار سے
IDEALIST ہونے میں ہے۔ اس کا اندازہ مجھے آپ کے اُس مضمون سے ہوا جو علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا، یہ مطلب ن
اس مضمون سے مجھے زیادہ اختلاف ہے بلکہ مجھے کچھ وہ ضرورت سے زیادہ متعین اور ترشا ترشایا نظر آیا۔ اس معین معیارِ حیات کے س
خلش کا وجود لازمی ہے، اس لیے میں اسے CONFUSION نہیں ایک معیار کے لیے نامعلوم بے چینی سمجھتا ہوں، اس سے بہت
پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنے کاموں میں لگے رہیئے۔ میں خود بے دلی سے اتنے بیگار کرتا رہتا ہوں کہ اپنی ضروریات کی طر
نہیں دیکھتا، اگر کوئی خدا ہے تو اس کا صلہ مجھے ضرور ملے گا، آپ بھی کچھ ایسے کاموں میں لگے ہوئے ہیں جن کے لیے دل پوری ط
رضامند نہیں، ان میں سے کوئی نہ کوئی کام ضرور چھوڑ دینا چاہیئے۔

خطوط اگر اس قابل ہوں کہ شایع ہوجائیں تو ضرور نقوش کو بھیج دیجئے مجھے کوئی اعتراض نہیں، اس آفاق گہ شیشہ گری میں
ورنہ یہ کہتا کہ ان میں سے کچھ بھی کم نہ کیجئے۔

WORLD TING
انگریزی میں ہندوستانی ادب وغیرہ کے متعلق مضامین کی طلب امریکہ میں بہت ہے میں نے خاص طور سے
والوں سے گفتگو کی تھی۔ یہ کتاب نما رسالہ NEW WRITING کے انداز پر NEW AMERICAN LIBRARY والے نکالتے ہیں، وہ
ایسے مضامین پسند کریں گے۔   لکھنؤ آئیے تو ناول ضرور لیتے آئیے میں ضرور دیکھوں گا۔

آج سے یونیورسٹی کھل گئی، ابھی اندازہ نہیں کہ اردو میں کتنے طلبا ہوں گے۔ ہمارے یہاں سب سے اہم اور خطرناک معاملہ ایم اے
میرے یہاں انفلوئنزا تو نہیں پہونچا لیکن باری باری سے تین بچے بخار میں مبتلا ہوچکے ہیں محمد میاں اور ثریا کو اس وقت بھی بخار
علی گڑھ سے واپس آکر مجھے بھی سخت نزلہ ہوگیا تھا اور حرارت بھی ہوگئی تھی لیکن دو ہی دن میں نجات مل گئی۔
اب بارش کچھ شروع ہوئی ہے شاید گرمی سے نجات ملے۔

خیر طلب
احتشام

(۴)

باردوخانہ۔ لکھنؤ
۲۲ر نومبر ۵۵ء

عزیزم دعائیں

آپ کا خط پڑھ کر میں نے اپنے اوپر تنقید کی اور یہ سوچتا رہا کہ میری رفتار گفتار اور ملنے جلنے میں ضرور آپ کو کوئی ایسی تبدیلی نظر آئی جس کی وجہ سے یہ خیال ہوا کہ میں ناخوش ہوں۔ بہ ظاہر پیدا اُن الجھنوں کے جن کا ذکر کسی سے کرنا نہیں چاہتا اور کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ بعض اوقات اپنی بے عملی اور بے دلی کو چھپانے کے لیے دوسروں سے آنکھیں چرانی پڑتی ہیں، شاید کوئی ایسی منزل اُس وقت میرے لیے بھی آگئی ہو جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہی خط لکھنے میں تعویق، تو یہ تو اکثر ہو گیا ہے اور بغیر کسی خاص سبب کے ہوا ہے۔ ناخوشی کے متعلق میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ میں بڑی مشکل سے ناخوش ہو سکتا ہوں۔ ایک دفعہ نہ جانے کس نے اس بات کا شکوہ کیا تھا تو میں نے مومن کا یہ شعر لکھا تھا، اس وقت پھر یاد آیا

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

خیر یہ تو اس شک کے رفع کرنے کے لیے تھا جو نہ جانے کیسے آپ کے دل میں راہ پاگیا اب اور باتیں۔

انشاء والا مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے ایک نئے انداز میں اُن کا مطالعہ کیا۔ ایک بات البتہ کھٹکی عام طور سے آپ کے یہاں REPETITION نہیں ہوتا، اس مضمون میں ایک آدھ مقامات پر نظر پڑا۔ دوسری بات یہ کہ داستانی عنصر پر ضرورت سے زیادہ زور ہوگیا۔ ایک بات اور — انشاء کی فارسی غزلیں دیکھنے کی ضرورت ہے جو اس درباری ماحول، جدّت برائے جدّت اور سالغت میں مشکل زمینوں پر چلنے سے پاک ہیں۔ مضمون بڑھ جائے تو انشاء کی ہندوستانیت پر اور زیادہ لکھیے۔ ویسے مجھے لکھنے کا ڈھنگ پسند آیا اور وہی تازگی ملی جو آپ کے اکثر مضامین میں ملتی ہے اور جس پر مجھے رشک آتا ہے۔

ابھی ڈرامے نہیں پڑھے۔ ایک آدھ دن اور انتظار کرتا ہوں ورنہ فروغ اُردو سے منگوا لوں گا۔ ہندی کی تاریخ کی ایک جلد نسیم صاحب کے پاس ہے، جی چاہتا ہے اُن سے بے تکلف مانگ لوں۔

پرسوں عبادت کی کتاب۔ غزل اور مطالعہ غزل آئی۔ انجمن سائز کے ساڑھے چھ سو صفحوں پر محیط۔ بعض لوگ اتنا لکھ ڈالتے ہیں اور میرا یہ ہے کہ پڑھ بھی نہیں سکتا۔ عبادت بے حد محنتی، مخلص اور حوصلہ مند ادیب ہے لیکن اُن کی دو خامیوں کی طرف انھیں کسی نہ کسی شکل میں بارہا متوجہ کر چکا ہوں اس کتاب میں بھی ہے بات کو پھیلانا اور اتنا پھیلانا کہ طبیعت عاجز آجائے۔ دوسرے بنیادی یعنی فکری عنصر کا کمزور رہنا۔ پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب شائع ہوگئی۔ ضرور دیکھیے گا۔

رجسٹرار کے یہاں سے خط آگیا، ۳ر دسمبر مقرر کی ہے۔ میں دو دن سے زیادہ کے لیے نہیں آسکتا، اس میں جو پروگرام چاہے رکھیے۔ علیم صاحب کو خط لکھ رہا ہوں اس کی اجازت مانگوں گا کہ اگر محمد حسن کو نیا مکان مل گیا تو وہاں ٹھہر جاؤں — آج ہی رجسٹرار کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔

سرور صاحب یکم دسمبر کو وہاں چارج لینے کو کہتے ہیں۔ غالباً یہ پروگرام ٹھیک ہوگا۔ اُن کا مجموعۂ کلام ذوقِ جنوں شائع ہوگیا۔ خوش ہیں۔ اس وقت تھوڑے سے CYMICEL ہو رہے ہیں غالباً CHANGE OVER کا احساس ہے کہتے ہیں اب جی اچاٹ ہو چلا ہے۔ یہاں کی تعلقات کی زنجیریں بھی مضبوط ہیں، ضرور محسوس کریں گے مگر جب علی گڑھ پہنچ کر اپنے کام میں لگ جائیں گے تو

ٹھیک ہو جائیں گے۔ بڑی صلاحیتوں کے انسان ہیں۔

رشید صاحب کی خیریت اُن کی صاحبزادی نے لکھ بھیجی تھی۔ میری جانب سے سلام کہئے۔ شعبہ میں اور حضرات کو بھی پہونچائیے۔ آج خلیل کا ایک مضمون فن کار میں دیکھا، جی خوش ہوا۔

بیوی بہتر ہیں۔

دعاگو

احتشام

(۵)

بارود خانہ۔ لکھنؤ

۳ ستمبر ۵۷ء

عزیزی محمد حسن صاحب سلام و دُعا

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں۔ یہاں تو کئی دن سے ایسی بارش ہو رہی ہے کہ چلنا پھرنا دو بھر ہو رہا ہے۔

یہ خط میں ترقی پسند انجمن کی طرف سے لکھ رہا ہوں۔ یہاں یہ طے ہوا ہے کہ یومِ میر اکتوبر میں منایا جائے، اُس کا مفصل پروگرام ... چندہ دیکھ کر بنے گا لیکن جو بات سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس موقع پر ایک مختصر ڈرامہ کیا جائے۔ یہاں لوگ چاہتے ہیں کہ وہ ڈرامہ آپ لکھیں۔ غالباً آغا سہیل وغیرہ نے بھی خط لکھا ہوگا۔ میں نے بھی وعدہ کیا تھا کہ خود لکھوں گا اس لیے میں بھی اس میں شریک ہوں۔ ڈرامہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ کا ہو، کردار بہت سے نہ ہوں۔ زنانہ کردار ظاہر ہے کہ کم ہوں گے۔ میر کے چاند میں بھی نظر آتی تھی SHADOW کے ذریعہ دکھائی جاسکتی ہے۔ بس زندگی کے وہ ضروری واقعات سامنے آجائیں جن سے میر کی شخصیت اور زندگی کو سمجھ سکیں مثلاً باپ کے ساتھ ابتدائی زندگی، باپ کی زندگی میں امان اللہ کے ساتھ پھرنا، سوتیلے بھائیوں کا سلوک، دہلی کی سڑکوں پر پھرنا۔ خان آرزو سے تعلقات۔ چند واقعات دہلی کے ——— لکھنؤ آنا، کوئی مشاعرہ، آصف الدولہ اور پھر گھر میں بیٹھ رہنا ——— موت ——— اس طرح یا کسی اور شکل میں یہ ڈرامے لکھے جاتے تو اچھا رہے گا۔ یہاں کوئی بہت اکسپرٹ رائے تو دینے والا ملے گا نہیں، جیسا کچھ بھی پیش ہو جائے اچھا رہے گا۔ جانتا ہوں کہ آپ مصروف ہیں لیکن وقت نکال کر اسے کر دیجئے۔ مجھے توفیق ہوتی تو میں خود لکھتا لیکن عاجز ہوں کیا کروں۔ باقاعدہ بیٹھ کر کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ کیا سرور صاحب ۸ ستمبر کو یہاں کسی میٹنگ کے سلسلہ میں آرہے ہیں!

دعاگو

احتشام حسین

(۶)

بارود خانہ۔ لکھنؤ

۱۰ نومبر ۵۸ء

عزیزی محمد حسن دُعائیں

آپ کا ۳ نومبر کا خط ملا۔ افسوس ہے کہ اس سے پہلے والا خط نہیں ملا ورنہ اس سے بھی زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ خط نہیں ملا جس میں آپ نے اپنے ڈی لٹ کے موضوع کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے لکھا تھا جواب یاد نہیں...

قصائد کے بجائے سوداؔ کی ہجویات اِڈٹ کرنے اور اُن پر ایک اچھا مقدمہ لکھنے کی رائے دی تھی۔ اب تک ہجویات پر کام بھی نہیں ہوا ہے۔ عالمی ادب اور خاص کر عربی اور فارسی ادب میں ہجو کا جو مقام ہے اُس کے تعین میں محنت پڑے گی، جن لوگوں کی ہجو میں ہیں اُن میں سے بعض کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں دشواری ہوگی اور غالباً کچھ الفاظ اور محاورات کے معنی آسانی سے لغات میں نہ مل سکیں گے۔ ورنہ یہ کام دلچسپ ہے۔ ڈیڑھ دو سو صفحوں کا مقدمہ، چند ضمیمے، فرہنگ، بس یہی کام ہے۔ دوسرے موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کیا تھا، اب وہ موضوعات زیادہ تر ذہن سے نکل گئے ہیں۔

بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کیرل اور بڑودہ ہو آئے، سفر کے تجربوں کے علاوہ مختلف ادیبوں سے ملنے اور باتیں کرنے کا تجربہ بھی بڑی چیز ہے اور خوشی ہے کہ آپ کو وہاں سے کام کرنے کا حوصلہ ملا۔ آپ کے اندر جو ناآسودگی ہے وہ کسی قدر تو فطری ہے لیکن بہت کچھ اس لیے ہے کہ محبت اور دوستی کا کوئی مرکزی نقطہ نظر نہیں ہے۔ اس کی تفسیر پھر کبھی۔

مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ آپ کو بھی جدید ادیبوں میں وہ CRISIS نظر آرہا ہے جس کا میں اکثر ذکر کرتا رہا ہوں۔ یہ سیاسی نہیں ذہنی ہے۔ یہ ترقی پسند تحریک کا ردِعمل نہیں۔ میں ترقی پسند تحریک کو نا کام نہیں سمجھتا، اُس نے جو کچھ کیا وہ سرسید کی تحریک کے سوا اور کسی تحریک سے نہیں ہوا۔ سرسید کی تحریک نے بھی بعض ذہنوں کو غلط راہ پر ڈالا اس لیے اگر کچھ لوگ ترقی پسندی کا مفہوم اور مقام سمجھے بغیر آج اس سے ناآسودہ ہیں تو اس کی ذمہ داری ترقی پسند تحریک پر نہیں۔ آپ نے علی گڑھ میگزین میں جو کچھ لکھا ہے اُس کے بعض حصوں سے میں متفق ہوں، بعض سے نہیں ۔۔۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اُس فکری راہ کو نہیں چھوڑا ہے، جس سے بہت سے لوگ کتراتے ہیں۔

یہ ثریا سلطانہ کو خوب اسکالرشپ ملا، دیکھیے وہ فرانس سے کیا ہوکر آتی ہیں! محمود الٰہی اور خلیل الرحمٰن کے مقالوں کے مکمل ہونے کی خوشی ہوئی۔

میں علی گڑھ شاید آخر نومبر یا شروع دسمبر میں آؤں گا بشرطیکہ اب بھی MODERATION BOOK میں میرا نام ہو۔ میرا حال وہی ہے اور میں دن رات کی فکر کے بعد بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا کہ کیا ہے۔ واضح سبب تو یہ ہے کہ مجھ میں جتنی طاقت نہیں اُس سے زیادہ بوجھ میرے کاندھوں پر ہے۔ مہمانوں کے علاوہ پندرہ سولہ آدمی میرے ساتھ رہتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے کیا کیا کرنا پڑتا ہوگا۔

۲ نومبر کو سمپورنانند کے یہاں مشاعرہ تھا، کچھ لوگوں کا شدید اصرار تھا، چند شعر میں نے بھی کہے اور چلا گیا ۔۔۔ یہ مشاعرہ بڑا مہنگا پڑا۔ میرا پارکر قلم کہیں کھو گیا۔ دو دن اس کا بھی سوگ منایا اب ایک سستا قلم کام چلانے کے لیے خرید لیا ہے۔

یومِ مجاز کے سلسلہ میں لکھنے کی کوشش کروں گا لیکن امید نہیں۔ اگر آپ یومِ مجاز اس طرح رکھیں کہ انجمن کا یا MODERATION کا جلسہ اسی دن ہو تو ایک ہی دن میں سارے کام ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے میں ۱۶ کو بھوپال جاؤں۔

آج ریڈیو پر سرورؔ صاحب کا پروگرام تھا۔ امید تھی کہ شاید آئیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ٹال گئے۔

دعاگو

احتشام

(۷)

شعبۂ اُردو، الٰہ آباد یونیورسٹی۔ الٰہ آباد
۹ر دسمبر ۶۱ء

عزیزم دعائیں

بھائی یہ کیسے ڈرا دینے والے خط لکھتے رہتے ہو۔ کیا نفسیاتی الجھنیں ہیں کچھ مجھے بھی تو معلوم ہوں۔ میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں لیکن کچھ تو دے ہی سکتا ہوں۔ خدا کرے وہ بات نہ ہو جس کا مجھے خطرہ ہے۔

بہرحال اگر میرے خطوں سے تسکین ہو سکتی ہے تو میں ضرور جلد جلد لکھوں گا لیکن کیا لکھوں گا یہ نہیں کہہ سکتا۔ ادبی بحثیں، یا سیاسی جھگڑے اپنی ذاتی زندگی کے واقعات یہاں وہاں کے SCANDALS آخر کیا لکھوں۔

وہاں کے حالات ادھر معلوم بھی ہوئے اور نہیں بھی۔ اُن سے بہت زیادہ متاثر ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

رسوا والی کتاب چھپ جائے تو بہت اچھا ہے اور اگر یونیورسٹی کی مدد سے چھپے تو اور اچھا ہے ـــ ابھی میرے علی گڑھ آنے کا کوئی موقع بظاہر نظر نہیں آ رہا ہے میں نے فروغ اردو سے کہا تھا کہ کم سے کم ایک کاپی "زیارت کے لیے" آپ کو تو بھیج دیں نہیں معلوم بھیجی یا نہیں۔ مضامین والے مجموعے میں کسی صفحہ میں بڑی غلطی ہے اُسے ٹھیک کرانے کے لیے تمھارے پاس بھیجنے والے ہیں۔

میں یہاں ہوں لیکن بالکل مہاجر کی طرح ـــ ہجرت کے بعد رسول مقبول کی زندگی میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی اور حالات بھی بدلے معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوگا ابھی تو بالکل UPROOTED سا معلوم ہو رہا ہوں۔ کچھ لکھ نہیں سکتا ـــ جاوید اور بچی کو پیار۔ بیگم روشن خط جلد لکھنا۔

دعاگو
احتشام

ڈاکٹر زور کے نام

(۱)

بارود خانہ۔ لکھنؤ
۱۳ر مئی ۴۲ء

محترمی تسلیم

بدقسمتی سے مجھے جناب کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں لیکن میں طالب علمی ہی کے زمانے سے آپ کی تحریروں سے دلچسپی لے رہا ہوں۔ چند دن ہوئے میرے ایک دوست نے "تاریخ ادب اردو" یہ کہہ کر دی کہ آپ کی تصنیف ہے میں نے اسے بہت شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کام حیدر آباد دکن میں انجمن ترقی اردو یا دارالترجمہ وغیرہ نے کیا ہے وہ ٹھوس ہونے کے باوجود مفید نہیں جتنا یہ کام جو آپ کے زیر نگرانی ادارۂ ادبیات میں انجام پا رہا ہے۔ جو کچھ بھی اب تک میں دیکھ سکا ہوں اس سے میں نے یہ نکالا ہے۔

یہ خط خاص طور پر اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگرچہ یہ مختصر تاریخ ادب آپ کی تصنیف نہیں لیکن بہت کچھ ذمہ داری آپ ہی پر ہے اس

رے دیکھنے میں چند باتیں جو مجھے غلط معلوم ہوئیں عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی تصحیح کر دی جائے۔
صفحہ ۱۲۰۔ تعشق میر انیس کے بیٹے نہ تھے بلکہ اس خاندان ہی سے نہ تھے بعد میں نسبتی تعلق رشید کے زمانے میں ہو گیا تھا۔
—— اس لیے عشق کے بارے میں بھی جو کچھ ہے وہ صحیح نہیں۔
—— رشید انیس کے داماد نہ تھے
—— عارف انیس کے پوتے نہیں تھے آپ نے دولھا صاحب عروج سے انھیں بدل دیا ہے۔
۱۲۵۔ میر کی مثنوی کا نام "معارج المضامین" نہیں بلکہ "معراج المضامین" ہے شاید کاتب کی غلطی ہو۔
میں نے صرف اشارہ کر دیا ہے اگر آپ چاہیں گے تو میں کسی قدر تفصیل سے لکھ کر بھیج دوں گا۔ "نیا ادب" میں تاریخ ادب اردو پر ریویو کروں گا۔

امید ہے کہ آپ میری جرأت آزمائی کو بری نظر سے نہ دیکھیں گے میں نے اسی کو تقریب بھی بنانا چاہا ہے۔ کیا آپ ادارہ کو حکم دیدیں گے ایک مکمل فہرست ادارہ کی مجھے بھی بھیج دے۔ زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ زیادہ والسلام

مخلص
احتشام حسین۔ لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی

(۲)

مل۔ اعظم گڑھ
۱۲؍ جون ۶۰ء

گرمی کی تعطیل ہو جانے سے میرے نظام اوقات میں کافی فرق آ گیا تھا۔ مجھے یونا کہیں جانا چاہیے تھا اور میں رہتا کہیں تھا یونیورسٹی کے آفس کو جو پتہ دیا تھا وہ وطن کا پتہ تھا آپ کا گرامی نامہ یونیورسٹی سے ماہل پہونچا جہاں میں کل پہنچا ہوں۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی ہوگی۔ معافی چاہتا ہوں۔

یہاں میں اس بے سر و سامانی کے عالم میں پہونچا ہوں کہ نہ تو میرے ساتھ کوئی کتاب ہے اور نہ یہاں کسی کتاب کا ملنا ممکن ہے۔ یہ خط مجھے پہلے مل گیا ہوتا تو میں کوئی خدمت کرتا۔ اس سلسلہ میں اتنا عرض کرنا غالباً غیر مفید ہوگا کہ جن مرثیہ نگار اصحاب کے بارے میں غلطیاں ہو گئی ہیں ان کے تفصیلی حالات تو کسی تذکرہ یا کتاب میں نہیں مل سکتے لیکن مختصر تاریخ ادب اردو کے لیے زیادہ تفصیل کی ضرورت بھی کیا ہے بہت کچھ جو اس کتاب کے لیے کافی ہوگا۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کے ترجمہ میں موجود ہے اور وہ صحیح بھی ہے۔ کیونکہ اس کے مترجم مرزا محمد عسکری صاحب لکھنؤ کے قدیم باشندے ہیں اور بتانے والوں میں سے اکثر خود ان کے ملاقاتی تھے۔ اب بھی ان حضرات کے خاندان سے مرزا صاحب کے مراسم چلے جا رہے ہیں۔ ان کی تحقیق ممکن ہے سن پیدائش یا کسی معمولی تفصیل کے سلسلے میں زیادہ صحیح نہ ہو لیکن ان میں اس قسم کی غلطیاں نہیں ہیں جو ڈاکٹر بیلی کے یہاں یا خمخانۂ جاوید میں لالہ سری رام کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ کسی طالب علم سے ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا وہ حصہ نقل کرا لیجئے جس میں مرثیہ نگاروں کا تذکرہ ہے اور اسے اپنی معلومات سے ملا کر مکمل کر لیجئے۔

حیات رشید کا مطالعہ بھی اس سلسلہ میں کارآمد ہوگا۔

مجھے افسوس ہے کہ مجبوریوں کی وجہ سے میں یہ خدمت خود انجام نہ دے سکا۔ آپ کی تاریخ ادب کا انتظار ہے کیا امید کی جائے کہ جلد ہی شائع ہوگی۔ ادھر میں بھی ایک کتاب کی تصنیف میں لگا ہوا ہوں اس سلسلہ میں کلیات قطب شاہ لینا چاہتا تھا معلوم نہیں آپ اسے

مرتب فرما چکے ہیں۔ انہیں ویسے تو تاریخ ادب اردو میں اس کے شائع ہو جانے کی اطلاع دی گئی ہے۔

اسیر خلوص
احتشام حسین

عبدالقوی دسنوی کے نام

(۱)

بارود خانہ۔ لکھنؤ
۱۴ر مارچ ۵۹ء

عزیزم تسلیم

مجھے افسوس ہے کہ خطوں کے جواب میں تاخیر ہو گئی۔ طرح طرح کی بیکار مصروفیتیں رہتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تنقیدی نظریات آپ جب تک اصول تنقید پر مختلف لوگ رکھیں۔ بعض ایک یا دو کتابوں سے کام نہیں چلے گا۔ میری بڑی خواہش ہے کہ کچھ لکھ سکوں۔ لیکن بہت اس موضوع پر دو کتابوں کے خاکے بار بار بنا کر بگاڑ چکا ہوں۔ لیکن جتنی فرصت اور محنت درکار ہے وہ اس وقت محض افکار کی وجہ سے ممکن پیٹ کی مستقل خرابیوں کی وجہ سے ایسی سستی مزاج میں آگئی ہے کہ باقاعدہ بیٹھ کر لکھنے سے الجھن ہوتی ہے۔ حالی پر جو کچھ لکھے ہوئے تھے ان کے گم ہونے کا افسوس ہے لیکن اب انھیں لکھنا مشکل ہے۔

تصویریں مل گئی تھیں۔ کھینچی تو بہت سی گئی تھیں۔ لیکن غالباً ٹھیک نہیں آئیں۔ ابھی تک جامعہ والی تصویریں نہیں آئی ہیں وہ بہتر ہوں گی۔

”کاروان ادب“ کا جو شمارہ آپ نے مجھے دیا تھا۔ بے حد پسند آیا، صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے دلچسپ اور مفید۔ مجاہد حسین کا مضمون ”گئودان“ پر محنت سے لکھا گیا ہے، افروزہ قریشی اور صفیہ انعام اللہ کے مضامین بھی معیاری ہیں۔ ضمیر مولانا آزاد کے اسلوب پر لکھتے ہوئے شعوری طور پر مولانا کے اسلوب سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس سے چند خامیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں لیکن مضمون بہت اچھا ہے اور ضمیر کے مستقبل کا اچھا اشاریہ ہے۔ شیکسپیئر، امراؤ جان ادا اور جدید نظم پر جو مضامین ہیں وہ کالجوں کے عام معیار سے بہتر ہیں۔ آپ نے خود اقبال کے کلام میں حذف و اصلاح کے جو نمونے دیے ہیں ان کی بنیاد پر اقبال کے فن اور ذہنی ارتقا قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔

پروفیسر گوریکر صاحب کا یوم شبلی کا خطبہ مختصر لیکن جامع ہے۔ شاید میں نے آپ سے زبانی بھی کہا تھا کہ ”کاروان ادب“ دیکھ کر خوشی ہوئی کیونکہ کالجوں کے رسائل کا جو عام معیار ہے یہ رسالہ اس سے بہت بلند ہے۔ اس کے لیے میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے

مخلص
احتشام حسین

[redacted]

(۲)

ڈ یونیورسٹی۔ لکھنؤ
۱۳ر ستمبر

عزیز من تسلیم

خط ملا، ہاں مجھے افسوس ہے کہ پہلے خط کا جواب نہ دے سکا، سبب یہ تھا کہ اسی زمانہ میں وہی سوال علی گڑھ کے رسالہ ادیب کے ایڈیٹر
پوچھا تھا اور میں نے اس کا مختصر سا جواب انھیں بھیج دیا تھا جواب جاکر جولائی کے ادیب میں شائع ہوا۔ خیال تھا کہ وہ رسالہ شاید آپ
ک دیکھ لیں۔ بہرحال آپ وہاں سے منگوا لیجیے۔ پتہ ہے ادیب، سرسید بکڈپو، علی گڑھ۔ میرے پاس سے بھی کوئی لے گیا ورنہ بھیج دیتا۔

یہ خیال بالکل سطحی اور میکانکی ہے کہ ہم انھیں موضوعات پر لکھیں جنھیں دیکھ سکتے ہیں۔ شرط یہ ہونی چاہیے کہ ان باتوں پر لکھیں جن کی حقیقت
ہم ادراک کر سکتے ہیں۔ یہ ادراک مختلف ذریعوں سے ہو سکتا ہے۔ اس میں مطالعہ بھی شامل ہے۔ تخیل کا وہ عمل جو حقیقتوں سے منحرف نہ ہو۔ ادب کا
موضوع بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے گو حقائق کے جانچنے کا طریقہ محض تخیلی نہیں ہوگا لیکن حقائق کا تخیلی اظہار ممکن ہے۔ اگر ایسا
ہو تو جیسا آپ نے لکھا ہے ادب کا بہت بڑا ذخیرہ بے معنی ہو جائے گا۔

بیچ میں بہت عدیم الفرصت رہا ہوں اس لیے اگر میری مدد کی ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ شاید کبھی کبھی
یر ہو جائے

آپ کا
احتشام

شمیم کرہانی کے نام

(۲)

الہ آباد
۱۰ر دسمبر رات

برادر کرم۔ جنا کے نام تار بھیج چکا ہوں۔ کل دس بجے رات کو وہ بات ہو کر رہی جس کا ڈر تھا، ابا جان رخصت ہو گئے۔ اگر اطمینان ہے
واس سے کہ بہت سے عزیز اور دوست اُن کے ساتھ رہے اور اس وقت جب دفن کر کے واپس آیا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ کتنے نیک نفس اور ہر دلعزیز
تھے۔ سیکڑوں مسلمان اور ہندو جنازے میں شریک ہوئے۔ انھوں نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہونچائی، کسی کی برائی نہیں کی، کسی کا مال غصب نہیں کیا،
اور رمضان میں شب قدر کو کوچ کیا اور آخری جمعہ کی نماز کے بعد دفن ہوئے۔ یہ ساری باتیں تسکین دیتی ہیں۔ یہاں عزیزوں اور دوستوں نے اس طرح ساتھ دیا
کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

میں کل آتے ہی اسپتال پہونچا تو مسکرا کر اطمینان کا اظہار کیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بس آپا جان اور میرا انتظار تھا ان میں میں نے بے حد
حساب خوبیاں دیکھی تھیں۔ اُن سے زیادہ مغفرت کا کوئی مستحق نہیں ہے۔

آپا جان بخیریت۔ مراد اچھے ہیں۔ عون، آزاد، مراد نے بے حد خدمت کی۔
دوشنبہ کو سوم ہے، ۵ر جنوری کو چہلم۔

آپ کا
احتشام

(۲)

[illegible] روڈ۔ الہ آباد

[illegible] جنوری [illegible]

برادرِ مکرم تسلیم۔ خدا کا شکر ہے کہ آپا جان بہ خیریت پہونچ گئیں۔ اس درمیان میں آپ نے اور عماد نے خطوط لکھ کر صرف انھیں بلکہ ہم لوگ کو بھی محبت اور فرض کی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور میں تو آپا جان کے چلے کہتا ہوں کہ جمالِ ہم نشیں اگر کسی میں اثر کرے تو اس طرح تو کرے وہ بھی جو چند دن یہاں رہیں تو آپ لوگوں کے سوا اور کسی کی فکر ہی نہیں تھی۔ نہ تو انھیں رائے بریلی کے قیام میں لطف آیا اور نہ یہاں رہ سکیں۔ معا ایسا تھا کہ انھیں روکنے کے بجائے یہ فکر ہو رہی تھی کہ جلد سے جلد کس طرح انھیں دہلی پہونچا دیں۔ میں تو بیوی سے کہتا ہوں کہ تم میاں بیوی کی اس محبت سے عبرت حاصل کرو۔

خیر! خدا کرے آپ سب اچھے ہوں۔ بخار تو موسم کی تبدیلی سے آ گیا ہوگا۔ بیوی اور بچّے سب تسلیم لکھاتے ہیں۔

عماد بیٹے! خوش رہو۔ تم اپّی کے چند روز وہاں نہ رہنے سے اتنے پریشان ہوئے کہ آخر بخار بلا لیا۔ ذرا سخت دل اور سخت کوش بنو۔ زا اسی کا ہے۔ محمد میاں اور اقبال کی ہمت کی داد دو، کہ دونوں بیچارے اس الجھن میں نہیں پڑتے۔

تمھاری خالہ امی اور سب بھائی بہن تم کو، مراد کو اور سلمان کو دعا سلام لکھا رہے ہیں۔ تسلیم دعا۔

دعاگو
احتشام

ابوذر عثمانی کے نام

یونیورسٹی۔ الہ آباد

[illegible] جولائی [illegible]

محترمی تسلیم۔ میرے علم میں ابھی تک راشد الخیری پر کوئی مقالہ نہیں لکھا گیا ہے۔ ان کے متعلق جتنی معلومات بھی ہو سکتی ہے وہ پاکستان سے حاصل ہوگی۔ آپ کی خوش قسمتی سے اُن پر ایک بہت اچھا خاص نمبر عصمت کراچی نے شائع کر دیا ہے۔ ساری ضروری معلومات آپ کو اس میں مل جائے گی۔ ان کی کتابیں تھوڑی بہت دہلی کے بعض کتب خانوں میں یا پھر دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ سے مل سکیں گی۔ بعض کا دستیاب ہونا تو ممکن ہی نہیں ہوگا۔ اگر کراچی میں کوئی دوست ہو تو اس کو لکھئے کہ وہ آپ کے لیے دس روپے خرچ کر کے اور آپ کو بذریعہ رجسٹری بھیج اس میں کتابوں کا، مضامین کا، اُن کے متعلق لکھنے والوں کا، ہر ایک کا پتہ ہے۔

پتہ ہے — دفتر عصمت (کراچی)

نزد قیصر سینما۔ براہ بندر روڈ کراچی [illegible]

یہ نمبر ان کے بیٹے رازق الخیری صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔

احقر

سید احتشام حسین

(صفحہ ۵۵۲ سے آگے)

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب کے نام

ستی الہ آباد
لتوبر ۶۹ء

مخدومی و محترمی تسلیم

محترمہ بھابی صاحبہ کے اچانک انتقال کی خبر ملی اور کمال صدمہ ہوا۔ زندگی اور موت کے کھیل میں زندگی ایک بازی پھر ہار گئی اور آپ
حیثیت سے بالکل تنہا رہ گئے۔ یوں تو بھرے پُرے گھر میں ایک ہی فرد کی کمی ہوئی ہے لیکن ایک ایسی فرد کی جس کی حیثیت آپ سے بھی
، مرکزی تھی۔ یہ بات غم میں اور اضافہ کرتی ہے۔ احساسات یہی ہیں لیکن عقل کہتی ہے کہ صبر کی تلقین کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کہنا
ئیے، موت حیات بشری کا لازمی جز ہے اور بے بسی صبر کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں دکھاتی۔ یہ انسان کا مقدر ہے! خدا سے
ہے کہ آپ کو اور سارے عزیزوں کو صبر جمیل عطا کرے اور مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے، جس کے لیے انھوں نے اس دنیا ہی میں
ت سامان کر لیا تھا۔ ان کی ذات میں جو خوبیاں اور نیکیاں جمع تھیں وہ بھی باعث تسکین بنیں گی کیونکہ ان کے تذکرے سے انسان کی شرافت
لی پر اعتماد زیادہ ہوتا ہے۔

اہلیہ اتفاق سے لکھنؤ میں تھیں، انھوں نے گھر کے ہر چھوٹے بڑے کی بیقراری اور غم کا تذکرہ جس طرح کیا اُس سے دل بھر آیا۔
، آپ پر یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے ثبات قدم سے عزیزوں کے دل کو تقویت بخشئے۔ یقیناً اُن کو بھی اس فرض کا احساس ہوگا
پہلے سے زیادہ آپ کی دلجمعی کا ذریعہ بنے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ عزیزی نیر مسعود اور ان کے بھائی اور برادرم آفاق صاحب اپنے غم کو
اگر آپ کی ڈھارس اس طرح بندھائیں گے کہ آپ کے قلب و دماغ پر مزید بار نہ پڑے یہاں تک کہ وقت خود زخم کے اندمال کی تدبیر
ے! خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

شریکِ غم
احتشام حسین

قاسم صدیقی کے نام

یونیورسٹی - الہ آباد
۳۰ مارچ

مکرمی تسلیم۔ آپ کا خط ابھی ملا حالانکہ لکھا ہوا ۲۰ مارچ کا ہے۔ غالباً آپ کے شاگرد صاحب نے اسے پرسوں ڈاک کے حوالے کیا۔ دہلی میں جس کانفرنس کا ذکر آپ نے کیا ہے اُس کے متعلق حال میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اگر آپ کا اشارہ اس کانفرنس کی طرف ہے جس کا ذکر حیات میں ہے تو میرا خیال ہے کہ اُسے ملتوی ہو جانا چاہیے اور اس کی نوعیت کو بھی کسی قدر بدلنا چاہیے۔ بہرحال آپ نے جو باتیں پوچھی ہیں مختصراً اُن کا جواب عرض کرتا ہوں۔

۱- میں نے لکھنا تو ۱۹۳۰ء میں شروع کیا لیکن میرا پہلا افسانہ نگار، لکھنؤ میں ۱۹۳۳ء میں، مزاحیہ مضمون سرپنچ لکھنؤ/شوکت تھانوی کا پرچہ ۱۹۳۳ء میں اور سیاسی مضمون سرفراز لکھنؤ ۱۹۳۳ء میں چھپا۔ اُن دنوں میں بی اے کا الہ آباد یونیورسٹی میں طالب علم تھا۔

۲- جہاں تک یاد ہے شعر کہنا ۱۹۲۳ء میں شروع کیا تھا۔ اس وقت اعظم گڑھ میں تھا اور آٹھویں درجہ کا طالب علم تھا لیکن شعر کہنے کی رفتار ہمیشہ بے حد سست رہی۔ اس وقت کچھ نثر میں بھی لکھا تھا اور دہلی کے کسی اخبار میں شائع ہوا تھا لیکن وہ محض بچکانہ کوشش تھی۔ بالکل شروع میں غزل، پھر کچھ نظمیں لکھیں، کچھ مذہبی بھی تھیں۔

۳- سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد ترقی پسند تحریک کو زوال...... اس کے وجوہ میرے خیال میں حسب ذیل تھے۔

(۱) تحریک جن مقاصد کی ترویج اور اشاعت چاہتی تھی وہ اچھے خاصے عام ہو چکے تھے اور اکثر لکھنے والے کسی نہ کسی شکل میں ادب کی سماجی حیثیت کے قائل ہو چکے تھے صرف شعوری طور پر سیاسی اختلاف رکھنے والے کھل کر مخالفت کر رہے تھے۔

(۲) تحریک بہ حیثیت تنظیم کے کمزور ہو گئی تھی۔

(۳) کسی حد تک تنگ نظری بھی اس کی ذمہ دار ہے۔ اگرچہ یہ تنگ نظری عام نہیں تھی بلکہ چند مخصوص افراد سے متعلق تھی جنھیں احساس ہو رہا تھا کہ یہ تحریک اُن کا علم بلند نہیں کر رہی ہے۔

(۴) آزادی کے مسئلہ پر اختلاف رائے نے انتشار پیدا کیا تھا۔

(۵) کچھ ادیب جن کی سیاسی حیثیت بھی نمایاں تھی، دوسروں میں یہ شک پیدا کرتے تھے کہ یہ تحریک ادبی نہیں سیاسی ہے۔

(۶) ترقی پسند رسائل اور اخبارات کی کمی، لکھنے والے دوسرے رسائل کے مزاج اور معیار کے مطابق لکھنے پر مجبور تھے۔

۴- نظم اور غزل کی بحث فضول ہے۔ دونوں ساتھ چلتی رہی ہیں چلتی رہیں گی۔ دونوں کے میدان اچھے خاصے الگ الگ ہیں۔ مجھے کوئی نظر نہیں آتی کہ ایک کو چھوڑ کر دوسری کی ترقی کا تصور کریں۔

۵- آزاد نظم کی زیادہ مخالفت تو مجھے نظر نہیں آتی، ہاں کامیاب آزاد نظم لکھنے والوں کی کمی اس کے ہردلعزیز نہ ہونے کا باعث ہے۔ چونکہ ابھی آزاد نظم کی روایت بہت مختصر ہے اس لیے لوگ اس سے مانوس نہیں ہیں، جب تک اچھی آزاد نظمیں نہیں لکھی جائیں گی مشکل ہی سے عام لوگ اس میں دلچسپی لے سکیں گے۔ پابند نظم آزاد کے مقابلہ میں جلد متوجہ کرتی ہے، اس کا آہنگ مانوس ہے، نئی نظم کے آہنگ سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔

۶- تنقید نگار کے لیے اچھا ادیب ہونا ضروری ہے۔ انشا پردازی سے مراد اگر محض عبارت آرائی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ تنقید نگاری کے لیے مفید

لیکن صحیح، مربوط، دلکش طرزِ تنقید کو مؤثر اور دلچسپ بنا سکتی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ تنقید کے اصل مقصد کو عبارت پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔

۴۔ مغربی نقادوں میں سے میں نے کسی کو اپنا ماڈل بنانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ متاثر کئی ایک سے ہوا ہوں۔ بلکہ یوں کہوں کہ بعض اوقات متضاد قسم کے لوگوں سے۔ مجھے بہت سی باتیں میتھیو آرنلڈ کی پسند آئیں، بعض سینٹ اور ٹین کی، بعض ایلیٹ اور رچرڈس کی اور بعض ہربرٹ ریڈ کی۔ پھر مارکسزم سے متاثر ہونے کی وجہ سے مارکسی نقادوں سے زیادہ فائدہ اٹھاتا رہا ہوں مگر کسی کی پیروی نہیں کی۔

۵۔ یہ سوال بہت طویل جواب چاہتا ہے، اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ ادب کے تقاضے ہر دور میں ایک ہی رہے ہیں — وہ اچھا ادب ہو اور ادیب کے تخلیقی جوش اور خلوص سے وجود میں آیا ہو۔ اس کے تقاضے اور حیثیت سے ہر عہد میں بدلتے رہیں گے کہ ہر قدر کے لوگ اپنی آسودگی کے لیے اپنے عہد کے شعور اور نظامِ جذبات سے ہم آہنگی چاہیں گے۔ اس وقت بھی ادب کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے عہد کے ذہن اور جذبے کو اپنے حسن سے آسودہ کرے۔ پڑھنے والوں کے مختلف گروہوں کے تقاضے مختلف ہو سکتے ہیں اس لیے ان کی پسند کے معیار بھی مختلف ہوں گے اور مطالبات بھی۔

اس وقت کے ادیب سے یہ مطالبہ کرنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ایسی باتیں کہے جو ہمیں کھوکھلی، بے وقت کی راگنی اور محض تخیلی نہ معلوم ہوں اور وہ اس طرح کہی گئی ہوں کہ ہمارے شعور اور احساسِ جمال کو بہ یک وقت بیدار کریں — آج زندگی کے تقاضے کیا ہیں، ان کے متعلق لکھنے کی ضرورت نہیں، آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ بہ خیر ہوں گے۔

احقر
احتشام حسین

اقتدار حسین کے نام

نور اللہ روڈ۔ الٰہ آباد
۲۴ر نومبر رات

عزیزا سلمہ۔ دعا۔ ابھی لکھنؤ سے دردناک خبر آئی کہ برادرم کلب مصطفیٰ صاحب کا انتقال حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔ کیا کہوں کیسی تکلیف ہوئی۔ دل یقین نہیں کرتا لیکن حادثہ تو ہو ہی گیا۔ ان کے بیوی بچوں کا کیا عالم ہوگا، یہ سوچ کر بے حد تکلیف ہے — میری طبیعت ٹھیک نہیں ورنہ میں اسی وقت جاتا۔ کیا کروں۔ رشیدہ کو کیسی تکلیف ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں سبھوں پر ایک عجیب کیفیت طاری ہے۔ کچھ لکھا نہیں جاتا۔ جس بات کی طرف ذہن نہیں جاتا تھا، وہ ہو گئی۔

معلوم نہیں تم لوگ کب جاؤ گے اور کیا صورت ہوگی۔ بہرحال جو کچھ ہوا ہو گیا، کسی کا اختیار نہ تھا۔ تمھیں اپنے دل کو مضبوط رکھنا چاہیے۔ تاکہ رشیدہ وغیرہ کو سنبھال سکو۔ اس بیچاری کے لیے تو واقعی یہ غم بہت ہی بڑا ہے۔ والدہ صاحبہ اور تمھاری بھابی دونوں حیران ہیں کہ کیا کھائیں اور کیا کہیں۔

ابھی گاڑی میں کچھ وقت ہے اگر میں نہ جا سکا تو کسی کو بھیجوں گا۔ ابھی ۵ر دسمبر کے آنے کے متعلق میں نے کچھ نہیں سوچا۔

سبھوں کو دعا۔ خدا کرے سب ٹھیک ہوں۔

دعا گو
احتشام حسین

جعفر عباس کے نام

(۱)

نورالنسا روڈ ۔ الہ آباد

26.12.70

ڈیر محمد میاں ۔ دعا ۔ یہ آرٹسٹک قسم کا کاغذ دیکھ کر تم کو اس لیے لطف آنا چاہئے کہ تمھاری امّی نے کسی کے نام یہ خط لکھا تھا، پھر رائے بدل دی اور اسے پھاڑنے جارہی تھیں کہ میں نے اسے موت سے بچا لیا کہ کسی بے تکلف دوست کو بھیج کر اسے دوبارہ زندگی بخشوں گا۔ تمھارے ایک خط کا جواب باقی ہے۔ اس سے بہتر اس کا مصرف اور کیا ہوسکتا ہے!

میں ادھر کو لکھنؤ چلا گیا تھا وہاں سے کل رات کو واپس آیا۔ یہاں وہاں سب اچھے ہیں۔ سب تمھاری خیریت اور تمھارے مشاغل کے متعلق پوچھتے ہیں۔

حِنّا کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ تمھیں غالب انعام کے سلسلہ میں تقریباً پونے دو سو روپیوں کی کتابیں خریدنا ہے۔ خیال ہے کہ کم سے کم چند کتابیں ایسی ہوں گی جو میرے کام بھی آئیں گی۔ غالب پر کم سے کم نوّے فیصدی کتابیں میرے پاس ضرور ہی ہوں گی۔ لیکن اگر شرط یہی ہے کہ کتابیں غالب ہی کے متعلق ہوں تو مجبوری ہے۔

میں نے تمھارے سامنے ہی ڈگل صاحب سے مدراس جانے کا وعدہ کیا تھا، بلکہ خود اپنے کو ان پر مسلط کیا تھا لیکن اب یونیورسٹی ۴ کو کھل رہی ہے اور تقریباً ایک مہینہ بعد، اس وقت بعض وجوہ سے موجود رہنا ضروری ہے جا نہ سکوں گا بہت افسوس ہے۔ میں نے ڈگل صاحب کو خط لکھ دیا ہے۔ شاید جلد ہی ایک دن کے لیے لکھنؤ اور ایک دن کے لیے علی گڑھ جانا ہو۔

معلوم نہیں ریڈیو کے بارے میں معاملات کہاں تک پہونچے، کیا امید ہے؟ وقت قریب آئے تو گجرال صاحب سے مل لینا وہ ڈراما جو لکھ رہے تھے کیا نکلا۔ ایک مختصر سا ڈراما عون نے بھی لکھ ڈالا تھا۔ تم نے موضوعات کے بارے میں پوچھا تھا، وہ موجودہ حالات میں تو بہت ہوسکتے ہیں، فیملی پلاننگ، قومی یک جہتی، بیروزگاری، سوشلزم کی طرف قدم، فرد اور سماج کی کشمکش۔ خود غرضی، نفع اندوزی، فرسودہ رسم و رواج، روایت پرستی کے خلاف طنز وغیرہ۔ لیکن اس کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو زندگی کے کچھ واقعات کو لے کر اپنے خیالوں پر منطبق کرنا یا اپنے خیالوں کے مطابق واقعات اس طرح تخلیق کرنا کہ وہ فطری معلوم ہوں۔ سارا زور مطالعہ پر اور ڈرامائی کشمکش یا TENSION پر ہونا چاہیئے۔ ریڈیو ڈرامے کی محدود دنیا کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ وہاں عمل آوازوں سے ہی ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ کچھ انگریزی ڈرامے بھی پڑھ ڈالو اور ڈرامے پر چند کتابیں۔

حِنّا کو اور شمیم بھائی کو لکھنؤ سے لکھ چکا ہوں۔ مقدمہ کے معاملہ میں کوئی ایسی بات نہ معلوم ہوسکی جو مستند ہو۔ شاید آج موہن لال گ سے کاغذات واپس آئے ہوں، اس وقت کچھ معلوم ہوگا۔ والدہ صاحبہ کو آداب، حِنّا، رشیدہ دعا۔ آصف زویا پیار، شمیم بھائی کے یہا سلام دعا کہنا۔ سب تمھیں سلام دعا لکھاتے ہیں۔

دعا گو

احتشام

(۲)

سٹی روڈ - الہ آباد

20.11.6

پیارے محمد میاں دعائیں۔ تمہارا ۲۱ کا خط ملا۔ خوشی ہوئی۔ جب تو اس وقت عازم سفر ہوں گے۔ شاید کل تک ان کے پروگرام
سل حال معلوم ہو۔ اجمل اجملی صاحب کا تو نہیں غلام علی کا خط آیا تھا اس سے تمہاری دست بُرد کا حال معلوم ہوا تھا۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔
جس اُردو گھر کا میں نے ذکر کیا ہے اُس کا اتنا ہی پتہ ہے اُردو گھر، کوچہ فولاد خاں دہلی ۶۔ اب کوچہ فولاد خاں اتنا بڑا کیا ہوگا کہ وہ
ادو کان نہ ملے! ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر اُن سے پورا پتہ دریافت کر لو۔
عون کو میں نے ایک کام سے ۱۱ کو لکھنؤ بھیجا تھا، کہہ گئے تھے ۱۳ کو آ جاؤں گا، آج بھی نہیں آئے تو میں نے انصار کو فون کر کے پوچھ
وہ اکی ہدایت کر دی کیونکہ وہ دوا بہت کم یعنی صرف دو یا تین دن کی لے گئے تھے۔ یونیورسٹی بند ہونے سے سیدہ بے حد بحال اور پھر تیلی
ہی ہیں، کبھی کبھی کہہ اٹھتی ہیں کہ یونیورسٹی خواہ مخواہ بند ہے، ہرج ہو رہا ہے لیکن تم سمجھ سکتے ہو کہ اس جملے کے کیا معنی ہیں۔ میں البتہ
ن میں ہوں کہیں آ جا بھی نہیں سکتا۔

تم نے جو سوالات بھیجے ہیں اُن سے کچھ خشک سا ہو رہا ہے کہ تم پڑھ رہے ہو! یہ خاصی اچھی علامت صحت مندی اور سعادت مندی
ہے، خدا کرے قائم رہے۔ بہت سی کتابیں خرید کر پڑھنے کی نہیں ہوتیں لائبریریوں سے لو اور جلد پڑھ کر، اپنے ضروری نوٹ بنا کر واپس
یا کرو۔ تم تو میاں لائبریریوں، ندیریہ، دلی کالج، یونیورسٹی اور اپنے اساتذہ کی کتابوں سے فائدہ حاصل کر سکتے ہو۔
اردو زبان کی ابتدا اور آغاز کے متعلق حسب ذیل چیزیں ضرور دیکھو:

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	از احتشام حسین۔ محض مقدمہ	ان سے ساری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔ آؤ گے تو باتیں بھی ہو جائیں گی لیکن اسی وقت جب خود پڑھ چکے ہو گے۔
اُردو زبان کی تاریخ	ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ اس کے ضروری حصے	
اُردوئے معلّٰی، دہلی یونیورسٹی کا لسانیات نمبر		

اقبال کے عشق کے تصور کے متعلق حسب ذیل چیزیں۔

۱۔ مضامین عابد — ڈاکٹر عابد حسین
۲۔ روح اقبال — یوسف حسین خاں۔ اس کتاب کا ضروری حصہ
۳۔ اقبال کا تصور عشق۔ — ڈاکٹر غلام عمر۔ چھوٹی سی کتاب ہے بھیج دوں گا
۴۔ فکر اقبال — خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی کی کتاب انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ، اچھی خاصی ہے لیکن خریدنے کی کیا ضرورت ہے، ڈاکٹر عابد حسین کی
قومیت کا مسئلہ، محمد اکرام کی آب کوثر، موج کوثر، رود کوثر کے بعض حصے، انگریزی کی بعض کتابیں مفید ہوں گی۔ جادو ناتھ سرکار کی ایک کتاب
INDIAN CULTURE THROUGH AGES بھی کام آ سکتی ہے۔
قطب شاہ کی بارہ پیاریوں پر الگ الگ کیا مل سکتا ہے، سب اس کی محبوبائیں ہیں۔ ڈاکٹر زور کی حیات قلی قطب شاہ میں جو کچھ ہے
کافی ہے۔ حال میں انگریزی میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کی SULTAN MOHD. QULI QUTUB SHAH نکلی ہے، اس میں کچھ زیادہ اس کی
بات ہی کی ہے، چند دن ہوئے میں نے وہ کتاب پڑھی۔

ابھی میرے دہلی آنے کا کوئی پروگرام نہیں۔ خواجہ صاحب نے غالب کے سلسلہ میں فروری میں یاد کیا ہے۔ تم جب جب فرصت ملے یہ کام کر دینا۔

۱۔ تنویر علوی صاحب سے کہنا کہ اُن کا خط مل گیا ہے، اچھا ہوں جواب لکھوں گا۔

۲۔ ظہیر صدیقی صاحب سے کہنا خط مل گیا، اسد صاحب کا مقالہ مل جائے تو انھیں لکھوں گا

۳۔ شمیم بھائی کا خط مل گیا ہے۔ جواب لکھنے کی تیاریاں بیوی بھی کر رہی ہیں اور سعیدہ بھی۔

کل رات کو اتر ڈیہہ سے باجی مع محسن بچا کے آئیں

آزاد آج کل یہیں ہیں۔

والدہ صاحبہ ۲۰ نومبر کو بمبئی پہونچیں گی غالباً ۲۵ تک لکھنؤ آئیں گی۔ جتنا نہیں ہیں تم زیادہ تر گھر ہی پر رہنا۔ رشیدہ بی بی دُعا۔ بچوں کو پیار ——— اب تو ان لوگوں کا امتحان قریب ہوگا۔ تمھاری امّی دعا کہتی ہیں بھائی بہن سلام کہتے ہیں۔

دعاگو

احتشام

(۳)

۱، نوراللہ روڈ - الہ آباد

11.10.70 اتوار رات

پیارے محمد میاں سلمہٗ ۔ دُعا

میرا خط ملا ہوگا۔ اسی میں عون نے بھی کچھ لکھا تھا ——— میرا خط پہونچنے سے پہلے تم نے جو خط لکھا وہ ملا۔ حالات معلوم ہوئے یہ نہ ہو سکا کہ شعبۂ اردو میں کسی کو وظیفہ ملا یا نہیں، اگر دوسرے کو ملا تو اس کی کوئی وجہ بھی معلوم ہوئی یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ کیا کوئی اور مل سکتا ہے۔؟

تمھارا موضوع خاصا وسیع ہے۔ انگریزی میں سیکڑوں کتابیں ہیں، تنقید اور شاعری کے علاوہ نفسیات اور سوشیالوجی وغیرہ سے متعلق بھی پڑھنا ہوگا۔ میں نے ایک مختصر سا خاکہ بنا دیا ہے وہ مع چند کتابوں کے نام کے دو ایک دن میں بھیج دوں گا۔ فیس کتنی جمع کرنا اور کب تک؟

ایک بات اور سوچنا ہے۔ اگر ڈاکٹر ہونے کا انتظار کرنا ہے تو اس میں کم سے کم چار سال لگیں گے اور اُس کے بعد بھی کام کا ملنا بالکل یقینی تو نہیں۔ اِدھر دو جگہیں ہوئیں ایک نیشنل بک ٹرسٹ میں اور دوسری ریڈیو میں (اشتہار آج کے پیٹریاٹ میں ہے جو وہاں کا ۱۰ ارکا ہوگا) میری رائے میں درخواست دونوں میں دینا چاہیے۔ جو ترجمے وغیرہ کیے ہیں اور شائع ہوئے ہیں اُن کی فہرست بنا لو۔ چند اچھے سرٹیفکیٹ لے لو ——— یہ کھوکر میں یہ معاملہ کس کے ہاتھ میں ہوگا ——— تنخواہ زیادہ نہیں لیکن اب ان محکموں کی حالت کا بہتر ہوتا یقینی ہے۔ ایک ضروری کام یہ کرو کہ نیشنل بک ٹرسٹ ٹیلیفون کر کے کرتار سنگھ دُگل سے مل لو۔ ممکن ہے وہاں سوار جعفری بھی ہوں ——— اُن لوگوں سے میرا نام لے کر مشورہ کر لو ———

اس درمیان میں اگر میں آیا تو جن لوگوں سے ملنا ضروری ہوگا ملوں گا۔

دو چار مضمون وغیرہ لکھے ہوں، دو چار نظمیں جلد جلد اِدھر اُدھر شائع کرا دو۔ اس میں شمیم بھائی سے مدد مل سکے گی۔ یہ ساری چیزیں انٹرویو میں کام آتی ہیں۔ مسز مجیب کی تعریف میں خط لکھ چکا ہوں، ملا ہوگا۔

احتشام

ڈاکٹر سید محمود الحسن کے نام

(۱)

روڈ - الہ آباد

فروری ۵۹ء

محمود سلمہٗ دعا

تمہارا ۲۳ کا خط کل ملا۔ میں اعظم گڈھ کئی وجہوں سے نہ جا سکا۔ ایک سبب تو یہی تھا کہ شمس الرحمان فاروقی کی کار سے جانا تھا ہو گئے۔ پھر میں بھی ٹھیک نہ تھا۔ تیسرے یہ کہ اتنا وقت بھی نہ تھا کہ ادھر بھی جاتا، بابا زیادہ بیمار ہیں، وہاں بھی جانا ضروری ہے ابد حسین صاحب اعظم گڈھ سے وہاں پہونچے ہوں گے۔

حسینی صاحب کی بیماری کا حال معلوم کر کے افسوس ہے، میری طرف سے بھی مزاج پرسی کرنا۔ بیوی بھی سلام لکھاتی ہیں، غالباً خود بھی ل سخت نزلے میں مبتلا ہیں۔

آج سے سعیدہ کا امتحان شروع ہے۔

اعتبار تنظر کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کر کے لکھو، مضامین کی فہرست بھیجو اور لکھو کہ کن کن مضامین میں دشواری ہے تو میں ترکیب ے۔

ہاں ضروری بات یہ ہے کہ شبیہ الحسن صاحب سے کہنا کہ اُن کا خط مل گیا، ۱۳ مارچ ساڑھے دس بجے امتحان ہے۔ سرکاری خط بھی ے گا اور میں بھی پھر لکھوں گا۔

کل میں ڈاکٹر عبد القیوم کی کتاب ڈھونڈھ رہا تھا، کچھ علمی مطالعے یا علمی نقوش قسم کا نام تھا، نہیں ملی۔ خیال ہوا کہ تم تو نہیں ے اگر ہو تو صرف کتاب کا نام اور پتہ لکھ بھیجو، اُنھیں شکریہ کا خط تو لکھ دوں۔

معلوم نہیں کیسے خبر تھی کہ میں لکھنؤ آرہا ہوں۔ شبیہ الحسن صاحب نے بھی لکھا ہے اور نکہت جہاں نے بھی۔

ضروری بات یہ ہے کہ جشن ملنے کے بارے میں ٹھیک تاریخ لکھو۔ بیوی دعا اور بچے سلام کہتے ہیں۔

دعاگو

احتشام حسین

(۲)

نور اشفر روڈ - الہ آباد

11.12.67

محمود سلمہٗ دعا

تمہارا ۹ کا خط ملا۔ تم لوگ کبھی الہ آباد کے قائل نہیں ہوئے۔ آخر لکھنؤ کے الکشن میں وہ کیا بات ہے جو یہاں نہیں ہے! وہی شور، جلوس، جھنڈے، سیکڑوں لاؤڈ اسپیکر، جن سے کسی کی بات سمجھ میں نہیں آتی، نہ دوکاندار گاہک کی سنتی پاتا ہے، نہ رکشے والا کرایہ چکا سکتا ہے گالی گلوچ، مار پیٹ، جلسے، بھونڈی بھدی تقریریں، ناچتے گاتے جلوس، گھر گھر حاضری ــــ یہی باتیں تو وہاں بھی ہوں گی۔ وہ نئی بات کیا ہے جو صرف لکھنؤ میں ہے!

حسینی صاحب کے متعلق معلوم ہو کر افسوس ہوا۔ خدا رحم کرے ــــ انھیں بھی خط لکھ رہا ہوں۔

میں ۱۲ کی رات کو علی گڑھ ایک دن کے لیے جا رہا ہوں۔ انصار کے آنے کی ابھی تو کوئی خبر نہیں۔

تم نے نیر مسعود کو اُداس نسلیں نہیں دی، انھوں نے مسیح الزماں صاحب کو لکھا ہے۔

باجی ابھی مرزا پور ہی میں ہیں۔ چند روز بعد آئیں گی۔ ماں سے خط آیا تھا۔ بابا کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی، قدرے بہتر ہیں۔

کل صبح کو نعیم بھائی الہ آباد کے اسٹیشن سے گزریں گے، بنارس کسی مشاعرے میں وہ اور فراق صاحب جا رہے ہیں۔

انصار اور محسن کے یہاں سبھوں کو دعا کہنا۔

بیوی اور ابا جان دعا اور سلام لکھاتے ہیں۔

دعاگو

احتشام

وسروں کے مکتوب احتشام حسین کے نام

عبدالماجد دریابادی

(۱)

بار "صدق" لکھنؤ
یا باد۔ بارہ بنکی
خہ ۲۵ مارچ ۱۹۴۲ء

شفیق مکرم۔ السلام علیکم

کئی دن ہوئے اتفاق سے ریڈیو سننے بیٹھا تو آپ کا تبصرہ اردو کتابوں پر آ رہا تھا۔ ماشاء اللہ سُن کر جی بڑا خوش ہوا۔ باتیں پُر مغز۔ پیرایہ
ن متوازن لہجہ شستہ۔ اب اس کے علاوہ اور کیا چاہیئے۔

افسوس ہے کہ لکھنؤ میں یا کہیں ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ تبصرہ سن کر جی نہ مانا۔ اور اس نصف ملاقات کی ابتدا کر دی۔

والسلام
عبدالماجد

(۲)

خبار "صدق جدید"
یاباد ضلع بارہ بنکی
ر نومبر ۱۹۵۸ء

کرم گستر السلام علیکم

اکیڈمی والوں کا یہ اندھیر آپ نے دیکھا کہ پچھلے دسمبر کے سالانہ اجلاس والے مضمون جو شائع کئے وہ سارے ہیں ہندی میں۔ یعنی اُردو
، بھی دونوں مضمون ہندی میں ہیں۔ تعصب و تنگ نظری کی حد ہوگئی۔

اگر مناسب سمجھئے تو ایک محضر (انگریزی یا اردو میں) سارے اُردو والوں کی طرف سے پیش کیجئے کہ

(۱) کارروائیاں اور ایجنڈے اُردو میں ہی جایا کریں جیسا کہ چند سال قبل برابر جاتا ہی کرتے تھے۔

(۲) اُردو کے مضمون آئندہ سے اُردو ہی میں چھپا کریں۔

(۳) اکیڈمی کا سائن بورڈ اردو میں بھی ہو۔

(۴) لائبریری میں انگریزی و ہندی کے ساتھ اردو کتابوں کی بھی خریداری ہوا کرے۔

وقس علیٰ ہذا۔

اگست کی ایگزیکٹو کمیٹی کے وقت میں نے سکریٹری کو انگریزی میں کہا کہ بہ طور عنایت خاص (ASA SPECIAL FORM) میرا
بنڈا اردو میں بھیج دیا کیجئے کہ مجھے ہندی پڑھنے میں سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے AS I HAVE A POOR KNOWLEDGE OF HINDI
ری بات سن کر اسسٹنٹ سکریٹری صاحب نے زبانی کہا کہ اب کی تو بہت دیر ہو چکی تھی آئندہ سے تعمیل ہوگی۔ اکتوبر کی میٹنگ کے لیے پھر ہندی نازل
ئی۔ میں نے انگریزی میں شکایت نامہ لکھا کہ "بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنی چھوٹی سی درخواست بھی منظور نہ ہوئی۔ وعدہ کے باوجود" اس پر
رزی میں ایجنڈا آیا۔ مگر میری طبیعت ہٹ چکی تھی میٹنگ میں نہیں گیا

پچھلے دنوں کتابوں کی جتنی بھی خریداری ہوئی ۔ ہندی اور پھر انگریزی کی۔
صدر اور سکریٹری دونوں بہ ظاہر تو بڑے غیر متعصب صلح کل معلوم ہوتے ہیں لیکن حالت ؟؟

والسلام
عبدالماجد

(۳)

صدق جدید
دریاباد ضلع بارہ بنکی
۱۷ مارچ سنہ ۱۹۷۶ء

کرم گستر، السلام علیکم

ذیل کا رزولیوشن، ۲۴ مارچ کے لیے اگر آپ یا فراق صاحب پیش کر دیں تو کیا اچھا ہے؟ اس کی نقل آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں لفظ و اصلاح کا پورا اختیار آپ کو حاصل ہے۔

"چونکہ سنہ ۱۹۲۷ء میں جب اکیڈمی کی بنیاد پڑی ہے، ہندی اور اردو دونوں غیر سرکاری زبانیں کس مپرسی میں پڑی ہوئی تھیں اور دونوں کے لیے خارجی امداد اور سہارے کی ضرورت تھی یہ اکیڈمی دونوں کی ترقی و سرپرستی کے لیے قائم ہوئی لیکن اب جب کہ ان میں سے ایک زبان یعنی پوری طرح سرکاری زبان قرار پا چکی ہے اور اُسے فروغ و ترقی کے زیادہ سے زیادہ موقع از خود حاصل ہو گئے ہیں اب اُسے کسی خارجی امداد یا سہارا ضرورت کسی درجہ میں بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ اکیڈمی اب اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ دوسری زبان یعنی اردو پر کرے اردو کو اپنے التفات کا مرکز قرار دے۔"

اور تائید کرنے والوں میں ایک نام میرا بھی رکھ دیجیے۔

نیاز کیش
عبدالماجد

(۴)

صدق (ہفتہ وار)
۱۷ مئی سنہ ۱۹۷۶ء دریاباد بارہ بنکی

برادرم السلام علیکم

اکیڈمی کے اس جلسے سے افسردہ و مایوس واپس آکر کچھ روز بعد ایک خط، بجائے انگریزی کے قصداً اردو میں لکھ کر صدر صاحب کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ شبہ کیا یقین تھا کہ جواب نہ آئے گا۔ چنانچہ نہیں آیا بھی۔ بس ایک دل کی بھڑاس تھی جو نکل کر رہی ؎

افشائے راز عشق میں گو ذلتیں ہوئیں   لیکن اُسے جتا تو دیا، جان تو گیا

نقل آپ کی اطلاع و واقفیت کے لیے ملفوف ہے۔

اپنی عمر بھر کی زبان کو بھلا کر جلسے میں کیسے "سبھا پتی" اور "دھنیاد" بولنے لگوں؟

یہ تو اردو کی کوئی خدمت نہ ہوئی الٹی اور بدخدمتی ہوئی ع

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اس خط کو اگر آپ چاہیں تو دوسرے مخلصین کو بھی دکھا سکتے ہیں۔

والسلام
عبدالماجد

(۵)

صدق جدید
۲؍جولائی ۱۹۶۱ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

برادرم سلمہ وعلیکم السلام
۱؍کو صبح ۹ بجے عین اس وقت کہ اسٹیشن کے لیے روانہ ہو رہا تھا مسعود صاحب نے ٹیلی فون پر یہ سنائی سنائی۔ انا للہ۔ دل مسوس کر رہ گیا واقعہ کی غم انگیزی کے علاوہ حسرت اس کی بھی کہ جنازہ میں شرکت اور کاندھا دینے کا موقع بھی ہاتھ آکر ہاتھ سے نکل گیا۔
حکیم عبدالقوی سلمہ کو اپنا نائب بنا آیا تھا۔ ضرور میری طرف سے شریک ہوئے ہوں گے۔ دعائے مغفرت دور ہی سے کرتا رہا۔
اب ان شاء اللہ وقت نکال کر کسی دن آؤں گا اور مرحوم کے کسی صاحب زادے یا خود آپ کی رہنمائی میں چل کر قبر پر فاتحہ خوانی کروں گا۔
تعزیت نامہ جان تاجدار کے نام پرسوں ہی لکھ چکا ہوں۔ آپ سے بھی اگر ملاقات ہو جائے تو ضرور میرے نام سے تعزیت پہونچا دیجئے گا مرحوم کی بیوہ اور لڑکے لڑکیوں سب کو۔
اور موقع مل جائے تو مرحوم کے آخیر وقت کے حالات بھی لکھ دیجئے گا۔ دفن کہاں ہوئے نماز جنازہ کس نے پڑھایا وغیرہ
میں لسانی کمیٹی سے ہٹ رہا ہوں۔ میں گوشہ میں بیٹھ کر قلم چلانے کا عادی، کمیٹی و میٹی کے کام کا اہل نہیں۔ مجھ سے کہیں بہتر حیات اللہ انصاری ثابت ہوں گے بس یہ چاہتا ہوں کہ اپنی جگہ مسعود صاحب کو کرا جاؤں۔

والسلام
عبدالماجد

قاضی عبدالودود

بھور پوکھر پٹنہ ۴
۱۴؍جون ۸۱ء

شفیق مکرم، آپ کا خط ملا، شکریہ
مصحفی ۱۱۴۰ھ سے قبل اکبر گڑھ میں جو دہلی سے قریب ہے پیدا ہوئے۔ اس مقام سے اُن کے والدین کا کیا سروکار تھا، پیدائش کے بعد وہاں کب تک رہنا ہوا اور اس زمانے میں وہ دہلی گئے تھے یا نہیں، ان امور سے متعلق کوئی اطلاع موجود نہیں (دیباچۂ دیوان ششم مصحفی و روزنامچہ عبدالقادر خاں رام پوری)۔ بدو شعور میں یہ امروہہ میں پائے جاتے ہیں (تذکرۂ ہندی) اور ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ روہیل کھنڈ کے مختلف مقامات میں ملتے ہیں۔ ۱۱۸۶ھ میں انھوں نے بہ قول خود تین ماہ ٹانڈہ میں قائم کے ساتھ گزارے۔ اس کے بعد ایک برس لکھنؤ میں رہ کر بارہ برس دہلی میں قیام کرتے ہیں۔ (تذکرۂ ہندی) ۱۱۹۷ھ میں یہ پھر لکھنؤ جاتے ہیں اور وہیں ۱۲۴۰ھ میں پیوند خاک ہوتے ہیں۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ قائم سے ملاقات سے پہلے دہلی گئے تھے، اور اس زمانے میں ایسی عمر تھی کہ شعرا کی صحبت میں جا سکیں، تو میں یہ تسلیم کر لوں گا کہ میں نے قائم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے

غلط ہے۔

اب آپ مصحفی کی عبارت ذیل پر غور کریں جو خود اپنی نسبت ان کے قلم سے نکلی ہے:

"از آغاز شباب .... معروف تحصیل علم بود، چنانچہ بہ فیض بزرگان اول از تکمیل نظم و نثر ...... فارسی و تحقیق اصلاح آن فراغت حاصل کردہ، خود را معروف ریختہ گوئی داشتہ ..... دوازدہ سال در شاہجہان آباد بہ دور .... صحبت خاں .... زبان ریختہ ...... کما ہی دریافت نمود"

یہ بارہ سال وہی ہیں جو دوسری بار لکھنؤ جانے سے پہلے دلی میں گزارے ہیں۔ اگر اس سے پہلے دلی گئے ہوتے (یہاں ایام رضاعت سے کہ نہیں) تو صراحتاً لکھتے۔ مصحفی کی کسی تحریر سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ وہ ۱۱۸۶ھ سے پہلے بھی دہلی گئے ہیں، اور نہ ان کو کسی ہم عصر نے یہ لکھا ہے۔ زادۂ حال کے بعض اشخاص جو اس کے قائل ہیں ان کا شمار قائم کی عبارت ذیل پر ہے:

"از مردم بیرہ نجابت است، اما تقریب روزگار بالکل بیہلے خود در بدو شعور وارد .... دہلی شدہ نشو و نما یافتہ .... مدتیست کہ بہ .... لکھنؤ طرح اقامت افکندہ .... در زمانی کہ وارد .... دہلی بود یک چند طرح مرافعہ بخانۂ خود انداختہ"

گو "بدو شعور" کے زمانے میں وہ امروہہ میں تھے اور خود قائم بھی یہ نہیں کہتے کہ وہ بار دہلی آئے تھے۔ "بدو شعور" کا استعمال یا تو اس کی وجہ سے ہے یعنی یہ کہ جوانی کو "بدو شعور" کہا ہے، یا یہ کہ انھیں صحیح اطلاع نہیں ملی، اور کوئی تذکرہ نگار قائم کی تصدیق نہیں کرتا۔

قیام امروہہ سے متعلق مصحفی کے اقوال: فقیر ہمراہ استاد خود روزے در عالم کتب نشینی و ابتدائے شوق موزونی بہ صحبت او (تذکرۂ ہندی کا ترجمہ زبان امروہوی)۔

"فقیر او را در ابتدائے شاعری در ...... امروہہ دیدہ بود۔ اکثر بعد ہفتہ و عشرہ ملاقات می شد" ترجمہ عبدالرسول نثار

مصحفی نے اپنے حالات زندگی تذکروں کے علاوہ ایک رسالے میں لکھے ہیں جس کا نام مخزن الفوائد (غالباً) ہے اور یہ کلیات کے اس نسخے میں شامل ہے جو پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں ہے۔

میں نے اس کی نقل مانگی تھی اور میری کاپی بھی لائبریرین کے پاس جمع تھی، لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جو مصحفی پر کام کر رہے تھے اور لائبریرین نے نقل دینے سے انکار کر دیا۔ صدیقی صاحب امیر احمد علوی صاحب کے تتبع میں مصحفی کا دو بار دہلی جانا تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے مضمون مصحفی سے قائم ہے جو اورینٹل کالج میگزین میں چھپا ہے اور جس پر معاصر حصہ ۱ (بزم عام) میں اعتراضات کیے گئے ہیں۔ مضمون میں انھوں نے مخزن الفوائد سے کام لیا ہے اور اس کے طویل اقتباسات دیے ہیں۔ اگر اس میں دو بار دہلی جانے کا حال لکھا ہے تو ان کے لیے اس کا حوالہ ضرور دیتے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ یہ نتیجہ صحیح نہیں، تو آپ انھیں لکھیں اور انھوں نے مصحفی کی عبارت جس سے دہلی جانا ثابت ہوتا ہو بھیج دی، تو مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل کی بہ نسبت حاتم سے پہلے ملنے کا امکان ہے مطلق تامل نہ ہوگا۔

کوئی بات غیر واضح ہو تو بے تکلف لکھیے اور میری تحریروں میں جب بھی کچھ شبہ ہو جس طرح مناسب سمجھیں مجھے مطلع کریں اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ کریں کہ میں اعتراض سے خفا ہوتا ہوں، خواہ وہ خط کے ذریعہ ہو یا بالاعلان۔

آپ اب کے پٹنہ آئیں تو مجھ سے ضرور ملیں، امید ہے کہ اس بار ایسا نہیں کہ محض سرسری ملاقات نہ ہو۔ اختلاف خیالات کے باوجود اس کا معترف ہوں کہ آپ اپنے خیالات واضح اور دل نشین پیرائے میں پیش کرتے ہیں اور اپنے بیشتر مضامین میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور پیدا کرتے ہیں جو ہر شخص کو نہیں سوجھ سکتا۔

ہاں، میں اسے نہیں مانتا کہ سودا حاتم کے شاگرد تھے، تفاصیل کبھی اور

مخلص

عبدالودود

(۲)

کھر پٹنہ ۴
ن ۵۲ء

شفیق مکرم

میرے مضمون مصحفی اور سودا سے متعلق جو بات آپ نے دریافت کی تھی، اس کا جواب آپ کا خط ملنے کے بعد ہی میں نے دے دیا تھا، کہ آپ کو ملا یا نہیں۔

مرزا غالب کے چار خط جو آپ نے آج کل کے غالب نمبر میں شائع کرائے تھے، ان سے متعلق کچھ باتیں مدت سے دریافت کرنی چاہتا تھا آج سے پہلے اس کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن قبل اس سے کہ میں اپنے سوالات لکھوں، آپ کی اجازت سے یہ کہوں گا کہ آپ کا مضمون خوب ہے اور خطوط یا مکتوب الیہ سے متعلق کوئی ضروری بات ایسی نہیں جو آپ سے نظر انداز ہو گئی ہو۔

سوالات یہ ہیں۔

(۱) کیا نعمان احمد کی فارسی نثر کا نمونہ موجود ہے؟

(۲) صفحہ ۳۴ ستون ۲ سطر ۴ و ۵ میں نعمان احمد کے تین بیٹوں کے نام سلطان احمد، عمران احمد اور سید احمد لکھے ہیں، لیکن صفحہ ۳۹ ستون ۲ سطر ۱۴ ستون ۱ میں ایک بیٹے کا نام سلطان احمد مرقوم ہے۔ کیا یہ ہے کہ طباعت کی غلطی سے یہ اختلاف پیدا ہوا ہے، اگر صحیح نام کیا ہیں؟

(۳) صفحہ ۳۹ ستون ۲ سطر آخر: میرے ایجاد کئے ہوئے طرز" سوال یہ ہے کہ غالب نے کئے کو کس طرح لکھا ہے۔ ہمزے کے ساتھ یا ی کے ساتھ اور ی کا نقطہ ہے یا نہیں؟

زحمت دہی کے لیے عذر خواہ ہوں۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

مخلص

عبدالودود

(۳)

پو کھر پٹنہ ۴
رجون ۵۲ء

شفیق مکرم۔ خط ملا، شکریہ قبول فرمائیں

(۱) غالب کے خطوں کا عکس واپس آجائے تو سوالات ذیل کا جواب عنایت ہو: (الف) آجکل: "جب سلطنت موجود نہیں" کیا یہ اس طرح ہے؟ (ب) مہر میں دراصل کیا سنہ ہے؟ ۱۲۸۰ سنہ تو صریحًا چھاپے کی غلطی ہے۔ (ج) ایجاد کئے ہوئے" میں کئے پر ہمزہ ہے یا نہیں؟

(۲) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مصحفی پر جو کتاب لکھی ہے وہ میں نے دیکھی ہے، لیکن جرأت پر جو کتاب ان کے قلم سے نکلی ہے اب تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ آپ لکھتے ہیں: "حال آں کہ میں تحقیق کے میدان میں پیادہ بھی نہیں، لیکن اگر میرے سامنے کلیات مصحفی کا وہ نسخہ ہوتا جو آزاد مرحوم کے پاس تھا اور اس کے اس کے مجمع الفوائد بھی تو میں اس سے بہتر کام لے سکتا تھا۔" اگر آپ "بہتر" کی جگہ "بہت بہتر" لکھتے تو میں بھی اس سے اتفاق کرتا۔ ایک سلجھی ہوئی طبیعت کا آدمی بہ شرطے کہ بے غرض ہو تحقیق کے میدان میں زیادہ دیر تک "پیادہ" نہیں رہ سکتا۔ آپ اسے مانیں یا نہ مانیں لیکن میں کامل خلوص کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صدیقی کی کوئی تحریر میں نے ایسی نہیں دیکھی جیسے آج کل والے

مضمون کے مقابلے میں رکھ سکوں۔ اس کے معنی یہ کہ آپ کا مضمون کہ اس کا دائرہ محدود ہے، کامل طور پر اطمینان بخش ہے، شاید ہی کوئی ضروری بات ایسی ہو جو لکھی جا سکتی تھی اور آپ نے نہیں لکھی۔ ڈاکٹر صدیقی کی کسی تحریر کے بارے میں خواہ وہ طویل ہو یا قصیر میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ مکمل کلیات تو نہیں، لیکن مصحفی کے اس رسالے کی نقل میں نے طلب کی تھی جس میں ان کے حالات ہیں، لیکن یہ معلوم ہوا کہ نقل نہیں مل سکتی۔ لاہور میں میرے ایک کرم فرما لکھنؤ کے سید مرتضیٰ حسین صاحب ہیں۔ میں نے انھیں تکلیف دی کہ کلیات کو دیکھ کر میرے چند سوالات کا جواب دیں۔ انھوں نے لکھا کہ ڈاکٹر صدیقی کسی کو دیکھنے نہیں دیتے۔ یہ کلیات آزاد کی ملک نہ تھا، پنڈت کیفی صاحب نے پنجاب یونی ورسٹی کے کتاب خانے کو دیا تھا، آرزو صاحب نے اُن سے کہا اور انھوں نے خود اپنے لئے نقل مانگی، انھیں بھی نہ ملی۔

(۳) میں ادھر غالب بہ حیثیت محقق کو از سر نو لکھنے میں مصروف تھا، اس نے بہت وقت لیا لیکن اس کے باوجود کچھ مضامین میں نے اور لکھے ہیں جو معاصر حصہ ۳، آج کل، خاور اور شان ہند (بہار نمبر) میں شائع ہونے والے ہیں۔

(۴) پنجابی صاحب کی گشتی چٹھی میرے نام بھی آئی ہے، اس کے متعلق آپ کو کچھ دنوں کے بعد لکھوں گا۔

(۵) ایک موضوع آپ کے لیے تجویز کرتا ہوں، آپ لکھنؤ میں ہیں اور اس پر ایک مقالہ لکھنا آپ کے لیے چنداں دشوار نہ ہوگا۔ موضوع یہ ہے: "غالب اور نول کشور" یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ نول کشور جب دہلی گئے تھے تو غالب سے بھی ملے تھے اور غالب کے دوران حیات انھوں نے غالب کی تین کتابیں شائع کی تھیں: کلیات نظم فارسی (اشاعت ۲) کلیات نثر فارسی (اشاعت ۱) قاطع برہان (اشاعت ۱) نول کشور کے اودھ اخبار نے غالب کا نامۂ غالب بھی چھاپا تھا، اور غالب کی مخالفت و موافقت میں مضامین بھی اس میں شائع ہوئے ہیں۔ غالب کی وفات پر جو مضامین اس میں نکلے تھے ان میں سے دو کا ترجمہ دُتا اسی کی کتاب میں ہے، ممکن ہے اور مضامین بھی طبع ہوئے ہوں اور قطعہ تاریخ وفات تو یقیناً بہت سے شائع ہوئے ہوں گے۔ نول کشور کے نام جو خطوط غالب نے لکھے تھے وہ بھی ممکن ہے کہ تلاش سے مل جائیں۔ میں نے سنا ہے کہ لکھنؤ کے بعض کتب خانوں میں اودھ اخبار کی کل جلدیں محفوظ ہیں۔ یہ تجویز پسند ہو تو براہ مہربانی مجھے اطلاع دیں۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بہ خیر ہوگا۔

مخلص

عبدالودود

(۴)

پٹنہ ۴

۵۴/۳/

شفیق کرم۔ آپ کا خط ملا۔ زحمت کا شکریہ۔ دیوان برق برق کی زندگی میں واجد علی شاہ کے اودھ سے نکلنے کے قبل چھپا، شہر آشوب اس کے بعد لکھا گیا، اس لیے دیوان مطبوعہ میں نہیں۔ عجب نہیں کسی مجموعہ میں یا الگ سے طبع ہوا ہو، مجھے یاد آتا ہے کہ حسرت موہانی نے اردوئے معلی کے کسی شمارے میں اس کے چند بندوں کو حذف کرنے کے بعد شائع کیا تھا۔ صفیر بلگرامی کے جلوۂ خضر جلد ۲ میں بھی یہ شہر آشوب نامکمل شکل میں ہے۔ شعرائے لکھنؤ کے بیان، ایسی با اثر نظمیں کم ہیں اس کے متعلق مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے اور میں نے بھی اس کے وہ بند جو صفیر نے نقل کیے ہیں۔ اپنی اسی کتاب میں جس کا آپ سے ذکر آیا تھا، شامل کر لیے ہیں۔ آپ یا اثر صاحب مکمل شہر آشوب کسی رسالے میں شائع کرا دیں تو اچھا ہے۔

حسن عسکری صاحب وغیرہ سے ملاقات ہوئی تو آپ کا سلام کہہ دیا جائے گا۔

نسیم لکھنوی (پنڈت دیا شنکر) کا قلمی یا مطبوعہ دیوان آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ ایک نسخہ مطبوعہ ۱۲۶۸ھ مسعود صاحب کے

ں نے مستعار منگوایا تھا اور اس کی نقل رکھ لی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۲ء سے پہلے بھی چھپا تھا۔ اردو کی مطبوعہ کتابیں بھی
اسے نہیں ملتیں، یہ بڑا ستم ہے۔

برق کا دیوان جو اثر صاحب کے پاس ہے اس میں ایسا کلام بھی معلوم ہوتا ہے جو دیوان مطبوعہ میں نہیں۔ دونوں کے مقابلے سے
ہے گا۔

مخلص

عبد الودود

پروفیسر رشید احمد صدیقی

(۱)

رسٹی علی گڑھ

ہمبر ۱۹۶۳ء

احتشام صاحب محترم۔ آداب نیاز

آپ کی نئی تصنیف سمندر و ساحل کل سرور نے دی۔ اسی دن اسے باقر مہدی صاحب لے گئے۔ وہ واپس لائے تو ایک خاتون
لیں۔ دونوں ایسے تھے کہ انکار ممکن نہ تھا۔

ایک سے آبروئے ذات خطرہ میں تھی۔ دوسرے سے آبروئے عشق! اب منتظر ہوں کہ واپس آجائے تو آبروئے کتاب پر ہاتھ ڈالوں۔
ت نفلی پر سرور صاحب اور مولانا ماجد صاحب سے عذر خواہ ہوں۔

امید ہے آپ مسرور مع الخیر ہوں گے۔

خیر طلب

رشید صدیقی

(۲)

یونیورسٹی علی گڑھ

دسمبر ۱۹۶۳ء

احتشام صاحب محترم۔ بالخیر شما سلامت!!

اس دعائیہ کے کہنے کے یہ معنی تو ضرور ہوتے ہیں کہ میرے آپ کے سخت زبان یا قلم سے شریف لوگ کچھ دنوں محفوظ رہیں گے۔ مولانا ماجد
حب ایسے موقع پر صرف سلام و رحمت پر اکتفا کرتے ہیں۔ ساحل و سمندر یہ یہاں ڈپارٹمنٹ میں اس گفتگو سے اور وہ قدح ہوئی کہ بس
بچھ لیجئے کہ اس پر جو ریویو ہوا وہ طبع ہونے سے پہلے ہی شائع ہو گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود میں نے آپ کی بڑی حمایت کی۔ کچھ سا بھی ایسا لگا ہے
عورتیں معذور اور مریض کا بڑا خیال کرتی ہیں اور کہیں وہ مصنف بھی ہو تو دل و جان سے شیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ بات میں نے آپ کے چڑھانے
کے لیے نہیں کہی ہے۔ سرور صاحب کی ہمت افزائی کے لیے کہی ہے۔ ساحل و سمندر کی ابتدائیں اور آخری صفحات پڑھنے کے بعد کچھ کہنے کی
ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بحث تو نقطہ نظر پر کی جا سکتی ہے۔ افتاد طبع پر کچھ کہنا بے سود ہے۔ دل ہی عدو ہو جائے تو پھر کیا کیجئے۔ اس پر اگر کبھی گفتگو
ہو سکی تو فرصت سے اور ادبی چوٹ یہ کبھی میسر نہ آئے! آپ لکھتے بہت اچھا ہیں یعنی جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ نہایت ہی وضاحت
اور سنجیدگی سے کہہ ڈالتے ہیں اور بات ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ آپ کی باتوں سے کوئی متاثر ہو یا نہیں مطمئن ضرور ہو جائے گا۔ بہر حال
یہ طے کیا ہے کہ آپ کے ساتھ امریکہ کا سفر نہ کیا جائے۔ البتہ یہ طے نہیں کر سکا ہوں کہ حرمین شریفین کی زیارت میں آپ کو ساتھ رکھوں یا

سرور صاحب کو سرور صاحب کی عاقبت درست کراتے ہوئے اور آپ کو اس لئے کہ میری عاقبت سنور رہا ہے۔
اور ہاں کرسمس کی تہنیت قبول فرمائیے
کرسمس کو عید بار دیکھئے تقریب تہنیت سمجھئے۔

آپ کا
رشید صدیقی

ڈاکٹر عابد حسین

جامعہ نگر۔ نئی دہلی
۶ر فروری ۵۷ء

محبی و عزیزی، سلام شوق!

۳۰ر جنوری کا محبت نامہ پہنچا۔ مبارکباد کا دلی شکریہ۔ میں اعزاز و اکرام کی قسم کا آدمی نہیں ہوں تاہم ؎
"ہر چہ از دوست می رسد نیکوست"
علی گڑھ کے کام کے بارے میں آپ کی رائے پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ تجویز نہایت معقول ہے کہ آپ پہلے ایک سال کی چھٹی لیکر آئیں اور پھر حالات کا اندازہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کریں کہ اور دو سال رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسٹاف کے تقرر کا معاملہ اس مہینے کے آخر تک یا مارچ کے شروع میں طے ہوگا۔ آپ یکم اپریل سے کام شروع کر سکیں تو اچھا ہے ورنہ ۱۵ر اپریل یا یکم مئی سے سہی۔ بہرحال میں نے ذاکر صاحب کو جو سلیکشن کمیٹی کے سب سے اہم رکن ہیں مطلع کر دیا ہے کہ آپ آٹھ سو روپے ماہوار پر ایک سال کے لئے آنے کو تیار ہیں۔ اور کوئی ڈھائی مہینے کے بعد آسکتے ہیں۔ اب جب باضابطہ OFFER آپکے پاس پہنچ جائے۔ اور ریڈر کی جگہ پر آپ کا مستقل تقرر ہو جائے تو چھٹی کی کارروائی شروع کر دیجئے گا۔

آپ کے رجسٹرار نے مجھے VIVA VOCE کے لیے بلایا ہے۔ مہربانی کرکے یہ لکھئے کہ کس تاریخ کو آنا ہوگا۔ زیادہ اشتیاق۔

آپ کا
عابد

جوش

مکتوبِ جوش

پروفیسر سید احتشام حسین کے نام

لشکر سیٹھی روڈ، پونہ ۱

احتشام صاحب، آپ خود واقف ہیں کہ اپنی شادی کے بعد سے آپ نے احبابِ دیرینہ سے جو رُو گردانی کی روش
رکھی ہے، اُس پر نگاہ کرتے ہوئے میں آپ سے کس قدر ناخوش و کبیدہ ہوں، لیکن اِس انتشار میں، آپ کے ادبی و انتقادی
ن پڑھ کر دل اس قدر خوش ہوا کہ میں آپ کو خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔
بات یہ ہے کہ آدمی کا دل جس طرح اپنے محاسنِ حسن کر خوش ہوتا ہے (بشرطیکہ وہ حدود کے اندر اور مختصر ہوں)
رح ایک شایانِ تحسین انسان کو اُس کی قابلیت کی داد دے کر بھی قلب میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے، اور دراصل
آپ کے محاسنِ علمی کی داد دے کر، اپنے قلب میں شگفتگی پیدا کرنے کا یہ جذبہ ہی ہے، جو اِس وقت مجھ سے
لکھا رہا ہے، ورنہ قیامت تک آپ کو ایک سطر بھی نہ لکھتا۔
آپ کو اندازہ نہیں کہ میں یہ محسوس کر کے کس قدر خوش ہوا ہوں کہ آپ کی ذات میں جو وسعتِ نظر، دقیقہ سنجی،
ی، خود بینیت، اور عصرِ حاضر کے علمی و ادبی رجحانوں اور تقاضوں کی آگاہی، قدرت نے جس توازن
ساتھ مجتمع کر دی ہے، اُس کی نظیر ہندوستان میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ تجکو اپنی دلبری پر ناز کرنا چاہیے!
مشکل تجربوں کے بعد پتا چلا ہے کہ علم کی دیوی سرستی، تمام دیویوں کے مقابلے میں، سب سے
وہ مغرور واقع ہوئی ہے۔ اور اُس کے غرور میں اِس قدر رفعت ہے کہ لاکھوں تعلیم یافتہ آدمیوں میں
صرف دو ایک افراد کے ذہن کو اپنا مہبط بناتی ہے۔ اور باقی تمام افراد، سند و دستارِ فضیلت حاصل
لینے کے باوجود، جاہل کے جاہل ہی رہ جاتے ہیں۔ اور ان میں اور عام جاہلوں میں فرق صرف اس قدر
ہے کہ وہ تعلیم یافتہ اور حرف شناس جاہل ہوتے ہیں، اور یہ بیچارے غیر تعلیم یافتہ اور ناحرف شناس
سمجھے جاتے ہیں۔ اور کس قدر ارفع و اعلیٰ ہیں وہ ہستیاں، علم کی دیوی، جن کو، لاکھوں میں انتخاب
، اپنا مسکن و مہبط بناتی، اور اُن کے فرقِ ذہن پر تفکر و تدبر اور آگاہی و ادراک کا لازوالی تاج رکھ
ہے۔ اور اس لحاظ سے میں آپ کو جس قدر بھی مبارک باد دوں وہ کم ہے کہ اُن خوش نصیب غیر معمولی
ت والے افراد میں سے ایک آپ بھی ہیں۔
اِس کے دوش بدوش، ایک دوسری حیثیت سے بھی، میں آپ کو جواں بخت سمجھتا ہوں، اور وہ حیثیت

ہے آپ کی غیر معمولی ذہانت۔

ذہانت کے سلسلے میں شاید میں آپ سے کبھی یہ کہہ چکا ہوں کہ ذہانت کی ایک ایسی قسم بھی ہے جو بطن عبادت سے پیدا ہوتی ہے، جس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ وہ ذہانت جو اصیل و نجیب الطرفین ہوتی ہے، وہ ایک ایسی دولت بیدار ہے، کرۂ ارض پر جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں، جس کو میں الٹی ترتیب، یعنی قسم سوم، دوم، اور اول سے بیان کرونگا۔ قسم سوم کی ذہانت کا آلۂ کار "مٹھی" ہوتی ہے، جو صرف موٹے موٹے رموز و نکات کو اٹھا سکتی ہے۔

قسم دوم کی ذہانت کا آلۂ کار "چمٹی" ہوتی ہے، جو باریک نکات کو بھی اٹھا لیتی ہے۔

اور قسم اول کی ذہانت کا آلۂ کار "ناخن" ہوتا ہے، جو سُبک سے سُبک اور باریک سے باریک، بلکہ باریک ترین رموز و نکات تک کو بہ آسانی چن لیتا ہے۔ اور آپ اس لحاظ سے بھی شایانِ مبارکباد ہیں کہ قدرت و حیات نے آپ کو اس درجۂ اول کی ذہانت کا شرف و حق بھی عطا فرمایا ہے۔

شام کی شفق، آسمان پر اجاگر ہو چلی ہے، آفتاب غروب ہوتے ہی پر ہے اور میں طلوع ہونے والا ہوں، اس لیے اس خط کو ختم کرتا ہوں، بادلِ ناخواستہ۔ میرزا اور حکیم، دونوں صاحبوں سے میرا سلام شوق کہیے۔ موسم یہاں بہت خوشگوار ہے۔ وہاں تو ستمبر کی ستمگری شباب پر ہوگی۔

میں اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر میں لکھنؤ آؤنگا۔ آپ کے مضامین نے جو آپ کی داد کا جذبہ مجھ میں بیدار کر کے مجھ سے یہ طویل خط لکھوایا ہے، اس سے اس دھوکے میں نہ پڑ جائیگا کہ آپ کی بے مہری کا نقش میرے دل میں دھندلا ہو گیا ہے، نہیں، میں بدستور آپ سے ناخوش و کبیدہ ہوں، یہ خط تو [illegible] کو اس کا [illegible] ہو بجا رہا ہے، اور بس۔

لیجیے غضب ہو گیا، آدمی نے آکر کہا آج [illegible] کی چھٹی ہے باعث تمام دفتروں کی دکانیں بند ہیں، رہے نام اللہ کا۔ اب اس خط کو کس چارہ کار نہیں کہ جلد سے جلد رحلت ہو کر کنڈ کمنڈلے جاؤں اور [illegible] کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔ ارے بڑے بڑے جلدی کرنا چاہیئے [illegible]۔

[illegible]

آداب … جوش
۲۵ ستمبر ۱۹۲۵ء

جوش ملیح آبادی

شملہ

۱۹۵۴ء

میاں احتشام حسین صاحب،

چاند جیسی شکل کی شفاعت ہوتی ہے اس کا دھبا اتنا ہی نمایاں اور برا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جس شخص کے ساتھ جس پائے کی محبت ہوا کی ندا اسی بات، اس کے چہرے کی خندہ جبینی شکن بھی اسی شدت کے ساتھ دل میں چبھتی اور بعض اوقات چبھ کر ٹوٹ جاتی ہے۔ آپ کے ساتھ میری آزردگی کی عمر بھر کی ہے جو آپ کے انتقاد کی ہے۔ جیسا کہ ان تمام ناتجربہ کار اور زبوں ہمت نوجوانوں کے ساتھ

"صالح نوجوان" ہونے کی سیلی ہوئی زمین پر رینگا کرتے ہیں، آپ کچھ ایسے بوکھلا گئے کہ آپ کی آنکھیں بری طرح اوپر چڑھ گئیں مجھے بھی پہچاننا چھوڑ دیا۔ یہ ہے علم میری آزردگی کی، جسے میں نے انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کر دیا۔

آپ کا خیال ہے کہ میری آزردگی "آزردگی بے سبب" ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میری آزردگی نہایت مضبوط چٹان پر قائم ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو آپ اس قدر تو ضرور تسلیم کریں گے کہ میں جو آپ سے آزردہ ہوں، اس آزردگی کی تہ میں محبت کا چشمہ بہہ رہا ہے ہے کوئی اس کرۂ ارض پر جو محض آپ سے محبت کرنے کی بنا پر آپ سے "ناخوش اور بے حد "ناخوش ہو۔ چراغ لے کر ڈھونڈ لیجیے دیجیے، جوش کے علاوہ آپ کو کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا۔

میرے آپ کے درمیان، ادبی امور میں، کوئی اختلاف ہے، مجھے اب تک اس کا کوئی علم نہیں ہے اور اگر ایسا ہوتا یا ایسا ہو بھی تو ایک سوچنے والے آدمی پر، آپ خود بآسانی سمجھ سکتے ہیں، ایسی "ناقابل اعتبار باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑ سکتا۔

موسم یہاں آجکل نہایت خوشگوار ہے۔ شام کو مال روڈ پر مکھڑوں کے دریا بہتے نظر آتے ہیں، اُف مارے ڈال رہی ہیں یہ مال ادایاں لیکن کروں تو کیا کروں، ام الشعرا میرے بلکہ یوں کہیے کہ میں ان کے ہمراہ ہوں، نظر اٹھانے میں اتنی احتیاط سے کام لیتا ننگے پاؤں والا ٹوٹے ہوئے شیشوں پر چلتا ہے۔ ویسے پھنسے ہوئے ہیں سالے کہ نہ ہنستے بن پڑتا ہے نہ روتے۔

اگر یہی لیل و نہار ہے تو انشاء اللہ ہم شملے سے دہلی ویسے ہی مردود پاکباز بنے پہنچیں گے جیسے امریکہ سے میاں احتشام ہندوستان پہنچے ہم کی ناک کٹا کر۔ تف ہے۔ لـه .. ..

.. ..

نیازمند

جوش

محی الدین قادری زور

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۳ - ۱ - ۵۶

محب مکرم۔ تسلیم

آپ کے کرم نامہ اور مضمون اور نئے سال کی مبارکباد کے لئے دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ غنیمت ہے کہ دیر سے سہی مگر آپ نے یاد تو فرمایا۔ دوسرا ادیبوں سے بھی شروع نہیں ہوئیں۔ دوسرے کاموں میں مصروف رہا۔ یوں بھی فرصت کم ملتی ہے۔ جو کچھ کر سکتا ہوں کرتا ہوا دسمبر میں لکھنے کا کام بہت برا معلوم نہیں۔ آجکل آپ کیا کر رہے ہیں۔

میں اپنے لسانیاتی مضامین کا مجموعہ چھاپنا چاہتا ہوں۔ وہاں کوئی پبلشر تیار ہو تو مطلع فرمائیے۔ یوں بھی کئی کتابیں مثلاً اردو شہ روح تنقید وغیرہ اب نایاب ہو چکی ہیں۔ یہاں تو کوئی ناشر نہیں ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے خود اپنی کتابوں کے دوسرے ا چھپوانا نہیں چاہتا۔ دوسروں کے بہت سے مسودے زیر طبع پڑے ہیں۔

ہاں سرور صاحب کے جانے کے بعد لکھنؤ کا کیا حال ہے۔ مسعود صاحب کیا کر رہے ہیں۔ اب تو وہ آزاد ہو گئے ہیں۔ سرور صاحب نے علی گڑھ جانے کے بعد خط ہی نہیں لکھا۔ لکھنؤ میں اردو کے کرتا دھرتا تو بس آپ ہی رہ گئے ہیں۔

اردو کے اساتذہ کو ایک جا جمع ہو کر اردو کے مسائل پر غور کرنا چاہئے۔ سرور صاحب نہ معلوم اس بارے میں کیا کر رہے ہیں۔ خود آپ کا کیا خیال ہے۔ جو میں نے لکھا تھا کہ دکھن ترقی اردو اس قسم کا اجلاس بلائے۔

اردو کے بارے میں بیانات تو اچھے آ رہے ہیں لیکن یوپی اور لکھنؤ میں عملاً کچھ سہولتیں ملی ہیں یا نہیں۔ وہاں کے حالات فرمائیے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

خواجہ غلام السیّدین

دہلی

۱۰ر جنوری ۱۹۶۱ء

حبیب محترم۔ تسلیم

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ مجھے خود اس بات کا افسوس اور شکایت رہ جاتی ہے کہ آپ سے کبھی فرصت سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ دفعہ آپ دہلی آئیں تو مجھے ضرور مطلع کریں۔ اب کہ میں منسٹری سے "رخصتی جشنی" پر ہوں۔ مجھے مقابلتاً فرصت ہے اور امید ہے البتہ ملاقات ہو سکے گی۔ آجکل آپ کی ادبی دلچسپیاں اور مشغولیتیں کیا ہیں۔ علاوہ اپنے معمول و فرائض کے۔

...... محمود الحسن کے بارے میں آپ کے خط کے ساتھ ساتھ جناب علی عباس حسینی صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ صورت حال

نت منسٹری سے تعلق نہیں ہے اور بعض وجوہ سے اس بارے میں کسی کی بھی سفارش نہیں کر سکتا لیکن انشاءاللہ جلد معلوم کر کے آپ کو
ا گا کہ ان کا انٹرویو کیسا رہا۔ خدا کرے کامیابی ہو۔ سب عزیزوں کی طرف سے سلام نیاز۔
اکو پتا خبر نامک میں ڈال رہا ہوں۔ پتہ یہ چلا کہ کمیٹی نے
ن کا انتخاب نہیں کیا۔ اس کا افسوس ہے۔

مخلص
خواجہ غلام السیدین

سید سجاد ظہیر

۔ حوض خاص

١٩- (

ء٦٦

عزیزی احتشام۔ ایک علیحدہ لفافے میں تمہارے پاس ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے پانچ ممبر شپ فارم۔ پانچ کانسٹی ٹیوشن،
مو کی کاپیاں بھیج رہا ہوں۔ براہ مہربانی اپنا ممبر شپ کا فارم بھر کر بھیج دو۔ اس کے علاوہ الہ آباد سے اگر اور دوسرے ممبر بنا کر
بھیج دو تو اچھا ہو۔ امرت، پی سی گپتا اور اعجاز صاحب کو براہ راست لکھ رہا ہوں اور فارم بھیج رہا ہوں۔ فراق صاحب کے
چلے جاؤ اور ممبر بنا لو تو اچھا ہو۔ میں تھوڑے دنوں بعد انجمن کی تنظیم کے سلسلے میں جنوبی ہندوستان جانے والا ہوں۔
مجھے تمہیں اس کی بھی اطلاع دینی ہے کہ کانفرنس کا آخری دن، انجمن کی ایگزیکیٹو پر تم بھی منتخب کیے گئے ہو۔ براہ مہربانی اس کی منظوری
مجھے بھیج دو۔
ب کی ساہتیہ اکاڈمی نے کسی اردو کی کتاب پر انعام نہیں دیا۔ اس پر مجھے بڑا غصہ اور رنج ہے۔ ورآنحالیکہ تمہاری، کرشن چندر، سردار جعفری
سیدر، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، سکندر علی وجد کی کتابیں موجود تھیں۔ میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین
ذ احتجاجی خط بھیجے ہیں اور مطالبہ کیا ہے کہ اس کی انکوائری ہونا چاہیئے کہ ایسا کیونکر ممکن ہوا۔ اگر تم بھی مناسب سمجھو تو اس سلسلے میں
لکھو۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی اور آخری ذمہ داری سرور کی ہے اور طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ بہرحال ہم کو معلوم نہیں ہوتا
ورت کیسے پیدا ہوئی۔
ید ہے کہ تم اچھے ہوگے۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے تمہارا ذاتی طور پر شکر گزار ہوں۔ پیار

تمہارا
بنے

فراق گورکھپوری

۔ الہ آباد
١٠ اگست

محبی۔ عنایت نامے کا جواب دیر سے دے رہا ہوں۔ بیمار بیمار سا اور کھویا کھویا سا رہتا ہوں۔ میں کرسمس کی چھٹیوں میں پریم چند
پہ مضمون مرتب کروں گا اور فوراً آپ کو بھیج دوں گا۔
مجاز صاحب کا رسالہ کاروان ایک خاص نمبر نکالے گا جس میں گذشتہ چار پانچ برس کی میری غیر مطبوعہ نظمیں اور غزلیں ہوں گی۔

اعجاز صاحب اور میری دونوں کی تمنا ہے کہ میری شاعری اور خصوصاً اس نمبر میں شائع ہونے والے میرے کلام پر آپ ایک مقدمہ مفصل اور نہایت بصیرت افروز مقدمہ لکھیں۔ یہ سوچ کر مجھے بہت اطمینان ہوتا ہے کہ کم سے کم اس مقدمے کے لکھنے پر آپ رسمی تعریف یا گول مول تعریف کرنے پر اپنے کو مجبور نہ پائیں گے۔ اس نمبر میں نظمیں غزلیں سب کچھ ہوں گی۔ کل چار ہزار اشعار ہوں گے۔ آپ کا مقدمہ کارواں کے موجودہ سائز کے اندازاً بیس صفحوں کا ہونا چاہیے۔ نظموں کے تراشے اخیر اکتوبر تک آپ کو مل جائیں گے اور بہت سی غزلوں کے مسودے بھی اور اخیر نومبر تک بلکہ اس سے پہلے آپ کا مقدمہ بھی آ جائے تاکہ اخیر دسمبر تک یہ نمبر کارواں کا مع آپ کے مقدمے کے مکمل جائے۔ بھائی اس کام کے لیے اپنے کو RESERVE رکھیے۔ امید کہ آپ سب اچھی طرح ہوں گے۔ ایک سطر کا جواب ضرور بھیجیے۔

آپ کا
فراق

یگانہ چنگیزی

بسیلا مکان۔
شاہ گنج لکھنؤ
۲۰ مارچ ۱۹۵۲ء

شفیقی و مخلصی زاد لطفکم۔ سلام شوق
یقین ہے آپ بھولے نہ ہوں گے اور کوئی نہ کوئی تدبیر فرمائیں گے میرے قیام کی مناسب ہو تو کچھ اور مخلصوں سے بھی مشورہ کیجیے۔ مختصر یہ کہ مردہ بدست زندہ۔

یاس یگانہ

پروفیسر آل احمد سرور

۱۷ شبلی روڈ
علی گڑھ
۲۴ نومبر

مجتبی احتشام

دہلی میں بات ہی نہ ہوئی۔ بہرحال رواروی میں جو کچھ کہا تھا۔ اس کا خیال رہے۔ تمھیں ایک زمانہ میں میرا ایک شعر پسند تھا معلوم نہیں اب بھی پسند ہے یا نہیں ؎

برسوں جو پھونک پھونک کے رکھتے تھے یہ قدم
اک لغزش جنوں کے برابر نہ ہو سکے

خیال تھا کہ تم جامعہ کے مشاعرہ میں آؤ گے۔ بشعر دوسرے شاعر پڑھیں گے ہم تم باتیں کریں گے۔ مگر بھلا تم کو آشفتہ مزاجوں کی نو سے کیا کام تم اپنے گیسو سنوارتے رہو۔

اکیڈمی کی تقریریں منگا لینا نظموں کے انتخاب میں کچھ اضافہ ضروری ہو تو بتا دو۔ بھارتی کو بتیا کے لیے غالباً تمھیں دے دیا تھا ٹھیک سے ہو۔ میرا حال یہ ہے کہ جتنا گلو خلاصی کی کوشش کرتا ہوں اور پھنستا ہوں۔ اب یہ کوشش چھوڑ دو۔ دیکھتے ہیں میرا کیا حال ہوتا ہے۔ خدا جا

ہو؛ بہرحال کچھ بھی ہو تم سے تو اچھا ہوگا اور شاید حشر بھی۔

اب ملا بیمار ہیں۔ میری طرف سے مزاج پرسی کردیا۔ انھیں اس ڈر سے لکھتا نہیں کہ شاید پڑھنے لکھنے کی ممانعت ہو۔ ان سے
ت نہیں ہوتی۔ مگر محبت کا رشتہ ایسا ہے کہ انھیں یاد کرتا رہتا ہوں۔

مخلص

آل احمد سرور

(۲)

لم یونیورسٹی علی گڑھ

17 —

19 —

مجتبیٰ احتشام صاحب

آپ کے کئی خطوں کا جواب میرے اوپر قرض ہے۔ میں بھی ان پرانے زمینداروں میں سے ہوں جو پرانے قرض نئے قرض کے ذریعہ
تے تھے۔ وضع داری چلتی رہتی تھی۔

کابل میں میں نے جو کچھ دیکھا وہ سفرنامہ میں بیان کردیا لیکن آپ یہ دکن کا پھیرا جو کرآئے ہیں تو آپ بھی کچھ بتائیے کہ کس بت کافر کے
،عدہ قید کی دھمکی جو تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں۔ کبھی کبھار تو واقعی آپ پر رشک آتا ہے۔

مجھے بڑی خوشی تھی کہ فیکلٹی کی میٹنگ میں آپ آرہے ہیں لیکن جب آپ نہ آئے تو سمجھ لیا کہ بچے کی صحت کی طرف سے اطمینان نہ ہوگا۔

آپ اچھے ہوں اور بچے بھی ٹھیک ہوں۔

ادھر پریشانی رہی۔ میرے خسر عرصہ سے بیمار تھے۔ ۸ ستمبر کو ان کا انتقال ہوگیا۔ میں سوم کے بعد واپس آگیا۔ بیوی ابھی وہیں ہیں۔

اعجاز صاحب اب کیسے ہیں۔ میری بد توفیقی دیکھیے کہ انھیں خط بھی نہ لکھ سکا۔ خیر ان کا جو خلوص ہے اس کی بنا پر توقع ہے کہ وہ خیال
، اور معاف کردیں گے۔ یہ فاروقی جس باقاعدگی سے شب خون نکال رہے ہیں اس سے خوشی ہوتی ہے۔ کاش اس کے نام پر اپنے آپ کو
تا ہو جو کا معیار بھی ہر طرح قابل تعریف ہے۔ خیر اعجاز صاحب کی وجہ سے اور آپ کی وجہ سے الہ آباد میں ادبی سرگرمیاں تو چلتی رہتی
ب خون کے لیے کچھ بھیجوں گا۔

میں اب ہر چیز سے بچنا چاہتا ہوں لیکن عمر بھر کی زنجیروں کو ایک آن میں کیسے توڑ دوں۔ آجکل تنہائی میں اکثر اپنی جستجو کرتا ہوں۔
کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک اضمحلال طاری ہے مگر افسوس کہ اضمحلال رنگین بھی نہیں۔ دیکھیے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔ اچھا
ر بھی موجود ہوں۔

مخلص

آل احمد سرور

اختر اورینوی۔ پٹنہ

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

۸/ اے اوپی بنگلو
عثمانیہ یونی ورسٹی
حیدرآباد اے پی
۱۰ر فروری ۷۶ء

محترم احتشام صاحب، تسلیم

ملفوف در ملفوف ابھی ابھی موصول ہوا۔ آپ نے لکھا ہے کہ اسے۔ بے خیالی میں کھول لیا۔ لیکن میں ممنون ہوں کہ آپ نے بڑے خیال سے مجھ تک پہونچادیا۔ جامعہ ملیہ کو یونی ورسٹی کا درجہ دینے کے لیے یہ کمیشن قائم کیا گیا ہے اور اس میں میری شرکت ضروری ہے۔ بروقت اطلاع مل گئی۔

اس سے چند روز قبل بھی ایک عنایت نامہ ملا تھا۔ میں شمالی ہند (علی گڑھ اور لکھنؤ) کا چکر لگا کر یہاں چند روز ہوئے جب پہونچا آپ کے جواب دینے میں تاخیر ہوگئی۔ بہرحال اب ایک بہتر عذر، تحریر نکل آیا اور مجھے موقع ملا کہ آپ کا شکریہ ادا کرسکوں۔

ہمارا رسالہ موسوم بہ "قدیم اردو" (نہ کہ دکنی اردو) نکل آیا ہے۔ آپ کی خدمت میں اسی کے چند آف پرنٹس جو ہم لوگوں نے علاحدہ سے کروالیے تھے، بھیجے تھے۔ ان کے علاوہ تین مخطوطے اس رسالہ میں اور شامل ہیں۔ ساڑھے پانچ سو صفحے کا رسالہ ہے اور اس کی قیمت دس روپے متعین کی گئی ہے۔ صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی کے نام آرڈر آنے پر ارسال کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن قیمت کی ادائگی بذریعہ وی پی ہونی چاہیئے۔ اس لیے کہ یونی ورسٹی ادھار کھاتے کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ علمی اداروں اور اشخاص کو ۱۰٪ (دس فی صدی) کمیشن بھی دیا جارہا ہے۔ اُمید ہے کہ ایک دو رسالوں (یا مزید) کا آرڈر آپ کے یہاں سے بھی ملے گا۔

اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص آپ کا
مسعود حسین

علی سردار جعفری

گفتگو
۲۰، گلستان بھون
۹۰۹ بے ٹاٹا روڈ بمبئی ۱۲
۱۵ر اپریل ۶۸ء

برادرم احتشام صاحب تسلیم۔ شدید انتظار کے بعد آپ کا خط ملا۔ "گفتگو" کے متعلق آپ کی رائے سے پورا اتفاق ہے۔ کتابت اور طباعت کی خامیاں آئندہ اشاعتوں میں نہ ہوں گی۔ یہاں دراصل کتابت اور طباعت کی بڑی دشواریاں ہیں۔ پھر الیکشن کا زمانہ تھا۔ ہر پریس پوسٹر چھاپنے اور روپیہ بنانے میں لگا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرچہ پڑا رہا اور ڈکلریشن کی میعاد ختم ہونے پر آگئی۔ اتنا وقت لیا کہ جو صفحات غلط لکھے گئے تھے جن کا قلم بدلا ہوا تھا انھیں دوبارہ لکھوایا جاتا تاریخ ختم ہونے سے دو روز پہلے پرچہ چھپ کر تیار ہوا۔ ایک روز میں جلد بندھوائی گئی اور پوسٹ کردیا

گی ویسے خامیوں کے لیے یہ عذر ناکافی ہے۔

ایک اور دشواری روپئے کی فراہمی ہے احباب ہاتھ بٹا رہے ہیں لیکن پھر بھی مجھے ہر جگہ جانا پڑتا ہے۔ اشتہارات تو صرف اپنی صورت دکھا کر اور شعر سنا کر حاصل کئے ہیں۔ دوسری اشاعت کی بھی یہی صورت ہے۔

گفتگو کے ترقی پسند کردار کی طرف سے آپ مطمئن رہیئے محنت میرے لیے بالکل واضح ہے۔ دوسرے تیسرے پرچے تک آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ میں نے بہت سی چیزیں جان بوجھ کر شائع کی ہیں۔ نئے شاعروں میں جدت کتنی ہے اس کا مجھے اندازہ ہے۔ جدیدیت کے پس پشت کون سی قوتیں کام کر رہی ہیں اور کس قسم کے مفادات ہیں اس سے بھی میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ ہونا تھا۔ دنیا کے ہر ملک کے ادب میں ہوا ہے اور یہاں بھی ہو رہا ہے۔ ترقی پسندی اور رجعت پرستی کی لڑائی ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ تیز ہو گئی ہے۔ اس میں ہمارے دوستوں کی تساہلی کو بڑا دخل ہے۔ بہت سے نوعمر شاعر بالکل بہکے ہیں۔ فن اور شعور دونوں اعتبار سے۔ لیکن انھیں راستہ نہیں مل رہا ہے۔ ایک یلغار ہے اس میں وہ بھی بہہ رہے ہیں لیکن اچھا اور بہتر ادب اب بھی ہمارے ہی پاس ہے اور آخر میں یہی طاقت کام آئے گی۔

میں نے آپ کو دلی سے ایک خط لکھا تھا علی گڑھ کے سیمینار کی رپورٹ اور بعض مضامین کے ساتھ میں الہ آباد کے سیمینار کی رپورٹ بھی شائع کرنا چاہتا ہوں اور خاص طور سے آپ کا مضمون جو آپ نے اس سیمینار میں پڑھا تھا۔ یہ دونوں چیزیں ضرور بھیج دیجئے اور تنقیدی مضمون بھی (مشرقی و مغربی تنقید کی چند بنیادی مماثلتیں) بھیجئے وقت بہت کم ہے اس لیے ذرا عجلت ہے۔ مئی میں دوسرا شمارہ شائع ہوگا۔ طباعت ہو رہی ہے۔

آپ کے کام کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ وہاں تاخیر بہت ہوئی ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ جلد ہو جائے۔

میرا ابن رشد کی ایک جلد تین روز بعد بذریعہ رجسٹری بھیجوں گا کتاب دفتر میں ہے اور دفتر محرم کی وجہ سے بند ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا

سردار جعفری

مجروح سلطان پوری

احتشام صاحب کرم۔ لکھنؤ سے واپس ہو کر ۱۰ر فروری کو بھوپال چلا گیا وہاں سے تین چار دن قبل آیا تو آپ کا نوٹ ملا۔ اب تو وقت اتنا گذر چکا ہے کہ مشاعرے کے موضوع گفتگو بے معنی ہے۔

فراق صاحب کی خدمت میں میرا سلام پہونچا دیجئے گا۔ (بشرط ملاقات) خدا کرے مع متعلقین بخیریت ہوں۔

آپ کے شعر سنے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ نئے بھائی کی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ میں جو مغربی ادب سے یکسر ناواقف ہوں۔ اپنی کم علمی کی بنا پر سوالیہ نشان بنا ہوا ہوں۔ شاید آپ لوگ کچھ کہہ سکیں۔ لیکن احتشام صاحب ایک بات تو صاف ہے کہ شاعری خواہ کسی دیس کی ہو یا کسی دیس کے مسائل پر ہو اگر معقول ہے تو کم از کم شعرا و ادبا کو تو ضرور بھلی لگے گی۔ مجھے تو یہاں تک الجھن ہوتی ہے کہ بھلی لگتا تو در کنار اسے نظم کہوں یا نثر ابھی تک یہی فیصلہ نہیں کر پایا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو ضرور ہے۔ زمانہ آئندہ خود ہی کوئی مناسب سا نام دے دیگا۔

خدا کرے آئندہ بھی اس کا نام شاعری ہی ہو۔ ہنے کے احترام میں مجھے یہی کہنا چاہئیے۔ والسلام

آپ کا
۱۰ چنائے کاٹو فی - جوہو - بمبئی ۵۴

مجروح
۲۲-۳-۶۶

احمد ندیم قاسمی

۱۴۰- انار کلی- لاہور

۱۵ر جنوری ۶۶ء

برادر گرامی قدر- تسلیمات

میں دسمبر کی چھٹیوں میں بچوں کو گاؤں چھوڑنے گیا تو وہیں بیمار ہو گیا۔ اسی دوران میں آپ کا کرم نامہ اور مقالہ ملا۔ میں شرمندہ ہوں کہ اتنے دنوں سے ان کی رسید تک نہیں بھجوا سکا۔ پرسوں سے کچھ افاقہ محسوس کر رہا ہوں اور آج یہ عریضہ لکھنے بیٹھا ہوں۔

آپ نے مدتوں کے بعد "فنون" میں پہلی بار شرکت فرمائی ہے اس لیے آپ کی عنایت فرمائی سے معمول سے کہیں زیادہ خوش ہوں۔ میں سمجھتا ہوں آپ کا یہ مضمون حصۂ مقالات کا حاصل ہے۔ یہ پرچہ انشاء اللہ فروری کے اوائل میں آ جائے گا۔ اگر دوسرا موعودہ مضمون مارچ تک بھی مکمل ہو جائے تو میں اسے اپریل کے شمارے میں شامل کرنے کا فخر حاصل کر سکوں گا۔ آپ نے اسے فنون کے لیے وقف کر دیا ہے اس لیے مجھے اطمینان ہے۔

"فنون" کے سلسلے میں آپ جس فراخ دلی سے میری حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں یہ آپ کی نیک دلی کی دلیل ہے اور ساتھ ہی آپ کی شفقت اور محبت کی بھی، ورنہ میں ہی جانتا ہوں کہ میں "فنون" کو کیا بنانا چاہتا ہوں مگر وسائل ساتھ نہیں دیتے۔

آپ نے مجھ پر ہمیشہ کرم فرمایا ہے۔ اس پر مجھے فخر ہے اور یقین کیجیے کہ میں آپ کے نادیدہ فدائیوں میں سے ہوں۔

کل ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب سے برادرم وقار عظیم صاحب کے یہاں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا ذکر خیر بھی رہا۔

آپ کا مخلص

ندیم

مالک رام

سی ۳۹۶/ ڈیفنس کالونی

نئی دہلی-۳

۴ر نومبر ۱۹۶۹ء

حضرت، یہ آپ کو معلوم ہے کہ میں پچھلے تین برس سے ایک ماہی علمی و تحقیقی رسالہ "تحریر" کے نام سے شائع کر رہا ہوں لیکن آپ نے آج تک دریافت نہیں کیا کہ کہو میاں! کیا میں اس میں کچھ مدد کر سکتا ہوں؟ اگر آپ پوچھتے تو میں بھلا کیوں نہ بتاتا۔ رسالے کے مرتب کرنے کے لیے مضمون درکار ہوتے ہیں اور اسے شائع کرنے کے لیے (کتابت، کاغذ، طباعت) روپیہ۔ اس کے بعد مرحلہ آتا ہے اسے بیچنے کا؟ اور صاحب علم و ذوق خریدار پیدا کرنے کا۔

لیکن نہ آپ نے دریافت کیا، نہ میں نے آپ سے کچھ کہا لیکن اب پانی سر سے گزر رہا ہے۔ ڈھائی ہزار روپیہ سال کا خرچ اور تقریباً اتنا ہی خسارہ ہے۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ اسے بند کر دوں لیکن ایک دوسری صورت یہ بھی ذہن میں آتی ہے کہ کیا آپ کچھ مدد کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تو میں آپ کو بتاؤں گا کہ ہاں (۱) آپ علمی اور تحقیقی مضامین سے اس کی ترتیب میں (۲) کہیں سے کچھ مالی امداد دلوا کر اس کی اشاعت میں اور (۳) خریدار مہیا کر کے اس کی نکاسی میں مدد دے سکتے ہیں۔

لیکن آپ پوچھیں بھی تو! اور اگر پوچھیں نہیں، تو میں بتلاؤں کیونکر!

خاکسار

مالک رام

چیلی شیف

(روس)
مئی ۱۹۶۱ء

عزیز دوست، آداب عرض
میں آپ کو خوشی کے ساتھ خبر دیتا ہوں کہ آپ کی کتاب उर्दू साहित्य का इतिहास روسی زبان میں چھاپ گئی ہے۔ جس کا
یں نے لکھا ہے۔ ہماری عام رائے ہے کہ یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ہے کیونکہ سوویت لوگوں کو اردو ادب سے واقفیت دینے والی
اب ہے۔ اور اردو زبان و ادب سے متعلق سب دیگر ماہرین تہہ دل سے آپ کے سائنسی کاموں میں بڑی کامیابیوں کی خواہشات
رتے ہیں۔

عزیز دوست! میرا ایک عرض ہے۔ ہمارا ایک علمی کارکن کرشن چندر کے تخلیقی علم پر تھیسس لکھ رہا ہے۔ ہمارے کتب خانوں میں
چندر کی بہت کتابیں ہیں مگر ہندوستانی تنقید کرنے والوں یا سائنسدانوں کے کرشن چندر کی تصنیفات پہ لکھے ہوئے تنقیدی مقالے، مضامین
یں نہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ اگر آپ کے لیے یہ زیادہ تکلیف دہ نہیں ہو مہربانی لکھ دیجئے گا کہ بھارت کے کون سے تنقید کرنے والے یا مصنف نے کرشن
کے بارے میں کچھ لکھا ہے یا لکھ رہا ہے، ان کے مضامین اور کتابوں کا نام لکھ دیجئے گا۔ میں آپ کو بہت شکرگزار ہوں گا اگر آپ ان میں
ن اہم ترین کتابیں ہمیں ایک عرصے کے لیے بھیج دیں۔

میری زندگی اور کام پہلے کی طرح چلتے ہیں۔ اب مجھے ٹیگور کے جنم دن کے سوویں سالگرہ کے سلسلے میں بہت کام کرنا پڑتا ہے کیونکہ
نی کمیشن کا جنرل سکریٹری ہوں۔

میرا ایک اور عرض ہے۔ یہ کرشن چندر کی کتابوں کا فہرست ہے۔ اگر آپ زیادہ تکلیف دہ نہیں سمجھیں گے تو مہربانی یہ فہرست پڑھ لیجئے گا
دیجئے گا کہ کرشن چندر کی کون سی کتابوں کو آپ اہم ترین اور ان کے لئے REPRESENTATIVE سمجھتے ہیں آپ کی رائے ہمارے
ت اہم ہے

بڑی عزت کے ساتھ
اے چیلیشیف

وقار عظیم

ری

ڈیر احتشام۔ سلام شوق
زندگی نے مجھے اور تمہیں اس طرح اپنی زلفوں کا اسیر بنایا ہے کہ دوستوں کی دوستی اور عزیزوں کی محبت کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں
ا۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ اس طرح کشمکشوں میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے اور اس حال میں دوستوں کی خیریت بھی معلوم ہوتی رہے تو محسوس

ہوتا ہے کہ اب کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ میرے اور تمہارے معاملہ میں عیادت کا وجوہ ایک فرشتۂ رحمت کا ہے کہ وہ طرفین کی خبریں ادھر سے اُدھر پہنچا کر اطمینان کا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔

اب سنو کام کی بات یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ناول کی ایک تاریخ لکھنے کا ارادہ ہے۔ اور اسی بہانے علی گڑھ، لکھنؤ اور الٰہ آباد کی سیر کرنے کی ٹھانی ہے۔ لیکن یہ کام گرمی کی چھٹیوں میں ہوگا۔ اس سے پہلے کچھ اور مرحلے طے کرنے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ کہاں کہاں میرے کام کی کون کون سی کتابیں موجود ہیں۔ کام ذرا الجھن اور محنت کا ہے لیکن اگر کسی طرح یہ انتظام کر دو کہ تمہاری یونیورسٹی میں اردو کے جتنے ناول ہیں ان کی فہرست کسی طرح بن جائے۔ الٰہ آباد اور علی گڑھ سے بھی اسی طرح کی فہرستیں منگا رہا ہوں۔

اور کیا لکھوں ـــــ سوائے اس کے کہ خیریت سے ہوں۔ دمہ البتہ دم کے ساتھ لگ گیا ہے لیکن اسے میں نے اپنا مستقل رفیق جان کر اس کے سلسلے میں فکر مند رہنا چھوڑ دیا ہے۔

پرسانِ حال سے میرا سلام کہو۔

تمہارا

وقار

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی دہلی ۱۲

محبِ مکرم

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا تھا۔ آپ نے جس محبت سے خط لکھا ہے اس کے جواب میں "شکریہ" میرے احساس سے فروتر ہے۔ خط کیا ہے: پارۂ دل اور پارۂ ادب۔ میں نے اسے تصاویرِ بتاں اور خطوطِ حسیناں میں رکھ لیا ہے۔ کتنی دفعہ پڑھا اور ہر دفعہ آپ کے خلوص سے متاثر ہوا۔ آپ نے جو کلمات میرے متعلق لکھے ہیں وہ میری اوقات سے زیادہ ہیں۔ اور ان سے آپ کی کریم النفسی، شرافتِ نفس اور وہ محبت ظاہر ہوتی ہے، جو خاص میرے حال پر ہے۔ آپ کے سامنے مہر و محبت کا دعویٰ بے ادبی اور بناوٹ ہے لیکن میری دلی تمنا ہے کہ مجھے ہر ہر قدم پر آپ کی رہنمائی اور امداد حاصل ہو اور میں آپ کی توقعات کو پورا کر سکوں۔ ہر چند کہ آپ کے خط نے مجھے سرمایۂ نشاط سے تونگر بنا دیا ہے لیکن مجھے سچ مچ کی خوشی، احتشام صاحب اس روز ہوگی جب آپ پروفیسر ہوں گے اور آپ کا شعبہ فارسی سے الگ ہوگا۔ یہ قرض ہے انصاف پر۔ علم و فضل پر۔ لکھنؤ کی معقولیت اور شرافت پر۔

اچھے کام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ساتھی اچھے ہوں اور وہ اردو کے کام کو خدا کا کام سمجھ کر انجام دیں ورنہ حیدرآباد اور بمبئی میں جو اختلافات ہیں ان کو سن کر شرم سے میں ڈوب جاتا ہوں۔ ہمارے یہاں اردو میں ایک ریڈر کی ضرورت ہے کیا آپ ایک یا دو نام تجویز فرما سکتے ہیں۔ جو صاحب ذوق ہوں اور مل جل کر کام کریں۔ براہ کرم جواب جلد۔ بہت جلد۔ بواپسی لکھئے۔ ممنون ہوں گا۔

اردوئے معلیٰ کے غالب نمبر کے بعد پھر غالب نمبر نکالنا زیادتی ہے لیکن یہ قصور کہیں معاف ہو یا نہ ہو آپ کے عفو میں ضرور ہوگا۔ کیا آپ اس کے لیے ایک مضمون مرحمت فرما سکتے ہیں اگر آپ بھیج دیں تو بڑا احسان ہو۔ اور ہمارے ساتھیوں کے حوصلے بلند ہو جائیں۔

کشمیر آپ تشریف نہ لے گئے۔ میری رائے یہ تھی کہ صرف سال بھر کے لیے جاتے اور شعبہ کی تنظیم کر کے چلے آتے۔ اب وہ پروفیسری پھر نیلام پر چڑھی ہے۔ خدا کرے لکھنؤ میں آپ کے لیے مواقع پیدا ہوں اور وہ شعبہ جس کو آپ نے خونِ جگر سے سینچا ہے اس کی جلد بہار دیکھنا نصیب ہو۔ بغیر اس اعلان و اطلاع کے بھی ہمارے دل میں آپ کی پروفیسروں سے زیادہ عزت اور عزیزوں سے زیادہ محبت ہے۔

آج کل صحت کیسی ہے؟ خدا کرے مزاج بخیر ہو اور آپ جواب جلد مرحمت فرما سکیں۔

ارادت مند

خواجہ احمد

پروفیسر یان مارک

لی

وری ۱۹۶۷ء

پروفیسر محترم - آداب عرض ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ لکھنؤ یونیورسٹی فروری ۱۳ تاریخ کو کھلے گی۔ میں پانچ فروری صبح ۹.۴۰ بجے ہوائی جہاز سے آؤں گا (جمعہ کا دن ہے) CORLT(ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ مہربانی کر کے آپ یا دوسرا کوئی علمی دوست ہوٹل یا INDIAN AIRLINES CORP OFFICE) نے آئے گا ہیں۔ ر فروری تک رہوں گا۔ میرے لیے سارا پروگرام بنائیے۔ میں "چیکوسلواکیہ میں اردو زبان و ادبیات کا مطالعہ" پر تقریر کروں گا۔ میرے پاس چیکوسلواکیہ کے مشہور رنگین PUPPET FILMS بھی ہوں گے۔ دکھانا چاہتا ہوں۔ ایک دن تقریر لگائیے دن پروجیکٹر وغیرہ کا انتظام کرنا چاہئے۔ میں لکھنؤ کی سب تاریخی آثار بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاید مجھے بہو نچائے گا؟ دہلی سے ری صبح سویرے چلے جاؤں گا۔ لکھنؤ سے الہ آباد جاؤں گا۔

آپ سے ملنے کا آرزومند

یان مارک

ڈاکٹر محمد حسن

ڈیپارٹمنٹ آف اردو

یونیورسٹی آف دہلی

ڈی ۱/۱۴۱ اے

ماڈل ٹاؤن

دہلی-۹

۱۲ر فروری ۱۹۶۷ء

اُستاد محترم - آداب گزارش

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ شرمندگی ہے کہ میرا کوئی خط آپ کو نہیں ملا۔ کچھ ایسا اتفاق ہے کہ مجھے یہ خیال رہا کہ میرے خط کا جواب آپ کے ہے اور آپ کو یا وہ خط ملا نہیں یا اس کا جواب آپ نے دے دیا ہو مجھے یاد نہ رہا ہو۔ بہرحال خط و کتابت کے معاملے میں کوتاہ قلم کبھی اور ہوتا بھی تو آپ کو خط لکھنا تو زندگی ان گنی چنی مسرتوں میں سے ہے جو اپنی دسترس میں ہیں۔ لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور میں ہوں یا نہ ہوں آپ کو خط لکھکر کچھ اس قسم کی مسرت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

ان دنوں انواع و اقسام کی مصروفیات میں الجھا رہا لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ جن کاموں کو مدتوں سے اٹھا رکھا تھا انھیں شروع

ترکیب گند حقوق شدہ صدی کا ابتدائیے مجید بگہے کرچا ہوں اور داغ حسرت دل کا شمار کر کے ان کے عاماکی فکر کرنے والا ہیں۔ اس سے ایک گونا خوشی بھی ہے۔

ماڈریشن والے معاملے کی تفصیلات کا مجھے علم نہ ہوا میں پی ایچ ڈی کا ایک VIVA لینے گورکھپور گیا تھا وہاں سے واپس آیا تو رجسٹرار کے دفتر سے یہ اطلاع ملی کہ چونکہ آپ نے ماڈریشن میں آنے سے معذوری کا اظہار فرمایا ہے اس لیے محمود الٰہی صاحب کو بلا لیا گیا ہے۔ دوسرے دن وہ ہاں کالج میں محمد میاں ملے ان سے معلوم ہوا کہ آپ مدراس گئے ہوئے ہیں یہ کچھ بھی دیا۔ بہر حال محمود الٰہی آگئے تھے اور وہ کام مکمل ہو گیا۔ فاروقی صاحب امریکہ روس کے لیے روانہ ہو گئے اور اب وہاں سے بین الاقوامی اور مختلف کانگرس میں شرکت کے لیے امریکا جائیں گے اور اس وقت تک کے پروگرام کے مطابق ستمبر کے وسط میں واپس آئیں گے۔

میرے لیے سرد جامے جی کی کتابیں پڑھ رہی ہیں نا گفتنی قسم کی بعض CHILD DEVELOPMENT اور تعلیمی نفسیات کے متعلق اوبی نقیب پر WIMSATT AND BROKS کی کتاب پڑھ ڈالی ہے لکھنے میں البتہ کچھ زیادہ سرگرمی ہے کہ ادھر ایک کالج کے جشن فراق منایا اس کے لیے ایک مضمون فراق پر لکھا وہ چھپ گیا ہے ایک کتاب کے رسالے کے لیے عنوان ہے "یہ اداسی کیوں ہے" ایک انگریزی میں STATEMAN کے لیے کوئی تین چھپے مہینے کی ۲۲ کو شائع ہوا اور وہ کسی قدر تفصیلی مضمون ہے یہاں خاصہ پسند کیا گیا۔ اس پر کئی خطوط بھی شائع ہوئے۔ ویسال نجلہ یادگار آر دو شائع کر دیا ہے اس کی دو ایک کاپیاں آپ کی خدمت میں بھیجوں گا اور آیا جو کہ بعض ایڈیٹریوں میں اس کی کمزوری کی سیل کھلوا دیں تو یقین عنایت ہوگی ایک مضمون BEAT GENERATION پر بالکل معروضی نقطہ نظر سے بلکہ یاقیہ انداز سے لکھ رہا ہوں۔

یہ تو باتیں ہوئیں ادھر ادھر کی مگر آپ سے کچھ ذاتی اور کچھ کانشا تی باتیں کرنے کو بے اختیار جی چاہ رہا ہے دیکھیں یہ ترکیب ٹھیک ہے یا نہیں!

پہلے کائناتی قسم کی بات سے پہلے یہ بات عرض کر دوں کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اور جس سلسلے پر آپ سے خیالات جاننا چاہتا ہوں وہ شے نا قابل اشاعت ہے اور شہر لئے تذکرۂ عام بالکل ذاتی اور نجی طور پر آپ کے خیالات جاننا چاہتا ہوں اس لیے اور بھی کہ اس کو جو شکست وہ وفائی آپ ہی نے کی ہے اس لیے آپ کے بالکل INTIMITE اور بے محابا خیالات جاننا چاہتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ آج کے حالات کی روشنی میں آپ مارکس ازم کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ مارکس ازم کا دعویٰ ہے کہ وہ سائنس ہے اور اگر حقیقت کی کسوٹی پر وہ پورا نہ اترے تو یا وہ سائنس نہیں ہے یا صحیح نہیں ہے اب جو دو تین باتیں اس ضمن کی ہیں وہ یہ ہیں کہ

(۱) ATOM کے توڑنے میں جو کامیابی ہوئی ہے اور مادے کے چھوٹے سے چھوٹے جزو کا تجزیہ کو توانائی میں تبدیل کر لینے کی جو صورت پیدا ہوئی ہے اس کے مطابق کیا اب مارکس ازم کے نظریے مادی جدلیت کے لفظ مادی پر نظر ثانی ضروری نہیں؟ یا مادے کی تعریف بدل جائے؟ یہ کہا جائے کہ ہیگل ہی کا نظریہ درست تھا اور اگر جدلیت ہے تو تصوراتی ہے؟

(۲) روس اور چین کے علاوہ کسی جگہ بھی انقلاب نے وہ کلاسیکل مارکسی طریقہ اختیار نہیں کیا جو جماعتی ٹکراؤ اور اقتصادی بحران کی وجہ سے ناگزیر طور پر پیدا ہوتا۔

(۳) آج کل روس اور چین کی جو کشمکش ہے اس کا جواز مارکس ازم کے حدود میں کیسے مل سکتا ہے؟ میری مراد یہ ہے کہ ملتا ہے یا نہیں اور ملتا ہے تو کیونکر؟

آخری سوال یہ ہے کہ آپ موجودہ ہندوستان میں موجود کمیونسٹ پارٹیوں کی اور لیڈروں کی منافقت کوشی اور موقع پرستی سے بد دل ہیں

ہ ایک اس کا کوئی جواز ہے؟ کیا آپ کی توقعات مجروح نہیں ہوئی ہیں؟ اور اس قسم کی NATIONAL DIAMINISM
میں آپ کا کیا خیال ہے؟

دوسری بات ذاتی ہے۔
چند دن میں دیوان آبرو آپ کو ملے گا اس کی پشت پر میری کتابوں کی فہرست ہے ان میں شاید سبھی آپ کے ملاحظہ سے گزری ہوں گی
نی میں آپ کی رائے چاہتا ہوں کہ مجھے کس سمت میں اور کس صنف پر concentrate کرنا چاہئیے۔ ایک آدھ کام کر کے
sense of fulfilm حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے بعد اگر لکھنا پڑھنا چھوڑ بھی دوں تو قلق نہ ہو میرے جی کی دو باتیں
یہ کہ ideal of ... tory کے سلسلے میں جو کام شروع کیا ہے اس پر کام کروں دوسرے ڈرامے پر یکسوئی سے توجہ کروں۔
میں کوئی معقول کام لکھ نہیں سکا ہوں لیکن شاید لکھ سکتا ہوں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی درکار ہے کیونکہ دونوں راہوں میں قدم آپ کی
ہی کی بدولت ہی رکھا تھا۔ اب اس سفر کا اختتام بھی آپ ہی کی رہبری میں ہو تو اچھا ہے۔
روشن اچھی ہیں اور آپ کو سلام لکھواتی ہیں۔ بچوں کی طرف سے آداب۔
آپ دہلی کب تشریف لا رہے ہیں ہمارے یہاں فروری کے اواخر یا مارچ کے شروع میں نظام لیکچرز میں اس بار ڈاکٹر تاراچند خطبات
، موضوع ہے ہندوستانی کلچر کا ارتقاء۔ آپ دہلی تشریف لائیں تو اس بار میرے ہاں قیام فرمائیں۔

آپ کا

محمد حسن

ڈاکٹر وزیر آغا

، لائنز، سرگودھا
ج

محترمی احتشام صاحب

سلام مسنون

پ کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ جب کبھی آپ کا خط آتا ہے تو دل کھل اٹھتا ہے۔ کاش آپ سے ملاقات کی بھی صورت پیدا ہو سکتی
ہی چاہتا ہے کہ بہت سے ادبی مسائل کے بارے میں آپ کے خیالات سنوں۔
پ نے "چوری سے یاری تک" کے بارے میں جن قیمتی خیالات کا اظہار کیا، میں دل سے ان کی قدر کرتا ہوں اور آپ سے متفق ہونے کے
ر خوش بھی ہوں کہ انشائیہ کے سلسلے میں آپ کو میری تخلیقات میں جمود یا تکرار کا احساس نہیں ہوا۔
ادبی دنیا کے زمانے میں بھی میری یہ آرزو تھی کہ آپ کے مضامین چھاپنے کا شرف حاصل کروں اور اب اوراق کے دور میں بھی یہ
ت شدید ہے اگر کوئی مضمون تیار ہو تو آج ہی بھجوا دیں ممنون ہوں گا۔ "اوراق" انشائیہ کی تحریک کو بھی آگے بڑھا رہا ہے۔ اس لئے
ہ کے بارے میں آپ مجھے ایک مختصر سا مضمون لکھ دیں تو اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور ہمارے لیے اس تحریک کو آگے
ن ہو جائے گا۔

اس خط کے جواب کا منتظر ہوں۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ حادثے کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا لیکن شکر ہے کہ آپ محفوظ ہیں۔ والسلام

مخلص

وزیر آغا

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یونی ورسٹی اورنٹیل کالج

لاہور

۱۴ر نومبر ۱۹۶۶ء

اُستادِ گرامی۔ آداب

اس سے قبل مختصر سا خط لکھ چکا ہوں۔ ملا ہوگا۔ اس خط میں کامیابی کی اطلاع تھی کل پرسوں ہفتے کو وہ معاملہ یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ کے سامنے پیش ہوا اور متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ ۲۰ر اکتوبر سے مجھے اُردو کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ معاملہ اتنی جلدی طے ہو جائیگا۔ یہ بھی یقین نہیں تھا کہ میرے حق میں طے ہوگا۔ حالات بہت خراب تھے۔ میں سہما ہوا تھا اور مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ الکشن کی سی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اس فضا کی وجہ سے میں کچھ گھبرا سا گیا تھا کیونکہ میں اس فضا کا آدمی نہیں ہوں۔

۲۰ر اکتوبر کو اس معاملے کا طے ہونا معجزے سے کسی طرح کم نہیں میرے تو خیال و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہ معاملہ اس طرح طے ہوگا۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ شادانی صاحب کو کاغذات پہنچے ہی نہیں یا انھوں نے واپس کر دیے ہیں لیکن ۲۰ر اکتوبر کو شام کے وقت ان کا تار آیا جس میں میرے نام کی سفارش تھی۔ وائس چانسلر صاحب نے فوراً اس کو سلکشن بورڈ کے سامنے رکھ دیا اور چونکہ دو رائیں میرے حق میں تھیں۔ اس لیے بورڈ نے میرے نام کی سفارش کر دی۔ وائس چانسلر صاحب نے آٹھ بجے کے قریب فون پر مجھے یہ سب کچھ بتایا اور مبارک باد دی۔ میں حیران رہ گیا۔

تار کے پیچھے ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ دوسرے حضرات نے اس روز کئی بار ڈھاکہ ٹرنک کال کی اور مجبور کیا کہ تار سے رائے پہنچ جائے۔ ادھر دفتر میں سب کچھ طے کر لیا گیا تھا ــــ صاحب کے بھائی ڈھاکہ میں ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے تمام اثرات استعمال کیے۔ غرض جب بہت زور پڑا اور لاہور سے اُن کے داماد نے بھی فون کیا تو وہ تار دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے تار دے دیا لیکن اس کا مضمون مختلف تھا۔ یہ دیکھ کر اوس سی پڑ گئی۔ اور سارا کھیل بگڑ گیا۔ سب منصوبے خاک میں مل گئے۔ یہ سب کچھ بڑے ہی ڈرامائی انداز میں ہوا۔ بڑے سید صاحب نے دوسرے دن ایک محفل میں فرمایا کہ سہ پہر تک تو ہم لوگ پر اُمید تھے لیکن پھر خدا جانے کیا ہوا کہ حالات بگڑ گئے اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کتنا بڑا محاذ تھا۔ خدا جانے مجھے کیسے کامیابی ہوئی یہاں ہر شخص حیران ہے۔

مجھے اپنی کامیابی کی مطلق خوشی نہیں۔ اس قسم کے ماحول سے نبرد آزما ہونے کے بعد اگر کسی کو یہ علمی اور تعلیمی اعزاز نصیب ہو تو ظاہر ہے اس سے خوشی نہیں ہو سکتی۔ میں ایک دوسرے مزاج کا آدمی ہوں۔ دوسرے کی شکست کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جہان کا غم اپنے ساتھ لیے پھرتا ہوں دشمنوں کی تکلیف بھی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔

آپ کی شفقت اور محبت نے مجھے اس منزل پر پہنچایا ہے۔ اب آپ ہی کی رہنمائی کے سہارے اس راستے پر آگے بڑھوں گا۔ مجھے آپ کے مشوروں کی اب کچھ زیادہ ہی ضرورت ہوگی۔

شعبے کی طرف سے رسالہ تو شاید اس سال نہ نکل سکے کیونکہ ارباب اختیار کو اندیشہ یہ ہے کہ اگر یہ رسالہ نکلا تو یونی ورسٹی کا ریسرچ
جائے گا۔ اس کا حال اس وقت بھی اچھا نہیں ہے لیکن اب میں نے سوچا ہے کہ ہم لوگ شعبے کی طرف سے اردو زبان اور ادب
پر ہر سال ایک کتاب شائع کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس سال اردو زبان کے بارے میں کچھ مضامین جمع کر کے شائع کروں گا۔
تنقید کے مضمون۔ اس طرح سے کچھ شاعروں اور نثر نگاروں کے بارے میں۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا کتابیں خوبصورت ٹائپ میں
گی۔

آپ اردو زبان کے بارے میں مجھے ایک مفصل مضمون لکھ کر بھیج دیجئے۔ اگر آپ نیا مضمون نہ لکھ سکیں تو اردو لسانیات کا خاکہ، کا
نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد مجھے بھیج دیجئے۔ یہ بھی تحریر فرمائیے کہ ہندوستان میں کون کون سے لوگ اس موضوع پر لکھنے کے
جائیں گے۔ میں سب کو مجبور کروں گا۔ آپ کو بھی توجہ دلانا پڑے گی۔
یونی ورسٹی کی طرف سے دو کتابیں سید حیدر بخش حیدری کی گلزار دانش اور مظہر علی خاں ولا کا دیوان آئندہ سال شائع ہوں گی
نے مجھے ڈنمارک میں ملے ہیں۔
امید ہے آپ مع بچوں کے خیریت سے ہوں گے! فہمیدہ آپ کو آداب کہتی ہیں۔

خاکسار

عبادت بریلوی

اسما یلوائیل

محترم پروفیسر احتشام حسین!

میں ہوں ازبکی لڑکی، ایشیا قوموں کے انسٹی ٹیوٹ کی پوسٹ گریجویٹ۔ اس سال میں نے تاشقند کے یونیورسٹی کے مشرقی
کیا اور آجکل معزز جے لشیف کے راہنمائی میں ہندوستانی ادب کا مطالعہ کرتی ہوں۔ میرے مقالے کا موضوع ہے خواجہ احمد
تخلیقی عمل۔ بڑا افسوس ہے کہ اس محترم ادیب کے اردو اور ہندی میں کتابیں ہمارے یہاں کم ہیں۔ روسی میں احمد عباس
لاب" ناول اور " TOMORROW IS OUR " میں اور بہت کہانیاں بھی ہیں۔ پر اردو میں صرف یہ کتابیں ہیں:

١۔ "زعفران کے پھول اور دوسری کہانیاں"
کتاب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی ۱۹۴۱ء

٢۔ "چار دل چار راہیں" ایک ناول ایک فلم
الہ آباد کتابستان ۱۹۵۹ء

٣۔ "دیا جلے ساری رات"
دہلی مکتبہ جامعہ ۱۹۵۹ء۔

٤۔ "ایک لڑکی"
مکتبہ اردو لاہور ۱۹۴۹ء

کچھ کتابیں ہندی میں بھی ہیں :

۱- "میری دنیا" بلابہ پرکشن الٰہ آباد ۱۹[illegible]ء
۲-"اودھ کی شام" دو بتیا سنسارن الٰہ آباد نلابہ پرکشن ۱۹[illegible]ء
۳- "آدھا انسان" الٰہ آباد ۱۹۵۳ء
۴-"لال اور پیلا" الٰہ آباد ۱۹۵۶ء
۵-"میرا بیٹا میرا دشمن" الٰہ آباد ۱۹۵۳ء

اور یہ سب۔ نہ کوئی ہندوستانی تنقیدی مضمون ز اور کچھ شری احمد عباس کے بارے میں یا ان کی کتابوں کے بارے میں ہمارے یہاں نہیں ہے۔ کن کن نئے فلموں کے سکرپٹ (SCRIPT) انھوں نے لکھا ؟ کیا کچھ شری احمد عباس نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے ؟
اگر آپ کے لیے یہ مشکل نہ ہوگا تو مہربانی کر کے نیچے لکھے ہوئے میرے سوالوں پر جواب لکھئے :

۱- شری خواجہ احمد عباس کے اردو اور ہندی اور کسی کتابیں ہیں (جو ہمارے یہاں نہیں ہیں) ؟ اور وہ کتابیں کس کے بارے میں یا کس چیز کے بارے میں ہیں ؟
۲- ان کے بارے میں اور ان کی کتابوں کے بارے میں تنقیدی مضمون کیسے اور کس کے ہیں ؟
۳- شری احمد عباس کے نئے فلموں کا ایک لائن۔
۴- کیا کچھ شری احمد عباس نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے ؟

اگر آپ میرے ان سوالوں پر جواب دے سکیں گے اور کچھ بھیج دے سکیں گے میرے لیے تو میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں گی۔
جو کتاب آپ کو چاہیئے (جس کے بارے میں آپ نے شری اچ لشیف کو لکھا تھا) میں اس کی تلاش کر رہی ہوں۔
بڑی عزت سے۔

اسما یوا نیل

ابھی ہے مسندِ تنقید خالی

۱۳۹۲ھ

(خیالؔ ماہلی)

فیضانِ احتشام

درِ دل کشا بہ چمن درآ

تو چپ ہوا، پیغام رہے گا تیرا

تو باقی نہیں کام رہے گا تیرا

وہ نقش بنائے ہیں قلم نے تیرے

تو زندہ نہیں نام رہے گا تیرا

اعجاز خورشید کاشمیری

سید احتشام حسین مرحوم

فتح مکہ

حضرت ابراہیم و اسماعیل سے پہلے مکہ کی تاریخ جو بھی
س کے اصل عروج کا سلسلہ انھیں بزرگوں کے عہد
ع ہوتا ہے۔ خدا کے گھر کی تعمیر نے اسے جو شرف
، تہذیب انسانی میں ایک زبردست موڑ کا پتہ
۔ کیونکہ اس کی بنیاد ایسے ہاتھوں سے پڑی۔
نے نہ صرف بت شکنی کی تھی۔ بلکہ ستارہ پرستی
کو ٹھکرا کر وحدانیت کا راستہ دکھایا تھا۔ حضرت
نے ستارہ پرستی کے دور عروج میں شمس و قمر کی ربوبیت
کر کے قدیم افکار انسانی پر کاری ضرب لگائی اور
ق کے بہت سے علاقوں کی سیر کرنے کے بعد مکہ کی،
کو دین حنیف کا مرکز بنانے کی آرزو کی، تاریخ کی
ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس مقدس
کو اصنام پرستی کے خلاف۔ ایک علامت بنا کر پیش
تھا۔ چند ہی صدیوں کے اندر وہ جاہلیت کے اندھیرے
میں ہو گئی اور بتوں کی ایسی آماجگاہ بن گئی جس نے وحدانیت
ذر کو خطرے میں ڈال دیا۔ اس دوران میں اگر اخلاقی
حانی حیثیت سے مکہ کا زوال ہوا تو مادی نقطۂ نظر
سے مخصوص عروج حاصل ہوا۔ عرب کا مرکزی مقام
نے کی وجہ سے اس کی تمدنی زندگی میں چہل پہل
رہی، مخصوص تہواروں کے مواقع پر سارے عربی
اکٹھا ہوتے، تجارت کی گرم بازاری ہوتی رہتی۔

معاہدوں اور مناقشوں کی تجدید ہوتی، ادبی اور شاعرانہ سرگرمیاں بڑھتیں اور شام و فلسطین، عراق و یمن سے تجارتی اور تمدنی رابطے استوار کئے جاتے، اس طرح مکہ کو ام القریٰ کی حیثیت ملتی جا رہی تھی۔ یقیناً ایسے ہی مراکز تاریخ میں کوئی فیصلہ کن کردار بنتے اور اہم مقام حاصل کرتے ہیں۔

ابراہیمی خانوادے کی سرگرمیاں اس علاقہ میں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ بنی قریش کی ایک شاخ نے اپنی ذاتی خصوصیات، تجارتی سوجھ بوجھ، مہمان نوازی، شجاعت اور سخاوت کی وجہ سے مکہ کی سرداری حاصل کر لی۔ اور مکہ تاجروں اور سیاحوں کے لیے ایک محفوظ اور نفع بخش مرکز بن گیا اس کی عظمت اور اہمیت کا دوسرا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب قیادت ہاشم کے ہاتھ میں آئی۔ خانۂ کعبہ پھر دار الامان بن گیا اور گو بت پرستی کا استیصال نہ ہو سکا۔ لیکن دین حنیف کے ماننے والے ابراہیم کی بشارت کا انتظار کرنے لگے۔

چھٹی صدی عیسوی نے ابھی اپنی سات دہائیاں پار کی تھیں کہ مکہ میں، ایک نئی روشنی نمودار ہوئی۔ سوائے عرب کی قسمت جاگی اور مکہ کے سب سے مقتدر گھرانے میں عبد المطلب کے مرحوم بیٹے عبد اللہ کے یہاں رسول اللہ نے آنکھ کھولی، ابراہیم اور اسماعیل کے بعد سے کعبہ اپنے

حقیقی وارث کے انتظار میں تھا لیکن ابھی جد و جہد اور آزمائشوں کی بڑی سنگین گھڑیاں درمیان میں حائل تھیں اور کعبہ کو اپنی اولین منزلت حاصل کرنے میں ابھی تقریباً ساٹھ سال کا سفر طے کرنا تھا۔ مکہ میں پیدا ہونے والے کو گھر سے بے گھر ہونا تھا، خانہ کعبہ میں اپنے مذہبی فرائض انجام دینے کے لئے موحدین کو انتظار کرنا تھا اور اسے ہمیشہ کے لئے مرکز توحید و امن بنانے کے لئے ریاضتوں کے ایک طویل سلسلہ سے گزرنا تھا۔ اسی میں رسول اسلام محمد عربی کی حیات قدسی کا بڑا حصہ صرف ہوا اور اس کے لئے انھیں بہت سے معرکے جھیلنے پڑے۔

یقیناً بدر ہو یا احد، خندق ہو یا خیبر، صلح حدیبیہ ہو یا بیعت رضوان فتح مکہ ہو یا غزوۂ موتہ، سب کا بنیادی مقصد حقیقت اسلام کو عام کرنا تھا۔ رسول کی حیات طیبہ کے کسی چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے اقدام کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ اور ہر واقعہ کو ایک دوسرے سے مربوط سمجھنا چاہئے۔ اس وقت صحیح طور پر اندازہ ہوگا کہ تاریخی اسباب و علل کی کڑیاں نتائج سے کس طرح بندھی ہوتی ہیں۔ اور رسولؐ کا ہر قدم کس طرح ایک ہی منزل کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ فتح مکہ پر بھی انھیں حقائق کی روشنی میں نظر ڈالنا چاہئے۔ یہ سلسلۂ اقدامات اور واقعات کی ایک ایسی مضبوط کڑی ہے جس سے اس کے پہلے کی تاریخ اسلام، بعد کے واقعات سے ہم رشتہ ہو گئی ہے۔

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن فتح مکہ پر غور کرتے ہوئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس سے پہلے اسلام تاریخ ارتقاء کی کس منزل میں تھا کہ اس فتح کا پس منظر واضح ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہجرت کے بعد ہی سے قریش کے مظالم اور اسلام سے مخالفت کی نوعیت بالکل بدل گئی تھی۔ جب تک رسولؐ مکہ میں رہتے اس وقت تک انھیں یہ توقع تھی کہ یہ امید تھی کہ وہ خود کار اسلام کی ابتدائی قوت کا استیصال کر لیں گے۔ جاہلی اور قبائلی جذبات کو بھڑکا کر محمدؐ عربی کے دعوائے پیغمبری کو گمراہ کن دلائل کا نشانہ بنائیں گے۔ لیکن جب اسلام کو مدینہ میں پناہ مل گئی تو قریش کو اندیشہ ہوا کہ اسلام کے لئے زمین ہموار ہو رہی ہے۔ اس کی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ رسولؐ اسلام کی آواز کی گونج بڑھ رہی ہے۔ اور اثر و نفوذ کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے اس لئے مخالفت کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ مہاجرین مکہ نے بے گھر ہو کر ہمت نہیں ہاری اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر محنت اور مشقت، تجارت اور مزدوری کی مدد سے اپنی حالت سنبھال لی۔ انصار نے جس کشادہ دلی سے انھیں اپنے یہاں جگہ دی تھی۔ اس نے پہلے ہی دلاسائی کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اس مادی حالات کے بہتر ہو جانے کی وجہ سے انھیں اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے مواقع بھی نظر آنے لگے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان آمد و رفت کی وجہ سے قریش کو ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ اور مسلمانوں کا وجود ان کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ چنانچہ تصادم کی کھلی ہوئی صورتوں کا امکان زیادہ ہو گیا۔ رسولؐ مقبولؐ اس سے غافل نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مکہ کے قریش قبائل کسی نہ کسی وقت ان کے سکون میں خلل انداز ہوں گے۔ انھیں یہ خبریں بھی برابر ملتی رہتی تھیں کہ وہ لوگ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ نہ صرف ان غریب مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رہے ہیں جو مکہ اور نواح مکہ میں رہ گئے ہیں بلکہ جن کے عزیز و اقارب مدینہ میں ہیں انھیں بھی تکلیفیں پہونچاتے رہتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود رسولؐ مقبول نے قریش کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا یہاں تک کہ غزوۂ بدر کی صورت پیش آ گئی۔ یہ جنگ اگرچہ مسلمانوں کے لئے بڑی آزمائش کی جنگ تھی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے بہت سے سردار مارے گئے اور ان کی قوت

ں سے ضرور ہوا کہ ابو سفیان اور اس کے حلیفوں
تت بڑھانے کا موقع مل گیا۔ قبل اس کے کہ
یں۔ قریش نے پھر معرکہ آرائی شروع کر دی اور
کا انتقام لینے کے لیے مدینہ کا رخ کیا اور احد کی
ئی۔ اس کا بھی نتیجہ اسلام کی فتح اور ازدیاد
کل میں ظاہر ہوا۔ دوسرے الفاظ میں مدینہ
ہو پہنچائے بغیر قریش مکہ کی طاقت گھٹتی جا رہی
ہ منزل قریب آتی جا رہی تھیں جب
داخلہ مکہ میں فاتحانہ ہونے والا تھا۔

ب لحاظ سے مکہ میں مخالفین اسلام شکستوں کے
رہ میں رہتے تھے۔ حج کے زمانے میں اور بعض
عات میں قبائل عرب مکہ میں اکٹھا ہوتے تھے۔
یش کو موقع ملتا تھا کہ وہ اسلام کے خلاف
ائیں۔

لام کے محدود اثرات نے ابھی عربوں کی جہالت
ہا کیا تھا اس لئے وہ بڑی آسانی سے ابھارے
چنانچہ احد کے بعد دو ڈھائی سال کے درمیان
ے چھوٹے ...... غزوات میں اسلام کو الجھایا
ہا سے بعض ایسے بھی تھے جن میں قریش اور یہود
بھوتے کر لئے تھے تاکہ اسلام کے بڑھتے ہوئے
ت حاصل کر سکیں۔ اس کے سبب سے بھیانک
حزاب میں نمودار ہوئی جو ہجرت کے پانچویں
زیا۔ اس خوفناک لڑائی میں رسول اسلام
سیاسی اور عسکری سوجھ بوجھ سے کام لے کر
ں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد مکہ کے قریش
پر اعتماد کھو دیا اور بہ ظاہر خاموش ہو گئے۔
نے ہنر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک نفسیاتی
کیا۔ مسلمانوں کے ایک خاصے بڑے گروہ کو ساتھ
ے مکہ کا رخ کیا اور عمرہ کا احرام باندھا اپنے

ساتھ نہ فوجی ساز و سامان لیا نہ جنگ و جہاد کی فضا پیدا ہونے دی۔ اس کا مقصد جہاں ایک طرف مذہبی فریضہ کی ادائیگی تھی۔ وہاں دوسری طرف مکہ میں مخالفت کے طلسم کو توڑنا اور دشمن کی قوت کا اندازہ لگانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قریش جنگ کے لئے کوئی بہانہ نہ پیدا کر سکے۔ اور صلح پر مجبور ہوئے یہاں اس صلح کے مختلف پہلوؤں یا اس کے تعمیری انداز کا ذکر نہیں ہے۔ صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اگر دنیا کی تاریخ میں کسی صلح کو (جسے کچھ لوگ دب کر صلح کرنا سمجھتے ہیں) فتح مبین کہا گیا ہے تو وہ یہی صلح ہے۔ جس میں بظاہر مسلمان مکہ میں داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ صلح حدیبیہ کے متعلق کسی کو کتنا ہی شک کیوں نہ ہو اس نے مستقبل کی کامیابی کے دروازے کھول دیے اور ایک ایسی قابل اطمینان فضا پیدا کر دی کہ رسول مقبول کو اگلے دو برسوں میں اسلام کا پیغام دور دراز ملکوں میں پہونچانے کا موقع مل گیا۔ اس صلح نے جنگ کے بغیر اگلے سال حج کی امید پیدا کر دی اور بہت سے مہاجرین کے دل اس مسرت سے بھر دیئے کہ وہ آٹھ سال بعد اپنے وطن کی گلیوں میں پھر سکیں گے حقیقت یہ ہے کہ اس صلح نے قریش کے ہاتھ کمزور کر دیئے۔

سنہ ۷ھ میں خیبر کی مہم پیش آئی۔ اس کا تفصیلی تذکرہ کتب تواریخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا مقصود ہے کہ فتح خیبر سے یہودیوں کی طاقت ختم ہو گئی اور اسلام اتنا مضبوط ہو گیا کہ اس کی طاقت اور ناکامی کا خواب دیکھنے والے خوفزدہ ہو گئے اور یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ خوفزدہ لوگ گھبراہٹ میں جلد جارحانہ کارروائیوں پر اتر آتے ہیں۔ چنانچہ پسپا ہوتے ہوئے قریش کے ساتھ یہی صورت پیش آئی۔

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ دس سال تک جنگ نہیں ہوگی۔ اور یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ سارے قبائل آزاد ہوں گے۔ جن کا جی چاہے قریش کے ساتھی بن جائیں

اور جن کا جی چاہے اسلام کے۔

چنانچہ بنو بکر نے قریش سے معاہدہ کر لیا اور بنی خزاعہ نے مسلمانوں سے۔ یہ دونوں قبیلے پہلے سے ایک دوسرے کے مخالف چلے آ رہے تھے اور چھیڑ چھاڑ جاری رہی تھی کہ بنو بکر نے سرداران قریش کی مدد سے بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ بنی خزاعہ کو حرم کے اندر بھی پناہ نہیں ملی اور ان کے متعدد افراد قتل کر دیے گئے۔ بنی خزاعہ نے اس حادثہ کی اطلاع رسول اللہ کو دی اور مدد کے لئے استغاثہ کیا۔ رسولؐ نے چند شرائط پر معاملات کو ختم کرانا چاہا۔ لیکن قریش نے اپنے زعم میں ان شرائط کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ حالانکہ ابوسفیان کو اب اسلام کی قوت کا اندازہ ہو چکا تھا اور اس نے اپنی جانب سے مدینہ میں یہ اعلان کر دیا کہ ہم صلح حدیبیہ کی تجدید چاہتے ہیں۔ چونکہ ان میں سرداران قریش شامل نہیں تھے اس لئے مسلمانوں نے اس اعلان تجدید کو اہمیت نہیں دی اور بنی خزاعہ کی اعانت کے خیال سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس دفعہ محمد عربیؐ نے اسلام کے عسکری نظام میں تیاریوں کو دشمن سے خفیہ رکھنے کی اہمیت پر زور دے کر یہ واضح کیا کہ فوجی تیاریوں سے لاعلمی دشمن میں نفسیاتی انتشار پیدا کرتی رہتی ہے۔

قریش مکہ اتنا خوفزدہ ہو چکے تھے کہ ممکن ہے بغیر کسی مدافعت کے ہمیں مکہ میں داخل ہونے کا موقع دیدیں۔ آپ نے اپنے ان اتحادی قبائل کو بھی اپنے ارادہ سے مطلع کر دیا۔ جو اسلام کے حلیف بن چکے تھے۔ اس درمیان میں ایک صحابی نے کمزوری دکھائی اور تیاریوں کی اطلاع مکہ بھیجنے کی کوشش کی جسے حضرت علیؓ نے ناکام بنا دیا۔ یہ صحابی حاطب تھا جس کی خطا بعد میں معاف کر دی گئی۔

جب تیاری مکمل ہو گئی تو دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ رسولؐ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اور جب مکہ صرف ایک منزل رہ گیا تو قیام کا حکم دیا۔ اب قریش چونکے۔ ابوسفیان نے پوری خبر لانے کا ذمہ خود لیا۔ اپنی آنکھوں سے اس نے افواج اسلام اور جنود دین اللہ کا جو تزک و احتشام دیکھا۔ اس نے اسے حیرت زدہ کر دیا۔ یہ صرف ایک جلاوطن اپنے وطن میں نہیں آ رہا تھا، ایک پیغام حیات، ایک نظام زندگی، ایک طوفان رحمت اس علاقہ میں داخل ہو رہا تھا جہاں اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ابوسفیان نے گھبرا کر عباس سے پوچھا یہ کون ہے، انھوں نے جواب دیا۔ یہ رسولؐ اپنے انصار و مہاجرین کے ساتھ آ رہے ہیں علم لشکر سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھا اور رسولؐ کے گرد جاں نثاروں کا ہجوم تھا۔ ابوسفیان نے کہا۔ آج تو تمھارے لڑکے کا جاہ و جلال بہت بڑھ گیا ہے۔

یہ اعتراف شکست تھا۔ قریش مکہ میں اس سیل نور و رحمت کو روکنے کی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ رسولؐ مکہ میں فاتحانہ لیکن پرامن طریقہ پر داخل ہو گئے حکم ہو گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے۔ اپنے گھر کے دروازے بند کرے، خانہ کعبہ میں یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے۔ اس کو امان ہے۔ اس دن محمدؐ مجسم رحمت اللعالمین بن کر داخل ہو رہے تھے۔ اس لئے جو ایک معمولی سی جھڑپ ہو گئی آپ کو وہ بھی پسند نہ آئی۔ اور جب ابوسفیان نے سعد ابن عبادہ کے ایک جملہ کا حوالہ دے کر یہ خیال ظاہر کیا کہ شاید سعد کی نیت امن و امان اور رحم و کرم کی نہیں ہے تو آپ نے بقول خلدون علم لشکر سعد سے لے کر علی ابن ابی طالب کو دیا تاکہ کفار قریش کے دل سے ہر طرح کا خوف رفع ہو جائے۔

مکہ میں پرامن داخلہ حقانیت اسلام کی بڑی فتح تھی کیونکہ یہی سارے عرب میں صنم پرستی کا سب سے بڑا گڑھ تھا۔ ابراہیم اور اسماعیل کے کعبہ میں مٹی اور پتھر کے تودوں کے سامنے انسانی وقار کی تذلیل ہو رہی تھی، ہر طرف بت

طاقوں پر، محراب میں، چھت پر، دیواروں پر
تھیں۔ رسولؐ نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ ان
ر تصویروں کا خاتمہ کیا، حضرت علیؓ تمام جہادوں کی
، جہاد میں بھی پیش پیش رہے۔ پھر آپ نے ایک خطبہ
رمایا۔ جس میں وحدانیت پر سب سے زیادہ زور تھا
ے ان کے سامنے وہ جبّاران قریش کھڑے تھے جنہوں نے
سی نہ کسی شکل میں رسولؐ اور اسلام کی مخالفت کی
ی بات تھی کہ ان کے دل انجام کے خوف سے دھڑک
ے، وہ مخالفت اور انتقام کا وہی مشرکانہ قبائلی تصوّر
تے، اس لئے یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ رحمت
یں معاف کر دے گا۔ چنانچہ ذہنی الجھنوں کے اس
مل کے درمیان ایک بار محمدؐ عربی ان کی طرف مخاطب
ر پوچھا تم کو معلوم ہے کہ میں معاملہ میں کیا کرنے والا
غرور کا سر جھک چکا تھا۔ لیکن عربی مزاج آڑے
ں نے جواب دیا تو شریف بھائی ہے اور شریف بھائی کا بیٹا۔ فرمایا
ٰ الزام نہیں، جاؤ سب کو معاف کیا۔ اصل فتح یہ
شاہراہوں، گلیوں، عمارتوں اور مکانوں کی فتح
بلند اور ارفع تھی۔ کیونکہ اس فتح نے اس رسول اسلام

کے کردار کی وہ تصویر پیش کر دی جسے ابوجہل یا ابولہب
ابوسفیان اور دوسرے رہنمایان قریش نے مکہ کے عوام کے
سامنے بالکل غلط رنگ میں پیش کی تھی۔

نماز کا وقت آگیا تھا، بلال حبشی نے اذان
دی۔ صفیں قائم ہوگئیں اور بڑے اطمینان سے
فریضہ عبادت ادا کیا گیا۔ پھر رسولؐ کوہ صفا پر چلے
گئے اور لوگ جوق در جوق بیعت کے لئے آنے
لگے۔

یہ ہے فتح مکہ! اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ
تھا ایک عمر کی جدوجہد کا جس میں جہاد بالسیف سے زیادہ جہاد
بالنفس نے کام کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فتح مکہ میں رسولؐ
ایک فوجی فاتح نہیں، نبی خدا دیکھائی دیتے ہیں جس کا اصل
کام اخلاق کی تلقین اور حقانیت کی اشاعت ہوتا ہے۔
فتح تو ایک ضمنی چیز اور حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے
اصل مقصد خانہ کعبہ کو بتوں، کاہنوں، پروہتوں سے
پاک کرنا تھا جب یہ کام ہوگیا تو رسولؐ پھر مدینہ واپس
گئے تاکہ کچھ دن آرام کر کے اپنے اس آخری حج کی تیاری
کریں جس میں دین اسلام کی تکمیل کا اعلان کرنا تھا؛

پروفیسر احتشام حسین مرحوم

مطالعۂ انیس

عالمی ادب پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض ادیب اور شاعر محض اس وجہ سے ایسا مقام حاصل نہ کر سکے کہ ان کے موضوع پر تنگ خیالی سے نگاہ ڈالی گئی اور اس کے صرف ایک رخ کو پیش نظر رکھ کر یہ سمجھ لیا گیا کہ اس کی اپیل محض ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فنی صلاحیت، شاعرانہ بصیرت، تخلیقی قوت اور قدرت بیان کا اعتراف بھی دبی زبان سے کیا گیا۔ اس حیثیت سے میر انیس کا شمار ان فنکاروں میں ہوتا ہے جن کا سارا سرمایۂ شاعری مسلمانوں کے ایک خاص فرقے کے لیے وقف ہے۔ ایک اعلیٰ پایے کے فنکار اور شاعر پر اس سے بڑا ظلم نہیں ہو سکتا کہ اس کے پر خلوص انتخاب موضوع کو اس کی مذہبیت یا تنگ نظری پر محمول کر کے اس کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ انصاف نہ کیا جائے اور صرف اس وجہ سے کہ اس کے موضوع کو کچھ لوگوں نے محدود یا فرقہ وارانہ قرار دیدیا ہے اسے اس توجہ کا مستحق نہ سمجھا جائے، جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ ایسی صورتیں پیدا ہو گئیں جنھوں نے اس عام بے توجہی کے لیے فضا بھی تیار کر دی، مثلاً مرثیے کو اصناف ادب میں وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو قصیدہ، مثنوی یا غزل کو حاصل تھی۔ بڑا شاعر مرثیہ گو کا فقرہ اس عام تصور کا غماز ہے خود مرثیہ گویوں نے بہت دنوں تک اس کی جانب شاعرانہ حیثیت سے کوئی خاص توجہ نہیں کی یہاں تک کہ دکن اور شمالی ہند کے دور متقدمین کے سیکڑوں مرثیہ گویوں میں سے کسی نے وہ اہمیت اور شہرت حاصل نہیں کی جو مثنوی نگاروں اور غزل گویوں کو حاصل ہو چکی تھی۔ محض از راہ ثواب یا رونے رلانے کے کے لیے مرثیہ لکھنا اتنا عام تھا کہ شعرا اس کی ادبی حیثیت کی طرف سے غفلت برتتے تھے۔ سودا نے اپنے مرثیے کے دیبا اور بعض تنقیدی نظموں میں اسی کے خلاف صدائے احتجاج بل کی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں صرف اردو مرثیے کا ذکر ہے جو بہ حیثیت صنف کے مرثیے کا جو کچھ بھی عروج ہوا، وہ اسی عہ کا ہوا، جو واقعات کربلا پر مشتمل تھے۔ جب اٹھارھویں صد میں مرثیہ اس ادبی منزل پر پہنچا کہ انیس کے ہاتھوں اس کا تاج کل تیار ہو گیا، اس وقت بھی اس سے متعلق یہ ذہ کیفیت الگ نہیں کی جا سکی کہ مرثیہ کوئی مخصوص ادبی صنف نہیں ہے۔ اس کا مقصد تو محض ایک محدود طبقے کے جذبا کو برانگیختہ کر کے رونا رلانا ہے۔ اس کی ادبی اور شاعرا حیثیت کی طرف مولانا شبلی کے متوجہ ہونے کے بعد تک لا کے کچھ بادل چھٹے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی کہ اب بھی مرثیہ کم و بیش اسی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

دوسرا بڑا سبب یہ تھا مرثیے کا ادبی عروج ایران م شاہان صفویہ کے دور میں اور ہندوستان میں ابتداً قطب شا گولکنڈہ اور بیجاپور کے عہد میں، اور پھر ان سب کے بع شاہان اودھ کے زمانے میں لکھنؤ میں ہوا۔ ایسا ہونا ضرو تھا کیونکہ ان تمام شیعہ حکومت کے زمانے میں واقعہ کربلا

نشرواشاعت اور اس سے جذباتی وابستگی کے لیے جتنے سامان وہاں فراہم ہوسکتے تھے، وہ دوسری صورتوں میں ممکن نہ تھے لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ مرثیے کے عروج کے اس تاریخی سبب کو مرثیے کے مطالعے میں رکاوٹ بننے دینا ایک غیر ادبی فعل ہوگا۔ دنیا کے ادب کی تاریخ جس طرح تاریخ اور سماج سے اپنے لئے غذا فراہم کرتی ہے شاعر اور ادیب ہمدرد، مناسب اور پسندیدہ ماحول کی تلاش میں رہتے ہیں۔ خاص زمانوں میں مخصوص خیالات اور تصورات کی داد ملتی ہے اس لیے شعرا ماحول کی مطابقت کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی خاص صنف ادب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ کسی خاص مذہب یا مسلک کی پابندی سے مجبور ہو کر ایسا کرتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر وہ اس فضا کو اظہار خیال کے لئے ساز گار پاکر اس کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اگر محض شیعہ حکومتوں کی سرپرستی کسی صنف ادب کو ترقی دینے میں مکمل طور پر معین ہوتی تو فن مرثیہ گوئی کی تکمیل ایران اور گولکنڈہ میں ہو جانا چاہیے تھی۔

تاریخی حیثیت سے جو کچھ بھی ہو، لیکن ادبی نقطۂ نظر سے مرثیہ نگاروں کو محض اس وجہ سے خاطر خواہ اہمیت نہیں دی کہ ان کا عروج شیعہ حکومتوں کے عہد میں ہوا اور نقادوں نے مراثی کو شیعہ حکومتوں کی سرپرستی یا شیعی خدمت سے منسوب کرکے اس کی ادبی حیثیت کو نظر انداز رکھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اودھ کے نوابوں اور بادشاہوں کے زمانے میں لکھنؤ میں تعزیہ داری کا عروج ہوا اور محرم نے وہ اہمیت اختیار کرلی جو دنیا کے کسی اور خطے میں اسے حاصل نہیں ہوسکی تھی لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ محرم کے اس طرح اہمیت حاصل کرنے میں اگر ایک طرف شاہی سرپرستی یا مذہبی جذبات کا ہاتھ تھا تو دوسری طرف وہ تہذیبی طاقتیں بھی کام کررہی تھیں جو ہندوستان کی کئی صدیوں کی تہذیبی آمیزش کا نتیجہ تھیں۔ اگر ہم تہذیبی اور ادبی ارتقا کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کردیں جو گزشتہ کئی سو سال میں وجود میں آیا تھا تو ہم میر انیس اور ان کی شاعری کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ کوئی شاعری محض کسی مخصوص گروہ کی سرپرستی یا مخصوص نقطۂ نظر کی ترجمانی سے ترقی کی ساری منزلیں طے نہیں کرسکتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عام ادبی اور تہذیبی روایت کا جز بھی ہو، اس کے بہترین عناصر کو پیش بھی کرتی ہو اور اس کے سرمائے میں اس کی وجہ سے اضافہ بھی ہوتا ہو۔ اگر مرثیے کی ترقی اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی تو یقیناً ہمیں اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ ہم اسے وہ ادبی مرتبہ نہ دیں جو دوسرے اصناف کو دیا جاتا ہے۔ لیکن مرثیوں اور خاص کر میر انیس کے مرثیوں کا مطالعہ اس بات کو واضح کردے گا کہ وہ نہ صرف فارسی اور اردو ادب کے اعلیٰ ترین رتبے کے حامل ہیں، بلکہ عام ادبی سرمائے میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے کہ ان تمام اسباب کا جائزہ لیا جائے، جن کی وجہ سے مرثیے کو وہ ادبی اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ اس میں شک نہیں کہ واقعۂ کربلا کے متعلق جو مراثی لکھے گئے۔ ابتدا ہی سے ان کے ساتھ یہ تصور وابستہ ہوگیا تھا کہ وہ محض رونے رلانے کا ذریعہ تھا۔ لیکن اس کی ترقی یافتہ صورت پر نظر رکھ کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کا مقصد اگر محض رونا رلانا ہوتا تو اس میں بہار و خزاں، فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ اخلاق، رزمیہ معرکہ آرائی اور ایسے دوسرے عناصر کی جگہ کہاں تھی! میر انیس اور دوسرے شعرا نے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا کہ مرثیے کا اصل مقصد جذبات حماست کو برانگیختہ کرنا ہے، نہ صرف حقیقت پر پردہ ڈالا کر مرثیہ لکھتے ثبت عقیدتاً وہ ثواب آخروی کا تصور بھی رکھتے تھے۔ لیکن انھوں نے مرثیے کے محدود جو کھٹے میں، جو تصویریں سجائی ہیں، جو رنگ آمیزی کی ہے وہ صناعی کا جو کمال دکھایا ہے، وہ براہ راست محض رلانے کے لیے نہیں ہوسکتا۔ یقیناً ان کے اندر وہ شاعرانہ اور خلاقانہ بصیرت تھی، جو کسی صنف کی رسمی اور میکانکی حدود کی پابند نہیں ہوتی، بلکہ اپنے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔ انھیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر میرا

خیال ہے کہ اب تک ہمارے نقادوں نے مرثیے کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔

میر انیس کے مرثیوں کا باقاعدہ مطالعہ کرنے سے پہلے چند مبادیات پر نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ بدقسمتی سے اس مقدمے میں ان کی تفصیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ لیکن مطالعہ کرنے والوں کو ان کی طرف متوجہ کر دینا ضروری ہے کیونکہ کسی کے مطالعے میں اگر ایک بڑی حقیقت بھی نظر انداز ہو جائے تو نتائج غیر صحت بخش ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ہر وہ شخص جو مراثی انیس کا مطالعہ ادبی اور تنقیدی نظر سے کرنا چاہتا ہے، وہ ان باتوں کو نگاہ رکھے تو اس کی منزلیں آسان ہو جائیں گی۔ مرثیے کا مفہوم ابتدا کیا تھا اور اس میں آہستہ آہستہ کس طرح تغیر ہوا؟ جو تغیرات ہوئے ان کے اسباب کیا تھے؟ موجودہ دور کے بعض ناقد مرثیے کے سلسلے میں ایپک اور ڈرامے کی بحث بھی لاتے ہیں۔ مرثیے کا مطالعہ کرتے ہوئے انھیں پیش نظر رکھنا چاہیے یا نہیں؟ مرثیوں میں واقعۂ کربلا کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ کس حد تک تاریخی حقائق پر مبنی ہے؟ کیا مرثیے کی واقعہ نگاری کو تاریخی وقائع نگاری کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے؟ اس سلسلے میں یہ سوالات بھی پیدا ہوں گے کہ مرثیوں میں جو کردار پیش کیے گئے ہیں اور جو فضا تیار کی گئی ہے۔ وہ عربی ہے یا ہندوستانی؟ اس سے مرثیے کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی پڑتی ہے؟ کیا مرثیہ نگاروں کے پیش نظر کوئی مخصوص فلسفۂ حیات تھا، جس کی بنیاد پر انھوں نے واقعۂ کربلا کو پیش کیا ہے؟ پھر ان تمام باتوں کے ساتھ مرثیے کے مطالعہ کے سلسلے میں یہ بحث بھی اٹھ سکتی ہے کہ حقیقت نگاری کا کیا مفہوم ہے اور میر انیس نے کس حد تک اس کی پابندی کی ہے؟ ایک آخری سوال یہ بھی اٹھ سکتا ہے کہ مرثیے میں جو اخلاقی تصور زندگی پیش کیا گیا ہے وہ کس قسم کے سماج اور کس قسم کے لوگوں کے لیے مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے؟ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میر انیس کے مرثیوں کا مطالعہ کرنے والے کو ان کے حالات زندگی، ماحول، عقائد اور خیالات سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ اسے یہ بھی جاننا چاہیے کہ جس ماحول میں مرثیے تصنیف ہوتے تھے اس کے بنیادی عناصر کیا تھے۔

میں نے ان تمام پہلوؤں کو دو مبادیات قرار دیا ہے جن کے جانے بغیر نہ تو مرثیے سے پوری طرح لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے، نہ اس پر تنقید کے لیے قلم اٹھایا جا سکتا ہے اور چونکہ لوگوں نے ان باتوں کو سامنے نہیں رکھا اس لیے انھوں نے یہ کہہ کر آسانی سے چھٹکارا حاصل کر لیا کہ مرثیے کا تعلق ایک خاص مذہبی طبقے سے ہے اور جو ادب اس سے متعلق ہوگا وہ صرف ایک محدود اپیل رکھتا ہوگا۔ اگر کسی نے توجہ بھی کی تو مرثیے کا ایک مثالی تصور قائم کر لیا اور اسی کی روشنی میں اس کے عیوب اور نقائص بیان کر دیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرثیے کے موضوع اور فن کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے اور تاریخ کی روشنی میں اس کے ارتقا پر بحث کی جائے تاکہ ایک ادبی صنف کی حیثیت سے اس کا مطالعہ مکمل ہو سکے۔

مرثیے کا لفظ جیسا کہ اس کے معنی سے ظاہر ہے ایک ایسی نظم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس میں کسی مرنے والے کے خصائص کا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہو کہ سننے والوں کے دل اس سے متاثر ہوں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرنے والوں کی تخصیص کر دیں یعنی جس کا مرثیہ لکھا گیا ہو، وہ اہم ہو اور قابل بیان خصوصیات کا مالک بھی ہو، اس کی قومی اہمیت بھی ہو، اس کی موت نے لوگوں کو متوجہ بھی کیا ہو، اس کے مرنے کا اثر تاریخ کی رفتار پر بھی پڑا ہو اور تہذیبی قدریں اس سے متاثر ہوئی ہوں۔ یہ پابندیاں عائد کرنے کا حق ہمیں حاصل تو نہیں ہے۔ لیکن ہم مرثیے کی آفاقی اہمیت پر نظر کرتے وقت ان پہلوؤں کو سامنے رکھ سکتے ہیں اگر کسی مرثیے میں ایسی شخصیت کا بیان ہو تو ممکن ہے کہ اس کا مطالعہ کرتے وقت ہم کو مرثیت کے علاوہ بعض اور پہلوؤں مثلاً تاریخ، واقعے کی اہمیت، کردار کے مختلف عناصر وغیرہ بھی دیکھنے پڑیں۔ بظاہر یہ مرثیے کے اجزا نہیں ہیں۔ لیکن ایسے مرثیے لکھے گئے ہیں اور لکھے جا سکتے ہیں۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے اس میں ستر دہی بھی سے زیادہ تر مرثیے واقعۂ کربلا سے متعلق لکھے۔ کسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے یہ تاریخِ عالم کا ایک بہت ہی اہم واقعہ تھا۔ اس میں کئی اہم ترین شخصیتوں اور کرداروں کا تذکرہ ناگزیر تھا بعض جذبوں سے اس میں ڈرامائی عناصر بھی داخل ہو گئے تھے۔ اور اس میں تو کسی طرح کا شک ہی نہیں کہ اس کے دو قد کچھ ایسے المناک پہلو تھے جو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ابتدائی مرثیوں میں ان باتوں کو واضح طور پر پیشِ نگاہ نہیں رکھا گیا، بلکہ مرثیہ گویوں نے نہایت سادگی اور اختصار سے ان تاثرات کا اظہار کر دیا، جو ایک عقیدت مند کے دل میں واقعۂ کربلا کے خیال سے پیدا ہوتے تھے اور چونکہ ان کا مقصد ایک طرح کے جذبۂ عقیدت کو آسودہ کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے اس سے کچھ زیادہ لکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس سادگی میں بھی کہیں کہیں پُرکاری نظر آ جاتی ہے دکن کے مرثیوں میں امام حسینؑ کی شخصیت کے سارے پہلو اجاگر نہیں ہوتے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی شخصیت ہی نہیں رہتی عقیدت کی آنکھ اس میں جو کچھ بھی دیکھ لے، شاعری سے اس کی تصویر کشی نہیں ہوتی۔ واقعے کی اہمیت نمایاں نہیں ہوتی، مقاصد کے تصادم کا پتہ نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ غم و الم کا اظہار بھی فنکارانہ نہیں ہوتا۔ اتفاقاً کبھی کسی کے یہاں ادبی حسن پیدا ہو جائے تو ہو جائے، خود شعرا اس کی کاوش کرتے نہیں معلوم ہوتے دلی کے ابتدائی مرثیہ گو جن کا کلام عام طور سے دستیاب نہیں ہوتا، صورتِ حال میں کچھ زیادہ تبدیلی نہ پیدا کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعوری طور پر مرزا سودا ہی نے مرثیہ کو ایک ادبی صنف کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کی یہاں اس سے بحث تو نہیں کی جا سکتی کہ سودا کو کس حد تک کامیابی ہوئی۔ لیکن ایک ایسی فضا ضرور تیار ہو گئی، جو مرثیے کی ادبی ترقی میں معین ہو۔ اگر ہم سودا کے تعمیری کام کو مرثیے کے ارتقا کی پہلی منزل قرار دیں تو دوسری منزل جو میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر اور مرزا فصیح کی کوششوں سے پیدا ہوئی۔ اسے ارتقا کی دوسری منزل کہہ سکتے ہیں۔ یہاں مرثیے کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ مرثیے کی ہیئت میں جو تبدیلیاں ہوئیں، انھوں نے اس صنفِ سخن کو ایک ایسی بلندی پر پہنچا دیا جہاں مرثیہ کو دیکھ لوگوں کے ذہن میں ایک اور ٹریجیڈی کا خیال آنے لگا۔ مرثیے کی ہیئتی ساخت کے سلسلے میں ایک اہم اور دلچسپ شخصیت میر ضمیر کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مرثیہ کا نیا طرز ایجاد کرنے میں انھیں کو اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے ایک مرثیے میں حسبِ ذیل بند لکھا ہے۔ ؎

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبیؐ کے
تھے بارہ سو انچاس (۱۲۴۹) وہ سال نبویؐ کے
آگے کبھی دیکھے نہ تھے یہ طرز کسی کے
اب سب ہی مقلد ہوئے اس طرزِ نوی کے
دس میں کہوں سو میں کہوں یہ درد ہے میرا
جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا

اس بند کو پڑھنے کے بعد کئی اہم سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا سن بارہ سو انچاس کے پہلے میر ضمیر نے خود جو مرثیے لکھے۔ وہ اس مرثیے یا اس کے بعد کے مرثیوں سے مختلف تھے؟ کیا ان کے ہم عصر دوسرے شعرا اس وقت تک جو مرثیے لکھتے تھے، ان میں وہ باتیں نہ تھیں جو اس ۱۲۴۹ھ والے مرثیے میں پیدا کی گئی ہیں؟ وہ کیا خصوصیات ہیں، جو اس مرثیے کو دوسرے مرثیوں سے الگ کرتی ہیں اور جنھیں میر ضمیر نے "طرزِ نوی" کہا ہے۔ اس مختصر سے مقدمے میں ان الجھنوں کے دور کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان شعرا کا کلام تاریخی ترتیب سے نہیں ملتا۔ اس لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ میر ضمیر نے مرثیے میں وہ کون سی خصوصیات پیدا کر دیں، جو میر خلیق کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتیں؛ جس

مرثیے میں یہ ہند آیا ہے۔ اس میں یقیناً مرثیے کا وہ عام ڈھانچہ تیار ہو گیا، جسے بعد میں میر انیس اور مرزا دبیر نے تکمیل تک پہنچایا یعنی مرثیے کے وہ اجزائے ترکیبی اپنی ابتدائی شکل میں نظر آنے لگتے ہیں، جن کا ارتقا بعد میں ہوا۔ اس میں تمہید یا چہرہ بھی ہے، رخصت بھی، سراپا کے کچھ نقوش بھی، آمد اور رجز بھی، رزم کے مناظر بھی، شہادت اور بین بھی۔ گویا ایک مختصر سے نقشے کے اندر وہ سارا رنگ و روغن نظر آ جاتا ہے جس کو زیادہ حسن و تناسب اور تعمیری احساس کے ساتھ میر انیس نے پیش کیا ہے۔ بہرحال تاریخ مرثیہ گوئی کے طالب علموں کے لیے میر ضمیر کی مرثیہ نگاری غور و فکر کا بڑا سامان فراہم کرتی ہے، جس کے نظر انداز کرنے سے میر انیس کے فنی ارتقا کو مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ انداز بیان اور بعض دوسری خصوصیات کے لحاظ سے خلیق، ضمیر، دلگیر، اور فصیح کے مرثیے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے مرثیے نے وہ وسعت اختیار نہیں کی، جس کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جا سکے کہ ساخت اور ہیئت کے نقطۂ نظر سے انھیں "مرثیے" کے علاوہ کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے۔

یہیں بحث کا وہ پہلو سامنے آتا ہے، جس کی طرف ابتدا میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی اگر مرثیہ محض ان تاثراتِ غم کے اظہار کا نام ہے، جو کسی شخص کی موت پر انفرادی یا اجتماعی طور پر پیدا ہوتے ہیں تو پھر میر انیس کے مرثیوں کو مرثیہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ غالباً اس الجھن کو دور کرنے کے لیے بعض لوگوں نے مرثیے کو ایپک[1] اور ٹریجیڈی[2] کا مماثل قرار دیا ہے۔ ایپک کا ہر نقاد جانتا ہے کہ ایپک کی کوئی معین تعریف نہیں ہے۔ ڈراما اپنی ساخت کے لحاظ سے ایک ہیئت ضرور رکھتا ہے لیکن اپنی روح میں غم و الم کے ایسے عناصر بھی رکھتا ہے جو کسی دوسری صنف اور خاص کر مرثیے میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مرثیے کو ایپک یا ٹریجیڈی کہنا اس حیثیت سے صحیح نہیں ہے کہ ہم ایک کو دوسرے کا بدل قرار دیں۔ کیو ان میں سے ہر صنف کی کچھ الگ الگ خصوصیتیں ہیں۔ ان میں کوئی قباحت نہیں ہونا چاہیے کہ شاعری کا طالب علم مرثیے میں بھی ایپک اور ٹریجیڈی کی خصوصیات تلاش کرے اور جس حد تک اُن میں اشتراک پایا جاتا ہے، ا بنیاد بنا کر یہ کہے کہ مرثیے اور ایپک یا مرثیے اور ٹریجیڈی کچھ مشترک باتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے میر انیس بحیثیت ایپک کے ایپک سے اور بحیثیت ٹریجیڈی ٹریجیڈی سے ناواقف تھے۔ ٹریجیڈی کا تو خیر کوئی سوا نہیں تھا اگر وہ کسی ایپک سے واقف تھے تو وہ صرف شاہنامہ یقیناً انھوں نے سکندر نامہ، حملۂ حیدری اور خاور نامہ جیسی ضرور پڑھی ہوں گی لیکن کوئی نقاد ان نظموں کو ایپک میں ش کرے گا۔ نقادوں نے عام طور پر شاہنامے میں وہ خصو پائی ہیں، جو اسے ایک طرح کا ایپک بناتی ہیں۔ لیکن ا ایپک کی خصوصیات سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے شا کو ایک اعلیٰ ایپک کی طویل رزمیہ مثنوی کی حیثیت سے پڑ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں شاہنامے کی تعمیری تشکیل کا تھا اور یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ وہ مہابھارت[3]، راماین[4]، اوڈیسی[5]، اینیڈ[6]، ڈوائن کامیڈی[7] اور پیراڈائز لاسٹ[8]

---

[1] ایپک (EPIC) رزم کا بیان۔

[2] ٹریجیڈی (TRAGEDY) المیہ۔

---

[3] مہابھارت، مشہور سنسکرت ایپک مصنفہ ویاس۔ [4] راماین سنسکرت مصنفہ والمیک۔ اودھی زبان میں جو راماین لکھی گئی اس کے مصنف داس ہیں۔ بہت سے لوگ اسے بھی ایپک میں شمار کرتے ہیں۔ [5] (ALED) یونانی شاعر ہومر کی مشہور نظم جسے پہلی ایپک قرار دیا جا

[6] اوڈیسی (   ) یہ بھی ہومر ہی کی لکھی ہوئی ایپک۔

[7] اینیڈ (   ) مشہور اطالوی شاعر ورجل کی نظم

[8] ڈوائن کامیڈی (   ) ڈانٹے کی مشہور اطا

[9] پیراڈائز لاسٹ (   ) ملٹن کی طویل نظم

سے بالکل ناواقف تھے۔ گویا ایپک کے اعلیٰ نمونے ان کی نگاہوں سے نہیں گزرے تھے۔ اس لیے یہ سوچنا کہ انھوں نے مرثیے ایپک کی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر لکھے، درست نہ ہوگا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ابتدائی ایپک لکھنے والے خود ایپک کے فن سے ناواقف تھے اور اپنی تخلیقی قوت کے سہارے ایسی نظم لکھ رہے تھے جنھیں بعد میں ایپک کہا گیا۔ یہی بات میر انیس کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔ انھوں نے مرثیے کی محدود دنیا میں ان اعلیٰ نظموں کی شان پیدا کی جو دوسرے ملکوں کے سرمایۂ شاعری میں ایک بیش بہا مقام رکھتی تھیں۔ جن لوگوں نے مرثیوں میں ایپک کی خصوصیات تلاش کیں انھوں نے کوئی بڑی غلطی نہیں کی کیونکہ چھوٹے چھوٹے اختلافات کے باوجود ایپک میں معنوی حیثیت سے اعلیٰ مقصد، بلند اخلاقی خیر و شر کی کشمکش، ایک بڑے پیمانے پر بڑی طاقتوں کے تصادم، اخلاق کے اچھے اور برے نمونوں کی نمائش کا پایا جانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور یہ ساری باتیں کسی نہ کسی حیثیت سے مرثیے میں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام حسینؑ کی شخصیت کی عظمت اور واقعۂ کربلا کی غیر معمولی نوعیت نے شاعر کی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے میں مدد دی۔ یہاں بھی بہت بڑے پیمانے پر خیر و شر کا تصادم ہے، انسانیت اور بہیمیت کا مقابلہ ہے۔ صبر و استقلال کے مقابلہ میں بہیمانہ قوتوں کی صف آرائی اور ناقابل بیان مصائب کے ہجوم میں امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کی بلندیٔ کردار کے نمونے ہیں۔ اس لیے مرثیے کو کچھ باتوں میں ایپک کا مماثل قرار دینا کوئی ایسا گناہ نہیں ہے، جس پر جبینیں شکن آلود ہو جائیں۔

یہی حال ڈرامے یا ٹریجیڈی کا ہے۔ میر انیس اس صنف ادب سے بھی واقف نہیں تھے۔ لیکن جو واقعہ انھوں نے اظہار خیال کے لیے منتخب کیا تھا، اس میں خود ڈرامائی عناصر کی فراوانی تھی، اور ٹریجیڈی بننے کی وہ ساری صلاحیتیں تھیں، جن کا ذکر ارسطو کے وقت سے اس وقت تک تمام نقاد کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن ہر آنکھ رکھنے والا اس حقیقت کو دیکھ لے گا کہ ڈراما اپنی مخصوص ہیئت رکھتا ہے اسٹیج کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ دیکھنے اور پڑھنے والے واقعات کو منطقی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہوتے، کرداروں کے عمل سے واقعہ کے اندرونی ربط کو مضبوط بنتے اور اصل کشمکش کو انجام کی طرف جاتے دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں۔ المیہ یا ٹریجیڈی کے بنیادی عناصر پلاٹ، کردار، عمل، کشمکش یا تصادم ہیں۔ مرثیہ ڈراما نہیں ہے لیکن یہ عناصر اس میں پائے جاتے ہیں۔ واقعۂ کربلا میں حالات کئی جگہ ایسے نقطے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان میں المیہ کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ خوف اور رحم کے جذبات ابھر کر بہتر اخلاقی قدروں کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دل میں بلند کرداری کی عظمت اور انسانی ہمدردی کے متعلق ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں، جن سے المیہ کا اصل مقصد پورا ہوتا ہے۔ اس لیے بناوٹ اور ہیئت کے لحاظ سے مرثیے اور ڈرامے میں زبردست فرق نظر آتا ہے۔ لیکن اپنی روح میں دونوں گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ ایپک، ٹریجیڈی اور مرثیے کا ذکر ایک ساتھ کرنے کا مطلب کبھی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انھیں ایک ثابت کیا جائے یا ایک کی ساری خصوصیات دوسرے میں تلاش کی جائیں۔ لیکن شعریات کے نقاد کے لیے یہ بھی نامناسب نہ ہوگا کہ وہ مرثیے کے مختلف بیرونی اور اندرونی عناصر ترکیبی، موضوع اور ترتیب و واقعات، مقصد اور تصور فن پر نگاہ رکھتے ہوئے دوسرے اصناف سے ان کا مقابلہ کر کے اشتراک اور اختلاف کے تمام پہلوؤں پر ناقدانہ رائے دے۔ ایسا کرنے میں یقیناً ان اصناف میں مشابہت کے بہت سے پہلو نظر آتے ہیں۔ اور چونکہ ایپک کے متعلق اس وقت کوئی معین نقطۂ نظر موجود نہیں ہے اس لیے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انیس کا مرثیہ ایک خاص قسم کا ایپک ہے۔ جو ایسی ہی بعض دوسری نظموں سے کچھ پہلوؤں میں مشابہت رکھتی ہے۔ اور کچھ میں اختلاف۔ جب ارسطو نے ایپک پر بحث کی تھی تو اس کے پیش نظر صرف ہومر کی نظمیں تھیں اور جب سترھویں یا اٹھارہویں صدی کے کسی نقاد نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو اس کے سامنے ملٹن کے دور تک کی تمام ایسی

نظمیں تھیں، جن پر ایپک کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس بحث کو اور زیادہ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ افراط اور تفریط سے بچ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ مرثیہ ایپک نہیں ہے لیکن اردو زبان کی کوئی دوسری نظم ایپک سے اس قدر مشابہت نہیں رکھتی اور یہی بات ٹریجیڈی کے لیے بھی درست ہے۔

ایک خاص بات جو مرثیے کے فن، بناوٹ اور مقصد سے گہرا تعلق رکھتی ہے اور جو اس کے ارتقا پر اثر انداز ہوئی، وہ اسکے پڑھنے کا طریقہ ہے۔ اکثر نقاد اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ مرثیے کے تحت اللفظ پڑھے جانے کی وجہ سے مرثیہ نویسی پر جو اثر پڑا، وہ اس کے ارتقا کے لیے مفید بھی ہوا اور نقصان دہ بھی۔ لکھنؤ میں مرثیے کے منبر پر بیٹھ کر پڑھے جانے کا فن خود اپنی جگہ پر اظہار کمال کا ایک ذریعہ بن گیا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میر انیسؔ نے مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک ایسی بلندی تک پہنچا دیا، جس کا اب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بڑے مجمع کے سامنے، مرثیہ خواں اپنی پوری قوت صرف کر کے زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو بند پڑھ سکتا تھا۔ اس وقت آواز کو دور تک پہنچانے والے آلات میسر نہ تھے۔ اس لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ آہستہ آہستہ پڑھے پھر ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ جہاں اپنی پوری قوت سے پڑھنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بزم، رزم، بین، رخصت، ہر منظر ایک ہی طرح نہیں پڑھا جا سکتا یہی نہیں، بلکہ جو لوگ مرثیہ خوانی کے فن سے ذرا بھی واقف ہیں، وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ بچوں اور بوڑھوں، عورتوں اور مردوں، دوستوں اور دشمنوں کے متعلق مرثیے کے بند پیش کرتے ہوئے آواز اور لب و لہجہ میں مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا کرنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ جب کسی واقعہ کو بھی بیان کرنے لگتا ہے تو صرف ان الفاظ پر ہی اکتفا نہیں کرتا جو اس کے منہ سے نکلتے ہیں، بلکہ اعضائے جسم کے اشاروں سے، چہرے کی ساخت سے اور دوسرے ایسے ذرائع سے بھی کام لیتا ہے۔ جس سے وہ بیان کو زیادہ قابل فہم بنا سکے اور سننے والوں کو زیادہ سے زیادہ متاثر بھی کر سکے۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرثیے کے اندر بہت
ڈرامائی عناصر پیدا ہو سکتے تھے۔ اسی طرز لکھنے
کی گئی جس سے حسب موقع تعجب، خوف یا اح
پیدا کیا جا سکے۔ انیسؔ کے مرثیوں میں ناگاہ،
وغیرہ الفاظ اس مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ بعض
کہ اگر مرثیوں میں مکمل واقعہ کربلا بیان کیا جاتا ت
زیادہ قریب ہوتے یا کم از کم شاعر کی فنی صلاح
چلتا۔ لیکن جب ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ مرثیے مج
جانے کے لیے لکھے جاتے تھے تو ہمیں یہ نہیں بھ
والوں کی قوت گویائی اور سننے والوں کی قوت
سو بندوں سے زیادہ بڑے مرثیے کی تاب نہیں لا
پابندی نے مرثیہ نگاروں کو کبھی اس کی طرف
واقعہ کربلا کو شروع سے اخیر تک حسن ترتیب و تس
ہوئے ایک ہی طویل نظم میں بیان کر دیں۔ ا
ایک کی صلاحیت جو ان مرثیہ نگاروں اد
میں پائی جاتی تھی، وہ کبھی بروئے کار نہ آسکی
میں ایک نیا مرثیہ پڑھنے کے التزام نے انھیں
کیا کہ وہ واقعہ کربلا کے مختلف گوشوں کو کبھی سمیٹ
کر بیان کریں۔ جو بات ایک مرثیے میں صرف
کہہ دی گئی ہے، وہ کسی دوسرے مرثیے میں بیس
بندوں میں کہی گئی ہے۔ اس طرح گو کبھی کبھی
ہونے لگتا ہے۔ لیکن نظر غائر سے دیکھنے پر پتہ چلا
نے ایک ہی واقعہ کو مختلف مرثیوں میں اپنی قو
کتنے مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔ یہاں ا
نہیں ہے کہ میر انیسؔ کے نظریۂ فن یا نظریہ ش
کی جائے۔ گو اس کا مطالعہ بھی انیسؔ کا صحیح
میں معاون ہوگا۔ مگر اتنا کہنا ضروری ہے کہ انیسؔ
نظر سے حقیقت نگاری کی طرف مائل تھے اور ا
باوجود جو ایک مخصوص مذہبی عقیدے کی وجہ

ہوتی تھیں۔ انھوں نے واقعات اور مناظر کو واردات اور جذبات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ خود بخود حقائق سے قریب ہو جاتے ہیں۔ وہ جہاں ایک طرف ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کو کمال فن سمجھتے تھے، وہاں اس کا احساس بھی رکھتے تھے کہ:

"ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد"

اور جس شخص کو اس بات کا احساس ہو کہ جو بات جیسے کہی جانے کی ہے اور جس جگہ کہی جانے کی ہے اسی طرح اور وہیں کہی جائے۔ اس کے حقیقت پسند ہونے میں کسی طرح کا شک نہیں ہو سکتا۔

میر انیس کو حقیقت نگار کہہ کر ہم نے اپنے سر ایک بڑی ذمہ داری لی ہے۔ کیونکہ حقیقت نگاری کی جو مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بحث اٹھ سکتی ہے کہ انیس کس قسم کے حقیقت نگار ہیں۔ قبل اس کے کہ اس پر بحث ہو، چند ضروری باتوں کی طرف توجہ دلانا مناسب ہوگا۔ واقعۂ کربلا تاریخ اسلام کا ایک اہم ترین واقعہ ہے جس کے اسباب و علل اور اثرات کی نوعیت ہمیشہ زیر بحث رہی ہے پھر بھی اس واقعے کے واضح خط و خال ہیں جنھیں زمان و مکان کے آئینے میں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ حقیقتیں ایسی ہیں، جن میں اختلاف نہیں ہے مثلاً امام حسینؑ کا حسب نسب، عربی سماج میں ان کا مقام، یزید سے اُن کا اختلاف، جلاوطنی، کربلا میں مختلف قسم کے مصائب جھیل کر شہید ہو جانا، خاندان کی باعزت خواتین کا قید ہونا وغیرہ یہ ساری باتیں وہ ہیں جن میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے اگر اختلاف ہو سکتا ہے تو جزئیات میں اور امام حسینؑ کے مقاصد کی تعبیر اور تفسیر میں۔ اور چونکہ میر انیس نے اپنے مرثیوں میں محض واقعۂ کربلا کو ہی بیان نہیں کیا ہے، بلکہ ان جزئیات کو بھی شامل کر لیا ہے جن کا کچھ حصہ بعض تواریخ مقاتل میں پایا جاتا ہے۔ کچھ ان کے عقیدے کا جزو ہے اور کچھ ایسا بھی ہے جسے ان کی شاعرانہ تخلیقی قوت وجود میں لاتی ہے لیکن جسے امکان اور قیاس کی حدوں سے باہر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ کہ اگر کسی تاریخ میں اس گفتگو کی تفصیلات نہ ملیں جو امام حسینؑ اور ان کے بیٹے حضرت علی اکبرؑ کے درمیان رخصت ہوتے ہوئے ہوئی ہوں تو بھی ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو کربلا میں رونما ہو رہے تھے، ان کا تصور کر لینا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔ بعض نقادوں نے اسے واقعہ نگاری سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے حقیقت پر مبنی ہونے کی کسوٹی یہی ہے کہ کیا اُن کا بیان واقعۂ کربلا کی روح کے منافی ہے؟ کیا وہ فطرت انسانی سے بعید ہے؟ کیا اس کی جزوی باتیں کسی تاریخی حقیقت کو جھٹلاتی ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اس واقعہ نگاری کو حقیقت نگاری قرار دیے جانے میں کوئی قباحت نہیں ہونا چاہیے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جس بات کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ میر انیس واقعۂ کربلا کی تاریخی حیثیت اور ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے وہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں اور امام حسینؑ کے دشمنوں کے متعلق کچھ عقیدے رکھتے تھے۔ ان سے بھی سر مو انحراف کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ تاریخ اور عقیدے کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کی روایات سے پیدا ہونے والی کچھ فنی پابندیاں بھی تھیں، جنھیں اچھا شاعر کبھی نظر انداز نہیں کرتا اور سب سے بڑھ کر اودھ کے واجد علی شاہی ماحول میں بسنے والے سماج کو اپنے خیالات سے متاثر کرنا تھا اُن میں سے کسی چیز کو نظر انداز کر دینے میں انھیں ناکامی ہو سکتی تھی۔ جاگیرداری سماج کے زوال پذیر ماحول میں اخلاق کی قدریں بھی اپنے معنی بدل لیتی ہیں۔ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے معیار میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ زندگی کے وہ پہلو جو تعیش، نکمے پن اور تنگ نظری کی طرف مائل کرتے ہیں پسندیدہ بن جاتے ہیں اس ماحول میں تاریخ اور عقیدے کا سہارا لے کر ان اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو ابھارنا جو کسی قوم کے دور عروج کا پتہ دیتی ہیں، آسان کام نہ تھا۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ میر انیس نے اپنے سامعین کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر واقعۂ کربلا کے انھیں پہلوؤں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، جو باطل کے مقابلے میں حق کا، شر کے مقابلے میں خیر کا اور بد اخلاقی کے مقابلے میں اخلاق کا۔

علم بلند کرتے ہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک ڈرامہ یا منظوم قصہ لکھنے والے کی تخلیقی قوتیں اپنے مقصد کے مطابق واقعات کو ترتیب دینے کیلئے آزاد ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جب کردار تاریخ کے جانے بوجھے افراد ہیں (جیسا کہ واقعۂ کربلا میں حصہ لینے والے کردار ہیں) اس وقت کسی شاعر یا ادیب سے کردار نگاری کا مطالبہ کرنا درست نہ ہوگا لیکن اگر ہم مراثی انیس کو غائر نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ان پابندیوں کے اندر آزادی کی جو راہیں نکال لی ہیں، وہ ان کی شاعرانہ عظمت اور تخلیقی صلاحیت کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔ انھوں نے اُن کرداروں کو لیا، جن کے ساتھ کچھ تاریخی حقائق اور عقائد وابستہ تھے اور انھیں کو نفسیاتی اور جذباتی حیثیت سے ماننے اور تسلیم کئے جانے کے قابل بنا کر پیش کیا۔ وہ یہ تو نہیں کر سکتے تھے کہ ان کرداروں کو اس سے مختلف بنا دیتے، جیسے کہ وہ واقعی تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی تخلیقی قوت سے کرداروں کے نقوشِ عمل کی زندگی میں ابھارے نفسیاتی اور جذباتی پیچیدہ راستوں سے گزار کر اُن کی انسانی اور حقیقی خصوصیتوں کا احساس دلایا۔ غلطی سے بعض نقادوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ مراثی انیس کے سب کردار ایک سے ہیں۔ غالبًا کہنے والوں کے یہاں یہی الجھن ہوگی کہ جب کرداروں کی سیرت اور افعال و اعمال معلوم ہیں اور جب شاعر انھیں کے اظہار پر مجبور ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اپنے عقیدے کی وجہ سے وہ انھیں مثالی ہی بنا کر پیش کر سکتا ہے تو پھر سب کی سیرتیں یکساں ہی ہو جائیں گی۔ بعض خصوصیات میں یقینًا ان تمام کرداروں میں یکسانیت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن جس شخص نے میر انیس کے چار چھ مرثیے بھی سمجھ کر پڑھ لئے ہیں، وہ افرادِ مرثیہ میں ایک پر دوسرے کا شبہ نہیں کر سکتا۔ شجاعت، صبر و وفا، حسن، بردباری، نیز تسلیم و رضا، حق گوئی اور خدا رسی چند اہم صفات ہیں۔ جو امام حسینؑ اور ان کے تمام ساتھیوں کے یہاں ملتی ہیں لیکن انھیں کے اندر باریک باریک پہلو پیدا کر کے میر انیس نے ایک کو

دوسرے الگ کر دیا ہے۔ کوئی شخص مراثی میں امام
عباسؑ کے کردار میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ بہرا
میں مماثل ہوتے ہوئے بھی ان میں، زبردست
فرق کو مسلسل ملحوظ کرنا مرثیہ کی کردار نگاری کو
ہے ہر مرد، ہر عورت، ہر بوڑھا، جوان اور
رکھتا ہے، جیسے میر انیس نے کسی موقع پر نظر انداز
ہے، تاریخ ان کی انفرادیت کو نمایاں کرنے
شاعر نے کہیں کوتاہی نہیں کی ہے۔ لیکن یہ با
نظر سے مطالعہ کرنے والوں ہی کی سمجھ میں آ سکتی
نہیں جانتا کہ حبیب ابن مظاہر کون تھے، اما
اُن کے جذباتی اور ذہنی تعلقات کیسے تھے، وہ
کو فرکی ناکہ بندیوں کا حصار پار کر کے کربلا کے
تھے، خاندانِ رسالت کے متعلق ان کے کیا عقا
یزید کو کیسا سمجھتے تھے؟ وہ پوری طرح حبیب
اُس کردار کا اندازہ نہیں لگا سکے گا۔ جو میرا
ہے۔ مرثیوں میں ان کا ذکر چند بندوں میں
تمام باتوں کے جانے بغیر کوئی شخص مرثیہ نگار
نہ سکے گا۔ یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اگر
لیا جائے تو بہت سی ایسی باتوں کو جاننے کی
عام تاریخوں میں نہیں ملتیں، بلکہ مقاتل اور
حاصل کی جاتی ہیں یا ان کی بنیاد عقیدے
ان کے متعلق شاعر کے نازک اور لطیف اشا
پس منظر کو ابھار دینے کی صلاحیت ہوتی ہے، ان
کوئی کیفیت نہیں پیدا کرتے، جو اُن سے واقف
پوری طرح شاعری کے لئے صحیح ہے۔ لیکن
اور زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہاں واق
کی زنجیریں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور
سے بہت سے دوسرے واقعات نکلا ہوں
ہیں جب کرداروں کے متعلق نا واقف

کنایوں اور استعاروں کی زبان سمجھ میں آ جائے۔ اس وقت یہ سمجھنا کہ شاعر کردار نگاری میں ناکام رہا ہے، شاعر کے ساتھ ناانصافی ہے۔ مرثیہ کی کردار نگاری ناول، افسانے اور ڈرامے کی کردار سازی سے مختلف ضرور ہے۔ لیکن انیس اور میرانیس نے کرداروں کی ظاہری اور باطنی، جذباتی اور ذہنی کیفیات اور نفسیات کا لحاظ ہی نہیں رکھا، درپے جانے کردار کو بنی بنائی شکلوں میں بغیر کہ دکاوٹ کے پیش کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کرداروں کا عمل ہمیں متاثر نہ کرتا اور ہمیں ان کے متعلق تجسس نہ ہوتا۔ شاید ان کے کرداروں کے جاندار ہونے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ میرانیس نے یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھی ا لوہی شان رکھتے ہیں عام طور سے کردار کے انسانی پہلوؤں ہی پر زور دیا ہے۔

کرداروں ہی کے سلسلہ میں ایک اور بات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کئی نقادوں نے کہا ہے کہ مرثیہ میں جو واقعے وہ سرزمین عرب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو کردار ہیں۔ وہ بھی عرب کے ہیں لیکن میرانیس اور دوسرے مرثیہ نگاروں نے انھیں ہندوستانی لباس میں پیش کیا ہے۔ یہ بات ایک نیا تحقیقی و تنقیدی فضا پیدا کرتی ہے اور تقاضے وقت کے خلاف ہے۔ یہ مسئلہ اس حیثیت سے ضرور قابل غور ہے کہ مرثیوں نگاروں نے خالصتاً عربی مزاج اور کردار پیش کرنے کے بجائے وہ انداز اختیار کیا ہے جو ہندوستانی مزاج اور انداز طبیعت کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ میں جب اس بات پر غور کرتا ہوں تو جہاں تک میرانیس کا تعلق ہے چند مقامات کے علاوہ کہیں ایسی صورت نہیں پیدا ہوتی جس کا اطلاق محض ہندوستانی ماحول اور زندگی پر ہو سکے امام حسینؑ ان کے اہل بیتؑ عزیزوں، بچوں اور ساتھیوں کے متعلق اتنا سمجھ لینا ضروری ہے میرانیس انھیں خوبیوں کا مجسمہ اور اعلیٰ ترین صفات کا مجموعہ سمجھتے تھے ان کا ذہن نفاست مزاج، پاکیزگی ذوق، صدق مقال، شجاعت، بزرگوں کی اطاعت اور احترام، باہمی محبت، عزت نفس، حلم اور صبر و شکر کے جس اعلیٰ معیار کا تصور کر سکتا تھا انھوں نے اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کی مثالی تصویریں ہندوستانی ایرانی، عربی تمام مردوں اور عورتوں میں یکساں ہی ہوں گی۔ چنانچہ انیس انھیں مثالی تصویروں کی مدد سے اپنے کرداروں کو سمجھتے اور سمجھاتے تھے اور اسی میں انھیں کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔ ان کرداروں میں کوئی بات عربی مزاج کے منافی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعتراض لاعلمی یا حقیقت نگاری کی بنیاد پر نہیں، عقیدے کے فرق کی بنیاد پر کیا جاتا ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت زینبؑ، حضرت شہربانو یا بعض دوسری خواتین کو بعض مواقع پر جو روتا یا فریاد کرتا دکھایا گیا ہے، وہ اہل بیت رسالتؐ کی شان اور عربی مزاج کے منافی ہے اور اول تو یہ کہ یہ بات نہ اہل بیتؑ کی شان کے منافی ہے نہ عربی مزاج کے، فرق طرز اور مدارج کا ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں ان مواقع کو بھی پیش نگاہ رکھنا چاہیئے، جہاں ان کو اس حالت میں دکھایا گیا ہے۔ کیا حقیقتاً وہ مواقع رونے اور فریاد کرنے کے منافی ہیں۔ انسانی نفسیات کے عام اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ چاہے کسی موقع پر ان کا دکھ ناپسندیدہ نہ ہو لیکن عام طور پر وہ حقائق سے انحراف کا پتہ نہیں دیتے پھر مرثیہ گویوں نے انھیں محض روتا اور فریاد کرتا ہی نہیں دکھایا ہے، وقت آنے پر کو صبر و استقلال بنتے ہوئے بھی پیش کیا ہے۔ ان خواتین کے کردار میں رونے دھونے اور صبر کرنے کے الگ الگ مواقع ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو میدان جنگ میں مرنے کے لئے بھیجتی ہیں اور یہ جان کر بھیجتی ہیں کہ ان کا جان دینا کیوں ضروری ہے وہ انھیں روکتی نہیں، ان کا دل بڑھاتی ہیں، بزرگوں کی بہادری اور جرأت کے قصے سناتی ہیں جان دینے میں سبقت کرنے کے لیے اپنے حق کی قسم دلاتی ہیں، پردے کے پیچھے سے ان کے جنگ کرنے کے منظر کو دیکھتی اور ان کی بہادری پر فخر کرتی ہیں۔ لیکن جب ان کو خاک و خون میں لوٹتا ہوا دیکھتی ہیں تو ایک ماں کی طرح بلک بلک کر روتی ہیں۔ وہ عربی یا ہندوستانی نہیں ہیں۔ ماں ہیں۔ یہ میرانیس کے مرثیوں کا

عام انداز ہے۔ جس سے کسی مقام پر انحراف نہیں ملتا۔ ہاں! اگر [illegible] بچّوں کو رخصت کرتے وقت یہ فقرہ بھی کہہ دیتی ہیں کہ تمھیں دولہا بنانے کی آرزو تھی تو یہ بھی ایسی بات نہیں ہے کہ عربی خاتون کے دل میں نہ پیدا ہو سکے۔ انھوں نے یہ بات ہمیشہ مبہم شکل میں کہی ہے۔ کہیں اس کی تصریح نہیں کی ہے کہ وہ کون سے پہلو ہیں، جو عربی کردار میں نہیں پائے جاتے، صرف ہندوستانی کردار میں پائے جاتے ہیں، ورنہ شاید کسی پر تفصیل سے گفتگو ہو سکتی۔

جہاں تک واقعۂ کربلا کا تعلق ہے، وہ ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن جب وہ شاعر کی زبان سے بیان ہوتا ہے تو تاریخ کے مفہوم میں تاریخ نہیں رہ جاتا کیونکہ مرثیہ نگار تاریخ نگار نہیں ہو سکتا۔ میر انیس نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے تاریخی واقعات بیان کرنے کے بجائے وہ فضا پیدا کر دی ہے، جو تاریخ کے منافی نہیں ہے۔ تاثرات اور تصورات، جذبات اور کیفیات کی وہ فضا جو کربلا کے المیہ کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے پر شاعر کے یہاں پیدا ہونی چاہیے، وہ انیس اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ ہم واقعات پر غور کرنے کے بجائے ان سے پیدا ہونے والی فضا کا اثر قبول کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص جو اس فضا کا تصور نہ کر سکے، مرثیوں سے پوری طرح کیونکر تسکین ہو سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر شخص مرثیہ نگار کے عقیدے میں شریک ہو جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ جب تک واقعۂ کربلا کا جزوی اور تفصیلی علم نہ ہو، جب تک افراد مرثیے کے متعلق پوری واقفیت نہ ہو، جب تک مرثیہ میں آنے والی تلمیحوں، اشاروں اور کنایوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، مرثیے کے ادبی اور شعری پہلوؤں سے لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔ ارسطو نے تاریخ اور شاعری کے فرق سے بحث کرتے ہوئے وضاحت شاعری کی جس عمومیت پر زور دیا تھا اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تاریخ خاص خاص واقعات کو لیتی ہے اور شاعری عام واقعات کو بلکہ یہ بھی تھا کہ شاعری نام واقعات کے بجائے فضا کی ترجمانی کرتی ہے اگر ایسا نہ ہو کہ تاریخی واقعات شاعری کے دائرے سے یکسر خارج ہو جائیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ اس پر شعریات کے کسی ماہر اور ناقد نے اصرار نہیں کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکالنا چاہیے کہ شاعر تاریخی واقعات کے بیان میں تاریخ سے بالکل بے نیاز ہو جائے یا انھیں توڑ مروڑ کر بیان کرے۔ ہرگز نہیں۔ بس یہ ہے کہ وہ تاریخ سے انحراف نہ کرتے ہوئے بھی مورخ نہیں ہے، شاعر ہے۔ مراثی انیس کے مطالعہ کے وقت اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اس ضمن میں ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ابھی اس صورت حال کا جائزہ لیا جا چکا ہے کہ میر انیس نے عربی کرداروں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ خالص عربی نہیں معلوم ہوتے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ نہ صرف کردار نگاری میں بلکہ رسم و رواج اور بعض دوسرے معاملات کے بیان میں انھوں نے ہندوستانیت کو راہ دی ہے۔ مثلاً حضرت قاسم کی شادی کے ذکر کے سلسلے میں بعض ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے شادی کے ایسے لوازم پر روشنی پڑتی ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان سے ہے۔ یا مشعل سے مانگ بھرنے اور دلہن کو تاروں کی چھاؤں میں بیاہ کرانے کا ذکر ہے، جس سے ہندوستانی فضا پیدا ہوتی ہے۔ یقیناً یہ باتیں ایسی ہیں، جن سے ہندوستانی نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے لیکن کیا حقیقتاً ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میر انیس نے اس چھوٹی سی بات کا بھی خیال نہیں کیا کہ عرب اور ہندوستان میں شادی بیاہ کی رسمیں مختلف ہوتی ہیں؟ یہاں میں پھر یہی بات عرض کروں گا کہ ان سے نہ تو حقیقت مجروح ہوتی ہے نہ کسی قابل اعتراض غلطی کا ارتکاب ہوتا ہے۔ یہاں بھی مرثیہ نگار کا مقصد واقعہ کی حقیقی شکل کو پیش کرنا نہیں، بلکہ اس فضا کا پیدا کرنا ہے، جو اس واقعہ کی طرف منسوب کی جا سکے۔ چونکہ میر انیس کا مقصد ایک مجمع کو متاثر کرنا اور ان کے جذبات الم کو برانگیختہ کرنا بھی تھا اس لیے انھوں نے ایسے ہی اشاروں اور استعاروں سے کام لیا، جو ان کے سامعین کو متاثر کر سکتے تھے۔ واقعہ کی نوعیت میں

ہیں ہوئی ہو تو بلند بیان میں تقریر ہوا ہو۔ یہ بات بحث
ہے کہ حضرت قاسمؑ کی شادی ہوئی بھی یا نہیں۔ مرثیہ
عام ہدایت سے قاسمؑ شادی ہے اور بنا دلہن کی انگ
نے کے لیے اس واقعہ کو بھی شگفتہ آمیزی کے ساتھ بیان
جہاں کہیں بھی ایسے مواقع آئے ہیں شاعر واقعہ کو واقعہ
ت سے پیش کرنے کے بجائے اس کے جذباتی پہلو پر زور
، تاکہ اس کا ادبی اور شاعرانہ مقصد پورا ہو۔ میر انیسؔ
پسند دستانی رسموں کا ذکر کیا ہے تو وہ اسی کا بھی
ہے۔

یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ایک اور ٹریجیڈی رکھتے
ا مرثیہ اعلیٰ شاعری کی تمام خصوصیات اپنے اندر رکھتا
ن دونوں اصنافِ ادب میں جذبات کی تنظیم اور تہذیبِ اخلاق
زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو عالمی ادب میں
لی پایہ کی نظمیں ہیں، وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انسانی زندگی
ے پہلوؤں اور اعلیٰ مقاصد کو بلند کرتی ہیں، جو سماجی اور
ا بہتری میں معین ہوں۔ یونانیوں کے یہاں شعر محض کا
ور نہ تھا۔ ان کے منظومات اور ڈرامے دیوتاؤں، وطن اور
ں کی مذمت کے لئے وقف تھے۔ دوسرے ملکوں کی اہم ترین
بھی اسی مقصد کو پورا کرتی تھیں۔ مرثیہ اس خصوصیت میں
دسری نظم سے پیچھے نہیں۔ یہاں وعظ و پند، نصیحت اور
ی ضرورت نہیں۔ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے
ے جو اعلیٰ اخلاقی نمونے پیش کئے ہیں ان کا ڈرامائی اثر خود
رلیتا ہے۔ یہاں یہ بات تفصیل سے نہیں پیش کی جا سکتی
اکربلا میں اخلاق کی کون سی اعلیٰ قدریں پوشیدہ تھیں۔ ر
یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاید ہی دنیا کا کوئی ایک واقعہ
وقت زندگی کے اتنے اہم پہلوؤں کو پیش کر سکے اور چند
ے، عورتوں اور بچوں کے عمل سے ان کی ناقابلِ فراموش
ت گری ہوئی ہو۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ اخلاق
اخلاقی کا جو تصادم کربلا میں ہوا۔ اس نے زندگی

کے مثبت پہلوؤں کو اور زیادہ روشنی میں پیش کر دیا حقیقت
یہ ہے کہ مرثیہ نگار اور جن میں میر انیسؔ بھی شامل ہیں، واقعۂ
کربلا کو اسلام کی مجموعی تاریخ کے چوکھٹے میں رکھ کر نہیں
دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں دور تک اسباب و نتائج کے
رشتوں کو بھی نہیں دیکھ رہی تھیں، وہ شعوری طور پر حسینی پیغام کی
اشاعت بھی نہیں کر رہے تھے۔ اور نہ زندگی کے اس
نصب العین کی فلسفیانہ توجیہہ کر رہے تھے، جس کے لیے
امام حسینؑ نے قربانی دی تھی۔ لیکن پھر بھی چونکہ اس معرکے
نے زندگی اور موت، حق اور باطل، نیکی اور بدی کی متضاد
قدروں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا تھا اور ان کا
مظاہرہ فیصلہ کن انداز میں ہو گیا تھا۔ اس لئے اگر انھوں نے
واقعات کو فلسفیانہ اور فکری پس منظر کے بغیر بھی پیش کر دیا
تو اس میں وہ سارے اخلاقی پہلو آ گئے، جن سے ایسی کش مکش
کے موقع پر انسان کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر میر انیسؔ کے مرثیوں
سے ہر موقع کی مثالیں پیش کی جائیں تو ایک دفتر تیار
ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا ہے کہ میر انیسؔ نے وعظ و تلقین کے دفتر کھولے
بغیر افرادِ مرثیہ کے عمل سے اخلاقیات کا ایک لازوال خزانہ
پیش کر دیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں، اور خاص مرثیوں کی تمہید
میں زندگی کے عبرت ناک پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے واعظانہ
اور ناصحانہ رنگ بھی اختیار کر لیا ہے۔ اگر ہم مرثیہ کے موضوع
کو پیش نگاہ رکھیں تو یہ بات کچھ زیادہ قابلِ گرفت نہیں کہی
جا سکتی۔ تاہم مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ حصے مرثیے کے
بہترین حصے نہیں ہیں۔ اصل اخلاقی کشش ان حصوں میں ہے
جہاں اپنے مقصد کی صداقت، برتری اور گہرائی پر کامل یقین
رکھتے ہوئے بچے، جوان، بوڑھے، عورت اور مرد سب موت کا
خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں، تاکہ امام حسینؑ کے مقصد کو تقویت پہنچے
اس طرح مرثیہ (وہ مختصر مرثیے نہیں، جو محض اظہارِ عقیدت
کے لیے یا صرف رونے رلانے کے لیے لکھے جاتے رہے ہیں)

شاعری کے اس اعلیٰ مقصد کو بھی پورا کرتا ہے، جو اس کے اندر پوشیدہ ہے۔

میر انیسؔ کی شاعری کا وہ پہلو جس میں وہ تمام کے بہت کم شاعروں کے مد مقابل قرار دیے جا سکتے تھے، وہ واقعات کی نفسیات سے واقفیت اور اسی کی مصوری ہے اس میں مکالماتی شاعری، جذبات نگاری، اجتماعی مواقع کی ہل چل اور ذہنی مرقع کشی اور انفرادی کشمکش کے مناظر اور ان کی مصوری تمام چیزیں شامل ہیں۔ انھیں جگہوں پر ان کے کمالِ فن کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ واقعۂ کربلا کی تفصیلات سے واقفیت رکھنے والے اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ واقعات کی پیچیدگی، عقیدہ کی پابندیاں، جوشِ شجاعت، امام کی اطاعت، قربانی کی خواہش، مقصد کی برتری کا احساس، آخر وقت تک گمراہوں کی اصلاح کی کوشش، محبت اور تعلقات کے مختلف مدارج اور ایسے ہی دوسرے عناصر نے یکجا ہو کر لاتعداد جذباتی پہلو پیدا کر دیے تھے، جنھیں سادہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میر انیسؔ کی شاعری کے اس پہلو کا مطالعہ سنسکرت اور پراکرت کے قدیم تنقیدی تصورات کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے تو اس کا حسن پوری طرح نمایاں ہوگا۔ ہندوستان کے قدیم علمائے ادب نے انسانی جذبات کو بنیادی طور سے نو رسوں میں تقسیم کیا تھا، جن میں محبت، نفرت، شجاعت، سکون، حیرت، خوف، غصہ، مسرت اور غم شامل ہیں۔ پھر ان کے امتزاج اور مدارج سے مختلف شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان جذبات کا بیان سادہ ہوگا اگر صرف ان کی شدت اور خفت کا تذکرہ مقصود ہو۔ لیکن اگر کہیں خوف و حیرت اور نفرت کے جذبات مل جائیں، غصہ اور شجاعت ایک ہو جائیں، محبت سے غم کی آمیزش ہو جائے تو پھر ان کو کیمیاوی انداز میں محلول کر کے فن کے سانچے میں ڈھالنا، الفاظ میں قید کرنا آسان نہیں رہ جاتا۔ مرثیوں میں اس کے لاتعداد مواقع آتے ہیں اور میر انیسؔ اکثر نہایت کامیابی سے ان منازل سے گزر جاتے ہیں۔ بلکہ بعض مقامات کے لیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں جتنی زیادہ پیچیدگی اور شدت ہے، وہیں انھیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ جہاں بہت سے متصادم اور متضاد جذبات کی کشمکش ہے، وہاں انھوں نے تمام پہلو مدِ نظر رکھتے ہوئے بڑی کامیابی سے مرقع کشی کر کے پیش کیا۔ مثالیں حسب ذیل مراثی میں بڑی آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) جب کربلا میں داخلۂ شاہِ دیں ہوا
(۲) نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری
(۳) بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حُر
(۴) فرزندِ پیمبر کا مدینے سے سفر ہے
(۵) جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے
(۶) پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح
(۷) جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج
(۸) جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی
(۹) جب رن میں سربلند علی کا علم ہوا
(۱۰) کیا غازیانِ فوجِ خدا نام کر گئے
(۱۱) جب خاتمہ بخیر ہوا فوجِ شاہ کا
(۱۲) یہ زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا

یہ چند مرثیوں کا تذکرہ ہے۔ دوسرے مراثی میں بھی زیر بحث کی اچھی مثالیں نظر آتی ہیں۔ اشارے کے طور پر چند مواقع کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔ امام حسینؑ مدینہ رخصت ہو رہے ہیں، مستقبل کا پتہ نہیں۔ مدینہ میں ان کا مرتبہ ہے اس کے پیش نظر ان کے ہم وطنوں، عزیزوں، جاں نثاروں، ساتھ جانے والوں اور نہ جانے والوں کے (جذبات)۔ حضرت مسلمؑ کے کم سن بچوں کی شہادت کا بیان۔ راستہ کی پریشانیاں، سفر کی صعوبتیں۔ حُر کی فوج کا راستہ روک(نا)، مستقبل کی جھلک۔ بچوں کی پیاس پر دشمن فوج کی (پیاس) کو ترجیح دینا۔ کربلا میں آمد، دریا کے کنارے قیام کرنے پر حُر کی زندگی میں کشمکش اور فیصلہ کی بات ...

کے جذبات اور ماں سے گفتگو وغیرہ وغیرہ۔ ان مواقع کو ایک
سے زیادہ جگہوں پر میرانیسؔ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ محض ان
کی قدرت بیان کا نہیں، نفسِ انسانی کے علم کا بھی قائل
ہونا پڑتا ہے۔

اس مختصر مقدمہ میں منظر نگاری، رزم آرائی، گھوڑے
اور تلوار وغیرہ کی تعریف، سراپا کا بیان اور ساقی نامہ وغیرہ کی خوبیوں
اور خامیوں کا تذکرہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ زبان و بیان کی فنی
خصوصیات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق بہت
زیادہ اختلاف رائے نہیں ہے۔ لیکن اس بات کی طرف متوجہ
کرنا البتہ ضروری ہے کہ ہر فن پارے کو ہم دو حیثیتوں سے دیکھتے
ہیں۔ ایک اس کی ظاہری ساخت اور اس کے اجزائے ترکیبی
کے لحاظ سے دوسرے اندرونی وحدت کے نقطۂ نظر سے، جو
شروع سے آخر تک موضوع کے تانے بانے میں رنگ بھرتی رہتی
ہے۔ انھیں کی مکمل ہم آہنگی سے شاعری میں عظمت اور تاثیر
کے جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ اب جہاں تک مراثی انیسؔ کی ظاہری
ساخت کا تعلق ہے۔ ان میں یکسانیت نہ ہونے کے باوجود
تمہید یا چہرہ، رخصت، آمد اور سراپا، رجز، جنگ شہادت
اور بین کی ترتیب قائم رہتی ہے۔ کوئی مرثیہ ایسا بھی
ہو سکتا ہے کہ وہ محض شہادت اور بین پر مبنی ہو اور کوئی ایسا
جس میں شہادت کے بعد کے واقعات بیان کئے گئے ہوں۔
یہ ضروری نہیں کہ ہر مرثیہ میں یہ تمام اجزا پائے جائیں
اس ظاہری تقسیم کا تعلق جیسا کہ سرسری نظر سے بھی
دیکھنے پر ظاہر ہوگا۔ موضوع مرثیہ نہیں ہے۔ یہ ایک اتفاقی
ترتیب ہے، جس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ موضوع بھی عظیم اور
اہم ہے یا نہیں۔ ایک دوسری صورت غور کرنے کی وہی ہو سکتی
ہے جو ہم ناول یا ڈرامے پر غور کرتے وقت کام میں لا سکتے ہیں
یعنی ترتیب واقعات (ابتدا، عروج اور انتہا)، کردار،
کشمکش اور مقصد کی خصوصیات کی روشنی میں شاعر
کی کامیابی اور ناکامی کا اندازہ یہاں واقعہ کی ظاہری

ترتیب اور اندرونی وحدت دونوں پر بیک وقت غور کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال یہ نقاد کا کام ہے کہ وہ مراثی میرانیسؔ کے مطالعہ میں جو طریق کار چاہے استعمال کرے۔ اسے دیکھنا تو یہی ہوگا کہ جس قسم کا موضوع ہے۔ اس کی مناسبت شاعر کے احساس کے سے ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں شاید یہ کہنا نامناسب نہ ہو کہ واقعہ کی عظمت اور موضوع کی اہمیت کا احساس نہ ہوتا تو میرانیسؔ کے احساس فن کو چار چاند نہ لگتے۔ اچھی شاعری سے ایک نظم اچھی بن سکتی ہے۔ لیکن اسے اعلیٰ بنانے کے لیے ایک عظیم واقعہ ہونا چاہئے، جو انسانی احساس کو جھنجھوڑ سکے اور جس کی مدد سے جذبات کے رشتوں میں بہتر تنظیم پیدا کی جا سکے۔ مختلف جہتوں سے واقعہ کربلا اس کے لیے بہت موزوں اور مناسب تھا اور میرانیسؔ کے فنی شعور نے جس پر عربی فارسی اور اردو شاعری کی بہترین روایات کا پرتو پڑ رہا تھا، اس سے بہترین کام لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس زوال پذیر سماجی ماحول میں میرانیسؔ کی شاعری پروان چڑھی۔ اس میں عقیدے کے سہارے کے سہارے کے طرح کی رزمیہ، اخلاقی اور سنجیدہ نظموں کا تصور مشکل معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ میرانیسؔ کی شاعری میں بھی بعض مقامات پر صناعی کی بے جا کوششوں میں اس دور کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ میرانیسؔ کے سوانح حیات پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی سیرت میں ایسی خصوصیتیں اکٹھی ہو گئی تھیں، جو انھیں اس قسم کی اخلاقی اور رزمیہ شاعری کے لیے موزوں بناتی تھیں۔ ان کی تعلیم کے متعلق ہمارے پاس تفصیلی معلومات نہیں ہیں لیکن اندرونی شہادتوں پر نظر رکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عربی فارسی کی صرف درسی کتابیں نہیں پڑھی تھیں، بلکہ قرآن اور حدیث، منطق اور عروض، بیان و بدیع کا مطالعہ اس طرح کیا تھا کہ ان سے اپنے موضوع کے سلسلے میں واقف کارانہ انداز میں کام لے سکتے تھے۔ عربی فارسی، محاورات، تلمیحات، اقوال

سید احتشام مرحوم :-

دیباچہ

"ویرانے" کیوں ؟

ویرانے اس لیے کہ یہ افسانے تعمیر کا کوئی مخصوص تصور پیش نہیں کرتے، ان میں چند ٹوٹی پھوٹی دیواریں ہیں. کچھ ویران محل، کچھ گرے پڑے ستون ہیں. کچھ بوسیدہ چھتیں! اس لیے انھیں ویرانے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے! ان کی بے ربطی اور تنظیم کے فقدان میں کوئی حسن ہو تو ہو. کسی مخصوص تکنیک کی؟ کوئی حسن نہیں معلوم ہوتا. اس میں اس ویران تمدن کی پرچھائیاں ہیں. جس سے تمھارے جذبات میں تعمیر کا خیال پیدا ہوتا ہے اور بے پناہ تخریب کا بھی ـــ ویرانی اور بربادی کی تخریب سیاسی اور معاشی تخریب، ذہنی اور جذباتی تخریب ویرانے کو اور ویرانے بڑھانا کتنا آسان ہے. ویران کو ویران بنانا کتنا سہل ہے. لیکن یہ کام کبھی کسی طرح مکمل نہیں ہو چکتا اور تعمیر دور ہوتی چلی جاتی ہے. بندھے ہوئے ہاتھوں سے تخریب عمل میں آرہی ہے. تعمیر کیوں عمل میں نہیں آتی! ـــ لیکن کیا تخریب اور تعمیر ایک ہی عمل کے دو پہلو نہیں ہیں؟

ان افسانوں کا مصنف افسانہ نگار سے زیادہ نقاد ہے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنی افسانہ نگاری کو تنقید نگاری پر قربان کردیا اس سے اسے کوئی فائدہ حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو. ایک بات ضروری ہوئی کہ اس نے خود نقادی میں کسی طرح کی کمی نہیں کی ہے. اس کی فنی صلاحیتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوں، اس کی تخیل اچھے فن کار کی نہ ہو، اس کے کردار بے جان ہوں، اس کے اشارے مبہم ہوں. اور اس کی زندگی کی ترجمانی ناقص ہو، پھر بھی اپنی بساط بھر اس نے اس کی کوشش ضرور کی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی وہ جھلک تھوڑی بہت ضرور دکھاسکے جسے اس نے دیکھا اور سمجھا ہے. اس لیے شاید خلوص سے پڑھنے والوں کو ان افسانوں میں خلوص اور تاثیر دکھائی دے اور یہی احساس اس کی مسرت کے لیے کم نہیں ہے.

اردو میں افسانہ نگاری نے جتنی ترقی کی ہے اس کا احساس مجھے کسی سے کم نہیں. خصوصیت اور مقدار دونوں میں ہمارے قدم بڑھ رہے ہیں اور یکسانی اور یک رنگی نہیں ہے. موضوعات میں تنوع ہے، طرز بیان میں جدت ہے، نیرنگیاں ہیں. ہمارے لکھنے والے ایک دوسرے کے نقال نہیں معلوم ہوتے. وہ اپنے علم اپنے شعور اور اپنے تجربے کی مدد سے اپنے افسانوں کے سنہرے جال بنتے ہیں اور سیدھی سادھی اصلاح پسندی اور حقیقت نگاری سے گزر کر زندگی کی پیچیدہ حقیقت کو سمجھنے لگے ہوئے ہیں. انھیں پڑھ کر انسانی حیات پُراسرار اور رنگین معلوم ہونے لگتی ہے اور یہ احساس پیدا ہوتا ہے لکھنے والوں نے کہانیوں میں حیاتیات، نفسیات، معاشیات اور تمام دوسرے رائج علوم سے مدد لی ہے. ان کی کہانیاں سپاٹ، اور بے رنگ نہیں ہیں، پلاٹ نہ ہونے کے باوجود پیچیدہ ہیں. سادہ

...جود پیدا کار ہیں۔ میری کہانیوں میں شاید ان چیزوں کی
...ملے۔ لیکن مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میں اردو کے
...ز نویسوں کے دور میں پیدا ہوا ہوں جس میں معیار کی
...وجہ سے کھوٹے سکے اور معمولی قصے کہانیوں کی قدر
...لیے جب کوئی فرض شناس اور باشعور افسانہ نگار
...جائے گا تو اس بلند معیار کی وجہ سے ضرور کوئی معقول
...ہے گا اسی چیز نے افسانہ لکھتے وقت میرے قدم پکڑ لیے
...نے اپنی تنقید اس سے زیادہ سخت کی ہے جتنی میں
...سانہ نگاروں کی کرتا ہوں ــ میں نے افسانہ لکھتے
چند باتوں کا خیال رکھا ہے وہ کیوں نہ کہہ دوں۔
...ادہ تر ایسے افسانے لکھے ہیں جنکے لکھنے کے لیے
...دل میں کوئی تڑپ پائی ہے۔ بعض افسانوں
...تاثر میرے ذہن میں کئی کئی سال تک گھومتا رہا
میں نے کسی وجہ سے ۔ ۔ ۔ اسے افسانے کی
...نہیں ڈھالا ہے۔ لیکن کبھی معمولی سی تحریک نے مجھ سے
...کے گرد افسانے کا خاکہ کھڑا کرا دیا ہے۔ میں نے
...رکھنے کے لیے اپنی بات کو کم سے کم جگہ میں کہنے کی
...لی ہے۔ شاید یہ ایک طرح کا "اعتراف شکست"
...کیونکہ میں نے ایسے افسانے بھی پڑھے ہیں جن کی
...جن کی بے محل باتیں بعض اوقات بار ہونے لگتی
...سب کچھ مرکزی خیال سے گندھا ہوا معلوم ہوتا
...صرف اتنی باتیں کہی ہیں جتنی اس افسانہ کیلئے ضروری تھیں
...کی اصلیت کا منکر نہیں ہوں لیکن جانتا ہوں کہ داخلی حقیقتیں خارجی حقیقتیں
...ہوتی ہیں اور کبھی نتیجہ، اس لیے داخلی حقیقتوں کا
...یان کہ ان کا تعلق خارجی حقیقتوں سے نہ ظاہر ہو میرے
...حقیقت نگاری نہیں ہے۔ حقیقت ایک پیچیدہ عمل
...لیے اسے حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، عشق و
...معی اور سیاسی مسائل، عمل اور خیال سب ایک
...گتھے ہوئے ہیں اور میں نے اپنے بیشتر افسانوں میں

میں اس کا خیال رکھا ہے۔ خبر نہیں اس میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں۔ میں نے کہانی لکھتے وقت اس دل کشی کا ضرور خیال رکھا ہے جو کہانی کے لیے ضروری ہے۔ یہ دلکشی کبھی پلاٹ سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی انداز بیان سے اور کبھی صرف موضوع کے انتخاب سے ـــــ اس کا فیصلہ بھی پڑھنے والے ہی کریں گے۔ کیونکہ میں تو فیصلہ کر چکا اگر میں نے ان میں دل کشی نہ پائی ہوتی تو انھیں شائع ہی نہ کراتا۔

لیکن اس منزل تک میں کس طرح پہنچا ہوں یہ بھی بتا دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس مجموعہ میں میرے بعض ایسے افسانے بھی شامل ہیں جنہیں لکھتے وقت میں اُن باتوں سے اچھی طرح واقف نہ تھا جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔

سنہ ۱۹۳۰ء کی گرمیوں میں جب میں ہائی اسکول کا امتحان دے کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا تو وقت گذاری کے طور پر کوئی افسانہ یا ناول لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ناول تو غیر ارادہ ہی کی منزل میں ختم ہو گیا لیکن دو یا تین افسانے میں نے ضرور لکھے۔ اس زمانہ میں مجھ پر نیاز فتحپوری کی طرز نگارش کا اثر تھا۔ اس لیے ساری طاقت عبارت آرائی پر صرف ہوتی تھی اور افسانہ بے جان ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ معمولی پڑھے لکھے شخص کے بس کی یہ بات نہیں کہ وہ دونوں باتوں پر نظر رکھے۔ افسانے حسب معمول رومانی تھے۔ یاد نہیں ہیرو اور ہیروئن کو کس طرح ملایا تھا، دونوں نے خودکشی کی تھی یا ایک نے، لیکن ایسی ہی کوئی بات ضرور رہی ہوگی۔ ان افسانوں نے کسی رسالہ کا منہ نہیں دیکھا۔ چند سال گذر گئے اور میں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ لیکن سنہ ۱۹۳۴ء میں جب میرا شعور حکمت اور جنون کے درمیان فیصلہ کرنے میں جنون کی طرف جھک جاتا تھا۔ میں نے باقاعدہ افسانہ نگاری شروع کر دی، اس وقت میرا خیال تھا کہ ہر واقعہ افسانہ بن سکتا ہے اس لیے اگر کوئی واقعہ اسی شکل میں جیسے وہ ہوا ہے، لکھ دیا جائے تو پھر افسانہ نگار کے لیے کوئی اور بات باقی نہیں رہ جاتی۔ اسے میں حقیقت نگاری کی ابتدائی شکل سے تعبیر کرتا ہوں، اور

افسانہ یا شاعری کے لیے بے ناکافی سمجھتا ہوں مگر اُس زمانے میں یہی بہت تھا۔ رسالے ایسے ہی افسانے سے بھرے ہوتے تھے صرف پریم چند اور دوسرے افسانہ نویس تھے۔ جن کی اصلاح پسندی، مقامی رنگ اور بلند انسانیت کے تصوّر نے رومانی افسانوں میں بھی نفسیات اور معاشرت کی آمیزش کر دی تھی۔

میں نے متعدد افسانے لکھے، کچھ شائع ہوئے کچھ شائع نہ ہو سکے، بعض پسند کیے گئے بعض ناپسند، کچھ لوگوں نے دل بڑھائے اور کچھ نے ہمت شکنی کی۔ میں ہر طرح کے مضامین لکھ رہا تھا، ڈرامے اور نظمیں بھی لکھتا تھا۔ اس لیے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اگر میں افسانے لکھنا چھوڑ بھی دوں تو دوسری چیزیں مجھے زندہ رکھنے کے لیے بہت ہیں۔ یہ احساس، مجھے اب اندازہ ہوتا ہے میرے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوتا۔ کچھ دنوں کے لیے میں نے افسانوں سے اپنی توجہ ہٹالی۔ ایم۔ اے، میں پڑھتا تھا، زیادہ وقت نقد و تنقید میں صرف ہوتا۔ اس لیے ذہن کو کچھ اسی سے انس پیدا ہو گیا اور اب جس وقت میں اپنی اس عہد کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتا ہوں تو وہ صرف چند اثرات کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۳۶ء کے قریب افسانہ نگاری کے آسمان پر نئے ستارے طلوع ہونے لگے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ہندوستان میں شروع ہو چکی تھی، میرا بھی اس سے تعلق تھا نئے افسانے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب نئے راستے دکھائی دے رہے ہیں جن پر چلنا شاید نقالی اور مجہول قسم کی اثر پذیری سے بچا سکے۔ اس لیے پھر افسانہ نگاری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس زمانے کے افسانوں میں سے صرف "دوسرا نکاح" ہے جس سے بہت سے لوگوں کو تکلیف پہنچی اور البتہ بے لوگ خوش ہوئے۔ اسی زمانے میں ایک شخص سے شناسائی ہو گئی، اس نے ایک دارالاشاعت قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ میرے افسانوں کے مجموعے کا اعلان ہوا۔ اور نام "زنجیریں" قرار پایا۔ چند پرانے افسانے کتابت کے لیے دیے اور دیوانوں کی طرح نئے افسانے لکھنے شروع کیے۔ کئی افسانے لکھ کر کاتب کو دے دیے، یکایک کچھ ایسا ہوا کہ میرے نئے دوست کو الٰہ آباد چھوڑنا پڑا۔ دارالاشاعت کا قصہ ختم ہو گیا اور یہی نہیں میرے کئی افسانے جنہیں واقعی میں نے بڑی محنت سے لکھا تھا موصوف سے ضائع ہو گئے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی لیکن اور کئی واقعات ایسے اکٹھے ہو گئے کہ پھر کچھ دنوں کے لیے افسانہ نویسی ترک ہو گئی۔

جب اچھے اچھے افسانے پڑھنے کو ملتے ہوں تو "کم اچھے" افسانے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے زیادہ افسانے نہیں لکھے ہیں۔ میرا زیادہ وقت تنقیدی مضامین میں لگ جاتا ہے۔ اس لیے افسانہ لکھنے کے لیے جس سکون اور دماغی تازگی کی ضرورت ہے وہ کم میسر آتی ہے تاہم جب کبھی میرے پاس کوئی بات لکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ اور وہ سوا افسانہ کے اور کسی شکل میں نہیں لکھی جا سکتی تو میں افسانہ لکھتا ہوں۔

شاید کوئی یہ پوچھے کہ ان افسانوں کو مجموعہ کی شکل میں لانے ہی کی کیا ضرورت تھی ہر چیز جو لکھی جائے ضروری نہیں کہ اسے شائع بھی کیا جائے۔ یہ سوال یقیناً پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ہر سوال کا کوئی نہ کوئی جواب ہوتا ہی ہے۔ چاہے وہ قابل قبول ہو یا نہ ہو۔ جہاں تک میری ذاتی خواہش کا تعلق ہے میں چاہتا تو یہ تھا کہ پہلے میرا کوئی معقول تنقیدی مقالہ شائع ہوتا اور اس کے بعد افسانوں یا تنقیدی مضامین کا مجموعہ نکلتا اس طرح شاید میری پہلی سنجیدہ تصنیف کے سایہ میں دوسری تصنیف کی پذیرائی بھی ہو جاتی۔ لیکن میری کاہلی نے اس کی نوبت اب تک نہیں آنے دی۔ کوئی کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ سب کچھ ایک سلسلے میں کہہ دوں جو مجھے کہنا ہے لیکن نہیں کہہ سکتا ہے جنگ اور ہندوستان کے سیاسی جمود نے مجھ میں ایک طرح کا احساس

پیدا کر دیا ہے اور اگرچہ ہر وقت اس سے برسرِپیکار
ہوں۔ لیکن مجھے اس کا اعتراف ہے کہ وہ احساس کہیں
ہوں کہ بے عملی کی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اس
کی نفسیاتی توجیہ بھی کر لیتا ہوں۔ لیکن ضمیر مجھے مجرم
دیتا ہے۔ آپ کو میری اس روحانی بیماری سے کیا واسطہ!
یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ مجموعہ شائع کرنے کی کیا ضرورت
اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ دن ہوئے جب پنجاب کے
ناشر نے ایک ادارۂ اشاعت کی بنیاد ڈالی اس
کسی کمزور جذباتی لمحے میں میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ میں
کو کچھ نہ کوئی کتاب اشاعت کے لیے ضرور دوں گا۔
کے عہد کا وقت آگیا اور میرے پاس کوئی تصنیف اشاعت
کے لیے موجود نہیں، میرا چھوٹا بھائی اقتدار نہ جانے کب سے
غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ پڑھنے والے میرے ایک ایک
کے لیے بے چین ہیں اور میں اپنے افسانوں سے
دانی برت کر دنیا سے ظلم کر رہا ہوں میں جانتا ہوں کہ اس کا یہ

خیال حقیقت سے زیادہ بھائی کی اندھی محبت پر مبنی ہے لیکن
اس کو مانے بغیر چارہ بھی نہیں۔ یہی ایک راستہ ہے جس پر
چل کر میں ادارۂ اشاعت سے اپنا وعدہ بھی پورا کر سکتا
ہوں اور اسے بھی مسرور بنا سکتا ہوں۔ اگر اقتدار نے
میری ناراضگی کا خیال کئے بغیر اپنا اصرار اسی طرح جاری
رکھا تو یقیناً میں بہت جلد اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ
پیش کر سکوں گا۔

یہ مجموعہ بعض وجوہ کی بناء پر پنجاب سے شائع نہ کیا
جا سکا۔ جس کے لیے مجھے نہ ملال ہے نہ شکایت۔ بلکہ اب اس کی
خوشی ہے کہ میرے دوست شبیر احمد صاحب ہندوستانی
پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے شائع کر رہے ہیں۔ یہ مسرت
شاید اس لیے حاصل ہے کہ الہ آباد ہی میری پہلی ادبی
جولان گاہ ہے۔

بارود خانہ۔ لکھنؤ
(۱۳ر ستمبر ۴۳ء)

پروفیسر سید احتشام حسین

کھنڈر

شہر سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر ایک بہت بڑی عمارت کا ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ غریب کے جھونپڑے کی طرح ویران اور مزدور کی جیب کی طرح خالی، مگر جیسے غریب کے جھونپڑے میں کبھی کبھی زندگی کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور مزدور کی جیب میں چند پیسے آجاتے ہیں اسی طرح اس کھنڈر میں بھی بوڑھا فقیر رات کاٹنے کے لئے آجاتا تھا، وہی اس کا تنہا مالک تھا۔ شاید کسی زمانہ میں اس عمارت کی ملکیت کے لیے جھگڑے ہوئے ہوں۔ لیکن اب تو فقیر اس پر پوری طرح قابض تھا۔ کبھی کبھی وہ سیاہ کتا بھی آتا تھا۔ جو بھکاری کی جمع کی ہوئی چیزوں میں شریک ہو جاتا تھا۔

قصے تو بہت سے مشہور تھے۔ لیکن ٹھیک پتہ نہ تھا کہ یہ کس عمارت کا کھنڈر ہے۔ بوڑھے اور جوان اس کے متعلق کم باتیں کرتے تھے۔ لیکن بچے ہر زمانے میں یہ جانتے کہ اس میں بھوت رہتے ہیں، اس پر جنوں کا قبضہ ہے، اسی لئے کوئی اس کے قریب نہ جاتا تھا، جس راستہ سے گزر کر وہ کھنڈر ملتا تھا۔ وہ بھی سنسان تھا۔ چرواہوں کے لڑکے اپنے جانوروں کو ادھر نہ جانے دیتے تھے اور بچے ادھر کھیلنے کے لیے نہ نکلتے تھے لیکن وہ بوڑھا بھکاری دن بھر کی محنت کے بعد اسے رات میں ضرور آباد کرتا۔ کم لوگوں نے اسے اس کھنڈر سے نکلتے یا اس کے اندر جاتے دیکھا تھا۔ اور اگر کبھی صبح کے اندھیرے میں یا رات کی تاریکی میں دیکھا بھی تو جن یا بھوت سمجھا۔

کھنڈر کی دیواروں پر گھاس اُگی ہوئی تھی، زیادہ حصّہ گر چکا تھا، اونچی نیچی زمین ہر برسات میں اپنی شکل بدلا کرتی تھی۔ لیکن اس عظیم الشان عمارت کا وہ گوشہ جس میں بھکاری کی راتیں بسر ہوتی تھیں ایک ہی حالت پر قائم تھا۔ تقریباً دس بارہ فٹ لمبی چوڑی چھت چند بوسیدہ لکڑیوں پر رُکی ہوئی تھی۔ موسم کے لحاظ سے بعض مہینوں میں سورج کی روشنی اور چاندنی کی کرنیں اس کے اندر تک پہونچ جایا کرتی تھیں۔ ویسے بھکاری کو کبھی چراغ جلانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ خبر نہیں وہ کب سے اس کھنڈر میں رہتا تھا۔ شاید اپنی زندگی کا زیادہ حصّہ اس نے یہیں بسر کیا ہو۔ ممکن ہے کبھی انھیں تاریکیوں میں اس کی جوانی کی راتیں رنگین بنی ہوں۔ کون جانتا ہے۔؟ مگر اب وہ بالکل بوڑھا تھا۔ مرنے کے قریب۔

اور پاس ہی ایک برگد کا سوکھا درخت بھی اس کھنڈر کی طرح ویران اور خشک تھا، اس کی ایک اونچی شاخ پر ایک بڑا گدھ بیٹھا ہر وقت اونگھا کرتا تھا، دوسرے تیسرے دن وہ کہیں جاتا اور پھر اسی درخت پر واپس آجاتا، وہ بھی اس بھکاری کی طرح اکیلا تھا۔ کھنڈر، بھکاری، درخت اور گدھ، جیسے یہ سب ایک ہی سلسلہ کی کڑی معلوم ہوتے تھے، سب ضروری تھے، اگر وہ کھنڈر نہ ہوتا تو بھکاری کہاں جاتا، اگر بھکاری نہ ہوتا تو پھر اس کھنڈر کی ضرورت

ہی کیا تھی، اگر درخت نہ ہوتا تو اس کھنڈر کی ویرانی پوری طرح محسوس نہ ہوتی، اور پھر گدھ کہیں اور ہوتا اور اگر گدھ نہ ہوتا تو یہ درخت بیکار رہتا. یقیناً ان سب میں فرسودگی کی جھلک کے باوجود کوئی کہانی تھی جو کہے جانے کی محتاج تھی۔

کیا اس کھنڈر میں جوان مرد اور حسین و جمیل عورتیں کبھی نہ پھرتی رہی ہوں گی؟ کیا اس سوکھے درخت میں کبھی پتیاں اور پھل نہ رہے ہوں گے کہ اس مُردار خوار گدھ کے علاوہ دوسری چڑیاں بھی اپنا آشیانہ اس میں بنائیں——

کیا معلوم تھا شاید رہا ہو مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو اس کھنڈر میں ایک بھکاری رہتا تھا جو دن بھر دو ایک ٹکڑے روٹی کے لئے مارا مارا پھرتا اور رات کو آکر اس میں آرام کرتا، اور اس درخت پر ایک گدھ تھا جو مُردہ جانوروں کے انتظار میں بیٹھا اونگھا کرتا۔

جاڑوں کی ٹھنڈی ہواؤں سے بچنے کے لئے اور بارشات سے محفوظ رہنے کے لئے بھکاری اس ٹوٹی پھوٹی چھت کے نیچے چلا جاتا اور گرمی کی نکھری ہوئی چاندنی میں چھت کے باہر نکل کر سوتا مگر گدھ کو ہمیشہ ایک ہی جگہ بیٹھا ہوا دیکھا گیا، دونوں ایک دوسرے کی طرح بھی تھے اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔

بھکاری بوڑھا اور کمزور ہوتا چلا گیا، اب کوئی کوئی دن ایسا بھی گزر جاتا تھا کہ وہ باہر نہ نکلتا، اگر پچھلے دن کی بچی ہوئی روٹیاں ہوتیں تو کھا لیتا ورنہ فاقے سے پڑا رہتا اور تیسرے دن بھوک سے مجبور ہو کر پھر نکل پڑتا۔ اس سے چلا نہ جاتا تھا مگر چلتا تھا، اس سے بولا نہ جاتا تھا مگر بولتا تھا، اس میں شہر تک جانے کی ہمت نہ تھی مگر جانا ضروری تھا، واپس آنے کی سکت نہ تھی مگر واپس آنا لازمی تھا۔ شہر کی تمام عمارتیں اپنی عظمت اور ہیبت سے ڈرا کر اسے اپنے یہاں جگہ دینے سے انکار کرتی تھیں۔

جاڑے ہی سے اس کی بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا مگر وہ شہر آتا جاتا تھا۔ دو تین دروازے ایسے تھے جہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا تھا۔ پہلے وہ ان دروازوں سے پا جانے کے بعد بھی سارے دن شہر میں مانگتا پھرتا تھا۔ مگر اب اس کی طاقت جواب دے چکی تھی، وہ کم سے کم پر اکتفا کرتا تھا اور اٹھتا بیٹھتا اپنے کھنڈر میں واپس آجاتا تھا۔ گرمی آتے آتے اس کی ساری قوت ختم ہو گئی اور تین دن تک وہ کہیں نہ جا سکا، چوتھے دن پھر اس نے ہمت کی اور دن بھر شہر میں چکر لگاتا رہا، رات کو واپس ہوا تو تیز بخار سے اس کا جسم بھن رہا تھا۔ اب تک اُسے کھنڈر میں روشنی کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی تھی مگر آج اس کی نگاہ کام نہ کرتی تھی، اسے ہر جانب روشنی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی ناچ رہی تھیں اور طبیعت میں ہیجان تھا، رات کو دیر گئے چاندنی پھیلی بھکاری بخار کی گرمی سے لوٹتا ہوا چھت کے نیچے سے باہر آ گیا۔ یہ اس کی آخری رات تھی۔

صبح ہوئی تو گدھ نے پر پھڑپھڑائے اس نے کبھی کسی انسان کو کھنڈر میں اس طرح پڑے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس کی غنودگی ختم ہو گئی اور وہ اُڑ کر مردے کی طرح پڑے ہوئے بھکاری کے قریب آیا، بھکاری نے بے چینی سے ہاتھ پیر پھیلائے، گدھ نے اپنی چونچ اس کے جسم پر ماری، بھکاری نے درد سے جلد جلد کروٹیں بدلیں، گدھ اُڑ کر اپنی جگہ پر چلا گیا۔ لیکن اب وہ اونگھ نہیں رہا تھا، اس کی نگاہیں بھکاری پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دن بھر تڑپا کیا اور رات کو کھنڈر بے مالک کے رہ گیا۔

صبح کو گدھ پھر نیچے اترا اور تھوڑی دیر میں بہت سے گدھ جمع ہو گئے اب وہ درختوں پر بیٹھ کر اونگھنے والے کمزور جانور نہ تھے، ان میں زندگی تھی، اُن میں آواز تھی، ان میں لوٹنے والوں کی خود غرضی بھی، وہ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

از۔ احتشام حسین رضوی ماہلی

غُسل

شیخ علیم کا بچپن ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بوڑھے ہونا شروع ہو گئے۔ آپ تعجب کریں گے کہ یہ ایک منزل کی چھلانگ ہماری سمجھ میں تو نہیں آئی لیکن واقعہ یہی ہے۔ جوانی یا شباب (حضرت شوکت تھانوی کا نکلنے والا رسالہ معاف کریئے!) کسی مقررہ عہد کا نام نہیں، کوئی خدائی وعدہ نہیں کہ وہ ٹوٹ ہی نہ سکے، عمر کوئی گھڑی نہیں ہے کہ سوئیاں ایک محدود اور مقررہ رفتار سے چلا کریں۔ بلکہ زندگی جس طرح بنائی جائے گی اسی طرح کے ذہنی اثرات ہوں گے محسوسات قلب صرف رجحانات طبعی کے ہاتھوں میں اسیر ہیں۔ اگر کوئی بچہ شروع ہی سے ہر طرح کے کھیل کود، جسمانی ورزش اور بیرونی فضا کے اثرات سے بچایا جاتا ہے۔ تو اس میں بچپن کی شریر حرکتیں، ہر چیز کے تعلق دلچسپ، اور تحیر آمیز سوالات تلاش کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بچپن جس احساس کا نام تھا وہ اس کے لئے بالکل بیگانہ رہا۔ یہی حالت جوانی کی بھی ہے، اگر شباب کی امنگیں، بدمستیاں، لاپرواہی، لاابالی پن کسی شخص سے چھین لی جائیں تو اس کو جوان کہنا گناہ ہے۔

خیر تو شیخ علیم بچپن کے بعد یکایک پیری کی آغوش میں آگئے۔ عجیب اتفاق تھا کہ ان کی شادی کرتے ہی ماں اور باپ دونوں عالم بالا کو چل دیئے اور اپنی گاڑھی کمائی کا زیادہ حصہ علیم کے لیے چھوڑ گئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علیم بھی اسی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ لوگ مریں اور یہ چنیا بیگم سے عشق شروع کر دیں۔ چنانچہ جب باپ کی چالیسی کے لیے اور سامان منگائے گئے تو ساتھ ہی تھوڑی سی افیون بھی آئی اور اسی روز سے افیون پارٹی کا افتتاح ہوا۔ اور محلہ کے کئی دوستوں کے ساتھ تھوڑی مقدار میں شروع کر دی گئی۔ افیون اور ضعف کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے یہاں تک کہ اس کا نام زبان پر آتے ہی ایک سستی اور کاہلی سی چھا جاتی ہے۔ پھر آپ ہی بتلائیے کہ شیخ جی جوان کب ہوتے۔

تھوڑے دنوں تک، تو خیر کوئی خاص بات نظر نہ آئی، علیم کے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور آپ نے شخانی کو الگ بلا کر تاکید کر دی کہ اگر بچی کی زندگی اور تندرستی کا کچھ بھی خیال ہے تو ایک مٹر کے برابر افیون دیا کرو (راوی کا یہی بیان ہے۔ لیکن غالباً سر یوں کہا ہوگا) افیونی کو دو تین چیزوں سے عشق ہوتا ہے لیکن ساتھ کئی چیزوں سے عداوت بھی ہو جاتی ہے سنا ہے کہ اگر کسی افیونی کو سانپ کاٹ لے تو سانپ خود ہی اناللہ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن ہمارا تو یہ خیال ہے کہ ایسا نہ نہانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جسم پر میل کے ساتھ ہی ساتھ زہریلے جراثیم بھی جمتے چلے جاتے ہیں۔ ہم لوگ غلطی کرتے ہیں۔ اکثر غسل کر کے انھیں دھو دیتے ہیں۔

ایک افیونی اس کا خاص خیال رکھتا ہے کہ اس کے جسم پر کبھی پانی نہیں پڑنے پاتا۔۔۔ جس طرح عام طور پر لوگوں کو پھنکے ڈنک سے تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح افیونی کو پانی سے ایذا پہنچتی ہے۔

ـنے نہانا بالکل ترک کردیا۔ بیوی کے نے بہت کچھ
ـنا کے فلسفہ کے آگے کسی طرح بس نہ چلا۔ ہر
ـسا و تدریس کے ایک بہترین عالم ہوتا ہے اس
تاریخی افسانوں کا گرانبہا خزانہ ہوتا ہے۔ ہر علم
کر سکتا ہے۔ سیاست حاضرہ پر اس کی رائے
ـباب میں بڑی وقعت رکھتی ہے۔ یہی حال علیم
ـنے شیخانی کو ہمیشہ سمجھایا کہ نہانا بالکل جائز
ـن کا حکم اس کے خلاف ہے۔ بیوی نے سرپٹ
ـو کیا جو لوگ نہاتے ہیں وہ قرآن شریف کے
ـہیں؟ سراسر" علیم نے افیون کی گولی کو چائے
ـولتے ہوئے کہا۔ پھر سر اٹھا کر بولے "آخر قرآن
ـہ کہ اسراف بیجا جائز نہیں۔ پھر اگر میں نہاؤں
ـبیجا ہوگا۔ جبکہ نہانے کی کوئی ضرورت نہیں تو کیا
ـنہ ہوگا۔؟ اب بولو۔"
ـا سمجھ کے باہر تھا کہ اس تحقیقات کا جواب دیں۔
ـکے طور پر کہا "ارے تو کبھی کبھی تو نہالیا کرو ورنہ
ـہوگا؟"
ـا؟ کبھی کبھی؟ ارے بھئی بھول گئیں ابھی جس
ـہوئی ہے اسی سال عید میں تو خوب نہایا تھا!
ـے ہوئے" ہاجرہ قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔

ـری عمر کیا دس برس سے کم ہے؟"
ـدس برس تو دیکھتے گزرتے ہیں۔ دیکھو جس طرح

امریکہ لڑائی میں ہار کر کمزور ہو گیا تھا۔ اسی حال میں پڑا ہوا ہے
روس کے بادشاہ اسی طرح حکومت کر رہے ہیں۔ ایک
تنکا بھی تو اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور تم لوگوں کے نزدیک بڑا
زمانہ ہو گیا۔

(۲)

جاڑے کا موسم تھا۔ علیم نے کسی خیال سے اپنے کپڑے اتار کر
دھوپ میں ڈال دیئے تھے۔ اور خود بھی وہیں دھوپ میں بیٹھ کر
سجدے کی رسم ادا کر رہے تھے، بدن کی رنگت تبدیل ہو چکی
تھی۔ کیونکہ جلد بدن پر ایک تہہ گرد و غبار کی جمی ہوئی تھی،
کھانا سامنے رکھا گیا اور شیخ جی نے کھانا کھایا۔ ایک چلو
پانی سے ہاتھ منہ بھی دھویا اور برتن بھی قریب قریب صاف
کر دیا۔

بیوی کو ان کی حالت پر ترس آگیا۔ اس نے نہایت منت و
سماجت سے کہا "دیکھو کل جمعہ ہے۔ میں پانی گرم کر دوں
گی نہا ڈالنا۔"

شیخ جی نے غصہ سے آنکھ اٹھا کر دیکھا جیسے کسی دشمن
کو گھور رہے تھے۔ "کیا چاہتی ہو کہ مر جاؤں؟" شیخانی حیرت سے
ان کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

کہ انھوں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ بیوی نے دبی زبان
سے پوچھا کہ:۔

"آخر مطلب کیا ہے؟"

— ✣ —

احتشام حسین

انشا — ایک تمثیل

آوازیں

(۱) خواجہ خضر کی آواز
(۲) مولانا محمد حسین آزادؒ
(۳) انشاء اللہ خاں انشاؔ
(۴) شیخ غلام ہمدانی مصحفی
(۵) نواب سعادت علی خاں
(۶) شہزادہ سلیمان شکوہ
(۷) بی نورن
(۸) میر غفر غینی
(۹) سعادت یار خاں رنگینؔ
(۱۰) چوبدار اور متعدد آوازیں

(منظر کچھ ایسا ہو کہ شام اور ندی کے کنارے کا اندازہ ہو۔ ہلکی موسیقی بہت ہلکی۔ پانی میں چھپ چھپ کی آواز اور کبھی کبھی بیتابی سے یہ مصرعہ پڑھنے کی آواز)

جو طلسم زیست کے کھول دے مجھے اس نظر کی تلاش ہے
مجھے اس نظر کی تلاش ہے، مجھے اس نظر کی تلاش ہے

خضر کی آواز: کون ہے جو اس اندھیرے میں روشنی ڈھونڈھ رہا ہے؟ کون ہے جسے علم کی پیاس یہاں لائی ہے؟ کیا خضر اسے راستہ دکھا سکتا ہے؟

آزاد: خضر؟ (آہستہ سے) خواجہ خضر؟ کیا یہ خواجہ خضر کی آواز ہے؟

خضر کی آواز: ہاں خضر! گھبراؤ نہیں، ڈرو نہیں، تم کون ہو؟ اور اس وقت جب ندی کا پانی ساکن ہو جانا چاہتا ہے، جب مسافر اپنی منزلوں کے قریب پہنچنے کی فکر میں ہیں، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟

آزاد: مجھے بھی آب حیات کی تلاش ہے۔ مگر اس آب حیات کی نہیں جسے سکندر نے ڈھونڈھ نکالا تھا۔

خضر کی آواز: پھر کیا چاہتے ہو تم۔ اور تم ہو کون؟

آزاد: میں ایک فقیر بے نوا آزاد ہوں۔ محمد حسین آزاد۔ میں قلم کا تاجر ہوں کچھ پڑھتا لکھتا ہوں۔ دیوانگی کی حد تک مجھے اپنے بزرگ ادیبوں اور شاعروں کا حال جمع کرنے کا شوق ہے۔

خضر کی آواز: میں سمجھ گیا کہ تم کس آب حیات کے پیاسے ہو۔ میں اس دھندلکے میں بھی تمھیں روشنی دکھا سکتا ہوں۔ کہو تم کس گتھی کو سلجھانا چاہتے ہو؟

آزاد: میں سید انشاء کے متعلق لکھ رہا ہوں اور بات نہیں بن رہی ہے۔ چاہتا ہوں کہ وہ دور، وہ لوگ اور اس دور کی زندگی میرے سامنے بے نقاب ہو جائے، سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اور میرا قلم دل کا حوصلہ نکال لے۔

خضر کی آواز: آزاد! مجھے تمھاری لگن پسند آئی میں تمھیں اس دنیا میں پہنچائے دیتا ہوں۔ تم سب کچھ دیکھ لو گے۔ اب تمھیں نہ ڈھونڈھنا اپنا مقصد ڈھونڈھنا۔ تمھاری نگاہیں سوتے میں سب کچھ دیکھ لیں گی۔

(ہلکی موسیقی ــــ اور وقفہ)

ں وقفے کے بعد نوبت بجائی جائے جیسی شاہی محلوں
ں کے سامنے بجائی جاتی ہے اور ایک یا ڈیڑھ منٹ
بند ہو جائے اور شاہزادہ سلیمان شکوہ کے دربا
منے آ لیے)۔

ہل دربار انگاہ روبرو۔ شہزادہ سلیمان شکوہ برآمد
تے ہیں۔

(وقفہ)

اہل دربار ہوشیار

ڑوں کے کھڑے ہونے کی بے ترتیب آواز)

با:۔ شہزادہ سلیمان شکوہ سلامت!
عالی جاہ پائندہ باد (وغیرہ)

ادیو! آج تو سب ہی ہیں بھئی ہمیں تو دہلی کا
لطف آگیا۔

جہاں شہزادہ وہیں دہلی۔

ٹھیک کہا تم نے سید انشاء جہاں سکون ہو اور
ستوں اور ہوا خواہوں کی محبت، وہی دہلی ہے

دہلی میں کیا ہے عالم پناہ الہ آباد میں قیدی کی
گی بسر کر رہے ہے۔ دہلی اب دہلی کب ہے؟

ضور گھبرائیں نہیں۔ وہ دن دور نہیں جب تخت
بحانی لال قلعہ میں بچھے گا۔

سید انشاء انھیں رنجیدہ کرنا بھی آتا ہے اور خوش
ا بھی دہلی کا ذکر کر کے تم نے مجھے رنجیدہ کر دیا اور
ب مجھے دہلی کے تخت پر بیٹھنے کی امید دلاتے ہو۔
ی کا غم لے کر کیا بیٹھوں۔ میں مغل شہزادہ ہوں۔
ل شہزادہ تخت کھوتا بھی ہے حاصل بھی کرتا ہے۔

ضور کی باتوں نے جہاں پناہ ظل سبحانی کے شعر
دلادیے حکم ہو تو عرض کردوں۔

عزیز! میرے کان پدر بزرگوار کے کلام کے لیے کھلے
ہوئے ہیں۔

انشاء:۔ اہل دربار ظل سبحانی حضرت شاہ عالم بادشاہ
دہلی کا کلام پیش کرتا ہوں۔

شب دل آرام سے گذرتی ہے
رات دن جام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گذرتی ہے

سلیمان:۔ کیوں استاد مصحفی! آپ خاموش کیوں ہیں؟"

مصحفی:۔ جہاں پناہ! میری زبان میں طاقت کہاں کہ تعریف و
توصیف کر دوں۔ بادشاہ کا کلام کلاموں کا بادشاہ
ہوتا ہے۔

انشاء:۔ حضور! استاد مصحفی کچھ نہ کہیں مگر انھیں شکایت ہے کہ
انشاء کے آجانے سے ان کی آؤ بھگت میں کمی ہوگئی
ہے۔ بلکہ یہ شعر بھی کہے ہیں۔

اے دلائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے
ہم بھی تھے کبھی روزوں میں پچیس کے لائق

سلیمان:۔ استاد مصحفی!

مصحفی:۔ جہاں پناہ! یہ شعر تو میرا ہی ہے۔ لیکن مجھے شکایت
کا کیا محل ہے یہ تو محض شاعری ہے۔

سلیمان:۔ استاد مصحفی! آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ میرے دل
میں آپ کی عزت نہیں۔ میرے پاس ہوتا تو میں پچیس
کے پچاس کر دیتا مگر کیا کروں۔ رہے سید انشاء تو وہ اپنے
حق سے پاتے ہیں۔

انشاء:۔ مجھے تو کوئی شکایت نہیں، سرکار آج وہ معرکہ والی غزلوں
کا دن ہے جس کی طرح آپ نے تجویز فرمائی تھی۔

سلیمان:۔ ہاں خوب یاد دلایا۔ میں تو لکھ نہیں سکا۔ مگر آپ حضرات
کی غزلیں تو ہوں گی۔ سید انشاء! پہلے آپ ہی سنائیے۔

انشاء:۔ جیسا حکم! عرض کرتا ہوں۔

(گاکر پڑھتے ہیں)

دیکھو اس کی پڑی خاتم یاقوت میں انگلی
ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

گھستی ہے مری آہ فلک میں تو کہوں ہوں
یوں ڈالتے ہیں پنبۂ مسکوت میں انگلی

ہے یوں تری انگلی پہ حنا جیسے کہ تر ہو
داؤد کی خونِ سرِ جالوت میں انگلی

ناسوت کے عالم میں ہے سید ہم انشاؔ
کرتے ہیں تنگاب در لاہوت میں انگلی

سلیمان:۔ واہ واہ سید انشاؔ! کیا کیا قافیے نکالے ہیں۔ یہ آپ ہی کا حق ہے۔ اچھا اب استاد مصحفیؔ کا کلام ہوگا۔

مصحفی:۔ عرض کرتا ہوں۔

(سیدھے سیدھے پڑھتے ہیں۔ ہر دفعہ کہتے ہیں شعر ملاحظہ ہو۔ کچھ سبحان اللہ کی واہ واہ کی آوازیں)

سلیمان:۔ ارشاد۔

مصحفی:۔ زہرہ کی جو آئی کفِ ہاروت میں انگلی
کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں انگلی

ہندی کے یہ چھلے نہیں پوروں پہ بنائے
ہے اس کی ہر اک حلقۂ یاقوت میں انگلی

بن دودھ انگوٹھے کی طرح چوسے ہے کودک
رکھتی ہے تصرف عجب اک قوت میں انگلی

تھا مصحفیؔ یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

سلیمان:۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ کیا استادانہ رنگ ہے۔ سید انشاؔ تم نے بھی سنی استاد کی یہ غزل!

انشاء:۔ حضور سنی غزل۔ کیا کہنا ہے استاد مصحفیؔ کا مگر جہاں پناہ! اجازت ہو تو عرض کردوں کہ اس وقت استاد مصحفیؔ نے مقطع بدل کر پڑھا۔ کہا دوسری طرح تھا۔

سلیمان:۔ کیا تھا مقطع استاد مصحفیؔ؟

مصحفی:۔ حضور اب انھیں سے پوچھیں۔ میں نے تو جو کہا پڑھ دیا۔

سلیمان:۔ کیا مقطع تھا سید انشاء۔

انشاء:۔ جہاں پناہ! استاد مصحفیؔ کے شاگرد تو مقطع یوں پڑھتے ہیں (شعر پڑھتے ہیں)

تھا مصحفیؔ کانا جو چھپانے کو پس از مرگ
تھی اس کی دھری آنکھ پہ تابوت میں انگلی

(ہر طرف سے قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں اور یہ شعر کئی آدمی دہراتے ہیں۔ پھر آوازیں کچھ کم ہوتی ہیں۔ اور استاد مصحفیؔ اٹھ کر جانے لگتے ہیں)

مصحفی:۔ حضور یہ مجھ پر کھلی ہوئی چوٹ ہے۔ میں جاتا ہوں۔ اب میری یہاں کوئی عزت نہیں۔ کوئی عزت نہیں۔

انشاء:۔ استاد مصحفیؔ! یہ محض مذاق تھا۔

مصحفی:۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔

کئی آوازیں:۔ ٹھہرئے تو ... سنئے تو! (مصحفی جاتے ہیں)

سلیمان:۔ چلے گئے استاد۔ سید انشاء یہ تم نے کیا غضب کیا۔

انشاء:۔ جہاں پناہ! بہت ستایا ہے مجھے مصحفیؔ اور ان کے شاگردوں نے۔

سلیمان:۔ پھر بھی وہ میرے استاد ہیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔ کیوں چوبدار کیا ہے؟

چوبدار:۔ جہاں پناہ! دہلی کی بی نورن شرفِ باریابی چاہتی ہیں اور ان کے ساتھ کوئی اور ہے۔

سلیمان:۔ اوہ بی نورن، حاضر کرو۔ سید انشاء تم واقف ہو ان سے۔

انشاء:۔ جہاں پناہ خوب جانتا ہوں بلکہ بی نورن کے ساتھ جو میر عفر علینی ہیں ان کی باتیں بھی سن چکا ہوں۔ آپ سنیں گے تو لطف آئے گا۔

سلیمان:۔ ہم ضرور سنیں گے۔ آئیے آئیے بی نورن کہاں تھیں بہت دنوں پر دکھائی دیں۔

بی نورن:۔ جہاں پناہ! آپ کے لئے بڑی دعائیں کرتی تھی۔ لونڈی کو تو بہت دنوں سے حسرت تھی مگر کیا کہوں کیا

اندآ لگتے ہے)
:۔ زمانے کو کچھ نہ کہو۔ ہماری تقدیر برگشتہ ہے۔ بیٹھ کر
سننے بولنے کا بھی وقت نہیں ملتا، اور یہ تمھارے ساتھ۔
:۔ حضور! یہ دہلی کے میر غفر غینی ہیں۔ آپ کی زیارت
ے مشتاق تھے۔
۔ ہمیں خوشی ہوئی آپ کے آنے سے۔
:۔ جہاں پناہ! ان کی باتیں سنیں گے تو خوش ہ
ں گے۔
ضور! ان کی اور بی نورن کی باتیں سنیں تو واقعی
ف اندوز ہوں گے۔
ھئی ہم ضرور سنیں گے، بی نورن کیا باتیں ہوتی ہیں
ب سے سید انشاؔ کو پسند آئیں تو ضرور کوئی بات
لی۔
:۔ اے حضور! کوئی ایسی بات نہیں (میر غفر غینی کی
ف مخاطب ہو کر) میر صاحب! جہاں پناہ آپ کی
ں سننے کے مشتاق ہیں ــــ جہاں پناہ! بس خوبی
ہے کہ ان کی زبان سے "ل" اور "ر" کی جگہ غین۔
ن) کی آواز نکلتی ہے۔ حکم ہو تو وہی باتیں دہرا دوں۔
:۔ ہاں بھئی ہم ضرور سنیں گے۔ سید انشا نے بہت تعریف
ہے۔
:۔ میر صاحب! سنا جہاں پناہ کا حکم؟
جی ہاں۔ سن غیا۔
:۔ اجی آؤ میر صاحب تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ دلی میں
تے تھے، تو دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے
لکھنؤ میں تمھیں کیا ہو گیا کہ کبھی تمھارا اثر آثار معلوم
ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھوں میں بھی نہ چلو۔ تمھیں علی کی
آٹھوں میں مقرر چلیو۔
بی بی نوغن یہ بات کیا فغماتی (فرماتی) ہیں ... جب سے
(دلی) چھوٹی ہے۔ جی افسغدہ (افسردہ) ہو گیا
ہے ادغ (اور) شغغ (شعر) پڑھنے کو جو کہو تو اس میں بھی
کچھ غطف (لطف) نہیں غہا (رہا)۔ غکھنؤ (لکھنؤ) میں جیسے
چھوکغے (چھوکرے) ہیں ویسے ہی شاعغ (شاعر) ادغ
(اور) دغی (دلی) میں بھی ایسا ہی کچھ چغچا (چرچا) ہے۔
سبحان غغاہ (سبحان اللہ) جغت (جرأت) ہیں ادغ
(اور) میاں مصحفی مطغق (مطلق) شوغ (شعور) نہیں
غکھتے (رکھتے) اور میغ (میر) انشا کو آگے یعنی زاد (پری
زاد) تھے۔ ہم بھی گھوغنے (گھورنے) جاتے تھے۔ اب
شاعغ (شاعر) بن گئے ہیں۔
سلیمان :۔ واللہ آپ تو خوب چیز ہیں میر صاحب! سنا میر انشا
تمھارا تذکرہ میر غفر غینی نے کس طرح کیا ہے۔
انشا :۔ (نقل کرتے ہوئے) حضوغ سن غیا میغ غفر غینی کو۔
(قہقہوں کی آواز)
میں مصحفیؔ تو ہوں نہیں کہ خفا ہو کغ بھاگ جاؤں۔
(پھر قہقہے)
سلیمان :۔ بھئی چھوڑو اب اس ذکر کو۔ بی نورن تشریف رکھتی
ہیں۔ اُن سے کچھ سنیں۔
انشا :۔ جہاں پناہ کے ذوق کا کیا کہنا ہے۔ پھر بی نورن تو
مجسّم شعر و نغمہ ہیں۔
بی نورن :۔ اس عزت افزائی پر مجھے فخر ہے۔ حکم ہو تو سید انشا
ہی کی غزل سناؤں۔
سلیمان :۔ یہ تو سونے پر سہاگے کا کام دے گا۔ ضرور ضرور۔
بی نورن :۔ عرض کرتی ہوں۔
(معمولی ساز کے ساتھ گاتی ہے:)

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں
کہ ابھی عرش کو جا ہیں تو ہلا سکتے ہیں
مجھ سے اغیار کوئی آنکھ ملا سکتے ہیں
منہ تو دیکھو وہ مرے سامنے آ سکتے ہیں

ہاں وہ آتش نفسیاں ہیں کہ بھریں آہ تو جھٹ
آگ دامانِ شفق کو بھی لگا سکتے ہیں

حضرتِ دل تو بگاڑ آئے ہیں اس سے لیکن
اب بھی ہم چاہیں تو پھر بات بنا سکتے ہیں

وہ نہ آواز سنائیں مجھے در تک آ کر
اپنے پاؤں کے کڑوں کو جو بجا سکتے ہیں

ہے محبت جو تری دل میں وہ اک طور پہ ہے
ہم گھٹا سکتے ہیں اس کو نہ بڑھا سکتے ہیں

سلیمان: سبحان اللہ سبحان اللہ! جیسے شعر ویسا ہی نغمہ! بی نورن یہ موتیوں کا ہار تمھارے لیے ہے۔

بی نورن: یہ عزت افزائی ہے لونڈی کی۔ خدا دلی کا تخت جلد نصیب کرے۔

کئی آوازیں: آمین۔ دولت و اقبال سلامت!

(دربار برخاست ہونے کی نوبت)

٭ ٭ ٭

(سعادت علی خاں نواب اودھ کا محل)

(باہر سید انشاء اور رنگین باتیں کر رہے ہیں کبھی کبھی چوبدار سے باتیں کر لیتے ہیں)

انشاء: رنگین! تمھاری زندگی رشک کے قابل ہے تم گھوڑوں کی تجارت کرتے ہو اور آزاد ہو۔ تمھارا جی چاہتا ہے تو شعر کہتے ہو۔ ورنہ یار دوستوں میں وقت گزارتے ہو۔ درباروں میں جاتے ہو عام لوگوں سے ملتے ہو۔ تم آزاد ہو۔ تمھارے ہنسنے رونے پر پابندی نہیں۔

رنگین: سید انشا یہ آج بات کیا ہے؟ یہ تمھیں بول رہے ہو نا۔؟ تمھیں ایسی باتوں سے کیا سروکار۔ تم دہلی میں شاہ عالم بادشاہ کے مصاحب خاص بنے رہے۔ لکھنؤ میں سلیمان شکوہ کو تمھارے بغیر چین نہیں، اور اب سنتا ہوں کہ نواب اودھ بھی تمھیں ایک لمحہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتے۔ تم ایسی باتیں کرتے ہو بات کیا ہے؟

انشاء: شکر کرو رنگین کہ تمھاری زندگی دوسری ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو میں ہنسنے ہنسانے کے لئے پیدا ہوا ہوں لیکن یقین کرو کہ اپنی خوشی سے ہنس بھی نہیں سکتا۔ دوسروں کی ہنسی ہنستا ہوں۔ میں علم کی خدمت کر سکتا ہوں۔ میرے آباؤ اجداد سپاہی تھے یا عالم۔ اور میں۔ میں درباروں کا بھانڈ ہو کر رہ گیا ہوں (چوبدار سے مخاطب ہو کر) حضور کو اطلاع ہوئی میرے آنے کی؟

چوبدار: جہاں پناہ ابھی حمام میں ہیں۔ مگر حکم ہے کہ آپ بغیر ملے ہوئے نہ جائیں۔

انشاء: کیسے جا سکتا ہوں۔ رنگین! اب وہ شعر محض خواب ہے۔ جب میں نے تمھارے لیے کہا تھا۔

عجب رنگینیاں آپس میں کچھ ہوتی ہیں اے انشاء
بہم مل بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

اب باہم مل بیٹھنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ حکم ہے کہ دربار کے سوا اور کہیں نہ جاؤں۔ رنگین! تم آئے ہو اور میں تم سے سرِ راہ باتیں کر رہا ہوں۔ گھر پر تمھارے ساتھ بیٹھ نہ سکا۔ دربار میں حاضری کا وقت تھا۔

رنگین: ہوا کیا؟ تم تو نواب کی ناک کے بال تھے۔

انشاء: یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ نواب اب مجھے بات بات پر ٹوکتے ہیں۔ جس گندے مذاق کا مجھے عادی بنایا اب اسی پر چڑھتے ہیں۔ اب تو ایسا ہے کہ آزاد بھی نہیں ہو سکتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ کچھ شرافت اور نسبی فخر کا ذکر تھا، نواب سعادت علی نے کہا کیوں سید انشاء! ہم نجیب الطرفین ہیں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا نجیب ہی کیا حضور انجب ہیں۔ تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ روانی میں کہہ گیا۔ ورنہ میں اتنا جانتا ہوں کہ میں خود اپنے ولی نعمت کو لونڈی بچہ نہیں کہہ سکتا تھا! اس طرح کی اور باتیں ہیں کہاں تک کہوں۔ کیوں چوبدار؟"

جہاں پناہ کا حکم ہے کہ میرے برآمد ہونے کا انتظار
رہیں۔

۔ دیکھتے ہو میری بے بسی رنگین! میرا بیٹا تعالیٰ اللہ
ار ہے۔ اور مجھے یہاں حاضری کا حکم ہے۔ میرا جی
ہتا ہے کہ تمھارے گلے لگ کر چیخوں، لیکن ابھی مجھے
اپ کی خلوت میں جھوٹی ہنسی ہنسنا ہوگی۔ الٹے
یدھے اشعار پڑھنے ہوں گے۔ رنگین! تم ابھی لکھنؤ
ں ٹھہرو گے۔

ہیں میر انشاء! میں عظیم آباد اور مرشد آباد جا رہا
ں۔ واپسی سات آٹھ مہینے میں ہوگی۔

اچھا تو پھر خدا حافظ ــــ دیکھو چوبدار مجھے بلانے کیلئے
ا ہے۔

خدا حافظ ــــ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

چوبدار! کیا کر رہے ہیں جہاں پناہ۔

دیے پر تشریف رکھتے ہیں۔ پیچ دار چھپر کھٹ میں
افروز ہیں۔ پھولوں کا گہنا سامنے ہے۔ ایک گجرا
میں ہے اسے اچھالتے ہیں اور پاؤں کے اشارے
چھپر کھٹ کو جنبش دیتے ہیں، یہی شغل ہے آپ
کر رہے ہیں۔

چھا اچھا ــــ

(وقفہ)

خاں: ـ تم آگئے سید انشاء!

جہاں پناہ!

یسی حسین چاندنی ہے اور کیسا خوبصورت منظر۔

شعر سناؤ حسب حال ــ

رض کرتا ہوں جہاں پناہ!

(ذرا سا وقفہ)

گا چھپر کھٹ میں چار پہیے اچھالا تو نے جولے کے گجرا
موج دریا لے چاندنی میں وہ ایسے چلتا تھا جیسے بجرا

سعادت: ـ بہت خوب! بہت برجستہ۔ کیسے کہہ لیتے ہو اس
قدر۔

انشاء: ـ حضور کا اقبال کہلواتا ہے۔ انشاء کیا کہتا ہے۔

سعادت: ـ چلو اس وقت دریا کی سیر کا لطف ہے۔ بجرا تیار
ہے، کوئی اور نہ ہوگا ساتھ

انشاء: ـ یہ میری خوش نصیبی ہے۔

(وقفہ)

(چلنے کی آواز ــــ کشتی میں سوار ہونا۔ ہلکی موسیقی)

سعادت: ـ بھئی انشاء ہم نے تو تماشا دیکھا نہیں۔ سنتے ہیں مصحفی
سے تمھارا خوب مقابلہ رہا۔ ہوا کیا آخر۔

انشاء: ـ جہاں پناہ کا اقبال شامل حال ہے۔ مصحفی میرا کیا
مقابلہ کریں گے۔
میں کبھی خود ابتدا نہیں کرتا۔ جب وہ عزت کے درپے
ہو جاتے ہیں تو مجبوراً میں بھی کچھ کرتا ہوں۔

سعادت: ـ یہ تو میں جانتا ہوں مگر اس بار کیا ہوا؟

انشاء: ـ ہوا یہ کہ مصحفی نے اپنے شاگردوں کو مجھ پر چھوڑ دیا۔
انھوں نے میرے مکان پر بارات کی شکل میں آکر میری
ہجوئیں پڑھیں مجھے گالیاں دیں۔ میں نے ان کی خاطر
تواضع کی۔ ان کی ہنسی خوشی میں شریک ہوا لیکن دوسرے
دن میں نے مصحفی مصحفن کا سوانگ رچایا۔ لوگ
ہاتھیوں پر سوار گڈے اور گڑیوں کو لڑاتے گاتے
پھر رہے تھے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھیے چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی اور مصحفن

سارے شہر میں یہ بات آگ کی طرح پھیل گئی۔
اور چھوٹے چھوٹے بچے سڑکوں پر یہی کھیل کھیل رہے ہیں۔

سعادت: ـ بھئی انشاء، تمھیں جو سوجھتی ہے تکلیف دہ
اور انوکھی سوجھتی ہے۔

(وقفہ)

بڑی نند و مشی ہے سامنے کی عمارت میں۔ یہ کس کا
محل ہے۔؟"

انشاء:۔ جہاں پناہ۔ یہ علی نقی خاں بہادر کی حویلی ہے۔
کسی نے اس کی تاریخ بھی کہی ہے۔ "حویلی علی نقی
خاں بہادر کی"۔ تاریخ تو ہو گئی۔ مگر اسے نظم نہ کر سکا
وہ بے چارہ۔

سعادت:۔ تو سید انشاء تم دماغ لڑا کر اسے نظم کر دو۔
بے چارے کا ارمان نکل جائے۔

انشاء:۔ ابھی جہاں پناہ ابھی۔ بحر کیا رہے؟"

سعادت:۔ ہاں بات تو جب ہی ہو گی۔

انشاء:۔ تو پھر حاضر ہے۔

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی
نہ سم کی نہ تال کی نہ ترکی
یہ تاریخ کہی ہے کس لُرکی
حویلی علی نقی خاں بہادر کی۔

سعادت:۔ بہت خوب، بہت خوب سید انشاء،
اچھا اب ہم داپس ہوں۔ مگر اپنی کوئی تازہ
غزل تو سناؤ۔

انشاء:۔ جہاں پناہ فکر تازہ تو نہ کر سکا۔ ایک غزل عرض
کرتا ہوں۔

(گا کر پڑھتے ہیں)

گا ہے گا ہے جو ادھر آپ کرم کرتے ہیں
وہ ہیں اٹھ جاتے ہیں یہ اور ستم کرتے ہیں
جی نہ لگ جائے کہیں تجھ سے اسی واسطے بس
رفتہ رفتہ ترے ہم ملنے کو کم کرتے ہیں
عشق میں شرم کہاں ناصح مشفق یہ بجا
آپ کو کیا ہے جو اس بات کا غم کرتے ہیں
ہیں طلب گار محبت کے یہاں جو اشخاص
وہ بھلا کب طلب دام و درم کرتے ہیں

مین ہستی میں ہمیں دید فنا ہے انشاءؔ
آنکھ جب موندتے ہیں سیر عدم کرتے ہیں

سعادت:۔ خوب ابھی بہت خوب، سید انشاء۔ مگر اس غزل
میں تمہارا خاص رنگ نہیں۔

انشاء:۔ عالم پناہ! جس وقت جو گزرتی ہے وہی بات زبان
پر آتی ہے۔

سعادت:۔ سید انشاء اب ہم ماحضر تناول کریں گے۔
کشتی سے اتر کر، تم آؤ۔ ابھی ٹھہرو گے نا؟

انشاء:۔ جیسا حکم ——

(وقفہ)

سعادت:۔ دریا پر کیسی ہوا تھی اب کیسی گرمی ہے۔

انشاء:۔ بڑی گرمی ہے جہاں پناہ۔ اس کی ہجو لکھنی پڑے
گی۔ جیسے میں نے کھٹمل اور مچھر کی لکھی تھی۔

(وقفہ)

(کھانے کے برتنوں کی آواز۔ کچھ خاموشی پھر
سر پر چٹ سے چپت پڑنے کی آواز)

انشاء:۔ اوہو۔ میں نے گرمی سے ٹوپی اتار لی تھی۔ بزرگوں
نے سچ کہا تھا کہ ننگے سر کھانا کھاؤ تو شیطان سر پہ
دھولیں مارتا ہے۔

سعادت:۔ (زور سے) شیطان —— یہ ہم نے مذاق کیا تھا۔
نواب سعادت علی خاں —— ہم اور شیطان۔

انشاء:۔ جہاں پناہ۔

سعادت:۔ (نقل کرتے ہوئے) جہاں پناہ اور شیطان
العجب اور پھر جہاں پناہ۔

(ایک جھٹکے کے ساتھ فیڈ آؤٹ)

آواز نمبر ۱:۔ بھئی چلتے ہو مشاعرے میں۔

آواز نمبر ۲:۔ ضرور چلیں گے۔ حالانکہ دیر ہو گئی۔

آواز نمبر ۱:۔ سنتے ہیں سید انشاء مجنوں ہو گئے کیا لطف مشاعرے کا۔

ز جانے کیا ہوا۔ وہ مسکرانے ہنسانے والے آدمی اور
تنگی کا یہ عالم ۔ ۔ ۔ ۔

کیوں نہ ہو، نواب نے ان کے چلنے پھرنے آنے جانے
ندیاں لگا دیں، اور ہر طرح انکو تکلیفیں پہنچانے
ہتے تھے سید انشا ر ایسی کہو جو نہ دیکھی ہو نہ سنی ۔
ہر ایسی حالت میں ان کے جوان بیٹے تاں اللہ
موت نے ان سے چھین لیا ۔
سچ کہا تھا کسی نے ۔ سید انشا کے فضل و کمال
اعری نے کھویا اور شاعری کو نواب سعادت
خاں کی صحبت نے ڈبویا ۔ اب وہ بالکل
ہیں ۔
۔ ہائے افسوس زمانے نے کیسے کیسے اہل کمال
توڑے ہیں ۔
تم نے ادھر انھیں دیکھا بھی ۔
۔ ہاں میں نے دیکھا ۔ بالکل دیوانوں کی
حالت ہے ۔ میلی کچیلی روئی دار مرزائی پہنے
میلی سی پگڑی ، میری تو آنکھیں بھر
۔
زمانہ کبھی ایک حال پر نہیں رہتا ۔ آخر یہ
عرہ کیوں نہیں شروع ہوتا ۔۔۔
۔ ابھی تو مشاعرہ میں دیر معلوم ہوتی ہے ۔ صرف
چار سو آدمی ہیں ۔
۔ وہ ادھر دیکھو میاں رنگین بھی کھڑے ہیں ۔
سید انشا کے دوست ، کیسے افسردہ ہیں ۔
۔ ارے یہ کون السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا ۔
سید انشا ہی معلوم ہوتے ہیں ۔
۔ ہاں ہاں وہی ہیں ، دیکھو وہی میلی کچیلی مرزائی
ہاتھ میں حقہ ہے کیا کوئی انھیں پہچانتا
ہے ۔

آواز ۱ :۔ نہیں نہیں ، میزبان انھیں کے لیے بچوان
لیے خود آ رہے ہیں ۔
میزبان :۔ یہ حاضر ہے بچوان سید صاحب ۔!
انشاء :۔ صاحب ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو نہیں
تو ہم جاتے ہیں ۔
میزبان :۔ جیسا حکم ۔۔۔
انشاء :۔ اور صاحبو! مشاعرہ کیوں نہیں شروع
ہوتا ۔
میزبان :۔ لوگ جمع ہو رہے ہیں ، سب آجائیں تو
شروع ہو ۔
انشاء :۔ صاحب ہم تو غزل پڑھ کر جاتے ہیں ہمارے
پاس وقت نہیں ۔
آواز :۔ اے لو ایک پھٹا کاغذ جیب سے نکال لیا ۔
سنو وہ پڑھنے بھی لگے ۔
انشاء :۔ (بڑی دھوم سے غزل پڑھتے ہیں ۔ ہر شعر کو
بار بار پڑھنے کی فرمائش ، تعریف ہو رہی ہے ، مگر وہ
نہیں پڑھتے ، تحسین سے بے نیاز معلوم ہوتے ہیں ۔)

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

انشاء: سلام علیکم (کہہ کر چل دیتے ہیں)

رنگین: (دوڑ کر) سید انشاء۔ ادھر دیکھو میں ہوں رنگین۔

سعادت یار خاں رنگینؔ، تمہارا دوست میں آگیا، کیا مجھے بھی نہیں پہچانتے؟

انشاء: کوئی نہیں، نہ سید انشاؔ نہ رنگینؔ ہر طرف سناٹا ہے۔

رنگین: ہائے سید انشاؔ نے مجھے بھی نہیں پہچانا۔ لوگو دوڑو۔ وہ سید انشاء ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ دوڑو!

(چھناکا اور پھر کوئی دردناک ساز بجے)

آزاد: میں نے دیکھ لیا جو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں سو رہا تھا یا بیدار؟ خیر اب میں کچھ لکھ سکوں گا سید انشاءؔ کے متعلق۔

(فیڈ آؤٹ)

سید احتشام حسین مرحوم

تنقید ــــ نظریہ اور عمل[1]

نقدِ ادب کے اصول کیا ہیں؟ تنقید سے کیا مراد ہے۔؟
الوں کا جواب دینے سے پہلے اس پر غور کرنے کی کوشش
ہیے کہ ادب کیا ہے؟ کیونکہ جیسے ہی ادب کے متعلق گفتگو
ہوگی، تنقید کے اصول خود بخود سامنے آجائیں گے۔ اد
ید کا تعلق اتنا گہرا اور ہمہ گیر ہے کہ انھیں بالکل دو
لگ خانوں میں تقسیم کرنا درست نہ ہوگا۔ یوں عام طور
سکے لئے ادب اور نظریہ ادب میں فرق ہے، لیکن ادب
قی عمل ہی میں تنقیدی عمل کی نمود بھی ہو جاتی ہے۔
دں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ساتھ ساتھ چلتے
تخلیقی ادب پیدا کرنے والا اپنے جذبات، خیالات،
ب دے کر خاص اسلوب اور لطافت کے ساتھ پیش
ہے، لیکن اس کی وہ تنقیدی صلاحیت جسے وہ ابتدا
یالات کی تہذیب اور تنظیم میں صرف کرتا ہے، بعض
نی اثرات اور وفورِ جذبات کی وجہ سے کافی نہیں ہوتی۔
یہ صلاحیت جتنی قوی ہوگی تخلیقی کارنامہ اسی قدر اعلےٰ
ب
ے داغ ہوگا۔ اس طرح درحقیقت ادب اور نظریہ اد
ضاد نہیں ہے۔ ادیب اور نقاد دونوں اور اک
ت کے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں لیکن خاص
ی سماجی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے

زندگی سے مختلف نتائج نہیں نکال سکتے۔ جہاں یہ صورت رونما ہوتی ہے وہاں ادیب اور نقاد کے تصورِ ادب میں اختلافِ رائے ہوتا ہے۔

ایک حیثیت سے ادب اور تنقید کا تعلق نظریہ اور عمل کے تعلق کی نوعیت رکھتا ہے۔ ادبی مطالعہ میں اس وقت تک یہ پہلو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اس تفریق کی وجہ سے بعض اوقات بالکل غلط نتائج مرتب ہوتے ہیں بات یہ ہے کہ ادب اور سائنس، جذبہ اور عقل، جنون اور حکمت کی مسلسل تفریق نے انسانی خیال کے ان نقوش کو جنھیں شعر و ادب کہا گیا ہے، اس کسوٹی سے دور رکھا اور اگر کبھی کسی نقاد نے اس کی کوشش کی تو اس کو غیر ادبی جرم پر نشانہ ملامت بنایا گیا بہرحال اس میں شک نہیں کہ ادب اور شعر کی دنیا انسانی تجربے سے ماورا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ اس لئے وہ نازک، لطیف خوبصورت، پیچیدہ اور تخئیلی ہونے کے باوجود انسانی تخلیق ہی رہتی ہے اور اگر وہ عام صداقتوں پر مبنی ہے تو دوسرے انسانوں کے تجربات اور محسوسات کی دسترس سے باہر نہیں ہو سکتی، یہی وہ بنیاد ہے جس کی وجہ سے ادب اور تنقید میں اصل رشتہ قائم ہوتا ہے، یہ رشتہ تضاد کا ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ جس طرح ادب زندگی کی سمت کو سمجھے بغیر اچھا

---

[1] مجموعہ میں پہلے اس کا عنوان تھا۔ "تنقید اور عملی تنقید"۔ (مرتب)

ادب نہیں بن سکتا، اسی طرح تنقید اپنے ادب کو پیش نظر رکھے بغیر چند اصولوں کا مجموعہ نہیں بن سکتی۔ تنقید کے اصول ادب ہی کے اندر سے وضع کئے گئے ہیں اگر وہ باہر سے ادب پر لادے جائیں تو انھیں تنقید نہیں کہا جا سکتا۔ ادب اگر کوئی ایسی راہ اختیار کرے جو انسانی تجربہ اور فہم کی حدوں سے باہر ہو اور کسی ایسے اصول کا پابند ہی نہ ہو، جسے عمل کی ترازو پر تولا جا سکے، تو اسے ادب نہیں کہا جا سکتا۔ سائنس، فلسفہ اور مظاہر زندگی میں نظریہ اور عمل کے تعلق کا یہی مطلب ہے کہ نتائج اپنے دعووں سے بے نیاز نہ ہوں۔ یہاں ترازو پر تولنے اور عقل میں آنے کا تذکرہ جس طرح کیا گیا ہے، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ تعلق محض ایک میکانکی شکل میں نمایاں ہوگا، ایسا نہیں ہے۔ متحرک زندگی میں ـــــ ادب جس کا آئینہ ہے ـــــ یہ تعلق میکانکی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ طبقاتی سماج میں طبقات کی آمیزش اور طریقہ پیداوار کی تبدیلیوں کی وجہ سے انسانی اعمال کے دائرے بدلتے رہیں گے اور نظریات میں ترمیمیں ہوتی رہیں گی۔ ان باتوں کے سمجھنے کے لئے کسی خاص طرح کے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ناقابل تغیر مطلق نظریوں کا فلسفہ ہمیشہ اس سماج یا سماج کے اس طبقہ میں مقبول رہا ہے جو سماجی تغیرات کو یا تو تسلیم نہیں کرتا یا تسلیم کرنا نہیں چاہتا۔

تجربہ خود عمل کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا اور یہ عمل انفرادی نہیں سماجی شکل رکھتا ہے۔ ایسا ہی تجربہ انسانی علم کا جز بنتا ہے۔ اسی شعور میں ادراک حقیقت کے نقش و نگار بنتے ہیں اور یہی ادیب اور شاعر کے جذبات سے مملو ہو کر ادب اور شعر کے پیکر میں ڈھلتے ہیں۔ اس لئے حصول علم کا جو منبع ادب کے لئے ہے، وہی نقاد ادب کے لئے بھی ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تجربے یا حقائق انسان کی قوت تمیز کے دائرے سے گزر کر ہی اس کے علم کا جز بنتے ہیں اسی وجہ سے حقیقت کا کوئی مطلق تصور نہیں ہو سکتا۔ وہ حقیقت کا اظہار کرے ... سماجی یا طبقاتی شعور کا عکس سامنے آئے گا۔ یہ بحث اس سلسلے میں کی گئی کہ ادیب نقاد دونوں حقائق سے بحث کرتے ہیں تو اظہار حقیقت کے طریقے مختلف ہوں گے لیکن ان سے حقیقتیں نہیں بدلیں گی اسی لئے نظریہ اور عمل کے تعلق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ جن حواسوں کی مدد سے انسان نظریاتی حقائق تک پہنچتا ہے وہ بھی سماجی عمل ہی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، کارآمد بنتے ہیں، ان کی طاقت میں عمل ہی کے ذریعہ اضافہ ہوتا ہے ....

.... موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت تقریباً ہر نارمل انسان میں ہوتی ہے لیکن بھاتکھنڈے اور فیاض خاں کے کمال فن سے کیف حاصل کرنے کے لئے موسیقی کے فن کو سمجھنے کی ضرورت ہوگی۔ جس نے جس قدر زیادہ اسے سمجھنے کی کوشش کی ہوگی اسی قدر زیادہ وہ اس کے متعلق معقول رائے دے سکے گا۔ البتہ حواس کا ارتقاء خود سماجی ارتقا کا پابند ہے یعنی شعور کی سطح عمل کے ذریعہ سے بلند کی جا سکتی ہے۔ وہ ادیب یا نقاد سماجی حقائق کو سمجھے بغیر ذمہ داری کے ساتھ ان کی ترجمانی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ علمی اور حکیمانہ نقطہ نظر سے وہی حقیقت ہے، جس میں نظریہ اور عمل کی تفریق ختم ہوتی ہے اور دونوں ایک حقیقت کے دو رخ بن جاتے ہیں۔ حقیقت اگر ادیب کی نگاہ سے اوجھل ہو تو اس کا ادب ناقص ہوگا اور اگر نقاد اس کے علاوہ ادیب سے کسی اور چیز کا مطالبہ کرے تو اس کی تنقید ناقص ہوگی۔

اگر ایسا ہے تو پھر ادیب اور نقاد ایک دوسرے کے دل کی بات کیوں نہیں سمجھتے؟ کیا محض طرز اظہار، احساس اور انداز بیان کے سمجھنے یا نہ سمجھنے کا جھگڑا ہے یا ادراک

ے متعلق اختلاف ہے، جو بعد میں اختلافات کی خلیج
جاتا ہے؟ اگر سارے اہم تخلیقی اور تنقیدی ادب کو بغور
کیا جائے تو ادیب اور نقاد میں طرز اظہار اور مواد دونوں
متعلق اختلافات ملیں گے لیکن اہم اختلافات زیادہ تر
، حقیقت سے متعلق ہوں گے جس کا اظہار کیا گیا ہے۔
اس نقاد سے یقیناً ادیب اور شاعر کو ناخوش ہونے کا
حاصل ہے جو بغیر سوچے سمجھے یا محض اپنی انفرادی
دیدگی اور ناپسندیدگی کی بنا پر، عام انسانی تجربات
محسوسات کو نظر انداز کر کے شعر و ادب کے متعلق رائے
تا ہے۔ ایسے ہی نقادوں کے خلاف ہمیشہ شاعروں اور
یبوں نے آواز بلند کی ہے، لیکن صورت حال اگر اس کے برعکس
تو نقاد کو بھی فن کار سے اختلاف کا حق حاصل ہوتا ہے۔
ں اور ایک حقیقت اور حسن اظہار میں ہم آہنگی ہوگی۔
ں ادیب اور نقاد کا اختلاف ختم ہو جائے گا یا اگر ہوگا بھی
یت معمولی ہوگا۔ پھر بھی یہ مطالعہ کی چیز ہے کہ ادیب اور
اد کے اختلافات کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ چیخوف نے کہا
کہ نقاد وہ مکھی ہے جو گھوڑے کو ہل چلانے سے روکتی ہے۔
ن نے اسے ادبیات کے گیسوؤں میں جوؤں سے تشبیہ
ی ہے۔ فلابیر نے تنقید کو ادب کے جسم پر کوڑھ سے تعبیر کیا
۔ یہ تو بڑے بڑے فنکار ہیں، چھوٹے سے چھوٹا ادیب اور
عر بھی نقاد کو گالیاں دے لیتا ہے اس لئے اس اختلاف
بنیاد کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے، لیکن اس کو محض معمولی
سیاتی یا طبعی اختلافات تک محدود رکھنا اس مسئلہ کی
یت کو کم کرنا ہوگا۔

تنقید شعر و ادب کی کی جاتی ہے اس لئے ادب کے
سے میں پھر پہلا... پھر جاننا پڑتا ہے کہ ادب کیا ہے؟ اور
سے یہ جواب نکلے گا کہ تنقید کیا ہے۔ اگر ہم فن اور ادب کے
تصور کو پیش نظر رکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ادب لکھنے والے کے
۔ اور خیالات کا وہ اظہار ہے جسے وہ سماج کے دوسرے

افراد تک پہونچانے کے لئے ایسے ذرائع سے نمایاں کرتا ہے جسے
وہ سمجھ سکیں اور اس سے لطف حاصل کر سکیں یا کم سے کم سمجھنے
کی کوشش کر سکیں۔ اگر فن اور ادب کی یہ نوعیت نہ ہوتی
اور اس سے محض وہ اظہار مراد لیا گیا جو فنکار کے ذہن میں پیدا
ہوتا ہے اور سماجی اظہار کا محتاج نہیں رہتا تو پھر تنقید کا
کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ کروچے اور اس کے ہم خیالوں
نے فنکار کا یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے
فن کی تکمیل خیال ہی میں ہو جاتی ہے، اس کا کاغذ
پر آنا یا الفاظ میں ظاہر ہونا ضروری نہیں۔ موجودہ دور
کے مشہور شاعر، جوش ملیح آبادی نے تو اس سے بھی زیادہ
نازک سوال پیش کر دیا ہے۔ کہتے ہیں:

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بیشمار
نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعر کی ترکیب ادب
ڈھل کے گو وہ گوہر غلطاں کا پاتی ہیں لقب
اور ہوتی ہے تجلی بخش تاج زر فشاں
پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں
جن کے اسرار درخشاں روح کی محفل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہیں
شاعری کا جامناں ہے نطق کا لوٹا ہوا
اس کا شیشہ ہے زبان کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر
ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لب گفتار پر
جاگتے رہتے ہیں دل کی محفل خاموش میں
بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کی آغوش میں
لوگ جن کی جاں گدازی سے ہیں دل پکڑے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ اور ان میں وہ جکڑے ہوئے۔
جام میں آتے ہی اڑ جاتی ہے شاعر کی شراب
ٹوٹ جاتا ہے کنارے آتے آتے یہ حباب

اگر شاعری وہ نہیں ہے جسے ہم سنتے اور پڑھتے ہیں بلکہ وہ جسے جو حرف و صوت سے ماورا ر شاعر کے دل میں ہے۔ تو شاعر اور دوسرے افراد یا نقاد میں کوئی ربط قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کوئی شخص شاعر کے خیالات سے واقف ہی نہیں ہو سکتا لیکن عام زندگی میں اس رابطے سے مفر ممکن نہیں ہے۔ جس نے بھی کچھ لکھا ہے اور اسے پڑھنے والے نے پڑھ لیا ہے، تنقید سے بچ نہیں سکتا۔ چاہے اس تنقید کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ جس طرح تخلیقی ادبی کارنامے سے مصنف کے تصورات کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح طریقۂ تنقید کے استعمال سے نقاد کے تصورِ زندگی اور فلسفۂ حیات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کیونکہ جس طرح نقاد ادب کو پرکھے گا، ادیب سے جس قسم کی امید لگائے گا، جس طرح کے مطالبے کرے گا، ادب اور زندگی میں جس نوع کا تعلق چاہے گا وہ اس طرح کے تصورات کی غمازی کرے گا۔

کیا سماج میں ادب کی کوئی جگہ ہے؟ کیا اس سے کوئی تہذیبی مقصد پورا ہوتا ہے؟ کیا ادیب اور شاعر سماج میں کوئی ذمہ دار جگہ رکھتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو لکھنے والا زندگی کے مہتم بالشان سوالات کے متعلق کچھ نہ کچھ نظریے ضرور رکھتا ہوگا۔ اظہار کے مختلف طریقوں میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینا ہوگا۔ اظہار کے جو سانچے موجود ہوں گے ان میں سے ایک یا کئی کو منتخب کرنا ہوگا۔ اور اگر ان کے علاوہ کوئی اور سانچے تیار کرنا ہوگا تو اس کے وجوہ ہوں گے۔ اس طرح کسی پہلو سے دیکھا جائے کوئی ادیب ان ساری ادبی روایات اور ان تمام افکار و خیالات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا جو اس کا طبقہ، اس کا سماج اس کا شعور اور اس کا علم سب مل کر اس کے لیے مہیا کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ادب کی حیثیت سماجی اور طبقاتی ہو جاتی ہے اور تنقید کی ضرورت پڑتی ہے۔

ادب کے مقاصد کا تعین کرنے میں خود تنقید کے مقاصد کا تعین بھی ہو جاتا ہے اور دونوں کے مطالعے سے عملی زندگی میں

ادب کی سماجی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ
ادبی کارنامے پر سرد مہری سے ... ہر ادیب اور شاعر
کرتا ہے، کسی نقطۂ نظر سے تعرض نہیں کرتا، بقول ...
اس کا حال اس نیلام کرنے والے کا سا ہے جو ہر ...
کرتا ہے۔ اپنے سماجی شعور کے ساتھ مخلص ہونے کے ...
ہر ادیب اور شاعر کا تجزیہ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ وہ
میدان میں محض ایک طفیلی کی حیثیت سے اظہار کرے گا
کا کام یہ رہ جائے گا کہ وہ ہر ادیب کی ہاں میں ہاں
ہو اور فیصلہ یا رائے کی ذمہ داری سے بچ جائے۔
بہت طویل ہے لیکن مختصراً اس کا جائزہ لینا ضرور...
کیونکہ اس وقت تنقید کی اہمیت اور حقیقت، تنقید...
منصب اور عملی تنقید کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا...
بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تنقید نگار کا کام ...
متعلق فیصلہ کن انداز میں رائے دینا نہیں ہے بلکہ
کو دہرا دینا ہے جو ادیب پر تخلیق کے وقت طاری ہو...
اس گروہ کی نمائندگی کسی شکل میں وہ تمام نقاد ...
جنھیں تاثر پسند کہا جاتا ہے لیکن اس کی سب سے ...
جوش حمایت اور دلچسپ وضاحت امریکہ کے ایک نقاد
نے کی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کا نام "تنقید جدید" اور "تخلیقی ...
رکھا ہے۔ اردو میں بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر اس
کے حامی، پیرو اور ترجمان موجود ہیں۔ اس لیے اس پر
ڈالنا ضروری ہے۔ تاثراتی تنقید کا نظریہ مختصر لفظوں ...
ہے کہ ادب تاثر ہے اور اس کی تنقید بھی محض ان
کا مجموعہ ہے جو کسی تصنیف کے پڑھتے وقت پیدا ہوتے ...
کوئی ضرورت نہیں کہ ان ہی نتائج افکار کو سماجی ...
روشنی میں پرکھا جائے۔ اسپنگارن نے انھیں خوبصورت
انداز میں پیش کرکے اس کا نام تخلیقی تنقید رکھ دیا ...
بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شعور کا معیار بدلنے سے ...
معنی کس طرح بدل جاتے ہیں، تنقید کے لیے تخلیقی ...

ر ح استعمال کرنا خود تخلیق کے مفہوم کے متعلق الجھن پیدا
ہے اس کا خیال ہے کہ کسی کتاب کو پڑھنا اور اس سے
حاصل کرنا ہی اصل تنقید ہے۔ اسی پرلطف اثر پذیری
د کرنا چاہیے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک کتاب پڑھ کر
ں کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے کہ اس کا
پر کیا اثر ہوا؟ گویا تنقید کا اصل کام ان کیفیات کی
فرنا ہے، جو کسی شاعر یا ادیب پر گزری تھیں۔ اسی
ے بعض نقاد کتابوں کی تشریح اور تفسیر ہی کو تنقید
لگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تنقید اور تشریح میں کیفیات کی با
ں بھی تو نہیں ہو سکتی، کیونکہ کسی اور پر گزرے ہوئے
ت کو پوری طرح اپنے اوپر طاری کرنا ناممکن ہے اس لئے
یات خاص قسم کے محرکات اور پیچیدہ حالات کے ماتحت
دتے ہیں۔ اسی لئے تنقید کا یہ نظریہ فیصلہ اور رائے
سے بچنے اور ادیب کو سماجی ذمہ داری سے بچانے کا
ذریعہ ہے، تنقید نہیں ہے۔

ایسی تنقید کو اسپنگارن نے تخلیقی کیوں کہا ہے۔
بہت دلچسپ اور پرلطف بحث ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر
ے تاثرات کے معاملہ میں حساس ہوں اور ان کا اظہار
پر بھی قادر ہوں تو ہم میں سے ہر شخص ایک ایسی نئی
ی کی تخلیق کرے گا جو اس کتاب کی جگہ لے گی جسے
ھ سے ہم نے وہ تاثرات حاصل کئے تھے۔ فن کار کے
اپنے تاثرات کا اظہار اسپنگارن کے خیال میں
عمل ہے وہ صاف صاف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ
یا تنقید کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی اخلاقی یا سماجی
ر کا اظہار کرے یا اسے آگے بڑھائے، ان خیالات
سے تنقید کی جائے اور ان کے محرکات کا منبع تلاش
ئے تو معلوم ہوگا کہ ایسے نقاد امریکہ کی سیاسی طبقاتی
ں میں بظاہر غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں۔ اس طریقہ
ے منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادب میں موضوع اور مواد کی

کوئی اہمیت نہیں، اچھے برے، صحیح غلط، جس تصور پر مصنف نے
کتاب کی عمارت کھڑی کی ہے اسی پر نقاد کو یقین کر لینا چاہیئے۔
ان تصورات کے اچھے برے، صحیح غلط ہونے سے بحث نہیں کرنا چاہیئے۔
غیر جانبدار بننے کی ضرورت اسی لئے پڑتی ہے کہ ادیب اور نقاد
دونوں طبقاتی کشمکش پر پردہ ڈال سکیں۔ صورت یہ ہے کہ جب
پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ساری دنیا میں سرمایہ اور محنت
کی جنگ تیز ہوئی اور محنت کشوں نے روس میں اپنی حکومت
قائم کر لی تو امریکہ میں ایسے ادیب، نقادوں اور مفکر ابل
پڑے جنہوں نے سرمایہ داری کے قلعہ کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ رویہ
اختیار کیا۔ اسپنگارن وغیرہ ادب کے معاملہ میں اس طرح
غیر جانبدار رہ کر حاکم طبقہ کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ ہر ملک کے
ادیب اور نقاد جب حالات کو بہتر بنانے والی عوامی جدوجہد سے
دور رہنا چاہتے ہیں تو یہی کرتے ہیں اور دھوکا دینے کے لئے یہ
کہتے ہیں کہ ہم کسی طرف نہیں ہیں، ادیب اور نقاد کو جانبداری
یا سیاسی اور سماجی اقدار کی تبلیغ اور تلقین سے کیا واسطہ لیکن
ہر نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ ان کا یہ رویہ منطقی طور پر کس کی حمایت
کرتا اور کس کا طرفدار بن جاتا ہے۔

اسپنگارن اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ تنقید نگار
کو خیالات کی صحت اور غلطی کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت نہیں
یہ کام نقاد کا نہیں فلسفی کا ہے۔ یہاں بہت سے سوال پیدا
ہوتے ہیں کیونکہ باشعور ادیب یا نقاد کا کسی مسئلہ کے متعلق
کوئی رائے نہ رکھنا کس طرح ممکن ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں
آتی۔ اگر ادب اظہار ہے تو یقیناً کسی بات، خیال، تجربہ، مقصد
یا خواہش کا اظہار ہوگا۔ اور اگر پڑھنے والا بھی اپنا کوئی شعور
رکھتا ہے تو وہ بھی ان باتوں، خیالوں اور خواہشوں کے متعلق
کوئی رائے رکھتا ہوگا جس کا ادیب کی رائے سے متفق ہونا
لازمی نہیں۔ ایسی حالت میں اسپنگارن کے خیال کے مطابق
یا تو تنقید سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ یا اپنی رائے کو زبردستی
دبا کر مصنف کی رائے سے متفق ہونا پڑے گا۔ یہ بات کہاں تک

قابل عمل ہے یا ہو سکتی ہے، یہ بھی پوچھنے کی بات ہے، پھر بھی
سوال نہیں ہے، اصل سوال ایسی تنقید کی اہمیت اور افادیت
کے متعلق پیدا ہوتا ہے، جو تنقید کسی تاثر کے متعلق محض تاثر ہے
اس کی افادیت کیا ہو سکتی ہے! تخلیقی تنقید کا یہ نظریہ ایک
بے حقیقت، کمزور اور ناکارہ فلسفہ پر مبنی ہے۔ اس میں افلاطون
کے اس خیال کا زور بھی موجود نہیں ہے جس سے اس نے
شاعری کو حقیقت کی نقل قرار دے کر غیر اہم ثابت کرنا
چاہا تھا۔

اوپر کی سطروں میں جن باتوں کی طرف اشارے کئے
گئے ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ادیب کوشش
کے باوجود بے تعلق نہیں رہ سکتا کیونکہ اس کے شعور کی تشکیل
اور ترتیب میں جن خارجی، مادی اور سماجی عناصر نے حصہ
لیا ہے، وہ اس کی بے تعلقی کی راہ میں حائل ہوں گے ہی
ایک صورت ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض حالات کے ماتحت
کوئی شخص اپنی شعوری کوشش سے ان عناصر کا مقابلہ کرکے
اپنے لئے نئے ذہنی سامان فراہم کر لے اور اپنے خیالوں کو نئی
طرح ترتیب دے لے۔ اگر یہ کوشش خلوص اور علم پر مبنی
ہوئی۔ تو شعور کی طبقاتی اور سماجی نوعیت بدل جائے گی۔ اس کی
ایک سادہ مثال یہ ہے کہ متوسط طبقہ کا کوئی باشعور انسان
اپنے طبقہ کے مفاد کے نقطہ نظر سے عوام کا دشمن بھی ہو سکتا
ہے اور سماجی حالات، طبقاتی تضاد اور محنت کش طبقہ کی فتح
کے خیالوں سے اپنے طبقہ کی ثنویت اور دو عملی سے آزادی حاصل
کرکے عوام کا دوست اور ساتھی بھی بن سکتا ہے۔ دونوں
حالتوں میں شعور کی تشکیل دو طرح سے ہوتی ہے لیکن دونوں
حالتوں میں تاثر کے لئے خارجی اسباب اور ان کے داخلی نتائج
کا علم ہونا ضروری ہے۔ ادیب ذہنی اچھائی برائی یا خیر و شر
کے معاملے میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا اپنے اصل خیالات
اور مقاصد پر پردہ ڈال سکتا ہے، عقائد کو منطقی اور فلسفیانہ
شکلیں دے سکتا ہے، انداز بیان کی رنگینیوں سے سچ کو جھوٹا

اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کر سکتا ہے، متضاد تصورات
کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن
کر سکتا کہ زندگی کے ہر مسئلے پر خاموش رہ جائے یا
دے کہ اس کے رجحان کا پتہ ہی نہ چل سکے اگر کوئی
یا نقاد ایسا سمجھتا ہے تو وہ یا تو خود فریبی کا شکار
کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ جو ادب کے لئے درست
ایک باشعور نقاد کے لئے بھی ٹھیک ہوگی، اگرچہ د
ذہنی عمل کی شکلیں مختلف ہوں گی۔

نقاد بھی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا ہے کہ منتخب
کردہ ادیب کے محرکات تخلیق کا پتہ لگائے، ان
تلاش کرے۔ جہاں سے ادیب نے زندگی حاصل کی
فلسفہ کو ڈھونڈھ نکالے جو ادیب کے خیالوں کو ایک
میں پیش کرنے کا ذریعہ بنا اس طرح یقیناً ایک
تو نقاد کو بھی ادیب کے ساتھ ہر وادی و کہسار میں
پڑے گا اور ہر طرح کی خاک چھاننی ہوگی۔ لیکن ا
یہیں ختم نہیں ہو جائے گا۔ بلکہ آگے بڑھ کر وہ ادیب
سفر کا تجزیہ کرکے اس کے حقیقی خیالات اور معاشی
کا پتہ چلائے گا۔ ادیب کی جانبداری کا ذکر کرے گا
ارتقائے تہذیب میں ادیب کے کارناموں کی جگہ
کرے گا۔ یہ سارے کام محض تشریح یا تاثر کے اظہا
ممکن نہیں ہیں۔ ان کے لئے نقاد میں خود ایک تخلیقی
ضرورت ہے جو تنقید کو بھی ادبی حیثیت عطا کرد
میں نقاد کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور جو کسی ایک
یا تصنیف کا تذکرہ ہونے کے باوجود انسان
اور فلسفیانہ شعور میں اضافہ کا سبب بن جائے۔ او
تخلیقی تنقید کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو
نقاد بھی ادیب کے خیالات کی بنیاد کو ڈھونڈھ کر اس
کا دشمن یا اعلیٰ ادبی رنگ میں اظہار خیال کرے
ادیب کے سماجی شعور کا جائزہ لے۔ فن کی نزاکت

نگاہ ڈالے اور عام پڑھنے والوں کی رہنمائی کرے، اگر کوئی نقاد اس سے بچتا ہے۔ تو وہ تنقید کا حق ادا نہیں کرتا۔

اس مضمون میں اصول تنقید اور تنقید کے ارتقا کے متعلق کچھ لکھنا نہیں، ان کے لئے راقم الحروف کے مضامین "اصول نقد" اور "ادبی تنقید" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، یہاں ان کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے۔ اگرچہ عملی تنقید پر نظر ڈالنے کے سلسلے میں بعض خیالات کی تکرار ضرور ہوگئی ہے۔ تاہم اس مسئلے کے دوسرے پہلوؤں کی طرف قدم اٹھانے سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ تنقید میں خود تنقید کے اصول و نظریات کا مطالعہ بھی شامل ہے اور ادبی تصانیف کا مطالعہ بھی اصول و نظریات میں ادب اور زندگی کا رشتہ، حقیقت اور تخیل، افادیت اور پروپیگنڈہ، مواد اور ہیئت کا تعلق، حسن کا مفہوم، تنقید نگار کا نقطۂ نظر، ادب اور عوام، شعر و ادب میں زبان کی جگہ، اسلوب، فنی اصول اور روایات فن چند اہم مباحث ہیں۔ جن کے ضمن میں اور بہت سے معاشی، سماجی اور نفسیاتی پہلو آ جائیں گے اگر نقاد ان مسائل پر واضح رائے نہیں رکھتا اور اپنی رایوں کو کسی مخصوص فلسفہ ادب سے منطقیانہ طور پر ہم آہنگ نہیں کر سکتا تو اسے عملی تنقید کے میدان میں قدم رکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ انھیں مسائل کے علم کو بنیاد بنا کر وہ کسی ادب پارے کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ اس میں مواد اور موضوع کی صداقت اور فن کی خصوصیات کی جستجو کر سکتا ہے ورنہ وہ یا تو محض اپنے غیر تنقیدی تاثرات پیش کر سکے گا یا تشریح پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوگا۔ مندرجہ بالا مسائل کے متعلق نقاد جس قسم کے رائے رکھتا ہوگا اسی کے مطابق اس کی عملی تنقید ہوگی یعنی اگر وہ سماجی حقیقت پسندی کو اپنے خیالات کی بنیاد بنائے گا۔ تو وہ ادب میں اقدار کی جستجو کرے گا۔ اور اگر اس کا نقطۂ خیال تاثراتی ہوگا۔ تو اس میں مختلف چیزیں ڈھونڈھنے کی کوشش کرے گا۔ اور ہر قدم پر دونوں قسم کے نقادوں میں اختلاف رائے ہوگا۔ اس طرح ایک ہی ادب پارہ عملی تنقید کی بساط پر مختلف حیثیتیں اختیار کرے گا۔ ادبی نظریات کی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں اس لئے عملی تنقید پر نگاہ رکھتے ہوئے نقاد کے نقطۂ نظر کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

تنقید نگار اپنے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر جس طرح ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان سب کا تذکرہ تو ناممکن ہے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ بعض نقاد ادب اور شاعری کو مخصوص قوموں کے مزاج کردار، عادات، اطوار کی روشنی میں پرکھتے ہیں اور ادب کو ادیب کی قومی زندگی سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ طریق کار نسل اور قوم کے غلط نظریات پر مبنی ہے اس لئے جو نتائج اس سے نکلیں گے وہ دلچسپ تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کا صحیح ہونا ضروری نہیں۔ کچھ نقاد اصناف اور ان کی حد بندیوں کو بے حد اہم قرار دیتے ہیں اور ان کی ساری کوشش اسی بات پر مرکوز رہتی ہے کہ کوئی مخصوص نظم یا کتاب کس صنف ادب میں رکھی جا سکتی ہے۔ ادب کو اصناف میں تقسیم کرنے کا کام سب سے پہلے ارسطو اور بعد میں ہوریس نے کیا، ارسطو، افلاطون کے نظریۂ نقل کو سامنے رکھ کر ادب کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ لیرک ایپک اور ڈراما، یہ تقسیم بعد میں نظم و نثر پر حاوی ہوگئی اور کسی نہ کسی شکل میں کلاسیکی ادب کے سارے پرستار اسی تقسیم کو تسلیم کرتے رہے۔ دوسری صنفیں اور قسمیں وجود میں آتی رہیں ـــ وہ بنیادی قسموں کی قسمیں قرار دی گئیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی حدیں برابر ٹوٹتی رہی ہیں اور محض ساخت اور ہیئت کی بنیاد پر ادب کی قدر و قیمت

---

۱ مطبوعہ روایات اور بغاوت۔

اور شعر کی عظمت کا اندازہ لگانا بہت درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں اصل توجہ ادب کے اصل اثر اور اس کی سماجی اہمیت سے ہٹ جاتی ہے۔ فنی پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے ساخت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔ لیکن اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا تنقید سے بے تعلق کر دے گا۔ کچھ نقاد تقابلی مطالعہ کو سب سے اچھا تنقیدی مطالعہ قرار دیتے ہیں، اور تقابلی مطالعہ کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تقابلی مطالعہ ہمیشہ ناقص ہوتا ہے۔ کیونکہ تقابل کے تمام عناصر کو پیش نظر رکھنا تقریباً ناممکن ہے اور اگر ایک یا کئی اہم پہلو نظر انداز ہوتے ہیں تو نتائج بالکل غلط ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کچھ نقاد موضوعات کے اعتبار سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، کچھ سارے ادب کو کلاسکی اور رومانی میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ہر شاعر اور ادیب کو اسی چھ کھٹے میں بٹھانا ضروری سمجھتے ہیں، کچھ تحقیقی میلان رکھتے ہیں۔ اور صرف لفظی مطالعہ کو اہم جانتے ہیں، ان کی ساری قوت اس پر صرف ہوتی ہے کہ مختلف نسخوں میں کسی خاص لفظ کی کیا کیا شکلیں ملتی ہیں۔ اس ضمن میں بہت سی کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں لیکن انھیں تنقید سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ اس میں ادب کے اندر پیش کی جانے والی سماجی اور طبقاتی کشمکش پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

ان کے علاوہ بعض طریقوں نے غیر معمولی اہمیت حاصل کی اور اکثر نقادوں نے انھیں میں سے کسی ایک کو اپنا کر عملی تنقید میں اس سے کام لیا۔ گو تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ انکی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں لیکن ان میں سے تین نظریوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ نقادوں کا ایک بہت بڑا گروہ ادب کے نفسیاتی مطالعہ کا قائل ہے۔ اس قسم کے مطالعہ کی کئی شکلیں ہیں۔ کئی اہم اور مشہور نقاد ادیب اور شاعر کی سوانح عمری کی روشنی میں اس تخلیقات کا مطالعہ کرنے ہی کو تنقید سمجھتے ہیں

یعنی وہ ادب کو شخصیت کا اظہار سمجھتے ہیں اور کچھ
ادب پارے کو اسی ترازو پر تولنا صحیح نتائج تک
سکتا، اس کے علاوہ نقطۂ نظر محدود ہو جاتا ہے۔
سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تحلیل نفسی کے رسیا
آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فن کی تخلیق شعور کا
نتیجہ ہے ادیب اور شاعر کا قلم کسی اندرونی طا
ہے۔ جس طرح بچہ کھیل میں لگ جاتا ہے ویسے ہی
فن میں غیر اختیاری طور پر مصروف ہوتا ہے۔ اد
انسان ہو ہی نہیں سکتا، وہ احساس جرم کے
تدابیر ڈھونڈھتا ہے اور اس کا لاشعور اس کو
نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان تجزیہ نفس والوں نے
عجیب معمہ بنا دیا ہے جس کا تعلق شعور سے
ظاہر ہے کہ نقاد لاشعور کی تلاش میں نہ جانے
بھٹکے گا۔ اور پھر بھی صحیح نتائج تک اس کی ر
یا نہیں، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ پھر اگر اس سا
کے لاشعور نے بھی کوئی راہ اختیار کر لی۔ تو اس
سے باہر نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔ ادبیات کا یہ
بہت کچھ غیر سماجی ہے اور ادیب کے شعوری
کر کے ادب اور ادیب کی سماجی اور تہذیبی اہم
ہے، نفسیاتی مطالعہ کے کئی پہلو اور ہیں جیسے کسی مص
مطالعہ، اس کے تخلیقی عمل کا مطالعہ، تصنیف کے
یا موضوع کا مطالعہ، تصنیف کا جو اثر پڑھنے وا
گا اس کا نفسیاتی مطالعہ، سبھی باتیں نفسیاتی
شامل ہیں اور نقاد ان میں سے ایک یا کئی
مطالعہ کر سکتے ہیں۔ نفسیات کے جتنے نظریے ہیں
نظریے بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی ادیب کو جنسی بیما
ہے جس کی بیماری جسمانی نہیں ذہنی ہے، کوئی
کمتری اور برتری میں مبتلا دیکھتا ہے۔ کوئی ا
اور ایذا دہندہ میں تقسیم کرتا ہے، کوئی غیر متوازن

اور تفریح پسند ہیں پھر ان کے اندر بھی چھوٹی چھوٹی قسمیں ہیں سوال یہ ہے کہ کیا ہم نفسیات کی مدد سے کسی ادبی کارنامے کی قدر و قیمت اور عظمت کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں ؟

نقادوں کا ایک اور گروہ ہے جو تاریخی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ بعض جرمن نقادوں نے اس تصور کو ایک حد تک پہونچا دیا اور "روح عصر" ہی کو سب کچھ قرار دیا۔ کبھی کبھی اس نقطۂ نظر سے دیکھنے والے ادبی کارناموں کا اچھا تجزیہ کر لیتے ہیں لیکن یہ نقطۂ نظر خود تاریخی حقائق کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہتا ہے اور سماجی ارتقاء کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس سے زیادہ سائنٹیفک نقطۂ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر نقطۂ نظر ہے اور ادبی مطالعہ کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا، گو اس پہلو کو پیش نظر رکھنے والے تمام نقاد یکساں بصیرت نہیں رکھتے۔ بعض تجزیہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ بعض ادب اور معاشی ارتقاء کو میکانکی طور پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض تاریخی جبریت کو پیش نظر رکھ کر ادیب کو اسکی سماجی ذمہ داری سے معذور قرار دیتے ہیں۔ بعض ادیب سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ماحولیت کے جبر کو توڑ کر بہتر زندگی کی جانب رہنمائی کر سکتا ہے اور اسے ایسا کرنا چاہئے۔ نقطۂ نظر کے یہ نازک فرق بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ انھیں سے سماج اور زندگی اور ادب کی اصلی جگہ متعین ہوتی ہے اور ادب ارتقاء، تہذیب اور جہد حیات میں ایک مضبوط مگر نازک اور پُراثر آلہ بنتا ہے ادب کی یہ حیثیت کہ اس میں سماجی حقائق اپنی طبقاتی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ادیب کے سماجی رجحان کا پتہ اس کے خیالات سے چلتا ہے، ادیب زندگی کی کش مکش میں شریک ہو کر اسے بہتر بنانے کی راہ بنا سکتا ہے، اختراکی حقیقت نگاری اور مارکسی تنقید میں سب سے زیادہ نمایاں شکل میں ملتی ہے جو نقاد اس نظریہ تنقید کو اپناتے ہیں وہ روح عصر، سماجی نفسیات، عمرانیات یعنی ان تمام باتوں پر نگاہ رکھتے ہیں جو طبقاتی سماج میں پیداوار کی معاشی بنیادوں کے اوپر فکری اور نفسیاتی حیثیت سے وجود میں آتی ہیں۔ تعبیر ادب کے اس مادی نقطۂ نظر پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس پر عمل کرنیوالے ادب میں ادبیت کے بجائے فلسفہ، تاریخ، معاشیات اور دوسرے عناصر کی جستجو کرتے ہیں، یہ درست نہیں ہے کیونکہ ادب محض چند فنی خصوصیات کا مجموعہ نہیں ہے، اس سے زیادہ ہے۔ پھر فنی خصوصیات خود تاریخی حالات اور سماجی ارتقاء سے وجود میں آتی ہیں۔ اس وقت تک عملی تنقید کا یہی طریقہ سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں خارجی اور سماجی کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پاتا۔ لیکن زور انھیں باتوں پر زیادہ دیا جاتا ہے جو ادیب کے شعور (سماجی اور فنی دونوں) سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ نظریہ نہ تو جمالیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کرتا ہے نہ ادب کو عمرانیات اور سیاسیات کا بدل قرار دیتا ہے۔

عملی تنقید کے سلسلے میں یہ سوال بھی برابر پیدا ہوتا ہے کہ کیا شعر و ادب کے اندر فلسفہ کا ہونا ضروری ہے؟ کیا ادب کیا عظمت فلسفہ سے پیدا ہوتی ہے کیا شاعر کے پاس کسی مکمل اور منظم فلسفہ حیات کا ہونا لازمی ہے؟ اس میں شک نہیں کہ فلسفہ اور ادب دو مختلف مظاہر حقیقت ہیں جن کی سرحدیں کئی مقامات پر مل جاتی ہیں مگر ان میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ بہت سے ایسے شاعر اور ادیب ملتے ہیں جن کے مطالعہ کے لئے فلسفہ کا علم ضروری ہے، بعض اوقات ادب تاریخ افکار میں ایک دستاویز کی حیثیت سے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ادیب اور شاعر محض فلسفہ سے متاثر ہی نہیں ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ انھیں اپناتے بھی رہے ہیں، پھر بھی یہ مسئلہ بہت بحث طلب ہے۔ ایک نقاد نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شاعری میں جس فلسفہ کا ذکر ہوتا ہے۔

وہ غلط اور مبتذل یا افتادہ ہوتا ہے، سولہ سال سے زیادہ عمر کا انسان اس سے لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتا۔ جو شاعری فلسفیانہ معلوم ہوتی ہے اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ محض معمولی اخلاقی نکات ہیں۔ ایلیٹ نے بھی کہا ہے کہ حقیقی تفکر نہ تو شیکسپیر کے یہاں ہے۔ نہ ڈانٹے کے یہاں۔ ان خیالوں کے برعکس بھی خیالات ملتے ہیں۔ آرنلڈ نے ایک موقع پر شاعری کو فلسفہ اور مذہب سے بلند تر حقیقت کا حامل کہا ہے۔ تقریباً یہی خیال ایک جگہ افلاطون کے یہاں اور ماضی قریب میں ڈاکٹر اقبال کے یہاں ملتا ہے۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعر و ادب میں افکار و خیالات جگہ پاتے ہیں اور خاص قسم کی فنی لطافت کے ساتھ، لیکن اس بحث سے کچھ نتائج اسی وقت نکل سکتے ہیں۔ جب ہم فلسفہ کا عملی مفہوم متعین کر لیں۔ فلسفیانہ خیالات کے فرق کو سمجھ لیں۔ فلسفی اور ادیب کے ادراک حقیقت کے طریقوں پر غور کر لیں۔ لیکن یہ ساری بحث بہت طویل شکل اختیار کر سکتی ہے، مختصراً ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ایک اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر کے پاس کوئی نہ کوئی خیال ضرور ہوتا ہے اور وہ اپنے افکار و خیالات پیش کرتے ہوئے اس کا خیال ضرور رکھتا ہے کہ اس کے بیانات میں تضاد نہ ہو اور اس کے پیش کردہ حقائق ایک دوسرے کی نفی نہ کریں اور اگر اس کے پاس کچھ کہنے کو ہے تو وہ ایک منطقی تسلسل کے ساتھ پیش کیا جائے معمولی جذباتی باتوں کا ذکر نہیں، اہم حقائق کے معاملے میں کوئی گہری نظر رکھنے والا باشعور ادیب بے عنوانی کو پسند نہیں کر سکتا ہے۔ پھر اگر کسی ادیب کے خیالات تاریخ کے مادی تجزیہ اور سماجی حقائق پر مبنی ہوں گے تو وہاں ایسی غلطی کا امکان کم ہوگا۔ اور افکار میں خود ایک طرح کا فلسفیانہ تسلسل پیدا ہو جائے گا۔ لیکن وہ فلسفہ کا بدل کسی حالت میں بھی قرار نہ پائے گا۔ نظم یا کسی اور ادب پارے کو منظوم فلسفہ کہنا درست نہیں۔ پھر یہ بھی کہنا کہ فلسفیانہ گہرائی ادب میں عظمت

نہیں پیدا کرتی۔ ہٹ دھرمی ہے۔ فلسفہ ادیب کے شعور کا جز ... عملی زندگی کی صداقتوں کا نقیب بن کر ادب میں جگہ پا... اور چونکہ فلسفہ بھی ادب کی طرح معاشی بنیادوں ہی کے ا... وجوہ میں آتا ہے اس لئے دونوں میں ایک ہی قسم کے ح... کا دو طریقوں سے ظاہر ہونا بالکل قرین قیاس ہے حقا... کے اظہار کے طریقوں کو دیکھتے ہوئے بعض اوقات ادب... دوسرے فنون لطیفہ کی تنقید میں بھی یکسانی یا اختلا... اظہار پایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ فنی ح... سے رقص، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور شاعر... رائے دیتے ہوئے مختلف باتوں پر زور دینے کی ضرو... پیش آئے گی، کیونکہ ہر فن کے ارتقا کی تاریخ مختلف... خود ادب کے مختلف اصناف کے مطالعہ میں ان اختلا... کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ کیونکہ ہر صنف کے فنی مطالبات مخ... ہوتے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ نظریہ ت... ہر جگہ بدل جائے گا، کیونکہ تنقید تو حقائق کے جانچنے کے پر مبنی ہے، اس میں حقائق کی ظاہری شکل کے لحاظ سے ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آئے گی اور بس۔ زبان... استعمال، صنائع و بدائع، معانی و بیان، تلمیحات محاکاتی ح... نگاری وغیرہ کے متعلق ہر صنف ادب کے لحاظ سے رائے... جائے گی، کیونکہ ان سب کا استعمال ہر نظم اور ادب پار... یکساں طور پر نہیں ہوتا۔

عملی تنقید نظریات تنقید کا استعمال ہے، شعر و اد... کو جانچنے کیلئے یہ نظریے شعر و ادب کے جانچنے اور پرکھنے ہی... میں پیدا ہوئے ہیں، اور کہیں سے بن کر نہیں آئے ہیں۔ ا... تخلیق اور تنقید میں بہت زیادہ فرق کرنا مناسب نہیں... جائزہ ادیب کو اپنی کاوشوں کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے ا... کے حسن کو دوبالا کرتا ہے اس مختصر مضمون میں نظریاتی اور... پہلوؤں کو مکمل طور پر پیش کرنا ممکن نہیں ہے تاہم اس میں بعض ایسے... اشارے ضرور آگئے ہیں جنکی مدد سے ہم اس اجمال کی تفصیل تیار کر...

(تنقید اور عملی تنقید سے)

سید احتشام حسین

کتابوں کی باتیں

تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

صنف انشائیہ اور چند انشائیے از ڈاکٹر سید محمد حسنین، ناشر ایوان اردو پٹنہ نمبر ۴۔
قیمت چار روپے

ادھر کچھ دنوں سے نثری ادب کی اس صنف کی جانب توجہ کی جارہی ہے جسے انگریزی میں "ایسے" کہا گیا ہے اردو میں اس کے لئے انشائیہ کا لفظ عام ہو رہا ہے، گزشتہ سال حیدر آباد کی ایک خاتون سیدہ جعفر نے اور الہ آباد کے ایک طالب علم سید ناصر حسین نقوی نے تقریباً ایک ہی زمانہ میں اس موضوع پر لکھے ہوئے مقالوں پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ یہ مسرت کی بات ہے کہ دوسرے ادیب بھی ادھر متوجہ ہیں۔ اگرچہ واقعی انشائیے بہت کم لکھے جاتے ہیں۔ انشائیہ کو محض ہلکا پھلکا ہونا ہی یا مزاحیہ مضمون سمجھنا درست نہیں، شگفتگی اس میں ضرور ہوتی ہے لیکن وہ محض طنز و مزاح تک محدود نہیں ہوتی۔ لیکن ڈاکٹر محمد حسنین نے دو تین کو چھوڑ کر باقی جتنے انشائیوں کا انتخاب کیا ہے وہ سب مزاحیہ ہیں۔ مرتب نے اس مجموعہ میں ۲۸ مضامین یکجا کئے ہیں جن میں آزاد، شرر، اور حسن نظامی سے لیکر موجودہ دور کے بہترین مزاح نگاروں کے مضامین شامل کئے ہیں۔ یہ مجموعہ صرف طلبا ہی کے لئے نہیں عام ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے بھی دل کشی کا حامل ہے لیکن انتخاب کا دائرہ اور وسیع ہونا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر محمد حسنین نے ابتدا میں ۴۲ صفحوں کا ایک مفید مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں انشائیہ کی خصوصیات سے بحث کی ہے اور مستند انگریزی انشا پردازوں کے اقوال اور خیالات سے بحث کر کے اردو پڑھنے والوں کے لئے چند کارآمد نتائج نکالے ہیں اس سلسلے میں ہمیں محض الفاظ اور صحت کے متعلق البتہ یہ کہنا ہے زبان میں نئے الفاظ کا اضافہ بری بات نہیں۔ لیکن انھیں غلط نہیں ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر "کہانی" سے "کہانی پن" تو بن سکتا ہے لیکن "کہانویت" بنانا کسی حیثیت سے بھی درست نہیں، بہرحال یہ صاف ستھرا اور خوبصورتی سے چھپا ہوا انتخاب مطالعہ کا مستحق ہے۔

عالم برزخ کا ایک مشاعرہ :۔ ناشر ایوان اردو پٹنہ۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال اور آب حیات میں جس طرح شعرا کی آمد کا ذکر تمثیلی اور علامتی انداز میں کیا تھا۔ غالباً اسی سے مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنا چراغ روشن کیا اور دلی کی آخری شمع جلائی اس کے بعد سے یہ انداز کافی مقبول ہوا اور متعدد ادیبوں نے ایسے مشاعرے کی محفلیں سجائی، چند سال پہلے ایک صاحب نے عالم بالا یعنی فردوس میں ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ لیکن وہ اتنا طویل تھا کہ غالباً کہیں اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکا۔ مولوی مرتضےٰ حسین صاحب

کے عالم ارواح کا ایک مشاعرہ ترتیب دیا جو لکھنؤ سے شائع ہوا — ابواللیث صدیقی نے لکھنؤ کا ایک مشاعرہ تیار کیا۔ گزشتہ سال اظہر علی فاروقی صاحب نے یاد ابام کے نام سے آگرہ کے ایک مشاعرہ کو رو یک کی شکل میں پیش کیا۔ اب ڈاکٹر محمد حسنین کا مرتب کیا ہوا یہ تمثیلی مشاعرہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مشاعروں کا زیادہ لطف اسٹیج پر پیش کئے جانے میں ہے کیونکہ مکالمہ کی شگفتگی اور برجستگی شعراء کی ہیئت گذائی اور انداز نشست و برخاست، سب کی کامیابی کا دار و مدار اسٹیج پر ہے خیال ہے کہ اگر یہ تمثیل قاعدے سے پیش کی جائے تو دیکھنے والوں کو ضرور محظوظ کرے گی۔

انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد:۔

از محمد مسعود جوہر ناشر مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی نمبر ۶۔ قیمت سات روپے۔

جوہر صاحب م م جوہر کے نام سے کئی مختصر تصانیف پیش کر چکے ہیں چنانچہ انقلاب روس پر موصوف کی ایک مختصر کتاب پہلے بھی شائع ہو چکی ہے، ان کے مضامین اور کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں سارے روسی مفکروں اور سیاست دانوں میں ٹراٹسکی نے سب سے زیادہ متاثر کیا، بات بحث طلب ہو سکتی ہے کہ ٹراٹسکی کا نقطۂ نظر انقلاب روس کے متعلق کس حد تک صحیح تھا۔ بہر حال اس تاریخ پر بھی اس کے تصورات کی چھاپ نظر آتی ہے سوا چھ سو صفحات میں جوہر صاحب نے انقلاب روس سے لیکر دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ تک کے واقعات جو روس میں سیاسی تاریخ سے متعلق تھے بڑے دلکش انداز میں بیان کئے ہیں اگرچہ روس میں جو انقلاب ۱۹۱۷ء میں ہوا... وہ محض ایک سیاسی انقلاب نہیں تھا بلکہ اس نے زندگی کا ایک نیا تصور ہی پیدا کیا، جس سے وہاں کی تعلیمی، تہذیبی ادبی، علمی اور فکری زندگی نئے سانچے میں ڈھل گئی۔ ا کے ہر گوشہ میں اس آواز کی بازگشت سنائی دی۔ لہ مصنف نے اپنے خیالات کو محض سیاسی مسائل کی بحث تک محدود رکھا ہے۔ یہ بھی قابل قدر ہے۔ کیونکہ اردو کا دامن ابھی علمی اور تاریخی تصانیف سے کم و بیش ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ سارے افادی علوم کی طرف توجہ کی جائے۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں انقلاب کی تاریخ ہے اور دوسرے حصہ میں اس کی روشنی میں واقعات مابعد کے تجزیہ پیش کیا گیا ہے، مصنف نے مواد کی فراہمی میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ لیکن ایسی علمی کتاب میں حوالجات کی کمی کھٹکتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آخر میں حوالہ کی کتابوں کی ایک فہرست ہی نہیں بلکہ ایک اشاریہ بھی ہوتا۔ فہرست ضروری تھی، اردو دانوں کو جوہر صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے معاصرانہ تاریخ کے ایک بہت اہم حصہ کو عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

کلیات نسیم میسوری:۔

مرتبہ میر محمود حسین لکچرر فارسی کالج میسور۔ ناشر سنٹرل بک ہاوس بنگلور نمبر ۲ قیمت مجلد چار روپے۔

ہندوستان کی زبانوں میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس نے ملک کے گوشے گوشے میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا اور ہر جگہ اپنی علمی و تہذیبی خصوصیات کی روشنی میں ایسا سرمایہ جمع کر دیا جو قابل قدر ہے۔ چنانچہ میسور کا علاقہ لسانی نقطۂ نظر سے کرناٹکی زبان کا علاقہ ہے اردو کا یہ عظیم الشان مرکز رہا ہے جب دکھن میں اردو کا نشو و نما ہوا اسی زمانہ سے میسور میں بھی اس کا سراغ ملنے لگتا ہے لیکن اس علاقہ میں اس کا ارتقا زیادہ تر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہوا، اب جو علمی تحقیق کا ذوق

ہے تو ہر علاقے کے مدفون خزانے باہر آرہے ہیں چنانچہ
حسین صاحب نے میسور کے ایک اہم شاعر بانئے
محمد حسین علی سلطان قریشی۔ نسیم میسوری کا دیوان
کرکے شائع کر دیا ہے اور اس پر ایک مفید مقدمہ
نا ذکیا ہے، نسیم میسوری کا تعلق اس خانوادہ سے
سانے ٹیپو سلطان کو جنم دیا۔ نسیم بھی ایک دلچسپ
نگا رنگ شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۸۲۹ء میں
رے اور ۱۸۸۳ء میں انتقال کر گئے ان کے دیوان کے
مے سے بھی ان کی زندگی کے بعض واقعات پر روشنی
ہے، غزلوں کے علاوہ دوسرے اصناف بھی ان کے
رہے اور ہر ایک میں کچھ نہ کچھ جاذبیت ہے یہ کہنا
ت نہ ہوگا کہ نسیم کا مقابلہ شمالی یا جنوبی ہند کے
یے شعراء سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے کلام کی پختگی
یعنی اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے، مرتب نے مختلف
رمطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کر کے یہ مجموعہ بڑی محنت سے
دیا ہے اور ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے
ے ایک قدیم شاعر سے ہمیں روشناس کرایا۔

...برنگ :- دریاست مدراس کے نمائندہ شعراء کی غزلوں کا انتخاب) ناشر مرکز ادب مدراس قیمت ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے۔

مدراس بھی اردو ادب کا ایک قدیم مرکز رہ چکا ہے۔
ذہبی، سیاسی اور لسانی وجوہ سے اردو کا نشو و نما
اس طرح نہیں ہو سکا جیسا کہ شمالی ہندوستان میں
تاہم یہ بڑی قابل غور بات ہے کہ کوئی زمانہ شاعروں
لوں سے خالی نہیں رہا ہے اور ہر دور میں وہاں بھی
ور ادبا سرگرم عمل رہے ہیں۔ چونکہ وہاں سے اردو کے

اچھے اخبار اور رسالے شائع... نہیں ہو سکے اس لئے اکثر ایسا بھی ہوا کہ جنوبی ہند کے شعراء کے کلام منظر اشاعت پر نہ آسکے اس میں تھوڑی بہت شمالی و جنوب کی عصبیت کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ لیکن اب حالات بدلے ہیں اور خود جنوب میں ادبی مرکز قائم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہ مختصر مجموعہ اس کا ثبوت ہے کہ مدراس کے شعراء کا جذبہ خودشناسی بھی جاگ اٹھا ہے وہاں کے ادیبوں نے ایک مرکز ادب قائم کیا ہے اس کی یہ پہلی پیش کش ہے مجلس ادارت میں صرف حوصلہ مند نوجوان شاعروں اور ادیبوں کے نام نہیں ہیں بلکہ بزرگ علماء بھی شامل ہیں، اس لئے ہمیں یقین ہے کہ یہ ادارہ کام کرے گا اور اعلیٰ پائے کی چیزیں اس کے زیر اہتمام شائع ہوں گی۔

رنگ برنگ میں مدراس کے تیرہ شعراء کی منتخب غزلیں یکجا کی گئی ہیں، یہ سب موجودہ دور ہی کے شاعر ہیں اگرچہ وہ اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اگر ایک طرف شاکر نائطی سے پختہ کار تو دوسری طرف کاوش بدری، دانش فرازی اور حسرت سہروردی کے سے نوجوان شعراء ہیں جو اپنے انداز سے زندگی کی کشمکش کو اشعار میں ڈھال رہے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ مرکز ادب ایسے اور مجموعے شائع کرے گا۔ تاکہ جنوبی ہند کے پھولوں کی خوشبو دور دور تک پھیلے؛

پروفیسر سید احتشام حسین

شعاعیں

ہم نشیں نکہتِ برباد کا ماتم کب تک
پھول ہر روز تو کھلتے ہیں گلستانوں میں

عشق مغرور شرمسار رہا
اُن سے آج عرضِ مدعا کر کے

ہنس کے میں نے جو ہر بلا جھیلی
خود وہ شرما گئے جفا کر کے

کام لاؤ حیات ہی سے لیں!
تھک گئے موت کی دعا کر کے

یہ بھی ہے نظامِ فطرت میں
یوں بھی لیتا ہے کوئی انگڑائی

حُسن نازاں ہے جس تغافل پہ
عشق کو بھی وہ بات آتی ہے

تلخ دونوں کی زندگی ہو جائے
اس طرح سے نہ مجھ کو پیار کرو

وہ دیکھ بھی لیتے ہیں نظر سب کی بچا کر
پھر بھی مری آشفتہ نگاہی نہیں جاتی

کل تو پھر ان کی یاد آئی تھی
آج کیوں ہے فضا اُداس اُداس

بھول جانے کی آرزو کیوں ہے
کیا محبت بھی ہے زمانہ شناس

کیا اور بڑا مرحلہ درپیش ہے کوئی
دل عشق سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں

اک ادھورا خواب بن کر رہ گئی ہے زندگی
اے خیالِ دوست اب تجھ سے بھی ہم گھبرا گئے

یہ آج کیا ہے کوئی راستہ نظر میں نہیں
مرا وجود مری جستجو میں تنہا ہے

ر احتشام حسین رضوی

پنڈت آنند نرائن ملا سے ایک انٹرویو

سین

ملا صاحب! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کی نظمیں اور غزلیں بیس سال سے برابر پڑھ رہا ہوں۔ اور بائیس تیئس سال سے ریب ہوں کہ مختلف ادبی اور علمی مسائل پر آپ سے تبادلۂ خیال ہا ہوں۔ آج کچھ ایسی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں جن کا جاننا ال میں آپ کی شاعرانہ اور ادبی زندگی سے واقف ہونے اور اعری سے لطف اندوز ہونے میں مدد دے گا۔ آپ اجازت یافت کروں۔

آنند نرائن ملا

ضرور ضرور، مگر ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ آپ ٹھہرے بایہ نقاد، ساری کائنات پر نظر رکھنے والے، اور میں صرف ی شاعر۔ اگر میری سطح پر اتر کر سوال کیجیے گا تو شاید ب دے سکوں گا، ورنہ جواب دینا کہیں میری بساط سے ہو جائے۔

سین

خیر یہ تو آپ کا انکسار ہے۔ لیکن آپ کو کچھ خیال ہے کہ آپ کی ر ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا اور وہ خاص محرکات کیا تھے۔ نے آپ کے ذوق شاعری کو اکسایا۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ ی زندگی، تعلیم اور ادبی دلچسپی پر روشنی ڈالیے۔

* * * *

پنڈت آنند نرائن ملا

جو سوال آپ نے کیا ہے اس کا جواب تو کوئی ماہر نفسیات ہی دے سکتا ہے۔ اصل وجہ غالباً ہمیشہ ایک فطری رجحان ہوتا ہے جو زیادہ تر غیر شعوری ہوتا ہے۔ میرے علم میں تو میرے خاندان میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں گزرا جس نے کبھی ایک مصرع بھی موزوں کیا ہو یا جس نے کچھ نثر میں لکھا ہو۔ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی دور کی کوڑی لانے والا ماہر نفسیات نقاد میرے کسی میراث میں وہ تمام عناصر ڈھونڈ لے جو مجھ تک آتے آتے اشعار میں ڈھل گئے۔ لیکن میں اس میراث سے واقف نہیں۔

جیسا میرے بچپنے میں دستور تھا۔ میں نے اردو فارسی گھر پر پڑھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے مولانا برکت اللہ صاحب رضا فرنگی محلی مرحوم کا سا معلم ملا۔ مرحوم محض ایک بہت بڑے عالم ہی نہ تھے بلکہ شاعر بھی تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے، اور ان میں ایک راجہ اشفاق علی خاں بھی تھے۔ چنانچہ جب راجہ صاحب کا دیوان شائع ہوا تو اس میں مولانا کے کئی ایک قطعات قائم تھے۔ اور ان کے سب شاگردوں کا بھی ایک ایک قطعہ شامل تھا۔ جب دیوان میرے ہاتھوں تک پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس میں ایک قطعہ میرے بڑے بھائی کے نام سے اور ایک میرے نام سے بھی شائع کیا گیا تھا۔ مولانا نے ہمارے تخلص بھی رکھ دیے تھے۔ میرے بھائی کا تخلص کمال اور میرا تخلص آتش۔ شاگرد رضا لکھنوی درج تھا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ میں نے یہ سلسلہ آگے بڑھنے نہیں دیا اور یہ تخلص قبول نہیں

کیا۔ ورنہ لکھنؤ میں ایک کے بجائے دو اثر لکھنوی ہو جاتے یہ دیوان غالباً ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا تھا کیونکہ جو قطعہ تاریخ میرے نام سے منسوب تھا اس کا دوسرا شعر مجھے اب تک یاد ہے یہ تھا ؎

سچ میں لکھو اثر تم اس کی تاریخ
ہے شاعر خوش بیان کا نایاب کلام

میں نے کیننگ کالج میں تعلیم پائی کالج میں ہر سال مختلف ہوسٹلس اپنے اپنے مشاعرے کرتے تھے اور ان میں جہاں اور اساتذہ بلائے جاتے تھے مولانا رضا کو بھی دعوت شرکت دی جاتی تھی یاس مرحوم جو بعد میں یگانہ چنگیزی ہو گئے اور حضرت ثاقب لکھنوی کو میں نے پہلے پہل انہیں مشاعروں میں سنا مولانا رضا طرح پر کم سے کم پچاس ساٹھ شعر کہتے تھے اور ۱۵-۱۲ شعر انتخاب کر لیتے تھے اور باقی اشعار شاگردوں میں تقسیم ہو جاتے تھے مجھ کو بھی حصہ ملتا تھا اور مولانا کا اصرار ہوتا تھا کہ میں مشاعروں میں غزل پڑھوں لیکن میری ہمت ہی نہ ہوئی کہ میں ان دیئے ہوئے اشعار سے اپنی شاعری کی دوکان کھولوں۔ مولانا سمجھاتے تھے کہ شاعری کا پہلا زینہ یہی ہے اور بڑے بڑے اس پر سے گزر چکے ہیں۔ لیکن میں اس زینہ پر قدم نہ رکھ سکا۔ کالج تک پہونچنے سے پہلے ہی مجھے انگریزی افسانے پڑھنے کا بے انتہا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور دن میں ایک ناول پڑھ لینا میرے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ کوئی نہ کوئی ناول میرے ہاتھ میں ہمیشہ رہتا تھا۔ اور میں یہ ناول درجے میں بیٹھ کر بھی پڑھا کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہو کہ میں نے انگریزی میں شاعری شروع کی کوئی سات سال میں نے انگریزی میں شاعری کی۔ اس دور میں میں نے اقبال، انیس اور غالب کے کچھ ترجمے بھی انگریزی میں نظم کیے جن میں سے کچھ میرے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔ میری اس زمانے کی انگریزی نظموں میں ایک نظم تھی "THE LAND OF IND" میرے پہلے مجموعہ جوئے شیر میں جو نظم "زمین وطن" کے عنوان سے ہے وہ در اصل اس انگریزی نظم سے ماخوذ ہے۔ میری یہ انگریزی نظمیں بھی حلقہ احباب میں پسند کی گئیں۔ لیکن ۱۹۳۳ء میں میرے محترم بزرگ پنڈت منوہر لال زتشی مرحوم نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں انگریزی کے بجائے اردو میں شعر کہنے کی کوشش کروں۔ اسے میں خوش قسمتی کہوں یا وقت کی بات کہوں کہ میں نے یہ رائے فوراً قبول ہی نہیں کی بلکہ اسی روز سے انگریزی میں کہنا بند کر دیا اور اردو میں شعر کہنے کی کوشش کی . . .
. . . . میری پہلی کوشش کا نتیجہ میری نظم "پرستارِ حسن" ہے جو جوئے شیر میں شامل ہے۔

احتشام حسین

اس سلسلے میں یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ اپنے ابتدائی دور شاعری میں کن کن شاعروں اور ادیبوں یا مفکروں سے متاثر ہوئے اور کیا کسی سے اس حد تک بھی متاثر ہوئے کہ آپ کے دل میں اس کی تقلید کرنے یا اپنے کلام پر اس سے اصلاح لینے کی خواہش پیدا ہوئی ؟

پنڈت آنند نرائن ملا

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں مجھ پر اپنے طالب علمی کے زمانے میں انگریزی ادب کا بہت گہرا اثر تھا۔ میں بائرن، شیلی اور کیٹس سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اردو شعراء میں تین شاعر مجھے اور شعرا سے زیادہ پسند تھے اور ان کا کلام میں نے کئی کئی بار پڑھا تھا۔ یہ تھے غالب انیس اور اقبال۔ میر کی قدر آج میرے دل میں اس زمانے کے مقابلے میں کہیں زائد ہے۔ شعوری طور پر تو میں نے سوائے اقبال کے کسی اور شاعر سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہاں، اقبال کے رنگ میں شروع میں میں نے کچھ نظمیں کہنی چاہیں۔ لیکن مجھے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اگر میں یہ کوشش ترک نہ کر دیتا تو شاید کبھی کوئی انفرادی حیثیت حاصل نہ کر سکتا۔ اصلاح لینے کا تو کبھی کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ میں نے اردو شاعری ۲۵ سال کی عمر میں فارغ التعلیم ہونے کے بعد شروع کی میرے دل میں ایک خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ اور شاید میرے ذہن میں ایک چھوٹا احساس برتری بھی تھا جو مجھے اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ میں کسی ایسے شخص سے جس کے پاس کوئی ڈگریاں نہ ہوں اور جس کی واقفیت مجھ سے بہت کم ہو مشورۂ سخن کروں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شروع شروع میں انگریزی ادب کے زیر اثر میں نے نظمیں کہیں اور میرے زمانے کے اساتذہ غزل گو شعرا تھے۔ اور جس قسم کی نظمیں میں کہتا تھا وہ ان کے مذاق

ں دور تھیں۔ ایسی صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ انداز بیان
ں بتا سکتے تھے اور کوئی اصلاح دے بھی نہیں سکتے تھے۔

م حسین

درست ہے ملا صاحب، جب آپ نے لکھنؤ کے مشاعروں میں
شروع کی تو ظاہر ہے کہ اہم اساتذہ یہاں موجود تھے آپ کے ان سے
ت تھے اور آپ کس حد تک ان کے خیال یا انداز بیان
بتے تھے۔

آنند نرائن ملا

میرا خیال ہے کہ بہ حیثیت شاعر کے میں نے مشاعروں میں ۱۹۲۶ء
سے شرکت شروع کی۔ اس وقت لسان القوم مولانا صفی،
ند مولانا عزیز۔ حکیم ناطق، نواب ببن صاحب بلیغ اور مولانا
نی کے ایسے اساتذہ سخن لکھنؤ میں موجود تھے۔ مولانا آرزو
ے میں کلکتے اور بمبئی میں رہتے تھے اور کچھ سال بعد لکھنؤ پلٹ کر
ے

جناب اثر لکھنوی بھی بہ سلسلۂ ملازمت لکھنؤ سے باہر رہتے تھے
ں ایک دو بار تشریف لاتے تھے۔ جناب عزیز نے مشاعروں
ت ترک کر دی تھی اور صرف ایک مشاعرہ میں مجھے ان کا اہم
نے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اساتذہ میں میں نے تلمذ
م نہیں لیا۔ کیونکہ وہ ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ کی محفلیں سونی کر کے
ے ان اساتذہ کے علاوہ لکھنؤ میں ایک اور گروہ شاعروں کا
ب پارٹی کے نام سے موسوم تھا اس گروہ میں حکیم آشفتہ مرحوم
لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا عبد الباری
ں لکھنؤ میں اپنا مقام بنا چکے تھے اور ان کے ساتھ ان کے بے شمار
ے۔ شوکت تھانوی اور امین سلونوی اسی گروہ میں تھے۔ ان
دہوں کے تعلقات آپس میں کچھ بہت خوشگوار نہ تھے۔ جملہ
نجمن معین الادب میں تھے۔ ینگ پارٹی کی انجمن کا نام
ادب تھا۔ اور مولانا آسی کی انجمن الگ تھی جس کا نام مجھے
ت یاد نہیں۔ مجھے ادب کی دنیا میں یہ تفرقہ سمجھ میں نہ آتا تھا
دلی خواہش تھی کہ میں کسی طرح یہ اختلافات دور کر دوں

اور سب کو ایک انجمن میں شامل کر لوں مجھے خوشی ہے کہ میں اس مقصد
میں کامیاب ہوا اور انجمن بہار ادب کی تشکیل ہوئی جس میں سب
شعرا شریک ہوئے۔ میری آج تک کسی شاعر سے ان بن تو کیا شاعرانہ
چشمک یا تکرار تک کی بھی نوبت نہیں آئی۔ میں نے کبھی کسی محفل میں
اپنی جگہ نہیں ڈھونڈی اور میں نے کبھی کسی شاعر سے کوئی مزاحمانہ
بات کی بزرگوں کا ادب اور احترام کیا۔ برابر والوں میں کبھی تقدیم
اور تاخیر کا قصہ نہیں چھیڑا اور جو خورد تھے ان کو برابر والا سمجھا۔

احتشام حسین

آپ نے ابتدا میں غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی۔ ادھر کچھ دنوں
سے آپ زیادہ تر غزلیں ہی لکھ رہے ہیں کیا آپ غزل کو نظم سے زیادہ
اہم سمجھتے ہیں؟ فن اور فکر دونوں کے لحاظ سے اظہار خیال فرمائیے۔

پنڈت آنند نرائن ملا

بھائی نہ میں غزل کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں اور نہ نظم کو۔ بلکہ صرف
اس بات کو اہم سمجھتا ہوں کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کیا چیز ہے۔
وہ اپنا پیام دینے میں کہاں تک کامیاب ہوا اور اس نے اپنا پیام دینے
کے لیے کیا انداز بیان اختیار کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ادھر میں نے غزلیں نظموں
کے مقابلے میں زیادہ کہی ہیں۔ اس کے دو سبب میری سمجھ میں آتے ہیں۔
ایک تو یہ کہ میری طبیعت روز بروز مشکل پسند ہوتی جا رہی ہے اور جو
چیز میرے معیار پر پوری نہیں اترتی اسے میں اپنے کلام میں جگہ دینے کو
تیار نہیں دوسرے یہ کہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد کوئی سینس جو
دل و دماغ پر چھا جائے نظروں کے سامنے نہیں رہا غالباً اور شعراء پر بھی
اس کا اثر پڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج غزلیں زیادہ کہی جا رہی ہیں۔
یہ صحیح ہے کہ انسان کو ابھی اپنا انتہائی مقصد حاصل کرنے کے لیے بہت
سے معرکے سر کرنے ہیں اور شاعر کا کلام یہی ہے کہ وہ نوع انسان کو
اس میں مدد دے۔ لیکن جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں ابھی اس کی کوئی واضح
اور نمایاں تصویر نظروں کے سامنے ابھری ہے۔ اس کے علاوہ میں چند
سال سے اپنے فرائض میں کچھ اس طرح محو ہو گیا تھا کہ کسی اور بات پر غور کرنے
کی کوئی فرصت نہ تھی۔ میں نے اس واسطے یہ صورت نکالی کہ نظم کو غزل
کے سانچے میں ڈھال لیا اور درد انسان کو اس کا خاص موضوع بنا لیا۔

احتشام حسین

ملا صاحب، اب میں براہ راست یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی جنگ آزادی سے آپ کس حد تک متاثر ہوئے اور اس کا اثر آپ کی ادبی زندگی پر کس حیثیت سے پڑا؟

پنڈت آنند نرائن ملا

جنگ آزادی کا جو اثر مجھ پر پڑا وہ میرے کلام سے ظاہر ہے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ میری نظموں میں اس جنگ آزادی کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے یہ تصویر بہت روشن نہ ہو لیکن ایسی کچھ دھندلی بھی نہیں ہے۔ میں اس جنگ سے اسی طرح متاثر ہوا جس طرح اور لاکھوں کروڑوں ہندوستانی جنھیں اس دور میں پیدا ہونے کی سعادت نصیب ہوئی لیکن جنگ آزادی کے کیں داشد اخر مجھ پر مہاتما گاندھی کی شخصیت اور ان کی تحریک عدم تشدد کا ہوا۔ پنڈت نہرو آج تک میرے دل و دماغ پر بڑی حد تک چھائے ہوئے ہیں۔ اس تحریک نے میں سمجھتا ہوں کہ خالی مجھی کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو متاثر کیا اور ارتقائے انسانی اور امن عالم کے لیے ایک نیا راستہ دکھایا۔ اگر میں عدم تشدد کا قائل نہ ہوتا تو شاید آج میں بھی اشتراکیت پر ایمان لے آتا جس انداز سے یہ جنگ لڑی گئی اس نے یقیناً مجھے زندگی کا ایک فلسفہ دیا، میرے خیالوں کو ایک موڑ دیا اور اس طرح میرے تصوّر حیات و کائنات کو ایک نیا رنگ دیا۔

احتشام حسین

آپ نے مدتوں وکالت کی اور قانونی نکات پیش کرتے رہے پھر برسوں ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے حقائق اور قوانین کو پرکھتے رہے۔ اس سے آپ کو جو ذہنی اور جذباتی تربیت ہوئی کیا اس کا اثر بھی آپ کی شاعرانہ اور ادبی زندگی پر پڑا۔

پنڈت آنند نرائن ملا

بھائی، اگر تم اسے نازیبا دعویٰ نہ کہو تو میں عرض کروں گا کہ میں ان خوش قسمت یا بدقسمت لوگوں میں سے ہوں جو اگر داڑھی نہیں تو کم سے کم مونچھیں لے کر خود پیدا ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میرے ذہن میں ایک توازن بچپنے میں بھی موجود تھا۔ میں نے کوئی بات جب تک وہ خود

میرے ذہن کو قبول نہیں ہوئی محض اس وجہ سے کہ کوئی بڑا آدمی وہ بات کہہ رہا ہے کبھی نہیں مانی۔ اس ذہنی افتاد نے مجھے خود ہر بات پر مختلف پہلوؤں سے سوچنا سکھایا۔ اور اب تو یہ عادت میرے مزاج کا جزو بن چکی ہے اس عادت نے اکثر مجھے نقصان بھی پہنچایا۔ ۱۹۲۳ء میں میں نے I.C.S کا امتحان دیا اور میں صرف اردو میں بہت کم نمبر پانے کی وجہ سے ناکامیاب رہا۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ ایک سوال کے جواب میں میں نے میر کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم نہیں کیا اس لیے شاید ممتحن نے یہ رائے قائم کی کہ یہ اردو ادب سے بالکل بے گانہ ہے اور اسے اردو میں اچھے نمبر نہیں دیئے جا سکتے۔ وکالت کا پیشہ بھی ذہن کو توازن بخشتا ہے۔ کوئی وکیل جب تک کہ وہ جو کچھ اس کے خلاف کہا جا سکتا ہے اس پر غور نہیں کرتا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ججی تو توازن کا دوسرا نام ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ میرے لیے مناسب ہوگا اگر میں اپنا تخلص توازن رکھ لوں۔ میرے توازن کا یہی ثبوت کیا کم ہے کہ آپ نے اتنے سوال کیے لیکن میں نے کسی جواب میں کسی بہانے سے اپنے کچھ شعر شامل نہیں کر دیئے۔ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ نقاد توازن کو شاعر کے لیے عیب قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک کوئی شخص جو پہلے ایک ذمہ دار شہری ہے اور پھر کچھ اور صحیح مفہوم میں شاعر نہیں ہو سکتا۔ معلوم نہیں آپ کی کیا رائے ہے۔ مگر میرے نزدیک خالی ستاروں پر نظر رکھنا شاعری نہیں جب تک کہ پاؤں زمین پر مضبوطی سے جمے نہ ہوں۔

احتشام حسین

میں آپ سے بالکل متفق ہوں اس وقت موقع ہے تو ایک بات یہ بھی پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ آپ کے خیال میں اردو ادب پروپیگنڈا بنے بغیر قومی یک جہتی میں کس طرح مدد دے سکتا ہے؟

پنڈت آنند نرائن ملا

آج کل قومی یک جہتی کا سوال ہر پلیٹ فارم سے اٹھایا جاتا ہے اور مختلف حکیم مختلف نسخے تجویز کر رہے ہیں۔ پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ میں قومی یک جہتی سے زیادہ انسانی یک جہتی کا قائل ہوں قومی یک جہتی اگر انسانی یک جہتی حاصل کرنے کے لیے زینہ

ے تو کیا کہنا ہے۔ لیکن میرے دل میں بہت سے شک پیدا ہوتے
مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آج قومیت، نیشنل ازم بھی انسانی یک
کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میں تو چاہتا ہوں
ار اور ادیب قومی یک جہتی کے مقابلے میں انسانی دوستی پر
توجہ دیں۔ یک جہتی ہم خیال اور ہم مقصد ہونے سے پیدا ہوتی
پ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ملک کو آزاد کرانے کی
ں ایک ایسا مشترکہ مقصد تھا کہ ملک بھر میں یک جہتی پیدا
تھی۔ آج ملک کے سامنے کوئی مشترک مقصد نمایاں طور پر
یہاں بتانے کی گنجائش نہیں کہ یہ قصور کس کا ہے۔ میرا خیال ہے
ار اور ادیب ایسے دو مقصد ملک کے سامنے رکھ سکتے ہیں
یک جہتی پیدا کر سکتے ہیں اول جمہوریت کی بقا قیام اور
ت کے لیے آواز بلند کرنا۔ دوسرے امن عالم کے لیے ایک مسلسل
ظاہر ہے کہ اس آواز میں اثر وہی شاعر اور ادیب پیدا
کر سکتے ہیں جن کے پیام اور زندگی میں تضاد نہیں جن کے دل میں
خلوص ہے اور جو محض نعروں کا سہارا لے کر کسی سیاسی نظریہ کی
تبلیغ میں شعلہ فشانی نہیں کر سکتے۔ بلکہ مظالم انسان کو ہمدردانہ
نرمی کے ساتھ راہ دکھاتے ہیں ادب عالیہ میں وہی چیز جگہ پاتی ہے
جو سننے والے یا پڑھنے والے کو ہمدردانہ لہجے میں مخاطب کرنے
اور اس کی صلاحیتوں کو بیدار کر کے اسے صحیح راستہ اختیار کرنے پر
مائل کرے نہ کہ اسے گرفتار کر کے کشاں کشاں کسی طرف لے جائے۔
ایسی کوشش میرے نزدیک نہ تو کامیاب ہوتی ہے اور نہ اس کا
اثر دیرپا ہوتا ہے۔

احتشام حسین

ملا صاحب آپ کی گفتگو سے میرا ذہن بھی روشن ہوا اور میرا خیال ہے
کہ بہتوں کا ہوا ہوگا۔ آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی ادبی اور علمی زندگی کے
متعلق ایسے گرانقدر خیالات پیش کیے۔ یقیناً ادب کے طالب علم کو ان سے فائدہ ہوگا۔

(دہلی سے براڈکاسٹ)

نریش کمار شاد

جدید تنقید کے مقتدر رہنما

سیّد احتشام حسین سے انٹرویو

شاد۔ ڈاکٹر صاحب! پہلے تو یہ فرمائیے کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے اور آپ نے کہاں کہاں سے اور کہاں تک تعلیم حاصل کی

احتشام۔ آپ نے مجھے ڈاکٹر کہا ہے۔ پہلے اس کی تصحیح کر لیجئے۔ میرے پاس ڈاکٹری کی کوئی سند نہیں ہے۔ میں پیدا تو ہوا ہوں ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو لیکن طور سے ۱۱ جولائی ۱۹۱۲ء لکھتا رہتا ہوں کیونکہ اسکول کے کاغذات میں یہی تاریخ لکھائی گئی تھی۔ ۲۱ اپریل کا یقین اس لیے ہے کہ یہ تاریخ گھر کے بعض قدیم کاغذات میں اور عزیزوں کے بعض خطوط میں مل گئی اور والدہ نے جو عربی مہینے کی تاریخ بتائی وہ بھی مطابقت رکھتی ہے۔ مقام پیدائش کی بھی صورت یہ ہے کہ میں ہر جگہ قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ لکھتا رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پیدائش ماہل سے پندرہ سولہ میل دور جون پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی جہاں میرا خاندان پندرہ بیس برسوں کے لیے ماہل طاعون پھیل جانے کی وجہ سے منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن مستقل وطن ہونے کے باعث میں اکثر و بیشتر ماہل ہی کو اپنا وطن قرار دیتا ہوں ابتدائی تعلیم مکتب اور پھر ماہل کے اُردو اسکول میں ہوئی۔ ہائی اسکول اعظم گڑھ کے ویسلی ہائی اسکول سے پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کائستھ کالج الہ آباد سے، بی اے، اور ایم اے الہ آباد یونیورسٹی سے۔ ایل ایل بی میں پڑھ رہا تھا کہ ۱۹۳۸ء میں ملازمت مل جانے کی وجہ سے تعلیم سے کنارہ

شاد۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب اور کیونکر ہوا، سب سے پہلی تخلیق کیا تھی اور کہاں شائع ہوئی؟

احتشام۔ یہ تو یاد نہیں کہ بالکل ابتدا میں کیا کیا لکھا۔ لیکن یہ یاد ہے کہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے افسانے لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا کبھی کبھی شعر کہہ لیتا تھا لیکن جہاں تک یادداشت کام کرتی ہے، سب سے پہلا مضمون جو شائع ہوا وہ مسٹر میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کے کیونزم پر تبصرہ تھا جو "تالشی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ پھر جلد جلد چند مضامین اور افسانے "نگار" لکھنؤ، "سرپنچ" لکھنؤ، "حریم" لکھنؤ "نظارہ" لکھنؤ، "یادگار" لاہور اور "جہانگیر" لاہور میں شائع ہوئے۔

شاد۔ کن کن ملکی اور غیر ملکی ادیبوں سے متاثر ہو کر آپ نے لکھنا شروع کیا؟

احتشام۔ ابتدا میں غیر ملکی اثرات کا تو خیال بالکل نہیں آتا۔ اُردو کے ادیبوں میں سب سے گہرا اثر نیاز فتحپوری کا ہے جو ابتدائی تحریروں میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ بعد میں اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور سیکڑوں ملکی اور غیر ملکی ادیبوں..... سے خوشہ چینی کا موقع ملا لیکن یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ درحقیقت اثر کن کن ادیبوں کے پڑے۔

شاد۔ اقبال اور پریم چند کے بعد آپ اُردو کا سب سے بڑا شاعر اور افسانہ نگار کسے سمجھتے ہیں؟

احتشام۔ یہ کچھ طالب علمانہ سا سوال ہے۔ اس کا جواب قطعی شکل میں دینا تو ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ میری پسندیدگی کسر غیر جذباتی ہے۔ اچھے نظم و نثر لکھنے والوں میں کبھی کسی کی تخلیق بہت اچھی معلوم ہوتی ہے کبھی کسی دوسرے کی۔ اس لیے ترجیحات معین اور اٹل نہیں ہیں۔ شاعروں

افسانہ نگاروں میں شمار کرتا ہوں۔ مثلاً جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض۔ جمیل مظہری اور افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی۔ اگر شاعروں اور افسانہ نگاروں کے علاوہ بھی نام لینا ضروری ہوں تو میں ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عابد حسین، غلام السیدین، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی کے نام بھی شامل کروں گا۔ نئی نسل والوں کی بھی ایک اچھی خاصی فہرست میرے ذہن میں ہے، جن کا ذکر مختلف مضامین میں بار بار کرتا رہا ہوں لیکن آپ کا سوال اتنے طویل جواب کا مطالبہ نہیں کرتا۔

شاد۔ بہترین شعر اور بہترین افسانے کی آپ کے نزدیک مختصر ترین تعریف کیا ہے؟

احتشام۔ جو شعر یا افسانہ فن کی کچھ خصوصیات کے ساتھ میرے ذہن اور جذبے دونوں کو متاثر کرتا ہے، اسی کو میں اچھا شعر اور اچھا افسانہ کہتا ہوں۔

شاد۔ کیا ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے؟ اگر ہے تو اس کی وجہ؟ اور اگر نہیں تو یہ مسئلہ پیدا ہی کیوں ہوا؟

احتشام۔ مجھے اُردو ادب میں قطعاً جمود نہیں دکھائی دیتا۔ یہ سوال اُن نئے پُرانے ناآسودہ ادیبوں نے پیدا کیا ہے، جنھیں بدقسمتی سے وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جسے وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ اور غالباً دوسرا سبب یہ ہے کہ آج ادبی اور فنی قدروں کے تعین میں بڑی افراتفری ہے اور بہت سے لوگ یہ سمجھنے سے معذور ہیں کہ ادب میں کیا ہوتا ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔

شاد۔ آپ کے سیاسی نظریات کیا ہیں اور کیا ہر ادیب کے لیے کسی مخصوص سیاسی نظریے کا حامی ہونا ضروری ہے؟

احتشام۔ اگر سیاسی نظریے سے آپ کی مراد کسی سیاسی پارٹی کا نظریہ ہے تو میرا کوئی نظریہ نہیں۔ لیکن ویسے میں اپنے طور پر اشتراکیت کے اکثر و بیشتر اصولوں کو پسند کرتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اسی مفہوم میں ایک ادیب کا سیاسی نظریہ ہو سکتا ہے جسے ہم دوسرے لفظوں میں زندگی کا تصور کہہ سکتے ہیں اور جس کے بغیر اعلیٰ ادب کی تخلیق میرے خیال میں ناممکن ہے۔

شاد۔ آپ ادب میں افادیت اور مقصدیت کے کس حد تک قائل ہیں؟

احتشام۔ میرے خیال میں افادیت اور مقصدیت سے کوئی ادب خالی نہیں۔ صرف اس کی ضرورت ہے کہ ہمیں ادب اور فن کے سلسلے میں افادیت اور مقصدیت کے معنی معلوم ہوں۔

شاد۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اب یہ تحریک ختم ہو گئی ہے اور کیا اب اس کی ضرورت نہیں رہی؟

احتشام۔ جو لوگ اسے سیاسی تحریک سمجھتے تھے اُن کے لیے یقیناً یہ تحریک ختم ہو گئی ہے لیکن ادب میں ترقی پسند تحریک نے جن قدروں کو بنیادی جگہ دی تھی اُن کا اب بھی ذکر آتا رہتا ہے اور اُس وقت تک آتا رہے گا جب تک وہ جمہوری اور انسانیت نواز قدریں عام نہ ہو جائیں جن کے لیے ہر مہذب انسان نہ صرف سوچتا رہتا ہے بلکہ اپنے دائرے میں کسی نہ کسی حیثیت سے اُن پر عمل بھی کرتا ہے۔ یہ عمل انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ مادّی بھی ہے اور روحانی بھی۔ قومی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی۔ عصری بھی ہے اور آفاقی بھی۔

شاد۔ اُردو کے بالکل نئے ادیبوں میں آپ کی نظر میں کون کون سے قابلِ ذکر ادیب ہیں؟

احتشام۔ شادؔ صاحب! بات یہ ہے کہ مجھے یہ سمجھنے میں ہمیشہ دشواری ہوئی کہ بالکل نئے ادیبوں کا سلسلہ کہاں سے شروع کیا جائے۔ اس لیے اس سوال کے جواب میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ ہر بار رسائل میں ایک دو ایسے نام نظر آجاتے ہیں جن کی اس سے پہلے کوئی چیز نہیں پڑھی ہوتی لیکن جو چیز نظر کے سامنے ہوتی ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ مجھے خبر نہیں ہوتی کہ وہ اس کی پہلی تخلیق ہے یا بدقسمتی سے میں ہی اسے پہلی بار پڑھ رہا ہوں۔ اس لیے ناموں کی فہرست طویل ہی نہیں ہوتی جا رہی ہے بلکہ کتنی چھٹتی بھی رہتی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ نئے ادیبوں کو جتنا پڑھ سکتا ہوں پڑھوں اور جب اُن کی بہت سی چیزیں نگاہوں کے سامنے آجائیں تو کوئی رائے قائم کروں۔ محض نام گنانے میں خطرہ یہ ہے کہ شاید اس وقت سارے نام ذہن میں نہ ہوں اور اس سہو سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ میں بعض لکھنے والوں کو قابلِ ذکر

بھی نہیں سمجھتا۔ اس دشواری کی وجہ سے بہت سے نام گنانا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر ۱۹۴۷ء سے بھی شروع کروں تو فہرست خاصی طو

شاد۔ آپ کے خیال میں کسی ادیب اور شاعر کے شعور کی جستجو کس حیثیت سے کی جاسکتی ہے؟

احتشام۔ کسی ادیب اور شاعر کے شعور کی جستجو کئی حیثیتوں سے کی جاسکتی ہے کیونکہ شعور کی انفرادیت میں جانے کتنی منزلوں اور خوابوں سے بہت سے پردے گرتے اور بہت سے اُٹھتے ہیں۔ ماحول کی مادی بنیادوں سے لے کر خوابوں کی رنگا رنگی تک نہ جانے کتنی منزلیں اور ہر منزل انسانی شعور پر اپنا عکس چھوڑتی ہے۔ گو اصل بنیاد معاشی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے متعین ہوتی ہے لیکن دوسرے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح فرد کا شعور مخصوص مادی حالات اور سماجی ماحول میں مسلسل عمل اور ردِ عمل سے تشکیل پاتا۔ کسی کے پاس بنا بنایا شعور نہیں ہوتا بلکہ بنتا ہے اور حالات بدلیں تو بدل بھی جاتا ہے۔ انسان ماحول کو بدلتا ہے اور اس کے بدلنے سے خود بھی بدل جاتا ہے۔ اس طرح فرد کے شعور کے مطالعے میں سماج کی بدلتی ہوئی مادی حالت کا مطالعہ ایک جزوِ لازم کی حیثیت سے شامل ہے۔ عمل اور ردِ عمل کا یہی تسلسل ہے جس کے نظر انداز ہو جانے سے فرد کا شعور گرفت میں نہیں آتا۔

شاد۔ کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شاعر اور فنکار کا طبقاتی رُجحان اُس کے فلسفۂ حیات کا پتہ دیتا ہے؟

احتشام۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر اور فنکار کا طبقاتی رُجحان اُس کے فلسفۂ حیات کا بہت کچھ پتہ دیتا ہے لیکن محض یہ دیکھنا کہ شاعر کس طبقے میں پیدا ہوا یا سماج کے کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے کافی نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُس نے زندگی کی کش مکش کے سمجھنے میں اپنے ذہن و شعور کی توسیع کس طرح کی اور عصری مسائل کے سمجھنے . . . . کے سلسلے میں کیا رویّہ رہا۔ محض کسی طبقے میں پیدا ہونا ایک شخص کو اُس طبقے کا نہیں بناتا بلکہ اُس طبقے کے مفاد کی ترجمانی کرتے رہنا۔ اس کی جدوجہد میں حصّہ لیتے رہنا طبقاتی شعور کی سطح کو متعین کرتا ہے۔

شاد۔ آپ کے نزدیک نقاد کا منصب کیا ہے؟

احتشام۔ نقاد کا منصب یہ ہے کہ وہ ادیب کے محرکاتِ تخلیق کا پتہ لگائے۔ اُن سرچشموں کا منبع تلاش کرے جہاں سے ادیب نے زندگی لی ہے۔ اُس فلسفے کو ڈھونڈ نکالے جو ادیب کے خیالات کو ایک مربوط شکل میں پیش کرنے کا ذریعہ بنا۔ اس طرح یقیناً ایک تو نقاد کو بھی ادیب کے ساتھ ہر وادی و کہسار میں چلنا پڑے گا اور ہر صحرا کی خاک چھاننی پڑے گی۔ لیکن اُس کا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ آگے بڑھ کر وہ ادیب کے ذہنی سفر کا تجزیہ کرکے اُس کے حقیقی خیالات اور معاشی تعلقات کا پتہ چلائے گا۔ ادیب کی جانب داری کا ذکر کرے گا اور ارتقائے تہذیب میں ادیب کے کارناموں کی جگہ متعین کرے گا۔

شاد۔ آپ خیال کو مقدم سمجھتے ہیں یا اسلوب کو؟

احتشام۔ اس پر بارہا بہت تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ مختصراً پھر عرض کرتا ہوں۔ اعلیٰ ادب کی تخلیق میں مجھے ان دونوں کا وجود لازمی نظر آتا ہے۔ رہی خیال کی اولیت، اس کا میں کسی حد تک اس لیے قائل ہوں کہ بغیر کسی جذبے، خیال، تجربے یا موضوع کے لکھنے کی تحریک نہیں ہوسکتی۔ صرف اسلوب کبھی اعلیٰ تخلیق کا محرک نہیں ہوا۔ اس معنی میں خیال کو اسلوب پر اولیت حاصل ہوسکتی ہے لیکن فنی تکمیل کی منزل پر پہنچ کر دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

شاد۔ اپنے ہم عصر تنقید نگاروں میں کون کون سے تنقید نگار آپ کو پسند ہیں؟

احتشام۔ ہم عصر نقادوں میں آل احمد سرور، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ممتاز حسین، فراق گورکھپوری، عبادت بریلوی، اختر اورینوی، سجاد ظہیر اور محمد حسن کی تنقیدیں تو اکثر و بیشتر پڑھتا رہتا ہوں لیکن کلیم الدین احمد، حسن عسکری، خورشید

خلیل الرحمن اعظمی، ریاض احمد، جمیل جالبی اور بعض جدید نقادوں کی تحریریں بھی بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور اُن کے بعض مضامین پسند بھی کرتا ہوں۔

شاد۔ تنقید نگاری کے علاوہ خود لکھنے کی حد تک آپ کو ادب کی اور کس کس صنف سے دلچسپی ہے؟

احتشام۔ اب تو تنقید کے علاوہ بس کبھی کبھی ایک آدھ شعر کہہ لیتا ہوں اور دل ہی دل میں اگر دو کرتا ہوں کی حسرت پر پیچ و تاب کھاتا ہوں کیونکہ کبھی کبھی دل میں ناول، افسانے اور ڈرامے کے علاوہ سماجی علوم پر کچھ لکھنے کی آگ بھی بھڑکتی ہے لیکن وقت کی تنگی، مشغولیت اور حالات کی سرگرانی اُسے ٹھنڈا کر دیتی ہے۔

شاد۔ تخلیقِ ادب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُس سے ادیب کو ایک گونہ سکون حاصل ہوتا ہے، آپ اس پہلو کو کس حد تک اہمیت دیتے ہیں؟

احتشام۔ بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں بشرطیکہ یہ ذہنی بیماری کی شکل میں نہ ہو۔

شاد۔ آپ کی ادبی زندگی میں آپ کی سب سے زیادہ رہنمائی کس نے کی؟

احتشام۔ میرے خیال میں میری سب سے زیادہ رہنمائی احتشام حسین ہی نے کی ہے۔ کیونکہ میں نے خود ہمیشہ اپنے خیالوں اور تحریروں کا سختی سے احتساب کیا ہے اور دوسروں کی کوئی بات اُس وقت تک قبول نہیں کی جب تک کہ میرے دل نے بھی اُسے قبول نہ کیا۔ ادب کے سلسلے میں یہ بات کسی قدر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ عملی زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں کمزوری برتتا ہوں۔

شاد۔ حب الوطنی اور بین الاقوامی اخوت میں آپ کسے ترجیح دیتے ہیں؟

احتشام۔ مجھے تو دونوں میں کوئی تضاد یا اختلاف نظر نہیں آتا۔ مجھے حب الوطنی اور بین الاقوامی اخوت دونوں عزیز ہیں۔ ان میں ترجیح کا بھی کوئی سوال نہیں ہے۔ ہاں جارحانہ قوم پرستی اور عام انسان دوستی میں انتخاب کا سوال ہوتا تو دوسری بات تھی۔

شاد۔ آپ کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ جس نے آپ کی ادبی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو۔

احتشام۔ جہاں تک ادبی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالنے کا سوال ہے مجھے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے سوا اور کوئی دوسرا واقعہ یاد نہیں آرہا ہے۔ رہے وہ محرکات جنھوں نے شعر کہلائے یا افسانے لکھنے پر مجبور کیا، اُن کا براہ راست تعلق ادبی زندگی سے نہیں ہے۔

شاد۔ کیا ادیب کی زندگی میں شراب اور عورت کو خاص اہمیت حاصل ہے؟

احتشام۔ ہر ادیب کی زندگی میں تو نہیں ہے لیکن کچھ ادیبوں کی زندگی میں ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں شراب اور عورت ہی کیا انفرادی طور پر کوئی چیز، کوئی نقطہ نظر، کوئی تصور ایسی ہی اہمیت اختیار کر سکتا ہے۔

شاد۔ اور کیا اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

احتشام۔ یوں بھی ہوتا ہے اور اس کے برعکس بھی۔ ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے کہ اچھائی ایک اضافی تصور ہے۔ اُسے کسی چیز پر منطبق کرتے وقت بہت غور و فکر سے کام لینے کی ضرورت ہوگی۔ دونوں کا ربط معلوم کرنے کا کوئی معین پیمانہ نہیں ہے۔

شاد۔ کیا ادب ادیب کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے؟

احتشام۔ شخصیت ادب میں بڑے پیچیدہ طریقوں سے نمایاں ہوتی ہے، اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ زندگی کے ظاہری نقوش اور ادب میں کوئی واضح ربط دکھائی دے۔ لیکن کسی نہ کسی شکل میں ادیب کی شخصیت کا سب سے اچھا اظہار اُس کی تخلیق ہی میں ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ قاری کی گرفت میں آسکے یا نہ آسکے۔

شاد۔ تو کیا ایک قاتل یا ڈاکو کا تخلیق کیا ہوا ادب بھی ظاہری طور پر نہ سہی باطنی اعتبار سے اُس کی شخصیت کا ترجمان ہوگا؟

احتشام۔ قاتل اور ڈاکو ہر وقت قاتل اور ڈاکو نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر وہ کچھ لکھے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی زندگی کے یہ پہلو بھی اس
تخلیق میں جگہ پائیں۔

شاد۔ لیکن کچھ اصحاب کے خیال میں ادب ادیب کی شخصیت کا نہیں کہ شخصیت سے اس کے فرار کا عکس ہوتا ہے

احتشام۔ بیمار اور مجروح ذہنوں کے لیے ہوسکتا ہے کہ وہ غیر شعوری یا شعوری طور پر اس کی کوشش کریں۔

شاد۔ آخر میں صرف یہ اور فرمادیجیے کہ آپ کے خیال میں ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے اور کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ ہندوستان
میں اردو کی بقا کی صرف یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا جائے۔

احتشام۔ اُردو کے لیے دیوناگری رسم الخط اپنانا اُردو کی بقا کا کسی شکل میں ضامن نہیں ہوسکتا۔ یہ اُردو کی بقا کے بجائے اُس کی انفرادیت
کو ختم کرنے کا ایک نعرہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُردو کی اشاعت دیوناگری یا رومن رسم الخط میں نہ کی جائے۔
ہندوستان میں اُردو کے مستقبل کا سوال۔ اس کا جواب تو وقت ہی دے سکے گا۔ اس وقت حالات یقیناً اچھے نہیں ہیں۔

وقار خلیل

اُتّر پردیش میں اُردو کے مسائل

پروفیسر احتشام حسین سے بات چیت

ہندی پرچار سبھا حیدرآباد کی سلور جوبلی کے موقع پر منعقدہ سمپوزیم میں شرکت کے لئے ممتاز ادیب و نقاد جناب پروفیسر سید احتشام حسین رضوی صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۲ ستمبر کو ایوان اردو میں راقم السطور نے پروفیسر صاحب سے یو۔پی میں اردو کے تعلق سے بات چیت کی۔

آزادی سے پہلے یو۔پی میں اردو کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین رضوی نے بتایا کہ اگر آزادی کے پہلے کے دس بیس سال قبل مراد ہے تو دونوں حالات میں فضا کے لحاظ سے کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہوا۔ کیونکہ ہندستانی سیاست جس راہ پر جا رہی تھی۔ اس سے اردو کو پہلے ہی سخت دھکا لگ چکا تھا۔ ایک مشکل جو سب سے زیادہ خطرناک معلوم ہوتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ مسلم لیگ نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ اردو دانوں کی ایک خاصی جماعت اس خیال کی مخالف بھی تھی۔ اس سے جو نقصان پہونچ سکتا تھا وہ پہونچ گیا۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ پرستوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ آزادی کے بعد اس صورت حال میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ قانوناً دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی اتر پردیش کی سرکاری زبان قرار پائی۔ اسی ذریعہ سے کے قانون میں اردو کے حق کو ملیامیٹ کر دینے کی پوری طاقت تھی۔ چنانچہ اس کا سہارا لے کر عدالتوں نے اور محکمہ تعلیم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اتر پردیش میں ہندی کے سوا کسی دوسری زبان کی گنجائش ہی نہیں ہے نہ قانوناً ہم سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم ہندی کے سوا کسی دوسری زبان۔ (یعنی اردو) میں عدالت کے لیے کوئی کاغذ قبول کریں۔ یا اس کی تعلیم کا انتظام کریں۔ چنانچہ بہت سے میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں نے اپنے ہاں سے اردو خارج کر دی۔ پرائیوٹ اسکولوں اور کالجوں نے اردو کی تعلیم سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور عدالتوں نے اردو میں کسی قسم کے کاغذات قبول کرنا بند کر دیا۔ اس زبردست تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو جو بعض حیثیتوں سے بعض علاقوں میں ہندی سے زیادہ مقبول تھی۔ بڑی نیچی سطح پر آگئی۔

دوسرا بڑا اثر جو اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ یہ ہوا کہ خود اردو دانوں میں بیچارگی اور مایوسی کا احساس پیدا ہو گیا۔ اور انھوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ صرف ہندی جاننے سے ملازمتیں مل سکتی ہیں۔ ان کا اثر اردو کے اشاعت کتب، اخبار و رسائل پر بھی پڑا۔ اور باوجود بہت سی کوششوں کے مایوسی کا یہ اثر اب بھی قائم ہے۔

جب احتشام حسین صاحب نے بات ختم کی تو میں نے قدرے رک کر دریافت کیا کہ "پروفیسر صاحب آزادی کے بعد اردو تحریک کو صحیح ہے کہ کل ہند سطح پر نقصانات پہونچے۔ زحمت نہ ہو تو "یوپی"

میں اس پر کیا گزری؟ وضاحت فرما دیجئے!"

تحقی الفور احتشام صاحب نے کہنا شروع کیا کہ "جناب یہ بات شروع ہی میں سمجھ لینا ضروری ہے کہ اردو کے معاملے میں یو.پی، بہار، دہلی، مدھیہ پردیش، اور راجستھان کے کچھ حصوں کا ..... معاملہ اردو کی دوسری جگہوں کے موقف سے مختلف ہے۔ کیونکہ یہی وہ علاقے ہیں جہاں ہندی کو علاقائی زبان قرار دیا گیا اور اردو کو وہ حیثیت بھی نہیں دی گئی جو ایک مددگار زبان کو دی جانی چاہیئے۔

خاص طور سے یو.پی میں سیاسی قائدین نے اردو کی کھلم کھلا مخالفت اس لئے کی کہ وہ اسی کو اردو کا مضبوط قلعہ سمجھتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ اگر اردو کو یو.پی میں کچل دیا جائے تو دوسرے علاقوں میں اس کی اہمیت کو کم کر دینا مشکل نہیں ہوگا۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو نے جب تقریباً (۲۲) لاکھ دستخطوں کے ساتھ حکومت ہند اور صدر جمہوریہ کی خدمت میں یہ عرض داشت پیش کی کہ دستور ہند کے دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کو بھی یو.پی میں بعض سرکاری کاموں کے لئے علاقائی زبان قرار دیدیا جائے۔ تو نہ صرف یو.پی کی حکومت نے اس کی مخالفت کی بلکہ ہندی کے مختلف اداروں اور بعض اہم شخصیتوں نے بھی اسے فرقہ پرستی اور قومی اختلاف کا بہانہ قرار دیا اور حکومت ہند یہ بھی ظاہر کیا کہ یہ صرف تھوڑے سے لوگوں کا مطالبہ ہے اور اردو کو وہ ساری سہولتیں فراہم ہیں جو قانوناً فراہم ہونی چاہئیں۔ حکومت ہند نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ صحیح صورت حال کا پتہ چلایا جائے۔ لسانی کمشنر کی چار یا پانچ رپورٹوں میں یہ بات سینکڑوں جگہ دہرائی گئی ہے کہ توجہ دلانے کے باوجود یو.پی کی حکومت اردو کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہے لیکن پھر بھی حکومت ہند نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے یو.پی میں اردو کی حالت بہتر ہو سکتی۔ بات چیت کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پروفیسر احتشام نے کہا کہ روشنی کی ایک کرن اس وقت نظر آئی جب یہ کہا گیا کہ جن اسکولوں میں (۴۰) یا جس درجے

دس طالب علم اردو پڑھنا چاہیں گے۔ اس کے لئے انتـ کیا جائے گا۔ لیکن اسکولوں اور کالجوں نے بہت سے بـ اس پر کبھی عمل درآمد ہونے نہیں دیا۔ جب ہندوستان کے وزرائے تعلیم نے مرکزی حکومت کی خواہش پر سہ لسانی قبول کرلیا۔ اس وقت پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ تحتانی ا اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو جائے یو.پی کی حکومت نے سہ لسانی فارمولے میں ترمیم کر زبان کی جگہ صرف زبانوں کا لفظ رکھا اور اس میں سنـ کو بھی شامل کرلیا۔ اس طرح اردو کو جو حق ملا تھا۔ وہ اس میں تقسیم ہو گیا۔ فرقہ وارانہ فضا نے اردو کو شکست دینے اور ذریعہ تلاش کرلیا۔ اور اس فارمولے کے تحت ارد فائدہ پہونچنا چاہیئے تھا وہ نہیں پہونچا۔ اس طرح پورے ہنـ کے نقشے میں یو.پی کے نقشے پر سب سے زیادہ گہری دھند ہے۔ یہاں اب بھی اردو کے لئے وہ آسانیاں فراہم نہیں جو قانوناً اور دستوری حیثیت سے اسے حاصل ہیں۔ یہاں تک عدالتوں اور تعلیمی اداروں میں اردو آج بھی کوئی اونچا مقا رکھتی۔ اس کا اثر اعلیٰ تعلیم پر بھی پڑ رہا ہے اور یونیورسٹیوں اردو کے لئے تقریباً وہی سہولتیں فراہم ہیں جو دوسرے مضا کے لئے ہیں۔ چونکہ ابتدائی تعلیم میں اردو کو کوئی اہمیت حـ نہیں ہے۔ اس لئے اعلیٰ تعلیم میں بھی طلباء اس کی طرف را نہیں ہوتے۔ انھیں یہ احساس ہو چلا ہے کہ اردو پڑھنے ـ انھیں زندگی کی جد و جہد میں کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ا اس کا پڑھنا لا حاصل ہے۔"

پروفیسر سید احتشام حسین سے میں نے پوچھا۔ یو.پی۔ اردو کے متعلق حیات اللہ انصاری صاحب مجلس مشاورت ڈا فریدی اردو محافظ دستے اور بعض دوسرے ادارے جو کام کر ہیں ان کی نوعیت کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟" تو احتـ نے بتایا کہ "میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ جب اردو کو سرکاری پر زندہ رہنے کے لئے کوئی سہارا نہ ملا تو مختلف گروہوں، سیا

اعتوں اور شخصیتوں نے اپنے اپنے طور پر اس مسئلہ کو حل کرنے کی
شش کی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو جو ایک آل انڈیا ادارہ ہے
ں نے اپنے علاقائی زبان کے مطالبے کو جاری رکھا لیکن کسی
بی عملی تحریک سے احتراز کیا جس سے فرقہ پرستی کو یا خود غرض
ر موقع پرست جماعتوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملے۔ اس
بن کو جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی
تصویر بہت کچھ حیات اللہ انصاری اور بیگم انیس قدوائی کے
خیالات میں جھلکتی ہے۔ مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل
اور اس طرح کے دوسرے ادارے اسے خالص مسلمانوں کا
مسئلہ بنا کر حکومت سے اس کا تحفظ چاہتے ہیں۔ یا ظاہر
کرنا چاہتے ہیں کہ کانگریس مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت
نہیں کر رہی ہے۔

صفحہ ۴۷۲۔ اعتبار نظر:۔ کبھی کبھی یہ جملے بھی دیکھنے اور سننے میں آجاتے ہیں کہ ایک خاص قسم کی تنقید نے ادب کو خراب کر رکھا ہے یا یہ کہ نقاد موجودہ نسل کی رہنمائی نہیں کر رہے ہیں۔ یہ دونوں باتیں بھی اسی حقیقت کی غماز ہیں کہ الجھن اور شکایت تنقید سے نہیں کسی خاص نوعیت سے ہے۔ حالانکہ وہی تنقید بعض لوگوں کو پسند آتی ہے اور اس کی روشنی میں ایک آدھ ادیبوں اور شاعروں نے ادبی معیاروں اور قدروں کا محسوس کرنا بھی سیکھا ہے۔ اس سلسلہ میں میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر کسی خاص قسم کی تنقید کسی کے خیال میں ادب کو نقصان پہونچاتی ہے تو اس کا علاج یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جس کو اس کا اندیشہ ہو وہ اس کی چھوت سے بچنے کے لئے اسے نہ پڑھے یا اگر پڑھے تو اپنے خیالوں کی مضبوطی کی وجہ سے اس سے متاثر نہ ہو بلکہ اس کے دلائل اور نتائج کو ناقابل قبول سمجھ کر ٹھکرا دے اور خود ایسی چیزوں کی تخلیق کرتا رہے۔ جو اس کے خیال میں اعلیٰ ہیں اور میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر اس کی تخلیق اعلیٰ ہوئی تو فتح اسی کی ہوگی۔ اور کوئی غلط یا بدنیتی سے کی ہوئی تنقید اسے کبھی نقصان نہیں پہونچا سکے گی۔ یہ جد وجہد کچھ دن جاری کرکے ختم ہو جائے گی۔ اور اعلےٰ ادب اپنی آفاقی قدروں سمیت زندہ رہ جائے گا۔ اور ممکن ہے وہ تنقید بھی زندہ رہے جو اس اعلےٰ تخلیق کے پرکھنے میں کامیاب رہی ہے یا مدد دے سکی ہے۔

احتشام حسین کے مضامین وار سنہ

جس رسالے میں طبع ہوئے اور جو میں حاصل کر سکا۔

(مرتب)

سنہ	مضمون	رسالہ	تاریخ
۱۹۳۳ء	ایڈورڈ گبن	رسالہ یادگار لاہور	ستمبر ۱۹۳۳ء
۱۹۴۰ء	چکبست۔ پیام بر دورِ جدید	رسالہ جوہر	۱۹۴۰ء
۱۹۴۲ء	اردو شاعری کے موجودہ دور کی تنقید ۱	سرفراز لکھنؤ	۱۲ر نومبر ۱۹۴۲ء
〃	〃 〃 〃 ۲	〃	۱۳ر 〃 〃
〃	〃 〃 〃 ۳	〃	۱۴ر 〃 〃
〃	〃 〃 〃 ۴	〃	۱۵ر 〃 〃
〃	〃 〃 〃 ۵	〃	۱۶ر 〃 〃
۱۹۴۴ء	سحر البیان پر نظر	آج کل دہلی	مارچ ۱۹۴۴ء
۱۹۴۷ء	آج کا اردو افسانہ	آج کل دہلی	جون ۱۹۴۷ء
〃	پنڈت آنند نرائن ملا	آج کل دہلی	مارچ ۱۹۴۷ء
۱۹۴۸ء	اردو کا لسانیاتی مطالعہ	ماہ نو کراچی	اپریل ۱۹۴۸ء
〃	غالب کا فلسفۂ تصوف	زمانہ کانپور	ستمبر ۱۹۴۸ء
	اختر شیرانی کی رومانیت	نیا ادب بمبئی و بہترین ادب	
۱۹۴۹ء	پریم چند کی ترقی پسندی	آج کل	مارچ ۱۹۴۹ء
〃	شعر فہمی	سالنامہ شاعر آگرہ	جنوری ۱۹۴۹ء
〃	ادب میں طنز کی جگہ	آجکل دہلی	اگست ۱۹۴۹ء
〃	حالی کا سیاسی شعور	شاہراہ دہلی	اکتوبر ۱۹۴۹ء
	افسانے میں نفسیات	ادب لطیف افسانہ نمبر	اکتوبر ۱۹۴۹ء
۱۹۵۰ء	اردو کا مستقبل ہندوستان میں	کارواں الہ آباد	جولائی ۱۹۵۰ء
〃	غالب کا تفکر اور اس کا پس منظر	اردو ادب علی گڑھ	جولائی ۱۹۵۰ء
〃	تاریخ زبان اردو	اردوئے ادب علی گڑھ	جولائی ۱۹۵۰ء

سنہ	عنوان	رسالہ	ماہ	سنہ
سنہ ۱۹۵۰ء	خون کی لکیر	شاہراہ		سنہ ۱۹۵۰ء
"	تخلیقی تنقید	نئی روشنی جمہوریت نمبر	جنوری	سنہ ۱۹۵۰ء
"	میں لکھتا ہوں	محاذ بمبئی	فروری	سنہ ۱۹۵۰ء
"	رومان سے انقلاب تک	شاہراہ دہلی	مارچ	سنہ ۱۹۵۰ء
سنہ ۱۹۵۱ء	زبان اور رسم خط کا تعلق	نگار لکھنؤ	جون	سنہ ۱۹۵۰ء
"	تنقید کے ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت	نگار لکھنؤ	جنوری، فروری	سنہ ۱۹۵۱
"	حسرت کی غزلوں میں نشاطیہ عنصر	اردو ادب	اکتوبر۔ دسمبر	سنہ ۱۹۵۱ء
"	غالب خستہ کے بغیر	شاعر بمبئی		سنہ ۱۹۵۱ء
"	قدیم ہندوستانی مصوری	آج کل دہلی	اگست	سنہ ۱۹۵۱ء
سنہ ۱۹۵۲ء	ادب و جمہور	نیمروز کراچی	جولائی	سنہ ۱۹۵۲ء
"	اقبال کی شاعری کے بعض عملی پہلو	نگار	جولائی	سنہ ۱۹۵۲ء
"	مسدس حالی اور اس کے نقاد	کارواں۔ الہ آباد	ستمبر	سنہ ۱۹۵۲ء
"	حسرت کا رنگ سخن	نگار	جنوری و فروری	سنہ ۱۹۵۲ء
"	حسرت کی غزلوں میں نشاطیہ عنصر	نورنگ	مئی	سنہ ۱۹۵۲ء
"	غالب کے غیر مطبوعہ ایک نئے مکتوب الیہ کے نام	آج کل دہلی		سنہ ۱۹۵۲ء
سنہ ۱۹۵۳ء	برنارڈ شا مصنفہ ظ انصاری		مارچ	سنہ ۱۹۵۳ء
سنہ ۱۹۵۴ء	اردو تنقید۔ حالی اور ان کا عہد	فروغ اردو لکھنؤ	دسمبر	سنہ ۱۹۵۴ء
"	مولانا عبدالماجد کی تنقیدی بصیرت	فروغ اردو لکھنؤ		
	میں کیوں لکھتا ہوں	سویرا	جنوری۔ اپریل	سنہ ۱۹۵۴ء
سنہ ۱۹۵۵ء	اردو تنقید اور جدید ذہن	ادب لطیف لاہور	اپریل مئی	سنہ ۱۹۵۵ء
"	مجاز۔ فکر و فن کے چند پہلو	علی گڑھ میگزین		سنہ ۱۹۵۵ء
	روسی ادب کے پچیس سال	ساقی		سنہ ۱۹۵۵
سنہ ۱۹۵۶ء	اردو ادب کا قدیم ادب	فروغ اردو لکھنؤ	جولائی	سنہ ۱۹۵۶
	آزاد نظم	کردار بھوپال	اگست ستمبر	سنہ ۱۹۵۶ء
"	صنف انشا اور چند انشائیے	فروغ اردو	نومبر	سنہ ۱۹۵۶ء
"	ادبی تاریخ	نیا دور لکھنؤ		سنہ ۱۹۵۶ء
سنہ ۱۹۵۷ء	اردو نظم کا فنی ارتقاء	نگار	جنوری فروری	سنہ ۱۹۵۷ء
"	غزل کا مستقبل	آج کل دہلی	ستمبر	سنہ ۱۹۵۷ء
"	سرشار کا لکھنؤ	شاہراہ دہلی	نومبر	سنہ ۱۹۵۷ء

سنہ ۱۹۵۷ء	روحوں سے ملاقات	فروغ اردو لکھنؤ اکتوبر	سنہ ۱۹۵۷ء
"	غدر اور ہندوستانی تہذیب	" " ستمبر	سنہ ۱۹۵۷ء
"	قدیم ایرانی تہذیب	علی گڑھ میگزین	سنہ ۱۹۵۷ء
"	لکھنؤ۔ اردو ادب کا علمی اور ادبی مرکز	فروغ اردو جون	سنہ ۱۹۵۷ء
سنہ ۱۹۵۸ء	ادب کا مادی نظریہ	علی گڑھ میگزین نظریاتی ادب نمبر	سنہ ۱۹۵۸ء
	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	آج کل دہلی مارچ	سنہ ۱۹۵۸ء
سنہ ۱۹۵۹ء	زبان اور تہذیب	نیا دور لکھنؤ افکار و مسائل	
"	جدید اردو ڈرامہ اور اس کے بعض مسائل	آج کل دہلی ڈرامہ نمبر	سنہ ۱۹۵۹ء
"	حالی کا سیاسی شعور	شاہراہ دہلی جون	سنہ ۱۹۵۹ء
"	اردو ادب غالب کے عہد تک	شاعر بمبئی جون	سنہ ۱۹۵۹ء
"	انقلاب روس اور روسی انقلاب کے بعد	فروغ اردو لکھنؤ نومبر	سنہ ۱۹۵۹ء
"	رنگ برنگ (مرکز ادب)	فروغ اردو لکھنؤ نومبر	سنہ ۱۹۵۹ء
"	عالم برزخ کا ایک مشاعرہ	فروغ اردو لکھنؤ نومبر	سنہ ۱۹۵۹ء
"	کلیات نسیم میسوری	فروغ اردو لکھنؤ نومبر	سنہ ۱۹۵۹ء
	مقدمہ شعر و شاعری از حالی	فروغ اردو لکھنؤ جون	سنہ ۱۹۵۹ء
سنہ ۱۹۶۰ء	موازنہ انیس و دبیر	ادیب ستمبر	سنہ ۱۹۶۰ء
سنہ ۱۹۶۱ء	ٹیگور کا اثر اردو ادب پر	سب رس حیدرآباد جون	سنہ ۱۹۶۱ء
"	اردو تحقیق و تنقید	جامعہ دہلی ستمبر	سنہ ۱۹۶۱ء
"	جگر کی شاعری۔ موثرات و محرکات	فروغ اردو فروری۔ مارچ۔ اپریل	سنہ ۱۹۶۱ء
"	یاد جگر	آج کل دہلی مارچ	سنہ ۱۹۶۱ء
"	جوش ایک تعارفی مطالعہ	افکار کراچی	سنہ ۱۹۶۱ء
"	نسخہ حمیدیہ	ہماری زبان علی گڑھ مارچ	سنہ ۱۹۶۱ء
	ادبی ملاقات (مولانا عبدالماجد اور احتشام)	نقوش لاہور اگست	سنہ ۱۹۶۱ء
سنہ ۱۹۶۲ء	ادب کے نئے تقاضے۔ قومی اور ملی شعور	الشجاع کراچی جولائی	سنہ ۱۹۶۲ء
"	مہدی افادی	ادیب علی گڑھ	سنہ ۱۹۶۲ء
"	اقبال کی شاعری عملی نقطہ نظر سے	نگار جنوری	سنہ ۱۹۶۲ء
	تلسی داس	فروغ اردو لکھنؤ جولائی	سنہ ۱۹۶۲ء
سنہ ۱۹۶۳ء	اردو ادب اور قومی یکجہتی	صبا قومی یکجہتی نمبر جولائی۔ اگست	سنہ ۱۹۶۳ء
"	امریکی تنقید کے چند پہلو	کتاب گھر	سنہ ۱۹۶۳ء

سنہ	عنوان	رسالہ	سنہ
سنہ ۱۹۶۳ء	ادبی تنقید کی ضرورت پر چند خیالات	ادب لطیف سالنامہ	سنہ ۶۳ء
"	مصر کا افسانوی ادب	صبا حیدرآباد اکتوبر	سنہ ۶۳ء
"	ڈرامے میں وحدتوں کا مفہوم	شاعر بمبئی	سنہ ۶۳ء
"	نیاز فتح پوری ۔ چند تاثرات	نگار پاکستان	سنہ ۶۳ء
"	چین کی زبوں حالی حملے کا سبب	سب رس حیدرآباد مئی	سنہ ۶۳ء
"	حضرت امام حسین کا نفس مطمئنہ	گل خندان لاہور مئی	سنہ ۶۳ء
"	علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو	انجام کراچی	سنہ ۶۳ء
سنہ ۱۹۶۴ء	عالمی ادب اور انیس	محور کراچی مئی	سنہ ۶۴ء
"	کالی داس	آج کل دہلی مئی	سنہ ۶۴ء
سنہ ۱۹۶۵ء	تنقید اور ادبی تنقید	افکار کراچی جنوری	سنہ ۶۵ء
"	آغا حشر کی ڈرامہ نگاری	فروغ اردو لکھنؤ فروری	سنہ ۶۵ء
"	دکن کا عاشق	سب رس حیدرآباد فروری	سنہ ۶۵ء
"	علامہ شبلی	فروغ اردو لکھنؤ جون	سنہ ۶۵ء
"	علی عباس حسینی کے افسانوں کی فضا	صبح نو پٹنہ	سنہ ۶۵ء
"	اقبال کی شاعری اور انقلاب روس	ثقافت لاہور اگست	سنہ ۶۵ء
"	چکبست ۔ آزادی کا پہلا شاعر	فروغ اردو لکھنؤ ستمبر، اکتوبر	سنہ ۶۵ء
"	غالب کا تصوف اور فلسفہ	فروغ اردو دسمبر و اکتوبر	سنہ ۶۵ء
"	کافر غزل	کتاب نما دہلی	سنہ ۶۵ء
"	محمد عظمت اللہ (ادبی جنگاری)	فروغ اردو لکھنؤ نومبر	سنہ ۶۵ء
"	ابن رشیق قیروانی	معارف اعظم گڑھ	سنہ ۶۵ء
"	احتشام حسین سے ایک انٹرویو	کتاب لکھنؤ اگست	سنہ ۶۵ء
"	اردو کے صوفی شعراء	شاعر بمبئی	سنہ ۶۵ء
"	اودھ کی ادبی فضا	کتاب لکھنؤ	سنہ ۶۵ء
سنہ ۱۹۶۶ء	ادب کے محرکات ۔	فروغ اردو لکھنؤ جنوری	سنہ ۶۶ء
"	بحران اور ادب	سیپ کراچی	سنہ ۶۶ء
"	ناول کی تنقید	شب خون الہ آباد اگست	سنہ ۶۶ء
"	افسانہ اور اردو افسانہ	نگار اصناف ادب نمبر	سنہ ۶۶ء
"	اردو شاعری میں وطن پرستی	فروغ اردو لکھنؤ فروری	سنہ ۶۶ء
"	اردو مثنوی کا ارتقا	صبح نو پٹنہ مارچ	سنہ ۶۶ء

سنہ ۱۹۶۶ء	نئے تیشے نئے کوہکن	شب خون الہ آباد	جون	سنہ ۶۶ء
″	نئے تیشے نئے کوہکن	شب خون الہ آباد	اگست	سنہ ۶۶ء
″	″ ″ ″	″ ″	اکتوبر	سنہ ۶۶ء
″	غالب کے غیر مطبوعہ خطوط	افکار کراچی		سنہ ۶۶ء
″	ہم صفیر انقلاب	صبا	اکتوبر، دسمبر	سنہ ۶۶ء
″	امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر	فروغ اردو لکھنؤ	جون	سنہ ۶۶ء
″	تاریخ تہذیب ادب	کتاب لکھنؤ	جنوری	سنہ ۶۶ء
سنہ ۱۹۶۷ء	ادب کے زاویے تعبیر فن	فروغ اردو لکھنؤ		سنہ ۶۷ء
″	مشرق و مغرب کے اصول تنقید	گفتگو بمبئی		سنہ ۶۷ء
″	ایک غزل اور جدید نقاد (احتشام حسین۔ آل احمد سرور)	گفتگو		سنہ ۶۷ء
″	انجمن ترقی پسند مصنفین کی چھٹویں کانفرنس	شب خون الہ آباد	اپریل	سنہ ۶۷ء
″	کرشن چندر۔ کچھ تاثرات	شاعر بمبئی		سنہ ۶۷ء
″	غالب ایک مطالعہ	شب خون الہ آباد	نومبر	سنہ ۶۷ء
″	غالب کے غیر مطبوعہ خطوط	فروغ اردو	جون	سنہ ۶۷ء
″	مصحفی کا ایک اور فارسی دیوان	اردو کراچی	اپریل	سنہ ۶۷ء
″	کبیر بانی	شب خون الہ آباد		سنہ ۶۷ء
″	مکتوب در معرفت شاعر نو	شب خون الہ آباد	اکتوبر	سنہ ۶۷ء
سنہ ۱۹۶۸ء	لسانیات کی پیچیدگیاں	صبح نو پٹنہ	جون، جولائی	سنہ ۶۸ء
″	جدید ادب کا تنہا آدمی	شب خون	نومبر	سنہ ۶۸ء
″	اختر اورینوی صاحب کا نظریہ تنقید	ساغر نو، پٹنہ		سنہ ۶۸ء
″	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	شاعر، بمبئی		
″	غالب کا تفکر	فروغ اردو	نومبر، دسمبر	سنہ ۶۸ء
سنہ ۱۹۶۹ء	ادب اور تہذیبی ورثہ	آہنگ لکھنؤ	اکتوبر	سنہ ۶۹ء
″	اردو ادب میں مہاتما گاندھی کی شخصیت	نیا دور لکھنؤ	ستمبر، اکتوبر	سنہ ۶۹ء
″	غالب اور بھوپال	ہماری زبان	اپریل	سنہ ۶۹ء
″	غالب اور تفکر	فروغ اردو لکھنؤ	نومبر، دسمبر	سنہ ۶۹ء
″	غالب ایک پیغمبر	انقلاب بمبئی	فروری	سنہ ۶۹ء
″	غالب ایک مطالعہ۔ دیوان کے آئینے میں	امتزاج کراچی		سنہ ۶۹ء
″	شاعری یادنفس اور نکہت گل	شاعر بمبئی		سنہ ۶۹ء

سنہ ۱۹۶۹ء	غالب فکر ادب	کتاب لکھنؤ	مارچ	سنہ
"	غالب، غالب، غالب فکر ادب	کتاب لکھنؤ	مارچ	سنہ
"	غالب کا جہاں دیر و کعبہ	جنگ کراچی		سنہ
"	غالب کے نغموں میں وحدت انسانی اور راقیت کا عنصر	یونم حیدر آباد		سنہ
"	غالب کی بُت شکنی	نگار پاکستان	جنوری، فروری	سنہ
"	غالب کی شاعری میں فکر و نظر	ہماری زبان علی گڑھ	مارچ	سنہ
"	فکر غالب	کتاب لکھنؤ	مارچ	سنہ
"	مرزا غالب۔ زندہ اور روشناس خلق	اُردو میگزین	فروری	سنہ
"	اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	نیا دور لکھنؤ	اگست	سنہ
"	ایک نقاش شاعر۔ مظفر حنفی	شاہکار الہ آباد	جولائی	سنہ
سنہ ۱۹۷۰ء	اُردو رسم خط۔ چند خیالات	شب خون الہ آباد	نومبر	سنہ
"	محسن کاکوروی۔ چند تاثرات	فروغ اُردو	اپریل مئی جون	سنہ
"	برگ آوارہ از حاجی	سب رس حیدر آباد	جون	سنہ
سنہ ۱۹۷۱ء	نئی شاعری کا پس منظر	آہنگ، گیا	نومبر	سنہ
"	نذیر احمد کے ناول۔ تنقیدی جائزہ	شاخسار کٹک		سنہ
"	لمحوں کی بازگشت	شاخسار کٹک		سنہ
سنہ ۱۹۷۲ء	اُردو ادب پر ٹیگور کا اثر	کتاب نما دہلی	نومبر	سنہ
"	اُردو میں تحقیق آزادی کے بعد	نیا دور لکھنؤ	اگست	سنہ
"	قومی شاعری کے مطالعہ کے چند اہم پہلو	سیکولر ڈیموکریسی		سنہ
"	مطالعہ انیس	سرفراز لکھنؤ	فروری	سنہ ۷۲
"	جمالیات، فن اور قاری	شاعر بمبئی		سنہ ۷۲
سنہ ۱۹۷۳ء	ادب اور مکتوبات	آج کل دہلی	مئی	سنہ ۷۳
"	میر حسن	سب رس حیدر آباد	جنوری	سنہ ۷۳

سید جعفر عباس

احتشام صاحب ــــــ میرے ابّا

یوں تو ہر شخص کو اپنے والدین سے اتنی ہی جذباتی محبت ہوتی ہے جتنی مجھے اپنے والد مرحوم سے ہے دنیا میں شاید ہی کچھ لوگ ایسے ہوں گے جنھیں اپنے والدین سے محبت نہ ہو۔

میرے ابّا کا جنم ۲۱ر جولائی ۱۹۱۲ء کو ایک چھوٹے سے گاؤں ماہل میں ہوا جو ضلع اعظم گڑھ میں واقع ہے۔ لیکن کیا کسی شخص کی عظمت اس کی تاریخ پیدائش یا جائے پیدائش سے ہوتی ہے؟ احتشام صاحب کا سفر ۱۹۱۲ء سے شروع ہوا اور زندگی بھر غم و الم مشکلات کو جھیلتے ہوئے، سیاسی ریشہ دوانیوں اور مادی مصلحتوں سے خود کو بچاتے ہوئے آخر کار یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کی صبح کو اپنے سفر کو ختم کیا۔

آپ کے ذکر کے لیے اپنی بات کہاں سے شروع کروں؟ وہاں سے جہاں سے میں نے انھیں جانا یا وہاں سے جہاں سے وہ ہم لوگوں کو چھوڑ کر ابدی اور گہری نیند سو گئے۔

ابّا کو میں نے ہر موڈ میں دیکھا تھا غصے میں تمتماتے ہوئے بھی، خوشی میں مسکراتے ہوئے بھی اور گفتگو میں والہانہ انداز لیے ہوئے بھی۔ ادبی محفلوں اور جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے بھی ہر جگہ ایک ہی انداز، ایک ہی آواز، ایک ہی ٹھہراؤ۔

جن لوگوں کو اُن سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملا ہوگا۔ انھوں نے بھی غور کیا ہوگا کہ ابّا بات چیت کرتے وقت دوسرے شخص کا دل جیت لیا کرتے تھے۔ اپنی علمیت، اپنی شان، اپنے نام و نمود کا اثر دوسرے پر نہ ہونے دیتے تھے۔ ہر شخص کی بات بہت غور سے سنتے تھے چاہے وہ کسی بھی غیر دلچسپ موضوع پر ہی بات کیوں نہ کر رہا ہو۔

میں نے ابّا کو مختلف اوقات میں، مختلف شکلوں میں دیکھا ہے۔ گھر میں اور گھر کے باہر بھی۔ ہر جگہ، وہ مجھے ایک ہی سے لگے۔

اکتوبر میں میری ان سے آخری ملاقات دلّی میں ہوئی۔ وہ کسی کمیٹی کے جلسہ میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ دلّی وہ سال میں کئی بار آتے تھے اور ہر بار مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے والد نہیں بلکہ میرا محبوب آرہا ہے۔ روحانی خوشی ہوتی تھی۔ دل آپ ہی آپ خوش رہتا تھا۔ حالانکہ میری ملاقات مشکل ہی سے کوئی ایک آدھ گھنٹے کے لیے ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود بھی مجھے ایسا لگتا تھا کہ ابّا میرے پاس ہر وقت ہیں۔ ہر وقت میرے ساتھ ہیں۔

موت کا کوئی وقت نہیں ہوتا ہے۔ کب موت، کسے جکڑ لے گی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ابّا کی موت کا نہ تو یقین آتا تھا اور کچھ ایسا لگتا تھا کہ شاید میرے ابّا ہیں اس لیے کبھی مریں گے ہی نہیں۔ کتنا یقین تھا مجھے؟ لیکن میرا سارا اعتماد اس وقت ٹوٹ کر چکنا چور ہوگیا جب ایک بہت مختصر سا تار مجھے ملا FATHER EXPIERD۔ کیا بتاؤں کیا لگا تھا مجھے؟ نہ میں رویا تھا اس وقت، کیونکہ اس تار کو میں جھوٹ سمجھ رہا تھا۔ اور دل کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ کیا یہ بھی ممکن ہے؟ دلّی سے الہ آباد کا سفر کتنا دردناک تھا میرے

لئے، کتنا اذیت ناک اور کتنا تڑپا دینے والا جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اظہار نہیں کیا جا سکتا۔

ابا کا انتقال ہو گیا۔

میں یتیم ہو گیا۔

بہت سے لوگ یتیم ہو جاتے ہیں، بہت سے والدین کا سایہ اٹھ جاتا ہے۔ پھر مجھے کیا غم؟ کسی شخص کی موت کوئی انوکھی بات نہ

یہ آنسو کیوں؟

یہ اداس چہرہ کیوں؟

یہ کمزوری کس لئے؟

کیا یہ سب اور لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا؟

میں نہیں جانتا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میرا باپ مجھ سے بچھڑ گیا۔ میں یتیم ہو گیا۔

میرے ابا جو صرف ایک باپ کی شفقت ہی نہیں دیتے تھے۔ بلکہ میرے ایک اچھے دوست بھی تھے۔ جن کے ساتھ صرف نہیں لڑا تا تھا، الٹی سیدھی گفتگو بھی کرتا تھا، ضدیں بھی کرتا تھا، ناز بھی اٹھواتا تھا، ان کے ساتھ کیرم بھی کھیلتا تھا اور جن کی جیبیں بھی مار لیا کرتا تھا۔

یوں تو ہر شخص کو اپنے والدین سے اتنا ہی جذباتی لگاؤ ہوتا ہے جتنا مجھے اپنے مرحوم ابا سے تھا۔ لیکن اوروں اور مجھ اوروں کے والدین اور میرے ابا میں فرق تھا جو میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں ایسے والدین آتے ہوں گے جو صرف ہی نہ رہے ہوں بلکہ دوست، استاد، اور اعلیٰ ظرفی کا اتنا بے مثال انسان بھی۔

میرے ابا ساری زندگی دوسروں کے بوجھ کو ڈھوتے رہے۔ دوسروں کے غموں کو ہلکا کرتے رہے، دوسرے کی تکلیفوں کا مداوا کر لیکن اپنے لیے کچھ بھی نہ کیا۔ اپنے غم کو چھپائے رہے۔ اپنی تکلیفوں پر مسکراتے رہے تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے، اپنی پریشانی کسی سے نہیں کی کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ پریشان ہو جائیں۔

کتنے خاموش تھے میرے ابا۔ زندگی بھر خاموشی سے دیکھتے رہے، سب کچھ برداشت کرتے رہے لیکن اُف تک نہ کی اف کس سے کرتے؟ ان کی باتوں کو سمجھنے والے کتنے لوگ موجود ہیں؟

کتنے عظیم تھے میرے ابا۔ انسان کی عظمت، انسان کی عزت خود اس کے اپنے کردار سے بنتی ہے اور یہ بات میں نے ا سے سیکھی۔ اور اس وقت سیکھی جب وہ مجھے سکھانے کے لیے موجود نہیں ہیں۔ اور اپنی بات کہاں سے شروع کروں۔ وہاں سے جہاں سے ا مجھے جنم دیا یا وہاں سے جہاں سے وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے یا میں اُن سے بچھڑ گیا۔

میں نے جو کچھ بھی سیکھا جو کچھ بھی دیکھا، جو کچھ بھی حاصل کیا۔ وہ سب میرے والد کی شفقت اور دوستی کی وجہ سے۔ پھر آپ ہی بھلا میں یہ سب کیسے سیکھ لیتا؟ کون مجھے سیکھنا بتاتا، کون مجھے علم کی طرف راغب کراتا، کون مجھے اتنا شعور بخشتا۔ اور کون مجھے اس کو لکھنے پر مجبور کرتا۔

سب کے والدین اتنے ہی عظیم ہوتے ہیں جتنے کہ میرے لیے احتشام حسین۔ لیکن کتنا فرق ہے؟ کتنا فاصلہ ہے مجھ میں دوسروں میں؟ یہی وجہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے والدین کا جب انتقال ہوتا ہے تو کتنے لوگ تعزیتی مضامین لکھتے ہیں، کتنے لوگ نظ لکھتے ہیں؟ یہ فرق ہے میرے والد احتشام حسین میں اور دوسرے لوگوں کے والدین میں۔

عام طور پر کچھ لوگ بڑا خشک سمجھتے تھے میرے آبا کو، لیکن دراصل ایسا نہیں تھا۔ وہ جب ہنستے تھے تو بہت ہنستے تھے، خوشی کی بات پر خوش ہوتے تھے، بہت سے لطائف انھیں ازبر تھے اور جب کبھی بھی موقعہ ملتا تو اس کا ذکر بھی کرتے تھے۔ بہت سے دلچسپ واقعات جن کا تعلق ان کی زندگی سے تھا انھیں اکثر بہت لطف لیکر ہم لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ امریکہ، روس اور یوروپ میں پیش آنے والے بعض سے دلچسپ واقعات سناتے تھے۔ جن کو سن کر دیر تک ہنسی آتی تھی اور خود بھی ہنستے تھے۔

اسی طرح یادوں کا ایک اتھاہ سمندر ہے۔ کہاں سے شروع کروں۔ سارے واقعات نہ لکھنے کا یہ موقع ہے اور نہ ہی ضرورت۔

عام طور پر صبح و شام کو مطالعہ اور لکھنے پڑھنے میں گزارتے تھے۔ اور اگر اس درمیان میں کوئی آجاتا تو اس سے ملاقات بھی کرتے اور اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کوئی ضروری کام کر رہے تھے۔ اکثر بہت بور اور بیکار لوگ بھی ان کے پاس آتے تھے۔ لیکن آبا نے کبھی انھیں اس بات کا احساس نہ ہونے دیا کہ وہ بور ہو رہے ہیں۔ اکثر ہم لوگ آبا سے کہہ بھی دیتے تھے لیکن وہ ہمیشہ ہم لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کرتے رہے۔

عموماً رات کو ہی انھیں فرصت ہوتی تھی جب وہ ہم لوگوں سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ وقت ہم لوگوں کی زندگی کے بہت اہم اوقات ہیں۔ جب تک آبا حیات تھے اس وقت تک کبھی دھیان بھی نہ آیا کہ جو شخص اتنی دلچسپ باتیں کرتا ہے، اتنے علوم و فنون اور . . . . . . سیاست، جغرافیہ، تاریخ، ادب، آرٹ، یعنی ہر موضوع پر اتنی گہری نظر رکھتا ہے وہ ایک دن ہم سب لوگوں کو اس طرح اور اتنی جلدی اداس کر جائے گا۔ اب بھی سوچتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔

وہ ہندوستان کی بہت سی ادبی اور سماجی انجمنوں کے ممبر تھے، بہت سے رسالوں کی رہنمائی کرتے تھے، اور بہت سے دوسرے چھوٹے بڑے کاموں میں کافی مصروف رہتے تھے۔ شہر میں مشاعرہ ہو، کوئی تقریب ہو، مجلس ہو، شادی ہو غرض کہ کسی قسم کی بھی کوئی نشست ہو آبا ہر جگہ پہنچنے کی کوشش کرتے تھے اور جہاں نہیں پہنچ پاتے تھے اس کے لیے بہت شگفتہ انداز میں معذرت کر لیا کرتے تھے۔

کھانے عام طور پر سادے اور ہلکے کھایا کرتے تھے۔ دعوتوں سے بہت گھبراتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ آبا جب دلی آتے تھے تو چچا جان (احتشام حسین صاحب آبا کے سب سے چھوٹے بھائی) کو خاص طور پر خط میں تاکید کر دیا کرتے تھے کہ کھانے کے لیے کسی قسم کا کوئی اہتمام نہیں کیا جائے۔ اور چچا جان بیچارے جنھیں اچھے کھانے کھانے اور کھلانے کا بہت شوق ہے ہمیشہ ایسی تاکیدوں پر اداس ہو جاتے تھے۔

آبا زیادہ تر معدے کے مریض رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کھانے کا کوئی مخصوص وقت نہیں ہوتا تھا۔ کھانے کے معاملہ میں نہایت بے احتیاط تھے۔ دواؤں اور ڈاکٹروں سے اپنے لیے انھیں بہت الجھن ہوتی تھی۔ لیکن اگر گھر میں کوئی دوسرا بیمار ہو جاتا تھا تو اس کے لیے فوراً ڈاکٹر اور دواؤں کی فکر کرنے لگتے تھے۔ اور خاصے پریشان ہو جاتے تھے۔

لیکن ادھر پچھلے چار پانچ برسوں میں میں ان میں ایک تبدیلی اور محسوس کر رہا تھا اور وہ تبدیلی بظاہر عام آدمی کو نظر نہ آتی تھی لیکن ایک کرب کا احساس مجھے ان کے چہرے پر کبھی کبھی نظر آتا تھا اور وہ کرب تھا کچھ سیاسی ریشہ دوانیوں کا جس کے وہ کبھی عادی نہ تھے۔ کچھ لوگ ان کی شرافت، ان کی نیکی اور ان کے سیدھے پن سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس کا انھیں بخوبی علم تھا وہ اگر چاہتے تو اس کا جواب بھی دے سکتے تھے لیکن انھوں نے ہمیشہ لوگوں کی قدر کی دوسروں کو بھی اس بات کی تلقین کرتے رہے کہ دوسروں کی عزت کرو کسی کو ذلیل نہ سمجھو۔ اس لیے وہ یہ سب کرب، یہ سب الجھنیں اکیلے ہی برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ اس کا اظہار انھوں نے ان لوگوں سے بھی کبھی نہیں کیا جو لوگ یہ سب کر رہے تھے۔ انتقام کو وہ ہمیشہ ذلیل شے سمجھتے رہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں تھیں جن کی وجہ سے وقت سے پہلے کمزور اور بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی ذات سے کسی کے

ساتھ بُرائی کرتا نہیں جانتے تھے۔

میں ان کی علمیت، ان کے فن تنقید پر کچھ نہیں کہہ سکوں گا کیونکہ میں ان تحریروں سے واقف نہیں ہوں۔ یہ کام ا
ہے کہ وہ ان کی علمی اور تنقیدی تحریروں پر کچھ لکھیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ میرے آبا تھے جو اب میرے پاس نہیں
جواب کبھی مجھے ڈانٹیں گے نہیں، کچھ کہیں گے نہیں اور نہ اب میں ان کی جیبوں سے پیسے لیا کروں گا اور نہ اب مجھے کسی کا ا
کیونکہ اب وہ مسافر اپنی منزل پا چکا ہے۔ جس کا مجھے انتظار رہتا تھا جس کے انتظار سے اور جس کی آمد سے مجھے ایک عجیب ر
ہوا کرتا تھا۔ ایک عجیب سی خوشبو آیا کرتی تھی اس لیے اب مجھے کسی کا انتظار نہیں۔ ۔ ۔ ۔

چراغِ علم و آدب بُجھ گیا

۱۳۹۲ھ

(خیالؔ ماہلی)

ممتاز اخبارات و رسائل

کے

اداریئے

تعزیتی خطوط

اور

اہم تعزیتی جلسوں کی مختصر روداد

جو افتخارِ نوعِ بشر تھا وہ احتشام
جو ناقدِ علوم و خبر تھا وہ احتشام
جو مایہ دارِ فکر و نظر تھا وہ احتشام
جو تیشہ کار و آئینہ گر تھا وہ احتشام

جس کے قلم پہ ظُلمتِ شب ٹوٹتی رہی
لیکن قلم سے فن کی کرن پھوٹتی رہی

(شمیم کرہانی)

ہماری زبان

عالم کی موت کیا ہی ایک عالم کی موت ہے

یکم دسمبر کو شعبۂ اُردو میں کچھ رفیقوں سے اقبال پر ایک مجوزہ سیمینار کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ کہ احتشام صاحب کا ۲۹ نومبر کا لکھا ہوا خط ملا جس میں اُنھوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا۔

"مجھے آٹھ دس دن بخار رہا۔ وہی فلو۔ اب بخار نہیں لیکن کھانسی اور کمزوری ہے۔"

میں نے سمجھا کہ اس زمانہ میں فلو کی شکایت بہت سے لوگوں کو ہو جاتی ہے اور اب تو وہ خود لکھ رہے ہیں کہ صرف کھانسی اور کمزوری ہے اس لئے کوئی تشویش کی بات نہیں مگر ساڑھے تین بجے سہ پہر کو ظہیر پرویز آئے اور اُنھوں نے بھرآئی ہوئی آواز میں یہ جان فرسا خبر سُنائی کہ احتشام صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آیا اور بار بار پوچھا کہ کیا تم نے صحیح سُنا ہے اُنھوں نے وثوق سے کہا اور بتایا کہ اُردو سروس میں چار بج کر بیس منٹ پر خبریں نشر ہوتی ہیں۔ سُن لیجیے۔ سُنا تو پھر ماننا ہی پڑا۔ رات کی خبروں سے معلوم ہوا کہ صبح کے وقت دل کا دورہ پڑا تھا۔ اور تھوڑی دیر میں اُردو ادب کی ایک محبوب اور محترم شخصیت ہم سے چھن گئی۔

احتشام صاحب کی صحت اچھی خاصی تھی کبھی کبھار ذیابیطس کی شکایت ضرور ہو جاتی تھی اور بس۔ وہ ہم سے زیادہ سفر کرتے تھے جلسوں کمیٹیوں اور ادبی اجتماعات میں اکثر شرکت کرتے تھے [illegible] کے ساتھ ساتھ برابر اپنے علمی و ادبی کاموں میں لگے رہتے تھے

اُنھوں نے ایک درجن سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں تنقیدی جائزے، ادب اور سماج، تنقید اور عملی تنقید، اعتبار نظر، عکس اور آئینے، ذوق ادب اور شعور، اُن کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ تنقیدی نظریات (دو جلدیں) ان مضامین کا انتخاب ہے جس میں اُنھوں نے دَورِ حاضر کے اہم نقادوں کے مضامین یکجا کر دیئے ہیں ساحل اور سمندر اُن کا امریکہ کا سفر نامہ ہے۔ اس کے علاوہ ہندی میں اُردو ادب کی تاریخ ہے۔ جو انجمن ترقی اُردو ہند نے شائع کی تھی۔ بچّوں کے لئے اُردو کی کہانی ہے جس کی لسانیت کا ترجمہ ہے۔ جس پر ایک فاضلانہ مقدمہ ہے گیسنی کے افکار کا ترجمہ ہے جو ساہتیہ اکاڈمی نے شائع کیا۔ آبِ حیات کی تلخیص ہے۔ جو حال میں نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے مضامین موقر رسالوں کے صفحات کی زینت ہیں۔

احتشام صاحب غالباً ۱۹۱۲ء میں ماہل ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے ویلزلی اسکول سے امتیاز کے ساتھ ہائی اسکول کیا۔ پھر الہ آباد یونی ورسٹی میں داخل ہوئے جہاں سے امتیاز کے ساتھ بی۔ اے اور اُردو میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۳۸ء میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ میری اُن سے پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس میں ہوئی۔ محرّم کا زمانہ تھا مقالات اور تقریروں کے بعد ایک طالب علم نے کتھک رقص کا مظاہرہ کیا۔ [illegible] اُٹھ کر چلے گئے احتشام

بیٹھا رہا۔ شام کو ایسٹ ہوم میں اُن سے تفصیل سے باتیں ہوئیں
اندازہ ہوا کہ طبیعت میں سنجیدگی ہے مگر یبوست نہیں ہلکی سی شگفتگی
ہے، چہرے پر اُداسی برستی ہے مگر دماغ روشن ہے اور دل گداز۔
پھر تو ہم لوگ ایک دوسرے کے خاصے قریب ہوگئے۔ اور اکثر
مل بیٹھتے تھے۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں میرا تقرر لکھنؤ یونی ورسٹی میں اُردو
کے ریڈر کی حیثیت سے ہوا۔ مولوی عبدالحق مرحوم اکسپرٹ تھے۔
شادانی مرحوم اور حفیظ سید مرحوم کے علاوہ احتشام بھی اس جگہ
کے اُمیدوار تھے۔ جب میں اگست ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ پہنچا تو احتشام
اُسی شگفتگی سے ملے اور پھر میں، احتشام، ہاشمی اور عبدالاحد جلیل
شعبے کے علاوہ کلب میں بھی ساتھ ہی دیکھے جاتے۔ جب انجمن
ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کے جلسے ہفتہ وار میرے مکان پر ہونے لگے
تو احتشام سب سے زیادہ پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ ان کے
وسیع مطالعے، گہری تنقیدی بصیرت، نکتہ رس ذہن کے سبھی قائل
تھے، مگر اس کے علاوہ وہ بہت اچھے اُستاد اور بہت اچھے مقرر
بھی تھے۔ جب بحث تلخ ہونے لگتی تو بھی وہ نرمی سے اپنا نقطۂ نظر
پیش کر دیتے تھے۔ انتظامی ذمہ داریوں سے دُور بھاگتے تھے
شروع شروع میں کچھ افسانے لکھے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے مگر
سناتے کم تھے۔ مگر جب سناتے تھے تو ان کے اشعار کا رچاؤ
اور پڑھنے کا انداز لطف دے جاتا تھا۔ اُن کا ایک پُرانا شعر
اس وقت رہ رہ کر یاد آرہا ہے۔

کل تو خیر اُن کی یاد آئی تھی
آج کیوں ہے فضا اُداس اُداس

میں نے ۱۹۵۵ء میں جب ایک بے انصافی سے بددل ہو کر لکھنؤ
یونیورسٹی سے استعفا دے دیا تو سب سے پہلے احتشام سے ذکر کیا
اُنھوں میری بڑی منت کی کہ سرور صاحب جلدی نہ
وہ ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ میری برہمی کو حق
مگر اس انتہائی اقدام سے متفق نہ تھے۔ لغزش جنو
سے شاید اُنھیں سابقہ نہیں پڑا تھا۔

جب اعجاز صاحب الٰہ آباد یونی ورسٹی کی ملا
سبکدوش ہوئے تو اُن کی جگہ کے لئے احتشام صا
کی جس کمیٹی نے سفارش کی تھی۔ اُس کے رکن، میں،
سروری اور ڈاکٹر زور تھے۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی میں
نے بہت جلد ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ وہ جہا
میں مقبول اور طلبہ کے محبوب رہے۔ وہ اپنے شاگردو
محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ اور درس و تد
علاوہ اُن کے ذاتی مسائل میں بھی ان کی مدد کرتے
طبیعت میں مروت بہت تھی۔ اس لئے جو بھی چاہتا
مقدمہ یا تعارف یا پیش لفظ لکھوا لیتا تھا۔ ہم لوگ جب
پر چھیڑتے تھے تو مسکرا کر کہتے، کیا کریں فلاں صاحب کی سف
احتشام صاحب شروع سے ترقی پسند تحریک میں شـ
وہ مادی نقطۂ نظر کے ماننے والے تھے۔ مگر عملی سیاست
نے کبھی حصہ نہیں لیا۔ یوں تو وہ مجلسوں میں بھی شریک
اور مشاعروں میں بھی، مگر ان کے اصلی جوہر تعلیمی ادارو
اجتماعوں میں کھلتے تھے۔ وہ نہ صرف ہندی ادب پر گہری
تھے، بلکہ تمام ہندوستانی زبانوں کے اہم میلانات سے با
اُن کا عالمی ادب کا مطالعہ بھی خاصا وسیع تھا۔ فلسفہ،
سماجیات، عالمی تنقید، لسانیت پر ان کی نظر نہایت گہ
وہ ہمارے اُن اُستادوں میں تھے۔ جن کی وجہ سے علم کو
ملا، وہ سارے ان نقادوں میں سے تھے۔ جنھوں نے اُردو

کو فلسفیانہ گہرائی اور علمی بصیرت عطا کی۔ وہ اُن دانشوروں میں سے تھے جو ذہنی رہ نمائی کا فرض انجام دیتے ہیں۔ وہ ادب کی تنقید میں میرے نزدیک سماجی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے تھے۔ اور ادب کے جمالیاتی پہلو پر نسبتاً کم۔ مگر اس کے باوجود اُردو تنقید میں اُن کا درجہ بہت بُلند ہے اور اُن کی تنقیدیں ہمارے ادب کا غیر فانی سرمایہ ہیں۔ جدیدیت کی رَو سے وہ خوش نہ تھے۔ اُن کا ایک خاص مزاج بن چکا ہے اور وہ اس عمر میں اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے تھے۔ اسی لئے اپنے راستے پر گامزن رہے ان کی نظر اُردو کی کلاسیکی ادب پر بھی تھی۔ مگر اُنھیں زیادہ شغف ہم عصر ادب سے تھا۔ اُنھوں نے زیادہ تر نظریاتی تنقید لکھی ہے یا تنقید کے منصب کی اہمیت واضح کی ہے۔ عملی تنقید کے نمونے نسبتاً کم ہیں مگر جو ہیں وہ بھی قابل قدر ہیں۔ وہ موضوع اور نظریہ زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ مگر ہیئت کے تقاضوں اور فن کے مُطالبات سے بے گانہ تھے۔ اُن کی نثر چُست، مدلل اور رواں ہوتی تھی۔ اُنھوں نے ہماری علمی نثر کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

لکھنؤ میں ایک زمانہ میں احتشام صاحب کی تحریروں میں 'اُلجھن' اور میری تقریروں میں 'بحیثیت مجموعی' بار بار آتے تھے میری بیوی نے ٹوکا۔ میں نے 'بحیثیت مجموعی' کہنا چھوڑ دیا۔ احتشام کی "اُلجھن" بدستور رہی۔

یُوں تو جہاں جہاں اُردو کے شعبے ہیں وہاں احتشام صاحب جاتے رہتے تھے، مگر الہ آباد اور لکھنؤ کے بعد علی گڈھ کے شعبۂ اُردو سے اُنھیں گہرا تعلق تھا۔ اس کے ہر مذاکرے میں وہ ضرور آتے تھے اس کے ہر کام میں وہ مدد کرتے تھے۔ یہاں کے اُستادوں کے علاوہ یہاں کے ریسرچ کے طالب علموں سے بھی ملتے تھے اور اُنھیں مفید مشورے دیتے تھے۔ انجمن ترقی اُردو ہند کے جلسوں میں بھی پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ اس کی کانفرنسوں میں وہ برابر میرا ہاتھ بٹاتے تھے۔ کوئی قرارداد پیش کرنا ہو، کوئی مسودہ تیار کرنا ہو، کسی اہم مسئلے پر تبادلۂ خیالات کرنا ہو، احتشام نے کبھی پہلو تہی نہیں کی، ہر قدم پر ساتھ دیا۔

احتشام جمہوریت کے فدائی۔ ہندوستانی تہذیب کے عاشق ہی نہیں، عارف اور سوشلزم کے پجاری تھے۔ اُنھوں نے ساری زندگی علمی و ادبی کاموں میں گزار دی۔ ان کے بہت سے ساتھی سیاسی داؤ پیچ یا گروہ بندی کے شکار ہو گئے وہ سب سے اُسی طرح آخر تک ملتے رہے۔ جس طرح شروع میں ملتے تھے۔ اُنھوں نے کسی بڑے عہدے کے لئے جوڑ توڑ نہیں کیا۔ وہ وزیروں اور لیڈروں کے گھروں کا طواف نہیں کرتے تھے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کی صحبت میں یا اپنے لکھنے پڑھنے میں مگن رہتے تھے۔ اُن کی علمیت تو مُسلّم تھی ہی، مگر اُن کی شرافت وضع داری اور بجل منسائیت کا بھی جواب نہ تھا۔ اُنھوں نے بہت کچھ کیا اور ابھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔ اُن سے بعض باتوں میں میرا اختلاف بھی ہوا، مگر ہماری دوستی میں فرق نہیں آیا۔ اُن کی اچانک موت سے جو خلا ہو گیا ہے وہ شاید کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ ان کے دوستوں کو اُن کی دلنواز شخصیت اور وضعداری یاد رہے گی، اُن کے شاگرد اُن کی شفقت اور محبت کو کبھی بھلا نہ سکیں گے۔ اور اُردو زبان و ادب کا ہر قدرداں اُن کے بُلند پایہ اور وقیع ادبی کارنامے کو ہمیشہ احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھے گا۔

آل احمد سرور

حیات ویکلی

احتشام حسین

پروفیسر احتشام حسین کی اچانک وفات کا سانحہ میرے لئے سخت تکلیف دہ ہے۔ یکم دسمبر کی سہ پہر کو آل انڈیا ریڈیو سے عمیق حنفی نے مجھے فون پر اس کی اطلاع دی، مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے لوگ احتشام کے متعلق میرے تاثرات ریکارڈ کرنے کو آئے۔ اُس وقت مجھ سے مشکل سے بولا جارہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے اس وقت وہ نوجوان احتشام تھے۔ جب وہ الہ آباد میں ایم۔ اے فائنل کر رہے تھے۔ اور میں اُن سے پہلی بار ملا تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ اُسی زمانہ میں الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی۔ اور احتشام ہمارے جلسوں میں آنے لگے۔ ملک کے پڑھے لکھے نوجوانوں میں اُس وقت ایک نیا انقلابی شعور بیدار ہو رہا تھا جواہر لال نہرو کے خیالات اور رہنمائی سے ہم سب متاثر ہو رہے تھے آزادیٔ وطن کی تحریک ایک بلند سطح پر پہنچ رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔ لیکن اس کا اثر پھیل رہا تھا۔ احتشام ہمارے بہت قریب آگئے۔

اس وقت ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے اُس زمانہ میں الہ آباد میں میں اپنے والد کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ کانگریس، کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی میں بیک وقت شامل رہنے کے دن تھے۔ ایک موٹر ہمارے دروازہ پر آکر رُکی، اور ذرا دیر بعد میرے کمرے میں لال بہادر شاستری جی داخل ہوئے۔ شاستری جی نے اپنے جیب سے کچھ کاغذات نکالے۔ یہ پنڈت جواہر لال نہرو کے صدارتی خطبہ کا انگریزی مسودہ

تھا۔ پنڈت جی کانگرس کے منتخب صدر تھے۔ اور یہ خ
دو دن بعد پڑھنا تھا۔ شاستری جی نے مجھ سے ک
کا ہندی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ مجھ سے اُنھوں نے
اُردو میں ترجمہ کر دوں۔ لیکن دوسرے دن صبح کو ی
چھپنے کے لئے جانا ضروری تھا۔ ایک رات میں چالیس
خطبہ کیسے ترجمہ ہو؟ مجھے احتشام یاد آئے۔ فوراً مو
یہاں بھیجی گئی۔ وہ آئے اور پھر اُنھوں نے اور میں نے ا
کو آدھا آدھا تقسیم کر لیا۔ اور رات بھر بیٹھ کر اُس خ
میں ترجمہ ہوگیا۔ احتشام کی مستعدی اور رضندہ پیشا
کو انجام دینے کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اور شاستری جی بھی ب

الہ آباد میں اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد احتشام لکھ
میں شعبۂ اُردو میں لکچرار مقرر ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ ا
ہی نہیں، اُردو کے تمام حلقوں میں اُن کی علمیت اور اُن
اور بحیثیت ایک اُستاد کے اُن کے غیر معمولی لیاقت کا ظہ
افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اُبھ
لیکن سب سے زیادہ اُن کے ادبی تنقید کے مضامین او
نے جدید اُردو ادب کو متاثر کیا۔ ادب کے ترقی پسند،
مارکسی نظریہ سے اُردو کے قدیم اور جدید ادب کا تجزیہ
تنقید میرے خیال میں ابھی تک، احتشام حسین سے بہ
لے نہیں کی ہے۔ اُنھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے مت
(تنقیدی جائزے، روایت بغاوت، ادب اور سماج، تنقی

ذوقی ادب اور شعور (عکس اور آئینہ، اعتبار نظر) جو ہمارے لئے چھوڑے ہیں وہ اُردو کے ترقی پسند تنقیدی ادب کا ایک بیش بہا خزانہ ہیں گذشتہ تیس پینتیس سال تک اُنھوں نے ہمارے ادبی شعور اور فہم کی لاجواب تربیت کی اُسے اُردو ادب کی تاریخ میں ایک مستقل اور پائدار جگہ ملے گی۔ احتشام حسین کے چھوڑے ہوئے اس ورثہ کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

احتشام حسین بہ حیثیت ایک انسان کے، اتنے زیادہ شریف تھے۔ اُن میں اس قدر نیکی بھلمناہٹ تھی اور اتنا زیادہ انکسار اور علم کہ اس دَور میں جب اچھے اچھے لوگ بھی خود کو آگے بڑھانے کے لئے اپنے گردو پیش کے لوگوں کو دھکا دیکر پیچھے دھکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ احتشام نے اپنے جائز ذاتی مفاد کی خاطر کبھی ایسا نہیں کیا۔ گو کہ وہ اپنے فلسفیانہ، اور ترقی پسند ادبی نظریات پر بڑی ثابت قدمی اور سختی سے قائم تھے۔ لیکن اُن میں عصبیت اور کروہن کا بالکل شائبہ نہیں تھا۔ وہ اُردو زبان کی بقا اور ترقی کے لئے مسلسل کوشاں رہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُنھیں ہندی ادب پر بھی عبور تھا، اور لکھنؤ اور الہٰ آباد کے ممتاز ہندی ادیبوں سے اُن کے قریبی اور دوستانہ تعلقات تھے۔

چند برس قبل جشن غالب کے موقعہ پر احتشام کو پہلی مرتبہ ایک ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالحلیم، مالک رام،... کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری کے ہمراہ) سوویت یونین جانے کا اتفاق ہوا، اور اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے اشتراکی سماج کو دیکھا۔ وہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور سوویت یونین سے بہت خوش ہوکر واپس آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُنھوں نے اپنی زندگی کے سب سے حسین خواب کی تعبیر دیکھ لی ہے۔ اپنے تاثرات اُنھوں نے متعدّد بار جلسوں میں اور مضامین میں بیان کئے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ اُنھوں نے اپنے سوویت یونین کے سفر کے بہت سے نوٹ لئے ہیں۔ اور جلد ہی وہ اپنا سفرنامہ کتابی شکل میں لکھیں گے افسوس کہ اُنھیں اس کی مہلت نہیں ملی۔

احتشام کی اور میری آخری ملاقات اُردو کمیٹی کے اُس جلسے میں ہوئی جو اگست میں دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اسوقت وہ بالکل اچھے تھے شام کے وقت وہ ڈاکٹر عبدالحلیم اور مالک رام کے ساتھ میرے گھر کھانا کھانے بھی آئے اور ہم سب دیر تک اُردو کے مسائل پر باتیں کرتے اور ہنستے بولتے رہے۔ ہم چاروں میں عمر کے لحاظ سے وہی سب سے چھوٹے تھے۔ موت کتنی ظالم ہوتی ہے کہ اُس نے اتنی بے دردی سے اور اتنا اچانک احتشام کو ہی اپنا شکار بنالیا۔
ترقی پسند ادبی تحریک کو پائیدار اور مستحکم بنانیوالا اور ترقی پسند نظریات اور خیالات کو برسہا برس اپنی تقریروں اور تحریروں سے ترویج کرنیوالا یہ بے مثل انسان آج ہمارے درمیان نہیں رہا۔ لیکن اُس کا کام زندہ ہے اور ہم اور آنیوالی نسلیں اُس سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے، اس نے اپنے علم و فضل سے جو مشعل روشن کی تھی ہم اُسے جلتا رکھیں گے۔

سجاد ظہیر

قومی آواز

آہ احتشام حسین

پروفیسر سید احتشام حسین رضوی کی ناوقت رحلت کی خبر سے اُردو کے ادبی حلقوں کو جتنا بھی صدمہ ہو کم ہے وہ بلند قامت ادیب ہی نہیں ادیبوں کی نئی نسل کے رہنما بھی تھے۔ ان کا شمار اس برصغیر کی ان چند شخصیتوں میں کیا جائے گا۔ جنھوں نے اُردو ادب کو زندگی

نے حقائق سے قریب لانے کے لئے ساری عمر جد و جہد کی۔ وہ مارکسی نظریات کے شیدائی اور مبلغ ہونے کے ساتھ اُردو کے پُرانے ادبی خزانہ کے قدرداں بھی تھے اور غالب، میر انیس اور اقبال جیسے ادبی تاجداروں کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے تھے۔ اور تصوف کے اچھے اشعار پر سر دھنتے تھے۔ یقیناً وہ نظریے سے زیادہ حقیقی ادب کے پرستار تھے۔

احتشام صاحب نے خاص طور سے تنقید میں نام پیدا کیا اور ان کے تنقیدی مضامین اور کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان کی ادبی کاوشیں تنقید تک محدود نہیں تھیں۔ اُنھوں نے بہت اچھی نظمیں اور غزلیں بھی کہی ہیں لیکن شرمیلے اور منکسر المزاج ہونے کی وجہ سے سناتے بہت کم تھے۔ ان کی نثر بہت پُرمغز اور جامع ہوتی تھی۔ اور کوئی اس کو پڑھ کر ان کی علمیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ تنقید کے علاوہ لسانیات اور تاریخ ادب کے موضوعات پر ان کی تصانیف شائع ہوئی ہیں۔ ایک سفرنامہ اور اُردو قاعدہ بھی لکھا ہے۔ تدوین اور ترجمہ سے بھی شغف رہا اور ادبی رسالے "نیا ادب" کے شریک اڈیٹر بھی رہے۔

اُنھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ اُردو پر مصیبت آ گئی اور اس زبان کو قعر مذلت میں ڈھکیلا جا رہا ہے۔ اُردو کو ڈھارس دلائی اور اُردو کی راجدھانی لکھنؤ میں اُس کو پُورے آب و تاب کے ساتھ روشن رکھنے کی جد و جہد اور ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی۔

احتشام صاحب کی شخصیت بے حد پُرکشش تھی۔ وہ اخلاق کے پیکر تھے۔ مروت، شرافت، بے ریا ہمدردی، نرمی اور وضعداری میں ان کا ثانی مشکل سے ملے گا۔ جس دور کے تھے وہ دور گیا۔ اور ان کے ساتھ یہ قدریں بھی چلی گئیں۔

ان کی رحلت سے ہندوستان میں اُردو ادب میں جو خلا ہوا ہے وہ شاید ہی کبھی پُورا ہو سکے۔

<u>سیاست جدید</u>

مرحوم احتشام حسین کی یاد کو سلام

پروفیسر احتشام حسین کی ناگہانی وفات کے بعد وہ جگہ خالی ہو گئی ہے جسے اُنھوں نے سید ممتاز حسین کے پاکستان ہجرت کرنے اور ڈاکٹر عبدالعلیم کے خاموش ہو جانے کے بعد فنکارانہ کمال اور تنقیدی امتیازات کے ساتھ پُر کی تھی۔ الہ آباد یونی ورسٹی سے تعلیمی فراغت سے ڈاکٹر اعجاز حسین کی طویل صحبت تک اور لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو سے طویل مدت تک کی وابستگی سے الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کی سربراہی کے کئی برسوں کے وقفہ تک احتشام صاحب کی زندگی کا ہر لمحہ اُردو زبان کے گاز کی خدمت کرنے اور اس کے تنقیدی ادب کو یورپ کی سائنٹفک تنقیدی اقدار سے روشناس کرنے پر صرف ہوا۔

احتشام صاحب کا کارنامہ یہ تھا کہ اُنھوں نے اُردو تنقید کے شعور کو مارکسزم کی منزل تک آگے بڑھایا۔ ہماری تنقید جو روایتی خول سے باہر نکالا اور مادیت کے تابع اسے تنقید سونپ دی۔ جو زندگی کے خارجی اُصولوں اور ارتقائی نظریات سے مالامال تھی۔ اور جس اُردو زبان کا طور پر منفرد ... احتشام صاحب کو جو لوگ قریب سے جانتے تھے

سنا تھا پڑھا تھا۔ دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا وہ اس ہنس مکھ، حلیم بردبار اور گوناگوں انسانی اوصاف کے پیکر کو کبھی فراموش نہ کریں گے۔ احتشام صاحب کے لہجے کا لوچ ان کی نرم گفتاری اور تعصبات تنگ نظری اور علاقائیت سے بلند تر اُن کی ذات گرامی میں وہ نیا انسان چھپا بیٹھا تھا۔ جس نے گذشتہ برس روس میں مرزا ترسون زادے اور زلفیہ خانم جیسے روسی جانشینوں کا دل جیت لیا۔ جس نے امریکہ میں اپنے قیام کے دوران میں امریکی حبشیوں سے نئے انسان نئے نظریات اور زندگی کی نئی قدروں کے لئے بے مثال خراج عقیدت حاصل کیا۔ اور جس نے برطانیہ میں انسانیت کی شمع کا ایسا نور بکھیر دیا۔ جس کی روشنی میں برطانوی نسل پرست برہنہ ہو کر رہ گئے ہمیں یقین ہے کہ جب اُن کی وفات کی خبر ہماری قومی سرحدیں پار کرے گی۔ اور پاکستان کویت برطانیہ، بحرین، ماریشس، عدن، عراق اور نیروبی پہونچے گی۔ تو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے محبان اُردو کو شدید ذہنی جھٹکا لگے گا۔ اور ایسا کچھ بالکل فطری ہوگا! ان کا یہ احساس بھی فطری ہوگا کہ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کے بعد اُردو زبان و ادب کا عظیم محسن ان کے درمیان سے رخصت ہوگیا ہم اُردو کے اس عظیم ادیب، نقاد اور شاعر کو ترقی پسند مصنفین کے قافلہ سالار کو اُردو کے فارسی رسم الخط کے بلند پایہ وکیل اور اس سے بھی بڑھ کر "ادیب" "انسان کو ـــــ سید احتشام حسین کی یاد کو بہ کمال ادب اور بہ کمال احترام اپنے دل کی تہوں سے نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

صدق جدید

احتشام حسین

اُردو پر جو مخلص آج اپنا جی جان قربان کئے ہوئے ہیں اور اُردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں ان میں کوئی احتشام مرحوم سے بڑھ کر تو خیر اور کیا ہوتا، کوئی ان کے برابر کا، ان کی ٹکر کا نکل آئے تو یہی بڑی بات ہے۔ دعوے زبان سے کرنے والے بے شمار ہیں لیکن میزان اخلاص پر پورے اترنے والے کچھ تھوڑے ہی سے ہیں؟ اور ان چند میں بھی خاص بلکہ یہ کہئے کہ اخص الخواص کہلانے کے قابل جو دو ہی چار ہیں ان میں سے ہر ایک وہ مرحوم تھے جن کی یاد منانے اور اُن پر آنسو بہانے ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ پرانی ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد جانی ہو اور نئی اُردو اکیڈمی لکھنؤ والی ہو تو آل انڈیا انجمن ترقی اُردو علی گڈھ کی ہو تو ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ کا ہو تو، شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کا ہو تو اور الہ آباد یونیورسٹی کا ہو تو، اُردو کا کوئی سا بھی شعبہ یا ادارہ ہو، سرکاری یا غیر سرکاری، سب سے ان کا یکساں تعلق، ملک گیر ہو، ریاستی ہو، شہری اور مقامی ہو، سب سے ان کا مساوی ربط، وہ ہر ایک کے خادم اور نیاز مند اور پھر یہ تو ان کا اجتماعی سلسلۂ خدمت ہوا۔ رہا شخصی و انفرادی سلسلۂ تعلیم و تدریس، تصنیف و تحقیق، یہ سب اس کے علاوہ اور ماسوا، سینکڑوں، ہزاروں صفحے کتابوں اور مقالوں کے حجم کی صورت میں کس نے تیس سال کی مدت میں تیار کر ڈالے؟ تنقید کے، تاریخ ادب کے، اور سفرناموں کے ڈھیر لگا دیے؟ اُردو کی خدمت بہر عنوان، بہر صورت۔ یہی قال، یہی مشغلہ، یہی دھندا، یہی جمال یہی کمال۔ اُردو میں ناقد تو پہلے بھی بڑے بڑے ہو چکے تھے، اور سخن فہم و سخن سنج

حالی و شبلی کے سے گزر چکے تھے، لیکن وہ سخن فہمی تمام تر ذوقی و وجدانی تھی۔ کسی ترکیب کی ندرت پر جھوم اٹھے۔ کسی فقرے کی نزاکت پر ادا کے ساتھ دل دے بیٹھے۔ لیکن تنقید بحیثیت فن کے "دورِ احتشامی" سے قبل اردو میں کہاں آئی تھی اور تنقید کی اُصولی بحثیں مغرب سے لا لاکر مشرق کے مدرسوں میں کس نے پھیلائیں؟ یہ نئے نئے رنگ اور وضع کے گل بوٹے بستان مشرق میں کس نے کھلائے تھے؟ یہ نت نئے سبق اپنے ہم وطنوں کو کس نے پڑھائے تھے؟

اردو کا مورخ ادب اس موضوع پر جب اٹھائے گا اور اس فن کے بانیوں میں جن کا نام گنائے گا۔ اردو والوں میں نام اس عالیشان والاحتشام کا ضرور آئے گا۔ حضرت رومی نے اپنی مثنوی میں عشق کو مخاطب کرکے فرمایا ہے ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

دے طبیعت جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما

اے تو افلاطون و جالینوس ما

اب عشق کے بجائے اردو زبان کے عشق کو رکھ لیجئے اور اس کلام کو احتشام مرحوم کی روح کی زبان پر بلا تکلف جاری کرا دیجئے۔ مرحوم نے اپنی عمر کا بہترین حصہ لکھنؤ یونیورسٹی میں گزارا اور اس کے ذریعہ سے اردو اور اردو پسندی کو جتنا پھیلایا، خصوصاً اردو بیزاری کے عین زمانہ میں، وہ بس انھیں کا حصہ تھا۔ اور پھر اب کئی سال سے ان کا یہی جہاد لطیف الہ آباد یونیورسٹی کے ذریعہ جاری تھا۔ یہ بھی انھیں کا حصہ تھا۔ سینکڑوں ہی کی تعداد میں تو اپنے قابل فخر شاگرد انھوں نے چھوڑ دیے ہیں۔

خالقِ کائنات کی مشیت اور مصلحت میں کون دم مار سکتا ہے۔ ورنہ اس درجہ دفعتاً اور ناگہانی اس چشمۂ فیض کی بندش ہم بندوں کی سمجھ میں تو آتی نہیں۔ بے ادبی نہ سمجھی جائے تو دل۔ بھلا چلا اور ہلکا ہوا ہر اردو والے کا یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اردو کی مخالف تکوینی قوتوں نے موت سے ساز باز کرکے سورما سے یوں میدان صاف کر دیا۔

میری اس تقریر حقیر کے بعد آپ کے سننے احتشام صاحب کے فن پر آئیں گی۔ اور آپ اس فن کے تجزیے اور تحلیل سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس حد دیجئے کہ مرحوم کی ذاتی صفات سے متعلق اپنے تاثرات کچھ عرض کر دے۔ ایسی بزرگ داشت، ایسا انکسار، طبع، ایسی سلاست روی، ایسی خوشگوار رواداری، کہوں گا کہ ایسی بے نفسی اور مشرقی اخلاق کی جامعیت کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ سن میں مجھ سے چھوٹے لیکن برتاوے میں چھوٹے سے بھی چھوٹا اپنے کو دکھا اور کبھی کوئی نا ملائم یا غصہ کا لفظ اُن کی زبان پر کبھی نہیں سنا۔ اختلاف چاہے وہ سیاسی ہو یا اس خوشگوار رواداری کے ساتھ ٹال جاتے کہ انانیت لگتی اور خود داری عش عش کہہ کے رہ جاتی۔ ضابطہ شائد ترقی پسندوں سے رہا ہی۔ لیکن سابقہ میں کبھی چلنے پایا کہ ترقی پسندوں کا کوئی شائبہ بھی ان کے مزاج میں ہے۔ نہ دقیانوسی شاعروں کے کلام پر مضحکہ کسی دیوان کے مطالعہ میں وقت ضائع ہونے کا احساس استادوں سے مقابلہ کے دم خم۔ نہ اپنی تعلیوں کے نہ ترقی پسندوں کے ہمہمہ کا کوئی نشان، اور ان کے کوئی نشان۔ ایک بار کیا ہوا کہ ریڈیائی یا نشری سلسلہ میں شرکت کی نوبت آئی اور مجھ سے انٹرویو اب جواب میں ریڈیو والوں کو کچھ کلام ہوا۔ مجھے یقین جواب اب رد ہوا۔ لیکن واہ ری شرافت کہ احتشام خود اپنا سوال ہی اُلٹا واپس لے لیا اور کمال بالا کہ اس امکان بدمزگی پر بھی شرمندہ اور معذرت

اسی طرح کے نازک موقعے دو ایک کبھی پیش آئے مگر وہ مرد خدا اپنی شرافت کا نشان

کرداری اور اس بے نفسی کے نمونے اگر عام ہوجائیں
صوصاً دنیائے ادب سے رنجش و فساد کے امکانات
ہوجائیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان مرحوم کو یہ احساس بھی
کبھی نہ ہوا ہوگا کہ انھیں کسی سے اختلاف ہے بھی! ایسی
پاکیزہ اور ملکوتی صفات والی ہستیاں اب کہاں دیکھنے کو ملیں گی

افکار کراچی

ایک سیارۂ فکر کی گمشدگی

تشام حسین کی ناگہانی موت صرف اُردو ادب کا ناقابلِ
نہ ہی نہیں، ایک سیارۂ فکر کی گمشدگی اور ایک خوشبوئے
الایاں ہے۔ اس سرزمین میں پروان چڑھنے والی ترقی
کے نظامِ شمسی کے روشن سیارے اور اُردو تنقید و
کی منازلِ ترقی کے راہ داں کی حیثیت سے احتشام حسین
ردو ہی میں نہیں، اس برصغیر کی ادبی تاریخ میں ایک
نام رکھتے ہیں۔ وہ اُردو تنقید کے سلسلۂ فکر کو آگے بڑھانے
ساتھ زندگی اور معاشرے میں انسانی اقدار کی روایت
ت سے تا بہ حدِ امکاں مستحکم کرتے رہے۔ ان کے اندازِ فکر
ذات کی بلندی بھی شامل تھی۔ اور ایک شعوری تحریک
نظری بھی۔ احتشام حسین ایک ادبی تحریک۔ ذہن
صاحبِ نظر معلّم اور باشعور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ
بڑے انسان بھی تھے۔ اُنھوں نے جو نشاناتِ راہ
ہیں، وہ ان کی شخصیت کی دل نوازی کے رنگوں اور
ری تابندگی کے جلوؤں سے جگمگاتے رہیں گے۔
احتشام حسین اپنی گفتگو اور اپنی تحریر دونوں میں اس
بہت دور تھے۔ جسے صحیح علمی شعور سے امتیاز کے لئے کسی بہتر
موجودگی میں، اسکول ماسٹرانہ ذہنیت کہا گیا ہے (خود

میتھو آرنالڈ کی تنقید دوں پر اسکول انسپکٹر، کی تحریر ہونے کی پھبتی کسی
گئی تھی) احتشام حسین صحیح معنوں میں بولنے سے پہلے تولنے کے قائل
تھے اور لکھنے سے پہلے جانچنے کے۔ پھر وہ ادبی فیصلوں کو اضافی جانتے
تھے، کسی آمرِ مطلق کے فیصلے نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ ارادتاً اپنی رایوں
کے اس جامدیت سے محفوظ رکھتے تھے جو پتھروں یا مجبوروں کی خصوصیت
کہی گئی ہے۔ نہ وہ بے تحاشہ لکھتے تھے اور نہ بے تکان بولتے تھے۔ اُن
سے گفتگو میں ذہنوں کے رد و بدل کا پتہ چلتا تھا۔ اور ان کی تحریر اس
بات کا ثبوت تھی کہ وہ کاغذ سیاہ کرنے یا پکّی روشنائی سے اپنا
نام چھپا ہوا دیکھنے کے لئے نہیں لکھتے تھے، بلکہ اُنھیں واقعی کچھ کہنا
مقصود ہوتا تھا۔ اُنھیں تصانیف کی تعداد بڑھانے کا شوق نہ
تھا کیوں کہ وہ ادب میں شماریاتی قدر و قیمت کے نہیں، فکری قدر و
قیمت کے قایل تھے۔ ایک کتاب پر رائے دیتے ہوئے اُنھوں نے برجستہ
کہا تھا کہ مصنف کا اس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کو جی چاہا۔ بس یہ
کتاب لکھ دی گئی۔ احتشام حسین ان تحریروں کو جو صرف مصنف کہلانے
یا تصانیف کی تعداد بڑھانے کے لئے لکھی گئی ہوں چنداں اہمیت
نہ دیتے تھے۔ خود ان کی تحریریں مدرسانہ داؤ پیچ کا نتیجہ نہیں،
مفکرانہ وقار رکھتی ہیں۔ احتشام حسین حقیقتاً صاحبِ علم تھے اور
علم ان پر بارِ گراں کی طرح لادا نہیں گیا تھا۔ اسی لئے انکسار و فروتنی

کی صفات بھی جو لازمۂ علم ہیں۔ ان کی ذات میں موجود تھیں۔ اپنے علاوہ بھی وہ دوسروں کے وجود کو مانتے تھے اور کسی قابلِ قدر کام کی تحقیر روا نہ رکھتے تھے۔ اپنے طالب علموں سے بھی وہ اسکول ماسٹر کے سے انداز میں نہ پیش آتے تھے۔ بلکہ تبادلۂ خیال کے لین دین کو ضروری سمجھتے تھے دوسروں کے خیالات کے احترام اور ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش نے ایک طرف احتشام حسین کو شخصی طور پر ہر دل عزیز بنا دیا تھا اور دوسری طرف خود ان کے نقطۂ نظر میں وہ وسعت پیدا کر دی تھی کہ اس کے تابندہ خطوط میں کتنے ہی خطوط گھل مل کر آیات روشن بناتے ہیں۔

جہاں احتشام حسین کی تحریروں میں فکری جسارت کے کئی پہلو ملتے ہیں، وہاں اپنی ذاتی زندگی میں وہ شرافت، خلوص محبت، ایثار، وضع داری اور بلند نفسی کے قایل تھے۔ وہ کسی فکر کی تنقید کو تو علم کا حق سمجھتے تھے۔ لیکن انھوں نے ذات کی برائی سے کبھی اپنی زبان یا قلم کو آلودہ نہ ہونے دیا۔ اپنی کتاب "ذوق ادب اور شعور" کا انتساب احتشام حسین نے آل احمد سرور کے نام کیا ہے اور اختلافات کے باوجود یہ اعتراف ان کی اپنی بڑائی کی دلیل ہے۔ آل احمد سرور سے ایک میدان میں زک اٹھانے کے بعد ذہنی طور پر انھیں جو صدمہ بھی ہوا ہو کبھی اپنے رکھ رکھاؤ اور برتاؤ سے انھوں نے اس کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ احتشام حسین کے ایما سے لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے آل احمد سرور کی رہائش گاہ ہی میں منعقد ہونے لگے۔ اور ان ہی کی تجویز سے لکھنؤ میں ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کی تنقیدی نشست (جس میں ڈاکٹر احسن فاروقی، اور راقم الحروف کو بھی مقالے پڑھنے تھے) کی صدارت آل احمد سرور ہی نے کی۔ دراصل احتشام حسین یگانگت اور اختلاف دونوں میں شریفانہ حدود سے تجاوز معیوب گردانتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصی بلندی میں اس تہذیبی حصہ کا بھی درخہ تھا جو میر

غالب، نظیر اکبر آبادی، آتش، انیس، حالی، شبلی، سرشار، دبیر اور پریم چند سے ہوتا ہوا گورکی، ٹالسٹائی، چیخوف، رومین رولاں، ٹورگنیف، شولوخوف، ٹامس مان، نٹ ہیمسن، ہاورڈ فاسٹ اور رالف فاکس تک پہنچتا ہے۔

احتشام حسین صرف ادب ہی میں ایثار و سیر چشمی کے قایل نہ تھے اپنی نجی زندگی میں برابر ان اقدار کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ مدیر افکار صہبا لکھنوی کے بیان کے مطابق، احتشام حسین نے افکار کے جوش نمبر کے لیے اپنی جوش پر لکھی جانے والی زیر ترتیب کتاب کے اہم حصے ہی نہیں بھیج دیے۔ اس نمبر کی ترتیب سے متعلق مفید تجاویز کارآمد مشورے بھی دیتے رہے۔ دراصل احتشام حسین کے سماجی شعور نے ان کے ادبی شعور کو جلا بخشی تھی۔ اور ان کے ادبی شعور نے خلوص، ذہنی رفعتوں سے آشنا کیا تھا وہ قدیم تہذیب کی شائستگی کے امانت دار ہونے کے ساتھ ساتھ نئی ابھرنے والی تہذیب کی انسانیت کے نقیب بھی تھے۔ بڑی بات یہ ہے کہ احتشام حسین کی شخصیت کے جادو سے یہ دونوں دنیائیں قریب آئی ہیں اور تحریر و گفتگو، خیال و عمل اور تعلقات و تصورات میں اپنی ملی جلی جھلکیاں دکھاتی رہی ہیں۔ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں احتشام حسین شاید زیادہ اصول پرست بھی تھے۔ اور زیادہ خوگرِ مروت و شائستہ وضعِ قدامت بھی۔ شاید ان کی تحریروں میں پہلی دنیا کی جھلک زیادہ ہے اور شخصی تعلقات میں دوسری دنیا کی۔ پھر بھی احتشام حسین کے یہاں یہ دنیائیں الگ الگ نہیں رہی ہیں اور کم زیادہ دونوں سے ان کی فکر اور زندگی متاثر ہوتی رہی ہے۔ احتشام حسین نے کتابوں اور انسانوں سے سیکھا اسے اپنی شخصیت کا ٹھپہ لگا کر پیش کیا ہے۔

احتشام حسین کی زندگی اور تحریر میں جو سنجیدہ فکری کے پہلو ملتے ہیں وہ ادب کو آگہی اور فکر کو تہذیب کی منزلت عطا کر

ہیں۔ احتشام حسین نے تنقید کے علم ہی کو نہیں آگے بڑھایا، خود زندگی کے شعور کو تیز تر کیا ہے۔ چراغ سے چراغ تو جلتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ احتشام حسین نے ہواؤں کے رُخ کو پہچانتے ہوئے کبھی ان سے بچ کر اور کبھی ان کے مقابلے میں اپنے علم کا چراغ روشن رکھا ہے۔ وہ ایک سرزمینِ وعدہ کی نوید بھی سناتے ہیں۔

لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اپنے دَور کے تہہ در تہہ محرکات پر نظر ڈالتے ہوئے وہ حقیقت اور تصور کی باہمی آویزش کا بڑی خوبی سے تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے آدرشوں کی روشنی میں اس تجزیہ کو نامساعد حالات کے خلاف ذہنی چیلنج کے طور پر پیش کرتے ہیں ان کا اندازِ نظر سائنسی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ قیاسیات اور ظنیات سے بچ کر اس حقیقت کی جستجو کرتے ہیں جو صرف ذہن کا عکس نہیں ہوتی بلکہ خارجی زندگی میں بھی اپنی بنیادیں رکھتی ہے.....

احتشام حسین کی تحریروں میں آزادی کی ہوائیں چلتی ہیں اور انسانی جد وجہد کی روشن دھوپ سے دلوں میں گرمی آتی ہے۔ وہ اس جد وجہد کی مختلف سطحوں، اس کی فکری و معاشی تہوں اور طبق در طبق نمودار ہونے والی متحرک صورتوں کی متصادم و غیر متصادم کیفیوں کو ادبی مظاہر سے سرگوشیاں کرتے سنتے ہیں۔ احتشام حسین میں شخصی طور پر یہ ہمت تھی کہ روایاتِ شرافت کے سانچے کو طرزِ زندگی بنا لیں اور ساتھ ہی اپنے وقت کی خود سرسچائی کا برملا اظہار کر سکیں۔ ان کی شخصیت میں وہ پختگی بھی تھی۔ کہ تیزی سے بدلتے ہوئے سماج میں اپنی شریفانہ وضع کو برقرار رکھ سکیں۔ اور وہ لچک بھی کہ نئے دَور کی اُمنگوں اور خواہشوں کی فکری دھاراؤں کو سمیٹ لیں اپنی ذات اور ذہن کے اعتبار سے خواجہ غلام السیدین، ذاکر حسین، قاضی عبدالغفار اور ہمایوں کبیر وغیرہ۔ اس برصغیر کی جس علمی لہر کو پیش کرتے ہیں، احتشام حسین نے اسی لہر کو شاید زیادہ انقلابی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان جلائے ہوئے چراغوں کی روشنی سے نئے چراغ جلے ہیں اور جلتے جائیں گے۔

بلڈز

... باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

موت تو ایک دن سب کو آنی ہے کوئی آگے جائے گا اور کوئی پیچھے۔

پھر بھی ہر موت پر — چاہے وہ دشمن کی ہی کیوں نہ ہو چاہے وہ کتنی ہی حقیر ہستی کی موت ہی کیوں نہ ہو۔ افسوس ضرور ہوتا ہے کبھی کم کبھی زیادہ۔

لیکن جب کوئی ادیب، کوئی نقاد کوئی شاعر مرتا ہے تو اس کا افسوس اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کو ہی نہیں ایک پوری زبان کے پڑھنے والوں کو ہوتا ہے۔

اور جب مرنے والا سید احتشام حسین مرحوم جیسے پایہ کا ادیب اور نقاد ہو تو ایک زبان بیوہ ہو جاتی ہے ایک ادب یتیم ہو جاتا ہے اور ہزاروں لاکھوں اُردو پڑھنے والے، اُردو سے پیار کرنے والے اس کے ماتم میں شریک ہو جاتے ہیں۔

احتشام صاحب ایک ہمہ گیر ادبی شخصیت کے مالک تھے۔

وہ لکھنؤ اور الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر رہے۔

اور ہزاروں اُردو ادب کے طالب علموں نے ان سے سیکھا کہ ادب کی پرکھ اور اعلیٰ قدروں کی پہچان اور پرکھ کیسے کی جاتی ہے۔ یہی نہیں راہ راست اپنے لیکچر کے ذریعے اور بالواسطہ اپنی کتابوں اور مضامین کے ذریعے اُنھوں نے اُردو ادیبوں اور اُردو والوں کی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ پڑھنے والوں کے ذوق کی تربیت کی اور نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی کر کے اُن کی تخلیقی قوتوں کو اُجاگر کیا اور ان کو سنوارا۔ اردو زبان ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کے مزاج کی چھاپ صدیوں تک اُردو ادب پر باقی رہے گی۔

لیکن احتشام حسین صرف پروفیسر ہی نہیں تھے۔ !

وہ صرف نقاد اور ادیب ہی نہیں تھے !

وہ ایک ترقی پسند تھے۔ جنھوں نے اپنی تنقید سے ترقی پسند ادب کی حمایت ہی نہیں کی بلکہ ترقی پسند ادب کی تحریک کو راستہ دکھایا۔ ان کا وقت، ان کا مکان، ان کا کتب خانہ ہر اُبھرتے ہوئے ادیب اور ہونہار طالب علم کے لئے ہمیشہ اور ہر وقت کھُلا رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ ایک سچے فن کار، ایک سچے ادیب، ایک سچے نقاد کا پیدا ہوتا ایک معجزہ سے کم نہیں ہوتا۔ احتشام نے اپنے علم سے، اپنے اخلاق سے، اپنی شخصیت کے اثر سے نہ جانے کتنے ادیب، شاعر اور نقادوں کو جنم دیا۔

پروفیسر احتشام حسین اُردو کے ادیب اور نقاد تھے مگر اُنھیں ہندی سے بھی لگاؤ اور پیار تھا۔ اور ہندی ساہتیہ کاروں سے ان کے بہترین مراسم تھے۔ وہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے دوست تھے۔ ہندی زبان میں اُن کی کتاب "اُردو ادب کی تاریخ" شائع ہو چکی ہے۔

انگریزی ادب سے بھی ان کو خاص شغف تھا۔ روسی ادب (انگریزی اور اُردو ترجموں کے ذریعے) پر اُن کی گہری نظر تھی، کلچرل ڈیلی گیشنز کے ساتھ وہ روس، یورپ اور امریکہ گئے اور ہر جگہ یونیورسٹیوں، کالجوں اور دوسرے تعلیمی اور کلچرل اداروں میں لکچر دیئے جو بہت مقبول ہوئے۔ کیوں کہ وہ بہترین مقرر تھے۔ اور اُردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں جیسے بے تکان لکھتے تھے ویسے ہی روانی سے بولتے بھی تھے۔

تب ہی تو ان کا ماتم کرنے والوں میں اُردو اور ہندی کے ادیبوں ساہتیہ کاروں، لکھنؤ اور الہ آباد کے پروفیسروں اور طالب علموں کے علاوہ دوسرے ملکوں اور دوسری زبانوں کے مشاہیر بھی شامل ہیں۔

علاوہ اور خوبیوں کے احتشام حسین صاحب ایک زندہ دل انسان تھے۔

شاید جب تک اُردو زبان زندہ ہے احتشام حسین کا نام اور ان کا کام یاد رہے گا۔ ان کی تنقید کی مشعل کی روشنی میں ابھی بہت کچھ تخلیق ہوگا۔

خدا حافظ احتشام صاحب بہت جلدی تھی شاید آپ کو دنیا سے جانے کی ورنہ ہم بھی سامان باندھ کر تیار بیٹھے ہیں۔

سوویت دیش

یکم دسمبر کو الہ آباد میں دل کی حرکت بند ہو جانے سے پروفیسر احتشام حسین کا انتقال ہو گیا۔ اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کی انتہائی ممتاز شخصیتوں میں سے تھے۔ اُنھوں نے اپنی تنقید کے ذریعہ سماجی حقیقت نگاری کی تحریک اور ادب کے بارے میں مارکسی نقطۂ نظر کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے وہ اُردو ہی نہیں پُورے ہندوستان کے مارکسی ادیبوں میں بلند شخصیت

کے مالک تھے اور اپنی تحریروں سے انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کی کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے ہمیشہ ہند سوویت دوستی کا خیر مقدم کیا اور اسے ترقی اور فروغ دینے میں منہمک رہے۔ پچھلے دنوں وہ سوویت یونین تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے بیحد متاثر ہو کر آئے تھے، انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ اطمینان کیساتھ اپنا سفرنامہ تحریر کرینگے افسوس کہ موت نے انھیں اس کی اجازت نہ دی۔

ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بیرونی ملکوں میں بھی اپنے زمانے کے ایک ممتاز عالم کی حیثیت سے پروفیسر احتشام حسین کی بڑی قدر کیجاتی تھی۔

سوویت یونین میں انکا بڑا مان تھا، انکی کئی کتابیں وہاں ترجمہ کیجا چکی ہیں اور مقبول ہیں۔

سوویت دیش، کو پروفیسر احتشام حسین کی خصوصی سرپرستی حاصل رہی ہمارے رسالے کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسکے وجود کی دو دہائیوں کے دوران انکے بہت سارے اہم مضامین ان کے صفحات پر شائع ہوئے۔

انکی نا وقت موت کو، سوویت دیس، ایک عظیم نقصان سمجھتے ہوئے انکی یاد میں سر جھکاتا ہے، سوویت دیس، کی مجلس ادارت ان کے خاندان والوں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں اور ہندوستان کی پوری ترقی پسند تحریک کے ساتھ سوگواروں میں شامل ہے۔

سب ساتھ دہلی

آہ ادب! آہ تنقید!

اس مہینے دو بہت جانکاہ حادثے ہوئے ہیں۔ ایک ہے اُردو کے عظیم نقاد پروفیسر احتشام حسین کی وفات اور دوسرا ہے۔ ڈرامہ نگار، ایکٹر و ڈائریکٹر موہن راکیش کا انتقال۔ ان حادثوں سے علم اور آرٹ کی دُنیا کو سخت نقصان پہنچا ہے۔

ان دونوں کی عمر کیلنڈر کے لحاظ سے جو بھی ہو، ہماری نظروں میں تو دونوں ابھی نوجوان تھے اور ان کے پاس علم کی دنیا کو عطا کرنے کے لئے بہت کچھ تھا۔

پروفیسر احتشام حسین بڑے پایۂ کے نقاد اور محقق تھے۔ جن کے قلم سے سطحی بات کبھی نہیں نکلتی —— ان کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا تھا لیکن رائے کے وزن سے نہیں۔ یوں تو اُردو ادب کو احتشام صاحب نے بہت کچھ دیا جو ادب کی لائبریری میں یادگار رہے گا، لیکن خاص طور سے ترقی پسند ادب کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اس کو احتشام صاحب کا سا صاحبِ قلم مل گیا تھا۔ اُنھوں نے ترقی پسند ادب کے درجنوں تاریک گوشوں کو استدلال کی شمع سے روشن کردیا اور اپنی کوششوں سے اسکی تحریروں میں توازن اور ہمواری پیدا کی۔ ایسے نقاد بہت کم ہوئے ہیں جنکی تحریروں میں اصلاح بار آور ثابت ہوئی ہیں۔

موہن راکیش کے ڈراموں کے کرداروں اور واقعات میں ایسی گھریلو حقیقت پسندی ہوتی تھی کہ وہ سب اپنے اردگرد کی باتیں معلوم ہوتی تھیں اور زبان تو ایسی رواں کہ اسکو جی چاہے تو اُردو کہو اور جی چاہے تو ہندی۔ وہ بول چال کی زبان ہوتی تھی۔ اور لہجے پر فرٹ بیٹھتی تھی۔ ایسے ہی کمال کے وہ ڈائریکٹر اور ایکٹر بھی تھے۔

موہن راکیش سے تو ابھی بہت توقعات تھیں، ان کا آرٹ اور قلم تو ابھی اُبھر رہے تھے۔ لیکن افسوس ان کو موت نے چھین لیا۔

ہم ان دونوں عظیم فنکاروں کے عزیزوں، دوستوں، شاگردوں اور ساتھیوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

معارف اعظم گڈھ

پروفیسر احتشام حسین صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کی ناگہانی وفات علمی و ادبی دنیا کا بڑا سانحہ ہے، مرحوم اس دَور کے چوٹی کے ادیبوں اور نقادوں میں تھے۔ ترقی پسند ادب کے تو معلم و رہنما تھے، اس دَور کے نوجوان ادیبوں کی پوری نسل ان سے متاثر ہوئی جدید ادب کے ساتھ قدیم ادبیات پر بھی اُنکی نظر بڑی گہری اور مبصرانہ تھی۔ اور وہ اس کی اچھی روایات کے بھی قدر شناس تھے، لسانیات سے بھی واقف تھے۔ اُنھوں نے سیکڑوں ادبی و تنقیدی مضامین اور بعض مستقل کتابیں لکھیں۔

اگرچہ وہ ترقی پسندوں کے امام تھے لیکن ان کے خیال میں بڑا اعتدال و توازن اور زبان و قلم دونوں میں بڑی شائستگی تھی۔ اس لئے جدید کے ساتھ قدیم طبقہ میں بھی ان کی بڑی قدر تھی۔ وہ ابتداء میں لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر ہو گئے تھے۔ اُردو کی تمام اہم مجالس کے ممتاز رکن تھے۔ کوئی اہم ادبی اجتماع ان کے بغیر کامیاب نہ سمجھا جاتا تھا۔ اُنھوں نے مختلف حیثیتوں سے اُردو کی بڑی قیمتی خدمات انجام دیں اور ہر محاذ پر اُردو کے مخالفین کا مقابلہ کیا۔

ان علمی کمالات کے ساتھ وہ طبعاً بڑے متین، بہ شریف اور وضعدار تھے، ان کے علم سے زیادہ ان کے اخ و شرافت کا اثر پڑتا تھا۔ دارالمصنفین سے ان کو دہرا تعلق ایک علمی و ادبی، دوسرا وطنی، ماہل ضلع اعظم گڈھ ان کا تھا، ہائی اسکول تک ان کی تعلیم بھی اعظم گڈھ میں ہوئی اسی زمانہ سے ان کو دارالمصنفین سے تعلق تھا، جو ہر زمانہ میں قائم رہا، جب تک وہ لکھنؤ میں رہے اکثر ان سے ملاقات ہوتی تھی، الہ آباد جانے کے بعد بھی ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ کبھی اُردو کی دوسری مجالس میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اجب ہوتی تو اپنی طالب علمی کے زمانہ کے دارالمصنفین کے تمام کو فرداً فرداً پوچھتے، اپنے اعظم گڈھ کے شاگردوں کو دا سے استفادا کی برابر تاکید کرتے رہتے۔ اور ہر مرتبہ آ وعدہ کرتے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آئی، ا موت سے اُردو کا بہت بڑا ستون گر گیا۔ اور تہذ و شرافت کا ایک نمونہ اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اُن فرمائے۔

سرفراز لکھنؤ

احتشام صاحب یکم دسمبر کو جمعہ کے دن صبح کو بالکل ٹھیک تھے۔ اور گھر والوں کو اس کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ چند لمحوں کے بعد ان سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائیں گے۔ مگر اُن باتوں سے جو وہ انتقال سے کچھ دن پہلے سے کر رہے تھے۔ یہ اندازہ ہوتا تھا کہ مرحوم کو اپنے انتقال کا پہلے سے احساس ہو گیا تھا۔ آپ کے پاس اپنے چالیس پچاس فوٹو کی کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ نکال کر اپنی صاحبزادی کو دیں کہ یہ رکھ لو۔ لڑکی نے کہا کہ آپ کے پاس رکھی تو ہیں دینے کی کیا ضرورت ہے فرمایا کہ کچھ اخبار والے آئیں گے اور وہ میری تصویر مانگیں گے۔ اُنھیں تم جو چاہو دے ایک مہمان آنے والے تھے ان کا تار آیا کہ میں یکم دسمبر کو پہنچ رہا ہوں۔ تار اپنی اہلیہ کے پاس لے گئے اور کہنے لگے وہ بڑے غلط وقت آرہے ہیں۔ اہلیہ محترمہ نے کہا کہ وقت پر کیسے آرہے ہیں۔ کہنے لگے کہ شاید مجھے کہیں سفر

ے۔ بیوی بولیں کہ ابھی تک تو آپ کا کہیں جانے کا ارادہ نہیں
۔ اچانک یہ ارادہ کیسا؟ اور مہمان کی خاطر ایک دن کے
سفر کو ملتوی بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہنے لگے کہ مجھے دُور جانا
التوائے سفر مشکل ہے۔ اہلیہ نے کہا کہ اب تک آپ کا رخت
بھی نہیں بندھا ہے اور اس وقت سے پہلے آپ نے اس کا
رہ بھی نہیں کیا تھا۔ کہ آپ کو آج ہی جانا ہے۔ بولے ہاں جانا
ری ہے، دو چار دن پہلے بھی اپنے سب لڑکوں سے کہا کہ تم لوگ
سے جو کام لینا چاہو، وہ ۳۰ نومبر تک لے سکتے ہو۔ ورنہ تم اپنے
ں میں لیٹ ہو جاؤ گے۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ
ام صاحب فرما کیا رہے ہیں۔ جب یکم دسمبر کو ناشتہ وغیرہ سے
ہونے۔ کپڑے تبدیل کئے اور صحن مکان میں ٹہلنے لگے۔ اچانک
۔ین پر گر پڑے گھر کے لوگوں نے دوڑ کر اُٹھایا۔ پلنگ پر لٹایا
یک ہچکی آئی اور آپ نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔
عتشام صاحب سانحۂ انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح نہ صرف
باد میں بلکہ پورے ملک میں پھیل گئی۔ نہ صرف شہروں میں بلکہ
ت اور قصبات تک میں۔ آپ کے مداحوں، ہمدردوں اور
توں کا ایک وسیع حلقہ جو اقطاع ہند میں پھیلا ہوا تھا۔ بلکہ
۔سے غیر ممالک میں بھی۔ آپ ایک ادیب، شاعر، نقاد اور
ذر کی حیثیت سے شہرت عام اور بقائے دوام کی منزلوں
نچے ہوئے تھے، اس لئے ہندوستان بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں
راً اس خبر کو نشر کیا۔ دہلی ریڈیو نے اپنے سارے پروگرام
ل کر دیئے۔ اور غم کی دھن بجانے کے بعد تھوڑے وقفے
خبرِ غم کو نشر کرتا رہا۔

پورے الٰہ آباد کے ہندو مسلمان، سُنی اور شیعہ، الٰہ آباد
ٹی کے اساتذہ اور طلبا پر غم واندوہ کی ایک کیفیت چھائی
تھی۔ آپ کے سوگ میں یونی ورسٹی دو دن بند رکھی گئی۔

جنازے کے جلوس میں ہزار ہا سُنی، شیعہ، ہندو، مسلمان
بھائی شریک تھے۔ مجمع کا یہ عالم تھا کہ مرحوم کے مکان سے
ر بلا تک جہاں تدفین عمل میں آئی تقریباً دو میل کا فاصلہ ہے

یہ پوری سڑک سوگوار دل سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اور
اتنا مختصر راستہ کم سے کم ڈیڑھ دو گھنٹے میں طے ہوا۔

الٰہ آباد کے باشندوں نے مرحوم کے انتقال کے سلسلے میں
بڑی محبت و خلوص کا مظاہرہ فرمایا۔ یکم دسمبر کی صبح سے ۲ دسمبر
کو مرحوم کے تدفین کے وقت تک جو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے
عمل میں آئی۔ ہزاروں کا مجمع موجود رہا۔ تدفین کے بعد علامہ
سید ذیشان حیدر صاحب قبلہ مجتہد نے پانچ منٹ کی مختصر سی
بڑی موثر تقریر فرمائی۔

تدفین کے وقت ہر شخص آپ کے آخری دیدار کے لئے ..
مضطرب تھا۔ اور مخصوص اعزا کو بھی صورت دیکھنے کا موقع مشکل
ہی سے مل سکا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ تدفین کے
چھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اس سے مرحوم کی بے پناہ
ت کا پتہ چلتا ہے۔

ذمہ داران یونی ورسٹی نے بھی بڑی ہمدردی اور خلوص کا عملی
اظہار کیا۔ ڈین آف فیکلٹی نے وائس چانسلر سے مل کر فوراً مرحوم کے
صاحب زادے سید جعفر عباس سلمہ کا یونی ورسٹی میں اس خالی جگہ
پر تقرر کر لی۔ بہت سے مخصوص مسلمان کہا کرتے تھے کہ ہندو
مسلمانوں سے تعصب کرتے ہیں لیکن اگر نگاہ حقیقت سے دیکھا
جائے تو یہ الزام بالکل غلط ہے۔ اگر ہندو متعصب ہوتے تو
احتشام صاحب کے صاحب زادے کا اسی وقت تقرر کیوں کر
دیا جاتا۔ جب کہ احتشام صاحب کی میت سپرد خاک بھی نہیں
ہوئی تھی، یہ واقعہ ہے کہ شرافت و انسانیت کسی قوم کی ملکیت
نہیں ہے جس طرح ایک شیعہ شریف ہو سکتا ہے اُسی طرح
ایک ہندو اور سُنی بھی۔ اور ہمارے ہندوستان کی ایک یہی سب سے
بڑی خصوصیت ہے۔

احتشام صاحب کی زندگی بڑی مرنجان مرنج تھی۔ وہ جس سے
ملتے تھے وہ ان کی باغ و بہار زندگی سے حد درجہ متاثر ہوتا تھا
اور احترام کے ساتھ ان کی عزت بھی اس کے دل میں جاگزیں
ہو جاتی۔ اُنھوں نے کسی ہندو مسلمان اور سنی شیعہ کی کبھی دل

آزادی نہیں کی۔ ان کی زندگی اور انکی وفات کے سلسلے میں سب میں قطعہ بالکل صادق آتا ہے۔

یاد داری کہ وقت زادن تو ہمہ خنداں بودند تو گریاں
آں چناں زی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں شوند تو خنداں

واقعی احتشام صاحب نے اپنی ساری زندگی اس طرح گذاری کہ انکے مرنے پر ہر متنفس اشکبار نظر آرہا تھا اور آج تک سوگوار نظر آرہا ہے۔

مرحوم کی نماز جنازہ علامہ سید ذیشان حیدر صاحب قبلہ نے پڑھا شیعوں کے بعد برادران اہل سنت نے خواہش کی کہ دوبارہ پڑھی جائے گے چنانچہ اہل سنت کی طرف سے نماز جنازہ میں تقریباً ڈیڑھ سو نے شرکت کی۔

مرحوم کے لاکھوں مداح ان کے قریبی اعزا کی طرح اس سے متاثر ہیں اور وہ ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

سورجیہ

ماتم احتشام

کبھی میں اُردو اخبارات میں شائع ہونے والی اس خبر کو پڑھتا ہوں جس میں جناب احتشام حسین صاحب کے انتقال کی اطلاع دی گئی ہے اور کبھی میں اپنے نام آئے ہوئے اس پوسٹ کارڈ (مورخہ ۲۷ نومبر سات بجے رات) کو پڑھتا ہوں جسے احتشام صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور جو مجھے ۳۰ نومبر کو ملا۔ ٹھیک چوبیس گھنٹے کے بعد یعنی پہلی دسمبر کو احتشام حسین راہی ملک عدم ہوئے ——— عدم و وجود کے اتنے نازک رشتے کی ڈور سے لٹکے ہوئے ہم کتنے بڑے بڑے حوصلوں کی بات کرتے ہیں۔ اور اپنے کارناموں پر غرور کرتے نہیں تھکتے ہم جو اپنے وجود پر اتنے نازاں ہیں ایک کچی ڈور کو تھامے خود کو اکثر وہ سب سمجھ بیٹھتے جو ہم نہیں ہیں۔

احتشام حسین ان میں سے تھے جو بہت کچھ ہو کر بھی اپنے آپ کو نمائشی بنانے سے زندگی بھر احتراز کرتے رہے دنیاوی ترقی کی سیڑھیوں پر دوسروں کو ڈھکیلیں ڈھکیل کر چڑھنے کی اُنھوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ دوسروں کو اُنگلی پکڑ کر اُوپر اُٹھانے کا مقدس مگر بے صلہ کام کرتے رہے۔

احتشام حسین بڑے عالم اور یکتا نقاد تھے۔ مگر اس یکتا نقاد کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ اوّلاً ہندوستان میں پیدا ہوئے ثانیاً اُردو میں لکھتے رہے، ملک کے اتنے بڑے دانشور، عالم اور نقاد کے انتقال کی خبر سے ملک کے بڑے بڑے اخبار خالی رہے۔ اور اگر شاید کسی میں خبر آئی بھی تو اتنی سی سائیکل اور رکشے کی ٹکر کی خبر ہوا کرتی ہے۔ کون جانے گا تین پُشت تک ہزاروں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے والا اذہان کو متاثر کرنے والا، علم و ادب کے ایوانوں کو منور کرنے والا، تنقید کی دُنیا میں نئے افکار و خیالات کی ترویج کرنے والا ——— ۱۹۷۲ء میں خاموش ہو گیا؟

کون جانے گا کہ احتشام حسین نے اپنے ذہن کا رس نچوڑ کر اپنے ملک اور سماج کو دے دیا۔ اور اچانک جب اُن کی آنکھیں بند ہو گئیں تو ان کے وارثوں پر کیا بیتی اور کیا بیتے گی۔ جنھیں ابھی احتشام حسین صاحب کی ضرورت تھی۔

کون جانے گا جس "رفاقت" نے احتشام حسین کی ازدواجی زندگی کے لئے ان دیکھی اور انجانی ہزاروں قربانیاں دی ہوں گی اس "رفاقت" کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں نے کیا کہا۔

دن کے اُجالے نے اس شخصیت کے دفن کا منظر دیکھا جو زندگی بھر جہالت اور کم علمی کے اندھیروں سے لڑتا رہا مگر رات نے ان دو دلوں کو ڈوبتے دیکھا۔ جن میں رفیق احتشام حسین، باپ احتشام حسین، دوست احتشام حسین، اُستاد احتشام

میت حرکت و حرارت بن کر جاگزیں تھی۔
احتشام حسین کو کون کیا دے سکے گا۔۔۔؟ اس دیوقامت
وراور نقاد کو کیا مل سکے گا۔۔۔ جس نے علم ادب کو خون
جگر دیا"؟
احتشام حسین ۔۔۔ کہاں ڈھونڈھیے.....
اُنھیں؟

مسیکولرڈیموکریسی

گوش معنی شنو ہوا خاموش

احتشام صاحب مرحوم

ہر بڑے ادیب کی وفات پر کچھ اس قسم کے رسمی الفاظ
رہیت کی جاتی ہے کہ مرحوم ایک عظیم انسان تھے۔ ایک فنکار
ن کی وفات سے ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو
رنہ ہو سکے گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن احتشام صاحب مرحوم
رے میں ایسے رسمی فقرے لکھ دینے سے دل کو تسلی نہیں
اس لئے کہ وہ واقعی ایک عظیم انسان تھے اور وہ واقعی
ند پایہ عالم تھے۔ وہ علم کو علم کے لئے حاصل کرتے تھے۔
عزت وقار کے لئے نہیں۔ بعض لوگ صرف سرکاری حلقوں
ل ہوتے ہیں اور بعض عوام میں۔ احتشام صاحب اپنی متواز
لدت شخصیت کی وجہ سے ہر حلقہ میں غیر معمولی عزت اور
کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

اُردو تنقید اپنی ابتدا ہی سے ادب کی دوسری اصناف
ھر پروان چڑھی۔ اُردو کے سب سے پہلے نقاد الطاف حسین
نیادی طور پر شاعر تھے۔ ان کی بہترین تنقید مقدمہ شعرو
یا ان کے دیوان کی مرہونِ منت ہے۔ یعنی اُنھوں نے
یوان کا مقدمہ لکھا تھا۔ جو بعد میں بذاتِ خود اردو کا
ت تنقیدی سرمایہ بن گیا۔ حالی سے لیکر مجنوں گورکھپوری
پوری، رشید احمد صدیقی تک۔ نقادوں کا یہی حال رہا
دی طور پر مورخ افسانہ نگار یا شاعر ہوتے تھے۔ اور
انوی طور پر تنقیدی مضامین بھی لکھ لیتے تھے ترقی پسند

تحریک کی ایک دین یہ بھی ہے کہ اس نے اُردو میں تنقید نگاری
کو ایک الگ صنف کی حیثیت سے فروغ دیا۔ اس تحریک کے زیر
اثر جو نقاد پیدا ہوئے ان کی فہرست بہت مختصر ہے اور صفِ اول
کے نقاد صرف تین ہوئے۔ احتشام حسین صاحب، آلِ احمد سرور
اور ممتاز حسین۔ ان میں ممتاز حسین تو کمیونزم کے فقیہہ بن گئے۔
اور ان کی تحریریں خشکی اُلجھاؤ کا شکار ہو گئیں۔ اس کے علاوہ
جو کچھ اُنھیں کہنا تھا۔ وہ بہت جلد کہہ کر فارغ ہوئے.....
احتشام صاحب اور سرور صاحب نے عملی تنقید میں کارنمایاں
کئے اور اس تحریک کے دوش بدوش چلتے رہے۔ کچھ سال پہلے
سرور صاحب اور بعض دوسرے ترقی پسند نقاد جدیدیت سے
متاثر ہو کر ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے رشتے تلاش کرکے
یہ ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے کہ جدیدیت ترقی
پسند تحریک ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ترقی پسندوں میں احتشام
صاحب واحد نقاد ہیں جن کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے اُنھوں
نے ابتدا ہی میں اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا تھا۔ زندگی کے
آخری سانس تک اسی پر چلتے رہے ان کے نقطۂ نظر سے
اختلاف ممکن ہے۔ جو خود ان کی زندگی میں ہوتا رہا ہے ۔۔۔
لیکن ان کی ایمانداری اور ان کے خلوص پر ان کے سخت سے
سخت نقاد نے بھی حرف گیری نہیں کی۔ اُنھوں نے ایک طویل
عرصہ ایسا گذارا ہے جب پہلے سامراجی حکومت اور پھر خود

ہندوستانی حکومت کی نظر میں اپنے سیاسی عقائد کی وجہ سے اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ کبھی اپنے مسلک کو نہیں بدلا۔ بلکہ کبھی اسے چھپانے کی بھی کوشش نہیں کی۔

ترقی پسندوں میں صرف احتشام صاحب اور سرور صاحب ہی ایسے نقاد ہیں جن کی تنقیدوں کا بہت بڑا حصہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

احتشام صاحب ایک سچے عالم تھے۔ جب تک موضوع کے تمام پہلوؤں پر ہر ممکن مواد کا مطالعہ نہ کر لیتے ہرگز قدم نہ اُٹھاتے تنقید تو ظاہر ہے ان کا میدان تھا۔ لیکن دوسرے موضوعات پر بھی ان کے تحریروں کی یہی خوبی ہے۔ جان بیمز کی کتاب "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کے اُردو ترجمے پر ان کا مقدمہ اور اُردوئے معلّیٰ میں شائع ہونے والا ایک مضمون ہند آریائی زبانیں میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں، ان دونوں مقالوں کو پڑھنے والا ہرگز یہ یقین نہیں کر سکتا کہ لسانیات میں انھوں نے باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ انھوں نے لسانیات میں جو کچھ علم حاصل کیا وہ محض ان کے ذاتی شوق، غیر معمولی ذہانت اور علمی بصیرت کی دین ہے۔ انھوں نے اُردو لسانیات میں جو اضافہ کیا وہ بہت سے تربیت یافتہ ماہرین لسانیات بھی نہیں کر سکے۔ ترقی اُردو بورڈ کی طرف سے گریرسن کی Linguistic Survey of India کی اُردو سے متعلق جلد کے ترجمے کی ذمہ داری انھیں سونپی گئی۔ افسوس ہے کہ اس کام کی ابتدا بھی نہ ہو سکی کہ وہ چل بسے۔

احتشام صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۹ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے بعد ان سے بیشمار ملاقاتیں ہوئیں۔ اور ہر ملاقات میں دل میں ان کی عزت پہلے سے زیادہ ہو جاتی تھی۔ جب کبھی دیر تک ان کے ساتھ نشست رہتی تو وہ فلسفہ، سماجیات، تاریخ اور انگریزی ادب کی بعض کتابوں کا ضرور ذکر کرتے مقصد ان کا یہ ہوتا تھا کہ ہم ان کا مطالعہ کریں لیکن بات ہمیشہ یوں شروع کرتے آپ نے پروفیسر کی سوشیولوجی

تو ضرور پڑھی ہوگی۔ پھر اس کتاب کے بارے میں کچھ اس طرح گفتگو کرتے کہ ہم (میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز) پہلی فرصت میں وہ کتاب ضرور پڑھتے۔ جن دو عالموں کی منکسر المزاجی نے مجھے غیر معمولی طور سے متاثر کیا ہے ان میں سے ایک تو مولانا امتیاز علی عرشی اور دوسرے احتشام صاحب مرحوم تھے۔ جب کبھی وہ زبانی یا تحریری طور پر کسی سے اختلاف کرتے تو ہمیشہ اس رکھ رکھاؤ اور انداز کے ساتھ کہ دوسرے کو ناگوار نہ گزرے۔ میں نے ان دونوں حضرات کو کبھی معمولی سے معمولی ادیب کے بارے میں بھی سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے نہیں سنا۔ جب کبھی ایسے ادیب کی کسی تحریر کا ذکر آتا تو احتشام صاحب صرف اتنا کہتے ان کا یہ خیال ہے میرا ذاتی خیال یہ ہے۔ پھر تفصیل سے اس موضوع پر بحث کرتے۔ اس بحث و مباحثہ کے ضمن میں وہ جس طرح بیشمار کتابوں کے زبانی حوالے دیتے تھے وہ قاضی عبدالودود کے علاوہ انہی کا حصہ تھا۔

ان کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ کبھی کسی کو محض اسلئے چھوٹا نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عمر میں چھوٹا ہے یا اس کی سماجی حیثیت کچھ کم ہے۔ ایک دفعہ اُردو کے ایک مقتدر ادیب باہر سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ ان کا قیام تھا۔ دہلی کے ایک ایسے صاحب نے جو ادبی اعتبار سے تو مجھ جیسے حقیر کے مقابلے میں بھی حقیر تر ہیں لیکن جن کی سماجی حیثیت مجھ سے کہیں زیادہ تھی میرے برگزیدہ مہمان سے یہ کہہ دیا کہ آپ خلیق کے یہاں کیسے ٹھہرے۔ یہ آپکے شایان شان نہیں۔ اتفاق سے انھیں دنوں احتشام صاحب دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں اسلم پرویز اور وہ صاحب احتشام صاحب سے ملنے گئے۔ ان صاحب نے یہ قصہ احتشام صاحب کو بھی سنایا کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔ چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ احتشام صاحب کو یہ بات ناگوار گزری ہے۔ لیکن اولاً کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب وہ کچھ دیر تک یہ موضوع چلتا رہا تو ان سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھے کہ وہ

ب گرمے ہیں کچھ اور بات کیجئے۔

میں نے پچھلے بارہ تیرہ برسوں میں انھیں صرف دو
ـہ میں دیکھا تھا۔ ایک تو اس وقت جس کا ذکر میں ابھی
ا ہوں۔ اور دوسرے جب دو تین سال پہلے ایک خاتون
فیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ
اتون پروفیسر تو کجا لیکچرر ہونے کے قابل نہیں تھیں۔
ہوا کہ ان کے مقابلے میں ایک مشہور ترقی پسند نقاد کو
یا گیا تھا۔ احتشام صاحب سے اس موضوع پر جب
ہوئی تو میرے اور ڈاکٹر اسلم پرویز کے علاوہ اور بھی
عزات موجود تھے۔ خاموش بیٹھے سب لوگوں کی گفتگو
رہے۔ بہت دیر بعد بہت غصہ اور دکھ کے ساتھ بولے
یہی روش رہی تو تمام یونیورسٹیاں جاہلوں سے
ئیں گی۔" اور پھر موضوع بدل دیا۔

احتشام صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ جس سے
ار ملتے اسے ہمیشہ یاد رکھتے۔ دہلی تشریف لاتے تو
، ان سے اکیلے ملنے جاتا تو سب سے پہلے اسلم پرویز کے
یں پوچھتے، خیریت سے ہیں؟ آجکل کیا کر رہے ہیں؟
ے بعد ہی کوئی اور بات ہوتی۔

احتشام صاحب ایک حقیقی عالم کی طرح کبھی جوڑ
ہیں کرتے تھے۔ ان کے بعض ہم عصروں کی زندگی کا بڑا
احب اقتدار لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں گذرتا
یکن احتشام صاحب نے اپنی ساری زندگی علمی مشاغل
زار دی۔ ان کے ایک صاحبزادے جعفر عباس نے دہلی
رسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے کیا اور فرسٹ کلاس
ٹ حاصل کی۔ چونکہ میرے طالب علم رہے ہیں اس لئے
ملازمت کے لئے مجھے خاص پریشانی تھی۔ ترقی اردو
میں کچھ جگہیں نکلیں۔ میں نے احتشام صاحب سے
رخواست کی کہ آپ فلاں صاحب سے کہہ دیں تو تقرر
ئے گا۔

مسکرانے لگے۔ میں نے پھر بات دہرائی۔ کہنے لگے بھئی
وہ میرا بچہ ہے، میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں مگر
کسی سے کیسے کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو غلط بات ہے۔ آپ اس کے
استاد ہیں یہ ذمہ داری آپ کی بھی ہے۔

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ترقی اُردو بورڈ کے
انچارج شہباز حسین صاحب تشریف لے آئے۔ سوچا موقع
اچھا ہے۔ میں نے شہباز صاحب سے کہا کہ حضرت آپکے ہوتے
ہوئے جعفر عباس بے روزگار پھرے۔ میری یہ بات احتشام
صاحب کو ناگوار گذری۔ اور انھوں نے فوراً موضوع بدل دیا۔
بظاہر یہ بات بہت معمولی تھی۔ لیکن ایسی معمولی باتوں کے
لئے بھی انسان کو فرشتہ بننا پڑتا ہے۔

پچھلے اکتوبر میں ترقی اُردو بورڈ کے تحت علی گڈھ
میں لسانی اصطلاحات کا پانچ روزہ سمینار ہوا۔ مجھے
چونکہ علم تھا کہ احتشام صاحب بھی تشریف لائیں گے۔
اسلئے میں اپنے ساتھ وہ پیش لفظ لے گیا جو مکتبہ جامعہ سے شائع
ہونے والے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت کے لئے لکھا
تھا کہ ایک بار احتشام صاحب کی نظر سے گذر جائے۔ پہلے
ہی دن میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بغیر کچھ بولے
انھوں نے اپنے کاغذوں میں اسے بھی رکھ لیا۔ دو تین دن بعد
سمینار ختم ہوا۔ تو ہم لوگ باہر نکلے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔
"آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" اور ایک طرف لے گئے
جب ہم سب لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو انھوں نے وہ
پیش لفظ واپس کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس کے بارے میں جو میرے خیالات تھے وہ آخری
صفحے پر لکھ دیے ہیں۔"

شاید انھیں یہ خیال تھا کہ اگر اور لوگوں کو یہ علم
ہوا کہ میں نے احتشام صاحب سے مشورہ لیا ہے تو شاید یہ بات
مجھے پسند نہ آئے اس لئے وہ مجھ بالکل الگ لے گئے تھے۔ میں ان
کے اس انداز پہ ہنس پڑا۔ اور عرض کیا قبلہ میرے لئے اس سے

پڑھ کر اور کیا خوشی کی بات ہوگی کہ آپ کی شاگردی کا فخر حاصل کروں۔ لیکن اس واقعہ سے میرے دل میں ان کی کتنی عزت بڑھی وہ شاید بیان نہ کرسکوں۔

احتشام صاحب کا آخری مقالہ سیکولر ڈیموکریسی اُردو (سالنامہ ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوا ان کی کچھ آخری تصویریں لینے کا فخر بھی مجھے ہی حاصل ہے۔ محترمہ سبھدرا جوشی اور ڈی۔ آر۔ گوئل صاحب سے ان کے بہت دوستانہ مراسم تھے۔ اس لئے اکثر ہمارے دفتر آتے تھے۔ ایک شام وہ دفتر آئے تو میں نے فرمائش کی کہ قومی شاعری پر ایک مقالہ لکھ دیجئے۔ فرمانے لگے الہ آباد جا کر بھیج دوں گا۔ میں نے گذارش کی کہ پرچہ پریس جا رہا ہے۔ میرے بے پناہ اصرار پر ہنس کر فرمانے لگے کہ آپ ضد کرتے ہیں تو میں رات کو لکھ دوں گا۔ دوسرے دن تین صفحے کا نامکمل مضمون ملا۔ ایک چھوٹا سا خط منسلک تھا۔ جس میں احتشام صاحب نے لکھا تھا رات میری طبیعت خراب ہوگئی تھی الہ آباد جاتے ہی باقی مضمون بھیج دوں گا۔ دو تین دن میں باقی مضمون بھی بھیج دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس رات ان کی طبیعت غیر معمولی طور پر خراب ہوگئی تھی۔ چونکہ وعدہ کیا تھا جب تک جسم نے ساتھ دیا لکھتے رہے۔

آخر میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کردوں، الہ آباد یونیورسٹی کے ایک تعزیتی جلسہ میں یونیورسٹی کے ڈین آف فیکلٹی نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ وفات سے کچھ عرصہ پہلے مرحوم کو یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ پیش کی گئی تھی لیکن ان کی استغنا پسندی نے اسے قبول نہیں کیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ چند ماہ پہلے یو۔پی کی گورنرشپ کیلئے انکا نام تجویز ہوا تھا لیکن یہ علم و فضل کا شیدائی اقتدار کے جال میں نہیں پھنسا اور بالآخر ایک عالم کی حیثیت سے اس نے وفات پائی۔ (خلیق انجم)

پیامِ نو لکھنؤ

خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

پروفیسر سید احتشام حسین کے اچانک انتقال سے اردو ادب عہدِ حاضر کے ایک ایسے عدیم المثال ناقد اور گراں قدر ادیب سے محروم ہوگیا۔ جس نے گذشتہ تیس برسوں میں اپنی تحریروں تقریروں اور کاوشِ فکر سے ادیبوں اور شاعروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا تھا۔ اُن کے اُٹھ جانے سے اُردو ادب میں ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پُر ہونا ممکن نہیں۔ وہ ایسے نقاد تھے جنھوں نے جدید ترین اصولوں کو اردو ادب میں تراش کے رچ دیا تھا اور ایسے ادیب تھے جن کے تبحرِ علمی میں پیر جانا آسان نہ تھا۔ اسی کے ساتھ اُن کی پُرخلوص شخصیت نے اُنکے ہر علم و فن میں، اتنی درخشندگی پیدا کر رکھی تھی کہ وہ ہر ممتاز محفل میں ادیبوں اور شاعروں کے لئے مرکزِ توجہ بن جاتے تھے۔

احتشام صاحب یکم دسمبر کی صبح کو ۸ بجے تک بظاہر بالکل اچھے تھے۔ اپنے لاڈلے فرزند عون سلمہٗ سے یہ ضرور کہا تھا کہ سینہ میں کچھ درد ہے۔ لیکن اس کی نہ کوئی اہمیت ظاہر کی اور نہ ڈاکٹر کو بلانے کی اجازت دی حالانکہ وہ درد ایسا تھا کہ چند منٹ کے وقفہ ہی میں انتقال فرما گئے۔ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی غیور اور خوددار طبیعت نے تیمارداروں کی تیمارداری، چارہ گروں کی چارہ سازی، غمخواروں کی غمخواری، غرضیکہ کسی کی بھی نیازمندانہ خدمت کرنا گوارا نہ کیا۔ اور ہستی سے نیستی کی منزل تک ایک چھلانگ کے سہارے زندگی کا سارا راستہ طے کرلیا۔ لیکن بہارستان اُردو ادب کا یہ چہکتا ہوا عندلیبِ خوش الحان اس طرح خاموش ہوا کہ سارے نواسنجانِ چمن دم بخود رہ گئے۔

ماہلی، جیساکہ پیار سے ہم اُنکو پکارا کرتے تھے ۔
ہر کے قصبہ ماہلی میں ۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء کو ایک
خانوادۂ نبی سادات میں پیدا ہوئے تھے۔ اعظم گڑھ
سکول تک تعلیم حاصل کرکے الہ آباد آگئے اور وہیں
ے اُردو میں ایم اے پوری امتیازی خصوصیات
س کیا۔ اُن کے طالب علمی ہی کے زمانہ میں"
بازہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی"
، تحصیل ہونے کے کچھ ہی بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونی
بہ اُردو میں لکچرر مقرر ہوگئے۔ لکھنؤ میں اُن کے
بہت اہم اور زریں تھا۔ اُن کی بلند پایہ تصانیف
کتابیں اسی زمانہ میں شائع ہوئیں۔ لکھنؤ ہی کے
ی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔ اور تحریک کا
، کے بعد بھی آخر دم تک ترقی پسندی کے علمبردار
میں الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر
لیکن لکھنؤ سے اُن کا گہرا قلبی تعلق برقرار رہا۔ وہ
آتے تھے۔ اُن کا جتنا وقت بھی بچتا دوستوں
ہوں اور شاعروں سے ملاقاتوں میں صرف ہو
کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ وہ مختصر سے مختصر دوران
پنے ہر دوست سے، خواہ وہ قلیل سے قلیل وقفہ
ں نہ ہو۔ ملاقات ضرور کرلیتے تھے۔ اُنھوں نے
ورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد اسی شہر میں
فیصلہ کرکے اپنے قیام گاہ کے لئے ایک مکان بھی
یکن ایسا نہ ہوسکا کیوں کہ الہ آباد کی کربلا کے
ں کی آخری آرام گاہ بننے کا شرف مقدر تھا۔
شام صاحب کی اہم تصانیف میں روایت اور
دب اور سماج۔ تنقیدی جائزے۔ عکس اور
ور عملی تنقید۔ تنقیدی نظریات۔ اعتبار نظر
بلہ وہ ادھر کچھ دنوں سے اُردو ادب کی ایک آٹھ

نو سو صفحات کی تاریخ مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ جس کے ابتدائی حصے لکھنؤ کے ایک اشاعتی ادارے کی طرف سے زیرِ اشاعت ہیں۔ افسوس ہے کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اُنھیں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا موقع نہ دیا۔

احتشام صاحب نے امریکہ اور رُوس کا دَورہ بھی کیا تھا۔ امریکہ کے دَورہ کے سلسلے میں ساحل اور سمندر کے نام سے ایک سفرنامہ بھی شائع کیا تھا۔ جو اُن کی اُصول پرستی انصاف پسندی اور حق گوئی کو ثابت کرنے کے لئے ایک دستاویزی ثبوت کی حیثیت رکھتا ہے۔

احتشام صاحب تمام سرکاری اور غیر سرکاری کمیٹیوں نیز ہر اُس تحریک کے روح رواں تھے۔ جن کا تعلق اُردو سے تھا۔ ایسی متعدد کمیٹیوں میں ساہتیہ اکاڈمی۔ اُردو اکاڈمی۔ ریاستی حکومت کی انعامی کمیٹی اور قومی یکجہتی کونسل خصوصیات کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان سب میں وہ ایک سرگرم کارکن اور ہر جگہ ممتاز اور باوقار حیثیت کے مالک تھے۔ اُن کے اُٹھ جانے سے ہر محفل سونی ہوگئی اور تمام ادارے غریب ہوگئے۔

احتشام صاحب کے پس ماندگان میں اُن کی بیگم صاحبہ، چار بیٹے، دو بیٹیاں۔ اور ایک ضعیف علیل اور معمر والدہ ہیں........ اپنی والدہ کو وہ بُوبُو کہتے تھے۔ بیوگی کی مصیبت پڑنے کے بعد بوبو کا سہارا اُن کا یہی ہونہار اور مایۂ ناز فرزند تھا۔ جس کے اُٹھ جانے کے بعد اس غم زدہ ماں کے دل کا حال سوچ کر کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ یوں تو ان محترمہ کی خدمت کرنے کے لئے خدا کے فضل و کرم سے تین ہونہار سعید اور مطیع فرزند موجود ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی۔ احتشام صاحب کی موت ایک ایسا کوہ گراں ہے۔ جس کا اندازہ وہی دل کرسکتا ہے۔ جس پر یہ مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔

آجکل ۔ نئی دہلی

پروفیسر احتشام حسین

یکم دسمبر ۲ے۱۹ء کو پروفیسر احتشام حسین کا انتقال ہوگیا احتشام صاحب اُردو ادب میں سائنسی تنقید کے بانی، اپنی تحریر میں نہایت غیر جذباتی اور اپنی زندگی میں سراسر جذبہ تھے اور شاید اسی لئے وہ نہ صرف ایک عظیم ناقد تھے۔ بلکہ ایک اچھے انسان بھی۔ اپنی سوانح، شخصیت اور انداز فکر کے بارے میں وہ "ساحل اور سمندر" میں فرماتے ہیں۔

"۱۹۳۰ء میں تعلیم کے لئے میں الہ آباد پہونچا۔ الہ آباد اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف تحریک سول نافرمانی کا مرکز تھا۔ میں بھی فطری طور پر قومی آزادی کے جذبہ سے معمور ہو گیا۔ یونی ورسٹی کی تعلیم کے دوران میں میں نے لکھنا شروع کیا افسانے، ڈرامے، نظمیں، تنقیدی مقالات، علمی مضامین، سب کچھ پڑھنے کا یہ حال کہ کبھی کسی خاص ترتیب یا خیال سے نہیں پڑھتا تھا۔ لیکن ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، نفسیات اور جنسیات سبھی سے دلچسپی لیتا تھا تاکہ میں زندگی کے مسائل کو پوری طرح سمجھ سکوں، آخرکار میرا سارا وقت تنقید سے دلچسپی لینے اور تنقیدی مضامین لکھنے میں صرف ہونے لگا۔ ۱۹۳۶ء میں میرے خیالات ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگے۔"

اس نئے سانچے کی تفصیل یہ ہے۔

"میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی ملک اور قوم کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اس کے سماجی نظام میں پیوست ہوتی ہیں۔ اور ان کو اس سے الگ کرکے دیکھنا کبھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے اپنی تمام تحریروں میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے ایسا آئینہ نہیں جس میں صرف زندگی کے ٹھہرے ہوئے نقش دیکھے جاسکیں۔ بلکہ ادب متحرک بن کر ہمیں زندگی کے اعلیٰ مقاصد تک پہونچانے اور انھیں حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے میرا خیال ہے کہ انسان کی فطرت میں بدی نہیں ہے بلکہ حالات اسے ایسا بناتے ہیں اور اگر ہم تمام قوموں کو مطمئن اور آسودہ حال زندگی بسر کرنے کا موقع دیں۔ تو دُنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ انسان دوستی پر مبنی بین الاقوامیت، جو ہر ملک اور قوم کو برابری کا درجہ دینا قبول کرتی ہے۔ اور ہر قوم کی شخصیت کو برقرار رکھنا چاہتی ہے' ہماری اصل منزل ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ دائمی امن قائم ہوسکتا ہے۔ اور انسان ترقی کی جانب بڑھ سکتا ہے۔ دُنیا کے اچھے انسان اور اچھے ادیب اسی جانب رہنمائی کرتے رہے ہیں۔"

اُردو کے بارے میں احتشام صاحب نے فرمایا:۔

"میں جس زبان میں لکھتا ہوں وہ اُردو ہے جسے ابھی بیسویں صدی کی ابتدا تک ملک کی عام زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن حالات اس قدر تیزی سے بدلے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاست نے وہ ابتری پھیلائی ہے کہ ہندوستان میں اس کی زندگی مشکل ہو رہی ہے۔ تاہم یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں اعلیٰ ادب موجود ہے اور اب بھی پیدا ہو رہا ہے اور میں اس کی حیثیت منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

یہ اقتباسات نہ صرف احتشام صاحب کی شخصیت کے عکاس ہیں۔ بلکہ ان کے طرزِ تحریر کا بھی اچھا نمونہ ہیں، جس کی جڑیں سرسید احمد اور حالی کے سیدھے، سچے، کھرے، مدلل اور معرا اسلوب سے ملتی ہیں۔ یہ طرز شاید ان لوگوں کو ملتفت نہ کرےگا جو محمد حسین آزاد اور نذیر احمد کی تثیلی اور چٹخارے دار زبان

یکن دراصل یہی کامیاب ترسیل وابلاغ کی
ا طرز سے جو مشکل خیالات کو آسان لفظوں
۔ اُردو نثر کا مستقبل وابستہ ہے۔
احب محض قلم کے بادشاہ نہیں تھے۔ وہ اُردو
ون میں ایک کامیاب مقرر اور اپنے اُستاد ڈاکٹر
ایک مثالی معلم تھے۔ اُنھوں نے لکھنؤ اور الہٰ آباد
ب علموں کو جن میں ڈاکٹر محمد حسن سے لیکر راقم الحروف

تک شامل تھے اپنی مثال سے یہ سکھایا کہ تعلیم کا مقصد امتحان پاس کرنا یا ڈگریاں جمع کرنا نہیں۔ بلکہ ذہن کی کشادگی، ذوق کی تربیت، کیرکٹر کی تشکیل اور نتیجتاً ایک اچھا شہری بنانا ہے۔ احتشام صاحب نے کبھی یہ فکر نہیں کی کہ وہ پی۔ ایچ ڈی یا ڈی لٹ کرلیں لیکن وہ بڑھتے لکھتے اور سوچتے رہے۔ دوسروں کو پی ایچ ڈی بناتے رہے اُنھوں نے کوئی ایک درجن بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں جو تا ابد ادب میں اُن کے اعلیٰ مقام کی ضامن ہیں۔

سیاست حیدرآباد

احتشام صاحب

برلامت کی خبریں سُنتے ہوئے۔ اچانک ایسا محسوس
نہ لہریں جو آواز کو قید کرکے دُنیا کے گوشے
، ہیدہ دل کے نازک ترین گوشوں میں خنجر کی طرح
الفاظ، ایسے کتنے الفاظ روز ہوا کی لہروں میں
باتے ہیں، مگر یہ الفاظ روز سُنے جانے والے
مختلف تھے۔ "اُردو کے مشہور نقاد اور الٰہ آباد
ر شعبۂ اُردو پروفیسر احتشام حسین کا آج حرکت
نے سے انتقال ہوگیا۔ اُن کے سوگ میں یونی ورسٹی
بھی ادارے بند کر دیئے گئے۔
صاحب ایک ماہ قبل علی گڈھ آئے تھے۔ میں شام
لئے گھر سے چلا تو کسی نے کہا کہ "احتشام صاحب تو
ہ رہتے ہیں آئندہ آئیں تو مل لیجئے" لیکن میں اُن سے
یشی صاحب کے مکان پر ان سے ملنے والوں کا
ر طلباء اور نوجوان اساتذہ تھے جو سب کے
رت اور مرتبے کے فرق کے باوجود، احتشام صاحب
۔ ادبی اور علمی مسائل کے علاوہ احتشام صاحب
معاملہ میں اسی طرح دلچسپی لیتے تھے، گویا سب

اُن کے اپنے قریبی عزیز ہوں۔ ہم سب ٹہلتے ہوئے یونی ورسٹی اسٹاف کلب آئے راستے میں اور پھر کلب میں کتنے ہی حضرات اُن سے آکر محبت اور عقیدت سے ملے۔ دیر تک شاعری، ادب، تنقید جدیدیت اور نہ جانے کتنے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ لطیفہ بازی بھی ہوئی اور سنجیدہ خیال آرائی بھی۔ احتشام صاحب کو یہ فکر کہ فلاں صاحب کو اب کہیں لکچرر شپ مل جانی چاہیئے۔ فلاں کو ڈاکٹریٹ ملنے میں بہت دیر ہوگئی۔ فلاں کو اپنا کام مکمل کرلینا چاہیئے فلاں کتاب اچھی ہے۔ فلاں موضوع پر کام کرنے کی گنجائش ہے اُردو اور اُردو والوں کے مسائل ان کے اپنے ذاتی مسائل تھے۔ ساہتیہ اکاڈمی، اُردو اکاڈمی، گجرال کمیٹی مسلم یونی ورسٹی کے مختلف کمیٹیاں جن کے وہ رُکن تھے حیدرآباد میں ہونے والا اُردو اصطلاحات کا سمینار جس میں وہ شریک ہونے والے تھے، فلسفے اور لسانیات کی اصطلاحیں، ہر موضوع پر اس انکسار سے بات کرتے تھے کہ مخاطب اپنی بے باک رائے دینے میں کوئی تکلیف محسوس نہ کرے۔
علم نے اُن کے مزاج میں وہ نرمی اور سادگی پیدا کی تھی۔
جو جہالت کے غرور اور ذہنی کم مائیگی کی حماقت انسانی کی تاریکی میں شمع کی طرح روشنی پھیلاتی تھی۔ مارکسزم پر اُن کے ایقان

نے طبیعت میں خشونت ایک رُخہ پن اور تعصب پیدا نہیں کیا تھا بلکہ درد مندی دل سوزی اور ہر غم کو اپنا غم سمجھنے کے قابل بنا یا تھا۔ اُنھوں نے اپنے تاثرات، اپنے عہدوں اور اپنی بلندی کو کبھی اپنے یا اپنے عزیزوں کی ترقی کے لئے استعمال نہیں کیا۔ اُن کے بڑے بیٹے جعفر عباس نے دہلی یونی ورسٹی سے درجۂ اول میں اُردو سے ایم۔ اے کیا تھا۔ اور کئی برس سے دہلی میں چھوٹے موٹے کام کرکے اپنا تحقیقی کام کر رہے تھے۔ احتشام صاحب نے جو دوسروں کو یونیورسٹی کی عظمتیں، اعلیٰ ملازمتیں دینے والی کمیٹی کے رکن ہوتے تھے، اپنے بیٹے کے اسکالرشپ کے لئے کسی سے کہنا تک کوشش کی۔ وہ دولت مند نہ تھے۔ پروفیسر ہونے کے باوجود مالی لحاظ سے وہ ہمیشہ غریب رہے۔ ان پر اپنے خاندان، بھائیوں، دُور کے غریب عزیزوں کا ہمیشہ بار رہا جسے وہ خندہ پیشانی سے پورا کرتے تھے۔ اُن کی ضرورتیں محدود تھیں، اور اُنھوں نے کبھی اپنے آرام اور آسائش کو اہمیت بھی نہ دی۔ آج کل ہمارے یہاں "کنبہ پروری" کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ اپنے عہدے، اثر اور اختیار کے بل پر اپنے کنبہ کے افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدے پہونچائے جائیں احتشام صاحب کی "کنبہ پروری" پرانی وضع کی تھی۔ وہ اپنی محدود آمدنی میں سے جسے جو دے سکتے تھے، دے دیتے تھے۔ اپنی فیاضی اور فراخ دلی کے لئے حکومت یا یونی ورسٹی کے وسائل کو اُنھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ اُن کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے بے روزگار تھے۔ معلوم ہوا کہ الہ آباد یونی ورسٹی کے وائس چانسلر، رجسٹرار اور ڈین آرٹس فیکلٹی اُن کے مرنے کے آدھے گھنٹے کے اندر ان کے بیٹے کے لئے لیکچررشپ کے تقرر کا کاغذ لیکر آئے۔ احتشام صاحب زندہ ہوتے تو وہ یہ احسان کبھی قبول نہ کرتے۔ حالاں کہ یہ اُن کا حق تھا۔ لائق ستائش ہیں وہ افراد جنھوں نے اُن کے حق کو مرنے کے بعد فراموش نہ کیا۔ اور اُن کے وسیع کنبے کے لئے عزت سے زندہ رہنے کا بروقت انتظام کر دیا ہمارے معاشرے میں زندگی میں تو بڑے لوگوں کے بیٹوں بھانجوں بھتیجوں کے لئے ہر اک بات کرنے پر بہت کچھ آمادہ رہتا ہے

مگر آنکھیں بند ہونے کے بعد یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرنے والے سے اب کوئی کام نہیں نکل سکتا۔ اس لئے کوئی اس کے خاندان کے لئے کیوں کچھ کرے۔ لین دین کے اس ماحول میں احتشام صاحب نے دیا سب کو، لیا کسی سے نہیں، آپ کی یہی شرافت، کردار کی یہی بلندی، علم وادب کے لئے اُن کی یہی بے غرضی اپنی مثال آپ ہے وہ سیاسی لیڈر نہ تھے وہ اختیار و اقتدار کے حلیف نہ تھے۔ لیکن ان کی موت پر الہ آباد بند ہو گیا، دفاتر، بازار، تعلیمی ادارے سب نے ان کا سوگ منایا ان کے انتقال کو ایک ماہ ہو گیا مگر آج تک شمالی اور جنوبی ہند کے اخبارات ان کے تعزیتی جلسوں کی خبروں سے بھرے رہتے ہیں۔ اُردو کے کسی پروفیسر کا سوگ اتنے بڑے پیمانے پر، چھوٹے، موٹے مقامات، قصبوں اور دیہاتوں تک میں کبھی نہیں منایا گیا ہوگا۔ مرنے کے بعد اُن کی شرافتیں اور نمایاں ہو گئی ہیں۔

احتشام صاحب نے الہ آباد یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی، اور اُن کی تعلیمی زندگی جد وجہد اور آزمائشوں سے بھری ہونے کے باوجود، شاندار اور مثالی تھی۔ وہ الہ آباد کے چند بہترین اور ناقابلِ فراموش طلباء میں ہمیشہ شمار ہوں گے۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں لکچرر ہو گئے اور ۱۹۶۲ء تک اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ درمیان میں اُن کے لئے ریڈرشپ کا موقع نکلا مگر اُنھوں نے سرور صاحب کے اس عہدہ پر تقرر کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ جب لکھنؤ والوں اور طلباء کی طرف سے اس تقرر کے خلاف احتجاج کی تجویز رکھی گئی تو احتشام صاحب نے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ لکھنؤ چھوڑ دیں گے۔ ہماری یونی ورسٹیوں میں ترقیوں کے لئے جو کچھ ہوتا ہے اور معیار کے حضرات ہر جائز و ناجائز طریقے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا اندازہ کرنا مشکل نہیں احتشام صاحب خاموشی سے لکچرر شپ پر کام کرتے رہے حالاں کہ اُن کا علمی ادبی کام اُس وقت بھی بیشتر پروفیسروں سے کہیں زیادہ اہم اور وقیع تھا۔ اُردو تنقید میں اُنھوں نے اپنی پہلی کتاب ہی سے بلند ترین مقام حاصل کر لیا تھا۔ اُن کی شہرت اُس وقت بھی

بقیہ ۶۸۶ پر

دا کر میں بیمار پڑ گیا۔ وقت پر اپنا مقالہ نہ بھیج سکا
ب برابر خطوط لکھتے رہے لیکن تاخیر پر انھوں نے
ا اظہار نہیں کیا بلکہ دوسرے بزرگ اپنی فرمائشوں کی
خیر کو اپنی ذاتی توہین سمجھتے اور خفا ہو جاتے ہیں ــ
ب اس طرح کے معاملات میں اپنی شخصیت کی بڑائی
یان میں نہ لاتے تھے وہ کسی معاملے میں بھی اپنی
ت کو حائل نہ ہونے دیتے تھے۔
دو کے با اثر لکھنے والوں میں مجھے دو افراد ہی ایسے
اپنے اثرات اور مقبولیت سے اپنے اور اپنے خاندان کے
رہ نہ اٹھایا۔ ایک مخدوم اور دوسرے احتشام صاحب
حب علمی اعتبار سے ہمارے معتبر ترین ادیب تھے۔
لم اور نظر کم ہی لوگوں کو میسر آئی ہوگی۔ اُن کا نام اردو
ی تاریخ کا لازمی حصہ بن گیا ہے۔ ان کے علمی اور

تنقیدی کارناموں سے سب ہی واقف ہیں۔ لیکن اُنکی شخصیت کی سادگی، دل کی شرافت، کردار کی بلندی، اقتدار سے بے نیازی، علم کی اتھاہ لگن اور اپنے ہم عصروں سے غیر معمولی محبت پر کم ہی لکھا جائے گا۔ اگر احتشام صاحب کا کوئی بڑا ادبی کارنامہ نہ بھی ہوتا تب بھی اُن کی شخصیت کی بڑائی اُن کے ہزاروں لاکھوں طلبا کے دلوں میں برسوں زندہ رہتی۔ احتشام صاحب کی موت اُردو ادب ہی کا نقصان ہی نہیں، ہندوستان، پاکستان کے دانشور حلقوں اور تہذیبی زندگی کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اس نقصان کو اُن کے ہزاروں جاننے والے اپنا ذاتی نقصان سمجھ رہے ہیں۔

علم کتابوں کے اوراق میں زندہ رہتا ہے، مگر کسی بڑے آدمی کی شخصیت اس کے معاصرین کے ذہنوں اور تاثرات میں زندہ رہتی ہے۔

(ڈاکٹر وحید اختر)

نیا دور لکھنؤ

آہ احتشام حسین مرحوم

ور کے زیر نظر شمارہ کی اشاعت میں بعض ناگزیر اسباب
ی سے تاخیر ہو گئی تھی اور اس کی آخری پلیٹ
نچ گئی تھی کہ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے سانحہ
لی بن کر گر پڑی۔ پہلی دسمبر کا وہ منحوس دن تھا جب
ب دنیائے علم و ادب، دنیائے شرافت و انسانیت
و محبت، دنیائے انکسار و مروت کو تاریک بنا کر
نہیں معلوم تاکہ یہ پرکشش ذات اب ہمارے درمیان
ا ربار دل میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اب احتشام صاحب
ت نہ ہوگی۔
نام صاحب کی ہمہ گیر شخصیت میں ایسی کشش تھی، ایسا
بھی ایک بار ان سے قریب ہوتا ہمیشہ کیلئے ان کا
تا۔ یہ گرویدگی انکی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی
، دور بینی اور معاملات و مسائل کو انتہائی

خوبی کے ساتھ حل کرنے کی زبردست قابلیت کے باعث تو ہوتی ہی اس سے بڑھ کر ان کے خلوص محبت، انکسار، مروت، فراخدلی ہمدردی اور پاس وضعداری کی بنا پر ہوتی۔ موجودہ دور میں شاید انکی واحد ذات تھی جس سے کسی کو شاکی نہیں پایا گیا۔ وہ سب کے پیارے تھے اور ان کو سب سے پیار تھا۔ یہ ان کی شہرت و عظمت اور مقبولیت کی ادنیٰ دلیل ہے کہ کوئی جلسہ ہو، کوئی کمیٹی ہو، کوئی سمینار، اکیڈمی ہو، انکے بغیر نامکمل سمجھی جاتی بہت سے نجی اجتماعات احتشام صاحب کے انتظار میں ملتوی رہتے کہ آ لیں تو انجام پائیں۔ انکے ساتھ اس طرح کے اجتماعات بھی مر گئے، انکی اچانک دائمی جدائی کا جو زبردست دھچکا لگا ہے۔ اسکے باعث اظہار تاثر کیلئے الفاظ بھی نہیں مل رہے ہیں۔ یہ حال راقم الحروف ہی کا نہیں ہے بلکہ سبھی کی یہ حالت ہوگی۔ ایسی عظیم ہستی کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسکا صحیح احساس

سے آگے

ردو کے اکثر تمام نہاد سر برآوردہ افراد سے بہت زیادہ اچھی تھی۔
کا اخر بھی تھا۔ مگر اُنھوں نے ترقی کی اندھی خواہش سے اپنے کو
یشہ بے نیاز رکھا۔ ۱۹۷۲ء کے آس پاس اُنھیں الہ آباد یونی ورسٹی
پروفیسر شپ ملی۔ اس وقت بھی اس کا قوی اندیشہ تھا کہ
ض مصلحتوں کی بناء پر شاید اُن سے کسی جونیر اور کم رتبہ شخص
پر اعزاز دے دیا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ اُردو کی بدقسمتی
دتی، ورالہ آباد یونی ورسٹی ہی نہیں، بلکہ اُردو کے صاحب اختیار
ساتذہ کے دامن پر بھی ہمیشہ کے لئے دھبہ رہ جاتا۔ احتشام
صاحب تو ان چیزوں سے بے نیاز تھے۔ مگر اُردو کو اُن کے حق
ا بہت پہلے لحاظ کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے ملک میں جو شخص کسی
ہدے یا ترقی کے لئے، غلط یا صحیح طور پر اپنا بار بار حق جتائے
ڑ توڑ کرے۔ وہ تو اس کا اہل سمجھا جائے گا۔ مگر جو شخص ان
یزوں کو حقارت سے دیکھے، اُن کے حق کا خیال کبھی نہیں
یا جاتا۔ چند برسوں کے اندر ہی احتشام صاحب کو الہ آباد
نی ورسٹی کے معاملات میں وہ عزت اور احترام حاصل ہوا جو
ہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اُن کی بے وقت اور اچانک
دت نے بتا دیا کہ اُن کے لئے سب کے دل میں کتنی عزت ہے۔

احتشام صاحب اُردو کے پروفیسر تھے۔ لیکن ہندی کے
بی اور علمی حلقوں میں بھی ان کا بڑا اعزاز و اکرام تھا۔ وہ
گریزی ادب، فلسفے، نفسیات اور معاشیات کے میدانوں میں
ن علوم کے ممتاز ترین پروفیسروں سے کم درک نہ رکھتے تھے۔
ن کا مطالعہ قابل رشک تھا، اُن کی نظر وسیع اور علوم میں اُن
بصیرت گہری تھی۔ اُن کے مارکسی انداز فکر اور ادب پر اُس
اطلاق سے بیشتر جدید ادیبوں کو شدید اختلاف رہا۔ چند
س پہلے احتشام صاحب ایک تلخ اور تند ادبی بحث میں اُلجھا
ے گئے تھے۔ جدیدیت اور ترقی پسندی کی بحث میں اُن کا نقطۂ
ظر مخیوں کی وجہ سے انتہا پسندانہ ہو گیا تھا۔ مگر شخصی سطح پر وہ
نتہا پسند جدیدیوں سے بھی ہمیشہ شفقت اور محبت سے ملتے رہے
رحتی الامکان دنیاوی معاملات سے لیکر ادبی، کاموں میں

بھی اُن کی ہمت افزائی اور مدد کرتے رہے اُردو ادب اُن
کا مسلک بھی تھا۔ اور پہلی اور آخری محبت بھی۔ اُردو میں لکھنے
والے ہر اختلاف اور تنگ نظری کو وہ معاف کر دیتے اور بھول
جاتے تھے۔ اُن کے لئے اُردو میں اچھا لکھنے والا ہر شخص محبت کے
لائق تھا۔

میں ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ گیا تو وہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے
میرے لئے ایک نشست کا انتظام کیا۔ ترقی پسند اور نئے ادب کا
وہ تنازعہ جس پر میں نے اُسی زمانے میں بہت کچھ لکھا تھا، ابھی
تازہ تھا۔ احتشام میرے نقطۂ نظر سے خوش نہ تھے۔ انھوں نے
دبے لفظوں میں اپنے اختلاف کا اظہار بھی کیا۔ مگر جلسہ انھوں نے اپنے
ہی گھر پر کیا۔ اور بڑی محبت اور اصرار سے میری نظمیں سنتے اور داد
دیتے رہے۔ شخصی سطح پر اُن سے میرے مراسم پچھلے پانچ برسات
برسوں میں بڑھے۔ انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اُن کی
شخصیت کے طلسم نے مجھے بھی اپنا اسیر کر لیا۔ انھیں جب بھی
معلوم ہوتا کہ میں نے کسی نئے موضوع پر مضمون لکھا ہے تو اصرار سے
اس کا مسودہ مانگ کر پڑھتے اور مشورے دیتے۔ انیس پر میرا
مضمون انھوں نے اُس وقت پڑھا جب وہ کہیں شائع نہیں
ہوا تھا اور خود ہی اُسے "سرفراز" کے "انیس نمبر" کے لئے
منتخب کیا۔ حالانکہ انیس پر اُن کا مطالعہ مجھ سے کہیں زیادہ
تھا۔ آخری ملاقات میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ "آپ آج کل شاعری
سے زیادہ نثر پر توجہ کر رہے ہیں۔ ہم لوگ آپ کی شاعری کے منتظر
رہتے ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ "شاعری کو میں نے کبھی نثر کے
مقابلے میں پس پشت نہیں ڈالا، میرے دو تین شعری مجموعے
جلد ہی شائع ہونے والے ہیں۔" اِس بات پر انھوں نے خوشی
کا اظہار کیا۔

اندرا گاندھی پر جو کتاب کئی جلدوں میں انگریزی،
اُردو اور بنگالی میں شائع ہونے والی ہے۔ اُس کے اردو حصّے
کے احتشام صاحب مرتب تھے۔ انھوں نے مجھ سے "تصوف اور
بھگتی" کے تہذیبی کردار پر لکھنے کی فرمائش کی۔ پچھلی تعطیلات

(بقیہ صفحہ ۶۸۵ پر)

...ے
...سلات غم بھی رفتہ رفتہ کمی کے ساتھ ہوگا اور اسوقت
...لاکر بیرحم موت نے ہمارے ساتھ کیسا ظلم کیا ہے۔ بقول فلسفی شاعر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن احتشام صاحب کے ایسا دیدہ ور پیدا ہونا "بڑی مشکل" نہیں ناممکن ہے۔ ادارۂ نیا دور احتشام صاحب کے پس ماندگان کے غم میں اسے اپنا بھی غم سمجھ کر شریک ہے۔

(ایڈیٹر)

شاعر بمبئی

احتشام صاحب

یوں یاد تری آئی۔ ہر چوٹ اُبھر آئی

"مشاعر" کا اجراء فروری ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۴۲ء تک میں
...ر د مزاج کو ایسا بنا دیا کہ نئے لکھنے والے بھی اُس میں دلچسپی
...۔ کانپور اور لکھنؤ کے بڑی عمروں کے اُدبا اور اساتذۂ سخن
...ت پہلے سے تھے ہی۔ نئے لکھنے والے بھی میرے گرویدہ ہوتے
...۔ انھیں دنوں شوکت صدیقی۔ کمال احمد صدیقی۔ مسعود
ابو اللیث صدیقی۔ چودھری ابو الفضل صدیقی۔ صہبا لکھنوی
...دی۔ اختر ملیح آبادی۔ ہاجرہ مسرور اور کئی دوسرے قلم
...گہرے روابط پیدا ہوئے۔ لکھنؤ اور کانپور آگرہ سے کچھ
...۔ میں عام طور سے بیرونی مشاعروں میں شریک ہونے لگا
...، معراجِ ادب لکھنؤ یا بہار ادب لکھنؤ نام کی کسی انجمن کا
...ما۔ میں والد ماجد مولانا سیماب اکبری کے ساتھ لکھنؤ گیا تھا
...مانوی، آیین سلوتوی، آل رضا لکھنوی اور کئی دوسرے
...ر لکھنؤ کی جانِ سخن سمجھے جاتے تھے۔ میں نے حضرتِ صفی
...حضرت ظریف لکھنوی۔ حضرتِ ثاقب لکھنوی کو بھی لکھنؤ کے
...، سلسلہ مولانا حسرت موہانی۔ حضرت اثر لکھنوی۔۔۔۔۔

حضرتِ آرزو لکھنوی اور مرزا یاس یگانہ چنگیزی سے تو لکھنؤ سے باہر کے مشاعروں میں بھی بارہا ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ہمارا قیام وصل بلگرامی کے یہاں تھا وصل بلگرامی والد صاحب کے حلقہ بگوشوں میں سے تھے احتشام صاحب سے پہلی ملاقات اسی سفر میں ہوئی تھی۔ اُن کی سنجیدگی اور اُن کے خلوص نے متاثر کیا تھا۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک دس سال کا زمانہ بڑا ہی نازک اور سخت تھا۔ ۱۹۳۹ء سے دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی تھی ۱۹۴۵ء میں اس کے ختم ہو جانے کے بعد ہندوستان کی تحریک آزادی نے شدت اختیار کر لی۔ پھر ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور ساتھ ہی ساتھ تقسیم بھی۔ فسادات کی آگ چاروں طرف بھڑکی ہوئی تھی۔ خاندان کے خاندان چلے جا رہے تھے۔ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان خود کو بے یار و مددگار سمجھ رہے تھے۔ اُن پر قیامت ٹوٹ رہی تھی مکانات دوکانیں اور اُن کے کاروبار مقفّل کئے جا رہے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پنڈت گووند ولبھ پنت کی حکومت نے یو۔ پی سے اُردو کو ختم کر دیا نئے ضابطۂ تعلیم میں اُردو کو لازمی زبان کے بجائے اختیاری زبان

ز میں ڈال دیا گیا۔ انجمن ترقی اُردو دہلی میں تباہ ہو چکی تھی۔
بدالحق کراچی تشریف لے جا چکے تھے حکومت یو۔ پی کے اس
ے خلاف میں نے زبردست احتجاج کیا۔ اور اس یادداشت میں
نقصان اُٹھایا۔ شاید ہی اُردو کے کسی شاعر اور ادیب پر ایسی
ت ٹوٹی ہو جو مجھ پر ۱۹۴۷ء ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں ٹوٹی تھی احتشام
ب نے ہر ہر قدم پر اور ہر ہر پریشانی میں مجھے اپنے پُر خلوص مشوروں
زا تھا۔

ہر چند ملک کے حالات بے حد خراب تھے مگر دوسری...
ظلم ختم ہوتے ہی میں نے "شاعر" کو مزید ترقی دی۔ ۱۹۵۰ء میں
بن افسانہ نگار نمبر" نکالا۔ یہ ایک جدّت تھی اور اُردو حلقوں
ں کی بہت داد ملی تھی۔ احتشام صاحب بھی داد دینے والوں میں

۱۹۵۵ء میں "شاعر" کا "مشاعرہ نمبر" نکالنا طے پایا اور اُس

"اُنھیں اندھیروں سے بزمِ گیتی کو ایکدن روشنی ملے گی"

طرح دیکر، ہند و پاک کے قدیم و جدید مشاہیر شعرا سے غزلیں
یں۔ بڑے اہتمام سے یہ "مشاعرہ نمبر" نکلا اس میں بکثرت تصاویر
سرِ ورق پر حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی پُورے صفحہ کی تصویر تھی۔
رعِ طرح پر اُن کی نظم بھی اس میں شامل تھی۔ تقسیم ملک نے ایک
پھیلا دی تھی۔ اخلاقی قدریں دم توڑ رہی تھیں۔ ہر طرف انتشار
راب تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر وہ مصرعِ طرح دیا تھا۔
طرحی مصرع ہی کا تصرّف تھا۔ بُرانے شعرا نے اپنی غزلوں میں
مل سمونے کی کوشش کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ "مشاعرہ" میں طرحی
وں پر ایک سیر حاصل مضمون بھی ہو۔ میں نے احتشام صاحب کو
خط لکھا اور پُورا خاکہ بھیجدیا۔ اُنھوں نے میرے خیال کو بہت

پسند کیا اور مضمون لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ وقت پر مضمون بھی آ گیا اُنھوں
نے حالیؔ سے لیکر اپنے دَور تک کی شاعری اور مشاعروں کی اصلاح
پر نہایت عالمانہ انداز میں بحث کی تھی اور ایک جگہ...وار
نقّاد کی حیثیت سے حالیؔ کے بعد سیمابؔ کی اصلاحی کوششوں اور
مشاعروں میں اُن کے خطبہ خوانی کے رواج دینے کو بہت سراہا تھا۔
یہ وہ دَور تھا جب کہ یو۔ پی کے بعض دوسرے نقاد مولانا نیازؔ فتحپوری
کے زیر اثر مصلحت آمیز تنقیدیں لکھ رہے تھے "سیمابؔ، جگرؔ کے شاگرد
معلوم ہوتے ہیں"۔ "سیماب دل سے نہیں دماغ سے کہتے ہیں" یہ سب
کچھ ایسے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لکھا اور لکھوایا جا رہا تھا مولانا
نیازؔ اور اُن کے گروہ کے دوسرے لوگ کسی صورت مولانا حسرتؔ موہانی
کو سب سے بڑا غزل گو ثابت کرنا چاہتے تھے۔ سائلؔ، بیخودؔ، صفیؔ،
ثاقبؔ، آرزوؔ وغیرہ کا رنگ الگ تھا۔ بحث ان سے نہ تھی، بلکہ چار
معتبر شعرا سیمابؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور یگانہؔ کو حسرتؔ کے مقابلہ میں گرانا
مقصود تھا۔ رسالہ "نگار" کا "شاعری نمبر" اور اس کے بعد "انتقاد نمبر"
اسی غرض سے نکالا گیا تھا۔ "شاعری نمبر" میں مولانا نیازؔ نے آخر میں
ہر شاعر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا۔ اُن کے زیر اثر نقادوں
نے "انتقاد نمبر" میں ہُو بہُو وہی رائیں دُہرا دیں۔ احتشام صاحب
لکھنؤ ہی میں تھے، مگر کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے، ادب و شعر
کے سلسلے میں اُنھوں نے وہی لکھا جو حقیقت پسندانہ تھا۔ وہ کسی
سے مرعوب نہیں ہوئے۔ ہوائے زمانہ کے ساتھ ساتھ محض تھوڑی
سی واہ واہ کے لئے جس طرح اُن کے بعض دوسرے دوست ادیب
اور نقاد بدلتے رہے۔ احتشام صاحب آخر وقت تک نہیں بدلے
یہ اُن کے شعور کی پختگی، کردار کی بُلندی۔ علم کی گہرائی اور فکر و نظر
کی گیرائی تھی۔ اُنھوں نے ترقی پسند تحریک کا ساتھ بے سوچے سمجھے
نہیں دیا تھا۔ اُن کا مقصود سیاسی نعرہ بازی نہ تھا بلکہ وہ ادب کا

ے رشتہ جوڑنا چاہتے تھے۔ اُن کی نظر حال اور مستقبل پر تھی۔ دب کے میدان میں آئے تو اُردو تنقید محض الفاظ کے اُلٹ یک ہی محور پر گھوم رہی تھی۔ تنقید نگار جس سے خوش ہوا۔ ان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اور جس سے ناخوش ہوا اُسے ری میں اُتار دیا۔ ادب میں انسانی عظمت کی تلاش، سماجی رقی پہلوؤں کی جستجو۔ اقدارِ حیات اور عصری میلانات کی ر ادب و زندگی کے رشتے پر اتنا زور احتشام حسین سے پہلے دیا تھا؟ ہم ترقی پسند ادیبوں اور ترقی پسند ادب کو کتنی ں دے لیں۔ لیکن اُس رجحان نے اُردو زبان اور اُس کے ب کو اپنے عصر اور زندگی سے جتنا قریب کیا، جو کسی کل بخشا ی عطا کی اور جتنا "زمینی" بنایا، اس احسانِ عظیم کو جھٹلایا سکتا۔

احتشام صاحب ترقی پسند اور نقاد ہی تھے۔ اُن کے انتقال بالاتفاق کہا جا رہا ہے کہ وہ اُردو تنقید کا سب سے بڑا تھے۔ تنقید میں اُن کی انفرادیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے ی ادب کے وسیع مطالعہ کی بنیادوں پر وہ اُردو تنقید کو یارات تک پہنچا دینا چاہتے تھے۔ ترقی پسند ادب کے خلاف ر لکھا گیا، لیکن احتشام صاحب اپنی جگہ پہاڑ کی طرح جمے ن کے نظریات میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ وہ کم نظروں ہیں اُلجھے۔ کسی تحریری یا تقریری بحث میں اتفاق سے اگر ث ہو گئے تو صرف دلائل سے کام لیا، غیر متوازن کبھی نہیں نجی ملاقاتوں میں نئی نسل کے قلم کار بحث کے دوران امی پر اُتر آتے۔ تو بھی احتشام صاحب ضبط ہی سے کام لیتے پیشانی سے جواب دیتے۔ اُنھوں نے تو ترقی پسندوں پر بھی تنقیدیں کیں۔

باتیں تو اتنی ہیں کہ پوری کتاب لکھی جائے۔ اس وقت دل لخت لخت کو جمع کرنا مشکل ہے۔ احتشام صاحب سے اپنے تعلقِ خاطر کے سلسلے میں چند دلچسپ باتیں مختصراً بیان کر دوں۔ "شاعر" کے "مشاعرہ نمبر" ۱۹۴۸ء کے بعد ۱۹۴۹ء میں آگرہ ہی سے اُن کا سالنامہ نکلا تھا۔ اس کے حصۂ مقالات میں مالک رام، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر عبادت بریلوی، خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، مولانا حامد حسن قادری، سید اختر علی تلہری اور کئی دوسرے ادیب شامل تھے۔ اس میں احتشام صاحب کا مضمون "شعر فہمی" کے عنوان سے شریک تھا۔ دوسرے سال ۱۹۵۰ء میں "خاص نمبر" نکلا۔ میں نے اُردو کے مشہور ہندو ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں سے اُردو کی حق تلفی کے سلسلے میں رائیں طلب کر کے "خاص نمبر" کے ابتدائی حصے میں شائع کی تھیں ہندوستان کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات بھی حاصل کیے تھے۔ خاص نمبر کا یہ حصہ بہت وقیع اور اہم ہو گیا تھا۔ احتشام صاحب کسی مجبوری کی بنا پر خاص نمبر میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ مگر جب خاص نمبر اُنھیں ملا تو پھڑک اُٹھے اُردو زبان سے متعلق حصے کی تو بہت ہی تعریف کی۔

پھر ایسا ہوا کہ میری پریشانیاں انتہا کو پہنچ گئیں۔ آگرہ میں میرا ذاتی پریس "سیل" کر دیا گیا۔ کراچی میں والدِ ماجد مولانا سیماب پر فالج کا سخت حملہ ہو چکا تھا۔ کراچی جانا امرِ محال۔ آگرہ میں مقدمہ چل رہا تھا۔ کاروبار کو سخت نقصان پہنچ چکا تھا۔ اس عالم میں بھی "شاعر" کی روایات کو تو برقرار رکھنا ہی تھا۔ میں نے سالنامہ ۱۹۵۱ء کا اعلان کر دیا۔ احتشام صاحب کو بھی مضمون کے لیے خط گیا۔ تمام درمیانی کڑیوں سے قطع نظر اتنا ہی کہوں گا کہ میں ۱۸ جنوری ۱۹۵۱ء کو والدِ محترم کی عیادت کے لیے بے پناہ پریشانیوں اور دشواریوں

کے بعد کراچی پہنچا۔ اور صرف ۱۰ دن ہی میں ۲۲ جنوری ۱۹۵۰ء کو واپس ہندوستان آگیا۔ میری محرومی و بدقسمتی دیکھئے۔ کہ آٹھویں دن ۳۱ جنوری کو والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحۂ عظیم کے فوراً بعد دوسرا زبردست حادثہ یہ ہوا کہ آگرہ کے ناقابلِ برداشت حالات سے مجبور ہو کر مجھے بمبئی ہجرت کرنا پڑی اور ۲۲ فروری ۱۹۵۰ء کو میں بمبئی آگیا۔ اسی دوران میں احتشام صاحب کے کئی خط آئے، انھوں نے بڑی دلجوئی کی۔ شاعر کا سالنامہ ۱۹۵۱ء جو آگرہ سے نکلتا تھا۔ میرے بمبئی کے چند ماہ بعد بمبئی سے نکلا۔ احتشام صاحب اپنا مضمون بھیج چکے تھے۔ جس کا عنوان تھا

غالبِ خستہ کے بغیر...

مضمون یا لطیفہ؟

اس لطیفہ کی نوعیت کیا تھی۔ احتشام صاحب نے مضمون کے دوسرے پیراگراف میں خود ہی اس کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"محترم اعجاز صدیقی صاحب جب کوئی خاص نمبر نکالنے لگتے ہیں تو "شاعر" کے لئے مضمون کی فرمائش کرتے ہیں، یہ کوئی عجیب بات نہیں، اور دو چار خطوں تک خاموش رہنا بھی کچھ ایسا تعجب خیز نہیں، لیکن آخر کہیں نہ کہیں تو آپ گھبرا کر جواب لکھنے پر مجبور ہوں گے ہی۔ چنانچہ جب موصوف کا چوتھا یا پانچواں خط ملا کہ بہت اچھے اچھے مضامین حاصل ہو گئے ہیں، آپ بھی کوئی مضمون بھیج دیں تو "شاعر" کا سالنامہ گرانقدر بن جائے گا۔ میں نے انھیں ایک کارڈ لکھا، مجھے اپنے الفاظ تو یاد نہیں، لیکن میں نے جو کچھ لکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری بیوی سخت بیمار ہیں، افسوس کہ اس دفعہ کچھ نہ لکھ سکوں گا۔ پھر آپ کو اچھے اچھے ادیبوں کے متعدد مقالے مل گئے ہیں، ایک میں شریک نہ ہوا تو کیا ہوا۔ مجھ "غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں" ریڈیو اسٹیشن سے میری ایک تقریر نشر ہونے والی ہے اگر اس کی نقل مل گئی تو دوبارہ کوشش کروں گا۔"

"آپ خود دیکھئے یہ خط کتنا سادہ ہے، لیکن یا تو میرا ایہام تھا، یا اعجاز صاحب نے خط کو غرض مندوں کی طرح پڑھا مجھ کو لکھا کہ آپ نے ریڈیو کے لئے جو تقریر "غالبِ خستہ کون سے کام بند ہیں" کے عنوان سے لکھی ہے، وہ کسی ادارے کی اس کی نقل بھیج دیجئے۔ میں سالنامہ کے لئے آپ کے نام اسی مضمون کا اعلان کر رہا ہوں۔ اب بتائیے جو مضمون لکھا جائے وہ کس زمرہ میں آتا ہے! اس لئے میرا خیال مضمون نہیں محض ایک لطیفہ ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عنوان کے تحت مجھے اپنے متعلق کچھ لکھنا چاہیئے یا غالب کے متعلق" یہ مضمون بیحد دلچسپ ہے اور واقعی احتشام صاحب کو عنوان کا ساتھ دینے میں بڑی دشواری پیش آئی۔

تقسیم کے پہلے تک احتشام صرف ادیب تھے، لیکن تقسیم کے بعد انھیں شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ اردو کے ادب اور اردو تحریک کی رہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ یو۔ پی میں اردو پر جو ظلم ڈھایا گیا تھا وہ ان کے سامنے تھا۔ اس سلسلے میں ان سے کافی مراسلت رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی توجہ سے انجمن ترقیِ اردو کی تنظیمِ نو کا کام شروع ہوا۔ انجمن کا دفتر دہلی سے علی گڈھ منتقل کیا گیا۔ مولانا خیر بہوردی (اللہ غریقِ رحمت کرے) بڑی تن دہی سے اس کام میں لگے رہے۔ کچھ دن بعد قاضی عبد الغفار کو انجمن کا معتمد بنایا گیا۔ اردو تحریک سے احتشام صاحب کی دلچسپی بڑھتی گئی اور پھر تو اس کے ایسے مخلص رکن ثابت ہوئے کہ کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔ بقول جناب پروفیسر آل احمد سرور۔ —

"انجمن ترقیِ اردو کے جلسوں میں بھی پابندی سے شرکت

کرتے تھے۔ اُس کی کانفرنسوں میں وہ برابر میرا ہاتھ
بٹاتے تھے۔ کوئی قرارداد پیش کرنا ہو، کوئی مسودہ
تیار کرنا ہو، کسی اہم مسئلے پر تبادلۂ خیال کرنا ہو، احتشام
صاحب نے کبھی پہلو تہی نہیں کی، ہر قدم پر ساتھ دیا۔"
میں نے خود بھی اُنھیں بہت سی کانفرنسوں، متعدد کنونشنوں
ینا روں میں دیکھا ہے۔ چند سال پہلے انجمن ترقی اُردو کی
نس دوسری بار جے پور ہی میں خالص اہتمام سے ہوئی تھی
کے بعد سے اب تک انجمن کی کوئی کانفرنس نہیں ہوئی ہے)
ایک نمائندہ کی حیثیت سے اُس میں شریک ہوا تھا۔ بمبئی سے
شہاب الدین دسنوی، مدن موہن کالیہ اور دوسرے اراکین
کانفرنس میں گئے تھے۔ کانفرنس کے ہر اجلاس میں احتشام
پیش پیش تھے۔ جیسے وہی انجمن کے جنرل سکریٹری ہوں۔
جلسہ بہ صوبۂ بہار کے نمائندوں، خصوصاً غلام سرور صاحب
اور پنجاب وغیرہ کے لوگوں نے انجمن کی پالیسیوں پر سخت
ات کئے اور زبردست احتجاجی رویہ اختیار کیا۔ تو اُس
حملے پر احتشام صاحب ہی سامنے تھے اور وہی ہر بات
دے رہے تھے ویسے وہ مرکزی انجمن کے دوسرے
ہی کی طرح زندگی بھر انجمن کے کاموں سے نالاں رہے
انہیں متعدد بار اُن سے تنہائی میں بھی اور انجمن کے بعض
دار اراکین کے سامنے تبادلۂ خیال ہوا۔ اُن کے دل
تڑپ تھی کہ مرکزی انجمن میں حرکت و عمل کی چنگاریاں
لیکن وہ اتنے بے بس تھے کہ انجمن کے ڈھانچے میں کوئی
نہ کر سکے۔ مالک رام، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ
احتشام صاحب نے بھی میرے انجمن ترقی اُردو میں نہ لئے
جانے پر اظہار افسوس و تعجب کیا۔ وہ اُتر پردیش کی انجمن

ترقی اُردو کے بھی رکن تھے۔ مگر وہاں بھی اُردو کو اُس کا حق نہ
مل سکا۔ اس سلسلے میں احتشام صاحب کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا
سکتا۔ اکثریت اور طاقت تو مصلحت پسندوں ہی کی رہی ——
احتشام صاحب کیا کر سکتے تھے۔

اُردو کے بڑے اداروں، بڑی انجمنوں اور تمام سرکاری کمیٹیوں
میں اُن کا نام تھا۔ وہ خلوص کے ساتھ کام کرتے تھے اور اپنی ذمہ داریوں
کو توجہ کے ساتھ پورا کرتے تھے۔ اُن کی اہمیت و مقبولیت اور محبوبیت کا
یہی عالم مختلف یونیورسٹیوں، کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں تھا۔
حیرتناک بات یہ ہے کہ وہ ہر جگہ جانے کے لئے وقت نکال لیتے تھے
اُن پر ہر طرف سے دباؤ ڈالے جاتے تھے۔ اور اُن کے بغیر کوئی بڑا
جلسہ، کوئی کانفرنس، کوئی سیمینار اور کوئی کنونشن کامیاب نہیں
سمجھا جاتا تھا۔ ہر اجتماع میں شدت کے ساتھ اُن کی ضرورت
محسوس ہوتی تھی۔ وہ ہر مجلس کی روحِ رواں سمجھے جاتے تھے۔
پی۔ ایچ۔ ڈی اور ایم۔ اے کے ممتحن وہ تھے۔ "وائوا" کے لئے
وہ جاتے تھے، اپنی یونیورسٹی کے طلباء کی بھی بہترین علمی تربیت
کرتے تھے۔ تنقید اور لسانیات کے بے مثل اُستاد تھے۔ اُن کا تصنیفی و
تالیفی کام بھی جاری رہتا تھا اور مطالعہ کا تو یہ عالم تھا کہ بقول
ڈاکٹر ظ۔ انصاری: "وہ لیٹ کر پڑھتے تھے اور اُن کے پیٹ پر
بھاری بھاری کتابوں کے بوجھ سے مستقل ایک لمبا سا نشان پڑ گیا تھا۔"
وہ سرکاری کمیٹیوں میں اُردو کی دیگر شخصیتوں کے لئے انعامات
و اعزازات کی سفارش کرتے تھے، مگر خود اُنھیں کتنے "ایوارڈز"
ملے؟ کیا اُنھیں "پدم بھوشن" اور "پدم شری" کا اعزاز ملا؟ کسی یونی
ورسٹی نے اُنھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تک نہ دی۔ میری یاد
داشت میں تو اُنھوں نے خود کوئی تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی
کی ڈگری تک نہ لی۔ حالاں کہ تحقیقی مقالہ لکھنا اُن کے لئے معمولی

کام تھا۔ اُن کا کوئی جشن بھی نہیں منایا گیا۔ اور نہ کوئی کتاب مرتّب کرکے اُن کی نذر کی گئی۔ کیا وہ ان تمام اعزازات کے مستحق نہ تھے؟ دراصل احتشام صاحب ایک "مردِ قلندر" تھے اور بے نیازی اُن کی فطرت تھی۔ وہ ان باتوں سے بہت بلند تھے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ان "پھلوں" کے نہ ہوتے ہوئے بھی وہ کتنے عظیم تھے۔ کتنے لافانی ـــ!!

احتشام صاحب بہت آسودہ حال بھی نہ تھے۔ اُن کی بڑی ذمہ داریاں تھیں۔ اُن پر کتنے ہی نازک وقت آئے، مگر کبھی کسی پر اُنھوں نے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ ایک بڑے خاندان کے کفیل تھے۔ وہ تو اپنی زندگی میں اپنے بڑے بیٹے کو کسی تعلیمی شعبہ میں ملازمت تک نہ دلا سکے۔ محنتِ شاقّہ سے جو کچھ کماتے تھے، بس اُسی پر اکتفا کرتے تھے۔ گٹھ جوڑ جانتے ہی نہ تھے۔ کتنے معصوم تھے احتشام صاحب ـــ! اُن کے ترقی پسند دوستوں نے تو اُنھیں آٹھ ہزار روپے کا "نہرو ایوارڈ" بھی نہ دلایا۔!!

احتشام صاحب کو مجھ سے کتنا غیر معمولی لگاؤ تھا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میرے ہر دکھ اور درد کے وہ شریک تھے جب بھی شدید بیمار ہوا، اُنھوں نے بار بار پرسش کی۔ کراچی میں والدۂ ماجدہ کے سانحۂ ارتحال، پھر چھوٹے بھائی سجاد حسین صدیقی اور برادرِ معظم منظر صدیقی کی وفات پر سب سے پہلے اُن کے تعزیت نامے آئے وہ میری اور میرے خاندان کی طویل علمی و ادبی خدمات کے مداح تھے اور اُن حق تلفیوں کا اُنھیں احساس تھا جو مسلسل ہوتی رہی ہیں وہ چاہتے تھے کہ سیماب کی تمام قدیم اور جدید نظم و نثر عنوان کا ازسرِ نو مرتب اور شائع کیا جائے۔ "خطباتِ سیماب" کی اشاعت پر اُنھوں نے [illegible] اور دیا میرے اصرار پر وہ خطبات کو مرتب کرنے اور اُس پر مقدمہ لکھنے کے لیے بھی تیار ہو گئے تھے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں ہی اُنھیں تمام خطبات جمع کرکے نہ بھیج سکا اور وہ اس دنیا سے اُٹھ گئے۔

"شاعر" کے خاص اور عام نمبروں کو وہ اپنے تازہ مضامین سے ہمیشہ نوازتے رہتے تھے۔ "شاعر" کے سالنامہ ۱۹۷۲ء میں اُن کا جو مضمون شائع ہوا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ اُن کا آخری مضمون ہے مضمون ڈاک سے نہ بھیجتے ہوئے اُنھوں نے لکھا تھا کہ میں بمبئی آرہا ہوں مضمون اپنے ساتھ لیتا آؤں گا چنانچہ جنوری ۱۹۷۲ء میں وہ کسی کے "وائیوا" کے سلسلے میں بمبئی آئے تھے (یہ کیا معلوم تھا کہ جنوری ۱۹۷۳ء میں خود مجھے اُن پر مضمون لکھنا پڑے گا) پروفیسر عالی جعفری کے یہاں اُن کا قیام تھا۔ عالی صاحب کے یہاں شام کو ایک نشست ہوئی۔ بڑی پُر لطف صحبت رہی۔ باقر مہدی اور ندا فاضلی نے ذرا تیز مگر پُر احترام و خلوص لہجہ میں گفتگو کی ـــ

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"

نشست کے اختتام کے بعد مضمون دیا اور کہا کہ اسے پڑھ نہیں سکا ہوں۔ دیکھ لیجیے گا۔ دوسرے دن گاندھی میموریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں اُن کی تقریر تھی۔ اتنی پُر مغز، ایسی محققانہ اور عالمانہ کہ سامعین محوِ حیرت تھے۔ ہندی زبان کے بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ اُردو کی پیدائش، اُس کی نشو و نما، خصوصیات اور ہندی زبان سے اُس کے رشتے کے سلسلے میں لسانیات کی تاریخ کے حوالوں سے اُنھوں نے یہ تقریر کی تھی اور اُس کے بالکل برعکس باتیں کہی تھیں۔ جو ہندی کے [illegible] اُردو کے متعلق کہتے رہے ہیں۔ واضح ہو کہ وہ [illegible] احتشام صاحب لسانیات کے ماہر تھے اور [illegible] ہندی کے مشہور ادیبوں [illegible] سے اُن کے مراسم تھے اُن [illegible] کہ وہ اپنے خیالات

[illegible] باوجود ہندستان کے علمی و ادبی حلقوں
[illegible] و مقبولیت حاصل تھی۔ احتشام صاحب کی دانشوری
[illegible] دوں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ موضوع
[illegible] ہو، موقع و محل کچھ بھی ہو اُن کی تقریر کی لذت کچھ عجیب
[illegible]۔ اُردو کمیٹی بمبئی کی طرف سے منعقدہ اُردو کنونشن میں اُنکی
[illegible] اور جلوہ گری کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس کنونشن میں
[illegible] ان کی تمام بڑی زبانوں کے دانشوروں نے شریک ہوکر
حمایت کی تھی۔ (اس کنونشن کو مرکزی انجمن ترقی اُردو کا
[illegible] تھا) احتشام صاحب نے اس سہ روزہ کنونشن کی
[illegible] دائی کو بڑی خوبی سے چلایا تھا۔ مگر جب کھلے اجلاس
[illegible] عظم شریمتی اندرا گاندھی کے سامنے یادداشت پیش
[illegible] تمام زبانوں کے دانشوروں کے دستخطوں کا پلندہ اُنھیں
[illegible] بت آیا تو بعض لوگوں کی مصلحت پسندی نے احتشام
[illegible] ت بدمزہ کر دیا۔ مجھے بھی انتہائی رنج ہوا تھا۔ اور اس کھلے
[illegible] سے واپس آتے ہی میں نے اُردو کمیٹی بمبئی کو اپنا استعفا پیش

[illegible] بمبئی کے اُردو حلقوں اور تعلیمی اداروں میں احتشام صاحب
[illegible] احترام اور محبت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ کسی نہ کسی
[illegible] وہ بمبئی آتے رہتے تھے۔ چند سال پہلے مسلسل چھ دن تک
[illegible] انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی میں حالی پر چھ لیکچرز دیئے تھے۔
[illegible] ہوجاتا تھا۔ اور آخری دن
[illegible] دیدنی تھا، ہر شخص کے چہرہ
[illegible] محبت کا کیا ٹھکانہ ہے!۔
[illegible] اور کس کس خوبی کا
[illegible] سادگی اور دلنوازی

اُصول پسندی اور وضع داری کا اعلا نمونہ تھے۔ میں نے تو کبھی اُن کے جسم پر لباسِ فاخرہ نہیں دیکھا۔ معمولی کپڑے کا بش شرٹ اور پینٹ۔ چند بار اُنھیں شروانی اور پاجامے میں ملبوس دیکھا اور مکمل سوٹ میں بھی۔ غذا کے سلسلے میں یہی حال۔ نہ سگرٹ کا شوق اور نہ پان کا۔ شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ تو غالب کی طرح "گنجفہ باز" بھی نہ تھے۔ اُن کی پوری زندگی "ذکر و فکر" میں گذری۔ وہ ایک پاکیزہ کردار کے حامل تھے۔ کٹر قسم کے ترقی پسند ہونے کے باوجود مذہب سے بیگانہ نہ تھے۔ اسلامی اور مارکسی فلسفے میں حدِ فاصل رکھتے تھے۔ مشرق اور مغرب کی تہذیب، ادب اور تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے۔ اُن کا بڑا کمال یہ تھا کہ کم سے کم الفاظ اور جملوں کے خرچ سے گہری سے گہری بات کہہ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مضامین طویل نہیں ہوتے تھے، دوسرے ادیبوں اور نقادوں کی طرح وہ تمہید نہیں باندھتے تھے۔ نہ منفی انداز اختیار کرتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے مگر مجھے اُن کی شاعری سے اتفاق نہ تھا۔ اس سلسلے میں اکثر چھیڑ رہتی، وہ کہتے۔ "کچھ منہ کا مزہ بدل جاتا ہے، اپنے پیمانے سے کیوں ناپتے ہیں آپ" میں کہتا آپ نقاد ہیں۔ جب دوسروں کو ناپتے ہیں تو خود کو کیوں نہیں ناپتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تنقید نگار شاعر ہو ہی نہیں سکتا۔ اِلّا سردار جعفری اور آل احمد سرورؔ۔ آپ میں اور سردار میں کئی خصوصیات مشترک ہیں۔ احتشام صاحب کچھ اور سنجیدہ ہوجاتے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ شاعری کی بات پس منظر میں چلی جاتی۔ میں دوسری بات چھیڑ دیتا فلاں فلاں شاعروں کے مجموعے میں آپکی تحریر [illegible] احتشام صاحب پہلو بدل رہے ہیں، میرا سلسلہ [illegible] جاری ہے۔ بات تو کچھ نہیں، مگر مجھ [illegible] کو جو شاعری

[illegible] آپکا دوست اور بھائی ہوں،

(احتشام صاحب مجھ سے ایک سال بڑے تھے) تبصرہ کرتے وقت خاصی الجھن ہوتی ہے اور آپکی تحریر کے پاس و لحاظ میں پہلو تہی کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی مجبوریوں، سفارشوں اور حوالوں کا ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ بات کا رخ بدلتے ہوئے کہتے۔ "آپ اپنی نظموں غزلوں کے مجموعے کیا قیامت میں چھپوائیں گے"۔ چھپ جائیں گے، جلدی کیا ہے، مطالبے تو سالہا سال سے ہوتے آرہے ہیں، سردار جعفری، خلیل الرحمن اعظمی، مظہر امام، ندا فاضلی اور بھی کتنے ہی ہم عصر ادیب دوست اور عزیز بار بار یاد دلاتے رہتے ہیں، مگر ایک تو میں بہت کم گو ہوں، دوسرے میری مصروفیات نے مجھے اپنی نظم و نثر تحریروں کو جمع کرنے کا آج تک موقع نہیں دیا۔ جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ منتخبات شائع کروں، مگر اپنے مجموعوں میں کسی سے کچھ لکھواؤں گا نہیں — مجھ سے بھی نہیں"۔ جی نہیں (میرے جی نہیں کے بعد احتشام صاحب کی لطف اندوزی قابل دید تھی، وہ اس چھیڑ سے مزہ لے رہے تھے)۔

پھر اردو اور انجمن ترقی اردو کی بات چھڑ گئی وہ ختم ہوئی تو جدیدیت کا ذکر نکل آیا۔ میں کہہ رہا ہوں، آپ نے اس بحث میں ناحق حصہ لیا۔ ڈاکٹر عقیل کو بھی چپ ہی رہنا چاہیئے تھا۔ جواب لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میرے پاس بھی ان کے خطوط آئے تھے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا ایک تاریخی خط میرے پاس موجود ہے۔ آپ نے تو ہمیشہ نئی نسل کی رہنمائی کی ہے۔ اصلاح حال کے سلسلہ میں کوئی پہلو ضرور اختیار کیجئے۔ احتشام نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا "میں تو چاہتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ کوئی کچھ سننے اور سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ افسوس [illegible] نئے قلم کار بھاگنے سے پہلے ادب کی تعمیر و ترقی کرتے تھے۔ یہ رجحان اردو زبان اور ادب دونوں کے لئے بے حد مضر ہے"۔

"اب تیار ہوں، وہ لوگ بیٹھنے کے لئے آتے ... احتشام صاحب دوسرے کمرے میں چلے جاتے اور میں پھر خیالات میں کھو جاتا ہوں"۔

ناگہانی موتیں تو اور بھی کئی شاعروں اور اد... کی ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تو اور عبدالقادر سروری۔ سری نگر میں ہنستے بولتے لقمۂ اجل مخدوم محی الدین کو دہلی میں اور رئیس صدیقی کو شا... کے مشاعرہ میں فرشتۂ اجل نے یکایک آ لیا۔ سب کے تھوڑا بہت لکھا گیا۔ کہیں کہیں تعزیتی جلسے بھی ہوئے لیکن یہ احتشام صاحب کی موت کیسی ہے کہ ہندوستا... میں یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں، انجمنوں، کمی... اداروں اور بزموں میں سیکڑوں تعزیتی جلسے ہو گئے او... ابتک کسی نہ کسی شکل میں ان کا سوگ منایا جا رہا ہے ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ریڈیو اسٹیشنوں سے تقریریں نشر ہو رہی ہیں۔ جو بھی اخبار اور رسالہ آتا ہے۔ احتشا... صاحب کا ذکر اس میں موجود۔ سرسری نہیں تفصیلی۔ جذ... و تاثرات سے بھرپور۔ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں پر... اور دانشوروں کے علاوہ علمائے عصر بھی ان کے ماتم گسار... میں شامل ہیں۔ کئی رسالوں اور اخباروں نے احتشام... نمبر نکالنے کا اعلان کیا ہے۔ ہر شخص بیک زبان کہہ رہا ہے

"احتشام حسین اردو تنقید کا سب سے بڑا ستون تھے"۔

"احتشام صاحب ان دانشوروں میں سے تھے جنھوں نے اردو تنقید کو فلسفیانہ گہرائی اور عالمانہ بصیرت عطا کی"۔

"احتشام صاحب نے ایک پوری نسل کی ذہنی رہنمائی
بی انجام دیا، وہ ایک عظیم رہنما تھے"
"احتشام صاحب، اُن استادوں میں سے تھے، جنکی
ے علم کو وقار ملا"
"احتشام صاحب علم کا بحرِ ذخار، تہذیب و اخلاق
ضعداری کا دلنواز پیکر تھے"۔
"احتشام صاحب جیسے صاحبِ نظر ادیب اور بے مثل
ن صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں"۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں!

مجھے یکم دسمبر ہی کو احتشام صاحب کے سانحۂ وفات کا علم ہو گیا تھا اور کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔ چند دوستوں کو فون کئے، چند نے مجھے کئے، تفصیلات جاننے کے لئے بےچین تھا۔ بمبئی کے علمی ادبی اور تعلیمی حلقوں میں رنج و غم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ دوسرے دن مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے کو تعزیتی خط لکھا اور اُن کے جواب سے تفصیلات کا علم ہوا۔

(اعجاز صدیقی)

جاسوسی دُنیا

علم و ادب کا ایک روشن منارہ گِر گیا

ہندوستان کی قابلِ فخر اور عظیم المرتبت شخصیت
یسر سید احتشام حسین یکم دسمبر کی منحوس صبح کو ۹ بجے ہم
چانک بچھڑ گئے۔ زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ اس
یک جھپکتے طے کر لیا۔ کہ ہم سب منھ دیکھتے رہ گئے اتنی جلد
کو نیند نہیں آتی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ عظیم سانحہ کا پُرسہ کس کو دیں۔؟
لمناک حادثے سے کوئی ایک فرد، کوئی ایک خاندان،
ایک ادارہ، کوئی ایک انجمن ....
. کوئی ایک زبان، کوئی ایک قوم، کوئی ایک فرقہ اور
ایک سرزمین ہی متاثر نہیں ہے۔ بلکہ رنج و غم کی یہ بر
یاں تو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر آنکھ اشکبار ہے۔ ہر
سناٹا ہے۔ ہر محفل سونی ہے۔ ہر انجمن خاموش ہے۔
ن بجھا ہوا ہے ——— ہم اُن کا پُرسہ ان کی ضعیف ماں
دمت میں بھی نہیں پیش کریں گے۔ بلکہ دست بستہ یہ عرض
ہنگے کہ آپ کی تسکین کا سبب یہی کیا کم ہے کہ آپ کی
ش تربیت کا پلا ہوا لاڈلا اپنے علم و فن کی روشنی سے سارے
و منور کئے ہوئے تھا۔ اپنے کردار کی عظمتوں سے سارے
دلوں کو جیتے ہوئے تھا۔ اخلاق و مروت کی اُن اعلیٰ منزلوں پر گامزن تھا جہاں آج کا انسان مشکل ہی سے پہونچ پاتا ہے ——— اسنے مشرق و مغرب کی راہوں پر اپنے فضل و کمال کے چراغ روشن کر رکھے تھے آج کتنی آنکھیں اس غم میں رو رہی ہیں۔ اس لئے ہم آپ کو پُرسہ نہیں دیتے البتہ آپ کی آغوشِ تربیت کو ضرور سلام کرتے ہیں۔ جس نے احتشام حسین جیسا دُرِ بے بہا ہمارے حوالے کیا تھا یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ دُرِ بے بہا بہت جلد ہم سے چھین لیا گیا —— آپکی آغوش ضرور سُونی پڑ گئی۔ لیکن خدا رکھے ابھی آپ کی تین اولادیں اور ہیں جو آپ کی آغوش کی گرمی برقرار رکھیں گی۔ ہاں البتہ دنیائے علم و ادب میں جو سناٹا پھیلا ہے وہ کیسے دور ہوگا۔ !

ادارہ نکہت بھی اس تکلیف دہ سانحے سے دوچار ہے ——— مرحوم کی بے پناہ شفقتیں، انکی محبت، ان کے پُرخلوص مشورے، ان کی ہمدردیاں ہمیشہ ہمارے لئے باعثِ فخر رہی ہیں۔ اور میں ذاتی طور پر بس اتنا ہی کہونگا کہ والد محترم کے انتقال کے بعد شفیق بھائی کا جو سہارا ملا تھا اسے بھی موت کے بےرحم ہاتھوں نے مجھ سے چھین لیا۔

خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

آزاد ہند، کلکتہ

آہ سیّد احتشام حسین

اُردو کے مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر سید احتشام حسین بھی اللہ کے پیارے ہوگئے۔ احتشام حسین صاحب عالم بھی تھے۔ اُستاد بھی تھے اور مرنجاں مرنج و باغ و بہار انسان بھی۔ احتشام صاحب الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر بھی تھے اُنھوں الہ آباد یونی ورسٹی میں نہ صرف اُردو کے معیار کو بلند کرنے میں نمایاں حصّہ لیا، بلکہ دوسری زبانوں کے ساتھ اپنے شعبے کی اہمیت بھی بڑھائی۔ ان کی نگرانی میں اُردو کے کامیاب شاعر ادیب، ریسرچ اسکالر (محقق) بھی نکلے۔ ان کی بے لوث خدمات کی وجہ سے ان کو یونی ورسٹی میں بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔

سید احتشام حسین کی اچانک موت خرمن ادب پر برق بن کر گری۔ اور اُردو دنیا کو ویران کر گئی۔ جسٹس آنند نرائن مُلّا۔ اور اُردو کے مشہور شاعر فراق گورکھپوری نے سید احتشام صاحب کی موت کو اُردو زبان و ادب کے لئے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سید صاحب کی موت سے اُردو کا مضبوط ستون گر گیا ہے اس کا جانباز مجاہد چھن گیا اور اُردو کا زکو لیکر آگے آگے چلنے والا ایک علمبردار ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔

سید احتشام حسین نے اُردو کے لئے ہر محاذ پر جنگ کی تھی۔ وہ ہندوستان کی ان تمام اہم انجمنوں سے وابستہ رہے جو اُردو کے فروغ و کمال کے لئے کام کرتی رہی ہیں۔ حکومت ہند نے اُردو کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لئے ترقی اُردو بورڈ کی تشکیل دی۔ سید صاحب اس کے بھی ایک رکن تھے۔ نئی دلّی میں دنیائی ادیبوں کی کانفرنس میں اُردو ادیبوں کی قیادت بھی کی تھی۔ اُردو کے دوسرے ادیبوں کی طرح سید حسین صاحب نے بھی اپنی ادبی زندگی۔ افسانہ نگاری سے شروع کی۔ مگر تعلیمی ادارے سے وابستگی کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے تحقیقی کام پر توجہ دی۔ اُردو میں تنقید، بہت پچھڑی ہوئی اور آج بھی تنقید اپنی بلندی پر نہیں پہونچی ہے پھر بھی اُردو تنقید کو باوقار صنف بنانے میں مرحوم احتشام صاحب نے حصّہ لیا۔ اور ان کا شمار اُردو کے صف اوّل کے نقادوں میں ہوتا رہا ہے۔ اُردو تنقید پر علامہ نیاز فتحپوری مرحوم،... پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر کلیم الدین، اور پروفیسر مجنوں گورکھپوری وغیرہ احتشام صاحب کا احسان کچھ کم نہیں اُنھوں نے کئی اچھی، مفید اور بلند معیار کی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا سفرنامے "ساحل اور سمندر" کو اُردو ادب میں نمایاں جگہ ملی۔ اُردو کے اس منجھے ہوئے نقاد کی موت سے اُردو تنقید کو سخت دھچکا لگا ہے، مگر ہم پھر بھی مایوس نہیں ہیں۔ کیوں کہ سید احتشام صاحب نے اپنے پیچھے جو روایات، جو ادبی قدریں، اور جو نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ سب مل کر اُردو کے نئے نقادوں اور ادیبوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیں گے۔ اور اس کی روشنی میں نئی نسل کے نقاد ان کے ادھورے کام کو پُورا کر سکیں گے۔

سید احتشام صاحب اور اُردو زبان و ادب کے لئے یہی سب سے بڑا خراج عقیدت ہوگا۔"

صبح نو پٹنہ

پروفیسر احتشام حسین

موت برحق ہے موت سے کسی کو بھی نجات نہیں، جو آدمی
تا ہے، وہ ایک دن ضرور مرتا ہے اور جس طرح اس کی
ں پر خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی موت پر رنج بھی۔ لیکن
اس وقت بہت بڑھ جاتا ہے۔ جب مرنے والا اپنے اوصاف
سے اوروں سے مختلف ہو۔ مرنے والے کی خوبیاں یاد آتی
وصاف یاد آتے ہیں۔ کارنامے یاد آتے ہیں اور ایک ایک
د آکر رنجیدہ اور رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انسان
سے لڑ نہیں سکتا، مرنے والے کو بچا نہیں سکتا۔ صرف
نا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کی موت اردو دنیا کو دلی اور جذباتی
لگا گئی۔ سارے ملک میں ان کا ماتم کیا جا رہا ہے ان کے
یار احباب، شاگرد، ان کے ادبی کارناموں کے مداح
تا دیکھی ماتم کناں ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین اپنی ذات سے ایک مستقل ادارہ
شمار خوبیوں کے انسان تھے۔ ان کا علم، فضل، ان کی
اور متانت، ان کا خلوص، ان کی بے ریائی۔ اپنے خیالات
رہ کر دوسروں کے خیالات اور جذبات کا احترام
ے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملنے کی عادت، اور ہر جاننے
لئے اپنے دل میں جگہ رکھنے کا سلیقہ، یہ ساری ایسی
ہیں جو اس زمانے میں بہت کم ملتی ہیں۔ اور کسی ایک
ل جانا تو تقریباً ناممکن ہی ہے ان کو جس شخص نے
جان لیا وہ انھیں زندگی بھر بھول نہیں سکتا۔

پروفیسر احتشام حسین اردو کے استاد تھے یوں تو انھوں
نے ابتدا میں غزلیں بھی لکھیں تھیں، افسانے بھی لکھے تھے اور مزاحیہ
مضامین بھی، لیکن ان کا اصل میدان تنقید کا فن تھا۔ اردو میں نقاد
تو بہت پیدا ہوئے اور اب بھی ہیں لیکن یقین کے ساتھ کہا جا سکتا
ہے کہ ان کی طرح متوازن، بے لاگ اور ہمدردی کے ساتھ تنقید
کے نمونے کسی نے بھی پیش نہیں کئے۔ پروفیسر احتشام حسین کی
تنقیدوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کسی
کی کمزوریوں کو چھپایا نہیں، لیکن ان کی تنقیدوں میں بے رحمی
نہیں، جھلاہٹ نہیں، استہزا نہیں، بلکہ جس پر تنقید کرتے ہیں
اس سے ہمدردی کا جذبہ ملتا ہے۔ وہ اپنی رائے پر سختی کے ساتھ
قائم رہ کر دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ اور کبھی اگر کسی
موقع پر ان سے چوک ہو گئی ہے، اور اس کا انھیں احساس ہوا
ہے تو انھوں نے بعد میں بڑی فراخ دلی سے اس کا اقرار کر لیا ہے
طبیعت کی یہ بلند مائگی کی نظیر اردو کے کسی دوسرے نقاد کو
نصیب نہیں ہوئی۔

پروفیسر احتشام حسین بہترین مقرر تھے۔ انھوں نے مقرر
کی حیثیت سے خود کو کبھی پیش نہیں کیا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ بہت
سے مشہور مقرروں سے بہتر مقرر تھے۔ ان کی تقریروں میں لفاظی
نہیں ہوتی تھی، علم و ادب کا خزانہ ہوتا تھا۔ مقرر کی حیثیت سے شہرت
نہ پانے کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ ان کی تقریریں عام طور پر علمی
ادبی حلقوں میں ہوتی تھیں۔ اور ایک محدود طبقہ اسے سن پاتا۔
اور لطف اٹھاتا تھا۔ اور اسے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ....
احتشام حسین بڑے عالم ہیں، ادیب اور نقاد ہیں یا مقرر۔
پروفیسر احتشام حسین اب اس مادی دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن

ہر دو زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ پروفیسر احتشام حسین کی موت اُردو دنیا کا عظیم سانحہ ہے۔ جو بہت دور تک [illegible] دلوں کو سوگوار [illegible] ادارۂ صبح تو اس غم میں ان کے پس ماندگان کا شریک ہے

•

ماہنامہ سبرس

پروفیسر احتشام حسین

اُردو ادب میں قحط الرجال کے اس دَور میں پروفیسر احتشام حسین کا اچانک انتقال ایک نقصانِ عظیم ہے احتشام صاحب نے خود کو زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا جو مشرق اور مغرب دونوں کی اہم زبانوں کی ادبیات سے مستفید ہونے کے علاوہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کی ادبیات پر بھی محیط تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ معاشیات اور علوم عمرانی کی بھی اچھی بصیرت رکھتے تھے۔ خود اچھے ادیب، افسانہ نگار، شاعر اور ادبی مورخ تھے۔ ان تمام مہارتوں کی یک جائی کی بدولت ان کی تنقیدیں بڑی بصیرت افروز ہوتی تھیں۔

احتشام صاحب ادب برائے زندگی کے نظریے کے حامی تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے ان کا تعلق آخری دم تک برقرار رہا۔ اس خصوص میں متعدد مضامین جو اُنھوں نے لکھے ہیں اور جو چھپ کر شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان میں احتشام صاحب نے اپنے اس نقطہ نظر کو پیش کیا ہے کہ ادب کا ایک معینہ مقصد ہونا چاہیئے اور اس مقصد کا تعین ادب کو کمال احتیاط کے ساتھ انسان کے وسیع تر مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیئے۔ اکثریت کے بیش ترین مفاد کی پیش رفت سے بہتر اور حیات بخش مقصد ادب کے لیے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں مارکس کے عہد آخر میں نظریات کو بڑی اہمیت حاصل ہے احتشام صاحب [illegible] کے لیے مشعل راہ بنایا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

ہم عصر ادب کے مزاج کی تشکیل میں احتشام صاحب کو کافی دخل ہے۔ احتشام صاحب مذہب علوم عمرانی، سائنس ادب اور تہذیب کو ایک دوسرے سے وابستہ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ان خیالات اور نظریات کو صحیح سمجھتے اور ان پر خلوص کے ساتھ قایم تھے ان کے نزدیک "زندگی کی دستاویز" تھا۔

اس خصوص میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ جدید بلکہ جدید ترین نظریات کے حامی ہونے کے باوجود احتشام صاحب ماضی کے ادب کو ناقابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے بلکہ جیسا کہ اُنھوں نے ایک مضمون میں وضاحت کی ہے گزشتہ ادب کے مطالعہ کے بغیر جدید ادب کو ٹھیک طور پر سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ انسانی تہذیب کے تسلسل کی طرح ادب کے تسلسل کو بھی ناقابل شکست سمجھتے تھے اپنی کتاب "روایت اور بغاوت" میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ:۔

اعلیٰ ادب اور اعلیٰ مقصد کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن اور توانائی کو سمجھنے اور اُسے اُبھارنے میں مدد ملتی ہے۔ زندگی ادب کو سنبھالتی ہے اور ادب زندگی کو سہارا دے کر آگے بڑھاتا ہے؟

ایک مضمون میں احتشام صاحب نے اپنے اصول نقد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ہم عصروں کی تخلیقات کے زیادہ سے زیادہ اچھے پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں [illegible] پیش نظر نہیں [illegible] کمزوریوں پر [illegible]

تشام صاحب صدر شعبہ اُردو فارسی تھے۔ وہ ماہل ضلع
ء ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے ابتدائی تعلیم قصبہ ماہل،
ڈھ اور الہ آباد میں ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں چوبیس سال
ھوں نے الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری
ی۔ اس کے دو سال بعد ان کا تقرر لکھنؤ یونی ورسٹی کے
و فارسی میں ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں اُنھوں نے یورپ اور
فر کیا۔ احتشام صاحب نے قدیم و جدید اُردو ادب اور
تانی لسانیات پر متعدد تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے
ل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور جن سے بیشتر کتابوں کے
ریشن چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اُن کی اہم تصانیف
، اور آئینے" "تنقیدی جائزے" روایت اور بغاوت"
سماج" "تنقید اور عملی تنقید" ذوق ادب اور شعور"
ظر" ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" وغیرہ شامل ہیں۔
نظریات بھی ان ہی کی مرتبہ ہے۔!
ن کے علاوہ احتشام صاحب نے ادب اُردو کی تاریخ ہندی
، اور بچوں کے لئے "اردو کی کہانی" بھی ان کی تالیفات
ہے۔

حتشام صاحب نے اپنے اشعار کا کوئی مجموعہ غالباً شائع
یکن ان کے افسانے کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں اور
سندر" سفرنامہ احتشام صاحب کا تخلیقی شہ کار ہے۔
وں نے اُردو ادب کے بارے میں انگریزی زبان میں بھی مضامین لکھے ہیں۔

احتشام صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۲ء میں دلّی میں ہوئی تھی۔ میں اپنے اُستاد محترم ڈاکٹر زورؔ کے ساتھ اکیڈمی دلّی کے دفتر گیا۔ تو وہاں احتشام صاحب بھی منہ ماچوے کے کمرے میں موجود تھے۔ زور صاحب نے میرا تعارف کرایا تو احتشام صاحب نے کہا' بڑی خوشی ہوئی۔ مگر میں آپ کی تحریروں کے ذریعے پہلے ہی سے آپ سے واقف ہوں۔ اس کے بعد کچھ دیر تک حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ حیدرآباد کی ادبی سرگرمیوں سے احتشام صاحب کی واقفیت سے متاثر ہوا۔ اس کے بعد دلی اور حیدرآباد میں کئی بار احتشام صاحب سے ملنے زبان ادب کے مسائل کے بارے میں ان کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملا — ایک بار جب وہ حیدرآباد تشریف لائے۔ تو میرے مکان میں چند روز قیام کیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر میں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اُن سے خصوصاً ترقی پسند ادب اور جدیدیت کے بارے میں مختلف سوالات کئے تھے۔ جس کے اُنھوں نے نہایت معقول اور مناسب جوابات دیئے۔ مخدوم محی الدین حسینی شاہد، پروفیسر زینت ساجدہ، سریواس لاہوٹی اور بعض دوسرے مقامی احباب سے پروفیسر احتشام حسین بے تکلف تھے۔

افسوس صد افسوس کہ دنیائے ادب اُردو کی ایک عظیم شخصیت جس سے قرب کا مجھکو شرف حاصل تھا۔ یکایک اچل بسے۔

کتاب نما نئی دلّی

اِشاریہ

موت کے سرد ہاتھوں نے اس مہینے ایک اور ایسی ہستی کو ہم سے ہے جس کی زندگی اُردو میں بہت سی سرگرمیوں کا باعث تھی افسانہ نگاروں کی انجمن۔ انشائیہ نویسوں کا اجتماع۔ ادیبوں کا استقبال۔ ماہرین لسانیت کی مجلس۔ نقادوں کی بزم۔ یادگاروں کا جشن۔ مجلسیں۔ میلاد یں وہ کون سی تقریب تھی۔ جس کا تعلق اُردو سے ایسی جگہ ہو جہاں وہ پہونچ سکتے ہوں اور ان کی

جوت سے ہم آج ان کی شرکت کرنے کے متمنی ہوں۔ اور احتشام حسین وہاں سے کبھی نہیں آئیں گے، آج سب اجتماع ہے۔ آج تمام افراد جو اردو کے ہیں۔ جن کا تعلق اردو سے ہے، جو اردو کے لئے ہیں احتشام حسین کی ناوقت موت پر سوگوار ہیں۔ ریڈیو سے ایک سکینڈ بھی نہ لگے ہوں گے اس ارتحال کی خبر کے نشر میں کہ نہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکن ایک لمحہ کے لئے رک گئی کیوں کہ احتشام حسین کے دل سے ان سب کے دلوں کی دھڑکنیں وابستہ تھیں۔

ضلع اعظم گڈھ کے قصبہ ماہل میں پیدا ہونے والے احتشام حسین نے الہ آباد میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور اپنے پیچھے اپنے اہل و عیال کے علاوہ اردو والوں کا ایک بہت بڑا کنبہ جو کروڑوں انسانوں پر مشتمل ہے سوگوار چھوڑ گئے۔ یقیناً ان کی یاد دلوں سے صدیوں محو نہ ہوگی۔ کیوں کہ وہ ناطق اور ساکت کتابوں کا ایک بیش بہا گنجینہ دنیا کو امانتاً دے گئے ہیں۔ جب تک ناطق یہ کتابیں یہ روشن شمعیں۔ تلامذہ کی یہ جماعت ترقی کرتی رہے گی۔ شمع سے شمع جلتی رہے گی۔ جب تک تنقیدی بصیرت کی تلاش ہوتی رہے گی، احتشام صاحب کی انتقادی تخلیقات کا رواج رہیگا اور احتشام صاحب روحانی طور پر زندہ رہیں گے۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

• مکتبہ جامعہ اس سعادت سے تو محروم رہا کہ ان کے افکار و تخلیقات میں سے کوئی چیز شائع کرتا۔ ایک مجموعہ مضامین کی اشاعت کے لئے بات چیت ہو رہی تھی۔ کہ احتشام صاحب کو موت نے خاموش کر دیا۔ مگر مکتبہ کو اس پر ہمیشہ ناز رہے گا۔ کہ اسے مرحوم کی ہمدردیاں اور تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔ وہ مکتبہ کے کارناموں کو سراہتے رہے اور اپنی سرپرستی اور مشوروں سے اسے نوازتے رہے اس احسان کا تقاضہ ہے کہ کتاب نما کی ایک اشاعت ان کی یاد سے منسوب کر دی جائے۔ چناں کتاب نما نے طے کیا ہے کہ ایک مبسوط اور قابل قدر نمبر مرحوم کی یادگار کے طور پر شائع کرے۔

خوشی اور غم توام ہیں۔ کتاب نما کو "نئی نظم کا سفر" پیش کر کے جو مسرت ہوئی تھی۔ اس کی کامیابی نے اس کے لئے آئے ہوئے تحسین و آفرین کے خطوط نے جو سینہ چوڑا کیا تھا ہم ابھی اس کا اظہار بھی نہ کرنے پائے تھے کہ پروفیسر احتشام حسین کی موت نے افسردہ اور سوگوار کر دیا۔

کلیاں لکھنؤ

سیّد احتشام حسین صاحب مرحوم

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کی تاریخ اردو زبان اور ادب اور میرے لئے [illegible] سال کی ہی نہیں غالباً اس صدی کی سب سے منحوس اور نامبارک تاریخ ثابت ہوئی اس لئے کہ پہلی دسمبر کی شام کو یہ افسوس ناک خبر ملی کہ میرے شفیق اور بزرگ استاد پروفیسر سید احتشام حسین صاحب صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی یکم دسمبر کی صبح کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ موصوف کا شمار آج کے دیگر عظیم ترین نقادوں میں ہوتا تھا بلکہ اگر مرحوم کو اس دور کا سب سے بڑا نقاد اور صاحب طرز ادیب کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔ مرحوم اپنے طلبہ سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ اور میرا تو مرحوم سے ایسا گہرا لگاؤ تھا۔ اور مرحوم میرے ایسے محسن تھے کہ ان کے انتقال سے مجھے جو صدمہ پہنچا ہے وہ ناقابل تحریر ہے مرحوم ہمیشہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے رہے تھے۔ اور زندگی کے ہر آزمائشی موقعہ پر موصوف نے میری رہنمائی و مدد فرمائی تھی جب ہم نے ۱۹۶۶ء میں کلیاں نکالا تھا تو مرحوم نے

پرستی قبول فرمائی تھی۔ اور جب تک موصوف کا قیام لکھنؤ
اس کے سرپرست رہے۔ مرحوم کے انتقال سے اردو ادب
ن پہونچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں اس کے ساتھ ہی
تو یہ کہوں گا کہ قدرت نے احتشام صاحب کو ہم سے
چھین کر دنیا کو ایک ایسے انسان سے محروم کر دیا جو اخلاق، مروت، محبت اور شفقت کی بدولت ایک آئیڈیل انسان تھا کلیہ پڑھنے والے بچے خدا سے دعا کریں کہ وہ مجھ کو احتشام صاحب کے تمام متعلقین کو صبر جمیل اور مرحوم کو جنت میں جگہ عطا فرمائے ۔۔۔ (آمین)

اتر پردیش اُردو اکاڈمی

ایک عالم اور ایک عالم کی موت

ی کا ایک مقولہ ہے" موت العالِم موت العالَم "۔
ت، عالم کی موت ہوتی ہے پروفیسر سید احتشام حسین کی
اہی درجہ رکھتی ہے اُن کی ناوقت وفات سے محفل
ب شمع تھی جو خموش ہو گئی۔ آسمان ادب کا ایک آفتاب
ب ہو گیا۔ اخلاق و رواداری کا ایک پیکر تھا جو نظروں
ہو گیا۔ پروفیسر احتشام حسین ایک عالم متبحر تھے اُردو
کے اتنے احسانات ہیں کہ اُن سے وہ عہدہ برآ نہیں
نھوں نے اس زبان کے ادب کو نئی راہوں سے
دیا اُسے نئے زاویے عطا کئے اور اُس کے خزانے میں
ضافہ کیا۔ اُن کی فکر و نظر نے اُردو کی پوری ایک
اثر کیا اور اُن کی تربیت نے اُردو کے نوجوانوں
کو پختہ کار کیا اور بالغ نظر بنا دیا۔ ایک ناقد کے لئے
متوں کا حامل ہونا ضروری ہے ۔۔۔ وفیسر احتشام حسین
ن سب سے متصف تھے اور اسی لئے صرف وہ ادیب ہی
بلکہ اُنھیں تاریخ پر عبور رکھا ہر دور کی اقتصادی کیفیت
اہی تھی۔ ہر عہد کے سماج کے مسائل سے بھی واقفیت
ہ کو بھی وہ پہچانتے تھے اور عالمی ادب کے بھی رمز آشنا
ہی میں نہیں وہ قلم برداشتہ، انگریزی میں بھی لکھتے تھے
ح تقریر میں بھی دریا کی سی روانی تھی۔ ہندی زبان میں
اُن کی لکھی ہوئی اُردو ادب کی تاریخ شائع ہو چکی ہے اور تاریخ ادب اُردو پر اُن کی ضخیم کتاب تقریباً تیار ہو چکی ہے کہ دست قضا نے اُنھیں چھین لیا۔ پروفیسر احتشام حسین ایک بڑے ادیب ہی نہیں ایک عظیم انسان بھی تھے اُن کے انکسار، بردباری، شرافت، خوش اخلاقی، کا ایک زمانہ مداح تھا۔ اُن کی وفات پر ہر شخص کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اُس کا ایک نہایت مخلص دوست اور انسانیت کا ایک نمونہ اُس سے جُدا ہو گیا۔ بحیثیت ایک انسان کے پروفیسر احتشام حسین صاحب کی عظمت کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے پروفیسر احتشام حسین ملک میں اُردو کے تمام اہم ادبی اداروں سے متعلق تھے، مرکزی ساہتیہ اکاڈمی، کل ہند انجمن ترقی اُردو، مرکزی بورڈ برائے فروغ اُردو کے اہم رُکن ہونے کے علاوہ وہ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی کونسل اور مجلس انتظامیہ دونوں کے بڑے سرگرم اور ممتاز ممبر تھے۔ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی ان کے تعمیری اور مفید مشوروں سے برابر مستفید ہوتی رہتی ہے۔ اور اُنھیں یقین تھا کہ یہ اکاڈمی جلد ہی اُردو کی خدمت کرنے والا ایک عظیم ادارہ بن جائے گی۔ افسوس کہ اُردو ادب، اُن کے شاگردوں اور مداحوں کا وسیع حلقہ، اُردو کی تمام ادبی انجمنیں اور اُتر پردیش اردو اکاڈمی اس ممتاز ادیب اور دانشور، اور اس جلیل القدر انسان سے ناوقت محروم ہو گئی۔

اردو اکاڈمی خبر نامہ

پروفیسر سید احتشام حسین

اُردو کے ممتاز اور مقبول ترین ادیب سید احتشام حسین رضوی قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ کے ایک معزز اور تعلیمیافتہ خاندان میں ۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ انکے والد کا اسم گرامی سید ابو جعفر تھا۔ اعظم گڑھ سے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے الٰہ آباد آگئے اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۳۶ء میں انھوں نے اُردو میں ایم اے (فرسٹ کلاس فرسٹ) کیا۔ ۱۹۳۸ء میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ اور بعد میں لیڈر۔ اس زمانہ سے ۱۹۶۱ء تک وہ لکھنؤ ہی میں رہے۔ انکی زیادہ تر تصانیف اسی زمانہ میں شائع ہوئیں اور ان کا شمار نہ صرف اُردو کے صفِ اول کے ناقدوں میں ہونے لگا۔ بلکہ ملک گیر شہرت بھی حاصل ہوگئی اور بحیثیت ادیب اور انسان کے ملک کے ہر حلقے میں انکا احترام کیا جانے لگا۔ قیام لکھنؤ کے زمانہ ہی میں وہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اور آخر عمر تک اسکے اہم ترین علمبردار بلکہ سرپرست رہے۔ اس دور میں لکھنؤ کے محلے باردوخانہ میں انکا مکان ابھرتے ہوئے ادیبوں، شاعروں اور علم دوستوں کا مرکز بنا رہا۔ لکھنؤ کے دورانِ قیام ہی میں اُنھوں نے نہ معلوم کتنے نوجوان لکھنے والوں کو تحقیق و تفتیش اور تنقید کی نئی راہیں دکھائیں۔

مرحوم کو لکھنؤ سے، لکھنؤ کے گلی کوچوں سے عشق تھا اور لکھنؤ اور لکھنؤ کے رہنے والوں کو اُن سے۔ انکے دروازے ہر شخص کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ اور ایک بار بھی ان سے کوئی شخص ملتا، تو انکے تبحر علمی، قوتِ حافظہ، وسعتِ معلومات، اور اس سے بھی بڑھ کر انکی شرافت، انکسار اور خوش اخلاقی کے نقوش اسکے دل پر مرتسم ہوجاتے۔ اپنے علم و فضل کے باوجود راہ چلتے ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی خیریت اور اسکا حال معلوم کرنا اور اگر اسی حالت میں انکا کوئی نیا پرانا طالب علم یا کوئی اور جاننے والا ان سے کسی ادبی مسئلے کے سلسلے میں سوالات کرنے لگتا تو اُسکا خندہ پیشانی سے جواب دینا انکا شعار تھا۔

ڈاکٹر اعجاز حسین سابق صدر شعبۂ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے ریٹائر ہونے کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر مقرر کئے گئے جانے کو تو وہ لکھنؤ سے چلے گئے لیکن بادل نخواستہ لکھنؤ اور احباب لکھنؤ کی یاد وہ کبھی دل سے بھلا نہیں سکے اور باردوخانہ (گولہ گنج) کے قریب ہی احاطہ ممتاز حسین میں اُنھوں نے اپنے لئے ایک مکان خرید لیا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اُنھوں نے لکھنؤ ہی میں مستقل قیام طے کیا تھا۔ لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے انکی آخری آرامگاہ بھی لکھنؤ میں بننا منظور نہیں کیا۔ پہلی دسمبر ۱۹۷۲ء کو ۸ بجے صبح حرکت قلب بند ہوجانے سے الٰہ آباد میں انکا انتقال ہوگیا۔ اور دوسرے دن سوگواروں کے ایک عظیم مجمع نے وہیں کی کربلا میں اُنھیں سپرد خاک کر دیا۔

پروفیسر احتشام حسین ہندوستان اور دوسرے ممالک کے ثقافتی رابطوں کے سلسلے میں روس، یورپ اور امریکہ گئے اور ہر جگہ یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں میں لکچر دیے۔ سفر امریکہ کے سلسلے میں انکی ایک کتاب "ساحل اور سمندر" بھی شائع ہوچکی ہے۔ انکی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں افکار و مسائل۔ تنقیدی جائزے۔ عکس اور آئینے۔ اُردو کی کہانی۔ روایت و بغاوت۔ تنقید اور عملی تنقید۔ ادب اور سماج۔ ذوق ادب اور شعور۔ اعتبار نظر۔ تاریخ ادب اُردو (ہندی)۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔ انتخاب آب حیات۔ انتخاب کلام جوش۔ سلک گہر۔ ادب پارے (نثر و نظم)۔ انتخاب نثر جدید۔ انتخاب مثنویات۔ اُردو (لکھنؤ کے ایک ادارے کے زیر اہتمام اُنکی بعض دوسری کتابیں زیر طبع ہیں)۔

پروفیسر احتشام حسین مرحوم اُردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی بڑی روانی سے لکھتے تھے۔ اُردو ادب کے سلسلے میں اُنھوں نے انگریزی میں بھی مقالات لکھے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین جس روانی سے لکھتے تھے۔ اسی روانی سے وہ اُردو اور انگریزی میں تقریریں بھی کرتے تھے۔ کسی موضوع پر

زبان میں بھی وہ اکثر بغیر تیاری کے بولتے اور معلومات کے دریا
شاعر کی حیثیت سے اپنے آپکو پیش کرنا نہیں چاہتے تھے
طرح مشاعروں میں طرح پر اپنی غزل بھی سناتے تھے۔ ان کی
نظموں میں بھی وہی گہرائی اور گیرائی ہوتی تھی جو انکی نثر
کی خصوصیات تھیں۔

پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی شادی قصبہ نگرام ضلع لکھنؤ کے ایک معزز زمیندار میر فدا حسین مرحوم کی پوتی سے ہوئی۔ ان کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

متاخماس (اڑیسہ)

میرا صفحہ

لکھنؤ۔ ۲/۱۲/۷۲۔

"...... کل صبح نو بجے پروفیسر سید احتشام حسین رضوی صاحب مشہور تنقید نگار کا الہ آباد میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اطلاعاً تحریر ہے۔"

مخلص، رشید قریشی"

لکھنؤ سے آیا ہوا رشید قریشی کا خط پیش نظر ہے۔ میری نامعلوم جذبے کے تحت ڈبڈبا گئی ہیں، احتشام صاحب کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے جیسے اب بھی مخصوص شفقت آمیز لہجے میں کہتے ہوں۔ "آپ کا سوچنے کا اپنا انداز ہے۔"

"ریاضیات میں تو آپ کا کام اعلیٰ پایہ کا ہوگا ہی، لیکن مجھے تو آپ میں ادبی صلاحیتیں غیر معمولی نظر آئیں ان کی طرف سے غافل نہ رہیئے۔"

شفقت آمیز آواز آج ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ہے۔ اس کی گونج ہمارے ذہنوں میں محفوظ رہ گئی ہے احتشام صاحب ہستی میں اتنی جاذبیت تھی اور ان کی باتوں میں اتنا خلوص جس نے ایک بار بھی انھیں دیکھ لیا یا ان سے گفتگو کی ان کا شیدائی بن گیا۔ مجھ جیسے ہزاروں شیدائیوں کو رنج طوفان میں گھرا ہوا چھوڑ کر خود ہر طرح کے رنج و غم سے گئے۔ نہیں نہیں احتشام صاحب اس قدر خود غرض نہیں انھیں تو زندگی بھر دوسروں کی دل آزاری کا فن معلوم انھوں نے تو مجھے ایک بار لکھا تھا کہ "میں تو ان لوگوں سے نہیں، جو مجھے گالیاں دیتے ہیں۔ اور آپ تو ہمیشہ محبت د

احترام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ سے کیوں ناراض ہوں گا۔؟"

خلوص کا یہ پیکر آج ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے روپوش ہو گیا۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ مشیت ایزدی کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے

ہمارے ادب میں ایک روایت چلی آ رہی ہے۔ کہ جو ادیب جس قدر بڑا ہوگا، دوسروں کو اسی قدر حقارت کی نظر سے دیکھے گا۔ دوسروں کے خط کا جواب خاموشی سے دینے کو اپنے لئے اسی قدر باعث افتخار سمجھے گا۔ کسی نئے ادیب کی ہمت افزائی کیلئے دو چار سطریں بطور تقریظ لکھنا تو کجا بار بار خوشامد کے باوجود رائے دینے کا وعدہ کر کے عین موقع پر بے چارے کو دھوکہ دے گا۔ لیکن احتشام صاحب کا دامن بڑے ادیبوں کی مندرجہ بالا "خوبیوں" سے خالی تھا۔ انھوں نے خود کو بقراط یا فرعون تصور نہیں کیا۔ حالانکہ اردو کی تنقید کو نئے ابعاد سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ان کا عطیہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ اپنے ذات پر بجا طور پر فخر کر سکتے تھے۔ لیکن انکساری تو گویا ان کی سرشت میں داخل تھی۔ ہر کس و ناکس کی پہنچ ان تک بآسانی ہو سکتی تھی۔ معمولی سے معمولی ادیب ان سے تقریظ لکھوا سکتا تھا اور اس کے لئے وہ خاصے بدنام بھی تھے۔

سننے میں آیا ہے کہ شادی، ولیمہ، منگنی اور ختنہ جیسی تقریبوں کی نجی ادبی نشستوں میں بھی، ان کو کرسی صدارت پیش کی جاتی تھی۔ اور وہ اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے تھے۔ لیکن اگر غور کیجئے۔ تو ان کی انکساری اور سادگی ہی میں ہر دلعزیزی کا راز پنہاں ہے

تک وہ تمام محفلیں ان کی یاد میں آنسو بہا رہی ہیں، جن کو وہ رونق بخشتے آئے تھے۔

انجمن ترقی اردو ہند ترقی اُردو بورڈ، انجمن اساتذہ اُردو (ہند)، مختلف یونی ورسٹیوں کے بورڈ آف اسٹڈیز سے لیکر چھوٹی چھوٹی نجی محفلوں تک سب پر رنج و غم کا سایہ پڑا ہے اُردو کی نئی نسل اس لئے مضمحل ہے کہ روشنی کا ایک ایسا بلند مینارہ بجھ گیا۔ جس سے اکتساب نور کرکے یہ نسل اپنی منزل مقصود کی جانب گامزن تھی۔ اور جس کے بجھ جانے سے اسکے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا ہے۔

غرض کہ احتشام صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر سے ہر چھوٹا اور بڑا ادیب مضمحل اور افسردہ ہے ہر شخص کا ذہن ماؤف اور شل ہو کے رہ گیا ہے ایک دوسرے کو جو بھی خط لکھتا ہے، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے اس میں مرحوم کی خوبیوں کا والہانہ ذکر ہوتا ہے۔ کوئی احتشام صاحب کی محنت، عبادت اور ریاضت کا ذکر کرتا ہے تو کوئی انکی سادگی اور انکساری کا۔ کوئی ان کی انسانیت دوستی کا ذکر کرتا ہے۔ تو کوئی ان کی اُردو تحریک کی قیادت کا۔ کشمیر اور پنجاب سے لیکر میسور اور مدراس تک اور بنگال اور اڑیسہ سے لیکر گجرات اور مہاراشٹر تک۔ کہاں مرحوم کی یاد میں جلسے نہیں ہوئے؟ کہاں آنسو نہیں بہائے گئے۔ چاروں طرف صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ بقول امجد نجمی ؎

بلبلِ رنگین نوا خاموش ہے
باغ کی ساری فضا خاموش ہے

غور فرمایئے کہ جس شخص کی زندگی قلندرانہ انداز سے گذری، اس کی موت کس قدر شاہانہ تھی۔ میرے اس جملے سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے بلکہ بعض رسالوں کے مدیروں نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ ایک سیاستداں یا سائینس داں کی موت سے ملک بھر میں جس طرح ماتم منایا جاتا ہے۔ احتشام صاحب جیسے بلند پایہ ادیب پر اس طرح نہیں ہوا بلکہ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے کہ احتشام حسین کون تھا۔ اس طرح کی غلط بیانی دراصل بعض لوگوں کی کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ سیاست داں یا سائنس داں کی وفات پر ماتم کرنے والوں کا دور فوراً ختم ہو جاتا ہے لیکن احتشام حسین جیسے بلند پایہ ادیب اور بلند کردار شخصیت کی موت پر رونے والے انسان ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے۔

۱۹۶۳ء میں جب میں نے "آبِ خضر" کا ایک نسخہ احتشام صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے بڑے حوصلہ افزا کلمات لکھے کہ "ظلمات سے چشمۂ حیوان نکالنا اسی کو کہتے ہیں"۔ یہ ان کا پہلا خط تھا۔ اس کے بعد ان سے وقتاً فوقتاً خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۶۵ء میں ان سے پہلی بار ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ وہاں انھوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ کس طرح نیاز فتحپوری نے سب سے پہلے ان کے ایک افسانہ کو ناقابل اشاعت قرار دیکر بعد میں اسے "نگار" میں شائع کیا۔ اور اس کے بعد "نگار" کے افسانہ نمبر میں بھی اس کو ڈائجسٹ کیا اس ملاقات کے بعد احتشام صاحب نے دوسرے دن مجھے اپنے یہاں دعوت دی۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک مختلف ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی میں نے اپنا مضمون "جدید شاعری اور اس کا پس منظر" (جسے فرمان فتحپوری کی فرمائش پر نگار پاکستان کے "جدید شاعری نمبر کے لئے لکھا تھا) پڑھ کر سنایا انھوں نے میری باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے مضمون کو بے حد پسند کیا میری بیاض سے نظم "خاکے" بار بار پڑھ کر لطف اندوز ہوتے رہے۔ بعد میں جب نگار پاکستان کا "جدید شاعری" نمبر شائع ہوا تو انھوں نے خط کے ذریعہ اس طرح رائے دی: "نگار نے جدید شاعری نمبر" بہت اچھا نکالا گو اس کے ساٹھ ستر فیصدی مضامین پرانے ہیں۔ آپ کا مضمون پھر پڑھا۔ بے حد پسند آیا"

الہ آباد میں احتشام صاحب سے جو میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے متعلق ایک خط میں اس طرح رقم طراز ہیں۔ "ملاقات مختصر ہی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کو پہچاننے کے لئے کافی تھی"

احتشام صاحب سے دوسری بار ملاقات کشمیر میں اُردو ٹیچرز کانفرنس ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔ جدید شاعری کا یہ ہو سکتا ہوا تھا۔ اس

انے صدارت کی تھی۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان، شہاب جعفری
رید شاعری پر مقالے پڑھے تھے۔ احتشام صاحب نے
ی تقریر میں بڑی معقول بات کہی تھی کہ "ہمیں جدید
ض یہ سوچ کر اپنانا نہیں ہے کہ یہ نئی ہے بلکہ ہمیں یہ
ہ اس کا معیار کیا ہے۔"
دی کشمیر میں شالیمار، نشاط باغ، چشمہ شاہی ہر
ساتھ رہا۔ ٹورسٹ ہال میں مشاعرہ تھا۔ ترنم سے
سننے کا موقع ملا۔

تفاق کی بات ہے کہ گزشتہ دس سال کے اندر مختلف
ان کے جتنے بھی مضامین میری نظر سے گذرے تقریباً
مجھے اتفاق تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اس اثنا
مان فاروقی کے جتنے بھی مضامین نظر سے گذرے
اختلاف تھا۔ "شاعر" کے غالب نمبر میں شائع شدہ
ن" شاعری باد نفس اور نکہت گل" کے ان جملوں
انسان جذبات اور تصورات کی لاکھ بازآفرینی
د ۱۹۶۹ء کا انسان نہیں بن سکتا۔" میں اس حد تک
ی نظم "غالب اور نئی نسل" میں اسی خیال کو اس طرح

رہا ہے قیاس آرائیوں کے رخش دوڑاتے رہو
سو سال کے پہلے کے قاری کا بدل بن ہی نہیں سکتے کبھی
سو سال کے پہلے کا اک ہمدرد قاری۔
ردن، ان خزاؤں کا تھا گہرا راز داں
ڑمن کا نہ تھا میں بھی خوشہ چیں کبھی۔"
احب شروع ہی سے "شاعر" کی فلاح و بہبود کے
، لیکن میرے شعری مجموعہ "شعاعوں" کی صلیب
سلسلے میں اُنھوں نے غیر معمولی دلچسپی کا ثبوت دیا۔
میں کے زیر اہتمام اس قدر خوبصورت شائع ہو سکی
ت، سرورق ہر معاملہ میں "سعید عارفی ان سے مشورہ
بھی اُنھیں وقتاً فوقتاً خط کے ذریعہ زحمت دیتا
دہ عزیز کی خاطر ہر طرح کی زحمت برداشت کی۔

کو تیار تھے، کبھی اُنھوں نے سرورق کے بارے میں رائے دی کہ
"آرٹسٹ نے خوبصورت اور معنی خیز خطوط اور رنگ دیئے ہیں۔
مجھے بہت پسند آیا۔" کبھی لکھا کہ میں بھی کاتب سلیم اللہ کو کھٹکھٹا دوں گا
" تو کبھی لکھا۔ "آج ہی کل میں کسی وقت اسرار کریمی پریس والوں سے
مل لوں گا۔" "اب پریس بس چھاپنے ہی جا رہا ہے۔ میں بھی مل کر دباؤ
ڈالوں گا۔ واقعی بہت دیر ہوگئی۔" اب آپ ہی غور کیجیے کہ اتنا خلوص
آج کل کہاں ملتا ہے۔؟

یہاں میں آپ کے سامنے چند واقعات بیان کرتا چلوں۔ جنکی
روشنی میں ان کی شخصیت کے بعض اہم گوشے آپ کے سامنے آسکیں گے۔

۱۹۶۵ء میں الہ آباد کے سفر کے دوران میرے کچھ پیسے گم ہو گئے تھے
احتشام صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو اُنھوں نے خود زبردستی
مجھے پچاس روپے (بطور قرض) عطا کئے حالاں کہ میں اُنھیں زحمت
دینا نہیں چاہتا تھا۔ اسی طرح ۱۹۶۶ء میں کشمیر سے واپسی کیلئے بس
کی ٹکٹ میں نے دو روز قبل خریدی تھی بس علی الصباح نکلنے والی تھی۔
اور یونی ورسٹی (جہاں ہم لوگوں کا قیام تھا) سے بس اسٹینڈ تک
علی الصباح جانے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ احتشام صاحب
نے یونی ورسٹی کے کارکنوں سے بار بار تقاضہ کر کے رات ہی کو
بس اسٹینڈ تک پہنچانے میں مدد کی۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات سہی
لیکن اعلیٰ انسانی اقدار کے ایسے نمونہ ہیں جو اس تعنج زدہ دور
میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

کشمیر کا ایک اور واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے.....
احتشام صاحب نے ڈاکٹر گیان چند کی موجودگی میں کہا" کرامت
صاحب اُردو میں لکھتے ہیں۔ اس لئے عام طور پر لوگ اُنھیں اُردو
ڈپارٹمنٹ کا آدمی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے اُنھیں
اُردو ٹیچرس کانفرنس میں دعوت دے کر بلا لیا۔" میں نے کہا کہ
مجھے کانفرنس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ آپ لوگوں
سے ملنے کی خاطر یہاں پہنچا۔" ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مخصوص
مزاحیہ انداز میں کہا" ہم میں کون سی ایسی خوبی ہے کہ آپ
اتنی دور سے تشریف لائے۔ اگر اتنا پیسہ خرچ کر کے بمبئی جاتے
[illegible]

ملاحظہ فرمائیے۔ اُنھوں نے فوراً کہا "کرامت صاحب بڑی نیچے والے آدمی ہیں۔ ایکٹریس سے مل کے کیا کریں گے؟" افسوس کہ احتشام صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی یہ باتیں کیسے بھلائی جاسکتی ہے۔

احتشام حسین صاحب عام طور پر "مارکسی نقاد" کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن میری رائے میں اُنھیں "مارکسی نقاد" کا لقب دینا ان کی فعال و متحرک تنقید کے لاتنا ہی پہلوؤں کو محدود مسدود کرنے کے مترادف ہے۔ اُنھوں نے ترقی پسندی سے لیکر جدیدیت تک ہر طرح کے صحت مند تجربوں کا خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ یہ ہمارے ادب کا ایک ناقابلِ معافی المیہ ہے کہ ان کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوششیں کی گئیں۔ ان کی مخالفت کو جدید ہونے کا بہت بڑا پیمانہ قرار دیا گیا۔ لہٰذا کئی لوگوں نے عمیق حنفی سے متلق لکھا ہے کہ حالانکہ وہ سینیر گروپ سے تعلق رکھتے تھے لیکن احتشام حسین سے مخالفت کی وجہ سے اُنھیں جدید گروپ میں شمار کیا جانے لگا

ہمیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے خلاف غلط فہمی کی لو مدھم نہیں ہوئی ہے چنانچہ ۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کے اداریہ میں پروفیسر آل احمد سرور ان سے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں۔

"وہ ادب کی تنقید میں میرے نزدیک سماجی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے تھے اور ادب کے جمالیاتی پہلو پر کم...... جدیدیت کی رو سے وہ خوش نہ تھے ان کا ایک خاص مزاج بن چکا تھا اور وہ اس عمر میں اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے تھے اسی لئے اپنے راستہ پر گامزن رہے۔"

اسی طرح جنوری ۱۹۷۳ء کے "شب خون" میں شمس الرحمان فاروقی رقم طراز ہیں۔

احتشام صاحب ترقی پسند تھے اور خاصے کٹر ترقی پسند تھے۔ ادب میں نئی تبدیلیوں سے وہ بہت خوش نہ تھے۔"

میری رائے میں احتشام صاحب نے اپنی فعال طبیعت سے اپنے سابقہ رویہ میں کافی حد تک تبدیلی پیدا کر دی دہائی میں اُنھوں نے جتنے بھی مضامین لکھے، ان کے با وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں ادب کے سم اور جمالیاتی پہلو کا ایک خوش گوار توازن پایا جاتا ادب کے جمالیاتی پہلو کو زبردستی مصنوعی طریقے پر سم الگ کر کے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے کے مضمون جمالیات، فن کار اور فنکاری" (مطبوعہ شاعر) کی اس طرح وضاحت کی ہے۔"

"اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حسن کا مادی ا وجود بھی ہے اور اس سے بھی انکار کرنا ممکن نہیں کہ جغرافیائی علاقائی اور تہذیبی تصور بھی ہو سکتے ہیں مصوری، موسیقی یہ ملکوں ملکوں میں جو فرق ہے اور امر ہونے والا جو ردِ عمل ہے وہ ایک دوسرے سے اتنا مختلف یہی نہیں بلکہ تلازمۂ ذہن اور تلازمۂ نفس کی وجہ سے خانوں میں بٹ جاتا ہے۔ فلمی دھنوں پر سر دھننے والے د خیال سے بے گانہ گذر جاتے ہیں۔ قوالی پر وجد کرنے وا مزے سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ مشرق و مغرب کو تو چھوڑ بی علاقے میں بسنے والے اپنے ذہنی رجحان اور نفسیاتی وجہ سے حسن کو مختلف شکلوں میں تلاش کرتے...۔ او

احتشام صاحب نے جو کچھ کہا ہے اس سے شاید شخص کو اختلاف ہوسکتا ہے۔"

یہ کہنا احتشام صاحب پر سب سے بڑا ظلم ہے کی رو سے وہ خوش نہ تھے" نیز یہ کہ "ان کا ایک خا چکا تھا۔ اور وہ اس عمر میں اپنے آپ کو بدل نہیں "اگر وہ جدیدیت کی رو سے ناخوش ہوتے تو ان پر پوری نئی نسل اس قدر گہرا اثر قبول نہ کرتی۔ ا ذہن پر اس قدر رنج و اضمحلال کی فضا طاری نہ نقادوں میں سردار جعفری، سجاد ظہیر، وغیرہ سب کا نئی نسل ان لوگوں کی باتوں کو کیوں نہیں اتنی اہمیت

ہمارے سینئر گروپ کے نقادوں میں کلیم الدین احمد سے لیکر اختر اورینوی اور مجنوں گورکھپوری تک کی تنقید . یا تو شوکیس میں رکھنے کے قابل ہے یا کسی مندر میں مت بنا کر پوجے جانے کی۔ نئی نسل کو ان نقادوں سے کیا لینا دینا ہے ؟ صرف آل احمد سرور اور احتشام حسین ایسے نقاد ہیں جن کی تنقیدوں سے نئی نسل کو روشنی ملتی آئی ہے۔ آل احمد سرور نے نئے شعر و ادب کے لئے نئے احساس اور نئے طرز اظہار کے زیادہ زور دیا اور اچھے برے کے پھیر میں نہ پڑنے کی تلقین کی۔ جبکہ احتشام حسین نے نئے احساس اور نئے طرز اظہار کے پہلو بہ پہلو خوب وزشت کے تصور کو بھی بروئے کار لانے کی تلقین کی ہے جسے حال و ماضی کے تجربوں سے شعور سلیم نے فراہم کیا ہے۔ فنکار کے احساس کی سچائی پر احتشام صاحب زیادہ زور دیتے تھے وہ جدید شعر و ادب کے نام پر اچھے برے ہر طرح کے تجربات کو حلق سے اُتارنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس اعتبار سے میرا نظریہ احتشام صاحب کے نظریہ سے بہت قریب تھا۔

میری طرح ان کا بھی نظریہ یہ تھا کہ جدید شعر و ادب کا ایک معتدبہ حصّہ احساس کی سچائی کے فقدان کے سبب ناکامیاب ثابت ہو رہا ہے "سطور" میں شائع شدہ میرے مضمون "جدید شعری رویہ ساتویں دہائی میں" سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے اُنھوں نے مجھے لکھا۔

"آپ تو بہت ہی خیال انگیز مضامین لکھ رہے ہیں غالباً لکھ چکا ہوں کہ "سطور" والا مضمون مجھے بہت پسند آیا۔ آپ نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ نئی شاعری نے جو اپنی دنیا محدود کر لی ہے۔ وہ نہ تو شاعری کے لئے مفید ہے اور نہ شعراء کے اس دعوے کی ترجمان کہ وہ اپنے عصر کی حقیقتوں کے ترجمان ہیں ایک بات البتہ یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح بہت سے شاعر محض موضوع کو سامنے رکھ کر موت اور تنہائی اور شہری صنعتی زندگی کی اُلجھنوں پر نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اگر اسی طرح بغیر سچے احساس کے زندگی کے اور مسائل پر لکھیں گے تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ بہر حال یہ اچھا ہے کہ آپ نے بعض مثبت حقائق کی طرف متوجہ کیا ہے۔ میں بھی بارہا اس خیال کو پیش کر چکا ہوں۔"

گذشتہ دہائی میں، جدید شعر و ادب کے نام پر جس طرح ادبی سیاست کا جال بچھایا گیا، اس سے احتشام صاحب کو وحشت سی ہونے لگی۔ چند گنے چنے موقع پرست جدیدیوں کے حملوں کا جواب اُنھوں نے اس لئے خاموشی سے دیا کہ غیر علمی انداز میں گفتگو کرنا ان کا شیوہ نہیں تھا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ جدید نقادوں میں سے بیشتر ایسے ہیں جو انگریزی میں کہی گئی پرانی باتوں کو اُردو میں دہرا رہے ہیں حالانکہ کہنے والوں کو یہ باتیں نہیں نظر آ رہی ہیں اُن کے اہم خط کا اقتباس درج ذیل کر رہا ہوں جس سے آپ کو اندازہ لگ جائے کہ جدید نقادوں کی ادبی سیاست سے کس قدر بیزار تھے۔ فرماتے ہیں۔

"شاخسار میں آپ کے رشحاتِ قلم دیکھ کر طبیعت خوش ہوتی ہے سائنسی مزاج کے ساتھ ادبی ذوق کی آمیزش نادر چیز ہے وہ آپ کے یہاں موجود ہے۔ نئی شاعری کے مسائل کے متعلق آپ کا نقطہ نظر افراط و تفریط سے محفوظ رہتا ہے جہاں اختلاف کی گنجائش بھی ہوتی ہے وہاں محض جذباتیت سے نہیں ہوتی۔ یہ بڑی بات ہے۔ نئی شاعری سے متعلق لوگوں نے ایسی انوکھی اور دلچسپ باتیں کہی ہیں کہ ان کا جواب خاموشی ہے اس لئے نہیں کہ ان سے اختلاف ہے بلکہ اس لئے یا تو وہ باتیں بیش پا افتادہ ہیں اور کہنے والوں کو نئی نظر آ رہی ہیں یا اس لئے کہ ان کا انداز خالص غیر ملکی ہے۔ گو آہستہ آہستہ بادل چھٹ رہے ہیں اور اعتدال پیدا ہو رہا ہے لیکن طرح طرح کی وجوہ سے اختلاف کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بحث اگر صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے کی جائے تو مفید ہے لیکن جہاں یہ خیال ہو کہ ادبی مسائل کے نتیجہ خیز ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے وہاں اس کی حیثیت چھیڑ چھاڑ کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی۔ مختصر۔ دعا گو

کو چند گالیاں دے کر اپنے کو غیر جانب دار اور خالص
آزاد نقطہ نظر رکھنے والا ظاہر کر کے مضمون شروع کرتا ہے

اور ہر طرح کے ادعا کے باوجود وعظ و پند، فتوے اور
اعلان پر اُتر آتا ہے بہر حال مجھے یقین ہے کہ آخر کار فتح
وقت اور تعقل کی ہوگی۔"

خدا کے فضل و کرم سے احتشام صاحب کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے اور شدت پسند جدیدیت کی جو ہوا کچھ دن ہوئے ہمارے ادب میں چل رہی تھی، اس کی رفتار سست پڑ گئی ہے خس و خاشاک میں سے جواہر پارے رفتہ رفتہ سامنے آ رہے ہیں۔ وہ جدید شعراء جن کو اپنی شدت پسند جدیدیت پر ناز تھا قصہ جدید و قدیم کو دلیل گم نگہی قرار دینے پر مائل نظر آ رہے تھے اس اعتبار سے احتشام حسین ترقی پسندی، جدید اور قدیم کی افراط و تفریط سے پاک صالح اور صحت مند شعر و ادب کی علامت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں: کل نفسٍ ذائقۃ الموت، رہے گی۔"

ان کے انتقال کے بعد متعدد رسالوں نے "احتشام حسین نمبر" نکالنے کا اعلان کیا ہے۔ اس اعلان سے جہاں احتشام صاحب کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس مردہ پرست قوم کے رویہ کا افسوس ہوتا ہے کہ احتشام صاحب کی زندگی میں ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ غالباً "شاعر" کے علاوہ کسی دوسرے رسالے نے "احتشام حسین نمبر" نکالنے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" کے ذہن میں تو یہ بات آئی تھی؛ لیکن بدقسمتی سے نمبر جام پینے سے قبل ہی احتشام صاحب راہی ملک عدم ہو گئے۔

احتشام حسین نے عملی تنقید کی بہ نسبت اُصولی اور نظریاتی تنقید پر زیادہ توجہ دی ہے اور اُردو کی اصولی اور نظریاتی تنقید کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ کسی زبان کی عملی تنقید سے وہی شخص دلچسپی لے سکتا ہے جس کو اس زبان سے دلچسپی ہو۔ لیکن اُصولی اور نظریاتی تنقید کا دائرہ عمل زیادہ وسیع ہے اور دوسری زبان کے ادیبوں کے لئے بھی دلچسپی کا سامان مہیّا کر سکتی ہے۔ اور ان کے لئے مشعل راہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ میں احتشام کے پرستاروں

"احتشام حسین یادگار کمیٹی" کے ممبروں اور میشنل بک ٹرسـ
تمام ارباب حل و عقد سے درخواست کروں گا کہ احتـ
کی اصولی اور نظریاتی تنقید کے اعلیٰ نمونوں کو ہندوستا
بیرونی ممالک کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے پیش کـ
احتشام صاحب کو بین الاقوامی ادبی حیثیت حاصل ہو۔
اس بات پر فخر کر سکیں گے کہ ہم میں بھی ایک ایسا جینئس
گزرا ہے جس کے کارناموں کو۔ ٹی۔ ایس، ایلیٹ، آئی۔ اے
سی۔ ڈے، لوئیس، کرسٹافر کاڈول جیسے بین الاقوامی
کے کارناموں .... کے مقابل میں پیش کیا جا

احتشام حسین نے اڑیسہ جیسے دور افتادہ
ادیبوں کو وقتاً فوقتاً جس طرح سراہا ہے، اسے بھلایا
حیدر رنایاب صاحب کے شعری مجموعہ پر رائے
انھوں نے کہا ہے۔"

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے
ان علاقوں میں اُردو شعر و ادب کو فروغ ہو رہا
جو قدیم مراکز سے دور تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے
اُردو کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے اور وہ علاقائی
بندیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ جنھوں نے احساس نظـ
محدود کر رکھا تھا۔ اڑیسہ خود ایک اہم ادبی مرکز
رہا ہے۔ اور اس تابانی کے ساتھ جو عصر جدید نے
و خیال کو بخشی ہے۔"

اے اُردو زبان، تو احتشام حسین کا ماتم نہ کر۔ ا
اب بھی تجھ میں زندہ ہے۔ اور قیامت تک تیرے
اس نے تیرے اندر اعلیٰ روایات و اقدار کے جو د
نقوش چھوڑے ہیں، ان سے تیری جبیں تا ابد تا
اور آنے والی نسل کے لئے یہ تابناکی یقیناً مشعل
اقبال نے سچ کہا ہے۔

آدمی مرتا ہے لیکن یہ فنا ہوتا نہیں
درحقیقت یہ کبھی ہم سے جدا ہوتا نہیں

تار اور خطوط کے ذریعہ

تعزیتی پیغامات اور اظہارِ غم والم

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر چند ہی گھنٹوں میں سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ ٹیلی فون، تار اور خطوں کے ذریعہ ہزاروں عقیدتمندوں نے تعزیتی پیغامات بھیجے، ہفتوں تک ان پیغامات کا سلسلہ جاری رہا مرحوم کی بیگم اور ان کے صاحبزادے سید جعفر عباس اور ان کے بھائی سید انصار حسین صاحب نے اخبارات کے ذریعہ ان سبھی افراد کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے ان کے غم میں شرکت کی۔ اس نمبر کے ذریعہ بھی مرتب (سید انصار حسین) سب لوگوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے ــ لاتعداد خطوط اور ٹیلی گراموں میں سے چند پیغامات کی نقل پیش کی جا رہی ہے۔ تاکہ پروفیسر مرحوم کے عقیدتمندوں کے جذبات کی ترجمانی ہو سکے۔

(مرتب)

تار کے ذریعہ تعزیتی پیغامات۔

عالیجناب پروفیسر سید نور الحسن صاحب۔ وزیر تعلیم، حکومت ہند۔

مجھے سخت صدمہ پہنچا، مہربانی کر کے میری پرخلوص اور صمیم قلب سے تعزیت قبول فرمائیے۔

محترمہ سبھدرا جوشی۔ ایم۔ پی

صمیم قلب سے تعزیت پیش کرتی ہوں، یہ نقصان ناقابل تلافی ہے۔

ڈاکٹر عبد العلیم۔ وائس چانسلر علی گڈھ یونیورسٹی۔

پرخلوص تعزیت قبول فرمائیے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور، صدر شعبۂ اردو، علی گڈھ یونیورسٹی

ایک عظیم المرتبت ادیب اور بلند پایہ شخصیت کی افسوسناک اور ناگہانی وفات پر شعبۂ اردو سوگوار ہے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور، (سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علیگڈھ)

اردو کے ایک عظیم المرتبت ادیب، ناقد اور انجمن کے ایک ممتاز رکن کی ناگہانی وفات پر انجمن سوگ نشین ہے اور آپ کے غم میں شریک ہے۔

جناب ڈاکٹر گیان چند صاحب، (صدر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی)

شعبۂ اردو اور میری طرف سے دلی تعزیت قبول فرمائیے۔

جناب مالک رام صاحب۔ دہلی۔

انتہائی پرخلوص تعزیت اور مرحوم کی مغفرت کے لئے دعائیں پیش کرتا ہوں۔

جناب سید علی جواد صاحب، زیدی صاحب۔ دہلی۔

احتشام بھائی کی ناگہانی وفات کی خبر نے سکتہ طاری کر دیا۔ یہ ایک قومی نقصان اور انکی افسوسناک وفات سے ہمارا ادب غریب ہو گیا براے کرم صمیم قلب سے میری تعزیت قبول فرمائیے۔

جناب شری نواس لاہوتی صاحب ۔ حیدرآباد۔

دلی تعزیت قبول کیجئے۔ میں آپ کے غم میں شریک ہوں۔

جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب ۔ صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی سری نگر۔

اس عظیم سانحہ نے مجھ پر سکتہ طاری کر دیا۔

جناب جگن ناتھ آزاد صاحب، سری نگر، (کشمیر)

اس افسوسناک خبر نے مجھ پر سکتہ طاری کر دیا۔ تعزیتی خط روانہ کر رہا ہوں۔

جناب علی سردار جعفری صاحب ۔ بمبئی۔

پروفیسر احتشام حسین کی ناوقت رحلت پر صمیم قلب سے تعزیت پیش کرتا ہوں۔ خدا ان کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

جناب سید نجم الدین نقوی صاحب، رامپور۔

شدید صدمہ پہنچا، خط لکھ رہا ہوں۔

درشن سنگھ دگل ۔ دہلی۔

پیارے بھائی کی ناگہانی وفات میرے لئے، اور ساری ادبی دنیا کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مہربانی کر کے ہماری دلی تعزیت قبول کیجئے۔ خدا ان کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

جناب ڈاکٹر شارب ردولوی صاحب، و ڈاکٹر شمیم نکہت صاحبہ دہلی یونیورسٹی۔

اپنے محبوب استاد کی ناوقت وفات کی خبر سنکر شدید صدمہ پہنچا۔ یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ خدا ان کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ سب کو اس عظیم سانحہ کو برداشت کرنے کی قوت فرمائے۔

جناب ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب، سری نگر۔ کشمیر۔

پروفیسر سید احتشام حسین کی وفات کی خبر سن کر سخت صدمہ پہنچا۔

جناب سید مظفر حسین طاہر جرولی صاحب سکریٹری، شیعہ کالج لکھنؤ

میرے فاضل استاد کی افسوسناک وفات پر دلی تعزیت قبول فرمایئے۔ دنیائے علم و ادب کے لئے یہ ایک نا نقصان ہے۔

جناب عباس موسوی صاحب، مسلم یونیورسٹی

دلی تعزیت پیش کرتا ہوں۔

جناب خلیق انجم صاحب، دہلی

اس ناقابلِ تلافی نقصان پر دلی تعزیت

جناب مرتضےٰ علیخاں صاحب، اسکریٹری اردو، رضا پوسٹ گریجویٹ رامپو

اس افسوسناک وفات پر دلی ہمدردیاں، یہ دنیائے ادب کے لئے یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصا

جناب عبدالوحید صدیقی صاحب ۔ دہلی

آپ کے والد کی افسوسناک اور ناوقت وفات ہوا۔ مہربانی کر کے میری طرف سے اور میرے خاندا سے دلی تعزیت قبول فرمایئے۔

شاہد علی خاں صاحب ۔ دہلی۔

شدید صدمہ ہوا، مرحوم کی روح کے لئے مغفر کرتا ہوں۔

جناب گوپل صاحب ۔ دہلی۔

دلی تعزیت پیش کرتا ہوں۔ یہ نقصان ناقا

مسٹر اور مسز دورا ۔ دہلی۔

آپ کے والد کی ناوقت وفات کی خبر سنکر شدید پہنچا۔ مہربانی کر کے اپنے تمام اعزا کو ہماری پر خلوص پیش کر دیجئے۔

محترمہ جناب شیریں موسوی صاحبہ، مسلم یونیورسٹی

صمیم قلب سے تعزیت پیش کرتی ہوں۔

جناب نازش حسینی صاحبہ ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈ

اس ناگہانی وفات کی خبر سنکر سخت صدمہ پہنچا

جناب ریحانہ صدیقی ۔ دہلی۔

آپ کے والد کی افسوسناک اور ناوقت وفات

بیحد صدمہ ہوا۔ مہربانی کرکے میری پرخلوص تعزیت اپنی والدہ اور دوسرے اعزا کی خدمت میں پیش کر دیجئے۔

جناب ظہیر محسن صاحب ایڈوکیٹ، مراد آباد۔

احتشام صاحب کی وفات کو سنکر سخت صدمہ پہنچا۔ خدا انکی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ سب غمگساروں کو اس نقصان عظیم کے برداشت کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔

جناب وصی الحسن صاحب ۔ بنارس۔

اس مصیبت عظیم کو سنکر بے حد صدمہ ہوا۔

جناب سبط محمد صاحب۔ اکبر پور

میں آپ کے اس شدید رنج وغم میں پوری طرح شریک ہوں۔

جناب شاہد صاحب۔ ماہلی — دہلی۔

اس ناقابل تلافی نقصان پر دلی تعزیت پیش کرتا ہوں

محترمہ مہر بانو صاحبہ۔ سری نگر۔ کشمیر

میں آپ کے اور چچی صاحبہ کے اس صدمہ عظیم میں برابر کی شریک ہوں۔

جناب انوار اشرف۔ بمبئی۔

اس افسوسناک خبر کو سنکر میرے غم والم کا جو عالم ہے اس کا اظہار الفاظ کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس وفات نے غیر معمولی سکتہ طاری کر دیا۔ میں آپ سب کے غم میں پوری طرح شریک ہوں۔

جناب محمد اسلم صاحب ۔ دہلی

آپ کے والد کی نا وقت وفات پر تعزیت پیش کرتا ہوں

جناب سید واصف رضا صاحب۔ روزنامہ انقلاب بمبئی۔

ڈیر محمد بھائی۔ آداب۔

باپو کا سایہ ہم لوگوں کے سروں سے ایک ایسے نازک وقت میں اٹھا ہے۔ جبکہ ہم لوگوں کو ان کی سرپرستی، رہبری اور رہنمائی کی سخت ضرورت تھی۔ اس عظیم اور جانکاہ غم کو بھول جانے کی یا صبر کی تمنا تو فضول ہی ہے۔ کیونکہ باپو کی یاد ہم لوگوں کو تا زندگی ستاتی اور رلاتی رہے گی۔ یہ تقویت ضرور ہے کہ باپو کی مثالی زندگی اور ان کی عظیم وقابل قدر شخصیت ہم لوگوں لئے تا زندگی مشعل راہ رہے گی، رہبر رہے گی، رہنما رہے گی۔ اور اگر ہم لوگ باپو کے نقش قدم پر چلے تو یہ اس عظیم انسان کو بہت بڑا اخراج عقیدت ہوگا۔ ہم لوگ بد قسمتی سے آپ لوگوں سے دور تو ضرور ہیں لیکن اپنے لوگوں کے آنسوؤں میں ہم لوگوں کے آنسوؤں کو بھی شامل سمجھئے۔ ہم لوگ بھی آپ ہی لوگوں کی طرح اداس ہیں، سوگوار ہیں، رو رہے ہیں اور تڑپ رہے ہیں۔ دادی اور بڑی اماں کو سمجھانے کی کوشش کیجئے گا۔ حالانکہ یہ ایک ایسا غم ہے جس کا کوئی مرہم نہیں۔ کوئی مداوا نہیں۔

عالی جناب قاضی جلیل عباسی صاحب (وزیر حکومت۔ یوپی)

محترمہ! تسلیم۔

میں دورے پر تھا۔ دوران سفر مجھے ریڈیو سے مرحوم کے انتقال کی دلدوز خبر ملی تھی۔ میری طرح کوئی بھی اس خبر کو سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مرحوم کی شخصیت علمی حلقوں میں تو مسلم الثبوت تھی ہی اور اس بنا پر ملک کے طول وعرض میں اس حادثہ پر غم کا اظہار ہوا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ میرے ایک مخلص دوست بھی تھے۔ اس لئے یہ حادثہ میرے لئے ذاتی بھی ہے۔ میرے ان کے تعلقات اس زمانے سے تھے۔ جب وہ لکھنؤ میں رہتے تھے اور ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ گردش لیل ونہار کی کتنی ساعتیں گزر گیئں۔ لیکن اس تعلق ویگانگت میں کبھی فرق نہیں محسوس ہوا۔ اب سوچتا ہوں تو سوا اس کے کہ مشیت کی کارفرمائی کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ بیشک اس اچانک حادثہ نے سینکڑوں نہیں ہزاروں دلوں سے قوت برداشت چھین لی ہے لیکن زندگی کا قافلہ بہر حال اسی متاع بے بہا کے سہارے ہی سے آگے بڑھے گا۔ خدا آپ کو اور سارے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے اور مرحوم کو اپنے خاص جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائیے۔ سہ
آسمان "انکی" لحد پہ شبنم افشانی کرے۔

عزت مآب عالیجناب اکبر علی خاں صاحب
(گورنر اتر پردیش۔)

راج بھون۔ لکھنؤ۔ ۵ر دسمبر ۱۹۷۲ء

ڈیر جعفر احتشام۔

پروفیسر احتشام حسین کی وفات کی خبر سنکر مجھے شدید رنج و افسوس ہوا۔ میری ان سے آخری مرتبہ اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب وہ حیدرآباد گئے تھے۔ وہ نہ صرف اردو کے بلکہ ہماری مخلوط تہذیب کے ایک بہت بڑے ستون تھے۔ ان کی وفات سے ہم ایک عظیم المرتبت ادیب سے محروم ہو گئے۔ مجھے اس نقصان کا احساس اس لئے اور بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ وہ الٰہ آباد یونیورسٹی سے متعلق تھے۔ جس سے اب موجودہ حیثیت میں میرا گہرا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔

براہ کرم میری پرخلوص تعزیت قبول فرمایئے اور خاندان کے سبھی متعلقین کو میری طرف سے یقین دلا دیجئے کہ میں، اور اتر پردیش کے سارے عوام ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور مرحوم دوست کی روح کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

(انگریزی سے ترجمہ)

مخلص

اکبر علی خاں

عالی جناب ایچ، این، بہوگنا۔ (وزیر مواصلات۔ ہند)
سنچار منتری، بھارت، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱۔ ۶ر دسمبر ۱۹۷۲ء

مائی ڈیر محمد میاں صاحب

آپ کے والد محترم پروفیسر سید احتشام حسین کے اچانک انتقال کی خبر سے مجھ کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپ کے خاندان والوں اور مرحوم کے دوستوں اور قدردانوں کے لئے یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔

مہربانی فرما کر اس مصیبت میں میری طرف سے دلی تعزیت قبول فرمایئے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اس نقصان عظیم کے برداشت کرنے کی طاقت عطا کرے۔ نیک خواہشات کے ساتھ۔

(ترجمہ)

عالیجناب پی، ڈی ٹنڈن (وزیر اطلاعات و تعلیمات حکومت اتر پردیش۔)

۱۔ اکالی داس مارگ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱۔ ۲ر دسمبر ۱۹۷۲ء

مائی ڈیر وائس چانسلر۔

پروفیسر احتشام حسین کے انتقال کی خبر سنکر مجھے شدید صدمہ پہنچا۔ ان کی موت سے یونیورسٹی کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ میں اس سانحہ پر آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ مرحوم ایک جید عالم تھے اور ان کی عزت و شہرت دور دور تک پھیلی تھی۔ وہ شرافت و تہذیب کا مکمل نمونہ تھے۔ ادبی دنیا میں ان کی کمی برسوں تک محسوس کی جائے گی۔

میں مرحوم سے بخوبی واقف تھا لیکن ان کے خاندان کے افراد سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ ان کے اعزا تک میرا تعزیتی پیغام پہنچا دیں گے۔ کوئی خاص زحمت نہ ہو تو یہ خط ان لوگوں کو پہنچا دیجئے جس کے لئے میں شکر گزار رہوں گا۔

مخلص

پی، ڈی، ٹنڈن

(مندرجۂ بالا خط کی نقل جناب سید جعفر عباس صاحب نورالٰہ روڈ، الٰہ آباد کو بھیجی گئی۔)

بابو رام سکسینہ وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

محترمہ ڈاکٹر راجندر کماری باجپئی۔ (صدر اتر پردیش کانگریس کمیٹی)

۱۹ ر قیصر باغ۔ لکھنؤ۔ ۲ر دسمبر ۱۹۷۲ء

عزیزہ بیگم صاحبہ!

پروفیسر احتشام کے اچانک انتقال کی خبر سنکر میں سکتے میں رہ گئی۔ ان کی موت سے ساری ادبی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے اور الٰہ آباد نے ایک مفکر، دانشور اور عوام کی خدمت کرنے والے ادیب کو کھو دیا۔ میں آپ کے سوگوار عزیزوں اعزا کے لئے دلی تعزیت پیش کرتی ہوں۔ خدا سے دعا ہے کہ

ح کو سکون حاصل ہو اور آپ کو اس عظیم سانحہ کو برداشت کی
ت عطا فرمائے۔

آپ کی
(راجیندر کماری باجپئی)
بخدمت بیگم احتشام حسین۔
(گڑیا تالاب۔ الہ آباد) (ترجمہ)

جناب مولانا عبدالماجد صاحب۔ دریا بادی۔

بسم اللہ

۳ دسمبر ۱۹۷۲ء "صدق جدید" دریا باد ضلع بارہ بنکی۔

برادرم، السلام علیکم۔

ڈاک یہاں سہ پہر کو مل جاتی ہے۔ کل سنیچر کے سہ پہر کو قومی از پڑھ کر کلیجہ دھک سے ہو گیا! انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حادثہ عظیم کا خیال بھی نہ تھا۔ آپ تو خیر مرحوم کے بھائی ہیں ے حق میں بھی مرحوم ایک عزیز قریب سے کم نہ تھے۔ اپنی بیوہ دنا، بیٹیوں اور سارے خاندان والوں کو میری طرف سے دلی یت پہنچا دیجئے۔ اللہ آپ کو بھی صبر دے اور ہم سب کو بھی۔ ا بھی طرح عزادار نہ معلوم کتنے ہوں گے۔ مرحوم اپنی نیکیوں، ش خلقیوں کا صلہ آج کیسا کچھ پا رہے ہوں گے۔

والسلام
حزین و سوگوار، عبدالماجد
(سید انصار حسین کے نام)

جناب ڈاکٹر عابد حسین صاحب۔ نئی دہلی۔

دسمبر ۱۹۷۲ء

عزیزی بھائی، سلمہا

کل ریڈیو سے یہ دلدوز خبر سنی کہ برادر عزیز احتشام حسین کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس جانکاہ ر کا جو مجھے اور میری بیوی کو ہوا کیا ذکر کروں۔ اس کی حقیقت ہے آپ کے اور آپ کی اولاد بے پایاں غم و الم ہئے۔ مگر خیال ہے آپ لوگوں کو اس سے کچھ تھوڑی سی تسکین ہو کہ ہم جیسے سیکڑوں آدمی جو احتشام مرحوم کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے آپ کے غم میں شریک ہیں۔ یہی نہیں کہ بلکہ ساری اُردو دنیا اور عام طور پر ہندوستان کی ادبی دنیا اس مرحوم کا سوگ منا رہی ہے۔ اور منائے گی۔ ایسا دیدہ ور ادیب و نقاد، شفیق استاد، شریف انسان اس زمانے میں کہاں ملے گا۔

آپ کے اور بچوں کے دل کی حالت کا تصور کر کے دل بیٹھنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد وہاں پہونچ کر آپ سب کو تسلی دینے کی ..... کوششیں کروں مگر میرے گھر میں میری بہن بہت سخت بیمار ہیں اور میری بیوی بھی دمے میں مبتلا ہیں۔ اس لئے مجبور رہوں۔ جب موقع ملا الہ آباد یا لکھنؤ آؤں گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسی مصیبت میں انسانوں کی غمخواری اور ہمدردی کم ہی کام آتی ہے۔ خدا کے سوا کسی میں یہ قدرت نہیں کہ ٹوٹے دلوں کو جوڑ دے۔ اس لیے یہ دعا ہے کہ آپ کو، آپ کے بچوں اور دوسرے عزیزوں کو صبر عطا فرمائے اور مرحوم کو رسول اور آل رسول کے طفیل میں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

سوگوار۔ عابد حسین۔

عالیجناب پروفیسر آل احمد سرور صاحب۔ (صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۹ دسمبر ۱۹۷۲ء

عزیزم جعفر عباس۔

احتشام کے اچانک انتقال سے تم کو اور تمھاری والدہ کو جو صدمہ ہوا ہوگا اس کا تھوڑا سا اندازہ کر سکتا ہوں۔ خود میرا یہ حال ہے کہ اس اچانک خبر کے بعد سے اب تک دل ٹھکانے نہیں ہے اور ہر وقت احتشام کی صورت آنکھوں میں گھومتی ہے۔ مجھے پہلی دسمبر کو صبح ہی ان کا ۲۹ نومبر کا خط ملا تھا جس میں اطلاع تھی کہ "دس بارہ دن بخار رہا۔ فلو تھا۔ اب بخار اتر گیا ہے۔ صرف کمزوری اور کھانسی باقی ہے۔" کسے معلوم تھا کہ اچانک ان کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔

ہائے کیسا عالم، کیسا انسان اور کیسا دوست اچانک

بچھڑ گیا۔ خدا اسے اپنی رحمت سے سرفراز کرے اور تم سب کو صبر کی توفیق دے۔ گھر میں تم ہی سب کے بڑے ہو۔ تم پر بڑی ذمہ داری ہے۔ سب بھائی بہنوں اور اپنی والدہ کی دیکھ بھال کرتے رہو۔ خدا کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں ہے۔

مخلص

آل احمد سرور

عالیجناب مالک رام صاحب۔ نئی دہلی۔

۳۹۲ ڈیفنس کالونی۔ نئی دہلی۔ ۲۴۔۲۶ دسمبر ۱۹۷۲ء

عزیز مکرم جعفر عباس — دعوات

پروفیسر سید احتشام حسین کی ناگہانی وفات کا جتنا صدمہ ہوا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ میں نے جہلم کے دن تار دے دیا تھا، لیکن چاہتا تھا کہ خط بھی تفصیل سے لکھوں لیکن آج تک یہی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ لکھوں تو کیا لکھوں۔ ایسا عزیز ادر ہمدرد دوست ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا، خود ہم سوگوار ہیں، لوگوں کو ہم سے تعزیت کرنا چاہیئے۔ آپ لوگوں پر جو گزر رہی ہے، اس کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون" مجھے مرحوم کے حالات درکار ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی ذہنی کیفیت کسی تفصیلی تحریر کے قلمبند کرنے پر آمادہ نہیں ہوگی لیکن اگر مختصراً بھی مندرجۂ ذیل سوالوں کا جواب دے سکیں تو کوشش کیجئے، تا کہ میں تحریر کے آئندہ شمارے میں "وفیات" کے تحت اسے شامل کر سکوں۔

(۱) خاندان مختصراً۔ ۲۔ والد کے حالات نسبتہً مفصل، خاص کر پیشہ، وفات کی صحیح تاریخ، مدفن، ۳۔ احتشام صاحب کی ولادت کی تاریخ۔ مقام ولادت، ۴۔ تعلیم۔ کہاں کہاں اور کب سے کب تک؟ خاص اساتذہ، مضامین جن میں امتیاز حاصل کیا! وغیرہ؟ ۵۔ ملازمت کہاں کہاں اور کب سے کب تک؟ تصنیف و تالیف کا شوق کیونکر ہوا؟ شاعری میں تلمذ کس سے تھا؟ تاہل، اولاد؟ مرض الموت، علاج، صحیح تاریخ وفات اور وقت! کیا اسپتال میں رحلت کی یا گھر پر، مدفن۔ مرحوم کا مجموعۂ کلام تو آج تک شائع نہیں ہوا۔ کچھ کلام بھی درکار ہوگا لیکن فی الحال حالات کی فوری ضرورت ہے۔ کلام بعد کو درکار ہوگا۔ لیکن میں ان کی بیاض ضرور دیکھوں گا۔ تا کہ اس سے حسب خواہش انتخاب کر سکوں۔

آپ جس تفصیل سے لکھ سکیں لکھئے۔ عبارت آرائی کی ضرورت نہیں ہے۔ جو جی میں آئے، لکھ ڈالئے۔ میں اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے اخذ و اقتباس کر لوں گا۔ لیکن یہ کام ذرا عجلت کا ہے اس لئے براہ کرم مستعدی سے کر ڈالئے ورنہ نہ صرف پورے حالات لکھ نہیں سکوں گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ ان میں غلطی راہ پا جائے۔ جو ٹھیک نہیں ہوگا۔ گھر میں سب سے میرا سلام کہیئے۔ خدا آپ سب کا حامی و ناصر رہے! آمین۔

تفصیلات کی پوری فہرست اور ان کا مقام و سال اشاعت بھی لکھئے۔ والسلام والاکرام۔

خاکسار

مالک رام

عالی جناب سری نواس لاہوٹی صاحب، حیدر آباد۔

۲ دسمبر ۱۹۷۲ء — (اردو ہال۔ حیدر گوڑہ۔ حیدر آباد۔ ۱)

محترمہ بھابی صاحبہ۔ تسلیم

آج کے اخبارات میں بھائی جان کے انتقال کی خبر پڑھ کر بڑا صدمہ ہوا۔

پچھلے دنوں ان کا خط آیا تھا اور انھوں نے جو کتاب بھجوائی تھی وہ بھی ملی۔ اس خط میں کسی بھی بیماری کا ذکر نہیں تھا۔ یکایک یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟

موت ایک اٹل حقیقت ہے اسے ہمیں تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ میں آپ کے اور بچوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ میرے لائق کوئی بھی کام ہو بلا کسی تکلف کے تحریر فرمایئے گا۔

آپ کا بھائی

سری نواس لاہوٹی

۲/۱۲/۷۲ (بیگم احتشام حسین مرحوم کے نام)

...ناب سید کلب عباس صاحب۔ ایڈوکیٹ۔

(جنرل سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس)

...شہ انیلرآباد لکھنؤ:۔

عزیزہ سلمہا۔

کل سہ پہر کو یہاں خبر وحشت اثر انتقال پرملال احتشام
...سنکر کلیجہ پھٹ گیا۔ اس کا وہم بھی نہ تھا کہ یہ چاند پورے
...اب پر غروب ہو جائے گا۔ اور یکایک ایسی ناگہانی اور نا وقت
... افسوس کہ کسی بچے کی شادی نہ دیکھی۔ کیا معلوم تھا کہ اس
...بد وہ ہم سے چھوٹ جائیں گے۔ مجھے تو یقین کرنے میں کہ ایسا
...ہو تامل جو ہا تھا بہرحال تصدیق کے لئے فوراً انصار میاں
...ں گیا۔ معلوم ہوا کہ ہاں۔ وہ بھی یہی خبر پاکر الہ آباد گئے
...رغالباً لاش لے کر شب تک واپس آئیں گے۔ پھر شب میں
...ت کرایا معلوم ہوا کہ نہیں آئے۔ پھر صبح کو کلب سلمان سلمہ گئے
...وم ہوا کہ وہیں دفن ہوں گے۔ افسوس کہ آخری دیدار سے
...وم رہا۔ دل رو رہا ہے۔ میں ۸۲ برس کا زندہ ہوں اور وہ
...رس کے اٹھ گئے۔ مگر مشیت ایزدی میں چارہ ہی کیا ہے۔ اور
...وگوں کو صبر دے۔ اور تم سے جو نعمت چھن گئی ہے اس کا بدل
...ں کو اسی درجہ پر پہونچا کر عطا کرے۔ بہرحال صبر کرو۔
...د مع الصابرین" اس میں شک نہیں کہ رٹ گئیں۔ برباد
...، مگر بیٹی اپنا اختیار ہی کیا ہے۔ اب تم بزرگ ہو سبکو
...دا اور جیسے پڑی ہے کاٹو، اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بچوں کو
...د۔ میں آتا مگر جب دیدار ہی نہیں ملا تو آنا بے سود ہے۔
...ئمی شرکت، اس سے کیا فائدہ۔ یہیں سے مرحوم کی
...، اور تم لوگوں کی عافیت کے لئے دعاگو ہوں محمد میاں
...میاں، اقبال سلمہٗ اور لڑکیوں کو میری طرف سے
...ادو۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں ان بچوں کے لئے ہر خدمت
...ر ہوں۔

غم نصیب

کلب عباس

(بیگم پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کے نام)

محترمہ بیگم خواجہ اطہر حسین صاحب (کراچی پاکستان)

عزیزہ ہاشمی سلمہا۔ بہت بہت دعائیں۔

۱۲ر دسمبر ۷۲ء

پروفیسر احتشام صاحب کے انتقال کی خبر سنکر دلی صدمہ ہوا۔ کسی طرح دل کو یقین نہیں آتا۔ تم کس مصیبت و پریشانی میں گرفتار ہوگئیں۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ بس دلہن خدا تم کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اپنے کو سنبھالو اور اپنے بچوں کی طرف دیکھو۔ ان کے لئے اب ماں اور باپ دونوں تمھیں ہو، ان کو تسلّی و تشفی دو، اور ان کی ہمت بڑھاؤ۔ مجھے بے حد غم ہے کہ میں لکھنؤ میں موجود نہیں کہ تمھارے غم میں شریک ہو سکتی اور تمھیں تسلّی دیتی۔ بس خدا ہی سب سے بڑا کارساز ہے۔ اور اس کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔ مرحوم اتنے نیک اور مخلص انسان تھے کہ ان کی کمی ہر شخص کو محسوس ہوگی۔ ابھی تو ان کا کچھ سن بھی نہ تھا۔ نہ جانے کس کی نظر ان کو لگ گئی۔ بس دلہن اپنی صحت کا خیال رکھو، دل کو مضبوط رکھو کیونکہ ان بچّوں کی پرورش کے لئے تمھاری سخت ضرورت ہے۔ تمھارے بھائی صاحب بھی تمھیں دعائیں کہتے ہیں۔ اور ہم سب تمھارے غم میں شریک ہیں۔ سعیدہ اور سب بچّوں کو دعائیں۔

دعاگو تمھاری

بیگم خواجہ اطہر حسین۔

(بیگم پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے نام)

عالی جناب ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب۔ (صدر شعبۂ اردو۔ گورکھپور یونیورسٹی)

میرے عزیز جعفر عباس!

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا لکھوں۔ جب میرا یہ حال ہے کہ قلم قابو میں نہیں ہے تو آپ لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ اس کا اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے۔

مرحوم مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے اور مجھے اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ انھوں نے مجھ پر جو احسانات کئے ہیں انھیں

میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ مجھے بجا طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے
سب سے بڑے محسن کا انتقال ہوگیا۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ صبر کیجئے کیونکہ یہ وہ غم ہے جو کسی طرح بھلایا نہیں جا سکتا۔ میں اس وقت صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس غم میں ہم لوگوں کو برابر کا شریک سمجھئے۔

اب آپ کے سر بڑی ذمہ داری آگئی ہے۔ دعا کر رہا ہوں کہ آپ بہ حسن و خوبی اس سے عہدہ برآ ہوں۔ میرا تعاون آپ کو ہمیشہ حاصل رہے گا۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اردو والے ہمیشہ احتشام صاحب مرحوم کے خاندان کے کام آنے کی کوشش کریں گے۔ اب مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن جن لوگوں پر انھوں نے احسانات کیے تھے، وہ موجود ہیں اور وہ اپنا فرض ادا کریں گے۔

میں جلد ہی الہ آباد آؤں گا۔ اور مرحوم کے مزار پہ فاتحہ پڑھوں گا۔

اپنی والدۂ محترمہ کو یقین دلا دیجئے کہ پوری اردو دنیا ان کے غم میں شریک ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ والسلام

محمود الٰہی

عالیجناب پروفیسر سید نجم الدین نقوی صاحب۔

(صدر شعبۂ اردو۔ آگرہ یونیورسٹی)

(رضا پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج رامپور)

۴ر دسمبر ۱۹۷۲ء۔

ہاشمی سلمہا۔

یہ کیا ہوگیا۔ یہ کیسی خبر بد ہے۔ یہ خبر کیوں آئی۔ اس خبر کے لئے میں زندہ رہا۔ اور اس خبر کے بعد بھی زندہ ہوں۔ آخر کیوں؟ اب دنیا میں کیا رہ گیا۔ ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ میری خبر احتشام صاحب سنتے۔

افسوس ہزار افسوس۔ ایک عظیم انسان ایک معصوم انسان ایک عالم باعمل، ایک پیکر انسانیت، ایک ایثار مجسم ایک خلوص مجسم، ایک پیکر شرافت، ایک عظیم ادیب و نقاد، غرض معلوم نہیں کیا کچھ ہم سے چھین لیا گیا۔ اللہ کی مشیت اور اس کے حکم کے آگے ہم سب سر بسجدہ ہیں۔ لیکن دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے، دماغ ہے کہ معطل ہے۔ کسی طرح خبر کو یقین کرنے کے لئے دل آمادہ نہیں ہو پاتا ہے۔

اب کس کو خط لکھوں گا۔ کس کے خط کا منتظر رہوں گا۔ کس کی صورت دیکھنے کے لئے بے چینی ہوگی۔ کس سے بات کرنے کے لئے بے تاب رہوں گا۔ یہ بے تابی اور بے قراری اب ہمیشہ باقی رہے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ۔ والدۂ ماجدہ کا اور تمھارا رنج شدید ترین ہے۔ مگر صبر کرو، سید الشہدا اور ان کے مصائب کو یاد رکھو، شہر بانو جناب کی پیروی کرو، فاطمۂ زہرا سے صبر کی التجا کرو۔

احتشام نہیں مرے، میرے لئے تو سب کچھ فنا ہوگیا۔ اب الہ آباد میں کیا رہ گیا۔ اب لکھنؤ میں بجز خاک کے کیا باقی ہے۔ اب اردو ادب و انشا اور تنقید سوگوار ہے اور یہ سوگواری لازوال ہے۔

صبر۔ صبر۔ صبر۔ مگر کیسے۔

رہے نام اللہ کا۔

شریک غم

مسعود

(بیگم سید احتشام کے نام)

(۲)

۱۲۔اے۔ قلعہ رامپور۔

۹ر دسمبر ۷۲ء۔

محمد میاں سلمہٗ

احتشام صاحب کی رحلت میرے لئے جانکاہ ہے۔ میرا بھائی، میرا دوست، میرا مخلص، اور میرا رہبر چھوٹ گیا۔ ہاشمی سلمہا کو تار اور خطوط بھیج چکا ہوں۔ اس وقت تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

۱۹۳۸ء میں جب مرحوم لکھنؤ میں یکجا ہوئے تو ماں بھائی اور بچوں کے ساتھ پورے کنبے کو سمیٹ لیا تھا۔ اپنی شرافت، خلوص، ایثار اور علم دوستی کے باعث وہ بلند ہوتے گئے، اور

خراستہ بلند ہوئے کہ ان کی بلندیاں اللہ کو عزیز
ہیں اور جنت الفردوس میں جگہ ملی۔

کم و بیش ۱۹۴۳ء کے حالات ایک بار پھر پیدا
ہو گئے ہیں اور لائق باپ کے لائق فرزند کی حیثیت سے
د اپنے پورے کنبے کی ناخدائی کرنا ہے مجھے پورا وثوق
کہ تم پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام
گے بدنصیب دادی اور اپنی ماں کا دل ہاتھ میں
نے ماں کی اطاعت کو عین عبادت جانو گے اور
ں کے سر پر ہاتھ رکھو گے اور یونیورسٹی میں اپنے
فن منصبی کو حسن خوبی انجام دیتے ہوئے اپنے کو
شام صاحب کی طرح بے لوث علمی خدمات کے لیے
کر دو گے اور بہت جلد لوگ تم کو احتشام کی معنوی
یہ سمجھنے لگیں گے۔

اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ احتشام صاحب کے
ی میں صحیح ترین وارث اور جانشین بنو۔

چہلم لکھنؤ میں ہو رہا ہے کہ الہ آباد میں تاریخ
مطلع کرنا۔ اگر چہلم لکھنؤ میں ہوتا لکھنؤ کے عزیز دوست
مخلص کثیر تعداد میں شریک ہوتے کیونکہ مرحوم کی
گی کا بہترین حصہ لکھنؤ کی نذر ہوا ہے۔

اللہ تم سب کو صبر کرامت کرے اور تم کو زندہ
سلامت رکھے اور اقبال بلند کرے آمین۔

شریک غم نجم الیاس

سید جعفر عباس صاحب کے نام

(۳)

محمود صاحب احتشام صاحب کے بعد زندگی بے
ہی نہیں بلکہ بالکل ویران نظر آتی ہے الہ باد ہو کہ
دونوں میرے لیے لائق کشش نہیں ہے احتشام صاحب
س قدر جلد یہ دنیا چھوڑ دی کہ اب بھی جبکہ ان
حلت کو کئی دن ہو چکے ہیں ان کا تصور اور تصویر
دل و دماغ سے جدا نہیں ہوتے آہ کیا انسان اس
دنیا سے اٹھ گیا۔

تم عمر اور تجربے میں محمد میاں سے بہت زیادہ ہو
ان کی رہبری کرتے رہو خداوند عالم تم کو بھی اپنی
عارضی جگہ پر مستقل کرے تاکہ چچا بھتیجے مل کر گھر کا
سکون اور وقار برقرار رکھ سکو۔

میری جانب سے احتشام صاحب کی والدہ
کی خدمت تعزیت کر دو۔ بچوں کو تسکین دو اور ہاشمی
سلمہا کو صبر کی تلقین کرو۔

زیادہ بجز حسرت و غم اور کیا لکھوں اور لکھ بھی
کیا سکتا ہوں بہت دور ہوں ورنہ صبح و شام
حاضری دیتا چالیسواں لکھنؤ میں ہوتا تو اچھا تھا اسے
جیسا مناسب سمجھو کرو تاریخ سے مجھ دل ملول کو بھی
مطلع کرنا۔ شریک غم و شکستہ حال میری اہلیہ خاص
طور سے ہاشمی سلمہا کو دعا اور ہمدردی بھیجتی ہیں

(ڈاکٹر سید محمود الحسن کے نام)

عالی جناب پروفیسر سید حسن صاحب (صدر شعبۂ فارسی
پٹنہ یونیورسٹی۔ (پٹنہ)

۱۱ر دسمبر ۱۹۷۲ء

عزیز محترم سلامت باشد!

پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی بے وقت اور اچانک
وفات کی خبر سن کر مجھے اور میرے اور اردو و عربی کے
شعبوں کے تمام اساتذہ کو سخت صدمہ ہوا ہے میرے
اور مرحوم کے تعلقات تقریباً بیس سال سے تھے یعنی
اس وقت سے جب وہ لکھنؤ میں شعبۂ اردو کے استاد
تھے۔ میں نے انھیں بڑا نیک وضعدار اور مخلص و شریف
انسان پایا اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو سبب نجات
اخروی بنائے میں آپ لوگوں کی اس المناک مصیبت میں

بنا شرکت سوگواری کا یقین دلاتا ہوں، خداوند پاک آپ
صبر و سکون عطا فرمائے۔

شریک غم والم
سید حسن

(جناب سید جعفر عباس صاحب کے نام)
بجناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب (صدر شعبہ اردو
کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر)

ر دسمبر ۱۹۷۲ء۔

محترمہ۔

میں کن الفاظوں سے اپنے دکھ کا اظہار کروں اور
طرح آپ کا دکھ درد بٹاؤں۔ میرے لئے احتشام صاحب
شخصیت ایک مشفق استاد ایک مربی اور محسن کی شخصیت
ہی ہے۔ انھوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ان کی وجہ
میری تعلیم و تربیت ہوئی ان کی محبت اور شفقت نے
قدم قدم پر میری رہبری کی اس دکھ میں میں آپ کے ساتھ
یک ہوں۔ میرے لئے ان کی وفات ایک مشفق باپ کا سایہ
اٹھ جانے کے برابر ہے۔ آج ایک بڑا آدمی ہمارے درمیان
اٹھ گیا جو ایک عالم اور ادیب ہی نہیں۔ بلکہ ایک ایسا
انسان تھا جس کی شرافت کی قسم انسانیت کھاتی آئی ہے۔

غم گسار
محمد حسن

(بیگم پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم کے نام)
بجناب سید صفدر حسین صاحب عابدی۔ (سیتاپور)
ر دسمبر ۱۹۷۲ء۔

معظمہ تسلیم

استاد محترم کے اچانک انتقال کی خبر سنتے ہی دل
ل اٹھا۔ تصوّر میں بھی نہ تھا کہ ایسی شفیق اور ہر دلعزیز ہستی
طرح ہم سب سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے گی۔ مرحوم
ذات تشنہ کامان علم و ادب کے لئے ایک ایسا سرچشمہ تھی۔
جس سے ہر شخص بقدر ضرورت اپنی پیاس بجھا لیتا تھا خصوصیت
کے ساتھ اپنے شاگردوں کے لئے ان کے دل میں جو درد جو
محبت اور خلوص تھا وہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ وہ کون ایسا
طالب علم رہا ہوگا جو ان کی ذات سے وابستہ رہا ہو، اور
انھوں نے اس کی رہنمائی قدم قدم پر اس کی حوصلہ افزائی
اور بقدر ضرورت امداد نہ کی ہو۔ ان واقعات کے دہرانے
کا یہ وقت نہیں۔

لیکن سوچتا ہوں کہ ایسی شفیق اور بزرگ ترین ہستی
کا غم آپ حضرات سے کیونکر برداشت کیا جائے گا۔ خدائے
بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ حضرات کو صبر و ضبط
کی قوت عطا فرمائے۔ اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے
میری طرف سے تعزیت قبول فرمائیے۔

والسلام
صفدر حسین عابدی

(بیگم سید احتشام حسین مرحوم کے نام)
محترمہ رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ۔ نئی دہلی۔
۲۱ر دسمبر ۱۹۷۲ء۔

عزیزہ دلھن بی بی سلمہا۔ دعائیں۔

ہم لوگ احتشام میاں کے وفات کے صدمے سے
اس قدر بدحال ہوئے ہیں کہ دل و دماغ بالکل بے کار
ہو گیا ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کو کیا لکھوں۔

رسمی باتیں کہہ نہیں سکتے، پھر کیا کریں۔ تمھاری
بربادی تو مسلّم۔ لیکن یہ بھی یقین رکھو کہ ہماری تحریک
بھی احتشام کے مرنے سے لٹ گئی! میں اس کوشش میں
ہوں کہ جلد کسی طرح تم تک پہونچوں، مجھے تم سے بہت سی
ضروری باتیں کرنی ہیں۔

خدا تمھیں بچوں کے سر پر سلامت رکھے۔

تمھاری شریک غم تمھاری آپا۔

(بیگم سید احتشام حسین مرحوم کے نام)

عالیجناب مولانا ہاشم میاں صاحب فرنگی محلی لکھنؤ۔

۹ر دسمبر ۷۲ء

عزیز گرامی قدر سلمک اللہ السلام علیکم۔

اس تیس سال میں سید صاحب مرحوم و مغفور نے محبت ہی فرمائی۔ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ان کو بے پناہ محبت تھی اور ہمیشہ اس رشتہ کا لحاظ رکھا۔

میں آپ سے کیا تعزیت کروں۔ میں اپنی بدقسمتی پر افسوس کر رہا ہوں کہ ایک محبت کرنے والے سے محروم ہو گیا۔

سید صاحب مرحوم و مغفور کا میں بہت ہی قدیم نیاز مند ہوں آپ مجھے اپنا ہی سمجھئے۔

اللہ سید صاحب کے مدارج بلند فرمائے اپنی رحمت خاص سے ان کو حصہ وافر عنایت فرمائے اور نیک بندوں کے ساتھ ان کا حشر ہو میں انشاء اللہ ان کو ایصال ثواب کروں گا۔ براہ کرم آپ میری طرف سے تعزیت گھر کے تمام افراد سے فرمائیے۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ سب لوگ اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت کر کے اللہ سے اجر و ثواب حاصل کریں اور اس دنیا میں بلند مراتب پر سرفراز ہوں۔ براہ کرم میرا اسلام عرض کیجئے۔

تقریباً دو ہفتہ لکھنؤ سے باہر رہا اس لئے تعزیت نامہ حاضر کرنے میں تاخیر ہوئی۔ لکھنؤ کے احباب کرام تعزیتی جلسے میں دعوت دینے غریب خانے پر آتے تھے مگر میں لکھنؤ سے غیر حاضر تھا۔ ان سے بھی معذرت کرنا ہے۔

میں آپ کے غم میں شریک ہوں۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو برداشت کی قوت عنایت فرمائے اور سہارا دے۔

اللہ کرے آپ سب مع الخیر ہوں والسلام۔

ہاشم

(سید جعفر عباس صاحب کے نام)

عالی جناب ڈاکٹر صفدر آہ صاحب۔ بمبئی۔

۸ر دسمبر ۷۲ء

عزیز گرامی۔ تسلیم۔

آج بمبئی آیا تو خبر ملی کہ اردو کا درخشندہ قرص آفتاب غروب ہو گیا۔ احتشام حسین اردو کی عزت تھے۔ وہ ایک ایسے نقاد تھے جن کو یورپ کے اچھے نقادوں سے تولا جا سکتا ہے۔ اس انحطاط پذیر دور میں احتشام حسین کا بدل اردو کے لئے پیدا کرنا مشکل ہے۔

خداوند عالم مرحوم کو مراتب عالیہ اور آپ حضرات کو صبر عنایت کرے۔

بیگم احتشام حسین کی خدمت میں میری طرف سے رسم تعزیت ادا کر دیجئے گا۔ میں چار پانچ دن میں گنیتوری پہنچ جاؤں گا۔

آپ کا شریک غم

صفدر آہ

عالی جناب ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ ریڈر شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی۔

۴ر دسمبر ۱۹۷۲ء

عزیزم! اسلام مسنون

اخبار سے محترم احتشام حسین صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر جو صدمہ ہوا ہے اس کو کن الفاظ میں بیان کروں۔ آپ پر جو کچھ نہ گزر گئی ہو وہ کم ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ یہ خط مکمل کرنا دشوار ہو رہا ہے۔ ان کی شفقت اور محبت، کس کس کا ذکر کروں۔ کتنے رشتے اور تعلق تھے ان سے ان میں سے ہر ایک اتنا مضبوط اور مستحکم کہ جس کا بیان ممکن نہیں۔ اردو دنیا میں چند شخصیتیں ہیں جن کو ہمیشہ فخر اور عزت کی نظر سے دیکھا گیا۔ یہ تعزیت آپ کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر اس شخص سے کرنا ہے جس کا تعلق اردو سے ہے۔ احتشام صاحب کے علم و فضل سے زیادہ وہ بحیثیت ایک انسان ایسے عظیم المرتبت شخصیت تھے کہ ان کے سامنے اور ان کی یاد میں ہمیشہ سر نیاز جھکا رہے گا۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میں کسی قریب عزیز کی قربت سے محروم ہو گیا۔ مگر قدرت الٰہی کے قانون سے کس کو انحراف ہے۔ بارگاہ رب العزت میں ان کی بخشش کی دعا کی جا سکتی ہے۔ رسولؐ اور آل رسولؐ کی قربت ان کو میسر ہو۔ اپنی والدہ اور بہن بھائیوں سے میری طرف سے تعزیت کر دیجئے۔ ان کی دل جوئی کیجئے۔ اس لئے کہ اب گھر کی ذمہ داری کا بوجھ آپ کے سر ہے۔ خدا اس غم کو ضبط کرنے کی توفیق عطا کرے۔

آپکے غم کا شریک

ظہیر احمد صدیقی

(سید جعفر عباس کے نام)

عالیجناب صلاح الدین نیّر صاحب۔ حیدر آباد۔

۲ر دسمبر ۷۲ء۔

کرمی! تسلیم

اردو زبان کے بے لوث خدمت کرنے والا نہ رہا۔ بڑا افسوس ہوا۔ احتشام حسین مرحوم کی مجلس چہلم کی اطلاع ملی۔

خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ پروفیسر صاحب کی مجھ پر خاص عنایت تھی۔ مجھے اپنے آپ پر فخر ہے کہ مرحوم نے اپنی ذاتی شرافت کی وجہ سے بغیر کسی سفارش کے میرے دوسرے مجموعہ کلام "زخموں کے گلاب" پر پیش لفظ لکھا۔ مرحوم سے حیدر آباد کی ادبی محفلوں میں ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ایسے بے لوث سیدھے سادے شریف لوگ کہاں ملیں گے۔ یقین مانیئے حیدر آباد کے تمام طبقوں سے وابستہ ادیب، شاعر پروفیسر صاحب کا سچے دل سے احترام کرتے رہے ہیں۔

آپ نے یاد فرمایا۔ شکر گزار ہوں۔

مخلص

صلاح الدین نیّر

(سید جعفر عباس صاحب کے نام)

عالیجناب وامق صاحب جونپوری۔

لونا رصناد۔ ۵ر دسمبر ۷۲ء۔

عزیز از جان محمد صاحب سلمہ۔ دعا۔

ابھی ابھی وصیؔ ماموں سے احتشام م[illegible] انتقال کی خبر ملی۔ یہ خبر کیا تھی جیسے ذہن پہ کا[illegible] بیان نہیں کر سکتا کہ کس قدر صدمہ ہوا۔ صبر کی تلقی[illegible] فعل لایعنی سمجھتا ہوں۔ ایسے زخم کا اندمال تو[illegible] کر سکتا ہے۔ سہ

تھے پاس جب تو قیامت کا لطف آتا ت[illegible]

ہوئے جو دور تو یادوں کا حشر برپا ہے

کیا اس نقصان کی کوئی تلافی ہو سکتی ہے۔ میں[illegible] کبھی نہیں۔ مرحوم کی جگہ کوئی پر نہیں کر سکتا۔ ا[illegible]

شریک غم

وامق۔

(سید جعفر عباس صاحب کے نام۔)

سہیل عظیم آبادی صاحب۔ پٹنہ

نور منزل۔ سلطان گنج۔ پٹنہ ۶

۳ر دسمبر ۷۲ء

عزیزم سلمہ دعا خیر۔

احتشام صاحب کی اچانک موت کی خبر سے صدمہ ہوا۔ اللہ پاک انہیں حبیب کے طفیل میں جنت میں مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ اور آپ لوگوں کو صبر عطا[illegible] ثم آمین۔

احتشام صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک ت[illegible] ایک ایک خوبی کو یاد کر کے دل دکھتا ہے۔ اردو ادب[illegible] دنوں تک اتنا اچھا نقاد اور سنجیدہ لوگوں کی محفل کو ا[illegible] شریک محفل نہ مل سکے گا۔ ان کی موت پر جتنا ماتم کیا جائے[illegible] لیکن غموں کے باوجود ہر انسان ہو سکتا ضرورت ہ[illegible] انسان کا مقدر ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا ضرور ہے۔

برحق ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ ایک دن مرنا تھا ہی۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ پس ماندوں کی دیکھ بھال کیجئے۔ اور اپنے والد مرحوم کی خوبیوں کا نمونہ بن کر وہی عزت احترام اور محبوبیت حاصل کیجئے۔

احتشام صاحب کے بہت سے دوست آپ کے غم میں شریک ہیں۔ آپ تنہا نہیں۔ دعا گو ہوں۔ اللہ پاک مرحوم کو غریق رحمت کرے اور آپ کے غم کو ہلکا کرے۔ آمین

آپ کا شریک غم۔
سہیل عظیم آبادی

(سید جعفر عباس صاحب کے نام)
پروفیسر اختر قادری۔ صدر شعبۂ اردو و فارسی۔
بہار یونیورسٹی، مظفر پور۔
۵؍دسمبر ۷۲ء

محترمہ!
میں اپنے غم سے آپ کی شدت غم کا کچھ اندازہ کرسکتا ہوں۔ آپ پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ لیکن آپ کو بہرحال اپنے بچوں کا خیال رکھنا ہے۔ اس لئے ہمت سے کام لیجئے۔
اہل بیت ابتلاؤں میں مرضی مولا پر ثابت قدم رہے ہیں، خدا آپ کو اور میرے بھائی، میرے دوست، میرے ہمدرد و غم خوار کے بچوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ اور انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

شریک غم
اختر قادری

(بیگم پروفیسر احتشام صاحب کے نام)
محترمہ ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ۔ حیدرآباد۔ اے۔ پی
۲؍دسمبر ۷۲ء

محترمی
آداب عرض ہے۔
آج اخبار "سیاست" میں احتشام صاحب کے انتقال کی خبر پڑھی۔ دور رہنے والوں کے لئے یہ صدمہ انتہائی غیر متوقع ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا! آخری مرتبہ جب وہ حیدرآباد آئے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے کہا تھا: "میری صحت ادھر کچھ مہینوں سے ٹھیک نہیں تھی۔ اب اچھا ہوں"۔ پتہ نہیں قلب پر حملہ کس بیماری کی وجہ سے ہوا۔"

آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ خدا کرے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں۔ اعجاز صاحب کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے۔ فقط

سیدہ جعفر

(ڈاکٹر سید محمد عقیل، شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے نام)
عالیجناب کلام حیدری صاحب۔ گیا۔
(ہفتہ وار مورچہ)

برادرم
آج اردو اخبارات سے جناب احتشام حسین صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ حیران اور سراسیمہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس خبر پر یقین کروں یا نہ کروں۔
آپ کے والد بہت بڑے دانشور تھے، میں نے انھیں ذاتی زندگی میں اس سے بھی بڑا آدمی پایا۔
میں ان کا شاگرد نہیں ہوں۔ انھوں نے رول کال میں میرا نہیں کیا ہے۔ مگر میں ان کا سو فیصدی شاگرد ہوں۔ کیونکہ انھوں نے ادبی راہوں پر ہمیشہ بھٹکنے سے بچایا اور ادب کا ادب کرنا سکھایا۔
میں آپ کو صبر کرنے کا مشورہ کیا دوں جبکہ میں خود بھی پرسکون نہیں رکھ پا رہا ہوں مگر احتشام صاحب؟
احتشام صاحب کا نام دنیائے دانشوروں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سب لوگوں کو خاص کر اپنی والدہ صاحبہ کو میرا آداب پہونچا دیں۔ میں احتشام صاحب کے لاکھوں پرستاروں میں ایک حقیر پرستار ہوں۔

آپ کا
کلام حیدری۔

محترمہ شکیلہ اختر (بیگم اختر اورینوی) صاحبہ۔ پٹنہ۔

۵؍دسمبر ۱۹۷۲ء۔

بہت عزیز اور بہت پیاری بہن السلام علیکم

میری عزیز بہن اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔ اچانک اخباروں سے اپنے بہت ہی پیارے بھائی کے بچھڑ جانے کی خبر ملی۔ میری بہن یہ خبر نہیں تھی۔ ایک بجلی تھی جو ہم سب لوگوں پر گر پڑی۔ اتنا بڑا حادثہ اور ایسے اچانک ہو گیا۔ کاش یہ نہ ہوتا، میرا اتنا پیارا، اتنا عزیز اتنا قابل قدر بھائی ہم لوگوں سے جدا نہ ہوتا۔ میری عزیز بہن ہم لوگوں کو اپنے بھائی پر کتنا ناز تھا، جب بھی پٹنہ آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو میں اختر صاحب سے کہتی کہ احتشام بھائی اتنے دنوں سے نہیں آئے ہیں ان کو جلدی سے بلوائیے لیکن میری پیاری بہن اب ہم لوگوں کی زندگی کا ایک بہت بڑا اور اہم حصّہ خالی ہو گیا ہے۔ اس خلا کو اب کوئی کبھی نہیں بھر سکے گا۔ خداوند کریم میرے پیارے بھائی کو اپنی رحمتوں برکتوں اور اپنے فضل و کرم کے سائے میں جگہ دے۔ آمین۔ اور آپ سب لوگوں کو اپنی حفاظت میں رکھے اور صبر جمیل عطا فرمائے۔

میری بہن میرا دل اتنا بےچین ہے کہ جی چاہ رہا ہے کہ آپ سے آ کر ملوں لیکن میں بہت مجبور ہوں اختر صاحب تین سالوں سے بیمار ہیں۔ اس خبر نے ان کو اور بھی بدحواس بنا دیا ہے افسوس کہ ان کو اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی ہوں۔

میری عزیز بہن میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے میں آپ کو صبر کی تلقین کروں۔ آپ لوگوں پر تو قیامت آ گئی ہے۔ بس اللہ تعالیٰ ہی کا دامن تھامئے اسی عظیم خدا کی ذات ایسی ہے جس کو موت نہیں آتی۔

پیاری بہن آپ کو علم ہو گا کہ اختر صاحب سے بھائی صاحب کے تعلقات کتنے گہرے تھے۔ اب تو اختر صاحب کو کچھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ان کی ساری طاقت ختم ہو گئی ہے۔

میرے سارے دکھوں میں میرا بھائی کتنا شریک تھا یہ میں آپ کو کیسے بتاؤں لیکن اپنی جدائی کے اس شدید غم و الم میں اس وقت وہ ہم سے کتنا دور ہے۔

میری بہن اپنے بچوں کو میری طرف سے دعائیں کہہ دیجئے گا۔ اختر صاحب بے حد غمزدہ ہو رہے ہیں جب سے انھوں نے اس قیامت کی خبر سنی ہے۔ ان کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ وہ آپ کو سلام علیکم کہہ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ افسوس کہ ابھی ابھی لمبے امریکہ کے سفر سے واپس آیا ہوں تھکا ہوا ہوں اور غم سے چور ہوں۔ اس وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ میری دعائیں آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے ساتھ ہو۔ خدا حافظ والسلام۔

آپ کی غمزدہ بہن

شکیلہ اختر

(بیگم سید احتشام حسین صاحب کے نام)

عالیجناب صباح الدین عمر صاحب۔

(سکریٹری اردو اکیڈمی اتر پردیش)

۵۴۔ نیا گاؤں لکھنؤ۔

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء!

عزیزہ،

ابھی ابھی اس جاں کاہ حادثے کی اطلاع ملی۔ مجھے ذاتی طور سے جو صدمہ پہنچا ہے اس کا اظہار الفاظ میں نہیں کر پا رہا ہوں، نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آپ سے صبر کی کیسے تلقین کی جائے۔

صباح الدین عمر

(بیگم پروفیسر سید احتشام حسین کے نام)

عالیجناب سید شبیہ الحسن صاحب۔ نونہروی۔ (شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی۔)

۴؍دسمبر ۱۹۷۲ء۔

عزیزم!

جس حادثہ سے آپ دیگر پسماندگان اور ہم سب لوگ دوچار ہوئے ہیں اس پر صبر کرنے کی خدا توفیق دے ورنہ ہمت نہیں ہے۔

یسا ظلم ہے جس سے کبھی سابقہ نہیں ہوا تھا.
و مرحوم کہنے اور سمجھنے پر دل کسی صورت سے
ہے. لیکن خدا کی مشیت کے آگے سر جھکانے
ہ کار ہی کیا ہے. مجھے یقین ہے اور دعا کرتا
ت اور مکمل استقلال کے ساتھ آپ بہت
بہت کا مقابلہ کریں گے۔
ملنے کے بعد تدفین میں شرکت کے لئے الٰہ آباد
مگر پروگرام کی اطلاع رات میں اتنی تاخیر سے
ہو سکا۔ اب کسی اور دن حاضر ہوں گا۔ آپ
بہنوں کو خوب اچھی طرح تسکین دیجئے اور
صاحبہ کی خدمت میں میری جانب سے تعزیت
یئے۔

شریکِ غم
سبط الحسن نونہروی

جعفر عباس صاحب کے نام)
صاحب۔ ایڈوکیٹ۔ (بدری ناتھ
لکھنؤ۔ ۳۱ دسمبر ۷۲ء

محمود میاں۔ دعائیں لو!
یب نے پرسوں صبح کو وہ خبر سنی جس کے لئے
نہ تھا۔ جو کچھ گزر گئی دل جانتا ہے۔ کل صبح تک
نتظار رہا۔ ایک مرتبہ اور نہ دیکھ سکا۔ معلوم ہوا
گے۔ یہ بھی ہم ہی لوگوں کی بدنصیبی تھی۔ بقول
ا کر نون پر پتہ لگا کے سوم میں چلیں گے۔ آج
ون نے بتایا کہ آج ہی سیوم ہے اور وہ نہ جا
ے دل میں یہ بھی حسرت رہ گئی کہ نہ پہنچ سکا۔
ہ کہنا ہے کہ میری طرف سے محمد میاں سلمٰہٗ عون
قبال سلمٰہ نیز بچیوں کو گلے لگا کے آنسو بہا لو۔
ا کیا حال ہے۔ طبیعت بہت پریشان ہے اور
دعا گو۔ مرزا جعفر حسین۔
سید محمود الحسن صاحب کے نام)

عالیجناب ڈاکٹر ورجیشور ورما صاحب۔ (ڈائرکٹر سنٹرل انسٹیٹیوٹ آف ہندی۔ آگرہ۔

نمبر ۲/۷۲/۰۲-۱۔
مورخہ ۴ دسمبر ۷۲ء

محترمہ بیگم حسین صاحبہ

مجھ کو ڈاکٹر احتشام حسین کے مرنے کی اندوہناک خبر سُن کر افسوس ہوا۔ مرحوم میرے گہرے دوست تھے اور ایک وقت میں یونیورسٹی میں میرے ساتھی رہ چکے تھے۔ اس خبر نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو سخت دھکا پہنچایا۔ وہ ذاتی حیثیت سے بھی نیز اردو کے بڑے ادیب ہونے کی حیثیت سے ہم لوگوں سے بیحد قریب تھے۔ ڈاکٹر حسین کی گہری علمیت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ان کی عظمت صرف اردو زبان و ادب تک محدود نہیں تھی۔ وہ اپنے تبحرِ علمی اور اپنی قابلیت سے سامعین کو ہمیشہ متاثر کر لیتے تھے۔ ہر دل عزیز اور کامیاب استاد، ادیب اور ناقد ہونے کے علاوہ بیحد شریف نیک نفس، تصنع سے پاک اور روشن ضمیر انسان تھے۔ ان کے اٹھ جانے سے یقیناً ہم سب غریب ہو گئے ہیں۔ مجھے بیحد شک ہے کہ ڈاکٹر احتشام حسین کے بغیر الٰہ آباد یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اس مرتبہ پر برقرار رہ سکے گا جہاں پر تھا۔ ہم لوگ جو اس ادارہ میں کام کر رہے ہیں، اردو سے مخصوص رابطہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر حسین ہم لوگوں سے محض اس لئے قریب نہیں تھے کہ وہ اردو کے بہت بڑے عالم تھے، بلکہ اس لئے بھی کہ انھوں نے اس سیمینار کے بعد جو کچھ دنوں پہلے ادارہ میں منعقد ہوا تھا۔ ہم لوگوں پر اپنے گہرے تفکر اور علمی ذخیرہ سے بیحد متاثر کیا تھا۔ انھیں چیزوں نے ڈاکٹر حسین اور ہمارے درمیان ایک رابطہ قائم کرایا تھا۔

آپ کو اپنے شوہر کی جدائی سے جو ذاتی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اس تکلیف کو ہم لوگ بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ میرے رفقائے کار آپ کی خدمت میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے دوستوں کے لئے نیز آپ کے اعزا کی خدمت میں میرے ساتھ

اشتراک کرتے ہوئے اپنی دلی ہمدردیاں پیش کرتے ہیں۔ خدا مرحوم کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

آپ کا مخلص

درجینشر رور ما

(بخدمت بیگم ڈاکٹر احتشام حسین الہ آباد)

عالی جناب سید محمد آغا حیدر حسن عابدی صاحب۔

امراوتی

اللہ باقی۔ باقی فانی

میاں جعفر سلمہ اللہ الاکبر!

بھائی صاحب کے انتقال کی خبر سنی لیکن پرسا ابھی تک نہ بھیج سکا۔ اس خیال سے کہ گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ یونیورسٹی کے پتے پر بھیجتا تو شاید تلف ہو جاتا۔ آج ۹ دسمبر کے سرفراز میں تمہارے تقرر کی خبر پڑھی۔ لہذا اسی پتے پر اسے روانہ کر رہا ہوں۔

شاید تم کو میں نے کئی بار لکھنؤ میں دیکھا ہے اور دو تین سال پہلے جون میں جبریل سلمہٗ کے ہمراہ الہ آباد میں ملنے آیا تھا۔ وہ یونیورسٹی جانے کے لئے تیار تھے۔ تھوڑی دیر گفت و شنید رہی اور ربت کا دور چلتا رہا۔ ممکن ہے اس وقت تمھیں بھی دیکھا ہو۔ وقت زرنے سے بچے جوان اور جوان بڈھے ہو جاتے ہیں۔

بہر حال میں نیا اور اجنبی نہیں ہوں۔ تمہارے والد مرحوم مدتوں سے (جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں آتے تھے) اچھے تعلقات اور خط و کتابت اکثر ہوتی رہتی تھی۔ میرے فرزند اکبر۔ آقا بدر۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔

قضا کا وار بہت ہی سخت ہوا اور دم کے دم میں مرحوم اپنے عقبیٰ میں پہنچ گئے۔ بظاہر کوئی شکایت تو نہ تھی۔ کیا کسی قسم پریشانی تھی۔ یا کوئی سخت صدمہ تھا۔ موت کے لئے تو کوئی نہ کوئی بہانہ مل جاتا ہے اور لوگ بے بس ہو جاتے ہیں۔

باپ کا سایہ تو اب نہ رہا۔ لیکن خداوند عالم کی عنایت و رحمت کا سایہ سر پر ضرور ہے۔ بددلی اور نا امیدی کو ہرگز ہرگز ہمت شکنی دو۔ وہی صبر دے گا۔ لیکن اس کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ یہی مرہم روزگار ہے۔

میری جانب سے بھاوج صاحبہ یعنی اپنی والدہ ماجدہ کو پرسا دینا اور چونکہ تم سب سے بڑے ہو لہذا چھوٹے بھائی بہنوں کو ہر طرح تسلی اور تشفی دو۔ تمہارا ملول چہرہ دیکھ کر وہ اور شکستہ دل ہو جائیں گے۔ ہمت سے کام لو اور قضائے الٰہی پر صابر و شاکر رہو۔ بگڑی بنانے والا وہی ہے۔ اس کی مصلحت وہی جانتا ہے۔ ممکن ہے یہ سانحہ مہمیز کا کام کرے اور تم خدمت علم و ادب میں وہ کار نمایاں کرو جس سے مرحوم کی شہرت میں چار چاند لگ جائیں۔ بڑی ذمہ داری تمہارے سر پر آ پڑی ہے۔ اللہ پاک کی ذات سے امید ہے کہ تم اسے بہت ہی عمدہ طریقہ سے سنبھالو گے۔

بھائی انصار تو لکھنؤ واپس چلے گئے ہوں گے۔ انھیں بھی لکھ رہا ہوں۔ ایک درخواست ہے۔ بہ شرط فرصت اور اس وقت جب کہ طبیعت پر ذراسی بھی گرانی نہ ہو، اپنے بھائی بہنوں کے پورے ناموں سے مطلع کرو اور لکھنؤ میں وہ کیا کر رہے ہیں۔ اور ان کی عمریں کیا ہیں۔

میں خود علیل ہوں ورنہ خود ہی الہ آباد آتا اور تم کو کلیجے سے لگا کر اپنے اور تمہارے دل کا بار ہلکا کرتا۔ پھر کسی بھی وقت اگر الہ آباد آنا ہوا تو حاضری دوں گا اور پرانی یادوں کو تازہ کروں گا۔

خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے اور تم سب کو صبر جمیل بخشے۔

آمین۔ شریک غم بے انتہا۔

سید محمد آغا حسن

(سید جعفر عباس صاحب کے نام)

کچھ تعزیتی تجاویز

ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی

محترمہ

ے اور میرے رفقاء کو آپ کے نامور شوہر کی ناوقت اور اندوہناک وفات کی خبر سنکر بیحد افسوس ہوا۔
نامور عالم اور بہت بڑے ادیب تھے۔ آپ کی اس مصیبت میں ہمہ دلی ہمدردیاں پیش کرتے ہیں۔

(ترجمہ) ڈاکٹر آر ایس۔ کیلکر
(قائم مقام سکریٹری)

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ یونیورسٹی

ن اردو سے متعلق شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ جلسہ پروفیسر سید احتشام حسین کے اچانک انتقال
نج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

فیسر سید احتشام حسین اس وقت اردو دنیا کی اہم ترین ہستیوں میں تھے وہ ادب تاریخ سماجیات فلسفہ
ور دیگر علوم کے ایک مستند عالم تھے۔ اردو زبان و ادب کو انھوں نے کئی پہلوؤں سے متاثر کیا۔ اردو میں
کے اصولوں کو سنجیدہ اور سائنسی طور پر برتنے میں انھیں اولیت حاصل ہے۔ احتشام صاحب نے اپنے
سے روایت اور بغاوت ادب اور سماج تنقید اور عملی تنقید عکس اور آئینے افکار و مسائل تنقیدی نظریات
؛ اردو ادب کی تاریخ ہندی میں سفرنامہ ساحل اور سمندر نیز متعدد علمی تصانیف کے تراجم اور ادبی
سائل پر تقاریر اور خطبات ان کی علمیت سنجیدہ فکر لہجے کی متانت اور شخصیت کے وزن و وقار کا ثبوت
ہیں۔

تام صاحب اردو کے ان چند ادیبوں میں سے تھے جن کا پوری اردو دنیا احترام بھی کرتی تھی اور محبت بھی
ان و ادب کے معلم کی حیثیت سے بھی بے مثال تھے۔ ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں اردو کے
پنے یہاں کسی نہ کسی حیثیت سے مدعو کرتے رہتے تھے اور ان کے علمی خیالات اور تعلیمی تجربوں سے استفادہ
لی گڑھ کے شعبہ اردو سے مرحوم کو خصوصی تعلق تھا اور اس کی ہر سرگرمی میں وہ شریک رہتے تھے۔
تذہ اور طلبہ سے فرداً فرداً وہ محبت و شفقت کا رشتہ رکھتے تھے۔
وفیسر احتشام حسین کے انتقال کو اردو زبان و ادب کے لئے ناقابل تلافی نقصان سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔
حوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی یاد میں تعزیتی جلسہ

بتاریخ ۲ دسمبر ۱۹۷۲ء بروز ہفتہ جامعہ کالج (جامعہ ملیہ اسلامیہ) دہلی کے اساتذہ اور طلبا کی جانب سے مرحوم پروفیسر احتشام حسین کی وفات حسرت آیات پر ایک تعزیتی جلسہ آرٹس فیکلٹی (جامعہ کالج) میں منعقد ہوا اسکی صدارت کے فرائض، ایکٹنگ پرنسپل جامعہ کالج اینڈ ڈین فیکلٹی آف آرٹس جناب مجیب رضوی نے انجام دیئے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی ایڈ ہیڈ شعبۂ اردو موصوف مرحوم کی خدمات زبان و ادب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اردو تنقید کو وسعت مطالعہ کے ساتھ ایک معتدلانہ مزاج ایک منصفانہ نقطۂ نظر اور ایک متوازن لب و لہجہ عطا کیا ـــــ مرحوم ایک بلند پایہ نقاد ادب ایک دیدہ ور ادیب اور ایک اعلیٰ درجہ کے استاد ادبیات ہونے کے علاوہ ایک بے حد شریف اور مخلص انسان تھے اُن کی علمی و ادبی خدمات کے ساتھ ان کی درویشی خوبی، عالی ظرفی، انکسار المزاجی اور خلوص خاطر جیسی انسانی صفات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

صاحب صدر نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا کہ پروفیسر مرحوم کی وفات علمی دنیا کا بڑا نقصان ہے اُن کی بے وقت اور اچانک موت سے صرف اردو ہی کو نہیں ملک کے مختلف علمی ادبی اور ثقافتی اداروں کو نقصان پہنچا ہے۔ احتشام صاحب مرحوم جیسے انسان کسی ایک زبان اور کسی ایک ادب کے نہیں بلکہ سب کے ہوتے ہیں اُن کی موت سے بے حد نقصان پہنچا ہے وہ بھی سب کا ہے ـــــ شعبہ اردو کے استاد جناب قیصر زیدی صاحب نے مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد پیش کی جس کی منظوری اور دعائے مغفرت کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

شعبۂ اردو۔ جامعہ کالج۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء آل انڈیا ریڈیو نے ایک نہایت الم ناک اور غم انگیز خبر نشر کی۔ سید احتشام حسین ماہلی پروفیسر اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی پر قلب کا دورہ پڑا اور وہ اس سے جانبر نہ ہو سکے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اردو زبان و ادب کا دلدادہ طبقہ یہ خبر سن کر رنج و الم میں ڈوب گیا۔ آج کرۂ ارض پر اردو بولنے اور سمجھنے والے بے شمار لوگ غم زدہ ہیں۔ ان میں سے سیکڑوں نے ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر ان کے علم کی گہرائیوں سے اور حسن اخلاق سے جمال سے اپنی زندگی کو منور پایا ہے اور ان کی خوش کلامی اور شیریں بیانی سے لطف اٹھائی ہے۔ ان کے علم کے پرتو سے خود علم کی مشعل جلائی ہے۔ اور ہزاروں نے انکے مطبوعہ، اور نشر شدہ مضامین سے خوشہ چینی کرکے خود کو وسادۂ علم و ادب پر پہونچایا ہے۔ آج یہ تمام کارواں غم و الم کے ہجوم کے باعث سرنگوں ہو رہا ہے اور انکے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ احتشام کا پیکر خاکی پیوند زمین ہو چکا۔ مٹی مٹی میں مل گئی مگر وہ احتشام جس نے اردو علم و ادب کو احتشام بخشا ہے زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ یہ احتشام بھی زندہ ہے اور حسین کی دین ہے وہ بھی زندہ رہے گا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا یہ غم زدہ حلقہ جس میں شعبہ اردو کے اراکین کے علاوہ اور عاشقان ادب بھی شامل ہیں بارگاہ عز و جل میں دعا کرتا ہے کہ مرنے والے کو اس کی نیکیوں کا اجر عطا ہو اور غم زدوں کو صبر کی

توفیق بھی عطا ہو کہ مرنے والے کو یاد رکھتے ہوئے اردو علم و ادب کی تعمیری خدمت کا مقدس فریضہ بھی
رہے۔

منجانب شعبہ اردو
جامعہ کالج۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

قرارداد تعزیت

(مولانا آزاد کالج اورنگ آباد)

ولانا آزاد کالج آف آرٹس کالج اینڈ کامرس اور مراٹھواڑہ کالج آف ایجوکیشن اورنگ آباد کے طلباء اور
کا یہ مشترکہ جلسہ، اردو کے نامور اور بے باک نقاد اور الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر سید احتشام حسین
سانحہ ارتحال پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت
مقام سے سرفراز فرمائے اور پسماندگان کو جن میں مرحوم کی والدہ محترمہ، اہلیہ اور پسران اور دختران ہیں
توفیق عطا فرمائے۔

اردو مجلس حیدرآباد قرارداد تعزیت

ردو مجلس کا یہ خصوصی اجلاس، اردو زبان کے صف اول کے ممتاز و منفرد ترقی پسند ادیب و نقاد پروفیسر
م حسین صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔
روفیسر سید احتشام حسین کی بے وقت موت نے شعر و ادب کی محفل میں ایک ایسی مستقل سوگوار فضا پیدا کر دی
کے اثرات اردو والوں کے دل و دماغ میں ایک عرصہ تک مسلط رہیں گے۔ خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت
ملا فرمائے۔ آمین۔

۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء

پیش کردہ از صلاح الدین صاحب

حلقہ اردو مجلس

رضا پوسٹ گریجویٹ کالج۔ رامپور، یوپی

رمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور کے پرنسپل اساتذہ اور طلباء کا یہ جلسہ ملک کے مایہ ناز ادیب
د، اور شاعر پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد کے ارتحال پر ملال
دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کے انتقال کو علم و ادب کے لئے ناقابل تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔
حتشام حسین مرحوم نے اپنے ۴۴ سالہ دور درس و تدریس میں ہمارے مقدس وطن ہندوستان و بیز
رمیں اپنا جو علمی مقام متعین کرالیا تھا وہ ہم سب کے لئے قابل فخر ہے، مرحوم ایک عظیم محب وطن اور
خلوص و یگانگت کا پیکر تھے۔
ری دعا ہے کہ خداوند عالم مرحوم کی روح کو سکون عنایت فرمائے اور پسماندگان کو صبر کرامت کرے۔

طے پایا کہ اس تجویز کی نقول بیگم احتشام حسین اور مقامی اور بیرونی اخباروں کو روانہ کی جائیں۔

بیگم احتشام حسین نمبر ۱ نور اللہ روڈ گڑھیا تالاب الٰہ آباد ۳

بی، وی، بی کالج۔ بیدر، (میسور)

پروفیسر احتشام حسین کی اندوہناک وفات پر بی، وی، بھومارڈی کالج، بیدر کے پرنسپل، اسٹاف کے ممبران اور طلباء اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم بہت بڑے اردو ادیب، نا قد اور شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے صدر تھے۔

ہم لوگ سوگوار خاندان کی خدمت میں تعزیت ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

پرنسپل

بی، وی، بی کالج آف آرٹس اینڈ سائنس

بیدر (میسور)

اردو اکیڈمی "منزل" ۱۸ ملز روڈ کالونی گلبرگہ ۲ (میسور اسٹیٹ)

قرارداد تعزیت

گلبرگہ (کرناٹک) کے اردو دوستوں کا یہ اجتماع، اردو کے صاحب طرز اور ممتاز نقاد، پروفیسر سید احتشام حسین کی بے وقت اور الم انگیز موت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین کا شمار اس صدی کے بلند ممتاز ترین نقادوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی رحلت اردو زبان و ادب کے لیے ایک نقصان عظیم ہے۔ اس کے ارتحال سے اردو ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے، جو مشکل ہی سے پر ہوگا۔

یہ جلسۂ عام دعاگو ہے کہ خدائے قدوس، مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے! (آمین)

حلقۂ ادب رانچی

(جناب ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب صدر اردو الٰہ آباد یونیورسٹی)

اردو ادب کے ایک عظیم اور معتبر نا قد پروفیسر احتشام حسین کے انتقال پر حلقۂ ادب رانچی کے زیر اہتمام بر وقت تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں شہر کے ممتاز و معروف ادباء و شعراء نے خاص بڑی تعداد میں شرکت کی اور پروفیسر مرحوم کے انتقال پر اپنے شدید رنج و غم میں ڈوبے ہوئے تاثرات کا اظہار کیا اس موقعہ پر حلقۂ ادب جناب ابوذر عثمانی لکچرار شعبۂ اردو رانچی کالج، رانچی یونیورسٹی نے مندرجہ ذیل تحریر پڑھ کر سنائی۔

پروفیسر احتشام حسین کا انتقال اردو دنیا کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کے انتقال سے اردو کا ایک اہم اور مضبوط ستون گر گیا ہے۔ مرحوم بلاشبہ اردو ادب کی ایک قد آور شخصیت تھے جن کے

فکار کوئی چوتھائی صدی تک ہمارے ادب پر پوری شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتے رہے۔
بد کے ایک اسکول کے علمبردار اور معمار کی حیثیت سے ان کی جگہ ہماری ادبی تاریخ میں قطعی طور
ئی ہے۔
دم کی شخصیت کا ایک امتیازی وصف ان کے فکر و نظر کی وحدت اور استواری تھی جس کی مثال اردو
یہاں بہت ہی کمیاب ہے۔
ڑی بات ہے کہ مرحوم کا ذہن اخیر اخیر تک متحرک اور بیدار رہا اور ان کے روشن، بیباک
سند خیالات اردو ادب کو برابر زندگی، توانائی اور تب و تاب عطا کرتے رہے۔
م کی شخصیت اور مزاج میں علمی وقار اور عظمت کے ساتھ وہ بے مثال سادگی اور شرافت تھی جس نے
حلقوں میں انہیں یکساں طور پر محبوب اور مقبول بنا رکھا تھا۔
م نے تنقید کے علاوہ دوسرے شعبہ ہائے ادب میں بھی اپنی شخصیت اور مطالعہ کے گہرے اور لازوال
یے، ضرورت ہے کہ ان کی شخصیت، خدمات اور کارناموں کے تمام ہی پہلوؤں کا بھرپور اعتراف

م کے انتقال سے یقیناً اردو ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو اب شاید عرصہ تک
لے گا۔
راکین حلقہ ادب مرحوم کے انتقال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے
فالی مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلم پرویز
ناظم حلقۂ ادب رانچی

اردو سوسائٹی، پٹنہ

محترمی تسلیم!
، احتشام حسین صاحب کے اچانک انتقال کی خبر سے اراکین اردو سوسائٹی کو جو صدمہ ہوا وہ بیان
حتشام صاحب کو کھو کر ہم اردو والوں نے اپنا ایک محسن و ہمدرد کھو دیا۔
ی دعا ہے کہ وہ احتشام صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر کی طاقت
مین)
کے پسماندگان تک میرا یہ پیغام پہنچا دیں گے، (شکریہ)

شریک غم!
اعجاز حسین زاہد
(معتمد) اردو سوسائٹی پٹنہ-۴

گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول بانہال (کشمیر)

تعزیتی قرارداد

ہم مدرسین وطلباء گورنمنٹ ہائر سکنڈری سکول بانہال اردو کے مشہور مصنف۔ نقاد اور ماہر لسانیات جناب سید احتشام حسین صاحب صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی بے وقت رحلت پر اظہار تعزیت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالےٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جاگزیں فرمائے۔ اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین"

مدرسین وطلباء گورنمنٹ ہائر
سکینڈری سکول بانہال

گورنمنٹ انٹر کالج۔ رائے بریلی

آج بتاریخ ۲ دسمبر ۱۹۷۲ء گورنمنٹ انٹر کالج رائے بریلی کے طلبا اور اساتذہ کا ایک جلسہ زیر صدارت پرنسپل ایس۔ پی۔ سیکسنہ کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے سانحہ انتقال پر اظہار رنج وغم کیا گیا اور تعزیت کی قرارداد منظور ہوئی۔

گورنمنٹ انٹر کالج، رائے بریلی کے طلباء اور اساتذہ کا یہ جلسہ ہند و پاک کے عظیم ترین نقاد اور ادیب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے سانحہ انتقال پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی موت کو اردو ادب کے لئے ناقابل تلافی نقصان قرار دیتا ہے اور مرحوم کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی، اور دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔ اور دعا کرتا ہے کہ خلاق عالم مرحوم کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

انجمن ترقی اُردو۔ بریلی کالج بریلی

کا جلسہ تعزیت اُردو کے نامور ادیب ومعتبر ناقد پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے انتقال پر ملال پر اظہار کرتا ہے۔ اور دست بدعا ہے کہ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔
ساتھ ہی متعلقین اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

سعید خاں۔
سکریٹری بریلی کالج۔ بریلی

اینگلو اردو ہائی اسکول۔ جلگاؤں

آج بتاریخ ۴ دسمبر ۱۹۷۲ء اینگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں میں پروفیسر سید احتشام حسین کے بے وقت سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت جناب اے۔ یو۔ سید ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول ہذا منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس کا متن حسب ذیل ہے۔

اساتذہ، طلبہ وطالبات انیگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں اردو کے مشہور نقّاد، ادیب، مفکر اور ماہر لسانیات
پروفیسر احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے ناگہانی انتقال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں۔
انہوں نے اردو زبان، ادب اور تنقید کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکینگی۔ اُن کے
اٹھ جانے کی وجہ سے اردو تنقید میں ایسا خلاء پیدا ہوا ہے جو شاید کبھی پُر ہو سکے۔
ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق
(آمین)

شرکائے غم

اساتذہ، طلبہ وطالبات انیگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں

منجانب یونین، وبزم ادب۔ مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج۔ الہ آباد

دریائے علم وادب کے بہترین شناور پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کی یاد میں "یادِ احتشام" کا انعقاد
صدارت پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری بتاریخ ۲۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء بروز چہارشنبہ بوقت ۳ بجے
مجیدیہ اسلامیہ کالج ہال میں ہو رہا ہے۔ ... آپ سے شرکت کی درخواست ہے۔
صدر محترم کی تقریر کا موضوع "اردو کیا ہے؟ اور پروفیسر احتشام حسین مرحوم صف اول کے
حیثیت سے"

پروگرام:- ۱۔ تقاریر ۳ بجے سہ پہر سے ۴½ بجے شام تک
۲۔ منظوم گلہائے عقیدت ۴½ بجے سے ۵½ بجے شام تک

منجانب ۔ اراکین یونین و بزم ادب
مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج۔ الہ آباد ۔ ۳

شیروانی رورل انٹر کالج۔ صلاح پور۔ الہ آباد

شیروانی انٹر کالج، صلاح پور، الہ آباد کے اساتذہ اور طلباء نے بتاریخ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء ایک تجویز
پروفیسر احتشام حسین صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی ناوقت اور ناگہانی وفات پر اپنے دلی
کا اظہار کیا۔ اُن سب نے مرحوم کی روح کے لئے دعائے خیر کی سوگوار خاندان کی خدمت میں تعزیت

صادق حسین
(پرنسپل)

حمیدیہ گرلس انٹر کالج۔ الہ آباد

آپ کے محترم شوہر، مرحوم احتشام حسین کی افسوسناک اور اچانک وفات کی اندوہناک خبر جناب
روزنامہ ہمدم کے ذریعہ سنکر ہم سب کو سکتہ سا ہو گیا۔ ان کی وفات سے الہ آباد نے ایک بہت نمایاں اور

ہر دلعزیز شخصیت اور ایک ماہر تعلیمات کو کھو دیا۔

ہم سب آپ کے غم اور ناقابل تلافی نقصان میں شریک ہیں۔ اس کالج کے پرنسپل اساتذہ اور طلباء فوراً ہی جمع ہوئے اور ان کی افسوسناک وفات پر تعزیت کا اظہار کیا اور دعا کی ان کی روح کو مغفرت ملے اور غم زدہ خاندان والوں کے دل میں یہ قوت پیدا ہو کہ اس غم کو صبر کے ساتھ برداشت کر سکیں۔

(پرنسپل)

فاربس انٹر کالج۔ فیض آباد

۲ دسمبر ۷۲ء آج فاربس انٹر کالج فیض آباد میں ایک نشست اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر احتشام حسین صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر پر منعقد ہوئی اور درج ذیل تجویز اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔

"فاربس کالج فیض آباد کے اساتذہ و طلباء کی یہ نشست اردو کے مشہور و ممتاز نقاد، بے مثل ادیب اور یگانہ استاذ کی اچانک رحلت پر اپنے قلبی رنج و غم کا اظہار کرتی ہے اور مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں اپنے کو شریک سمجھتی ہے اور خدا سے دعا کرتی ہے کہ وہ مرحوم کی روح کو ابدی سکون و راحت عطا کرے۔"

بخدمت جناب بیگم مرحوم پروفیسر سید احتشام حسین صاحب

۱۔ نور اللہ روڈ۔ الہ آباد

انجمن انیس ادب بنارس

حکیم محمد جعفر روڈ، دالمنڈی، وارانسی

یکم دسمبر ۷۲ء "انجمن انیس ادب بنارس کا یہ ہنگامی اجلاس اردو کے عظیم نقاد پروفیسر احتشام حسین کی اس ناگہانی موت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے ـــــ اور اس سانحہ کو اردو دنیا کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔ احتشام صاحب نے جس تندہی اور لگن کے ساتھ اردو زبان اور ادب کی خدمات انجام دیں اور ان کے فیضان تربیت سے اہل قلم کی جو نئی نسل پیدا ہوئی اس کی بدولت انکا نام ہمارے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ انجمن مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا گو ہے اور پسماندگان کے غم میں برابر کی شریک ہے۔"

عالم سکریٹری۔

ایس، کے، بی، ایم انٹر کالج، دلدار نگر۔ غازی پور

یہ خبر بے قیاس غم و الم، حسرت و یاس کے ساتھ سنی گئی کہ عالیجناب احتشام حسین صاحب سربراہ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا سلسلہ حیات دفعتہً حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

موصوف علم و فن کے مسلم خضر راہ۔ صالح و صحت مند ذوق ادب کے حامل حیات انسانی کے مبصر اور فن تحقیق و

نقید کے نیّرِ درخشاں تھے۔ ان کی اس ناگہانی وفات حسرت آیات سے ارباب فکر و نظر ایسی تاریکی میں مبتلا ہو چکے ہیں جن سے ابھرنا دشوار اور ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پورا ہونا مستقبل قریب میں ناممکن سا نظر آتا ہے۔

ہم جملہ اساتذہ و طلباء اس سانحہ ہوش ربا و حادثۂ انتقال پر ملال سے سخت اندوہگیں ہیں اور بدرگاہ مجیب الدعوات دست بدعا ہیں کہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

تحویز کنندہ — شاہ نواز خاں — XII A
تائید کنندہ — حنیف خاں — XII A

تعزیتی جلسہ

یکم دسمبر ۷۲ء — ۵ بجے شام

انجمن اجملیہ کا یہ تعزیتی جلسہ ملک و ادب، تہذیب و تمدن کے عظیم رہنما پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی وفات حسرت آیات پر اظہار افسوس کرتا ہے جنھوں نے اپنے پرائے کی تخصیص کو مٹا کر اردو زبان و ادب کی ترقی اور اشاعت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا جنھوں نے اپنے عظیم کارنامو، اخلاص اور محبت سے ہر فرد کو علم و ادب کا بیش بہا خزانہ عطا کیا۔ جن کے ایثار و قربانی کی بدولت طلباء، طالبات ادبا اور شعراء کی جو حوصلہ افزائی ہوئی ہے وہ بجا طور پر قابل قدر ہے۔ ان کی اخلاقی تصویریں آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔

پروفیسر احتشام حسین علم و ادب کے ایک ایسے روشن چراغ تھے جس کی لو سے صدہا چراغ روشن ہو کر علم و ادب کی دنیا کو جگمگاتے رہیں گے یہ جلسہ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے ان کی اہلیہ ان کے خاندان کے جملہ افراد نیز ان کے مداحوں اور شاگردوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

یونیورسٹی لائبریری۔ الہ آباد

لائبریری اسٹاف کا یہ جلسہ پروفیسر سید احتشام حسین، یونیورسٹی کے آنریری لائبریرین کی اچانک اور نابوقت وفات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین مئی ــــــ میں آنریری لائبریرین مقرر ہوئے تھے۔ ان کی طبیعت محبت سے بھری تھی اور سارے عملہ سے وہ شفقت و ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ اُن سے لائبریری کے عملہ کے ہر فرد سے نہایت خوشگوار تعلقات تھے۔ ان کی مثال بزرگ خاندان کی طرح تھی جس تک بروقت رسائی ممکن تھی اور جو اسٹاف کی دشواریوں اور تکلیفوں کو سننے کے لئے بیحد ہمدردی کے ساتھ ہر وقت تیار رہتے تھے۔ انھوں نے عملہ کے حالات سدھارنے اور لائبریری کے کام کو بہتر بنانے کے لئے کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔

ان کی وفات سے نہ صرف لائبریری نے ایک بڑے عالم و فاضل بلکہ ایسے منتظم کو بھی کھو دیا جو کہ غیر معمولی شریف انسان تھا اور جس کا دل انسانی ہمدردیوں سے لبریز تھا۔ یہ جلسہ اُن کے سوگوار خاندان کے افراد کی خدمت

میں تعزیت پیش کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ ان کی روح کو مغفرت نصیب ہو۔

مسلم ہوسٹل۔ الہ آباد یونیورسٹی

مسلم ہوسٹل کے طلبا یکم دسمبر ۷۲ء کو مسجد کے سامنے جمع ہوئے اور انہوں نے پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم کی المناک موت پر اظہار غم و افسوس کرتے ہوئے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی۔ بعد نماز جمعہ مسجد میں بھی مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی تھی۔ تعزیتی ریزولیشن کی نقل حسب ذیل ہے۔

"اراکین و طلباء مسلم ہوسٹل الہ آباد یونیورسٹی پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم کی اچانک اور المناک موت پر اظہار غم و افسوس کرتے ہیں اور مرحوم کی پاک روح کو اطمینان و سکون اور ان کی مغفرت کے لئے درگاہ رب العزت میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ خداوند کریم اُن کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین"

منجانب اراکین و طلباء
مسلم ہوسٹل الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد

ادباء شعراء۔ فتح پور

فتح پور یکم دسمبر ۷۲ء ۸ بجے شب۔ اہل قلم حضرات کا ایک جلسہ بر مکان قمر صدیقی زیر صدارت جناب گا لکھنوی منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے نامور ادیب و نقاد پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے ناگہانی سانحہ ارتحال پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور ان کی ادبی خدمات کا موثر پیرایہ میں ذکر کیا گیا جس میں معززین شہر کے علاوہ مندرجہ ذیل اہل قلم حضرات کے نام قابل ذکر ہیں۔ جناب مست فتح پوری جناب وحید مبین جناب بیتاب بیلی بھیتی جناب طاہر فتح پوری جناب اخلاق فتح پوری جناب اعظم فتح پوری جناب کلیم اللہ حامد جناب محمد ثاقب جناب قمر صدیقی جناب ظفر اقبال جناب سعید الظفر جناب جاوید اقبال جناب نسیم احمد جناب محمد ذکی جناب اے۔ رحمان وغیرہ . . . .

حسب ذیل قرارداد پاس کی گئی اور یہ بھی طے کیا گیا کہ اس کی نقل اُردو اخبارات کو اور ایک مرحوم کے صاحبزادے جناب جعفر عسکری کی خدمت میں روانہ کر دی جائے۔

"شہر فتح پور کے ادباء و شعراء کا یہ جلسہ پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کے ناگہانی سانحۂ ارتحال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اس بات کا خاص طور سے افسوس و غم منا رہا ہے کہ اردو ادب کا یہ روشن آفتاب یکایک غروب ہو گیا اور ہمارے دل میں ایک نہ مٹنے والا غم ہو گیا۔ بارگاہ ایزدی میں یہ دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمت کاملہ سے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)"

منجانب:
ظہیر قاسم رضوی

جعفر لائبریری کے مبارکپور جلسۂ تعزیت کی قرارداد

جعفر لائبریری کا یہ غیر معمولی جلسہ ہندوستان کے مشہور نقاد و مصنف ماہر لسانیات اور اردو کے مایہ ناز ادیب و شاعر پروفیسر سید احتشام حسین سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی ناگہانی وفات پر اظہار تعزیت کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔

احتشام مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر جو دلی صدمہ پہنچا وہ ناقابل بیان ہے، مرحوم اردو زبان کے عظیم محسن تھے، انھوں نے تصنیفات اور تنقیدوں کے ذریعہ اردو کو مالا مال کیا، اسے سنوارا کہ اس کے حسن سے چشم زمانہ حیرت زدہ رہ گئی انھوں نے آغاز جوانی سے تادم مرگ اردو کی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، افسوس کہ بہت جلد موت کے بے رحم ہاتھوں نے مرحوم کو ہم سے چھین لیا، مرحوم کی موت سے دنیائے اردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے وہ بہت عرصہ تک پورا نہیں ہو سکتا۔

جعفر لائبریری مرحوم کے پسماندگان اور متعلقین کی خدمت میں صبر کی تلقین کرتی ہے اور ارکان لائبریری دعا گو ہیں کہ مرحوم کو وحدہ لاشریک کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

یونین بینک آف انڈیا۔ الہ آباد

یونین بینک آف انڈیا، شاخ الہ آباد کے اسٹاف کے تمام ممبران آپ کے شوہر سید احتشام حسین کے اچانک انتقال پر اپنے گہرے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے آپ اور آپ کے دوسرے اعزاء کی خدمت میں دلی ہمدردیاں پیش کرتے ہیں۔

ہم سب درگاہ باری میں دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کی روح کی مغفرت ہو اور آپ سب کے دلوں میں اس ناقابل تلافی نقصان کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو۔

پروفیسر احتشام حسین کو چیف منسٹر مسٹر پی وی نرسمہا راؤ کا خراج عقیدت

حیدرآباد۔ چیف منسٹر آندھرا پردیش مسٹر پی وی نرسمہا راؤ نے پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے انتقال پر پیام تعزیت جاری کیا ہے۔ چیف منسٹر نے اس پیام میں کہا ہے کہ پروفیسر احتشام حسین کے انتقال کی خبر نے مجھے سخت دکھ پہنچایا ہے۔ وہ مشہور نقاد مضمون نگار اور زبان اردو کے ماہر تھے۔ ان کی موت نے ہندوستانی اور خاص طور پر اردو ادب کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ پسماندگان کو میں دلی ہمدردیاں پیش کرتا ہوں۔ خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔

"برگ آوارہ" ۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء

محسن بھوپالی

سلسلہ روز و شب

(پروفیسر احتشام حسین کے تعزیتی جلسہ کا رپورتاژ)

۵ردسمبر کی شام ہے۔ پونے چھ بج رہے ہیں غالب لائبریری کے احاطے میں حاضرین کی خاصی تعداد موجود ہے۔ جن میں شہر کے ممتاز ادیب، نقادانِ فن اور طالبانِ علم بھی شامل ہیں۔ فضا میں سوگواری چھائی ہوئی ہے۔ ادارۂ یادگارِ غالب، انجمن ترقی اردو پاکستان، رائٹرز گلڈ، ترقی اردو، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ اربابِ ذوق کے زیرِ اہتمام مشترک طور پر، حال ہی میں ہم سے جدا ہونے والے اردو کے عظیم اور منفرد نقاد پروفیسر احتشام حسین کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے تعزیتی اجلاس منعقد کیا گیا ہے۔

مجنوں گورکھپوری کی صدارت میں سحر انصاری نے جلسے کی کارروائی کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر حنیف فوق کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی ہے۔ فوق صاحب فرما رہے ہیں احتشام صاحب بڑے شفیق استاد، جید نقاد اور خلوص و شرافت کے پیکر تھے۔ وہ انکسار و مروت کا نمونہ تھے۔ چھوٹوں سے شفقت کرتے تھے اور ہمعصروں کا احترام۔ وہ کسی کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہیں پہنچاتے تھے اور نہ ہی یہ بات اپنے لئے پسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے کہا کہ خواجہ غلام السیدین آپ سے ملنا چاہتے ہیں اس پر احتشام صاحب نے ان صاحب سے کہا کہ "آپ اُن سے برابری کا تعارف کرائیں۔ یوں یوں نہیں کہ یہ احتشام حسین ہیں۔ بلکہ ان کا بھی تعارف کرائیں کہ یہ خواجہ غلام السیدین ہیں"۔ احتشام صاحب زندگی میں بے حد روایت پرست تھے لیکن ادب میں روایت شکن تھے۔ جب وہ امریکہ گئے تو اُن کے بہت سے احباب نے یہ سوچا کہ احتشام صاحب مغرب کی رنگینی سے متاثر ہو جائیں گے اور اُس کے چکا چوند کر دینے والے معاشرے کو دیکھ کر ممکن ہے اُن کے اندازِ نظر میں تبدیلی آ جائے لیکن سب نے دیکھا کہ اُنھوں نے لوٹ کر ایک سفرنامہ "ساحل اور سمندر" لکھا جس میں کوئی رجعت پسندی نہیں تھی بلکہ وہ اپنے نظریے پر زیادہ مستحکم طریقے پر کاربند نظر آتے ہیں۔ احتشام صاحب کا انتقال نہ صرف یہ کہ ادبی سانحہ ہے بلکہ تہذیبی سانحہ بھی ہے۔

فوق صاحب کے بعد مجاور حسین تبسم کو اُن کی فرمائش پر بلایا گیا۔ وہ بتا رہے ہیں کہ جب اُنھوں نے گزشتہ جمعہ کو ریڈیو پر احتشام صاحب کے انتقال کی خبر سُنی تو اہلِ خاندان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ احتشام صاحب اُن کے ماموں تھے۔ غم و اندوہ کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ بچپن کا ایک گھریلو واقعہ سُنا رہے ہیں

ین کوئی ۹ برس کا تھا احتشام صاحب کے تین بیٹوں عون ، محمد ، ارشد اور ایک بیٹی سعیدہ کے ساتھ میں اکثر کھیلتا تھا۔ سب سے چھوٹے ارشد ۵ سال کے تھے۔ ایک دن ارشد باورچی خانے سے جیسے ہی باہر آیا ماموں نے دیکھا کہ اُس کے گال پر سیاہی لگی ہوئی ہے۔ اُنھوں نے بڑی محبت سے کہا ارشد بیٹے آئینہ لائیے۔ وہ آئینہ لے آیا تو کہنے لگے ذرا اپنا چہرہ دیکھو۔ اب جو ارشد نے دیکھا کہ سیاہی لگی ہوئی ہے تو بے حد شرمندہ ہوا اور فوراً غسل خانے کی طرف بھاگ گیا۔ مجھے اُن کی نکتہ چینی اور تربیت کے اس انداز نے بے حد متاثر کیا۔

تبسم صاحب کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو زحمت دی گئی۔ نہایت درد بھرے لہجے میں کہہ رہے ہیں کہ افسوس احتشام صاحب ہمیں ۶۰ برس کی عمر میں چھوڑ گئے۔ وہ عمر میں صاحب صدر مجنوں گورکھپوری سے چھوٹے تھے۔ اُنھوں نے شعر کہے ، افسانے لکھے لیکن تنقید میں اُنھیں سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ بہت سے لوگ احتشام صاحب کو اشتراکی نقاد کہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں نقاد صرف نقاد ہوتا ہے۔ وہ اشتراکی ، نفسیاتی یا جمالیاتی نقاد نہیں ہوتا۔ جو ادیب زبان کے علم کو ادب سے علیحدہ کرکے سمجھتا ہے وہ تنقید کا حق ادا نہیں کرتا۔ ادب میں اُن کی قریب کی نظر کمزور تھی اور نہ دُور کی۔ احتشام صاحب کی تنقید میں مارکس ، اینگلز ، سقراط وغیرہ کے حوالے نہیں ملتے لیکن اُن کی تنقید کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ان سب ہستیوں کو پڑھا ہے نتیجۃً اُن کی تحریروں میں آپ کو بہت کم حوالے نظر آئیں گے۔

سحر انصاری نے مجتبیٰ حسین کو تاثرات کے اظہار کے لئے اس درخواست کے ساتھ بلایا ہے "ہر چند ہم باقاعدہ دعوت نامہ جاری نہیں کر سکے۔ مجتبیٰ صاحب سے رابطہ بھی قائم نہیں ہو سکا۔ بہر حال یہ تعزیتی اجلاس ہے۔ اُمید ہے کہ وہ اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں گے۔ مجتبیٰ صاحب فرما رہے ہیں مجھے احتشام صاحب کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنا ہی چاہیئے۔ میری اُن سے صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجسمۂ شرافت اور پیکرِ خلوص نظر آئے۔ اُن کی تنقید آدمی کی بزرگی اور ادب کی بزرگی کی تصدیق کرتی ہے۔ اُن کی تنقید زمین سے پھوٹی ہے اور ایک تناور درخت کی حیثیت رکھتی ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوطی سے پیوست ہیں اور جس کے سائے میں جدید ترقی پسند تنقید اُبھری ہے اور پروان چڑھی ہے۔ بس مجھے یہی کہنا ہے۔

اُن کے بعد ڈاکٹر احسن فاروقی سے درخواست کی گئی ــــ وہ اس طرح گویا ہیں۔ ہم دونوں لکھنؤ یونیورسٹی میں تقریباً دس برس ساتھ رہے۔ وہ اچھے شاعر اور افسانہ نگار تھے لیکن تنقید میں اُنھیں ترقی پسند انجمن اور ترقی پسندی لے ڈوبی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی وجہ سے وہ ایک خاص قسم کی تنقید کرتے رہے۔ اُنھوں نے ایک مرتبہ جب لکھنؤ یونیورسٹی میں اسٹیفن اسپنڈر آئے تھے تو ایک غزل سُنائی تھی اُس کا ایک شعر اب تک یاد ہے ؎

کل تو خیر اُن کی یاد آئی تھی
آج کیوں ہے طبیعت اُداس اُداس

ڈاکٹر صاحب اُکھڑے اُکھڑے انداز میں بات کر رہے ہیں اور حاضرین بے چینی سے پہلو بدل رہے ہیں۔ انکشاف کر رہے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب کا نام "قریب نظر" رکھا تو احتشام صاحب نے اپنی کتاب کا نام "اعتبارِ نظر" رکھا۔ غزل میں معشوقِ حقیقی اُستاد ہوتا ہے اس

ر جب طلبا غزل پڑھتے ہیں تو اُن کا معشوق
د ہوتا ہے۔ احتشام صاحب بھی معشوقِ حقیقی
لیکن اشتراکی تنقید کی وجہ سے وہ محدود ہو کر
ے تھے۔ جوں توں تعزیت ختم ہوئی ہے۔

ممتاز حسین صاحب اپنے جذبات کا اظہار
طرح کر رہے ہیں۔ یہ تعزیتی اجلاس ہے۔ یہ
ت مناسب نہیں کہ احتشام صاحب کے کام، ترقی پسند
یک اور ترقی پسندی پر تنقیدی نظر ڈالی جائے اور
لاتی بحث چھیڑی جائے۔ میرا اُن کا ساتھ ۴ سال
رہا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ترقی پسند تحریک
ے شباب پر تھی۔ احتشام حسین کا کہنا تھا کہ ترقی پسند
ب ہمارے ادب کا جزو ہے اور یہ اُس ادب کا
وہ ہے جو حالی اور سرسید نے ہمیں دیا ہے۔ روایت
ت دریا ہے جس میں درایت اور جدّت کے دھارے
ل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کا مضمون روایت
. درایت جو اُن کے مجموعۂ مضامین "روایت اور
وت" میں ہے نہایت مدلل اور بھرپور ہے۔ ممتاز
حب نہایت روانی سے صاف صاف کہہ رہے ہیں
ب تک نئے خیالات کے دھارے نہیں پھوٹتے
گی میں قوت نہیں آتی۔ حالی کی تنقید کے بعد ہی
ب میں سماجی شعور پیدا ہوا۔

ترقی پسندی اور سماجی شعور کا مذاق اُڑانا
ت آسان بات ہے۔ لیکن تاریخ فیصلہ کرے گی
دن کس پر ہنستا ہے۔ تنقید کے بہت سے نظریے ہیں
ین احتشام حسین تنقید کو زندگی کے وسیلے سے
شے کے پابند ہیں۔ ہم کسی انوکھے معاشرے میں
ہیں ہیں جہاں کہ سارے لوگ ایک طرح سوچتے
ں، ایک ہی طرح سمجھتے ہوں، ایک ہی طرح لکھتے
ں۔ اور ایک سی اُمنگیں رکھتے ہوں۔ ہم کچھ چاہتے

ہیں۔ دوسرے کچھ چاہتے ہیں۔ ہماری تمنائیں اور
آرزوئیں بٹی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی تحریک سے وابستہ ہے
تو کوئی بُری بات نہیں ہے۔ ادب میں جانبداری
بُری بات نہیں ہے اگر وہ مثبت اقدار کی نشوونما کے
لئے ہو۔ علامہ اقبال خود جانبدار تھے۔ وہ اپنے
نظریے اور خیالات کا پرچار کرتے رہے اور زندگی بھر
ملّائیت کے خلاف رہے۔ بودلیئر فرانسیسی شاعر جس
کا نام جمالیاتی ادب و تنقید میں سرِ فہرست ہے خود
کہتا ہے :-

"Criticism is partisan
and passionate."

احتشام حسین Committed Literature
کے حامی تھے۔ وہ اشتراکیت کو معاشرے کے لئے
ضروری سمجھتے تھے اسی لئے اُن کی تنقید مارکس اینڈ
اینگلز کے فلسفے سے ہم آہنگ ہے۔ میں صرف خراجِ عقیدت
پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہاں کچھ باتیں کہی گئی
ہیں جن کی تردید ضروری تھی۔ یہ موقع نہیں ہے کہ
اُن کے حوالے سے حملے کئے جائیں۔ آیندہ صحبتیں رہیں
گی۔ ہم مواقع فراہم کریں گے۔

مجمع کا سکوت ٹوٹ چکا ہے۔ داد و تحسین کی صدائیں
بلند ہو رہی ہیں۔ سحر انصاری اعلان کر رہے ہیں کہ اب
صدرِ جلسہ حضرت مجنوں گورکھپوری اپنے تاثرات
بیان فرمائیں گے۔ مجنوں صاحب گویا ہیں۔ جب مجھے
یہ خبر ملتی ہے کہ جب کوئی مجھ سے کم عمر والا اس دنیا
سے رُخصت ہو گیا تو مجھے اپنی ذات سے شرم آنے
لگتی ہے۔ وہ گلوگیر آواز میں کہہ رہے ہیں۔ جو میری
زندگی کے تھوڑے دن باقی تھے وہ اُس کو مل جاتے
وہ انہیں استعمال کرتا۔ ادب کے لئے یا کسی کارنامے
کے لئے۔ میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ اُن کی عمر کیا

میں اتنا جانتا تھا کہ سرور مجھ سے ۷ سال اور
م حسین اُن سے دو ڈھائی سال چھوٹے ہیں۔
کی مسجد سے اذان سے صدا بلند ہو رہی ہے۔
صاحب احتراماً خاموش ہو گئے۔ میرے قریب
ہوئے فوق صاحب، شوکت صدیقی کو مخاطب
ہوئے کہہ رہے ہیں۔ ادارہ یادگارِ غالب کی
ت بھی مسجد کے زیرِ سایہ بنائی گئی ہے۔

مجنوں صاحب پرانی یادوں کو دھوپ دکھا
ہیں۔ احتشام سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۳ء یا
ء میں ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر اعجاز حسین کے چہیتے
تھے اور اُن کے یہاں ہی رہتے تھے۔ میں الٰہ آباد
یا کرتا تھا اور دس پندرہ دن ٹھہرتا تھا۔ ظاہر
اں فراق کے یہاں قیام کرتا تھا۔ احتشام یونیورسٹی
بعد سے فراق کے گھر آتے تھے اور مجھ سے ملتے تھے
۱۹۶۵ء میں پاکستان آیا ہوں اُس وقت تک اُن
اقات ہوتی رہتی تھی۔ بعض اوقات میں نے دیکھا
جو کچھ گفتگو کرتا تھا وہ نوٹ کرتے جاتے تھے
بھی اُن کی اس حرکت کو نوٹ کرتا رہتا تھا (مجھے
پ پر ہنسی آئی کہ میں بھی اس وقت مجنوں صاحب
کو نوٹ کر رہا تھا) احتشام شعر بھی کہتے تھے اور
نے بھی لکھتے تھے۔ اُن کی غزلیں بڑی رومانی۔
رکر خشکی لئے ہوئے ہوتی تھیں۔ تنقید میں وہ عملی
لیقی تنقید پر کاربند رہے۔ میں جانتا ہوں کہ
قی پسند تھے اور ڈنکے کی چوٹ پر تھے۔ میں بھی
پسند رہا اور ہوں۔ دنیا کا کوئی آدمی ایسا نہیں
یہ کہے کہ میں آگے کی طرف جانا نہیں چاہتا۔ اگر
نقدمی نہیں کرتا تو وہ اپنے آپ کا دشمن ہے۔
ری حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کوئی روگردانی
سکتا۔ یہ دو قدم پیچھے اور ایک قدم آگے کا

جھگڑا نہیں ہے۔ ابن برشیق پر تو اعتراض نہیں ہے لیکن مارکس اور اینگلز کے لئے کیوں اعتراض ہے جب کوئی ادیب سقراط سے متأثر ہوتا ہے تو کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن جب وہ کارل مارکس اور لینن سے متأثر ہوتا ہے تو اُس پر الزام لگ جاتا ہے۔ یہ مقولہ بھی عربی ہی میں ہے کہ "یہ نہ دیکھو کس نے کہا یہ دیکھو کیا کہا۔" میں نے احتشام کے افسانے پڑھے جو بعد میں "ویرانے" کے نام سے شائع ہوئے۔ احتشام نے ان افسانوں میں رومانیت اور ترقی پسندی کو بڑے سلیقے سے سمویا ہے۔ رومانویت اپنے دور میں خود بھی انقلابی رہی ہے۔ ہندو پاک میں رومانی تحریک نے جنم ہی نہیں لیا لیکن مغربی ممالک میں رومانویت تحریک کے طور پر اُبھری تھی۔

ابھی ابھی ڈاکٹر احسن فاروقی نے احتشام کے مجموعے کا نام لیا تھا "اعتمادِ نظر" مجھے یاد ہے کہ اُن کے مجموعے کا نام "اعتبارِ نظر" ہے۔ احتشام بے انتہا مخلص تھا۔ پڑھتا تھا خلوص کے ساتھ جتنا ہضم کرتا تھا خلوص کے ساتھ، پیرایۂ اظہار میں لاتا تھا خلوص کے ساتھ۔ وہ اس سے مرعوب نہیں ہوتا تھا کہ یہ مارکس کا خیال ہے یا میتھیو آرنلڈ کا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس کی بنیاد پر ادب کو بھی تول سکتے ہیں۔ میری کوشش رہی ہے اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ جتنے میلانات ہوئے ہیں اُنھیں خلوص کے ساتھ اپنے ادب میں سمو لو۔ میں نے احتشام کو کبھی شدت کے ساتھ اختلاف کرتے نہیں دیکھا۔ اس کے برخلاف اُس کے یہاں نرمی تھی۔ وہ نرمی جسے کمزوری کہتے ہیں۔ تحمل سے کہنا، تحمل سے سننا اور تحمل سے ہضم کرنا بہت بڑا فن ہے۔ زندگی کا سلیقہ بھی ہے اور ادب کا سلیقہ بھی۔

میں احتشام کو اردو ادب میں ایک اہم منزل اور ایک اہم مقام سمجھتا ہوں۔ میں جب اُن کو نقاد کہتا ہوں

یری مراد جو [illegible] کہ وہ ادیب بھی ہیں۔ میرے
غ میں تنقید اور تخلیق کا بٹوارہ نہیں ہے۔ اگر
ید تخلیق نہ ہو تو خشک اور بیجان ہے۔ احتشام
ے استقلال سے ترقی پسندی کے راستے پر گامزن
۔ وہ کسی کو یکسر ناپسند نہیں کرتے تھے۔ اُن میں
لطل المیہ کی خصوصیات تھیں۔ ایک سنجیدہ اور
ان دوست شاعر اُن کے اندر تھا۔ وہی اعلیٰ انسانی
اصد کی لگن بن کر اُن کی تنقید میں نظر آتا ہے۔ مجھے
ن کے جدا ہونے کا دُکھ ہے۔ یہ بڑی رسمی بات ہے

لیکن مجھے واقعی دکھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ
رہتے تو ادب کو اور بہت کچھ دیتے۔ یہ کہہ کر مجنوں صاحب
اپنی نشست پر جا بیٹھے ہیں۔ سحر انصاری صاحب نے
مرزا ظفر الحسن معتمد ادارۂ یادگارِ غالب کو کلمۂ اختتامیہ
کے لئے زحمت دی ہے۔ مرزا صاحب فرما رہے ہیں کہ
ہم سب لوگ احتشام حسین کے واسطے یہاں جمع ہوئے
ہیں۔ اس لئے نہ تو میں مقررین کا شکریہ ادا کروں گا
اور ساتھ ہی حاضرین کا۔ یہ ہم سب کا فرض تھا جو ادا کیا۔

مطبوعات ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت)

کاغذ کی گرانی کے باعث یکم دسمبر ۱۹۷۳ء سے قیمتوں میں اضافہ کردیا گیا ہے۔

۱۔ انتخاب کلام چکبست لکھنوی — مولفہ نشتر ٹیپوری شاکر ۲/-
۲۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر — ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۵/-
۳۔ اردو نمبر فروغ اردو۔ اقبال صدیقی ۳/۵۰
۴۔ انوار اللغات اردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۴/-
۵۔ ادبی تاثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۵/-
۶۔ آئینہ عقل۔ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری ۴/۵۰
۷۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/۵۰
۸۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۳/۵۰
۹۔ انارکلی امتیاز علی تاج جدید ایڈیشن ۲/۲۵
۱۰۔ امراؤ جان ادا مرزا رسوا ۴/-
۱۱۔ اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ — پروفیسر کلیم الدین احمد ۷/۵۰
۱۲۔ اردو میں تنقید۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۴/-
۱۳۔ انتخاب قصائد اردو۔ مغیث الدین فریدی ۱/۵
۱۴۔ ادب اور نظریہ۔ آل احمد سرور ۷/-
۱۵۔ اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبدالشکور ۵/۵۰
۱۶۔ ادبی نقوش۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ۷/-
۱۷۔ اقبال۔ مرتبہ فروغ اردو -/۵۰
۱۸۔ اکبر الہ آبادی میری نظر میں۔ عبدالماجد دریابادی ۶/۵۰
۱۹۔ البرامکہ اور ان کا عروج، عروج و زوال — ڈاکٹر [illegible] حسین ایم اے ۲/-
۲۰۔ انتخاب کلام میر مع مقدمہ۔ ناظر اردو ۴/-
۲۱۔ انتخاب کلام غالب۔ [illegible] ۱/۵۰
۲۲۔ ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ۲/۵۰
۲۳۔ انتخاب قصائد و غزلیات۔ از فروغ اردو ۲/۵۰
۲۴۔ ادب کیا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۳/-
۲۵۔ ادبی خطوط غالب۔ مرزا محمد عسکری ۶/۵۰
۲۶۔ آئینہ نثر اردو۔ سعادت علی صدیقی ۳/۵۰
۲۷۔ ایک نادر روزنامچہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۲/۵۰
۲۸۔ ابوالخیر مجنوں گورکھپوری -/۳۷
۲۹۔ اردو کی کہانی سید احتشام حسین ۲/۰۰
۳۰۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر ۴/۷۵
۳۱۔ ابوالکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد -/۲۵
۳۲۔ ارمغان نثر و نظم عبدالاحد خاں خلیل ۳/۷۵
۳۳۔ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اردو ۱/۵۰
۳۴۔ اچھی نظمیں اخگر مشتاق -/۵۰
۳۵۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد — جدید ایڈیشن غلام احمد فرقت ۱۶/-
۳۶۔ اردو شاعری امیر احمد علوی ۲/۵۰
۳۷۔ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ ۱/۵۰
۳۸۔ غزلیات حافظ صائب۔ غالب فارسی ۲/۵۰
۳۹۔ اپنی پہچان پوری زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب — اعجاز احمد فاروقی ۱/۲۵
۴۰۔ اللہ کے پیارے۔ امیر حسن نورانی -/۵۰
۴۱۔ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اردو ۲/۵۰
۴۲۔ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی — عبدالماجد دریابادی ۱/۲۵
۴۳۔ اسپین کی شہزادی صادق سردھنوی ۴/۵۰
۴۴۔ [illegible] آوارہ [illegible]
۴۵۔ ادارے سے خط و کتابت۔ [illegible] [illegible]

۴۶۔ ایک جان تین قالب — خان محبوب طرزی — ۴/۵۰
۴۷۔ الفت — " — ۵/۵۰
۴۸۔ آغازِ سحر — " — ۴/-
۴۹۔ امین آباد — " — ۴/-
۵۰۔ انشائے خطوط نویسی حصہ اول۔ منیر احمد علوی — -/۳۰
۵۱۔ " حصہ دوم — -/۵۰
۵۲۔ ایجادوں کی باتیں۔ مصطفےٰ احسن رضوی — ۳/-
۵۳۔ اچھی کہانیاں (حصہ اول) شمس الدین نوری — -/۲۵
۵۴۔ " حصہ دوم — -/۲۵
۵۵ " حصہ چہارم " — -/۵۰
۵۶۔ ادب کا مقصد — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/۵۰
۵۷۔ اسلامی نظمیں — محمد حسین علوی شمس — -/۳۰
۵۸۔ اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں
عبدالماجد دریابادی — ۲/۲۵

(ب)

۵۹۔ بابائے اردو عبدالحق۔ عبداللطیف اعظمی — ۶/-
۶۰۔ بستانِ حرم۔ (جدید نعتیہ کلام) زائر حرم حمید صدیقی — ۲/۵۰
۶۱۔ شہید محبت بوٹا سنگھ۔ خان محبوب طرزی — ۴/-
۶۲۔ بزم بے تکلف۔ ڈاکٹر سید عابد حسین — ۳/۵۰
۶۳۔ دستہ گل — شبلی نعمانی — -/۳۰
۶۴۔ بہادر شاہ ظفر۔ امیر احمد علوی کاکوروی — ۵/۵۰
۶۵۔ بہشتی ثمر۔ (اول دوم) یعنی خلاصہ بہشتی زیور
مولانا تھانوی — ۳/۸۰
۶۶۔ بانی اسلام۔ علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا
اردو ترجمہ — -/۷۵
۶۷۔ بشریت انبیاء۔ عبدالماجد دریابادی — ۲/۲۵

(پ)

۶۸۔ پطرس کے مضامین۔ پطرس بخاری — ۲/۵۰
۶۹۔ پیار کی باتیں — محسن کاکوروی — -/۲۰

۷۰۔ پھولوں کا انبار (ناول) منظر سلیم — ۴/۷۵
۷۱۔ تیرا اور پرچھائیں۔ مجموعہ ڈرامہ ڈاکٹر محمد حسن — ۵/-
۷۲۔ پاگل خانہ (ناول) مائل ملیح آبادی — ۳/۲۵
۷۳۔ پیغام۔ (ناول) طاہر دیالپوری — ۳/-
۷۴۔ پنجاب میں اردو۔ حافظ محمود شیرانی — ۵/۵۰
۷۵۔ پردیسی کے خطوط۔ حصہ اول۔ مجنوں گورکھپوری — ۴/۵۰

(ت)

۷۶۔ تاریخ ادب اردو۔ (فروغ اردو ایڈیشن)
ڈاکٹر سید اعجاز حسین — ۱۰/-
۷۷۔ تحریریں۔ مجموعہ مضامین۔ ڈاکٹر گیان چند — ۵/۵۰
۷۸۔ تصویر درد معہ تشریحات و ترجمہ۔ فرید احمد علوی — -/۷۵
۷۹۔ تاریخی جائزے — ڈاکٹر محمد یٰسین — ۳/-
۸۰۔ تنقیدی تجزیے — کاظم علی خاں — ۴/۵۰
۸۱۔ تعارف تاریخ اردو جدید ایڈیشن
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۵/-
۸۲۔ تاجدار مدینہ — اقبال صدیقی — -/۶۰
۸۳۔ تنقیدی اصول اور نظریے۔ حامد اللہ افسر — ۵/۵۰
۸۴۔ تنقید و تحلیل — شبیہ الحسن نونہروی — ۴/۵۰
۸۵۔ تنقیدی جائزے۔ (جدید ایڈیشن) سید احتشام حسین — ۵/۵۰
۸۶۔ تنقیدی نظریات۔ جلد اول " — ۷/۵۰
۸۷۔ " " دوم " — ۷/۵۰
۸۸۔ تنقیدی اور عملی تنقید " — ۶/-
۸۹۔ تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) ۱۹۶۸
آل احمد سرور — ۴/۵۰
۹۰۔ ترانہائے خیام۔ ڈاکٹر رغیب حسین — ۲/۵۰
۹۱۔ تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص
محمد حسین شمس — ۱/۲۵

(ٹ)

۹۲۔ ٹیگور — آدم [illegible] — ۳/[illegible]

۹۳- ٹیکسیے کی جنگ۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲/-

(ث)

۹۴- ثنائے حبیب (نعتیہ کلام)۔ بہزاد لکھنوی ۲/۲۵

(ج)

۹۵- جانِ غالب۔ محمد حسین شمس علوی ۲/-

۹۶- جائزے۔ انور سدیدانی ۳/-

۹۷- جواہر اسمٰعیل۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱/۵۰

۹۸- جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) فروغ اردو ۳/-

۹۹- " نمبر ۲ " ۳/-

۱۰۰- جوئے رواں۔ مجموعہ کلام۔ حامد اللہ افسر ۲/۵۰

۱۰۱- جادو کی آنکھ۔ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اثر بلگرامی ۲/۵۰

۱۰۲- جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین ۲/۵۰

۱۰۳- جلوے معین الدین دردائی ۱/۷۵

۱۰۴- جمیلہ پوائزی۔ (ناول) خان محبوب طرزی ۲/۵۰

۱۰۵- جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۶/-

(چ)

۱۰۶- چوتھی بہن۔ مجموعہ افسانہ۔ مسیح الحسن رضوی ۲/۷۵

(ح)

۱۰۷- حیات فضل الحق خیرآبادی ۱/۲۵

۱۰۸- حالی بحیثیت شاعر۔ (جدید اڈیشن) مع اضافہ جدید اڈیشن
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۵/-

۱۰۹- حسرت موہانی عبدالشکور ۴/۵۰

۱۱۰- حسرت تعمیر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰

۱۱۱- حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰

۱۱۲- حکیم نباتات وزیر خاں لشکری ۲/-

۱۱۳- حبیبۂ غالب سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۱۴- خیالات رنگین یعنی مجموعہ مضامین فارسی زیر طبع

۱۱۵- خلاصہ فرائض زادہ مرزا رسوا

۱۱۶- خطبات ماجدی یا سیرت نبوی
عبدالماجد دریابادی

۱۱۷- خضر راہ مع ترجمہ علامہ اقبال

۱۱۸- خلاصہ روح تنقید

۱۱۹- خلاصہ جواہر العروض

۱۲۰- خلاصہ المیزان ۵

۱۲۱- خیلی (مزاحیہ) محمد علی واحدی مع مقدمہ
شوکت تھانوی

۱۲۲- خوش بختی کی تلاش۔ احسن الظفر ایم اے

۱۲۳- خلاصہ شعر الہند حصہ دوم

(د)

۱۲۴- دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۱۰

۱۲۵- دیوان فغانی ۱۰

۱۲۶- داستان سہراب و رستم مع مقدمہ (فارسی)
عبدالاحد خاں خلیل

۱۲۷- دیوان صفی حصہ اول صفی لکھنوی

۱۲۸- دہلی کا یادگار مشاعرہ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۲۵

۱۲۹- دستۂ گل شبلی نعمانی ۱/۲۰

۱۳۰- دوشیزۂ قاف (ناول) خان محبوب طرزی ۱/-

۱۳۱- دلربا " ۱/-

۱۳۲- دکن کا دبستان شاعری مع اضافہ جدید اڈیشن
ڈاکٹر محمد الحسن ہاشمی ۸/-

(ڈ)

۱۳۳- ڈپٹی نذیر احمد ڈاکٹر افتخار حسین ۱۳/-

(ذ)

۱۳۴- ذوق و جستجو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

۱۳۵- ذوق ادب و شعور سید وقار احتشام حسین ۴/۵۰

۱۳۶۔ ذوقِ جنوں۔ مجموعہ کلام آل احمد سرور ۶/-

(ر)

۱۳۷۔ رعایت اور بغاوت سید احتشام حسین ۶/-

۱۳۸۔ رباعیات غالب معہ اُردو ترجمہ

سید امیر حسن نورانی ۳/-

۱۳۹۔ رہبر مضمون نویسی۔ شجاعت علی صدیقی ۲/۵۰

۱۴۰۔ راکھی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی -/۳۷

۱۴۱۔ رخسارِ سحر ناول انصر کریم قدوائی ۱/۵۰

۱۴۲۔ رفتار " ۳/۵۰

۱۴۳۔ رموزِ حکمت معہ مقدمہ اُردو۔ محمد شریف ۳/۵۰

۱۴۴۔ ریاضِ فارسی۔ منتخب کلام فارسی ۲/-

(ز)

۱۴۵۔ زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ)

مولانا تھانوی -/۵۰

۱۴۶۔ زعفرانیوں کا بادشاہ۔ حکیم بانا۔ مزاحیہ ناول

علی عباس حسینی ۳/-

(س)

۱۴۷۔ سلور کنگ آغا حشر کاشمیری ۳/۵۰

۱۴۸۔ سوانح اصفیا کے نجم الدین نقوی ۳/-

۱۴۹۔ سرور جہان آبادی ڈاکٹر حکیم چند نیر ۸/-

۱۵۰۔ سردو نو (مجموعہ کلام) پروفیسر خضر قادری ۳/۵۰

۱۵۱۔ سنگ گہر سید احتشام حسین ۳/-

۱۵۲۔ ساحل و سمندر " ۹/-

۱۵۳۔ سرسید و احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری

سید علی عباس حسینی ۱/۵۰

۱۵۴۔ سرمایۂ زبانِ اردو جلال لکھنوی ۴/۵۰

۱۵۵۔ سخنہائے گفتنی کلیم الدین احمد ۷/-

۱۵۶۔ سفر (ناول) بائی ملیح آبادی ۴/-

۱۵۷۔ سیاحت زمین (ناول) محمود عظیم فہمی ۱/۵۰

۱۵۸۔ سید سالار مسعود غازیؒ وحشی محمود آبادی ۳/۵۰

۱۵۹۔ ستاروں سے آگے ناظر کاکوروی ۳/۵۰

۱۶۰۔ سنہرا حلقہ -/۷۵

۱۶۱۔ سرسید احمد خاں انوار الحسن صدیقی -/۳۷

۱۶۲۔ سوشل اسٹڈی احمد محسن کاکوروی ۱/۷۵

(ش)

۱۶۳۔ شرح دیوان غالب۔ (مزاحیہ) غلام احمد فرقت ۸/۵۰

۱۶۴۔ شرح سنگ گہر عبد القوی دریابادی ۴/-

۱۶۵۔ شاہ غمگین حضرت جی پروفیسر عبد الشکور ۳/-

۱۶۶۔ شرح ادب پارے نثر سعادت علی صدیقی ۴/-

۱۶۷۔ شرح ادب پارے نظم ڈاکٹر محمود الحسن ۴/-

۱۶۸۔ شرح منتخبات فارسی عبد القوی دریابادی ۵/-

۱۶۹۔ شبلی نعمانی انوار الحسن صدیقی -/۳۷

۱۷۰۔ شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن) نظم طباطبائی ۶/-

۱۷۱۔ شہری اور سماجی زندگی عبد العلیم قدوائی -/۵۵

۱۷۲۔ " " -/۷۰

۱۷۳۔ " " -/۷۵

۱۷۴۔ " " -/۷۵

۱۷۵۔ شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ۔ امیر احمد علوی ۳/۵۰

۱۷۶۔ شعر العجم۔ حصہ اول۔ دوم۔ سوم۔ چہارم۔ پنجم

شبلی نعمانی ۲۹/-

۱۷۷۔ شرح نثر امروز ایران احسن المظفر بی اے ۲/-

۱۷۸۔ شرح شعر امروز ایران " ۲/۵۰

۱۷۹۔ شمع و شاعر علامہ اقبال -/۲۵

۱۸۰۔ شرح حکیم نباتات خاں نیر مسعود ۱/۲۵

۱۸۱۔ شرح انتخاب قصائد و غزلیات

مطابق نصاب بی۔ اے۔ عبد العلیم قدوائی ۶/-

۱۸۲۔ شرح ترانہائے خیام حکیم عبد القوی ۲/-

۱۸۳۔ شرح نصاب فارسی ۳/-

۱۸۴۔ شرح غنچہ و گل ۲/۵۰

۱۸۵۔ شرح گلہائے ادب ۳/-

۱۸۶۔ شرح شعرستان حصہ ۲ احسن الظفر ۳/-

۱۸۷۔ شرح نثر فارسی امروزہ 〃 ۳/-

۱۸۸۔ شرح آئینہ نثر اردو خلیل قدوائی ۳/۵۰

(ص)

۱۸۹۔ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۳/۵۰

۱۹۰۔ صحیفۂ محبت۔ مہدی افادی کے خطوط۔ ڈاکٹر محمود الٰہی ۵/۵۰

(ط)

۱۹۱۔ طرزی کا تغیر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اردو ۲/-

۱۹۲۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیئے۔ غلام الثقلین ۲/۳۰

۱۹۳۔ طلسم اسرار۔ (ڈرامہ) مرزا رسوا لکھنوی ۱/۵۰

۱۹۴۔ طرۂ امیر۔ امیر مینائی منتخب کلام
(جدید ایڈیشن) امیر احمد علوی ۳/۵۰

(ع)

۱۹۵۔ عذرا۔ ناول صالحہ عابد حسین ۵/-

۱۹۶۔ عکس اور آئینے۔ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
سید احتشام حسین ۵/۵۰

۱۹۷۔ غالب کا تنقیدی شعور۔ مکتوبات کے آئینہ میں
اخلاق حسین عارف ۳/۵۰

(غ)

۱۹۸۔ غالب کی تخلیقی تخیل۔ شہید صفی پوری ۸/۰۰

۱۹۹۔ غنچہ و گل سید محمود الحسن رضوی ۲/-

۲۰۰۔ غالب کے کلام میں محاکاتی عناصر۔ نادم سیتاپوری ۵/-

۲۰۱۔ غزنی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۲۰۲۔ غزلیات نظیری ۱/۵۰

(ف)

۲۰۳۔ فروغ ادب) طاہر حسن علوی ۴/۵۰

۲۰۴۔ فن خطابت یعنی استاد تقریر۔ مکتبہ مصطفائیہ ڈپو ۹/-

۲۰۵۔ فسانۂ بیرہ خان محبوب طرزی

۲۰۶۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ نادم سیتاپوری

۲۰۷۔ فلسفۂ اقبال۔ عبدالقوی دریابادی

۲۰۸۔ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی

۲۰۹۔ فروغ جام مجموعۂ کلام منظور واحدی

۲۱۰۔ فغان محسن محسن کاکوروی

۲۱۱۔ فارسی آموز مشیر احمد علوی

۲۱۲۔ فرہنگ استانگوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد

(ق)

۲۱۳۔ قر بیچے۔ جدید میت پر مزاحیہ نظمیں۔ غلام احمد ف

۲۱۴۔ قصائد ظہیر فاریابی

۲۱۵۔ قصائد مومن۔ مع شرح۔ ظہیر احمد صدیقی

۲۱۶۔ قطرے سے گہر ہونے تک۔ صالحہ عابد حسین

۲۱۷۔ قدر و نظر۔ ڈاکٹر اختر اورینوی

۲۱۸۔ قصص و مسائل۔ عبدالماجد دریابادی

۲۱۹۔ قصائد قاآنی (فارسی)

۲۲۰۔ قومی ادب نثر و نظم حامد اللہ افسر

۲۲۱۔ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول)
خان محبوب طرزی

(ک)

۲۲۲۔ کبیر اور کابی بدرالدین طیب جی

۲۲۳۔ کف گلفروش (مزاحیہ مضامین)
غلام احمد فرقت

(گ)

۲۲۴۔ گلبانگ حرم مصور۔ مع مقامات مقدسہ کے فوٹو
زائر حرم حمید صدیقی لکھنوی

۲۲۵۔ گاندھی نمبر

۲۲۶۔ گلدستۂ فارسی اول و دوم

۲۲۵۔ گلزار فارسی [illegible]

۲۲۸- گلہائے ادب عبدالاحد خان خلیل ۳/-

۲۲۹- گاندھی جی کے ساتھ۔ حامد اللہ افسر ۱/۵۰

(ل)

۲۳۰- لوائح جامی مع مقدمہ عبدالاحد خان خلیل ۱/۵۰

۲۳۱- لال قلعہ مائل ملیح آبادی ۶/-

۲۳۲- لب بام عادل رشید ۵/-

۲۳۳- لسانیات اور اردو سید محمود حسن رضوی ۴/-

(م)

۲۳۴- مرقع اقبال۔ عصمت فاطمہ ۱۲/-

۲۳۵- مزاحیہ شرح دیوان غالبؔ اردو۔ غلام احمد فرقت ۸/۵۰

۲۳۶- محسن کاکوروی نمبر ۳/-

۲۳۷- مسلمان اور کانگریس ابوالکلام آزاد ۲/۵۰

۲۳۸- مرثیہ نگاری اور میر انیس ڈاکٹر احسن فاروقی ۴/۵۰

۲۳۹- مضامین فرحت حصہ اول
مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/۵۰

۲۴۰- مضامین فرحت (حصہ دوم) " ۴/۵۰

۲۴۱- ماضی کی کہانیاں آفتاب اختر تلہری ۲/۵۰

۲۴۲- میرے اسٹیج ڈرامے ڈاکٹر محمد حسن ۵/۵۰

۲۴۳- موسم گل (ناول) عادل رشید ۴/-

۲۴۴- مجبور " خان محبوب طرزی ۴/۵۰

۲۴۵- مضامین جدیدہ محمد ہادی ۱/۲۵

۲۴۶- مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ
قدرت اللہ بیگ ۲/۵۰

۲۴۷- مطالعہ شبلی۔ ناظر کاکوروی، شجاعت علی سندیلوی -/۲

۲۴۸- مطالبات شبلی جالب مظہری ۲/۵۰

۲۴۹- مثنویات حالی۔ ناظر کاکوروی، شجاعت علی سندیلوی ۳/۵۰

۲۵۰- مطالعہ حالی۔ " " ۵/۵۰

۲۵۱- میٹھے بول " " ۱/۵۰

۲۵۲- مولوی نذیر احمد کی کہانی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۲۵

۲۵۳- معرکۂ روم و یونان صادق سرور صفوی ۶/-

۲۵۴- مثنوی چاند خان محبوب طرزی ۴/-

۲۵۵- مقدمہ شعر و شاعری (مطابق نصاب بی اے) حالی ۱/۵۰

۲۵۶- مرثیہ غالب حالی -/۲۵

۲۵۷- محبوبہ کربلا جرجی زیدان ۳/۵۰

۲۵۸- معمار مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۲۵۹- مولانا حالی انوار الحسن صدیقی -/۳۷

۲۶۰- انتخاب فسانہ آزاد سرشار لکھنوی

۲۶۱- مہاراج بلی ڈاکٹر احسن فاروقی ۲/۵۰

۲۶۲- مسٹر ملا کی نوک جھونک

۲۶۳- خواجہ عزیز الحسن مجذوب ۱/۷۵

۲۶۴- مجذوب اور انکا کلام۔ مولانا رضا انصاری ۱/۵۰

۲۶۵- مصباح بلاغت مع مقدمہ اردو
محمد شریف ۳/-

۲۶۶- مطالعہ سودا ڈاکٹر محمد حسن ۳/۵۰

۲۶۷- مزاحیہ شرح دیوان غالب۔ غلام احمد فرقت ۸/۵۰

۲۶۸- مقدمات و مقالات۔ عبدالاحد خان خلیل ۵/۵۰

۲۶۹- منتخب سوانح اور خاکے۔ نجم الدین نقوی ۳/-

(ن)

۲۷۰- نثر امروز ایران ڈاکٹر رغیب حسین ۳/-

۲۷۱- نشاط غالب وجاہت علی سندیلوی ۵/-

۲۷۲- نقد و انتقاد اعجاز احمد معجز ۲/۵۰

۲۷۳- نقش حالی اول دوم یعنی حالی نمبر
پروفیسر احتشام حسین۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

۲۷۴- شجاعت علی سندیلوی ۱۵/-

۲۷۵- نغمۂ کوہسار خان محبوب طرزی ۴/-

۲۷۶- نفحات الہند مع مقدمہ۔ اردو۔ محمد شریف ۳/-

۲۷۷- نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی
کبیر احمد جائسی ۲/-

[illegible]

۲۷۹- خیابانِ [illegible] [illegible] ۳/۵۰

۲۸۰- [illegible] [illegible] ۴/۵۰

۲۸۱- نئے اور پرانے چراغ مع اضافۂ جدیدہ
آل احمد سرور ۸/۰۰

۲۸۲- نقوش و افکار مجنوں گورکھپوری ۵/۵۰

۲۸۳- نیلم انتظار حسین ۳/-

۲۸۴- نذیر احمد کی کہانی فرحت اللہ بیگ ۱/۲۵

۲۸۵- نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی
عبدالاحد خاں خلیل ۴/-

۲۸۶- منشی نولکشور نمبر ۲/۵۰

(و)

۲۸۷- وعدۂ فردا اخگر مشتاق رحیم آبادی ۷/-

(ہ)

۲۸۸- ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے علی عباس حسینی ۳/-

۲۸۹- ہندوستانی مسلمان [illegible] [illegible]

۲۹۰- ہمارا جھنڈا حامد اللہ افسر ۱/-

۲۹۱- ہندوستان شاہراہ ترقی پر
منظر سلیم ۱/۵۰

۲۹۲- ہندوستان کا تعمیری منصوبہ " ۱/۵۰

۲۹۳- ہمارا سماج حصہ اول ڈاکٹر مصطفی حسن علوی فرنگی محلی -/۷۵

۲۹۴- " حصہ دوم " " -/۷۰

۲۹۵- " حصہ سوم " " -/۷۵

۲۹۶- " حصہ چہارم " " -/۷۵

۲۹۷- یادگار غالب مولانا حالی ۳/-

۲۹۸- یاقوتی ناول
خان محبوب طرزی ۳/۵۰

۲۹۹- یادگار انیس امیر احمد علوی ۴/-

ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

۱- پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۲- جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں۔

۳- اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

۴- جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

۵- ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔